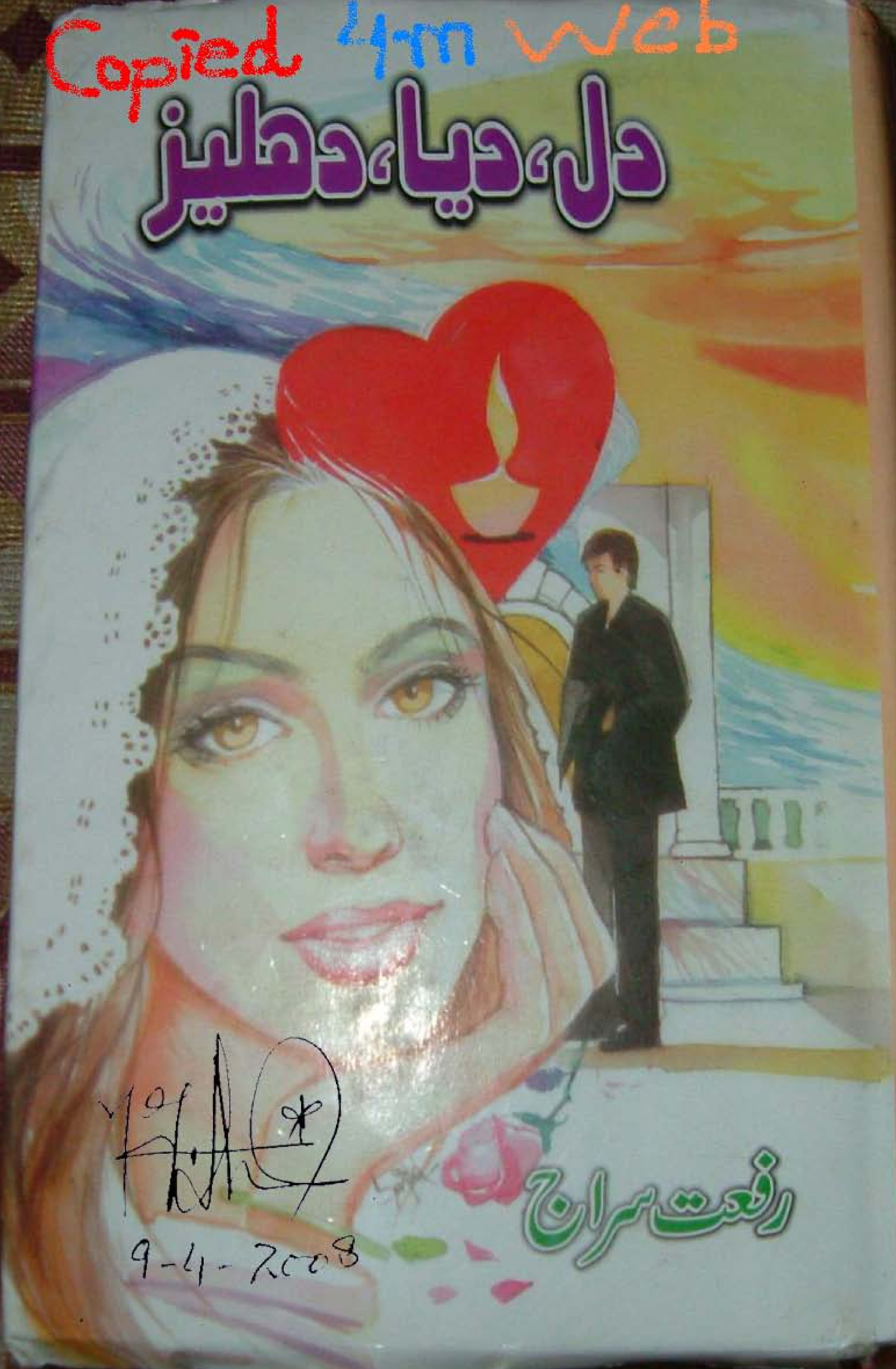
Copied 4m Web
دل، دیا، دہلیز
رفعت سراج
9-4-2008

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اس دنیا میں ہر متحرک انسانی وجود ایک کہانی ہے۔

دل، دیا، دہلیز کو ایک آئیڈیل "لو اسٹوری" کا سرٹیفکیٹ (قارئین کی طرف سے) ایشو ہوا۔ 48 ماہ تک یہ ناول قسط وار شائع ہوا۔

اس دوران مجھ سے اس کے نام کے معنی و مقصد دریافت کیا جاتا رہا......

جہاں دل ہے وہاں انتظار کی کیفیت سے گزرنا اس کی قسمت ہے...... دل کھلنے کا انتظار دہلیز پر سماعت ٹھہری رہتی ہے...... کسی کے قدموں کی آہٹ پر کان لگے رہتے ہیں دہلیز پر جلتا ہوا دیا اس بات کا غماز ہے کہ اندر کوئی جاگ رہا ہے۔ اندھیری دہلیز سے تو یہ خوشہ ہے آنے والا یہ سمجھ کر واپس نہ پلٹ جائے کہ انتظار کرنے والے سو چکے ہیں۔

محبت کو اندیشے و دھڑکے بہت رہتے ہیں...... ہر آن کوئی تسلی کی تھپکی چاہئے ہوتی ہے جلتا ہوا دیا...... اندیشوں میں سہارا ہے...... کہیں دور سے آنے والے کیلئے خوش اُمیدی کی کرن ہے...... اس کی روشنی میں وصال کی آس ہے۔

یہ دل کی کہانی ہے۔ دل والوں کی کہانی ہے۔ پھول کھلنے کی کہانی ہے۔ آگ لگنے کی کہانی ہے وہ آگ جو دل میں سلگتی رہے تو محبت کہلائے۔

بھڑک اُٹھے تو سب کچھ بھسم کر ڈالے۔ اس آگ کا نام ہے۔ حسد انتقام

یہ وہ جذباتی کیفیات ہیں جو ازل سے انسان کو زنجیر کرتی آ رہی ہیں......
انسانوں کے موڈ اور رویے بناتی ہیں...... جن سے واقعات جنم لیتے ہیں جن کو مرتب کر دیں
تو کہانی کہلائے بے ترتیب رہنے دیں تو صرف مسائل کا انبار ہوں۔
میں نے دل کی کہانی لکھی ہے......
دل والوں نے بڑے پیار سے پڑھی ہے اور انشاء اللہ پڑھتے رہیں گے......

جنریشن خواہ کوئی ہو۔
دل تو سب کا ہے
سب کے پاس ہے
اس خوف سے کہ
آنے والا اندھیرا دیکھ کر
پلٹ نہ جائے......
بے وفائی کے اندیشوں کے
گھنے جنگل میں بھٹک جائے
دل کی دہلیز پہ
اک دیا جلا رکھا ہے

copied from web

آپ کی
6-5-05

وے بول سانول وے بول سانول
نہ رولیں سانوں، نہ رولیں سانوں
ویکھیں کنڈیاں دے وچ نہ تو، تولیں سانوں
وگدی اے راوی وچ، ستاں مہینیاں۔ ستاں مہینیاں
تیرا ڈھولا بڑا سوہنا مجھیں سیاں کھندیاں۔

"روشی آپا، آپ کو بابا صاحب بلا رہے ہیں"۔ خادمہ اس کے کان میں بولی تھی۔
ڈھول کی تھاپ یکدم رک گئی۔ اور اس کی سانس بھی۔
"لائبریری میں ہیں؟" وہ کہہ کر روبوٹ کی طرح اٹھ گئی۔
روشی نے اپنے چاروں طرف بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو اس طرح دیکھا۔ جیسے ان میں سے کوئی آنے والے لمحات کی پیشگی کرے گی۔
وہ بدقت تمام اٹھی اور ڈرے ڈرے انداز میں چلتی لائبریری کے دروازے پر آ کر رک گئی اور بہت مشکل سے جیسے دستک دی۔
"آ جاؤ۔" بابا صاحب کی خشک اور بے تاثر آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اندر داخل ہو کر جیسے آگے نہیں بڑھی۔
بابا صاحب نے کتاب چہرے کے سامنے کی ہوئی تھی۔ اور روشی کو جیسے یہ پردہ غنیمت تھا۔ ایک ڈھال۔ ایک دیوار۔ درمیان میں حائل پا کر جیسے اس کے خوف میں کمی واقع ہو رہی تھی۔
"ڈھولک کون بجا رہا تھا؟" بابا صاحب کی سرد آواز سے جیسے وجود برف ہونے لگا۔

''مم...... میں...... بجا رہی تھی بابا صاحب''۔

''کیوں؟''۔

''ظفری بھائی کی شادی جو ہے'' اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

''اور یہ شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے؟'' لہجہ ہنوز چبھتا ہوا تھا۔

روشی نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

''جھومر کے ساتھ بابا صاحب''۔ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

''جھومر کون ہے؟'' وہ برہمی سے پوچھ رہے تھے۔

اللہ۔ (معاملہ کیا ہے آخر؟) اب خوف کی جگہ پریشانی نے لے لی۔

''کاکا جان کے شوفر عنایت علی کی بیٹی ہے بابا صاحب''۔ اس نے اس بار قدرے سنبھل کر جواب دیا۔

''بے وقوف لڑکی۔ یہ بات جو چند افراد کے علاوہ کسی کو پتا نہیں۔ تم ڈھول پیٹ کر گویا اعلان کی صورت بتا رہی ہو''۔ وہ گرجے۔

روشی کی تو ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''بابا صاحب! باہر کی تو کوئی بھی لڑکی نہیں ہے۔ ہماری تینوں چاروں نوکرانیاں ہیں اور میں۔ زری آپا' مونا باجی' گلو آپا' حنا' ثانیہ' لالی' روبی' مریم' شنو آپا' بیہ' سونی۔ کوئی بھی تو نہیں گا رہا تھا۔ تو''۔

''اس لئے کہ وہ تمہاری طرح بے وقوف اور کم عقل نہیں ہیں۔ اور تمہارا اس قدر حرج ہو رہا تھا کہ خادماؤں کو لیکر بیٹھ گئیں''۔

ان کی پر جلال آواز پر روشی کی رہی سہی طاقت بھی جواب دے گئی۔

''جو وقت کالج میں اور تصویریں بنانے میں گزارتی ہو' گنواتی ہو۔ کسی سمجھدار لڑکی کے ساتھ گھر میں معروف رہا کرو۔ شاید تھوڑی بہت عقل آجائے''۔

بڑی زبردست لتاڑ تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ مگر بابا صاحب کو چہرے دیکھنے کی نہ عادت تھی نہ فرصت۔

''جاؤ۔ اور آئندہ دھیان رکھنا۔ جو کچھ آج ہوا اس پر غور کرنا۔ غور و فکر کرنے سے بھی عقل میں اضافہ ہوتا ہے''۔

کس قدر کاٹ تھی اس جملے میں

اتنی سخت سست پر اس کا دل چاہ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

وہ نیم تاریک راہداری میں نکل آئی۔ کس جوش ولولے سے وہ گا رہی تھی۔ کیا بے چارے ظفری بھائی انسان نہیں؟ کیا ان کا دل نہیں؟ کتنے پتھر ہیں بابا صاحب۔ میں نے تو کلو کو بھیجا ہوا تھا کہ وہ ظفری بھائی کو بلا لائے۔ وہ کتنا خوش ہوں گے۔ ہائے۔ کاش بچپن میں انہیں خر کار اٹھا کر لے جاتے۔ کم از کم ان کی شادی پر سارے بیگار کیمپ میں شادی والی رونق تو ہوتی۔

روشی نے اپنی سمجھ عقل کے مطابق تمنا کی۔

''ادھر اندھیرے میں کہاں جا رہی ہیں؟'' وہ کیونکہ سوچوں میں غلطاں تھی۔ اچانک آواز پر جیسے اچھل پڑی۔

''جہنم میں بھی جا رہی ہوں تو۔ تم سے مطلب؟'' وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرائی۔

''میں تو پوچھ رہا تھا۔ وہ خفیف سا ہو کر گویا ہوا تھا۔

''کس قدر شوق ہے تمہیں پوچھنے کا۔ کسی روز تمہیں پوچھ لیا ناں تو پتہ لگ جائے گا''۔ وہ جل بل کرتی جیسے اس پر چڑھ دوڑی۔

''ارے ہم تو عاجز ہیں بالکل آپ کے نوکر جیسے۔ دبے دبائے سے۔ کیوں بلا وجہ اپنی انرجی ضائع کرتی ہیں''۔ وہ عجیب سی تلخی سے ہنسا اور آگے موڑ پر گم ہو گیا۔

''لو۔ ہر بات دل پر لے لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ حضرت جانتے ہیں سارے گھر میں سب سے زیادہ نرم گوشہ کس کا ہوں ان کیلئے''۔

''اب بھی ان کی قسمت ایسی ہے تو میرا کیا قصور ہے اس میں''۔ اب وہ نئے سرے سے کڑھ رہی تھی۔

''اے۔ شی!'' مونا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سب کو کھڑکی کی سمت آنے کا اشارہ بھی ساتھ ہی کیا۔

وہ سب گرتی پڑتی کھڑکی کی سمت بڑھی تھیں سوائے روشی کے۔ وہ اسی طرح بیڈ پر سر جھکائے پاؤں کے ناخنوں پر سے کیوٹکس کھرچ رہی تھی۔

''اے روشی آؤ ناں''۔ گلو آپا نے جیسے اس کے ٹس سے مس بیٹھے رہنے پر تعجب کا اظہار بھی کیا تھا۔

روشی اسی طرح بہری گونگی بنی بیٹھی رہی۔

گلو آپا نے جیسے بیزار کن انداز میں شانے جھٹک دیئے تھے اور دوسری لڑکیوں کی سمت بڑھ گئی تھیں۔

''دوپہر سے تو ڈھول پھاڑے جا رہے تھے اور اب حرکت بھی دشوار ہے''۔ وہ بڑبڑائی تھیں۔

''یہ ظفری بھائی کو گاڑی میں کون بٹھا رہا ہے؟'' سونی کی آواز کمرے میں ابھری۔

''چھوٹے چچا ہیں''۔ مونا نے جواب دیا تھا۔

''بابا صاحب نظر نہیں آرہے؟'' بیہ نے ذرا دور تک تاک جھانک کی۔

''ان کی تکبیر و دیر ہوئی۔ روانہ ہو چکی''۔ مریم نے اطلاع بہم پہنچائی۔

''وہ ساتھ کیوں نہیں گئے؟'' بیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''آئیں گے تو پوچھ لینا''۔ زری آپی نے جیسے ڈانٹا تھا۔

''لو بابا۔ ان سے کون پوچھ سکتا ہے''۔ بیہ نے کانوں کو ہاتھوں سے چھوا۔

"تو پھر چپ رہو"۔ مریم کو جیسے یہ بے تکی گفتگو بہت کھل رہی تھی۔

"ارے بڑی امی بھی جا رہی ہیں"۔ منا کی تعجب خیز آواز روشی کے کانوں میں پڑی۔

"تو کیا وہ نہیں جائیں گی اپنے نور چشم ظفر یاب ان خان آفتاب کے حلقہ مستورات میں"۔ جانیے نے چچ کر قدرے سوالیہ انداز میں جواب دیا تھا۔

"اللہ کتنا دل چاہ رہا ہے ظفری بھائی کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کو"۔ شعلہ بڑی بے بسی سے گرل تھام کر بولی تھی۔

"جاؤ دیکھ آؤ۔ ابھی مریم نے بتایا نہیں۔ بابا صاحب تو دیر ہوئی جا چکے"۔ گلو آپا نے جیسے اس کی بے بسی سب سے زیادہ محسوس کی تھی اسی لئے فوراً ہی بتایا تھا۔

"مگر گلو آپا۔ اس وقت جتنے بھی لوگ پورچ میں کھڑے ہیں۔ سب تقریباً بابا صاحب جیسے ہی ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ"۔ شعلہ نے خاصی خفگی سے جواب دیا۔

"لو بھئی۔ رونا شروع"۔ بینے نے کن انکھیوں سے بظاہر بے نیاز روشی کی طرف دیکھ کر رننگ کمنٹری کی تھی۔

"آج تو ظفری بھائی بہت خوش ہوں گے"۔ بینہ دھپ سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"لو ایسے ویسے۔ اب تو انہوں نے سب کی شادیوں پر "رونا" شروع کر دیا تھا۔ انیق بھیا کا سہرا انہیں تو ڈالا تھا۔ اسی دن تو بابا صاحب نے وعدہ کیا تھا ان سے کہ ان کی شادی بھی بہت جلد کر دیں گے"۔

روبی جواب تک بڑی خاموشی سے تمام کاروائی دیکھ رہی تھی۔ بڑی تفصیل سے شروع ہوئی تھی۔

"مگر ہائے بے چاری جمہور۔ اس کے بھی تو۔ خواب ہوں گے۔ کچھ ارمان ہوں گے۔ ماما بلی بتا رہی تھی کہ بہت حسین ہے"۔

روبی کی معلومات واقعی وسیع تھیں۔

"تو۔ ماما بلی کو کیسے پتا"۔ زری آپی نے تنک کر جھوٹ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔

"جب نیچے کی آیا اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ تو کاکا جان انہیں لے گئے تھے ماما بلی کو"۔ روبی کو "تنک" کرنے پر شدید غصہ آیا تھا۔ (ہونہہ۔ یہ ہر ایک کو جھوٹا ہی سمجھتی ہیں)

"اوہ ہاں۔ اس کو تو مجھے دھیان ہی نہیں آیا۔ وہ بے چاری بیٹے رو کر آئی تھی ماما بلی مرائے"۔

"اور ابھی کے بعد سیکڑوں قصے بھی سنائے تھے۔ مرائے کے"۔ زری آپی کو یاد آ گیا۔

روبی کا موڈ خاصا آف ہو چکا تھا اس لئے اس نے کسی قسم کے تاثرات دینا مناسب نہ سمجھا۔

"اچھا۔ تو روبی تم بتا رہی تھیں۔ جمہور بہت حسین ہے"۔ زری آپی کا اشتیاق دو آتشہ تھا۔

"بس بتا تو دیا"۔ روبی نے اسی اکھڑے اکھڑے انداز میں کہا۔

"ایک تو تم نازک مزاج بہت ہو۔ فٹ سے ہی ارمان جاتی ہو۔ وہ تو میں اپنی یادداشت کیلئے ہی پوچھ رہی تھی"۔

زری آپی نے اسے دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا اور کھلکھلائیں۔

"زری۔ یہ جمہور بھابی کیا نام ہوا؟" سونا باجی کی انتہائی بے زاری اس میں پوری طرح عیاں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ نام ہے۔ گزارہ کرو"۔ سونا باجی زری سوچ بچار میں الجھی تھیں۔

"حد ہے تم سے سونا۔ یہ وقت نام جیسی چیزوں سے ماورا رہتی ہو۔ کاکا جان کے سارے خاندان کا پرانا تعلق ہے تعلق رکھتے ہیں اور تم تو جانتی ہو وہاں نام رکھنا بالکل ہی رواج نہیں۔ بھلا پتے نہیں کیا نام رکھتے ہیں کسی سے پوچھ کر وہ لوگ تو ہوتے ہی ایسے ہیں"۔ شعلہ نے انداز میں ... سے جواب دیا تھا۔

"چلو نہیں وہ ابھی کب تک ہو گی؟"۔

"تو ان کی واپسی بھی شروع ہو گی۔ انہوں نے تو ابھی آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہو گا"۔ روبی بولی۔

"اچھا صاحب جمہور بھابی آ گئیں تو کیا نام سب سو آگے کو جانیئے؟" سونا باجی گلو آپا سے مخاطب ہوئیں۔

"بابا صاحب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کروں کہ مجھے بھی ذرا شستگی کا ادراک ہو آپ لوگوں کا یہ حال ہے"۔ روشی نے سخت خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا حال ہے ہمارا؟" سونا کو وہ بہت ہی بے ادب لگی تھی۔

"یہ سسٹری بھرتی ہے بھولی آپی"۔ روشی کے اب سارا کچھ میں آ چکا تھا اسے علم تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا۔

"لو بھئی۔ یہاں تو ہر چیز ہی "سسٹری" ہے۔ یہ صرف بھرتی پکڑے بیٹھی ہیں"۔ زری آپی نے ہنس کر سونا کو گھورا۔

"مجھے تو ان سب کی واپسی تک نیند بالکل نہیں آئے گی"۔ بینے نے اپنی مشکل بیان کی۔

"لو ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ جن راستوں سے یہ بارات گئے ہیں ان راستوں سے واپس نہیں آئیں گے۔ پچھلے بڑے پھاٹک سے دلہن سیدھی حجلہ عروسی میں پہنچائی جائے گی۔ اسے اس طرف کبھی بھی نہیں آنا ہے۔ سمجھیں"۔

"ہائے گلو آپا آپ کتنی بے درد ہیں۔ ایسی شام غریباں جیسی شادی۔ آپ کو ترس نہیں آتا جمہور پر"۔

سونی نے خاصی دیر بعد حصہ لیا۔

گلو آپا نے اپنی حسین بلوریں آنکھیں ایک لمحے کو سونی کی آنکھوں میں ڈالیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بہت ہی ناسمجھ ہو سونی"۔ وہ گم صم سے انداز میں مسکرائیں۔

"کہاں چلیں گلو؟" زری بھی اب ہر پہلو سے متجسس تھیں۔

"نیند آ رہی ہے۔ سونا چاہتی ہوں"۔

"ابھی سے"۔

"ہاں۔ اگر سونہ پائی تو چودہ دن تک ڈپریشن رہے گا۔ نیند کیسی اچھی راحت ہے اگر آ جائے تو"۔

وہ سرگوشی کے انداز میں کہہ کر مسکرائیں اور باہر نکل گئیں۔

"ظفری بھائی کو دولہا تو بنایا ہو گا بڑی امی نے"۔ بینے کو یکدم پھر کچھ یاد آیا۔

"ہاں۔ ظاہر ہے آخر اکلوتے بیٹے ہیں ان کے۔" شمع نے بھرپور انداز میں شرکت کی۔

"آپ کو کیسے پتا لگا ہے" روبی نے شمع کی سمت دیکھا۔

"تم بس اپنی حد میں رہا کرو۔ بڑی آئیں خوش ہونے والی۔" شمع کو تاؤ آ گیا۔

روبی بے نیازی سے شانے جھٹک کر باہر نکل گئی۔

"ارے۔ بی بی جا رہا ہے۔" مونا نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے ان سب کو مخاطب کیا۔

"ہائیں اسے۔ اسے تو سارا ایجنڈا ازبر ہوگا۔" زری نے مارے اشتیاق کے کھڑکی کی سمت دوڑ لگائی

"بی بی ہی نہیں۔ غیر ضروری مبالغہ۔ جو کچھ وہ سنائیں گے اس میں سے سچ چھانٹنے کے لیے دو دانشمند درکار ہوں گی۔"

روشی جل کر بولی تھی۔

"پھر بھی کچھ تو پتہ چلے گا۔"

"ہادی بھائی۔ شش۔ ادھر آ گئے۔ ہمارے کمرے میں۔" مونا نے کھڑکی سے پیغام رسانی شروع کی۔

"ارے آ گئیں ناں" وہ جیسے اس کی جھنجھلاہٹ پر جھلائی۔

"سب ہیں اور سب تو ہمیشہ سے ہی ہیں۔ آج کیا نئی ہے۔ جلدی سے آئیں۔" مونا کہہ کر کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی اور جلدی سے دروازے کے بیچ جا کھڑی ہوئی۔

"توبہ۔ کتنے نخرے ہیں۔ جلدی سے آئیں۔ ارے بھئی ریڈ کارپٹ ریسپشن دیں آپ لوگ۔"

"السلام علیکم" وہ چند لمحے گزرنے کے بعد نمودار ہو چکا تھا۔

"وعلیکم السلام" سب نے کورس کے انداز میں جواب دیا سوائے روشی کے۔

"فرمایئے!" وہ پشت پر ہاتھ باندھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"ہم نے نہیں فرمانا۔ اس وقت تو جو فرمانا ہے آپ نے فرمانا ہے۔ حاضرین سوالات کی بارش فرمایئے۔" حنا نے شرارت بھرے انداز میں اس کے مقابل میں آ کر کہا۔

"میں۔ میں کیا فرما سکتا ہوں آخر کرتی ہیں آپ لوگ۔" وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

"ابھی پتہ چل جائے گا۔ آپ کیا فرما سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ پہلے تشریف تو رکھئے۔" سونی نے موڑھا اس کے سامنے کیا۔

"کھٹو کہاں ہے؟" وہ سٹپٹا کر ادھر دیکھنے لگا۔

"نعوذ باللہ۔ غیاث الدین مصطفی نام رکھا ہے انہیں۔" زری چڑ گئیں۔

"ہر بات کی فریاد ان سے۔"

"اوئی!" روبی چیخ مار کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"دماغ میں پھنس گیا۔ اوئی۔" وہ سر پکڑ کر بیڈ پر اوندھی ہو گئی۔

"کیا پھنس گیا؟" حیرت آمیز آوازیں بلند ہوئیں۔

"وہ کیا تھا۔ غیاث ا۔"

"بدتمیز۔" سونی نے لطف اٹھانے کی کوشش میں اس کے ایک دھپ جڑی۔

"آپ نے تو ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے۔" ہادی موڑھا کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے آپ فرصت میں ہیں۔ اگر ہاتھ پاؤں بھی چھوڑ دیئے تو گویا اس وقت تک وہاں جا پہنچے۔"

"وہ کیسے؟" روبی شمع کے کچھ انداز کے سمجھنے میں ہی ناکام رہی تھی۔

"شکر ہے تجھے تک معمول کی بات سمجھ آئی ہیں گی اور یہ جو یہاں نکلے کے اندر اتر جاتی ہے۔" کہہ کر اس نے اپنی خصوصی دلچسپی ظاہر کر دی۔

روشی نے جھکا سر اٹھا کر ہادی کی سمت دیکھا۔

وہ بیچاری طرح ہٹ گیا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر تکیہ کو اپنی پشت پر رکھ دیا۔

"کیا میں یاد دلاؤں کہ میں یہاں کیوں مدعو ہوں؟" ہادی نے حنا کی سمت دیکھا۔

"نہیں نہیں زحمت نہ کریں۔ ہمیں یاد ہے۔" حنا دوسرا موڑھا کھینچ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"ہادی۔ کیا تمہیں علم ہے۔ بابا صاحب دلہن لیکر کب تک آ جائیں گے؟" زری آپی نے قدرے آہستگی سے سوال کیا تھا۔

"لیجئے۔ یہ آپ لوگوں کے پروگرام مجھے کیوں معلوم ہونے لگے۔" وہ جیسے اس کی سادگی پر ہنس دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ بارات تو سرائے ہی گئی ہے ناں" زری آپی اب انداز میں کہنے لگیں۔

"جی۔ یہ بات تو اچھی طرح معلوم ہے کہ بارات (اس نے بارات پر خاصا زور دیا) سرائے ہی گئی ہے۔"

وہ گھنٹے کا راستہ ہے۔ سات بجے وہ لوگ یہاں سے گئے ہیں۔ بارہ بجے تک ہی واپس ہوں گے۔" وہ حساب کتاب میں لگ گئیں۔

"ہاں۔ پتہ ہے۔ وہاں کون سا ماحضر تناول کیا جائے گا۔" شمع نے مسکرا کر کہا۔

"وہاں نہ سہی۔ کاکا جان تو ڈنر کے بغیر نہیں آنے دیں گے۔"

"تو کیا ایک بجے تک جاگیں۔" حنا نے بے زاری سی جمائی لی۔

"ہر رات کی ایک صبح بھی ہوتی ہے۔" روبی نے یاد دلایا۔

"اوہ ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔" حنا نے اسے چڑایا۔

"ظفری بھائی تو بہت خوش ہوں گے۔ ہے ناں ہادی بھائی۔" مریم نے بھی حصہ لیا۔

"بہت۔ میں نے تو ہلکی روشنی میں بس کانوں تک چری باچھیں ہی دیکھیں۔" اس نے بھی سو سیر بننے کا فیصلہ کیا۔

"اچھا۔ اب ذرا حد میں ہی رہو۔" شمع کی سنجیدہ روح تلملائی۔

"کیا سویا ہوا تھا؟"

"نہیں"۔

"تو پھر پھولوں کے ہار پہنے ہوں گے؟" اس نے کہا۔

"صرف ایک ہی تھا"۔ وہ فوراً گویا ہوا۔

"اس کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ پھول تو لوگ قبر پر ڈال دیتے ہیں"۔ روبی آزردگی سے گویا ہوئی۔

"ساتھ لے گئے ہوں گے۔ لا رہے ہیں ایک چلتی پھرتی قبر"۔ شیبو کی زہر میں بجھی آواز نے کمرے میں سکوت طاری کر دیا۔

"کون کون گیا ہے؟" بالآخر حنا نے خاموشی توڑی۔

"بابا صاحب ہیں۔ بڑے ابا ہیں۔ بشیر چچا ہیں۔ بہادر ماموں، کبیر ماموں، عباد پھوپھا، مجھلے پھوپھا، شمس پھوپھا، انکل، میاں صاحب، چھوٹے بھیا، ثمر، جواد، فاران، امیر، حماد، مسعود، منہاج، مظاہر، منہاج، وہاج ------"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ سب گئے ہیں"۔ شیبو نے زچ ہو کر اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

"سب نہیں گئے۔ زوار ماموں، پاپا اور چچا اور عدیم نہیں گئے۔ بڑی امی کے علاوہ کوئی خاتون نہیں گئیں۔ اب مجھے اجازت؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم اجازت دیں گے تو جاؤ گے۔ بھاگتے کیوں ہو"۔ شیبو نے خاص تحیرانہ انداز سے اس کی سمت دیکھا۔

بیڈ پر خاموش بیٹھی روشی نے باری کی طرف بڑی جانچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

ایک نفرت کی لہر لمحے بھر کو ابھری تھی اور فوراً ہی معدوم ہو گئی تھی۔

"جانے دیجئے باری بھائی۔ بس یونہی پوچھ رہی تھی"۔ حنا نے جیسے اس کی جان چھڑائی۔

"بیچارے بچے ہیں۔ اس بہانے کچھ آرام ہی مل رہا ہوگا"۔ شیبو ہنسی۔

"ارے نہیں۔ نہیں۔ بس جاؤ تم"۔ زری نے بھی جیسے اس پر ترس کھایا۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ بے تاثر مسکراہٹ پھینک کر چلا گیا۔

"کچھ زیادہ فری نہیں ہو گیا"۔ شیبو نے نخوت سے ناک سکیڑ کر زری آپا کی سمت دیکھا۔

"کیوں خوامخواہ اچھالتی ہو۔ وہ کیا کر سکتا ہے بیچارہ۔ بس وہ مجبور۔" زری آپا نے شیبو کو جیسے اس کے بے رحم رویے کی جانب توجہ دلائی تھی۔

"اور بھئی لڑکیو! چلو اپنے اپنے ٹھکانے پر۔ میں تو کچن دیکھتی ہوں۔ ماما بی تو ہمیں غائب پا کر خود بھی بستر میں غائب ہو چکی ہوں گی"۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں۔

چند لمحات کے بعد کمرہ منتشر محفل کا منظر پیش کرنے لگا۔ باقاعدہ عمل چل پڑی تھی۔

"سب تک بیچارا ہوں۔ سارے باری تو ہے تم تو اس طرح بھی ہو جیسے کہ سب ہی نہ ہیں"۔

وہ اسی طرح حالت تحمل میں تھا۔

"تمہارے مزے ہیں خاک"۔ زبیدہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

"اسی لئے لائے تھے مجھے گھر میں۔ کبھی بیمار، روتی رہوں۔ تم تو ان ہاتھوں سے تنگ آ گئے ہو۔ اب کیا؟"

اس کی آواز بھر آ گئی۔

"شکر بھی ہے تمہیں تین دانے ہوش ہو چکا ہے وہ صاحب۔ تمہیں گھر میں مجھ سے ہی ہونے سے روٹی کے ٹکڑے نہیں"۔ وہ رو دی۔

"ڈاکٹر کے پاس نہیں لے گئی"۔ چوہدری صاحب نے کچھ ہوش سا تھا اٹھ کر اس کے پلنگ کے قریب آیا۔

"ارے بھائی تو پہلے ہی جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر"

"کیا رات تک بگڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر رہے ہیں اس کے مکان میں"۔ وہ چیخ پڑی۔

بچے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر بچے کو بازوؤں میں اٹھایا۔

دن بھر منوں وزن کی بوریاں اٹھانے والے کو بچہ پھول کی طرح ہلکا لگا تھا۔

"چل رہی ہے تو چل"۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔

"ذرا صبر کرو۔ برقعہ لے کر آتی ہوں۔ باہر دروازہ اچھی طرح بند کر دینا"۔ اس نے چولہے کی راکھ کو کریدنے کا عمل موقوف کر دی اپنی پھولتی کی بچی کو تاکید کی۔

"اور دیکھو۔۔۔ بچوں کو یہ کہہ کر سلانے کی کوشش کیجو کہ اماں ابا ابھی روٹی لے کر آتے ہیں"۔

"یہ کیوں نہ کہہ دوں کہ چندا ماموں آئیں گے۔ وہ حلوائی لائیں گے۔ کہ روٹی کا یقین تو انہیں شاید ہی آئے"۔ وہ دو بے انداز میں ہنس کر بولی۔

برقعہ پہنتی زبیدہ نے اپنی مصروفیت میں اس کا جملہ نہیں سنا۔ خاوند اور بچے کے پیچھے تیزی سے نکل گئی۔

ایمرجنسی کی وجہ سے شنوائی تو جلدی ہو گئی مگر ساتھ ہی دواؤں کی فہرست بھی اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ وہ شش و پنج سا دواؤں کی فہرست اور قیمت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ زبیدہ تو فہرست تھما کر اندر بچے کے پاس چلی گئی تھی۔

وہ شکست خوردہ انداز میں ہاسپٹل کے پچھواڑے آ کر بیٹھ گیا تھا۔

سیٹھ نے جو رقم دی تھی وہ تو پچھلے تین دنوں میں دواؤں اور گھر کے اخراجات میں اٹھ گئی تھی۔

ایک سوالیہ نشان اب دل میں ترازو تھا۔

خالی کشکول نظر آ جاتا ہے۔ خالی جیب، خالی پیٹ نظر نہیں آتا۔ آنکھوں کی ویرانی دکھائی دے جاتی ہے۔ جب دکھائی نہیں دیتی۔

ایک دولت اولاد ہے

ایک دولت غیرت ہے

کیا لاؤں؟

کیا گنواؤں؟

نفع کا سودا کون سا ہوگا؟

جان گنواؤں' خلوص مشہور کروں۔

پر پیچھے رہ جانے والوں کا گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

ہر طرف خسارے کا سودا ہے۔

کوئی تجارت کروں۔ ہاتھ خالی کے خالی۔ ازلی مزدور کی آنکھیں بے قیمت موتیوں سے جھلملانے لگیں۔

"اندھیرے میں روشنی ڈھونڈنے آیا ہے"۔ اچانک اس کے قریب سے خفیف آواز آئی۔

وہ چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔

"بھائی! میں یہ رہا۔ ابھی زمین کے اوپر ہی ہوں۔" آواز پھر آئی۔

ذرا سا آگے بڑھ کر اسے بالآخر وہ نحیف و نزار لاش نظر آگئی۔

"تم یہاں زمین پر اس طرح کیوں لیٹے ہو۔ اندر اسپتال میں کیوں نہیں آتے؟ تم تو بیمار دکھائی پڑتے ہو"۔ وہ اس کے قریب ہوا تو مخاطب کی حالت فوراً آشکار ہو گئی۔

"ابھی خادمائیں چھپر کھٹ سجا رہی ہیں۔ سجا چکیں گی تو صندل لگا کر مجھے عرق گلاب سے غسل دیں گی۔ پھر احتیاط سے چھپر کھٹ پر لٹا دیں گی اور ریشمی زلفوں سے ہوا دیں گی۔ ہا ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہاہاہا"۔

"کیا مجھ سے بھی زیادہ بدنصیب ہو؟" میں تو ابھی تک اتنا زیرِ بار نہیں ہوا"۔

وہ آہستگی سے اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"ہو جاؤ گے۔ ہر بات کا آغاز بھی ہوا کرتا ہے یا نہیں"۔

"مت ڈراؤ بھائی۔ آٹھ پہر کوئی اچھی بات سننے کو نہیں ملتی۔ میں تو کوئی حل سوچتے اس طرف نکل آیا تھا"۔ وہ بے چارگی سے بولا۔

جن کی جیب خالی ہو۔ سوچ سے نہیں بھرا کرتی"۔ وہ اجنبی بھرگی سے ہنسا۔

"کیا کرتے ہو بھئی؟"

"خون پلا رہا ہوں اولاد کو۔ ایک ایک کر کے چراغ بجھ رہے ہیں۔ خون بھی کافی نہیں' مزدوری کرتا ہوں اور کوئی ہنر پاس نہیں"۔ وہ لاچارانہ انداز میں بیٹھ گیا۔

"کھاؤ سے والا خون پلاتے ہو یا اصلی؟" اجنبی نے چمکتے ستاروں پر نظریں جما کر سوال کیا۔

"اصلی؟ کیا مطلب؟" میں واقعی نہیں سمجھا۔

"ہاں تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اندر اسپتال میں تمہارے خون کے طلب گار داخل ہیں۔ ہر ایک کی کٹیا کٹی تھی کے تمہارے انتظار میں ہیں۔ محنت سے ان کو اگر تمہارے خون کی طلب کا کوئی سوال آ سامنے ہوگا تو۔ پتہ نہیں سمجھ میں جی رہ جاؤ گے"۔

"اب سمجھ میں آیا کہ چراغ کہاں جلتے ہیں؟ دیکھو کیسے وہ روشن چمکتے ہیں"۔ وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"ہاں۔ سمجھ کی دیواریں ٹھنڈے گرم ہوتی ہیں۔ ایک ایک کے سر پر وہ پیچھے چلتے ہیں۔ کھجور ہے اور ہے ٹھیک ہے۔ اندر گرم ٹھاٹ ٹھیک ہے۔ سواک ٹھیک ہے۔ ہاتھوں والے پر آ مٹے ہیں۔ کیسی سہولت کی لذت ہے۔ کاش ہم کوئی سمجھ ہی ہوتے"۔

"کوئی حل دو تو"۔ اس نے فوراً اجنبی کی گفتگو پر ماحول بچا کر اکتفا کی۔

"تم کیوں اپنے ہو؟" اسے چاہئے انسان سمجھ سعادت ہے۔ تھوڑا تصبیح چلے۔

"سعادت ابھی جا رہے سمجھ ابھی گھر ہے"۔ اس کی آواز میں اجنبی کی ہتک آمیزی کی تڑپ کے ساتھ تھی۔

"اور قرآن میں وہ خود کہتا ہے کہ ہم انسان کے شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ۔ وہ تو صاحب فقط عطار ہے۔ اس کے سامنے تو دیواریں بھی گر گئی نہیں۔ گر بھائی۔ ہم تو انسان ہیں۔ کوئی دیوار تو نہیں"۔

"یہ فیصلے کرنے والے کا اختیار ہے کہ وہ دیواریں بنائے یا انسان کی مدد کو آئیں۔ اس نے تو دیواروں میں موتی پرونے کا حکم نہیں دیا۔

"اس نے تو ہر جگہ انسان کو ہی اہمیت دی ہے۔ یہ اندھی عقیدت بھی نہیں ہے۔ محض بزرگی کی دوڑ ہے۔ بھیجا ہے۔ مقدر جواہر سے چھپے دیگل میں سونے کی کلیاں گریں۔ ہم کیوں پیچھے ہیں۔ انسان تو روز پیدا ہوتے ہیں۔ عبادت گاہیں روز تھوڑا ہی بنتی ہیں"۔

"چلو سمجھ والی منت نہ مانو تو یہی مان لو اگر کسی ساہوکار کو میرے خون کی پیاس لگی تو کسی بھی کے کو بیچ کر گھاٹا کھواؤں گا۔

اب تو ٹھیک ہے"۔ اجنبی نے اندھیرے میں اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی۔

"کیا خون بیچ کر تیرے پیسے جل جائیں گے کہ بچے کی ساری دوائیاں آ جائیں؟" اس کے اندر ایک عجب طوفان سا پیدا ہو چکا تھا۔

"ارے۔ دوائیاں بھی آ جائیں گی' رضائیاں' رلائیاں' ملائیاں' سب آ جائیں گی۔ جا اندر جا کر کسی رگ سے کوزہ اپنے خون کا ذرا لے تو چکھا۔ پھر دیکھ تماشا"۔

"اتنا آسان حل!" اس کی رگ رگ میں خوشی دوڑنے لگی۔ آنکھوں کے سامنے بچے۔ جاوید میاں اور دانے ٹشات کھینچے گا"۔ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"بچہ کھیل رہا تھا۔ گلاس بھر دودھ پی رہا تھا۔ سارے گھر والے کباب پراٹھے کھا رہے تھے۔

"بھائی تمہارا نام کیا ہے؟"

"ختم ہو گیا ہے"۔ وہاں سے بے اطمینانہ جواب آیا۔

"کیا شغل کرتے ہو؟" وہ جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگا۔

"بس طرح کامیابی کا نشہ ہوتا ہے اسی طرح ناکامی کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے۔ عادت ہر شے کی بری۔ تم نے پوچھا ہے کیا شغل کرتا ہوں" وہ ہنسا۔

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری مے خواری ابھی تک راز ہے

وہ حسن لہجے میں شوخی پرونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پڑھے لکھے بھی لگتے ہو"۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور ترس بھی آیا تھا۔

"لگتا تو جانے کیا کیا ہوں۔ پر وہ نہیں لگتا جو ہوں"۔ انجی پھر پوری قوت لگا کر ہنسا۔

مگر اب وہ دوسرے مرحلے میں تھا۔ توجہ تقسیم ہو چکی تھی۔

"بھائی! کہاں کھڑے ہو کر اعلان کروں کہ میرا اتوں نے لو"۔ ایک بنیادی سوال پیدا ہوا تو اس کے قدموں کی حرکت خود بخود رک گئی۔

"اعلان کرنے کی کیا ضرورت۔ بیاہے خود ڈھونڈتے ہیں۔ ابھی تک تو رشتوں کی جو گتھیں الجھی ہوئی تھی۔ اب ذرا باہر کی ہوگوں کا تماشا دیکھو۔ اور خود صدر دری کی طرف چلے جاؤ۔ لال مظہر پہنے ایک موٹی سی جونک سنگاری ہوگی۔ کہنا عارف نے بھیجا ہے"۔

"بس؟"

"اور نہیں تو کیا"۔ انجی جھاگ گیا۔ بڑی اپروچ ہے اس لال مظہری کی ذرا بچ کے رہنا"۔

"کتنے پیسے دے گا وہ؟"

"کہا تو ہے مست مان۔ آسامی وہ چاہنے گا تو کمیشن بھی لے گا۔ دیکھ بھائی بات کر کے آ ہو گا۔ پہلے بتائے دیتا ہوں"۔

"سمجھ گیا"۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

"بھائی ذرا سنو"۔ انجی نے پھر اس کے بڑھتے قدموں کو زنجیر کیا۔

"اب کیا ہے؟" وہ جھلایا۔ میرا اچھا اندر وہ کے انتظار میں ہے۔ جلدی کہو"۔

"نسو ہاتھ لگتے ہی انداز بدل گئے۔ شکریہ ادا کرنے سے گئے۔ بھائی میں وہ ایک شعر سنا رہا تھا۔ وہ کیا ہے کہ۔

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ آزار
کہ اک جام میں سب کا جواب ہے ساقی
چل اک بہشت بسائیں سرورِ مستی کی
بہشت دہر تو غم سے خراب ہے ساقی

اشعار کی دنیا ہی جہاں کر دینے کے دعوے پکا تھا۔ اگر سرما کہتے وہ بہت آگے جا چکا تھا۔

"یہ معقول انسان۔ باتوں سے تو پڑھا لکھا لگتا ہے پر شوقین لوگ ایسے خوشبو میں بھی کہاں ہے"۔ انجی

وہ جانے کیوں چلتا ہوا صدر دری کی طرف آ رہا تھا۔

ساری عمارت پر سناٹے کا راج تھا۔

کچھ دیر پہلے کسی مرے نے بے ہنگم انداز میں اس کے کان میں شور کے بیچ میں ساتھ گئی ہوئی تھی۔ جس کے جواب میں مغرب کی نماز بھی ادا کر کے اس طرح خاموش تھا جیسے ابھی ابھی کچھ کر کے اٹھا ہو اور پھر کوئی نہ ہو۔ ابھی نہیں سمجھا تھا۔ جھگڑوں کے ارادے میں بھی تسلسل نہیں تھا۔

وہاں کلاک کی ٹک ٹک اور دل کی دھڑک کے ساتھ مل کر ماحول میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

وہ کمرے میں چہل قدمی کرتی رہی۔

معا اسے محسوس ہوا کہ ماحول کا سکوت ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے تو کانوں کے بہرے پن کا سا احساس ہوا۔ پھر اسی شور میں کچھ لوگوں کی آوازیں واضح سنائی دیں۔ وہ اچھل کر استر سے کودی اور تقریباً دوڑتی ہوئی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ پورٹیکو کی چھت میں لگا ہلکا سا زرد روشنی کا بلب وہاں کے منظر کو اجاگر کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ پھر کچھ سوچنے لگی۔

"اوہ"۔ جیسے اسے اپنے مسئلے کا حل مل گیا۔ وہ دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر بے آواز کمرے سے نکل آئی اور چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

محتاط انداز میں زینے طے کر کے اس منڈیر کی طرف آئی جہاں سے پورٹیکو کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کہنیاں منڈیر پر ٹکا دیں اور غور سے نیچے دیکھنے لگی۔

بابا صاحب اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بڑے آپا گاڑی کے دروازے چیک کر رہے تھے اور چچا چھوٹے بھیا سے بات چیت میں مصروف تھے۔

"اللہ۔ عقری بھائی اور دلہن کہاں ہیں؟" اس کی سوچ یہاں آ کر تھم ہو گئی۔

معا اسے پیچھے کی جانب کچھ کھڑ پڑ محسوس ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر پچھلی منڈیر تک آ گئی اور منڈیر پر ہاتھ ٹکا کر نیچے جھانکنے لگی۔

بڑی امی پچھلے پورچ میں سرخ گٹھڑی تھامے اندر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"ہوں۔ تو دلہن کو یہاں رکھا جائے گا۔ خیر کیوں۔ وہ تو مفقود نہیں ہے۔ ابھی پچھلی کھڑکی ہے"۔ وہ سوچنے لگی۔ بڑی امی دلہن سمیت اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اندر چلی گئیں۔ ابھی بڑے ابا بھی پچھلے پورچ میں نمودار ہوئے اور لمحہ بھر میں اندر غائب ہو گئے۔ پھر بھیا چچا جو دوسرے ساتھ وہاں دکھائی دیئے پھر وہ بھی وہیں چلے گئے جہاں بڑی

ای دلہن کو لے کر گئی تھیں۔

وہ بڑے غور سے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ معاً اسے محسوس ہوا کہ اس کے علاوہ بھی چھت پر کوئی موجود ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔

اماوس کی کالی رات میں تاروں کی چھاؤں میں بیٹھے اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ چاروں سو کس قدر اندھیرا ہے۔ شوق نے کچھ جسارت ہی ایسی دی تھی کہ اسباب و ماحول پر غور کرتی۔ ستاروں کی روشنی اس کے شوق کو کافی تھی جیسے۔

مگر اب صورت حال خاصی کٹھن تھی۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا تھا۔ جنبش کر رہی تھی۔

"ڈریں نہیں۔ میں ہوں ہاری۔"

اس کے کانوں میں ہاری کی آواز کیا آئی مستعدی از سر نو بیدار ہوئی۔

"یہ تم کیا میری ٹوہ لگتے پھرتے ہو؟" وہ جھنجھلائی۔

"آپ ان ڈائریکٹ حیوان نہ کہیں۔ بابا صاحب جس وقت جیپ سے اتر رہے تھے۔ میں نے آپ کو کھڑکی میں کھڑا دیکھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو کھلی چھت سے جھانکتے پایا تو پیچھے چلا آیا۔ یہ بے قراری کیوں؟ آپ بھی اس طرح کیوں نہیں سو جاتیں جیسے اس گھر کے سارے مکین سو رہے ہیں؟"

"سارے کہاں سو رہے ہیں۔ سنو بہت جاگ رہے ہیں۔" وہ ترش ہو کر بولی۔

"آپ کو ماما کر کہتر بن گئے ہیں۔"

"تم آدمی ہو یا جن رات کو بھی آرام نہیں کرتے؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"پری زاد کہیں آپ سے کچھ نسبت ہو جائے گی۔"

"وہ ڈائیلاگ بولا کرو جو تمہارے منصب کے لحاظ سے سوٹ کریں۔" وہ آگ بگولا ہو گئی۔

"آہستہ روشی بی بی آہستہ۔ میں تو آپ کی مدد کو حاضر ہوا ہوں۔"

"کیسی مدد۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جاؤ تم یہاں سے۔" وہ درشتگی سے گویا ہوئی۔

"ویسے دیکھئے بٹیا تو آپ کو نیند نہیں آ رہی۔ آپ فکر نہ کریں جیسے ہی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں گے۔ میں لائن کلیئر دیکھ کر آپ کو لے جاؤں گا۔ مگر گھر کے سارے راستے جو پچھلے حصے کو جاتے ہیں بند ہیں۔"

"آپ کو کھوکھر کے کواڑ سے لے جاؤں گا اس کا تالا کھل سکتا ہے آپ ڈریں نہیں رات کو بند ہوتا ہے۔"

"کھوکھر جاگ رہا ہے؟" وہ الجھی۔

"بابا صاحب کے ذاتی خدمت گار اس وقت تک نہیں سوتے جب تک بابا صاحب نہ سو جائیں۔"

"جیسے تم۔" روشی نے فوراً بات کاٹ دی۔

وہ ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"جی۔ جیسے میں۔"

"ارے نہیں۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" اسے خود نہ جانے کیوں وضاحت کرنا پڑی۔

"ہاں۔ کھوکھر کہیں بابا صاحب سے نہ کہہ دے۔" اسے خدشہ ہوا۔

"فکر نہ کریں۔ یہ میرا معاملہ ہے آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"آئیے آپ اپنے کمرے میں میرا انتظار کریں۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

اسے بیٹھے بیٹھے پہرہ پر جماہیاں آنا شروع ہو گئیں مگر ہاری کی طرف سے کوئی سگنل نہ ملا۔ یا اللہ۔ کہیں بھول تو نہیں گیا؟"

اس نے کروٹ بدل کر گہری نیند سوئی ہوئی حنا کو دیکھا۔

"ایک یہ لوگ ہیں انہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ دن بھر بے فکری سے رات بھر لمبی تان کر سو گئے۔ یہ صرف میرے ذہن میں ہی کیوں سوال جاگتے ہیں۔ ان سب کی طرح کیوں نہیں ہوں میں۔ مجھے کیا تجسس ہے آخر جو حاصل اور موجود پر مطمئن کیوں نہیں ہوں؟"

وہ انگلیاں چٹخا کر سوچوں کے جال میں الجھی ہوئی تھی۔

"گھر آپا۔ سونا ہاری۔ یہ لوگ بھی کتنی سنجیدہ ہیں مگر عجیب بے حس ہیں۔ کسی بات پر چونکتی ہی نہیں۔ کسی بات کا نوٹس ہی نہیں لیتیں۔"

"اور بابا صاحب کہتے ہیں میں بے وقوف ہوں۔ ہونہہ۔ کیا عقلمندی بے حسی کو کہتے ہیں؟"

"لگتا ہے۔ ہاری واقعی بھول گیا؟"

وہ دوبارہ کمرے سے باہر آئی۔ لیکن کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔

"اس گھر میں کیا چھپایا جاتا ہے۔ بس میں جاننا چاہتی ہوں۔" وہ جیسے خود سے الجھی۔

"روشی!" اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے پکارا ہو۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ واقعی دائیں جانب ہاری موجود تھا۔

"آ جائیں۔ آرام سے بالکل بے آواز۔" وہ سرگوشی میں گویا ہوا۔

"اب کیا پاؤں سر پر رکھ لوں؟ آخر آواز تو پیدا ہو گی ہی۔"

وہ جھنجھلائی۔ طویل انتظار نے جان جلا کر رکھ دی تھی۔

ہاری آگے آگے چلنے لگا اور وہ اس کے پیچھے۔

طویل راہداری سے گزر کر انہوں نے بائیں طرف بنا ہوا چھوٹا سا گوشہ عبور کیا۔ اور کھوکھر کے کوارٹر کی زنجیر آہستگی سے کھڑکائی۔

"آ جاؤ صاحب جی۔ دروازہ کھلا ہے۔"

کھوکھر کی جیلنے سے پہلے ہی آواز آئی۔ ہاری نے آنکھیں ہٹ سے ہٹ جھٹکا۔ بجلی سی چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ ہاری نے مڑ کر جو اسے پیچھے آتے دیکھا۔ وہ کون سا اس کے اشاروں کی منتظر تھی۔ اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ پلک جھپکتے سارا راستہ طے ہو جائے۔

بھلا سے پلنگ پر کھوکھر بیٹھا امی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ بجلی جا چکی ہے۔ ہم پر یہ تو اس سے زیادہ عمل کھوکھر کے گھر میں ہو رہا تھا۔ چالیس واٹ کا بلب سارے گھر میں روشنی پھیلانے کا فریضہ تن تنہا انجام دے رہا تھا۔

"سلام بی بی۔"

"وعلیکم السلام۔ جلدی چلو ہاری۔" اس نے جلدی سے کہا۔ معاً دونوں سوالات شروع ہو جائیں۔

وہ گھر سے نکل کر پتے میں آ گئے۔ کھوکھر کے کتے نے دونوں کی ہلکان پورے کر کے شروع کئے۔

روشی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے بے اختیار ہاری کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ کتے نے اب زیادہ قوت سے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ روشی پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"ہاری!" وہ گھگھیائی۔

ہاری نے اسے بائیں بازو کے گھیرے میں محفوظ کر لیا۔

"گھبرائیں نہیں۔ کچھ نہیں کہے گا۔" وہ ملائمت سے تسلی دے رہا تھا۔

"مجھے کتوں کے بھونکنے سے بہت وحشت ہوتی ہے۔ لگتا ہے جیسے پوری فوج کراب کے قریب آ گئے۔"

"حد ہو گئی۔ آپ تو واقعی کانپ رہی ہیں؟" وہ ہنس دیا اور غیر ارادی طور پر اسے خود سے قریب کر لیا۔ ایسا اس نے دوسری طرح عمل ہو کسی کیلئے محسوس نہیں ہوتا۔ پتے سے باہر آتے ہی روشی اپنے حواسوں میں آ گئی اور جیسے تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی۔

"یہ کیا حرکت تھی بھلا؟" انداز میں خفت بھی تھی اور جلال بھی۔

"یہ صرف جوابی حرکت تھی۔ آپ تو کو سمجھ۔ ہمت کیسی اتنی گھبرائی ہے۔" وہ بے ترس سا تھا بلکہ خاصا تیز بھی۔

"عجیب آدمی ہے۔ کتوں کو بھی نہیں پالنا۔" اس کے کچھ دیکھ میں نہیں آیا تو کتے پر لعنت ملامت کرنے لگی۔

"اس کا مالک کھوکھر ہے۔" اس نے تصحیح کی۔

"کھوکھر کو بھلا کیا ضرورت ہے کتے پالنے کی۔ بڑے خزانے دفن ہیں یہاں۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

ہاری خاموش رہا۔ اور اس آخری عمارت کے پچھلے حصے میں لے کر داخل ہو گیا۔

یہ وہ حصہ تھا جو اس عمارت کے مکین کسی ایمرجنسی میں بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ بہرحال یہ حصہ آباد ضرور تھا۔ اس کی آبادی سے متعلق عمارت میں گفتگو کرنے پر سخت ممانعت تھی اور روشی اس پابندی کے اسرار سے واقف ہونے پر بضد تھی۔ مگر کے افراد آپس میں بہت بے تکلف تھے۔ مگر پچھلے حصے کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے اس طرح کتراتے تھے جیسے بھاری جرمانے کا ڈر ہو۔

عجیب طرح کا شوق روشی کے وجود میں اچھل پھاند مچانے لگا تھا۔ جانے یہ تھا کوئی بڑی مہم سر کرنے کا۔ کسی میدان میں [illegible]

ہونے کا احساس۔ کچھ اپنی خودسری کی انتہا ہو رہی تھی۔

"آ گئے۔" وہ ایک تاریک راہداری میں بند دروازے کے سامنے رک گیا۔

"یہ ظفری بھائی بھی اندر ہیں؟" وہ چونکی۔

"نہیں۔ وہ بڑی امی کے ساتھ اس طرف گول کمرے میں ہیں۔"

"بڑی امی! کیا وہ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟" وہ گھبرا گئی۔

"جی ہاں۔ ظفری کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔"

"آپ بھی نہیں آئے بھی نہیں؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ہاری خاموش رہا۔

"کیا اس حصے میں بھی کوئی گول کمرہ ہے؟"

"جی" ہاری نے نہایت اختصار سے کام لیا۔

"میں اندر چلی جاؤں اگر بڑی امی آ گئیں؟"

"یہ سوچنا اب آپ کا کام ہے" وہ جھلا گیا۔

"سارے حل بتانے ہیں؟ اب یہ بھی بتاؤ"

"کتنا وقت گزار دیا ہے میں نے۔ ایک منٹ کی بات ہے۔ اندر دیکھے اور واپس آ جائیے۔ آپ نے کیا تصفیہ کرنا ہے؟"

وہ زچ ہو کر بولا۔

"ویسے ہی تو دیکھنا چاہتی تھیں آپ"

"ہاں ہاں۔ اچھا اب مگر تم مت" وہ جھپاک سے اندر داخل ہو گئی۔

"دیکھو پیا! اگر میرا دل وہاں نہیں لگا تو میں راتوں رات واپس آ جاؤں گی۔ پہلے سے بتا رہی ہوں۔"

"ارے بھئی وہاں سے تمہارا دل کبھی واپس نہیں آنا چاہے گا۔ وہاں جن بھر خوبصورت لڑکیوں کی تو تم آئی ہو۔"

"ہائے اللہ۔ اب اتنی بزرگ نہیں ہو رہی میں۔" وہ [illegible]

"بھئی بزرگی تو تمہیں۔ تمہاری پیدائش سے پہلے مل چکی ہے۔ تمہاری تین چار بھابیاں تو تم سے پہلے استقبال کو موجود تھیں۔" منیب احمد نے قہقہہ لگایا۔

"اچھا جب میں جاؤں گی تو کیا وہ سب خالہ خالہ کہہ کر مجھ سے لپٹ جائیں گی؟"

"یہ تم اچھا خاصا قابل قبول جملہ کہہ کس طرح رہی ہو؟ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہی ہو، چچی جیسی چمٹ جائیں گی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔"

"نوری بھائی۔ آپ بھی چلیں ناں۔"

"اللہ کی پناہ۔ میں باز آیا اس قدر خوفناک بزرگی سے اور جن بھر حسین زنانہ آوازیں۔ وہ بھی ماموں ماموں کی۔"

تو" اس نے پاس سے گزرتی گھگی کے ماہین کے سامنے لے آئی۔

"اچھا مت کریں۔ مجھے شرم آ رہی ہے۔" اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم بھی چلے جاؤ۔ کوئی حرج نہیں۔ ابھی تو پورے بیس دن ہیں تمہاری واپسی میں" منیب احمد نے نعمان احمد کو جو ان کے اکلوتے فرزند ارجمند تھے مخاطب کیا۔

"سوری نہیں پاپا۔ پھر سہی۔" اس نے شرارتی انداز میں ماہین کو چھیڑا۔

"ممکن ہے نبیل اور شاہین بھی آج کل یہاں آ موجود ہوں۔"

"پھر تو آپ مجھے آج ہی روانہ کریں۔ دونوں کے بچے جب اکٹھے ہوں گے تو۔ اف میری توبہ۔ لگتا ہے بھونچال میں انہیں خیر بسر نہیں۔ جنگل میں رہتے ہیں۔"

"بری بات بیٹا۔ وہ بچے ہیں۔ اور بچے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔"

ماہین مسکرا کر بیٹھ گئی۔

نعمان کمرے سے باہر چلا گیا۔

"ماہی۔ بیٹا ادھر آؤ میرے قریب" منیب احمد نے اسے محبت سے اپنے پاس بلایا۔

جی ابو! آہستگی سے اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی۔

"دیکھو بیٹا! تمہاری بجو نازمین کا سسرال دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔"

"دو حصوں میں!" ماہین نے حیرت سے منیب احمد کے سلیقہ ریش سے آراستہ چہرے کی سمت دیکھا۔

"ہاں۔ تمہاری بجو کے دادا سسر بہاول علی خان کو انگریز سرکار نے جنگ عظیم اول میں شاندار کارکردگی پیش کرنے پر جاگیریں عطا کی تھیں۔ ابھی وہ زندہ ہی تھے کہ انگریز سرکار نے بہاول علی خان اور ان کے بیٹے دلاور کے نام جاگیر عطا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ انگریز کی خوشی کی انتہا تھی۔

ایک چھوٹی سی جاگیر تمہاری بجو کے سسر دلاور علی خان سنبھالتے ہیں۔ اس کا نام دلاور بستی ہے۔ دوسری ان کے دو بیٹوں کے سپرد ہے۔ جو دلاور بستی سے ستائیس میل کے فاصلے پر ہے اسے یہ لوگ سرائے کہتے ہیں۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے دو تین دیہاتوں پر مشتمل ہے۔

"مگر پاپا۔ بجو کی وفات کے بعد دلاور بستی والے مجھے کیا حیثیت دیں گے؟"

"ہمارا ان سے رشتہ برقرار ہے بیٹی۔ نازمین کے دو بچے وہاں موجود ہیں۔ ایک لڑکی روشانے دوسرا اس سے بڑا بیٹا جواد۔"

"تو پھر؟" وہ الجھی۔

"تو پھر یہ کہ تم ان کی خالہ ہو حقیقی خالہ۔"

"آپ بھی تو نانا ہیں۔ آپ کیوں نہیں جاتے؟"

"میں بھی جاؤں گا۔"

"پہلے آپ کبھی وہاں گئے ہیں؟" ماہین کے ذہن میں ایک دم سوال ابھرا۔

"ہاں نازی کی شادی کے بعد دو تین مرتبہ جانا ہوا۔ پھر میں یونیورسٹی چلا گیا۔ اس وقت تم بہت چھوٹی تھیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ وہ تو وہیں واپس آنے والی تھی۔ نازی کے دونوں بچے ابھی چھوٹے ہی تھے۔ پھر ایک روز اس کے انتقال کی خبر پہنچ گئی۔ اس صدمے کے ساتھ ہی وہ ہم سے جدا ہو گئی تھی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا بیماری تھی۔ سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ ماشاء اللہ اچھی صحت تھی۔ اللہ نے حسن بھی بہت دیا تھا۔ اپنی کلاس کی ایک تقریب میں دلاور علی خان کی اہلیہ نے پسند کر لیا تھا۔ ہم ابھی کم عمری میں اس کی شادی کے حق میں نہیں تھے۔ مگر ہمیں ان کے سامنے کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تمہاری امی بھی اس رشتے پر بہت خوش تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں اس کی قسمت بہت اچھی ہے۔ اس نے اللہ نے یہ سب کیا ہے کہ اس کی شادی ایسی ہی جگہ پر مناسب ہے۔"

دولت اقتدار اور سوچ خدام۔ میں نے ایسے ہی خواب دیکھے تھے اپنی بیٹی کیلئے۔"

"ان لوگوں نے فی الفور شادی مانگی۔ وہ میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئی اور ہم نے شادی کر دی۔"

"وہ خوش تھیں؟" ماہین نے کھوئے انداز میں سوال کیا۔

"تمہاری امی کے بقول بہت خوش۔ ورنہ ہمیں کیا پتہ تھا اسے کوئی روگ کس طرح اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔"

"اور ان کے دولہا کیسے تھے؟"

"اللہ اسے سلامت رکھے۔ موجود ہے۔ تم خود دیکھ لینا۔"

"اچھا۔ وہ دلاور بستی رہتی تھیں یا سرائے؟"

"بیاہ کر تو وہ دلاور بستی گئی تھی۔ بعد میں جو اس کے خط آتے تھے۔ ان پر سرائے کا پتہ درج ہوتا تھا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دونوں جاگیریں انہی کی ہیں۔"

"جی!"

"تم کیا سوچنے لگیں؟" منیب احمد نے عینک کے پار سے گھورا۔

"کیا وہ کبھی یہاں آئیں؟"

"نہیں۔ لکھا کرتی تھیں کہ آئیں گے۔ دلاور کو جاگیر کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ سب ہے۔ ہم نے بھی کبھی زور نہیں دیا۔ یعنی وہ اپنے گھر خوش تھی۔ ہمیں اور چاہیے بھی کیا تھا؟"

"کیوں؟"

"جی۔ مگر اتنی دولت و حشمت کے ہوتے ہوئے یونیورسٹی کا چکر لگانا ان کیلئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میں بیٹھ کر اپنی زمینوں کا چکر لگا آئیں۔"

"سوچنے کی حد تک تو یہ بہت آسان بات ہے۔" منیب احمد ہنسے۔

"آپ ان کے انتقال پر آئے تو کیا فاتحہ پڑھی تھی۔" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔ ہوا یوں کہ جب میں وطن واپس آیا تو دلاور علی خان خود میرے پاس آ گئے۔ تعزیت کیلئے۔"

"وہ خود کیوں آ گئے۔ جاگیر کا مرض نہیں ہوا؟" وہ تنک کر گویا ہوئی۔

"اتفاق سے وہ شہر آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کاموں کے سلسلے میں شہر آتے ہی رہتے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔"

"نہیں خیر۔ وہ آ گئے تھے۔ پر آپ کو جانا تو چاہیے تھا ناں؟"

"ہماری سات پشتوں میں کوئی وکیل نہیں گزرا پھر یہ روح تم میں کہاں سے آ گئی؟"

وہ مسکرا کر بیٹی کو دیکھنے لگے۔

"دیکھیے پاپا میں تو اس جاگیردارانہ نظام کے سخت خلاف ہوں۔ یہاں انسانیت نہیں بٹتی۔ آپ نے سب سے بڑی اور پہلی غلطی یہ کی کہ بیٹی جاگیرداروں سے بیاہی۔ دوسری یہ کہ پلٹ کر خبر نہیں لی۔ تیسری یہ کہ بیٹی کو ملوانے کیلئے ان پر دباؤ نہیں ڈالا۔ چوتھی یہ کہ ان کی فاتحہ ان کی قبر پر پڑھنے نہیں گئے۔"

"آپ ہم سب سے اتنا پیار کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے آپ کو ان سے محبت نہیں تھی؟"

وہ قدرے خفگی سے گویا ہوئی۔

"وہ لوگ اور طرح کے جاگیردار ہیں۔ وہ نہیں جو تم فلموں کہانیوں میں دیکھتی یا پڑھتی ہو۔ میری لائبریری میں سرخ لیدر کی فائل موجود ہے۔ اس میں ناز کے سارے خطوط موجود ہیں۔ پڑھ لو۔ وہ تو ان میں اس طرح مدغم ہو گئی تھی کہ انہی کا حصہ بن گئی تھی۔ حویلی کا چھالہ سا کر رکھا ہوا تھا۔ دلاور علی خان اور ان کی اہلیہ نے۔ ایک مرتبہ جب ہم وطن آئے تو وہ ہمارے پاس دو تین دن رہنے کیلئے آئی۔ یقین کرو چند گھنٹوں میں پریشان ہو گئی۔ فوراً فون کر کے اپنی ذاتی ملازمہ کو بلوایا۔ حالانکہ جواد کی آیا ساتھ تھی جو اس کے بھی سارے کام کرتی تھی۔ اس کے بال بہت حسین تھے۔ بہت لانبے۔ جنہیں اس کی ملازمہ دھوتی تھی اور وہی سنوارتی تھی۔ اس قدر نازک مزاج ہو گئی تھی کہ اسے معمولی سی زحمت دینے کے خیال سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ دوسرے دن اس نے سامان سمیٹ لیا تھا کہ سڑک پر دوڑتی ٹریفک کی وجہ سے اسے نیند نہیں آتی۔ اس کا نروس سسٹم متاثر ہو رہا ہے۔ امید ہے اب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ہم اسے بلانے پر اصرار کیوں نہیں کرتے تھے۔"

منیب احمد پائپ میں تمباکو بھرنے لگے۔

"میں کیونکہ اس کے انتقال کی خبر پر جلدی میں آیا تھا۔ اس لئے دلاور علی خان صاحب سے ملاقات پر دریا بستی جانے کا خیال موقوف کر دیا۔ پھر وہاں تمہاری امی اسپتال میں داخل تھیں۔ یہ وجہ تھی اور کوئی بات نہیں۔ وہ ہماری اولاد تھی اور اولاد سے کسے محبت نہیں ہوتی؟"

"بہر حال۔ آپ کو ان کی شادی اتنے بڑے لوگوں میں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بتائیے رشتہ دار ایسے ہوتے ہیں؟ جو ایک دوسرے سے واقف تک نہ ہوں۔ ہونہہ اب میں جا کر وہاں تعارف اس طرح کراؤں گی۔"

مجھ سے ملئے۔ مجھے ماہین احمد کہتے ہیں۔ میں آپ کی بہو ناز بیگم یعنی دلاور علی خان کی حقیقی بہن ہوں۔ گھر سے اکیلی آئی ہوں یعنی بن بلائی ... کرتے۔ کس قدر مضحکہ خیز تعارف ہے۔ اوہ مائی گاڈ۔"

"ہوں۔ ہوں۔" منیب احمد بے ساختہ ہنسنے لگے۔

"پر۔ میں وہاں کروں گی کیا؟ ابھی سے ہی گھبرانے لگتی ہوں۔"

"تمہیں جاگیر کا وارث کرے۔ بچپن تو گزر گیا ورنہ بچوں کو کہانیاں سناتا۔"

نعمان نے کمرے میں داخل ہو کر مداخلت کی۔

"ان کے بچے تو خود کہانیاں سنانے والے ہو چکے ہوں گے۔ جواد بھی ماشاء اللہ بڑے ہو چکے ہیں۔ اور شاید تو میری ہم عمر ہو گی۔ کیوں پاپا؟"

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل۔"

پتا نہیں وہاں کا ماحول کیسا ہو گا۔ میرے پاس تو سارے کپڑے جدید فیشن کے ہیں۔"

"تم کون سا وہاں مستقل رہنے جا رہی ہو۔ تم کھانے پینے میں ان کی پابند نہیں ہو۔" نعمان نے اسے سمجھایا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بیٹے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" منیب احمد نے بھی تسلی دی۔

"پاپا۔ بچے تو بڑے ہیں۔ جانے کس طرح پیش آئیں۔"

"ابھی تم ان کی خالہ ہو۔ رشتہ بڑا ہے۔ وہ تمہارا احترام کریں گے۔ مجھے یقین ہے۔ تمہارا وہاں بہت دل لگے گا۔ ناز بیگم کی طرح۔"

"خدا نہ کرے میرا دل اس طرح لگے کہ ماں باپ کی فاتحہ تک نصیب نہ ہو۔" وہ جل کر بولی۔

"یہی تو دیکھنے جا رہی ہوں کہ ناز بیگم پر وہاں کیا گزری۔"

"تمہاری واپسی پر میں ایک ناول لکھوں گا۔ میڈم ماہین دریا بستی میں۔" نعمان نے سر پر برش چلاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"ہاں اگر خیریت سے واپس آ گئی۔" وہ نہ جانے کیوں اتنا گھبرا رہی تھی۔

"زبردستی نہیں ہے بیٹا۔ نہیں موڈ تو نہ جاؤ۔ میں تو تمہارا شوق دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔" منیب احمد نے پہلے اس کا ذہن ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

"جاؤں گی تو خیر ضرور۔ چاہے کچھ بھی ہو۔" وہ بڑے مستحکم انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹے۔ کچھ تحائف ضرور ساتھ لے کر جانا۔"

"تحائف۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "سنا نعمان بھائی؟"

"پھر تو ریوڑیاں ہی مناسب رہیں گی۔ دریا بستی کی آدھی بستی تو اس عمارت میں ہے۔" ہا ہا ہا۔ نعمان کا قہقہہ بے حد بھرپور تھا۔

منیب احمد بھی مسکرا دیے۔

"اچھا بچی اب تم تیاری کرو۔ میں وہاں اطلاع کر دیتا ہوں۔ وہاں سب تمہارے منتظر ہیں۔"

"آپ کیوں نہیں چل رہے بابا؟"

"میں بھی دو چار روز میں آ جاؤں گا۔ پھر تمہیں ساتھ لے کر ہی واپسی ہو گی۔ ابھی ذرا یہاں کام ہے۔"

"بہت اچھا۔ میں تھوڑی دیر سو جاؤں پھر پیکنگ کروں گی۔ ٹھیک ہے نا بابا؟"

"ہوں ٹھیک ہے۔ اس بلڈ وریسٹ واچ کو تمہاری امی کے لاکر میں ہی رکھ دینا۔ باقی کچھ چیزیں میں کل شام سے پہلے تمہیں بھجوا دوں گا۔ میرا خیال ہے تمہارے پاس تو اب شاپنگ کا وقت نہیں۔"

"ٹھیک بابا۔ ٹھیک ہے۔"

وہ آہستگی سے تیاری کے خیال سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں اور اس کے ذہن کے افق پر وہ بالکل ہی طلوع تھی۔

وہ بے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی تھی

پیچھے ہاتھ کر کے اس نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا تھا اور وہیں کھڑی ہو کر کمرے میں نظر دوڑانے لگی۔

سادہ سے فرنیچر سے آراستہ کمرا کسی طور دلہن کا کمرا نہیں لگ رہا تھا۔

اس قسم کی سجاوٹ بھی بابا صاحب سے ممکن ہے مگر بڑی امی... وہ تو جانتی ہیں کہ ظفری بھائی کس قدر حساس ہیں۔

سامنے مسہری پر بھاری سوٹ میں طویل گھونگھٹ نکالے دلہن جیسے سانس روکے منتظر تھی۔ وہ آگے بڑھی اور ہولے سے کلکاری مار کے دلہن صورت دیکھ کر پہچان کر کے پرسکون ہو جائے۔ اس نے قدرے جھک کر گھونگھٹ الٹ دیا۔

گویا بجلی کا شاک لگا تھا۔ وہ منہ کھولے حیران دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس قدر..... ہوش ربا حسن آج سے پہلے اس حویلی میں نہیں تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ۔ بلکہ ہلکا میک اپ اور صرف پھول..... اتنے سے سنگھار پر وہ ہوش اڑا رہی تھی۔

وہ دم بخود کھڑی تھی۔

حسن جو دیکھنے والے کیلئے بجائے خود ایک الوہی خوشی ہے۔ ایک آسمان ساتھ ہے جو دیدار سے فیضیاب ہونے والے کو دنیا سے بیگانہ کر دینے والی عطا ہے۔

اس نوخیز و کم آمیز لڑکی پر کئی بجلیاں دوڑ گئیں۔

"آداب!" اس نے کسی خواب سے جاگ کر اسے متوجہ کیا۔

پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ بمشکل تمام اوپر اٹھیں۔

نیلا جھاگ سا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

وہ جیسے نشے میں ڈوب کر بستر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

"آپ واقعی بہت پیاری ہیں! ہم تو ترس گئے تھے۔"

وہ وارفتہ ہوئی جا رہی تھی اور والہانہ انداز میں اس کے ہاتھ تھام لئے۔

دلہن نے دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

اس نے دلہن کے سراپے پر نظر ڈالی۔ ایک عجیب سا احساس اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی وہ کچھ پوچھنے کو وقت کا کچھ رہی تھی جس سے دیکھنے کو جی چاہتی تھی۔

"آپ ہماری بڑی آفت ہی بھابی ہیں! مجھے آپ کے دیدار کے شوق نے اس قدر بے تاب کر رکھا تھا کہ سلامی کی طرف دھیان ہی نہیں گیا بہرحال....."

اس نے سونے کا چھلا اپنی انگلی سے نکالا اور اس کا ہاتھ تھام کر ایک انگلی میں ڈال دیا۔

"آپ کوئی بات نہیں کریں گی؟ حالانکہ اب تو ساری زندگی آپ نے ہی باتیں کرنی ہیں۔ کیونکہ ظفری بھائی....."

ٹک ٹک ٹک ..... دروازے پر دستک ہوئی۔ جملہ ادھورا رہ گیا اور وہ جیسے یک دم ہوش میں آ گئی۔

"اف کون آ گیا؟ ظفری بھائی تو دستک دے کر آنے سے رہے بیچارے۔"

وہ دبے قدموں سے دروازے کی سمت آ گئی تھی۔ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔

اس نے گویا خوف کی گھڑی پر پاؤں رکھ کر دروازہ کھولا۔

"اوہ" دیر سے رکی سانس بحال ہو کر خارج ہوئی۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا باری۔ حد ہو گئی۔" وہ خوف سے بحالی کے بعد کی خوشی سے بولی چاہتی تھی۔

"مزید تفصیل بعد میں" وہ عجلت میں بولا "فوراً نکلو یہاں سے وہ دروازے پر بابا صاحب دلہن کے پاس آ رہے ہیں۔"

"ہیں!" وہ سرعت سے مڑی تھی اور دروازہ ابھی بند نہیں کیا تھا۔

ایک منٹ میں باری نے اسے جا لیا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تقریباً کھینچا۔

وہ کھوکھر کے دروازے سے ابھی کافی دور تھے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ ابھی سے کہہ رہی تھی۔ کس بری طرح اس کا بازو دبوچا تھا۔

"یہ جو آپ دوڑیں لگا رہی ہیں اس میں کوئی شک نہیں آپ دوڑ کے مقابلے میں وکٹری پوائنٹ پر ضرور پہنچی ہوں گی۔ آپ ضرور شوق فرمائیں۔ بس ذرا اپنے یہ سلیپر ہاتھ میں لے لیں۔ پورا گاؤں 'سارے کھلیان' گونج اٹھے ہیں۔ ان کی ٹھک ٹھک سے۔"

وہ بھی چڑ کر بولا تھا۔

"جیسے ابھی آپ نے کھوکھر کے کتے سے دوڑ ابھی سنتا ہے۔"

روشی اپنے بازو کو سہلا رہی تھی۔

"بالکل ہی خبط ہو گئی ہو۔ دورے پڑنے لگے ہیں کیا تمہیں۔ احمق ہو رہا ہے"۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

"آئی ایم سوری، روشی! ایکچوئلی یہ بہت احمقانہ اقدام تھا۔ اس عمارت میں چاروں طرف کھڑکیاں ہیں۔" آپ کو تو شاید ہماری کے نقش سے عادت مل جائے مگر آپ کو میرے پاس میں پڑی زنجیروں کی آواز نہیں آتی؟"

اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"سوری مجھے واقعی خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے رخسار تک آ جانے والا آنسو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔

"ارے آپ تو رو پڑیں"۔ وہ از سر نو احساس جرم میں مبتلا ہوا۔

دونوں آگے پیچھے کھوکھر کے کوارٹر میں داخل ہوئے۔ وہ ابھی تک منتظر بیٹھا تھا۔

انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟" ہادی کھوکھر سے مخاطب تھا۔

"نہیں سرکار"۔

"تمہارا کتا نہیں بھونک رہا اب"۔ روشی نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔

"وہ جو آپ بہت ڈر رہی تھیں ناں تو میں اسے استھان پر باندھ آیا"۔

"اچھا۔۔۔ اچھا!" وہ جلدی سے اس کے کوارٹر سے باہر آ گئی۔

"ہادی اگر کھوکھر کو احتیاطاً تاکید ضرور کر دینا۔ بابا صاحب کو پہلے ہی مجھ سے شکایت رہتی ہے"۔ اس نے پلٹ کر ہادی کو یاد دہانی کرائی۔

وہ خاموش رہا۔

"جواب کیوں نہیں دے رہے؟" وہ جھلائی۔

"آپ نے حکم دیا، میں نے سن لیا"۔

"رات بہت ہو گئی ہے ورنہ پوچھتی تمہیں"۔

"دن میں تو آپ اتنا بھی نہیں پوچھتیں جتنا اب پوچھ لیا ہے"۔ وہ مسکرایا۔

"بہت ہے"۔

"نان سنس۔۔۔ اچھا شب بخیر"۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"بالو"

"ہاں اماں!"

"دیکھ تیرے باپ کو بھنا ہوا قیمہ بہت پسند ہے اچھی طرح بھون لیجیو"۔

"کیا ہے اماں"۔

"لے۔۔۔ وہیں [illegible] چار کپ پانی ڈال دے [illegible] دیر سے [illegible] اب آرام [illegible] کے کمرے سے [illegible] گئی [illegible] ہو۔"

"ارے ہاں اماں میں تو بھول ہی گئی۔ سوکھا کر پانی ڈالتے ہوئے اسے [illegible] کر رہی ہوں اماں سن بھی رہی ہے؟"

وہ اس کی طرف متوجہ ہو کر [illegible] جہاں اماں کی موجودگی کا احتمال تھا۔

"سن رہی ہوں اماں کو"۔ اماں کی آواز کسی کونے سے برآمد ہوئی۔

"دیکھ آج پانچ روپے سنبھال کر رکھ [illegible] پرانی مشین [illegible] باقی بعد میں دیتے رہیں گے۔ گھر میں سلائی کا کام آ جائے تو دال روٹی کا آسرا ہو جائے گا کہیں؟"

"ٹھیک ہے اماں!" اس نے مصروف انداز میں کہا۔

"اللہ کرے تیرے باپ کا بھی روزگار لگ جائے، اس سال گھر میں تیری شادی بھی کر دیں گے"۔

بالو اس جملے کے جواب میں اقرار و انکار دونوں سے معذور تھی۔ تب چپ رہی۔ مگر روشی کے چہرے کے رنگ ضرور محسوس ہوئے۔

غریب لڑکی کی بے مقصد زندگی میں ایک یہی تو دن ہوتا ہے جس میں جھانک کر دیکھنے والی اس عظیم خوشی کو راست بھی ملتی رہتی ہے۔

سونے کے چند زیورات گوٹا لگے چند شوخ جوڑے ایک ساتھ ایک دم کئی نئے جوڑے۔

اور آنے والے اجنبی ساتھی کی رومان بھری باتیں۔

اس کی اجنبی قربت کے وہ پرلطف لمحات۔۔۔ جہاں ذات تکمیل کے لمحے سے گزر کر بے پناہ وقار ہو جاتی ہے۔

زندگی جو جھک کر گزر رہی ہوتی ہے ایک دم سے رواں ہو جاتی ہے۔ محبت بھری قربتوں کے ان لمحوں کا تصور غربت کی آزمائشوں کو بہت بے وزن کر دیتا ہے۔ کڑے کوسوں کے کرنے کی لگن پیدا ہو کر زندگی کو قدرے آسان بنا دیتی ہے۔

ماں کے اگلے منصوبے پر پروگرام نے پچھلی اس کے ذہن پر چھائے خیالات کو [illegible] کام یاد آنے لگے۔

روزانہ کی صفائی میں رہ جانے والے گوشے دکھائی دینے لگے۔ ٹوٹے صحن میں پھول پودے لگانے کا خیال از سر نو آیا۔

صندوق میں پڑے چند ان سلے کپڑے بھی دھیان میں آئے۔ جن پر سلائی کڑھائی کا پروگرام بھی ساتھ ہی بننے لگا۔

وہ بڑی ترنگ کے ساتھ روزانہ کے معمول میں مصروف ہو گئی۔

اس کا رشتہ کہاں ہو سکتا ہے؟

"بڑی پھپھو کے جمیل کے ساتھ؟"

نہیں وہ تو خوب بیچارے بڑے غریب ہیں۔ کیا وہاں جا کر بھی سلائیاں کروں گی۔ گھر بدلنے سے کیا ہوتا ہے حالات

بھی ہونا چاہیے۔

پاپا انور کے رشید کے ساتھ؟

نہیں اس کا تو غصہ بہت تیز ہے وہ بہت بھاگا کرتا ہے ہر وقت تو انگارے پہ رہتا ہے۔

"ہائے کیا چیز... شاید (کسی) کا بھائی رشتہ بھیج دے... کیسے دیکھتا ہے گھنٹوں میرا دل کانپ جاتا ہے"۔

نہیں... وہ کرکٹ کھیلتا ہے ہمارے ہاں سے بھی گھر آ کر نہاتا ہے بچے کے ساتھ۔ اس نے اس روز مجھے کس طرح دیکھا تھا انہیں دھکے سے... رہ گئی تھی۔ شاید وہ بھی اس کو ہمارے ہاں بھیج دے۔

شاید... حمید بھائی اپنے دیور کا رشتہ لے آئیں۔ مجھے کتنا چاہتی ہیں اور ان کا دیور بھی تو اس شب برات پر حلوہ دینے آیا اور کتنی دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔

"ہانو کی ماں... جلدی سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آ"۔

چھناک ایک پیالی سونیرہ چاہنے کی دراز تھی... کٹ... وہ ٹوٹ گئی۔

باپ کی تھکی ہوئی اور لرزتی آواز پر وہ ننگے پاؤں دوڑی تھی۔ اس کی ماں اس سے پہلے پانی کا گلاس لیکر پہنچ چکی تھی۔

"ارے کیوں کرتے ہو اتنی محنت... چہرہ ایک دم پیلا ہو رہا ہے۔ چھوڑو یہ دو دو نوکریاں شفٹوں سے مشین سے آؤ گی کچھ پیسے جمع کر کے... پھر تم بس ایک ہی کام کرنا"۔

"ابا طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی بے وقت آ گئے" اسے ہول کر دیا سارے سپنوں کی ڈور اس کے باپ سے تو بندھی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہوں آج دھوپ بھی تو بہت تیز ہے چکر آ گیا تھا"۔ وہ ہانپتے ہوئے وجہ بیان کر رہا تھا۔

"چکر آ گیا تھا۔ پہلے تو ابا کو کبھی چکر نہیں آیا"۔ اسے بے حد تشویش ہوئی۔

"ہاں مگر اب نوکریاں بھی تو دو دو کرتے ہیں"۔ اس نے عقیدت سے باپ کا ہاتھ تھام کر سہلایا۔

"ابا سیون اپ منگواؤں؟"

"نہیں نہیں ایک پانچ روپے کی دراز بوتل آتی ہے پانچ روپے بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ پانچ روپے کی ایک ڈکار؟ اتنی سستی نہیں ہے میری۔ بشیر کو بھیج کر گنے والے سے ایک روپے کا شربت منگا لے۔ بس!"

وہ فکر مندی سے باپ کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں خواہ مخواہ چودہ روپے کا پراٹھا لے آئی۔ تین دو چلیں آ جاتیں ابا کیلئے"۔ اس نے اپنی فضول خرچی پر خود کو لعنت ملامت کی۔

وہ باورچی خانے سے تانبے کا گلاس لیا اور دروازے کی سمت آ گئی۔

اس نے پردے کی اوٹ سے گلی میں جھانکا۔

بشیر سامنے ہی کھڑا تھا۔

"کیا ہے آپا؟"

"ابا کیلئے ایک گلاس ٹھنڈا شربت لے آ"۔

"آج ابا شربت پئیں گے؟" (وہ اٹھ آنے کی بجائے وہیں کھڑے سوچتے ہوئے)

"ہاں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں"۔

اس نے پلٹ کر پیچھے باپ کو دیکھا جو چند دنوں میں ہی بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔

پشاور ایئرپورٹ کے لاؤنج سے باہر آ کر وہ حیران پریشان کھڑی تھی... حبیب احمد کے وہاں کی […] تصویر بھیج چکے تھے... اگر وہ تصویر سے بھی پہچانی جاتی تو پہلے کوئی ہوا اس کی مدد کیلئے موجود ہوگا۔

حبیب احمد نے یہی کہا تھا کہ توقع تو یہی ہے کہ یاور اسے ریسیو کرنے آئیں گے... انہوں نے اسے دیکھا ہوا ہے... تصویر بھجوانے کی وجہ سے بھی وہ اسے فوراً ہی پہچان جائیں گے... دوسری بات […] کی وجہ سے بھی کوئی مشکل نہ ہوگی۔

یاور علی خان کی جاگیر اگرچہ پنجاب کے علاقے میں کی جاتی تھی۔ مگر وہ ایئرپورٹ سے اس کا فاصلہ زیادہ تھا۔ نسبت پشاور ایئرپورٹ کے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صوبہ سرحد کے اس حصے میں تھی جو پنجاب کے آخری حد کے ساتھ تھا۔

حبیب احمد نے یہ بھی بتایا تھا کہ ایئرپورٹ سے جاگیر تک کا سات گھنٹے سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ ابھی تو طویل فاصلہ طے کرنا تھا اور اس سے پہلے کی پریشانی تھی کہ اسے لینے کوئی آیا بھی ہے یا نہیں؟

وہ بیگ تھام کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

گھڑی کی سوئیاں اس کا انتظار نہ ختم ہو رہی تھیں اگر کوئی نہ آیا تو آپ پھپھو کے پاس صدر چلی جاؤں گی۔ یہاں سے صدر کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں۔ اس نے متبادل حل سوچ کر پیسے خود ہی اپنی ڈھارس بندھائی۔

سہ پہر کے پانچ بجنے والے تھے۔ اس نے پیچھے مایوس ہو کر راہ سے بھاری بھرکم سوٹ کیس کھینچا۔

"پتا نہیں مجھے کیا جلدی ہوئی تھی۔ پاپا کے ساتھ ہی آ جاتی تو ٹھیک تھا"۔ اس نے اپنے فیصلے پر خود ہی تنقیدی لحظہ کیا۔

"السلام علیکم!"

اس سے پہلے کہ وہ چونک کر صورتحال سمجھتی سلام کرنے والے نے اس کا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"دیکھیں جی... وہ... یہ..." وہ اس قدر پراعتماد عمل کے سامنے گڑبڑا کر رہ گئی۔

"یاور علی خان... آپ ماہین ہیں... کم آن پلیز..." وہ اس کا بھاری سوٹ کیس اٹھا کر سامنے گاڑی کی قطار کی سمت بڑھے تو اسے بھی ان کے پیچھے تقریباً بھاگنا پڑا۔

"یا اللہ یہ ان لوگوں کا انداز ملاقات ہے۔ استغفراللہ"۔ وہ اپنے دوڑنے بھاگنے پر جھلا کر رہ گئی تھی۔ سیاہ رنگ کی

پھر وہ جیپ کے پچھلے دروازے کو کھول کر انہوں نے سوٹ کیس رکھ کر پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

”تو یہ انسان ہے یا بیت ہلیا وہ۔ اپنے جیسے مردوں جیسی [illegible] انہوں نے وہ ڈھونڈ کر مارا ہے“۔

وہ ان کے نزدیک پہنچ کر سانس درست کرنے لگی۔

انہوں نے جیپ کا اگلا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ کر ان کا چہرہ غور سے دیکھنے کی نیت سے بائیں طرف دیکھنے لگی اور وہ کھٹاک سے دروازہ بند کر کے دائیں طرف بھی آ گئے۔ اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ تب اس نے بھی گویا طمانیت کا سانس بھرا اور دائیں طرف چہرہ موڑ کر ان کے رخ انور پر تفصیلی نگاہ دوڑائی۔ البم میں لگی تصویروں سے بے حد مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ جب ہی تو وہ ان کو پہچان نہیں پائی۔ تصویریں بھی جانے کون سے زمانے کی لگی ہوئی تھیں البم میں۔

چھ فٹ سے اونچا قد و قامت، جاگیرداروں کی نمایاں نشانی گھنی مونچھیں۔ مگر وہ تلوار مار کر طرز کی نہیں تھیں۔ آنکھوں پر انتہائی تاریک گلاسز۔ کنپٹیوں پر سفیدی، بالوں کی تراش فوجی انداز کی، سیاہ پینٹ، سفید بے داغ قمیض، سفید و سیاہ امتزاج کی خوبصورت ٹائی جس میں لگی ڈائمنڈ پن کے نگینے نیم تاریک ماحول میں جگنوؤں کی طرح دمک رہے تھے۔

”اچھی پرسنالٹی ہے“۔ اس نے فوراً نمبر دے دیئے۔

”اگر یہ روایتی بے تکلف اور ملنے ملانے والے والد بھائی ہوتے تو بڑی شان بڑھ جاتی، ہمارے خاندان کی مگر اب کیا جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا“۔

اس نے شانے اچکائے۔

”کیا کچھ بولیں گے نہیں؟“ وہ حیرت سے سوچنے لگی۔

”آپ شاید بہت جلدی میں ہیں“۔ بالآخر وہ خود ہی بولی۔

وہ گاڑیوں کے ہجوم سے بڑی احتیاط سے جیپ نکال رہے تھے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خجل سی ہو کر رہ گئی۔

چند منٹوں کے بعد جیپ ایک شفاف کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

”آئی ایم سوری ویلکم ٹو یو۔ جلدی میں نہیں ہوں۔ سفر بہت لمبا ہے راستے میں رات ہو جائے گی“۔ ان کی بھاری، پاٹ دار آواز جو کچھ زیادہ ہی دھیمی تھی بڑی تفصیل سے محدود فضا میں مرتعش ہوئی۔

”آپ اکیلے ——— میرا مطلب ہے بچے نہیں آئے؟“ اس نے قدرے احتیاط سے گفتگو شروع کی۔

یاور علی خان نے قدرے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

بہت ہی بزرگانہ انداز میں اس نے بچوں کی بابت دریافت کیا تھا۔

”شاید انہیں پتا نہیں چل سکا، میں زمینوں سے واپس آیا تو پتا چلا آپ تشریف لا رہی ہیں مجھے اس لئے لازمی آنا پڑا کہ میرے علاوہ شاید کوئی دوسرا آپ کو آسانی سے نہ پہچان پاتا“۔

”پاپا نے تصویر بھی تو بھجوائی تھی“۔ اب ذرا اس کے اوسان بحال ہوئے۔

”ضرورت ہی نہیں تھی کسی تصویر کی۔ سب ہالی وڈ ہے“۔ وہ طنز کے انداز میں گویا ہوئے۔

”جی!“ وہ تعجب سے ان کی سمت دیکھنے لگی۔

”یقیناً نہیں!“

”اگر آپ کو گھٹن محسوس ہو تو آپ پچھلی سیٹ پر جا کر آرام کر سکتی ہیں“۔ ان کی پاٹ دار گمبھیر آواز میں اس بار خاصی ملائمت تھی۔

تیس چالیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد انہوں نے سڑک کے کنارے جیپ روک دی اور سگریٹ سلگانے لگے۔ ”میں آپ سے اجازت بھی اس کی نہیں لے سکتا کیونکہ یہ میری مجبوری ہے ——— ڈرائیونگ کا حصہ ہے“۔

”کوئی بات نہیں“۔ اس نے رواداری سے کہا۔

”مجھے دیکھ کر آپ کو پھوپھو بہت یاد آئی ہوں گی“۔ اس نے بہن کے تعلق کا تذکرہ کر کے گویا اپنائیت کا احساس جگانا چاہا۔ پیدا ہوا۔

وہ حیرت انگیز طور پر قطعی خاموش رہے۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اپنی پھپھو کی بہن کے تذکرے پر وہ ایک دم خوش ہو جائیں گے اور چائے پانی کا پوچھیں گے یا باتیں شروع کر دیں گے۔

”اس سے پہلے آپ کبھی پنڈی آئی ہیں؟“ انہوں نے اس کی سوچ سے بہت ہی مختلف گفتگو شروع کی۔

”جی نہیں“۔ اس نے مجمل سا جواب دیا۔

سگریٹ کے دو چار کش لگا کر انہوں نے ڈرائیونگ پھر شروع کر دی۔

اب شام کا جھٹپٹا تھا۔ یاور علی خان نے گلاسز اتار کر جیب میں اٹکا لئے۔ ماہین نے نہایت پُرشوق انداز میں ان کی سمت دیکھا تھا۔

خوابیدہ بھاری سیاہ اور سوچتی ہوئی گہری آنکھیں ”عاری“ ”پیچ“ والوں جیسی۔

ماہین کو عجیب سا خوف محسوس ہوا۔

”میں اسی لئے ڈارک گلاسز استعمال کرتا ہوں۔ دھوپ میری آنکھوں کو کچھ نہیں کہتی مگر یہ آنکھیں ——— دوسروں کو پریشان کر دیتی ہیں ——— دراصل برسوں سے اصل اور گہری نیند نہیں سویا۔ نیند کے قرض سے سرخ سی ہیں اور کوئی بات نہیں“ آپ پریشان نہ ہوں“۔

(واقعی کس قدر محبت کرتے ہیں یہ پھوپھو سے۔ ان کی جدائی سے نیندیں ہی پریشان ہو گئیں)

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا“۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی اور گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

یاور علی خان نے اندرونی لائٹ آن کر دی۔ گھنی مونچھوں تلے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ یوں نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی جیسے بادلوں کی اوٹ سے لمحہ بھر کو چاند جھلکتا ہے۔

ماہین دور تک نظر آنے والی سڑک پر نظر دوڑا کر فاصلے کی طوالت محسوس کرنے لگی منزل تک پہنچنے کے بعد کی گھٹن کو ابھی سے

محسوس کر رہی تھی۔

"ہادی!"

"جی بابا صاحب!"

"وہ دیوار سے برابر والا کمرہ مہمان کیلئے صاف ہو گیا؟"

"جی بابا صاحب! دیکھ کر آیا ہوں"۔ اس نے مؤدبانہ کہا۔

"ہوں"۔ انھوں نے گہری سوچ کے دوران "ہوں" کہہ کر گویا اپنے متوجہ ہونے کا اظہار کیا۔

"دیکھو اس کا پچھلا دروازہ باہر سے بند کر دو اور اس میں تالا ڈال دو"۔

"جی بہتر"۔

"دھیان رہے سوائے بڑی دلہن کے مہمان کے پاس زیادہ دیر کوئی نہ رہے"۔

"جی"۔

"خاص طور پر روشانے"۔

"جی"۔

"یہ مہمان کہاں سے آ رہی ہیں بابا صاحب؟" اس نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

"کراچی سے ـــــ ماہین نام ہے۔ روشانے کی سگی خالہ ہیں"۔

"اوہ! اماں جی کی سگی بہن"۔

"ہاں"۔

"گھر میں اور کسی کو خبر نہیں"۔ اس نے گویا کوئی لائحہ عمل ترتیب دینا شروع کیا۔

"تمہاری بڑی امی اور بڑے ابا کو اطلاع ہے"۔

"انھوں نے آہستگی سے جواب دیا"۔

بابا صاحب نے جتنی ڈھیل اور رعایت ہادی کو دے رکھی تھی وہ گھر میں اور کسی کو حاصل نہیں تھی جس پر سارے گھر والوں کو بہت تعجب تھا۔ اسے ان کے معتمد خاص کی حیثیت حاصل تھی۔

"دیکھو جیسے ہی وہ مہمان کو لیکر گھر میں داخل ہوں، سیدھے میرے پاس لے کر چلے آنا۔ ماما لی کو تاکید کر دینا مہمان سے پہلے وہ نہیں سوئے گی۔ نہ جانے وہ کس وقت آئیں۔ کھانا وغیرہ بھی پوچھنا ہو گا۔

کیوں ـــــ؟"

"جی!"

"اور اسے کہنا سونے سے پہلے مہمان کیلئے دودھ ضرور لے جائے خواہ وہ پیے یا نہ پیے۔ ضروری اشیا اس تک پہنچ جائیں

چاہیں تو بے شک وہ استعمال کر سکیں برابر کے کمرے کے؟"

"بہت اچھی طرح"۔ اس نے بابا صاحب کو مطمئن کیا۔

"اب تم جا سکتے ہو"۔

وہ سلام کر کے باہر نکل آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"خان! اس کمرے میں ابھی بلب نہیں"۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے اطلاع دی۔

"کوئی بات نہیں۔ انہیں اندھیرے میں رکھیں گے"۔ اس نے ذو معنی جملہ پھینکا۔

"جی!" ماما لی نے آنکھیں پھاڑیں۔

"اچھا میں سمجھی"۔

"ہادی بھائی! آپ سے زیادہ کون کر سکتا ہے یہ بھی بہتر طریقے سے"۔ روشی دالان کے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔

"میں خوش قسمتی سے خاتون نہیں ہوں اور آپ لوگوں کی پارلیمنٹ ہے اور آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" وہ کسی خیال کے تحت فوراً چونکا۔

"گھر ہے ہمارا۔ کہیں بھی، کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کو اعتراض کیا ہے؟"

"مجھے بھلا کیوں اعتراض ہونے لگا"۔ وہ ادب بجا لانے کے خیال سے باہر نکلنے لگا۔

"ہادی!"

"فرمائیے"

"کون آ رہا ہے"

"مہمان"۔ وہ اختصار سے کہہ کر رہ گیا۔

"کون مہمان؟" وہ پوچھی۔

"یہ سارے گھر میں آپ ہی کیوں اس قدر تجسس کی حالت میں رہتی ہیں؟" وہ مسکرایا۔

"بتا دو نا ہادی کون مہمان ہے؟"

"ماما لی تمہیں کچھ پتا ہے؟"

"بتا دیجئے جلدی کیا ہے"۔ وہ تیزی سے باہر آیا۔ مبادا کوئی نیا سوال حملہ آور ہو۔

"آپ سے پہلے مجھے کیا پتا ہو سکتا ہے بی بی!" ماما لی مسکرا دی۔

"لیجئے تو میرے سپاہی گئے ہیں چل جائے گا پتا"۔ روشانے ایک دم کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ تو کزنز پارلی میں اپنی معلومات سے کوئی دھماکہ کرنا چاہتی تھی مگر کچھ پتا ہی نہ چل سکا تھا۔ وہ وہیں سے اس سمت آ گئی جہاں "کزنز اجتماع" نہایت ہی ذوق و شوق سے کراچی جانے کے پروگرام پر بحث و تمحیص میں مشغول تھا۔

"یہ آپ کی عقل کیوں "بھرجائی" ہو رہی ہے" شعبو نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"جیسے آپ کو پتا ہی نہیں ہے بھرجائی مذاق کا۔ ملائی دوڑ سمجھ تک اور آپ کی وہ اس گھر میں سو ہو گزرنے تک۔ بڑی شعبو آپا کی لالہ بھائی سے نسبت ٹھہر گئی ہے اور پھر ان کا جو اس کھڑکی سے شروع اور اس کھڑکی پر ختم وہ داستان عالم کر کے پلٹ جائے گی۔ ایک زور دار قہقہہ پڑا تھا۔

"شعبو بولا کر گئی۔ ایک تو تمہیں بولنے دیا ہے مجھے کون لاولد انہیں"۔ وہ اداکر بھلا کر بولی۔

"تو مجھے کیوں "بھرجائی" کہا؟ بھرجائی ہوں میری دشمن"۔

"ان کی ہے جو وصال ملاپ سے ترتیب پائے گی اور سنہری حروف سے لکھی جائے گی"۔

حنا نے ہمیشہ کے ارادے سے ٹی وی کی آواز اونچی کی۔ اس شور شرابے میں اس کی طبع خراب ہو رہی تھی۔

"تمہیں کوئی اس کا بھید پتا ہے؟" گڑو آپا نے فوراً ہی تفتیش شروع کر دی۔

"مگر تم ہی جاننا چاہیں تو وہ کوئی جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو تو اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ جس کا حاصل وصول"۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

"تم نے دیکھا۔ یہ بیچاری کو بھائی نہیں کہتی" زوری نے وکیلوں کی طرح نکتہ اٹھایا۔

"یہ تو ہے"۔

"میں زوری کے بھائی نہیں رہتی۔ ابھی خاصی خوش شکل ہوں۔ بھائیوں کے سلسلے میں"۔

"اچھا پھر کل ذرا اسے بھائی کہہ کر ہمارے سامنے بلانا۔ اگر کوئی بات نہیں۔ شعبو نے جیسے اپنا بدلہ لے لیا۔

"میں اسے بتا دوں گا خالوجی کہ وہ لالہ بھائی تک کہنے کو تیار ہوں اگر آپ برا نہ مانیں۔ مگر بھائی نہیں کہوں گی۔ اب تو میری انا کا مسئلہ ہے"۔ وہ تو جیسے اڑ گئی۔

اور شعبو تو سمجھو غیض انداز میں وہ لالہ بھائی کہنے پر گویا جلتے توے پر جا بیٹھی۔

"خبردار! جو تم نے میرے ساتھ کسی ایسے ویسے کا تعلق مذاق میں بھی جوڑا"۔

"میں اس سے شادی کروں؟ اس سے لاکھ درجے بہتر ہے کنواری مر جاؤں"۔

"ارے شعبو! چھوڑو مذاق ہے"۔ گڑو آپا نے بیچ بچاؤ کرایا۔

"ارے نہیں! یہ بدتمیزی کرتی ہے"۔ شعبو کا غصہ ٹھنڈا ہو کر نہیں دے رہا تھا۔

"بڑی بات چھوٹی ہے"۔ بابا صاحب بہت سب نے اسے سر پہ چڑھا رکھا ہے"۔ شعبو کے انداز شدید تر ہو گئے۔

"چھوڑو شعبو! عمر بھی کم ہے اور عقل بھی۔ ہوش کی دوا کرو۔ ایمانداری کی بات ہے، یہ بیچاری اول تو کسی کو کچھ کہتی بھی نہیں ہے"۔

گڑو آپا نے ماحول میں امن پیدا کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ کلمۂ حق بھی بلند کیا۔

"یا اللہ توبہ! یہ کیا شروع ہو گیا۔ کتنا اچھا پروگرام ہو رہا ہے تم لوگ۔ خوش قسمتی سے پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ بابا صاحب

نے ہم سب کو ٹی وی دیکھنے کیلئے ٹوکا نہیں ورنہ تو اجازت بھی مشکل سے دیتے تھے"۔

"بابا کو نہیں پتا کہ ہم سب "سہیلی" جانے کیلئے ایسے بیٹھے تیار ہیں۔ اف۔ وہ رات کے وقت۔ چلو اس پروگرام ختم۔ ہاں تو کیا بات کرتے تھے ہم"۔ سہیرہ بڑی تفصیل سے شروع ہوئی۔

"ایسی کہ بابا صاحب تو کہیں دو تین سے پہلے واپس نہیں ہوں گے۔ جب بھی آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی بات کر ہی گئے"۔

سوچو جو کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی اندر داخل ہو کر زوری پر نادیدہ کا وزن ادا کرنے لگی۔ وہ کچھ دیر پہلے کی صورتحال سے قطعی لاعلم تھی۔

"سوچو بابا سارے جانے ہی بالیں گی آپ؟" سونی نے سوچو کو یوں تعجب سے دیکھا جیسے اڑ گئی ہو۔

"تم سب کے ساتھ ہی کر رہی ہوں گی۔ اکیلے تھوڑا ہی"۔ وہ زوری کو آنکھ مار کر ہنس دی۔

"ارے یہ روشی کیوں چپ ہے؟" سوچو نے روشی کی خاموشی نوٹ کی۔

"ایسے ہی طبیعت ٹھیک نہیں۔ کچھ تھکی تھکی ہوئی شام سے پینٹنگ کر رہی تھی"۔

روشی کشن پر سر رکھے دراز تھی۔ گڑو آپا اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بہت محبت سے انہوں نے روشی کی پیشانی پر بکھرے بال سمیٹ کر سوچو کو جواب بھی دیا تھا اور دوسری سوچو زوری کے ذہن میں بیٹھے کے اندرونی اثرات ابھرنے کی شعوری کوشش بھی کی تھی۔ مبادا وہ کچھ دیر قبل کی ناپسندیدہ صورتحال کو دوبارہ موضوع بنا لیں۔

اتفاقاً سوچو کیلئے تھے اور معنی خیز نگاہ پرستی کی نیلم باقی تمام لڑکیوں کیلئے

لڑکیاں بھی پچھلی صورتحال کی طرف پلٹنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ اس لئے گفتگو یا وضاحت نہیں کرنا چاہتی۔

"ان لوگوں کے امتحانات زوری کے ہیں وہ اور ہمارے اس پروگرام میں بالکل شامل نہیں اس لئے کہ ان قصورواروں کی وجہ سے ہم بے قصوروں کو بھی جلد بوریا بستر سمیٹنا پڑ جائیگا"۔ حنا نے جو اتنی دیر کے بعد کی طویل تعطیلات منانے کے موڈ میں تھی فوراً ہی پیش بندی کی نیت سے بول پڑی۔

"پہلے چلے تو جائیں"۔ حنا نے بے مزا ہو کر اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"تو پروگرام تو پکا ہے"۔ اماں نے تو مجھے پورے ایک ہزار روپے بھی دے دیئے۔ زوری نے انکشاف کیا۔

"ایک ہزار! آپ کیا کریں گی اتنے سارے روپوں کا؟" روبی جو صرف سن رہی تھی ایک ہزار کا سن کر جیسے سوتے سے جاگ گئی۔

"بے چاری روبی! اور سو روپے مہینہ دیتی ہیں پھپھو"۔ حنا نے ترس کھایا۔

"وہ سو روپے تو نام کے ہیں۔ کپڑے وہ لاتی ہیں۔ ہر فرمائش پوری کرتی ہیں۔ اب گڑو کو میسر ہے۔ وہ سو روپے بھی جمع ہی کرتی ہوگی"۔ زوری نے کہا۔

"کہاں جمع ہوتے ہیں۔ کالج کینٹین کا خرچ چار سو روپے کا ہے۔ امی دو سو دیتی ہیں"۔ روبی نے فریاد کی۔

"آپ کتنی کتنی دیں گی زری آپا؟ پورے ایک ہزار...... اور باقی لوگوں کو کتنے لے رہے ہیں؟"

"ملیں گے، ملیں گے...... سب کو ملیں گے...... مگر امید ہے وہ دوسرے زیادہ ہی ملیں گے ظاہر ہے ہم کراچی میں ہی کام کر رہیں گے، اتنا ہو کا شرح ہے۔"

"تو اصل میں تو ہو رہی ہے" شعلہ نے مونا کی بات کاٹ دی۔

"کیا لوگوں میں سے بھی کوئی جائے گا؟" حنا کی نظریں ہنوز ٹی وی اسکرین پر تھیں، مگر بہر حال وہ مذاکرات میں شامل تھی۔

"تو ان شہر سے ہمارا کو گھر کے اندر والی حصے میں رہنے کی اجازت نہیں اتنی لمبی رفاقت کی اجازت تو انہیں ضرور ملے گی۔" شعلہ نے استہزائیہ انداز میں حنا کی طرف دیکھا۔

"اکا تو بہت سنجیدہ ہیں شاید انہیں بھیج دیں بابا صاحب!" تانیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مگر انہیں تو خواتین سے الرجی ہے، انہیں بھیجیں گے بھی تو وہ نہیں جائیں گے۔"

مونا نے تجزیہ کیا۔ ظاہر ہے وہ ان کی حقیقی بہن تھی۔

"مگر بغیر کسی مرد کے بابا صاحب ہمیں جانے کیسے دیں گے؟" لالی بہت دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ اس لئے سب سے زیادہ سوچ کر بات کی تھی۔

"شاید خواتین میں سے کسی کو بھیج دیں۔ کراچی میں وہ ملازم تو ویسے ہی موجود ہیں۔" زری نے اندازہ لگایا۔ "ہو سکتا ہے۔"

"شاید ہماری بھائی کو بھیج دیں۔" تانیہ بھی اندازوں میں شریک ہوئی۔

"کبھی بھی نہیں...... بابا صاحب کا ان موصوف کے بغیر ایک پل...... گزارا نہیں۔ وہ بھی اتنے عرصے کے لئے۔" مونا نے فوراً اختلاف کیا۔

"ہو سکتا ہے بھیج بھی دیں۔ بابا صاحب کی طرف سے انہونی ہو سکتی ہے۔" روشی نے بڑی طویل خاموشی کے بعد برجستہ کہا۔

"کبھی بھی نہیں...... ہرگز نہیں...... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" شعلہ نے فوراً تردید کی۔

"اگر ایسا ہو گیا؟" گلو آپا نے شرارت سے پوچھا۔

"تو میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔ آدمی ہے یا اس گھر کا آسیب" وہ جل کر بولی۔

ایک فرمائشی قہقہہ پڑا تھا جس میں روشی نے حصہ نہیں لیا تھا۔

"خیر جانے دو کوئی بھی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں خوشی سے بھیجا جا رہا ہے۔" مونا نے سفید جھنڈا لہرایا۔

"ارے صبح نظری بھائی کو دیکھا تھا جب وہ بابا صاحب کے کمرے سے نکلے تھے؟" تانیہ نے حاضرین سے دریافت کیا۔

"ہاں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔" لالی نے دیکھے جانے کی گواہی دی۔

"اس کا مطلب ہے انہیں پسند آ گئی؟" زری نے گلو کی طرف سوالیہ دیکھا۔

"پسند کیوں نہیں آتی؟ ایسا حسن تو ہماری سات پشتوں میں دور دور تک نہیں" روشی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کیسے؟ ذوق سے کہہ رہی ہو جیسے دیکھ کر آئی ہو" زری نے تعجب سے پوچھا۔

روشی یک دم خاموش ہو گئی۔ وہ بے ساختہ بول پڑنے پر خجل تھی۔

اس کی خاموشی کے اسرار کو گلو نے بھانپ لیا تھا۔

"کوئی بات ہے ضرور؟ تم نے دیکھا ہے؟"

"میں کیسے دیکھ سکتی ہوں" وہ انجان بن کر لاپروائی سے بولی۔

"مگر جس انداز میں تم بولی تھیں۔ اس سے تو صاف اشارہ مل رہا ہے کہ تم دیکھ چکی ہو۔"

"ہاں میں نے سلیمانی ٹوپی پہن کر آپ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔"

اس نے گلو آپا کی بات کاٹ کر زچ کر کہا۔

"پھر تم نے اس کے حسن کے بارے میں اتنے وثوق سے کیسے کہا؟" گلو آپا کا شک برقرار تھا۔

"ماما جی جو کہہ رہی تھیں۔"

"مگر سنی سنائی بات اس انداز میں تو نہیں کی جاتی جس طرح تم نے کی ہے۔"

"اللہ مجھے معاف کریں۔ ویسے ہی کہہ دیا تھا۔" روشی نے زچ ہو کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ اس انداز پر خاموش ہو گئیں۔

روشی نے قدرے سکون کا سانس لیا۔

ہلکے ہلکے سبزے سے ڈھکے پہاڑ اور گرد کے ماحول کی سیاہی میں اضافہ کر رہے تھے۔ شام کا منظر ختم ہو کر رات کے مظاہر میں تبدیل ہو چکا تھا۔

یاور علی خان نے تو جیسے ہونٹ سی رکھے تھے۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بہت اکتائے ہوئے انداز میں بیٹھی تھی۔ نہ جانے کب اسے اونگھ آ گئی تھی۔ اس وقت وہ چونک کر جاگ پڑی۔ جب اس نے اپنے رخسار پر بھاری ہاتھ کی گرمی محسوس کی۔ وہ اس کا رخسار تھپتھپا رہے تھے۔

"ماہین! آپ پچھلی سیٹ پر جا کر آرام سے سو جائیں۔"

"جی!" وہ بدحواس ہو کر سیدھی ہو گئی۔ جانے کتنی دیر سے وہ ان کے شانے سے لگی ہوئی تھی۔

"آ...... تم...... سوری۔" اس نے شرمندہ سے انداز میں کہا۔

"ڈونٹ مائنڈ...... پلیز گو بیک۔" ان کے انداز ہر طرح سے بے تاثر تھے۔ جیسے کوئی روبوٹ "مجھے سوتا دیکھ کر کہیں

"آپ پر بھی نیند طاری نہ ہو جائے"۔ اس نے ان کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے عادت ہے"۔ انہوں نے نہایت مہارت سے ایک اندھا موڑ کاٹا۔

"پیچھے چائے اور کھانے پینے کی چیزیں ہیں، شاید آپ کو بھوک لگی ہو"۔

"آپ بھی کسی جگہ رک کر چائے پی لیجئے"۔ اس نے ہنوز ان کی سمت دیکھا۔

"ٹھیک ہے"۔

"کیا ہم اٹک سے نکل آئے؟" اس نے باہر جھانکا۔

"بہت دیر ہوئی"۔

"سنا ہے وہاں دو دریاؤں کا بہت خوبصورت سنگم ہوتا ہے۔ دونوں کے پانیوں کا رنگ مختلف ہے۔ ایک میں مٹیالاہٹ ہے دوسرے میں سبز رنگ کی جھلک"۔

"جی ہاں"۔

"آپ تو آتے جاتے دیکھتے ہوں گے؟"

"کبھی آئی تھیں اس طرف؟"

وہ خاموش رہی جیسے اس کا سوال نہ سنا ہو۔

وہ شل سی ہو گئی۔ سوال کرنے والے کو جواب میں خاموشی ملے تو اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے ہی سہی اپنی نظروں میں ہی غیر اہم سا ہو جاتا ہے۔

"آپ کو گھر یاد تو آتی ہوں گی؟" بہر حال اس نے خود کو بحال کیا۔

"ہوں"۔ وہ ہنوز سامنے دیکھ رہے تھے۔

"یہ سامنے اٹک نظر آ رہی ہے۔ یہاں جیپ روک لیجئے گا۔ چائے پی لیجئے یہیں"۔

یاور علی خان نے کچھ بولے بنا ایک چھوٹے سے کریانہ اسٹور کے سامنے جیپ روک دی تھی۔

"ہاری!"

"جی"۔

"میں کل والے راستے سے پچھلے حصے میں جا رہی ہوں"۔

"اب کیا ہے؟" اس نے چونک کر روشی کی صورت دیکھی۔

"پتہ نہیں کیوں انہی سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے"۔ وہ سادگی سے گویا ہوئی۔

"اچھا ہی ہے آپ کا"۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ "مجھے نہیں پتا آپ خود جا رہی ہیں"۔

"تو پھر آ کتنے ویسے ہو تم۔ میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ تم مجھے لے کر چلو۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ بڑی امی کے پاس

"ہوں"۔ وہ ذرا سے پاؤں آگے بڑھ گئی۔

اس نے پچھلے حصے میں قدم رکھا تو دل پریشان سا ہو گیا۔ ہر دو دروں کے پیچھے سے آتی دھوپ اور اس کے ادھورا ماحول ویرانی۔

اس نے ظفری بھائی کے کمرے کا دروازہ دھکیلا جو ذرا سا کھل گیا۔

جھومر پہلو میں بیٹھی سر میں تیل ڈال رہی تھی۔

اسے دیکھ کر ہر طرح بھی اور اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"باجی! مجھے اتنی بڑی قبر میں دفن کر رہا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی"۔

"ارے نہیں بھائی! آپ اس طرح گھبرایا نہ کریں۔ آپ پر کوئی پابندی تو نہیں ہے"۔

اس کی اپنی آنکھوں میں بھی اتر آئی۔ اسے اس دل کی ویرانی کا بہت خوب اندازہ تھا۔

"آپ گھبرائیں نہیں، یہ آپ کا گھر ہے"۔

"بڑی امی آئی تھیں؟"

جھومر نے سوالیہ انداز میں اس کی سمت دیکھا۔

"ظفری بھائی کی امی"۔

"صبح آئی تھی"۔ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کچھ کہہ رہی تھیں؟" روشی نے بڑی محبت سے اس کے بکھرے ہوئے بال پیچھے سمیٹے۔

"نہیں تو۔ بس یہی کہ ظفری کی خوشی کا خیال رکھوں۔ ہم ایک ہزار روپے مہینہ تمہارے باپ کو دے رہے ہیں"۔

روشی کا کلیجہ پھٹ گیا۔

قربانی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں بڑی امی۔ قصاب بھی ایک وار میں شہ رگ پر چھری رکھتا ہے دوسرے مرحلے میں پہلا وار ہے، ایک دم تن سے جدا نہیں کرتا۔

اس کا دل بھر آیا۔ وہ خود سسک کر رو دی۔

جھومر اپنا دکھ بھول کر اس کے رونے پر حواس باختہ سی ہو گئی۔

"باجی! آپ کو کیا ہوا؟ آپ رو رہی ہیں ... دیکھیں ..."

اس کی حالت قابل رحم تھی۔ روشی نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ جھومر نے اسے بہت اپنائیت سے سینے سے لگایا۔

"باجی"۔

"ہوں"۔

"آپ اس گھر کی بیٹی ہیں یا بہو؟" جھومر نے اسے شانوں سے تھام کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"بیٹی ہوں"۔ اس کی آواز میں آنسوؤں کا اثر تھا۔

"پھر کیوں روتی ہیں؟"

وہ اس کی سادگی پر مسکرا دی۔

"اگر مقدر میں رونا ہو تو بیٹی یا بہو ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے ہتھیلی سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے۔ آپ تو شہزادی ہیں، ملکہ ہیں۔"

روشی کھل کے مسکرا دی۔

"بھابی! ظفری بھائی مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ آپ میری بڑی بھابی ہیں مجھے بھابی نہ کہا کریں۔ میں تو آپ کی چھوٹی نند ہوں۔ روشانے نام ہے میرا، سب مجھے روشی کہتے ہیں۔ آپ بھی مجھے روشی کہا کریں۔"

اس نے جھومر کو شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"اچھا یہ بتائیں ظفری بھائی نے آپ سے کیا باتیں کیں۔"

"باتیں ... ؟" اس نے حیرانی سے روشی کی سمت دیکھا۔

"میرا مطلب ہے اشاروں ہی سے سہی۔" اس نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت کی۔

"ابھی مجھے ان کے اشارے سمجھ نہیں آتے۔" جھومر نے نظریں جھکا کر کہا۔

"محبت کے اشارے بھی نہیں؟" روشی نے شرارت سے جھومر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

شرم سے جھومر کے چہرے پر لالی پھیلنے لگی۔

"بھابی! ظفری بھائی آپ کو بہت چاہیں گے، یقین کیجئے آپ ان کی معذوری نہیں ان کی محبت کو نظر میں رکھیے گا۔"

"یہی تو کرنا ہو گا ورنہ دن کیسے کٹیں گے؟" اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"اچھا مجھے اپنے کپڑے دکھائیے۔" روشی نے اس کی توجہ ہٹانا چاہی۔

"کپڑے تو ڈھیر سارے ہیں مگر دل نہیں چاہتا۔"

"اسے کیوں دل نہیں چاہتا، صبح شام تبدیل کیا کریں، ظفری بھائی بہت خوش ہوں گے۔"

"وہ تو خیر ویسے بھی بہت خوش ہیں۔" اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔

روشی خاموش ہو گئی۔ مجرموں کی طرح خاموش جیسے دعا کر رہی ہو کہ جھومر اپنی محرومی آشکار نہ کرے، پی جائے، ضبط کر جائے کہ آخر وہ اتصال کرو گرد سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں کسی تلخ صداقت کو دہرانے کا حوصلہ نہ تھا۔

اس کا جی چاہا، جھومر کہے۔

"میں خوش ہوں، میرے ساتھ کسی نے زیادتی نہیں کی۔ یہ میری تقدیر ہے۔ ظفری معذور ہیں تو کیا، میں ان کے دل کی تسکین و خوشی ہوں اور اس بات پر خوش ہوں کہ مجھے بے لوث، بے کھوٹ محبت کی دولت حاصل ہے۔" تاکہ وہ اس تکلیف دہ احساس سے نجات پا جائے کہ وہ اپنے سامنے ضمیر فروشی کے عمل کو جاری دیکھ رہی ہے اور خاموش ہے۔

جھومر نے جس انداز میں ظفری کی خوشی کا ذکر کیا تھا وہ انداز اس کی اپنی خوشی کی کوئی گواہی نہیں دے رہا تھا۔

"بھابی! آپ خاص تو آئی ہیں ... مگر لگتا ہے آپ نے پڑھا لکھا بھی ہے۔" وہ اس کی مناسب گفتگو سے بہت متاثر ہو چکی تھی۔

"ہاں میں میٹرک کر چکی ہوں۔ ایف اے کی تیاری کر رہی تھی۔" اس نے سادگی سے اقرار کیا۔

"جی!" وہ ابھی بھی رو رہی ہو گی۔

"تیمور خان جی نے میرے ساتھ آج تک بڑی مہربانی کی تھی مگر شاید وہ وقت یہاں تک لانے کی تیاری تھی۔" اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

"کیا آپ کو کاکا جان نے پڑھایا ہے؟"

"جی ... یہ مجھے ہمسایہ پڑھاتا تھا وہ میری تعلیم کیوں کرتے ہیں؟" جھومر خاصی گہری تھی۔

"آپ کی اور بہنیں بھی ہیں؟"

"نہیں ... تین چھوٹے بھائی ہیں۔ اگر میری اور بہنیں ہوتیں تو شاید میں آج یہاں نہ ہوتی۔ میرے ماں باپ کو سب کچھ مجھ سے ہی حاصل کرنے کا لالچ نہ ہوتا۔ مجھے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں جاتی اسے کوئی فکر نہ ہوتی۔"

"روشی!"

"اوں ... ہوں ... روشی۔" روشی نے اسے ٹوک دیا۔

"جی ... روشی بی بی!"

"صرف روشی۔" اس نے دوبارہ ٹوکا۔

"اچھا! صرف روشی۔" وہ معصوم سے انداز میں پیچھے رخ ہو کر بولی۔

روشی بے ساختہ کھلکھلا اٹھی ... تو جھومر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"روشی! آپ کے اور ظفری کی امی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہیں گھر میں؟"

"ایک بھوپھو ہیں، بس اس ہے جب ہم سب کھانا کھاتے ہیں تو لگتا ہے دعوت میں 'رزق کھانا' ہو رہا ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"پھر ... وہ یہاں کیوں نہیں آئیں؟"

روشی نے جیسے زخم آمیز انداز میں اس کی سمت دیکھا۔

"بابا صاحب کا نام سنا ہے؟"

"جی تیمور خان جی کے والد۔"

"ہاں وہی ... ان کی اجازت نہیں ہے۔"

"آپ کو ہے؟" اس نے تعجب سے روشی کو دیکھا۔

"مجھے بھی نہیں ہے جب ہی تو رات کے اندھیرے میں چھپ چھپ کر آتی ہوں۔"

"آپ کیوں خطرہ مول لیتی ہیں؟"

"جس کو کھو جانے کا خطرہ ہوتا ہے وہ خطرہ مول لیتے ڈرتے ہیں میرے بہت سارے بڑے نقصان ہو چکے ہیں اب مجھے کچھ کھو جانے کا خوف نہیں"۔

اس نے بات کے اختتام پر گہری سانس لی۔

"وہ اور خواتین بھی تو بڑی امی کے علاوہ یہاں آتی ہیں؟ آپ سے نہیں ملیں؟"

روشی کسی خیال سے چونک کر پوچھنے لگی۔

"نہیں میرے پاس بڑی امی کے علاوہ اور کوئی نہیں آیا"۔ جھومر نے کہا۔

(حالانکہ میرے علم میں ہے ارجمند چچی اور بڑی پھپھو بڑی باقاعدگی سے یہاں آتی ہیں)

"روشی! مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔ دیکھو یہاں کوئی نظر نہ آنے والی آوازیں آئیں تو کیا ڈر نہیں لگے گا؟"

"کیسی آوازیں؟"

"زیادہ تو نہیں سمجھ سکی مگر ایسا لگتا ہے کوئی روتا ہے"۔

روشی کے دل پر ایک دھکا سا لگا۔

(ہائیں... اور کون روتا ہے؟) "آپ کو یقین ہے؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"آپ کا گھر ہے آپ کو نہیں پتا؟" اسے اچنبھا ہوا جو کہ لازمی امر تھا۔

"یہ گھر نہیں ہے بھائی اباجی صاحب کی سلطنت ہے"۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" معاً اسے پیچھے سے بڑی امی کی بارعب آواز سنائی دی۔

ایک لمحے کو تو وہ چکرا کر رہ گئی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے خوف آیا۔

وہ خود ہی سامنے آ گئیں۔ ان کی آنکھیں اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کپکپاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔

ساتھ ہی حیرانی بھی عیاں تھی۔

"تم یہاں کس طرح آئیں وہ بھی اتنی رات کو۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ یہاں وہاں اپنی من مانی کرتی ہو۔ تمہیں احساس نہیں کہ ساری مصیبت مجھ پر آ جائے گی۔ یہاں میرے خزانے دفن ہیں۔ تمہیں یا کسی اور کو کیوں دلچسپی ہو؟" یک دم ان کی آواز بھرا گئی۔

"یہاں حکمرانی ہوتی ہے رشتے داری نہیں دفع ہو جاؤ یہاں سے آئندہ یہ حرکت نہ دہرانا میں کہہ رہی ہوں جاؤ یہاں سے"۔ وہ دبے دبے لہجے میں برہمی کا اظہار کر رہی تھیں۔

روشی تو وہاں سے سرپٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔

"اف میرے خدا"۔ اس نے کھوکھر کے کوارٹر میں جا کر گہرے گہرے سانس کھینچے۔

"کھوکھر! بی بی کو ٹھنڈا پانی پلاؤ"۔ اسے نہایت قریب سے ہاری کی آواز آئی۔

"ہاری! میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔ جنات کی طرح میرا پیچھا لیا ہوا ہے"۔

"بہت ہی خوش فہم ہیں حضور یہاں سے وہاں میرے سینکڑوں چکر لگتے ہیں اگر کہیں آپ کو کوئی ملا ہو تو آپ کا تصور ہے میرا نہیں"۔

"خان! یہ شخص آج بھوکی ہے"۔ کھوکھر ہاری کی صورت دیکھتے ہی پوسٹ ہو گیا۔

"تمہیں اسے عادی بنانا ہے کھوکھر! یہ تمہارا اور میرا ہے"۔

"ویسے خان! اگر یہ ہار گئی ہے بہت ستائے گی"۔

"کوئی فکر نہ کرنا جی اس لئے ہے کہ اس کے نخرے کو تو اٹھانا ہے اگر یہ نگاہ گر گئی"۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہاری

ہاری ہاتھ مارتے ہوئے مسکرایا۔

"یہ شخص کون ہے؟" روشی نے فوراً مداخلت کی۔ عجیب سا تجسس تھا سوال میں۔

"بی بی محمودی آئی ہے اصطبل میں کوئی اعتراض؟" وہ باہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

وہ کھسیانی ہو گئی۔ اس پر مستزاد ہاری کی مسکراہٹ اور گنگناہٹ

گھوڑوں کی رات کی تنہائی میں آواز نہ دو

آواز نہ دو

"ہونہہ! اباجی صاحب کا بچہ" وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر آ گئی۔ کھوکھر کی بیوی بے چاری ہاری کے حکم کی تعمیل میں پانی کا گلاس لئے پیچھے پیچھے آئی تھی۔

آج ہم نے بھی ہجر سے مل کر

بیچنے والوں کی نقل اتاری ہے

"بھائی! ادھر وہاں کہاں... یہ ہے ہم ادھر" اس نے اندھیرے میں سرگوشی سے آتی عارف کی آواز سنی۔

"بھائی! تو کتنا اچھا ہے نذیر رفاقت اس شعر پر مستانہ جاتا ہے" وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"اور کیا حال ہیں تمہارے؟" اس نے تھکے تھکے انداز میں عارف کا احوال پوچھا۔

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں

جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

"کیا حال ہونا ہے جناب ہمارا؟" وہ اپنی مخصوص زہریلی ہنسی ہنسا۔

"میں تیرے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تیری نشے سے یہ حالت ہوئی ہے یا خون بیچنے سے؟"

وہ عارف کی سمت گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ہمارے متعلق نہ سوچا کر۔ تیرے اپنے دکھڑے کم ہو گئے ہیں؟" عارف بالکل چت لیٹا تھا۔ پیٹ پر سے قمیض ہٹا کر سینے تک چڑھائی ہوئی تھی اور وہ پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور پیٹ بھی کیا تھا۔ پسلیاں بلندی پر تھیں اور پیٹ کھائی میں۔ جیسے

''معدہ'' تو میرا کھیلا بھی اعدت سا ہو۔

''عارف یار ---- لال خان بہت تنگ کرتا ہے''۔

''یہ منت نہیں کرتا پوری؟'' عارف نے بیچ میں سے بات اچک لی۔

''ہاں بھائی''۔

''یہ تو ہے اس معدے میں بلکہ ہر معدے میں سالی گردن پھنسی ہوتی ---- ہر کوئی نظر رکھتا ہے ---- بات کروں گا اس سے''۔

''ابھی کرو یار' آج مجھے چکر آ گیا تھا۔ سیٹھ نے پیسے نہیں دیے واپس گھر جو آ پڑا''۔

''کوئی گھڑی چیز کھایا کرو' بس ہے گا تو رس لگے گا''۔

''کہاں سے کھاؤں؟ ابھی کچھ پتا ہی نہیں''۔

''ابھی بھی نہیں پتا؟ کیا سونے کے نوالے کھلا رہا ہے اولاد کو؟'' وہ بے ہنگم انداز میں ہنسا۔

''ابھی وہ پوری اجرت دیتا ہی کب ہے۔ یہ سالا بھی اپنے سیٹھوں جیسا ہے۔ قسمت ہی خراب ہے''۔

''پھر بھی کچھ تو دیتا ہو گا؟''

''کونڈے کی دوائیاں بڑی مہنگی ہیں' پھر پچھلا ادھار بھی تھا''۔

''دو دن میں تو حالات نہیں بدلیں گے' ذرا انتظار کر' ہمارے جیسے ضرورت مندوں نے ہی ان کے دماغ آسمان پہ چڑھائے ہیں''۔

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں

''تو پھر چل رہے ہو؟'' اس نے عارف کی سمت بہت امید سے دیکھا۔

''پہلے سرکار بولے تو کنڈی بھی کھولیں گے پر یار' ہم گے گا نکلنے میں ہمت باندھ رہے ہیں۔ ذرا ہاتھ تھام کر اٹھا کر تو بٹھاؤ''۔

''یار تم سے تو اچھا حال ہے' پھر تمہاری اتنی چلتی کیسے ہے؟'' اسے حیرانی ہوئی۔

''زہر زہر کو مارتا ہے سنا نہیں؟ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے' زندہ لاش ہیں تو کیا ہوا؟ سانس تو پوری کرنی ہے۔ ایک آدھ چابی تو دکھنی پڑتی ہے جیب میں''۔

اس نے جیب سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالتے ہوئے بڑی تفصیل سے جواب دیا۔

''اب تم سگریٹ پورا کرو گے؟'' اسے جتنی جلدی تھی عارف اتنی دیر لگا رہا تھا۔

''کچھ گے تو آدھا پی لیں گے۔ بات یہ ہے بھائی سنا کہ بغیر اپنی گاڑی سو نہیں لگتی''۔

''ویسے لونڈا اب پہلے سے بہتر ہے' تم تو یار میرے محسن ہو' بھیک بھی مانگتا تو اس وقت اتنی تو نہ ملتی''۔ اس کے لہجے میں

ممنونیت تھی۔

''ہاں بھائی! اب کھڑے تھے تو کسی کے کام کے نہیں تھے' لیٹے ہیں تو دے کا آ دھی''۔ وہ ہنسا تو ادھر کی کی وجہ سے کھانسی شروع ہو گئی۔

بڑی مشکل سے کھانسی تھمی۔ ''تمہیں تو بڑی سخت کھانسی ہے''۔ اس نے بہت ترس کھا کر جیسے اظہار ہمدردی کیا تھا۔

''وہ کبھی پیچھے سے زندگی اور یہ ہے کہ پچھال سے آگے نہیں ہوتی''۔ وہ بھرپور بے بسی سے ہنسا۔

''وہ کون؟''

''پھر سنائیں گے یہ داستانِ الم''۔

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

''بیوی تھی وہ تمہاری؟'' وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

''بیویوں کا ذکر بھی اتنے اہتمام سے کیا جاتا ہے نادان؟'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔

''تم تو بیوی والے ہو کر بھی بڑے ہی تجربہ کار ہو' پر تم بھی کیا کرو' تمہاری زندگی میں اولاد کے بعد آئی ہی بیوی ہے۔ ہم سے پہلے ملتے تو ہم مشورہ دیتے کہ معاشقے والی بیوی نہیں لاتے''۔

''یہ اور بات ہے' معاشقہ کسی اور سے' شادی کسی اور سے''۔

''بھائی تیری باتیں اپنے کھاتے میں نہیں لگ رہیں' چل یار دیر نہ کر''۔

''ذرا سہارا دو''۔ عارف بمشکل اٹھتے ہوئے مدد کا طالب ہوا۔

اس نے دل و جان سے اسے سہارا دیا اور اسے تھامے ہوئے بوسیدہ دری کی طرف آیا۔

''لال خان!'' اس نے پوری قوت اکٹھی کر کے آواز دی جو پھر بھی کانپ رہی تھی۔

لال خان ایک پاؤں بینچ پر اور دوسرا زمین پر رکھے بڑے مزے سے دوروں کا شکار کر رہا تھا۔

عارف کی آواز سن کر وہ ادھر چلا آیا۔

''یار! ادھر کھڑے کھڑے تیرے بالوں میں سفیدی آ گئی۔ انسان اب بھی نہ پہچانے گئے تجھ سے؟'' عارف کی کمزور آواز میں گویا یہ ملامت تھی۔

''کیا غلطی ہو گئی بادشاہو؟''

''اس کا کچھ کر یار' یہ اتنے آرام سے یہ عادی بننے والا نہیں۔ چھوڑ کر مر گیا تو آ کے پھر یہ تیرے پاس؟''

''دیکھو آسانی ہے' تیرے سے بڑا پاگل نہیں ادھر کوئی''۔ عارف اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

''اس کی یہ منت پوری کر' بلکہ پچاس روپے جو جانے کے دے' غریب کوئی ٹکڑا دال کھا لے گا' پچاس روپے لے گا تو پانچ سو بیٹھیں گے''۔

لال خان نے کسی معمول کی مانند عارف کے حکم کی تعمیل کی۔ بے ہوا کے جھونکے چلائے جا رہے تھے۔ اسے عارف کے رویے پر سخت حیرانی ہوئی۔

"دو سو رو گئے تھے یہ لکڑ اور یہ پچاس روپے اوپر سے——— خوش؟"

"مہربانی تمہاری———" وہ اتنی آسانی سے کام ہوتا دیکھ کر نہال ہو گیا۔

"صبح نو بجے پہنچ جانا چوہدری عمر کی پرائیوٹ آسامی ہے وارے نیارے ہو جائیں گے، فیکٹریوں زمینوں کا اکیلا وارث ہے پھر کل ہی کی گاڑی۔"

"اچھا" اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ "اب میں جاؤں؟"

"بھائی! مجھے بھی ذرا درشن کرا دے، میری ماں میرے حصے کا بھی رو چکی ہو گی۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بے نیازی سے ماں کا دکھ بیان کیا۔

"ماں کو نہیں رلاتے عارف بھائی!" وہ اسے تھام کر باہر کی سمت بڑھا۔

"یہ ماں بھی عجیب ہوتی ہے۔ ٹوٹ وہ تب بھی روتی ہے نہ وہ تب بھی روتی ہے" وہ مسکرایا۔

"جو امرت اس نے تمہیں دودھ میں پلایا، بچ گئے تو رونے کی نہیں؟"

وہ اس کی ماں کا دکھ محسوس کر کے اداس ہو گیا۔

"اس امرت دھارے سے نہ جانے ہم نے کتنی زندگیوں کو کھلا دیا ہے۔ پھول کی طرح میرے یار اسود کے ساتھ مل لوٹا ہے" ہا ہا——ہا—— اس کی ہنسی میں نوحہ تھا۔

اس نے عارف کی سمت دیکھا اس کی آنکھوں کے دونوں گوشوں سے آنسوؤں کی چمک ظاہر تھی۔

"روشی" وہ لاؤنج کی طرف جا رہی تھی کہ بڑی امی کی آواز آئی۔ وہ وہیں رک گئی۔

"جی امی جی" اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"میرے کمرے میں آؤ" وہ بائیں طرف بنی طویل راہداری کی سمت بڑھ گئیں۔

وہ دل ہی دل میں اللہ کی پناہ مانگتی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

وہ ایک دروازے پر جا کر ٹھہر گئیں اور مڑ کر دیکھا کہ وہ ان کے پیچھے آ رہی ہے یا نہیں اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئیں اور ان کے پیچھے روشی بھی چند لمحوں کے توقف کے بعد کمرے میں داخل ہو گئی۔

بڑی امی ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ادھر بیٹھو" انہوں نے قریب پڑی دوسری کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ بے چوں و چرا کیے دم سادھ کر بیٹھ گئی۔

"تم پچھلے حصے کی طرف کیا کرنے گئی تھیں؟" ان کے لہجے میں برہمی تھی۔

"ایسے ہی" اس کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا ایسے ہی کیا ہوتا ہے؟" وہ ایک دم پوچھنے لگیں۔

"بھوری بھابی کے پاس گئی تھی بڑی امی" اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی سمت دیکھا۔

"تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ گھر کے بچوں میں سب سے زیادہ وہ شکایت تمہاری سننے کو ملتی ہے، جس طرح سب لڑکیاں رہتی ہیں تم اس طرح کیوں نہیں رہتیں کیا تکلیف ہے تمہیں؟" ان کے لہجے میں بلا کا جلال تھا۔

"کوئی تکلیف نہیں ہے میں تو بھوری———"

"کوئی تعلق نہیں ہے کسی کا بھوری سے، جب تمہیں پتا ہے بڑے خان نے سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ کوئی غلطی سے بھی پیچھے نہیں جائے گا تو تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟" انہوں نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورا۔

"یہی سمجھنے گئی تھی" اس نے بڑی جرأت سے کہہ دیا۔

"خبردار! کوئی ضرورت نہیں تمہاری دلچسپی کی کوئی چیز ادھر نہیں ہے اگر تم نے آئندہ یہ حرکت کی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"بڑی امی آخری بھائی کی بھوری سے شادی ہوئی ہے اب وہ ہمارے گھرانے میں شامل ہے" اس نے جھجکتے ہوئے بالآخر کہہ دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہمیں یہ بات معلوم نہیں۔ حدیں لگائی گئی ہیں ان کے اندر رہو ورنہ———"

"ورنہ———" وہ سوالیہ انداز میں ان کی سمت دیکھنے لگی۔

"ہم تمہیں سرائے بھجوا دیں گے پھر کبھی تم یہاں قدم نہیں رکھو گی۔ سن لیا؟ اب تم جاؤ اور آئندہ خیال رکھنا۔ بڑے خان کو پتا چل گیا تو میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکوں گی۔" وہ اٹھ کر وارڈروب کھولنے لگیں۔

اس نے طمانیت بھرا گہرا سانس لیا اور اٹھ کر باہر آ گئی۔

"اس کا مطلب ہے یہ والی شکایت بڑی امی ابھی بابا صاحب سے نہیں کریں گی۔"

وہ اب دوبارہ لاؤنج کی طرف بڑھی۔ اسی دم پورچ میں جیپ کی ہیڈ لائٹس جگمگا گئیں۔ اس نے کلائی میں بندھی گھڑی کی سمت دیکھا۔ بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ وہ رک کر سامنے دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا اس کے بابا اور علی خان جیپ سے اتر رہے تھے۔

☆....☆....☆....☆

وہ ٹھٹک کر دیکھنے لگی۔ بے بی پنک کاٹن کے جدید فیشن کے لباس میں۔ دوسری جانب سے بڑی کیوٹ سی لڑکی اتری تھی۔ وہ مارے اشتیاق کے ذرا پیش قدمی کرنا چاہتی تھی۔ مگر پاپا کی سمت دیکھ کر وہیں رکی رہی۔

معاً یاور علی خان کی نظر بیٹی کی سمت اٹھی۔ ان کے سرد چہرے کے تاثرات قدرے بدل گئے۔

"آؤ بیٹا۔ وہاں کیوں کھڑی ہو؟" انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"ماہین۔۔۔۔ یہ دوشانے ہے۔"

"اور۔۔۔۔ یہ آپ کی خالہ جان ہیں۔" انہوں نے روایتی انداز میں تعارف کرایا۔

"اوہ۔۔۔۔ تو۔" اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

اس کی بند سی زندگی میں اتنی حسین تبدیلی کا تو خواب بھی نہ آتا تھا۔ اس نے غور سے ماہین کی شکل دیکھی۔ واقعی وہ ان کی خالہ ہر لحاظ سے ثابت ہو رہی تھی۔

نگاہوں میں والہانہ اپنائیت۔

لبوں پر بے تکلف مشفقانہ سی مسکراہٹ۔

سب سے بڑھ کر اصل بات یہی تھی۔ اس فرق کو تو اتنا کہ ماہین کے بال شانوں تک جدید انداز میں ترشے ہوئے تھے جبکہ اس کی امی کے بال مشرقی لحاظ سے دراز اور گھنے تھے۔ اس نے اپنے ہوش میں ان کو نہیں پایا تھا۔ مگر ان کی بے شمار تصویریں اس کے پاس محفوظ تھیں۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ صرف سلام کرو گی۔ گلے نہیں ملو گی؟" ماہین نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ اس کے رخسار پر پیار کیا۔

"پاپا آپ کہاں سے لے آئے میری خالہ کو؟" وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"آپ کے پاپا میں لاؤنج میں لے جا رہی ہوں خالہ جانی کو۔ وہاں سب موجود ہیں۔ اف سب کتنا حیران ہوں گی۔"

مارے خوشی کے روشی کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

"پہلے۔۔۔ ابھی وہاں نہیں جائیں گی۔ بابا صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ پہلے ان سے ملاقات ہو گی۔"

آپ نے ماہین اور روشی کی سمت دیکھے بغیر ماہین سے کہا ہوئے اور بابا صاحب کی خوابگاہ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

ماہین نے روشی کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم بھی آ جاؤ روشی۔"

"روشی کو رہنے دیں۔ اس وقت بابا صاحب سے صرف آپ ملیں گی۔ پلیز۔"

یاور علی خان نے رک کر ماہین کو ٹوک دیا۔

ماہین نے قدرے جھجکتے ہوئے روشی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ لب بستہ سی کھڑی رہ گئی۔

اسے پاپا سے ایسی ہی بے اعتنائی کی شکایتیں تھیں۔ ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ اسورتے چہرے کے ساتھ مسلسل اس راستے کو گھور رہی تھی جہاں سے ماہین اور یاور علی خان گزر کر ایک موڑ پر غائب ہو چکے تھے۔

"کیا بچے اسٹاپ (STOP) کہہ کر غائب ہو گئے؟" "خالہ جانی نہیں واقعی؟" یہ باری کی آواز تھی۔

اس نے اسی کیفیت میں گردن موڑ کر باری کی سمت دیکھا۔

"خالہ آئی ہیں۔" اس نے باری کو مطلع کیا جیسے خود کو یقین دلا رہی ہو۔

"سچ کہہ کے؟" "سچ کا سیزن تو لگے والا ہے۔"

"جاؤ تم یہاں سے تمہارا تو کوئی فائدہ ہی نہیں۔" ماہین کے اس طرح ہٹ جانے کے بعد وہ خود کو بہت بے زار و مضمحل محسوس کر رہی تھی۔

"تم بہت بنتے ہو۔ تم کراہیت کر رہے تھے تمہیں سب پتا تھا۔" سعادہ باری پر برس پڑی۔

"جانے کیا کچھ سمجھتی ہیں آپ مجھے۔ میں صرف حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ اور مجھے تفصیلات بتائی جائیں تو کیوں آخر فرق پڑتا ہے اس سے؟" وہ شانے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔

"ہادی!" اس نے بے ساختہ پکارا۔

"جی۔ ارشاد" وہ واپس پلٹا۔

"مگر نہیں جاؤ" وہ بہت الجھ رہی تھی۔

"جی بہتر۔ پہلے اپنی مرضی سے جا رہا تھا اب آپ کے حکم سے" وہ مسکرایا۔

"اُف۔ یہ تم اتنا خوش کیوں رہتے ہو" وہ اسے مسکراتے دیکھ کر جھلائی۔

"بندہ واٹر پروف ہوں۔ ورنہ لوگوں کا تو حلق بیٹھ جاتا ہے کوں کوں کر" وہ ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اسے کھڑے کھڑے دس منٹ سے زائد ہو چکے تھے۔ معاً اس نے یاور علی خان کو بابا صاحب کے کمرے سے باہر آتے دیکھا۔ "خالہ جانی کو کیوں روکا ہوا ہے بابا صاحب نے" اسے غصہ آ گیا۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟" یاور علی اس کے قریب آ کر گویا ہوئے۔

"جی۔ میں خالہ جانی کا انتظار کر رہی ہوں"۔

"اب تم ان سے صبح ملو گی؟" انہوں نے بے تاثر اور دھیمی آواز میں اسے بتایا۔

"کیوں؟"

"یہ تمہارے پاس بہت سے کیوں کہاں سے آ گئے؟"

"میں ان سے ابھی کیوں نہیں مل سکتی؟"

"ابھی وہ کھانا کھائیں گی بابا صاحب اور جواد کے ساتھ"۔

"تو میں بھی ویسے ہی بیٹھ جاؤں گی؟" اس نے ضد کی۔

"نہیں۔ بیٹا ایسے نہیں۔ جاؤ اپنے کمرے میں" وہ سختی سے بولے۔

"اچھا۔ جواد بھائی بھی تو ہوں گے"۔

"بابا صاحب کا حکم نہیں ہے"۔ انہوں نے قدرے نرمی سے سمجھایا۔

"اللہ کرے میں اپنی اماں کے پاس چلی جاؤں' یہاں تو کوئی بھی مجھ سے محبت نہیں کرتا"۔ اسکی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔

یاور علی خان کے دل کو کچھ ہوا۔ مگر وہ خود پر قابو پا کر اس سمت بڑھے جہاں جواد کی موجودگی کا امکان تھا۔

وہ کافی دیر سے کسی آسامی کا انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر تو وہ ٹہلتے ہوئے اور برآمدے میں بیٹھا رہا۔ "لال مظفر" نے اسے انتظار کرنے کو کہا تھا۔ معاً برآمدے سے باہر ہری ہری گھاس پر اسے عارف لیٹا نظر آ گیا۔ وہ انتظار کی کوفت سے بچنے کیلئے اس کے پاس چلا آیا۔ عارف نے اسے دیکھتے ہی آنکھ ماری۔

"بڑا تیز دھڑک رہا ہے تیرا دل"۔ اس نے اپنے ہاتھ سے تصوراتی ریسیور کا کام کیا اور کان سے اس طرح لگایا جیسے

حقیقت میں فون سن رہا ہو۔

"بھائی تمہیں دیکھ کر سوچتا ہوں کہ تم بڑے خوش نصیب ہو۔ ہر طرح کی فکر سے آزاد"۔

"او بندہ خدا! ایمانداری سے بھی کبھی فراغت ہوتی ہے کہ نہیں؟ ظاہر دیکھ کر رشک کرنے والے عقل کے اندھے ہوتے ہیں"۔

"کیا بات۔ آسامی سے ملاقات نہیں ہوئی؟" اس نے مزید فلسفہ موخر کر دیا۔

"کب ہاتھ آتا ہے۔ ابھی پہنچ گئے کہ کر پریشان کب سے ہے۔ ابھی آتا ہے بیچارہ "مشینوں" میں پھنسا ہوا ہے"۔

اس نے اپنی فکر معاش سے سکڑی آنکھیں مزید سکیڑ کر آنے جانے والوں پر مرکوز کر دیں۔ صبح کا وقت تھا۔ او پی ڈی کی وجہ سے خلقت خدا کا ایک ہجوم بے کراں تھا جو مزید بڑھتا جا رہا تھا۔

"تم ہمیشہ یہیں رہتے ہو بھائی"۔

"نہیں۔ پیدائش کے بعد اماں گھر لے گئی ہوں گی۔ پھر بعد میں آ گیا تھا"۔ وہ حلق پھاڑ کر ہنسا۔

یہ اس کی بڑی بری عادت تھی اپنے مذاق پر سب سے پہلے خود ہی قہقہہ لگاتا تھا۔ اس نے قدرے پریشان ہو کر عارف کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ اسی شہر میں رہتے ہو شروع سے؟" اس کے پریشان ذہن کو مذاق سے اور الجھن ہوتی تھی۔ جب ہی تو کسی دانش مند نے کہا ہے کہ "بے موقع مزاح وحشت پیدا کرتا ہے"۔

"بھائی صاحب۔ بڑے شہروں کی خاک چھان رکھی ہے۔ تفصیل سنو گے تو دونوں تھک جائیں گے۔ میں بھی۔ تم بھی"۔

"گانا سنو گے؟ بڑی اچھی آواز ہے میری" وہ پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔

"میں نے کبھی گانا نہیں سنا۔ خود بخود کان میں پڑ جائے تو دوسری بات ہے"۔ اس کا ذہن برآمدے میں اٹکا ہوا تھا جہاں سے "لال مظفر" نے طلوع ہونا تھا۔

"میں گا رہا ہوں۔ تمہارے کان میں خود بخود پڑ جائے گا۔ لوٹنے سے دانا نہیں پڑے گا"۔ وہ پھر بے ہنگم قہقہے میں الجھ گیا۔

وہ چپ رہا۔ وہ بہرحال اس کا محسن تھا۔ وہ ایک حد تک ہی اس پر ناراض ہو سکتا تھا۔

پتھر کے خدا پتھر کے صنم پتھر کے ہی انساں پائے ہیں
تم شہر محبت کہتے ہیں' ہم جان بچا کر آئے ہیں

وہ گنگنانے لگا۔

"رہنے دو یار گانا"۔

اس کے اندیشوں بھرے ذہن کو اس بے وقت کی راگنی سے چڑ سی پیدا ہوئی۔ جوں جوں وقت سرک رہا تھا۔ اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔

"کہیں مریض کے رشتے داروں نے خون نہ دیا ہو۔ کہیں اور سے انتقام نہ ہو گیا ہو۔ ملٹی نیک سے والا زکیٹ دے لیا ہو۔ فاطمید والوں سے ذیل گیا ہو۔ کہیں یہ نہ ہو گیا ہو۔ کہیں وہ نہ ہو گیا ہو۔ ہم تو مگر ان سب سے سستا ہی رہتے۔ مگر بھی بیچتے سنتے سے کیا وہ تو پیچھے والے لوگ ہیں۔

"کہاں گم ہو گئے۔ پریشانی میں اتنی طاقت ہوتی تو بات ہی کیا تھی؟ ادھر پریشان ہوئے ادھر مسئلہ حل۔ ہوتا تو وہی ہے جو ہونا ہے شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

نیند سے بھی سکون نہیں ہوتا
آنکھ روتی ہے دل نہیں ہوتا
عمر گزری اسی کشاکش میں
یوں نہ ہوتا وہ تو یوں ہوتا

مگر ازل سے یہی فطرت کی پابندیاں ہیں اور انسان کی بے بسی۔ پھر ایسی بے کار سوچوں میں پڑ کر کیا فائدہ۔ آرام میں رہو یہ سوچ کر کہ جو ہونا ہو گا وہ ہو جائے گا۔ ایک تو پیسے ہی پریشانی۔ پھر پریشانی کی پریشانی۔ ایک خدشہ ایک ڈر ایک وہم۔ جس کا کوئی سر نہ پیر۔

یہ ٹھیک ہے جب قسمت خراب ہو تو دل ڈرتا ہی رہتا ہے کہ نہ جانے اب کیا ہو۔ مگر بھائی جو ہونا ہو گا وہ تو بغیر ڈرے کانپے بھی ہو جائے گا۔

"بھائی عقلمند ہو کے بھی یہاں پڑے ہو؟" اس نے بالآخر اس کی قابلیت کا اعتراف کیا۔

"پھر کہاں پڑوں؟ جس دن زیادہ عقلمند ہو گیا۔ پاگل خانے پہنچ جاؤں گا۔ جو زیادہ عقلمندی دکھاتا ہے۔ لوگ پکڑ کر وہاں پہنچا دیتے ہیں۔

"اور تم ان چکروں میں نہ پڑو۔ عقل و فکر اٹھا کے رکھو کسی طاق میں۔ نہ سمجھو دکھ اس کا۔ کیا کیجیے؟" جس کے پاس جتنا پیسہ ہے۔ یہاں وہ عقلمند ہے۔ جس کے ہاتھ اتفاقاً کرسی لگ جائے۔ وہ عقلمند ہے۔"

"بھائی کیا تمہاری گھر گرہستی نہیں ہے؟" اسے عارف کی بے فکری سے ایک نیا سوال سوجھا۔

"گھر ہے۔۔۔ اور گرہستی؟" وہ ہنسا۔ "جب ہستی نہیں تو گرہستی کیا۔"

"مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے تم سے کچھ پوچھا ہو اور تم نے سیدھا جواب دیا ہو۔" وہ چڑ گیا۔

"پھر کیوں پوچھتے ہو؟" عارف نے خلا میں گھورتے ہوئے سوال کیا۔

وہ لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔

سورج ذرا ۔ آ پاس آ
آج سپنوں کی روٹی پکائیں گے ہم

عارف نے بے سرے انداز میں گانا شروع کیا۔

"ارے بھائی۔۔۔ چپ ہو جا۔۔۔ اللہ کے واسطے" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"آپ رنگ میں قدرت کے۔ کوئی خون ملانے کیلئے پریشان۔ کوئی چھڑانے کیلئے بے تاب"۔ عارف ہنسا۔

وہ مستور آدمی کی سمت دیکھتا رہا۔

"یار ایک سوال مجھے پریشان کر رہا ہے"۔ عارف کے لہجے میں ہلکی سنجیدگی تھی۔

"کیا؟" اس نے ایک لمحے کو آدمی سے نظریں ہٹا لیں۔

"یہی کہ سورج اگر مشرق کے بجائے مغرب سے نکلے تو ہم یہاں تک کتنے بجے پہنچیں؟"

اس کا کوئی جواب پاس نہ تھا۔

"وہ اٹھ کھڑا ہوا"۔ میں جا رہا ہوں۔ اب نہیں آؤں گا تمہارے پاس"۔

"ارے یہ تم نہیں کہتا تھا" وہ لاپرواہی سے مسکرایا۔ "کیا کہا ہے شاعر نے کہ

حسن آ گیا ہے جو بے طور میں
میں نے کہا تھا کہ میرے پاس سوچنا

وہ عارف کی سمت بے بسی سے دیکھتے ہوئے پھر بیٹھ گیا۔

"تم ایسی بے سری باتیں کیوں کرتے ہو؟" وہ لاچاری سے پوچھ رہا تھا۔

"سارے سر چھوٹ گئے ہیں"۔ عارف کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"مجھے تم پر بڑا ترس آتا ہے"۔ اس نے ترحم بھری نظروں سے عارف کی سمت دیکھا۔

"اچھا"۔ عارف یوں ہنسا جیسے اس نے کوئی دلچسپ لطیفہ سنا ہو۔

"تمہارے پاس تو بڑا دماغ ہے تم تو کہیں افسر لگ سکتے تھے"۔ اس نے تجویز کیا۔

"ابھی بھی افسر ہی ہوں تم جیسوں کا"۔ وہ مسکرایا۔

تو وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور الجھی ہوئی نظروں سے عارف کو دیکھنے لگا۔

"کیا تمہارے گھر میں صرف ایک اماں ہی ہے؟" پانچ منٹ کی خاموشی بالآخر اس نے توڑ دی۔

"ابا کی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے اماں ایک ہی ہے"۔ وہ آسمان کی سمت دیکھ رہا تھا۔

اب اس نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ ایک لفظ منہ سے نہیں نکالے گا۔

وہ جیسے ہی بیدار ہوئی۔ بلی آنکھوں والی خادمہ کو منتظر پایا۔

"بڑے خان نے کہا ہے آپ ناشتہ ان کے کمرے میں کریں گی"۔ وہ مودبانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"بڑے خان؟" وہ الجھی۔

"بابا صاحب۔ بی بی جی"۔

"اوہ!" کوفت اس کی نس نس میں اتر گئی۔ رات کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ جواد سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہ رہی تھی مگر بابا صاحب نے موقع ہی نہیں دیا۔ ایسی کلاس لی تھی کہ ان میں ایک گھنٹا ایک صدی کے برابر لگا تھا۔ یاور علی خان اور جواد اس طرح بیٹھے تھے گویا موجود ہی نہ ہوں۔ کھانے کے دوران زیادہ باتیں تو انہیں نے کی تھیں۔ اس سفر کا انہوں نے احوال دریافت کیا تھا۔

"اچھا"۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے وارڈ روب کی سمت بڑھی۔ "بابا صاحب سے کہو بی بی کہہ رہی ہیں کہ روشی اور جواد کو بلا لیں۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہ رہی ہوں"۔

خادمہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے بلیک کلر کا سوٹ نکالا۔ اسے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے کئی استری شدہ سوٹ وارڈ روب میں لٹک رہے تھے۔ رات اس نے یہ کپڑے سوٹ کیس سے نکال کر صوفے پر ڈال دیئے تھے۔

یہ سوٹ جدید فیشن کا تھا۔ جس پر سرخ تاروں اور ریشم سے کڑھائی کی گئی تھی۔

اس نے غسل کر کے بال سکھانے کا تردد نہیں کیا۔ ویسے ہی سلجھا کر کھلے چھوڑ دیئے۔ نہ ہی کسی قسم کے میک اپ کا اہتمام کیا۔

جدید فیشن کو قدرے مشرقیت کا رنگ دینے کیلئے اس نے کڑھائی سے بوجھل سیاہ دوپٹہ سر پر ڈال لیا۔ بیس منٹ بعد خادمہ اسے لینے آ گئی۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے بابا صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔

بھاری بھرکم صوفے پر سامنے ہی بابا صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بڑی سی میز اور لدی پھندی ٹرالی تھی۔ دائیں جانب صوفے کے سنگل سیٹر پر یاور علی خان تازہ اخبار لئے بیٹھے تھے۔ سو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اخبار ایک سمت سے ہٹا کے یاور علی خان اسے بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مارے گھبراہٹ کے دوپٹہ ذرا آگے سرکایا۔ اور بمشکل سلام کیا۔

نظر کا ایسا طلسم تھا کہ اس کی خود اعتمادی کا آئینہ دھندلا کر رہ گیا تھا۔

وہ میز کے قریب پڑی ایک خوبصورت کرسی پر بیٹھ گئی۔

"روشی اور جواد نہیں آئے؟" اس نے بڑی ہمت کر کے بابا صاحب اور یاور علی خان کو باری باری دیکھا۔

یاور علی خان نے اخبار کو پھیلا کر صفحہ تبدیل کیا جیسے انہیں اس کی آواز نہ پہنچی ہو۔

"روشی کالج گئی ہوئی ہے اور جواد ضروری کام سے زمینوں پر گیا ہے"۔

بابا صاحب نے جواب دینے کے ساتھ خادمہ کو ناشتہ پیش کرنے کا اشارہ بھی کیا۔ وہ تو منتظر تھی۔ روبوٹ کی طرح شروع ہو گئی۔

"اسے بھی آتی ہے کالج؟" اس نے خادمہ کے ہاتھ سے ایک پلیٹ لے کر بابا صاحب کے سامنے رکھی۔

"نہیں بیٹے۔ یہاں سے ایک گھنٹے سے زیادہ کا فاصلہ ہے اس کے کالج کا"۔

وہ اس کی سمت دیکھے بغیر کہہ رہے تھے۔

"اور یہاں بھی بہت سویرے سے ناشتہ کرتے ہیں۔ سب دوپہر کا کھانا ایک بجے اور رات کا کھانا آٹھ بجے تک ہو جاتا ہے"۔

"آپ نے کیوں زحمت کی میری وجہ سے"۔ وہ شرمندہ ہوئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تم ہماری مہمان ہو۔ ہمیں احساس ہے کہ راستہ بہت تھکا دینے والا ہے۔ آج تم اپنی تھکن اتارو۔ کل سے یہاں کے معمول کے مطابق سب میں شامل ہو جاؤ گی" ان کے لہجے اور آواز میں بہت دھیمے پن کا تاثر تھا۔

جس سے وہ ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگا پا رہی تھی۔

"ماما! مجھے صرف ایک کپ کافی دیجئے"۔

"ابھی ناشتہ کر لیا تھا؟" بابا صاحب نے یاور علی خان سے دریافت کیا۔

"جی!" انہوں نے اخبار سے نظریں ایک لمحے کو ہٹا کر باپ کی سمت دیکھا۔

"مہمان کا انتظار نہیں کیا؟" انہوں نے حیرت سے یاور علی خان کی سمت دیکھا۔

"یہ زنانہ مہمان ہیں۔ اس لئے دھیان نہیں رہا کیونکہ ہمارے ہاں تو خواتین کی اپنی الگ ٹائمنگ ہے"۔ انہوں نے وضاحت کی۔

"یہ زنانہ مہمان ضرور ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ تمہاری مہمان ہیں"۔ ماہین دادا اور یاور علی خان کے تاثرات سمجھنے سے قاصر رہی۔

"خالہ کا آپ کو بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ میں خصوصیت سے آپ کی مہمان ہوں"۔

اس نے چہرہ موڑ کر یاور علی خان کی طرف دیکھا۔ جو ماما جی سے کافی کی پیالی لے رہے تھے۔ سلیٹی شلوار سوٹ اور اخبار کے مطالعے کی وجہ سے سنہری فریم کی عینک لگائے ہوئے وہ رات سے خاصے مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ اب اخبار ان کی گود میں اور پیالی ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے ماہین کو بہت توجہ سے اپنی سمت دیکھتا پا کر خود ہی نگاہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اگر تم پیچھے سے انہیں پہچانے اور یاد کرنے کی کوشش میں ہو تو کوئی فائدہ نہیں اس لئے کہ جب ہم بارات لیکر تمہارے ہاں"۔

"آپ نے بلایا تھا بابا صاحب"۔ اسی دم ہادی خواب گاہ میں داخل ہوا۔

ماہین جو دادا اور یاور علی خان کی گرفت میں لینے والی نگاہوں میں خود کو پا کر حواس باختہ سی ہو گئی تھی ایک دم حالت سکون میں آ گئی۔ اس نے نو وارد فرشتے کو دیکھا۔

"یہ روشی کی خالہ ہیں ہادی"۔

"اور یہ بھی ہمارا بچہ ہے" انھوں نے تعارف کرایا۔

"یہ بھی۔ ماہیر کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ "یہ بھی" سے ان کی کیا مراد ہے؟"

"بیٹھ جاؤ باری۔ ناشتا کر چکے؟"

"جی بابا صاحب"۔

"دیکھو یہ ہماری خاص مہمان ہیں وہی ہیں جن کا تذکرہ میں نے تم سے کیا تھا"۔ باری نے سر سے پاؤں تک ایک تفصیلی نظر ڈالی۔ بے ساختہ غیر شعوری۔

"جی"۔

"ان کا خیال رکھنا۔ کوئی شکایت پیدا نہ ہو"۔

"کیا یہ داور علی خان کے لئے آئی ہیں۔ اتنی خلقت کی موجودگی کے باوجود بھی کیوں میرا خیال رکھیں گے؟" وہ پھر الجھی۔

"ماما وہی الجھن کو کہہ دیا تھا؟"

"جی خان!" وہ مودبانہ انداز میں اخروٹ کا حلوہ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ماما۔ بی بی کو چکھنے کا حلوہ دو۔ ہمارے ہاں ناشتے کی خاص چیز"۔

"یا اللہ۔ ناشتے کے نام پر پورے "ناشتہ" کا سامنا تھا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ حلوہ چکھنے کے ارادے سے لیا۔ مگر واقعی بہت مزے دار تھا۔

"یہ تو بہت مزے کا ہے۔ میں اس کی ترکیب سیکھ کر جاؤں گی"۔ اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

"ایسی الجھن میں پڑنے کی بھلا کیا ضرورت۔ ہم آپ کے ہاں وقتاً فوقتاً بطور تحفہ بھجوا دیا کریں گے۔ کراچی تو ویسے آنا جانا رہتا ہے۔ ہمارے بندوں کا بھی اور ہمارا بھی"۔

وہ بڑی حکمت سے اپنی فیاضی طبع کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہ اس دریا دلی پر محجوب سی ہوگئی۔

"آپ لیجئے نا" اس نے داور علی خان کی سمت پلیٹ بڑھائی۔ وہ بائیں ہاتھ سے عینک اتار رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"شکریہ اس وقت میں صرف کافی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں"۔

ماہین ان کی سرخ آنکھوں کی تاب نہ لا کر ایک دم ہی باری کی سمت مڑ گئی۔

"آپ لیجئے نا"۔

"جی بس شکریہ"۔

"لے لو باری"۔ بابا صاحب نے بھی اس سے کہا۔

تب باری نے ایک چھوٹی پلیٹ میں ذرا سا حلوہ نکالا۔ اور بڑی سادگی سے کھانے لگا۔

"آپ صرف رسمداری کرتے ہیں؟" اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا وہ ان سرخ آنکھوں سے بالکل خائف نہیں ہوگی۔

"آپ بتائیے اور کیا کروں؟" داور علی خان برسوں بعد قدرے بشاش بشاش دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بات داور علی خاں اور باری دونوں محسوس کر رہے تھے۔

"میرا مطلب ہے"۔

وہ ان کے غیر متوقع انداز پر گڑبڑا کر رہ گئی۔

"یہ ڈی آئی جی ہوتے ہیں سرحد کے ایک ضلع میں"۔

ماہین ہکا بکا ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔ ڈی آئی جی اس قدر زندہ دل اور پر مزاح بھی۔ اسے بے حد مسرت ہوئی۔

"پھر آپ ڈیوٹی پر نہیں ہیں آج" وہ اب پہلے سے زیادہ خوش نظر آرہی تھی۔

"آج کل آرام کر رہے ہیں"۔

"آپ کیسے ہوتے ہیں وہاں" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

داور علی خان خاموش رہے۔

"ہم تو بہت چاہتے تھے کہ یہ دوسری شادی کرلیں۔ مگر—" انھوں نے ایک اچٹتی نظر بیٹے پر ڈالی۔

"آپ تو بور ہوتے ہوں گے بہت"۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑا دور افتادہ ضلع ہے۔ علاقہ میں عرضی گزار، خدمت گزار، سب سے سارے لوگوں کی نہ ختم ہونے والی عرضداشتیں۔ وہاں تو خالی وقت ملنا دشوار ہے"۔

"پہلے تو آپ کی یہ اضافی قابلیت مجھے نہیں بتائی"۔ وہ حیران تھی۔

"انھوں نے سول سروس کا امتحان شادی کے بعد دیا تھا"۔ اس بار بھی جواب داور علی خان نے دیا تھا۔

"آپ اگر اسلام آباد سے آتیں تو راستہ بہت شارٹ کٹ ہو جاتا"۔ باری ابھی تک اس بات پر حیران تھا کہ وہ پشاور سے کیوں آئی۔

دراصل اسلام آباد والی فلائٹس کی ٹائمنگ مجھے سوٹ نہیں کر رہی تھی۔ دن کی فلائٹس پر رش کی وجہ سے سیٹ نہیں مل رہی تھی اور مجھے بہت جلدی تھی۔ میں بہت تھوڑے عرصے کیلئے وطن آئی ہوں"۔

"کیا ابھی پڑھ رہی ہو؟" بابا صاحب نے سوال کیا۔

"جی — لاء کر رہی ہوں"۔

"بہت خوب!" وہ خوش ہوئے۔

"السلام علیکم"۔ معاً ایک پروقار نسوانی آواز دروازے کی سمت سے آئی۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ عالم تاب۔ تمہارا ہی انتظار ہو رہا ہے۔"

ہاری اپنی جگہ سے اٹھا اور آنے والی خاتون کو مؤدبانہ انداز میں وش کیا۔

یاور علی خان نے بھی سلام کیا تھا۔

ہاری کو دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور انہیں آداب کیا تھا۔

وہ آسمانی ریشمی شلوار سوٹ میں ملبوس تھیں۔ ہم رنگ نفیس شفون کا دوپٹہ انہوں نے سر پر اچھی طرح جما کر پھیلا رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں ڈھیروں سونے کی چوڑیاں اور کڑے تھے۔ رنگت بالکل گلابی تھی۔ ان کے خوبصورت بالوں میں سیاہ کم گرے چاندی اس قدر نمایاں ہو رہی تھی کہ چند لمحوں کیلئے تو اس کی نظریں ان کے بالوں پر جم کر رہ گئیں۔ تین چار ... چوہدرانیوں سے خاصا کم تھا۔ قد البتہ دراز تھا۔

"یہ ہماری بھتیجی اور اس گھر کی سب سے بڑی بہو ہیں۔ یہاں سب بچے انہیں بڑی امی کہتے ہیں۔"

"عالم تاب! یہ ماہین ہیں --- ساز مین کی سب سے چھوٹی بہن۔" باباصاحب نے تعارف مکمل کیا۔

"کوئی نہ بھی بتاتا تو بھی میں پہچان لیتی۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

عالم تاب کے کانوں میں بڑی موتیے کے پھولوں کی بالیاں۔ اس کے سامنے جان کو معطر کر گئیں۔ "سب سے زیادہ تمہاری جھلک کا خیال تھا۔"

"سفر تو آرام سے گزرا؟"

"جی" اسے جانے کیا یاد آیا کہ اس نے ایک نظر یاور علی خان کو دیکھا تھا۔

"ناشتہ کرو۔ ٹھیک سے۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔" انہوں نے اس کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھ کر گویا اصرار کیا۔

"جی۔ بس کر لیا ہے۔"

"بی بی! آپ چائے میں دودھ کم لیتی ہیں؟" ماما بلی اس کی چائے تیار کر رہی تھی۔

"اوہ" اس نے چہرے پر تشکر کے ساتھ ماما بلی کو دیکھا۔

"شکر ہے بڑی کوالیفائیڈ ملازمہ ہے۔ چائے کے نام پر ذرا دودھ تھما دیتی تو مرد و بیچارہ پڑتا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ دیہاتوں میں چائے کو بھی حفظان صحت کے معیار سے ناپتے ہیں۔ چائے کا مطلب یہاں یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی اور شریانوں میں آگ بھر دینے والی شے۔ لہذا کثرت شیر سے اس کے ان عیوب کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ دودھ میں برائے نام چائے کا استعمال کرنے والوں سے آج تک غالباً یہ سوال کسی نے نہیں کیا۔ کہ آخر اس رسمی کارروائی کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ماما بلی نے بہت حسین کپ میں بڑی خوبصورت سی رنگت کی چائے پیش کی تو اس کا جی خوش ہو گیا اب یہ اطمینان تو اسے ہو گیا کہ وہ جب بھی چائے طلب کرے گی تو بڑی اچھی چائے ملے گی۔ اس نے ریلیکس ہو کر پشت سے ٹیک لگا لی۔

"یاور! تم کب تک ہو؟" عالم تاب پوچھ رہی تھیں۔

"میں کل تک ہوں یہاں۔ خیریت؟"

"کچھ نہیں --- ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔" وہ کچھ سوچنے لگیں۔

"خیر آباد کے فارم میں پھل تیار ہیں۔ ماہین بی بی کو وہاں گھما لاؤ۔ پھر کس کے ساتھ جائے گی۔"

یاور علی خان نے بچے کی سمت سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"یہاں تو عالم تاب اور ہاری انہیں سیر کرا سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"جی --- مگر مجھے پرسوں ڈیوٹی پر ہونا ہے۔ ڈی آئی جی سے بہت ضروری میٹنگ طے ہے۔"

"مگر میں اور بھی تو لوگ ہوں گے۔ میں نے تو سنا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے ماہین بی بی، مگر ہمارا ماحول ذرا مختلف ہے۔ یہاں مردانہ زنانہ الگ الگ ہے۔ یہاں پردے میں ہوتی ہیں۔ آزادانہ میل جول یہاں پسند نہیں کیا جاتا۔" عالم تاب نے رسانیت سے سمجھایا۔

"مگر میں جواد کے ساتھ تو جا سکتی ہوں۔ اس کی تو حقیقی خالہ ہوں۔" اس نے دلیل دی۔

"بالکل --- کیوں نہیں --- مگر جواد آج کل بہت مصروف ہے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور ایک مقامی اکیڈمی سے کچہری بھی جاتا ہے۔"

"جواد کے علاوہ ماشاءاللہ یہاں اور بہت لوگ ہیں۔ میں نے سنا ہے۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے ماہین بی بی۔"

بابا کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ انہوں نے قدرے خفگی انداز میں اس کی سمت دیکھا تھا۔ ان کے سامنے بھی کوئی دوسری بات نہیں ہوتی تھی۔ صرف ایک بات ہوتی تھی اور وہ بھی ان کی اپنی زبان سے نکلی ہوئی۔

"مگر آپ بچی ہیں اور سراسر ہماری ذمہ داری۔ اس لئے یاور اور ہاری یہ دو افراد ہیں۔ ان میں سے آپ کسی کے ساتھ ہوں گی تو مجھے بہت اطمینان رہے گا۔"

ماہین کی سمجھ میں "یاور" والی بات تو آ سکتی تھی مگر ہاری۔ اس نے چہرہ موڑ کر اپنے بائیں جانب دیکھا۔ سفید کاٹن کے کلف شدہ سوٹ میں ملبوس وہ ایک مہذب نوجوان نظر آیا تھا۔ اچھی اٹھان کا حامل ورزشی جسم۔ بھرپور مردانگی کا احساس دلاتی گھنی مونچھیں۔ بالوں کی تراش میں نفاست۔ چہرے کے تاثرات میں بلا کی سادگی۔

"یہ کون ہے؟" اس کے ذہن میں فطری سوال پیدا ہوا۔ مگر اب وہ باباصاحب کے بدلتے تاثرات کے سبب خاموش رہی۔

"ایسے کرنا یاور۔"

"جی باباصاحب۔" یاور علی خان بہت دیر سے خاموش تھے۔ اتنی دیر کی گفتگو میں کسی قسم کے تردید یا تائیدی تاثرات ان کی جانب سے غلطی سے بھی نہیں آئے تھے۔

"تم ماہین بی بی کو خیر آباد کے فارم کی سیر کے بعد اپنے ڈاک بنگلے پر لے جانا۔ وہاں کی سیر بھی ہو جائے گی۔ دو دن بعد

جھے ہے۔ جمعرات کو آف ہو کر یہاں لے آنا۔ کیا خیال ہے؟"

(مگر وہ تو یہاں آئی ہے) اس نے چونک کر بابا صاحب کی شکل دیکھی تھی۔

"جیسے آپ مناسب سمجھیں" انہوں نے باپ سے اتفاق کرنے میں ذرا دیر لگائی تھی۔

"اف خدایا۔ وہ تو یہاں آئی ہے۔ یہ یہاں وہاں۔ کدھر بھیج رہے ہیں؟ یاور کے ساتھ اکیلی۔ ہرگز نہیں۔ وہ اس کے بھولی سہی۔ اس سے عمر میں بڑے سہی۔ مگر ان کے ڈاک بنگلے پر ان کے ساتھ تنہا وہ دن۔ نہ ان بھی ہاں"۔

اس نے چھری سے ان کی سرخ آنکھیں دیکھ کر گویا جھرجھری لی۔

"روشی کو بھی ساتھ لیں گے۔ پھر میں بالکل پریشان نہیں ہوں گی" اس نے تجویز پیش کی۔

"مگر روشی تو کالج۔۔۔" عالم تاب نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سسر کی شکل دیکھی۔

"ایک دو دن کی چھٹی سے کوئی مضائقہ نہیں" یاور علی خان جیسے اس کی سوچ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پہلی بار لطیف کی انداز میں حصہ لیا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ مگر بچی کا خیال رکھنا" بابا صاحب کے لہجے میں غیر معمولی پن ماہین نے صاف محسوس کیا۔

"تو کیا روشی۔ لڑکیوں کے ساتھ کراچی نہیں جا رہی؟" عالم تاب نے یاور علی خان سے پوچھا۔

(کراچی ——— !!!

کراچی والے یہاں آئے ہیں۔ یہاں والے کراچی جا رہے ہیں۔ لڑکیاں کیا مجھے کچھ نہیں دیں گی؟ میں یہاں کیا بزرگی کی تربیت لینے آئی ہوں؟)

"ان گھر والوں سے نہیں ملوائیں گے آپ؟" وہ یاور علی خان کی سمت متوجہ ہوئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی الجھن پوشیدہ نہ تھی۔

"اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ مجھے ضروری کام سے شہر جانا ہے۔ رات کھانے پر انشاء اللہ ملاقات ہوگی" دلاور علی خان اپنی آبنوسی چھڑی تھام کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اگر اس علاقے کی سیر کرنا چاہو تو یاور بھی موجود ہیں اور ہاری بھی"۔

(انہیں سیر کی پڑی ہوئی ہے۔ اس گھر کے درجنوں لوگوں کا ذکر سنا ہے۔ جن کی نقاب کشائی ہو کر نہیں دے رہی۔ وہ الجھ کر سوچ رہی تھی)

بابا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے یاور علی خان، ہاری اور عالم تاب بھی اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ اس بڑھاپے میں بھی دلاور علی خان کی چال میں بلا کا رعب اور مضبوطی تھی۔

یاور علی خان اور ہاری دوبارہ بیٹھ گئے۔ عالم تاب البتہ سسر کے پیچھے ہی چل پڑی تھیں۔

"دیکھو۔۔۔۔ بالکل نہ گھبرانا۔۔۔۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے" وہ جاتے جاتے مڑ کر بڑی شفقت سے مسکرائیں۔

"ظاہر ہے یہاں میری بچی کی بہن کا وارث موجود ہے مگر تم ہے ہی عجیب۔ دو بار کیا کہہ گئے ہیں بزرگ" ماں مری ماں جیسی ہے

اے کیا لفظ ہے۔ اسی۔ یعنی ماں سی LIKE MOTHER اس نے اپنے آپ کو ہمراز بھائی کیلئے اپنے اندر شفقت کا

شعوری طور پر بھی بارہا محسوس کیا۔

"بہشتی ایڈجسٹ ہوئی ہاری؟" یاور علی خان نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

"تھوڑی بہت۔ علاقہ، ماحول، لوگ، آب وہوا۔ ہر چیز اس کیلئے نئی ہے۔ عادی تو ہو گی۔" ہاری نے ان کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"پتہ ہے۔ حسن بہت ہے۔ بلکہ ذمہ داری بھی بڑی ہوئی ہوگی" وہ دھواں بکھیرتے ہوئے برائے نام مسکرائے۔

"آف کورس سر" ہاری ہنس دیا۔

"اف اللہ!" وہ ان کی بے تکلفانہ گفتگو پر حیران ہوئی۔ تاہم وہ دار، ماحول اور بہشتی کے حسن کے تذکرے۔

"کیا قارئیں ہیں؟" اس نے ان کی گفتگو سے نتیجہ اخذ کر کے خواہ مخواہ اڑائی۔

یاور علی خان کے لبوں پر پہلی مرتبہ طویل عرصے کیلئے مسکراہٹ پھیلی جس کا وہ اپنا گم وحشی ایک سمت ہوگا۔ البتہ ہاری کھل کر ہنس پڑا تھا۔

وہ بھی بن کر ہاری یاری دونوں کو دیکھنے لگی۔

"بہشتی ہماری نئی گھوڑی ہے" ہاری نے اطلاع دی تو وہ حق ہی بن کر رہ گئی۔

"آپ سائیس ہیں" اس نے سادگی سے بے ساختہ سوال کیا تھا۔

"آپ سمجھ لیں" اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

(لو میں سمجھ لوں؟ اس گھر کا سارا نظام میری سمجھ بوجھ سے تو چل رہا ہے۔ ہونہہ)

"گھر کے اور لوگ کہاں ہیں؟" اس نے بھولی کو پوچھا لیا۔

"سب سے ملوائیں گے۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں" انہوں نے احتیاطاً نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

نگاہ ملتے ہی اس کا خائف سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنا ان سے پوشیدہ نہ رہ سکا تھا۔

"وہ۔۔۔ کیا ہے کہ۔۔۔" ماہین ہاری کی سمت متوجہ ہوئی۔

"جی؟" وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"میں آپ کو کیا کہوں؟"

"مجھے ہاری کہتے ہیں مگر ویلو فاز میں خان کہتے ہیں۔ آپ جو چاہے کہیے۔ ویسے خادم ہیں آپ کے" اس نے چھپی ہوئی سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے ایک نظر یاور علی خان کی سمت دوڑائی تھی۔

"یہاں بھی کھیت اور باغات ہوں گے آپ کے آدمی دکھا دے۔ روشی کی واپسی تک وقت تو گزر جائے گا"۔

"کیا میں جا سکتی ہوں؟" وہ یاور علی خان سے اجازت لے رہی تھی۔

"او شیور... کیوں نہیں"۔ انہوں نے آگے کی طرف جھک کر راکھ جھاڑی۔

"چلیے باری!" وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"باری جیپ کون سی لے جاؤ گے؟"

"کون سی لے جاؤں؟"

"اوپن لے جاؤ"۔

"ارے نہیں پلیز اوپن نہیں۔ آج کل تو ہوا بہت گرم ہے"۔ وہ دونوں کے بیچ حائل ہوئی۔

بڑی بے ساختہ مداخلت تھی۔ دونوں کے سوال جواب کا سلسلہ چند لمحات کیلئے موقوف ہو گیا۔ پھر بھری والی لے جاؤ۔ چابی میرے بیڈروم میں ہے۔ انہوں نے عینک چڑھا کر اخبار دوبارہ کھول لیا تھا۔

ماما لی برتن سمیٹ رہی تھی۔ وہ باری کے پیچھے لالا اور علی خان کی خوابگاہ سے باہر آ گئی۔

"گلو آپا"۔

"ہوں؟"

"یہ حیدرآبادی سوٹ رکھ لوں؟" حنا نے کرتا اپنے ساتھ لگا کر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیہ بھابی کا نکاح کا سوٹ بھی رکھ لو۔ کہہ دینا کراچی سے واپس آ کر دے دوں گی"۔ شیبو نے استہزائیہ انداز میں مفت مشورہ دیا۔

حنا کی جان جل کر رہ گئی۔ اس نے پوری قوت سے کرتا بیڈ کی طرف اچھال دیا۔

"توبہ ہے شیبو آرام سے بھی کہہ سکتی تھی۔ بچی ہی تو ہے"۔ گلو کو بھی شیبو کا انداز ناگوار گزرا۔

"تو اسے اتنی سمجھ نہیں۔ وہاں کون سا ہم تقریبات اٹینڈ کرنے جا رہے ہیں"۔ شیبو کو اپنے رویے پر ذرا ملال نہ تھا۔

"دیکھو بیٹا تم لوگ زیادہ سامان نہ باندھ لینا۔ پلین تو جلدی پہنچا دیتا ہے۔ سامان کی وصولی میں اس سے ڈبل ٹائم لگتا ہے۔ ویسے بھی بوئنگ کی سیٹیں ہیں۔ چار پانچ سو مسافر۔ ہر ایک کے دو دو بیگ لازمی۔ گھنٹہ بھر تک جھگڑے بھر بھر سامان آتا رہتا ہے۔ شیشے کے پار تکتے تکتے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب کراچی گئی تھی تو دو سو سے زیادہ مرتبہ میں نے بورڈ پڑھا تھا۔ برائے مہربانی باہر نکلنے سے پہلے گمشدگی کا کلیم کریں۔ بعد میں کوئی کلیم قبول نہیں کیا جائیگا"۔

زری نے اپنے سابقہ تجربات کا نچوڑ پیش کیا۔

"ایسے کرو وہ تینوں لڑکیوں کا سامان بڑے سوٹ کیس میں کر دو۔ بیگ کی گنتی میں بھی آسانی رہے گی"۔

"تمہیں نہیں پتا پلین سے اتر کر سامان کا انتظار کتنا مارتا ہے"۔ زری نے مشورے کے ساتھ ساتھ اگلی صورتحال بھی واضح کی۔

"اسلام آباد سے جائینگے ناں"۔ لالی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے"۔ سوما نے اپنی قمیص کی ترپائی کے دوران جواب دینے کی فرصت نکالی۔

"پانچ بج گئے ہیں۔ روشی کہاں ہے؟" تائی کو روشی کی غیر موجودگی محسوس ہوئی۔

"سیہ بھابی کے بیڈروم میں ہو گی۔ وہ بیچ میں چلی جاتی ہیں تو ان کے مرے آ جاتے ہیں۔ اسی لیے چھوڑ رکھا انھوں نے ہے"۔ شیبو مخصوص انداز میں ہنسی۔

"کوئی حرج والے نہیں آ رہے۔ تین بجے سے بھی اپنی خان کا انتظار کر رہی ہوں"۔

روشی گجرے کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی۔

"ارے ہاں۔ بڑی ای بتا رہی تھیں کہ تمہاری خالہ آئی ہوئی ہیں۔ کہاں ہے؟ ہم نے ابھی تک انہیں دیکھا ہی نہیں۔ ویسے بیچارا ایک ان میں کیسے دولہے جائے گا۔ آج تک تو تمہارے خالہ ماموں کا کوئی ذکر نہیں تھا"۔ شیبو کو تعجب ہوا۔

"کل تک کیسے آج تو ہو رہا ہے"۔ وہ ایک کشن کھینچ کر دھپ سے بیٹھ گئی۔

"اسے دونوں بعد آئیں اور پھر کہاں چلی گئیں؟" سوما کو حقیقت میں سخت حیرانی تھی۔

"باری کے ساتھ سیر کیلئے گئی ہیں۔ بڑی ای بتا رہی تھیں"۔

"باری کے ساتھ؟ کیا عمر ہے ان کی؟" شیبو کی زہریلی ہنسی جیسے اچھل کے رہ گئی۔

"ماما لی بتا رہی تھیں کہ بیس پچیس سال کے درمیان ہوگی"۔ گلو نے سادگی سے کہا۔

"ارے۔ پھر باری کے ساتھ کیسے چلی گئیں؟ بابا صاحب کو پتا نہیں کیا؟"

زری نے تعجب سے سوما کی طرف دیکھا۔

"تو۔ وہ بابا صاحب کا مہمان کی مرضی کیخلاف سانس نہیں لیتا۔ انہی کی مرضی سے گیا ہوگا"۔ شیبو نے پھر مداخلت کی۔

کمرے میں لمحہ بھر کو سکوت چھا گیا۔

"ویسے دیکھنے میں کیسی ہیں؟ تم ملی تو ہو گی ان سے"۔ گلو کے اندر تجسس جاگا۔

"اچھی ہیں"۔ اس نے معصومیت سے کہا۔

"ہائے۔ پھر کیوں بھیج دیا باری کے ساتھ؟ تائی کے حسن کے چرچے تو آج تک جاری ہیں"۔ شیبو نے کن انکھیوں سے روشی کی طرف دیکھ کر گویا اسے چڑایا۔

روشی لاپرواہ انداز میں بیٹھی رہی۔

"انہیں ریسیو کرنے کون گیا تھا؟" زری نے سوال کیا۔ ایسی غیر متوقع ——— باتیں اس عمارت کے مکینوں پر اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ان طور طریقوں کے عادی تھے۔

"پتا"۔ روشی نے سوما کی قمیص کا جائزہ لیتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ وہ چند برس پہلے کیوں نہ آ گئیں۔ شاید بابا ماموں مان جاتے"۔ شیبو ہنسی۔

روشی کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو گیا۔

"مگر اب تو وہ ہاری کے ساتھ سیر کرنے جا چکی ہیں۔" وہ مزید گویا ہوئی۔

"عصمہ۔ چاہا دانی ہے۔" زری نے جمائی لی۔

روشی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ گلو نے لپک کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"عقل والے تم حد کرتی ہو۔ کیا ضرورت ہے اس طرح کی باتیں کرنے کی؟"
گلو نے ناراضگی سے کہا

"تو... میں نے کیا کہا ہے۔ یہی تو کہا ہے کہ خالہ ہاری کے ساتھ سیر کرنے چلی گئیں۔" عصمہ کی بے حسی قابل دید تھی۔

"بُری بات ہے تم اسے خوامخواہ رلا رہی ہو۔" گلو نے ملامت کی۔

"وہ تو اسے کسی اور بات پر آ رہا ہے۔" ان کے طنز بدستور تھے۔

روشی جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تولیہ پرس پر ڈالا اور ہاتھ میں لئے لئے باہر نکل گئی۔

"نان اسٹاپ کا بھی کوئی اسٹاپ ہوتا ہے۔" وہ اس سے برآمدے میں ہی ٹکرا گیا۔

"میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔" وہ غرائی۔

"خالہ کو کہاں لے گئے تھے؟" وہ ادھر ہی سے پوچھنے لگی۔

"کہیں بھی۔ خیریت؟" وہ حیران ہوا۔

"اور کوئی نہیں تھا انہیں لے جانے کیلئے۔ مگر تم جو ہر جگہ مفت خدمات کے نوکرے اٹھا کر پہنچ جاتے ہو۔ وہ میری خالہ ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ان سے بے تکلف ہونے کی۔"

"میں نے کب کہا میری خالہ ہیں؟ یوں بھی خوبصورت لڑکی کو چھوٹتے ہی "خالہ" بنانے والے کا ذہنی توازن درست نہیں سمجھا جاتا۔"

"شٹ اپ۔ تمہیں کیا پڑی ہے بے عزت کرنے کی کہ وہ خوبصورت ہیں یا بدصورت؟" وہ بھڑک گئی۔

"آپ کو اتنا غصہ کس بات پر ہے کہ آپ کی خالہ میرے ساتھ سیر پر کیوں گئیں؟"

"تو اور کیا۔" وہ اسی انداز میں بگڑ کر بولی۔

"مگر میں انہیں پکڑ کر تو نہیں لے گیا۔ وہ اپنی خوشی سے میرے ساتھ گئیں۔ باباصاحب کی اجازت سے۔" اس کا لہجہ بظاہر سادہ مگر عزائم بہت شریر تھے۔

"ہونہہ۔ پکڑ کر۔ یہ صلاحیت تم میں؟" وہ طنزیہ بولی۔

"پکڑنے کیلئے کوئی تیار ہو تو اس صلاحیت کا مظاہرہ ابھی بھی کرسکتا ہوں۔" اس کی شریر مسکراہٹ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"بس تم باباصاحب کو ہی پٹاؤ۔ تمہاری قسمت میں یہی ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"یہ کام تو میں بخوبی کر رہا ہوں۔ کوئی اور حکم؟"

اس کی مسکراہٹ بدستور تھی۔ وہ باہر نکلی اس کمرے کی سمت بڑھی جہاں ماہین کو ٹھہرایا تھا۔

ماہین کا انگ انگ حسن سے چور تھا۔ پسینے میں بھیگے ہوئے کپڑے اس کے بدن پر چپکے ہوئے تھے۔ چہرہ دھوپ کی تپش سے گلنار ہو گیا تھا۔

سیر اگرچہ بہت دلچسپ تھی۔ سرسبز کھیت، دیہات، دیہاتی عورتوں سے گپ شپ مگر بہرحال وہ بہت تھک گئی تھی۔

اس نے وارڈروب سے سفید گلابی پھولوں کا ہلکا پھلکا سوٹ نکالا اور نہانے کیلئے گھسنے کے ارادے میں تھی کہ روشی کو دروازے پر کھڑا پایا۔

"آؤ روشی۔ وہاں کیوں کھڑی ہو؟ میں تو تمہیں دیکھنے کو ترس گئی۔" وہ مسکرائی۔

"ایسے ہی کہہ رہی ہیں۔ میرا انتظار بھی نہیں کیا اور سیر کرنے چلی گئیں۔" روشی نے شکوہ کیا۔

"ابھی یہاں تو تمہارے باباصاحب کے پروگرام چلتے ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ "آؤ بیٹھو۔"

روشی فوراً بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"چاچا تو تھے۔ وہ نہیں لے گئے آپ کو؟"

"باباصاحب نے تو آپشن دیا تھا مگر انہوں نے کوئی ردعمل ہی ظاہر نہیں کیا۔ پھر میں نے سوچا ہاری کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ بھائی صاحب کے ساتھ تو بہت تکلف رہتا۔ ویسے ہاری بہت اچھا ہے۔ ذرا بوریت نہیں ہوئی۔ بہت مزے کی باتیں کرتا ہے۔ تمہارے باباصاحب نے ہمارے لئے خیرآباد کے قدرتی سیر کا پروگرام سیٹ کیا ہے اور تمہیں بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی ہے میں سوچ رہی ہوں ہاری کو بھی لے چلیں۔"

"ہم تینوں؟؟" روشی کی حیرانی قابل دید تھی۔

"ارے نہیں بھائی صاحب بھی ہوں گے۔" انہوں نے بالوں میں کلپ لگایا۔

"چاچا؟"

"ہاں اور کون؟ ان کے ڈاک بنگلے میں رکنے کا پروگرام ہے۔"

"چاچا مان گئے؟" وہ ہنوز حیران تھی۔

"نہ ماننے کی وجہ؟ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"کمال ہے۔ میں تو جب بھی ان کے ساتھ چلنے کو کہتی تھی تو کہتے تھے۔ کیا کرو گی۔ بور ہوگی وغیرہ وغیرہ۔"

اس کی حیرانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔

"ہوسکتا ہے ایسا امکان ہو۔ جب ہی تو کہہ رہی ہوں ہاری کو بھی لے چلیں گے۔ کیوں؟"

"وہ نہیں جاسکتا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں؟" ماہین نے حیرانی سے پوچھا۔

"بابا صاحب کا اس سے بغیر گزارا نہیں"۔

"سب گزارے ہو جاتے ہیں۔ مگر میں اس کے بغیر بیر کا تصور نہیں کر سکتی"۔

روشی کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک دم ماہین کی صورت دیکھنے لگی۔

"ایسا تو قابل ذکر نہیں وہ"۔ وہ تو گوری سے ناک چڑھا کر بولی۔

"ارے نہیں۔ بڑا نائس بندہ ہے۔ لائق بھی بہت ہے"۔

"پتہ ہے بڑی جلدی گھوڑے سدھا لیتا ہے"۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"لگتا ہے بابا صاحب کا خاص ملازم ہے۔ کیوں"

"وہ ملازم تو نہیں ہے"۔ روشی نے فوراً کہا۔

"کزن ہے؟"

"نہیں"۔

"پھر کیا ہے؟" ماہین کا تعجب بھرا لہجہ فطری تھا۔

"پتا نہیں۔ بس اچھا خاصا احمق ہے۔ آپ ہاتھ لینے جا رہی ہیں"۔ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

"ہاں"۔

"پھر چائے پئیں گی؟"

"نہیں۔ ذرا آرام کروں گی۔ یہاں کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا بے وقت آرام کرنے پر؟"

"کیوں؟ آپ مہمان ہیں۔ ہمیں آپ کے موڈ کا خیال کرنا چاہیے"۔

"آپ کے سوٹ کا پرنٹ بہت پیارا ہے۔ کراچی سے لیا ہے؟" اس نے پھر بات بدلی۔

"نہیں ۔۔۔ یوکے میں ہی بنایا تھا لاسٹ ایئر۔ تمہیں اچھا لگا؟ تم پہن لو۔ ویسے میں تمہارے لئے کئی سوٹ ہیں لائی ہوں۔ اللہ کرے تمہیں پسند آ جائیں"۔

ارے نہیں پتہ آپ پہنئے۔ کوئی چیز اچھی لگنے کا مطلب لینا تو نہیں ہوتا"۔ وہ جھینپ کر بولی۔

"رہی سوٹ ہمیں پسند آنے کی بات۔ میری خالہ نے بہت محبت سے ہی پسند کیے ہوں گے وہ"۔

"سو نائس"۔ ماہین کو اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس نے روشی کے رخسار پر پیار کیا۔

"اچھا آپ آرام کیجئے۔ تھوڑی دیر بعد ملیں گے"۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اور وہاں سے کچن کا رخ کیا۔

"ماما بی۔ ہماری خالہ کیلئے آج کون سی خاص ڈش بنائیں گی؟" اس نے دو ملازم حضرات کے ساتھ ماما بی کی از حد مصروفیت دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"آپ یہاں کیسے بی بی؟ چائے پئیں گی؟" ماما بی نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں چائے تو میں خالہ کے ساتھ پیوں گی۔ آج تصویریں بنانے کا موڈ نہیں تھا تو سوچا کچن میں ہی کچھ کر لیں"۔

"اس کا مطلب ہے کھانا باہر سے منگوانا پڑے گا"۔ ہاری اسی وقت داخل ہوا۔

وہ اس کی چھوٹی سی ذاتی بیکری پر بیٹھ گئی۔

"وہ مزا کر کرنے میں لگی ہیں۔ بھی کھا کر تم بیٹھ گئیں۔ مگر ہمیں ہمیشہ جھوٹ کھانوں کی عادت ہی کھا گئی ہے"۔

"ماما کھانا کھلاؤ۔ بی بی تو شہری ہیں۔ بھلا کھانا تو میں نے ابھی تک نہیں کھایا"۔

"ہائے اللہ۔ بی بی نے دوپہر کو کچھ بھی نہیں کھایا"۔ ماما بی تو تشویش زدہ ہوئی۔

"نہیں خیر ۔۔۔ ایک دیہاتی دوشیزہ کی محبت میں سرشار ہو کر اور حسن کی روٹی کھا رہی تھی"۔

"تو آپ نے نہیں کھائی؟" ماما بی نے پوچھا۔

"بھئی یہ چارہ چارہ سا کھانا ہے مجھے بالکل بھی دلچسپی نہیں"۔

اس نے کن انکھیوں سے روشی کی طرف دیکھ کر بظاہر بڑی بے زاری سے کہا۔ روشی تو اچھی رکی سی تھی۔ اب بھی اٹھ کر منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ مگر ہاری کی سمت سے منہ موڑے ایک ہی زاویے سے بیٹھی رہی۔ وہ اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"ماما کوئی گوشت کا اچھا سا آئٹم ہو تو لانا"۔

"کوفتے اور قیمہ مٹر بنایا تھا وہ پھر کر دو"۔

"وہ بھی کھانے سے پہلے ہی مزا آ گیا۔ ویسے ماہین بی بی سے اخلاقاً تو پوچھ لینا چاہیے"۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ نہیں کھائیں گی۔ صرف چائے پئیں گی۔ تم اپنے اخلاق آپ کے لیے اٹھا رکھو"۔ وہ قدرے تیکھے انداز میں گویا ہوئی۔

ہاری اس کے انداز پر قدرے الجھا پھر بیٹھ گیا۔

"میں نہ ہوں تو دوسری بات۔ مگر میری موجودگی میں اس قدر اخلاقی دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے انداز میں تلخی تھی۔

"پتا نہیں کیا کیا ڈرامے کرتے ہیں جو خالہ اس قدر تعریفوں کے پل باندھ رہی ہیں"۔ وہ چڑ کر بولی۔

"مت اتنا کڑھا کریں۔ مزید چڑچڑی ہو جائیں گی"۔ ہاری کے لب مسکراہٹ سے متحرک ہو رہے تھے۔

"مجھے کیا ضرورت ہے کڑھنے کی۔ ہونہہ۔ تم اتنے اہم تو نہیں ہو کر تمہاری وجہ سے کڑھا جائے"۔ اس نے نخوت سے ناک سکوڑی۔

"پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں"۔ اس کی نظریں بھی مسکرا رہی تھیں اور ہونٹ بھی۔

"اور سنو"۔ وہ تحکمانہ گویا ہوئی۔

"جی حکم"۔

"ہمارا خیر آباد جانے کا پروگرام سیٹ ہو گیا ہے خالہ تم سے چلنے کو کہیں تو انکار کر دینا"۔

"جی بہتر۔ پھر تو آپ کے ذہن سے بوجھ اتر جائے گا نا؟" اس نے آواز مزید دھیمی کی۔ ماما کھانا لگا کے ٹرے اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔

"ابا!" اس کے بڑے بیٹے نے اسے مخاطب کیا۔

"کیا ہے ہے۔ اب کیا رات کو بھی پیسے چاہئیں؟" اب تو اسے بات بات پر جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔

"باہر ایک آدمی آیا ہے۔ رکشے میں۔ تمہیں بلا رہا ہے۔"

"کون آ گیا ہے بھائی!" وہ ورق ایک طرف رکھ کر پاؤں میں چپل ڈالنے لگا۔

"سوکھا سا ہے۔ بھولے دودھ والے جیسا۔ ابا۔ دودھ والے سوکھے بھی ہوتے ہیں؟"

"چل ہٹ ادھر سے۔ افلاطون کی روح۔" وہ جھڑک کر کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ سامنے رکشے میں عارف کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

"خیر تو ہے بھائی؟"

"خیر ہے۔ تکلف نہ کر۔ رکشے میں بیٹھ جاؤ۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

"ابھی تو آیا ہوں۔ اب کہاں جانا ہے؟"

"انہیں اور خون کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"مگر اب ہمت نہیں ہے بھائی۔" اس نے معذرت کی۔

"ایسی آسامی روز نہیں پھنستی۔ تیری تو قسمت زوروں پر ہے۔ خون تو بنتا ہی رہتا ہے۔"

"یقین کرو بھائی ذرا ہمت نہیں ہو رہی۔" اس نے لاچاری سے کہا۔

بالو نے یونہی تجسس میں پردے کی اوٹ سے جھانکا تھا کہ ابا سے کون ملنے آیا ہے؟

سعید نے ایک دم پردہ ہٹا دیا تھا۔ جیسے بہن کو تنگ کر رہا ہو۔

بالو فوراً پلٹ گئی۔

ابا نے دیکھ لیا ہو گا تو بہت بگڑیں گے۔ اس کا جی دھک سے رہ گیا تھا۔

"بے وقوفی مت کرو۔ بیٹیاں نہیں بیاہنی تم نے؟" اس نے گہرا کش لگایا۔

"ایک ہی بیٹی ہے میری۔ اللہ مدد کرے گا۔" اس نے اب بھی اسی بے زار لہجے میں جواب دیا۔

"کر تو رہا ہے اللہ مدد۔ ارے بھائی تجھے سمجھ نہیں تو کتنا بڑا نقصان کر رہا ہے اپنا۔ ہمدردی میں آیا ہوں تیری۔ اس لال مظفر کو ذرا تازہ مال کی آسامی مل گئی تو تیرا دھندا مندا ہو جائے گا۔ آگے کی فکر کر۔ مال بنا۔ خون بھی بن جائے گا۔"

"ابھی تو میں نے کھانا بھی نہیں کھایا پیٹ بھر کر۔" اس نے تھکے ہوئے اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"عارف یار۔ مجھے چکر آنے لگے ہیں۔ کل پوری ابکائی تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سیٹھ کہہ رہا تھا کہ سست ہو گیا ہوں۔ فارغ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ خون روز تو نہیں دیا جاتا پر روٹی تو روز چاہیے۔"

"جب ہی تو کہہ رہا ہوں۔ آ جا۔ مہینے میں چار دفعہ خون بیچا کر۔ باقی دن آرام سے کھایا کر۔ چل شاباش آسامی بہت پریشان ہے۔ اس وقت ہماری مٹھی میں ہے۔ ارے لکشمی برس رہی ہے تیرے سر پر۔ چل بیٹھ شاباش۔"

"اچھا میں ذرا گھر والی کو بتا دوں۔"

"ہاں ہاں۔ مگر جلدی۔" اس کی نظریں پردے کے اس پار کچھ کھوج رہی تھیں۔

ماما جی نے اسے رات کا کھانا چنے جانے کی اطلاع دی اور اپنے ساتھ آنے کو کہا۔

وہ خاصی دیر سے ایک میگزین کی ورق گردانی میں مگن تھی۔ فوراً ماما کے ساتھ چل پڑی۔ ماما نے اسے بتایا تھا کہ کھانا سب لوگوں کے ساتھ ہو گا۔ بہت تجسس اور اشتیاق کے ساتھ اس نے ہال میں قدم رکھا تھا۔

اوہ۔ جیسے کسی دعوت کا منظر تھا۔ اچھی اچھی صورتوں والی خواتین، آنچل لہراتی لڑکیاں۔ بارعب اور قد آور مرد، معزز خواتین۔ فرشی دسترخوان تھا۔ سارے ہال پر بڑی امی (عالم آپا) کا کنٹرول دکھائی دیتا تھا۔

اس نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔

جس کے جواب میں سلام کے ساتھ ساتھ کچھ سرگوشیاں بھی ابھری تھیں۔

"آؤ بیٹا ادھر بیٹھو میرے پاس۔" بڑی امی نے اپنے پاس جگہ دی۔

"روشی کہاں ہے؟" انہوں نے نظر دوڑائی۔

"آ رہی ہیں — میں نے کہہ دیا ہے۔" ماما نے کہا۔

"یہ میرے بھائی زوار کی بیگم شفیقہ ہیں۔" انہوں نے دائیں طرف بیٹھی ایک سونے میں لدی پھندی خاتون کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ روشی کی سب سے بڑی پھوپھی ہیں رضیہ۔ یہ ان سے چھوٹی ہیں نزہت اور یہ منجھلی پھوپھی جہاں آرا ہیں۔" انہوں نے بائیں طرف بیٹھی خواتین کی طرف اشارہ کیا۔ "سب سے چھوٹی پھوپھو امریکہ میں ہوتی ہیں اور یہ میری چھوٹی بھاوج نعیمہ ہیں۔ اور یہ ان سے بڑی بھاوج سائرہ ہیں۔"

ابھی تعارف آدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ ماہین چکرا کر رہ گئی تھی۔

"ہم سب ساتھ رہتے ہیں۔ میری بھاوجیں بھائی کیونکہ بابا صاحب ہمارے حقیقی چچا بھی ہیں اور ادھر یہ میری دیورانی ہیں۔ روشی کی چچی۔ بصیر چچا کی بیگم ارجمند۔ گھر کے بڑوں کا تعارف تو میں نے کرا دیا ہے۔ اب لڑکیو اپنا تعارف کراؤ۔" وہ مسکرائیں۔

سب اپنی اپنی ماؤں کی طرف اشارہ کر کے حوالے کے ساتھ ساتھ اپنا نام بتانے لگیں۔

تعارف کے مرحلے میں ہی ماہین "بیزار" ہو گئی۔

"ہمارے ہاں لڑکے لڑکیوں کی بے تکلفی پسند نہیں کی جاتی۔ گھر میں آتے جاتے بات چیت کرتے ہیں مگر کچھ حدیں قائم ہیں۔ بڑے ہونے پر نہ ساتھ کھیلتے ہیں نہ ساتھ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں۔ نہ بلا ضرورت لڑکیوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ یہ بابا صاحب کے اصول ہیں۔ ویسے ہم افغانی ہیں۔ مگر ہمارے پچھلے مدتوں یوپی میں رہے ہیں۔ میرا ایک بیٹا انیق اور اس

"پھر سے اس پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ بس ہم تمہیں اپنے پروگرام میں دیکھنا پسند نہیں کرتے"۔

"یاد رکھیے گا اپنی ہی کہی بات" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"ہم کچھ نہیں بھولتے" وہ بڑے ناز و غرور سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماما" اس نے نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے ماما جی کو مخاطب کیا۔

"جی خان؟" وہ بڑی شفقت سے مسکرا کر متوجہ ہوئی۔

"اندر ایک غزل جوش مار رہی ہے کہیں پسلیاں توڑ کر باہر نہ آجائے۔ حلق سے نکال دوں؟"

"جی!" ماما جی ہنسنے لگی۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

وہ گنگنایا۔

"میری ہانڈی سے تو ہرگز نہیں اٹھ سکتا۔ اس لئے کہ ہلکی آنچ پر پک رہی ہے" وہ مسکرائی۔

اس نے کھا جانے والی نظروں سے ماری کی سمت دیکھا تھا جو بڑی معصومیت سے دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

بعض اوقات بہار کی دعا مانگی جائے تو آشیانے کو بھی خبر نہیں رہتی۔

بارش کی دعا مانگو تو وہ جل تھل ہوتا ہے کہ چھت ٹپکنے لگتی ہے۔

اس کی خوشحالی کا بھی ایسا ہی مزاج تھا۔

وہ اپنے وجود کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو در و دیوار سے خوشی و طمانیت کی مہک آئی۔

آج اس کا عرصے سے بیمار بچہ محلے کے ہم عمر بچوں کے ساتھ ہڑبونگ میں مگن تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط باپ کی سمت دوڑائی پھر لاپرواہی سے سامنے کھڑے بچے کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر گرا دیا۔ بچوں نے سرکس میں نعرے لگائے اور گھر سر پر اٹھا لیا۔

"کم بختو! چپ ہو جاؤ۔ چلو رات ہو رہی ہے۔ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ او سعید چل ایک طرف بیٹھ۔ دیکھ نہیں رہا باپ تھکا ہوا آیا ہے"۔

اس کی بیوی کی ڈانٹ پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ بچے اس کے تیور دیکھ کر ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔

"چلو تم منہ ہاتھ دھو لو۔ آج قیمہ کریلے پکائے ہیں"۔

وہ ہاتھ منہ دھونے نل کی طرف بڑھ گیا۔

اس کی بیوی بچی کو تاکید کرنے لگی کہ وہ جلدی سے کھانا لے آئے۔

وہ کاندھے پر پڑے رومال سے ہاتھ منہ پونچھتا واپس پلنگ پر آ بیٹھا تھا۔

"تمہاری صحت کو دن بدن گھن لگتا جا رہا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو تو دکھاؤ۔ مجھے بڑی فکر رہتی ہے"۔ اس نے اکتائی ہوئی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا تھا۔

"دکھاؤں گا ڈاکٹر کو بھی" وہ کہتے ہوئے جیب میں جھانک کر پیسے نکالنے لگا۔

"لے یہ رکھ لے، دو ہزار ہیں" اس نے رقم بیوی کی طرف بڑھا دی۔

"دو ہزار!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ایڈوانس لیا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ مزدوری ہے"۔

"اتنی مزدوری؟ کیا حکومت نے مزدوری بڑھا دی ہے"۔ وہ خوشی کی بجائے حیرت میں مبتلا تھی۔

"ہم حکومت کے نوکر تھوڑا ہی ہیں"۔ وہ پر مزاح انداز میں کہہ رہا تھا۔

"سیٹھ اتنا مہربان ہو گیا؟" وہ کچھ الجھن میں تھی۔

"تجھے نہیں چاہئیں تو واپس دے دے پر کسی بات پہ اصرار مت کر"۔

وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ مجھے کیا اعتراض ہے اگر تم پہلے سے کہیں زیادہ محنت کرتے ہو۔ برسوں کے بیمار لگتے ہو۔ دال کھا لو میں تمہارا سر دبا دوں گی۔ اور دیکھو اپنا خیال رکھا کرو۔ میرے منہ میں خاک۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو یہاں کون بیٹھا ہے ہمارا"۔

بانو نے سلور کی ٹرے میں پتیلے سے کھانا سجا کر باپ کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"اگر تم کہو تو مشین اٹھا لوں۔ بانو اور میں سلائی کا کام پکڑ لیں گے تو تمہیں اتنی محنت نہیں کرنی پڑے گی"۔

"پہلے قرضہ اتر جائے۔ پھر کسی دماغ کو کچھ آرام ملے۔ بہت ذلیل کرنے لگے ہیں لوگ۔ اسی طرح ذلیل ہوتے رہے تو بچی کیلئے رشتہ کہاں سے لائے گی۔ انسان کی تھوڑی بہت عزت ہو تو ایسے کام آسان ہو جاتے ہیں"۔ اس نے بڑی گھمبیرتا سے بانو کو دیکھا۔

بات عورت کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ گہری سانس لیکر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ ہوگی ماں نے بیٹی پانچ تولے زیور کے ساتھ بیاہی ہے تب سے وہ ہماری کھوج میں پڑی ہے۔ بچی کیلئے کچھ جوڑا کچھ بنایا"۔

"کسی کو ہم سے مطلب۔ کیوں میل جول رکھتی ہو ایسی عورتوں سے۔ یہ عورتیں ہی ہیں جو مردوں کو حرام کمائی کی طرف دھکیلتی ہیں"۔

"میں کب جاتی ہوں۔ کوئی خود آجائے تو گھر سے نکالا تو نہیں جاتا"۔ وہ نرمی سے بولی۔ اب وہ اس کی ترشی کے جواب میں بڑی دھیمی رہتی تھی۔ مرد کمانا ہو تو اور حاوی ہونے لگتا ہے۔

کی بیوی بچے سوئٹزرلینڈ میں رہتے ہیں۔ ایک اور ہماری بہو سیب ہے۔ اس کا میکہ پشاور میں ہے۔ آج کل گئی ہوئی ہے۔ بہت بڑی اللہ رکھی کی بہو ہے"۔

"ہائے خالہ! مجھے آپ پر ترس آرہا ہے۔" روشی کب سے دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

ماہین مسکرادی۔

"مجھے اس میں ترس آنے کی کیا بات ہے۔ اتنا بڑا کنبہ تو قسمت والوں کا ہوتا ہے"۔ سائرہ ممانی جن پہ ابھی ہو رہی تھی نے خاصی ناگواری سے کہا۔

"ہم تو آپ لوگوں میں گھل مل گئی تھیں۔ سب پیارے تھے"۔ ماہین نے اتنی دیر میں پہلی بات کی۔

"بجو" امید ممانی نے بڑی امی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"نازنین کی بات کر رہی ہے"۔

"اوہ" حاضرین میں سے بہت ساری "اوہ" کی آوازیں بلند ہوئیں۔

"اچھا بھئی چلو۔ کھانا شروع کرو"۔ بڑی امی نے سب کو کھانے کی طرف متوجہ کر دیا۔

وہ سب کی سب بڑے صبر سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر اشارہ ملتے ہی جیسے ٹوٹ پڑیں۔

"آپ پڑھتی ہیں؟" زری سے سوال کیا۔

"جی۔ ایم اے کر رہی ہوں"۔

"پھر تو ہمارے پاس آجائیے گا۔ دیہاتی خواتین کی ایک قطار کھڑی ہے۔ آپ کو کام پر لگا دیں گے"۔ بجو مسکرائی۔

"ہمارے پاس یہاں ہر چیز ہے۔ ہر رشتہ ہے۔ وکیل بھی گھر کا ہو جائیگا۔ ہمارے ہاں ماشاءاللہ اچھے لڑکے ہیں مگر کوئی بھی وکالت کی طرف نہیں گیا۔ کچھ بزنس کر رہے ہیں، کچھ میڈیکل میں ہیں۔ زیادہ کا رجحان سول سروس کی طرف ہے"۔ بجو بولیں۔

"تو کیا ان کے ساتھ ان کے میاں کو بھی یہیں رکھو گی؟" شیبو کی رگ پھڑکی۔

"میاں؟ کیا شادی شدہ ہیں؟" چند حیرت آمیز آوازیں ابھریں۔

"ابھی نہیں تو ہوں گی۔ یہ مطلب ہے شیبو کا"۔ سائرہ ممانی نے اپنی عقل سمجھ کے مطابق بات کی۔

محفل میں سناٹا سا چھا گیا۔ بچے بچیوں کی کھلکھلاہٹ بہت محسوس ہونے لگی۔

"سنا تھا تمہارے والد بھی آ رہے تھے؟" بڑی امی نے فوراً موضوع بدل دیا۔ اس کی نظر ان پر پڑی تو وہ لڑکیوں کو احتجاجی انداز میں گھور رہی تھیں۔ چہرے کی ساری ملاحت غائب ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"جی تین چار روز میں آئیں گے"۔ وہ ایسے ہو گئی جیسے اس نے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔

"وطن مستقل کب آنے کا ارادہ ہے؟" انہوں نے عجب شوشہ ڈال دیا تھا۔

"ابھی تو کوئی ارادہ نہیں۔ بزنس کا پھیلاؤ ادھر ہی ہے"۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھایا۔

"خالہ جانی۔ میں آپ کے ساتھ ہی سوؤں گی آج۔ رات کو باتیں کریں گے"۔ روشی نے کہا۔

"کیوں پریشان کرو گی مہمان کو۔ ویسے بھی بے چاری کی نیند پوری نہیں ہوئی"۔

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ روشی کی موجودگی سے دل لگے گا"۔ ماہین نے روشی کی تائید کی۔

"بابا صاحب پسند نہیں کرتے"۔

"نہیں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں"۔ ماہین حیران ہوئی۔

"بس بابا صاحب کے اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ ان کی بات کے آگے کسی کی بات نہیں ہوتی"۔ بڑی امی کے لہجے میں نصیحت تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ ذرا سی دیر تک باتیں کریں گے"۔ وہ لاپرواہی سے بولی۔

"ماما۔ یہ دو بار گئے ہوئے تھے آ گئے؟" بڑی امی نے ملازمہ کو مخاطب کیا۔

"جی۔ پتہ کرتی ہوں"۔ وہ باہر نکل گئی۔

ماہین کے ہونٹوں سے گلاس لگا تھا۔ بڑی امی اس کی نظر عالم جب کی طرف تھی۔ وہ مخمصے سی گئی۔

وہ ششدر نظروں سے روشی کو دیکھ رہی تھیں۔

☆—☆—☆—☆—☆

ایک سنسناہٹ سی ماہین کے وجود میں دوڑنے لگی۔ اس نے فوراً اپنی نظریں پلیٹ پر مرکوز کر دیں۔ مبادا بڑی امی یہ جان جائیں کہ وہ ان کی "حرکت" دیکھ چکی ہے۔

روشی کے وجود پر ایک مکمل سناٹا طاری ہو چکا تھا۔

اف۔ کس قدر گھٹن ہے یہاں۔ اور معصوم سی روشی جیسی ماں کے یہاں "آمرانہ" کے زیرِ سایہ کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ پاپا، بھائی اور جواد کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ مگر انہیں اپنی کنسٹری اور جواد کو اپنے جھمیلوں سے فرصت ہی کب ہوگی۔ میں اگر اسے ساتھ لے جانا چاہتی تو یہ لوگ کبھی بھی لے جانے نہیں دیں گے۔

کاش اس کی شادی کہیں بیرونِ ملک ہو جائے اور جلدی ہو جائے تاکہ اس زندان سے چھٹکارا ملے۔ اسے تو یہ سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی تھی کہ یہاں سے واپسی کے بعد وہ ایک لمحہ بھی خوشی اور سکون سے نہ رہ سکے گی۔ رہ رہ کر اسے روشی کی ندیدوں جیسی حالت یاد آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ یہاں سب ہی اس طرح رہ رہے ہیں۔ مگر ان سب کی آنسو پونچھنے والی مائیں تو ہیں۔ یہ بے ماں کی بچی اس پر دادی بھی نہیں ہیں۔ دادی بھی ایک نعمت ہوتی ہے جو اپنے پوتی پوتے کے لئے خالص اور بے کھوٹ محبت رکھتی

ہے۔ اس نے کھانا ابھی نہیں کھایا ہوا تھا۔

"آپ اب بے چین سی ہوں گی تو یہ برتری کا احساس ہو رہا ہوگا۔ ان کانوں کے بیچ"۔ مبین نے مسکراتے ہوئے اس کا گلاب جیسا ترو تازہ چہرہ دیکھا۔

"ارے نہیں اس طرح کی باتیں کمپلیکس کی نشاندہی کرتی ہیں۔ زندگی با مقصد ہو تو اس طرح کی الٹی سیدھی سوچیں اٹھا نہیں کرتیں۔ ہمارے والدین بہت سلجھی ہوئی فطرت کے حامل رہے ہیں۔ امی مرحومہ گھریلو خاتون ہونے کے باوجود بہت فعال تھیں۔ یہی حال پاپا کا ہے۔ تقدیر میں مصروفیت ہے اور فطرت میں محبت۔ اس طرح کے لوگ ماحول کو خوشگوار بنا دیتے ہیں کیونکہ واضح ہوتے ہیں۔ کمپلیکس نہیں ہوتے تو اس طرح کے ماحول میں پرورش پانے کے بعد کمتری و برتری کے احساس سے الجھے رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے آس پاس رہنے والے مقامی باشندے ہم سے اس وجہ سے محبت کرتے ہیں کہ سارے ماحول سے حسن ٹپکتا ہے۔"

واقعی۔

مبین نے گہری سانس لے کر گھوگی کی طرف بڑے تشکرانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا۔

"یہ تو خیر بہت سمجھداری کی بات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تمہارے پاپا بہت قابل اور لائق انسان ہیں"۔ بڑی امی نے بھی حصہ لیا۔

ماہین کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ اسے یکدم بڑی امی اچھی لگنے لگیں جو اس کے پاپا کی تعریف کر رہی تھیں۔

"اس کا مطلب ہے بڑی تیز نظر تھی ہماری دادی جان کی۔ دو آتشی بھی ظاہر ہے ماہین آپ جیسی ہی ہوں گی"۔ حنا نے جیسے بڑی امی سے تائید چاہی۔

"بالکل"۔ دریہ پھوپھو نے جلدی سے کہا۔

"اللہ میاں کو بھی پتہ نہیں کیا جلدی تھی اتنی پیاری چیز واپس لے لی۔ ایک گھوگو (ملازمہ) کا کہنا ہے میری پیدائش سے پہلے کھانس رہا ہے بہت ہوتا"۔ روبی نے آزردگی سے کہا۔

"ہوں۔ اوں۔ بری بات اس طرح نہیں کہتے"۔ محفل کو ایک دم سانپ سونگھ گیا تھا۔ بڑی امی کی سرزنش بھری آواز سے جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو گئی۔

اچانک ماہین کی نظر روشی کی سمت اٹھی۔ اس کے ہاتھ میں نوالہ تھا۔ سر جھکا ہوا تھا اور آنسو بڑی خاموشی سے بہہ رہے تھے۔

ماہین نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گلے لگا کر خاموش کرنے کا ارادہ کیا تو بڑی امی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"اس طرح سے اور زیادہ رونا آئے گا پھر مشکل سے چپ ہو گی"۔ انہوں نے دھیمی آواز میں ماہین کو کہا۔

"روشی۔ بری بات بیٹا دسترخوان پر بیٹھ کر ایسے نہیں رویا کرتے۔ بے ادبی ہے رزق کی" چلو شاباش کھانا کھاؤ۔ تم تو بہت

پھوپھو اس کے قریب بیٹھی تھیں اسے پچکارنے اور بہلانے لگیں۔

ماحول ایک دم بدل گیا تھا۔

ہر شخص اپنی جگہ یوں خاموش تھا جیسے اس صورتحال کا وہی ذمہ دار ہے۔ ماہین جو بڑی چاؤ اور خواہش سے شاہی کھانے پلیٹ میں نکالنے بیٹھی تھی اور چٹپٹے کھانوں کی خوشبوؤں سے الگ لطف اندوز ہو رہی تھی ایک دم افسردہ سی نظر آنے لگی۔ اس کے تصور کی اڑان کھانے کے ماحول سے نکل کر گویا آرام کی خوشبوؤں سے نکل رہی تھی اور کھانا کرو اور اٹھا۔

کھانا کھا کر وہ سب نماز پڑھنے چھت پر چلی گئیں تو وہ یہ کہہ کر اپنے رہائشی کمرے میں آ گئی کہ وہ اپنے کمرے میں ہی نماز پڑھے گی اور یہ کہ جلدی سونا چاہتی ہے۔

نماز پڑھ کر اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ہر سمت نیم تاریکی اور سناٹا تھا۔ وہ دبے پاؤں پھیلا کر پورا جائزہ لیا اور یاور علی خان کے بیڈ روم میں چلی آئی اور دروازے پر دستک دی۔

"ہوں" ان کی آواز کے بجائے ہلکی سی ہنکار ابھری جو گویا اجازت تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ وا کر کے اندر چلی آئی۔

انتہائی شاہانہ انداز میں سجا ہوا بیڈ روم تھا اور بے حد وسیع تھا۔ باغ کی طرف کھلنے والے دریچے کے ساتھ ان کا بیڈ تھا اور بیڈ سے ذرا فاصلے پر ان کی رائٹنگ ٹیبل اور چیئر تھی۔ وہ وہیں مصروف تھے۔ کمرے میں لائٹ آف تھی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی کی وجہ ایک دم تاریکی نہیں تھی۔

وہ آگے نہیں بڑھی۔ دروازے کی طرف ان کی مکمل پشت تھی۔ وہ کھنکاری۔

"کون۔ روشی؟"

"جی نہیں۔ میں ماہین" وہ وہیں کھڑے کھڑے گویا ہوئی۔ وہ بہت آہستگی سے گھومے۔ "آپ اس وقت؟" ان کی آواز مدھم اور لہجہ معمول کا تھا۔

"کیا کریں۔ یہاں تو ہر بات ہی باضابطہ ہے۔ کوئی تنہا اور ذاتی بات کرنا چاہے تو کیا کرے؟" اس نے جوں ہی جگہ کھڑے کھڑے الٹا سوال جڑ دیا۔

یاور علی خان اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اسے اپنی جانب آتے دکھائی دیئے۔ وہ کچھ بھی نہیں مگر اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔

وہ اصل سوئچ بورڈ کی جانب بڑھے تھے۔ کھٹ کھٹ کی کئی آوازیں ابھریں۔ چاروں طرف لگی فینسی لائٹس روشن ہو گئیں۔ کمرا ایک دم جگمگا اٹھا۔ وہ گویا روشنی میں نہا گئی۔ ٹیبل لیمپ تو بے چارا سا لگنے لگا تھا۔

"آیئے تشریف رکھئے" انہوں نے گھومنے جاتی ٹیبل صوفے کی سمت اشارہ کیا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وہ شاید حیران ہوں گے کہ وہ آتی رات کو کیوں ان سے ملنے آئی۔ مگر وہ بلا کے پرسکون اور نارمل تھے۔ اس کے مقابل خود بھی بیٹھ گئے تھے۔ ادھ جلا سگریٹ ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور باغ میں لگے دیو قامت درخت بڑے عجیب سے دکھائی دے رہے تھے اور جب ہوا سے شاخیں

ہلتی تھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جن بھوت قدم بڑھا رہے ہوں۔ بلا کی تاریکی تھی باہر۔

"میں جو کچھ کہوں آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟" اس نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

"آپ کہئے۔ میں کوشش کروں گا کہ مائنڈ نہ کروں۔ اگر کروں بھی تو اظہار نہ کروں" انہوں نے بچا کچھا سگریٹ ایش ٹرے میں کچل کر بجھا دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ اس طرح تو مجھے اپنی بات کہنے کی ہمت نہ ہو گی؟" اس نے بے دلی سے احتجاج کیا۔

"مگر میں مائنڈ نہ کرنے کا وعدہ بھی تو نہیں کر سکتا کہ موضوع جانے بغیر اس طرح کا وعدہ بڑی غیر ذمہ داری کی بات ہو گی" وہ مسکرائے۔

"مگر سیلف کنٹرول کے جب آپ اتنا کر بھی سکتے ہیں" وہ بھی مسکرا دی۔

"لیکن سیلف کنٹرول کا فیصلہ کرنا تو بھی بات یا موضوع کی نوعیت سے ہی مشروط ہے۔"

"اف اللہ" ماہین نے سر تھام لیا۔

"آپ بات کہئے۔ اور اس چکر میں مت پڑیئے کہ میں مائنڈ کروں گا یا نہیں کروں گا۔ جو کچھ مجھ پر گزرے گی مثبت یا منفی آپ کو کیا پتہ چلے گا؟ ہے کوئی پیمانہ؟ فرض کیجئے میں مائنڈ نہ کرنے کا وعدہ کروں اور آپ کی بات مجھے انتہائی نامناسب محسوس ہو اور میں محض وعدے کی پاسداری کی خاطر اپنی ناپسندیدگی ظاہر نہ کروں تو ایسی صورتحال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جب بات کہنے کا کوئی چارہ نہ ہو تو بات کہنے سے پہلے اپنے اندر جرأت پیدا کرتے ہیں ہر طرح کے ردعمل کا سامنا کرنے کی جرأت۔ جی۔ فرمایئے ارشاد۔"

"آپ ویل ایجوکیٹڈ ہیں۔ ماڈرن بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ آپ کو ذرا احساس نہیں کہ آپ نے اپنے بچوں کو انقلاب فرانس سے قبل کے ماحول میں قید کیا ہوا ہے۔ آپ خود کلاس ون سرکل میں موو کرتے ہیں۔ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے۔"

"یہاں کیا کمی ہے" انہوں نے رسانیت سے مگر کچھ کھوئے کھوئے ہی انداز میں کہا۔

"آپ اپنے بچوں کو کتنا وقت دیتے رہے ہیں؟" اس نے پہلو بدلا اور نکتہ اٹھایا۔

"جب وہ چھوٹے تھے تو وقت زیادہ تر ان ہی پر خرچ ہوتا تھا" ان کا انداز بدستور تھا۔

"اور اب..... اب آپ جائزہ لیتے ہیں کہ آپ کے بچوں پر تعلیم، تہذیب اور جدید تمدن کا کتنا اثر ہے۔ وہ بہترین دماغوں کے ساتھ کس درجہ اعتماد سے اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوتے ہیں؟"

"انہیں کوئی کمپلیکس نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے معاشی الجھنوں کے بارے میں صرف سنا ہے۔ اور زیادہ تر الجھنیں اسی ایک کمی کے سبب پیدا ہوتی ہیں" انہوں نے غایت درجہ استغنا سے نیا سگریٹ سلگایا۔

"مگر ایک ویل ایجوکیٹڈ اور ایک صرف 'ویل آف' یعنی امیر کبیر کا فرق آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ آپ کا خاندان بھی ہیں اور ویل آف بھی۔ اس وقت کو یاد کیجئے بلکہ اس دور کی تصاویر ہی دیکھ لیجئے جب آپ صرف دولت مند

تھے۔ اور آج خود پر نظر ڈالیے۔ بہت فرق محسوس کریں گے۔

"وہ بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں"۔ یاور علی خان نے تحمل سے بات کاٹی تھی۔

"مگر جو کچھ کتابوں اور لیکچرز سے سیکھتے ہیں۔ یہاں وہ دیا ہی کہاں رہنے دیا جاتا ہے۔ ایک ایک حرف پھونک پھونک کے اس بار نظر باد کر کے اندر داخل ہوتے ہیں"۔ وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔

پہلی مرتبہ یاور علی خان کی پیشانی کی عمودی لکیریں گہری ہوئیں۔ "میں اچھا محسوس کروں گا اگر آپ وضاحت کریں"۔ انہوں نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور بہت سرسری سا اس کی سمت دیکھا۔

"بڑی سادہ سی بات کہی تھی میں نے۔ یہاں اس ماحول میں ذاتی شعور اور جائز آزادی کے تمام دستور کالعدم ہیں"۔

"یہ ان کے حق میں اچھا ہے کیونکہ ابھی ان کا ذاتی شعور پختہ نہیں"۔ ان کے سکون میں ذرا فرق نہ آیا۔

"کیا اس کی کوئی مخصوص عمر یا زمانہ ہوتا ہے"۔ اس نے برجستہ سوال کیا۔

"نہیں۔ مگر والدین اپنی اولاد کے تمام ادوار سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں"۔

"مگر والدین"۔ وہ اپنی تکرار پر بڑے وقار سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔ مگر میں تو ہوں ناں؟" وہ قدرے جز بز دکھائی دیئے۔

"ماں تو بچے کی زندگی میں بڑی اہم ہوتی ہے۔ اس کی کمی کے ازالے کیلئے میری بہن کے پیارے بچوں کے ساتھ آپ نے کیا رول ادا کیا؟" بڑا بے رحم سوال تھا۔

"انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ انہیں معلوم ہے"۔

"کراکسویں، بائیسویں گریڈ کے افسران ہوتے ہی پر تکلف ہیں۔ خواہ باپ ہوں۔ بڑے باضابطہ اور پروٹوکول کانشس ہوتے ہیں۔ بچوں کو بھول جانا چاہیے کہ ان کا کوئی باپ بھی ہے۔ بس اس بات پر خوش اور مست رہنا چاہیے کہ وہ بڑے افسر کی اولاد ہیں"۔ اس نے ایک اور جارحانہ حملہ کیا۔

وہ خاموش رہے۔

"کچھ کہیے ناں۔ کیا سوچ رہے ہیں"۔ اسے ان کی خاموشی پر حیرانی ہوئی۔

انہوں نے بہت سا دھواں ایک وقت سے خارج کیا۔ چند لمحوں کیلئے اس کے اور یاور علی خان کے درمیان دھوئیں کے مرغولے حائل رہے۔

غبار چھٹا تو اس نے دیکھا ان کی سرخ اور بوجھل نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔

"ایک نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ آپ کسی کی وجہ سے اتنی جرأت مند ہیں کہ انا کی وجہ سے"۔

"آپ کسی نتیجے پر نہ پہنچیں مگر مجھے آپ کی قوت برداشت اور طرز گفتگو نے بہت امپریس کیا ہے"۔ وہ مسکرائی۔

"اور میں نے آپ کی ساری گفتگو سے ایک ہیڈ لائن تیار کی ہے۔ کیا آپ کو اس ہیڈ لائن سے دلچسپی ہو گی؟" انہوں نے دائیں طرف جھک کر راکھ جھاڑی۔

"اور شعور"۔ وہ ایک دم مستعدی دکھائی دی۔

"یہی کہ آپ مجھے غافل کیے رہیں اور خود غرض خود میں گن اپنی آنکھیں پر دہ اس وطیرہ منافق سے نظر چرانے والا زندہ رہنا چاہ رہی ہیں"۔

انہوں نے اسی اطمینان سے پشت صوفے کی ٹیک سے لگائی جس کا مظاہرہ وہ شروع سے کر رہے تھے۔

وہ واقعی دھک سے رہ گئی۔ حقیقتاً جب انسان کسی پر تنقیدی حملہ کر رہا ہوتا ہے تو اس کے جذبات بڑے آزادی سے مظاہرے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ مگر سامنے وہ شخص ماحول و الفاظ کو نظر رکھتے ہوئے خود پر کچھ پابندیاں عائد کر لیتی ہیں۔ نرم سے نرم الفاظ استعمال کرنے کے باوجود انسان چاہتا ہے کہ اس کی بات اسی تاثر کے ساتھ اس تک پہنچے جس چیز نے اس کے دل و دماغ کی دنیا میں تہلکہ مچایا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح کی لفاظی کی جنگ میں وہ کامیاب رہتی ہے۔

اگر مخاطب نے تنقیدی حملہ ظرف سے برداشت کر لیا تو طبیعت خوش ہو کر غبار نکل گیا۔

اور جو انہیں یہ حالیس تو نہایت سادگی سے کہہ دیا۔ "نہیں جی۔ آپ غلط سمجھے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے"۔

اسے بھی اسی طرح کی صورتحال درپیش تھی۔ لفاظی کی جنگ میں بلاشبہ اس کا فطری خلوص کار فرما تھا۔ اور وہ ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر اب جو انہوں نے خود اپنے لئے الفاظ استعمال کئے۔ انہیں سن کر وہ خاصی جھینپ سی گئی تھی۔

جھینپ ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک لمحے کیلئے بھی اس سے گفتگو کے دوران ہی سے غافل نہیں ہوئے تھے کہ وہ اپنی تنقید کو جائز قرار دے سکتی۔ ان کے برا ماننے کی صورت میں وہ جنگ کا فائدہ حاصل کر لیتی کہ

"دیکھا لگا ناں برا۔ ہیں جواب ہے"۔ مگر ان کی مستقل حالت سکون اسے الٹا مضطرب کرنے لگی تھی کہ مبادا وہ انہیں غلط سمجھ رہی ہو۔

"اگر میں آپ کے پیارے بھانجے کو کہیں سے ایک ماں مہیا کر دیتی تو بھی آپ کو مجھ سے شکایت ہوتی"۔ وہ اسے خاموش پا کر گویا ہوئے۔

"آپ کو تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میں نے بچوں کو اپنے ذاتی مقاصد کی نذر نہیں کیا۔ جی؟"

"آپ کا بہت شکریہ"۔ وہ شریر انداز میں زیر لب مسکرائی۔

"مگر میں یہ عرض کروں گی آپ ماں کی کمی تو کیا پوری کرتے" آپ نے تو باپ کا رول بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا۔

آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا ہوگا جو چیز میں سمجھتی ہیں میں نے نوٹ کر لیا ہے"۔

بالآخر وہ یاور علی خان کو چونکانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلنا بھول گئے تھے۔ آنکھوں کی سرخی کچھ گہری سی ہو گئی۔ "بات بات پر روشنی کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے خدانخواستہ اسے کبھی کسی وجہ سے رونا پڑا تو وہ بہت رو پڑے گی"۔

"خدا خیر کرے۔ دیا اور امبر جیسے یہاں آپ ہی کو پیش آتی ہیں۔"

"باری! آج میں خالہ سے ابھی ان باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا کالج جانے کو۔"

"مگر میں آپ کے بدلے کالج نہیں جا سکتا۔ مجھے افسوس ہے۔" وہ دوبارہ کتاب سے آنکھیں لگا کر بیٹھ گیا۔

"کوئی بات بھی تو سن لیا کرو۔" وہ جھلائی۔

"اچھا! ابھی بات آدھی تھی۔ لو وہ فرمایئے۔"

"پتا ہے کیا، تم گھر میں شور ڈال دو۔ مجھے ویٹنگ اور ری ہرسل سے۔"

"یعنی مجھے اب (معاذ اللہ) ہی کا عہدہ بھی تفویض فرما رہی ہیں آپ؟"

"مت بولا کرو اتنی مشکل اردو۔ میرے دماغ میں گرہیں پڑتی ہیں۔" وہ جھلائی۔ "بس اتنا سا کام ہے کوئی بڑا کام نہیں ہے۔"

"آپ کے تو سارے کام ہی اتنے سے ہوتے ہیں۔ یوں تو میں آپ کو زہر لگتا ہوں۔ مگر کام پڑتے ہی آپ کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہوں۔ پھر کام نکلتے ہی آنکھیں پھیرتی ہیں کر طوطے احتجاجی تحریک شروع کرنے کا پروگرام بنانے لگے ہیں۔"

"تمہیں تو پھر کیا ہر وقت تمہارے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہوں؟" وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔ باری کی باقی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔

"کیسے دیوانے کے خواب دکھا رہی ہیں آپ۔" وہ کتاب بالکل چہرے کے قریب لے گیا۔

"باری۔ سمجھو ناں۔ پرابلم یہ ہے کہ صرف بابا صاحب اور بڑی امی کا مسئلہ نہیں بلکہ آج کل تو بیا بھی گھر ہی ہیں۔ بس میرا دل نہیں چاہ رہا کالج جانے کو۔ باری پلیز۔"

"میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اصولی مدد کر سکتا ہوں۔" اس کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"بڑے آئے وہاں سے اصول پرست۔ اچھا اگر میں منہ میں انگلی ڈال کر قے کروں پھر تو کہہ دو گے؟"

"مگر اتنی صبح صبح نکلو گی کیا؟ ناشتے کے بعد یہ پروگرام بنانا ہے نا۔" اس نے انگلی میں تھوک لگا کر کتاب کا صفحہ پلٹا۔

"ویسے آپ کی چھٹی بے کار ہی جائے گی۔ آج تو میں آپ کی خالہ کو نہر والا علاقہ دکھانے لے جاؤں گا۔"

"تو پھر کیا ہوا، میں بھی چلوں گی۔" وہ چہکی۔

"نہیں بھئی، سارا موڈ خراب ہو جائے گا سیر کا۔ وہ اتنی سیریس اور نپی تلی باتیں کرنے والی اور کہاں آپ کی ایک زمین کی ایک آسمان کی بے جا گفتگو۔ کیا باتیں کرتی ہیں۔ واہ۔"

"واہ۔" اس نے نقل اتاری۔ "خالہ میری ہیں۔ باتیں تم سنو گے؟" وہ طیش میں آ گئی۔

"اگر آپ کہیں تو آپ کو دو چار سنوا سکتا ہوں۔" اس نے سادگی سے آفر کی۔

"دیکھو اب مجھ سے بات کرنا۔" وہ پاؤں پٹختی آگے بڑھی۔

"اگر کبھی ایسی غلطی سرزد ہو گئی تو کیا ہو گا؟" وہ مسکرایا۔

"خون پی جاؤں گی تمہارا۔" وہ غرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ میں شام کے اخبار میں آپ کی یہی کہانی شروع کرا دوں گا قسط وار۔ "آدم خور بننے سے پہلے" کیسا عنوان ہے؟"

"بالکل تمہاری طرح بدشکل۔" وہ رک کر پھنکاری۔ باری بہت کوشش کے باوجود اپنے بلند قہقہے پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔

ہال کمرے میں محفل رچ گئی تھی۔

وقت پر سونے کی وجہ سے وہ علی الصبح بیدار ہو گئی تھی۔ نماز پڑھی کیونکہ سورج طلوع ہونے والا تھا اس لیے پہلے نماز بعد میں صبح کے غسل کا اہتمام کیا۔

کلف لگے شلوار کمان کے کھڑکھڑاتے ہوئے سفید کرتا شلوار اور چوڑے سے دوپٹے میں ملبوس جیسے عمر کے اہتمام کا حصہ رہی تھی۔ ہال سو کھتے ہی عمارت کے بائیں طرف کمروں کی طرف آ گئی تھی۔

ادھر کی صبح کی جاگ دوڑ اپنے عروج پر تھی۔ ٹی وی آن تھا۔ صبح کی نشریات سے بھی لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔

"یار ٹی وی کی آواز آہستہ کرو۔ ریڈیو کا بڑا اچھا گانا شروع ہوا ہے۔" شعر نے جھلا کر ہاج کو مخاطب کیا تھا۔ وہ ریموٹ لیے بیٹھا تھا۔

"آپ کی فرمائش" سن رہا ہے۔ غدار کہیں کا۔" ندیم نے کھچائی کی۔

"او پہلے رنگے کی تو کہیں سکھ رہے ہو۔ حب وطن؟ کشمیر میں جا کر لڑو۔ بڑا آیا مجاہد۔ خود تو جیسے "مدینت" پر آیا ہوا ہے۔" اس نے جواباً ندیم کو رگیدا۔

"یار! کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جب ریڈیو جو کیا کرو تو انتظام کر دیا کرو۔" مجھو نے بھیا جھلاتے ہوئے ہال میں داخل ہوتے اور ضحا پر برسنے لگے۔ جوان کا ریڈیو استعمال کرتے ہوئے کئی بار بگاڑ چکا تھا۔

"بڑا اچھا۔ بدنام برا۔ کیا ضروری ہے کہ اس بار بھی مجرم میں ہی ہوں۔" وہ بے بسی کی تصویر بن گیا۔

"تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔" مجھو نے بھیا نے پر یقین انداز میں کہا۔

"کیوں۔ کیا ان سب نے "مجھوں لیگ" بنائی ہے۔ داڑھیاں رکھیں گے؟"

ندیم کی زبان پر کچھ نہ کچھ پھسل جاتا تھا اور اس کے بارے میں سب ہی کو پتا تھا کہ نمبر ایک کا فل ہے۔ بارے شجے ہوتا ہے۔

وہ بے ساختہ ہنس دی تھی۔ دھیرے سے۔ مگر امبر نے دیکھ لیا تھا بے چارا بغیر قمیص کے بے تکلف حلیے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

"شیر آیا۔ شیر آیا۔" اس نے رونی شکل بنا کر آواز نکالی۔

"آئے کا تب ہی بھاگیں گے۔" قاران تو ویسے ہی واحد مشہور تھا۔

"اگر اس کیلئے ماں کی موجودگی ضروری نہیں اور کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ پورا خاندان مل کر "بچہ" پالتا ہوا ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ اس حویلی میں موجود تمام بچوں کی مائیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کہ یہاں ماں ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"دنیا کی کوئی عورت میرے بچوں کی ماں نہیں بن سکتی۔ یہ میری محبت کی انتہا تو ہے کہ میں نے اپنے بچوں پر "دوسری ماں" مسلط نہیں کی۔ اور معاف کیجئے گا۔ آپ کو میری اولاد سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو، مگر آپ مجھ سے زیادہ میرے بچوں سے محبت تو نہیں کر سکتیں۔"

"میں اس طرح کے اعتقاد ہونے سے بھی نہیں کروں گی۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اپنے بچوں کو دوسری کی محبت کے بھروسے پہ چھوڑ دینا بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ مدت سے اپنے بچوں کو میسر نہیں ہیں۔ اب دیکھئے، ہم نے نہیں دیکھا کہ جو دو آپ سارا دن میں ایک بار بھی ملے ہیں۔ ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی۔"

"ہم عام لوگ نہیں ہیں مادام۔ اس لئے ہمارا انداز زندگی بھی عام نہیں ہے۔"

"آپ بزنس مین لوگ ہیں، یہ بھی بہت ہے مگر حکم و حکمرانی کے ساتھ زندگی کا ذائقہ کیا ہوتا ہے۔ آپ نہیں جانتیں۔ حکومت کرنے والے گھرانے کے افراد عام نہیں ہوتے ان کی سوچ بھی عام آدمی سے مختلف ہوتی ہے۔ جو اونے ہوش سنبھالنے کے بعد اب تک خود کو حکم دینے والوں میں پایا ہے۔ اس کے خون میں بھی یہی اثر ہے اور ماحول نے بھی اسے اور کر دیا ہے کہ وہ کیا ہے۔ وہ ایک وقت بھوکا رہ سکتا ہے مگر خود کو عام ماحول میں دیکھنا کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ وہ خوش ہے۔ آپ یقین کریں۔"

"میں نہیں جانتی۔ یہ محض خوش فہمی ہے۔ خاص طور پر مجھے روشی سے تو بہت ہی ہمدردی ہو رہی ہے" وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

"اور آپ کیلئے اچھی اطلاع یہ ہے کہ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ میرے بچوں کیلئے اس قدر فکر مند اور پرخلوص ہیں۔"

"تو شک تو مجھے بھی نہیں چاہیے آپ کو۔ آپ نے سنا نہیں "ماں مرے ماسی جئے"۔ یہ اور بات کہ میں ہمیشہ سے پردیس میں رہی ہوں۔ مگر فطری دلچسپی تو ہمیشہ رہی ہے۔ اپنی بہن سے، اس کے بچوں سے۔ اگر میں مستقل یہاں وطن میں ہوتی تو یہ مثل کب کی ثابت کر چکی ہوتی" وہ بڑے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

یادر علی خان مبہم سا مسکرائے۔ وہ بہت چھوٹی سی گڑیا محسوس ہو رہی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ اور گود میں ہاتھ رکھے بڑی بزرگانہ قسم کی سنجیدگی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ شانوں تک کٹے ہوئے بال دونوں طرف بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ کھلی پیشانی پر بھی دو چار لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بہت اچھے ماڈل کی بہت شاندار سی گڑیا محسوس ہوئی۔

انہیں جانے کیا کیا یاد آنے لگا۔ وجود حاضر اور دماغ غائب ہونے لگا۔

جیجی ریشمی چست قمیص میں سانچے میں ڈھلا سراپا۔

نقوش سے ذرا اونچے یا دور ذرا گھنگھریالے گچھے میں بندھا ہوا دوپٹا۔

ساس کے ٹوکنے کے باوجود اس کے دوپٹے کو کھینچا نہیں آیا تھا۔

بلا کی فیشن ایبل۔

غضب کی جاذب۔

بے حد طرح دار۔

جس کی معصوم سے معصوم ادا بھی دو دھاری تلوار تھی۔

ان کی سرخ آنکھیں بے خیالی میں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر باقی باتیں آپ سے پھر کروں گی۔"

وہ چونک پڑے۔ "یہی کچھ کہا آپ نے؟" ان کے تاثرات بدل گئے۔ بہت کھردرا اور خشک لہجہ تھا۔

"جی نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کہا" وہ جلدی سے کہتی اور شب بخیر کہہ کر باہر آ گئی۔

مادام کی اسسٹنٹ سرسوتی بیچ راہداری میں بچھے فرش پر اپنی چادر بچھائے نائٹ ڈیوٹی پر مشغول تھی۔

جانے کیوں اسے سامنے پا کر ایک خیالی وہم کی صورت اسے پریشان کرنے لگا۔ یہ سونے کے بجائے جاگتی ہوئی بھی پائی جا سکتی تھی۔

اسے اس طرح رات کے اس پہر یادر علی خان کے کمرے میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ محلاتی سازشیں تو یوں بھی بڑی مشہور ہیں۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے بڑے قریب سے سرسوتی کا چہرہ دیکھا۔

آیا وہ سچ مچ سو رہی ہے۔ کہیں بن تو نہیں رہی؟

"یہ واقعی سو رہی ہے۔ یہ اسی طرح گھوڑے بیچ کر سوتی ہے۔ اب تو صبح ماما بلی دو چار ٹھوکریں مار کر ہی اٹھا سکیں گی آپ فکر مند نہ ہوں" ہاری کی دھیمی آواز اس کے کان میں آئی تھی۔

وہ چونکی۔ پھر خفیف سی ہو کر رہ گئی۔ "تم جاگ رہے ہو ابھی تک۔ اور دراصل میں۔ یادر بھائی سے"

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" اس نے جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" وہ اس کی سمت دیکھے بنا بولی تھی۔

"اچھا تو پھر، شب بخیر"۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا ایک موڑ پر غائب ہو گیا۔

"ہاری!"

"یا الٰہی اتنی صبح صبح"۔ وہ برآمدے کے انتہائی کونے میں ایک کتاب لئے بیٹھا تھا اور وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کونے میں بھی پہنچ گئی تھی۔

"ہاری... پلیز ہیلپ می۔"

تب وہ مسکراتی ہوئی باقاعدہ اندر آ گئی۔

"السلام علیکم!" اس نے بڑے اعتماد سے حاضرین کو سلام کیا۔

جو جہاں تھا وہیں جم گیا تھا۔ چھوٹے بھیا کو تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے آدھے چہرے پر کریم کا جھاگ لگا ہوا تھا۔

ثمر کو "ریچ" بھول گیا۔

جو کندھوں پر تولیے ڈالے گھوم رہے تھے۔ انہوں نے تولیے اچھی طرح لپیٹ لئے۔

"معاف کیجئے گا۔ مجھے اس طرح کی صورتحال کا اندازہ نہیں تھا۔" وہ واقعی شرمندہ ہو گئی۔

"میں تو جواد کے پاس آئی تھی۔ نظر نہیں آ رہا وہ۔" اس نے طویل و عریض ہال پر نظر دوڑائی۔

"وہ ... سیٹھ سعید بننے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ وہ سیل پھول آنے کے وہ سیل جانے کے۔" ندیم نے تفصیلاً جواب دیا۔

"اوہ ... مارننگ واک ... گڈ۔" اسے بھائی جی کی صحت مندانہ عادت جان کر خوشی ہوئی۔

"کتنے بجے تک آ جاتا ہے؟" اس نے ندیم ہی کو مخاطب کیا۔

"آتا ہو گا۔" وہاج نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔

"آپ؟"

"خالہ ہوں جواد کی۔"

"خالہ!" وہ چار حیرت آمیز آوازیں بلند ہوئیں۔

"ہاں بتایا تھا جواد نے کہ اس کی خالہ آئی ہوئی ہیں۔" چھوٹے بھیا نے کہا۔

"مگر ہمیں تو معلوم نہیں تھا۔ خیر۔" ثمر نے شانے اچکائے۔

"ایک بات بتائیے۔ کیا ہم سب کو بھی خالہ ہی کہنا چاہئے؟" وہاج کو بہت زیادہ تشویش ہوئی۔

"ویسے یہ اس حویلی کا سب سے بھیانک حادثہ ہے۔" منہاج نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔ چھوٹے بھیا اسے گھور کر رہ گئے۔

"شیو مکمل کر لیجئے۔ کہیں بھول گئے تو ہم سب کو بھی پھنسوا دیں گے۔ کل کو فیشن چل پڑے گا۔ آدھی شیو کا۔" ندیم ان کے کان میں منمنایا۔

وہ فوراً کھسیا کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔

"آپ جو چاہے کہیے۔ جواد آپ کے برادر عزیز ہیں۔ اصولاً تو آپ سب مجھے خالہ ہی کہیں۔" اس کی ہنسی میں بلا کا اعتماد تھا۔

"آپ بالکل مس فٹ ہیں اس رشتے کیلئے۔" امبر نے بڑی تیزی سے اظہار ناپسندیدگی کیا۔

"مگر اتنے 'بڑے' ہونے کے باوجود آپ لوگوں کا یہ حال ہے؟" اسے بہت ہنسی آ رہی تھی۔

"اسی وجہ سے یہ حال ہے۔" منصور نے بہت سوچ سمجھ کر حصہ لیا۔ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"آپ پارلر ہیں۔ اوہ ... سوری تو ٹھیک کر رہے ہیں۔" ندیم آگے بڑھا۔

"این۔ او۔ سی؟" اس نے حیرت سے پوچھا تاکہ کچھ تو گفتگو کی شروعات ہی ہو جائے۔

"ہاں صاحب جاری کرتے ہیں۔ آپ کو چاہئے تھا کہ تاج کی شکل میں اوپر پہنچ جاتیں۔ لیکن ہمیں بھی اطمینان رہتا کہ کوئی غیر قانونی ملاقات نہیں ہو رہی۔" ندیم نے اسے بیٹھنے کیلئے موزوں جگہ پیش کیا۔

"شکریہ۔" وہ صوفے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔

"میرے خیال میں این او سی کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا ہے جو ریاست کے شہری ہوتے ہیں اور ریاست سے شہریت کے حقوق خصوصی طور پر حاصل کرتے ہیں۔"

"پولیس ..." ثمر نے حیرت سے ندیم کی سمت دیکھا۔ اس نے بھی شانے اچکا دیے۔

"ابھی اس جہاں آپ کے گھر میں ہوں ... یہی میرا این او سی ہے۔ آپ شرمندہ ہوں۔ میں اپنی ذمہ داری پر آپ لوگوں کے درمیان ہوں۔"

"میرے خیال میں مطمئن ہو جانا چاہئے۔" وہاج ایک کرسی پر گر گیا۔

"دراصل جواد کل نہیں پا رہا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے کام سے کہیں چلے جاتے ہیں اور مجھے بہت کوفت ہو رہی ہے۔"

اسی وقت جواد سیاہ ٹریک سوٹ میں اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ملازم جوس کا گلاس لئے آ رہا تھا۔

ماہین کی آنکھوں میں محبت اور اپنائیت کی روشنی سی کوند گئی۔

جواد کے چہرے پر حیرت آمیز تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

"آپ ...؟"

"تو کیا کریں آخر تو آپ ہمارے پاس آتے نہیں۔ ہم خود چل کر آتے ہیں تو جناب پھر بھی ہاتھ نہیں لگتے۔" اس نے پیار سے اس کی سمت دیکھ کر شکوہ کیا۔

"رات میں آپ کی وجہ سے جلدی آ گیا تھا۔"

"کتنی جلدی؟" اس نے بے یقینی کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور گویا جھوٹ پکڑنے کی کوشش کی۔

"ساڑھے بارہ بجے آپ کے کمرے کا دروازہ ناک کیا کوئی آواز نہیں آئی۔"

"ہاں ہو سکتا ہے شاید میں نماز پڑھ رہی ہوں گی۔"

"پھر میں چار دس منٹ کے وقفے کے بعد دوبارہ گیا۔ دروازہ ناک کیا پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ یہ سوچ کر دوبارہ دروازہ ناک نہیں کیا کہ آپ سو گئی ہوں گی۔"

(اس وقت تو میں عائشہ اور بھائی سے باتیں کر رہی تھی)؟ "ہاں ہو سکتا ہے میں سو گئی ہوں اور مجھے پتہ نہ چل سکا ہو گا۔ بہرحال یہ سن کر میرا سیروں خون بڑھ گیا ہے کہ تمہیں اس وجہ خیال آیا ورنہ میں تو یہی سمجھی تھی تمہیں پرواہ بھی نہیں

ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ ہنس دیا۔

"خیر! پہلے تو تم یہ جوس پیو" ۔اس نے بالکل ماؤں والے انداز میں کہا تھا۔

"آپ لیں نا پلیز..... ورنہ ہم پیتے ہیں" ۔اس نے گلاس ماہین کی طرف بڑھا دیا۔

"میں تو پہلے لے چکی ہوں، بالکل بھی بھوک نہیں ہو رہی" ۔وہ دھیرے سے ہنس دی۔

جواد نے جوس کے گھونٹ بھرنے شروع کر دیے۔

"کہاں کہاں سیر کی آپ نے؟"

"کل ہاری کے ساتھ گئی تھی۔ آج بھی جانے کا پروگرام ہے، تم چلو گے؟"

"سوری! آج کچہری جانا بہت ضروری ہے۔ بابا صاحب.....!"

"ماشاءاللہ! اتنے سارے لوگ موجود ہیں، کوئی اور چلا جائے نا کچہری" ۔اسے سراسر [illegible] محسوس ہوا تھا، ایک بجھ گئی تھی۔

"بابا صاحب جسے کام سونپ دیں اسے ہی مکمل کرنا ہوتا ہے" ۔اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"یہ بہت لاڈلے ہیں بابا صاحب کے" ۔منہاج نے مطلع کیا۔

"وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ دوپہر کو، رات کو کسی وقت کا کھانا تو وقت پر کھاتا نہیں ہے" ۔اس نے تنگ کر کہا۔ (یہ حال کے بچوں پر صادق ہی لگ رہی)

"روشی بتا رہی تھی دن کے اجالے میں تو بھائی نظر ہی نہیں آتے۔ تم تھک نہیں جاتے اس خالصانہ لاڈ پیار سے؟" اسے غصہ آ گیا تھا۔

اسی فطری اپنائیت کے اظہار نے جیسے جواد کا دل موہ لیا۔

"آپ کو نہیں پتا، یہ "نور" ہیں اس کے..... ڈی سی کا بیٹا ہے۔ سب کی نظروں میں رہتا ہے۔" آپ ترس نہ کھائیں۔

ہم سب تو اس سے چلنے کا پروگرام بنا رہے ہیں" ۔فاران نے صورتحال کلیئر کرنے کی کوشش کی۔

"یہ سارے کام پروگرام بنا کر کرتا ہے۔ مرنے سے پہلے بھی پروگرام بنائے گا" ۔امیر کو فاران سے خاصی پرخاش رہتی تھی۔

ماہین بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ اف خدایا کتنے دلچسپ ہیں یہ لوگ۔ بلکہ سارا گھر۔ اب سمجھ میں آیا بچو کا یہاں کیسے میں دل کیوں نہیں لگتا تھا۔

"بچو!" جواد نے اس کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تمہاری امی بھی، ہم سب بہن بھائیوں کی بچو" ۔اس نے بتایا۔

"اوہ!" وہ خاموش سا ہو گیا۔

ماہین کو افسوس ہوا کہ اس کی ماں کا ذکر چھیڑ کر تو اس نے اس کو اداس کر دیا۔

"ویسے آپ کو شاید یہ سن کر خوشی ہو کہ جیز آباد کے پروگرام میں میں بھی شامل ہوں۔"

"جی" ۔ماہین کو بے حد خوشی ہوئی۔

"بالکل جی! امی بابا میرے ساتھ ہی تھے، مجھے کہہ رہے تھے کہ مجھے ضرور جانا ہے۔"

"اب آ رہے ہو سوات؟ تو میں سوچ رہی تھی اب تمہارے نانا جان سے پوچھیں گے کہ بھائی جان کے ساتھ کیا وقت گزر رہا تو کیا جواب دوں گی۔"

"پتا تو تھا رہے تھے، نانا جان بھی آ رہے ہیں۔"

"ہاں ابھی دیر ہے ان کے آنے میں۔ روشی بھی ہمارے ساتھ ہو گی۔"

"پتا نہیں پیانے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہاری کے متعلق البتہ کہہ رہے تھے کہ شاید وہ ہمارے ساتھ چلے گا۔ بابا صاحب کا کوئی کام بھی کرنا ہے ادھر۔"

"وہی میں سوچ رہا تھا، خیر کسی بھاری وجہ کے ہاری صاحب یہاں سے مل کیسے سکتے ہیں۔ وہ تو بابا صاحب کے آکسیجن ماسک ہیں۔" قمر نے ذرا سی دیر میں خاصا غور و خوض کر لیا تھا۔

"اچھا میں چلتی ہوں، تم لوگ اپنی تیاری کرو ویسے تو میں ماما کو بتا کر آئی تھی۔ اگر وہ تھکا..... بھول گئی ہوں گی تو سب یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں ابھی تک سو رہی ہوں۔"

وہ باہر نکل گئی۔

"بڑی ہونڈا خالہ ہیں یار..... خالہ....." چھوٹے بھیا تولیے سے سر رگڑتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔

"آپ کو سوٹ نہیں کرتا یہ رشتہ۔ آپ انہیں صرف میری خالہ رہنے دیں۔" جواد شرٹ اتارتے ہوئے تقریباً جھلا کر بولا تھا۔

"یار! اچھی لگی ہو۔ ایسی شاندار خالہ اللہ ہر کسی کو ایسی ہزاروں خالائیں دے۔" امیر نے دعائیہ انداز میں ہاتھ بلند کیے۔

"تمنائیں کرنے سے غرض ہے، نتیجے کی طرف بھی دھیان نہیں دیتا۔ ہزاروں خالائیں..... ہوتے اسپال آ جیں گھر والی ہوتی ہے۔ انسان کو تھوڑی بہت ہمدردی اپنے باپ سے بھی ہونی چاہیے۔" ندیم نے جھاڑ پلائی۔

اسی وقت کھوکھر نے اندر آ کر ناشتہ لگنے کی اطلاع دی تھی اور اب سرے سے آپا دھاپی شروع ہو گئی تھی۔ ہر ایک پر عجلت سوار تھی۔ اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ بابا صاحب اکثر ابھی سب کے ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔

"خان! آپ کو بڑے خان بلا رہے ہیں" ۔سرسوتی پیغام دے کر فوراً ہی پلٹ گئی تھی۔

وہ اپنے کسی ضروری کام سے شہر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ دن گیارہ بجے تک واپس آ جائے گا۔ وہ گھری

سوچ میں مستغرق ان کی خواب گاہ میں چلا آیا۔ اور اندر داخل ہوتے ہی چونک پڑا۔

روشی کالج یونیفارم میں ملبوس بابا صاحب اور بارع علی خان کے درمیان بے چاری سی بنی بیٹھی تھی۔ بارع علی خان حسب معمول اردو اور انگریزی اخبارات میں الجھے ہوئے تھے۔ بابا صاحب روشی سے باتیں کر رہے تھے۔

"آؤ باری کہاں تھے بھئی؟ آج تو صبح سے نظر ہی نہیں آئے۔"

"میں تو یہیں ہوں گھر میں"۔ "ابھی البتہ باہر جانے والا تھا اور یہی بتانے آ رہا تھا آپ کو۔۔۔"

"بہت اچھے۔ بھئی آج روشی کی آنکھ نہیں کھلی جلدی، نانے بھی نہیں اٹھایا۔ سب بچیاں تو چلی گئیں۔ امتحان نزدیک ہیں پڑھائی کا حرج ہو گا۔ تم شہر تو جا رہے ہو نا یہ اچھا ہوا اسے کالج چھوڑتے جانا۔ جاؤ بیٹی تمہارا تو مسئلہ حل ہو گیا"۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

باری نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"بہتر بابا صاحب؟"

"چلیے روشی بی بی! آپ کی جیپ لے جاؤں بابا صاحب؟"

"ہاں ہاں وہی لے جاؤ"۔ "چابی جواد کے پاس ہو گی"۔

وہ پلٹ گیا یہ دیکھے بغیر کہ وہ آ رہی ہے یا نہیں۔ بابا صاحب کا حکم ہو چکا تھا۔ اب تعمیل تو ہونی ہی تھی۔ وہ جواد سے چابی لے کر آیا تو وہ جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ بے زاری سے جیپ لے اڑا۔ کچا راستہ طے کر کے جب بڑی سڑک پر آئی تو رفتار دھیمی کر کے بیک مرر سیٹ کرنے لگا۔

"اگر تم نے مرر میں مجھے دیکھنے کی کوشش کی تو میں جیپ سے چھلانگ مار دوں گی"۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرائی۔ مرر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ اس کی نیت بھانپ گئی تھی۔

اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔ ایک جھلک تو بہرحال دیکھ لی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے دل کو بہت افسوس سا ہوا تھا۔

"آپ کے پاپا تو یہیں موجود تھے؟ آپ اپنے دل کی بات ان سے کہہ سکتی تھیں۔ وہ آپ کی سفارش کر سکتے تھے"۔

"نہیں ہیں وہ میرے سگے۔ بابا صاحب کو کسی کی بھی پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پاپا ہی کی وجہ سے وہ اتنا زور دیتے ہیں"۔

"اور پاپا وہ صرف ای سی ہیں۔ ہر شے اے کلاس پسند کرتے ہیں۔ اولاد کو بھی چیز ہی سمجھتے ہیں۔ کم پڑھے لکھے ہوں گے تو انسلٹ ہو گی۔ کالج میں حاضریاں پوری ہونی چاہئیں ورنہ کالج میں سب کیا کہیں گے ای سی کی بیٹی کس قدر غیر منظم اور بے احتیاط طالبہ ہے۔ خود بھی چھوڑ کے ہیں اور ہمیں بھی چھوڑ کر کچھ ۔۔۔ رکھا ہے۔

اس کی باقاعدہ سسکیاں شروع ہو گئی تھیں۔

"میری ماں کو بھی ان لوگوں نے اسی طرح سسکا سسکا کر مارا ہو گا اور اب خالہ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہتے

ہیں۔ خود تو کبھی شاید ۔۔۔ خالہ ماموں سے ملانے بھی نہ لے جاتے۔ ان کی مہربانی کہ وہ آ گئیں۔ تو بھی ان کے ساتھ وقت گزارنے نہیں دیتے"۔

اب ہچکیاں رک گئی تھیں اور باری کیلئے یہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

اس نے درخت کے نیچے جیپ روک دی۔ اور آگے ہو کر مرر سیٹ کر لیا۔

"آپ اسی طرح روتی دھوتی کالج پہنچیں گی؟" اس نے اسے مرر میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہیں کیا"۔

"اور جو راستے میں کسی نے مجھے پکڑ لیا کہ ساتھ بیٹھی لڑکی روتی کیوں جا رہی ہے؟"

"اپنی آنکھوں سے رو رہی ہوں کسی کو کیا تکلیف ہے"۔ وہ بگڑ اٹھی۔

"مگر پکڑنے والے تو مجھے ہی ذمہ دار سمجھیں گے"۔ وہ زچ ہو گیا۔

"تو تم ہی تو ہو ذمہ دار۔ اگر ذرا سا ساتھ دے دیتے ۔۔۔ اچھا بس بات نہیں کرو مجھ سے۔ میں رونا چاہتی ہوں۔ مجھے رونے دو تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"یہی تکلیف ہے۔ جیپ چلانا مشکل ہو رہی ہے"۔ وہ چڑ گیا۔

"باری! مجھے یہیں اتار دو۔ نہ میں کالج جاؤں گی نہ گھر۔ یہیں کسی کنوئیں میں چھلانگ مار دوں گی"۔ وہ جیپ سے اترنے لگی۔

باری نے بڑی پھرتی سے گھوم کر اس کا بازو دبوچ لیا۔

"ہوش میں تو ہیں آپ؟" اسے سچ مچ غصہ آ گیا۔ "باری پلیز!" وہ اس کے بازو سے چہرہ ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سوچتی نظروں سے اسے گھورے گیا۔

شاید اس پر اعلیٰ درجے کا ڈپریشن طاری تھا۔

"شی! کیا میں سڑک پر تماشا بنوائیں گی آپ؟ آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ آگے آ جائیے کیونکہ اس طرح کی صورتحال میں مجھ سے ڈرائیو نہ ہو سکے گی ۔۔۔ پلیز روشی!"

وہ خاموشی سے سسکیاں بھرتے ہوئے اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ باری اس وقت شدید دکھ کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

"روشی! اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا ایک ایک آنسو مجھ پر عذاب بن کر نازل ہو رہا ہے تو کیا آپ مجھ پر رحم کریں گی؟"

"سب خام خیالی ہے۔ کسی پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا میں تو خونی رشتوں کو بھی دیکھ چکی ہوں"۔ وہ پھنکاری۔

"محبتیں عنایتیں تلاش کرنے اور غور کرنے سے نہیں ملا کرتیں۔ قسمت سے ملتی ہیں"۔

"تمہاری عنایت بھی میں نے دیکھ لی۔ ایک تم پر ہی بھروسا تھا۔ تم سے ہی تو امید تھی اسی لئے تو ہر مسئلے پر دوڑی دوڑی تمہارے پاس جاتی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے یونہی محسوس ہوتا تھا کہ میرا کوئی بھی مسئلہ ہو گا اور تم منٹوں میں حل کر دو گے۔ مگر نہیں تم بھی اسی سسٹم کا ایک پرزہ ہو۔ اب مجھے تم سے بھی کوئی امید نہیں ہو گی"۔

"میرے سینے میں بھی ایک دل ہے روشی! اتنا آزمانا بھی اچھا نہیں ہوتا"۔ اس کے لہجے میں بے حد شکستگی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہی کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ باتوں کے زخم مجھے بھی اسی طرح لگتے ہیں جیسے دوسرے انسانوں کو۔ مگر آپ کو میری پروا کیوں ہو؟" اس نے اپیل بہت آہستہ کر دی تھی۔

"مجھے اب دنیا کے کسی انسان پر بھروسا نہیں۔ میں انہیں کی زخم خوردہ ہوں"۔ وہ پھنکاری۔

"آپ اپنی سوچ پہ قادر ہیں جو چاہے سوچ لیں"۔ اس نے بے دلی سے پہلو بدلا۔

"تم بہت کچھ ہو ہاری! ہمارا یہاں کوئی خونی رشتہ نہیں۔ تم بہت سارے تکلیف دہ انکشافات سے محفوظ ہو۔ تم میرے مسائل نہیں سمجھ سکتے"۔ اس نے چادر سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"انسان کو غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے"۔ ہاری نے ایک چبھتی نگاہ اس پر ڈالی۔

"ہونہہ غلط فہمی! کلیجہ میرا پھٹتا ہے۔ راتوں کو میں جاگتی ہوں! خون کے آنسو میری آنکھوں سے بہتے ہیں۔ یہ سب غلط فہمی کا کرشمہ ہے۔ جو چیز جو بات غلط محسوس ہوتی ہے وہ اکثر محض وہم ہوتا ہے مگر عرصے بعد سچائی ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ کیسی مسلسل غلط فہمی ہے"۔ وہ تلخی سے بولی۔

ہاری نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"ہاری!"

"جی؟"

"یہ جو لڑکیاں گھروں سے بھاگتی ہیں سب کی سب فلم ایکٹریس بننے کیلئے تھوڑا ہی بھاگتی ہوں گی۔ میری جیسی بھی ہوتی ہیں جو زندگی تو جینا چاہتی ہوں گی"۔

"شٹ اپ پلیز۔ کیا واہی تباہی شروع کر دی ہے آپ نے؟" وہ برہم ہو گیا۔

"تم کرو نا علاج کون روک رہا ہے تمہیں مگر میں سچ کہہ رہی ہوں"۔

وہ اٹل تھی۔

"اللہ کا شکر ادا کریں اس نے آپ کو عزت داروں میں پیدا کیا۔ روٹی کپڑے کے مسئلے سے بے نیاز کیا۔ سلام لینے والوں میں شامل کیا۔ محض ایک آدھ ارمان رہ جانے پر سارا ملیا میٹ تو نہ کریں"۔

اس دنیا میں کروڑوں اربوں لوگ ہیں جو روٹی کے مسئلے میں الجھ کر بھی باعزت زندگی کی جدوجہد کرتے ہیں کتنے لڑکے لڑکیاں ایسی ہیں جو مسائل کے انبار میں دبے ہوئے ہیں اور ساتھ اپنی تعلیم کے بندوبست میں بھی الجھے رہتے ہیں۔ کھلونوں دھوپ میں چلتے ہیں۔ لالٹینوں میں ساٹھ پاور کے بلب میں راتوں کو جاگ کر پڑھتے ہیں۔ جبکہ کھلے دن انہیں صرف امتحان ہی دینا نہیں پڑتا۔ روٹی کی فکر بھی کرنا ہوتی ہے۔ آپ حاصل نعمتوں پر شکر ادا کرنا شروع کر دیں ناشکری کی فرصت نہیں ملے گی"۔

"مت ہو اتنا نازک دل میں آس گئی ہو کسی بات کا اثر نہیں ہوتا"۔ اس نے تلخی سے ہاری کی بات کاٹ دی۔

"تم مجھے کالج کے گیٹ پر اتار دینا مگر میں اندر نہیں جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں ضد تھی۔

"پھر کہاں جائیں گی؟" اس نے حیرت سے مگر بے حد نرم انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"جہاں میرا دل چاہے گا"۔ وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

"کہیں کا نہیں رہے گا آپ کا دل"۔ وہ درشتی سے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں کیا! تمہیں کون سی میری پروا ہے"۔ وہ درشتی سے بولی۔

"تو پھر ایسا کرتا ہوں یہیں کہیں اسے مار دیتا ہوں یہ سب سے اچھا حل ہے سب مسئلے ختم"۔

"مگر تم کیوں نقصان کا سودا کرتے ہو؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"تو پھر اس کا مطلب ہے وہ بے تک میں کالج کے گیٹ پر ہی موجود رہوں؟" اس نے طویل سڑک پر پہلا موڑ کاٹا۔

"فائدہ..... اس کالج میں تو تین گیٹ ہیں۔ وہاں سے جو ایک چھوٹا"۔ وہ دل جلانے والے انداز میں تھی۔

"شہر پہنچتے ہی پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ گھر فون کر کے بڑے پاپا کو بتاتا ہوں وہ خود نمٹ لیں گے"۔ اس نے گویا دھمکی دی۔

"ہاؤ!"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ جھلایا۔

"ہاری! تمہیں مجھ سے ذرا ہمدردی نہیں؟" وہ پھر رونے کو ہو گئی۔

ہاری نے گردن موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔

"مجھے اتنا مت بلوائیں کہ منہ سے کچھ سرزد ہو جائے"۔ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"کیا مطلب؟" اسے واقعی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔

"مطلب یہ کہ مجھے میری اوقات میں رہنے دیں"۔ اس کی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں۔

روشی نے اس کی سمت بغور دیکھا۔

"آف وائٹ شلوار سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے گرمی کی وجہ سے قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھائے وہ بہت شاندار نظر آ رہا تھا۔

"اگر تمہاری امی ہوتیں تو تمہیں دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں"۔ اس کی رو بہک گئی۔

"کیوں؟"

"تم بہت سمارٹ ہو"۔ وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

ہاری مسکرا دیا۔

"آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے۔ ماں اپنے بچے سے کسی وجہ سے محبت نہیں کرتی وہ بس محبت کرتی ہے چاہے اس کی اولاد بدشکل ہو یا خوش شکل"۔

"ہادی! تم اور بھیا تو کو ایجوکیشن میں پڑھتے تھے۔ تمہیں لڑکیاں پسند کرتی ہوں گی؟"

ہادی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی توجہ ادھر ادھر ہوئی رونے پیٹنے کا عمل تو تمام ہوا۔

"ہاں! بعض تو ابھی بھی فون کرتی ہیں" وہ مسکرا دیا۔

"کیوں؟"

"پسند جو کرتی ہیں"۔

"پھر تم کیا کہتے ہو؟" اس نے اچٹتی نظر اس پر ڈالی۔

"یہی کہ شادی تو میں اپنی پسند سے کروں گا"۔

"تم کسی کو پسند کرتے ہو؟" اس کے دل کو جانے کیا ہوا۔

"ابھی کیا پتا کون کب پسند آ جائے"۔

"تمہارے خیال میں تمہاری دلہن کیسی ہونی چاہیے؟"

"ساڑھے پانچ فٹ قد ہونا چاہیے اور سوا پانچ فٹ لمبے بال۔ چہرہ ایسا ہو جسے دیکھ کر دل نہ بھرے"۔

"سوا پانچ فٹ لمبے بال؟" روشی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے کھلے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ (چادر کے اوپر ہی سہی۔)

"پھر تو تمہاری شادی کبھی نہیں ہوگی۔ اتنے لمبے بال تو شاید ہی کسی کے ہوں" اس نے مایوسی سے کہا۔

"آپ غمگین نہ ہوں ہے ایک ایسی لڑکی" اس نے گویا تسلی دی۔

"کہاں؟"

"زمین پر"۔

"ظاہر ہے آسمان پر تو ہونے سے رہی"۔

نہ جانے کیوں اس کا موڈ آف ہو گیا۔

"نام کیا ہے؟" وہ بے دلی سے پوچھ رہی تھی۔

"جلدی کیا ہے۔ نام بھی بتا دیں گے بلکہ ملوا بھی دیجئے" وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

روشی چپ ہو گئی تھی۔

"کالج آنے والا ہے"۔

"تم چلے جانا اندر میں تو یہیں بیٹھی رہوں گی"۔ وہ پھر اڑ گئی۔

"کہاں بیٹھی رہیں گی؟" وہ حیران ہوا۔

"جیپ میں اور کہاں"۔ وہ جھلائی۔

"اور جو میرا کام ہے وہ کب کروں گا؟"

"تو پھر اپنے کام سے چلو۔ جہاں تم جاؤ گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی"۔

"مجھے آج اس کے پاس ہی جانا تھا" اس نے مسکراہٹ روک کر سنجیدگی سے کہا۔

"تو مجھے بھی ملواؤ اس سے" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ابھی نہیں پھر سہی" اس نے اسپیڈ ایک دم بڑھا دی۔

روشی ایک دم چپ سی ہو گئی جیسے الجھ گئی ہو۔

ہادی نے خاصی دیر اسے مخاطب نہیں کیا وہ سامنے بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ سر جھکائے کسی خیال میں گم تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" اسے جیسے روشی پر ترس آ گیا۔ جیپ کے گھٹے ماحول میں جیسے باد نسیم چلنے لگی۔

بعض اوقات کسی کی چپ کتنی ناگوار ہوتی ہے۔ لاکھوں خطیبوں کے خطاب پر بھاری۔

"سوچ رہی ہوں بعض لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ کتنی آسانی سے محبت اور توجہ حاصل کر لیتے ہیں اور بعض انسان کتنے پروقار اور معزز ہوتے ہیں مگر کتنے محروم ہوتے ہیں" اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

"ہادی!"

"جی!"

"وہاں حویلی میں ہر کوئی تمہیں عزیز رکھتا ہے کیسا لگتا ہے تمہیں؟"

"بہت اچھا لگتا ہے ہم دونوں سے سب اسی طرح محبت کرتے ہیں"۔

اس کے لہجے میں نامعلوم سی چبھن در آئی۔

"کالج آ گیا ہے" اس نے گیٹ کے سامنے جیپ کو بریک لگائے۔

"تم پڑھ لو میرے حصے کا جا کر کہہ دیا تمہیں کہیں نہیں جاؤں گی"۔ وہ پھر سے کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"مگر کئی دوسری لڑکیاں بھی کالج میں موجود ہیں بابا صاحب کو پتا چل جائے گا"۔

"تو چل جائے" اس نے ضدی انداز میں ہادی کی بات کاٹ دی تھی۔

"میرے بارے میں بھی کچھ سوچئے" وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

"میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے بے کار باتیں سوچنے کیلئے۔ تمہارے بارے میں تو وہی "لمبے بالوں" والی سوچے گی"۔ جس کی شامت نے دھکا دیا ہے۔

وہ جل کے کہہ کر اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گئی۔

ہادی کی مسکراہٹ بڑی بے ساختہ تھی۔

"روشی پلیز! آج کالج چلی جائیے۔ آئندہ میں آپ کے ہر گھریلو محاذ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ بدلے میں وہ چار مرتبہ آپ کو"۔ وہ ویٹنگ کروا کر چھٹیاں دلوا دیا کروں گا۔

آپ کے کسی من پسند رشتے دار کی آمد پر آپ کی سخت طبیعت خرابی کا اشتہار مشتہر کروا دیا کروں گا۔ آپ کے ہر معصوم

ذرا سے کام کو ایک سو دو بخار میں تبدیل نہ کرو تو میرا نام ہادی نہیں۔ پلیز روشنی صرف آج۔"

"اچھا میں کوچ میں انتظار کروں گی، تم اس" لمبے بالوں والی کے ساتھ مزے اڑاؤ۔"

وہ تو دوسری طرف سے بڑی بے نیازی سے اتر گئی تھی۔ زارا اس سے مس نہ ہوئی۔

"آپ کے سر کی قسم، آپ کی اجازت کے بغیر نہیں جاؤں گا اس کے پاس۔" اس نے گویا سر پیٹ لیا تھا۔

روشنی بے ساختہ مسکرائی۔

"پھر اب کہاں جاؤ گے؟"

"ایک ضروری کام ہے اور بھی کام ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"ہادی! اگر مجھے پتا چلا کہ کوچ میں صحیح ہے ہوا، اگر آسمہ تم نے بہانہ بنانے میں میرا ساتھ دیا تو میں بڑی بھیانک بددعا کروں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

"ہشت۔۔۔!" وہ مسکرا رہا تھا۔

"بری کی اللہ کرے اس کے سر میں خشکی ہو جائے، اس کے سارے لمبے بال گر جائیں۔"

ہادی کا قہقہہ بے ساختہ اور بھرپور تھا۔

وہ جیپ سے اتر گئی تھی۔

ہادی نے اس کی فائل اور کتابیں آگے کو جھک کر اسے تھما دیں۔

"ہادی! تم بہت کچھ کر میں ہار گئی ہوں۔ میں صرف تمہاری خاطر اپنی ضد توڑ رہی ہوں اس لیے کہ ادھر سب بہت بے رحم ہیں۔ جانے تمہارے ساتھ کیا کریں۔" اس نے کھڑکی سے جیپ کا دروازہ بند کیا۔

"میری خاطر۔۔۔؟" وہ مسکرا دیا۔

"ابھی تو بہت مرحلے ہیں روشنائے یار علی خان! کہیں اپنی 'خاطر' پہ گاؤ یا تو۔۔۔ ہم اپنے جذبات اور طرف کو آزمائیں گے۔ پر تمہیں مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔"

"یہ کیسے پھول کھلائے ہیں میرے چارہ گر۔۔۔ کہ بجائے جھک کے تپش آ رہی ہے۔"

اس نے الجھن سے اسٹارٹ کیا اور بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایکسیلیٹر پر پاؤں دے مارا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا

"دیوانے کے خواب۔۔۔ ہشت"

الف وہ روئے تابناک وہ چشم تر میرے لیے
ہائے وہ زلف پریشاں دو کمر میرے لیے

وہ شعر پڑھتے ہوئے ہنس دیا۔

"اس حال میں بھی ایسا سوچتے ہو۔" اس نے بے حد اداس نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس حال ہی میں تو ان خوابوں کا مزہ ہے میری جان۔"

"بھائی! زندگی خراب کر رہے ہو، کچھ آگے کا بھی سوچو۔" اس نے قطعاً مشورہ دیا۔

"کیا سوچنا ہے آگے کا، جو سوچنا تھا سوچ لیا۔ بس اب زندگی راست ہیں۔"

ہر جنم میں بھی تیرے ہی جاں ہوں گے
دیکھ لینا وہ بھی سوختہ ساماں ہوں گے

وہ ہنسی سے ہنس دیا۔ "تم سناؤ یار! کیسی زندگی گزر رہی ہے؟"

"تمہاری مرضی کی گزر رہی ہے۔ اب تو راتیں چھوڑتا ہوں تو آنکھیں جواب دے جاتی ہیں۔ سوچتا ہوں میرے مرنے کے بعد گھر والوں کا کیا ہوگا؟" وہ آزردگی سے گویا ہوا۔

"سوری کہیں بھاگی ہوئی ہے؟"

"کون بھاگتے آتا ہے غریب کی بیٹی اب تو دن رات یہی فکر ہے کوئی اچھا رشتہ ملے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔" وہ یاسیت سے آسمان تکنے لگا۔

"میرے ساتھ بھی تو ہوں گے۔"

"اندھیرے میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے کہاں والوں اپنے۔۔۔؟"

"اول خان بھی آج کل شادی کے چکر میں ہے۔"

"کیا بک رہا ہے؟ میری تو قطعاً مشکل سے نصیبوں میں لگی ہوگی۔" اسے غصہ آ گیا۔

"مجھے نہیں لے لڑکا رپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ عمر کی بات چھوڑ، مرد تو ساٹھ سال کا بھی جوان ہوتا ہے۔"

"بھائی! کوئی عمر نہیں لگی ہماری تین مردوں کے بیچ ایک زندہ درگور کر دوں؟"

وہ مزید بھڑک گیا۔

"ارے تیری سوچ کا بھی ہے عیش کرے گی تیری لاڈلی۔" وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

"بڈھے کے ساتھ؟" وہ مزید مشتعل ہوا۔

"عمر بھی جیسے اس جوانوں پہ بھاری ہے وہ۔۔۔ ہائے ہماری گمشدہ جوانی

کیا کہیے کس طرح سے جوانی گزر گئی
بدنام کرنے آئی تھی، بدنام کر گئی

دیکھ بھئی غریب کے مکان میں راستے بہت ہوتے ہیں۔ کب تک کرے گا لاڈلی کی حفاظت؟ اپنی زندگی میں اس کی شادی کر دے، وقت کا کیا بھروسہ ہے۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں مگر کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملے تو۔"

"پتا نہیں تم دھنک کا رشتہ کسے کہتے ہو؟ لال خان نے جیسے پیچھے ہی کہا ہے' بھوکا نہیں مارے گا تیری لونڈیا کو"۔

"دہ بھائی احمر کا بڑا فرق ہے' تیری عمر کا بھی ہو تو کوئی بات نہیں تھی"۔ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"اس تو عمر پیاری ہوتی لڑکی" اس نے گھاس نوچتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

"خون ڈال رہا ہوں گھر کے چراغ میں روشنی ہوتی جا رہی" اس نے لاغلاہت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"وہ بھی دادا کیا واویلا لگا مارا ہے' مگر بھائی واویلا گوں سے لڑکی کی شادی نہیں ہوگی' میں تو خود تیری بیٹی کا رشتہ مانگ لیتا پر مردوں کی شادیاں نہیں ہوتیں"۔

"یہ تو تیرے سامنے کرن بیاہی مجھے تو ترس آتا ہے" اس نے دکھ سے اس ہڈیوں کے پنجر پر نظر ڈالی۔

"دیکھ' بھائی غلام احمد اتفاق نہیں کر رہا ہوں تجھ سے۔ گھر والی سے بات کر کے دیکھ' شاید اسے یہ بات سمجھ میں آجائے"۔

"ہاں اب تو میرے گھر میں فساد ڈلوائے" اس نے خفگی سے جواب دیا۔

"تو مجھے گھر لے چل میں کر لیتا ہوں بات"۔

"سارے گھر کے برتن توڑ ڈالے گی تجھ پر۔۔۔ تجھے اس کا پتا نہیں ہے۔۔۔" اس نے اس کی ہنسی پر گویا ماتم کیا۔

"دیکھ غلام احمد! آج لال خان جیسے قسمت سے تیرے دروازے پر دستک دے رہا ہے' تو کیوں اپنی اولاد کا دشمن ہو رہا ہے اپنے جیسے نصیب کا مارا دیکھ رہا ہے' جو خون بیچ بیچ کر وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو جائے"۔

"یہ کوئی ضروری تو نہیں"۔ وہ واقعی مایوس نہیں تھا۔

"تیرے گھر میں تیسرے دن گوشت پکنے لگا ہے تو اب پہنچنا شروع ہو جائیگے اب"۔

"وہ تگی سے بجھا۔ غور کر میری بات پر"۔

وہ سوچ میں گم ہو گیا۔

"کیا سوچنے لگے؟" عارف کو اپنی پیسٹری پر بڑا بھروسہ تھا۔ اس کی آنکھیں کسی خیز انداز میں چمکنے لگی تھیں۔

"سوچ رہا ہوں شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بات کر کے دیکھوں گھر والی سے"۔

"یہ ہوئی بات۔۔۔ بات ہی نہیں کرنی اونچ نیچ بھی سمجھانا ہے"۔ اس نے چہکا۔

دوسرا لال کر بار گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

جنوں سے معصوم کون سی چیز ہے بتا دے
وفا کے شعلوں کو سرد کرتا ہے' آگ لا دے
دل حزیں کو تیرا یہ پیغام اس نے دیا ہے
کہ میں نے تجھ کو بھلا دیا' تو مجھے بھلا دے

عارف کی آواز میں دل چیرنے والا سوز تھا۔ وہ خیال سے چونکا تھا۔ وہ موتی عارف کی آنکھوں کے گوشوں سے ٹوٹ کر

گرے تھے۔ جو اس نے دیکھے تھے۔

ساڑھے گیارہ ہو گیا کا عمل تھا۔ جب اس نے کھڑکیوں کے استعمال ہونے کی آواز سنی تھی۔ نیند مفقود تھی۔ مگر شاید ان کی وجہ سے وہ بہار حائل ہو گئی تھی۔

گھر اس پر ایک ایک بار ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے پردے کے پیچھے متصل دروازے پر کوئی دھڑام سے آ کر گرا ہو۔ دھپ کی آواز کے ساتھ زنجیر کے جھٹکنے کی آواز بھی واضح تھی۔ وہ چھلانگ مارنے کی صورت میں اجڑ سے پیچھے آئی تھی۔ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سہمی دروازے سے متصل دیوار سے پیچھے کی طرف آ گئی تھی۔ شیشوں کے اس پار دروازہ کی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دوپٹہ سمیٹ کر کے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔

"وارث انعام کیلئے میرے حال پر رحم کرو میں کہیں نہیں جا رہی اس کمل ہو جیسے میں ذرا سانس لے رہی ہوں۔ دیکھو میرے پاؤں میں زنجیر موجود ہے اتنا وزن اٹھا کر کہاں بھاگوں گی؟" (ہچکیاں اور سسکیاں۔۔۔)

ماہین کی تو روح جیسے بے جان ہو رہی تھی۔

copied from web

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

ہالہ خود وجود نظر آنے لگے۔ نگاہ ذرا جمی تو وجود واضح ہونے لگے۔

ہاری پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ بچے گھاس پر ایک عورت دو زانو اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے گڑگڑا رہی تھی۔

ماہین کی سانسیں قدرے بحال ہوئیں مگر حلق ایک دم خشک ہو رہا تھا۔

"دیکھو۔۔۔ تمہاری سزا تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ اگر بابا صاحب کو بھنک پڑ گئی۔"

"سب سوئے ہیں۔۔۔ اپنے ٹھنڈے کمروں میں۔۔۔ کسی کو ہوش نہیں۔۔۔ میں ذرا دیر ہوا میں بیٹھوں گی۔" عورت نے ہاری کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں بھی تو سونا چاہتا ہوں۔ تمہیں یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟" اس کی آواز بے حد آہستہ تھی۔

"تو سو جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد چلی جاؤں گی۔ دیکھو کتنی وزنی بیڑیاں ہیں۔ میں اتنا وزن اٹھا کر بھلا بھاگ سکتی ہوں؟" وہ سسک پڑی۔

"یہ کون ہے؟" ماہین کے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔

"خدا کے لیے مجھے پریشان نہیں کرو۔۔۔ چلو اپنے ٹھکانے پر۔" لمحاتی سکوت چھا گیا۔ "اس کوٹھڑی میں بے حد حبس ہے۔ دم گھٹ جاتا ہے ہاری۔"

"تم سزا کاٹ رہی ہو۔۔۔ غلاموں کو ان باتوں سے کیا غرض؟" ہاری کتنا مختلف لہجہ دے رہا تھا۔

"یہ عمر بھر کی سزا ہے۔۔۔ وہ کوٹھڑی مجھے غلاظت میں گزارنے دو۔" وہ پھر پھوٹ کر رونے لگی۔

"دیکھو اگر تم باز نہیں آؤ گی تو میں خان کو بلا لاؤں گا۔" وہ رو رو کر کہہ رہا تھا۔

وہ جیسے ایک دم لرز کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ بیڑیوں کا شور سنانے میں کوشاں۔

"تم تو بہت اچھے ہو ہاری!" وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

"میں اچھا ہوں نہ برا۔۔۔ میں بس وہی ہوں جو خان کی مرضی ہے۔" وہ خاصی تلخی سے کہہ رہا تھا۔

"دو گھڑیاں ہو گئی ہیں۔۔۔ چلو۔۔۔ بلاؤں خان کو؟" اس نے دھمکی دی۔

"بس کرو۔۔۔ خان کو بلاؤ۔۔۔ شاید وہ طیش میں آ کر مجھے زندگی کے جال سے آزاد کر دیں۔ یہ روز روز کا مرنا تو ختم ہو۔" وہ گھاس پر بیٹھ گئی۔

ہاری الجھ کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ فطری اضطراری کیفیت تھی۔

اسی دم سے پھاٹک پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس پڑیں اور زور سے ہارن بجا۔ ہاری نے چونک کر پھاٹک کی سمت دیکھا۔

"دیکھو خان اکیلے اندر بھاگ جاؤ۔ پتا نہیں کون آ گیا ہے؟" اس نے جیسے اس بار التجا کی تھی۔ ہارن پھر زور سے بجا۔

ہاری کبھی گیٹ کی طرف۔ کبھی عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ ہارن چوتھی بار بجا۔ ہاری نے پھاٹک کی طرف قدم بڑھائے مگر اس سے پہلے گھوم کر وہاں پہنچ چکا تھا۔ کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ پھاٹک وا ہوا اور ایک جیپ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی سے لمحے بھر کو باہر کی ایک ایک چیز واضح ہو گئی۔ ہاری نے پھاٹک کی طرف سے تیزی سے رخ موڑا تھا۔ بیٹھی ہوئی عورت اپنے بیٹھنے کے انداز اور کھلے بالوں کے ساتھ کسی عظیم مصور کا شاہکار نظر آئی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔

جیپ پورچ میں جا کر رک گئی تھی۔ ماحول پر پھر سے تاریکی کا غلاف چڑھ چکا تھا۔ ماہین ایک ٹک۔ ساکت کھڑی سن بھی رہی تھی اور دیکھ بھی رہی تھی۔

سو اس نے ایک دراز قامت مرد کو ان دونوں کی طرف آتے دیکھا۔ منظر پہلے سے زیادہ واضح ہو رہا تھا۔ آنے والا سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ رنگ صاف تھا جو اندھیرے میں بھی واضح ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا بھی بالکل چھٹ جاتا ہے۔ اگر انسان خاصی دیر سے اندھیرے میں دیکھ رہا ہو مگر یہاں مسئلہ یہ تھا جس جگہ وہ واقعہ عمل پذیر تھا۔ وہاں درخت بے حد گھنے تھے۔

"السلام علیکم خان!" ہاری کی آواز نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔

"واسلام۔ یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟" آواز میں ملا کی گھمبیرتا تھی۔

"باہر آ گئی جانے کیسے۔ سن نہیں رہی"۔ یہ جیسے وضاحت تھی۔

"آپ بھی اس کے دماغ ٹھکانے نہیں لگے۔ اور کیا چاہتی ہے؟" لہجے میں سخت برہمی تھی۔

"اس کی بیڑیاں کھولا بند کرو۔ یہ اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کی جائے"۔ ملا کی برہمی عیاں تھی۔

عورت نے آگے بڑھ کر آنے والے کے پاؤں تھام لئے۔ "آپ کی گنہگار ہوں، آپ ہی رحم کریں گے تو جان چھوٹے گی"۔

"سب سے آخر میں آج تمہاری کوٹھری میں کون گیا تھا؟" نووارد کے لہجے میں غضب بھی تھا اور سوال بھی۔ بڑی حقارت سے اس نے پاؤں پیچھے ہٹائے تھے۔ وہ سسکتی رہی۔

"کیا پوچھ رہا ہوں؟" نووارد کے لہجے میں پھنکار تھی۔

"سرسوتی کھانا لائی تھی"۔ میرے خان۔ [illegible]

"ہاری۔ سرسوتی اگر سوچتی ہے تو اسے اٹھاؤ۔ اس کے ساتھ اس کی کوٹھری میں دو دن کے لئے بند کر دو۔ اسے کھانا دیتے رہو۔ سرسوتی کا بند کرو جب وہ کوٹھری سے باہر آئے گی تب ہی کھانا کھائے گی۔ چلو اٹھو جاؤ کوٹھری میں"۔ لہجہ واضح اور تحکمانہ تھا۔

"عورت کھڑی ہو گئی"۔ ایک بار کہہ دیں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ پھر چاہے میری جان لے لیں۔ آپ کا نام لے کر سولی چڑھوں۔ زندہ جلوں۔ دیوار میں چنوا دی جاؤں۔ پتھر کھاؤں"۔

"شٹ اپ" نووارد نے خاصی بلند آواز سے ٹوکا۔

"دیکھ رہے ہو ہاری؟ نان سینس۔ اسے لے جاؤ یہاں سے۔ فار گاڈ سیک"۔ نووارد نے جیسے بمشکل اپنے غیظ و غضب پر قابو پایا تھا۔

عورت دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پچھلے حصے کی طرف بڑھی۔ اس کی سسکیاں ماحول میں ایک دکھ کا دل ہلا دینے والا تاثر بکھیر رہی تھیں۔ اس پر مستزاد بیڑیوں کی چھنک۔

"میں نے سنا ہے گھر میں مہمان آئے ہیں؟" نووارد جاتے جاتے پھر ہاری کی سمت پلٹا۔

"نیب احمد کی سب سے چھوٹی صاحبزادی آئی ہوئی ہیں"۔ ہاری کی آواز ہنوز دھیمی تھی۔

"اور بھائی کہاں ہیں؟"

"جی"

"کتنے دن سے چھٹیوں پر ہیں؟"

"ایک دو دن رہ گئے ہیں"۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا"۔

"ابھی رات کو پھر واپس جا رہے ہیں؟" ہاری نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

"ہم چند دوست یہاں شکار پر آئے تھے۔ وہ ساتھ والے گاؤں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ [illegible] وہ چار دن بعد آ جاؤں گا۔ اور ہاں" اس کا "دھیان رکھنا۔ [illegible]

"سرسوتی کو ہرا ضرور ملنا چاہیے۔ بابا صاحب پوچھیں تو [illegible]"

"بہتر" ہاری گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں عورت گئی تھی۔

نووارد نے چند سیکنڈ بعد جیپ چلتی کی تھی اور ہاری نے پھاٹک کھول دیا تھا۔

ماہین تو کھڑے کھڑے جیسے پتھر ہو گئی تھی۔

دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے اندر ڈھول بج رہا ہو۔

وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی بستر تک آئی۔

کون تھی یہ عورت؟

بس ایک دم منظر سے غائب ہو گئی تھی۔ اس طرح کا شک پیدا ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مگر ہاری کا اس کے ساتھ طرز کلام کس طرح "ساتھ مکس" ہونے کا پتہ نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ ہاری کا انداز مالکانہ آزادانہ اور قدرے تحکمانہ تھا۔

پھر کون ہے؟

آنے والا کون تھا؟

اپنے انداز سے تو یہاں کے حاکموں میں سے ایک لگتا تھا۔

آیا تھا تو چلا کیوں گیا؟

عورت اسے فوراً پہچان گئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا۔ وہ کس بات کی معافی مانگ رہی تھی؟

ماہین کو یوں محسوس ہوا اس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ اس نے پاس رکھے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک سانس میں پی گئی۔ قدرے بحالی محسوس ہوئی۔ نیند کا تو اب دور دور پتہ نہ تھا۔ کیا ہاری آنے والے کا حکم بجا لائے گا۔ سرسوتی کو جگائے گا؟ ذہن نے ایک دم پلٹا کھایا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے قدم دروازے کی سمت اٹھ رہے تھے۔ وہ دروازے کے پاس ٹھہر گئی۔

ہاتھ کی کے گلے میں پڑی ڈوری لوز ہو رہی تھی۔ اس نے ڈوری کھینچ کر تنگ کیا اور بہت آہستگی سے دروازہ کھولنا چاہا مگر خوف و دہشت سے ایک جھٹکے کو اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر دروازے کو دونوں ہاتھوں سے کھینچا۔ مگر وہ کسی مہر سے ازلی طرح مقفل تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واپس اپنے بستر پر آ گئی۔

بچو... آپ پر کیا گزری تھی؟ کتنا نامانوس اور سفاک ماحول ہے اجنبیوں کیلئے۔ وہ آدھی رات کو بیٹھ پڑے گی۔ [illegible]

پچھلے کے واقعات بار بار کسی فلم کی طرح ذہن کی سکرین پر متحرک ہو رہے تھے۔ بظاہر اس کی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔

ٹرن۔ٹرن۔

وہ سرونٹ کوارٹرز میں پہنچ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فون کی گھنٹی نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

وہ ڈائننگ ہال کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے کے بالکل ساتھ فون رکھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

"اللہ رحم کرے"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"ہیلو۔ ہادی بات کر رہا ہوں"۔

"روشی بول رہی ہوں"۔

"اوہ"۔ وہ بری طرح چونک پڑا تھا۔

"کہاں سے؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"فی الحال وہاں سے"۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"ہادی۔ میں کراچی جانا نہیں چاہ رہی۔ میں کیا کروں؟"

"مگر اب تو آپ ایئرپورٹ پہنچ چکی ہیں"۔ اسے حیرت ہوئی تھی۔

"تو کیا ہوا۔ میں یہاں ہنگامہ مچا دوں گی۔ تم آ کر لے جاؤ"۔ وہ بہت سکون سے بات کر رہی تھی۔

"نہیں مچایا ہوتا ہنگامہ"۔ وہ اس کے بے سروپا پروگرام پر جھلا گیا۔

"سوچ نہیں ملا۔ ارادہ تو تھا"۔ وہ اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھیں آپ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کریں گی"۔ اس نے تنبیہ کی۔

"تم مجھے نہیں روک سکتے۔ دیکھنا میں ثابت کر دوں گی کہ میں ملاور خان کی پوتی ہوں"۔

"مجھے افسوس ہے میں آپ کے پروگرام میں شامل نہیں ہو سکتا"۔ اس نے ریسیور لٹکا دیا۔ اور باہر کی طرف بڑھا۔ گھنٹی دوبارہ چیخ پڑی۔

ہادی نے گہرا سانس لے کر فون کی طرف بڑھا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ ناچار اسے ریسیور اٹھانا پڑا۔

"جی؟"

"فون کیوں بند کر دیا۔ کیا تم مجھے اس طرح روک سکتے ہو جو میں کرنے جا رہی ہوں؟" وہ روہانسی سے کہہ رہی تھی۔

"ہادی کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا"۔ "کیا کرنے جا رہی ہیں آپ؟" وہ جیسے بے چارگی سے پوچھ رہا تھا۔

"جب میں تکلیف میں ہوتی ہوں تو تمہیں کچھ نہیں ہوتا؟"

"جس کے پاس آزادی ہے۔ اسی کے پاس راحت ہے اللہ کا شکر ادا کریں"۔

"شکر نے تو آپ پر قہر ڈھائے"۔ روشی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ ہو مجھے لینے یا کراچی آ کے میری ایڈ ماری لیتے۔ ظاہر ہے بابا صاحب مجھے جاگیر سے باہر تو نکال نہیں کر سکتے"۔

"مجھ سے بات کرائیں"۔ وہ اچھی پریشان ہو گیا۔

"وہ بوڑھا ٹھگ کاروبار کے چکر میں مجھ سے خاصی دور ہے۔ یوں بھی بات کرنے کی حالت نہیں ہے"۔ اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

ہادی ریسیور کو گھورتا رہ گیا۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال بہت آہستہ تھی۔ وہ ایسے جیسے ہاتھوں سے اپنے گریبان کے بٹن کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سب کی سب گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں۔ یہاں رات کے مستقل ملازمین اور ساتھ آئی ہوئی عورتوں کے جاگنے کے انتظار میں اپنے اپنے کام کو ہو کے بیٹھے تھے کہ نہ معلوم کب کون جاگ اٹھے اور ناشتے کا آرڈر دے۔

"آپ جب سے آئی ہو بی بی اسی طرح بیٹھی ہو۔ چائے لاؤں آپ کیلئے؟" گلو نے اس کے چہرے سے اس کے موڈ کا اندازہ لگایا تھا۔ لہٰذا ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔

"اپنے پاس رکھو اپنی چائے"۔ وہ پلٹ کر غرائی۔ گلو بے چاری اپنے پاؤں لوٹ گئی۔

روشی نے چاروں طرف دیکھا اور فون کی طرف بڑھی۔ فون گلو کے قریب تھا جو بے سدھ سو رہی تھی۔ اس نے نمبر ڈائل کیا اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہیلو" دوسری طرف ماما تھی۔

"ماما۔ خالہ سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں؟"

"پتا نہیں بی بی۔ میں کافی دیر سے بچوں کو ناشتا کرا رہی ہوں"۔ اس کا اشارہ لڑکوں کی طرف تھا۔

"آئی لیٹ ہو گئیں آج"۔ روشی کو حیرت تھی۔

"بابا صاحب 'سرائے' گئے ہوئے ہیں آج پانچ بجے صبح سے۔ سب کے مزے آئے ہوئے ہیں"۔ وہ وضاحت کر رہی تھی۔

"ہائیں۔ اچھا۔ کیا ہادی تو ان کے ساتھ نہیں گیا؟" اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"نہیں.....وہ نہیں گئے"۔

"اچھا ذرا بلاؤ"۔

"آپ ہولڈ کریں۔ بلاتی ہوں"۔

روشی بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ گلو کو بھی دیکھتی جاتی تھی۔

"اب کیا ہے؟" ریسیور میں ہادی کی بیزاری آواز ابھری۔

"میرے دل کو دور ہیں نہیں، تم بہت یاد آ رہے ہو۔ خالہ بہت یاد آ رہی ہیں۔ کیا کروں؟"

"اتنی دور بیٹھ کر بھی آپ مجھے بہن سے نہیں ملنے دیں گی؟" وہ جھلا رہا تھا۔

"میں بہن ہوں تو تمہیں کیوں بہن سے ملنے دوں"۔ وہ الٹ پڑی۔

"ہادی"۔

"جی"۔

"دیکھو مجھے سنبھالو۔ مجھے کسی طرح بہلاؤ۔ ورنہ یاد رکھو یہی کیفیت چند گھنٹے اور رہی تو میں موت کو گلے لگا لوں گی"۔

"وہ سب کیا کر رہی ہیں؟" ہادی کا لہجہ سرد تھا۔

"سو رہی ہیں؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"آپ بھی سو جائیے۔ نیند پوری ہو گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی"۔ ہادی نے بڑے بے رحم انداز میں مشورہ دے کر کھٹاک سے ریسیور رکھ دیا تھا۔

"اب ایسی طبیعت نہیں ہماری جو سونے سے ٹھیک ہو جائے گی"۔ ریسیور ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے قریب سوتی ہوئی گلو کی سمت دیکھا پھر سوز کم بیڈ پر لیٹی ہوئی روبی پر نظر ڈالی۔ اس کے بالکل نزدیک کارپٹ پر سمو کشن کے بیچ میں بے سدھ سو رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اوپر کمروں میں تھیں۔

کتنی خوش نصیب ہیں یہ سب۔ اسے رشک آیا۔

ایک میں ہوں۔

اور میرا دل ہے جیسے قید میں پھڑپھڑاتا ہوا پرندہ۔

کاش میں کوئی چڑیا ہوتی۔

دانہ ڈھونڈتی۔ اڑتے گئی، چیخ کرتی۔

کتنی مصروفیت ہوتی۔ اور کتنا سکھ ہوتا۔

پرندوں کے دل تو اس طرح نہیں ستاتے ہوں گے۔ صرف خون پمپ کرتے ہوں گے۔ نہ بے قرار ہوتے ہوں گے۔ نہ اداس۔

نہ گرفتار ہوں گے نہ پاگل۔

نہ تڑپتے ہوں گے نہ پھڑپھڑاتے ہوں گے۔

کھلی وسیع فضا کی طرح ان کا عشق بھی آزاد ہوتا ہوگا۔ نہ وہ اس میں الجھتا ہو گا نہ ترستا ہوگا۔ خوشی انہیں ڈھونڈتی پھرتی ہو گی۔

کاش میرا دل میری دسترس میں ہوتا۔

بالکل اسی طرح جیسے دل میں آگ لگی تھی۔

میں ہاتھ بڑھا کر روح کو کھینچ لیتی۔ جسم وہاں آرام میں آ جاتے۔ اور پھر میں بھی ان سب کی طرح ہاتھ پاؤں بکھیر کر بے خبر سوتی۔

اس پر عجیب دیوانگی طاری تھی۔

اس نے پھر نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف فون ہادی نے اٹھایا تھا۔

"جی؟"

"میں ہوں روشی"۔

"سوتے ہوؤں کا خون پینا ٹیلی فون کے تاروں کے ذریعے بھلا یہ کوئی انسانیت نہیں ہے"۔ اس کا لہجہ بڑا گستاخ سا تھا۔

"میرے باپ کا دل ہے جیسے چاہے اڑاؤں۔ کسی کو کیا؟" وہ تلخی سے بولی۔

"اب کیا ہوا؟" اس نے کوفت بھرے انداز میں سوال کیا۔

"ہادی... مجھے یقین ہے تمہیں سب پتا ہوگا۔ مجھے بتاؤ بابا صاحب مجھے خالہ سے دور کیوں رکھنا چاہ رہے ہیں۔ ابھی ابھی تو ہیں وہ۔ کیا پتا انہیں آج ہی پرے جا بیٹھے؟" اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

"میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ مہربانی اب آپ مجھے۔ سن رہی ہیں؟" مجھے ہر گز فون مت کیجئے گا۔ ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہا ہوں"۔ اس نے بات مکمل ہوتے ہی فوراً ریسیور رکھ دیا تھا۔

مارے طیش کے روشی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایسا لگا پورا وجود دھماکے سے اڑ جائے گا۔

وہ ریسیور کریڈل پر ڈالنا بھول گئی تھی۔ سارا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"کس کا فون تھا؟" گلو نے کروٹ بدلتے ہوئے غنودگی کے عالم میں اسے دیکھ کر سوال کیا۔

"کسی کا نہیں۔ میں نے کیا تھا"۔ اس نے آہستگی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"ہادی۔ جی چاہ رہا ہے تمہیں ٹکٹکی پر بندھوا کر اتنے کوڑے لگواؤں کہ تمہارے خون سے زمین رنگین ہو جائے اور تمہارا یہ پندار و غرور خاک میں مل جائے"۔

اس کے دماغ میں چنگیزی قسم کے خیالات برپا ہونے لگے۔ مٹھیاں کھل رہی تھیں بھینچ رہی تھیں۔

"سیون سی" سے باہر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اندر شور و غل کا ایک سمندر برپا ہوا تھا۔ وہ سب جاگ چکی تھیں۔ آزادی کے احساس سے خواہ مخواہ قہقہے اڑ رہے تھے۔

"بھئی یہ بابا صاحب کی آناً فاناً مہربانی بالکل سمجھ میں نہیں آئی"۔ سمو سب سے پہلے باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ اور حیرانی کا اظہار کر رہی تھی۔

"جبکہ گھر میں خصوصی مہمان موجود تھے"۔ شینہ نے اچٹتی نظر روشی پر ڈالی جو سوٹ کیس سے اپنے کپڑے نکال رہی

رہی تھی۔

"یہ تو ہے۔" زری نے اپنی چوٹی کے بل کھولنا شروع کیے۔

"شاید روشی کو آئیڈیا ہو۔" روبی نے متوقع انکشاف کی آس میں روشی کی طرف دیکھا۔

"مجھ سے کوئی بات نہ کرے۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"ہاں۔ اس سے کوئی بات نہ کرے۔ یہ یوں بھی اپ سیٹ ہو گی۔" شیبہ اپنے کپڑے اٹھا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کا زہر روشی کی نس نس میں اتر گیا۔

"اف کتنے شاندار پراٹھے بن رہے ہیں۔ خوشبو بتا رہی ہے۔" ثانیہ نے اندر سانس کھینچ کر جلدی سے فضا بحال کرنے کی کوشش کی۔

"ماما سے ایسے پراٹھے تو کوئی نہیں بنا سکتا۔" موہا کو ماما کے پراٹھے یاد آئے۔

"گلو بھی انہی کی اسسٹنٹ ہے۔ فکر نہ کریں۔" گلو مسکرائیں۔

"اسسٹنٹ تو ان کی سروتی بھی ہے۔ کیا نقشہ بناتی ہے پاکستان کا بغیر کشمیر کے۔" زری نے گرم کر سب کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔

"آپی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ قریبی بازار تک ہو آؤں۔" روشی نے بازو پر کپڑے لٹکائے زری سے مخاطب تھی۔

"اکیلی جاؤ گی۔۔۔ ابھی تو ہمارے پاس بہت وقت ہے۔" موہا نے مداخلت کی۔

"اکیلی کہاں۔۔۔ ڈرائیور بھی تو ہو گا۔ اور یہ کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" اس کے انداز میں عجیب کھویا کھویا پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سب چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"جلدی آ جاؤں گی۔" وہ پھر بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو جلدی آ جانا۔" زری نے کچھ سوچتے ہوئے اجازت دے دی۔

"آپ فکر نہ کریں۔"

"غسل کر کے پہلے ناشتہ تو کر لو۔" گلو نے ٹوکا۔

"غسل کرنے جا رہی ہوں مگر ناشتہ کرنے کا موڈ نہیں ہے۔" وہ اسی طرح گم صم انداز میں کھنچی ہوئی باہر نکل گئی۔

"اس کی تھکن نہیں اتری ابھی شاید۔" موہا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بازار تو رات تک کھلے رہتے ہیں۔" شیبہ نے خفگی سے کہا تو موہا بس اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

غسل کے بعد ناشتے کا غلغلہ شروع ہوا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ روشی سیاہ کپڑے بدل کر جا چکی تھی۔ وہ سب فلم لگا کر لاؤنج میں ڈھیر ہو گئی تھیں۔ انہیں پتا تک نہ چلا کہ روشی کب واپس آئی اور اوپر کمرے میں چلی گئی۔

فلم دیکھنے کے بعد وہ شام کو سمندر کی سیر کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ جب فاطمہ (نوکرانی) نے انہیں بتایا کہ اوپر کے کمرے کا

لاک نہیں کھل رہا۔ اسے صاف کرنا ہے۔ شاید لاک خراب ہو گیا ہے۔ یا اندر سے بند ہو گیا ہے۔

"اندر کون ہے جو بند کرے گا؟" زری نے موہا کی شکل دیکھی۔

"روشی نہیں آئی ابھی تک۔" ساگو نے چونک کر وال کلاک پر نظر ڈالی۔ دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔

"موہا روشی نہیں آئی۔" زری کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"تفصیل شاپنگ کر رہی ہوں گی۔ مال بہت بڑا ہے۔" شیبہ ہنسی۔

"آپ کے پاس چابی ہو گی۔ مجھے دے دیجئے۔ شاید خود لاک ہو گیا ہو۔ ان تالوں میں یہی تو خرابی ہے۔" فاطمہ نے زری سے چابی مانگی۔

"ارے تمہیں چابی کی پڑی ہوئی ہے۔ مجھے روشی کی فکر لگ گئی ہے۔ بابا صاحب کہاں گھوم رہے ہیں؟" گلو بے حد پریشان تھیں۔

"اسے کیا بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" شیبہ نے پھر طنز کیا۔

"موہا فاطمہ کو چابیاں دے دو۔۔۔ دروازہ کھول کر دیکھے تو۔" شیبہ نے چڑ کر کہا۔ گلو نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

وہ ابھی بیچ میں ہی تھیں کہ اختر (ڈرائیور) گیٹ پر چوکیدار سے باتیں کرتا دکھائی دے گیا۔

"ہائیں۔ ڈرائیور تو یہ رہا۔ پھر روشی کہاں ہے؟ کیا وہ اکیلی گئی ہے؟" انہیں جیسے شاک لگا۔

"اختر" وہ وہیں سے پکاریں۔

"جی" وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"روشی بی بی گئی تھیں تمہارے ساتھ؟" ان کا دل انجانے خدشات سے کانپ رہا تھا۔ اسے تو یہاں کے راستے کا بھی نہیں پتا۔

"جی ہاں۔"

"تو پھر کہاں ہیں وہ؟" گلو کی جان میں جان آئی۔

"وہ تو جلدی آ گئی تھیں۔ میڈیکل سٹور سے شاید دوائی لینا تھی انہیں۔ بس دوائی لی اور فوراً ہی میں انہیں واپس لے آیا تھا۔"

"کس بات کی دوا؟" انہیں مزید تشویش ہوئی۔

"اگر کوئی دوا چاہیے بھی تھی تو وہ ڈرائیور بھی لا سکتا تھا۔ مگر وہ اس مرض کی۔ کیا ہوا ہے؟" وہ ازحد فکر مند تھیں۔

"پھر کہاں ہے وہ؟" وہ جیسے جھلائیں۔

"میرے سامنے تو اندر گئی تھیں۔ پھر میں نے انہیں نہیں دیکھا۔"

"وہ یہاں آنے پر بالکل رضامند نہیں تھی۔ سارا سفر اس نے بدلحاظی سے کاٹا تھا۔ یہاں آ کر بھی وہ بے چین تھی۔ سوئی بھی نہیں تھی۔ ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔" گلو کے دماغ میں فلم سی چل پڑی۔

"میڈیکل اسٹور سے کیا لینے گئی تھی"۔ انھوں نے پلٹ کر روبی اور بیبی کی طرف دیکھا اور پھر جیسے کسی خیال سے چونک کر کمرے کی طرف دوڑ پڑیں۔

انھیں اس کا جملہ یاد آ گیا تھا جو اس نے دریا بستی سے روانہ ہوتے ہوئے بڑے روہانسے انداز میں کہا تھا۔ "اللہ کرے میری میت ہی اب یہاں آئے"۔

گھو بیگم دوڑتی ہوئی اس کمرے کی طرف آئی تھیں۔ جہاں فاطمہ اسے کھولنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔

"یہ نہیں کھل رہا بی بی"۔ وہ جیسے لٹک کر رو دی تھی۔ گھو نے جیسے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ زمین سے چھت تک بنے روشن دان کی طرف آئی تھیں۔ جس کے درمیانی پٹ انھوں نے صبح کھلے ہوئے دیکھے تھے۔ مگر اب وہ بھی بند تھے اور اندر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔

گھو پر جیسے وحشت سی طاری ہو گئی۔ انھوں نے پاس پڑا ہوا گملا شیشے پر دے مارا۔

"آئیں ہائیں"۔ روبی اور بیبی کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیران پریشان گھو کو دیکھ رہی تھی۔

فاطمہ نے بھی اپنی "کوششیں" ملتوی کر دیں۔ چھناک کی آواز کے ساتھ شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ گھو دیوانہ وار پردہ ہٹا کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرے کا ماحول چونکہ نیم تاریک تھا اس لئے فوری طور پر کچھ بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ بدستور بغیر پلک جھپکے اندر گھور رہی تھیں۔

چند لمحوں بعد انھیں اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ روشی سیاہ کپڑوں میں آڑی ترچھی لیٹی ہوئی نظر آ گئی۔

"روبی! اختر کو اور چوکیدار کو بلا کر لاؤ بھاگ کر۔ جلدی سے"۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا آپا؟" وہ دونوں بدحواس ہو گئیں۔

"دیر نہیں کرو جلدی جاؤ"۔ انجانے وہموں نے انھیں جیسے بے دم کر دیا تھا۔ یہ کیا کیا روشی؟ اور کیوں کیا ایسا؟ حالانکہ وہ دریا بستی سے روانہ ہونے سے بہت پہلے سے بہت چپ چاپ سی تھی۔ جانے اس نے کتنی بار ان سے کہا تھا وہ کراچی جانا نہیں چاہتی۔ وہ خالہ کے پاس رہنا چاہتی ہے۔

مگر یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں کہ جان پر بنا لی جائے ان کا دل ڈوب رہا تھا۔ روبی ڈرائیور کی طرف دوڑی اور بیبی لاؤنج کی طرف۔ آناً فاناً پورے گھر میں خبر پھیل گئی تھی۔ اختر چوکیدار کے ساتھ مل کر دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکیاں اور ملازمین حواس باختہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

مونا اور تانیہ بھاگتی دوڑتی آ رہی تھیں۔

"تمہیں کیسے دھیان آیا"۔ عظمیٰ کے بھی سارے کس بل نکلے ہوئے تھے۔

"ڈرائیور جو سامنے نظر آ گیا تھا، کہہ رہا تھا وہ میڈیکل اسٹور سے کوئی دوا لائی تھی۔ چلتے ہوئے وہ اپ سیٹ بھی بہت تھی"۔ گھو روہانسی ہو کر بتا رہی تھیں۔

دروازے پر پڑنے والی ہر ضرب پر ان کے دل دھڑک اٹھتے۔ شاید اس بار دروازہ کھلے۔

بالآخر دروازہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ سب دروازے پر ٹوٹ پڑے۔ سب سے پہلی سمت زری نے نکالی تھی۔ فاطمہ نے کمرے کی لائٹیں آن کر دیں۔ سرہانے کا پٹ پر سیاہ کپڑوں میں ملبوس بے سدھ پڑی روشی کا چہرہ بے حد پرسکون تھا۔ مونا نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔ "روشی ...... جان ...... اف خدایا"۔ روشی کی حالت ایسی تھی جیسے اس کے حواس بھی مردہ کر دیے گئے ہوں۔

"مونا خود کو سنبھالو"۔ زری نے ٹوکا۔

"گاڑی نکالو ڈرائیور"۔ چوکیدار بہت بوکھلایا ہوا تھا۔ زری نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"دریا خان ...... اٹھاؤ گے اسے؟" وہ بہت مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

چوکیدار نے روشی کو کاندھے پر ڈال لیا۔

"آؤ گھو ...... تم لوگ آرام سے رہو۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی ضرورت نہیں رونے دھونے کی۔ فون کروں گی"۔ زری نے دونوں کو سر پر جاتے ہوئے انھیں تسلی دی۔ اور دریا خان کے پیچھے چل پڑی۔ گھو بھی بمشکل خود کو گھسیٹ رہی تھیں۔

"مرے سے پہلے ہی یہ ہم سے ہار گئی"۔ عظمیٰ کے انداز میں ابھی بھی گھبراہٹ تھی۔

"ابھی اللہ تو ہے نا"۔ مونا نے آنکھیں پونچھیں۔ عجیب سا سکوت طاری ہو چکا تھا۔

"یہ ایسی بھی نکل سکتی ہے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی"۔ تانیہ نے لمبی سانس لے کر سکوت توڑا۔ "ماشاءاللہ" بچی کا پتا چلا اسٹور سے ہیں"۔ عظمیٰ کی ساری تفریح خطرے میں تھی۔ وہ تو سب ہی اس کے ساتھ ہاسپٹل جانا چاہتی تھیں۔ مگر زری نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

ابھی گاڑی نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہوگا اور وہ فون کی گھنٹی کے انتظار میں اپنی اپنی جگہ چپ تھیں۔

"مونا آپی ...... گھر فون کروں؟" روبی کو خیال آیا۔

"نہیں ابھی نہیں"۔ مونا نے منع کر دیا۔

"ہاں ابھی ذرا ہاسپٹل کے فون کا انتظار کرتے ہیں"۔ مونا نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

کمرے میں ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا

ماہین بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ ماما پہلی دفعہ جانے کا پوچھ چکی تھیں۔ اب پھر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"آ جاؤ"۔ اس نے کوفت بھرے انداز میں دروازے کی سمت دیکھا۔

دروازہ کھلا اور باری داخل ہوا۔

ماہین ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ نے ناشتا نہیں کیا؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد باری نے پوچھا۔

"بڑی امی کہہ رہی ہیں؟" "آپ نے چونکہ ناشتہ نہیں کیا تھا' اس لئے کھانا جلدی لگ رہا ہے"۔

"مجھے بھوک نہیں ہے" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"جی" ہاری نے اچٹ کر اس کی سمت بغور دیکھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" وہ فکرمندی سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں الحمدللہ" اس کے انداز بدستور تھے۔

"پھر...؟" وہ کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود کچھ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کچھ بھی نہیں پھر" وہ بےزاری سے گویا ہوئی۔

ہاری نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔

اس کے اردگرد بے شمار دنوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ جن سے وہ روز گزر رہا تھا۔ رویے کی معمولی سی تبدیلی اس کی حساس طبع پر الہام کی طرح اترتی تھی۔

اس نے باغ کی سمت کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جو آدھ کھلی تھی۔ پردہ گرا ہوا تھا۔ اس کے باوجود ادھ کھلے پٹ کا اشارہ واضح تھا۔

"کل میں نے سرسوتی کو دوپٹہ دھونے کیلئے دیا تھا' نہ معلوم کہاں رکھ گئی' ملا ہی نہیں' تم اسے ذرا میرے پاس بھیج دو"

ماہین کے لہجے میں قدرے سکون تھا۔

ہاری کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دریچے کی سمت بڑھا' پردہ پیچھے سرکایا' دریچے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

"صبح کے وقت اسے کھول لیا کریں' تازہ ہوا آتی ہے" اس نے پلٹ کر ماہین کو دیکھا۔

"اور رات کیلئے کیا حکم ہے؟" وہ طنز سے مسکرائی۔

"یہ آپ کا ذاتی کمرہ ہے جیسے چاہے تصرف کریں" وہ بھی مسکرایا۔

"تو پھر آپ کھانا نہیں کھا رہیں؟"

"نہیں' مجھے بالکل بھوک نہیں" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"تھوڑا سا کھا لیں' شام کو آپ بابا اور چچا اور جواد کے ساتھ لمبے سفر پر روانہ ہوں گی"۔

"کہیں نہیں جا رہی میں' روشی کالج سے آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا"

"آپ بابا اور چچا سے خود بات کر لیں"۔

"روشی کالج سے آئے تو بھیج دینا' یہ بابا اور بھائی کا مقدمہ کہاں سے شروع ہو گیا؟ بس تم میری طرف سے انہیں یہ پیغام پہنچا دو میرے دل میں خیرآباد دیکھنے کی کوئی حسرت نہیں' وہ میری سیٹ بک کرا دیں' میں جلد کراچی جانا چاہتی ہوں۔ ہاں اور سرسوتی کو بلا دو"۔ اس نے گہری نظر سے ہاری کا جائزہ لیا۔

ہلکے بادامی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے کسی خیال میں الجھا ہوا وہ بہت بے بس دکھائی دیا۔

"شالوں کو آگ لگاؤ... گھر کیا سارا گیا ہے" اس نے دل ہی دل میں داد دی تھی۔

"نئی اطلاع تو کوئی نہیں پر اس کی اہمیت نہیں ہو سکتی' اس لئے کہ بابا صاحب سرائے گئے ہوئے ہیں" وہ گویا اطلاع تھی۔

"اچھا؟" اسے حیرت ہوئی۔ "لڑکیاں تو آج بہت خوش ہوں گی" اس کے منہ سے نکل گیا۔

ہاری چپ رہا۔

ماہین نے اس کی چپ کو کوئی اہمیت نہ دی۔

"سرسوتی"۔

"میں اس سے معلوم کر لیتی ہوں کہ اس نے دوپٹہ کہاں رکھا ہے"۔ ہاری نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ماہین کی بات اس نے فوراً کاٹ دی تھی۔

"مجھے اس سے ایک اور بات کرنی ہے" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ہاری کو حتمی لہجے میں ٹوکا۔

ہاری جاتے جاتے رک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹا۔ نہایت خود اعتمادی سے اس نے ماہین کے چہرے پر نظریں جما دی تھیں۔ ایک لمحے کو تو ماہین بھی ٹھٹھک گئی تھی۔

"ماہین بی بی! اب سب کچھ دیکھ لیا' سن لیا' پھر کیوں مجھے پریشان کر رہی ہیں؟" اس کے سادہ سے لہجے میں بلا کی گمبھیرتا تھی۔

ماہین نے بری طرح چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"تھوڑے سے شرمندہ ہی نظر آ جاؤ تو ذرا سا بھرم رہ جائے زندگی کا' انسانیت کا"۔ ماہین کے لہجے میں بہت تپش تھی۔

ہاری نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی' پھر مبہم سا مسکرایا۔

"یوں بھی زیادہ باتیں کرنا میری عادت نہیں' اس لئے اس بھی کہوں گا' مجھے وضاحتوں کی اجازت نہیں"۔ اس نے اتنا کہہ کر دروازہ کھولا۔

"ہاری" ماہین نے بےساختہ اسے آواز دی۔

وہ رک گیا اور اس کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔

"تم کون ہو؟"

"آپ کی طرح مجھے بھی اس سوال کے جواب کی تلاش ہے"۔ وہ فوراً باہر نکل گیا تھا۔

گھر نے سہ پہر تین بجے ہاسپٹل سے فون کیا تھا۔ اس کے لہجے میں بے حد پریشانی تھی اس نے تاکید کی تھی کہ فی الفور دریا بستی فون کر کے بابا صاحب کو اطلاع کی جائے۔ روشی کی حالت سخت خطرے میں ہے۔

ان کا فون بند ہوتے ہی مونا نے بڑی عجلت میں دوبارہ نمبر ڈائل کیا تھا۔

اس کی آواز ابھی بھی کپکپا رہی تھی اور ہاتھ بھی۔

حویلی میں اٹینڈنٹ تو ظاہر ہے ہادی ہی تھا۔ دوسری طرف سے ریسیور اسی نے اٹھایا تھا۔

ریسیور اٹھاتے ہوئے اس کا دھیان روشی کی طرف ہی گیا تھا۔ اس نے خود کو جیسے تیار کیا۔ لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا تھا۔

"ہیلو—!" اس نے جیسے گھبرا کر پوچھا۔

"مونا بات کر رہی ہوں۔" مونا کے لہجے میں غیر معمولی پن واضح تھا۔

"جی مونا بی بی" وہ فوراً سنبھل گیا۔

"کون— ہادی؟"

"جی میں ہوں۔"

"بابا صاحب سو رہے ہیں؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ صبح پانچ بجے سرائے چلے گئے تھے۔" اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اور امی ابو اور ماموں؟"

"وہ بھی صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔" اب وہ الجھنے لگا۔ "خیریت—؟"

"خیریت نہیں ہے۔ بابا صاحب گھر آئیں تو فون کر کے فوراً اطلاع کرو کہ روشی نے خودکشی کر لی ہے۔"

ریسیور ہادی کے ہاتھوں سے پھسلنے لگا۔

"جی—؟" اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"ہاں بس یہی کہنا۔" مونا کی آواز بھرا گئی

"کیا کیا ہے انہوں نے؟" اس کی آواز بہت کمزور تھی۔

"گولیاں کھائی ہیں— پوائزن— اچھا جاؤ— خدا حافظ۔" مونا نے ریسیور رکھ دیا تھا مگر وہ ابھی تک کانوں پر لگائے کھڑا تھا۔

روشی کی اپ سیٹ کیفیت یادداشت میں فلم بن کر چل پڑی تو عنوان سمجھ میں آنے لگا۔ اسے اپنے انداز پر بھی جی بھر کے ندامت ہوئی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ضمیر کی خلش اسے کبھی خوش ہونے کا موقع نہیں دے گی۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔

اتنی پیاری روشی؟ کیا—!

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور سر تھام کر سوچنے لگا۔ آس پاس موجود ہر شے اپنی حقیقت اور اثر کھو رہی تھی۔ دنیا ایک دم سے خالی خالی اور ویران لگنے لگی۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھال کر سرائے ڈائل کیا۔ اٹینڈنٹ نے فوراً بابا صاحب سے ملا دیا۔

"ہادی بات کر رہا ہوں خان—"

"ہوں— بولو۔"

"کراچی سے فون آیا ہے ابھی ابھی— مونا بی بی کا۔"

"مونا کا؟ خیریت— کیا کہہ رہی تھی وہ—؟" بابا صاحب ایک دم مضطرب ہو گئے۔

"اچھی خبر نہیں ہے خان۔" ہادی نے انہیں خبر کے لیے تیار کیا۔

"جلدی بولو۔" بابا صاحب کے لہجے میں ایک دم سختی آ گئی۔

"روشی بی بی نے خودکشی کر لی ہے۔"

"زور سے بولو آواز صاف نہیں آ رہی۔" ان کی حواس باختگی واضح تھی۔

ہادی نے انہیں بتانے کے لیے اپنے ہونٹ تقریباً دانتوں سے لگا لیے۔

"خان! روشی بی بی نے پوائزن کھایا ہے۔ ہاسپٹل میں ہیں۔ مونا بی بی بتا رہی تھیں ان کی حالت بہت ہی خراب ہے۔"

"کیوں کیا اس نے یہ سب—؟" ان کی آواز غصے اور صدمے کے ملے جلے اثر سے کانپ رہی تھی۔

"اور کچھ نہیں بتایا انہوں نے۔"

"اچھا تم ایسا کرو گھر میں یار اور جوار سمیت فی الحال کسی کو اطلاع نہ دو۔"

"جی بہتر۔"

"آج کی کراچی جانے والی کسی فلائٹ سے میری اور اپنی سیٹ بک کراؤ۔ پھر مجھے اطلاع دو۔ میں ڈائریکٹ ایئرپورٹ پہنچوں گا۔ تم کراچی فون نہ کرنا۔ میں کر رہا ہوں۔" ان کی آواز میں جیسے صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔

"پھر تاکید کر رہا ہوں گھر میں کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ آج کل وہاں اس کی خالہ بھی موجود ہے— میرے پاس پہلے ہی بہت سے مسئلے موجود ہیں۔" انہوں نے یہ کہتے ہی ریسیور رکھ دیا تھا۔

ہادی نے ریسیور رکھتے ہوئے گھڑی کی سمت دیکھا۔ پھر فوراً ہی ریسیور دوبارہ اٹھا لیا۔ اب وہ اسلام آباد ایئرپورٹ ڈائل کر رہا تھا۔

"بھائی تمہارے اپنے بھی تو دنیا میں ہوں گے جو تمہاری فکر کرتے ہوں گے۔ تمہاری حالت پر کڑھتے ہوں گے۔"

آج وہ بھی ہارے شکایت کے عارف کے برابر لیٹا ہوا تھا۔

"کہیں یار کون اپنا کون پرایا اب تو سب برابر ہیں۔" وہ ہنسا۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

اور وہ کیا ہے کہ

وہ گھڑی ہم زیست اٹھا میری روح

پھر نظر آئے گا تو کہ بھی خفا میری طرح
یہ دعا ، مانگو ہوا وقت نہ آئے واپس
آپ بھی ڈھونڈیں گے اپنوں میں وفا میری طرح

کیا کیجئے۔ اپنے پن کی بھی کچھ شرطیں ہوتی ہیں یہاں بلاوجہ کوئی اپنا نہیں ہوتا"۔ وہ زیر لب بڑبڑا کر ہنس رہا تھا۔

"چھوڑو یہ سب باتیں۔ یہ بتاؤ ہماری درخواست آگے پہنچائی؟" عارف نے رخ موڑ لیا۔

"پہنچادی مگر ابھی لال خان کی مرضی نہیں بنتی۔ ذرا تیز مزاج کی ہے گھروالی"۔ آہستہ آہستہ لائن پہ لاؤں گا"۔

اس نے آسمان کی طرف اڑتے پرندوں کا نظروں سے تعاقب کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنی احتیاطیں بھی دروازے بند کر دیتی ہیں قسمت کے بند دروازے کو کھلوانے کیلئے ذرا ہمت بھی کرنا چاہیے۔ خیر، لال خان سے کہو کہ باہر دیکھنے کو جائے تو ایک ٹوکری پھلوں کا اور ایک ٹوکرا مٹھائی کا لیتا جائے۔ جتنے دن گھر والے بھی مٹھائی کھائیں گے۔ ذرا نرمی سے سوچیں گے۔ ہو سکتا ہے کام بغیر محنت کے بن جائے"۔ وہ پرامید تھا۔

"مال کھا کے ڈکار جانا کوئی اچھی بات تو نہیں"۔ اس کی خوددار طبیعت جھلائی۔

"ڈکار جائیں گے کیوں، کام کر کے دکھائیں گے۔ ارے مٹھائی کھا کر تو پرشادی سے دم کر لیں گے۔۔۔ اور بول"۔ وہ ہنسا۔

"صحت دیکھی ہے لال خان کی؟ دس جوانوں پہ بھاری ہے۔ تیس سال اور چلے گا ابھی۔ اتنی جلدی بوڑھی ہونے والی آسامی نہیں۔ عورت تو چار بچے پیدا کرتی ہے وقت سے پہلے ڈھل جاتی ہے"۔ عارف نے ایک اور پہلو پکڑا۔

"ابھی تمہاری لڑکی کے جوڑ کا نہیں لگتا۔ شادی کو دو سال ہو گزریں گے تو تمہاری لڑکی برابر کی لگے گی"۔

عارف نے بات اور آگے بڑھائی۔

"کیوں بولے جا رہا ہے؟ میں تو لائن پہ ہوں۔ مسئلہ تو گھروالی کا ہے"۔ وہ چڑ گیا۔

"تو تیرے لئے تھوڑا ہی بول رہا ہوں، ڈکٹیشن دے رہا ہوں"۔ وہ حلق پھاڑ کر ہنسا۔

"کیا دے رہا ہے بھائی؟" "یہی کہ تم اپنی گھروالی کے آگے اگل دینا اور بس"۔

"اتنا آسان کہاں یہ سب اگل دینا"۔ وہ زبردستی مسکرایا۔

"اب تو کیا کر رہا ہے یار۔ کمائی والے مرد کے آگے تو عورت جھک جاتی ہے"۔ اس نے بے حد حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

"ارے بھائی تو بہت بھولی ہے ان دنوں رات کو میرے سے دعا کرتی ہے۔ پر بھائی یہ اولاد کا معاملہ ہے"۔ اس نے بہت سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ذہن ایک وقت میں جانے کہاں کہاں بھٹک گیا تھا۔

"مگر اب تم شروع کر سکتے ہو۔ دیکھو بڑی ہمدردی کر رہا ہوں تم سے"۔

"بڑی مہربانی" اس نے عارف کی بات کاٹ دی۔ دیکھ رہا ہوں ذرا ہوا کا رخ، یہ چلتی ہوا کہیں بیچ میں رک نہ جائے"۔

عارف نے پھر اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم مجھ پر اتنی مہربانیاں کیوں کر رہے ہو۔ میں تو تمہارے کسی کام کا بھی نہیں"۔ اس کے ذہن میں شک کا کیڑا سرسرایا تو اس نے بڑی سادگی سے مجبور ہو کر کچھ لمحے میں ذرا رو کر کہا۔

"میں برا نہیں مان رہا، خوش ہو جاؤ"۔ عارف نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"جس نے بھی ہمدردی کا مزا چکھا ہو جس کی سوچ میں بھی اتنی پڑی ہوں اسے اتنی جلدی کسی کا اعتبار کیسے ہو جاتا ہے قصور ہو"۔ اس نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا۔

"دیکھ بھائی اجڑے ہوئے سے دوسرا اجڑا ہوا دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ہم سے دوسرے کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بیوہ بھر کے رکھ کے دکھ پر نہیں لگتا اور دیکھا نہیں جاتا"۔ عارف نے کہا۔

"تم اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ جب بھی تمہاری بات کرتا ہوں ادھر ادھر کی ہانکنے لگتے ہو"۔ اس نے تجسس لیے ہوئے عارف کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

"جس بات سے کچھ حاصل نہ ہو، وہ بات کرنے کا کیا فائدہ۔ اب ہم تو تجھ سے وہ باتیں کرتے ہیں جن میں "حل" بھی ہیں اور "حلوے" بھی"۔ پھر وہ بے تحاشہ ہنسا۔

پھر بھی مجھے خیال تو آتا ہے تمہارا۔ تم اتنے اکیلے کیوں ہو؟ تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں اور پھر تمہارا۔۔۔ بہت دکھی ہو"۔ اس نے عارف کے چہرے پر نظریں جمائیں جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

تمہیں کس بات نے یا کس نے اجاڑ دیا۔ تم اتنے دکھ والے ہو تو تم پر کس کا دوش چل گیا"۔

"بس۔۔۔ بھائی۔۔۔ پریس کانفرنس میں بٹھا دیا تجھے"۔ وہ ہنسا اور کھانسی شروع ہوگئی۔

"وہ پریشان ہو کر اذیت میں مبتلا اسے دیکھنے لگا، جلدی جلدی سینے پر ہاتھ بھی پھیرا مگر کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"جب سینے سے پھندا لگ جاتا ہے تو چیختے کیوں ہو؟" اس نے ناراضگی سے کہا۔

یہی تو بات ہے، اوپر والا نہیں چاہتا کہ ہم ہنسیں۔ ہم ہمدردی کرتے ہیں اور پھنس جاتے ہیں"۔ وہ کھانستے کھانستے بھی بولنے سے باز نہیں آیا۔ تب وہ اس کیلئے پانی لینے چلا گیا۔

واپس آیا تو وہ اپنی کھانسی پر قابو پا چکا تھا۔

اس نے گلاس اسے تھمایا جو عارف نے ایک سانس میں خالی کر دیا۔

"مت پوچھا کرو ایسے سوال جنہیں سن کر پہلے ہنسی کا پھر کھانسی کا دورہ پڑ جائے"۔

عارف نے گلاس گھاس پر الٹنے کے انداز میں رکھا۔

"میں نے تو کوئی ایسا سوال نہیں کیا جسے سن کر ہنسی آئے"۔ وہ الجھا۔

"اچھا" عارف مسکرا کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔ "مجھے تمہارے سوال سن کر بہر حال ایک شعر یاد آ گیا۔ وہ کیا تھا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

"پر تمہاری سمجھ میں خاک نہ آیا ہو گا مگر خیر ہم دوسروں کو کہاں سناتے ہیں"۔

"یہی بات ہے مجھے واقعی سمجھ نہیں آتے تمہارے شعر"۔ اس نے اعتراف کیا۔

"ایک تو تم بات پوری کرنے نہیں دیتے بیچ میں چھلانگ مار دیتے ہو"۔ عارف کے فلسفیانہ ترازو میں پھر خلل واقع ہوا تو وہ جھلا گیا۔ فلسفے کا تسلسل ٹوٹنے سے ایک ضرب سی پڑی تھی دماغ پر۔ وہ "بحالی" کے انتظار میں خاموش ہو گیا اور تیز تیز سانس لینے لگا۔

"ناراض ہو گئے۔ اچھا اب بیچ میں نہیں بولوں گا"۔ وہ اسے چپ دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا۔

"ارے نہیں یار ناراض وراض نہیں ہوتے ہم۔ جب چپ ہوتے ہیں تو کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں"۔ اس نے گھاس نوچتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

"اب کیا سوچنے لگے؟" اسے نہ جانے کیوں عارف کی سوچ سے دلچسپی ہو جاتی تھی۔

"کچھ نہیں، بس یہی کہ

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

اسے افسوس ہوا خوامخواہ اسے چھیڑا، پھر ایک شعر — اس کا سر پیٹنے کو دل چاہا تھا۔

یہ کوئی سکون کا موقع نہیں تھا کہ وہ ڈریسنگ کا اہتمام کرتا۔ اس نے وارڈ روب کھولی تو سامنے سرمئی سفاری سوٹ نظر آیا، اس نے وہی پہن لیا۔ تین چار شلوار سوٹ ایک چھوٹے سے سفری بیگ میں رکھے، ایک دو کتابیں، تین چار رومال، "سن گلاسز"، گھر میں پہننے والی چپل اور ایک واک مین۔ اس نے بار بار روشی کو لان کے کونے میں کتاب ہاتھ میں تھامے واک مین سے موسیقی سنتے دیکھا تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" وہ ڈیڈی ای کو بتا کر کہ وہ بابا صاحب کے ساتھ کراچی جا رہا ہے، راہداری عبور کرنے ہی والا تھا کہ اسے عقب سے ماہین کی آواز آئی۔

وہ قدرے چونک کر رہ گیا۔

"کہیں کی نہیں، بس ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں"۔ وہ نظریں چرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

"مگر یہ تو پارٹی میک اپ ہے"۔ وہ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ارے نہیں اتنا تو باہر جاتے ہوئے چل جاتا ہے"۔ وہ خفیف سا ہو کر مسکرا دیا۔

نہایت معصوم اور بھلی مسکراہٹ تھی۔

"مجھے تم سے نہایت ضروری باتیں کرنا ہیں، چاہے کچھ بھی ہو جائے میں آج رات کسی کو بتائے بغیر یہاں سے چلی جاؤں گی، سنا؟"

وہ بہت سنجیدگی سے دھمکی آمیز گفتگو کر رہی تھی۔

"جی کہیے"۔

"کیا کہیے؟" وہ سنجیدہ بھی تھی اور قدرے برہم بھی۔

"یہی کہ آپ کو مجھ سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں، اچھا خدا حافظ"۔ اس نے قدم بڑھائے۔

"میں انتظار کروں گی"۔

"جی بہتر"۔ اسے اس وقت کسی بھی قیمت پر جان چھڑانا تھی۔

ڈرائیور تو بابا صاحب کے ساتھ سرائے گیا ہوا تھا۔ وہ مردانہ ہال کی طرف چلا آیا۔

"قاسم! یار ذرا شہر تک ڈراپ تو کر دو"۔

"کہاں جا رہی ہے سواری؟" اسے شہر جانے کے خیال سے حیرت ہونے لگی۔

"ایمرجنسی ہے، دیر نہ کرو، بابا صاحب نے بلایا ہے"۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"بابا صاحب نے؟ سرائے تک چھوڑ آؤں؟" اس نے بدحواس ہو کر کھونٹی سے لگی شرٹ اتاری اور جلدی جلدی پہننے لگا۔

"نہیں بس۔ شہر سے باہر کروں گا کچھ۔ وہ مسئلہ اس لئے ہے کہ ڈرائیور تو ہے نہیں، گاڑی لے جاؤں تو واپس کون لائے گا؟"

"تو کیا کئی دن قیام و طعام ہو گا سرائے میں؟"

"چاہیے!" اس نے سوالیہ انداز سے باری کو دیکھا۔

"ہے میرے پاس، ہری اپ پلیز، ایک ایک لمحہ قیمتی ہے"۔ وہ بہت الجھا ہوا تھا۔

"بڑی کٹ میں ہو، کہاں کی تیاری ہے؟" جواد ہال میں داخل ہوا۔

"کام سے جا رہا ہوں"۔ اس نے جواد سے نظریں چرائیں۔

"کام سے تو نہیں لگ گئے؟" اس نے پاؤں جوتوں سے آزاد کر کے سکون کا سانس لیا۔

وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس کی شرارت سے لطف نہ اٹھا سکا۔ اس سے پیشتر کہ مزید گفتگو ہوتی یا بات آگے بڑھتی وہ باہر نکل گیا۔ بابا صاحب کو اس نے فون کر دیا تھا اور اسے یقین تھا وہ اس سے پہلے ایئرپورٹ پہنچ جائیں گے۔

اور جب رات سوا آٹھ بجے اس نے ایئرپورٹ کے احاطے میں قدم رکھا تو بابا صاحب کے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر ان کی موجودگی کی اطلاع دی۔ اس نے بابا صاحب کو سلام کیا اور وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ ٹکٹ حاصل کر کے پھر بابا صاحب کو لے کر اندر چلا گیا۔

بورڈنگ کارڈ کیلئے بھیڑ میں کھڑے کھڑے اس نے بابا صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی چھڑی کو ۔۔۔ اضطراری انداز میں زمین پر مار رہے تھے۔ پیشانی پر لکیروں کا جال گہرا تھا۔ اتنی بھیڑ اور شور کے باوجود وہ ایک بے خبری کی کیفیت میں تھے۔ ہاری کو کئی بار محسوس ہوا جیسے وہ خود سے باتیں کر رہے ہوں۔

فلائٹ میں ابھی دیر تھی۔ وہ لاؤنج میں ایک صوفے پر برابر بیٹھ گئے۔

یہ ایئرپورٹ کا سب سے بارونق حصہ تھا۔ مختلف شہروں کے باسی یا مسافر اپنی اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے۔

بچوں نے عجب چہل پہل کر رکھی تھی۔ بھاگ دوڑ بھی رہے تھے اور اپنے اپنے سرپرستوں سے فرمائشیں بھی کر رہے تھے۔

گود کے بچے کا رونا دھونا بھی شور کا ایک حصہ تھا۔ کچھ بے ہنگم اردو انگریزی میں ہونے والی اناؤنسمنٹ ماحول میں سرے سے ہلچل پیدا کر رہی تھی۔

اور اس کے باوجود وہ دونوں اپنے اپنے دھیان میں تھے۔ ان کی فکر کا تسلسل کوئی بات کوئی چیز توڑ نہیں پا رہی تھی۔

"اور کچھ بھی کہا تھا مومنہ نے ۔۔۔؟" آخر بابا صاحب نے چپ توڑی۔

"جی نہیں"۔

"دوبارہ فون نہیں آیا؟"

"جی نہیں"۔

"تم نے اطلاع دی؟"

"جی"۔

"کون ملا تھا فون پر؟"

"روبی"۔

"کچھ کہا نہیں اس نے؟"

"جی نہیں"۔

"تم نے بھی کچھ نہیں پوچھا؟"

"وہ بہت رو رہی تھی"۔

"تمہیں چاہیے تھا گلو سے بات کرتے"۔

"وہ اسپتال میں ہیں روشی بی بی کے پاس"۔

"اور زری؟"

"وہ بھی"۔

"پھر تو مومنہ کو بلاتے فون پر"۔

"وہ بھی شام کو اسپتال چلی گئیں ۔۔۔ روبی نے بتایا تھا"۔

"ہارون آگئے تھے گھر؟"

"جی نہیں"۔

"ماہین سے ملاقات ہوئی؟"

"جی"۔

"کیا بات ہوئی؟"

"میں نے ضروری کام کا کہہ کر جلدی کا اظہار کیا۔ موقع نہیں دیا انہیں بات کرنے کا"۔

"ہوں روشی کا نہیں پوچھا؟"

"میں نے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں دیا"۔

"اچھا کیا۔ یہ بڑی ایک مسئلے کی طرح الجھ رہی ہے۔ ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہے"۔

ہاری خاموش رہا۔

"اس نے انتہائی قدم اٹھا کر ہماری نسلوں کی عزت پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے ہم اسے معاف نہیں کر سکتے"۔ ان کا چہرہ مارے جذب کے سرخ ہونے لگا۔

"فی الحال تو وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے"۔

"ہمیں اس کی موت کا ذرا افسوس نہ ہوگا"۔ ان کا لہجہ پرجلال تھا۔

ہاری کا دل کہیں کسی اتھاہ میں اترا۔

"ہاری؟"

"جی خان"۔

"خاندانی وقار نہ جانے کتنی نسلوں کی محنت کا جوہر ہوتا ہے دولت صرف عیب چھپاتی ہے خون نہیں ہوتی۔ ہم اپنے پرکھوں کی محنت ایک گھڑی میں ٹھکانے لگانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ہر روشنی نور نہیں ہوتی۔ چھن چھن کر مختلف مرحلوں سے گزرتی ہے تو نور بنتی ہے۔

اسی طرح خاندان کا تاج ہوتا ہے جس کی محنت و ریاضت میں صدیوں اور پرکھوں کے لشکر کا حصہ ہوتا ہے۔

دولت مندوں کا شمار نہیں ہو سکتا مگر خاندانوں کا شمار ہو سکتا ہے۔ اچھا نسب اس دنیا میں اعزاز ہے۔ ظفری نسب روایتی ہے مگر نسب نمبر ایک ہے ہم گراں ہیں اپنے نسب کے وہ چار لوگوں کی خاطر ہزاروں کا نقصان نہیں کر سکتے۔ تمہیں شاید پتہ ہو ظفری کی بیوی کم نسب ضرور لائے ہیں وہ اس لئے کہ ظفری میں وہ باپ بننے کی صلاحیت نہیں۔ بچپن سے آج تک اس کے بیگم اس میڈیکل ٹیسٹ ہوتے ہیں ہم اپنے ایک ایک بچے سے باخبر ہیں"۔

ہاری جو مسلسل خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا ایک دم چونک پڑا۔

زری نے ڈاکٹر کو روک کر اس انداز میں پوچھا تھا کہ کوئی خطرناک بات تو نہیں اور ہر چند ڈاکٹر نے نفی میں جواب دیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں جو فکر اور الجھن تھی سوہا تو اسے دیکھ کر ہی حواس کھو بیٹھی تھی۔

اب گو ادھر روشی کی طرف ٹکٹکی لگا کر بیٹھ گئیں اور ادھر زری سوہا کی طرف......

رات کے پونے گیارہ بج چکے تھے۔ بابا صاحب بس پہنچنے ہی والے تھے۔

ایک تو ناگہانی اس پر مستزاد بابا صاحب کی آمد...... گو کے سینے میں ایک دھکڑ پکڑ شروع ہو گئی تھی۔

"ہائے روشی! کیا ہو گیا تیرا؟" انھوں نے رحم بھری نظروں سے ہوش و حواس سے بیگانہ روشی کی طرف دیکھا۔ "ا! میری الٰہی روشی کی جان بچ جائے...... افسوس جان بچ کر بھی نہ بچے گی کیسی رسوائی کی بات ہے"۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئیں۔ اب تک بہت ضبط سے کام لیا تھا مگر جیسے اب دل پر اختیار نہ رہا تھا۔ پھر بھی ذرا لحاظ ضرور تھا کہ آس پاس چلتے پھرتے لوگوں کو شبہ بھی نہ ہو کہ وہ رو رہی ہیں۔ ناک بہتی تو رومال سے پونچھ لیتیں۔ بس ذرا دیر کو سر اٹھاتی تھیں پھر گھٹنوں میں دے لیتی تھیں۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ تب زری نے آکر بتایا کہ سوہا کو ہوش آگیا ہے مگر سسٹر کہہ رہی ہے اسے ابھی وہیں لیٹا رہنے دو یا فوراً گھر لے جاؤ"۔

"اختر تو بابا صاحب کو لینے ایئر پورٹ گیا ہوا ہے۔ وہ آجائے تب ہی لے جا سکتے ہیں"۔ وہ زری سے نظریں چرا کر جواب بھی دے رہی تھیں اور ناک بھی پونچھ رہی تھیں۔

"رو رہی ہو گو......؟" زری کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے چونک کر شیشے کے پار دیکھا تھا۔ روشی ہنوز پہلی سی حالت میں تھی۔

"بس ایسے ہی...... سگی بہنوں سے بڑھ کر تو رہے ہیں اس کے اگر اسے کچھ ہو گیا تو میرا دل پھٹ جائے گا"۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"اللہ نہ کرے"۔ زری نے سر اپنے سینے پر لگا لیا۔

"اس نے کیوں کیا یہ سب؟ کس شے کی کمی ہے اس کے پاس۔ بابا صاحب تک اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کر جاتے ہیں"۔ وہ اس طرح رو رہی تھیں جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔

زری جو گو کے حوصلے سے تقویت پکڑے ہوئے تھی خود بھی آنسو بہانے لگی۔

ہاری بابا صاحب اور اختر سے چار قدم پیچھے ہی چل رہا تھا۔ بہت سارے وسوسے اس کی جان کو لگے تھے۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اب جو سامنے گو اور زری کو گلے لگ کے روتے دیکھا تو جیسے اپنی جگہ پتھر کا ہو گیا۔

اس حویلی میں ڈھیروں لڑکیاں ہیں...... مگر!

جو شہزادیوں کا سا طمطراق۔

ماسکوں کی سی حکمت۔

آقاؤں جیسا طنطنہ پیدا کرتی تھی اور اس کے اندر سے اٹل ارادہ کرنے والا کمال رہ گیا تھا وہی جیسے اس کے لیے پیچ سامنے آ رہا تھا۔

وہ اتنی بے خوف تھی کہ اس کی مردانگی دلیروں میں پچھاڑنے لگی تھی۔

وہ ستون تھام کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

"بی بی آغا جان تشریف لے آئے ہیں"۔ اختر نے رونے دھونے میں مصروف گو اور زری کو مخاطب کیا۔

گو ہڑبڑا کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ زری کے ساتھ سارے عالم جیسے سوچ کے پیچھے رہ گئے۔ وہ بھی پیچھے کھڑی رہ گئی۔

بمشکل منہ سے "السلام علیکم" نکل سکا تھا۔

"وعلیکم السلام! ڈاکٹر کو ادھر بھیج کر بات کراؤ"۔ بابا صاحب جوان کے رونے کی وجہ سے قدرے ٹھٹک گئے تھے شیشے کے پار نظر ڈالتے ہی اپنی وضع میں واپس آگئے۔

"جی اچھا" زری ڈاکٹر کو بلانے دوڑی گئی۔

"کوئی ایسی بات جو تمہارے علم میں ہو جس کی وجہ سے یہ سب ہوا؟" وہ گہری نظر ڈال کر پاس رکھی بینچ پر بیٹھ گئے۔

"جی نہیں میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ شاید وہ کراچی آنا نہیں چاہتی تھی"۔ گو قدرے جھجک کر گویا ہوئی تھیں۔

"ہوں!" بابا صاحب نے گہری سوچ کا غماز ایک لمبا ہنکارا بھرا۔

"مگر بیٹی! کراچی آنا یا نہ آنا ایسی خاص بات نہیں کہ انسان زندگی داؤ پر لگا بیٹھے۔ مسئلہ کچھ اور ہے بلکہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور"۔ ان کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

"بابا صاحب! ڈاکٹر اپنے کمرے میں ہیں" آپ وہیں آ جائیے' آرام سے بات ہو جائے گی وہاں"۔ زری نے آکر انھیں گہری سوچ کی دلدل سے باہر نکالا۔

"یہاں بچی موت سے لڑ رہی ہے۔ وہ وہاں جھک مار رہے ہیں"۔ اصولاً تو انھیں اس کے ہوش آنے تک کمرے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ اب میں ان نوابوں سے دفتر میں ملوں"۔ دلاور علی خان چل کر جانے کے احساس سے ایک دم مشتعل ہو گئے۔

ایک قہر آلود نظر انھوں نے آکسیجن ماسک کی مرہون منت روشی پر بھی ڈالی تھی۔

"یہ ہاسپٹل پرائیویٹ ہے؟" وہ زری سے مخاطب ہوئے۔

"جی...... بابا صاحب!" "ان کو ہم دیکھ کر پیسے ہی حلق میں کانٹے پڑ جاتے تھے۔"

"ویسے بھی ہم بھاڑیں گے اور نخرے بھی ہم اٹھائیں گے۔ تف ہے ایسی اولاد پر جو ایسے لوگوں کے سامنے وہ کوڑی کا کر کے رکھ دے"۔

وہ دونوں بے بسی سے دلاور علی خان کی صورت دیکھنے لگیں۔

اس وقت مشکل گھڑی تھی۔ ڈاکٹروں سے بدترین کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ جبکہ کیس بھی "خودکشی" کا تھا۔

ہادی کے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ اصل صورتحال تک پہنچنے تک اب اس کی رسائی تھی۔ وہ تیزی سے ... کران کی جانب بڑھ جاتا کہ بات گھر تک نہ پہنچے۔

"خان"۔ اس نے انہیں پشت کی طرف سے پکارا۔

"خان!! ڈاکٹر تو وہ ہیں ظاہر ہے یہیں ہوگا۔ اب رات بڑھ گئی ہے' اس لیے تھوڑی دیر کو چلا گیا ہوگا"۔ خود گمی کا کیس ہے ابھی ذرا نازک ہوگی خان۔ پھر صورتحال کنٹرول میں ہوگی۔ ورنہ مسئلہ ہو جائیگا"۔

اس کو سب بابا صاحب کا رعب کنٹرول کر کے چھوڑتے تھے۔ اس لیے کہ حیرت انگیز بات تھی ۔۔۔ کہ بابا صاحب اس کی ہر بات کو سنتے تھے اور باقاعدہ نوٹس لیتے تھے۔ یہی ہوا۔ اس کی دھیمی آواز اور پتے کے الفاظ جیسے ہی ان کے کان میں اترے۔ ان کے چہرے پر موجود تناؤ کی کیفیت معدوم ہونے لگی۔

"تم بھی چلو ہمارے ساتھ' تم ہی بات کرو گے ان "افلاطونوں" سے۔ ہم کلام نہیں کریں گے جو مریض سے بیٹھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں"۔ وہ چھڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی"۔ ہادی شیشے کے اس پار نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک دم چونک کر ان کے پیچھے ہو لیا۔ گلو اور زری کو وہیں ٹھہرے رہنے کا اشارہ کیا۔

"شکر ہے ہادی ساتھ آیا ہے"۔

"ہا معقولیت کی حد تک ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ ایسا لگا جیسے "بچوں کی ماں آ گئی ہو"۔ زری کھسیا کر کہہ رہی تھی۔ افسردگی کے ماحول میں لمحہ بھر کیلئے مسکراہٹ کی کرنیں چمکی تھیں۔ ایسی ہی بے ساختہ مسکراہٹ جیسے کہ بے ساختہ آنسو ہوتے ہیں۔

دونوں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ بابا صاحب اور ہادی کو دوبارہ اس طرف آتے آتے آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔

"زری بی بی! آپ لوگ جائیں' میں ہوں یہاں پر"۔ ہادی ان سے مخاطب تھا۔

"ہم یہیں ٹھیک ہیں' تم تھک گئے ہو' آرام کر لو"۔ گلو وہاں سے کسی طرح ہلنے کو راضی نہ تھیں۔

"ہادی ٹھیک کہہ رہا ہے' تم لوگ گھر چلو' اب کوئی بات نہیں"۔ بابا صاحب اپنے مخصوص فیصلہ کن لہجے میں مخاطب ہوئے۔

دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔

"میں سونا کو لے کر آتی ہوں"۔ زری بادل نخواستہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سونا کہاں ہے؟" بابا صاحب جو گم صم کیفیت میں روشی کی سمت متوجہ تھے' ایک دم چونک پڑے۔

"وہ ادھر وارڈ میں ہے' بے ہوش ہو گئی تھی"۔ زری جلدی سے بولی۔

"کیوں بے ہوش ہو گئی تھی' طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟" وہ پریشان سے نظر آئے۔

"وہ رو رو بہت رہی تھی' روشی کی وجہ سے"۔ گلو نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"احمق"۔ انہوں نے بہت کوفت محسوس کی۔ "اب کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے' آپ لوگ چلیں میں لاتی ہوں اسے"۔ گاڑی گیٹ کے ساتھ ہی ہے ناں' انور؟" زری نے کونے میں کھڑے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"جی بی بی؟"

"ہوں اچھا ہم گاڑی میں بیٹھتے ہیں' تم سونا کو لے آؤ"۔ گلو اٹھ بیٹھی۔

گلو روشی کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہادی! میرا دل ابھی نہیں چاہ رہا۔ یوں بھی نیند تو آئے گی نہیں"۔ وہ افسردگی کو سمیٹتی ہوئی تھیں۔

"پلیز ۔۔۔!" ہادی نے بس ان سے اتنا ہی کہا۔ تب وہ آہستہ قدموں سے ڈرائیور اور بابا صاحب کے پیچھے چل پڑیں۔

"ہادی!" وہ جاتے جاتے ٹھہر گئیں۔

"جی!"

"فون کر کے صورتحال بتاتے رہنا۔ میں تمہیں جاگتی ہوئی ملوں گی"۔

"بہتر ۔۔۔ آپ اطمینان رکھیں"۔ وہ اس جگہ بیٹھ گیا جہاں اب تک گلو بیٹھی ہوئی تھیں۔

"بی بی! کھانا کھا لیں۔ بڑی بیگم کہہ رہی ہیں' بھوک نہ ہو تو تھوڑا سا ہی کھا لیں"۔ ماما جی دروازے میں کھڑی تھی اور بہت سہمے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"پہلے روشی کی شکل دکھاؤ؟" ڈائننگ ہال میں اسی کے ساتھ جاؤں گی"۔ وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔

"وہ تو کل رات کراچی چلی گئی تھیں"۔ ماما نے سادگی سے بتایا' جس میں قدرے حیرانی بھی شامل تھی۔

"کیا ۔۔۔؟" وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا کہا تم نے' رات کراچی چلی گئی مجھ سے ملے بغیر ۔۔۔ اور وہ؟" اس کا ذہن تیزی سے چک پھیریاں کھانے لگا۔

"رات ۔۔۔ تمہارا مطلب ہے کل رات؟" وہ ماما کے نزدیک چلی آئی۔

"جی بی بی! کل رات"۔ وہ ماما جی کے انداز پر قدرے پریشان نظر آنے لگی تھی۔

"اکیلی یا اپنے پاپا کے ساتھ؟" اس نے کل سے یاور علی خان کو بھی تو نہیں دیکھا تھا۔

"ساری لڑکیاں گئی ہیں بی بی' سب ہی کے ساتھ گئی ہیں وہ"۔ ماما نے وضاحت کی۔

"سب گئی ہیں؟" یہ ایک اور چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"اچھا ماما! ہادی کو بلاؤ"۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"وہ جی ۔۔۔ خان حویلی میں نہیں ہیں"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"پھر کہاں ہیں؟" وہ بمشکل اسے ماما کو دیکھنے لگی۔

"جی مجھے پتا نہیں۔ بڑے خان بھی تو نہیں ہیں' جہاں بڑے خان ہوتے ہیں تو خان (یاور) بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں"

"۔ ماما پے در پے سوالات سے پریشان نظر آ رہی تھی۔

"بڑے خان کہاں گئے ہوئے ہیں؟" اس سوال کے جواب میں بھی ماسی کا [illegible] تھا۔

"جی مجھے پتا نہیں' ہم ملازموں کو ایسی باتیں پتا نہیں ہوتیں؟" ماما نے اس کے مزید سوالات کے حملوں کو روکنا چاہا۔

"پھر کیسی باتیں پتا ہوتی ہیں؟" اس نے دانت پیس کر پاس رکھی کتاب اٹھا لی۔

"ملازم کو تو جی صرف اپنے کام سے مطلب ہونا چاہیے۔ ہمیں ضرورت بھی کیا ہے پتا کرنے کی' آقاؤں کے کاموں سے ہمیں کیا مطلب جی" وہ ماہین کو غصے میں دیکھ کر پریشان ہی ہو گئی۔

"اچھا تم جاؤ" اسے مزید وہ کتاب پکار رہی تھی۔

"آپ آ رہی ہیں کھانا کھانے' میں بڑی بیگم کو کیا جواب دوں؟"

"آ رہی ہوں میں" اس نے جیسے کوئی تہیہ کر لیا تھا۔

ماما کے جاتے ہی اس نے خود پر نظر ڈالی۔ رات سے اتنا موڈ خراب تھا کہ اس نے خود پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اب ظاہر ہے کھانا تو محفل میں ہونا تھا۔

اس نے فیروزی شلوار کرتہ اور سیاہ دوپٹے کا انتخاب کیا۔ فیروزی کپڑوں پر سیاہ کشیدہ کاری اور کالے دوپٹے پر فیروزی کشیدہ کاری نے لباس کو بہت خوبصورت اور جاندار بنا دیا تھا۔ جیولری تو وہ کبھی کبھار خاص مواقع پر ہی تبدیل کرتی تھی۔ ڈائمنڈ کے ننھے منے آویزے ہمیشہ اس کے کانوں میں رہتے تھے۔ ہونٹوں پر پنک لپ اسٹک کا ٹچ دیا اور دوپٹا شانوں پر پھیلا کر اپنے رہائشی کمرے سے باہر آ گئی۔

ذہن میں ادھیڑ بن جاری تھا' مگر چہرہ پرسکون تھا۔ وہ ڈائننگ ہال تک پہنچانے والے لاؤنج میں داخل ہی ہوئی تھی کہ سامنے سے یاور علی خان آتے ہوئے دکھائی دیے۔

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ "اسلام علیکم" اس کا انداز غیر شعوری طور پر طنزیہ ہو گیا۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہیں آپ؟"

"میں کھانا کھا کر ابھی آتی ہوں' [illegible]"۔ اس نے ان کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات کی۔۔۔ اور آگے بڑھ گئی۔

یاور علی خان اسے جاتے ہوئے دیکھتے گئے یہاں تک کہ اس کا سیاہ لہراتا ہوا آنچل موڑ پر غائب ہو گیا۔ تب وہ جیسے چونک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

آج کھانے پر وہ چہل پہل نہیں تھی جو ان کی موجودگی میں نظر آتی تھی۔

جہاں سے وہاں تک جیسے [illegible] رہی تھیں۔ سامنے ہی عالم تاب [illegible]

زرد جوڑے کے دوپٹے میں جیسے اس طرح [illegible]

ہی تھا۔ گوشت سے پر کلائیوں میں چمکتی ہوئی سونے کی چوڑیوں کی جھلک ہوتی ہوئی کانوں کے [illegible]

روشن ہی محسوس ہوتی۔

"اسلام علیکم!" اس نے حاضرین کو سلام کیا۔ عالم تاب نے اسے اپنے پہلو میں آنے کا اشارہ کیا۔

وہ وعلیکم السلام کی آوازوں کے بیچ ان کی ہدایت کے مطابق بیٹھ گئی۔

"طبیعت کیسی ہے جناب؟ تم نے ماما سے کھانا اوپر ہی منگوا لیا تھا [illegible]"

جہاں "راز" ہوتے ہیں وہاں "وضاحتیں" بھی ہوتی ہیں۔

"جی ٹھیک ہوں اب' بس سر میں درد بہت تھا۔ رات سو نہیں سکی تھی۔ پتا نہیں باغ کی طرف سے کیسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے زنجیریں کھنک رہی ہوں"۔ اس نے ان سب کے ردعمل سے بے نیاز ہو کر پلیٹ اپنے سامنے کھسکائی۔

مگر اسے محسوس ہوا کہ وہ تمام خواتین کے علاوہ اس کی بات پر اور کوئی نہ چونکا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے برابر بیٹھی ہوئی عالم تاب کا ایک لمحے کو ٹھٹکنا صاف محسوس کیا تھا۔

"یہ نوکر بعض اوقات بہت لاپرواہی کرتے ہیں' کتے اصطبل میں کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ رات کو باغ میں بھاگتے پھرتے ہیں۔ بہت خونی قسم کے کتے ہیں۔ بڑی بھاری زنجیریں ان کے گلے میں ڈالنا ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر کو بھی ان کو کھولتے ہیں تو زنجیروں کے ساتھ تاکہ قابو کرنے میں آسانی ہو۔ [illegible] ہوئی تمہیں"۔ انہوں نے ڈش اس کی سمت بڑھا کر اظہار افسوس کیا۔

ماہین نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی بے لگام تیز مسکراہٹ کے آگے بند باندھے۔

"آج یہاں سرسوتی نظر نہیں آ رہی"۔ ماہین نے نہ جانے کیوں عالم تاب کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔ جانے وہ کس تجسس کی تلاش میں تھی۔

"کمبخت صبح سے غائب ہے"۔ سائرہ ممانی نے قاب اس کے سامنے رکھتے ہوئے قدرے خفگی کے انداز میں کہا۔

"ڈھیر پڑا ہوا ہے کپڑوں کا استری کے لیے۔ ایک تو کام بھی کراچی گئی ہوئی ہے اور یہ پہلے ہی کھسکی ہوئی ہے۔ سارا کام کیا کیا دیکھیے"۔

سرسوتی کا ذکر آتے ہی جیسے انہیں اپنی پریشانیاں سر سے یاد آ گئیں۔

ماہین کے صرف کان سائرہ ممانی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ آنکھیں بدستور عالم تاب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے نوٹ کیا کہ عالم تاب نے سرسوتی کی غیر موجودگی پر نہ کوئی تبصرہ کیا اور نہ ہی اس سے متعلق کوئی سوال کیا۔ وہ اسی طرح کھانا کھانے میں مصروف رہیں۔ جیسے پہلے تھیں۔ حالانکہ گھر کی منتظم کی حیثیت سے سرسوتی کی غیر موجودگی کی وجہ۔۔۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھی۔ اس نے صاف محسوس کیا کہ وہ سرسوتی کے ذکر کو ٹال رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ یہ موضوع ختم ہو

جانے وہ اسی طرح مطمئن تھیں۔ جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں۔

"آنے تو گیا ہے گا وہ جوتے اور کپڑے کہاں غائب ہو جاتی ہے بغیر بتائے' نوکری نہیں ہوتی تو سیدھا سیدھا جواب دے"۔ جہاں آرا پھوپھی نے بھی بھاوج کی تائید کی۔

عالم تاب تو جیسے گم کھا کر چپ تھیں۔

"آپ واقف نہیں ہیں اسے؟" ماہین نے عالم تاب کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں — ہاں —— واقف ہوں' آئے گی تو واقف ہوں گی"۔ انہوں نے رکھی سے انداز میں جواب دیا۔ جیسے کہ بچوں کا دل رکھنے کیلئے ان کی حسب خواہش کوئی بات کر دی جاتی ہے۔

اور ماہین اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ عالم تاب اس گھر کے ایک راز سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ حصہ دار ہیں۔

"اس کی ماں بہت محنتی عورت تھی۔ اس گھر کی خدمت کرتے کرتے مر گئی۔ اس پیسے تک حلال بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ نازنین تو اس کے بغیر کہیں جاتی تک نہیں تھی۔ ایک تو ماشاءاللہ اس کے بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ اس سے سنبھلتے نہیں تھے۔ سرسوتی کی ماں کی ڈیوٹی تھی' اس کے سر کی مالش کرے' سنبھالے۔ کہتی تھی آپا کس اگر یہ کہیں ادھر ادھر ہو جائے تو میرا گزارا تو نہیں ہو گا۔

اس کو مالش کی اتنی عادت ہو گئی جیسے کوئی نشے کا عادی ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جب وہ اپنے میکے گئی تو کراچی سے دوسرے ہی دن فون آ گیا تھا کہ "روپا" کو فوراً جہاز سے بھیجیں' مجھے نیند نہیں آتی۔ اس کی مالش کے بغیر۔ سچ سمجھوں میں "ملکہ" جیسی زندگی گزاری۔ اتنا عیش و آرام تو بابا صاحب کی بیٹیوں کو بھی نہیں ملا ہو گا۔ جو اسے اس گھر کی بہو کی حیثیت سے ملا' مگر بے چاری تھوڑی عمر لائی تھی"۔

رئیسہ یعنی نازنین کی بڑی نند سرسوتی سے اس کی ماں روپا اور روپا سے نازنین پر آ کر رک گئیں۔ سرسوتی کا ذکر اور معاملہ تو ایک طرف جا پڑا اور نازنین کی یادیں شروع ہو گئی تھیں۔

"بابا صاحب نے جتنے لاڈ پیار نازنین سے کئے' کسی اور کے حصے میں نہیں آئے"۔ رئیسہ سے چھوٹی جہاں آرا نے لقمہ لگایا۔

"ہاں بعض لوگوں کی اس معاملے میں قسمت بہت تیز ہوتی ہے۔ ہر ایک سے محبت پاتے ہیں۔ اپنی شرط پر زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سے پیار کیا جاتا ہے۔ ان سے لاڈ کئے جاتے ہیں"۔ عالم تاب نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ گفتگو میں باقاعدہ حصہ لیا۔

ماہین جو بھی کے ذکر میں کھوئی گئی تھی' ایک دم چونک کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"اس طرح مت دیکھو۔ یقین کرو میں بھی اس کے چاہنے والوں میں شامل رہی ہوں' دیورانی نہیں سمجھا اپنی چھوٹی بہن سمجھتی تھی۔ اس کے ہاتھوں پیروں میں مہندی بہت سجتی تھی۔ میں ہر ہفتے مہندی کا پیالہ لئے اس کے پیچھے پھرنے لگی تھی۔۔

نہیں لگواتی تھی۔ کہتی تھی بابا و علی تو بہت پسند کرتے ہیں اور بہت تعریف کرتے ہیں میری مہندی کی۔ کہتے ہیں میری طرف سے بھابی کا بہت شکریہ ادا کر دیا کرو۔ مگر مجھے اچھی نہیں لگتی۔ لیپ پے سر سار لے ہاتھ پاؤں کے ساتھ بالوں اور رنگ کا مزا نہیں آتا۔ جب مطلق نہیں قسم کی صورتحال ہو جاتی ہے۔ مگر میں زبردستی لگوا دیا کرتی تھی کہ میرے سمیاں کی بھی تھی بڑے شوق سے کیا فرق"۔

عالم تاب مسکراتی ہوئی ماضی کے خوبصورت دن یاد کر رہی تھیں۔

"میرے دل کو آج تک صبر نہیں آیا۔ بہت یاد آتی ہے وہ"۔ ان کی آواز بھیگی اور شکستہ ہو گئی۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

ماہین کی تو ساری جاسوسی دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ الجھ کر رہ گئی۔ اس کو تو یہ بھی بھول گیا کہ کیا جاننا چاہ رہی تھی۔ صورتحال یکلخت بدل کر رہ گئی تھی۔

"میں تمہیں اس کی بہت شاندار تصاویر دکھاؤں گی۔ جو اس کی شادی پر ہم نے اسے دلہن کی طرح پھولوں سے سجا کر رکھا تھا' اسے پھول پہنائے تھے کہ بس بہت ہی حسین تصویر ہے وہ۔۔۔۔ ابھی چلنا میرے کمرے میں کھانے کے بعد۔ یاد آنے سونے کی فریم چڑھائی تھی۔ کمرے میں چھوٹے کی سمت منہ جوڑ ہے۔ اتنی شاندار تصویر ہے اگر کسی آرٹ گیلری میں لگائی جائے تو بس سب اسی کو دیکھیں"۔ وہ ماہین کا اشتیاق بڑھا رہی تھیں اور ماہین کا واقعی دل چاہ رہا تھا کہ کھانا چھوڑ کر پہلے وہ تصویر دیکھے۔

عالم تاب اس کا ذہن ادھر ادھر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اس وقت اس کے ذہن میں سوائے اپنی الجھن کے کچھ نہ تھا۔

شک و بدگمانی کے وہ سانپ' جو رات سے اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے جیسے سو گئے تھے۔ یہاں تو ہر شخص ہی کا عاشق زار دکھائی دیتا ہے۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔ اتنا تو خیر اسے یقین تھا کہ وہ زنجیروں میں بندھی عورت گھر کی مالکوں میں سے تو نہیں تھی۔

انداز میں جس طرح کی عاجزی اور مسکینی تھی اس سے تو وہ ازلی تنگ خواروں میں سے لگتی تھی۔ مگر یہ سوال تو اپنی جگہ موجود ہے۔ وہ کون ہے؟ کس جرم میں قید ہے

"تم ٹھیک سے نہیں کھا رہیں؟" عالم تاب نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ٹوکا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ کھا رہی ہوں"۔ وہ چونک کر خفیف سے انداز میں مسکرائی تھی۔

"کیا تمام ملازمائیں کھانا کھا چکی؟"

یہ وہ سوال تھا جو اسے سب سے پہلے کرنا تھا مگر گفتگو کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ عجیب و غریب سا شروع ہو گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر رات کا واقعہ اتنا پراسرار اور خوفزدہ کر دینے والا تھا کہ باقی تمام سوالات کی حیثیت ثانوی ہی ہو کر رہ گئی تھی۔

"تو کیا ارم شامل نہیں گی تم سے؟" صاف ظاہر تھا کہ عالم تاب بہت انجان بن کر پوچھ رہی ہیں۔

"جی نہیں، مجھے تو کسی قسم کی اطلاع نہیں"۔ ادھر بھی لاعلمی تھی اور ادھر بھی۔

"ہاں شاید تم سو چکی ہوگی"۔

"مگر پروگرام تو ان کا پہلے سے ہوگا۔ گھر میں سب ہی کو اس کی اطلاع ہوگی۔ یہ بات تو کھانے کے وقت بھی نکل سکتی تھی، مگر وہاں تو کسی قسم کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہوا۔ کل تو آج بھی گئے ہوئے ہیں۔ عالم بھی کسی رشتے دار سے ملنے گئی ہوئی ہیں"۔ اس نے ساری باری تمام چیزوں کو جوڑنے کی کوشش کی۔ اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گویا اسے کوئی خبر نہیں۔

"کراچی گئی ہیں، بہت پہلے سے پروگرام بنا ہوا تھا"۔ عالم تاب نے گویا اطلاع دی۔

"کراچی اروشی اتنی جلدی اور تنہا کہیں بھی نہیں گئی اور سب سے اہم تو یہ ہے کہ میں تو اس کی اور جواد کی خاطر یہاں آئی ہوں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ "مہمان موجود، میزبان غائب"۔ اس کے لہجے سے ناراضگی جھلک رہی تھی۔

سب خواتین عالم تاب کی صورت دیکھنے لگیں جیسے وہ ان کی نجات دہندہ ہوں۔

"نہیں وہ ان پہلے سے ان کی سیٹیں کنفرم تھیں۔ تمہارے آنے سے پہلے ہی۔ میرے خیال میں کسی کو دھیان نہیں رہا، تم دل برا نہ کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بہرحال روشی کی یہ بات واقعی غلط ہے کہ اس نے تم سے تذکرہ کیوں نہ کیا"۔

عالم تاب نے ساری ذمہ داری روشی کے سر منڈھ دی۔

اب بولنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی۔ قصور روشی کا ثابت کر کے اس کا پلہ بھاری کر دیا گیا تھا۔ اب تو اس کے قیل ہونے کا مقام تھا کہ اس نے اپنی محبت کرنے والی خالہ کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی کہ جاتے ہوئے مل کر جاتی۔ جبکہ اس کی قربت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی خاطر وہ اپنے سارے پروگرام کینسل کر دیتی۔

وہ سر جھکا کر کھانا زہر مار کرنے لگی۔ خون بے شک کھول رہا تھا مگر ہونٹ سی لئے تھے۔ اب تو شاید سارا نزلہ بادر علی خان پر گرنا تھا۔

"تم خیال نہ کرو، کراچی میں بابا صاحب کے بہت قریبی دوست کے پوتے اور پوتی کی شادی کی وجہ سے بچیوں کو جانا پڑا۔ ظاہر ہے تمہاری موجودگی میں تو کسی سیر و تفریح کی غرض سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا اصرار تھا لڑکیوں کو ہفتہ بھر پہلے بھیجیں۔ ہم عورتوں میں سے تو جو بھی جائے گی، ایک دن پہلے ہی جائیں گی۔ مردوں کو تو اتنی فرصت نہیں۔ آج کل لڑکوں کے اپنے دھندے"۔

وضاحت در وضاحت کا سلسلہ تھا۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگی۔ کیونکہ اسے یہ احساس تو بہت اچھی طرح تھا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مقام مجبوری تھا۔ خاموشی ہی بہتر تھی کہ اظہار حقیقت کیلئے درست زاویہ نہیں مل پا رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی دلیل، کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جو ان کو غلط یا جھوٹا ثابت کرتا۔ اب بس یہ تھا کہ اس کا دلی سکون رخصت ہو چکا تھا۔ وہ بادر علی خان کو ملنے کو بہت بے چین تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے قبل کے واقعات ذہن میں دوہراتے، کوئی سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتی

تھی ساری حویلی نیند میں ڈوب جائے تب وہ بادر علی خان کے پاس جائے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کسی نے اسے بادر علی خان کے بیڈروم میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تو جانے کیا ہوگا۔ خصوصاً عالم تاب کو بھنک بھی پڑ گئی کہ وہ بادر کے کمرے میں پہلے سے آ موجود ہوگی۔ اسے تو ان کی نظریں مشکوک جاسوسی کی نظریں دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ لحاف اوڑھنے کے ارادے سے بار بار کروٹیں بدلتی اور اپنے آپ کو پرسکون کرنے کی شعوری کوشش کی۔ پھر وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار میں گزر گیا۔ اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔ بارہ بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ راہداری پرسکون تھی۔ آج تو سردی بھی نہیں تھی اور خاموشی میں سرسراہٹ رہی تھی۔ وہ چند منٹ تک باہر کا جائزہ لیتی رہی۔ آج باہر کی مداخلت کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور دبے پاؤں چل کر بادر علی خان کے بیڈروم کی طرف چل پڑی۔ بہت آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

"کون۔۔۔؟" راہداری کی طرف کھلنے والے دروازے کی وجہ سے بہت واضح آواز سنائی دی۔

اس نے دروازے کی سمت دیکھا، وہاں بہت بھاری پردوں کی آڑ موجود تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔

آج کمرے میں پہلے سے لائٹس آن تھیں اور وہ صوفے میں دھنسے ہوئے بیڈ ٹیبل کی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ سگریٹ انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ آگے سرے پر راکھ جمع ہو چکی تھی۔ جو اس بات کی غماز تھی کہ خاصی دیر سے کش نہیں لگایا گیا۔ یعنی وہ بہت مصروفیت کے عالم میں تھے یا غائب دماغی کی حالت میں تھے۔

"آ بیٹھو، بہت انتظار کرایا"۔ انہوں نے کش لگا کر راکھ جھاڑی۔

وہ پیازی شلوار قمیص میں ملبوس تھے جو ان پر بے پناہ سج رہی تھی۔

"ہائے بابا" اس کے دل سے ہائے نکلی۔

"آپ واقعی میرا انتظار کر رہے تھے؟" وہ حیرت آمیز مسکراہٹ سے انہیں دیکھنے لگی۔

"آپ نے کہا جو تھا اس لئے انتظار کرنا چاہئے تھا"۔ وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھے۔ "میں سب کے سونے کا انتظار کر رہی تھی"۔ اس کے منہ سے نکل گیا۔ بہت سچ بولنے کی عادت جو تھی۔

"کیوں؟" انہیں ہنسی سے اچنبھا ہوا۔ پھر وہ مسکرا دیئے تھے۔

"اوہ! آپ کا اپنا گروپ تو مختلف ہے، بے کار احتیاط کی"۔ ان کی طرف سے پہلی مرتبہ مزاح کی آمیزش دیکھنے کو ملی۔

وہ قدرے جھینپ گئی۔ درحقیقت اسے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح کے جملے بازی بھی کر سکتے ہیں۔

حیا سے اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ وہ کوئی جملہ موزوں کرنے لگی۔

انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی بے ساختہ کہہ گئی تھی۔ اب جو جواب میں خاموشی کی طوالت بڑھی تو نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

کیا تھا؟"

"کیا واقعی آپ مجھے ہر سوال کا جواب دیں گے؟" وہ حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہر سوال" کا وعدہ نہیں کر سکتا۔" انہوں نے دو ٹوک معذرت کی۔

"تو پھر سوال کرنا ہی بے کار ہے۔ اب تو بس آپ یہ کریں روشی کو واپس بلوائیں۔ میں کراچی چلی جاؤں گی تو اسے ساتھ لے جاؤں گی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" اس کا انداز بہت سادہ تھا مگر اندر بلا کی باریک تنقید پوشیدہ تھی۔ اب پتہ چل جانا تھا کہ روشی کا جانا ایک معمول کی کارروائی تھی یا واقعی اسے روانہ کیا گیا ہے۔

"ٹھیک ہے بابا صاحب سے کہہ دوں گا اسے بلوالیں۔" انہوں نے عام سے انداز میں کہا تھا۔ ماہین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"آپ اس کے باپ ہیں، آپ خود ہی اسے آنے کیلئے کیوں نہیں کہہ دیتے۔" اسے بابا صاحب کی آمریت بہت زیادہ کھلی۔

"ہم سب انہی کے ذریعے کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ عدم تحفظ نہیں 'شکریہ' کا سادہ سا انداز ہے۔ شکریہ اس بات کا کہ انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کر کے ہمیں شاندار اور ممتاز زندگی گزارنے کا موقع دیا۔ عزت اور امتیاز کے ساتھ ہمارا خاندان انہی کے ثمرات کھا رہا ہے۔ ان کی ان کے کام کی جو اہمیت ہے 'ہم سب کو اس کا احساس کرنا چاہیے۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو دنیا کی تمام نعمتیں جیسے دسترخوان پر چنی ہوئی تھیں اور آپ جانتی ہیں۔ دسترخوان ایسے ہی تو نہیں سج جاتے۔" انہوں نے گویا ہر رنگ کی بلیو فائل آگے کو جھک کر ٹیبل پر رکھ دی۔

سعادت مندی کا اتنا اعلیٰ نمونہ وہ بھی اس عمر میں جہاں وہ اپنی ذاتی حیثیت میں ممتاز تھے۔ ماہین نے شاید پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ ظاہر ہے اگر کوئی شخص اپنے والد یا والدین کے ساتھ فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہا ہو تو اس کی تردید کرنا اپنے ہی اخلاقی دیوالیہ پن کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔

"تو پھر آپ کہیں ان سے۔" وہ بس یہی کہہ سکی۔

"ڈونٹ وری.... وہ آجائیں تو ضرور کہوں گا۔" ان کا انداز ایسا تھا کہ جاسوسی اور شک کے سارے دروازے بند ہو کر رہ گئے۔ کھوج کا ایک لگا چھوڑا اسے یقین ہو گیا کہ وہ سب شادی میں انوالو تھے۔ اور واقعی ان کا پروگرام پہلے سے تھا۔

"مگر.... روشی کو مجھ سے مل کر جانا چاہیے تھا۔" وہ ابھی مکمل طور پر الجھن سے آزاد نہیں تھی۔

"ہاں یہ غلطی ہے اس کی۔ ممکن ہے اس وقت آپ آرام کر رہی ہوں۔ اور اس نے یہ سوچا ہو تو وہ آپ کی واپسی سے پہلے ہی آ موجود ہو گی۔"

"اب میں ہر وقت آرام تو نہیں کرتی۔" اس نے یاور علی خان کی بات تیزی سے کاٹ دی۔ "وہ کئی بار مجھ سے ملی۔ جب ان کا پروگرام پہلے سے تھا تو وہ کبھی ذکر تو کرتی۔"

"بچے.... اس طرح کا نفس نہیں ہوتے۔ اور بے فکری کے ماحول میں پلے بڑھے بچے تو بعض اوقات اسی طرح کی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ڈونٹ کیئر پلیز۔" یاور علی خان اپنی مخصوص احسان کرتی قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے۔

"پھر آپ آج تنہا ہی ڈنر پر چل رہی ہیں؟" انہوں نے پہلو بدل کر موضوع بھی بدل دیا۔

"کیوں؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"کیونکہ میں ابھی ہوں آپ کے ساتھ۔" ان کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ ساتھ کوئی دوسری خاتون یا لڑکی ہو تو وقت اچھا گزر سکتا ہے۔ روشی کے آنے تک انتظار کر لیتے ہیں۔" اس نے ان کا سپاٹ چہرہ بغور دیکھا۔

"ہو سکتا ہے پھر میرے پاس وقت نہ ہو۔ آج کل جو سیاسی صورتحال ہے اس سے آپ واقف ہیں۔ آنے والے دنوں میں بہت کام ہوگا۔"

"پھر چھوڑیں۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ مگر روشی بھی نہیں ہے۔ میں بھی کل سے آن ڈیوٹی ہوں۔ آپ بور نہیں ہوں گی؟" کش لگانے اور دھواں منہ سے خارج کرنے کا عمل مسلسل جاری تھا۔

"ہاں اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔" (محض دھواں اور بے تحاشہ تجسس کے ساتھ وقت گزارنے کا آخر فائدہ بھی کیا ہے! ہمیں پتا کو فون کروں گی وہ ہمارے پاس دو دن ہی رہنے آجائیں گے)

"ٹھیک ہے۔ پھر روانگی کس وقت ہے؟" وہ ان کی سرخ مگر پیار کی داستان کو ترحم کی نگاہوں سے نگاہیں ملانے سے بہت احتراز کر رہی تھی۔ جانے کیوں اسے محسوس ہوتا تھا 'نگاہیں نہیں ہیں موسم کا حال ٹھیک ٹھیک Read کرنے والا موسمی طیارہ ہیں۔ اسے لگا جیسے یاور علی خان کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔ اطمینان اور سکون کی لہریں ان کے چہرے پر صاف محسوس کی جاسکتی تھیں۔

اس کے ذہن میں ایک "کیوں" بیدار تو ہوا مگر وہ خاموش رہی۔

"تو پھر آپ کہہ دیجیے نا بابا صاحب سے کہ وہ روشی کو بلوالیں۔ ابھی تو شادی میں دس دن ہیں تاکہ اور میں آپ کی مہمانی کا لطف مزید تین چار دن اور اٹھا سکوں گی۔ پھر اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔"

اس نے پھر اپنی بات دہرانا ضروری سمجھا۔

"آپ فکرمند نہ ہوں۔ اطمینان رکھیں۔"

"آپ بہت اچھے ہیں یاور بھائی۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو جس نے آپ کو حیرت کی ہو تو میں معذرت چاہوں گی۔ آپ کو بھی ایسا ہی تو سوچتی ہوں۔ ہو گئی مختصر مگر خوش نصیب زندگی لائی تھیں۔ وہ بہت شاندار تھیں مگر آپ کی رفاقت نے انہیں اور شاندار بنا دیا ہو گا۔ کاش وہ آج آپ کے ساتھ ہوتیں۔ ہماری زندگی میں بہت عظیم انسان خوشی شامل ہوتی۔"

"اوہ.... یہ تو بہت زیادہ ہے۔" وہ بہت تکلف سے مسکرائے۔ اور نظریں اٹھا کر سراہنے والی کو اچھے جذبات سے

دیکھا۔

وہ پچاس سے اعلیٰ کراؤ دھا شانوں پر آدھا گود میں گر چکا تھا۔ الجھن کلپ میں مقید پونی کی شکل میں کئی اوائل جھم
چند نہیں پیشانی کو چوم رہی تھی۔ بھی کو پیار کرتی ہوئی اداس اداس سے تاثرات چہرے پر بکھرائے۔۔۔ وہ پھر انہیں دیکھ رہی
تھی۔ اور یہ باریں ان پر تھوڑی طرح ٹوٹتی تھیں۔

جب تک بات چلتی تھی ان کے پاس بیٹھنا آسان رہتا تھا۔ مگر جونہی خاموشی کے وقفے میں اس کا ارادہ ڈگمگانے لگتا
وہ خاصی پریشانی محسوس کرنے لگتی تھی۔

"اچھا میں چلتی ہوں۔ گڈ نائٹ۔" وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔

"صبح چھ بجے تک تیار رہے گا۔ کیونکہ مجھے کل ہر حال میں آفس ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے باہر آ گئی۔

صبح کے چار بجے تھے۔ اور ابھی تک حوصلہ افزا امکانات ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ گو کہ دو مرتبہ فون آ چکا تھا۔ اسے توڑ کر
پڑا تھا کہ اب حالت تسلی بخش ہے۔ مگر۔۔۔ وہ کوریڈور میں ٹہلتے ٹہلتے رک کر شیشے کے پار سے اسے دیکھنے لگا۔

"روشانے یار علی خان۔ زندگی سے تو بہت کم لوگ ہی راضی دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے تو سب کو ہی گلے رہتے ہیں۔
جو خودکشی کرتا ہے دکھ صرف اسی کو تو نہیں ملا ہوتا۔
جو اس کے آس پاس ہوتے ہیں دکھ تو ان کے پاس بھی ہوتے ہیں۔
کس بلا کی خود غرضی ہے۔

صرف اپنی نجات سے غرض۔ دوسروں پر یہ فرقت کیا اثرات ڈالے گی؟ جو پہلے دکھوں کی چٹانوں پر حوصلے کے تیشے
سے ضربیں لگا رہے ہیں۔ یہ جدائیاں ان کے حوصلے کو پست کر سکتی ہیں۔

کس قدر خود غرضی ہے پچھلے سال بارشوں کا بہت زور تھا۔ 6 اگست کو تمہاری سالگرہ تھی۔ تم ضد تھیں کہ سالگرہ پر صرف
آئس کریم کیک آئے گا۔ بابا نے کہا تھا کہ بارش بہت تیز ہے۔ سڑک پر کیچڑ بن چکی ہے۔ کیوں ڈرائیور کو مصیبت میں
ڈال رہی ہو۔ میں نے بھی تم سے کہا تھا اندھیرا ہو رہا ہے۔ راستہ خطرناک ہو چکا ہے۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو سکتا ہے تب تم
نے کہا تھا ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ہم سال بھر میں ملنے والی اس اکلوتی خوشی کو اپنی پسند سے منائیں گے۔ مجھے اس
بے دھیانی اور خود غرضانہ انداز پر نہ جانے کیوں بہت رنج ہوا تھا۔

مگر آج یہ انکشاف ضرور ہوا ہے۔ تمہاری خود غرضی حویلی کی دیواروں سے بھی زیادہ سفاک ہے۔ تم صرف اپنی ذات
کے علاوہ کسی اور ذات کی پروا نہیں کرتیں۔ نہ اس معاملے میں تم زندگی کو اہمیت دیتی ہو۔ چاہے وہ تمہاری اپنی ہو یا کسی اور
کی۔ زندگی بھی جیسے تمہاری جاگیر ہے۔ جاگیر ہے۔ جسے ہر آن تمہاری خواہشات کے تحت رہنا چاہیے۔

اور جب یہ تمہاری پسند سے متصادم ہو تو تم اسے بھی ٹھکرا دو۔ چاہے تمہارے اس عمل سے دوسرے زندہ لاش بن

ہوں کہ تم ان کے لیے ہی زندگی بن کر رہ گئی ہو۔
جائیں۔ مشعل اور بابا۔ میں جانتا ہوں زندگی سے دور ہو گئیں تو بھی۔ زندگی بچ گئی تو بھی۔ ظاہر ہے یہ پریشان ہیں تمہارے بے کار وار۔
مار تو دیا ہے تم نے انہیں۔ زندگی سے دور ہو گئیں تو بھی۔ تم نے تو انہیں جیتے جی
جو بیٹھے ہوئے کسی کھڑکی میں رہے ہیں اور آپ کے آس پاس ہے کلاس اشیاء اور لوگ دیکھتے رہے ہیں۔
مار دیا ہے بھی۔ اور یوں بھی۔ وہ کوئی بھی "خان" کے آگے اپنی بات رکھ سکا ہے اگر۔"
میں کیوں اتنا الجھ رہا ہوں۔ مجھے کیوں اتنا رنج ہے؟ تم ایک "نادان" خود غرض اور مغرور لڑکی ہو۔ مجھے تم سے کیا
مطلب تم زندہ رہو یا۔۔۔ مگر کوئی تو ہو یہ سوچنے والا کہ تم ایسی ہی ہو یا کیسی ہو گی؟
"ہیلو!" وہ اپنی گہری سوچ میں مستغرق تھا کہ نرس اسے متوجہ کرنے کیلئے باقاعدہ کوشش کر رہی تھی۔
"یس سسٹر!" وہ ایک دم بولا۔
"آپ ساتھ والے کمرے میں آرام کر سکتے ہیں۔ جب یہ اسپیشل (I-C-U) کیئر سے باہر آ جائیں گی تو اسی کمرے میں
ہوں گی۔ وہاں اٹینڈنٹ کیلئے بھی ایک بیڈ موجود ہے۔ کوئی خاتون ہوتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔ بہر حال شوہر بھی رک سکتا
ہے۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔
ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے اور جاتے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے
ہونٹوں پر نمودار ہو گئی۔
"میں شہوار قطب" بننے کیلئے بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ ملک پھر ملک ہوتی ہے۔ ایسی ان چاہی زندگی۔ خدانخواستہ۔" اس کا
مردانہ غرور پوری قوت سے ابھرا۔
"اور یہ دل کے چاہنے کی بات۔ دل تو نہ جانے کیا کیا چاہتا ہے۔ کون اس کی پروا کرے۔" وہ دوبارہ بینچ پر بیٹھ گیا۔
"جب تم کسی دوائی کا مظاہرہ کرتی ہو۔ یا مجھے بہت اہمیت دیتی ہو تو میں سوچتا ہوں۔ تمہارا کیا ہے۔ مگر اب تو تم نے
ایک بھیانک امکانی انجام کو خود سے قریب کر لیا ہے۔"
"مگر تم میرے دل میں کیوں بول رہی ہو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں جو تمہیں کانٹوں پر گھسیٹوں۔ بس وہ تصور اچھی لے
ال والی ٹھیک ہے۔ تمہیں تھوڑا رنج پہنچا کر کسی بڑے رنج سے بچانا بھی تو میری انتک حلالی کا تقاضا ہے۔"
"سر آپ روم میں نہیں گئے۔ بہر حال آگر پیشنٹ۔ ان کی حالت اب مکمل کنٹرول میں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بے
ہوشی کا زور ٹوٹا ہے۔ یہ ابھی رو رہی ہیں اور مسلسل باری باری کہہ رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہر حال آپ کو خوش ہونا
چاہیے۔" وہ مسکرائی۔
"باری۔ باری۔ ان سے بھی خطرہ ہے مجھے۔ یہ خدانخواستہ مجھ سے پہلے "عالم بالا" میں پہنچ گئیں تو مجھے انتظار کریں گی کہ
مجھے بھی بھیجا جانا پڑے گا" ذہن ایک دم ریلیکس ہوا تو لہجے میں از خود بشاشت آ گئی۔
"بچے کوئی آپ کا" نوعمر نرس نے مسکرا کر پوچھا۔
"وہ میری بیوی نہیں ہیں۔ آپ نے مجھے وضاحت کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے شوہر بنا کر فورا چل پڑیں۔" وہ فورا احتجاج

سے مسکرا رہا تھا۔

"پھر آپ کے درمیان کیا رشتہ ہے؟" وہ الجھ سی گئی۔ وہ ڈیوٹی روم میں ساتھی نرس کے ساتھ اس "ایکسیڈنٹ کیس" پر تبصرہ کر کے آ رہی تھی جس کا دورانیہ کم از کم پانچ سات منٹ کا تو ہو گا (جس میں اس کے متعلق ہو سکتی تھی پر اسرار حیرانی کا اظہار بھی کیا تھا۔ کہ ایسے شوہر کے ہوتے ہوئے وہ زندگی سے بیزار ہو گئی۔ جو اسے خون کی کمی کے باوجود اسے جیتے زندگی میں داخل کرتا ہے۔

جو شخص اس لڑکی پر اتنا مہربان ہوا ہو جس کے بچنے کے امکانات کم ہوں۔ وہ عام حالات میں اس پر کتنا فریفتہ ہو گا اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے وہ اس سے محبت نہیں عشق کرتا ہے۔ اور ہر حالت میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے)

"رشتہ (رشتہ دار) ہیں میری"۔ اس نے نرس کو جواب دیا۔ جو کچھ سوچ رہی تھی۔ "کیا اس وضاحت کے بعد مجھے اجازت مل جائے گی اس کمرے میں آرام کرنے کی۔ میرا خیال ہے ابھی بھی فی الوقت تو وہ اس کمرے میں"۔

"جی۔ جی۔ ایسا ہو تو نہیں مگر مجبوری ہے۔ آپ کئی گھنٹوں سے اسی طرح بیٹھے ہیں۔ آپ ایک دو گھنٹے وہاں آرام کر سکتے ہیں"۔ نرس نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کہہ دی تھی۔

ذہنی آزمائش دور سے آزاد ہوا تو بہت تفاوت محسوس ہونے لگی۔ اسے جاگتے ہوئے مسلسل چوبیس گھنٹے ہونے والے تھے۔ وہ جماہی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک نظر پھر نیم بے ہوش روشنی پر ڈالی اور اس طرف مڑ گیا جس طرف نرس نے اشارہ کیا تھا۔

دھونڈتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں ہمیں
زندگی ہم سے بچھڑ کر خود بھی پچھتائی بہت

آج عارف صاف ستھرے کپڑے پہنے بیٹھا بہت اہتمام سے کش پر کش لگا رہا تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"کتنے بجے کا کہا تھا لال خان نے؟" اس نے عارف کو مخاطب کیا۔

"آتا ہی ہو گا۔ گھر والی کو سیٹ کر رہا ہو؟"

"بھائی! ابھی میری ہمت نہیں پڑی۔ آج لال خان خود جا رہا ہے۔ سودا تمہیں لے کر۔ پھر اس کے بعد اس سے بات چیت تو آسان رہے گا"۔

"اور وہ جو لال خان کے سامنے "اکھاڑے" میں اتر آئی تو بڑی بے عزتی ہو گی یہ سوچا تم نے؟" اس نے چونک کر غلام محمد کی شکل دیکھی۔

"ارے ابھی بھی بے لگام نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں جو کر رہا ہوں کرنے دو۔ وہ دیکھو شاید لال خان ہی ہے"۔ اس کی نظر اچانک گیٹ میں داخل ہوتے لال خان پر پڑی۔

"اس وقت ہے۔ کیا بات ہے لال خان کی۔" غلام محمد اپنی فطرت کے مطابق جب تک بچے تھے تب تک مسکرا رہا تھا۔ اس کو مخاطب کرتے ہی۔ "کسی انہونی خوشی سے سرشار وہ ان کی طرف خوش دلی سے بڑھتا ہوا۔

"السلام علیکم"۔ لال خان نے قدرے جھک کر بطور خاص ان دونوں کو سلام کیا۔ اور غلام محمد کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام"۔ غلام محمد نے بھی بڑی "شفقت" سے جواب دیا جیسے وہ واقعی بڑا ہو۔

"خیر خیریت تو ہے۔ یہ کچھ "بے حد" روٹھی تھی"۔ اس نے چند لمحوں کی جانب بڑھاتے۔ غلام محمد نے پہلی کے اندر میں دونوں کی سمت دیکھا۔ پہلی بار کھانے کے بغیر وہ رہا تھا۔ اس نے فوراً اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر جیب میں احتیاط سے رکھ لئے۔

"سوری کیا حال ہے؟" عارف نے آنکھ مار کر لال خان سے چھیڑ خانی کی۔

جانے بیٹھے کے آنکھوں میں دل دھڑکتا ہے
یہ انتظار کے لمحے عجیب ہوتے ہیں!

"چھوڑو یار یہ شعر و شاعری"۔ لال خان کو بہت ساری شرم آ گئی تھی سے جھینپ گیا اور مسکرا ہوا۔

"ارے آج ہی تو شعر و شاعری کا موقع ہے"۔ عارف نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "اب تو سہانے دن آ رہے ہیں"۔ وہ مسکرایا اور زور سے کش لگایا۔

لال خان دولہا کی طرح شرما کر رہ گیا۔ "چھوڑیں؟ کیا انتظام کیا ہے؟" عارف نے اٹھنے کی سعی کی۔

"باہر سوزوکی کھڑی ہے۔ گاڑی ہے اپنے پاس"۔ وہ غلام محمد کو سنانے کی غرض سے اونچا بولا۔

"کیوں نہیں... کیوں نہیں... سیٹھ لال خان ہے کوئی معمولی چیز نہیں۔ چلو بھائی!" وہ غلام محمد کی طرف پلٹا۔ اچانک بننے والی رقم نے یہ خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

تینوں باہر آ گئے۔ جہاں نیلی سوزوکی کیری کھڑی تھی۔ جس کے اندر وہ ٹوکرے پھلوں کے اور ایک مٹھائی کا ٹوکرا رکھا تھا۔ ایک پچھلی روح افزا کی بوتلوں کی تھی لال خان اور عارف آگے بیٹھے تھے۔ غلام محمد پیچھے تھا۔ اس قدر سامان دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پہلے دن یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہو گا۔ نہ جانے کتنا سونا بری میں چڑھا ہو گا۔ کاش گھر والی مان جائے۔ یا لوٹ دولت میں کھیلے گی۔ جب انسان کی ہر خواہش پوری ہو رہی ہو تو اسے خوش ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

ٹھیک ہی تو کہتا ہے مرد صحت مند اور کماؤ ہو بس۔ عورت کو اور چاہیے بھی کیا۔ سمجھاؤں گا گھر والی کو۔ کیا بچی کو ایسے گھر میں جانا ہے گی جہاں کھڑکی کی دکان کا قرضہ ہی چڑھ جاتا ہے۔ میں نے لوہا جا تو گھر میں روشنی ہو گی۔ بچی کو کتنی آسانی سے مل رہا ہے سب۔ اسے بالوں کی قسمت بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے ہوئے تو اچھے سکولوں میں پڑھیں گے۔ تو ال بیس گے آخر کار عورت کی جیب ہوتی اس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔ اور اگر وہ قابل ہو تو عورت کو دنیا میں اور چاہیے بھی کیا؟

تازہ پھلوں اور مٹھائیوں کی مہک گاڑی کے اندر پھیل رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کے خیالات کے دائرے بھی۔

سے مسکرا رہا تھا۔

"پھر آپ کے درمیان کیا رشتہ ہے؟" وہ جل سی ہو گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں ساتھی نرس کے ساتھ اس "ڈھکے کھلے" ماحول میں تبصرہ کرکے آ رہی تھی جس کا وہ ابھی کم و بیش پانچ سات منٹ کا تاثر ہوگا (جس میں اس کے متعلق ہونے والی بے پناہ حیرانی کا اظہار بھی کیا تھا۔ کرتے ایسے شوہر کے ہوتے ہوئے وہ زندگی سے بیزار ہو گی۔ جبکہ اس کے شوہر کے بعد بھی وہ اسے جیتے جی زمین میں اپنا محل میں داخل کرتا ہے۔

جو شخص اس لڑکی پر اتنا زیادہ بھاری ہوا جس کے بچنے کے امکانات کم ہوں۔ وہ عام حالات میں اس پر کتنا فریفتہ ہوگا اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس سے محبت نہیں عشق کرتا ہے۔ اور ہر حالت میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہے)

"ریلیٹو (رشتہ دار) ہیں میری"۔ اس نے نرس کو جواب دیا۔ جو کچھ سوچ رہی تھی۔ "کیا اس وضاحت کے بعد مجھے اجازت مل جائے گی اس کمرے میں آرام کرنے کی۔ میرا خیال ہے ابھی یہیں فی الوقت تو وہ اس کمرے میں"۔

"جی۔ جی۔ ایسا ہو تو نہیں مگر مجبوری ہے۔ آپ کئی گھنٹوں سے اسی طرح بیٹھے ہیں۔ آپ ایک دو گھنٹے وہاں آرام کر سکتے ہیں"۔ نرس نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کہہ دی تھی۔

ذہنی آزمائش دور سے آزاد ہوا تو بہت تفاوت محسوس ہونے لگی۔ اسے جاگتے ہوئے مسلسل چھتیس گھنٹے ہونے والے تھے۔ وہ جمائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک نظر پھر نیم بے ہوش روشنی پر ڈالی اور اس طرف مڑ گیا جس طرف نرس نے اشارہ کیا تھا۔

ڈھونڈتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں ہمیں
زندگی ہم سے بچھڑ کر خود بھی پچھتائی بہت

آج عارف صاف ستھرے کپڑے پہنے بنچ پر بیٹھا بہت اہتمام سے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ وہ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"کتنے پیسے کا کہا تھا لال خان نے؟" اس نے عارف کو مخاطب کیا۔

"آٹھ سو کا۔ گھر والی کو سیٹ کر رہا ہے؟"

"بھائی! ابھی میری ہمت نہیں پڑی۔ آج لال خان خود جا رہا ہے۔ سو تاثیں لے کر۔ پھر اس کے بعد اس سے بات چھیڑنا آسان رہے گا"۔

"اور وہ جو لال خان کے سامنے "اکھاڑے" میں اتر آئی تو بڑی بے عزتی ہوگی یہ سوچا تم نے؟" اس نے چونک کر غلام محمد کی شکل دیکھی۔

"ارے ابھی سے انجام نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں جو کر رہا ہوں کرنے دو۔ وہ دیکھو شاید لال خان ہی ہے"۔ اس کی نظر اچانک گیٹ میں داخل ہوتے لال خان پر پڑی۔

"اس وقت ہے۔ کیا بات ہے لال خان کی۔" آتش گلابی شلوار قمیص میں ملبوس بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے ہاتھ کو مخاطب کرتے ہوئے۔ کسی انوکھی خوشی سے سرشار وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے جوش و خروش سے بول رہا تھا۔

"السلام علیکم"۔ لال خان نے قدرے جھک کر بطور خاص بڑے ادب و احترام سے اس کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام"۔ غلام محمد نے بھی دبی "شفقت" سے جواب دیا جیسے وہ ایسا چاہتا ہی نہ ہو۔

"خیر خیریت تو ہے۔ یہ پھول "بے مقصد" رکھ رہی تھی"۔ اس نے چند لال نوٹ اس کی جانب بڑھائے۔ غلام محمد نے بے یقینی کے انداز میں نوٹوں کی سمت دیکھا۔ پہلی بار کسی لال نوٹ کے بغیر دل بول رہا تھا۔ اس نے فوراً اس کے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی جیب میں احتیاط سے رکھ لیے۔

"سوری کیا حال ہے؟" عارف نے آنکھ مار کر گویا لال خان سے چھیڑ خانی کی۔

جانے بیٹھے کے آنکھوں میں دل دھڑکتا ہے
یہ انتظار کے لمحے عجیب ہوتے ہیں!

"چھوڑو یار یہ شعر و شاعری"۔ لال خان کو بہت ساری شرم آ گئی۔ ساتھ ہی جھینپ کر ہنس پڑا اور گھبرا گیا۔

"ارے آج ہی تو شعر و شاعری کا موقع ہے"۔ عارف نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "اب تو سہاگ رات کے دن آ رہے ہیں"۔ وہ مسکرایا اور دوبارہ کش لگایا۔

لال خان دولہا کی طرح شرما کر رہ گیا۔ "چھوڑیں؟ کیا انتظام کیا ہے؟" عارف نے اٹھتے ہی مشق کی۔

"باہر سوزوکی کھڑی ہے۔ گاڑی ہے اپنے پاس"۔ وہ غلام محمد کو سنانے کی غرض سے اونچا بولا۔

"کیوں نہیں ۔۔۔ کیوں نہیں ۔۔۔ سیٹھ لال خان ہے کوئی معمولی چیز نہیں۔ چلو بھائی!" وہ غلام محمد کی طرف پلٹا۔

اچانک ملنے والی رقم نے بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

تینوں باہر آ گئے۔ جہاں نیلی سوزوکی کیری کھڑی تھی۔ جس کے اندر دو ٹوکرے پھلوں کے اور ایک مٹھائی کا ٹوکرا رکھا تھا۔ ایک پیٹی روح افزا کی بوتلوں کی تھی لال خان اور عارف آگے بیٹھے تھے۔ غلام محمد پیچھے تھا۔ اس قدر سامان دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پہلے دن یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہوگا۔ نہ جانے کتنا سونا بری میں چڑھا دے گا۔ کاش گھر والی مان جائے۔ بالو تو دولت میں کھیلے گی۔ جب انسان کی ہر خواہش پوری ہو رہی ہو تو اسے خوش ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

ٹھیک ہی تو کہتا ہے مرد محنت کرے اور گھر کو ہو بس، عورت کو اور چاہیے بھی کیا۔ سمجھا اس کا گھر والی کو۔ کیا بچی کو ایسے گھر میں جانا ہے گی جہاں کپڑے کی دکان کا قرض ہی چڑھا ہے۔ میں نے لہو پیا تو گھر میں روشنی ہوئی۔ بچی کو کتنی آسانی سے مل رہا ہے سب۔ اسے بالو کی قسمت بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے ہوں گے تو اچھے سکولوں میں پڑھیں گے۔ قابل بنیں گے۔ آخر کار عورت کی تمیز بوڑھی اس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔ اور اگر وہ قابل ہو تو عورت کو دنیا میں اور چاہیے بھی کیا؟

تازہ پھلوں اور مٹھائیوں کی مہک گاڑی کے اندر پھیل رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کے خیالات کے دائرے بھی۔

بالو بھولی سی کھڑکی سے گلی میں جھانک رہی تھی کہ اچانک اس نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک سوزوکی رکتے ہوئے دیکھی۔ بھاگی کو تلاش کرتی ہوئی نظریں سوزوکی پر جم گئیں۔۔۔ وہ آگے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو دیکھ رہی تھی کہ پچھلے سے اس کا باپ اتر کر سامنے آیا۔

"ابا کو گاڑی چھوڑنے آئی ہے۔ اللہ خیر کرے۔" وہ جلدی سے کھڑکی سے ہٹ گئی۔

"اماں ۔۔۔ اماں ۔۔۔ ابا کو گاڑی چھوڑنے آئی ہے۔" وہ بھاگ کر ماں کے پاس آئی جو چولہے کے پاس بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ وہ منہ پر چھینٹیں ڈالنا بھول گئی۔

"کیا کہہ رہی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ لو وہ ابا آگئے خود ہی پوچھ لو۔" غلام محمد ان کے قریب آچکا تھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" وہ تشویش بھری نظروں سے خاوند کو دیکھ رہی تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک ہے۔ مہمان آئے ہیں۔ چائے بنالے اور کچھ لوٹے سے کچھ منگالے۔" اس نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر بیوی کو تھمایا۔

"کیا منگاؤں؟" وہ نوٹ لے کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔ کبھی اس گھر میں سو تک کی دال بھی ادھار آتی تھی۔ آج چائے کے لوازمات کے لئے سو کا نوٹ مل رہا تھا۔

"سموسے۔ قتلمہ۔ کیلے اور جو تیرا جی چاہے۔" وہ دوبارہ باہر کا رخ کرتے ہوئے بولا۔

تین چیزیں بتا کر آگے جی چاہنے کی رعایت بھی مل رہی تھی۔ وہ تعجب سے اس کی پشت پر دیکھنے لگی۔

"لگتا ہے کوئی خاص مہمان ہیں۔ شاید تیرے باپ کا سیٹھ ہے۔" اس نے بالو سے کہا۔ "تو چائے بنا میں خود لے کر آتی ہوں چیزیں۔ بچے کو تو کوئی اتنی سمجھ ہی نہیں پرانی دھرانی چیزیں پکڑا دیتے ہیں۔ ذرا میرا برقعہ لا۔" وہ دوپٹے سے منہ پونچھنے لگی۔ بالو برقعہ لینے اندر دوڑ گئی۔

جتنی دیر میں وہ برقعہ نکال کر لائی۔ اتنی دیر میں پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکرے اور شربت کی بوتلوں کی پیٹی اندر آچکی تھی۔ وہ برقعہ ہاتھ میں پکڑے بجائے ماں کی طرف جانے کے ٹوکروں کی طرف بڑھی۔

"اتنی ساری مٹھائی اماں!" اس نے ٹوکرے کے منہ پر پڑے اخبار کو تھوڑا سا سرکایا تھا۔ پھر دوسرے ٹوکرے کو دیکھنے لگی۔ حیرت آمیز خوشی اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگی۔

"ہاں ۔۔۔ ہاں تو برقعہ تو دے۔" وہ بیٹی کی طرح خوش ہونے کی بجائے الجھ رہی تھی۔ جتنی دیر میں اس نے برقعے کے بٹن بند کئے مہمان کمرے میں بیٹھ چکے تھے۔

وہ چائے بنانے کی نیت سے بھولنے سے باورچی خانے میں گھس گئی۔

اندر کمرے میں وہ ہی کرسیاں تھیں جن پر عارف اور لال خان متمکن ہو چکے تھے۔ اپنے لئے وہ چارپائی کھینچ کر لا رہا تھا۔

لال خان تو اس طرح بیٹھا تھا جیسے وہاں ان کر آیا ہو۔ تھوڑی سی گھبراہٹ اس کے چہرے سے صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

"کیا سوچا ہے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یار وہ کیا کہتے ہیں کہ

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

"میں گھبرا تو نہیں رہا یار۔ یہ غلام محمد تو بہت سیدھا آدمی ہے۔ پتا نہیں اس کی گھر والی کیسی ہوگی؟"

"تو اس کی گھر والی کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ تو اپنی ہونے والی گھر والی کو سوچ۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے شرارت سے مسکرایا۔ لال خان کو ایسے لگ رہا تھا جیسے گدگدی ہونے لگی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔

"تمہارا اپنا گھر ہے غلام محمد؟" عارف نے ابھرواں ادھر سے سوال کے ساتھ خارج کیا۔

"ہاں بس سر چھپانے کا آسرا ہے۔" اس نے تفکر انہ انداز میں جواب دیا۔

لال خان گردن ادھر ادھر گھما کر جائزہ لینے لگا۔ سارے کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ وہ گلی کی طرف کھلتی تھی۔

"یار ۔۔۔ اس کی گھر والی مجھے دیکھے گی کس طرح؟ کیا یہاں بلائے گا؟" اس نے سرگوشی کی۔

"صبر بے صبری کی۔"

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

"یار ۔۔۔ جنہوں نے دیکھنا ہو۔ ان کے پاس ہزار راستے ہوتے ہیں۔ تم کیوں فکر کرتے ہو آرام سے بیٹھو۔" عارف نے لقمہ دے کر کہا۔

"تم نے گھر میں کچھ سامان تو ڈلوا لیا ہوا ہے۔ اچھے دن ہوں گے تمہیں کماتے ہوئے۔ اب بھی ہاتھ تنگ رہتا ہے کیا؟" عارف نے غلام محمد سے گویا پائی پائی کا حساب لینے کے انداز میں سوال کیا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اس بار قرضہ بہت چڑھا ہوا تھا۔ کتنے دن تو قرضہ اتارنے میں لگ گئے۔ پھر یہ سوچا کچھ بیٹی کیلئے جوڑ لوں۔"

"اس کیلئے جوڑنے وڑنے کی ضرورت نہیں۔ لال خان کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ ہم تم سے ایک کپڑے کا جوڑا بھی نہیں لیں گے۔ غور سے سن لو۔" عارف نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بڑے شاہانہ انداز میں کہا اور ایک زور کا کش لگا کر سگریٹ کی راکھ بائیں طرف جھاڑ دی۔

"بجلی ہے تمہارے گھر میں؟"

"پچھلے مہینے لگی ہے پچاس روپے مہینہ دیتے ہیں۔" غلام محمد نے جواب دیا۔

"بس تو تم جلد فرصت میں اپنے گھر بجلی لگوا لو۔ تمہاری ایک ہی بیٹی ہے۔ جہیز تم نے اس کا دینا نہیں۔ اپنا گھر ٹھیک کر لو۔ لڑکوں کو کام سکھانے پر بٹھا دو۔" عارف نے پورا پروگرام طے کر دیا۔

"میں بھی سوچ رہا تھا۔ بیٹے کو ٹیلر کے پاس بٹھا دوں۔ بڑی کمائی ہے اس میں۔" اسے شروع سے خوبصورت

خواب آنے لگے۔ جہاں اس کا بچہ ایک بڑا انجینئر ماسٹر تھا اور اس کے سیف میں رنگ برنگے نوٹ بھرے رہتے تھے۔

وہ جانے کتنی دیر باتوں میں مصروف رہتے جبھی کمرے کے باہر سے آواز آئی۔

”بالو کے ابا چائے لے جاؤ“۔

لال خان ایک دم سنبھل کر بیٹھا۔ عارف پر اب تک کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو“؟ لال خان نے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

”کچھ نہیں....... کچھ اپنے حساب کتاب یاد آ گئے تھے“۔

”کیسے حساب کتاب“۔ لال خان نے تعجب سے اسے دیکھا۔ اس کے تو عارف کے ساتھ سارے معاملات ”سیٹ لیول“ تھے۔

”تمہیں نہیں بتا سکتے کہ کوئی فائدہ ہی نہیں“۔

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

وہ ہنس دیا۔ ”چائے پیو۔ بڑے نورانی ہاتھوں کی چائے ہے۔ جب گھر میں لڑکی جوان ہو تو عام طور پر چائے اچھی بنتی ہے“۔ عارف نے آنکھ ماری۔ اور لال خان چائے کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

وہ انہیں چائے پیش کر کے ”ابھی آیا“ کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

”بالو کی ماں!“ اس نے آہستگی سے بیوی کو آواز دی۔

”ہوں“۔ وہ ہولے سے کراہی۔ جانے کتنی ٹیسوں کی لہریں اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھیں۔

”یہ جو مہمان آئے ہیں اب یہ جائیں تو آ کے دیکھنا اچھی طرح“۔

”کیوں آئے کیا“ ”مر کیسے ہیں“؟ وہ ہونق سی ہو کر اس کی شکل غور سے دیکھنے لگی۔

”بس کہہ جو رہا ہوں ناں میں“۔

”اچھا اچھا۔ بگڑتے کیوں ہو۔ دیکھ لوں گی ———— اور اب تو ضرور دیکھوں گی۔ آخر ہے کیا ان میں دیکھنے والی بات“۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ دوبارہ کمرے میں چلا آیا۔

”لالی سے کچھ بات کر کے آ رہا ہے“۔ عارف نے لال خان کو ٹہوکا دیا۔ ”ابھی پیار آ رہا تھا اس بالو کی ماں کہہ کر“۔

لال خان مارے حیا اور خاکساری کے آگے کو جھک کر رہ گیا۔

”عارف بھائی! اگر ابھی علاج معالجہ کرا لو۔ بھلا رہے تو ذرا بھی نہیں ہو۔ میرا دل چاہتا ہے تمہیں ہنستا بستا دیکھوں“۔

اس نے سوکھے اجڑے عارف کو ترحم بھری نظروں سے دیکھا۔

”اچھا!“ وہ مسکرایا۔ (آج کل شدید کھانسی کے خوف سے صرف مسکراہٹ پر ہی اکتفا ہو رہا تھا) ”اب کیا ہنسیں گے۔ او

پھر حرج بھی نہیں ہے۔ ہم تو فقط وہ خودکشی کرنے والوں میں سے ہیں۔ اب ہم میں بچا ہی کیا ہے؟

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری!

غلام محمد نے بے بسی سے لال خان کی سمت دیکھا۔ پھر شعر۔ جو اس کے خاک بھی پلے نہیں پڑتے تھے۔

”کھاؤ، یہ سوچتے تو کھا تو کھا جائے پی رہے ہو“۔ اس نے لال خان کی طرف پلیٹ بڑھا دی۔ وہ بیوی کے لحاظ میں اس نے خود کو بہت حقیر سا محسوس کیا۔

آج وہ بھی اس قابل ہے کہ کسی کو کچھ کھلا سکے۔ اس نے عارف کی سمت دیکھا۔ نگاہوں میں احساسِ ممنونیت تیر آیا۔ جو اپنی تنگ دستی، قرض سے دبی زندگی آخر اسی کے تعاون سے تو اچھی چل رہی تھی۔

کمرے سے باہر ”بالو کی ماں“ بے چینی سے ان کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

روشی پر ابھی بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے ہاسپٹل میں بیدار ہوا تو بابا صاحب وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اسے گھر بھیج دیا تھا کہ آرام کرے اور ضرورت محسوس ہوئی تو فون کر کے بلا لیں گے۔ گھر والوں کے ساتھ تھیں۔

روشی صبح پانچ بجے سے شام پانچ بجے تک تین چار مرتبہ ہوش میں آئی تھی مگر صرف چند لمحوں کے لیے۔ محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ بے ہوش نہیں ہے۔

بابا صاحب نے چونکہ حکم دیا تھا کہ وہ خود بلوائیں گے۔ اس لیے کوئی بھی ہاسپٹل خود سے روانہ ہونے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں جو کٹ نہیں کٹ رہی تھیں۔ لہٰذا اب اس انداز کی تشویش تو نہیں تھی جس طرح کہ کل تک تھی۔ مگر اب ذہن یہ سوچ رہے تھے کہ اب تک ”ہاری“ کو کیوں نہیں بلوایا۔ زری نے تین مرتبہ فون کیا تو گھر کے بھی جواب دیا ”صبح تھیں پھر وقت وقت“ تھیں ہوئی۔ اسے روم میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہاں بابا صاحب موجود ہیں۔ اور اس کے ہوش میں آنے کے بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

وہ بیدار ہو کر غسل سے فارغ ہوا۔ پھر کوثر سے چائے منگوائی۔ جب سے وہ گھر آیا تھا تھکے تھکے سے سو رہا تھا۔ اتنا سارا تو شاید وہ زندگی میں سویا ہو گا۔ ”وادو روشی بی بی آپ نے جان پر کھیل کر ہم کو زندگی بھر آرام کا موقع دے دیا“۔ وہ کپ تھامے بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔ لڑکیاں تو سب بیچ ہی تھیں۔ بے چاریوں کی آوازیں تو کل سے بند تھیں۔ اس لیے سمندر کی لہروں کا شور زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ تنگ آ رہا تھا۔ گھر میں کوئی بھی نہیں۔

”بابا صاحب روشی سے کیا کہیں گے؟ کیا بات کریں گے۔ سب سے پہلے تو اس پر برہم ہوں گے۔ ملامت کریں گے۔ اتنا کوئی سخت سا فیصلہ سنا دیں گے؟“ ایک لمحے کو بھی اس کا ذہن روشی اور ولادو علی خان کے تصور سے ادھر ادھر نہیں ہو رہا تھا۔ ایسی بات کہ کرتے ہیں۔ جو ذہن سے نکال دیں اس کی تکمیل تک مصروف رہتے ہیں۔

”روشی کی اگلی منزل کون سی ہے؟“ وہ ولادو علی خان کے نزدیک یہاں وہاں سب رشتہ داروں ملاقاتیوں سے واقف تھا۔

ان سے بھی جو "خاندانی" تھے ان سے بھی جو اس قسم کے تناؤ سے محروم تھے۔

ان کا نشانہ تو ظاہر ہے "خاندانی" ہی ہوں گے کہ وہ حسب نسب کو زندگی پر فوقیت دیتے ہیں۔

"خان —— بڑے خان کا ٹیلی فون آیا ہے۔ بلا رہے ہیں آپ کو۔ اسپتال میں ہیں تو لیتے ہیں جلدی آ جائیں گے۔" پیچھے سے کھڑی تسنیم بوا لائی تھی۔

وہ کپ رکھ کر تیزی سے ریسیور لے کر پیچھے آیا۔ جہاں سومہ حواس باختہ سی موجود تھی۔

"میں چلوں ہاری؟"

"آپ —— پوچھ لیا آپ نے بابا صاحب سے؟"

"ان سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ لالی نے فون اٹینڈ کیا تھا۔"

"آپ کیوں فکر مند ہو رہی ہیں۔ اب تو وہ آ جائیں گی۔ یہاں۔ ٹھیک ہیں اب۔" اس نے تسلی دی۔

"پھر تمہیں کیوں بلایا ہے؟" وہ تو بابا اس کے بلائے جانے پر فکر مند تھی۔

"یہ تو معمول کی کارروائی ہے۔ جہاں وہ ہوتے ہیں۔ وہاں میں ہوتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"ہاری۔"

"جی۔"

"تم یہ بتاؤ بابا صاحب کے ایکسپریشن کیا ہیں؟ وہ تو تم سے ہر بات کرتے ہیں۔ روشی کی اس حرکت پر کچھ کہا تو ہو گا۔ تمہیں قسم ہے بتاؤ ہاں۔ پتا نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" سومہ تو حویلی کی کم ہمتوں کی کیمپ میں سرفہرست تھی۔

"اوہ" اسے سومہ کی پریشانی کی وجہ سمجھ آ گئی۔

"کچھ نہیں۔ وہ تو چپ ہیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہیں۔ کچھ تو ضرور کہا ہو گا۔ پلیز ہاری۔ اتنی بڑی بات ہو گئی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ وہ کچھ بولے ہی نہ ہوں۔ تم مجھے بتا دو گے میں کسی سے نہیں کہوں گی۔"

"کچھ بھی نہیں کہا سومہ آپی یقین کریں۔" اس نے بمشکل جان چھڑائی اور ڈرائیور کی طرف بڑھ گیا۔ سومہ جوں کی اسی طرح کھڑی تھی۔

"لگتا ہے لڑکیوں میں سومہ آپی سب سے زیادہ "خان" سے واقف ہیں۔" اس نے گویا سومہ کو داد دی۔

اختر کو گاڑی نکالنے کا کہتے وقت اس نے کن انکھیوں سے اس سمت دیکھا جہاں سومہ جوں کی اسی سابقہ کیفیت میں کھڑی تھی۔

جب وہ اسپتال پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ شہر روشن ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف آیا تھا جہاں روشی کی موجودگی کا یقین تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو روشی کمرے میں تنہا تھی۔ وہ چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے نظروں کا زاویہ

بدلا۔ ہاری پر نظر پڑتے ہی اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

"نئی زندگی مبارک ہو۔" اس کو اچانک ہوش سا آیا اور "ایکشن" حالت میں کچھ کرنے کی بلاوجہ ہی خواہش ہوئی تھی۔

"فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ اگر ایک لمحہ کی دیر کی تو میں گلاس کو زور سے ٹکڑے سے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لوں گی۔"

چیخ آہٹ ان اسے سومہ سنتا۔ "اس کی آواز میں حکم بھی تھا اور آنسوؤں کی آمیزش بھی۔

"یہ کہیں نہیں جائے گا۔ یہ ہمارے ساتھ ہے۔" عقب سے دادا علی خان کی آواز آئی تو وہ بے اختیار چونک کر پلٹا۔

☆—☆—☆—☆—☆

بابا صاحب کے چہرے پر بے بسی تھی اور شاید بے بسی بھی۔۔ رعایا اور اولاد میں بہر حال بہت فرق ہوتا ہے۔ سوچنے کی حد تک ہر شے امکان و اختیار میں ہوتی ہے۔

مگر فیصلہ کن لمحہ اور اس لمحے میں کر گزرنا ہی سب کچھ ہے۔

بعض اوقات ایک لمحے میں اظہار عمل ضرور ہوتا ہے۔

"مگر اس اظہار نے "میں جانے کتنی نیندیں' کتنی راتیں' کتنی آنکھیں' بھینٹ چڑھی ہوتی ہیں۔

اس طرح کے سلگتے "اظہار" ہو تو جاتے ہیں' لیکن ہونے کے بعد ان کا حاصل راکھ کا ڈھیر ہوتا ہے اور تب راکھ ہی آسودگی کی ایک سلگتی چنگاری۔

اور جس شخص نے کئی بار "راکھ کے ڈھیر" کی کمائی کی ہو ---- جو آسودگی کی چنگاریوں سے جسم و جاں سلگائے پھرتا ہو۔

اسے اس طرح کا کیا سودا کرتے ہوئے بہت سوچنا ہوتا ہے۔

ہاری اپنی جگہ سے ایک انچ ---- آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہ جہاں تک پہنچا تھا' وہ تو وہیں ایستادہ تھا۔

"بیٹھ جاؤ ہاری" بابا صاحب نے حکم دیا اور خود دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

...در حقیقت ان دونوں کی پوتی کے درمیان بیٹھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ ابھی تک اس کے کانوں میں روشی کے الفاظ گونج رہے تھے

"Get out with in movment"

"میں باہر بیٹھ جاتا ہوں خان' کوئی بات نہیں"۔ اس نے اپنی جانب سے لطافت سے سمجھوتہ کر لیا۔

"نہیں تم یہیں بیٹھو جہاں ہم ہیں وہیں تم ہو"۔ انہوں نے تحکمانہ انداز میں کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جو روشی کے بیڈ کے بالکل ساتھ ہی رکھی تھی۔

وہ ناچار کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

روشی اب بھی نیم دراز بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر سوائے سرد تاثرات کے اور کچھ نہیں تھا۔

"تم ٹھیک ہو گئی ہو۔ بہر حال مقام شکر ہے۔ فی الحال ہم تم سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرتے۔ اب تم بس اتنا کرو کہ جلدی سے اچھے ہو کر بستر سے اتر آؤ"۔

روشی خاموشی سے انگلیاں مروڑتی رہی۔

"ہاری پر کس بات کا غصہ ہے؟" ہاری کے حصے کا سوال بابا صاحب نے کیا تھا۔

وہ چپ رہی۔

"ہم کچھ پوچھ رہے ہیں؟" ان کی نازک طبع پر اس کی خاموشی گراں گزری تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس بہت اپ سیٹ ہے ایسے ہی کہہ دیا تھا"۔ ہاری کے سامنے بے بسی اور احساس توہین سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ آنسوؤں پر قابو پانے کی خاطر ہونٹ کاٹنے لگی۔ مگر چند قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

بابا صاحب نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"تم اکیلی نہیں ہو' تمہارے پاس بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جن سے دل کی بات کہی جا سکتی ہے"۔ ان کا انداز غیر معمولی طور پر نرم تھا۔

"مگر خان ---؟" روشی کے منہ سے بلا سوچے سمجھے بے ساختہ نکل گیا تھا۔ ہاری کو ایسا محسوس ہوا جیسے طوفان قریب آگیا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے کر روشی کی سمت دیکھا تھا' جس کے رخساروں پر آنسو چمک رہے تھے۔ مگر ایک عجیب سی خود سری اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

"ہاری! ہم گھر جا رہے ہیں' آرام کرنے کے لیے۔ تم یہیں ٹھہرو' ہم وہاں سے کسی لڑکی کو بھیج دیتے ہیں۔ پھر تم گھر آ جانا"۔

"میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں خان"۔ اس نے ضبط سے سرخ پڑتے بابا صاحب کو بغور دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

روشی کا دل چاہا پاس رکھا گلاس اس پر کھینچ مارے' ٹھیک ہے میں اسے جانے کو کہہ رہی ہوں' مگر کیا اس کے دل میں اتنی سی بھی آرزو نہیں کہ مجھ پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت کی حقیقت پوچھے ---- میرا حال پوچھے ---- میری دل جوئی کرے ---- کیا میں اس کے نزدیک اتنی اہمیت بھی نہیں رکھتی کہ یہ میرے ساتھ بیٹھنا چاہے' مجھ سے بات کرنا چاہے" کتنی جلدی ہے اسے تو جانے کی"۔

اس نے جل کر باری کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"تمہیں ابھی فی الحال یہاں ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہنا ہو گا۔" وہ مڑ کر کمرے سے جہاں تک کسی کو پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" وہ روشی کی طرف سے تھوڑی سی بے تابی بھی رہتے رہے تھے۔

باری دوبارہ بیٹھ گیا۔

"یہ تم سے عمر میں خاصا بڑا ہے پیار کیا کرو۔"

وہ خشک انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر گویا ہوئے اور چھڑی اٹھاتے باہر نکل گئے..... دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

سائیڈ ٹیبل پر کئی انگلش میگزین رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک میگزین اٹھا کر تقریباً آنکھوں سے لگا لیا۔

"تم کیوں آئے کراچی؟" وہ پھنکاری۔

"کام آیا ہوں۔" اس نے میگزین کی اوٹ سے ہی جواب دیا۔

"تم کیسے آدمی ہو تم وہ کام کیسے کر لیتے ہو جو کرنے کا دل نہیں چاہتا.....؟" اس کا طرز سنگ سا تھا۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں اپنے معمولات زبردستی نبھاتا ہوں۔ میرا ذہن بن چکا ہے مجھے خان کا خان کے بیٹوں کا خیال رکھنا اچھا لگتا ہے۔ اس لئے کہ میں ان سے کسی قسم کا خونی رشتہ نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود مجھے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک اس قدر محبت ملی ہے جس کے قرض اتارے نہیں اتریں گے۔"

"ہونہہ! تمہاری غلامی اور تابعداری کے طفیل ہے یہ سب..... ذرا کسی دن اپنی بات پر زور دے کر دکھاؤ، پھر دیکھنا ان لوگوں کی محبت۔" وہ زہر بھری مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔

"جن لوگوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا..... حتیٰ کہ مجھے بہترین تعلیم دلوائی میں ان سے جھگڑا کس بنیاد پر شروع کروں؟ اور کیوں؟ وہ میرے ساتھ اچھے ہیں، مجھے ان کے ساتھ اچھا ہونا چاہیے۔ آپ میرے بارے میں زیادہ نہ سوچیں آپ کی صحت کیلئے ٹھیک نہیں۔"

اس نے میگزین ایک ہاتھ میں تھام کر کرسی بیڈ سے ذرا اور کھسکائی اور دوبارہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"تم اتنے خود پسند کیوں ہو؟" وہ چڑ کر بولی۔

"میں....؟" باری نے بابا صاحب کے جانے کے بعد پہلی بار نظر اٹھا کر اس کی شکل دیکھی۔

"اچھی خبر ہے۔" وہ مسکرا کر میگزین کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"تمہیں غصہ کیوں نہیں آتا؟" اس کی جان جل گئی تھی باری کی مسکراہٹ دیکھ کر۔

"آیا تو تھا پھر آپ نے زہر کھا لیا تھا۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

روشی بری طرح چونک گئی۔ دل پوری قوت سے سکڑا اور اسی قوت سے پھیلا۔

"ہونہہ! تمہارے غصے کی وجہ سے زہر نہیں کھایا تھا۔" اس نے بڑی نخوت سے کہہ کر منہ پھیر لیا۔

"بتا رہا ہوں۔" وہ میگزین میں ایک چونکا دینے والی خبر بغور دیکھنے لگا۔

روشی نے تلملا کر اسے دیکھا۔ ڈارک بلیو جینز اور لائٹ پنک شرٹ میں وہ در حقیقت بہت اٹریکٹو لگ رہا تھا۔

"وہ تو دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہے ہوں گے..... کہ چلو جان چھوٹی۔" وہ نہ جانے کیوں اس قدر تلخ ہو رہی تھی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" اس نے لاپرواہی سے ورق الٹا تھا۔

"ہونہہ! تم میری طرف دیکھ کر بات کیوں نہیں کرتے ہو؟ بد شکل تو نہیں ہوں۔" اسے بہت زیادہ احساس توہین لاحق تھا۔

"ارے نہیں! آپ دل برا نہ کیجئے۔ آپ کی شکل تو خاصی اچھی ہے۔ شاید اسی وجہ سے آپ ایکسٹرا آرڈینری کو نظر انداز کرتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر میگزین بند کر دیا اور بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں نے تو نہ جانے کب سے آئینہ بھی نہیں دیکھا، اب تو پھٹکار برس رہی ہو گی۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"بری تو نہیں رہی..... البتہ آپ نے مرنے کیلئے زور پورا لگایا تھا۔ شاید آپ کو علم نہیں۔ اسلام کے مطابق خودکشی کرنے والا مردود ٹھہرتا ہے۔ شکر کیجئے بڑی مستقل قسم کی بچت ہو گئی۔ لگتا ہے کہ ہوش آ گئی۔ پتہ نہیں کب پہنچیں گی؟" اس نے ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

"جاؤ! باہر لان میں بیٹھ جاؤ، مجھ پر احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ چڑ کر بولی اور سیدھی لیٹ گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر۔ ڈھیلی ڈھالی سیاہ آستین جھٹکے کی وجہ سے الٹ گئی۔ دودھیا بازو رنگ میں یوں ہو گیا۔ جس پر ایک گہرا سیاہ نیل عجیب سا بگاڑ رہا تھا۔

باری نے نظریں چرا کر کمرے میں دیکھنا شروع کر دیا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

وہ سائیڈ ٹیبل سے دوائیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"ٹمپریچر بھی ہے آپ کو؟" وہ اس کی طرف فکرمندی سے دیکھ رہا تھا۔

"جہنم کا لاک ہے میرے اندر، ٹمپریچر کیوں نہیں ہو گا؟" وہ تنک کر بولی۔ انداز بدستور تھا۔

"کیوں لاک ہے جہنم کوئی وجہ بھی تو ہو؟" وہ قدرے سنجیدہ تھا۔

"کاش وہ منحوس اس وقت صفائی کرنے نہ پہنچتی۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ اور گزر جاتا۔ میری تو دعا میں بھی اثر نہیں کہ میں یہ دعا کرکے ہی پرسکون ہو جاؤں اللہ کرے میں مر جاؤں۔" وہ سسکنے لگی۔

"اس کی تو خیر ہے ہی نہیں۔ ہاں آپ بھی دور رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے پپا کو اطلاع ہی نہ دی ہو گی کہ میں مر رہی ہوں۔"

باری نے چونک کر اس کی سمت دیکھا مگر خاموش رہا۔

"دادا کو میرے کسی بات کی بھی تو سب سے زیادہ میرے..... جو سکون اور خوشی مجھے ان کا چہرہ دیکھ کر ہوتی ہے وہ کسی اور کو دیکھ کر نہیں ہو سکتی۔ باری میں پپا کو کیسے بتاؤں کہ میں ان سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ وہ اتنے پتھر کیوں ہیں؟" وہ رو رہی تھی۔

"یہ بات کوئی بتانے کی ہوتی ہیں؟ یہ تو فطری رشتہ ہے وہ آپ کے والد ہیں۔ ان سے محبت آپ کے خون کا تقاضا ہے۔ وہ بھی آپ کو دل و جان سے عزیز سمجھتے ہیں۔"

"مجھے یقین نہیں ہے۔" روشی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیوں؟" ہادی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ تو بہت عالم فاضل آدمی ہیں۔ وہ یہ یقین کیوں میرے اندر نہیں ابھار سکے کہ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں یا یہ کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لئے کہ میں ان کی بیٹی ہوں۔"

"محبت کا بھلا علم و فضل سے کیا تعلق۔ محبت مشروط ہوتی تو آج کل محبت روشی کی طرح اس کے لئے بھی محبت کرتی۔"

ہادی ہنس دیا۔

"یہ تو ایک آسمانی نعمت ہے جسے ملنا ہوتی ہے مل جاتی ہے بغیر محبت کے بغیر بیج کے جیسے مٹی میں پانی جذب ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اپنے اصل ٹھکانے سے بے پرواہ کرتی ہے اور اپنے ہدف یعنی کسی روح میں جذب ہو جاتی ہے۔ کسی ہم آہنگ اور ہم جاتی روح میں۔ خونی رشتوں میں کیونکہ ہم آہنگی فطری ہوتی ہے اس لئے محبت ان رشتوں میں در حقیقت موجود ہوتی ہے۔"

"تمہیں ابھی بھی کچھ ہے محبت کی۔" روشی کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

"کوشش کر رہا تھا آپ کو یقین آ جائے کہ یہ باور آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔" وہ بڑے سادہ سے انداز میں مسکرا دیا۔

"اچھا اگر تم سے کوئی کہے کہ محبت کی تعریف ایک جملے میں کرو تو کیا تم کر سکو گے؟" وہ تو جیسے سوال بھی لئے بیٹھے تھے۔

"جی ہاں کر سکتا ہوں۔ یعنی اس طرح کہوں گا محبت ایک الجھا ہوا ریشم ہے جس کو سلجھانے کی کوشش کرنا بھی عظیم کوشش ہے۔"

"بہت مشکل جملہ ہے۔" اس نے مسکرا کر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے پیچھے رکھ لیا۔

"محبت عبادت کی خوبصورت شکل ہے۔" روشی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"مجھے علم ہے دہرا رہے ہیں۔" اس نے سگریٹ دوبارہ اٹھا لیا۔

"لیبو لوسی والی تو تمہیں بہت مس کر رہی ہو گی؟" اسے ایک دم کچھ یاد آ گیا۔

"ہاں یقیناً ہے۔" اس نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا تم ہر وقت اس کے بارے میں سوچتے ہو؟"

"ہر وقت تو نہیں، جب فارغ ہوتا ہوں یا ڈرائیو کر رہا ہوتا ہوں۔" ہادی نے بھی جیسے ہر بات کا جواب دینے کی قسم کھائی تھی۔

"آپ ایک بات میں پوچھوں آپ سے؟" ہادی نے سگریٹ رول کر کے تکیوں کے پیچھے لگا لیا۔

روشی کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ اس سے از خود کم ہی بات کرتا تھا۔ زیادہ گفتگو ہمیشہ روشی کی ہوتی تھی یا کچھ پوچھا۔

"لیبو لوسی والی تو مجھے کس وجہ سے یاد رہتی ہے؟ آپ کو اتنا کیوں یاد آتی ہے؟ آپ نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم نے تو جی بھر کے دیکھا ہے اسے۔" وہ کھلکھلا کر بولی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ وہ باتیں بتائیں جس سے آپ کو خوشی ہو۔" نہ جانے کیوں ہادی کو اس پر ترس آ گیا۔

"میرے پاس کوئی ایسی بات نہیں جو مجھے خوشی دے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"بتائیے میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟" ہادی کو خود بھی یقین ہو چکا تھا کہ آج وہ بہت مضطرب ہے۔

"تم میرے کسی کام کے نہیں ہو۔" اس نے ہادی کی طرف سے کروٹ لے لی۔ اس کی آواز سے صاف ظاہر تھا وہ رو رہی تھی۔

"آپ تو رو رہی ہیں۔ آج آپ اداس ہیں۔ معلوم کرنے کا حق تو نہیں ہو گا؟"

وہ چپ رہی۔

(کاش میرے بس میں ہوتا میں چن چن کر خوشیاں اکٹھی کرتا اور تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں)

"غرض ہے تمہاری میرا کوئی ذاتی نہیں ہے تم پر۔" وہ آنکھیں پونچھ کر سیدھی ہو گئی۔

"اچھا ایک بات بتائیں زہر کیوں کھایا تھا؟" وہ اس کے ستے ستے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری وجہ سے نہیں کھایا تھا۔" وہ چہرہ موڑ کر ہادی کی طرف دیکھنے لگی۔

"اتنی زبردست خوش فہمی مجھے عمر بھر نہیں ہو سکتی۔" وہ ہنس دیا۔

اسی دم نرس ہاتھ میں گلوکوز کی بوتل لئے اندر داخل ہوئی۔ ہادی کو دیکھ کر مسکرائی اور وش کیا۔

"آپ کب آئے سر؟" وہ بوتل اسٹینڈ پر لگانے لگی۔

"خاصی دیر ہو گئی۔" وہ دوبارہ مسکرایا۔

"آپ واقعی بہت پریشان تھے۔ رات آپ گھنٹوں سوچ میں ڈوبے رہے۔ میں وہاں سے کئی بار گزری آپ کو پتہ تک نہ چلا۔ آپ بہت اچھے رہتے ہیں۔" وہ بوتل لگا کر قدرے ماہر سمجھنے لگی۔

"ٹمپریچر چیک کرائیے نمبر بڑھ گیا تھا اس لئے وہ اپ سیٹ ہو رہی تھی۔" وہ ہادی کو بتا رہی تھی۔

"اور کتنی دیر یہاں رہنا پڑے گا میرا تو ہارٹ فیل ہو چکا ہے۔" روشی بیزاری سے بولی۔

"یہ ضروری ہے... پلیز!" اس نے تھرمامیٹر روشی کے منہ میں لگا دیا۔ اور اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر جما کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے انہیں کو بتا دیا تھا کہ مجھے مس اندرا اسسٹنٹ کم ہو گئی تھی۔ یہ کل نہیں ہے بہت اچھے ہیں۔ دراصل اس نے رات مجھ سے کہا تھا کہ ہو سکے تو آپ کو کوئی پچھ ہے؟ اسے خوبصورت کیل کا بچھ دیکھنے کا بڑا تجسس رہتا ہے۔" وہ ہنس رہی تھی۔

ہاری بہت جزبز ہو رہا تھا۔ بھلا وضاحت کے بعد اس قسم کی گفتگو کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

''کس کا بچہ؟'' تھرمامیٹر حرارت میں ہونے کے باوجود روشی بولنے سے باز نہ رہ سکی۔

''کسی کا نہیں''۔ ہاری جلدی سے بول پڑا۔

نرس نے تھرمامیٹر اس کے منہ سے نکال کر روشی کی طرف کر کے ریکارڈ شروع کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے ٹمپریچر نارمل ہوا۔ دراصل ابھی وہ تین انجکشن لگنے بے حد ضروری ہیں۔''

اس نے ایک انجکشن اٹھا کر روشی میں انجکٹ کیا اور روشی کا بازو آہستہ سے آگے کر رگ ٹٹولنے لگی۔

''پلیز ذرا آپ یہاں آئیے''۔ اس نے ہاری کو بلایا۔

وہ میگزین سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر نرس کے نزدیک چلا آیا۔

''جی۔''

''ایک تو ان کی رگ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ذرا بازو دبا لیے''۔ اس نے روشی کے بازو پر ایک جگہ نشاندہی کی۔

ہاری نے اپنا مضبوط ہاتھ وہیں رکھ دیا اور باقاعدہ دبا دیا۔

روشی نے تڑپ کر اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑایا۔

''رگ ڈھونڈ رہے ہیں آپ لوگ یا تیل کے کنویں؟'' وہ برافروختہ ہو کر بولی۔

''یہ موصوف سرکش گھوڑے قابو کرتے ہیں۔ آپ نے میرا نازک سا بازو ان کے حوالے کر دیا''۔ وہ اپنا بازو سہلانے لگی۔

نرس ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

ہاری بھی بے ساختہ مسکرا رہا تھا۔

''ویری گڈ!'' نرس نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔

''اچھا ذرا آرام سے''۔ اس نے ہاری کو بیڈ پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

وہ بیٹھ گیا اور بہت رسانیت سے اس کا بازو تھام لیا۔

اس کے چھوتے ہوئے لمس سے زندگی کی حرارت جیسے روشی کے جسم و جان میں اتر گئی۔

اس نے چھوا تو زندگی کا ادراک ہوا۔ وہم و خیال تو سراسر آسودگی ہیں۔ مادی اور اسباب و علل کی دنیا میں لمس زندگی کی موجودگی کا یقین ہے۔ ایک شے یا ذات آنکھ پر خواہ نظر کے سامنے رہے۔ خواب و خیال کا شک رہتا ہے۔ جسے چھو لیا اس کے ہونے کا یقین آ گیا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ اسے احساس تک نہ ہو سکا۔ نرس نے سوئی کب اس کی رگ میں اتار دی۔

اپنے بازو پر سے ہاری کا ہاتھ ہٹ جانے کے احساس سے اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ کھڑا ہوا تھا۔

آنکھوں میں الجھن اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''ہوا یا زور سے چھو کر گزر جائے تو آپ چیخ پڑتی ہیں ابھی سوئی سوئی اندر اتر گئی اور ۔۔۔۔ تیر بھی ڈیری ہے۔ انسان کو سا ضرور ہونا چاہیے۔ کیمپ سسٹم میں اور رہا تھا جب آپ سوئی رگ میں اتر رہی تھیں کہ ان کی چیخ کے زور پر کمرے سے باہر نہ چلا گیا ہوں''۔

وہ بہت پرسکون تھا اس کی ہنسی سے ظاہر تھا ۔۔۔۔ نرس ہنس رہی تھی ۔۔۔۔ اور پھر بھی انٹرسٹ لے رہی تھی۔

''آپ لوگ خاصے پرلطف ہیں۔ آپ یہیں گے رات کون ان کے ساتھ؟'' وہ جاتے جاتے پلٹ کر پوچھنے لگی۔ خاصی شوخ و شنگ نرس تھی۔

''نہیں ان کی بہن آنے والی ہیں۔ اچھا! اور آپ نے پوچھا ہے؟ ویسے آج ادھر روم میں ہی کہانی سنا رہی تھی''۔

روشی کچھ زیادہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ وہ کھلکھلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اس سے پہلے کون سی کہانی سنائی تھی؟'' وہ ان دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے الجھ رہی تھی۔

ہاری کرسی کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ پورا گھومنے کے بجائے اس نے صرف چہرہ موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔

''رہنے دیجیے' کیا کریں گی سن کر۔ صدمہ بھی ہوگا اور غصہ بھی آئے گا''۔ وہ کچھ سوچ کر ہنس دیا۔

''نہیں آئے گا مجھے غصہ۔ بتائیں''۔ وہ مصر ہوئی۔

''آپ کو اس وقت ہر تکلیف سے دور رکھنا ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے اور ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں''۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''جب کوئی خاص بات نہیں تو نرس کیوں ہنس رہی تھی؟ وہ میری طرف دیکھ کر ہنس کیوں رہی تھی؟'' وہ اچھی خاصی مشکوک تھی۔

''صبح کروں گا جتنے سے تاکید کروں گا کہ آہستہ سے بول چال کر کمرے سے باہر نکلے''۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اچھی طرح ٹانگیں پھیلا کر اور بازو سینے پر لپیٹ لیے۔

''ہونہہ!'' روشی نے دوسری سمت منہ پھیر لیا۔

وہ اس کے سراپے پر نظریں ڈالے رہا۔

''ویسے میں آپ کو بے حد منظم اور باضابطہ ہونے پر داد ضرور دوں گا''۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے جانے کس شرارت کے تحت مسکرا رہا تھا۔

''شکریہ سنبھال کر رکھو اپنی داد ۔۔۔۔ آگے کسی کام آئے گی''۔ اس کا موڈ سخت آف تھا۔

''خودکشی سے پہلے آپ نے سیاہ رنگ کا انتخاب کر کے بڑے باذوق ہونے کا ثبوت دیا ہے''۔

''شٹ اپ!'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

وہ ہنس دیا۔

"سوا کیوں آف ہو گیا؟"

"بالکل بھی اچھی نہیں ہیں تمہاری عادتیں بزرگی سے راز و نیاز کرنے بیٹھ جاتے ہو۔ ابھی کی عمر میں اس سے اتنی بے تکلفی؟" وہ چہرہ سموز کرتے گھورتے ہوئے بولی۔

"راز و نیاز کا مطلب جانتی ہیں آپ ——؟" اس کا قہقہہ بلند ہو گیا۔

"جاہل ہوں ایک تم ہی عالم فاضل ہو —— ہونہہ —— اور ہاں سنو!"

دھڑام سے دروازہ کھلا —— گھر کی قیادت میں روبی، سوہا، زری اور شعبہ احمد داخل ہوئیں۔ اس کی بات منہ میں رہ گئی۔

"ماشاء اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ہم لوگوں کو ذرا دیر ہو گئی۔ پیچھے ہی پیچھے چار کرم عقل ہوش میں ہوں تو بھی ہم سب سے کم فرصت میں شرمانے کے نکل پڑے۔"

گھر اس سے پہلے کہ ارادے سے آگے بڑھی تھیں گرد آپ گئی دیکھ کر صفحے پر رک گئیں۔ پھر بڑے سکون سے آگے بڑھیں اور جھک کر اس کے رخساروں کو چوما۔

"بس بستر سے اٹھ جاؤ۔ پڑھائی تو بہت سخت کرو گی نئی الوال تو بہت خوشی کا وقت ہے —— مار والے والے خوف سے رہائی ملی بہت شکر کریں کم ہے۔"

"انسان کو اتنا نادان بھی نہیں ہونا چاہیے کہ آس پاس رہنے والوں کی زندگی بھی عذاب ہو جائے۔" شعبہ دوسرے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ اپنے حساب سے انہوں نے "نصیحت" کی تھی۔

زری نے آنکھوں آنکھوں میں شعبہ کو چھیڑا۔

"کیا آپ سب کی سب اندر آ کیسے گئیں؟" باری نے ان سب کو دلچسپی سے دیکھا۔

"سب کہاں ہیں؟ چار آنے ہیں بیچ —— بارہ آنے تو گھر پر ہیں۔" سوہا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آپ سے درخواست ہے آپ زندگی میں کبھی 'معاشیات' پر نظر کرم مت فرمایے گا۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔

سوہا فطری سادگی سے مسکرا دی۔ جب کہ شعبہ نے خاصے کینہ انداز میں باری کا جائزہ لیا تھا۔

"کتنا تھک گیا تم نے۔" گھر اس کے نزدیک بیٹھ کر بہت پیار سے دیکھنے لگیں۔

"[illegible] اس نے تمہیں؟" انہوں نے باری سے استفسار کیا۔

"میں ان کا ہمراز نہیں ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو بتانے میں کیا حرج ہے؟" شعبہ بے چاری عادت سے مجبور تھیں۔

باری نے قدرے چونک کر شعبہ کی سمت دیکھا۔ کیا "اسے" بھی مذاق میں خوش کیا جا سکتا ہے؟ مگر ہونا تو نہیں چاہیے۔ اندر سے بہت زیادہ احتیاط کا تقاضا ابھرا۔

"میں باہر گاڑی میں ہوں۔ آپ لوگ 'زری' کی درخواست کے مطابق کمرے سے باہر آنے کی کوشش کیجئے گا۔"

"پاپا!" شعبہ نے آواز دی۔

"گاڑی میں؟" واک مین رکھا ہوا ہے پچھلی سیٹ پر تمہارا ہے؟"

"جی!" اسے اپنی غائب دماغی پر خفت ہوا۔

"گاڑی میں تو کیسٹ پلیئر ہے اسے کیوں اٹھائے اٹھائے پھرتی ہو؟" وہ عجیب سی ہنسی ہنسیں۔

"وہ دراصل یہ زری بی بی کا ہے بھول گیا تو گاڑی میں —— دراصل سے چلتے ہوئے لے لیا تھا کہ راستے میں انسان بہت زیادہ تنہائی محسوس کرتا ہے۔"

"اوہ!" وہ اس طرح ہو گئیں جیسے ان کا کوئی خاص مطلب نہیں تھا ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔

زری کے کان کھڑے ہو گئے تھے واک مین کے ذکر پر۔ وہ بہت حیرانی سے باری کی سمت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"سب لڑکی کے جتنی جلدی ہو سکے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئیں۔" بچے سو گئے تو اس نے احتیاط سے موضوع چھیڑا۔

"میری تو تمنا ہے کل کی ہوتی آج ہو جائے اس کی شادی پر کوئی ڈھنگ کا رشتہ تو آئے۔" اس کی بیوی نے اپنے پہلو میں سوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ آج بیرون ملک والی کرنے آئے تھے۔ رشتہ لائے ہیں کس کا؟" اس کے ذہن میں مغرب کے وقت سے سوال کلبلا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ خاوند نے یہ موضوع کیوں چھیڑا ہے۔

"دیکھا تو تھا تم نے وہ جو لال کپڑوں میں تھا۔" غلام محمد نے وضاحت کی۔

"اپنے لڑکے کا رشتہ لایا تھا۔ کیا کرتا ہے اس کا لڑکا؟ خود تو اس عمر میں بھی پیدا نکالتا پھرتا ہے۔" بڑی تیز نظر تھی اس کی گھر والی کی۔

"اس کا کوئی لڑکا وڑکا نہیں ہے۔"

"بھائی ہو گا؟" اس کی بیوی نے بات کاٹ دی۔

"وہ خود کنوارا ہے۔" اس نے دبے لہجے میں بتایا۔

"تو اس میں ہمارا کیا قصور؟" وہ تنک کر بولی۔

"پیسے والا بہت ہے ——" اس کی آواز ہنوز کمزور تھی۔

"کیا رشتہ لایا تھا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ خاموش رہا۔

"شرم تو نہیں آئی تمہیں۔ ایسی کیا عمر گزرتی جا رہی ہے اس کی اور ہوش کے ناخن لو۔ کہاں میری پھول سی بچی اور کہاں وہ بڈھا ——" اس کی آواز تیز ہو گئی۔

"آہستہ بولو، بچہ سو رہا ہے جی۔" ترنم کے لہجے میں معذرت تھی [illegible] وہ پر سکون تھا۔

"اس کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی۔ کیا غریب کی کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ کہہ دو اس سے [illegible] کرے تمہیں اپنی جان کی قسم ہے" وہ [illegible] لیٹ گئی۔

"محبت [illegible] ہے، ہمارا تو اصول ہے کہ کوئی غریب [illegible] ساری زندگی [illegible] رہی ہے۔ چاہتی ہے بیٹی بھی اسی عذاب میں زندگی گزارے۔ [illegible] مار کرے گی۔ آج میں تیرے سامنے پیسے رکھتا ہوں تو [illegible] نہیں کرتی تھی [illegible] یہ جواب ہے!"

اسے جانے کیا کیا یاد آ گیا، وہ [illegible] ہونے لگے۔

"عورت پیسے سے خوش ہوتی ہے، جس سے اس کے ارمان پورے ہوتے ہیں۔ [illegible] بیٹی کی عمر [illegible] وہ ان کے پیچھے نہیں تھے [illegible] پاس؟"

"اچھا رات کے وقت شور نہیں کرو [illegible]" اس نے کروٹ [illegible] پھر کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"ہم نے [illegible] سامنے [illegible] کوئی پیچھے نہیں [illegible] ساری کمائی [illegible] نے پیسے [illegible] کے پیچھے جان [illegible]" وہ ایک دم مشتعل ہو گیا۔

"[illegible] دنیا کے ساتھ [illegible] کہاں جائیں گے [illegible] اچھا اب سو جاؤ۔ دماغ نہیں چاٹو میرا۔" اس نے دیوار کی طرف پشت کر لی۔

(ایک دن میں تو نہیں بنے گی۔ آخر بات ہی ایسی ہے، خیر کل دیکھیں گے۔) اس نے سونے کے خیال سے آنکھیں موند لیں۔

"جب سے [illegible] مٹھائیاں دیکھ کر [illegible] دوست بھی [illegible] اس کی نیت میں کھوٹ ہے۔ [illegible]" عورت کے اندر آگ سی بھڑک گئی تھی۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

اے میرے دل کے داغ تو ہی تو

تو کہاں تھا ؟ بہار سے پہلے

[illegible] ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایک گھنے درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ غلام محمد بہت دیر سے چپ تھا۔ اسے خوف تھا جیسے ہی [illegible] سے معذرت کرے [illegible] شروع ہو جائے گی۔ ایک شعر تو ابھی پڑھا تھا [illegible] ہو رہا تھا۔

[illegible] ہو رہا تھا۔

ماڑے ایک عجیب سرمستی کی کیفیت میں تھا۔ [illegible]

[illegible] غلام محمد [illegible] جواب دیا۔

"بیچارا" غلام محمد [illegible]

"جی۔" ماڑے نے [illegible] سر ہلایا۔

اچھا ہے تھوڑی [illegible]

اک بات [illegible]

اسے یقین تھا شعر [illegible]

"رات گھر والوں سے بات ہوئی تھی۔" [illegible] ماڑے کی طرف دیکھا۔

[illegible]

"وہ تو [illegible] تھا۔"

"ایک [illegible]" وہ [illegible]

[illegible] ماڑے نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"کیا کہا ہے" وہ [illegible]

[illegible]

"مجھے [illegible] ایک دن خودکشی کرنے [illegible]" اس نے بیٹھنے کی کوشش کی۔

"خدا کے واسطے [illegible]" غلام محمد نے گھبرا کر [illegible]

"ارے تم تو [illegible]"

آج پھر جام [illegible] ہے

آج پھر رحمت [illegible] ہے

"[illegible] جام [illegible] شراب [illegible]"

حاصل [illegible]" غلام محمد نے سادگی سے [illegible]

"جنت میں جانا چاہتے ہو؟" وہ مسکرایا۔

"اللہ ہر مسلمان کو جنت نصیب کرے۔" غلام محمد [illegible] ہو گیا تھا۔

محبوں کی طلب اور نہ ساغر سے ہے نفرت
زاہد ابھی عرفان سے کچھ بھول ہوئی ہے

"بھئی جو چیز اللہ اپنی مرضی سے دے اس میں کیا برائی ہے؟" پہلی مرتبہ غلام محمد نے اس کے کسی شعر سے کچھ اخذ کیا تھا، باقی سر سے گزر گیا تھا۔

"اچھا چلو جانے دو ناراض نہیں ہوتے۔" وہ صلح کن انداز میں بولا۔

"یہ تم اتنے سارے شعر یاد کیسے کر لیتے ہو؟" آج اس نے پوچھ لیا۔

"مجھے کہاں بھی یاد ہیں سنا دوں؟" وہاں سے بھی بے مروا جواب آیا۔

غلام محمد نے جیسے سر پیٹ لیا۔

"اچھا اب ذرا لائن پر آؤ۔ دیکھو گھر والی کو پہلے نرمی سے رام کرو۔ نہیں مانے تو گھر سے نکالنے کی دھمکی دو۔ اس عمر میں کہاں جائیں گی، راضی ہو جائیں گی اور جب اپنی بچی کے ٹھاٹ باٹ دیکھے گی تو سب بھول جائیں گی اور پہلے سے زیادہ تمہاری خدمت کرے گی۔ اپنی بے وقوفی کا اعتراف کرے گی تمہاری تو جی جان سے … دے گی۔"

"اور جو اسے دن میں تارے … کرے گی؟" اس نے خاصی دور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔

"چار دن کی تکلیف ہے اگر لیا آرام مل رہا ہو تو پھر گھاٹا کیا ہے؟" عارف نے پھر بیل دی۔

"ویسے بھی 'ٹرٹی' لگائی ہے؟" اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر ماچس ٹٹول کر تلاش کی۔

"ارے جب روٹی کا شوربا ہی تھا روز ہی کل کل ہوتی تھی۔ کبھی وہ جانے کی 'ٹرٹی' لگاتی تھی۔ کبھی میں طلاق کی 'ٹرٹی' دیتا تھا۔" غلام محمد اپنی سادگی سے بتا رہا تھا۔

"پھر تو تمہیں 'پریکٹس' ہے ٹرٹی لگانے کی۔ شاباش اب پھر 'چالو' ہو جاؤ۔ ان شاء اللہ تمہاری بچی دعائیں دے گی۔ ارے سال خان مزاج کا بھی اچھا ہے۔ گرم نہیں ہے اس کے دماغ میں زیادہ اور پھر کھلے دل کا ہے۔ بار بندوں کو وہ … گا۔ 'ہرمال ودھ پے' والے مچھے پولیس لے جائے گا۔ یہ حاجی … پہنچا ہے۔"

عارف نے کن انکھیوں سے غلام محمد کی طرف دیکھ کر بظاہر شرارتاً انداز میں کہا۔ "بھائی کسی کو تو کھٹکے اور جھگڑ خوشی … دروازے پر کھڑی یا جھوڑی ہی جاتا جا رہا ہوں … بولو؟"

عارف نے سگریٹ سلگا کر غور سے اس کی تیز … چھوڑتے ہوئے مزید … لگا۔

"ہاں خیر یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو خیر تم بتاؤ تمہاری ماں تو ٹھیک ہے؟" اس نے عارف کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

"مائی! کہاں ٹھیک ہوتی ہیں۔ بڑا دہ سوں کی ستائی ہوئی۔ ابھی پچھلے ہفتے … پانچ ہزار پر پریشانی۔ یہ … ہو رہا ہے۔ یہ موٹر سائیکل پر جا رہا ہوں پتا نہیں کیسے چلے گا۔ یہ کارس جا رہا ہے" کچھ ہو جائے۔ پیدل جا رہا ہوں سڑک دیکھ بھال کر پار کرنا۔" وہ بہت آرام سے دھواں چھوڑتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"تم نے بھی تو زیادتی کی۔ ٹھیک ٹھاک چلتے اس بے چاری کو ایک بھولا دیا۔ غریب نکل جاتی۔" غلام محمد اس کی

ماں کی جھولی پر ترس آیا۔

ابھی تک بے گھر سی ہے مری وحشت کی عریانی
پھر کس امید پر گھر کو بیاباں کر لیا میں نے

"اوہ … ہوں …" "کتنا خوب صورت اور لطیف ہے۔ جینے کی طاقت دیتا ایک مختصر فسوں۔" اس کی آنکھوں کے گوشے نم تھے مگر لب مسکرا رہے تھے۔

وہ فجر کے وقت اٹھنے کا عادی تھا۔ معمول کے مطابق آنکھ کھل گئی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے پھر قرآن پاک کی چند آیات پڑھیں … میں آ گیا۔ فوارے کے قریب ہی موڑھے کے پاس ان کی سنگ مرمر کی بنچ پر بیٹھا اور پانی کی اچھل کود پر نظریں جما دیں۔

"اچھا تو ادھر نکل گئے۔" وہ بابا صاحب کی آواز پر جانے کس خیال سے چونک پڑا۔

"السلام علیکم خان!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام بیٹھو … رات سے ہم ایک بات پر غور کر رہے ہیں۔" وہ اس کے برابر ہی بیٹھ گئے۔

"جی … فرمائیے۔"

"یہ کراچی کی جو فیکٹری میں ہمارا منیجر ہے علیم الدین تمہیں تو پتا ہوگا یہ اپنے ہی گاؤں کا ہے۔"

"جی … جی …" وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"سیدھے ہیں یہ لوگ وقت گزر گیا تھا ہے چار دن کا۔ پاکستان بننے سے پہلے کی واقفیت ہے ہماری ان کے خاندان سے۔"

"جی۔" وہ مزید سنبھل گیا۔ اسے بہت ہی خاص بات کی 'بو' آ رہی تھی۔

"اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ روشی سے سال چھ مہینے چھوٹا ہوگا۔"

"اوہ" ہماری سمجھ میں بات آ گئی۔ اس نے … ایک گہرا سانس لیا۔

"بارہ جماعت پڑھا ہوا ہے۔ باپ نے انگ … کر رہا تھا۔ غلط صحبت میں پڑنے لگا تھا کالج میں۔ باپ نے وہاں احمد شیخ سے … کالج سے اٹھا کر کاروبار میں لگا دیا پچاس ہزار قرض لیا تھا ہم سے چالیس ہزار واپس کر چکا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ اکیلا لڑکا ہے ماں باپ کا … ہمیں بھی سکون لے گا اور اسے بھی۔ سال چھ مہینے چھوٹا ہے تو کیا ہوا۔ ابھی اس سے بیٹی ہی ہوئے ہیں اسے کاروبار سنبھالے۔ ماشاء اللہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ ایسا کرو آج علیم الدین کو شام کی چائے یا رات کے کھانے پر بلا لو۔ فون کر دینا اور کہہ دینا بیٹے کو بھی ساتھ لائے۔ ٹھیک ہے؟"

"جیسے آپ حکم کریں۔"

"یار ابھی اس پندرہ دن بعد کراچی کا چکر لگ جائے گا۔ وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ویسے تو ہمیں امید ہے وہ ہمیشہ کی طرح ہمارے فیصلے سے اتفاق کریں گے۔ اس کے ایک بیٹے سے ہم روشی کی بات … کر دیں گے۔ کیوں؟"

وہ اپنی جگہ پر دونوں ہاتھ ملا کر سامنے دیکھنے لگے۔

"جو آپ بہتر سمجھیں"۔ وہ اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے ملکو چائے لئے آ رہی تھی۔

"اچھا ہم ذرا اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔ ایک ضروری فون کرنا ہے"۔ سر اٹھا کر "ابھی جلدی سے آ جاؤ کہ ہاں کا سامان پیک کرا کے چیک آؤٹ ہو گیا"۔

"چائے پی لیں خان"۔

"تم لوگ ہم پی چکے ہیں"۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ملکو نے اسے چائے کا کپ تھمایا اور اگلے حکم کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔

"تم جاؤ اپنا کام کرو"۔ اس نے پیچھے کسی دلیل سے چونک کر اسے کہا تھا۔ وہ چلی گئی۔

اسے محسوس ہوا تھوڑی دیر پہلے لان بہت حسین تھا۔ پھول حسن ابھی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ اب یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی گھر میں اچانک بری خبر آ گئی ہو۔ اور سب کے چہرے اتر گئے ہوں۔ وہ ویران آئینے وار ہی آ رہی سے تکلیفوں کو تک رہی ہوں۔

اس نے چائے کے گھونٹ بھرنا شروع کر دیئے جو بے حد بے مزہ محسوس ہو رہی تھی۔

بیلی ایک عین عالم شباب اور ان کی حد جہاں آرا اسے جیپ تک خدا حافظ کہنے آئی تھیں۔

جواد سے رات کمرے میں جا کر باتیں کر کے خدا حافظ کہہ چکا تھا۔

وہ فرنٹ سیٹ پر یاور علی خان کے برابر میں بیٹھ گئی اور کوئٹہ سے جیپ کا دروازہ بند کر لیا۔

ابھی تک وہ یاور علی خان کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

"زیبا تو وں میں صبح جتنی حسین ہوتی ہے شہروں میں تو پتا ہی نہیں چلتا اس کے حسن کا"۔ آپ کبھی اس سے پہلے مری گئی ہیں؟" وہ کچھ راستے پر جیپ بہت احتیاط سے چلاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"———— ذرا اوپر مال گرینڈیز اور بیک گراؤنڈ میں پہاڑوں کا منظر دیکھنے کو کبھی بھول نہیں سکیں گی"۔

"مری سے بھی زیادہ حسین ہے؟" اس نے ان کی طرف چہرہ موڑ کر دیکھا۔

لائٹ براؤن کوٹ پینٹ اور سر پر اون کی ہیٹ بنگ والی میں وہ بہت تر و تازہ محسوس ہوئے۔

"مری کا حسن الگ انفرادیت رکھتا ہے۔ مری بیر اپنی جگہ منفرد ہے۔ وہاں قدرتی حسن کے علاوہ سکون بہت ہے۔ زیادہ ہنگامہ سا نہیں ہے۔ علاقہ کے لوگ بھی اچھے سادہ ہیں"۔

پکی سڑک شروع ہو گئی تھی۔ انھوں نے رفتار بڑھا دی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف لگے ہوئے گھنے درخت ایک عجیب سی تازگی اور ٹھنڈک کا احساس دلا رہے تھے۔

"کتنے عرصے سے ہے آپ کی پوسٹنگ یہاں مری پور میں؟"

"زیادہ دن نہیں ہوئے"۔

"پہلے کہاں تھے؟"

"کوہاٹ"۔

"وہ بھی تو سنا ہے بہت خوبصورت ہے؟"

"تم لوگ میں گے وہاں بھی آپ کو اور جہاں کہیں گی"۔

"ارے سے سو ہوان ہیں آپ؟ آپ کا چہرہ تو پتہ نہیں دیتا"۔ وہ ہنس دی۔

"چہرے بلکہ چہروں پر نہ جائیے، پھر بعض اوقات بہت جھوٹ بولتے ہیں"۔ انھوں نے گیئر بدلتے ہوئے اس پر سرسری نظر ڈالی۔

مری سوٹی گر خوبصورت لباس میں وہ ماحول کو خوش نظر بنانے میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔

"کیسے ہوتے ہیں جھوٹے چہرے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پیشانی سے بال ہٹاتے۔

"یہ سمجھنا مشکل ہے۔ یہ تو اس انکشاف ہوتا ہے۔ پہلے سے پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

"کبھی ہوا ہے انکشاف؟" وہ ان کا خوبصورت چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

"میں پیش گوئی کر سکتا ہوں آپ ابھی وکیل بنیں گی"۔ وہ مسکرائے۔

"میرے سوال کا جواب ہے؟"

"اچھا یہ بتائیے آپ کو پہلے ریسٹ ہاؤس چھوڑا جائے یا آپ میرے آفس چلیں گی پہلے۔ ذرا آفس کا جائزہ لے کر اطمینان سے آگے چلیں گے۔ اس طرح کا پروگرام رہتا ہے بہت آسان ہو گا" کہیں؟"

وہ سامنے سے آتے ہوئے ٹرکوں کے ہنوز کو غور سے دیکھ رہی تھی جیسے چونک سی گئی۔

"آپ خاطر ہے جو سوچیں گے میں اس میں ساتھ دوں گی۔ اس لئے کہ مجھے کچھ پتا ہی نہیں اور ہاں میرا سوال آپ کے پاس امانت ہے۔ میں اتنی سادہ لوح نہیں ہوں کہ آپ اپنی مرضی سے جب چاہیں ادھر ادھر الجھا دیں اور مجھے پتہ چلے"۔ وہ ہنس پڑی۔

"ذہین عورت بھی بعض اوقات مسئلہ ہو جاتی ہے"۔ وہ کھل کر ہنسے اس انداز میں اس کی طرف دیکھ کر رہے کہ ان کی آنکھوں میں سرخی کے ساتھ چمک اور مسکراہٹ بھی تھی۔

"آپ تو بھی بہت ذہین ہوں گی۔ کاش انھوں نے بھی آپ کی اپنی کمشنری کے مزے چکھے ہوتے۔ جاگیرداری میں وہ مزا کہاں جو "Enlightened" کا ذرا سا بڑھ رہا ہے۔ پاکستان میں تو پیدا ہونے والے بچے کو اگر سب سے اچھی دعا دی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اللہ کرے "بیورو کریٹ" بنے"۔ وہ دونوں بہانے پہاڑوں پہنچے"۔ وہ پاؤں پھیلا کر ذرا آرام دہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یاور علی خان کھل کر مسکرا اٹھے"۔ "وری نائس آف یو بائی گاڈ نہیں"۔

ایلی آئی ذرا شرطی ہے ایک معصوم سی شرمگیں مسکراہٹ اپنی ان کے ہونٹوں پر پھیلنے لگی۔

محبت عادت ہو سکتی ہے۔

مگر عشق سراسر مجبوری ہے۔

زندگی یونہی اداس سی بسر ہو رہی ہوتی ہے

انسانوں کا ازدحام بھی وہی ہوتا ہے ہمیشہ سا

لیکن"۔

ایک طلسمی نظر مختلف سیارے کی طرح آشکار ہوتی ہے۔

نگاہوں کا ایک نیا جہاں دریافت ہوتا ہے۔

انسان ایک ساعت میں اڑ کر اس نئے جہاں میں پہنچتا ہے۔

اس جہاں کی تہذیب۔

یہاں کے رکھ رکھاؤ۔

یہاں کے شام و سحر۔

یکسر مختلف ہوتے ہیں۔

اس جہان میں ہم آہنگ ہونے کیلئے یہاں کا مخصوص لباس پہننا ہوتا ہے۔

جس کے تاروں میں سرمستی ہو۔

بے خبری ہو۔

جس کے لمس سے جسم سے طلب کی آنچ آتی ہو۔

اس جہاں میں نیند و بیداری کے مفہوم بھی الگ ہوتے ہیں۔

مطلوب و محبوب و مقصود کے دیدار و وصل میسر ہوں تو میٹھی نیند کے مزے کئے آتے ہیں۔ وہ نظر سے اوجھل ہو تو

حریر و ریشم سے آراستہ خوابگاہ میں الاؤ بھڑکتے ہیں۔

نہ نیند اپنی نہ بیداری۔

نہ خوشی نہ غم۔

نہ زہر نہ امرت۔

کوئی شے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔

اس ایک نگاہ کے سحر کے ساتھ زندگی سفر کرتی ہے۔

وہ نگاہ"۔

جس کی تائید و تردید کے ساتھ ذات وابستہ ہو جاتی ہے۔

بس وہ نگاہ۔

کہ اس نگاہ کا اثر ہر شے پر غالب آ جاتا ہے۔

چاند کا حسن محسوس ہوتا ہے تو اس نگاہ کے احساس کے ساتھ۔

سبزہ زاروں کی ٹھنڈک کا ادراک ہے تو اس کی مسکراہٹ کے ساتھ۔

بہتے دریا اس کی روانی ہے تو گویا اس نظر کی مستی تیزی کا استعارہ۔

اس نظر کی مستی تیز گفتگو کا تسلسل۔

عشق کیا ہے۔۔۔؟

آداب غلامی کی تفصیل"۔

پہلا"۔

ادھورا"۔

ہنستا مسکراتا"۔

سوچتا گیا"۔

سب اس نظر کے اختیار میں چلا جاتا ہے۔

عشق کیا ہے؟

جاں کو سوختہ بنانے والا بڑا سا ابھار۔

زندگی بن کر دوڑنے والے لہو سے روشن رہنے والا الاؤ۔

تنا تنا کھنچی ہوئی زندگی آن کی آن میں اس الاؤ میں جا پڑتی ہے۔

اور پھر کوئی کہے تو قصہ ختم ہو۔

راکھ ہے تو جان چھوٹے۔

پھر کوئی مٹتی راکھ۔

دہکتی ہے نہ بجھتی ہے۔

عشق کیا ہے؟

اپنی ذات سے دستبرداری کا اعلان۔

اپنی انا کی رخصتی کا سامان۔

اپنی گمشدگی کا اعتراف۔

اپنی ذات کے لاپتہ ہونے کا اشتہار۔

اپنے وجود سے لاتعلقی کا بیان۔

عشق کیا ہے؟

اس ایک نظر کا اثر۔۔۔

وہ نظر جو وسعت کے معنی سے بہت آگے اڑان بھرتی ہے۔

یکی نظر جس میں بربادی کے سامان چھپے ہوتے ہیں۔

مکمل کر کائنات بن جاتی ہے۔

اور ساری زندگی گویا اس کائنات میں مقید ہو جاتی ہے۔

ہر آن ہر لمحے۔

اس نظر کی تپش محسوس ہوتی رہتی ہے۔

دل حضوری کو ترستی تو اظہار ہوتی ہے۔

ورنہ۔۔۔!

جہاں گوشہ ہوتا ہے وہیں کائنات ہوتی ہے۔

اس نے تازہ اخبار رول کر کے پیچھے سے نکالا۔ ہسپتال سے آئے اسے دوسرا دن تھا۔

اس کی دردمندانہ اپیل پر کوئی اس کی تنہائی میں مخل نہیں ہو رہا تھا البتہ گھر کے ہر فرد ہے اسے دیکھنے یا سوپ وغیرہ لے کر آتی جاتی تھیں۔

اور جس کے سنگ بار لمحے نے اس کی دنیا تہہ کر رکھی تھی اس کی جھلک بھی دیکھنے کو نہیں مل رہی تھی۔

وہ پوری طاقت مجتمع کر کے بستر سے اٹھی اور کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ وہ سامنے ہی کھڑا نظر آ گیا۔ اختر (ڈرائیور) سے باتیں کر رہا تھا۔ اختر بھی ہنس رہا تھا اور وہ بھی۔

روشی کے سینے سے ہوک سی اٹھی۔

کتنا مشکل اور کتنا آسان ہے ہنسنا جیسے اس وقت دنیا کا دلچسپ ترین لطیفہ بھی اسے نہیں ہنسا سکتا تھا۔ وہ موتی اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ میں تو شاید اب عمر بھر نہ ہنس پاؤں گی۔ مجھ پر آخر یہ انکشاف کیوں نہیں ہوا کہ میری خوشیاں اور میری ہنسی تمہاری ذات کی مرہون منت ہے۔

"بی بی! جاگ رہی ہیں آپ؟" کلثوم کی آواز اسے چھری کی طرح اس کے دماغ پر لگی۔

"ہاں"۔ اسے زہر لگ رہی تھی۔

"اور ہاں سنو"۔ اس نے جاتی کلثوم کو پکارا۔ وہ ٹھہر گئی۔

"ہادی کو بھیجنا میرے پاس"۔ وہ دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔ اختر گاڑی گیٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔ ہادی ریسٹ واچ پر نظر ڈال کر اس طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ اس کا دل بے قابو ہونے لگا۔ "یہ جا رہا ہے جانے کب واپس آئے گا؟ اور یہ کلثوم کہاں مر گئی۔ جب پہنچے گی تو اس وقت تک تو نکل بھی چکا ہو گا"۔ اس کے دل و دماغ کی دیواریں لرزنے لگیں۔

اگر چند لمحوں کے اندر اس سے بات نہ ہوئی تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ دل رک جائے گا۔ اس کا جی چاہا کھڑکی سے کود کر اسے پکڑ لائے۔

سامنے اس نے دیکھا کلثوم بہت روتی ہوئی ہادی کی طرف جا رہی ہے۔ ساتھ عثمان خان کی آواز بھی آ رہی ہے۔ وہ رک گیا تھا کلثوم اس کا پیغام دے رہی تھی۔

روشی کے سینے سے ایک سرد سا سانس خارج ہوا۔ اعصاب پر سکون ہوئے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔

وحشت کے وقفے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ"۔ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

"میں میم! مجھے یاد فرمایا؟" اس کی شریر آواز بہت قریب سے آئی۔

"تمہارے اس ہادی کی حیات کا راز نہیں"۔ وہ جیسے بہت سنگ رہی تھی۔

"ہمارے پاس ایسی عجیب سی بات کی ہے آپ نے۔ جو ہمارا ہے وہ آپ کا ہے ہمارے تمہارے کی پابندی سے قدرت نے ہمیں آزاد کیا ہوا ہے حکم کیجئے"۔

وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر سر کو خم دے کر کہہ رہا تھا۔

"آج تو تمہاری ست دکھایا کرو ڈرامہ لگتا ہے"۔ وہ چڑ گئی۔

"آپ کو میری تابعداری پر شک ہے کیا؟" وہ ہنوز کھڑا ہوا تھا۔

"اچھا بیٹھ جاؤ کیوں پوز کرتے ہو کہ سارا کام تمہارے بغیر رکا ہوا ہے"۔

"لیجئے بیٹھ گیا ارشاد"۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ارشاد و شار کچھ نہیں تم اتنے بے حس ہو اندازہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ بھی آ کر میرا حال نہیں پوچھا"۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

اس نے جلدی سے ہادی کی طرف سے پشت کر لی اور ہادی حیران و پریشان اسے دیکھتا رہ گیا۔

"ہاں سب لوگ تو آپ کے ارد گرد طواف کر رہے ہیں۔ میں تو یہ سوچ کر آپ کے پاس نہیں آیا کہ کہیں آپ کو گراں گزرے آپ کو الجھن نہ ہو۔ میں تو احتیاط برت رہا تھا"۔

"بھاڑ میں جائے تمہاری احتیاط تمہیں نہیں پتا میں تمہاری کتنی عادی ہوں"۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔ لہجے میں آنسوؤں کی نمی گھلی ہوئی تھی۔

"آئی ایم سوری روشی بی بی! اچھا چلیں نارمل ہو جائیے۔ اب میں آپ کے کمرے کے اتنے چکر لگاؤں گا کہ آپ تنگ آ جائیں گی۔"

Get out with in movment (ایک لمحے میں دفع ہو جاؤ)۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں میں حیرت بھی

کا رنگ تھا۔

"ظلم کر رہے ہو تم بھی نہیں بخشو گے؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہادی ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا ہے؟ (شاید بابا صاحب اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں) پلیز! ایسے نہیں روئیں نا۔ کیا بابا صاحب نے کچھ کہا ہے؟" اس نے کوئی بات حسرت سے نکالنے سے پیشتر اپنی تسلی کرنا چاہی۔

"مجھے ان کے کہنے کی پروا نہیں، جو ان کے جی میں آتا ہے وہ کریں، جو میرے دل میں آئے گا میں وہ کروں گی۔" وہ غرائی۔

"اب کیا کریں گی؟" اسے ڈر لگنے لگا۔

"میں اوپر بنی ہوئی پانی کی ٹنکی سے چھلانگ لگا دوں گی، اگر مر گئی تو مقصد پورا ہو جائے گا، پھر بابا صاحب حویلی کے پچھلے حصے میں دفنا دیں گے۔ بلکہ تم بھی کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے، میرا انتظار کر کے آپ بیٹھے رہیں گے۔" وہ اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"یہ سارے قصے میں 'میں قریب' کہیں بار بار بیچ میں آ جاتا ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"یہ سب 'تم قریب' ہی کا تو کیا دھرا ہے۔" وہ ہتھیلی سے آنسو پونچھنے لگی۔

"اس طرح ظلم نہ کیجیے۔ میں تو پہلے ہی پریشان ہوں۔ بابا صاحب نے حکم دیا کہ علیم الدین اور ان کے بیٹے کو اوپر بیٹھک میں بٹھاؤ، میں نے دیکھا ہے اور ظاہر ہے کہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ آپ دل برا نہ کیجیے۔ اچھے لوگ ہیں۔ بعض اوقات زندگی میں جو چیز کم ہوتی ہے وہ آگے چل کر بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ تعلیم کی کمی ہے؟ آپ چاہیں گی تو یہ کمی بھی پوری ہو سکتی ہے۔ شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ بات کرنے کا انداز بھی برا نہیں۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہادی کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"علیم الدین صاحب کے صاحبزادے کی اور کس کی؟" وہ قدرے حیران نظر آیا۔

"مگر مجھے اس 'گھاس کھونے والے' کے ذکر سے کیا دلچسپی۔ تم سے اس وقت سراسر اپنی بات کر رہی ہوں، علیم الدین صاحب کہاں بیچ میں ٹپک پڑے۔"

"اچھا... اچھا"۔ ہادی بری طرح بیٹھتا گیا۔ اس کے انداز نے ظاہر کر دیا تھا کہ ابھی علیم الدین والی بات اس تک نہیں پہنچی۔ وہ اپنی حماقت پر پریشان ہو گیا۔

"اچھا خیر چھوڑیں اس قصے کو، یہ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ آپ اچھی طرح آرام کریں۔ صحت سے 'کھلواڑ' کی ہے، آپ بہت کمزور لگ رہی ہیں۔ رنگ تو آپ کا بالکل پیلا ہو چکا ہے۔ آپ ایسی رہیں۔ اطمینان رکھیں، جب تک آپ نہیں کہیں گی میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ٹھہر کر بات سنبھال رہا تھا۔

روشی بمشکل اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"کیا چکر ہے یہ علیم الدین اور ان کے صاحبزادے کا؟" اس کی نظروں میں ایک کھوج تیر رہی تھی۔

"کچھ نہیں، پرسوں وہ لوگ آئے تھے، ان میں سمجھا آپ ان کے متعلق بات کر رہی ہیں۔ خیر جانے دیں۔ اب کوئی بات نہیں ہے۔" وہ نظریں چرا رہا تھا۔

"اگر ان کے صاحبزادے کی تعلیم کم ہے تو کیا، وہ مجھ سے ٹیوشن پڑھیں گے، میں کیوں ان کی تعلیم کی کمی پوری کروں۔ ٹھیکہ لیا ہے میں نے جاہلوں کو پڑھانے کا؟ وہ ہمارے ملازم ہیں۔ ہماری خدمت کریں گے، ہم ان کی نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ ہادی یہ سارا چکر کیا ہے؟" وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہیں، کوئی چکر نہیں ہے۔ کہاں چل دی ہیں آپ؟"

وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا۔

"اس کی شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ تم تو رہے تھے، مگر تم مجھے کیوں بتا رہے تھے؟ کیا میں نے اسے دیکھا ہوا نہیں؟"

وہ مشکوک نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"بابا صاحب کے دماغ سے زبردستی کی لگی دو سب ٹکور۔ جس قیامت سے ڈر کر میں... وہ پھر آج ہی کیوں نہ آ جائے؟" وہ وحشی بنی کرب سے تکرار رہی تھی۔

"آپ دراصل گھبرا گئی ہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ..." وہ عجب مشکل میں گرفتار ہو چکا تھا۔

"ہادی اور وہ صاحب ذات نہیں ہیں، ان سے میں اب ذرا دیکھو کیا کرتی ہوں، یہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے کہ ان کے پاس بھی کوئی روشانے سے پالا پڑا تھا۔" اس نے پاؤں میں سلیپر اڑسے۔

ہادی چونک کر اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ "کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"جب جہنم ہی مقدر ہے تو ان کی مرضی کا جہنم منظور نہیں۔ اپنی مرضی کے جہنم میں جاؤں گی۔"

ہادی نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ "خدا کیلئے روشانے! کیوں زندگی کو کھیل بنا رہی ہیں۔ آپ کم از کم میری پوری بات تو سن لیں۔"

روشی نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور کھلے دروازے سے دوڑتی ہوئی نکل گئی۔ ہادی نے ایک سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر اس کا پیچھا کیا۔

وہ بیکل طور پر جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے زینے کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جا لیا۔

وہ اس کے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

☆—☆—☆—☆—☆

"میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دو"۔ روشی نے اس کے بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہونے کیلئے پورا زور لگایا۔ مگر بے بسی سے جیسے بے دم ہو گئی۔ دیہاتی ماحول اور فطری کے ماحول میں پلا بڑھا مضبوط وجود جیسے اس کیلئے لوہے کی دیوار بن گیا تھا۔

"ہوش کی دوا کریں۔ کچھ کرنے سے پہلے تھوڑی دیر سوچ لینا بھی بہت سی مشکلات سے بچا لیتا ہے"۔ وہ اسے اسی طرح تھامے اپنے بازوؤں میں جکڑے پیچھے ہٹانے لگا۔ روشی نے ایک بار بھرپور مزاحمت کی۔

"چھوڑ دو مجھے نہیں تو میں تمہارا خون پی جاؤں گی"۔ وہ بری طرح بپھر کر بولی تھی۔

"چھوڑوں گا تو پیئیں گی"۔ وہ اسے لئے ہوئے ایک زینہ مزید پیچھے اترا۔

روشی نے اس کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ ایک لمحے کو تکلیف کے مارے اذیت کے وہ بلبلا کر رہ گیا مگر گرفت ڈھیلی نہیں کی۔

"مزاحمت کریں جہاد کریں۔ ہاں دشمن کی گولی کھاتے ہوئے اور ڈرنا نہیں"۔ وہ مسکرایا اور ایک زینہ مزید پیچھے اترا۔ آپا روشی نے بے بسی سے اس کے سینے پر گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔

اس نے بہت آرام سے اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ ایک ہاتھ میں مضبوطی سے دبوچ لئے اور دوسرے

بازو میں اسے جکڑے رکھا۔

"ارے بے وقوف لڑکی! چھوڑو اسے آپ کو گولی مار دوں گی میں"۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"ضرور نہیں چاہئیں اس وقت آپ نہایت قابل اعتراض حالت میں میرے قابو میں ہیں۔ اسکینڈل بن جائے گا"۔ وہ آہستہ آہستہ نے فرصت فقرہ پر آگیا۔ اسے تنگ کرنے کے انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو بن جانے دو الو"۔ وہ پھر چیخی۔

"مگر پھر تو ہو جائے گا نقصان۔ حویلی کے پیچھے پھر کبھی آ جا ہو جائے گا"۔ وہ اسے لئے ہوئے اسی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے تھے۔

"ذلیل۔ کمینے جسم اور دل جائے بھی چھوڑ دو مجھے"۔ اس نے حقارت سے سر جھٹکا۔

"آپ میرے حق جذبات ابھارنے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ کامیابی نہیں ہوگی"۔ وہ بے حد پرسکون تھا۔

"تمہاری شادی وہاں تمہاری مرضی کے خلاف تو پھر تھی وحشت کا"۔ وہ بے بسی سے رونے کو ہو گئی۔

"اللہ کرے مر جائے وہ بے ایمان ... تمہارے دل میں بھی آگ لگے۔ تب پتہ چلے"۔ وہ رو رہی تھی۔

"یہ جو دعا آپ نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو ... جانی تھی"۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

اب وہ اسے لئے کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور بڑی پھرتی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

"ہاری! ایاز کتنا بہت بری طرح پیش آؤں گی تمہارے ساتھ"۔ وہ شکست خوردہ انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"آپ بات کو کہیں خود ہی فرض کر لیا ہے بلکہ علیم الدین اور ان کے صاحبزادے کا معاملہ اصل ہے"۔

"اچھا بس چپ ہو جاؤ۔ مجھے بابا صاحب کے اس قدر احمق سمجھا ہوا ہے مجھے۔ اب اسٹوری گھڑیں گے موصوف کب تک کریں گے میری نگرانی"۔

"بھئی بڑی بات"۔ ہاری نے اس کی بات کاٹ دی۔ "زندگی کو کیوں مذاق بنا رہی ہیں"۔

"زندہ مرنے سے بہتر نہیں ہے کہ انسان ایک بار ہی چلا جائے اس دنیا سے۔ جن کی شکل تک دیکھنا مجھے گوارا نہیں میں ان کے ساتھ عمر گزاروں گی اور ان کو بتا کیا سبق پڑھا کر جاؤں گی ان سب کو۔ ہمیشہ یاد رکھیں گے"۔ وہ چیخ رہی تھی۔

ہاری کی جان مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اب اسے نہیں سمجھایا جا سکتا تھا۔

"دیکھو ہاری! اگر وہ میری شادی میری مرضی کے خلاف کرنے کی کوشش کی گئی تو جنازہ اٹھے گا میرا۔ میری طرف سے یہی پیغام بابا صاحب کو پہنچا دینا"۔

"خدا کرے"۔ ہاری نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بہت دکھ اور الجھن سے اسے دیکھا۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں"۔ اس نے پھر سمجھانا چاہا۔

"کہہ دیا اب دکھو میرے پیچھے اب تم مت آنا"۔

بہت مشکل ہو گئی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ "ضروری تو نہیں جو کچھ ہونے جا رہا ہے وہ ہو بھی جائے۔ ذرا صبر کریں"۔ وہ بہت سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگا۔

"اچھا اگر صبر کے بعد بھی سب کچھ سامنے آیا تو"۔ وہ دراز سے ٹشو پیپر نکال کر ناک پونچھنے لگی۔

"دنیا میں زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں وہ زندگی گزارنا ہوتی ہے جو ہم گزارنا نہیں چاہتے"۔ وہ پھر ہاری سے گویا ہوا۔ "اور پھر آپ نے تو اپنی شامت خود بلائی ہے"۔

"وہ احتجاج تھا زبردستی ہے دل پر اور اسحاق بھی ہوگا اگر یہ بھی زبردستی ہوئی"۔ وہ پھر گرجی۔

"مجھ سے ہیں تو وہ آپ کے خیر خواہ ہیں آپ کو یقین کیوں نہیں آتا؟"

"میرے جنازے پر پھول تم بھی ڈالو گے۔ آ جانا تمہیں یقین خیر خواہوں کا"۔

اس نے اپنی ناک ذرا زیادہ ہی رگڑ ڈالی تھی جو ایک دم سرخ ہو گئی تھی۔

"اب یہ بات بات پر "جنازہ" نکل رہا ہے"۔ وہ بھی جھلا گیا۔

"نکل رہا ہے کیا مطلب؟ نکلے گا"۔ وہ پھر غرائی۔

"میں صرف اسے زندگی سمجھتی ہوں جو میری مرضی کی ہو"۔ وہ بہت اٹل انداز میں گویا ہوئی۔

"یہ بڑی جذباتیت ہے کاش آپ کچھ سمجھ سکتیں"۔ وہ جیسے تھک کر گویا ہوا۔

"تم اپنی انرجی ضائع مت کرو۔ جاؤ آرام کرو۔ ہاں مگر یہ بتاتے جاؤ۔ کتنی عزیز ہے تمہیں میری زندگی؟" وہ اچانک سے پوچھنے لگی۔

"میرے آس پاس میری حدود میں میری نظر کے سامنے جو زندگی بھی ہے وہ میرے لئے اہم ہے۔ اس میں کوئی امتیاز نہیں"۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔

"کیا ایسے لوگوں میں جب میری زندگی داؤ پر لگی ہو۔ تم کر سکتے ہو مجھ سے شادی؟" وہ بہت خود اعتمادی سے اس کے سامنے ایستادہ تھی۔

ہاری تو بری طرح چونک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

"اس طرح کی بات آئندہ کبھی مذاق میں بھی منہ سے نکالیے گا۔ آپ کو زیب نہیں دیتی۔ میں اپنا مقام پہچانتا ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ یا چاہوں گا کہ آپ کے جذبات پہنچا کر ہر رشتے آپ کی پسند کے مطابق آپ کے حق میں کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کی شادی ہرگز زبردستی نہیں ہوگی۔ آپ کے شایان شان شخص کو آپ کا جیون ساتھی بننے کا حق دیا جائے گا"۔

وہ بہت مستحکم لہجے میں وعدہ کر رہا تھا۔

"اور جو ایسا نہ ہو سکا؟" روشی کا لہجہ اس بار نہایت نرم اور آواز بہت دھیمی تھی۔

ہاری نے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ ست رنگے پرنٹ کے شلوار قمیص اور دوپٹے میں وہ اپنی سرخ ناک کے ہمراہ

اسے سوالیہ نظروں سے مگر بہت اعتماد سے دیکھ رہی تھی۔

"اس وقت تک جذبات کا طوفان اتر چکا ہوگا اور آپ کو ایڈجسٹمنٹ کے ہنر آ جائیں گے"۔ وہ اب پرسکون ہو چکا تھا۔

"ایڈجسٹمنٹ کبھی نہیں ہوگی۔ اس کا تو ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں۔ بس اس سوال کا جواب دو اگر کر سکتے ہو تو وعدہ تم کرتے ہو۔ پھر کیا کرتے؟ میں تو لعنت بھیجتی ہوں ایسی زندگی پر جس میں حکمرانی اور دل مردہ ہو۔ ایسی زندگی جس میں میرے دل سے برے آئینے لگتی ہیں۔ میں شوہر کو بھی پسند کروں۔ چاہا نہیں ہوں۔ بہت بھاری ہو جاؤں تو کیسے گے تم؟"

"پھر کیا کر سکوں گا میں؟ میری کچھ حدود مقرر ہیں۔ آپ یہ کہہ لیں"۔

وہ ہاری کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر اب وہ بہت الجھا ہوا تھا۔

"تم بہت بزدل ہو ہاری۔ تم پر تو غلاموں کو بھی شرم آ جائے"۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔ آپ یقین کریں۔ میں جب چاہے حویلی سے نکل سکتا ہوں۔ مگر حویلی کے حکمران میرے مربی میرے محسن ہیں۔ مجھے ان کو خوشی اور سکون پہنچا کر دلی سکون ملتا ہے"۔ وہ بہت بردباری اور تحمل سے گویا ہوا۔ "آپ جو بزدلی" وہ وضاحت ہے جو بے جا برداشت والے مرد کو بھی بے غیرت کر دیتا ہے"۔

"ہونہہ! حویلی کے حکمران تو احسان کرتے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھیں کوئی ان کے سامنے سر نہ اٹھائے"۔ وہ ایک چبا چبا کر بولی۔

"بہر حال اچھا سلوک احسان ہی ہوتا ہے؟" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"اور آپ کو میرا یقین کر لینا چاہیے کہ میں حویلی کے ایک ایک فرد کا خیر خواہ ہوں۔ میں بار بار یا چا سے انداز میں بات کروں گا۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ ان شاء اللہ آپ کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ آپ یقین کریں"۔ اس نے نہایت رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرا سوال اپنی جگہ موجود ہے۔ اگر زیادتی ہوئے گی اور تم بھی کچھ نہ کر سکے پھر؟ تمہیں نہیں بھولنا چاہیے میں موت سے بالکل نہیں ڈرتی۔ کس طرح مجھے زندہ رکھو گے۔ کیا راستہ نکالو گے"۔ وہ اسے گھور رہی تھی۔

"آپ اپنی زندگی کیلئے جو بھی شرط پیش کریں گی۔ مجھے منظور ہوگی لیکن میری بھی ایک شرط ہے اگر کوئی شخص جو ہر صورت مجھ سے بہتر ہوگا اسے آپ رد نہیں کریں گی۔ میں صرف لائف سیونگ میڈیسن (زندگی بچانے والی گولی) کے طور پر اپنا آپ استعمال کروں گا"۔

"وعدہ کرتے ہو؟" اس کے جسم و جاں میں عجیب سا سکون در آیا۔

"مرد کی بات ہی قول ہوتی ہے۔ مگر آپ کو میری شرط ذہن میں محفوظ کر لینا چاہیے۔ فکر نہ کریں۔ جائیں۔ اب کچھ نہیں ہوگا"۔ وہ بستر پر دراز ہو گئی اور ہاری کی طرف سے کروٹ لے کر نہ جانے کیا سوچنے لگی۔

ہاری نے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ لیکن دروازہ کھول کر باہر جاتے جاتے رک گیا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر پھر بغیر کچھ کہے تیزی سے گراؤنڈ فلور کی طرف جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

ریسٹ ہاؤس کا جاندار سناٹا اس کی وحشت بڑھا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے کچن میں برتن کھڑکھڑانے سے ہی آس پاس زندگی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ اکتا کر دوپٹا سنبھالتی کچن میں چلی آئی۔ خانساماں کو جیسے سو فیصد کسی کی مداخلت کا یقین نہیں تھا۔ بڑے مگن انداز میں جھوم جھوم کر ترکاری دھو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی پشت پر جا کھڑی ہوئی۔ مگر اسے احساس تک نہ ہو سکا۔

"صاحب کھانا کھانے آ رہے ہیں کیا؟"

"آپ بی بی! کھانا لگا رہا ہوں۔ بس پانچ منٹ لگیں گے۔" وہ قدرے خجل سا نظر آیا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے؟" اس نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔

"صاحب کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کبھی نہیں بھی آتے۔" اس نے ہانڈی میں چمچ چلاتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر اب تو میں یہاں ہوں انہیں آنا چاہیے۔" اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر ہونٹوں سے لگایا۔ ادھیڑ عمر خانساماں نے پلٹ کر اس کی سمت سرسری سا دیکھا۔

"بی بی صاحب کا کام ہی ایسا ہے کہ۔"

"چھوڑو، یہ کام وام تو کرتے۔ کام تو کام ہی ہوتا ہے۔ اپنے اپنے حساب سے سب ہی کرتے ہیں۔" اس نے ناگواری سے اس کی بات کاٹ دی۔

خانساماں نے تعجب سے اس کی شکل دیکھی۔ اس کا صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔

"اچھا ابھی کھانا مت لگانا۔ میں یاور بھائی کو فون کر رہی ہوں۔"

وہ یاور علی خان کے بیڈروم میں چلی آئی اور ان کا نمبر ملایا۔ پی اے نے صاحب کے "مصروف" ہونے کا مژدہ سنایا۔ اس کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔

"دیکھئے مسٹر! میں ان کی بہن ہوں اور پیر میں دفتر پہنچ جاؤں گی۔ اگر ان کے پاس پرائم منسٹر بھی بیٹھے ہوئے ہیں تو بھی آپ انہیں بتائیے کہ ان کی بہن فون پر ہیں۔" اس نے درشتی سے کہا۔

"ہولڈ کیجئے... پلیز۔" پی اے اس کے اس انداز پر واقعی بوکھلا گیا تھا۔

چند سیکنڈ بعد یاور علی خان کی گمبھیر آواز ریسیور میں ابھری۔

"یس یاور علی۔"

"کیا آپ مجھے یہاں اس لیے لائے تھے کہ میں بھوکی مر جاؤں؟" وہ بچوں کی طرح خفگی سے گویا ہوئی۔

"اللہ نہ کرے۔۔۔ دراصل میری غیر موجودگی میں کام اور فائلیں خاصی مقدار میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ اب ہزار چاہنے کے باوجود مجھ سے نہیں اٹھا جا رہا۔ وہ وقت تھا لیکن ایس پی صاحب تشریف لے آئے۔ سیاسی صورتحال جو بدلی ہوئی ہے تو اسی حساب سے کام بھی بڑھ رہے ہیں۔ آپ کھانا کھا لیں کیونکہ میرا ابھی کچھ پتا نہیں۔ کچھ پتا نہیں ایس پی صاحب

کس قسم کے معاملات ساتھ لائے ہیں۔ اور ان میں کتنا وقت لگے گا۔"

اسے بخوبی معلوم تھا وہ اس وقت جو بھی کہے گی۔ ادھر سے بڑا مختلف جواب آئے گا۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ جبکہ دوسری سمت ریسیور ہنوز یاور علی خان کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ اس کی کسی اگلی بات کے منتظر تھے۔

وہ ادھوری ساعت بانی ان کے بیڈروم سے باہر آ گئی۔

"کیا کھاؤ گی بی بی؟" خانساماں ایک دم سامنے آ گیا۔

"نہیں... ایک گلاس جوس لے آؤ۔"

"بس؟" بے چارہ اتنا حیران ہوا گویا جوس "پیچ" تھا۔

"ہاں ابھی بس۔" وہ جھلا کر کہتی ہوئی اپنے رہائشی کمرے میں چلی آئی۔

"تو یہ کتنا مشکل ہے۔ کسی "بیچارے" افسر کے ساتھ گزارا کرنا۔ زری آنٹی ٹھیک کہتی ہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی شام کیلئے کپڑے دیکھنے لگی۔

دس منٹ بعد خانساماں ٹرے میں جوس لے کر حاضر ہو گیا۔ اس نے جوس کا گلاس اٹھا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ اور وہ لمبی کرسی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ جوس پینے لگی۔ ابھی گلاس آدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ خانساماں پھر حاضر ہو گیا۔

"صاحب کا فون ہے بی بی۔"

وہ چونکی۔ ابھی تو بات ہوئی ہے پانچ منٹ قبل۔ وہ اس انداز سے گلاس رکھ کر تیزی سے ان کے بیڈروم میں آئی۔

"جی۔"

"مجھے ابھی ابھی دھیان آیا کہ آپ نے بغیر کچھ کہے ریسیور رکھ دیا تھا۔ کہیں کھانے سے ناراض تو نہیں ہو گئیں؟"

"چلیں شکر! آپ کو دور سے بھی دھیان آ تو جاتے ہیں۔" اس کا موڈ آف تھا۔

"دراصل آپ کے اور میرے ایج گروپ میں اتنا زیادہ فاصلہ ہے کہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کس انداز اور کن الفاظ میں آپ کو مطمئن کروں۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"رہنے دیجئے۔ یہ آپ کا قول بھی محض مصنوعی اظہار ہے۔ دراصل آپ پر کسی بات کا اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ میں جان چکی ہوں آپ کی نیچر۔" وہ اسی موڈ میں گویا ہوئی۔

"میں تو بہت سادہ سا آدمی ہوں۔ مجھے جاننا کوئی مشکل بات نہیں۔ مگر بہرحال یہ اچھی اطلاع ہے آپ کھانا ضرور کھا لیں۔ ورنہ میں بھی کل کروں گا۔"

"میں آپ کو محض اس لیے فون کیا ہے کہ آپ ایک اچھے میزبان ثابت ہوں۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں۔"

"فکر میں آپ کے "ضروری کام" میں مداخلت نہیں کروں گی۔ بس اتنا کہوں گی کہ شام کو آپ تیار رہیے گا۔ آپ کو بہت اچھی جگہ سیر کرائیں گے۔ آپ کی ساری کوفت دور ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے؟"

جھمکس"۔ وہ ان کی اتنی مہربان وضع پر واقعی خوشی سے مسکرا دی۔

"اب بات ہوئی ہیں۔ ورنہ میں تو الجھ گیا تھا۔ ایس پی صاحب کو ابھی تک انتظار میں اٹھایا ہوا ہے آپ کی وجہ سے"۔

جھمکس اگین"۔ وہ ایسے قسم کے انسان سے اتنی توجہ اور مہربانی کے انداز پا کر واقعی خوش ہوئی تھی۔

باری کا بلاوا آ گیا تھا۔ ہاں اور یاستی میں اس کی سخت ضرورت پیش آ گئی تھی۔

"وہ بابا صاحب کے ساتھ شہر آ جاتا تھا تو اسے شہر میں ہی امیروں کا کام پیش آ جاتے تھے۔ صبح فیکٹری گیا۔ وہاں سے ایئر پورٹ گیا۔ سیٹ کنفرم کرائی۔ شام ساڑھے پانچ بجے کی فلائٹ تھی۔ بمشکل فرسٹ کلاس میں سیٹ ملی تھی۔ وہاں کی دھمکی سے فرصت پا کر بابا صاحب کے بزنس پارٹنر سے حساب کتاب کر کے فائل اور چیک وصول کیا۔

تین بجے کے بعد گھر آیا۔ بمشکل وہ چار لوانے ہی منٹ میں ۱۱ لے تھے کہ فیکٹری سے منیجر کی کال آ گئی۔ بابا صاحب میڈیکل چیک اپ کیلئے گئے ہوئے تھے۔ ناچار اسے فیکٹری کا دوسرا چکر لگانا پڑا۔ گھر سے فیکٹری زیادہ دور نہیں تھی چار بجے تک واپس آ گیا۔ جلدی جلدی کپڑے بیگ میں ٹھونسے۔ غسل کر کے جھٹ جوڑا بدلا۔ بنیان پہن کر یاد آیا کہ قمیص پر تو استری ہی نہیں ہوئی۔ بڑی سخت جھلاہٹ ہوئی۔ اختر بھی گاڑی لے کر جا چکا تھا۔ باری کو ایئر پورٹ پہنچا کر اس نے بابا کو بھی لینے جانا تھا۔ وہ شرٹ ہاتھ میں لٹکائے کمرے سے باہر آیا۔

"گلو"۔ اس نے آواز لگائی۔

"محترمہ گلو صاحبہ ادھر ادھر کہیں پائی جاتی ہوں تو سامنے آ جائیں۔ سخت ضرورت ہے"۔ اس نے راہداری کے سرے پر کھڑے ہو کر صدا لگائی۔

"وہ تو گیٹ پر کھڑی سبزی خرید رہی ہے۔ بہت تیزی میں ہو"۔ معاً روشی سامنے آ گئی۔

وہ جھنجلاہٹ اور ہیجان میں خود کو اس کے سامنے پا کر قدرے شل سا ہو گیا۔ "ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔ ویسے ہی سیٹ بڑی مشکل سے ملی ہے"۔ وہ جانے کیوں نظریں چرا گیا۔

"جا رہے ہو؟" اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"ہاں"۔

"گلو ہی آف کرنے جائے گی؟" وہ مسکرائی۔

"کرے نہیں۔ یہ شرٹ بغیر استری کی ہے۔ میں تو خود ہی کر لیتا مگر یہاں تو کہیں آس پاس استری بھی نظر نہیں آ رہی"۔

روشی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے شرٹ لے لی اور ایک سمت بڑھ گئی۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور شرٹ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس خیال سے اوپر نہیں گیا کہ پھر اسے اوپر آنا پڑ جائے گا۔

پانچ منٹ بعد روشی شرٹ ہاتھ میں لئے اسی جگہ واپس آ گئی۔

"ہو سکتا ہے جلدی میں اچھی نہ ہوئی ہو۔ بہرحال گزارا کر لو"۔ وہ اسے شرٹ تھما رہی تھی اور شیعہ جانے کس طرف سے

آ کر ان دونوں کے پاس سے بے نیازی سے گزر گئیں۔

"معظمہ آپا۔ یہ باری اور یاستی واپس جا رہا ہے۔ کوئی پیغام دینا ہو تو دے دیں"۔

"کیا پیغام دینا ہے۔ حویلی میں فون ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں کوئی پیغام ہی نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہاں مگر تم ضرور دو"۔ وہ ان سے خاصے فاصلے پر رک کر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئیں۔

"بابا آ رہے ہیں یا پہلے ہی جا رہے ہو؟"

"بابا ہیں۔ اصل میں کام "سرائے" میں ہے۔ وہ یاستی سے تو صبح آیا ہے"۔ وہ بہت تحمل سے ان سے مخاطب تھا۔

"مگر تمہاری ضرورت تو یہاں بھی بہت ہے"۔ معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

"کام کے بعد کی تو فیکٹری ضرورت رہتی ہے"۔ وہ بابا وہ داشت ذکر کر گئی۔ بڑھ کر بولی۔

"ہاں بھئی۔ باری۔ کام کے تو تم بہت ہو"۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔

باری شرٹ پہن کر بٹن لگا رہا تھا۔ غور سے انہیں جاتا دیکھنے لگا۔

"ہر وقت جلی بھنی رہتی ہیں"۔ روشی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"مگر ہوش مند بھی بہت ہیں۔ آنکھیں کھلی رکھتی ہیں۔ آپ کو احتیاط کرنا چاہیے۔ آپ کیلئے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں"۔

"اور تمہارے لئے؟" وہ تو یوں بھی خاصی نڈر تھی۔

"میں تو خود ہی مسئلہ ہوں۔ میرے کوئی مسئلے درخواب نہیں ہیں۔ آپ بس مجھے ایک کچھ فون کر لیں"۔ اس نے آگے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

"جا کر فون ضرور کرنا"۔ اس نے تاکید کی۔

"وہ تو میں خان کو کروں گا"۔

روشی کی لٹائے اسے آگے بات سے باز رکھا۔

"اور ہاں اگر خالہ اور یاستی ہوں تو فون پر میری ان سے بات ضرور کرانا"۔

"بس؟" وہ پھر آگے بڑھا۔

"ہاں بس"۔

"اور ہاں سنو"۔

"جی!" وہ پھر رک گیا اور ریسٹ واچ پر نظر دوڑانے لگا۔

روشی کو اس کی ریسٹ واچ سے سوتن کا سا بیر تھا۔ "تم تو خود ہی گھڑی ہو۔ کیوں گھڑی باندھے پھرتے ہو؟"

"آپ کچھ کہہ رہی تھی؟"

"جاؤ تم۔ کچھ نہیں کہہ رہی"۔ وہ جل کر بولی تھی۔ اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

وہ گم صم سے انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

وہاں سب بھی بہت زور و شور سے بابا صاحب کے ایک شراکت دار کے ہاں ڈنر پر جانے کے پروگرام تیار کر رہی تھیں۔ پہنے جانے والے ملبوسات پر بحث مباحثہ ہو رہا تھا۔

روبی کا خیال تھا کہ اس بار بہت جدید ہونا چاہیے کیونکہ وہ لوگ بہت زیادہ ایڈوانس ہیں اور پھر جیسے کہ پہلے سے کراچی میں ہیں عصمہ کو اس پر اختلاف تھا کہ ہم وہ ایک ہی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ لباس وغیرہ پر غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تردید و تائید کا پرشور ماحول تھا۔

اس کی آمد پر قدرے خاموشی چھا گئی۔

عصمہ نے بہت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی سمت دیکھا تھا اور گڈو دیکھ کر مسکرا کر ہم راز ہو گئی تھی۔

"آؤ روشی! تم تو نظر ہی نہیں آئیں۔ طبیعت کیسی ہے اب؟" گڈو نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

"اب تو انشاء اللہ ابھی ہو جائے گی۔ ارے اس بار آیا۔ آج صبح ایک بہت مزے کے گانوں کی کیسٹ ملی ہے ادا کا سے۔ لتا اور مکیش کے دوگانے ہیں۔" عصمہ نے کیسٹ پلیئر میں کیسٹ رکھ کر اون کیا اور "یہ"...... چل کر کے واپس اپنی جگہ پر آ کر براجمان ہو گئیں۔ لتا اور مکیش کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ والیوم خاصا اونچا تھا۔

(لتا) بالی عمریا سجن کروں کیسے؟
چڑھتی جوانی جوگن ہوں کیسے؟
(مکیش) جھوٹا گر دکھاوا جتن کروں کیسے؟
ساجن ہوں تیرا جوگن ہوں کیسے؟

روشی نے چونک کر عصمہ کی صورت دیکھی اور آنکھیں موندے بہت معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

"گانا تو مزے کا ہے کس قسم کا ہے سنوا کر دیکھیں گے۔" روبی نے بہت دلچسپی لی۔

"تمہارا پیٹ نہیں بھرتا فلمیں دیکھ دیکھ کر۔" زری ہنس دی۔

"پتا نہیں اس کے دیدے۔" پیا شمشیر دو دو فلمیں اکٹھی دیکھ لیتی ہیں۔ میں تو ذرا دیر کو گھنٹہ بھر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاؤں تو سر دکھنے لگتا ہے۔ گڈو نے بھی حصہ لیا۔

"گانا سنو بڑے مزے کا ہے کس رہی ہو روشی؟" عصمہ بول پڑیں "میں نے کیسٹ لگائی۔ تم لوگوں نے اپنی چپڑ چپڑ شروع کر دی۔ ہے نا مزے کا روشی؟"

روشی نے جیسے زچ ہو کر ان کی صورت دیکھی۔

"اگر آپ کے پاس میرے خلاف چارج (Charges) اکٹھے ہو گئے ہیں تو کھل کر چارج شیٹ پر ہاتھ ڈال دیں۔ منع کس نے کیا ہے۔ بلیک میل ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اور نہ ہی حلق پھاڑ کر یہ کہوں گی کہ آپ مجھے بلیک میل (الزام) کر رہی ہیں۔" روشی ایک میگزین اٹھا کر دور صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

گڈو اور دوسری لڑکیاں حیرانی سے کبھی عصمہ کو اور کبھی روشی کو دیکھ رہی تھیں۔

"کوئی بات ہوئی عصمہ؟"

گڈو نے ترحم آمیز نظروں سے روشی کی طرف دیکھا۔ (ابھی تو بے چاری انگوٹھی چھینے کی اذیت سے گزر رہی ہے۔ عصمہ تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بے رحم ہیں۔ ایک تو اس پر اس کی ماں کا سایہ نہیں۔ وہ پہلے ہی نہایت حساس ہے پتہ نہیں کیوں اس پر پیچھے پڑی رہتی ہیں)

"روشی" انہوں نے نہایت محبت سے اسے پکارا۔

"جی آپا؟"

"اچھا تم اوپر جا کر آرام کر لو۔ شام سات بجے کے بعد ہی نکلیں گے سب۔ تم تھوڑی دیر کیلئے سو جاؤ۔ جاؤ شاباش۔"

ان کے لہجے میں اتنی محبت اور حلاوت تھی کہ روشی نہ چاہتے ہوئے بھی "جی اچھا" کہہ کر اٹھ گئی۔ "ٹھیک ہے" کہتی گڈو کی مداخلت سے ماحول ایک دم پرسکون ہو گیا تھا۔

"عصمہ پلیز" اس کے جاتے ہی اس انداز میں بات نہ کیا کرو۔ روتی ہے بے چاری پہلے ہی دکھی ہے اور پھر بچی ہے۔" گڈو نے روشی کے باہر جاتے ہی عصمہ کو گھیرا۔

"نام نسب دولت سب کچھ تو ہے۔ پھر رو کس بات کا؟ آہونہہ تم تو ایمان سے "پروپیگنڈا لالی" ہو گڈو۔" عصمہ نے منہ بنا کر گڈو کی نقل اتاری۔

"تمہیں نہیں پتا عصمہ۔ ماں کے پیار سے محرومی بعض اوقات انسان کی ہستی کو کھوکھلا کر دیتی ہے" "ماں" تو اس کائنات کا بنیادی حسن ہے۔ خدا کی اپنے بندے سے محبت کا لطیف سا اشارہ۔ یہ محرومی بہت بڑی محرومی ہے عصمہ۔ تمہیں احساس کرنا چاہیے۔"

"اچھا بابا کر لیں گے احساس۔ اب خدا کیلئے اپنی تقریر سمیٹو۔"

عصمہ نے ہاتھ جوڑ دیے اور زری نے آگے بڑھ کر ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آف کر دیا۔

"اب تمہیں پیسے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ دھیان نہیں آتا کہ بچی کیا سوچے گی۔ یہ رواج ہے ماں باپ نے؟"

عورت نے اس کے تیور دیکھ کر ذرا لہجہ سنبھال کر بات کی۔

"اور ہو کی کنگال اور مقروض کے پلے باندھ دی تو بھی لوٹا ہی کہے گی۔ یہ رواج ہے اور بس اب بات ختم کر۔ آگے سے بات نہ کریں گے۔ ہمیں کوئی تیاری نہیں کرنا۔ برادری کو روٹی کھلانا ہے کھلا دیں گے اور کچھ نہیں ہو گا۔"

"کوئی تو کٹ جائے گی برادری میں۔ کچھ ہوش کی دوا کر۔" عورت نے ماتھا پیٹ کر کہا۔

"کل سے کمانے نہیں جاؤں گا۔ ایک دھیلا تیرے ہاتھ پہ نہیں رکھوں گا اور جو تو نے روٹی روٹی کی آواز لگائی تو تمہیں

بولوں سے حرام کروں گا تجھے خود پر"۔ اس نے چارپائی پر سیدھا لیٹتے ہوئے کہا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

عورت تعجب سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"جب بھوکی مرنے لگے تو چلی جانا برادری کے پاس کر پلو اوڑھ کے بیٹھ۔ پھر دیکھیں گا کون کھلاتا ہے تجھے روٹی۔ کون جانتا ہے تیری بیٹی؟" وہ بڑبڑایا۔

"تیرا بیٹا تو اٹھائے بیٹھی ہوں۔ کون کھلاتا ہے کسی کو۔ سب اچھے وقتوں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ماں ہوں، کبھی لڑائی بھی تھی۔ بیٹی کے دل کی خوشی سوچ رہی تھی۔ تم باپ ہو اس کے۔ انکار میں تمہیں سمجھا تو سکتی ہوں، روک نہیں سکتی۔ کر دو رخصت بارات۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔ خوشیاں دے"۔

نہ جانے کیوں وہ ہچکیوں سے رو پڑی۔

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"دیکھ، خدا گواہ میں بھی باپ ہوں۔ دشمن نہیں ہوں اپنی لونڈیا کا۔ لال خان عمر کا ہے مگر صحت مند ہے۔ تو نے اس کا گھر نہیں دیکھا۔ چھ کمروں کا مکان ہے۔ دو منزلہ، سامان سے بھرا ہوا۔ اللہ کی ہر نعمت موجود ہے۔ جھوٹ جانے دے، اس جیسی بہشتی فرشی سے لونڈیا کی جان۔ ہم کسی لالچ سے نہیں دے رہے اپنی لونڈیا۔ اگر لالچ ہے تو بس اتنا کہ ہماری بچی سکھ دیکھے"۔

عورت روتی رہی۔

"جب مان گئی ہے تو دعا کر اللہ ہماری لونڈیا کو سکھ دے"۔

"بیٹیاں بیاہتے ہوئے تو مائیں روتی ہی ہیں۔ جسم کا ٹکڑا نوچ کر کسی کو تھما دینا کوئی کھیل تو نہیں"۔ عورت آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

وہ چپ رہا۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔

وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف آ گئی۔ بالو دوپہر کے کھانے کے اور شام کی چائے کے برتن اکٹھے کیے بہت تندہی سے مانجھنے میں مصروف تھی۔

"کہاں اٹھ کے آ گئی ہو اماں؟" اس نے ماں کو موجود پا کر گیلے ہاتھوں اپنا مسئلہ حل کرنا چاہا۔

"سو رہا ہے تیرا باپ، کو اٹھتے لگتے ہیں"۔ وہ غائب دماغی کے عالم سے چونک کر باہر آئی۔

"کیا آج جلدی آ گئے"۔

"جلدی کام ختم ہو گیا ہو گا۔ میں تو تجھے یہ کہنے آئی تھی کہ جو بلقیس لے کر آئی ہے ان میں سے چار پانچ جوڑے سی لے۔ تین ان میں سے پھر دوپٹوں پر گوٹا بھی لگانا ہے"۔

"کیوں اماں؟" بالو کے متحرک ہاتھ ساکن ہو گئے۔

"تیرا نکاح کرنا ہے تیرا باپ لگے ہیں"۔

"تیسری دنیا" کی تیسرے درجے کی لڑکی جو اٹھارہ سال کی ہو چکی کہ وہ "میرا نصف" کون ہے؟ کون ہے وہ مجھے

عمل کرنے آ رہا ہے۔ کہیں یوں نہ ہو، سب کچھ ہوتے ہوتے کے آسرے میں آدمی سے بھی جاؤں۔ چند لمحے ساکت و صامت بیٹھی رہنے کے بعد وہ پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

"انہیں کوئی خاص جہیز نہیں چاہئے۔ بس برادری اور بارات کو روٹی کھلانی ہے۔ پیسے والا آدمی ہے۔ پیسے بھیج دیا ہے اس نے"۔

وہ ایک بار پھر ساکت ہو گئی۔

"پیسے والا اس کا اماں سے دولہا ہے۔ پر کیا کام مجھ کیا کہنا ہے۔ ہائے اتنا کچھ ہو کر سکھیوں میں عزت رہ جاتی ہے"۔

چاچا قاسم کی بیٹی کو دولہا ذرا سا موٹا تھا۔ ساری سہیلیاں کتنا تنگ کرتی تھیں صغریٰ کو۔

"اور کچھ دن نہیں ذرا دیکھ کر چائیو۔ رات بہت بچی تھی۔ رزق ضائع نہیں کرتے۔ اللہ کو برا لگتا ہے"۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے مزید ہدایت دی۔

"اچھا اماں!" وہ اپنے دھیان سے چونک کر بولی تھی۔

اس نے وال کلاک کی سمت نظر اٹھائی۔ چھ بج رہے تھے۔

ایک عجیب سی کوفت اس کے رگ و پے میں اتر گئی۔ یا الٰہی کس طرح سر اٹھا رہی ہے؟ وہ دھم سے آمدے میں پڑی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اسی دم پورچ میں جیپ داخل ہوئی اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "فیملیز گو گا"۔

یار علی خان جیپ سے اتر کر سیدھے اس کی طرف بڑھے۔

"تیار ہیں آپ؟" انہوں نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔ بریل کرتے شلوار اور دوپٹے میں ملبوس بہت تر و تازہ سی محسوس ہوئی۔ دائیں کلائی میں بہت ساری بینگ کی چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اور بائیں کلائی میں گھڑی لٹکی ہوئی رسٹ واچ تھی۔ اور پاؤں میں بینگ شوز جم جم کر رہے تھے۔

یار علی خان نے ایک اچٹتی نگاہ میں اس کا جائزہ لے لیا۔

"بہت دیر سے تیار ہوں۔ مگر آج بے حس بھی نہیں ہوں کہ آپ کو چائے یا کھانے کی مہلت نہ دوں۔ آپ اطمینان سے ہاتھ منہ دھو لیں اور کھانا کھائیں"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کھانا تو میں کھا چکا ہوں۔ البتہ ہاتھ لینے کی ضرورت ابھی ہے۔ فریش ہو جاؤں گا"۔

"شیر خان!" انہوں نے ملازم کو آواز دی۔

وہ فوراً آ موجود ہوا۔

"جلدی سے ایک شلوار سوٹ تیار کرو۔ میں بہت ریلیکس ہو کر سیر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی"۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرا کر اندر بڑھ گئے۔

وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

انھیں باہر آنے میں واقعی بہت وقت سے زیادہ نہیں لگے۔

وہ جیپ ایک مختلف سڑک پر لے آئے۔

"پہلے ہم رائل ایڈ لائی کالونی چلیں گے۔ وہاں ایک دوست سے ضروری کام ہے۔ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ بہت شاندار مناظر ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ لطف اندوز ہوں گی۔" انھوں نے بہت مہارت سے اسٹیرنگ سے ہاتھ اٹھا کر سگریٹ سلگائی۔

"میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔" اس نے قدرے تحمل ہو کر کہا۔

"کیسے مگر؟ وہ کیوں؟" انھوں نے حیرانی کے تاثرات نہیں دیے۔ صرف سپاٹ انداز میں پوچھا۔

"آپ اتنے اسرار اور مصروف آدمی ہیں۔ حقیقتاً میں نے اسٹرب کیا ہے آپ کو۔ بہت ساری فارملٹیز میں الجھا دیا ہے خواہ مخواہ۔" وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آل ریڈی اسٹرب آدمی ہوں۔" انھوں نے بہت سادہ سے انداز میں جواب دیا۔

"جی!" وہ بھی تھکی سی رہی۔ "تھکتے تو نہیں ہیں؟" اس کے منہ سے نکل گیا۔

"تھکنے اور ہونے میں اچھا خاصا فرق ہوتا ہے۔" انھوں نے سگریٹ منہ سے ہٹاتے ہوئے دھواں منہ سے نکالا۔

"ہاں ظاہر ہے۔ بجو جیسی بیوی سے دوری وہ بھی ہمیشہ کی دوری کوئی چھوٹی بات تو نہیں۔ بجو جیسی بیوی ہر کوئی کہاں نصیب ہوتی ہے اور پھر اتنی شاندار رفیقہ حیات مل کے بچھڑ جائے یہ تو قسمت کا ستم ہی ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

باور علی خان خاموش رہے۔

"وریا بھتی آنے کے بعد میں تو بہت الجھ گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"مگر کیوں آخر کوئی کوتاہی ہوئی ہم سے؟" باور علی خان نے پھر ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ آپ سب نے تو مجھے حق میزبانی ادا کر دیا۔" وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

"روشی واپس آ جائے گی۔ لازمی ہے۔" انھوں نے سگریٹ منہ سے نکال کر ہاتھ سے دوبارہ اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔

"یہ بات بھی نہیں۔" وہ بولی۔

باور علی خان خاموش رہے کہ کران کی خاموشی کا سوالیہ پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔

"میری الجھن یہ ہے کہ وریا بھتی کا ماحول مجھے بہت پر اسرار اور گھٹا ہوا محسوس ہوا۔ بجو تو بہت پر کشش تھیں۔ ان کو ایڈجسٹ ہونے میں بہت مشکل ہوا ہو گا جب کہ کہتے ہیں کہ وہ حویلی میں بہت خوش تھیں۔ کراچی میں تو ان کا دل بھی نہیں لگتا تھا ایک ہفتہ بھی مشکل سے رہتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حویلی میں ان کیلئے کیا کشش تھی؟" وہ گہری سوچ میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

باور علی خان بدستور خاموش تھے۔

ماہین نے چہرہ موڑ کر ان کی سمت دیکھا۔ گہرے شفاف سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر مخصوص گلاس چڑھائے اپنی رعب

سوچلوں کے ساتھ وہ بہت متاثر کر رہے تھے۔

"حویلی میں میرا خیال ہے ان کی ساری دلچسپی آپ کی وجہ سے تھی۔ وہ بس آپ کی وجہ سے کراچی میں نہیں ٹکتی تھیں۔"

وہ مسکرا کر شرارت سے گویا ہوئی۔

"اور تو حویلی میں کوئی خاص بات نہیں۔" وہ کھلکھلا پڑی۔

"آپ کچھ بول نہیں رہے؟" ماہین چونک کر پوچھنے لگی۔

"آپ خود ہی سوال اور خود ہی جواب کے انتہائی دلچسپ عمل سے گزر رہی ہیں۔ میں انجوائے کر رہا ہوں آپ فکر نہ کریں۔"

انھوں نے بہت سکون سے ایک موڑ کاٹا۔

"شرارت کر رہے ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"یہ کام نہیں کرتا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں لطف اٹھا کر مسکرائے۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آپ نے وہاں کی ساری ذات کا طلسم پھونک رکھا تھا۔ انھیں آپ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ہوگا۔ خیر کوئی وہ بھی بہت خوش تھیں کہ انھیں آپ جیسا شریک سفر ملا تھا جس کی وفا کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد آپ نے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ آپ کی طرح کے لینڈ لارڈ تو بیک وقت کئی بیویاں رکھتے ہیں۔"

"آج آپ صرف مرنے والوں کی ہی باتیں کریں گی؟" انھوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"جی۔" وہ چونک کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔

"آپ کو اچھا نہیں لگتا کہ کوئی بجو کی بات کرے۔" وہ ابھی تک حیرت کے عالم میں تھی۔

"اچھا یہ بتائیے شام کے اس بیک گراؤنڈ میں نظر آنے والے پہاڑ کیسے لگ رہے ہیں؟" انھوں نے قریب الختم سگریٹ منہ سے ہٹا کر پھر ایش کیا۔

"اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔" اس کے لہجے میں اب افسردگی کا تاثر تھا۔

"آئس کریم کھائیں گی؟" ایک شاپ کے نزدیک انھوں نے جیپ آہستہ کی۔

"نہیں کھا لیتے ہیں۔ کچھ تو کرنا چاہیے۔" اس کا موڈ عجیب سا ہو گیا تھا۔

فون کی بیل بہت دیر سے ہو رہی تھی ابھی تو سورج بھی نہیں نکلا تھا۔

وہ لان کی طرف جانے کے ارادے سے کمرے سے باہر آئی تھی۔ ظاہر ہے اتنی صبح کا فون بابا صاحب کیلئے ہی ہوگا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

پھر ایک دم چونک پڑی۔ "بابا صاحب کا فون" "بابا نیں پتہ" "وریا بھتی" سے بھی ہو سکتا ہے اور یقیناً "اس" کا ہو سکتا ہے۔ وہ سرعت سے دوڑتی ہوئی بابا صاحب کے کمرے میں آئی اسے یقین تھا کہ بابا صاحب باتھ روم یا لان میں ہوں گے جب ہی تو ابھی تک ریسیور نہیں اٹھایا۔ وہ سب تو بے سدھ سو رہی تھیں۔ جاگی ہوئی بھی ہوتیں تو فون سننے کیلئے کبھی نہ آتیں۔

اس نے اندر آ کر ادھر ادھر دیکھے بغیر ریسیور تقریباً جھپٹ کر اٹھایا۔

"ہیلو"۔

"تھینکس گاڈ"۔ ادھر واقعی باری تھا۔

جسم و جاں میں ایک سرخوشی کی لہر دوڑ گئی۔ "روشی بات کر رہی ہوں۔ پہنچ گئے تم ٹھیک ٹھاک؟"

"ظاہر ہے عالم بالا سے تو فون کرنے سے رہا۔ خان کو ریسیور دیجیے"۔

"بابا صاحب تو آس پاس کہیں نظر نہیں آ رہے۔ میسج دے دو۔ میں پہنچا دوں گی"۔ اس نے مدد کرنا چاہی۔

"آپ ذرا ادھر ادھر دیکھ لیجیے۔ مجھے انہی سے بات کرنا ہے۔ میسج سے کام نہیں چلے گا"۔ ادھر سے جواب آیا۔

"خالہ بی ابھی حویلی میں؟" اس نے سنی ان سنی کر کے اپنا سوال کیا۔

"نہیں۔ وہ دیا اور بچا کے ساتھ ہری پور گئی ہیں"۔ اس نے عجلت بھرے انداز میں جواب دیا جیسے جان چھڑا رہا ہو۔

"وہ مجھے کراچی فون بھی تو کر سکتی تھیں"۔ اس نے خفگی سے کہا۔

"وہ جو کچھ کر سکتی تھیں یا کر سکتی ہیں۔ خود ہی بتا سکتی ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ پلیز خان کو فون دیجیے"۔ وہاں سے پھر اکتایا ہوا سا جواب آیا۔

"کیا خان کے کچھ جا رہے ہو؟ میں جو بات کر رہی ہوں"۔ وہ بھڑک کر بولی۔

"میں نے اس وقت کام کے سلسلے میں فون کیا ہے۔ مجھے خان سے بہت ضروری بات کرنا ہے"۔ وہ جیسے زچ ہو کر بولا۔

"وہ گڑھی میں کہیں ہوں گے۔ دیکھ لیجیے پلیز"۔ وہ جیسے عاجز آ گیا تھا۔

"اچھا دیکھتی ہوں۔ مگر مجھ سے بات کیے بغیر ریسیور نہ رکھنا"۔

"سن لیا۔ نہیں رکھوں گا۔ بس آپ ذرا جلدی کریں"۔ غالباً دوسری طرف اس نے سر پیٹ لیا تھا۔

وہ باتھ روم کا دروازہ چیک کر کے دوڑتی ہوئی لان میں آئی۔ بابا صاحب بینچ پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"بابا صاحب! آپ کا فون ہے حویلی سے"۔ اس نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کر کہا۔

"ہاں۔ بول رہا ہوں"۔ بابا صاحب نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔ "والسلام"۔

"ٹھیک ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا"۔

"ہم کہہ رہے ہیں نا۔ ہم خود وہاں پہنچیں گے"۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بچی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ہمارے پہنچنے تک ہمیں فوراً اس کی خیریت سے مطلع کرتے رہیں۔ بس اور کوئی خاص بات نہیں"۔

"بابا صاحب! ریسیور مجھے دیجیے گا۔ ایک ضروری بات کرنا ہے"۔ وہ ان کے سر پر سوار تھی۔

انہوں نے ریسیور اسے تھما دیا۔

"ہیلو"۔ دوسری طرف سے باری بول رہا تھا۔

اس نے گردن موڑ کر بابا صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر آہستگی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ لالہ علی خان نے ایک نظر کوس کی جانب دیکھا پھر بنا کچھ کہے کمرے سے باہر چلے گئے۔

سارا محلہ لال خان کی دلہن دیکھنے کیلئے جیسے عروسی پر حملہ آور تھا۔ بانو کو اس قدر حبس اور گھٹن کا احساس تھا لگتا تھا تھوڑی دیر ان عورتوں میں مزید گھری رہی تو بے ہوش ہو جائے گی۔ بھاری بھرکم عروسی جوڑا، مختلف سائزوں اور وزن کے چار پانچ سونے کے سیٹ۔ پھولوں کے زیور علیحدہ۔ وہ تو کہو کہ گھر کا کمرہ تھا اور چاروں طرف عورتیں اور بچے۔

وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ پڑ جائے گی۔

"دلہن بے ہوش ہو گئی۔ دلہن بے ہوش ہو گئی"۔ ایک چیخ پکار مچ گئی۔

"چلو بھئی سب باہر نکلو۔ جلدی"۔ لال خان کی ایک رشتہ دار سب کو باہر نکالنے لگی۔

"دیکھنے میں تو بہت ہی نازک۔ مزاج بھی نازک لگتا ہے"۔ ایک بڑی بی نے تنقیدی جملہ کسا۔

چند منٹوں میں ہی کمرہ خالی ہو گیا۔

بے ہوشی کا "اعلان" باہر تک سنا گیا۔ لال خان نے فوراً ہے پیشتر سیون اپ کی بوتل اندر بھجوائی۔

"تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کے اوسان بحال ہوئے لال خان کی ایک اور رشتہ دار نے اس کا میک اپ ٹھیک کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ہاں بھئی۔ ذرا راستہ دو۔ دولہا بھائی اپنی بھابھی کی منہ دکھائی کرنے آ رہے ہیں"۔ ایک عورت کی چہکتی سی آواز باہر سے آئی۔

"ہاں بھئی ہمیں تو ہم بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں"۔ کمرے میں عارف کی آواز ابھری۔ لال خان بھی ساتھ تھا۔

"لال خان! ہم تمہیں مبارکباد دیں یا تم ہمیں دو گے؟" وہ شوخی سے پوچھ رہا تھا۔

"ارے سرکار! ساری محنت آپ کی ہے"۔ لال خان تو سرتاپا نہال تھا۔

"اس کی ہے ہماری مبارکباد۔ اور اب ہم تمہیں دیتے ہیں"۔

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

"بہت بہت مبارک ہو تمہیں"۔

بانو کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر شعر پڑھنے والے کو اس نے چونک کر دیکھا۔ پٹ سے آنکھیں کھل گئی تھیں۔ "یہ ہماری طرف سے تحفہ ساتھ ہے بھابی"۔ اس نے انگوٹھی ڈبیہ سمیت اس کی سمت بڑھائی۔

"شادی مبارک ہو۔ یہ ہمارا یار ویسے بھی سیٹھ ہے اور دل کا بھی سیٹھ ہے۔ امید ہے آپ کو بہت خوش رکھے گا"۔

بانو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ کوشش کے باوجود "سیٹھ" کی طرف نہ دیکھ سکی۔

"لال خان بھائی بہت نازک سی ہیں"۔ بہت خیال رکھنا ہوگا۔ اچھا اب ہم چلیں گے"۔
"اب دیکھیں کہ بھائی کے آنے کے بعد تم ہمیں کس طرح دستیاب ہوا کرو گے۔ اب دیکھیں گے تمہارے لئے انداز"۔

ہر اک چیز بدل جاتی ہے عشق کا موسم آتے ہی
راتیں پاگل کر دیتی ہیں دن دیوانے ہو جاتے ہیں

"اچھا بھئی۔ شب بخیر" "خدا حافظ"۔ حالانکہ وہ بے اختیار اٹھ گئی تھی۔

لمبا ــــ انتہائی دبلا ــــ داڑھی بھی تھی یا کئی روز سے شیو نہیں بنائی تھی۔ صاف رنگ شاید کبھی گورا ہوگا۔ سے غرور کی سی چال۔

نہ جانے کس کا پچھڑا۔ اس نے چونک کر آنکھیں جھکالیں۔

اس کے جاتے ہی جانے کس کے کہنے پر کمرہ خالی کر دیا گیا۔ تب اس نے ایک گہرا اطمینان بھرا سانس لیا اور کمرے پر نظر دوڑانے لگی۔

بہت شاندار اور قیمتی فرنیچر تھا۔ اس نے تو کبھی اسے قیمتی استر پر بیٹھنے کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ مخمل لیمپ اور جھم جھم کرتے گلدانوں سے آراستہ۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر ریشمی پردے کمرے کی سجاوٹ میں اضافہ کر رہے تھے۔ تازہ موتیے اور گلابوں سے سجی سیج۔ جن کی مہک اس کے اپنے وجود سے اٹھنے والی خوشبوؤں سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

"معاً وہ کسی طرح چونک پڑی سامنے کارنس پر لال خان کی بڑی سی تصویر رکھی تھی۔
سفید شلوار قمیض اور واسکٹ پہنے مونچھوں کو تاؤ دیئے۔ وہ شاید کسی متوقع کامیابی پر مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی اتھاہ میں اتر گیا۔

وہ پلک جھپکنا بھول گئی تھی۔

ہر لڑکی روح کو زندگی ایک بار حق ہے اور عورت بھی زندگی کے اس سب سے حسین دور سے ایک بار گزرتی ہے۔
جس لڑکی کا دل پہلی رات ہی کو ڈوبنے لگے۔ اس کے بعد زندگی میں کبھی اچھی رات کے خواب نہیں آتے۔ اس کا دل کیا مرجھاتا ہے کہ پھول پہننے کے سارے شوق ہی مرجھا جاتے ہیں۔ وہ آن کی آن میں گلشن سے جنگل میں آن کھڑی ہوتی ہے۔ اور سارے دکھ کے وہ راستے دیکھنے لگتی ہے جس پر چلتے ہوئے گلاب کو اپنے پاؤں سے کانٹے نکالنے ہوتے ہیں۔
آبلہ پائی کا ہولناک سفر درپیش دیکھ کر اس کے حواس گم ہو گئے۔
اس نے چکراتے ہوئے سر کو سنبھال کر آس پاس نظر ڈال کر پانی تلاش کیا۔
لال خان نے ذوق شوق سے اٹھتے ہوئے قدم اندر رکھے۔

"پانی"۔ اس کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔
لال خان نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں جگ میں گلوکوز ملا پانی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک گلاس اٹھایا اور تیزی سے اس کے قریب آیا اور بہت آرام اور احتیاط سے اسے سہارا دے کر گلاس ہونٹوں سے لگا دیا۔
وہ ایک سانس میں چڑھا گئی۔ قدرے سکون کا احساس ہوا تو سنبھل کر بیٹھ گئی۔ مگر لال خان سے ذرا سی دور ہو گئی۔
ابھی پانی پیتے ہوئے وہ لال خان کے بازو کے گھیرے میں تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بازو اس کا حلقہ ہو، روز ازل ہی سے اس میں پھنسا ہوا طوق ہو۔
لال خان کو "حیا" کا یہ انداز بے حد خوش کر گیا۔
"دراصل ہم تم اس گھر کی ــــ دوسری سانس ــــ ہم پانچ بھائی ہیں۔ سب کا اپنا اپنا کاروبار ــــ اپنا اپنا گھر ــــ سب اپنی مگن ہو تم۔ جو جی چاہے کرو۔ جیسے چاہے رہو۔ اپنی طرف سے اجازت ہے۔ ہم تو بس چاہیں گے کہ تم خوش رہو۔"
وہ بولتا تھا۔ جو پوچھے کر رہا تھا۔
"خوش؟" اس نے پہلی بار نظر اٹھا کر لال خان کی سمت دیکھا۔
پتا نہیں اب خوشی کس رنگ میں آئے گی۔ میں اسے پہچانوں گی بھی یا نہیں۔ وہ ایک سوالی کی طرح پتھرائی آنکھوں سے خوشی کا راستہ دیکھا کروں گی۔
یاد نہیں آئی تھی تو خوشی کے امکان ہونے نہیں دیتے تھے اب اندر ایک ماتم برپا ہو گیا ہے جو عمر بھر رہے گا۔
"آج سے چودہ سال پہلے میرا نکاح ہوا تھا۔ میرے ماموں کی بیٹی سے"۔ لال خان مخاطب ہو رہا تھا۔
اسے دل کے دروازے پر پڑی زنجیر چھن سے بجی۔ وہ بجلی بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"مگر اسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ ماموں نے اس کا بہتر علاج کرایا۔ مجھے بھی سالوں لٹکا کر رکھا کہ ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر میں نے تنگ آ کر طلاق دے دی اور کویت چلا گیا۔ سات سال وہاں لگائے۔ پھر ملک واپس آ گیا۔ یوں تو شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پر رشتے دیکھے۔ دراصل قسمت میں تو تم لکھی تھی۔ اس لئے دیر ہو رہی تھی۔ ہر کام کا کوئی وقت مقرر ہے۔ مگر بھئی بڑی اچھی قسمت ہے ہماری۔ سب تعریف کر رہے ہیں ہماری دلہن کی"۔
اب دلہن کو بہلانے کا مرحلہ آ رہا تھا جو لجاتی قرب کے بعد دور جا بیٹھی تھی۔
"بھئی ہم تو سر سے پیر تک تمہارے ہیں۔ اتنی دور کیوں ہو گئی ہو"۔ لال خان گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔
اور ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔
وہ ایک رومان پرور لڑکی تھی جو اپنے خوابوں میں بہت آسودہ رہتی ہے۔ بجائے ایک ناپسندیدہ قرب کے، وہ حریم دور تھک گئی۔ بلا ارادہ ــــ
اس کا وہم الجھ رہا تھا۔ اس خیال ہی سے اسے غش آ رہی تھی کہ وہ اس کے قریب آئے گا۔
"میں تھک گئی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں"۔ وہ کافی آواز میں بمشکل کہہ پائی۔

"ہاہاہا"۔ لال خان کا بلند قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"بہت کم عمر ہو۔ بہت نادان ہو۔ ارے ابھی ساری تھکن اتر جائے گی"۔

بانو کو اس کے والہانہ انداز پر چکر آنے لگے۔

"میں رو پڑوں گی"۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ گویا پڑ سمجھی تھی۔

"تو پھر ساری عمر افسوس گی بھی تو"۔ لال خان کلائی سے گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

"پاگل۔ ایک تو عورت ستاتا ہے۔ پھر اسے شیشے کا دل دیتا ہے۔ اور پھر اسے "لال خان" دیتا ہے"۔ وہ اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"آج تو کچن سے خوشبوؤں کا طوفان باہر آ رہا ہے۔ کیا ہمارے لئے جشن کا جشن منایا جا رہا ہے"۔ اس نے کچن میں داخل ہو کر گہرے گہرے سانس لئے اور ایک کباب اٹھا کر چکھنے لگی۔

"بڑے ابا آ رہے ہیں آج شام چھ بجے"۔ گلو نے اطلاع بہم پہنچائی۔

"ہائیں۔۔۔ اچھا۔۔۔ یعنی حویلی کے سب باشندے قسطوں میں کراچی آ رہے ہیں"۔ وہ مزے لے لے کر کباب کھا رہی تھی۔

"سب ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ انہیں پہلی فرصت میں اوون پہنچاؤ"۔ روشی کو اچانک کچھ یاد آیا سو چ گیا۔

"ابھی رکھ رہی ہوں۔ تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں"۔ وہ کڑاہی میں کباب الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

"گلو"۔

"جی بی بی"۔

"بڑے ابا کیوں آ رہے ہیں؟"

"مجھے کیا پتا بی بی۔ ان کا گھر ہے سو بار آئیں گے"۔

"تو گویا بڑے ابا کی دعوت ہو رہی ہے"۔

"دعوت تو دوسروں کی ہے"۔ "آپ کو نہیں پتا؟ فاطمہ بتا رہی تھی وہ جو اس دن نہیں آئے تھے موٹے سے جن کی ناک پر موٹا سا مسا ہے۔ جب آپ اسپتال سے آئی تھیں، خان بھی یہیں تھے"۔ (اس کا اشارہ ہاری کی طرف تھا)

روشی کا ہاتھ منہ کی طرف جاتے جاتے رہ گیا۔ "علیم الدین؟"

"جی نام مجھے پتا نہیں۔ ویسے خان (ہاری) بتا رہے تھے کہ ہمارے گاؤں ہی کے ہیں"۔

"پر جی وہ تو سالوں سے شہر میں ہیں۔ جب وہ گاؤں میں ہوں گے تو میں چھوٹی سی ہوں گی"۔

"ابھی تو گئے تھے دعوت کھا کر۔ اتنی جلدی پھر آ رہے ہیں"۔ "اب سمجھ میں آیا کہ "بڑے ابا" کیوں آ رہے ہیں؟" اس نے ہاتھ گلو کے ایپرن سے پونچھے اور تقریباً پاؤں پٹختی لاؤنج سے باہر آ گئی۔

روبی ہاتھ میں آئینہ پکڑے آئی برو بنا رہی تھی۔ زری کے بالوں میں رولر لگے تھے۔ سوٹ کپڑوں کا انتخاب کر کے وہی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

بھٹ میں گھسے پاس کرانے کے ارادے سے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

شمو ایک کونے میں بیٹھی "کالا سوٹ پہنوں؟ کالا سوٹ پہنوں" کی گردان کر رہی تھی۔

ہائے "برائل واپس" گم ہو گئے تھے۔ وہ ایک ایک سے پوچھتی پھر رہی تھی۔

لالی ایک تذبذب کے عالم میں سوٹ لئے بیٹھی تھی۔ جو بھی فارغ دکھائی دیتا اس کے پاس جا کھڑی ہوتی پوچھنے کیلئے کہ دوپٹے کا رنگ چل تو نہیں رہا۔ چل جائے گا؟ اور ورنہ تو نہیں لگے گا؟"

مریم کو استری کرتے ہوئے شرٹ پر نیل پالش کا نشان نظر آ گیا تھا۔ وہ یہی پوچھتی پھر رہی تھی۔ یہ چھوٹ بھی جائے گا؟ اور بھی کر کس طرح؟

پورے لاؤنج میں اگر کوئی پرسکون تھا تو وہ گلو تھیں۔ وہ تیر کی طرح انہی کے پاس پہنچی۔

شمو نے سر اٹھا کر روشی کی سمت دیکھا۔

"ارے بھئی گلو۔۔۔ اس کا پہلا مصرعہ کیا ہے"۔

اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے

"ارے چھوڑیں آپا۔ یہ بے وقت کی راگنی"۔ مریم نیل پالش کے دھبے والی شرٹ لئے انتہائی غم ناک پوزیشن میں تھی۔ ایک دم تنک کر بولی تھی۔

"ارے کیوں غم میں دبلی ہوئی جا رہی ہو۔ منا کے پاس بھی تو ایسا سوٹ ہے۔ اس کی شرٹ لے لو تم تو بیٹھی ہو کر بھی سوٹ پہنتا ہے"۔ شمو اس سے زیادہ تنگ کر بولیں۔

"ہائے اللہ! اپنا شیمپو خراب ہے سارے بالوں کی لٹیں بن گئیں"۔ ستارہ واویلا کرتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس کی شکل دیکھ کر سب اپنی فکریں بھول گئیں۔ وہ قہقہے شروع ہوئے کہ بس۔

"کس سلسلے میں آخر یہ قیامت برپا ہے؟" روشی اب زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ سمجھ تو خیر وہ گئی تھی۔ مگر ایک خوش فہمی کا بھی "مارجن" ہوتا ہے ہر انسان کے اندر۔

"کوئی دولہا بارات میں کا پوچھ رہا ہے۔ آپ کیوں آئے ہیں"۔ روبی کو نئی نئی باتیں گھڑنا خوب آتی تھیں۔

لاؤنج میں ایک مرتبہ پھر مشترکہ قہقہہ گونجا تھا۔ وہ گھور ہی کر انہیں دیکھنے لگی۔

"تم نے اپنے کپڑے وغیرہ تیار نہیں کئے؟" گلو نہ جانے کیوں آج گم صم سی تھیں۔

"اب کہاں جانا ہے؟" وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔ "دریا ہستی سے اٹھتے ہیں تو کراچی میں گرتے ہیں۔ آگے جواب مستند ہے"۔ اس کی خود اعتمادی آناً فاناً بحال ہو گئی تھی۔ وہ اطمینان سے کشن کھسکا کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

روبی نے سب سے زیادہ اس کی اس بات سے مزہ اٹھایا تھا۔ خوب لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ "مان گئے روشی کیا جواب نازل ہوتے ہیں تم پر"۔

"اچھا اب تم بعد میں وہ تمیں پھیلا کر بیٹھنا۔ جا کر منہ دھوؤ، اچھے سے کپڑے بدلو۔ وہ سب ماموں بھی اس پہنچنے والے ہیں"۔ زری نے اسے حالت اطمینان میں پا کر "ذرا" چابی بھرنے کی کوشش کی۔

"لیڈی آف دی ہاؤس" کا انعام ہوتے آ رہے ہیں تو سے ایا"۔ وہ واقعہ دلیٹ گئی تھی۔

"زری۔ چلو اٹھو۔ بدتمیزی نہیں چلے گی"۔ سوہا نے پچکارا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ صبح ہی تبدیل کیے ہیں میں نے کپڑے۔ آپ سب میرے سر پر مت چڑھو"۔ اس کے لہجے میں ہراس در آیا۔

"زحمت ہے گھر میں۔ اس بار وہ لوگ باہر کھانے آ رہے ہیں"۔ مجھے نے سمجھایا۔

"وہ کھانا کھانے آ رہے ہیں۔ کھانا اچھا پکا ہے۔ میں سوگی اور گھوڑ "ٹونگ" کر آ رہی ہوں"۔ وہ ہنس کر ان کی شکلیں دیکھنے لگی۔

"ہو سکتا ہے آنے والے دنوں میں وہ تمہارے "سسرال" کہلائیں"۔ شعبہ اب مزید برداشت نہ کر سکیں۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ لڑکی کو اور بیگل حالت میں دیکھنا چاہیے"۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ "یہ لیمیا جانی تو کھلی ہوئی ہے۔ کیوں زری آپی؟"

"چھوڑو اسے اس کے حال پر۔ تم لوگ اپنی تیاریاں کرو"۔ سوہا نے ہمیشہ کی طرح صورت حال سنبھالی۔ مگر زارا سے ذرا برداشت نہ ہوتی تھی۔

"اچھا سنو۔ کیا تم لوگ کوئی بھی کچھ کرو گی؟" وہ شرارت بھرے انداز میں مریم سے پوچھ رہی تھی۔ "مگر تم لوگوں کو تو ڈھنگ کے کوئے بھی نہیں آتے خیر میں میک اپ کر دوں گی۔ ویسے تم لوگ تو ہر شادی میں ایک ہی گوٹا دیتی ہو۔"

چاندنی میں آئیو میاں بنڑے

"ابھی پورے چاند کے دنوں میں اگر "بنڑے" کو ضروری کام پڑ گئے تو کیا بارات ایک مہینہ لیٹ کرے گی؟" وہ ہنس رہی تھی ان کی اداس صورتیں دیکھ کر۔

گھر کی فرد وہی اس کی شکل دیکھ رہی تھیں جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

"تمہیں پتا ہے کون ہیں وہ لوگ؟" وہ دبی آواز میں پوچھنے لگیں۔

"علیم الدین عرف کلیم الدین۔ ایک عدد دولہا بہت کے والد ماجد نہ میں کوئی بیٹا نہ عادت نہ غازہ"۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی ان کی حیران پریشان صورتیں دیکھ کر۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اوپر جا رہی ہوں جب کھانے کا وقت ہو جائے تو بلوا لیجئے گا"۔ وہ اسی طرح کھلکھلاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

اور سیدھی اوپر بابا صاحب کے کمرے میں پہنچی۔ اس کی توقع کے مطابق وہ کمرے میں موجود نہیں تھے۔ وہ اندر داخل ہوئی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے اس نے نمبر ملائے۔

دونوں والا انداز تھا۔

"ماما۔ بابا ہیں؟" "اچھا تائی جان بلا رہی ہیں"۔ چند لمحے اسے انتظار کرنا پڑا۔

"ہیلو، زری بات کر رہی ہوں"۔

"اب کیا ہوا؟" دوسری طرف سے پوچھا جا رہا تھا۔

"آج تیم آ رہے ہیں، جس میں بارہ ہیں گھلاڑی والو ہیں"۔ وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"پتا ہے، مجھے۔ وہ بابا یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ تمہیں مجھے پہلے"۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تو آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی"۔ وہ دانت پیس کر پوچھنے لگی۔

"یہ سب اپنا بولو" "بیٹا اوپن" "فوٹو" کھینچ رہے ہیں"۔ وہ ہنس رہا تھا۔

"میں کیا کروں؟" وہ جھلائی۔

"کھانا کھانا ہے سب کے ساتھ۔ آج تو خاص دشمن ہوں گی"۔ اس کا قہقہہ ابھرا۔

☆——☆——☆——☆——☆——☆

"کھانا تو خیر میں کھا لوں گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ مگر یہ بتاؤ اگر وہ مجھے انگوٹھی پہنا گئے تو پھر۔۔۔؟" وہ چیخ گئی۔

"تو کیا ہوا میں لیتے کیا؟ انگوٹھی کا وزن تو زیادہ نہیں ہوتا" ۔۔۔ وہ ہنوز ہنس رہا تھا۔

"کوا جنت ہی۔۔۔ (تم نے مجھے دھوکا دیا)" وہ غصے سے اکڑنے لگی۔

"امی روشی بی بی ابھی پلیز آپا اور چچا کی غیر موجودگی میں کسی قسم کا "فائنل" نہیں ہو سکتا۔ یہ باتیں کوئی کھیل ہیں اور میں کیوں آپ کو ہدایت کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کتنی اچھی پسند ہیں اور کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں کچھ نہیں ہوگا" ۔۔۔ وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا۔

"مگر یہ سب لڑکیاں تو اس طرح تیاریاں کر رہی ہیں جیسے "منگنی" ہو رہی ہے اور وہ سوری۔

"عادت سے مجبور ہیں "آؤٹ ورلی"۔۔۔ پتہ اگر خواب بھی دیکھیں کہ کوئی نیا کپڑا پہنے ہوئے ہیں تو اٹھتے ہی تیار ہونا شروع کر دیں گی کہ "بشارت" ہوئی ہے۔" وہ قدرے جھلایا۔

روشی کی واقعی ہنسی چھوٹ گئی۔ "یعنی بڑی "رسم" ہے تمہاری"۔

"رسم تو کی کوئی بات نہیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیوں کو اس کے علاوہ کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔ آپ اپنی طرف ہی دیکھ لیجئے کہ "تیار" ہوئی پھرتی ہیں۔۔۔ ابھی کی نوعیت کا آپ نے اپنے گیارہ سوٹ منتخب کئے۔ ظاہر ہے اس کی تھی آپ نے یہ بھی تو بتانا ہوں گے"۔

اور وہ اس کی "باخبری" پر حیران ہوگئی۔

"آپ تو جیسے کپڑے وہ تے کو بھی نہیں چاہتا۔ تیار ہونا تو دور کی بات۔۔۔ بالوں کا حشر ہو رہا ہے۔ مگر ہمت کرنے کا سوال نہیں ہے"۔۔۔ وہ آزردگی سے کہہ رہی تھی۔

"پر اشین کیم "بنانا ضروری ہے۔ کسی "ہیر ڈریسر" سے وہ انداز کو شش شروع کریں۔ لمبے بال تو عورت کو مکمل کرتے ہیں۔ آپ کی امی کے کتنے لمبے بال تھے۔ ابھی تو حویلی میں چرچے ہیں"۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں مجھے پتا ہے تمہیں لمبے بال پسند ہیں۔۔۔ جب ہی تو وہ چڑیل تمہیں چانس مل گئی ہے"۔۔۔ اس کے دل میں کچھ الجھن سی ہونے لگی۔

"میں اپنی پسند کی بات نہیں کہہ رہا۔۔۔ آپ کو اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا پورا حق ہے۔ میں تو ہر عورت کے حسن کی بات کر رہا تھا"۔

(دل تو توڑ دو کوئی تم سے سیکھے) اس نے دل میں کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

بڑے ابا آ چکے تھے۔۔۔ اور وہ بے نیازی سے "ڈیل کارنیگی" کی کامیابی کے اصول نہایت عالم استغراق سے پڑھ رہی تھی۔

بڑے ابا کی آمد کی اطلاع اسے فاطمہ (نوکرانی) کے ذریعے مل گئی تھی۔ رد عمل کے طور پر اس نے کروٹ بدل کر شمال کی جانب سے منہ پھیر کر جنوب کی طرف کر لیا تھا۔

"کھانا لگ جائے تو بتا دینا"۔۔۔ اس نے کتاب پر سے نظریں اٹھائے بغیر تاکید کی۔ فاطمہ سر ہلاتی نکل گئی۔

انداز میں خاصا تعجب تھا۔ پیچھے لڑکیوں نے ایک ہنگامہ مچایا ہوا تھا اور اس پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں تھا۔

"کتاب پڑھتے پڑھتے اسے اونگھ سی آگئی تھی۔ گھو نے جھنجوڑا تو وہ ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے "مہمان خواتین کب سے انتظار کر رہی ہیں اور میں سمجھ رہی تھی کہ تم تیار ہو رہی ہو"۔ گھو کا موڈ سخت آف تھا۔

"تیار تو ہوں۔ بتایا تھا ناں کہ صبح ہی تبدیل کئے ہیں کپڑے۔۔۔ اور مجھے کوئی شوق نہیں فینسی ڈریس شو کے مقابلے میں حصہ لینے کا"۔۔۔ اس نے بھی جواباً خراب موڈ کا مظاہرہ کیا۔

"بالوں میں برش تو کر لو وہ چار پھیکے پانی کے ڈال لو منہ پر"۔۔۔ وہ ناراضگی سے کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

وہ بہ دل سے سلیپر گھسیٹتی باتھ روم میں گھس گئی۔

"کسی دن باری اقتم نے مجھ اس طرح انتظار کیا اس تو دیکھنا سر سے پاؤں تک جھول چکی ہوں گی"۔

بالوں کو سرسری برش کیا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی جھمکیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اسٹر کر دراز میں ڈال دیا۔ اور اپنے گیلے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈال کر دوپٹہ لپیٹ کر تی نیچے آ گئی۔

"کہاں ہیں سب لوگ؟" اس نے سامنے سے آتی فاطمہ سے پوچھا۔

"ڈائننگ روم میں۔ آپ ہی کو لینے جا رہی تھی بی بی۔"

"ایک عزرائیل ہی نہیں آتا میری جان لینے باقی سب آتے رہتے ہیں"۔ وہ بھناتی ہوئی ڈائننگ روم کی طرف آ گئی۔

طویل و عریض پر شکوہ ڈائننگ ٹیبل یہاں سے وہاں تک فل ہو چکی تھی۔

"السلام علیکم" اس نے جائزہ لیتے بغیر مختصر سلام کیا۔

"روشی! ادھر آؤ بچہ"۔ بڑے ابا بابا صاحب کے نزدیک بیٹھے تھے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بابا صاحب کی طرف قدرے خفگی بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"بیٹی! ابھی پڑھ رہی ہے؟" ہماری بیٹھی اچھی خاتون نے بڑے دلار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جی"۔ اس نے بیزار کن انداز میں جواب دے کر اپنے سنوارے بال۔ گویا جتانے کی کوشش کی کہ انہوں نے بال خراب کر دیئے تھے۔

"کون سی جماعت میں ہے بچی؟" وہی محترمہ پھر گویا ہوئیں۔

وہ چپ رہی اور سامنے رکھی محترمہ کی ڈشز کا جائزہ لیتی رہی۔

بابا صاحب نے بڑے پر جلال انداز میں اس کی سمت دیکھا۔ پھر اپنے بیٹے (بڑے ابا) کی طرف دیکھا۔ ان کے پہلو میں علیم الدین بیٹھے ہوئے تھے۔

"فورتھ ایئر میں ہے"۔ بڑے ابا نے علیم الدین کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے حصے کا جواب دیا۔

"اور بھئی علیم بیٹے! تمہارا بزنس کیسا ہے؟" ساتھ ہی انہوں نے علیم الدین کے صاحبزادے کو بھی مخاطب کیا۔ ایک طرح سے سب کی توجہ روشی پر سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

"فرسٹ کلاس! گراف اونچا ہی جا رہا ہے۔ کل ہم نے ریکارڈ کنسائنمنٹ روانہ کی ہے۔ یوں سمجھیں لاسٹ ایئر کے ڈبل کے برابر کوٹا ہے"۔

"بہت خوب! بابا صاحب ایک نظر روشی پر ڈال کر گویا وہ کس قدر "متاثر" ہوئی ہے۔ ہونہار فرزند کو سراہنے لگے۔ جس نے درحقیقت متاثر کرنے کیلئے اپنا بہترین پیرایہ اور چال صرف کی تھی۔

روشی علیم کی طرف دیکھنے کے بجائے بڑی بے چارگی سے کھانے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بڑے ابا! کھانا تو ٹھنڈا ہو جائے گا"۔ بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔

محفل کے آخری سرے تک ایک ہلچل سی محسوس کی گئی مگر اس کی بے چارگی میں کوئی کمی دکھائی نہیں دی۔

اسے اس بات کا تو سو فیصد یقین تھا کہ وہ جس کی سمت توجہ سے دیکھے گی۔ وہ اپنی نظر میں معتبر ہو جائے گا۔ تو کیوں ہم سمجھے گا۔ لہٰذا اس نے آخری حد تک لاشعوری ...... کوشش کی کہ غلطی سے بھی اس کی نظر علیم کی طرف نہ اٹھے۔

خاتون کے ساتھ تو کھانے کے خیال سے اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ کوفتے کوفتے "شاہی کوفتے" ...... ادھر وہ لوازمات سے تیار کیے ہوئے۔ جیسے ہی کھانا شروع ہوا وہ تو سر تا پا جیسے اس "حسین عمل" میں غرق ہو گئی۔ سارے ماحول سے بے نیاز بابا صاحب کی قربت سے بے خبر۔

"آپ نے اپنے بیڈ روم میں بھی کوئی تصویر نہیں سجائی ہوئی؟" ماہین یاور علی خان کے ہمراہ بیٹھی ہوئی شام کی چائے پی رہی تھی۔

ہم میں کیا بہت کچھ ہے رات ہی کا اجالا ابھر رہا تھا۔ طویل و عریض لان ...... اور لان کے اس پار چاروں طرف سے آ رہی اور ہریالی۔

"ہم تصویریں کیوں سجاتے ہیں؟ آرٹ اور دماغ میں اتری ہوئی تصویریں کیا کاغذ پر اتری ہوئی تصاویر کا مقابلہ کر سکتی ہیں؟ کاغذ پر اتری ہوئی تصویر تو جامد اور بے جان ہوتی ہے۔ ذہن کے پردے پر زندہ اور متحرک تصویر ہوتی ہے۔ دل میں اتر جانے والے بے چہرہ احساس کے ساتھ۔" وہ آہستگی سے دوبارہ چپ لینے لگے۔

"میری شامت نے دھکا دیا تھا کہ آپ سے سوال کر لیا۔ حالانکہ میرے "سب کانشس" میں یہ بات اچھی طرح اتر چکی ہے کہ آپ کے ہاں ہونے اور نہ ہونے کی ہر ادا کی ریزن (وجہ) موجود ہے۔ آپ سے سوال یا گفتگو تقریباً بے کار ہی ہے"۔ وہ شرارت سے مسکرا کر بولی۔

"آپ تو بغیر ریزن کے کسی کی موت میں بھی شریک نہ ہوں"۔

"بیٹی! ایک حساب سے آپ مجھے مطلبی یا غرض کا بندہ کہہ رہی ہیں؟ مگر ایک بات میں آپ کو بتا دوں اس دنیا میں بہت سے کام بغیر وجہ کے بھی انجام پا رہے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے کرنے سے دل کو وہ خوشی ملتی ہے جو غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) تحفہ ہوتی ہے۔ جس کے ملنے سے انسان پہلے سے زیادہ طاقتور اور توانا ہو جاتا ہے یا اس کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ایسی خوشی حاصل ہونے کے بعد انسان کو یہ ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ البتہ جب دکھ ملتے ہیں تب شاید انسان گزشتہ خوشی کے اسباب و وجوہات پر غور کرتا ہے۔ حالانکہ اکثر وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں"۔

ماہین تقریباً بھولی تھی اور ان کی سمت ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔

یاور علی خان کو پہلے اندازہ تھا جب اس کی حیرت ختم ہوگی تو وہ اپنے انداز پر شرمندہ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالنے اور سلگانے میں مگن ہو گئے۔

"آپ کو اس طرح کے لطیف جذبوں کی پہچان ہے؟ یقین کریں مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور ایمانداری کی بات

ہے اب تک تو مجھے اس پر حیرت تھی۔ کیوں آپ کی دیوانی تھیں۔ تجربے میں کیا نظر آیا تھا۔ معاف کیجئے گا۔"

"سر! آپ کا فون ہے"۔ ملازم نے مداخلت کی۔

یاور علی خان فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

ماہین اپنے لئے دوسرا کپ تیار کرنے لگی۔ دو منٹ بعد ہی وہ واپس آ گئے۔

"آپ کے بھائی نعمان احمد سے بات کر لیجئے"۔

ماہین تو جیسے سرپٹ دوڑی تھی۔ حویلی میں جتنی بار کراچی سے فون آیا تھا۔ نیب احمد کا تھا جب سے وہ آئی تھی یہ نعمان کا پہلا فون تھا۔

اس نے والہانہ شوق سے ریسیور کانوں سے لگاتے ہی سلام کیا تھا۔

اور ادھر سے سلام کا جواب دینے کے..... فوراً بعد اسے فی الفور کراچی واپس پہنچنے کیلئے کہا گیا تھا کہ جو بھی فلائٹ ملے، پہلی فرصت میں آ جائے۔ پپا کی طبیعت خراب ہے۔ اور پریشان کن بات یہ تھی کہ نعمان بھائی نے مزید کوئی بات کئے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔

اب اس کی پریشانی فطری تھی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی یاور علی خان کے پاس آئی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں، اپنا سامان پیک کریں، میرا آدمی آپ کو چھوڑ آئے گا، بلکہ جہاز میں بٹھا آئے گا"۔ گویا نعمان سے انہیں معلوم ہو چکا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی آپ کے کسی آدمی وادمی کے ساتھ، آپ میرے ساتھ چلیں۔ مجھے تو ان آدمیوں کی شکلوں ہی سے خوف آتا ہے۔ اتنا لمبا راستہ میں کسی بے ادب آدمی کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ اس سے تو بہتر ہے، میں اکیلی آپ کی جیپ ڈرائیو کر کے ایئرپورٹ لے جاؤں۔ بعد میں آپ کا ڈرائیور آ کر جیپ لے جائے"۔

"یہ دنیا ننانوے فیصد "بے ادب" ہے۔ کیا بنے گا آپ کا؟ اچھا چلیں تیار ہو جائیں اور پریشان نہ ہوں وہ ٹھیک ہو جائیں گے"۔

"وہ کون؟" وہ دامن کران کی طرف چلی۔

"آپ کے پاپا.....!" وہ خاصی الجھن میں دکھائی دیئے۔

"میرے پاپا آپ کے کچھ نہیں لگتے یاور بھائی؟" اسے جیسے ان کے انداز پر بہت صدمہ ہوا۔

"آئی ایم سوری..... میرا مطلب ہے نیب انکل"۔

ان کے انداز میں جان چھڑانے والی عجلت تھی جسے وہ محسوس کر سکتی تھی مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

اب ظاہر ہے ان کے ہاتھ مشغلہ ہی لگ گیا تھا، روشی کا ان کے درمیان چلنا پھرنا دو بھر ہو چکا تھا۔ بھلے ہاری جو بھی سوچتی۔ ادھر ادھر کونوں سے باقاعدہ فقرات نشر ہو رہے تھے۔

پھول بکھیرنے نکلے چھوڑ آیا ہے جان بہاراں
منتظر آئے ہیں ہمارے وارے چاند ستارے
میرے محبوب ہے

لالی بہت ترنگ اور ترنم سے گا رہی تھیں۔

کلثوم نے "کیا گل" دیکھیں ہے بڑا شاندار گیت ہے اس میں"۔

"کون سا؟" کلثوم اپنی دوست کو بہت انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔

"وہی..... کیا ہے وہ.....؟"

پھول یہاں رنگ بکھیریں گے اس جہان میں
کھلیں گے آرزو کے پھول جا کے آسمان میں

"ہاں واقعی بہت پیارا گیت ہے، پہلا مصرعہ لگتا ہے"۔

یہ زندگی اسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا

وہ لکھنے لکھنے بڑی سادگی سے بولیں۔

"آپا آپ تو ہمیشہ خوشی کے لمحوں میں کسی کونے سے غم اٹھا لایا کریں"۔ روبی کو غصہ آ گیا۔

"آج تو بڑا اچھا ماحول ہے..... خوشی کی گھڑیاں ہیں، دیکھا تھی شاندار جوڑی ہے گی، جو دیکھے گا تعریف کرے گا" زری ابھی پر بتا رہی ہے۔ شلوار قمیص میں تو وہ ایک دم قابل سردار دکھائی دے"۔ موٹی نے بھی حصہ لیا۔

"پہلا نام حافظ تیم الدین ہو گا"۔ بیگم کو پورے سلام کے سنتے نے بتایا۔

"خدا کیلئے روشی اتم اپنے بیٹوں کے نام اس قافلے پر مت رکھنا"۔ مریم نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

"کبھی پپا چلے الال دین..... فلاں دین کے ناموں کا رش لگا ہوا ہے"۔

وہ اس قدر سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں جیسے روشی کے ہاں بیٹے ہونے کا اسے سو فیصد یقین ہو۔

"رش کا کیا مطلب؟ کیا تمہیں کسی نجومی نے بتایا ہے کہ روشی کے ہاں گیارہ بیٹے ہوں گے؟" زری نے تعجب سے مریم کی طرف دیکھا۔

"ابھی بات فرض کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں"۔ مریم کے پاس جواب تیار تھا۔

"پھر بھی کچھ کم کر لو۔ بیٹے بہت زیادہ ہیں"۔ لالی کو آتی تعداد پر سخت اعتراض تھا۔

"مثلاً کتنے کروں؟" مریم نے کن انکھیوں سے روشی کی طرف دیکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں کم کرنے کی۔ تھوڑے دنوں کی پریشانی ہو گی، جب بچے چھوٹے ہوں، جب جوان ہو جائیں گے تو گھر بھرا بھرا لگے گا..... روشی کا جو پنچ "ہو گا وہ الگ.....!"

"پھر تو روشی کا ایک الگ قبیلہ بن جائے گا۔ میں نے ہسٹری پڑھی ہے۔ یونو؟ "سلطنت عثمانیہ" کی بنیاد جس قبیلے نے رکھی تھی

وہ صرف تو مردوں پر مشتمل تھا"۔ حنا نے معلومات "تقسیم" کیں۔

"لگتا ہے روشی کے نصیب میں ملکہ بننا ہی لکھا ہے"۔ زری نے شرارت سے روشی کی طرف دیکھا جو ان کی طرف پشت کیے بظاہر سو رہی تھی۔

چاند پھر نکلا مگر تم نہ آئے۔ جلا پھر مرا دل میں کیا کروں ہائے۔۔۔!

چاند پھر نکلا۔۔۔!

شمع کی پرسوز آواز اس شور میں بھی اپنی مہک لٹاتے ہوئے تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے گنگنا رہی تھی۔

"آپ کو صرف غمگین گانے ہی کیوں پسند ہیں؟" ہیرے نے فوراً پوچھ لیا۔

"پسند ہے اپنی اپنی مجھے اصل میں یاسیت زدہ گیت ہی پسند ہیں"۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں۔

"اٹینشن پلیز!" حنا تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔

"کیا خبر!" سب گھبرانے میں سب سے آگے زری تھی۔ ایک دم ہول گئی تھی۔

"ابھی ابھی فون آیا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے۔ میں اوپر تھی بابا صاحب بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے میں بچیوں کو ساتھ ہی لا رہا ہوں۔ سیٹ کی ٹکٹیں کرا لیتا ہوں"۔

حنا نے سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے چونکا دینے والی خبر سنائی۔

"آج کیا ہے؟" روشی یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"ہفتے میں دو دن باقی ہیں"۔ شمع نے مسکرا کر روشی کو جواب دیا۔

اس کی جان جل گئی۔ اس کا جی چاہا ہاتھ جوڑ کر درخواست کرے کہ خدا کیلئے آپ مسکرایا نہ کریں۔ بلاوجہ کا "طرز" ہوتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں چل پڑیں؟" گلو نے دعا مکمل کرتے کرتے اسے ٹوکنے کی فرصت نکالی۔

"سامان پیک کرنے"۔ شمع پھر بولیں۔ روشی خاموش رہی۔

"اتنی جلدی! ابھی تو ہمارا دل بھی نہیں بھرا"۔ لالی اداس ہوئی۔

"یہاں ہے کیا سوائے زلزلے کے۔ میں تو جس دن سے آئی ہوں۔ زلزلہ کا موضوع پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ بھوک بھی ٹھیک سے نہیں لگتی۔ رنگ علیحدہ "کالے" ہو رہے ہیں"۔ روشی نے تنک کر زلزلہ کو کوسا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے روشی۔ ایک حساب سے تو واقعی یہاں کچھ بھی نہیں ہے"۔ شمع نے افسوس کرتے ہوئے تائید کی۔ روشی پیشانی سے دل جھٹکتی باہر نکل گئی۔ کچھ اسے موقع پر چھوڑ کر۔

"ہیلو۔۔۔ جی ماہین بات کر رہی ہوں"۔

"جی۔۔۔ وہ کیسی طبیعت ہے آپ کے پاپا کی؟" وہ اپنے آفس سے بات کر رہے تھے۔

"ٹھیک نہیں ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے آپ سے کہوں آپ یہاں آ کر مجھے ان حالات میں "سہارا" دیں۔ میں بہت پریشان ہوں"۔ اس کی آواز رندھ گئی۔

"آپ تو واقعی ہی ایسے کریں انسان کہاں ہے؟"

"وہ اسپتال میں ہیں پاپا کے پاس۔ یاور بھائی اور ان کا دل ڈوب رہا ہے"۔ وہ رو دی۔

"آپ کیوں حوصلہ ہار رہی ہیں ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔ ایک منٹ ماہین پلیز"۔

"آپ آئیں گے؟"

"آپ یہاں کے حالات دیکھ رہی ہیں"۔

"آپ کا دل کیا کبھی نہیں آنا چاہتے۔ بے رحم ہیں آپ؟"

"سچ کہتی ہیں بے رحم کیوں نہ محسوس ہوں جھوٹ سے زیادہ بے رحم نہیں ہوتا"۔

"آپ کو دوری اللہ سے ہونے کے سارے عذر آتے ہیں"۔ وہ محسوس کر رہی تھی۔

"سچائی اور عیاری کے فرق کو پہچاننا سیکھیے ماہین"۔ وہ بپھر سے گئے۔

"گھبرائیے نہیں۔ سوچیں تو بہت فاصلے ہیں۔ سوچیں تو فاصلے کچھ نہیں۔ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا"۔ یاور علی نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

سارا دن بڑا خاموش اور پرسکون تھا کہ بابا صاحب اور بڑے ابا ہمراہ تھے۔ لڑکیاں خاموش اور پرسکون رہنے پر مجبور تھیں۔ مگر جیسے ہی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچیں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اپنی ماؤں کے گلے لگ لگ کر پیار ہو رہے تھے۔ بہت زیادہ پیار کرنے کے بعد ملانے جا رہے تھے۔ روشی تھوڑی دور ایک طرف کھڑی سب کو دیکھتی رہی۔ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

دادی امی آگے بڑھیں اور اس کے سر پر پیار کیا۔ "اچھی تو ہے میری بچی؟ ادھر کونے میں کیوں کھڑی ہے؟"

وہ عجیب انداز میں ان کے پاس سے ہٹ گئی۔ "ٹھیک ہوں۔ مجھے ہونا بھی کیا ہے؟"

"اور جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب آپ کو معلوم ہونے سے پہلے پہلے بتا دیں گی تسلی رکھیے"۔

وہ باہر نکل آئی۔ ملازمہ کچن کی طرف رات کا کھانا گرم کرنے جا رہی تھی۔

"اماں"

"جی بی بی!" وہ ٹھہر گئی۔

"جو اور بھائی کو بلا دیں کہ جلدی آ جائیں۔ میں ادھر باغ میں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوں"۔ وہ حکم صادر کر کے باغ کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر ٹہلتی رہی پھر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

پانچ سات منٹ بعد اسے جو اور آتا دکھائی دیا۔

"اسلام علیکم بھائی!" اس نے اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"کیسا وقت گزر رہا ہے کراچی میں؟" اس نے روشی کے اترے ہوئے چہرے پر تفصیلی نظر ڈالی۔

"سینٹرل جیل سے 'سب جیل' میں چلے گئے تھے۔" وہ پھیکی سی ہنسی۔

"یہ ہمارا ماحول ہے جو جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اسی ماحول کا عادی ہوتا ہے' تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتیں اس طرح خود سے سب کو دشمن کر کے رکھ لینا بھی کیا؟"

"آپ یہاں خوش ہیں؟" اس نے بھائی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بہت اچھی محبتیں اچھی سہولتیں ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ گھر ہے ہمارا اپنا ہے۔ یہ گھر ڈرنے میں تمام عمر دکھ سکھ کے رکھتی۔"

"آپ 'اس گھر' کے مرد ہیں' عورت نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کو آزادی جو بہت ہے۔"

اس نے بھائی کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔

"تمہیں کس طرح کی آزادی چاہیے۔ عورت کو آزادی سے کیا سروکار' وہ جتنی پابند ہوتی ہے اتنی ہی محفوظ ہوتی ہے اور جو عورت جتنی محفوظ ہوتی ہے وہ اتنی ہی پرسکون ہوتی ہے۔ عورت کے دلی سکون کے تمام سلسلے گھر سے شروع ہو کر گھر پر ختم ہوتے ہیں۔ عورت گھر میں مصروف رہ کر گھر کو سنوارتی ہے اور جتنا زیادہ گھر سنورتا ہے اتنا ہی وہ پرسکون اور مطمئن ہوتی ہے۔ اب اگر تم سیاستدان بننا چاہتی ہو تو بے کار ہے جو پہلے سے سیاست میں ہیں انہوں نے کیا کر لیا؟ انہیں تو میدان حاصل ہے پھر بھی ملک وہیں کا وہیں ہے۔ جو آتا ہے وہ سب سے پہلے 'خزانہ خالی' ہونے کی اطلاع دیتا ہے اور ہر بار خزانہ پہلے سے زیادہ خالی ہوتا ہے۔"

"سائنسدان بن کر کچھ 'ایجاد' کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں مقصد حاصل کرنے کا راستہ بتاتا ہوں۔ تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"انسان خالی سیاستدان یا سائنسدان ہی تو نہیں بننا چاہتا۔" اس نے تنگ کر بھائی کو بیچ میں ٹوک دیا۔

"تمہارے ایف ایس سی میں اچھے خاصے نمبر آئے تھے۔ بابا نے تم سے پوچھا بھی تھا کہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہو تو داخلہ ہو جائے گا' پوچھا تھا ناں؟"

"جی… مگر میں نے اس لئے منع کر دیا تھا کہ ڈاکٹر بن کر بھی میں نے صرف 'خاتون' کی خدمت کرنی تھی۔ بابا صاحب کو عورت کے 'جاب' کرنے سے ہی چڑ ہے۔ پتا ہے آپ کو… پھر فائدہ اتنی محنت و مشقت کا؟"

"پھر اب کیا کرنا چاہتی ہو؟" وہ اس کی سمت دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

"فی الحال تو بابا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ان کے آفس کا نمبر نہیں پتا۔ آپ ملا کر دیں۔ گھر والوں سے پرائیویٹ میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہاں لاؤنج میں وہ سب بیٹھی ہیں۔ بڑے ابا باہر گئے ہیں۔ آپ ان کی بیٹھک کا تالا کھول کر میری

ان سے بات کرا دیں پلیز جو بھائی!" اس نے بے بسی سے منت کی۔

"اچھا تم بیٹھو میں کھڑکی سے چابی لے کر آتا ہوں۔" وہ پیچھے والی طرف اٹھا۔

وہ اس کے کمرے سے واپس پر کچھ پکانے میں مصروف ہو گئی۔

جو جلدی واپس آ گیا تھا۔ "آؤ" اس نے روشی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ دبی بھرتی سے اٹھی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

چابی کے ساتھ ہی سے بابا کی بیٹھک تھی جہاں وہ ملاقاتیوں سے مخصوص اوقات میں ملا کرتے تھے۔

جو نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تالا کھولا۔ رات کے سوا آٹھ بجے کا عمل تھا۔

سب سے پہلے بابا کی میز پر جو جدید ترین ماڈل کا سپورٹ ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ جو نے نمبر ملانے کے دوران اسے نزدیک کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نمبر ملا کر دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھ کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ سیٹ سے "ٹون" آ رہی تھی اسے روشی بھی سن رہی تھی۔ ٹون کا آہنگ تبدیل ہوا اور جو نے تیزی سے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو… اسلام علیکم بابا! میں جو بات کر رہا ہوں… یہ روشی آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہے… خاصی مضطرب ہے آپ اس سے پوچھ لیجئے' اسے بات کرنا ہے۔"

اس نے ریسیور روشی کی سمت بڑھا دیا۔

"اسلام علیکم بابا!" اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بھرا گئی۔

"میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔" آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔

"خالہ کہاں ہیں؟"

"چلی گئیں… اتنی زیادتی بابا…؟"

"میرے حصے میں ماں کی محبت نہیں آئی تو کیا خالہ بھی نہیں… بابا آپ نے میرے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں۔" وہ رو رہی تھی۔

"ابھی ہم کراچی سے واپس آئے تو مجھے احساس اور زیادہ ہوا کہ آپ نے میرے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے۔ جب ہم گھر آئے اس پل تو وہ سب اپنی اپنی ماؤں سے لپٹ گئیں۔ میری طرف تو کسی کا دھیان بھی نہیں آیا۔ سب کی چولیں کھل گئیں وہ بے تکان باتیں کر رہی ہیں۔ سب اور کیا بتاؤں اتنی ہی مجھے کیسی لگ سکتی تھیں۔ صرف سر پر ہاتھ پھیر کر چلی گئیں۔ تب مجھے احساس ہوا آپ نے میرے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے۔ آپ مجھے دوسری 'ماں' لا کر نہیں دے سکتے تھے؟" وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

ہولے سے ریسیور لیا تھا۔

"جی… ٹھیک ہے۔ دوسری ماں کی محبت کی کمی نہیں ہوتی' وہ مجھے گلے سے لگا لیتیں تو کیا ہوتا میں خود ان کے گلے سے لگ جاتی۔"

"جی مجھے پتا ہے آپ کو میری ان باتوں سے غصہ آئے گا مگر میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ اب کوئی بات میں دل میں نہیں

دکھوں گی، ہر بات آپ سے کہا کروں گی۔ آپ کو مجھ پر کتنا ہی غصہ آئے مگر مجھے شرمندہ نہیں کریں گے۔"

"بتا رہی ہوں کہ آپ کو فون کیوں کیا ہے۔ پہلے یہ بتا دیجئے کہ آج کل آپ میں [illegible] کیا شادی [illegible] ہے۔"

"یہ انہی سے [illegible] تم نہیں [illegible] پلیز آپ مجھے جواب دیں۔"

"میرے سامنے [illegible] تو یہ بالکل ہی بے حس نہیں۔"

"مطلب یہ ہے بھیا! آپ خالہ سے شادی کر لیں۔" اس نے دھماکہ کر دیا۔

"[illegible] روشانے —!" جواد نے لپک کر [illegible] ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ مجھے بات کرنے دیں بھائی —— پلیز۔"

"تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟ پاپا تم سے سخت ناراض ہو جائیں گے، بات نہیں کریں گے تم سے —— اسٹوپڈ۔"

جواد نے ماتھے پر اسی طرح ہاتھ رکھا ہوا تھا کہ دوسری طرف سے ریسیور رکھنے کی واضح آواز سنائی دی۔

اس نے گہرا سانس لے کر ریسیور جواد کو تھما دیا۔

"آپ بہت خراب ہیں بھائی، مجھے پاپا کو جواب تو دینے دیتے۔ ہاں نہیں تو —— اصل بات یہ ہے کہ آج تک کسی نے ان کیلئے پر خلوص اور پکی کوشش ہی نہیں کی۔"

وہ بسور کر بولی۔ "یہ لوگ ذرا سی زبردستی کرتے پاپا کے ساتھ اور ہمارا بھلا ہو جاتا۔"

"تم کرو گی پاپا کیلئے کوشش؟ آسان نہیں [illegible] آ جائیں اور [illegible] لگانے والا قصہ تمہیں پاپا کے علم میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ وہ ڈسٹرب ہو گئے ہوں گے۔ اگر ہماری ممی نہیں رہیں تو اس میں ان کا کیا قصور۔" وہ آگے اور جواد اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"پتا نہیں اس حویلی کے مردوں کے سینے میں دل ہی نہیں ہوتے شاید۔ —— آپ بھی محسوس نہیں کرتے اپنی ماں کو، حیرت ہے شاید آپ کو مجھ سے بھی محبت نہ ہو۔" وہ اسی کیفیت میں اندر کی جانب بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"روشانے! کیا ہو گیا ہے تمہیں، ہر ایک پر شک کرنے لگی ہو؟" جواد نے اس کا بازو تھام کر آگے جانے سے روکا۔

"آپ کو میرا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو آپ مجھے پاپا سے ساری بات کرنے دیتے بلکہ میری ہاں میں ہاں ملاتے۔ میرے ساتھ مل کر پاپا کو [illegible] کرتے اور کہتے آپ کو شادی ضرور کرنا چاہیے۔"

"دماغ خراب نہیں ہے میرا تمہاری طرح —— اندر وہاں کسی سے ذکر کر دیا غلطی سے تو تماشا بن جائے گا۔"

"مگر مجھے رونا آ رہا ہے۔ اگر میں رو پڑی تو سب پوچھیں گے اور اس وقت میں سب سے جیلس ہو رہی ہوں۔ جی چاہ رہا ہے سب کے سر پھاڑ دوں۔"

اس نے رک کر جواد کو پوری سچائی سے اپنے اندرونی احساسات سے آگاہ کیا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"روشی۔"

"جی بھائی۔"

"—— ذرا باہر چلتے ہیں، آؤ شاباش۔"

اس نے نظریں اٹھا کر بھائی کی طرف دیکھا۔ [illegible]

[illegible] —— جی!

"[illegible] باہر جا رہے ہیں۔" اس نے جیب [illegible] گاڑی کی چابی [illegible]۔

"کدھر؟"

"بی بی جان۔"

"[illegible] جواد کے ساتھ باہر جا رہی ہوں [illegible]۔"

جواد چابی لیے اندر کی طرف جا رہا تھا، اس نے آہستگی سے دریافت کیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں؟ [illegible] ہوئے ہیں۔"

"کب سے؟"

"کل گئے تھے۔"

وہ جانے کس دھیان میں چل گئی تھی۔ جواد نے واپس آ کر مخاطب کیا تو وہ چونک گئی تھی۔

جب روشی کا فون آیا تو وہ بہت تھک کر بستر پر لیٹے تھے۔ جواد کی آواز سن کر وہ ذرا چونک گئے تھے مگر روشی کی آواز سن کر وہ اچھے خاصے پریشان ہو گئے تھے کیونکہ روشی کو رات کے وقت فون [illegible] بہت سارے [illegible] رکھتا تھا۔ وہ ویسے بھی اس کی طرف سے فکرمند رہتے تھے۔

اور اب جب کہ وہ اپنا [illegible] کر چکی تھی، فون خاموش ہو چکا تھا مگر روح میں ایک شور برپا تھا۔ جواد نے انہیں کبھی احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ [illegible] محسوس کرتا ہے۔ شاید وہ بہت گہرا تھا مگر روشی نے کئی بار انہیں لاشعوری طور پر احساس دلایا تھا کہ وہ [illegible] ہے اسے بہت زیادہ اس بات کا قلق ہے کہ اس کی ماں نہیں ہے۔

انہوں نے سگریٹ لگا کر سر بازو کے پیچھے ٹکا لیا۔ آج ان کو یقین ہو گیا تھا کہ روشی جسمانی طور پر ضرور بڑی ہوئی ہے مگر اس کا ذہن ابھی بچوں جیسا ہے۔

اس عمر میں ان سے ماں کی فرمائش کر رہی ہے جبکہ اب خود اس قابل ہو چکی ہے کہ شادی کر کے اپنی گرہستی سنبھالے۔

ماہین کا تصور کر کے وہ ویسے اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہو گئے۔ [illegible] انہوں نے گہرا کش لگایا۔

ماہین کو [illegible] رنگوں میں کھیل [illegible] اپنی چوٹی میں [illegible] ڈال رہی تھی، ان کے سفید ہاتھ [illegible] پر اس طرح لگتے تھے جیسے رات کے وقت جھیل کے پانی پر کنول۔

کمرے میں اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی گونجنے لگی۔ اس کے گہرے رنگ کے ملبوس سے اٹھنے والی خوشبو [illegible] ان کے

اعصاب چٹخانے لگیں۔

وہ ادھر ادھر یہاں وہاں متحرک ہو گئی۔۔۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

پھر آہستہ سے اٹھ کر آئے، کھڑکیوں کے پردے سرکائے۔۔۔ دروازہ کھول دیا۔

"عمر دین!" انہوں نے ملازم کو آواز دی۔

"جی صاحب"۔ وہ فوراً آ موجود ہوا۔

"ابھی چائے لے آؤ"۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر حکم دیا اور آگے بڑھ کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"پاپا! آپ شادی میں نہیں آ رہے ہیں تو میں یہ سب کپڑے نہیں پہنوں گی۔ میں جب اہتمام سے تیار ہوتی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے آپ موجود ہوں۔ آپ نہیں ہوتے تو میرا دل ہر شے سے اچاٹ رہتا ہے، بال بنانے تک کو جی نہیں چاہتا۔"

وہ اپنی بہن شاہین کی شادی میں جانے کی تیاری کرتے ہوئے ان سے مخاطب تھی۔

"اور پھر جواد کو آپ کی اتنی عادت ہے کہ وہاں مجھے بہت مضطرب کرے گا۔ حالانکہ دن بھر میں مشکل سے آپ آدھ گھنٹے کو میسر آتے ہیں، پھر بھی آپ کو اتنا چاہنے لگا ہے"۔ وہ وارڈروب سے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی تھی۔

"اب اتنا بے وقوف مت بناؤ، وہ بے چارا بچہ ہے، اسے صرف آپ کی عادت ہے محترمہ! آپ مجھے اولاد کی محبت کے ذریعے مزید بلیک میل نہ کریں۔ جب اعتراف عشق ہے تو پھر اتنا کیسی، سیدھے سیدھے کہیے آپ کا ہمارے بغیر دل نہیں لگتا

"

وہ ہنس رہے تھے اور اس کے چہرے پر کیسے کیسے حسین رنگ بکھر رہے تھے۔

وہ سر جھٹک کر دوبارہ سگریٹ سلگانے لگے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی گہری ہو گئی تھی۔ ان کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ اتنے گہرے اور اتنے ناقابل فہم تھے کہ انہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ صرف خود وہ سمجھ سکتا تھا۔

وہ فون کی طرف بڑھے۔۔۔ نمبر ملایا۔

"یس، یاور علی خان۔۔۔ اسپیکنگ"۔

"یقین نہ کرنے کی وجہ میں کوئی اولاد کی طرح تو نہیں ہوں، نہ ہی کوئی دوسرا ایسا، میرا دشمن ہے"۔

"کیسی طبیعت ہے انکل کی؟"

"بعض اوقات نظر انداز بھی کر دیا کرتے ہیں غلطی سے کب بتایا تھا؟ آپ کے پاپا۔۔۔!"

"بہر حال آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، وہ ٹھیک ہو جائیں گے"۔

"میں کوشش کروں گا کہ کچھ دیر کیلئے ہی سہی آپ کے پاس آ جاؤں۔ آپ حیران کیوں ہو رہی ہیں؟ ابھی جو کہا تھا وہ کہا تھا؟ آپ آج کی بات کریں، ابھی کی بات کریں"۔

"نہیں۔۔۔ نہیں حقیقت میں میں ہی ہوں کوئی اور نہیں"۔

"یقین نہیں آ رہا؟ آ تو جاتا ہے پر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ انکار کریں گی مجھے۔۔۔ اچھا جیسے۔۔۔ او کے خدا حافظ"۔

انہیں اسے لوٹ آنے والی آواز (بہت بہت شکریہ میری جان) انہوں نے میز کے پیچھے سے اپنا پرس نکالا اور کھول کر اس کی تصویر کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔۔۔ وہ روشی کی پہلی سالگرہ کی تصویر تھی۔۔۔ اور برسوں سے ان کے پرس میں رہا کرتی تھی۔ سالوں میں جانے کتنے پرس وہ بدل چکے تھے۔ مگر تصویر وہی تھی۔ وہ اس تصویر کی سرخ کار والی فراک میں انتہائی صحت مند روشی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ملازم چائے لے آیا تھا۔

"عمر دین"۔

"جی صاحب"۔

"دیکھو عمر دین، ڈرائیور کو ساتھ لے کر روز پاسٹل چلے جاؤ اور روشی بی بی کو لے آؤ"۔

"اور۔۔۔" ملازم اتنے عرصے ملازمت میں پہلی بار انہیں کسی کو گھر سے بلاتے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں ادھر"۔ انہوں نے بڑی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے جواب دیا اور چائے کی پیالی اٹھائی۔

"اور بڑے خان"۔

"میں یہاں سے فون کر دوں گا، آپ تم جاؤ"۔ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر جانے کا اشارہ کیا۔

اور سامنے میز پر پڑی فائل کھول کر بیٹھ گئے، دیکھتے ہوئے ایک فائل کا مطالعہ کرنے لگے۔ چہرے پر انتہائی درجے کا سکون طاری تھا۔

وہ علی الصبح بیدار ہو گئی تھی۔ نماز پڑھ کر اپنی کتابیں اٹھائیں اور باغ کا رخ کیا۔

سامنے ہی ملازمہ ٹرالی لیے گیسٹ روم کی طرف جاتی دکھائی دی۔

"کس کے لیے چائے لے جا رہی ہیں ماما؟" اس نے رک کر ٹرالی پر نظر ڈالی۔

"مہمان آئے ہیں؟"

"کیا خالہ واپس آ گئی ہیں؟" اس نے پے در پے سوال کر ڈالے۔

"نہیں بی بی، خالہ کیسے اتنی جلدی آ سکتی ہیں؟ کراچی سے علیم الدین صاحب آئے ہیں آج صبح پانچ بجے۔۔۔ ان کیلئے لے جا رہی ہوں"۔ وہ سادگی سے بولی۔

"علیم الدین۔۔۔" "یہ کون آ گئے ہمارے پیچھے پیچھے؟" اس کا منہ لٹکا۔

"اکیلے آئے ہیں؟" اس نے گھبرا کر ان کی شکل دیکھی۔

ماما نے غور سے اس کی صورت دیکھی "اور ابھی کسی کو تو تمہارے ساتھ؟" وہ ایسا سوال کرنے لگی۔

"اب ۔۔۔ اب مجھے کیا پتا؟ یہ بابا جی کب آئے تھے کو کیا آفت آئی ہے ہمارے سر میں؟" وہ جھنجھلا گئی۔

"یہ تو بڑے خان ہی جانتے ہوں گے ویسے خان کہہ رہے تھے کہ شاید دو اس دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ایک تو اس نے تو یوں میں گورنے لگا ہوتے ہیں۔ کوئی کام ہی نہیں ہوتا اس کے بغیر۔ اس کا فون آئے تو مجھے بتانا۔ ایک تو کاکا جان کے پاس وائرلیس فون نہیں ملتا۔ انٹینا ٹوٹ گیا ہوا ہے۔ مرضی ہوتی ہے تو ملاتا ہے ورنہ نہیں۔ کبھی بابا وہاں ہوتا ہے۔ تو میں ٹرائی کرتی ہوں مگر پتا چلتا ہے وہ "کام" پر گیا ہوا ہے۔" ماما اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر خود ہی آگے بڑھ گئی۔

وہ ایک کونے میں کتاب کھول کر تو بیٹھ گئی تھی مگر ذہن اب ایک ہی سوچ کے گرداب میں پھنس چکا تھا۔ "علیم الدین صاحب کس سلسلے میں آ کر مہمان ہوئے ہیں؟

کیا ہونے والا ہے؟ اگر وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تو وہ کیا کرے گی؟ آپا جی کیا کریں گی۔ وہ بابا سے کیا کہے گی؟ اس طرح کہے گی؟ آپا بابا صاحب پیا کی بات مان لیں گے؟ کیا بابا ان کے سامنے میرے حق میں بول سکیں گے۔ پھر میں پوچھ لوں گی کہ مجھے سزا کیوں دی جا رہی ہے۔

اگر بابا صاحب محض میری شادی کرنا چاہتے تو گھر میں ہی کسی سے کر دیتے۔ وہ مجھے خاندان سے نکال دینا چاہتے ہیں مگر میں امانت سے امانت نبھاؤں گی کہ میں بھی پھر انہیں کی پوتی ہوں۔ اس نے جیسے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

"اندر آ جاؤ یار! تمہاری طرح بھی کوئی اپنا دشمن نہ ہو۔" لال خان عارف کو اٹھائے گھر میں لا رہا تھا۔

"بالو! وہ دودھ میں ہلدی ڈال کر لے آؤ تمہارے دیور صاحب اسپتال کی سیڑھیوں سے گر پڑے ہیں۔ وہ تو نہیں مانتے تھے کہیں۔ جان! اس تو تم ہی پالیسی کہیں ۔۔۔!"

لال خان زخم آمیز انداز میں اسے ایک پلنگ پر لٹا کر کہنے لگا۔ "اور کوئی ہمارے لائق خدمت؟"

زخم ہوتے ایک دو تو پھر رفو کی بات تھی
اس دل صد چاک کا بس یہ رفو چھوڑ دیے

وہ تکیہ درست کر کے گرنے کے انداز میں لیٹ گیا۔

بالو باورچی خانے میں تھی۔ اس نے لال خان کا حکم سن کر وہ ایک گلاس میں ڈال کر ہلدی ملانا شروع کر دی۔ پھر کچھ سوچ کر باورچی خانے سے باہر آ گئی۔

"دودھ میں چینی بھی ملا دوں؟" اس نے وہیں سے لال خان کو مخاطب کیا۔

لال خان سوچ میں پڑ گیا۔ "پتا نہیں ہلدی والے دودھ میں چینی ملاتے ہیں یا نہیں؟"

"رہنے دو ایسے ہی لے آؤ۔" ہاں! خود کسی نتیجے پر پہنچ کر بولا۔

"بالو! اندر نہیں آئی۔ وہ دروازے پر اوٹ میں سے جھنک دے کر اس نے لال خان کو مخاطب کیا۔ وہ وہ گلاس لے کر وہیں آ گیا۔

"بھئی اندر آ جاؤ کیا کرنا۔ یہ دودھ نہیں کر رہا ہے اور پھر بے چارا ہے بے حال ہے۔" لال خان نے مسکرا کر عارف کو چادر اوڑھاتے ہوئے کہا اور گلاس اس عارف کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"کسی سے جو کہا ہے کہ اپنا علاج کرا لو گے کہ صحت ٹھیک ہو گی زندگی ابھی تھکے گی۔ مگر بھی اس سکتا ہے ایک بار کی زندگی ہے۔ کیوں دل ہے ہو اور دیکھو اس اپنا دھیان رکھنا شروع کر دو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ جہاں کہو گے وہیں بارات لے جاؤں گا۔"

لال خان در حقیقت بڑے سمجھانے کے حق دوستی نبھا رہا تھا۔ گلاس عارف کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ وہ پی رہا تھا۔ اور اس عمل سے ابھی جیسے تھک گیا تھا۔ سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔

"اچھا آج تو تم مجھے بتاؤ وہ کیسی تھی کون تھی؟ تاکہ جب تمہارے لیے کوئی لڑکی تلاش کروں تو اسی نمونے کی ڈھونڈوں۔" وہ عارف کو بہلانے لگا۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

وہ ہنس دیا اور ہاتھ سے گلاس پرے کر کے پھر لیٹ گیا۔

"آج آپ بھی گھر ہی ہوں گے کیا پکاؤں؟" بالو دروازے کے باہر کھڑی لال خان سے پوچھ رہی تھی۔

"اندر آ کر اپنے دیور سے پوچھو۔ ہم تو عمر بھر اب تم سے پکا کر کھاتے ہی رہیں گے۔" بالو میاں کے کہنے کے باوجود اندر نہیں آئی۔

"ارے اندر آ جاؤ بھابی یہ بے چارہ تو یوں بھی آنکھیں بند ہی رکھتا ہے۔" لال خان ہنس رہا تھا۔

بالو جھجکتی ہوئی اندر آ گئی۔ مگر اس جگہ کھڑی ہوئی جہاں سے عارف کی نظر براہ راست اس پر نہ پڑ سکے۔ مگر وہ لال خان اور عارف کو با آسانی دیکھ سکے۔

"اب خود پوچھو کیا کھانا پسند کریں گے آپ کے دیور صاحب۔" لال خان آج کل بہت خوش تھا خوش و شوخ ہوا جا رہا تھا۔

"آپ کیلئے کیا پکاؤں عارف بھائی۔" بالو کی آواز کانپ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں۔

"ارے کیوں ہمارے نخرے اٹھا رہے ہیں آپ لوگ اب ہم ان باتوں کے عادی نہیں ہے۔

محبت نے عنایت نے وفا نے چوٹ کھائی ہے
بکھر کے پھول ہوں بھنورو ہوا نے چوٹ کھائی ہے

"میرے یار! اسے شعر یاد کرنے کے بجائے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جاتے تو آج کہیں سرکاری افسر لگے ہوتے

"لالہ خان اپنی اپنی تو جانتا ہوں یہ نظرِ کرم ڈال کر بہانے بہانے سے چلتے بنو گے۔"

"بھائی! ہم آج بھی اصرار ہیں اپنی اپنی بھوک کی بات ہے۔"

"ایسا کرو، مچھلی کے کباب، دال اور مرغی کے تکے۔ یہ ٹھیک رہا تو پھر ہی اتنی باتیں کرے گا۔" اسے کھانسی بہت راس ہے گرم چیزیں اس کے لیے اچھی ہیں۔"

"یار! ہمارے پیٹ کا جہنم تو کب کا ٹھنڈا ہو چکا اب تو اس میں آگ ہی نہیں آتی۔" کیوں بھائی کو کام میں الجھا رہے ہو؟"

لالہ خان نے آنکھ کے اشارے سے جانے کو کہا۔

"تم تو ویسے ہی کہتے ہو اچھی چیزیں کھایا پیا کرو تاکہ جسم میں طاقت آئے۔" وہ عارف کو مکمل انداز سے رہا تھا۔

گلو ایک میڈیم سائز کا سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے گلو بھی اندر آ گئی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی دونوں کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

"جاؤ تم اور دیکھو دروازہ بند کرتی جانا۔" گلو نے گلو کو مخاطب کیا۔

وہ فوراً چلی گئی۔

"سیما بھابی آئی تھیں۔" گلو نے کارپٹ پر بیٹھ کر سوٹ کیس کی چابیاں نکالیں۔

اور کھٹا کھٹ کی آوازوں کے ساتھ سوٹ کیس کھول دیا۔

"کیوں؟ صبح سے دس بار آئی ہیں اب کیا ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کھلے ہوئے سوٹ کیس کو گھورنے لگی۔

"مہندی لگانے آئی تھیں۔" گلو نظریں چرا کر سوٹ کیس سے کپڑے اور جانے کیا کیا نکالنے لگیں۔

"مجھے خود مہندی لگانا آتی ہے اور سب سے اچھی آتی ہے آپ کو پتا بھی ہے۔" اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بظاہر سکون سے بات کر رہی تھی۔

"مگر یہ رواج ہے شادی منگنی کی مہندی دلہن خود نہیں لگاتی۔" گلو ایک سوٹ پھیلا کر دیکھنے لگیں۔

"کیسی اور کس کی شادی منگنی؟" وہ بستر سے نیچے آ گئی۔

"تمہاری اور کس کی؟" وہ دوسرے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"مگر میری مرضی پوچھے بغیر میری شادی یا منگنی کیسے ہو سکتی ہے؟" وہ بپھری ہوئی ان کے نزدیک چلی آئی۔

"ہمارے ہاں لڑکیوں سے کون پوچھتا ہے؟" وہ چڑی ہوئی رہی تھیں۔

"پھر لڑکیوں کو کمروں میں کیوں رکھتے ہیں؟ امتحان ہاسٹل میں کیوں نہیں پاس دیتے؟" اس نے آگے بڑھ کر زور دار سوٹ اٹھایا اور گول مول کر کے سامنے دیوار پر دے مارا۔ گلو —— ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔

"وہ زیوروں کے ڈبوں پر جھپٹی۔ گلو نے آگے بڑھ کر اسے اپنے قابو میں کر لیے۔

"پاگل ہوئی ہو، ان کی کیا ہے اس رشتے میں؟" وہ دوسرے لہجے سوٹ کیس میں رکھنے لگیں۔

"ٹھیک ہے آپ کریں۔" وہ دونوں آج شام ہی ہوئی تھی۔

"شٹ اپ روحی!" گلو نے اسے ڈانٹ دیا۔

اسی دم سیما بھابی دروازہ کھول کر اندر آئیں ان کے ہاتھ میں مہندی کی کٹوری تھی۔

گلو دروازہ کھلنے کی وجہ سے ادھر متوجہ ہوئی تھیں۔ روحی نے لپک کر سوٹ کیس میں پڑی اشیاء نوچیں اور ہاتھ بھر کے دروازے پر دے ماریں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" سیما بکا بکا دونوں کو باری باری دیکھنے لگیں۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔" گلو واپس ادھر ادھر کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

"مجھ سے پوچھے بغیر شان میں مہندی لگانا تھا، گرم ہے کہ بہرے ماں باپ سے تو نہیں پوچھا تھا۔"

وہ دوسرے سوٹ کیس کو لات مار کر واپس اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"پوچھا ہے جان سے۔" گلو نے جلدی جلدی سوٹ کیس میں چیزیں رکھنا شروع کر دیں۔

"پوچھا ہے یا حکم سنایا ہے —— ہونہہ۔"

"آپا! جا کے بابا صاحب سے کہہ دیجئے جب تک میری رضا سے بات نہیں ہو جاتی کوئی مجھے اپنی شکل نہ دکھائے۔" وہ غصے سے چلا رہی تھی۔

"تم کس کی بات ہو، ماموں سے بات؟" گلو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں اس لیے کہ میری ماں مر چکی ہے۔" وہ غرائی۔

"مگر وہ تو شام کو آ رہے ہیں۔" بڑی ای ابتلا رہی تھیں۔

"مت ذکر کریں کسی رشتے کا میں لاوارث ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

گلو اسے چلانے آگے بڑھیں۔ وہ دو قدم کر باتھ روم میں گھس گئی اور دروازہ بند کر کے چیخ چیخ جاری۔

"چلی جائیں آپ دونوں۔" وہ چیخی تھی۔

دونوں کافی دیر تک منت کرتی رہیں۔ مگر بے کار ہیں۔ بالآخر تھک کر واپس چلی گئیں۔ وہ کافی دیر باتھ روم میں بند رہی۔ بالاطمینان کے بعد آہستگی سے باہر آئی اور دروازہ کھلا دیکھ کر بند کرنے کے خیال سے آگے بڑھی۔

"کھلا رہنے دو۔ ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔" اسے بائیں جانب سے بابا صاحب کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحے کو آنکھوں کے سامنے میرٹھ سے ناچ گئی۔ گول گول دائروں کی صورت۔

"وہ گلو کہہ رہی تھیں —— کہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ ہاں۔" یہاں آواز کمرے میں گونجی تھی۔

وہ خاموش رہی۔

"ہم کیا پوچھ رہے ہیں، اب تک بس ہے ہمارے پاس۔" وہ دوسری کہہ رہے تھے۔

وہ اسی طرح خاموش رہی۔

"اگر تم نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا تو ہم منگنی کرنے کے بجائے آج تمہارا نکاح کریں گے اور ساتھ ہی رخصتی بھی۔ کراچی فون کریں گے۔ شام تک وہ پہنچ جائے گا۔" وہ شدید غصے کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔

"اسے آنا ہوگا ہمارے لئے بھی نہیں۔" وہ اسی انداز میں بولے۔

"نکاح اور رخصتی کا سن کر جیسے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ منگنی میں تو پھر بھی کچھ گنجائش نظر آ سکتی تھی۔

اس نے بے حد ہراساں ہو کر ان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بے ساختہ بول اٹھی۔

"بابا صاحب! میں آپ سے کچھ بھی نہیں کہوں گی بس آپ ایک دفعہ اسجد کو بلا دیں۔ پھر جو کچھ ہو جائے۔ میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گی۔ یہ شام کیلئے میری شرط ہے۔" وہ بڑی بے خوفی سے کہہ رہی تھی۔

"بابا صاحب غصے سے کانپ گئے۔ یہ کل کی لڑکی ان کے سامنے شرطیں پیش کرے گی۔

"ورنہ؟" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔ پتہ ہے آپ جانتے ہی ہیں کہ میں موت سے بالکل نہیں ڈرتی۔"

"تم ہمیں دھمکی دے رہی ہو اور ہم تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر سکتے ہیں۔" وہ احساس توہین سے چیخ پڑے۔

"میں جانتی ہوں اور میں تیار ہوں۔ بس آپ ایک دفعہ پاپا سے بات کرا دیں۔ پھر جو کچھ کہیں گے میں مان لوں گی۔" اس نے پست آواز میں کہا۔

"مگر ہمیں یہ منظور نہیں۔ تم یقیناً اس کے ساتھ بھی گستاخی کرو گی۔ اس کا دل دکھاؤ گی۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔" انہوں نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

"میرے باپ کو بھی اسی حویلی کے کسی قانون نے مارا ہوگا۔"

"ہم نہیں چاہتے ہماری اولاد کی گستاخی کا سامنا کرے۔ اس سے بہتر ہے وہ اپنی اولاد کے مرنے کی خبر سنے۔" وہ مارے غیظ کے ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

"آپ یہ بات آرام سے کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ میں آپ کی بیٹی نہیں پوتی ہوں۔" وہ رو دی۔

"نادان لڑکی! تم نے ساری زندگی اس حویلی سے سوائے پیار کے کیا پایا ہے۔ ہم نے جتنے ناز تمہارے اٹھائے اس گھر کے کسی بچے کے نہیں اٹھائے۔ یہ ہمارے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے کہ آج تم ہمارے سامنے گز بھر کی زبان لئے کھڑی ہو۔ ہم تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ٹھیک ہے پاپا سے ضرور بات کرو مگر جو تمہارے پاپا تمہیں کہیں اس کے مطابق شام کی تیاری کرو۔"

"ایک بات اور! آئندہ تم ہم سے اس طرح کی گستاخی نہ کرنا۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار کسی کی برداشت سے کام لیا ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ برداشت نہ کر سکیں۔ آؤ ہمارے ساتھ۔ ہم تمہارے باپ سے تمہاری بات کرا دیتے ہیں۔" وہ واقعی کمال ضبط سے کام لے رہے تھے۔

"مگر میں کسی کے سامنے پاپا سے بات نہیں کر سکوں گی۔" وہ ہچکچائی۔

"وہاں کوئی نہیں ہوگا۔" وہ اپنی چھڑی اٹھاتے ہوئے مستعدی سے قدم بڑھاتے باہر نکل گئے اور وہ پیچھے پیچھے ہی۔

بابا صاحب اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے اور موبائل فون اپنے بیٹے سے ملا کر اسے تھمایا۔

"ہم نمبر ملا رہے ہیں۔" اس کے لہجے سے انتہائی سرد مہری ظاہر ہو رہی تھی۔

وہ نمبر ملانے لگے۔ اسے پہلی بار ان کی آواز میں لرزش محسوس ہوئی۔ نمبر ملا کر بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی اور کیا سن رہی تھی۔

نمبر ملا کر اس نے فون بابا صاحب کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کانوں سے لگا کر کچھ توقف کیا۔ "ہاں.... بابا.... ہم بول رہے ہیں۔ یہ تمہاری بیٹی اپنی شادی کے مسئلے پر تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔" انہوں نے فون اسی کی طرف بڑھایا۔

نہ جانے کیوں وہ نظریں جھکائے رہ گئی۔ اور علی خان کے لہجے سے پہلے والی روانی ہو کر جیسے بے حسی کرنے لگی تھی۔

"آپ کمرے میں جا کر اطمینان سے بات کریں۔" وہ شفقت سے کہہ کر اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے اسی انداز میں گویا ہوئے۔

"بہت اچھے پاپا.... ہولڈ پلیز۔" اس نے آہستگی سے کہا اور تیزی سے تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں آ گئی اور دھپ سے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم پاپا!" وہ ذرا حواسوں میں آئی۔

"وعلیکم السلام.... کیا بدتمیزی ہے یہ؟" دوسری طرف سے پاپا علی خان کی ناراض آواز سنائی دی۔

وہ ہم تو رہ گئی.... "جی!" (ابھی تو میں نے بات بھی نہیں کی)

"کیا کہہ رہے ہیں بابا صاحب؟" پاپا علی خان برہم لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"آپ کو پتہ ہے پاپا کہ....!" وہ کہنے لگی۔

"مجھے پتہ نہیں تھا۔ آج صبح بابا صاحب نے بتایا ہے۔ اس طرح کے کام ان کی ذمہ داری ہیں۔ ان معاملات میں وہ بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آج تک جو عزت انہوں نے کمائی ہے اس کی حفاظت کا احساس ان سے زیادہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔"

"مگر پاپا!"

"یہ اگر مگر تمہیں کہاں سے آ گئے ہیں۔ جب میری شادی طے ہوئی تھی تو میں انگلستان میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنی منگنی کی اطلاع بذریعہ فون موصول ہوئی۔ میں مرد تھا اس کے باوجود جبکہ تم اس گھر کی لڑکی ہو۔ جس کو دنیا جہان کی نعمتیں بغیر محنت کے حاصل ہیں۔ جی کر دکھانا زندگی۔ کیا کسی انسان کیلئے یہ سب کافی نہیں۔ آخر تمہیں اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ بابا صاحب سے سوال جواب کرنے لگیں؟"

"پاپا! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کو میری بات سننا چاہیے۔ آپ نہیں سنیں گے تو پھر کون سنے گا؟" وہ ہچکیوں سے رو

رونے لگی۔

"کیا تمہیں یقین ہو گیا ہے کہ ہم تمہارے متعلق غلط فیصلہ کریں گے یا تمہیں تکلیف دینا چاہیں گے۔"

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے پاپا۔"

"جب یہ مطلب نہیں تو پھر بحث کرنے سے فائدہ؟" وہ جھنجھلائے ہوئے تھے۔

"پاپا! آپ کو شاید پتا نہیں کہ بابا صاحب نے اچانک اور اتنی جلدی یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔ اس تمام کارروائی کے پیچھے کون سا اہم واقعہ چھپا ہوا ہے۔" وہ رو رہی تھی۔

"مجھے کچھ جاننے کا شوق بھی نہیں ہے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے باپ سے زیادہ ہمارے خاندان کیلئے کوئی مخلص نہیں ہو سکتا اور ان کا کوئی فیصلہ بے معنی نہیں ہو سکتا۔" وہ اسی لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"آخر آپ حقیقت جاننا کیوں نہیں چاہتے؟"

"کھوج اس وقت ہوتی ہے جب شک یا شبہ ہوتا ہے۔ مجھے اپنے باپ پر نہ شک ہے نہ شبہ۔" وہ ڈانٹنے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"مگر بات سن لینے میں حرج کیا ہے پاپا؟" وہ اسی طرح رو رہی تھی۔ آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی ــــ عجب بے بسی کا عالم تھا۔

"مجھے لگتا تو تھا کہ جیسے میں آپ کی اولاد نہیں ہوں مگر آج یقین ہو رہا ہے۔"

"تب اب روشی! میں شام چھ بجے تک پہنچوں گا۔ اچھی بچی کی طرح جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو۔ رات میں وہیں رکوں گا۔ میرے کمرے میں آنا اور جو بات کہنا چاہتی ہو کہہ لینا بلکہ جو بات بھی کہنا چاہتی ہو۔"

وہ اس کی سسکیوں کو کافی دیر سے جھیل رہے تھے۔ اب برداشت کی حد ہو گئی تھی۔ آخر باپ تھے۔ مگر وہ جتنا اپنے باپ کو جانتے تھے وہ نہیں جانتی تھی۔ اپنی بات منوا کر نظروں سے گرنا انہیں منظور نہیں تھا۔

"پھر کیا فائدہ ہوگا۔" اس کے لہجے میں درشتی در آئی۔

"گھبراؤ نہیں روشی! اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے ذرا سی بھی تو بابا صاحب کو پریشان مت کرو۔ منگنی وگنی ہوتی ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوتی' باقی باتیں رات کو کریں گے' خدا حافظ۔" پاپا علی خان نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

ایک لمحے کو تو اسے یقین ہی نہیں آیا اور علی خان کے بدلے ہوئے لہجے پر ــــ ان کے الفاظ پر ــــ وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔

"منگنی وگنی ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔" یہ جملہ اسے حیرت سے مارنے کو کافی تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بابا صاحب کے کمرے میں آئی۔ وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے ــــ لیٹے ہوئے چھت کو گھور رہے تھے۔

اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر فون سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور علی خان کی طرف بڑھے بغیر باہر آ گئی۔

"کلو" اس نے راہداری میں جھاڑو لگاتی کلو کو پکارا۔

"جی بی بی؟"

"سب بھائی کو بھیج دو' کہو آ کر مہندی لگا دیں میں اپنے کمرے میں ہوں۔"

اس نے لفظ لفظ رک رک کر ادا کیا اور کمرے میں واپس آ گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے خوامخواہ بالوں میں برش چلانا شروع کر دیا تھا۔

اسی دم ــــ دھڑ سے دروازہ کھلا۔ وہ سب کی سب سب بھائی سمیت اندر داخل ہوئی تھیں۔ سب لڑکیوں کے چہروں پر جب ہوائی کے چہروں پر خوشی تھی۔ وہ کارپٹ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھیں اور سامان سب بھائی کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ گلو تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھیں۔ اس نے سوٹ کیس کو جلدی ماری تھی۔ اس کا احساس ابھی تک ان کے کانوں میں لرزش پیدا کر رہا تھا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چھوا۔

"سرسام نہیں ہوا مجھے' بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے جھلا کر ہاتھ جھٹکا۔

"یا اللہ! پانچ منٹ میں کیا ماجرا ہو گیا؟" ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کسی جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔" وہ تلملائی۔

"پہلے دولہن کو پکڑ کے ستانے کو ہم ہی رہ گئے ہیں؟" گلو کھسیائیں۔

"ہو سکتا ہے آپ کے علاوہ اور بھی ہوں مگر دور ہوں فی الحال۔" صبیحہ بھی سب کو ناپ کر صورت حال وہیں آ گئی تھیں۔

روشی کے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا۔ بابری کے تصور سے جانے کیا کیا اسے سوجھنے لگا۔ اب اسے ہنسی آ رہی تھی۔ آخر اس کے پیچھے کسی کا کیا ہوا ہاتھ تھا۔ اس نے شاید پہلی بار مسکرا کر صبیحہ کو دیکھا تھا۔

گھر میں خاصے عرصے کے بعد تقریب ہو رہی تھی اور وہ بھی اچانک۔ لڑکیوں کو اس بات کا شکوہ تھا کہ انہیں تیاری کا موقع بھی نہیں دیا گیا اور پڑے انہیں رکھے ہوئے پہنے ہوئے کپڑے پہننا پڑ رہے ہیں۔ وہ آتے جاتے روشی کو اس طرح گھور رہی تھیں کہ جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

پانچ بجے تک روشی کو مہندی لگتی رہی۔ گلو اس کے کپڑے پریس کر کے بیڈ پر ڈال گئیں کہ آدھ گھنٹے بعد مہندی سوکھ جائے گی تو غسل کر کے کپڑے بدل لینا۔

"جب تک میں تیار ہو جاتی ہوں پھر آ کر تمہیں دلہن بناؤں گی۔"

صبیحہ کی مارے حیرانی کے سب سے بری حالت تھی۔ وہ حیلے بہانے سے روشی کے پاس آ کر اسے ٹٹول چکی تھیں اور یہ بھی کہہ چکی تھیں کہ گھر کے افراد پورے نہیں ہیں' گئے ہوئے ہیں۔ اس پر بھی روشی کی حالت میں تغیر نہ پا کر وہ تین مرتبہ بابری کا ذکر کر چکی تھیں کہ اس کے نہ ہونے سے آج کی تقریب کے انتظامات میں بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ لڑکے تو اپنے اپنے

دھندوں سے گھبرا جاتے ہیں۔ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ روشی تو مرے جیسے کان دبائے بیٹھی تھی۔ باذ فرحت بھی کسی نتیجے پر پہنچے بغیر مایوس ہو کر اپنی تیاری میں لگ گئی تھیں۔

جس وقت روشی غسل کر کے باہر آئی تو اطلاع ملی۔ دولہا اور ان کی والدہ بھی حویلی پہنچ چکی ہیں۔

گلو نے پہلے ڈرائیر سے اس کے بال خشک کیے پھر اسے کپڑے پہنا کر ہلکا پھلکا میک اپ کرنے لگیں۔

دولہا والوں کی طرف سے زیور کا مکمل سیٹ آیا تھا جس میں نتھ، ٹیکا شامل تھی۔ سب کا ایک ہی سیٹ بڑے موتیوں کا تھا وہ چوکور ہار (ہائی نیک قسم کا گلوبند) اور جھمکیوں، انگوٹھی پر مشتمل تھا۔

"گلو نے تیار کرتے وقت کئی بار پوچھا بھی تھیں کہ بابا صاحب نے اسے کیا کہا؟ اور پر کر انہوں نے ڈانٹا ہے؟ روشی جواب میں مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھی۔ بلکہ بیچ سے ہمت بھی دے دی تھی۔ جبکہ سب کا خیال تھا کہ وہ بابا صاحب کی ڈانٹ کھا کر سیدھی ہو گئی ہے۔

گلو نے تیار کر کے دوپٹا سیٹ کر رہی تھیں کہ مالی پھولوں کے زیور لے کر آ گئی۔

"یہ بڑی بیگم نے بھجوائے ہیں"۔ وہ گلو سے مخاطب ہوئی۔

"دو دیکھو انہیں بڑی شکایت تھی کہ بڑی امی لڑکیوں کو پھول پہننے نہیں دیتیں۔ آج انہوں نے یہ ڈھیروں پھول بھیجے ہیں"۔ گلو نے اس کی پیشانی چوم لی۔

تھوڑی دیر بعد گلو پیغام لے کر آ گئی کہ "بڑی امی کہہ رہی ہیں روشی بی بی کو رسم کے لیے ہال کمرے میں لے آئیں"۔

اس کے جاتے ہی زری اور روبی اسے لینے آ گئیں۔

"پپا آ گئے؟" روشی کا دل جانے کیوں تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"انہیں آئے ہوئے تو ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا"۔ روبی نے جواب دیا۔

روشی کو ایک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ جیسے دھوپ میں چلتے ہوئے ہوا سڑک کے کنارے گھنا درخت نظر آ جائے۔ اور ستانے کے خیال ہی سے آدھی تھکن اتر جائے۔

وہ اسے لیے ہال کمرے میں چلی آئیں۔

آتشی گلابی زرتار شرارہ سوٹ میں دلہن بنی روشی کو دیکھ کر اس کی کزنز کے چہرے خوشی سے جگمگانے لگے تھے۔ تیاری کے وقت گلو نے کمرے میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ اسے ایک صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ دائیں طرف بڑی امی اور بائیں طرف نعیم کی والدہ تھیں۔ بڑی امی نے بسم اللہ کرنے کو کہا۔

اور نعیم کی والدہ نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

روشی کو یک دم ایک معصوم احساس نے بے چین کر دیا۔ ایسا لگا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھی اور بڑی امی سے کہہ بیٹھی کہ وہ اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہے۔

انہوں نے چند منٹ بیٹھے رہنے کو کہا کہ تصویریں بن رہی تھیں۔ سب کا اسے ایک رعب جاری لگ رہا تھا۔ جی

چاہا تھا کہ کسی طرح بھاگ کھڑی ہو۔

بمشکل آدھا گھنٹہ برداشت ہوا تھا کہ پھر وہ روبی کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔

"روبی! ادھر مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ میں کھانا سب کے ساتھ نہیں کھاؤں گی اور یہاں میں پپا کے لیے دعا میں رہی ہوں۔ یہاں انہیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے گا۔"

وہ روبی کو حیرت پریشان چھوڑ کر شرارہ سنبھالتی کمرے سے باہر چلی آئی اور ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چلتی خواب گاہ کی طرف بڑھی۔ مگر ذرا سا چونک کر الٹے پاؤں اپنی جگہ پر جمی کی جمی رہ گئی تھی۔

بابا صاحب پیچھے ہاتھ باندھے الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ دولہا اور ان کے بیچ میں اس طرح کھڑا تھا کہ وہ انہیں ہی سیدھی نہیں گزر سکتی تھی۔

وہ ڈرامائی انداز میں بھی ہو کر اس کے پاس سے گزرے گی۔ وہ تیزی سے بیچ میں اس کے سامنے دیوار کی طرح کھڑا ہو گیا۔

"ایک منٹ تو رک جائیں۔ اتنا برا کیا ہم نہیں ہیں گی؟" وہ روشی کی سنجیدگی سے مخاطب تھا۔

☆—☆—☆—☆—☆

"کیوں نہیں لوں گی؟ آؤ گے تو ضرور لوں گی۔" وہ جھٹکے سے آنچل کو سنبھالتے ہوئے لاپرواہی کے انداز میں بات کر رہی تھی۔

"جب میں کوشش کر رہا تھا تو آپ مجھ سے اکڑ رہی تھیں۔ اب یہ آناً فاناً انقلاب؟" وہ مسکرایا۔

"تم سے مطلب؟ تمہیں تو اس کی مطلق پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔" وہ نظریں چرا رہی تھی۔

"پرواہ تو خیر نہیں کر رہا۔ بس اپنی حیرت کا اظہار کر رہا تھا مگر ابھی تو مہمان موجود ہیں۔ آپ کہاں بھاگی جا رہی ہیں۔ ابھی تو مسز نعیم کو انگوٹھی پہنائی جائے گی۔ ہو سکتا ہے آپ اپنی اندرونی طبع سے مجبور ہو کر یہ منظر دیکھنا چاہیں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"نعیم کو دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ باقی تو تمام رسمیں عام سی ہیں۔ میں ذرا تھک گئی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"مگر آپ کا کمرہ تو پیچھے رہ گیا۔ اس طرف تو بابا جان کا بیڈروم ہے۔ کیا ارادے خوشی کے...؟"

اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں جاتی ہوں اسے کمرے میں جا رہی ہوں۔ مجھے ان سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"آپ کی ضروری باتیں باقی ہیں؟ آپ کیا پکر شادی کے دنوں میں ہوگی۔ کیا بارات کراچی سے آئے گی۔ یا پھر شادی جلدی نہیں ہو سکتی اور دیر کرنے سے کیا فائدہ اور پھر کہ..."

"اور پھر تمہارا سر۔" روشی نے جھلا کر اس کی بات کاٹی۔ "تم اتنے احمق کیوں ہو۔ تمہاری وجہ سے میں بچ نہیں رہی ہوں۔"

"تمام ہو تو اگر آپ نے مجھے دکھانے ہیں کچھ صاحب کے کہیں۔ اعتراف یہ ہو تو بڑی فطری سی بات ہے۔ مگر یقین کریں۔ میں واقعی بہت خوش ہوں۔ آپ نے بڑی حقیقت پسندی اور ہوش مندی سے کام لیا ہے۔ کراچی سے بڑا بوجھ اپنے سر پر کر چکا تھا آج اتر گیا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں اور یقین کریں میری تو راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔" وہ بہت پرسکون انداز میں مسکرا رہا تھا۔

روشی نے دو سارے میں بہت ہو جانے والی نظریں اس پر جما دیں۔

"تو کیا جانو شہزادے کے عمل کے بس میں ہو۔ بے وقوف مجھ سے باتیں کر کے وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم سمیت یہ سارا گھر ہی مجھے پاگل سمجھتا ہے۔ سب ہی اس طرح خوش ہو رہے ہیں جیسے سروں سے بلا ٹل رہی ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔

"روشی بی بی!" ہماری ایک دم پیچھے کیا آ راستہ وہ... مگر سسکتی ہوئی روشی اسے پھر سے الجھن میں ڈالنے لگی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے اطمینان سے خوف آ رہا تھا۔ الجھن ہو رہی تھی۔

"خود ہمیشہ سامنے سے کاش احمق تصالی ہوتے۔"

وہ نظریں بچاتی ہوئی بابر علی خان کے بیڈروم تک گئی تھی اور وہ بہت الجھے ہوئے انداز میں چہرہ موڑ کر شرارت سنبھال کر جاتی ہوئی روشی کو دیکھ رہا تھا۔

بابر علی خان کے بیڈروم کے باغ کی طرف کھلنے والے دریچے وا تھے۔ اور باہر باغ سے روشنیاں کمرے میں آ رہی تھیں۔ جب کہ کمرے کی تمام لائٹیں آف تھیں۔ یقیناً مردانہ تقریب باغ میں ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دریچے میں آ کھڑی ہوئی۔ بلکہ اوٹ میں کھڑی ہو کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔

آج باغ کی تمام لائٹیں آن تھیں۔ جو کسی تقریب کی واضح علامت ہوا کرتی تھیں۔ درمیان میں صوفہ سیٹ اور اطراف میں رنگ برنگی فولڈنگ چیئرز تھیں۔ جن پر اکثریت گھر کے مردوں کی براجمان تھی۔ مرکزی صوفے پر بابا صاحب، بابر علی خان، نعیم الدین اور نعیم براجمان تھے۔ باقی گاؤں کے دیگر اہم افراد بھی دکھائی دے رہے۔

سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس کم عمر سا نعیم سرخ و سفید اور سوالوں سے سوٹ مکمل تھے بہت ہی پر تکلف انداز میں بیٹھا تھا۔ جھاڑ فانوس اسے ادھر ادھر دیکھتے دکھائی دیا۔ جب کہ بابر کی دکھائی نہیں دیا۔ تمام مردوں میں اگر کوئی بہت شاندار دکھائی دے رہا

تھا تو وہ اس کے یار تھے۔ بڑی ملبوسات میں ڈھکے پر لگے صوفے کے پیچھے پر بازو ٹکائے اپنے ہونٹوں کو بھینچیں سے لگائے ہوئے چھوتے ہوئے وہ اطراف پر نظر دوڑا رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود صاف محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہیں۔

غالباً کھانا شروع ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ بابا صاحب کی قیادت میں ایک ایک کر کے سب اندر مردانہ ہال کی طرف جانے لگے۔ ذرا سی دیر میں باغ میں خاموشی چھا گئی۔ وہ بھی دریچے سے ہٹ کر صوفے کی طرف بڑھی۔ خود اختیاری آئی وجہ یہی تھی کہ کسی منظر نے اسے ذرا دیا نہیں۔ وہ بہت پرسکون تھی۔ اس نے اپنے باپ کا ایک جملہ اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ "سنگی کی بھی کوئی خاص چیز نہیں ہوتی"۔

اس نے صوفے سے پشت لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ابھی اس کیفیت میں بیٹھے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باغ کی طرف سے ایک خوبصورت نغمہ اس کے کانوں میں جلترنگ سے بجانے لگا۔ وہ نظر انداز کرنے لگی مگر اسے اس وقت چونکنا پڑا جب ایک ہی نغمہ تیسری مرتبہ شروع ہوا۔ وہ اپنا دوپٹہ سنبھالتی پھر دریچے میں آن کھڑی ہوئی۔ باغ میں کرسیوں کے دونوں سروں پر ایک رکھے ہوئے تھے۔ یہ انتظام لازماً موسیقی کے دیوانوں نے کیا ہوگا۔

اس نے سوچتے ہوئے اس طرف نظر ڈالی۔ جہاں چھوٹی سی ٹیبل پر پلیئر اور کیسٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ اسے خاصی حیرت ہوئی۔ وہاں "زاہد خشک" ہاری بیٹھا ہوا تھا۔ وہی گیت اب چوتھی مرتبہ ری وائنڈ کر رہا تھا۔ نغمہ ایک مرتبہ پھر پورے زور کے ساتھ فضا میں بکھر رہا تھا۔

میرا ایمان محبت ہے' محبت کی قسم!

ساری دنیا تیرے قدموں پہ نچھاور کر دوں
چاند تاروں سے میری جاں تیرا دامن بھر دوں

تیرے خوابوں پہ کبھی چھا نہ سکے شام الم
میرا ایمان محبت ہے' محبت کی قسم

وہ جہاں ایک جہنم ہے جہاں تو نہ ملے
جل کے مر جاؤں جو یہ سایہ گیسو نہ ملے

زندگی زہر بھرا جام ہے اب تیرے بغیر
تیری چاہت پہ قربان ہیں میرے لاکھوں جنم

میرا ایمان محبت ہے' محبت کی قسم!!

منزلِ جانِ بہاراں کہ سویرا ہوگا!
ختم صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہوگا

شب کی قسمت میں لکھا ہے گزر ہی جانا
راہ سورج کی کہاں روک سکے اہلِ ستم
میرا ایمان محبت ہے' محبت کی قسم!

"تم کھانا نہیں کھا رہے؟" اچانک سامنے سے مدثر نمودار ہوا۔

ہاری نے پلیئر آف کر دیا۔ "مجھے فی الحال بھوک نہیں ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مگر ہال میں آ تو جاؤ۔۔۔ دیکھو سب کھانا کھاتے ہوئے کیسے لگ رہے ہیں۔ تم ہمارے گروپ کے روح رواں ہو کے چہرے پر مسکراہٹ کرو۔ شاباش۔ اس طرح جو ابھی سب کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ تو اچھے لگ رہے ہیں۔ بے کار وقت ضائع نہیں ہوگا آدھا کیا کہتے ہیں دشمنوں کے کان تیز"۔ وہ اسے کاندھوں سے پکڑ کر اٹھا رہا تھا۔

"تیز نہیں بھیجے"۔ وہ تسلیم کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اب مسکرا رہا تھا۔

"مگر تمہارے دشمن بھی تمہارے لیول کے ہوں گے۔ بڑے ارسٹ قسم کے ہوں گے۔ ایسے لوگ بڑی تیز حسیات کان رکھتے ہیں۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن"۔ مدثر قائل ہونے کے بجائے ذومعنی سے بولا۔

"تھینکس فار انفارمیشن"۔ وہ بھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہنس دیا۔

"کیسا لگا بابا صاحب کا انتخاب؟" مدثر اور ہاری اب اندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہاری کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ کوشش کے باوجود سن سکی تو چھاکر صوفے پر بیٹھ گئی اور کچھ دیر قبل کی صورتحال پر غور کرنے لگی۔ گیت کی طرز، گلوکار کی آواز اور اشعار درحقیقت بے حد پر تاثیر تھے۔ جیسے جنون اس کی سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ "کیوں اس نے ہاں گیت بار بار۔۔۔ بے حس۔۔۔ نہیں بلکہ پتھر۔۔۔ ایک دم حس۔"

ختم صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہوگا

ہونہہ۔۔۔ پڑے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ مٹیں گے اور سر کاٹیں گے۔ کیسے دور ہوگا اندھیرا؟ ان کے والد صاحب آ پہنچے سلطان راہی کی طرح للکارتے ہوئے۔ کیونکہ ان کے بس کی تو بات نہیں۔" تاجدار ابی کا میڈل جیتے بغیر سانس نہیں لیں گے حضرت"۔

اس نے وال کلاک کی سمت نظر دوڑائی۔ جب تک پیا سے صاف صاف بات نہیں ہوگی۔ نیند بھی نہیں آئے گی۔ وہ ایک جھٹکا اٹھا کر صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔

حالانکہ اسے سو فیصد یقین تھا کسی سے نیند نہیں آئے گی۔ اس کے باوجود آنکھ لگ گئی تھی۔ یاور علی شیل اصحاب نئے اپنے بیڈروم میں داخل ہوئے تھے۔ اور روشی کو سوتے پا دیکھ کر چونک پڑے تھے۔

کتنی جلدی اور خود سر ہوگئی ہے یہ۔ انہوں نے دلہناپے کی مجب سے پلو روشی پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اور جیسے ہی تو ایک امپوز ما محسوس کرنے لگے۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ روشی کو جگا کر اپنے کمرے میں جانے کو کہیں۔

ان کا وجدان کہہ رہا تھا کہ روشی کے جاگنے سے طوفان جاگ پڑیں گے۔ وہ وقت اہر کر آہستگی سے وار اور ... میں ٹہلنے لگے۔ معاً انہیں دریچے کے پار دو نسوانی آوازوں نے متوجہ کیا۔ باہر درختوں پر قمقمے ہنوز روشن تھے۔ مگر محفل برخاست ہونے کا عمل تا حال بھی فضا میں موجود تھا۔ وہ تیزی سے دریچے کی طرف بڑھے۔

"لاہڈی جلدی طبیعت تساں دی۔ بہوں دیر ہوگئی اے۔ ہن تساں چلو۔ تساں نوں رب دا واسطہ۔ وڈے خان اجے آساں تے سادی خیر نہیں۔ چھیتی چلو"۔ (چلو)

سرسوتی کو "ہندکو" زبان کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ وہ گھاس پر بیٹھی عورت سے مخاطب تھی۔ جیسی اسے وہاں سے چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اسے ڈر رہی تھی کہ بڑے خان ادھر آگئے تو دونوں ہی کی خیر نہیں۔ لہٰذا یہاں سے جلدی چلو۔

"نئیں — میں کی کرساں — آں دیو اہاں ہاں — تساں ادرے او تے مجھ اچھوں۔ میں تساں نوں پھڑ ساں؟" (پھر میں کیا کروں؟ نہیں آتے وہ۔ تم ڈرتی ہو تو جاؤ میں نے تمہیں پکڑا ہوا ہے؟) جواباً گھاس پر بیٹھی ہوئی عورت نے بھی ہندکو میں بڑی لگی سے جواب دیا۔

"اک واری میں تو روشی بی بی ناں گل کرلین دے۔ آں تے فیر ای چل ساں اجھوں"۔ (ایک بار روشی بی بی سے بات کرنے دے۔ اب تو تب ہی جاؤں گی)

"وڈے خان میں سارا سوا ساں ساں"۔ سرسوتی لرزتی آواز میں کہتی ہوئی رو دینے کو ہو گئی (بڑے خان مجھے جلا کر راکھ بنا دیں گے)

یاور علی خان نے پلٹ کر روشی کی سمت دیکھا اور نہایت آہستگی سے دریچے کے پٹ بند کیے اور اسی تیزی سے کمرے سے باہر آئے۔ اور باہر باغ کا رخ کیا۔

اور ان دونوں سے تھوڑے فاصلے پر رک گئے۔ "تمہارے ساتھ کون ہے سرسوتی؟"

وہ بہت دھیمی مگر بارعب آواز میں اس سے مخاطب ہوئے۔

اور سرسوتی کی تو جیسے گھگھی بندھ گئی۔ کوشش کے باوجود حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں سرسوتی؟" ان کے لہجے میں بلا کی درشتی تھی۔

معاً گھاس پر بیٹھی ہوئی عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ماحول ایسا ہو گیا جیسے باغ ذہنوں اور جذبوں کا شور سنانے کی چادر سرکانے لگا۔ اور یاور علی خان نے خوف بھرے انداز میں گہری سانس سینے سے خارج کی۔

"کیوں آئی ہو اس طرف؟" انہوں نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے سوال کیا۔

"اپنی قسمت کا فیصلہ کروانے آئی ہوں۔ آپ کو مجھ سے دوری عزیز ہے تو ہوگی۔ اس حویلی میں پتھروں کی کمی نہیں۔ آپ مجھے پتھر مار دیں"۔ جذبوں کی کھنک ساری فضا میں سرایت کر گئی۔

"کیوں نہیں مارتے؟" وہ آگے بڑھی۔ "خان اپنا دیں کسی کو مجھے باہر دے دیں۔ یہ تو نہیں کہتی کہ مجھے گولی مار دیں۔ یہ بھی نہیں کہتی کہ میری گردن اتار دیں۔ آسان موت تو میں بھی نہیں مانگتی۔ میری کھال میں بھوسہ بھروا دیں۔ اسے پتھر ماریں۔ اپنی وحشت اور نفرت کی تلاش کریں مگر مجھے معاف کر دیں۔ جب میری روح میرے بدن سے نکلے گی اس وقت کہہ دیں آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ موت آتی ہے خان۔ نہ معافی ملتی ہے۔ ادھر باہر کھڑی ہوں۔ یا تو مجھے یہ احساس دیں کہ میں زندہ ہوں یا یہ احساس دیں کہ میں مر چکی ہوں۔ مجھے ہجر کی ان دو ناگنوں کے بیچ سے نکالیں۔ میرا جسم نہیں میری روح آزاد کریں۔ خان اللہ کے واسطے"۔

"شٹ اپ۔ سرسوتی اسے اس کی کوٹھڑی میں لے جاؤ"۔ یاور علی خان کی آواز غضبناک مگر دھیمی تھی۔

"ہاں خان"۔ سرسوتی عورت کا بازو تھام کر کھینچنے لگی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے خان سے باتیں کرنا ہیں"۔ عورت نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا۔

"دیکھو اگر تم باز نہیں آئیں تو تمہیں حویلی سے نکال کر باہر پتھر ور بھیج دیں گے"۔ یاور علی خان نے جاتے جاتے رک کر اسے دھمکی دی۔

"رک جائیں خان۔ فیصلہ کر کے جائیں"۔ وہ بجلیاں چمکاتی ان کی طرف بڑھی۔

"بکواس بند کرو۔ تمام فیصلے ہو چکے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے"۔ وہ برہم ہوئے۔

"خان — اب تو مرنے کے دن دور نہیں۔ آپ ایسا کریں مجھے "سرائے" بھجوا دیں"۔

یاور علی خان کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ اور وہیں رک گیا۔ جیسے انہوں نے بمشکل خود کو روکا تھا۔

"سرسوتی اس کی زنجیریں کھینچ کر اسے کوٹھڑی میں لے جاؤ۔ تمہاری ڈیوٹی اس پر ہے پھر یہ باہر کیسے آجاتی ہے۔ آئندہ ایسا ہوا تو تمہیں بھی اس کے ساتھ کوٹھڑی میں بند کر دیں گے"۔

"خان — روشی بی بی"۔

"شٹ اپ۔ اس گھر کے کسی فرد کا نام تمہاری ناپاک زبان پر نہیں آنا چاہیے"۔

وہ تیز تیز قدم بڑھاتے اندر کی طرف چلے گئے۔ ان کا قد پر تشنج طاری ہو رہا تھا۔ تمام جسم زلزلے کی زد میں تھا اور چہرہ سرخ انگارہ۔ سامنے ماما گلی کی طرف جاتی دکھائی دی۔

"ماما" ان کی بھاری آواز راہداری میں گونجی۔

"جی خان"۔ وہ دوڑتی ان کے پاس آئی۔

"ذرا کپ کافی میرے کمرے میں لے آؤ"۔

"اوہ" ماما جی نے الجھ کر ان کی شکل دیکھی۔

"روشی بھی میرے کمرے میں ہے"۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ روشی اوندھے منہ بے خبر سو رہی تھی۔

وہ روشی کے پاس جا کر رک گئے۔ اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک چکا تھا۔ چہرے پر عجیب طرح کی یاسیت الجھنوں کے سائے سے گڈمڈ ہو رہی تھی۔ بکھرے سیاہ بالوں میں الجھا ہاتھ۔ انہوں نے جھک کر اس کے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔

"روشی بیٹے اٹھو۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ"۔ روشی نے کسمسا کر دوسری طرف چہرہ موڑ لیا۔

"روشی۔۔۔ اٹھو بیٹا۔۔۔ شاباش"۔ انہوں نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس"۔ وہ سیدھے ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

"ماما جی"۔ خالی ہاتھ اندر داخل ہوئی۔

"خان! آغو بی بی نے مجھے کہا تھا۔ روشی بی بی نے کھانا نہیں کھایا ہے"۔ ماما خاصی حیرانی سے سوالی ہوئی روشی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اوہ"۔ ان کیلئے یہ اطلاع اسی طرح تھی جیسے کسی کتاب کا دیباچہ پڑھ کر کتاب کے مضامین اور موضوع کا اندازہ ہو جائے۔ وہ بیٹی کے وجود میں اترتے ہوئے طوفان کے ایک ایک جھٹکے کو محسوس کرنے لگے۔

"روشی!" انہوں نے اس کا شانہ ہلایا۔

"جاؤ ماما۔۔۔ تم پہلے کھانا لے آؤ"۔ انہوں نے مختصراً ماما کو وہاں سے روانہ کیا۔

روشی شانہ ہلانے کے عمل سے بیدار ہو چکی تھی۔ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"السلام علیکم پاپا"۔ اس نے ادھر ادھر تکتے ہوئے دوپٹہ سنبھالا۔

"وعلیکم السلام۔ کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"بھوک نہیں تھی"۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

"ماما کھانا لا رہی ہے۔ تم جیولری اتار کر منہ ہاتھ دھولو۔ ایزی ہو جاؤ۔ شاباش"۔

وہ سامنے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگے۔

"مجھے بھوک نہیں ہے پاپا!" اس نے ہاتھ پھیر کر ٹیکا کھولا پھر اتار کر اپنے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر بھاری بھاری جھمکیاں اتاریں اور اس کے بعد گلے میں پڑے ہوئے تینوں چاروں۔ نیکلس اور ہار۔ اور پھر تمام زیورات اٹھا کر ایک جگہ ڈھیر کر دیئے اور باتھ روم میں چلی گئی۔ خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا۔ یاور علی خان کی موجودگی کے احساس ہی سے اس کے اعصاب پرسکون ہو گئے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں برش چلا کر باہر آئی تو ماما ٹرالی سمیت منتظر تھی۔

"پاپا! میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت کھانا کھانے کو"۔ وہ دراصل اسے تو اپنا مسئلہ حل کرنے کی جلدی تھی۔

"تھوڑا سا کھا لو بیٹے۔ بھوکا سونا اچھی بات نہیں ہوتی"۔ یاور علی خان نے اسے سمجھایا۔

روشی کو جانے کیوں آج وہ بہت زیادہ شفیق محسوس ہو رہے تھے۔

اس نے بادل نخواستہ ٹرالی اپنی جانب کھسکائی۔ اور ایک پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سلاد لے کر کھانے لگی۔

"میں نے ایک پروگرام بنایا ہے۔ امید ہے تم سن کر خوش ہو گی"۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے پشت لگا کر اسے دیکھا۔

چمچ روشی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے واپس رکھ دیا۔ وہ باپ کی شکل دیکھنے لگی۔

"جلدی سے سنا دیجئے پاپا۔ سچ تو یہ ہے میری زندگی میں خوشیاں ہیں کب"۔ وہ ایک دم بے صبری ہو گئی۔

یاور علی خان کا چہرہ جیسے دکھ کے دھندلکے میں ڈوبنے لگا۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کی بیٹی سارا دکھ جانتی ہے۔

"ہم کراچی جا رہے ہیں"۔ انہوں نے آگے جھک کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

"ہم؟" وہ چونک پڑی۔

"ہاں۔۔۔ میں اور تم"۔ ان کے انداز میں بلا کا سکون تھا۔

"صرف؟" اسے جیسے یقین نہ آیا۔

"صرف"۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"تائی کے ہاں؟" اس نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں"۔ انہوں نے نظریں چرا کر دھواں خارج کیا۔

اور روشی کو اپنی وہ رات والی گفتگو اور "فرمائش" یاد آگئی۔ وہ متفکر سی ہو کر انہیں چوری چوری دیکھنے لگی۔

اس کا خیال تھا کہ اب تو جب بھی پاپا سے سامنا ہو گا۔ پہلی فرصت میں سخت سست سننے کو ملے گی مگر توقع کے برعکس ہو رہا تھا۔ شاید پاپا اپنی عادت کے مطابق برداشت سے کام لے رہے تھے۔ ضبط تو ویسا ہے۔ پاپا بس۔ کاش میں تھوڑی سی ان پر چلی جاتی۔ اس نے گویا خود ہی اپنی کمزوری کا اعتراف کیا اور مستحسن نظروں سے یاور علی خان کو دیکھنے لگی۔

"مجھے پاپا سے فوری سوری کر لینا چاہیے۔ یقیناً پاپا خوش ہوں گے"۔

"آئی ایم ساری پاپا فار ورڈز ریکلیس۔ بٹ آئی واز چل"۔ اس نے کہہ کر جلدی سے چمچ منہ میں رکھ لیا۔

"کس سلسلے میں سوری ہو رہا ہے؟" وہ قطعی نہیں سمجھے۔

"وہ میں نے آپ سے کہہ دیا تھا ناں کہ میں ماں کو مس کرتی ہوں"۔ اس نے چمچے میں چاول بھر کر منہ کی طرف لے جاتے ہوئے شرمسار لہجے میں کہا۔

"اوہ"۔ وہ جیسے کچھ یاد کر کے مسکرا دیئے۔ "ڈونٹ مائنڈ بیٹا"۔

"ڈونٹ مائنڈ؟" اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"اچھا۔ ہم بات کر رہے تھے کراچی کے پروگرام پر۔ تم تیاری رکھنا۔ میرا شیڈول پہلے تمہیں بری پور لے جائے گا۔ پھر ہم وہاں

سے کراچی کیلئے روانہ ہوں گے۔ مگر ایک بات"۔

وہ محبت کے انداز میں انگلی اٹھا کر بولے۔

"کہئے پاپا"۔ اس کے خوش ہونے کے عمل میں کوئی کمی سی پڑی۔

"یہاں کسی کو اپنے کراچی کے پروگرام کے بارے میں نہ بتانا۔ بھنک نہ پڑے کسی کو"۔

"بابا صاحب کو بھی نہیں"۔ اس نے بے تابی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"انہیں بھی نہیں۔ اگر یہاں کسی کو پتہ چل گیا تو میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکوں گا"۔ انہوں نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

"کیا آپ ڈرتے ہیں ان سب سے آپ تو "ان ڈیپنڈنٹ" ہیں؟" اسے جیسے باپ کا ڈرنا پسند نہیں آیا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جب ہماری بغیر عقل کے ہوتی ہے تو وبال جان بن جاتی ہے۔ جب عقل کے ساتھ ہوتی ہے تو کسی نتیجے کی بنیاد بن جاتی ہے"۔ وہ بہت تدبر سے سمجھا رہے تھے۔

روشی نے بہت محبت اور ستائش سے باپ کی طرف دیکھا۔

"بے موقع کام کرنے سے انسان تماشا بن جاتا ہے اور ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا۔ جب رسی موٹی ہو اور اوزار کند تو آہستہ آہستہ کٹتی ہے۔ نہ ایک وار میں نہ ایک جھٹکے سے۔ تم جو کچھ آج کرنے جا رہی تھیں۔ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوتا بلکہ میرے حصے میں ایک عظیم دکھ کا اور اضافہ ہو جاتا"۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے من چاہے موضوع کی طرف آئے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا اب اس کی گفتگو کا رخ آج کے واقعے کی طرف مڑ جائے گا۔

روشی کا دل سینے میں تیز تیز دھڑکنے لگا۔ بہر حال وہ ایک مخصوص ماحول کی پروردہ تھی۔ باپ کے سامنے وہ اپنی شادی کا تذکرہ ایک نئی بات تھی۔

"مگر پاپا...... وہ"۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو تو کچھ نہیں ہو گا"۔ انہوں نے نیا سگریٹ نکالا۔

روشی تو جیسے ریشم جیسی ہو گئی۔ "ٹھیک پاپا"۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

انہوں نے روشی کے خوشی سے جگمگاتے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اور سگریٹ سلگانے لگے۔

"کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" انہوں نے خاصے تردد سے سوال کیا۔

"کوئی وجہ نہیں"۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

"کیا تمہیں کوئی پسند ہے؟" انہوں نے جھکی جھکی نظروں سے نیا سوال کیا۔

روشی کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے لگا۔ کیا آج پاپا سارے شکووں کا حساب باق کر دیں گے؟ اس کا دل چاہا وہ زور سے اعلان کر دے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

سے خاص رعایت حاصل رہی کہ تم کو جینا چاہا وہ جی لی کی

"احمر بیٹے۔ ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا تمہیں میری طرف سے ... میں ہمیشہ خواتین کے حقوق پر خطاب کرتا ہوں۔ مگر ہمارا ایک اسٹینڈرڈ ہے۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے مقام اور حیثیت کو مدِ نظر رکھ لینا۔ تم اس ملک کے ان لوگوں کے طبقوں میں شمار ہوتی ہو۔ کیونکہ تم سماجی اور سیاسی طور پر بھی اسٹرانگ ہو۔ ہم جاگیردار لوگ ہیں۔ سرکاری عہدے بھی کلاس ان لیول کے قبول کرتے ہیں۔ اس رشتے میں تمہارا انتخاب کلاس ان لیول کا ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں تم مجھ سے کسی طرح کی مدد اور تعاون کی امید نہ رکھنا"۔

انہوں نے مگر اس کے ارد گرد پیچھے کی طرف لے کر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ روشی کا جگمگاتا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

"پاپا انسان کی ذاتی قابلیت اور اہلیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے"۔ وہ دوبارہ دھیمے انداز میں مخاطب تھی۔

"ٹھیک۔ مگر انسان کی اسٹرانگ پوزیشن تب ہی بنتی ہے جب اس کے باپ دادا کا ایک گریڈ وہ بھی اچھا ہو"۔

انہوں نے اپنے مخصوص مدبرانہ انداز میں جواب دیا۔

"اگر کسی کوئی کے باپ دادا ہی کا پتہ نہ ہو"۔ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"نان سینس"۔ وہ مدبر سے مسکرائے۔ "سلی گرل"۔ انہوں نے راکھ جھاڑی۔

"یعنی؟" وہ واقعی کچھ بھی نہیں۔

"یعنی یہ کہ ایسا شخص ہماری جاگیر میں۔ صرف ہمارے ملازمین کی لائن میں کھڑا ہو سکتا ہے"۔

"چاہے وہ کتنا ہی قابل اور لائق کیوں نہ ہو؟"

"بیوقوف لڑکی۔ یہ ہماری اسٹیٹس مجبوری ہے"۔ انہوں نے قدرے الجھ کر بیٹی کے چہرے پر نظر ڈالی۔

"جو تمہارے دل میں ہے کہہ دو۔ میں ہمیشہ کیلئے تمہیں کسی نتیجے پر پہنچا سکتا ہوں"۔

اس بار ان کا لہجہ خاصا سرد اور پرتکلف تھا۔ جیسے وہ کسی انہونی کیلئے پیش بندی کر رہے ہوں۔

"میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی آ جاتے ہیں نا ذہن میں بے تکے سوال کچھ"۔

وہ ایک کباب اٹھا کر کھانے لگی۔ اور چہرے پر بڑی فکر سے بے نیازی طاری کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ناؤ آر یو ریلیکس؟" انہوں نے بیٹی کو بہت محبت سے دیکھا۔

"یس"۔ اس نے گم صم انداز میں جواب دیا۔

"جو کچھ ہوا ہے اب یہ میرا "ہیڈیک" ہے تمہارا نہیں"۔

"تھینکس اے لوٹ ڈیئر پاپا"۔ روشی فی الحال اس تازہ ترین پیدا شدہ مسئلے کے حل پر بڑی خوش تھی۔

"مگر اس کا اظہار بھی نہیں کرنا"۔ انہوں نے تاکید کی۔

"ڈونٹ کیئر پاپا"۔

"دیکھو... فلاسک میں کافی ہے۔ ایک کپ کافی بناؤ۔ کھانا کھا لیا ہے؟" انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فلاسک کی

طرف اشارہ کیا۔

"تھی میں کہاں بچی"۔

"سوئیں نہیں لوگی؟"

"نہیں سوا نہیں ہے۔ پیٹ بھر کر کھاؤں گی تو ڈراؤنے خواب آئیں گے۔ رات بھی تو خاصی ہو چکی ہے"۔ وہ ہنس رہی تھی۔

"اب انشاء اللہ ڈراؤنے خواب نہیں آئیں گے"۔ وہ مسکرائے۔

روشی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ جب اندر شاپ میں لپٹی ہوئی خوشی ملی تھی۔

"ہم کراچی کتنے دن رکیں گے پاپا؟" وہ کافی دبانے لگی۔

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔ چار پانچ سوٹ رکھ لینا۔ بہت ہوں گے"۔ انھوں نے کہا۔

"پھر میں وہاں آپ کے ساتھ شاپنگ بھی تو کروں گی"۔ اس نے کپ یاور علی خان کو تھمایا۔

"شیو — تم کافی نہیں لوگی؟"

"نہیں — پھر نیند نہیں آئے گی۔ آپ کو کافی پی کر نیند آ جاتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نیند؟" یاور علی خان نے اپنی سرخ آنکھیں ایک لمحے کو اس پر مرکوز کیں۔

"آپ کی آنکھوں سے تو لگتا ہے آپ سوتے ہی نہیں ہیں۔ پاپا آپ آئی اسپیشلسٹ کنسلٹ کیوں نہیں کرتے۔ آپ کی آئیز ریڈ کیوں رہتی ہیں؟" وہ معصومیت سے ان سے پوچھ رہی تھی۔

"اچھا"۔ وہ مسکرائے۔ "مجھے کبھی دھیان ہی نہیں آیا۔ اب تم نے توجہ دلائی ہے تو ضرور کروں گا"۔

"جی — آپ کا دھیان رکھنے والا بھی تو کوئی نہیں ہے۔ ممی ہوتیں تو کم از کم"۔

اسے جانے کیا یاد آ گیا۔ ایک دم سے شرمندہ سی ہو کر چپ ہو گئی۔

"ممی نہیں ہیں تو کیا ہوا میں تو ہوں"۔ انھوں نے ایک اڑتی اڑتی سی نظر، بیٹی کی جانب ڈالتے ہوئے بہت گم صم سے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ کیا میں آپ کے ساتھ بری پور جاؤں گی؟" وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"نہیں — میں تمھیں بلواؤں گا"۔

"گڈ نائٹ پاپا"۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنی جیولری سمیٹتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"گڈ نائٹ گڑیا"۔ وہ آہستگی سے بولے۔

وہ نہ جانے کس دھن میں تھی۔ ایک دم شرارے میں الجھ کر گرتے گرتے بچی۔

"کیا مصیبت ہے حاصل نہ وصول کچھ، اتنی چوٹ ہی لگ جاتی"۔ وہ دیوار تھام کر بڑبڑائی۔

"خود سے باتیں شروع کر دی ہیں۔ کیا باتیں کرنے والے معذرت کر چکے ہیں"۔

اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ارل ایک برساتی کوٹ ہاتھ سے جھاڑتے ہوئے زینے کی طرف جا رہا تھا۔

"تمہارا مطلب؟" وہ چیخ کر مڑ کر بولی۔

"ارے آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ رات کے بارہ بج رہے ہیں آج حکیم صاحب"۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"اپنے روم سے گیسٹ روم تک کوئی وقت آ گیا ہے"۔ وہ اسی بات سے شرارت سے کہتے ہوئے مخصوص انداز میں طنز سے بولی تھی۔

یاور نے سمجھتے ہوئے خاصی حیرانی سے اس کی سمت دیکھا۔

"اگر ممی کی چار روم میں موجود افراد میں سے کسی کی تحقیق سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملتی تو میں آپ ہی پی ایچ ڈی کر لیتی"۔ اس نے برساتی کوٹ کا ٹانکا سے پرے رکھ کر قدم بڑھا دیا۔

"طنز؟" وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"یہ طنز کیا۔ تم؟"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بڑا عجیب سوال ہے۔ بیٹھ تو زمین پر یہاں وہاں لگنے کے چانسز ہوتے ہیں۔ اوپر جا کر چھلانگ تو مار نہیں سکتا"۔

وہ مدھم سے ہنس دیا۔ "ظاہر ہے اپنے کمرے میں ہی جا رہا ہوں"۔

"میں نے آج تک تمہارا کمرا اندر سے دیکھا ہی نہیں۔ عجیب ہے"۔ وہ واقعی حیران تھی۔

"کبھی ان میں تشریف لائیے گا، وارے ہاں"۔ وہ زینے چڑھنے لگا۔

"وہ بھی چال ہے تمہاری بہت اچھا لگا تھا"۔

وہ پلٹ کر رک گیا اور گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ "کون سا گانا؟"

"وہی جو باغ میں تم گا رہے تھے اور میں مرتبہ سن رہی تھی کہ حکیم بھائی آ گئے تھے"۔ وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔ اسے شرمندہ کرکے کوئی ادا یہ تماشا پوری کر رہی ہو۔

"ابھی تو سب ہی کو اچھی لگتی ہے۔ دل چاہ رہا ہے تو مجھ سے کیسٹ لے کر سن لیجئے گا۔ مجھے اس کے اشعار یاد نہیں رہتے۔ اس کی طرز اور آواز اچھی ہے۔ اس لئے اچھا لگتا ہے"۔ وہ بے نیازی سے جواب دے کر تیزی سے زینے چڑھ گیا۔

"ہونہہ۔ اشعار یاد نہیں رہتے۔ بہت ہی پوز کرتا ہے۔ اتنی دفعہ تو سنا ہے کوئی بہرا بھی اتنی مرتبہ سنتا تو اسے بھی یاد ہو جاتے۔ پتا نہیں اسے گھمنڈ کس بات پر ہے"۔ وہ جھلاتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"بھابی — کہاں ہیں آپ؟" وہ کچن کے دروازے پر ایستادہ تھا۔

بانو بڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن کے دروازے پر اس کا وجود پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دم ہی سامنے آ گیا تھا۔ وہ قطعی اس کے پیچھے پیچھے ہو رہی تھی۔

ناگواری کا احساس دلاتی چند شکنیں اس کی پیشانی پر نمودار ہو گئی تھیں۔ بھلا اس طرح ایک دم سامنے آ جانے کی کیا

سکتی تھی؟ اتنا تو جانتا تو دکھائی نہیں دیتا۔ اس نے دوپٹہ کھینچ کر سر پر ڈال لیا۔

"فرمائیے"۔ اس کے لہجے میں خود بخود تلخی آگئی۔

"ہماری آنکھیں بند ہیں بھائی اس طور پر عورتوں پر نظر ڈالنا تو ہم نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اپنے عشق کی مست تو ہم فاتحہ پڑھ چکے ہیں۔ سردی بہت لگ رہی ہے۔ شاید بخار تیز ہو گیا ہے۔ ایک کمبل اوڑھے ہیں۔ مگر یہاں سے دوسرے اور دوسرے کو ہم آواز دے نہیں سکتے۔ اس لیے ہمت کر کے خود کھینچتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔

لاؤ نا آپ ختم کر ہوں گے

آپ کی شکل بڑی پیاری ہے

وہ بڑبڑانے کے انداز میں شعر پڑھتے ہوئے واپس پلٹ رہا تھا۔

بانو کا دھیان کہیں اور تھا اس کی سمجھ میں شعر کیا خاک آتا۔ اس کی حساس طبیعت تو جیسے یونہی تڑپ گئی تھی کہ اسے سخت بخار کی وجہ سے سردی لگ رہی ہے۔

وہ تیزی سے اسٹور کی طرف گئی تھی۔

اور لال خان کا لایا ہوا نیا ان یو ایس اے کم کا بلینکٹ لے کر اس کمرے میں چلی آئی جہاں عارف کا قیام تھا۔

"عارف بھائی ایک کمبل"۔ اس نے دور ہی سے اسے متوجہ کیا۔

"شکریہ بھائی"۔ وہ بے دم انداز میں اپنے بیڈ پر گرا پڑا تھا اور تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ بانو کھڑی دیکھتی رہی۔ اس نے دیکھا، عارف میں تو پہلے سے موجود کمبل اٹھانے کی سکت نہیں۔ بانو خود آگے بڑھی۔ عارف کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے آہستگی سے کمبل اس پر پھیلایا۔ پھر ساتھ لایا ہوا دوسرا کمبل بھی اس پر ڈال دیا۔ اور سیدھی کھڑی ہو کر اس کی اگلی بات کا انتظار کرنے لگی۔

"بھائی۔۔۔ لال خان سے کہنا کل فرصت میں میری ماں کو اطلاع کر دے کہ میں آپ کے ہاں۔۔۔ زندگی کی سانسیں پوری کر رہا ہوں۔ ملنا چاہے تو آ کر مل جائے"۔ اس کی آواز بہت دھیمی اور کمزور تھی۔

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں عارف بھائی؟ آپ انشاء اللہ اچھے ہو جائیے گے"۔ وہ چھوٹے سے دل کی لڑکی کانپ کر رہ گئی۔

کم نہیں نازش ہمنامی چشم خوباں

تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

اور بھائی وہ جو آگے کہا ہے چچا غالب نے کہ۔۔۔

درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

وہ کھانسنے لگا۔ بانو حیران پریشان سی کھڑی تھی۔ "تو نشے کی طرح عادی ہے شعر پڑھنے کا۔ اس حالت میں بھی دماغ

اتنا چلتا ہے"۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"آپ کے لیے چائے لاؤں عارف بھائی؟" اس وقت اس کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز تھا۔

"نہیں بھائی۔۔۔ اس وقت تو ذرا سا اور اچھا حال ہے۔ کچھ کھانا پینا بھی محال ہے۔ اس کے لیے میں لال خان کا انتظار کر لیتا ہوں۔ شکریہ"۔

"آپ لیٹے لیٹے اللہ اللہ کرتے رہیں۔ دل کو سکون ملتا ہے"۔ اسے بروقت ہی اماں وصل بھائی دیا کرتے تھے یاد آئی کی ترکیب ہی دہرائے۔

کٹ رہی ہے کتنے بند عدم

بند وہ والا ہو جانا

"ہم تو وہ ہی شعر کہہ کر ہنس دیا"۔ "مگر۔۔۔ بھائی"۔

اب آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

"آپ کی عمر زیادہ تو نہیں"۔ بانو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

"مگر کوئی سال نہیں قوت حیات ہوتی ہے بھائی"۔ وہ اس کی سادہ لوحی پر مسکرا دیا۔

اس نے مصرعے سے اپنے مطلب کی بات اخذ کر لی تھی۔ اور بس۔۔۔ وہ درحقیقت اتنی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔

"میں آپ کے لیے کھچڑی دلیہ بنا لیتی ہوں۔ وہ پھر کھانا کھانے آئیں گے تو آپ ان کے ساتھ کھا لیجیے گا"۔ وہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"آپ کے وہ جب تک آئیں گے، میں پیاسا مر جاؤں گا۔ فرشتے آپس میں بحث کریں گے کہ صحرا میں بھٹک رہا ہے۔ حلق میں کانٹے دکھائی دے رہے ہیں"۔

"میں ابھی لاتی ہوں پانی"۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

کچن میں نل سے پانی لیتے ہوئے اسے دھیان آیا وہ تو اٹھ کر بیٹھنے کے بھی لائق نہیں۔ پانی کیسے پیئے گا؟ کیا وہ اسے سہارا دے کر اٹھائے گی؟ اسے جھرجھری آگئی۔ بالکل نہیں۔ یہ تو وہ کبھی نہیں کرے گی۔ شوہر کی غیر موجودگی میں کسی نامحرم کے اس قدر قریب جانا سراسر فتنہ ہے۔ لو اسے ایک دم دھیان آگیا۔ اس نے ایک چمچ ساتھ لیا۔ مسئلے کا حل سمجھ میں آتے ہی پرسکون ہو گئی تھی۔

وہ واپس عارف کے کمرے میں آئی اور چمچے میں پانی لے کر اسے متوجہ کیا۔

"عارف بھائی پانی"۔

"ہاں۔ خواب تو اچھا ہے۔ یوں بھی ساحلی شہر میں رہتا ہوں، پانی ادھر بہت ہے مگر حسرت میں تو اس وقت صحرا کروٹ لے رہا ہے"۔

"یا اللہ۔ اتنا کمزور ہونے پر اس قدر رونا ہے۔ حالت آگئی تو کیا عالم ہوگا"۔

"بچپن والی ہوں ساتھ۔ آپ آنکھیں بھی کھولیں اور دیکھیں"۔ وہ تڑپ رہی تھی۔

عارف نے تھیلی کی دوا سے پانی پلاتی رہی۔ وہ اس کی سمت دیکھنے کی بجائے چھت کی طرف دیکھ رہا۔

"ارے کیا بہت حالت خراب ہے"۔ پیچھے سے لال خان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

بالو کے ہاتھ سے گلاس فرش پر جا پڑا۔ یہاں وہاں کرچیاں بکھر گئیں۔

"کیا میں دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ کھلا ہوا تھا؟" دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ اور شیشے کے ٹکڑے اٹھانے لگی۔ مگر جانے کیوں نظریں اٹھا کر لال خان کی سمت نہ دیکھ سکی۔

"کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے دھیان میں ہو تو اچانک آواز سے چونک پڑتا ہے۔ میں تو اس لئے [illegible] پاؤں واپس آیا تھا کہ کہیں میرا یار پیاسا نہ مر جائے۔ یہ تمہاری بھابھی اسے تو بہت شرم آتی ہے۔ شکر ہے اس نے تمہیں پانی تو پوچھا۔ اب چلو اٹھو۔ ہسپتال میں داخلے کا بندوبست کر کے آیا ہوں۔ باہر گاڑی کھڑی ہے"۔

لال خان نے عارف کو بازوؤں میں اٹھا لیا۔ کرچیاں چنتی بالو نے سر اٹھایا نہ لال خان نے کوئی بات کی۔ نہ جانے اس کے ہاتھ کیوں اس کی جان کیوں نکل رہی تھی۔ بالکل ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

"دروازہ بند کر لو بالو"۔ لال خان کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

مگر بالو تو جیسے کسی پتھر کی طرح اپنی جگہ گڑ سی گئی تھی۔ حالانکہ اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی۔ مگر حالت چوروں جیسی ہو رہی تھی۔ کیا سوچتے ہوں گے۔ یہ ویسے تو سامنے نہیں آتی اور جب میں موجود نہیں ہوتا۔ کہیں انہیں کوئی برا خیال نہ آ جائے۔ حالانکہ وہ بیچارہ دو دن میں نہ تیرہ میں۔ آج بھی برا گزرا دوسرا دن۔

مگر لال خان کو اس طرح بیمار دوست کو گھر میں کیا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ اب تک اپنے مرد سے بھی کم بات نہیں کر پاتی تھی۔ مگر اس کے دوست کو پانی پلا رہی تھی۔

وہ کم عمر تھی۔ بے بنیاد وسوسے اس کے کچے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ وہ ساتھ والا آمنہ کا باپ اپنی عورت کو کس طرح طعنوں سے کھاتا ہے۔ وہ اپنے آنگن میں کام کرتی نہ تھی۔ جب بھی غصے میں ہوتا ہے کھڑے کھڑے غریب عورت کے اس میں "یار" گھوم جاتا ہے۔ اسے اس طرح کی باتوں سے بہت گھن آتی تھی۔ اور ایک مرد کا عورت پر کیچڑ اچھالنا تو اسے بہت کمزور لگتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ جب اس کی شادی ہوگی تو وہ ایسی عورت بنے گی۔ جس کی وفا پر اس کا شوہر حلف اٹھا سکتا ہو۔

کہیں یہی واقعہ کبھی کا طعنہ نہ بن جائے۔

بار بار ایک فلم ذہن کے پردے پر چل رہی تھی۔

وہ پانی پلا رہی تھی۔ پیچھے سے لال خان آ گیا تھا۔

"یار باری تم تو ٹھیک ہو گئے"۔ قارون نے اندر آتے ہی باری کو [illegible]۔ "جیسی [illegible]" [illegible]

"بھلا بھی کوئی بات ہوئی۔ ایک شخص باہر سے آیا۔ وہ اسے گھر کی ایک لڑکی پر ہاتھ صاف کیا اور چلتا بنا۔ گھر میں ہی تھا۔ رہتے تھے۔ صبر ہو سکتا تھا"۔ وہ ہنستے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اچھی تو ہوئی ہے۔ کوئی علاج تو نہیں ہوا۔ جا کر کہہ دو بابا صاحب سے"۔ باری کی کتاب کھلی رہ گئی تھی۔

"شریف آدمی [illegible] میں صرف اپنی بات تو نہیں کر رہا"۔ قارون ایک دم بھڑک اٹھا۔

"تو کیا ہوگیا [illegible] کریں گے [illegible]"

[illegible] وہ [illegible] کی جانب بڑھ گیا۔

"اس صاحب [illegible]" [illegible]

[illegible] بابا صاحب [illegible]" قارون [illegible]

[illegible]

"آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر [illegible]" [illegible] کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں اپنی مردانگی کی بڑی حفاظت کرتا ہوں۔ [illegible]"

[illegible] آپ [illegible]"۔

"[illegible] کراچی میں [illegible]"

"میں وہاں سے آ چکا تھا کیا کر سکتا ہوں"۔ باری [illegible]

"اچھا تو [illegible]" [illegible]

"آپ [illegible]" [illegible]

"[illegible]" [illegible]

[illegible] اس کی طرف۔ "[illegible]" قارون [illegible]

"پھر [illegible] کا مقصد؟"

"بابا صاحب [illegible] ایک [illegible]" [illegible]

"[illegible] ہوں"۔

"[illegible] آپ میں [illegible]"۔ اس نے بات کاٹی۔

"بابا صاحب کے فیصلوں کے بعد ہمارے ہاں [illegible] چلتی ہے۔ میرے بابا سوچ بھائی"۔ قارون نے [illegible] ہوئے کہا۔

"اب اتنا حکم ستاتے ہیں"۔ وہ وضاحت سے کہہ رہا تھا۔

"ہم سب اس کہانی پر حیران پریشان ہیں۔ اصل بات کا کھوج لگاؤ یار! کہیں لڑکی ماری نہ جائے۔ جواد اب بہت پریشان تھا۔ کہہ رہا تھا اس نے تصویریں بھی نہیں اتاری ہیں۔ کہہ رہا تھا ابھی نہیں کھایا اور جلدی سونے چلی گئی تھی۔"

"وہ بہت خوش ہیں۔ ادائے داری"۔ اس نے فاران کو بیچ میں ٹوک دیا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں"۔ اس نے فاران کو یقین دلایا۔

"پتہ نہیں یار کیا ٹھیک ہے کیا غلط۔ مجھے تو زال لق کی پارکنگ کہانی دے رہی ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں میں"۔

"یقین کرو۔ اگر تمہارے ساتھ بھی رہتی"۔

"مجھے میری اوقات میں رہنے دیں۔ فاران!" وہ شاید فاران سے مکمل بارگی سے مخاطب ہوا تھا۔ جب ہی فاران لاجواب ہو گیا تھا۔

"کیوں تمہاری اوقات کو کیا ہوا؟ Don,t be complexed! (احساس کمتری کا شکار نہ ہو)" فاران نے تعجب سے سوال کیا تھا اور نصیحت بھی کی تھی۔

باری ان سنی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "انٹرنیشنل لاء" کی بک نہیں مل رہی۔

"پہلے ڈومیسٹک لاء پر عبور حاصل کرو۔ جلد نہیں مار رہا ہوں"۔ فاران جھلایا۔

"یہ میرا شعبہ نہیں۔ آپ سب مجھے عقل دیں"۔ وہ اس بار جاتے جاتے مسکرا رہا تھا۔

"مگر تمہارا یہ دوغلا پن ہوا تو شک و شبہ سے بالاتر ہے"۔ فاران نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"مگر میرے اس دوغلا ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں "کانفیڈنس" ادھر سے ادھر نہیں کرتا"۔ بالآخر اس نے سنجیدگی سے تفصیلی جواب نہیں دیا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں حقیقت معلوم ہے؟" فاران اپنی جیت پر مسکرایا۔ باری خاموش رہا۔

"مجھے بتاؤ۔ کسی سے نہیں کہوں گا"۔ فاران شاید سب کی نمائندگی کر رہا تھا۔

"وہ راز ہی کیا جو دوسرے کو منتقل ہو جائے"۔ وہ مطلوبہ کتاب تلاش کر رہا تھا۔

"اہمیت جتا رہے ہو؟" فاران قدرے خفگی سے گویا ہوا۔

"آپ کسی کی زندگی یا کیریئر کی قیمت پر بھی مجبور کریں گے؟" وہ فاران کی طرف پلٹا اور اس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

فاران نظریں نہ اٹھا سکا۔ "ہرگز نہیں اب یوں بھی فائدہ نہیں ہے"۔

وہ اسٹڈی سے باہر چلا گیا۔ باری نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

"سب اپنی اپنی پریشانیوں کا اظہار کسی نہ کسی سے کر دیتے ہیں۔ ہم اگر کسی سے کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہ بے چاری "دیواریں" ہیں۔

"مگر قیمت تو ادا کرنی پڑتی ہے زیادہ ہو کیوں نہ ہو "دل" کی قیمت سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے ماتھے پر وہ داغ نہیں لگنے دیں گے۔ بلکہ کر رہے ہیں۔ زندگی اور کیریئر کی بات کر کے آپ خواہ مخواہ ہو گئے فاران صاحب۔ دل بھی کوئی معنی رکھتا ہے اس خاندان میں؟"

"شاید تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہاں اس حویلی میں"۔

"ہمیں پتہ ہے"۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"زندگی ایک الفت میں دیکھ کر آپ نے بات ہی سمیٹ دی۔ کیونکہ زندگی سے بھی زیادہ وہ ہے جو اس حویلی کے مکینوں کے شعور میں ہے۔"

"پتھر کی حویلی سے پتھر کی قبر تک یہاں پتھروں ہی کی اہمیت ہے"۔

اس نے کھوجتی نظروں سے باہر آ کر شیلف کے سب سے نچلے خانے سے مطلوبہ کتاب ڈھونڈ نکالی اور اپنے کمرے میں جانے کے خیال سے باہر نکلنے لگا۔

"یار۔۔۔ باری۔ جسٹ اے منٹ۔۔۔۔ ایک کانفیڈنس ہے"۔ وہ بہت پریشان سا اسٹڈی میں داخل ہوا تھا۔

"جی۔۔۔ اس جان ناتواں پر ایک بوجھ مزید"۔ وہ مسکرایا۔

"یار غضب ہی ہو گیا ہے"۔ اس نے اسٹڈی کا دروازہ بند کرتے ہوئے اگلا جملہ کہا۔

"پہلے بتاؤ تم نے کبھی کسی سے عشق کیا؟" وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

باری قدرے خفا۔۔۔ پھر مسکرا دیا۔ "عشق کرتے نہیں، عشق ہو جاتا ہے۔ "کرنا" کا لفظ اس صورت میں استعمال کرتے ہیں جب کوئی کام ارادے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس پوزیشن میں ارادہ دخل نہیں آتا"۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

"او ہو۔ میری سوچ کے مطابق تم تو واقعی تجربہ کار نکلے"۔ رحیم کچھ مطمئن ہوا۔

"کیا مطلب ہے؟" وہ قدرے الجھ گیا۔

"بات یہ ہے یار۔۔۔ وہ بھی الجھا ہی ہیں۔ ان کا نمبر دو بیٹا میرا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس کی ایک بہن ہے جسے میں بالکل دل کی سی سمجھتا ہوں"۔

"یہاں تو کوئی گنجائش ہی نہیں نکل رہی۔ گھر کی اکلوتی دختر نیک اختر کو تو آپ نے اپنی بہن بنا لیا"۔ اس نے بات کاٹ دی۔ "عادل کی بیٹی پیدا ہوئی تھی اس کا کیا خرچہ کیا ہے؟"

"یار اس کی کزن آئی ہوئی ہے۔ یار میں نے بطور شرارت ایک دو مرتبہ اسے گھور کر دیکھ لیا"۔

"او ہو مرتبہ اور وہ کچھ پیچھے اگر آسانی سے نظر آ جاتی ہے"۔ وہ ہنس دیا تھا۔

"اور۔۔۔ نہیں بھائی۔۔۔۔ وہ گھر میں ہی پڑی ہے۔ (وہ تو پیچھے ہی پڑ گئی ہے) اور کیا کہا ہے شاعر نے کہ

عاشق اپنا جان لیا ہے شاید ان نے میر نہیں
دیکھ کے مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

"یار آج یہ قصہ تھا ہے اگر میں نے اس سے بے وفائی کی تو وہ مجھ کو آگ لگا دے گی"۔

عدیم نے رخ ہادی کی جانب بدلا۔

"آپ اسے محض سب آپ کیلئے ہے"۔ وہ اس طرح سے گیا۔

"کچھ بھی نہیں ہادی صاحب۔ کچھ کر کے دیکھئے۔ یہ تو بہت بڑھ جائے گا۔ جب ذرا دیر کی ہے تو بولی رنگ کرے گی یہ۔"

عدیم بہت پریشان تھا۔

"کیا بھلا اس ہو اگر ایسے خاندانی لوگ ہیں تو آپ شادی کر لیجئے اس سے"۔ اس نے پرسکون چہرے سے اعصاب کے ساتھ مشورہ دیا۔

"اس سے شادی کرنے کا ارادہ ہوتا تو تمہارے پاس ڈسکس کرنے کیوں آتا؟" عدیم بھنا کر رہ گیا۔

"پھر محبت کیوں تھا؟" وہ ابھی بے تاب اور چھلکتی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے تھا۔

"یہ محض مٹی لیس کی عادت ہے آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی"۔ وہ لا تعلقی سے کہہ رہا تھا۔

ہادی کتاب ہاتھ میں تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ملال کی جھلک تھی۔

"عدیم خان ہو سکتا ہے آپ کو برا لگے۔ مگر ہم آپس میں ایک دوسرے سے مخلص رہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیے گا"۔ وہ رک گیا جیسے کسی تذبذب کا شکار ہو۔۔۔ یا۔۔۔ الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔

"لڑکیاں شیشہ ہوتی ہیں۔ اور محبت ان کی کمزوری۔ ان سے نہیں کھیلئے۔ یہ قول محمد ہے۔ محبت سے اڑ کیے"۔

"شیشے کو معمولی سی بھاپ بھی چھو جائے تو عکس دھندلا جاتا ہے۔ عدم اور آپ کا "صرف" ہوتا ہے۔ وہ ان کا "سب" ہوتا ہے"۔ اس نے عدیم کی طرف دیکھے بغیر قدم آگے بڑھائے۔

"تم کیسے دوست ہو؟ تم نے مجھے احساس جرم میں مبتلا کر دیا"۔ عدیم بے اختیار بول گیا تھا۔

"میں نے تو حقیقت کہی ہے۔ درحقیقت آپ کا ذاتی شعور ہے"۔ وہ بہت دھیمے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"مگر اس سے شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے اس سے محبت تو نہیں ہے"۔ وہ اٹھ کر ہادی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "اور بھلا یہ محبت کیا ہوتی ہے؟" وہ سچ میں احساس جرم میں مبتلا تھا اور شدت سے اس بات کا خواہشمند محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے اس اندرونی جنگ سے نجات دلا دے۔

خلیل جبران کہتا ہے "محبت خود کو پیش کرتی ہے۔ یہ اپنے سوا کچھ نہیں چاہتی۔ اور امرتا پریتم ایک جگہ لکھتی ہے "محبت ایک آگ ہے اور جدائی ہوا۔ آگ کم ہو گی تو ہوا اسے بجھا دے گی۔ آگ زیادہ ہو گی تو ہوا اسے اور بھڑکا دے گی۔ آپ ان سے دور ہیں۔ کچھ عرصہ انہیں نہ دیکھئے۔ اگر محبت ہوا تو آئیں تو ان سے شادی کر لیجئے۔ ورنہ بڑے انسانوں کی طرح اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معذرت کر لیجئے اور آئندہ کیلئے اس قسم کی شرارت سے توبہ کر لیجئے۔ مجھے اجازت"۔

"بڑی جلدی میں ہو"۔ عدیم خالص دماغی کیفیت میں تھا۔

"جی بس کچھ اسٹڈی کرنا ہے۔ پھر سہی۔ او کے"۔ وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ مبادا کوئی اور بات پیدا ہو جائے۔

"محبت خلیل جبران اور امرتا پریتم کے احساسات پر تو منتج نہیں۔ ہر انسان کے ذاتی تجربات بھی ہوتے ہیں۔ مسٹر

ہادی۔"

"ہاں ٹھیک۔ اب ہم اپنے ذاتی احساسات چھپانا چاہتے ہیں تو دوسروں کی کوئی بات دہراتے ہیں"۔ وہ ہنس رہے تھے۔ "اپنی حقیقت پانی سے کرتے ہیں"۔ "ہم کو یہ بتاتے ہیں وہ کیوں کر کے ہے ہم دوسروں سے ... ذاتی طور پہ کچھ اور ہوتی ہو"۔

عدیم کے سامنے ہادی آپ ہو کر کہتے تھے۔

"محبت اس قلمی پردے کا نام ہے جس کے مچھے پر اس سے کرب کی آنچ آتی ہے۔ کہیں اور بہت الفاظ میں بیان کرنے سے محروم کسی قیدی کی طرح سر پھوڑتا محسوس ہوتا ہے۔

محبت اس بچے کی طرح ہے جسے ہم نیند میں قربان کر کے پالتے ہیں۔

اور یہ کہ

محبت ٹھیک کر دی جائے تو سوکھتی ہے مگر مرتی نہیں ہوتی۔

ہاں ایسا کر سکتے ہیں۔ محبت کائنات کا سب سے خوبصورت انکشاف ہے۔

"یہ بھی کہہ سکتے ہیں دنیا میں جتنا بھی حسن نظر آتا ہے سب محبت کی تشریح ہے۔

وہ آنکھیں دبائے کر کے اپنے کمرے کی طرف مڑا اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"بات میں بات کرو" یوں بھی سب جلدی سوچ جاتے ہیں"۔ وہ ذرا سنبھل کر بول رہی تھی۔

"میں شادی کے دھیان میں تھا"۔ وہ کترا کر آگے بڑھ گیا۔

"تمہارا کمرہ ٹھیک کر دیا ہے"۔ وہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

"آپ دیکھیے۔ اس کی بے نیازی گہری نیند کی طرح تو نے کر لیں دے رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

انتہائی سادہ کمرہ تھا۔ لائٹ گرین اور وائٹ کے امتزاج کا منظر۔ فرنیچر وائٹ پالش کا۔ پردے لائٹ گرین بیڈ شیٹ وائٹ تو کچھ گرین۔ اور وائٹ پھول اور گرین زمین والا کارپٹ۔ ایک طرف شیلف کا ڈریس پر اسا گرین گلدان تھا جس میں تازہ پھول تھے۔

"ہم تمہارے کمرے میں آ کر تو کوئی جنت ہی محسوس ہو رہا ہے۔ اور تم ہی پر تم کو سلامی دینے کو جی چاہ رہا ہے"۔ وہ ہنسی۔

ہادی خاموش رہا اور بیٹھ سے پردے سرکانے لگا۔

"اتنے اہتمام سے بچے ہو انداز نہیں تھا"۔ وہ بیٹھ گیا ہوا۔

"گھر میں کہاں فرصت اہتمام کرنے کی۔ وہ تو پچھلے دنوں امی اپنا بیڈ روم سیٹ کرا رہے تھے۔ کوئی مہربانی والی رنگ کلر کی تھی۔ وہ اصل ان کا کمرہ بھی تو ویسا ہی ہے"۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بابا صاحب نے کوئی آبجیکشن نہیں کیا کہ کیوں یہ ٹرپ کر رہے ہو؟" اس نے ہاری کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"وہ مجھے غیر ضروری رعایت دیتے ہیں۔" وہ مسکرا کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"کیوں؟ تم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں؟" وہ اپنی مخصوص نخوت کے مظاہرے سے باز نہ آئی۔

"ابھی سے پوچھ لو گی؟"

"تم ان کے گھوڑوں پر بہت محنت کرتے ہو شاید اسی لیے۔ وہ اپنے اصطبل کو حویلی پر فوقیت دیتے ہیں۔ سارا اصل ہے۔" اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں تجزیہ کیا۔

"بالکل بجا بات ہو گی۔ آپ ان کی پوتی ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ بہتر جانتی ہیں۔" وہ ایک اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"طنز کر رہے ہو؟" وہ بھڑک گئی۔

"یہ جب ایسا سوال، یہ طاقت نہیں واللہ!" وہ پھر سے ہنس دیا۔

"تم برا کیوں نہیں مانتے؟" وہ چڑ گئی۔

"وہ کیسے مانتے ہیں؟" وہ پھر ہنس دیا۔

"کیا برا لگتا ہی نہیں ہے یا سینس نہیں ہے؟" وہ ہنوز کھڑی تھی۔

"شاید سینس نہیں ہے۔" اس نے نہایت آسانی سے اتفاق کر لیا۔

"تمہیں تو یہ بھی سینس نہیں ہے کہ کوئی کھڑا ہے تو اسے بیٹھنے کے لیے ہی کہہ دو۔" وہ بازو لپیٹ کر کھڑکی والی دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

"کمرہ بھی آپ کا ہے، گھر بھی آپ کا۔ جیسے چاہے استعمال کریں۔"

وہ پھر اسی سکون اور مسکراہٹ سے گویا ہوا۔

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری "انگیج منٹ" سے خوش نہیں ہو۔ خاصے بدلے ہوئے لگ رہے ہو؟" آخر اس نے کہہ دیا۔

"مائی گاڈ! یہ کیا آ گیا آپ کے ذہن میں؟ مجھے تو اس قدر اطمینان ہے آپ کی اس تبدیلی پر کہ آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ بلکہ میں تو اس بات پر الجھ گیا ہوں کہ بابا صاحب نے شادی کے بجائے یہ منگنی وگنی کا چکر کیوں ڈال دیا۔ سیدھے سیدھے شادی کر دیتے۔ جو کام ہر حال میں کرنا ہے اس میں دیر کیوں کی جائے۔ آپ کی اس تبدیلی کا بھروسا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ آپ موڈی اور۔۔۔۔"

"اور پاگل ہیں۔ بند کرو یہ تقریر۔ بڑے آئے وہاں سے میرے ہمدرد۔ شادی کر دیتے۔ شادی کر دیتے تو تاریخ سب کو اچھی طرح سے۔ میں تمہارے گلے میں تو نہیں لٹک رہی زبردستی۔ اپنی جان چھڑانے کی پڑی ہوئی ہے۔ کیا میں گلے پڑی ہوں؟ بچی ہوں؟ میں تو اپنی جان چھڑانے کو تمہیں استعمال کر رہی تھی۔ تمہارا تو کام ہی یہ ہے کہ حویلی والوں کے کام آؤ۔ تم

کس برتے کی ہو۔ تم شاید یہ سمجھنے لگے کہ میں تمہارے عشق میں مری جا رہی ہوں۔ سراسر غلط۔"

وہ اسی طرح مشتعل ہو گئی تھی۔ ہاری اسی طرح پرسکون انداز میں اپنا اخبار رول کر رہا تھا۔

"خالی پڑھ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ تم ہو کیا؟ میں نے تمہیں اہمیت دی۔ اس لیے کہ میں احمق ہوں۔ تم جانے کن ہواؤں میں اڑنے لگے۔ میں نے تو صرف یہ سوچا تھا تم استعمال ہونے والی شے ہو۔ تمہیں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ وہ دم لینے کو رک گئی۔

ہاری نے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل سے جگ اٹھا کر گلاس بھرا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ سوچ رہی ہوں گی کہ جواب میں بھی کچھ کہوں گا۔ اس لیے آپ کو بتا دوں کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ آپ کا قیمتی وقت ضائع نہ ہو، اس لیے وضاحت کر دی ہے۔ آپ اطمینان سے کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتی ہیں۔ اگر میں نے آپ کو جواب کیا نہ بھی دیا تو آپ سے سوری کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کروں گا۔"

"فضول۔ یو۔ آئی ہیٹ یو۔ آئی رئیلی ہیٹ یو۔ ورسٹ ہیٹ یو۔"

اس نے ہاری کے ہاتھ سے گلاس لے کر کارپٹ پر دے مارا۔ اور خود بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ہاری نے آگے بڑھ کر دروازہ ٹھیک طرح سے بند کیا۔ اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر دوبارہ اخبار کھول کر نظریں ڈالنے لگا۔ ایک آدھ منٹ بعد ایک اچٹتی سی نظر روتی ہوئی رشی پر بھی ڈال لیتا۔ پھر دوبارہ نظریں اخبار پر دوڑانے لگتا۔

آخر پانچ منٹ بعد اس کی سسکیاں ختم ہو گئیں۔ اس نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں اور ہاری کی طرف دیکھا۔ جس نے اسی لمحے ہاری کی نگاہیں بھی اس کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ بہت خونی انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہاری نے بہت آہستگی سے اپنی نظروں کا رخ دوبارہ اخبار کی طرف موڑ لیا تھا۔

"جی چاہ رہا ہے اخبار سمیت تمہیں آگ لگا دوں۔" وہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

ہاری اخبار رول کر کے ٹھوڑی کے نیچے ٹکا کر مسکراتے ہوئے دیکھنے لگا۔

"میری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہو گی۔ آپ شوق پورا کریں۔"

"ہونہہ!" وہ پاؤں پٹختی آگے بڑھی اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

ہاری اسی انداز میں بیٹھے جانے کس سوچ کے پاتال میں بھٹکنے لگا تھا۔

ہاری علی خان کو گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس نے تو ان کے جاتے ہی اپنا سوٹ کیس پیک کر لیا تھا۔ اس دن کے بعد سے اسے ہاری بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ماما نے خود ہی بتا دیا تھا کہ "سرائے" گیا ہوا ہے۔ ہونہہ سرائے میں چاچیں کون سے میلے لگتے

ہی آئے دن۔ اس نے سُن کر سر جھٹک دیا تھا۔ ایک تو کراچی جانے کا سن کر جو خوشی اس وجہ تھی کہ کسی نے شش و پنج میں
نہیں لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا پر لگا کر اڑ کر پہنچ جائے۔ وہ بڑی دیر سے باغ میں آئی تو جھولا جھول رہی تھی۔

تین روز سے طبیعت پر کچھ بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اندر سے جانے کتنی مرتبہ یہ آواز آئی تھی کہ اسے یہاں سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ کس طرح تاک کر اس نے باری کی روح پر تیر لگائے تھے۔ اور وہ کتنی خاموشی سے سنتا رہا۔ جواب کچھ کہہ دیتا تو شاید احساسات اسے شدید ہوتے۔

وہ جھولا جھولتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی۔

"بی بی! اسرار پور سے خان کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں آپ شام چھ بجے تک تیار رہیے گا۔ ان کا ڈرائیور آپ کو لینے آئے گا۔" کلثوم اسے کمرے پیغام دے رہی تھی۔

وہ چونک کر کلثوم کو دیکھنے لگی پھر ایک دم اچھل کر جھولے سے نیچے اتر آئی۔ اور اندر دوڑ گئی۔ پانچ تو بج چکے تھے۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ ضروری چیزیں سمیٹنے لگی۔ وقت بہت کم تھا۔ ابھی اپنی تمام کزنز کے سامنے وہ کیا کہنا تھا۔ ان سے یہ اتنی بڑی خبر چھپائے وہ اس کا پیٹ پھولنے لگا تھا۔ ظاہر ہے ان کے لیے یہ خبر تو کم ہی ہوتی کہ یاور علی خان نے پہلی بار بیٹی کو اپنے پاس بلوایا تھا۔

وہ کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں جا رہی تھی کہ بڑی امی آ گئیں۔

"کلثوم نے بتا دیا تھا تمہیں؟" وہ آتے ہی مخاطب ہوئیں۔

"جی بڑی امی!"

"اچھا تو تم تیاری کرو۔ شام بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ اندھیرا تو ویسے بھی ہو گیا ہے مگر اب کیا کریں۔ یاور ادھر جو کہہ رہے ہیں۔"

"حیرت ہے وہ تمہیں وہاں کیوں بلوا رہے ہیں۔ اور پھر وہاں تنہائی میں تمہارا دل کیسے لگے گا۔ خیر دل نہ لگے تو جلدی آ جانا۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں رکھ دوں تاکہ راستے میں کھا لینا۔"

"جی اچھا" وہ قلت بھرے انداز میں بولی۔

"اچھا چلو تم تیاری کرو۔" وہ بڑی گم صم سی نظر آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھ رہی تھیں۔

روشی ان کی پیٹھ ہوتے ہی جھپاک سے باتھ روم میں گھس گئی۔ دو منٹ میں کپڑے تبدیل کیے اور برش ہاتھ میں لیے دوڑتی ہوئی ہال کمرے میں آ گئی۔ جہاں وہ سب "حسب توفیق" ہاتھ پیر پھیلائے بچوں کا کوئی پروگرام دیکھ رہی تھیں۔

"ہیلو کزنز!" اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر چیخ ماری۔

وہ سب چونک پڑیں۔

"ارے آؤ بھئی۔ کہاں غائب ہو۔ کمروں سے نکل آنے کا نام تو کب کا ہو چکا۔" سمو نے پاؤں سمیٹے۔

"ہم اس لیے آئے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔" اس نے پھلجھڑی چھوڑی۔

"کیوں بھئی کیسے چھیتے؟" روبی کو بھی اسکرین سے نظریں ہٹانا پڑیں۔

"کراچی پور" اس نے خاصے اسٹائل کا مظاہرہ کیا۔

"کیا؟" وہ سب اپنے زاویے بدل کر متوجہ ہو گئیں۔

"پاپا کے ڈرائیور کے ساتھ۔" اس نے وضاحت کی۔

"بھائی، کیا ہو رہا ہے؟" کسی کو یقین نہ آیا۔

"یہ اچھا ہو رہا ہے۔" وہ کھلکھلائی۔

"پاپا نے بلوایا ہے۔" میری خوشی تو سب پھڑپھڑائی۔

"ظاہر ہے ان دنوں وہ تو خدا کے پاس بھی جا رہی ہیں۔" اس کی امنگ میں ترنگ تھی۔

"جانے کی کوشش تو کی تھی۔" معصومہ نے مقابل کے دروازے سے داخل ہو کر کہا۔

روشی نے آج اپنا اچھا موڈ ان کی خاطر خراب نہیں کیا۔ اور اندر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ سب اسے گھیر کر بیٹھ گئیں۔ پریس کانفرنس کا سماں بندھ گیا۔

سورج پیچھے کٹ سی گیا تھا۔ آنے کی خوشی میں کسی قسم کی ناگواری میں وزن نہیں تھا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یاور علی خان کسی کانفرنس میں گئے ہوئے تھے۔

حالانکہ ملازم نے بہت اچھے انداز میں گرمجوشی سے استقبال کیا تھا مگر اس پر جیسے اوس سی پڑ گئی تھی۔ وقت گزارنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ پہلے کچن میں آئی۔ وہاں موجود ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔

"کیا آپ کچن چیک کرتے ہیں؟" وہ خانساماں سے مخاطب ہوئی۔

"جی نہیں" وہ بے چارا حیران سا نظر آیا۔

"اچھا پھر تو تم بڑے ہی اعلیٰ قسم کے سرونٹ ہو۔ بڑا صاف ستھرا کچن ہے۔ برتن تو بہت خوبصورت ہیں۔ کیا پاپا لائے ہیں؟" اس نے دیوار گیر شیشے کی الماری میں لگے برتنوں کا جائزہ لیا۔

"جی مجھے علم نہیں۔ جب میں یہاں آیا تو یہ برتن پہلے سے موجود تھے۔"

"ہوں۔ بہت ہائی ہاؤس بہت شاندار ہیں میرے پاپا۔ ان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ہی بہت اچھی ہوتی ہے۔ میں تو خیر ٹھیک ٹھاک ہوں۔ مگر میری امی بہت حسین تھیں۔ سب سے اچھی بیوی بھی گھر بھر میں میرے پاپا کو ملی تھی۔" وہ ہنسی۔ "کیا ہیں ناں؟"

بے چارا خانساماں مؤدبانہ ہاتھ باندھے اس کے "ارشادات" سن رہا تھا۔

اسی دم فون کی گھنٹی بجی۔ وہ چپ ہو گئی۔

"فون کہاں ہے؟"

"اب کیا ہوں ہاں ۔۔۔ بس بس کریں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔" وہ ہنسی۔

"تم ایک دم سے بڑی بڑی سی محسوس ہونے لگی ہو۔ یہ انقلاب کیسا؟ کیا باری باقاعدگی سے ٹیوشن پڑھانے لگا ہے؟" ماہین ہنسی۔

"یا بھی بھلی باتیں کرتے کرتے آپ کیا کہہ لیں، پھاڑنے چلانے لگیں؟" اس نے منہ بنایا۔

"اچھا یہ بتاؤ ۔۔۔ ہیلو ۔۔۔ ہیلو ۔۔۔ ہیلو ۔۔۔" اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس نے ریسیور کو دیکھا، پھر آہستگی سے رکھ دیا اور گھوم کر دروازے کی طرف چلی۔ یاور علی خان بیڈ کے ساتھ کھڑے کوٹ اتار رہے تھے۔

"السلام علیکم پاپا!" وہ انہیں یوں اچانک سامنے پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹے! ایک ٹھیک ہو، کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی راستے میں؟" انہوں نے کوٹ روشی کی سمت بڑھایا اور وارڈ روب کی سمت اشارہ کیا۔

روشی نے سرخوشی بہار کی طرح اپنے وجود پر محسوس کی۔ روح کی ساری کثافت آناً فاناً مٹنے لگی۔

جن سے محبت ہوتی ہے، ان کی طرف سے محبت و اپنائیت کے ذرا ذرا سے مظاہرے ۔۔۔ بھی زندہ رہنے کی امنگ جگاتے ہیں۔ مقبول دعاؤں کا سا اثر رکھتے ہیں۔

اس نے باپ کے ہاتھ سے کوٹ اس طرح لیا، جیسے کوئی سوغات لے رہی ہو۔

اتنی پیاری مہک تھی، اس نے دل سے لگا لیا تھا۔ موتی اس کے رخساروں پر پھسل پڑے۔ اس نے وارڈ روب کا پٹ کھولا۔ ہینگر نکالا اور نہایت پیار سے کوٹ ہینگ کیا۔ اپنی آنکھیں سے جھاڑا، جیسے وہ کوئی بے جان کوٹ نہ ہو، زندہ وجود ہی ہوتا تھا۔

"کون سا پرفیوم لگاتے ہیں آپ پاپا؟" وہ ان کی طرف مڑی۔

"بہت سی باقاعدہ قسم کی عادتیں ہیں میری۔ بیس سال سے زائد عرصے سے یہ پرفیوم استعمال کر رہا ہوں۔ پہلے صرف انگلینڈ اور یورپ ہی میں ملتا تھا۔ اب تو یہاں بھی مل جاتا ہے۔ بلکہ اب تو کمپنی پوری کٹ دیتی ہے۔ ہاتھ سوپ، شیمپو، کلون، آفٹر شیو، شیونگ کریم، کیونکہ بہت سوفٹ پرفیوم ہے۔ اس لیے ان تمام چیزوں کو استعمال کرنے کے بعد ہی اس کی مہک واضح ہوتی ہے۔"

انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم اٹھا کر اس کی سمت بڑھایا۔ وہ ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی تفصیل سے جواب دے رہے تھے، جیسے اس نے کوئی بہت اہم اور ضروری سوال کیا ہو۔

"خالہ کا فون آیا تھا پاپا۔" اچانک اسے دھیان آیا کہ نہایت ضروری بات تو بھول ہی گئی۔

"اور تم نے پہلی فرصت میں انہیں بتا دیا ہوگا کہ ہم کراچی آ رہے ہیں؟" یاور علی خان ڈریسنگ روم کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئے۔

اس نے ذرا رک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ "تو مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا؟"

"ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں۔" انہوں نے اچٹتی نظروں سے جیسے اس کے چہرے سے خوف و اضطراب کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس لیے نرمی سے کہا اور ڈریسنگ روم کی سمت بڑھ گئے۔

اسے بہت اچھا لگا تھا۔ "سر! آج انہیں جاپان میں بیٹے نے دعوت دی تھی ۔۔۔" یہی محسوس ہوا جیسے کوئی انجکشن جیسی طرح روح میں داخل ہو گئی ہو۔

وہ جب سے بیڈ پر بیٹھ گئی اور یاور علی خان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

پندرہ منٹ بعد وہ باہر آ گئے اور روشی پر ایک سرسری نظر ڈالی۔

"کھانا کھا لیا تم نے؟"

"آپ کے بغیر کیسے کھاتے ۔۔۔ مگر آپ تو ڈنر کر کے آ گئے ہیں۔" وہ مایوس ہوئی۔

"ہاں بیٹا یہ آفیشل ڈنرز چلتے رہتے ہیں، ہو ہی جاتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"تم کھانا ضرور کھا لو۔ آج تو تمہارے لیے اسپیشل ڈشز بنائی ہیں۔ میں نے اس کو ہدایت کی تھی کہ میری بیٹی آ رہی ہے۔"

وہ اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر اسٹیٹمنٹس فولڈ کرنے لگے۔

"اسپیشل ڈش کا مزا تو آپ کے ساتھ آتا پاپا!" اس نے منہ بنایا۔

"اس طرح بھی ہو جاتا ہے بیٹے! ہر بات سوچ کے ساتھ نہیں ہوتی۔ سوچتے کچھ ہیں، ہو جاتا کچھ ہے۔" وہ اسے سمجھانے لگے۔

"کراچی کب جائیں گے؟" اس نے بیزاری سے پوچھا۔

"جلد جائیں گے، آپ کے نانا جان بہت بیمار ہیں، اس لیے جلدی ہی جانا چاہیے۔"

وہ اپنی جیبوں میں غالباً لائٹر تلاش کر رہے تھے۔

"آپ نے پوچھا ہی نہیں پاپا ۔۔۔ خالہ نے بتایا۔" روشی اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ جہاں اسے لائٹر رکھا نظر آ رہا تھا۔

"خالہ نے نہیں بتایا، تعجب ہے، پھر فون کیوں کیا تھا؟" وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔

"فون تو انہوں نے آپ کو کیا تھا۔ میں نے تو بس سن لیا تھا۔" اس نے لائٹر ان کی طرف بڑھایا۔

"ظاہر ہے، مجھے ہی کیا ہوگا۔ تمہاری موجودگی کی تو انہیں خبر نہیں ہوگی۔ حویلی فون کرتی ہیں؟" انہوں نے سگریٹ سلگایا۔ ان کی نظریں لائٹر کے شعلے پر مرکوز تھیں۔

"کہاں کرتی ہیں حویلی میں، انہیں بتا دیا ہو گا کہ پاپا کو فون کر دیتی ہیں، مجھے نہیں کرتیں۔" اس نے خالہ سے کیا ہوا شکوہ باپ کے سامنے دہرایا۔

یاور علی خان نے وائنڈ بند کرتے ہوئے اچٹتی سی نظر روشی پر ڈالی۔

"پھر کیا جواب دیا انہوں نے۔"

"کچھ نہیں۔ لائن ہی ڈسکنکٹ ہو گئی تھی۔" اس نے ذرا سا منہ بنایا۔

اسی دم فون کی گھنٹی بجی۔ اور یاور علی اپنی جگہ سے فوراً اٹھے۔

"جی۔۔۔ ہیلو۔۔۔!" انہوں نے ریسیور کان سے لگایا۔ پھر روشی کی سمت دیکھا۔

"حویلی سے فون ہے۔۔۔ ہاری ہے لائن پر۔"

انہوں نے ریسیور کان سے ہٹا کر روشی کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھی۔

"میرا فون ہے۔۔۔ اس وقت۔۔۔؟" وہ حیران ہوئی اور ریسیور یاور علی خان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ہوں۔۔۔ روشی۔۔۔ بات کر رہی ہوں۔۔۔ اتنی دیر تو نہیں ہوئی کہ وہاں سے آتے ہی مسئلے پیدا ہو گئے ہوں۔۔۔!"

"ارے آپ کو خبر نہیں، اب تو آپ بہت اہم ہو گئی ہیں۔ کراچی سے قیم صاحب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ نمبر دے دوں؟ کوئی ہرج تو نہیں؟" دوسری طرف سے ہاری بہت شوخ لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نان سینس!" اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر یاور علی خان کی سمت دیکھا۔

"مگر وہ بضد ہیں، حالانکہ میں نے تو یاور چچا کا ذرا ابھی دیا تھا مگر بھی بڑے بہادر قسم کے بندے ہیں۔" اس کا شوخ بدستور تھا۔

"تم کوئی میڈل دے دو انہیں بہادری کا، میرے کان مت کھاؤ۔" وہ برس پڑی۔

"آخر آپ کیا فیاضی ہیں، کچھ تو ان کے حقوق تسلیم کریں۔ یہ تو زیادتی ہے ناں؟" وہ ہنس رہا تھا۔

"کیپٹن مجھ سے لے لینا اور آئندہ اس موضوع پر مجھ سے بات مت کرنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔۔۔" وہ بھڑک اٹھی۔

"تو انہیں کیوں کیا؟" وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔ "وہ دس منٹ بعد پھر فون کریں گے۔"

"کہہ دینا روشی کے باپ سے بات کریں۔" اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اپنی تیز تیز سانسیں سنبھالتی وہ دوبارہ بستر تک آئی اور گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

یاور علی خان نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر بیٹی کا چہرہ ٹٹولا۔

"غصے سے انرجی ضائع ہوتی ہے، جو ہم نے نہیں کرنا، بس نہیں کرتا۔ پھر غصہ کر کے اپنا نقصان کیوں کریں۔ ٹیک اٹ ایزی مائی ڈیئر۔"

"پپا! میرے پاس بہت اچھے کپڑے نہیں ہیں۔۔۔ بس سوچ رہی ہوں۔۔۔ آکورڈ نہیں لگے گا وہاں۔۔۔!" اس نے جھٹ موضوع بدل دیا۔

"تو پھر کیا ہوا، کراچی سے لے لینا مگر ایک بات کا خیال رکھنا، اگر دادا جان کی طبیعت اچھی ہو تو شاپنگ کر لینا ورنہ کوئی ضرورت نہیں، ہم ان کی عیادت کرنے جا رہے ہیں۔"

"ارے پپا! اب سے میری امی کی وفات ہوئی ہے آپ دادا جان سے کتنی محبت کرتے ہیں؟" اس نے بہت معصوم انداز میں سوال کیا تھا۔

یاور علی خان جو جھک کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہے تھے، جواب دیے بنا انہوں نے سگریٹ مسل کر رکھ دی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹے! کھانا کھا لو۔ رات زیادہ ہو گئی تو کیا فائدہ۔ گیسٹ روم میں تمہارا قیام ہوگا۔"

"مگر پپا! میں گیسٹ تو نہیں ہوں۔" اسے دکھ سا ہوا۔

یاور علی خان مسکرائے۔ "آپ تو مالک ہو بیٹا۔ دراصل گیسٹ روم میں فی الحال سب سے زیادہ سہولیات ہیں۔ وہاں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوگی، وہاں بہت اچھا محسوس ہوگا۔" پھر انہوں نے سرہانے لگی بیل بجائی۔

فوراً ایک ملازم موجود تھا۔

"شیر دل! بی بی کے لیے کھانا لگاؤ۔"

روشی کی غیر ضروری سی طبیعت بوجھل سی ہو گئی۔ ایک تو اس کے سوال کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔ دوسرے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی موجودگی سے تنگ آ گئے ہوں۔۔۔ وہ بڑا سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"گڈ نائٹ پپا!" اس نے اتنی دھیمی آواز میں کہا جیسے نہایت مجبوری میں کہہ رہی ہو۔

"گڈ نائٹ۔۔۔!" یاور علی خان نے اس کے کمرے سے باہر نکلنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور نائٹ بلب جلا دیا۔

روشی نے آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور ڈائننگ ہال کی طرف مڑ گئی۔

شاید ماں۔۔۔ ماں بنتے ہی کوئی مرکزی طاقت حاصل کر لیتی ہے۔ ایک مقناطیسی طاقت۔۔۔ جو جہاں وہاں ہر طرف سے رشتوں کو کھینچتی ہوئی ایک ان دیکھے دائرے میں متحرک رکھتی ہے۔۔۔ ماں کی کمی سے بڑی کمی ہو جاتی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کچھ رکھ کر بھول گئے ہوں، یا یوں جیسے کوئی ضروری چیز گم ہو گئی ہو اور ذہن میں ہر آن اس کی تلاش جاری ہو، یا جیسے معمول کے سارے کام ہو گئے ہوں، اور سب سے ضروری کام ذہن سے نکل گیا ہو اور بہت دیر میں یاد آیا ہو۔ ایسی حالت کی سی کیفیت۔۔۔ ایسی نامکمل اور ادھوری سی زندگی اسے لگتی تھی۔

اس ادھورے پن کا احساس اسے ہمیشہ ہی رہا تھا۔ مگر لاشعور کے پاتال سے تب ہی باہر آتا تھا۔۔۔ جب کوئی دھچکا لگتا تھا۔

جیسے بوسیدہ چھت بارش میں ٹپکتی ہے تو اپنی ٹوٹ پھوٹ کا پتہ دیتی ہے۔ اس پر سے یہ شفیق انتظاب باری۔۔۔ کتنے عرصے آ رہے ہیں اسے۔۔۔ ملاقاتوں کی اچھی طرح۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے ناں کہ غصے کی ایک لہر کے ساتھ جانے کب کب کا دبا ہوا غصہ۔۔۔ اور غصے کی وجوہات سے سر سے ابل پڑتی ہیں۔

وہ ڈائننگ ہال پہنچ کر ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ میز پر کہنیاں ٹکائی ہوئی تھیں اور میز کی چکنی سطح پر اسے

اپنا گھر، اُلگ، چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"سب ہی ۔۔۔ یہ ایگ فرائیڈ رائس ۔۔۔ سر کہتے ہیں آپ بہت پسند کرتی ہیں۔" ملازم اسے متوجہ کر رہا تھا۔

وہ چونک پڑی۔ "پاپا! آپ مجھے پاگل کر دیں گے۔ بتائیے کس جگہ کس جہاں میں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے یہ ڈش پسند ہے۔ پھر آپ کو کیسے پتا چلا، زندگی میں کبھی ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا ۔۔۔ کوئی جن ہے آپ کے قابو میں۔"

وہ حیرت زدہ سی قدرے بھاری ہوئی کھانا کھانے میں درحقیقت مگن ہو چکی تھی۔

"روشی!"

ملازم کے بجائے یاور علی خان اسے پکار رہے تھے۔ انتہائی حیرت انگیز بات تھی۔ جب کہ ان کے بیڈروم سے گھر کا فاصلہ کافی تھا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پاپا، پلیز کم اِن" اس نے دوپٹا اٹھا کر شانوں پر پھیلایا۔

یاور علی خان اندر چلے آئے۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی۔ وہ آفس جانے والی حالت میں نہیں تھے بلکہ نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھے۔

اندر آ کر وہ بہت پُرسکون انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

وہ ان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

"اس وقت سوا سات بج رہے ہیں، گیارہ سے پہلے ہمیں ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔ تم ناشتا کر کے تیاری کر لو ہمیں ہر حالت میں دوپہر سے پہلے تک کراچی پہنچ جانا چاہیے۔ تمہارے نانا جان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

"ہیں!" ایک لمحے کو جیسے وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ "کیا پاپا؟"

"ہاں بیٹے!"

"خالہ کا فون آیا تھا؟" وہ اچانک صدمے کی کیفیت سے دوچار پست آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں، تمہارے ماموں نعمان احمد کا ۔۔۔ اچھا تم تیاری کرو، میں اتنی دیر میں ضابطے کی کارروائی سے نمٹتا ہوں۔"

(ان کا مطلب دفتری امور سے تھا۔)

وہ گنگ سی کیفیت میں ان کی صورت دیکھتی رہ گئی۔ پھر ایک دم چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رو دی۔

یاور علی خان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے وہ اس کے نزدیک چلے آئے۔

"روتے نہیں، یہ کیا بات ہوئی بھلا، بری بات۔"

"پاپا مجھے کسی موت پر رونا نہیں آ رہا، رونا تو اس بات پر آ رہا ہے کہ میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں دیکھا، نانا سے ملنے کی خوشی میں نیند بھی نہیں آتی تھی۔ اتنی بڑی خوشی کا خواب ہی کیوں دکھایا تھا اللہ میاں نے ۔۔۔ کیا ساری زندگی خوشیوں سے یونہی آ کر بچھڑی ہوتی رہے گی، اور پاپا خوشی تو بس وہی ہوتی ہے، جو دل چاہے پر مل جاتی ہے، مجھے دل چاہنے پر بھی کچھ

نہیں ملتا۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

یاور علی خان کی آنکھوں کی سرخی بے حد نمایاں ہو گئی۔ انہوں نے روشی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو روشی، ابھی تمہیں کیا خبر کتنی خوشیاں تمہاری منتظر ہیں۔"

"سب سے بڑی خوشی تو مل چکی ہے۔" اس نے باپ کی بات کاٹ دی اور انہیں دیکھنے لگی۔

"مگر آنے والی خوشی کی توقع قریب ہی آنے والے دکھ کا خوف بھی تو ہو سکتا ہے۔ پیش گوئی تو کسی کی بھی نہیں کی جا سکتی۔ اب اچھا سوچنا بھی اپنے اختیار میں ہے اور برا سوچنا بھی اپنے اختیار میں، تو اختیار مثبت انداز میں کیوں نہ استعمال کیا جائے، اچھائی کا پہلو سامنے رکھنے میں کوئی حرج تو نہیں؟"

وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

وہ بے اختیار کرب ہو گئی اور یاور علی خان فوراً ہی وہاں سے باہر نکل گئے۔ وہ کسی اور جانب سے روتی رہی۔

وہ بستر سے اتر کر وارڈروب کی سمت آئی۔ اس کا خیال تھا کراچی جانے میں کچھ دن لگیں گے اس لیے اسے کپڑے وارڈروب میں لٹکا رہے تھے۔ پٹ کھول کر وہ کپڑوں پر نظر ڈالنے لگی۔ کتنے اچھے اچھے کپڑے سلوائے تھے۔ اب یہ سوچ رہی تھی کہ موت کے ماحول میں کون سے کپڑے سلیکٹ کر جائے۔

"گھوگھر!" یاور علی خان چلتے چلتے رک گئے اور قریب موجود ملازم سے مخاطب ہوئے۔

"جی خان!" وہ بھاگ کر ان کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔

"ہم دیکھ رہے ہیں، وہ سامنے ایک لڑکی بہت دیر سے بچی مالی سے باتیں کر رہی ہے۔ ساتھ میں شاید مالی کا لڑکا ہے۔ کیا تم جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟" وہ ایک ٹک سامنے دیکھ رہے تھے۔

"خان! یہ نئی دلہن بیگم ہیں، روزانہ ادھر آتی ہیں، آپ نے شاید دھیان نہیں دیا۔"

"تمہارا مطلب ہے ظفری کی دلہن ۔۔۔ جھومر؟" وہ چونک پڑے۔

"جی خان!" گھوگھر مؤدبانہ بولا۔

یاور علی خان نے قدم آگے بڑھائے اور تیز تیز چلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے، جہاں جھومر باتیں کر رہی تھی۔

"لڑکی یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ وہیں سے گویا ہوئے۔

جھومر چونک کر کھڑی ہو گئی۔ "اسلام علیکم خان!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"وعلیکم ۔۔۔ ہم پوچھ رہے ہیں کیا کر رہی ہو؟" وہ بدستور وہیں سے پوچھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں خان! صبح صبح ادھر آ جاتی ہوں، اکیلے میں جی گھبراتا ہے۔" وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"تمہارے گھر میں کیا بیٹے تھکتے ہیں، رونق ہوتی ہے، عورتوں کو کیا مطلب رونق سے؟ ان کا کام تو یہ ہے کہ وہ گھر میں مصروفیت اختیار کریں، ملازموں سے ہنسی مذاق کا کیا مطلب ہے، تمہارا تو مرتبہ اور ہے، تمہیں تو اس کی خدمت سے فرصت

نہیں ملی چاہیے۔ تم اسے اکیلا چھوڑ کر ملازموں سے بھی محصول کرتی پھرتی ہو۔" وہ مطلب تک بولے۔

"وہ معذور ہے خان، میں تو معذور نہیں ہوں، انسان ہوں، قیدی بھی نہیں ہوں۔"

"گلاب خان! تم اپنے لڑکے کو لے کر یہاں سے جاؤ، اپنا کام کرو۔" انہوں نے مالی کو مخاطب کیا۔

وہ دونوں فوراً چلے گئے۔

"تم بھی جاؤ گھوکھر!" وہ گھوکھر کی سمت متوجہ ہوئے۔

گھوکھر بھی سر جھکا کر چل دیا۔

"ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم ---- قیدی نہیں ہو ---- قیدی نہیں ہو مگر ہماری بہو تو ہو ---- بڑا روپیہ پیسہ تمہارے باپ کو دیتے ہیں۔"

"تو پھر سے باپ سے کہیں وہ پتھری کے ساتھ نباہ کرے۔" چھومر نے تڑخ کر بات کاٹ دی۔

دلاور علی خان دم بخود اس کی شکل دیکھنے لگے۔ سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔

"کیا تم نہیں جانتیں، اگر ہم کسی کی زبان نکال کر تمہارے ہاتھ میں دے دیں گے۔ تمہاری اتنی ہمت۔"

"آپ ہزار روپے کے عوض مجھ سے حویلی میں کام کروا لیا کریں، میں ہر طرح کے کام کرنے کو تیار ہوں، مگر میں پتھری کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں اس کی نوکرانی بن کر اس کی خدمت کر سکتی ہوں مگر ایک بیوی کی طرح اس کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔" اس نے بڑے نڈر انداز میں دو ٹوک جواب دیا۔

"اسے نوکرانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم نے تمہارے باپ کے ساتھ سودا کیا ہے۔"

"کیا آپ صرف ظلم کے سودے کرتے ہیں؟" وہ بے خوف اور نڈر ہوتے ہوئے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟" وہ اسی طرح بپھرے ہوئے تھے۔

"آپ مجھے پتھری سے نجات دلا دیں اور اس عورت کے ساتھ اس کی کوٹھری میں قید کر دیں، جس کے رونے کی آوازیں مجھے رات کو سونے نہیں دیتیں۔"

دلاور علی خان چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔

"اتنی زبان درازی کا نتیجہ تم جانتی ہو؟ ہم تمہاری کھال میں بھس بھروا کر چوراہے میں لٹکا دیں گے۔" وہ دھاڑے۔

"ہر روز موت سے گزرتی ہوں، اب مجھے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔" وہ بڑی جرأت سے بولی تھی۔

"ہم آج ہی تیمور خان اور تمہارے باپ کو بلواتے ہیں۔" وہ بھاگ اٹھے تھے۔

"وہ سب آپ کے غلام ہیں، جو آپ کر سکتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔ کیوں انہیں زحمت دیں گے ---- جو فیصلہ کرنا ہے کر لیجیے، میں منتظر ہوں۔" چھومر جیسے اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔

"تمہیں کھانے کو اچھا ملتا ہے اس لیے آنکھوں پر چربی چڑھ گئی ہے مگر ہم یہ چربی اتار بھی سکتے ہیں، بہت برداشت کر رہے ہیں ہم۔"

"آپ ایک دفعہ بیٹے وہ ہے آپ کے کہنے کو۔" اس نے حقارت سے جواب دیا۔

"اور تم لڑکی! نہ ہوتیں تو تمہارا قصہ ہم اپنے ہاتھوں سے ختم کریں گے۔" وہ دھاڑے۔

"کرتے آپ مجھے انسان سمجھتے ہیں؟ کتنی حیرت کی بات ہے۔ حالانکہ آپ کے ملازم کی کرسی بھی مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہوگی۔" وہ استہزائیہ بولی۔

"تم چاہو تو تمہیں پڑھ کر خود کو کوئی انتہائی سمجھ گئی ہو۔ حالانکہ یہاں تمہاری حیثیت دیوار میں لگے کسی پتھر سے زیادہ نہیں۔" وہ دوبارہ بپھرے ہوئے تھے۔

"معلوم ہے مجھے۔" وہ منہ موڑ کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔

"آپ مجھے پتھری سے نجات دلا دیں، اور اس کے بدلے مجھے جس سزا کی جگہ دے لیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"وہ تمہارا سارا وبال ہے مگر حویلی کے وارثوں میں سے ہے تمہارے لیے کیا اعزاز کم ہے ---- گستاخ لڑکی!" وہ شعلے کی طرح بپھرے سانسوں میں کہہ رہے تھے۔

"ہم جیسی لوگ ہیں خان، اعزاز و انعام سے ہمیں کیا مطلب۔ یہ چیزیں تو تم سب والوں کو خوش کرتی ہیں۔ ہم اسے بکنے والے نہیں۔" وہ اپنی چادر سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"ہم تمہارا انتظام کرتے ہیں۔ خود کو کسی کی کمی نہیں اور مالکوں کے منہ کو بھی آتی ہو گی کسی غلام ہوتا ہے۔ غلام ---- اس کی اپنی مرضی، اپنی پسند، ناپسند کوئی نہیں ہوتی۔ مگر تم آداب غلامی سے واقف نہیں ہو، مگر فکر نہ کرو، ہم تمہیں یہ آداب سکھا دیں گے اور اس طرح کہ پھر کبھی بھول نہیں پاؤ گی۔ مگر تمہاری روح ہماری غلامی کرے گی۔"

وہ اپنی چھڑی اٹھاتے ہوئے حویلی کی طرف بڑھ گئے۔

چھومر الجھی ہوئی نظروں سے انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

جذبات چاہے ہوئے کے ہوں یا خوف کے، انتقام کے ہوں یا بغاوت کے، عشق کے ہوں یا نفرت کے، جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں تو حقیقتیں کھولتے ہوئے دھارے کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ وہ بے دم سی ہو کر گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔

دو دن وہ اسی میں رکی گئی تھی۔ دلبر لال خان اپنی سست چال کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔

سیاہ پینٹ، سفید قمیض اور بہت نفیس سے بیگ اور ہیں ملبوس عارف کو وہ حقیقت ایک نظر میں پہچان نہیں پائی تھی۔

اگرچہ اس کی کاملی کی سب سے بڑی دلیل بڑھی ہوئی شیو اسی طرح چہرے پر موجود تھی۔ ایک روز وہ پہلی دفعہ اس کے ساتھ شہر گیا تھا۔

"شکر ہے آج تو طبیعت بہت اچھی معلوم ہو رہی ہے اور بیج بھی اچھا لگ رہا ہے۔" کامل خان اس کو شانہ تھپتھپا رہا تھا۔

مجھے حادثوں نے سجا سجا کر بہت حسین بنا دیا
مرا دل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رچا ہوا

اس نے مسکرا کر اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ "ارے بھائی! آپ یہاں کہاں کھڑی رہ گئیں؟ آیئے تشریف رکھیے۔"

ہلکے گلابی شلوار قمیص اور سر پہ وائٹ کی شال پہنے بالو جھجکتی ہوئی اس کے بیڈ کے قریب رکھی چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔

"بالو! دیکھا چار دن اسپتال میں وقت پر کھانا، دوا اور آرام ملا تو شکل نکل آئی۔ اس کا ذہن جہاں کوئی نہیں، یہاں خوب ہے، پتا نہیں کس جنگ حرام کی خاطر مرد ہوا ہے، سارے مرد ایسے ہوتے ہیں۔ چار چھ کی لمبی ذرا سی کم عمری کی کام کی، آ گیا ایک ہی کو پینے جا رہا ہے، احمق کہیں کا۔"

لال خان نے مردوں کے خواص گنوا کر اسے حماقت کی سند سے نوازا۔

"بھائی! آپ چپ ہیں، مگر چپ رہتی ہیں، چپ لگتی ہیں، حال احوال بھی نہیں پوچھا؟"

اس نے مسکرا کر بالو کو سادہ اور گھبرایا ہوا چہرہ دیکھا۔

"وہ تو انہوں نے پوچھ لیا۔ ایک ہی بات ہے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"آپ کتنا پڑھے ہوئے ہیں؟" وہ جیسے مریض کا دل رکھنے کے خیال سے بات کرنے لگی۔

وہ چہرہ کتابی رہا سامنے
بڑی خوبصورت پڑھائی ہوئی

وہ ہنس دیا۔

بالو خوفزدہ ہو کر میاں کی طرف دیکھنے لگی (عجیب پاگل آدمی ہے)۔

"جیسے کسی کو کھانسی کی بیماری ہوتی ہے، کسی کو بارہ مہینے نزلہ رہتا ہے، اسے شعروں کی بیماری ہے، زندہ باد تم۔۔۔!"

لال خان نے دوست کی طرف سے صفائی پیش کی۔

بالو ذرا ریلیکس سی ہو گئی، جس کی وجہ سے برا ماننا پڑ رہا تھا۔ جب اسے ہی اعتراض نہیں تو بات ہی کچھ نہیں رہی۔

"تم بیٹھو، میں ذرا جوس لے کر آتا ہوں۔" لال خان نے سائیڈ سے فلاسک اٹھا کر بالو سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"آپ اپنا خیال رکھا کریں، عارف بھائی! آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بعض اوقات دو افراد کے درمیان خاموشی کسی کڑوے سچ، کسی سفید جھوٹ سے بھی زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ دل وحشت زدہ سا ہو جاتا ہے۔ اسی خوفناک خاموشی کا ٹوٹنا ایسا ہی ہوتا ہے، جیسے طوفان تھمنے کی خبر آ جائے۔ جسم و جاں سکون میں آ جائیں۔۔۔ نہ جانے کیوں اسے عارف سے اتنی گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے ہکلا کر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

"جتنا خیال رکھنا جائز ہے، اتنا تو اپنا خیال رکھتے ہیں اور سب ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں، اس کی نہیں پرواہ ہے نہ ضرورت۔

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا

تیری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے!

"آپ کی بڑی اماں ہے، اُن کے بہت سے ارمان ہوں گے۔" بالو نے شعر نظر انداز کر کے گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں، ماں کا دوسرا نام ارمان ہی ہے، اس کا دل کیا ہوتا ہے، ارمانوں بھرا صندوق ہوتا ہے۔ یہ اس دنیا کی سب سے بڑی ایک ہستی ہے، ساری زندگی محبت کے نام پر بلیک میل کرتی ہے۔"

"معاف کیجیے، یہ ماں کی شان میں گستاخی ہے۔ ماں صرف ارمان بھرے دل ہی کا نام نہیں، قربانی میں بھی کوئی اس کا جواب نہیں کر سکتا۔"

"میری ماں نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر اپنی مرضی سے میری شادی کی تھی۔ میں نے ماں کا دل رکھا تھا اور اپنے خواب رہن رکھ دیے تھے۔ وہ ہی خون آشام قسم کے مہاجن تھے وہ۔۔۔ اپنے قیمتی خواب رہن رکھ کر اس کے لیے خوشی ادھاری تھی۔ کس کی قربانی بڑی ہوئی بھائی؟" وہ مسکرانے لگا۔

"انہوں نے بھی آپ ہی کو خوش کرنا چاہا ہو گا۔" بالو اپنے موقف پر جمی ہوئی تھی۔

"ہاں، وہ بڑی سنہری روپہلی خوشی لائی تھیں وہ میرے لیے۔ میری منکوحہ کے ہاں نکاح کے ٹھیک پانچ مہینے بعد ایک صحت مند بچے کی ولادت ہوئی۔"

"پانچ مہینے بعد۔۔۔؟" بالو بے ساختہ بول پڑی، پھر ایک دم خجل سی ہو کر چپ ہو گئی۔

"جی ہاں، پانچ مہینے بعد ساڑھے آٹھ پونڈ کا بچہ قدرت نے مجھے اس کا دل خوش کرنے کی وجہ سے انعام میں دیا۔"

بالو کے ہونٹ اس طرح ایک دوسرے میں پیوست تھے، جیسے اب کبھی نہیں کھلیں گے۔

اگرچہ وہ ایک بیاہتا لڑکی تھی مگر مارے شرم کے وہ عارف سے کوئی سوال نہ کر پا رہی تھی۔

"آپ نے بہت سی لڑکیوں کے جہیز کی دھوم سنی ہوگی، ایسا جہیز بھی کسی کو نصیب ہوتا ہے، اب آپ پوچھنا چاہیں گی۔"

"یار! جوس ملا نہیں ہے، تو آیا ہوں۔" لال خان اپنی مخصوص تیز رفتاری کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

"یار جوس، چائے، کافی ہم سے پیتے نہیں۔ دوا کی طرح زبردستی تو نہیں۔" اس نے رہا ہونے پر جیسے برا سا منہ بنایا۔

"یہ جوس دوائی ہے، گھونٹ بھر کا ہے، رکھ ہاتھ تو رنگ بدل جائے گا۔ شاباش کافی پی لو اور ہاں اب تو تمہیں بے پینے پانے کا چکر؟"

وہ جوس گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "وہ آگ تمہیں خاک کر دے گی، اس طرح کی چیز پیا کر، اندر پھول کھلیں گے۔"

اس نے بڑے اچھے جذبوں سے نہال ہو کر گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

عارف نے مسکرا کر اس کا لیکچر سنا اور گلاس تھامتے ہوئے کن انکھیوں سے بالو کی طرف دیکھا۔

مے کدے میں اب بھی ذکر آتا ہے بے ہوشی کے وقت
کیا خبر تھی اختر اتنا پارسا ہو جائے گا!!

جھومری مظلومیت اس کے سینے پر ہاتھ مارنے لگی۔

"ہم خاندان سے باہر شادی کے خلاف نہیں ہم نے اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیاں باہر کی ہیں۔ مگر خاندانی حسب نسب جن کے پاس ہے وہاں۔ ہم نے بہوؤں کے جہیز کا لالچ نہیں کیا اور بیٹیاں بیاہ دیتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ جائیداد جائے گی۔

"ہم دولت کی ضرورت اور اہمیت سے بے خبر نہیں۔ مگر ہم خاندان کی اہمیت کو ہر چیز سے بڑھ کر رکھتے ہیں"۔

"ہم اپنے خاندانی وقار کی خاطر اپنی اولاد کو قربان کرنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں"۔ ان کا لہجہ بہت منظم اور مضبوط تھا۔

"ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر روشی کو اللہ نے زندہ رکھا تو ہم اسی ہفتے اس کی شادی کر دیں گے"۔

"جی!" باری نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔

"ہوں۔۔۔ ہم چاہتے تھے کہ اس کی شادی گھر کے ہی کسی قابل بچے سے کریں۔ مگر اب ہم اسے حویلی میں نہیں رکھیں گے"۔ ان کے انداز سے غیظ و غضب ظاہر تھا۔

"پھر کہاں؟" باری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کسی قریب خاندان کے۔۔۔ کے ساتھ چاہے پر بھی ہم راضی ہوں گے۔ خاندانی ہو گا تو ہم یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ وہ میٹرک بھی ہے یا نہیں"۔

"جی۔۔۔؟" باری کو ایک اور دھچکا لگا۔

"کوئی کنبہ بھرا بھی ہوا تو بیاہ دیں گے"۔

"جی"۔ باری کی پیشانی پر موتی چمکنے لگے۔

"بابا چچا"۔ اس نے بابا صاحب کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

"وہ کچھ نہیں بول سکتے۔ وہ ہمیشہ ہمارے فیصلوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ وہ عزت و وقار کے مسئلے پر ہم سے بھی زیادہ حساس ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں بہت عزیز بھی ہیں۔ انہوں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ ہمیں روشی پر اس لئے بہت زیادہ غصہ ہے کہ اس نے بابا کو ایک اور زخم لگانے کی کوشش کی۔ ہم اسے ہرگز معاف نہیں کر سکتے"۔

باری کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان اداؤں کو کیا نام دے۔ سفاکی یا عدل۔

کراچی جانے والی پرواز پی کے 302 روانگی کیلئے تیار ہے۔ اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی وہ ایک دم سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"آیئے بابا صاحب!" اس نے بابا صاحب کا ہاتھ تھام کر اٹھایا۔

اسے لگا جیسے اس نے بابا صاحب کو نہیں اٹھایا۔۔۔ روشی کی قضا کو اٹھایا۔

☆—☆—☆—☆—☆

ماحول اس وقت زیادہ پریشان کن ہو گیا جب موما روتے روتے ایک طرف ڈھے گئی۔

گگو اسپتال کے کاریڈور میں نفل پڑھنے میں مصروف تھیں۔ زری کی چیخ پر نیت توڑ کر بھاگیں۔ "میں نے کہا بھی تھا کہ مت آؤ مگر یہ سنتی کب ہے"۔ انہوں نے اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے شیشے کے اس پار موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا روشی کی طرف آئیں۔

"ایسا ایک لوگ بچت کے ساتھ نہیں آ جاتا بابا"۔ نرس نری بدمزاجی سے موما کو چیک کرنے لگی۔

"مین۔۔۔ تم اسٹریچر لاؤ۔۔۔ ام دیکھتا ہوں۔۔۔ ادھر کوئی ڈاکٹر نہیں اے۔۔۔ ڈیوٹی ڈاکٹر ابھی نہیں آیا۔ جو ہے وہ ادھر تمہارے مریض کے ساتھ مصروف اے"۔ وہ موما کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں سے دارا بوا نے "طلوع" ہونا تھا۔

چند منٹوں کے بعد آخر اسٹریچر آ گیا۔ زری، گگو اور نرس نے موما کو اسٹریچر پر لٹایا اور اس کے ساتھ ساتھ چل دیں۔

"گگو! تم یہیں ٹھہرو۔ روشی کے پاس۔۔۔ میں ہوں موما کے ساتھ۔۔۔"۔ زری نے گگو کے بڑھتے قدم روک دیے۔

ایک چھوٹی سی کھنک دار ہنسی آس پاس سنائی دینے لگی۔ کلیسا کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

فیروزی سلک کے پاجامے اور دوپٹے اور سیاہ جالی کے کرتے میں ایک شوخ وجود کے بجائے ان کی رگوں میں دوڑنے بھاگنے لگا۔ ماحول میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ آزمائش میں مبتلا کر دینے والا سراپا۔ دل کھول کر ہنستی ہوئی موتیوں جیسے دانتوں کی چکاچوند، ہاتھوں میں ہاتھ پھنسا کر ہنسی سے دوہری ہوتی ہوئی۔

شتاب جسم کے خون میں آگ لگا دینے والے انداز سے۔ جیسے خوشی اور ہنسی کے خمیر سے گندھا ہوا وجود جیسے روشنیوں کے تانے بانے سے بنا سراپا۔

جیسے خوشبوؤں کی خیالی تجسیم۔۔۔

"بیٹھ جائیے پلیز"۔ بجلی سی شگفتگی جو لمحے بھر کو چمکی تھی ایک دم معدوم ہو چکی تھی۔ لہجہ از حد روکھا اور پرتکلف تھا۔

"اب بتائیے کیسے زحمت کی؟"

"ہمارا آپ کا رشتہ تو ایسا ہے کہ اس طرح کی "زحمتیں" ہوتی رہنا چاہئیں"۔ وہ ان کے تبدیل شدہ انداز پر اپنی حیرانی چھپاتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"وہ اس کی بات پر خاموش رہے"۔

"روشی کہاں ہے؟" اس کا خیال تھا وہ اس کے سوال پر چونک اٹھیں گے مگر ان کا انداز بدستور رہا۔

"جس سوال کا جواب آپ کو معلوم ہے اس کو کرنے کا فائدہ؟" وہ کش لگا رہے تھے۔

"آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ مجھے اس سوال کا جواب معلوم ہے؟" اس نے انہیں لاجواب کرنا چاہا۔

"آپ گھر کی خواتین سے ملی ہوں گی یا ملازمہ سے ملی ہوں گی یا اتنا اہم سوال ہے کہ آپ نے فوراً سے پیشتر کیا ہوگا۔ اس پہلے شخص سے جو آپ سے ملا ہوگا"۔ انہوں نے اپنی سرخ نظریں لمحے بھر کو اٹھائیں۔

"تو آپ مانتے ہیں کہ یہ اتنا اہم سوال ہے کیونکہ جس سے متعلق ہے اس کی اہمیت میرے لئے کیا ہوگی؟"

اسے لاجواب ہونا پڑا تھا۔ اس کے سامنے وہ تھا جو پی آر کا امام پروردہ تھا۔

"تمہارے لئے کوئی بھی نہیں"۔ وہ مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

"پھر آپ نے میری موجودگی کے باوجود۔۔۔ اسے کیوں بھیج دیا؟" وہ دوبارہ الجھن چھپانے میں ناکام رہی۔

"اسے میں نے نہیں بھیجا۔ یہ سب بچیوں کا پروگرام تھا"۔ وہ مزید سکون سے بیٹھ گئے۔

"پروگرام تبدیل بھی کئے جا سکتے ہیں۔ کیا میری اتنی بھی اہمیت نہیں کہ میری بھابھی میری خاطر پروگرام بدل دیتی ـــــ؟"

"وہ بچی ہے لاپرواہی کر سکتے ہیں اسے۔ میں تو آپ کی خاطر ٹھہرا ہوا ہوں نا۔ حالانکہ مجھے آج ڈیوٹی پر ہونا چاہیے تھا۔ میں کبھی کسی ایمرجنسی میں بھی آفس مس نہیں کرتا مگر آپ کی خاطر۔"

وہ نہ جانے اپنے کام سے کام رکھنے والا انتہائی کم گو شخص جب اس طرح کا جملہ بولتا ہے تو چونکا دیتا ہے وہ بھی چونک

بڑی تھی۔

"سچی ایسا ہے؟" وہ وقار سے شرارت سے مسکرائی۔

اسے اس شخص کا یہ جملہ حد سے زیادہ اچھا لگا تھا۔ یہاں سے لے جانے والی بہترین سوغات۔ ایک ایک شخص بھی بہت ہی اہم اور عجیب ہوائی باتیں کرتا ہے۔

دل کی طرح کھلنے لگا۔ وہ بولنے لگی کہ اسے بہت سی اہم اور عجیب باتیں کرنا ہیں۔

"آپ کو جو شکایت ہو مجھ سے کریں۔ میں یہاں کا پہلا حوالہ ہوں۔ بچوں کے اپنے ذہن اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ ان کی ترجیحات ہماری زندگی بہت سے گھٹے بنا جاتی ہے۔ مگر بہت کچھ جانے والوں کو درگزر کے کام سے کر انہیں معاف کر دینا چاہیے"۔ انہوں نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بہت ہی فلسفے اور دھیمے لہجے میں کہا۔

"مگر بچوں کے جو بڑے ہوتے ہیں ان کا بھی تو کوئی فرض ہوتا ہے یا یہ بڑوں کا کام ہے کہ وہ ان کی مدد کریں۔ کیا یہ اہم سوال ہے اہم؟"

"آپ کو کبھی کبھی آپ کی کوئی دلیل ایسا جواز نہیں بن سکتی کہ میں مطمئن ہو جاؤں"۔

"آپ کی عمر میں دلیل کی اہمیت بھی نہیں ہوتی۔ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں روشی کی طرف سے"۔ وہ نیا سگریٹ لگا کر سلگا رہے تھے۔

"روشی کی معذرت کی تو ضرورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ وہ بے قصور ہے۔ اسے جیسا حکم ملا اس نے کیا"۔

"میں آپ کی غلط فہمی کو دور کرنے سے قاصر ہوں"۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ یاور علی خان نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"جی نہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں اور اپنے کانوں سے سنتی ہوں۔ کاش کوئی پوچھے میں نے کیا دیکھا؟ کیا سنا؟" وہ بولی کہ اپنی تسلی کو ضرور پہنچے گی۔

ڈاکٹر یاور علی خان کے ہاتھوں سے پھسلا تھا۔ انہوں نے جیسے اپنی حالت پر قابو پانے کی خاطر جلدی جلدی دو تین کش لگائے۔

"نئی جگہ نیا ماحول ہوتا ہے تو بہت سی باتیں چونکا سکتی ہیں"۔ وہ بہت آہستگی سے دھواں منہ سے خارج کر رہے تھے اور دھوئیں سے بننے والے سلسلے دار مرغولوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

"ہماری چونکا دینے والی باتوں سے ذہن میں سوال پیدا ہوتے کیا کریں؟" تاہم وہ اپنی مضبوط پوزیشن پر ڈٹا ہوا تھا۔

وہ جانتی تھی وہ ایک مقام پر ضرور ہار جائیں گے۔

"خطا۔۔۔ اس گھر میں حکم دینے والوں کی کیا کمی ہے کہ رات کے اندھیرے میں کوئی حکمران کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔ ظہور بھی نہیں ہے۔ حکم صادر کرتا ہے اور چلا جاتا ہے"۔

اسے یقین تھا وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ اس کا جی چاہا بچوں کی طرح تالیاں بجا کر خوشی سے نعرہ لگائے۔ "ہورا"۔

"ہماری جاگیر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کچھ حکم دینے والے وہاں بھی ہوتے ہیں۔ ذرا ذہن میں۔ آپ یہ بتائیے اور کیا دیکھا

"تھینکس ۔۔" وہ ان کی اتنی مہربان وضع پر واقعی خوشی سے مسکرا دی۔

"اب بات ہوئی ہے۔ ورنہ میں تو الجھ گیا تھا۔ ایس پی صاحب کو ابھی تک انتظار میں لٹکایا ہوا ہے آپ کی وجہ سے۔"

"تھینکس اگین" ۔۔ وہ اس خبطی قسم کے انسان سے اتنی توجہ اور مہربانی کے انداز پا کر واقعی خوش ہوئی تھی۔

ہادی کا بلاوا آ گیا تھا۔ یہاں اور یا پستی میں اس کی سخت ضرورت پیش آ گئی تھی۔

"وہ بابا صاحب کے ساتھ شہر جاتا تھا تو سے شہر میں ہی ایسوں کام پیش آ جاتے تھے۔ صبح فیکٹری گیا۔ وہاں سے ایئر پورٹ گیا۔ سیٹ کنفرم کرائی۔ شام ساڑھے پانچ بجے کی فلائٹ تھی۔ بمشکل فرسٹ کلاس میں سیٹ ملی تھی۔ وہاں کی دھما چوکڑی سے فرصت پا کر بابا صاحب کے بزنس پارٹنر سے حساب کتاب کر کے فائل اور چیک وصول کیا۔

تین بجے کے بعد گھر آیا بمشکل وہ چار دانے ہی منہ میں ڈالے تھے کہ فیکٹری سے منیجر کی کال آ گئی۔ بابا صاحب ہیڈ آفس کا چیک اپ کیلئے گئے ہوئے تھے۔ ناچار اسے فیکٹری کا دوسرا چکر لگانا پڑا۔ گھر سے فیکٹری زیادہ دور نہیں تھی چار بجے تک واپس آ گیا۔ جلدی جلدی کپڑے بیگ میں ٹھونسے۔ غسل کر کے شو بدلی۔ بنیان پہن کر یاد آیا کہ قمیص پر تو استری ہی نہیں ہوئی۔ بڑی سخت جھلاہٹ ہوئی۔ اختر بھی گاڑی لے کر جا چکا تھا۔ ہادی کو ایئر پورٹ پہنچا کر اس نے بابا کو بھی لینے جانا تھا۔ وہ شرٹ ہاتھ میں پکڑے کمرے سے باہر آیا۔

"گلو" اس نے آواز لگائی۔

"محترمہ گلو صاحبہ ادھر ادھر کہیں پائی جاتی ہوں تو سامنے آ جائیں۔ سخت ضرورت ہے۔" اس نے راہداری کے سرے پر کھڑے ہو کر صدا لگائی۔

"وہ گیٹ پر کھڑی سبزی خرید رہی ہے۔ بہت تیزی میں ہو۔" معاً روشی سامنے آ گئی۔

وہ جھنجھلا کر بنیان میں خود کو اس کے سامنے پا کر قدرے خجل سا ہو گیا۔ "ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔ ویسے ہی سیٹ بڑی مشکل سے ملی ہے۔" وہ جانے کیوں نظریں چرا گیا۔

"جا رہے ہو؟" اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"جی۔"

"گلو بھی آف کرنے جائے گی؟" وہ مسکرائی۔

"کر لیتیں۔ یہ شرٹ بغیر استری کی ہے۔ میں تو خود ہی کر لیتا مگر یہاں تو کہیں آس پاس استری بھی نظر نہیں آ رہی۔"

روشی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے شرٹ لے لی اور ایک سمت بڑھ گئی۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا اور شرٹ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس خیال سے اوپر نہیں گیا کہ پھر اسے اوپر آنا پڑ جائے گا۔

پانچ منٹ بعد روشی شرٹ ہاتھ میں لئے اسی جگہ واپس آ گئی۔

"ہو سکتا ہے جلدی میں اچھی نہ ہوئی ہو۔ بہر حال گزارا کر لو۔" وہ اسے شرٹ تھما رہی تھی اور سوچ رہی تھی جانے کس طرف سے

آ کر دونوں کے پاس سے بے نیازی سے گزر گئیں۔

"معلوم ہے آپ کو۔ ہادی اور یا پستی واپس جا رہا ہے۔ کوئی میسج وغیرہ تو نہیں دینا ہے۔"

"تمہارا نام پیغام ہی دے دینا ہو۔ حویلی میں فون ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ویسے کوئی میسج ہی نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہاں مگر تم ضرور دو۔" وہ ان سے خاصے فاصلے پر رک کر پر تجسس انداز میں گویا ہوئیں۔

"بابا آئے ہیں یا پہلے ہی جا رہے ہو؟"

"بابا یہ ہے اصل میں کام "سرائے" میں ہے۔ ورنہ یا پستی سے تو سمجھ آیا ہے؟" وہ بہت متحمل کرن سے مخاطب تھا۔

"مگر تمہاری ضرورت تو یہاں بھی بہت ہے۔" شفق نیم انداز میں مسکرائیں۔

"کام کے بعد ہی تو میری ضرورت پڑتی ہے۔" وہ بابا دوا دشت کر گئی۔ شروع کر دی۔

"ہاں بھئی۔ ہادی۔ کام کے تو تم بہت ہو۔" وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔

ہادی شرٹ پہن کر بٹن لگا رہا تھا۔ غور سے اسے جا کر دیکھنے لگا۔

"ہر وقت جلتی رہتی ہیں" روشی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"مگر ہوش مند بھی بہت ہیں۔ آنکھیں کھلی رکھتی ہیں۔ آپ کو احتیاط کرنا چاہیے۔ آپ کیلئے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔"

"اور تمہارے لئے؟" وہ تو یوں بھی خاصی نڈر تھی۔

"میں تو خود ہی مسئلہ ہوں۔ میرے کوئی سنہرے خواب نہیں ہیں۔ آپ بس مجھے ایک کمپیوٹر فرض کر لیں۔" اس نے آگے کی سمت قدم بڑھا لئے۔

"جا کر فون ضرور کرنا۔" اس نے تاکید کی۔

"وہ تو میں خان کو کروں گا۔"

روشی کی لاتنے اسے آگے بات سے باز رکھا۔

"اور ہاں اگر خالہ اور یا پستی ہوں تو فون پر میری ان سے بات ضرور کرا دینا۔"

"بس؟" وہ پھر آگے بڑھا۔

"ہاں بس۔"

"اور ہاں سنو۔"

"جی!" وہ پھر رک گیا اور ریسٹ واچ پر نظر دوڑانے لگا۔

روشی کو اس کی ریسٹ واچ سے سوتن کا سا بیر تھا۔ "تم تو خود ہی گھڑی ہو، کیوں گھڑی باندھے پھرتے ہو؟"

"آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟"

"جاؤ تم۔ کچھ نہیں کہہ رہی۔" وہ جل کر بولی تھی۔ اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

وہ گم صم سے انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

یار ابھی سے ساری خصوصیات ظاہر کرو گے۔ بھوری عقل شرم سے بھی آ ہی جاتی ہے۔"

"اور ہاں ـــ وہ ان دونوں کے درمیان تھی کب ـــ؟" اس کا ذہن تو ان سوالات کے بوجھ سے شل ہو رہا تھا جو وہ کبھی بھی عارف سے نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ اس کے الجھے ہوئے انداز نظر سے عارف خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔ بظاہر جو انہیں پڑھ رہا تھا۔

انہیں منیب احمد کی کوٹھی تلاش کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ جو تقریباً سڑک ہی پر واقع تھی، جس کے باہر گاڑیوں کی طویل قطار کسی غیر معمولی واقعے کی منتظر تھی۔ وہ گیٹ میں داخل ہوئے تو آس پاس کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو انہیں پہچانتا ہو۔ اور اپنی آمد کی اطلاع انہوں نے جان بوجھ کر نہیں دی تھی کہ میزبان کو مزید زحمت ہو گی، جبکہ گھر میں پہلے ہی صورتِ حال غیر معمولی ہے۔

ٹیکسی سے اترنے کے فوراً بعد ان کی نظر گیٹ پر موجود چوکیدار پر پڑی تھی۔ انہوں نے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے تھمایا تھا۔

"یہ نعمان صاحب تک پہنچاؤ۔"

"وہ پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگے۔ روشی ہنوز ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تو ان کے سوٹ کیس ہی ڈگی سے نہیں نکلے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک اچھی صحت کا حامل افسردہ سا نوجوان چوکیدار کے ساتھ باہر آیا۔

"السلام علیکم! اپنے گھر میں تکلف؟ آپ سے یہاں کھڑے ہیں، حد ہو گئی۔"

وہ بے اختیار یاور علی خاں کے گلے لگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یاور علی خاں نے بھی جواباً نعمان احمد کی پشت تھپتھپا کر بولے کچھ نہیں۔ نعمان ان سے فوراً الگ ہو کر ٹیکسی سے اترتی ہوئی روشی کی سمت متوجہ ہوا۔

"السلام علیکم ماموں!" وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"روشانے!" نعمان احمد نے یاور علی خاں کی سمت سوالیہ انداز میں دیکھا، پھر سلام کا جواب دیا۔ فطری طور پر ماحول کی سوچ سے الگ میسر آیا تھا تو جس کے انداز بھی بڑے عجیب سے تھے۔

"آیئے بھائی صاحب! سامان ملازم اندر لے جائے گا۔"

وہ ان دونوں کو لے کر اس کمرے کی طرف بڑھا، جہاں ماہین کی موجودگی کا یقین تھا۔ دروازے میں خاصی خواتین بھی ہوئی تھیں۔ آنے اور جانے والے دونوں ہی کسی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے، لہٰذا نتیجے کے طور پر دروازے میں پھنس گئے تھے۔

"پلیز! آپ لوگ راستہ دیجئے۔" نعمان احمد خواتین سے مخاطب ہوا۔

"کون ہیں؟ کون ہیں؟ کون ـــ کون ـــ؟" سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔

ہیں ـــ یاور علی کے شوہر اور ماہین کی بیٹی روشانے۔" نعمان احمد ایک بزرگ خاتون کے سوال پر

"یہ کون ہیں؟ ماہین کے بھائی ہیں ـــ

جواب دے رہا تھا۔

خواتین میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ عمر رسیدہ خواتین کا جوش دونوں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ـــ کوئی یاور علی خاں کے سر کرنے میں ایک ... بوسے، شفقت بھری گئی تھی تو کوئی روشانے کو گلے لگا رہی تھی۔

دونوں اب چپ تھے۔ ایک خاموش اور آرام دہ ماحول و فضا سے ایک سرا ہو کر نعمان ان سے متعلق ہو گئے تھے۔

"ڈاکٹر نہیں آیا ابھی تک؟" نعمان احمد ایک خاتون سے دریافت کر رہا تھا۔

"نہیں!" جواب مختصر ملا۔

ماہین بھاری سا تکیہ کے ایک کنارے پر بے خبر ہاتھ پاؤں چھوڑے دراز تھی۔

روشی تیر کی طرح اس کی طرف بڑھی، ماہین کے رخساروں پر ایک تو اترتے آنسوؤں کے بہنے کے نشان تھے۔

نعمان نے یاور علی خاں کو ماہین کے قریب کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا، بلکہ انہیں تھامے ہوئے خود کرسی تک لایا۔

عین اسی لمحے ڈاکٹر کی آمد کا غلغلہ ہوا۔ آناً فاناً بھیڑ چھٹ گئی۔

مکمل روحت کے دوران میں ماہین نے ذرا سا کروٹ لی تھی۔ جانے ڈاکٹر نے روشی میں کتنی طاقت کی دوا لگائی تھی کہ ایک کے قریب لے جاتے ہی ماہین اس طرح تڑپ کر اٹھی جیسے کسی نے "آ" کر کھلی جڑ کر دی ہے۔

"ہائے بابا!" اس نے ہوش میں آتے ہی سسکاری لی۔

"ماہین ادھر دیکھو کون بیٹھا ہے تمہارے پاس؟" نعمان نے اسے ماحول کی طرف متوجہ کیا۔

ماہین نے رونے کی وجہ سے بھاری بھاری پپوٹے بمشکل اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ قدرے چونکی، جیسے یقین نہ آیا ہو۔

"اب آئے ہیں آپ؟ کتنا ترسایا ہے آپ نے میرے بابا کو ـــ کتنے ظالم ہیں آپ ـــ آپ کی جھولی میں میرے ابو کے لیے ایک خوشی بھی نہیں تھی۔ کیا ضرورت تھی اب آنے کی، جنہوں نے آپ سے رشتہ داری کی بنیاد رکھی تھی۔ جب وہی نہیں رہے۔" وہ بری طرح رو دی۔

یاور علی خاں اپنے سپاٹ اور بے تاثر چہرے کے ساتھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی ملزم جرم سنتے وقت گھنٹوں کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے اور اپنی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے مطلق خاموشی اختیار کرتا ہے۔

روشی اپنی جگہ سے اٹھی اور ماہین کی سمت بڑھی۔ اسے بہت سارا رونا آ رہا تھا۔ وہ بہت سارا رونا چاہ رہی تھی۔ اس سے اہم سوچ شاید یہ ہو کہ ہو مر جاتا۔ وہ آگے بڑھی اور ماہین کے گلے لگ گئی۔ اب دونوں طرف طغیانی تھی۔

خواتین دونوں کو خاموش کرانے میں لگ گئیں۔

نعمان احمد، ڈاکٹر اور یاور علی خاں تینوں مرد بڑی مشکل سی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے۔

"آیئے بھائی صاحب! ہم اس طرف چلتے ہیں، جہاں بابا ہیں، آیئے پلیز ـــ!" نعمان احمد نے یاور علی خاں کو بمشکل

سے ملا۔

وہ ہال نما راستے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ماہین رو رہی تھی۔ انہیں تکلیف ہو رہی تھی مگر بیٹی کے تڑپ تڑپ کر رونے سے ان کے دل پر بہت بوجھ پڑ رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ وشا کو کینسر کے ہزاروں حصے میں پرسکون دیکھ لیں۔

نعمان نے راستہ صاف کیا اور انہیں لے کر اس حصے کی طرف بڑھا جہاں طیب احمد کا جسد خاکی رکھا ہوا تھا۔

نعمان احمد بہت صبر و استقلال کا مظہر بن کر یاور علی خاں سے ملا تھا۔ انہیں اپنی مضبوطی کی وجہ سے بہت اچھا لگا تھا۔ پشت پر ہاتھ باندھے دھیرے دھیرے اس کے ساتھ قدم اٹھا رہے تھے۔ کیا کیا کچھ انہیں یاد آ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں سرخی گہری ہو رہی تھی مگر آج کے ماحول میں اس سرخی پر کون چونکتا۔ سرخ آنکھیں بھر بھر کر رہی تھیں۔

سپہر کے سائے منڈلانے لگے تھے مگر حویلی پر ابھی سکوت طاری تھا۔

معاً ایک سیاہ جیپ سرخ روش کو روندتی ہوئی پورٹیکو میں جا رکی۔

گھوم کر جیپ کے پچھلے دروازہ تھا۔ اور اگلا دروازہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کھول دیا تھا۔ ڈارک براؤن قمیص میں ملبوس ایک پرشکوہ سا مرد جیپ سے اترا تھا۔

"میں مردانے میں ہوں۔ بابا صاحب کو اطلاع دے دو۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کی طرف چلا گیا۔

"السلام علیکم کاکا جان!" سامنے سے جواد آ رہا تھا۔

تیمور نے قدرے چونک کر جواد کی شکل دیکھی۔ "وعلیکم السلام!"

"بابا جان تو اپنے کمرے میں ہیں۔" جواد نے انہیں دھیان دلایا۔

"میں ان سے ادھر ملوں گا۔" تیمور نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔

"جلدی میں ہیں؟" جواد نے قدرے جھجکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"ہاں!" سپاٹ انداز میں جواب ملا۔

"اور سب نہیں ملیں گے؟" جواد نے خود پر قابو پا کر با اخلاق میزبان کے انداز میں سوال کیا۔

"نہیں۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔" تیمور آگے بڑھ گیا۔ جواد چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر اپنے راستے چل دیا۔

اسے حیرت کا شدید جھٹکا البتہ ضرور لگا۔ بابا صاحب غیر معمولی تیزی سے اس طرف آ رہے تھے۔ وہ ٹھہر گیا۔

"تیمور اندر ہے؟" انہوں نے رک کر دریافت کیا۔

"جی ۔۔۔ اندر ہی گئے ہیں۔ اور جلدی میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ یاور علی خاں آگے بڑھ گئے۔

تیمور علی خاں نے ہال کا دروازہ بند کر دیا تھا اور کارنر صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ چہرے پر تفکر کے گہرے سائے صاف

دیکھے جا سکتے تھے۔ انہوں نے جیب سے ڈن ہل کا پیکٹ نکالا۔ سگریٹ سلگانے لگے۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔ اور پیکٹ واپس جیب میں رکھ لیا۔ اور ہال میں لگے پورٹریٹس پر نظریں دوڑانے لگے۔ انہیں اس دوران بھی یاور علی خاں کی آمد کا احساس تک نہ ہو سکا۔

"بہت گہری سوچ میں ہو؟" ہال کا سکوت یاور علی خاں کی آواز سے یکلخت ٹوٹ گیا۔ تیمور علی خاں چونک کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔

"السلام علیکم!" انہوں نے مودبانہ انداز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو۔" یاور علی خاں ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

"کیا ضروری ہے کہ سارے گھر میں گھر والوں کی تصویریں پھیلا دی جائیں۔ بس ایک تصویر تک ہونا چاہیے مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔" تیمور علی خاں کے انداز تکلم میں باپ کا عکس واضح تھا۔

"مگر اس میں قباحت کیا ہے؟" یاور علی خاں کے انداز میں نرم روی ہی تھی۔

"جن کی موجودگی کا احساس ہم نہیں کرنا چاہتے۔ وہ موجود محسوس ہوتے ہیں۔ اسٹرائیک کرتے ہیں۔" تیمور علی خاں نے خاصی بیزاری سے جواب دیا۔

"آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" انہوں نے پلٹ کر تھوڑا سا انداز بدل کر یاور علی خاں سے سوال کیا

"بتاتے ہیں۔ بتاتے ہیں۔ صبر کرو۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دیوار میں نصب ایک بٹن دبا دیا۔ چند لمحوں بعد ہی ایک ملازم اندر داخل ہوا۔

"جی خان!" وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سرسوتی سے کہو۔ جھومر کو یہاں لے آئے۔" وہ آرام سے بیٹھ گئے۔

ملازم باہر چلا گیا۔ تیمور علی خاں الجھ کر باپ کی شکل دیکھنے لگے مگر بولے کچھ نہیں۔ دونوں کے درمیان ایک گہری خاموشی کا پردہ حائل رہا۔

تقریباً پانچ سات منٹ بعد ہال کا دروازہ کھلا۔ سرسوتی جھومر کے ساتھ داخل ہوئی۔ اور دونوں دروازے ہی میں رک گئیں۔

"السلام علیکم خان!" جھومر بے تاثر انداز میں بولی۔

"وسلام!" تیمور علی خاں کے چہرے پر الجھن کی لہریں ابھرنے لگیں۔

"سرسوتی تم باہر جاؤ۔ کسی کو اندر مت آنے دینا۔ باہر ہی کھڑی ہو کر ہمارا انتظار کرو۔" سرسوتی الٹے قدموں باہر نکل گئی۔

جھومر دروازے کی طرف۔ پتھر کی طرح ایستادہ تھی۔ جامنی کنول کی فراک اور جامنی چوڑی دار پاجامے میں۔ ملبوس نحیف سی لچکتی اور نازک شال سے سر ڈھانپے جیسے کوئی بے جان فیصلہ سننے کی منتظر تھی۔

"یہ تمہارے خان اس وقت موجود ہیں۔ جو کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو۔" دلاور علی خان کی پیشانی پر لکیروں کا جال بکھرا تھا۔

"کیا کہے گی یہ؟ اور کیوں؟ اور اب یہ بھی کہا کرے گی؟" تیمور علی خان نے بگڑے ہوئے انداز میں کہا۔ جھومر خاموش رہی۔

"اب کیوں خاموش ہو؟ جس طرح تمہاری اس گز کی زبان صبح چابک بن کر ہمارے دل پر برس رہی تھی۔ خان کو وہ دکھاؤ۔" دلاور علی خان بڑی سختی سے کہہ رہے تھے۔

"اس کی یہ مجال۔ اس نے آپ سے گستاخی کی ہے بابا صاحب؟" تیمور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جھومر کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ ان کے لہجے میں بلا کا غضب تھا۔

جھومر نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"کچھ اور حوالہ ہے باپ کی؟" وہ حقارت سے پوچھ رہے تھے۔

"وہ میرا باپ نہیں ہے خان!" جھومر نے قطعی انداز میں بلا خوف گویائی کی۔

"اگر وہ میرا باپ ہوتا تو مجھے زندہ دفن نہ کرتا کبھی ہزار روپے کی مزدوری کر لیتا۔"

"تم جیسے لوگوں کو عزت راس نہیں آتی شاید۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟" تیمور علی خان سینے پر بازو لپیٹے۔ کڑے تیور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"آرام کیا ہے مجھے یہاں؟ یہ پوچھئے۔" وہ بہت دکھے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"کیوں بھوکی مرتی ہو تم؟ کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس؟" وہ غضبناک ہوئے۔

"آپ نے میرے ساتھ یہی کرنا تھا تو مجھے پڑھایا کیوں تھا؟" وہ آنسو پی رہی تھی۔

"تمہیں حویلی میں عزت دی تھی اس لیے یہ مہربانی کی تھی۔ مگر لگتا ہے تمہیں ہضم نہیں ہوئی۔"

"مگر میں حویلی کی عورتوں میں تو شامل نہیں ہوں۔ کیا فرق ہے مجھ میں اور سرسوتی میں۔ وہ بھی خدمات بجالاتی ہے اور میں بھی۔ انداز مختلف ہیں بس۔"

"کیا چاہتی ہو تم؟" تیمور علی خان کے چہرے سے گویا سرخی چھلکنے لگی۔

"مجھے آزاد کر دیں۔ یا مجھے کنیزوں میں شامل کر کے انہی کی طرح کے کام لیں مجھ سے!"

"تم ظفری کے نکاح میں ہو۔ میں یا بابا صاحب تمہیں آزاد نہیں کر سکتے۔ اس کا حق صرف ظفری کو ہے۔"

وہ بہت ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"خان۔ اگر میں کچھ دن اور ظفری کے ساتھ رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ آپ مجھے سرائے واپس لے چلیں۔" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"تم ظفری کا دل بہلاؤ۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔" وہ سختی سے گویا ہوئے۔

"کیا میں کھلونا ہوں؟" اس نے اٹک اٹک کر سوال کیا۔

"ہاں۔" وہ حقارت سے بولے۔

"مگر میں کھلونا نہیں بن سکتی۔" وہ بھی بگڑ گئی۔

دونوں باپ بیٹا اسے اس طرح گھورنے لگے جیسے کچا چبا جائیں گے۔

"دیکھ لیا آپ نے تیمور؟" بابا صاحب کی سانسیں تیز ہو چلی تھیں۔

"سنو جھومر! تم صرف ظفری کی منکوحہ ہو ہماری بہو ہو۔ ہمیں تمہاری اس عزت کی ضرورت نہیں۔ یہ تکلیف اس کے کہے پر ہماری بات نہ مان کر تمہیں اٹھانی پڑے گی۔"

"ہم تمہیں کبھی واپس سرائے نہیں لے جائیں گے۔ حویلی کی چار دیواری میں ہر انسان کا ایک اپنا مقام ہے تمہارا مقام یہ ہے۔ بابا صاحب سے معافی مانگو اور آئندہ گستاخی نہ کرنے کا عہد کرو۔ چلو۔"

جھومر ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"مجھے کسی حویلی کا شوق نہیں ہے خان۔ صبح سے شام تک آگ کی طرح جلتی ہوں کیا سو رہا ہے۔"

"تمہیں ذرا سی عزت کیا دی۔ سر پر چڑھ آ رہی ہو۔ تم جیسے لوگ تو بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اور تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ ہم عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو قتل ہو چکا ہوتا۔"

تیمور علی خان جیسے مشکل ضبط پر قابو پا رہے تھے۔

"دفع ہو جاؤ۔ یہاں سے۔ بچ جاؤ گی۔"

"میں آپ کے ساتھ جاؤں گی خان۔ نہیں تو آپ مجھے یہیں گولی مار دیں۔" وہ بولی تھی۔

تیمور علی خان باپ کی طرف مڑے۔

"بابا صاحب اسے اس کے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"مگر ظفری؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ ابھی سارا انتظام کرتا ہوں آپ کا۔ چادر اور چار جوڑے کپڑے لے لو۔ ابھی لائے دیتے ہیں تمہیں۔" تیمور علی خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

جھومر سکتہ کی سی کیفیت میں کھڑی رہ گئی۔ وہ خان کے اس طرح پینترا بدلنے سے جیسے سنبھل نہ پائی۔

"فرق ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ چنگھاڑے اور دلاور علی خان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے۔

"فکر نہ کریں بابا صاحب اب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر ہم یہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے۔" دلاور علی خان ایک بے بس لڑکی کے ہاتھوں زچ ہو کر رہ گئے تھے۔

"آپ دیکھتے رہیے بابا صاحب۔ بہت جلد خوش ہوں گے آپ۔" تیمور علی خان گہری سوچ میں ڈوبے باپ کو تسلی دے رہے تھے۔ جھومر کب سے باہر جا چکی تھی۔

"تم تو ظاہر ہے زیادہ دیر رکو گے نہیں۔ مگر جانے والے تو پی لو۔ ہم ذرا چودھری سے بات کر لیں۔ بہت دیر سے بیٹھا ہوا ہے۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خدا حافظ بابا صاحب!"

"جاتے ہوئے مل کر نہیں جاؤ گے؟" وہ جاتے جاتے رک گئے۔ "اور وہ کچھ بتانے کو ابھی کہہ رہے تھے۔" انہیں اچانک دھیان آیا۔

"رات کو آرام سے فون پر بات ہوگی۔ فی الحال مجھے جانے کی جلدی ہے۔" وہ قطعی انداز میں جواب دے رہے تھے۔

"ہمارے اپنے بچے کا مسئلہ ہوتا تو کیوں سنتے اس چھوکری کی باتیں۔ یہ تمہیں رخصت دیتے۔ اچھا خیر خدا حافظ۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں چھڑی لگاتے ہال سے باہر چلے گئے۔

تیمور علی خاں نے اپنی گھنی مونچھوں میں کچھ دیر انگلیاں چلائیں پھر سگریٹ سلگا کر سامنے لگی تصاویر دیکھنے لگے۔ جو ان کے مرنے والے سامنے تھے۔ ہر تصویر دھندلا رہی تھی۔ چہرہ جتنا سرخ ہو رہا تھا، کانوں کی لوئیں اس سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔

عصر اور مغرب کے درمیان نجیب احمد کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ گھر سے زیادہ تر مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ خاصا سناٹا تھا۔ چند خواتین ڈرائنگ روم میں سپارے پڑھ رہی تھیں۔

اگربتی اور کافور کی مہک دلوں میں وحشت سی پیدا کر رہی تھی۔

یاور علی خاں سفید شلوار قمیص پہنے سر پر جالی کی ٹوپی لگائے نعمان کے ساتھ ماہین کے کمرے میں چلے آئے۔ ماہین گھٹنوں پر کمبل پھیلائے۔ بال بکھرائے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے چپ چاپ سامنے دیوار پر جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ جنازہ اٹھتے ہی وہ پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دونوں فوراً اس کے کمرے میں آئے تھے۔ روشی آنکھوں پر بازو رکھے ماہین کے برابر میں دراز تھی۔

"حوصلہ کیجیے ماہین! یہی زندگی کا ایک حقیقی رخ ہے۔ اسے برداشت کرنا ہوتا ہے۔" وہ اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

ماہین خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کتنی اکیلی ہو گئی ہوں میں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"ہم سب ہیں نا آپ کے ساتھ۔ ایسے کیوں سوچتی ہیں۔" یاور علی خاں آہستہ سے گویا ہوئے۔

"کب تک؟ بالآخر اکیلی ہوں۔" رخساروں پر آنسو لڑھکنے لگے۔ روشی بھی اٹھ گئی تھی۔

"خالہ، ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پرسوں تو ہم لوگ واپس چلے جائیں گے نا! کیوں پپا؟ ٹھیک ہے نا!" روشی بھی دلجوئی میں شریک ہوئی۔

"تمہارے ساتھ یا تمہارے پپا کے ساتھ؟" ماہین پھیکی مسکراہٹ سے روشی کو اس کی نادانی کا احساس دلانے لگی۔

"جب آپ ساتھ ہوں گی تو ہم اکٹھے ہی رہیں گے۔ میں بھی پپا کے ساتھ ہی رہتے تھک گئی ہوں۔" روشی نے بہت پہلے ہی سوچا ہوا ہے۔" وہ پُر اعتماد انداز میں کہہ رہی تھی۔

"اس طرح نہیں ہوتا روشی۔ بہت پاگل ہو تم۔ تم سوچتی تو دوسری بات تھی۔ بہت اس طرح کی باتیں کرتے تم جیسے اکیلے پن کے احساس کو کچھ کم کر سکو۔" ماہین نے لمبی سی سانس بھری۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس طرح انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔" روشی نے اٹک کر کہا۔

"نعمان! ہم اپنی خالہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ آپ ساتھ تو نہیں کریں گے۔" روشی نے ذرا سوچتے پھر جاتے جاتے کچھ سوچتے ہوئے نعمان کو مخاطب کیا۔

"آپ کو ایسے روشی نے؟" یاور علی خاں نے بیٹی کو روک دیا۔

روشی حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔

"آپ نے صبح سے کچھ کھایا؟" یاور علی خاں ماہین سے مخاطب ہوئے۔

وہ چپ رہی۔

"بیٹے اپنی خالہ کو کچھ سوپ وغیرہ لا کر پلاؤ۔" وہ روشی سے کہہ رہے تھے۔

"ابھی لاتی ہوں۔ مجھے بہت اچھا سوپ بنانا آتا ہے۔" وہ فوراً بیڈ سے اتر گئی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔ تم بیٹھ جاؤ۔" ماہین نے اسے روکا۔

"جاؤ روشی۔ تم جاؤ۔ نعمان! آپ بھی کچھ کھا لیجیے۔ اس طرح کے ماحول میں خوشی سے کھانا پینا نہیں ہوتا۔ مگر زندہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ چلیے اٹھیے شاباش۔" وہ نعمان کو ڈائننگ روم میں لے جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ بیٹھیے بھائی صاحب۔ میں کھا لوں گا۔ ابھی موڈ نہیں ہے۔ پلیز۔" وہ بہت افسردہ تھا۔

"تو پھر آپ بھی ماہین کے ساتھ تھوڑا سا سوپ لے لیجیے۔" وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

وہ اتنے بے تکلف تھے کہ اس سے زیادہ اصرار کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اپنے تمام تر مخلصانہ جذبوں کے باوجود۔

"ابھی آتا ہوں میں۔ باہر کچھ دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔" نعمان اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر جلدی آ جائیے گا۔ روشی خاصا تیز کام کرتی ہے۔ ابھی آ جائے گی۔" یاور علی خاں نے تاکید کی۔

"آپ کو کیسے پتا۔ وہ کون سا آپ کے ساتھ رہی ہے۔" ماہین نے انہیں ٹوک دیا۔

"بیٹی ہے وہ میری۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جانے گا؟" وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔

"آپ ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بتائیے آپ دونوں نے بھی کچھ کھایا؟" ماہین کے حواس پوری طرح جاگے تو وہ چونک پڑی۔

"ہاں۔ کچن میں کھایا تھا۔ روشی نے البتہ کچھ زیادہ نہیں لیا تھا۔ وہ آپ کے ساتھ شریک ہو جائے گی۔"

انہوں نے سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ پلیز اپنے آپ کو سنبھالیں۔ دکھ واقعی بہت بڑا ہے۔ مگر۔ دکھ تو ہوتے ہی بڑے ہیں۔ ایسے کیا ہوا ہارٹ اٹیک تھا۔؟" وہ اپنی عادت کے برخلاف خاصی گفتگو کر رہے تھے۔ ورنہ وہ ہر ماحول اور ہر موسم میں بیزار سے ہی محسوس ہوتے تھے۔

"نہیں۔ دوسرا۔ پہلا آج سے دو سال پہلے یو کے میں ہوا تھا۔ میں تو اس وقت سے بس ہر وقت کا ٹینشن رہتی تھی۔ وہ پرہیز کراتی تھی۔ اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر۔" اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگنے لگی۔ کچھ دیر ضبط کرتی رہی۔ پھر بیڈ سے پاؤں اتار کر چپل تلاش کرنے لگی۔ جو کہیں نظر نہ آئی۔ یہ بھی مہمانوں کی موجودگی کی علامت ہوا کرتی ہے۔

پھر اسی طرح بیڈ سے اتر کر ننگے پاؤں کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اور پردے سرکا دیے۔ اس کے بعد دائیں طرف کی کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ اور واپس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"میں نے پردے ہٹا دیے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔" اس نے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

یاور علی خان شاید یہ کام ملتوی کر کے بھول چکے تھے۔ چونک سے گئے۔ اور آگے کو جھک کر پیکٹ اور لائٹر اٹھایا۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگالی۔

"تھینکس۔" لائٹر بجھا کر انہوں نے اچٹتی سی نظر ماہین پر ڈالی۔ بظاہر یہ اچٹتی سی نظر بڑی مکمل ہوا کرتی تھی۔ یہ وہ پہلے اس کا اعتراف ماہین کر چکی تھی۔

بڑی بھابی اسے ایک تقریب میں کوئی مخصوص ساڑھی پہننے پر اصرار کر رہی تھیں اور وہ ساڑھی کئی بار پہننے کے بعد اس کے دل سے اتر گئی تھی۔ اس نے نہایت خاموشی سے وہ ساڑھی بیڈ کے نیچے رکھے سوٹ کیس میں چھپا دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ وہ کراچی میں بھول آئی ہے ان سے کیونکہ بہنوں کی طرح بے تکلفی تھی اس لیے خدشہ تھا وہ آ کر وارڈروب نہ کھنگال ڈالیں۔ سارا گھر ہی اسے سجا ہوا دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

ساڑھی اس نے بہت محتاط انداز میں چھپائی تھی۔ اس وقت یاور علی خان فون کرنے میں مصروف تھے۔ اور بہت مگن تھے۔

اس خدشے کے عین مطابق عالم تب ان کی خواب گاہ میں آ گئی تھی۔

"ارے وارڈروب میں اچھی طرح دیکھ لو۔ ہٹو۔ لاؤ میں دیکھتی ہوں۔" انہوں نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں اور پوری تندہی سے وارڈروب چھاننے لگی تھیں۔

"ایک تو تم میں لاپرواہی بہت ہے۔ اتنے نخرے کرتی کیوں جاتی ہو کہ سیدھا بھول جاؤ۔ اتنی خوبصورت ساڑھی ہے۔ کس قدر جچتی ہے تم پر۔ ارے آج تو وہ ملانی بھی آئے گی اپنی بہو کو لے کر۔ کہتی ہے اس کی بہو سے زیادہ حسین کسی کی بہو نہیں ہے۔ مجھے بڑا غصہ آتا ہے ایسی چھچھوری عورتوں پر۔ بتاؤ تو ابھی ساڑھی بھول آئیں۔"

وہ تلاش کرتی جاتی تھیں اور ساتھ بولتی جا رہی تھیں۔

"بھابی بیگم یہ ہمارے بیڈ کے نیچے ایک سوٹ کیس ہے۔ اس میں دیکھ لیجیے شاید اسی میں ہو۔" یاور علی خان نے

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بھاوج سے کہا۔

ماہین سہمی سہمی آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ اور بھابی تو سوٹ کیس سے ساڑھی برآمد ہوتے دیکھ کر ریشہ ختمی ہو گئی تھیں۔

"تو یہ ہے ناز ایک بچے میں تمہارا یہ حال ہے۔ تاؤ۔ کم از کم یہاں تو دیکھ لیتیں۔ یاور پہلے ہی کہہ دیتے۔ چلو شکر ہے مل گئی۔ لو یہی لو۔ اچھی طرح تیار ہونا۔ بھول جاؤ گی میں۔"

مارے خفت کے ماہین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"کتنی پیاری آنکھیں ہیں آپ کی۔ میں تو کبھی بڑے گن ہیں۔" وہ تیار ہو رہی تھی اور ان سے خفا ہو رہی تھی۔

"مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہو تم اس ساڑھی میں۔" وہ شرارت سے مسکرا رہے تھے۔

کالی۔ سنہرے ستاروں سے بوجھل ساڑھی میں وہ واقعی غضب ڈھا رہی تھی۔

"بہت بچے ہیں تم ہیں آپ۔ لگتا ایسے ہے جیسے آس پاس کا ہوش ہی نہیں ہے۔" اس کا موڈ واقعی خراب تھا۔

"دنیا میں جب کوئی شوہر اپنی بیوی کی تعریف کرتا ہے تو بد مزاج سے بد مزاج عورت کا موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔" وہ اسے سمجھا رہے تھے۔

"ان کی شکل سے تعریف ہوتی ہو گی۔ اور ان کو ایک ساڑھی کئی بار پہننا بھی نہیں پڑتی ہو گی۔ یاور امیر اول چاہوا ہے بہت سارا روؤں۔" وہ واقعی روہانسی ہو رہی تھی۔

"کس قدر مغرور ہو تم ناز اور نخرے بھی ہیں۔" وہ ہنس دیے۔

"میں تو کوئی مغرور نہیں ہوں۔ موم جیسا دل ہے میرا۔ مغرور تو آپ ہیں۔ پتھر رکھا ہوا ہے سینے میں دل کی جگہ ذرا سی صورت دے دیتے تو کیا ہو جاتا۔ لگ گئے اپنی بھابی کے ساتھ۔ ہاں نہیں تو۔"

"ماموں کہاں گئے؟" روشی ٹرے سمیت اندر آ گئی تھی۔

یاور علی خان نے اپنی سرخ آنکھیں جھکا لیں جنہوں نے ماہین کو پریشان کر دیا تھا۔

"ابھی آتے ہیں۔ تم اپنی خالہ کو سوپ دو۔ اور مجھے کہیں سے ایش ٹرے لا کر دو۔" یاور علی خان نے روشی کو کام بتائے۔

"ٹھہریے۔ میں لا دیتی ہوں۔" ماہین بیڈ سے اترنے لگی۔

"ارے نہیں خالہ آپ بیٹھیے۔ میں سارا گھر چیک کر چکی ہوں۔ مجھے پتا ہے کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔" اس نے ماہین کو روکا اور خود تیزی سے باہر چلی گئی۔

"آپ سوپ لیجیے پلیز۔" یاور علی خان نے مشفق انداز میں کہا اور سگریٹ کے کش لگانے لگے۔

ماہین پیالے میں ذرا سا سوپ نکال کر سپ لینے لگی۔

لائٹ براؤن چمچے سے سوٹ میں الفریڈو ماہین بادل نخواستہ سوپ پی رہی تھی۔

وہ بہت غیر طریقے سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دو گرم آنکھیں سوچ بچار رہی تھیں۔ گلابی ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

بال بے ترتیب سے تھے۔ بکھری ہوئی لٹوں کی وجہ سے پیشانی تقریباً اوجھل تھی۔

یہ بات طے ہے جب کسی کو بغور دیکھا جائے خواہ کسی بھی طریقے سے۔ تو محسوس ہو ہی جاتا ہے۔ ابھی وہ ان کی نگاہوں کے حصار سے نکل کر سنبھلی بھی نہیں تھی۔ کہ دوبارہ نظروں کی زد میں تھی۔ شاید اسے اچھا لگ رہا تھا۔ بس بے کلی ہو رہی تھی۔ (کہاں رہ گئی یہ روشی؟)

"آپ بھی لیجیے ناں۔" بابا خان کی نظروں سے بچنے کا اسے یہی حل سمجھائی دیا کہ کسی طرح خاموشی توڑ دی جائے۔

"سوری بیٹا! آئی ایم ذرا لیٹ ہو گئی۔ دراصل جہاں میں نے اینٹر رکھی تھی وہاں دو مہمانوں کی وجہ سے رکی ہوئی تھی ورنہ گاڑی اس کی کہیں اور مقرر ہے۔ بہر حال میں واپس لائی۔"

روشی عجیب سا شور برپا کرتی دوبارہ اندر داخل ہوئی۔ اور ساتھ ہی پلیٹ لا کر رکھ دی۔

"آپ نے ابھی تک اتنا سا نوش کیا ہے۔ حد ہو گئی۔ اتنا دل لگ کر رہا ہے۔" اس نے آگے ہی کے ماہین کی خبر لی۔

"میں نے لیا ہے۔ دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز روشی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"اچھا نہیں ہے کیا؟" وہ ڈرتے ڈرتے پوچھنے لگی۔

"ارے نہیں۔ بہت مزے کا ہے۔ بس کسی بھی چیز کو دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے شگفتہ انداز میں وضاحت کی۔

"بیٹا۔ آپ کہیے ناں خالہ سے۔ شاید آپ کی بات مان لیں۔ ماموں بھی نہیں آئے ابھی تک۔"

"نہیں دل چاہ رہا تو زبردستی نہیں کرو۔ بعد میں پی لیں گی۔" شاید بابا ان کی فطرت میں نہیں تھا۔

"شاہین خالہ اور جبیں خالہ نہیں آئیں؟" روشی کو ایک اہم کمی کا احساس ہوا۔

"سیٹ نہیں ملی۔ فون آیا تھا ان کا۔ جبیں آپی کے ہاں تو بیٹا ہوا ہے۔ دس دن کا ہے۔"

"آپ کو یاد ہیں بابا وہ لوگ؟" روشی نے باپ کی طرف توجہ کی۔

وہ بہت خاموشی سے ان دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت سن رہے تھے۔

"لو۔ یہ رشتے بھی بھولنے والے ہوتے ہیں۔" ماہین نے ٹوکا۔

"اچھا آپ کتنی بار ملے ہیں ان سے؟" وہ بڑے شوق انداز میں پوچھنے لگی۔

"کئی بار۔" انہوں نے بہت مختصر جواب دیا۔

"وہ لوگ حویلی آئی تھیں؟"

"دو تین مرتبہ شاید۔" وہ روشی کے سوالوں سے تنگ پڑ رہے تھے۔

"وہ بھی شروع شروع میں۔" ماہین نے بھی حصہ لیا۔

"شروع شروع؟" روشی کے پلے نہیں پڑا۔

"بھئی بجو کی شادی کے شروع میں۔" ماہین بھی عارضی طور پر کچھ دیر پہلے والے ماحول سے باہر آ گئی تھی۔

"پھر تو سب یوگنڈا چلے گئے تھے۔" ماہین مزید گویا ہوئی۔

"اچھا بیٹا کیں۔ ان دونوں میں اس سے زیادہ کون سی عادتیں ہیں؟" [illegible]

"جی آپی۔" ماہین نے جواب دیا۔

"جی بیٹا؟" وہ ایک بار اور تھکا اس کے ذکر سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"مجھے معلوم نہیں۔" بہت ہی صاف کرتے یاور علی خاں۔

"بیٹا مجھے اتنا اچھا لگا۔ جب میں نے نعمان ماموں کو دیکھا۔ ایسا لگا جیسے جو ابھی آ کر سو رہے ہوں۔"

"میں بھی جو دور کچھ کر اسی قسم کے احساسات سے دوچار ہوئی تھی۔" ماہین نے تصدیق کی۔

"بیٹا ان کی شادی اسی گھر میں ہوئی تھی؟" وہ جیسے سارے سوالات کر دینا چاہتی تھی۔

"نہیں۔ اس وقت پاپا سرکاری ملازم تھے۔ سرکاری کوٹھی تھی۔"

"شاید آپ نے محسوس کیا ہو کہ میں ان کو بہت مس کرتی ہوں۔ میرا دل شدت سے چاہتا ہے۔ بس وہ ایک دم میرے سامنے آ جائیں۔"

"روشی۔ بیٹے لڑکا نہیں پڑھو گی کیا؟" یاور علی نے مداخلت کی۔

"ممانی کی لڑکا تو بیٹا میں بہت آرام سے پڑھتی ہوں۔ خالہ آپ بستر سے اتریں پلیز گھر میں بھی پھریں۔ مجھے کام ہے۔ ماہین۔ میں آپ کی ہیلپ کروں گی۔ ابھی میں کچن میں تھی۔ سب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ آپ اٹھ آئیے۔"

ماہین خاموشی سے بستر سے اتر آئی۔ "بیٹا نہیں نعمان بھائی کہاں ہیں۔"

"آ بیٹا وہ بھائی! آپ تھک چکے ہوں گے۔ میں آپ کو کمرہ دکھاؤں۔"

وہ مجھے لہجے میں کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ یاور علی خاں اس کے پیچھے چل رہے۔

"آ روشی ادھر ساتھ۔" ماہین نے پلٹ کر اسے بلایا۔

"میں ڈرائنگ روم میں جا رہی ہوں۔ وہاں ایک آنٹی سے ملوں گی۔ کچن میں رونق ہوئی ہے میری ان سے۔ آپ کے ان سائیڈ پر رہتی ہیں۔"

اس نے سلیپر پاؤں میں پھنسانے کے دوران جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ سارہ آنٹی وہ ابھی ہیں یہاں۔ بہت اچھی پڑوسن ہیں۔ انہیں روکنا۔ میں آ رہی ہوں۔" ماہین اور یاور علی خاں آگے پیچھے باہر چلے گئے۔

روشی دوبارہ برتن سے جا کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

"روشی کون ہے۔" نعمان نے ڈرائنگ روم میں آ کر اطلاع دی۔ "یہ سامنے میرا بیڈ روم ہے۔ ادھر آ جاؤ۔"

دو چار خواتین میں گھری نہایت خضوع و خشوع سے گفتگو کرنے میں مگن تھی۔

بڑے اہتمام سے وہ چادر وجود پر پھیلائے، زمانے بھر کی سنجیدگی چہرے پر سجائے اس کا انداز گفتگو نپے تلے اور دیکھ
سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت ہی کھلی تھی مداخلت۔

"ایکسیوزمی، ابھی آئی۔" وہ اٹھ کر لقمان کے بیڈروم میں چلی آئی۔

"ہیلو!"

"بھئی، آپ اتنی دور جا کر بھی مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیں گی؟" دوسری طرف ہادی تھا۔

دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ مگر دوسرے ہی لمحے جیسے لہریں چھٹ گئیں۔

"دونٹ ٹیل می، ریموٹ سے چٹکیاں کاٹ رہی ہوں؟" وہ الزام تراشی پر جھلائی۔

"الزام نہیں لگاتا۔ جرم ثابت کرتا ہوں۔ حاجی صاحب ایڈریس مانگ رہے ہیں۔ تعزیت کے لیے پہنچنا چاہتے ہیں۔ بتائیے۔ کس کا غم کس کی خوشی ہے، کیوں؟"

ہادی بڑے بے ہودہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ہادی احمد علی پہنچ کر تمہاری وہ خبر لوں گی۔" وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

"حویلی کا اہتمام ویسا ہی ہے میں آپ کو بدولت کی "مغربی" مل سکتی ہیں۔ موصوف بڑے بدمعاش ہیں۔" "ان" رہنے دیں۔ اچھا۔ خیر، یہ بتائیے تعزیت کرنا کوئی بری بات ہے۔" وہ اب بڑی سنجیدہ سی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"مگر وہ لوگ تعزیت کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان کی تعزیت کی یہاں کسی کو ضرورت نہیں۔" وہ آگ بگولہ ہوئی۔

"جی! "لوگ" کہاں۔ ابھی تو اکیلے ہیں۔ لوگ تو آپ کے ساتھ مل کر بنیں گے۔"

"ان کے کچھ لگتے۔ مت کیا کرو ان سے متعلق مجھے فون۔" وہ پھر بگڑی۔

"کہہ تو میں جو کچھ لگوں گا آپ کے حوالے سے لگوں گا ان کا۔ بلکہ پہلے تو آپ میری "کچھ" لگیں۔ خیر، دونٹ مائنڈ۔ فون بند کرتا ہوں۔ ویسے یاد رکھنا ان کی طرف جائیں تو آپ ضرور جائیے گا۔ اسی بہانے گھر بھی دیکھ لیجیے گا۔ جتنا وہاں کے کمروں کی گرل، بیکم لان کی ترتیب، گاڑی کا ماڈل، اور خدا حافظ۔" اس نے فون بند کر دیا۔

وہ اس کا جملہ مکمل ہونے کے بعد ایک "عظیم جملہ" شروع کرنے والی تھی۔ دانت پیس کر رہ گئی۔ جہنم کا فرشتہ، میری جان جلانے پر مقرر ہے۔ مارے کوفت کے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ ایسے گن گن کر بدلے لوں گی۔ وہ آہستہ کا ٹاکو مل

ترتیب دے کر اپنا اشتعال بجھانے کی کوشش کرے گی۔

چند منٹ خود پر قابو پانے میں لگے۔ پھر دوپٹا درست کرتی واپس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

مسکراہٹ کی تو آج کے ماحول میں ضرورت ہی نہ تھی۔ اترا ہوا چہرہ آج ہر قسم کے سوالات سے مبرا تھا۔ یہ ماحول ہی اس کے حق میں تھی۔

"یہ بابا کا بیڈروم ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی؟" اس کی آواز مدھم ہوئی تھی۔

"ڈرائنگ روم زندہ وجود جو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بے چاری بے جان دیواریں اور یہ وقت کسی قسم کے تکلفات کا نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے کسی راہداری میں پلنگ ڈال کر بھی آرام کرنے کو کہیں گی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

ماہین نے حیرت سے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ انتہائی نفیس۔ حد سے زیادہ فارمل۔ اے سی۔ جو ہر قدم ضابطے کے تحت اٹھاتا تھا۔ کس قدر تبدیلی کا مظہر بنا ہوا تھا۔

"بہت بہت شکریہ اس اپنائیت کا۔ ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔" اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

یاور علی خاموش رہے۔

"آپ تھک گئے ہوں گے۔"

"سوٹ؟" وہ اپنا سوٹ کیس جو ان سے پہلے وہاں موجود تھا۔ بیڈ پر رکھ کر شب خوابی کا لباس نکالنے لگے۔

"میرا مطلب ہے، اب آپ آرام کیجیے۔" وہ جانے کے لیے اٹھی۔

"یہ دلہن کا ماحول تو نہیں ہے۔ آپ مجھے آرام کا کہہ کر کسی کونے میں جا بیٹھیں گی اور روئیں گی۔ تھوڑی دیر آپ یہاں بیٹھیے۔"

"آپ کے پاس؟" ماہین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ کس قدر "تبدیل شدہ" حالت میں تھے وہ۔

"نہیں، وہاں صوفے پر۔" وہ بھی برجستہ بولے۔

ماہین کو تسلی تو قطعی نہیں تھی۔ عجیب سی کھسیاہٹ اس پر طاری ہو گئی۔ وہ اپنی حالت کو نارمل ظاہر کرتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

یاور علی خاں اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کے نزدیک پڑی ایک خوبصورت سی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔

"کس خیال میں ہیں۔ زیادہ ٹینس طاری نہ کریں خود پر۔ یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ہنسیں اور مسکرائیں، لیکن پلیز کوشش کر کے اپنے دل و دماغ پر کنٹرول کریں۔"

"نہیں ہوتا۔" وہ جو کسی طرح مہربانی میں خود پر بہت کنٹرول کر رہی تھی پھر ایک دم سے بکھر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یاور علی خان کے سرد اور بے مہر سے دل میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔ اس سے تو بہتر پہلے کی صورت حال تھی۔ یہ انھوں نے کیا کیا؟ وہ بری طرح الجھ گئے۔

"کیونکہ عام حالات میں لوگوں سے کس ہونے کے راستے سوچ نہیں ملتے اس لیے مخصوص حالات میں خاص اہمیت وقت ہوتا ہوں۔ شوق کے لیے بھی کافی ہے کہ آپ ابھی خاص تھیں اور میں نے پھر سے لوٹا دیا۔۔۔۔ آئی ایم سوری۔"

وہ بیٹھے جا رہے شرمندہ ہو رہے تھے۔

لیکن پھر کوئی اثر نہ ہوا تھا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"ہائے، میرے بابا۔۔۔" اس کی ہلکی سی دلدوز کراہ تھی کہ وہ اپنی نشست سے بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دیکھیے ماہین! میں شدید قسم کے احساس جرم میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں آپ پلیز ماہین!"

"بعض دکھوں کا سلسلہ ابد سے ملتا ہے۔ آپ شرمندہ نہ ہوں، اس میں آپ کا کیا قصور؟" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یہ آپ نے بالکل درست کہا کہ بعض دکھوں کا سلسلہ ابد سے ملتا ہے لیکن ایک شے "قوت ارادی" بھی ہوتی ہے۔ جو ایسے ہی معاملات میں اپنا کام کرنا چاہیے اور شاید یہ ہوتی ہی اس لیے ہے۔" انھوں نے تاثیر کے ساتھ ساتھ آگے مرحلے آسان بنانے کے لیے ایک کوشش ضرور کی۔

"مجھے نہیں کرنا قوت ارادی کا استعمال اپنے اوپر۔ اپنے آپ کو ضبط کر کے آپ تو پتھر ہو چکے ہیں۔ جب رونا آئے تو بہت سارا رونا چاہیے۔ جب دل بھرا ہوا ہو تو ماتم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ بدستور سابقہ انداز میں رو رہی تھی۔

"بابا! آپ کس کس طرح مجھے یاد آئیں گے؟"

یاور علی خاں چند ثانیے اسے دیکھتے رہے، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ ماہین کا دوپٹا پھسل کر کارپٹ پر آ پڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے چہرہ ڈھانپا ہوا تھا۔

یاور علی خاں نے نیچے سے دوپٹا اٹھایا اور قریب تھا کہ اس کے سر پر ڈال دیتے، آہستگی سے دروازہ کھلا۔ اور روشی نے اندر جھانکا۔

وہ دوپٹا یاور علی خاں کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دوبارہ نیچے گر گیا۔ وہ اپنے مخصوص پُروقار انداز میں چلتے ہوئے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"تھینکس۔ مائی لارڈ!" انھوں نے چھت کی طرف دیکھ کر جیسے سکون کا سانس لیا۔

"آؤ روشی! یہ تمہاری خالہ بہت رو رہی ہیں۔ انھیں چپ کراؤ ورنہ ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" وہ مطمئن انداز میں کہہ کر سگریٹ سلگانے لگے۔

"اور دیکھو، یہ کمرے کے پردے بھی ہٹا دو، پلیز۔"

روشی جو باپ کے ہاتھوں میں ماہین کا دوپٹا دیکھ کر ایک دم جھجک کر اپنی جگہ رک گئی تھی، فوراً اندر چلی آئی۔

"پھر کیسے روئیں؟" روشی نے نیچے پڑا دوپٹا اٹھاتے ہوئے باپ کی سمت دیکھا۔ انتہائی سرد پایا اور غیر مرتب سوال

تھا کہ انھوں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے گہرا کش لگا کر آہستہ آہستہ سے دھواں اڑانا شروع کر دیا۔

"ظاہر ہے وہ فوراً تو سنبھلیں گی نہیں۔ تازہ تازہ غم ہے۔" "مگر آپ تسلی دینے کی بجائے کیا کرنا چاہ رہے تھے؟" آرزو آنچل سے ماہین کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ خاموش رہے۔

"آیئے خالہ! ہم بھی چلتے ہیں۔ مگر آپ اب روئیے گا نہیں۔ یہ سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اچھے، چلیں۔" اس نے ماہین کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

وہ سسکیاں بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"گڈ نائٹ پاپا!" آرزو نے ماہین کو ساتھ لے کر چلتے چلتے مڑ کر کہا۔

یاور علی خاں نے کھڑکیوں کی سمت دیکھا، جن پر پڑے پردے روشنی چھپانا بھول گئے تھے۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھے۔ پردے سرکائے۔ اور باہر سڑک کا منظر دیکھنے لگے۔ جہاں اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان کی سرخ آنکھوں میں گہری سوچ کا عکس بہت واضح تھا۔

عمارت پر گہرا تاریک غلاف چڑھا ہوا تھا۔

حتیٰ کہ اندر کسی موم بتی کی لو بھی ٹمٹماتی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ مگر کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں اتنا تسلسل تھا کہ کسی وقفے کا امکان تقریباً ناممکن ہی دکھائی دیتا تھا۔ سیاہ جیپ پھاٹک پر رک گئی تھی۔ ہارن ایک تواتر سے بج رہا تھا۔

ایک منٹ کے اندر پھاٹک کھل گیا تھا۔ کھولنے والے کے ہاتھ میں طاقتور ٹارچ جگمگا رہی تھی۔ جیپ تیزی سے اندر داخل ہو گئی تھی۔ اور پھاٹک کھولنے والا جیپ کے پیچھے سرپٹ دوڑا تھا۔ اور بڑی پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا تھا۔

"اس لڑکی کو بھی اتارو۔" گمبھیر آواز تاریکی میں گونجی۔

"یہاں تو بہت اندھیرا ہے خان!" جھومر کی آواز میں واضح لرزش تھی۔

"مگر تمہارے دماغ کے اندھیرے سے زیادہ نہیں۔"

"گل باز خان! ٹارچ ادھر دو۔ چلو لڑکی! آگے بڑھو۔" تیمور علی خاں نے ٹارچ کی روشنی سے رہنمائی کی۔

گلباز بھی ساتھ چل پڑا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ ہمارا انتظار کرو۔" تیمور علی خاں نے اسے ٹوک دیا۔

"یہ ہال کمرا ہے جھومر۔ اس کے ساتھ یہ دو کمرے۔ آگے جو راہداری ہے، اس کے آگے سرے پر کچن ہے۔ اس پوری عمارت میں تقریباً سات کمرے ہیں۔ چار نیچے اور تین اوپر۔ آج سے یہ سب تمہارے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہے سب تمہارا ہے۔

کیونکہ یہ عمارت آبادی سے بہت دور ہے۔ یہاں چالیس سال سے کوئی نہیں رہا، اس لیے یہاں بجلی پانی جیسی سہولتیں بھی نہیں ہیں۔ مگر تمہیں یہ تمام سہولتیں مہیا کر دی جائیں گی۔ آج سے دالان میں ہینڈ پمپ موجود ہے۔ تمہیں پانی کا مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"سامان تیل وغیرہ تمہیں مل جائے گا۔ اور ایک بڑا آئینہ بھی۔ روز رات کو اس میں اپنی شکل دیکھا کرنا۔ اب آؤ اس ہال کمرے کی طرف۔ یہاں ایک تخت موجود ہے۔ اسے ہی اپنا بستر سمجھو۔ گلباز جیسا ایک وفادار چوکیدار ہے۔ اس علاقے میں ہماری ہاری ہوئی دشمنوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اب تمہاری نگرانی بھی کرے گا۔ کتے بھی ہیں۔ اسے آوارہ ویرانہ بھاگنے کی کوشش کرے۔ شکل اس کی انسانوں جیسی ہی، مگر خصوصیات درندوں جیسی ہیں۔ ہم نے یہ ایک حویلی تمہارے حوالے کی۔ تم اس میں جیسے چاہو رہو، کوئی روک ٹوک نہیں۔ مگر صرف اندر۔ باہر کی طرف آنکھ اٹھانا بھی جرم ہے۔"

"یہ ظلم ہے خان!" جھومر کانپتی ہوئی ان کی سمت بڑھی۔

"ہم تمہیں خرید چکے ہیں۔ تم ہماری ملکیت ہو۔ ہم جیسے چاہیں استعمال کریں۔ ہم نے تمہیں سر پر بٹھایا تھا۔ عزت دی تھی۔ مگر تمہیں راس نہیں آئی۔ اب تمہیں تمہارا اصلی مقام دے رہے ہیں۔ تاکہ تمہیں شعور اور بشری کے سبق پہنچیں۔ ہر پندرہ دن بعد تمہارے باپ کو بھیج دیا کریں گے۔ جو تبدیلی اپنے اندر محسوس کرو اسے بتا دیا کرنا۔ خدا حافظ۔" تیمور علی خاں پلٹ گئے۔

"خان۔ خدا کے لیے ٹھہریں، میری بات سنیں۔" جھومر ان کے پیچھے دوڑی۔

"گلباز اس حرام کو سنبھالو۔ اس کی آواز سن کر دل چاہتا ہے اس کی زبان کھینچ کر آگ میں جھونک دیں۔" وہ پھنکارتے ہوئے حکم دے رہے تھے۔

"آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ میں مر جاؤں گی۔ پاگل ہو جاؤں گی۔ خدا کے لیے۔" وہ پھر دوڑی۔

مگر گلباز تیزی سے درمیان میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر چمک رہا تھا۔

"اگر یہ تمہیں تنگ کرے تو اس کے لمبے ہاتھ کی انگلیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دینا۔ پھر بھی باز نہ آئے تو سیدھے ہاتھ کی انگلیاں بھی کاٹ دینا۔ پھر بھی باز نہ آئے تو اس کی ناک جڑ سے کاٹ کر اپنے شیر کو کھلا دینا۔"

وہ اس طرح فرما رہے تھے کہ آس پاس تازہ خون اور کچے گوشت کی باس محسوس ہونے لگی تھی۔

جھومر نے تڑپ کر اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور وحشت زدہ ہرنی کی طرح گلباز کی طرف دیکھنے لگی۔

تیمور علی خاں کے قدموں کی آواز معدوم ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

گلباز نے اپنی سفاک آنکھیں اس پر جما کر ٹارچ سے ہال کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں [illegible] تیمور علی خاں کے اس کا منتظر تھا۔

وہ محسوس کرنے لگی جیسے اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ اور ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر آگے بڑھنے

آپ کئی سوالات کر سکتی تھیں۔ مجھے اس جگہ بڑی حیرت ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"مگر خیر ۔۔۔ یہ کوئی عیب نہیں۔ اچھی بات ہے۔ یہ بھی کسی انسان کا وصف کہلاتا ہے۔ بعض لوگوں کی بولی سارا کا تاج ہے خاموشی۔

وہ کیا کہا ہے۔ کسی بھلے سے شاعر نے۔

ہم کریں بات دلیلوں سے تو رد ہوتی ہے
اس کے ہونٹوں کی خاموشی بھی سند ہوتی ہے

تو شاید آپ ایسے لوگوں میں شامل ہوتی ہیں۔ آپ جگہ تو نہیں پڑتیں، ابھرے بولتے؟" وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ اس کی آواز کی طرف متوجہ ہی کب تھی۔ اسے تو وہ اپنے خوابوں کا دلال نظر آ رہا تھا۔

وہ بہت مگن انداز میں گنگناتا ہوا ہال کراس کرنے کی طرف آیا تھا۔ رات کے بارہ بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ آج اس کا دوست شاہد سے اپنے گھر پہنچا تھا۔ وہ یہی کنفرم کرنا چاہ رہا تھا کہ آیا وہ گھر پہنچ چکا یا نہیں۔ تا کہ وہ صبح اس سے ملنے جائے۔

ہال کراس کرنے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ بے چاری گلوان شریر لڑکوں کا پھیلاوا ایسی تندہی سے سمیٹ رہی تھی۔ کہیں چلغوزے کے چھلکے۔ کہیں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے۔ کہیں ٹشن کا جبار۔ کہیں اخبار۔ کہیں رسالے۔ کسی طرف ریموٹ کنٹرول۔ تو کسی جگہ ویڈیو کیسٹ۔

ہاری نے سارے "پھیلاوے" پر نظر ڈال کر گلو کی سمت بڑی ہمدردی سے دیکھا اور فون کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت اطمینان سے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنا چاہا۔ مگر ایک دم چونک پڑا۔ وہاں تو بات چیت ہو رہی تھی۔

"گلبانو کی حالت بہت خراب ہے بابا صاحب اس لیے کسی بھروسے کے آدمی کی فوراً ضرورت ہے۔"

"تمہارے پاس اتنے آدمی ہیں۔ ایک بھی بھروسے کا نہیں؟" بابا صاحب پوچھ رہے تھے۔

"یہ بات نہیں ہے۔ آپ سمجھیں ناں لڑکی بہت خوبصورت ہے۔"

"اچھا ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ ہم سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے۔ ہاری کو بھیج دیں؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"میرے خیال میں ہاری ہی مناسب ہے۔" وہ پہچان چکا تھا۔ دوسری طرف کا جانا پہچانا تیمور علی خان تھے۔

"آپ اسے کہیے کہ وہ سویرے حاضر ہو جائے۔ اسے صبح سے پہلے بھیج دیں۔ آپ کو نہیں پتا مجھے یہاں ایک ایک پل بھاری لگ رہا ہے۔ موبائل پر آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

"ارے ۔۔۔ تو کیا تم خود وہاں موجود ہو؟" بابا صاحب کی حیرت آمیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تو پھر کیا کرتا؟ اس کے باپ کو بھیجا تو وہ احمد اس کو لگا اور گھومنے رہا۔"

"ہوں ۔۔۔ ہوں" بابا صاحب کی آواز سے فکر مندی جھلکنے لگی۔

"اچھا ۔۔۔ خیر ۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔ بڑی زحمت ہو رہی ہے تمہیں۔ ہمیں بہت افسوس ہے۔" وہ بیٹے سے مخاطب تھے۔

اور یہی بات آج تک ہاری کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ان کا رویہ تیمور علی خان سے اس طرح کا کیوں سب سے کیوں مختلف ہوتا ہے۔

"ہم ابھی بلواتے ہیں ہاری کو۔ اور کوئی بات۔"

"جی نہیں۔ شکریہ۔ خدا حافظ۔" فون بند کر دیا۔

ہاری نے احتیاط سے ریسیور رکھ دیا۔

"یا اللہ اب کس حسینہ کے امتحان میں گرفتار ہونے والا ہوں۔" اس نے چھت کی طرف دیکھ کر خود سے سوال کیا۔ اس کے کانوں میں تیمور علی خان کی آواز گونج رہی تھی۔ "لڑکی بہت خوبصورت ہے۔"

"بھائی ۔۔۔ کیا میں "لڑکی پروف" ہوں؟" اسے جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ کسی بھی لمحے بابا صاحب کا بلاوا آنے والا تھا اس نے دوست کو فون کرنے کا پروگرام فی الحال ملتوی کر دیا۔

بابا صاحب کے استعمال میں تین ٹیلی فون رہتے تھے۔ موبائل سمیت۔ جن میں سے دو ایک ان کے بیڈ روم تک محدود تھے اور ایک نمبر حویلی کے دو تین ایکسٹینشن تھے۔ شاید تیمور علی خان پریشانی میں ایکسٹینشن والا نمبر ڈائل کر گئے تھے۔ وہ یہ سوچنے لگا۔

"خان نیند نہیں آ رہی ہے۔ چائے بنا دوں؟" گلو آنچل مروڑتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اسے گلو کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"توبہ ۔۔۔ ہاری تمہاری مردانہ وجاہت بھی غضب کی ہے۔ نوکرانیاں تک شرماتی ہیں۔" نہ جانے کب تاران نے اس پر چوٹ کی تھی۔ گلو کی ادا دیکھ کر بے اختیار یاد آ گئی۔

"ابھی بابا صاحب مجھے بلانے والے ہیں۔ وہاں سے واپس آ کر چائے تو ضرور پیوں گا۔ تیار رکھنا۔" وہ گلو کی طرف دیکھنے لگا۔

ماما اوڑھنی جھومتی ہال میں داخل ہوئی۔

"خان ۔۔۔ آپ ادھر بیٹھے ہو۔ میں سارا اوپر دیکھ آئی۔ ادھر یہ بیبیوں کے ساتھ ظلم اڑاتے دیکھتی رہتی ہے۔ اور پھر یہی تک جاگ کر کام کرتی ہے۔ صبح اصول بھلانے پر بھی نہیں اٹھتی۔" ماما نے ایک اشتہار پر دو پرچے ہاتھ میں اٹھایا ہوا تھا پھر ایک پوٹلی تھی جس کی تھیلی میں جلدی جلدی بھرنے لگی۔

"کیا کہہ رہی تھیں ماما؟" ہاری نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"بڑے خان نے یاد کیا ہے آپ کو۔"

"بہت ہی یاد کرتے ہیں وہ ہمیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر تھکے تھکے قدموں سے ان کی خواب گاہ کی سمت بڑھا۔ اور دروازے پر رک کر دستک دی۔

گی۔ خوف و دہشت سے تو جیسے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

اس نے دروازے میں رُک کر ٹفن اور فلاسک فرش پر رکھا اور چادر درست کی۔ پچھلے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم!" اس سے پیشتر کہ وہ سلام کرتی سلام اس تک آ گیا تھا۔

وہ مارے گھبراہٹ کے منہ ہی منہ میں جواب دے کر رہ گئی۔

"وہ ہمارے یار کہاں رہ گئے؟ بڑی خالی خالی سی لگ رہی ہیں آج!"

"وہ ضروری کام سے صبح حیدرآباد چلے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے وہیں سے سیدھا ہسپتال پہنچیں گے۔" بالو نے سامان لٹکانے پر رکھتے ہوئے اپنی چادر سے چہرہ پونچھا۔

"اچھا اگر آج تو شام بھی بڑی مشکل سے ہو گی۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ ایک دم چت لیٹا ہوا تھا۔ بالو نے پلٹ کر اس کی سمت دیکھا۔ "بہت محبت ہے آپ کو اپنے دوست سے؟"

اس نے ٹفن کھولنا شروع کیا۔

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے خدا جانے
محبت کا کوئی دھبہ نہیں ہے جن کے دامن پر

وہی ہوا جس کا بالو کو خطرہ تھا۔ یعنی شعر آ گیا تھا۔

"اٹھیے کھانا کھا لیجیے۔" اس نے ٹرے میں ساتھ لائی ہوئی چیزیں رکھیں اور اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ساتھ ہی شکر کرنے لگی۔ کہ جتنی دیر کھانا کھانے میں مصروف رہے گا۔ وہ شعروں سے تو بچی رہے گی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ٹرے پر نظریں دوڑانے لگا۔ "میرے حصے کی مرغیوں کو تو جان کی امان دے دیں بھابی! تنگ آ گیا ہوں میں اس یخنی سے۔" اس نے معصوم بچوں کی طرح نخرا کیا تھا۔

"یہ آپ کے لیے بہت اچھی چیز ہے عارف بھائی۔ آپ کے دوست دیسی مرغی لاتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹروں نے کہا ہے، آپ کو زیادہ سے زیادہ گوشت استعمال کرنا چاہیے۔ آپ کا خون بھی بہت کمزور ہے۔ "پلازمہ" کی بہت کمی ہو گئی ہے۔" بالو نے شوہر کے الفاظ من و عن دہرا دیے۔

عارف ہاتھ دھونے باتھ روم جا رہا تھا۔ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"انشاءاللہ میری صحت یابی تک، آپ آدھی ڈاکٹر تو بن ہی جائیں گی۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

بالو اس کی مسکراہٹ سے ایک دم محتاط ہو گئی۔ اور اس کے باتھ روم جاتے ہی کرسی اس کے بیڈ روم سے اور دور کھسکا دی اور خود اس کی پشت سے ٹیک لگا کر اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

چند منٹوں بعد وہ باہر آ گیا۔

"بیٹھ جائیے بھابی۔ کھڑی کیوں ہیں؟" وہ رومال جیب سے نکال کر ہاتھ پونچھنے لگا۔

رومال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر کرسی پر ہاتھ پونچھ رہا تھا۔ تو نظریں ادھر ادھر دوڑانی تھیں۔ بالو نے آگے بڑھ کر بیڈ کے نیچے سے پرس اٹھایا۔ اس میں سے بہت سارے نوٹ نکل پڑے تھے۔ اس نے وہ نوٹ واپس سمیٹے۔ پھر سیدھی ہو کر رکھتے ہوئے پرس کو دیکھنے لگی۔ جس میں عارف کی بہت خوبصورت تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہ بے خبری کے انداز میں دیکھتی رہ گئی۔ اس نے نظر اٹھا کر اس کا اجڑا چہرہ دیکھا۔ پھر تصویر پر نظر ڈالی۔ جانے کیوں دل دُکھ سا گیا۔

حالات کی اک ضرب نے صورت ہی بدل دی
مجھ سے مری تصویر ابھی تک نہیں ملتی

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ بالو نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر ہلکی سی ہو کر پرس اور نوٹ اس کے سامنے ڈال دیے۔ اور خود سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"شام کو آپ کے لیے کیا بھجواؤں؟" اس نے خاموشی سے گھبرا کر خود سوال کیا۔

"مونگ کی پھریری دال اور سلاد بس۔"

"آپ نہیں کھائیں گی بھابی؟ آخر یہ تو مریضوں کا کھانا ہے۔ خیر۔ یہ بھی تقدیر ہے۔ کیا کریں۔" وہ ہنس دیا۔ پھر ایک دم کسی گہری سوچ میں اتر گیا۔ چند لمحوں بعد نظریں اٹھا کر اس کا پریشان سا چہرہ دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔

خود غرض لوگوں نے جو حالت بنا دی ہے سلیم
کون کہتا ہے کہ یہ تقدیر اس مٹی کی ہے

بالو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ بیٹھی ہاتھ مسلتی رہی۔

"کمال خان بہت اچھے دل کا آدمی ہے۔ مجھے امید ہے وہ آپ کو بہت خوش رکھتا ہو گا۔" عارف نے نوالہ توڑتے ہوئے موضوع بدلا۔

وہ بدستور خاموش رہی۔

"جب میں یہ رشتہ کرا رہا تھا تو مجھے یقین تھا کہ جو بھی اس کی بیوی بن رہی ہے، بہت ہی قسمت والی ہے۔ میرا یار جتنی کا بھلا کرے کم ہے۔"

بالو نے چونک کر عارف کی شکل دیکھی۔ تو یہ ہے وہ لٹیرا۔ جس نے میرے خوابوں کے خزانے میں لوٹ مچائی ہے۔ اندر ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس کا جی چاہا۔ اس کا گریبان پھاڑ ڈالے۔ چہرہ کھسوٹ ڈالے۔ اتنا کہ لہولہان کر ڈالے۔

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے دیوار پر لگے ہوئے چارٹ کو گھورنے لگی۔ اسے آج تو عارف سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔

"شاید آپ کو زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں ہے۔ ورنہ اس روز جو موضوع میں نے شروع کیا تھا اس سے متعلق

"آؤ بھئی۔ جلدی آؤ۔" بابا صاحب کی آواز سے بہت عجلت جھلک رہی تھی۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔ دلاور علی خاں کمر پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے اسے دیکھ کر رک گئے۔

"ہاری!"

"جی خان!"

"اچھا — پہلے تم بیٹھو۔" وہ اسے بیٹھنے کا کہہ کر خود بھی اپنے بستر پر بیٹھ گئے۔

"بات یہ ہے — تمہیں اسی وقت سرائے جانا ہوگا۔"

اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کے منہ سے نکل جاتا کہ "اس وقت؟" مگر اس نے ہمیشہ کی طرح پرسکون لہجے کے ساتھ صرف اتنا کہا۔

"جی بہتر۔"

"ڈرائیور کو اٹھاؤ۔ تم سارا دن کے تھکے ہوئے ہو اور ڈرائیو مت کرو۔"

"جی بہتر! کوئی اور حکم؟" وہ اٹھنے کے لیے پر تولنے لگا۔

"نہیں — اب جو کچھ کہیں گے تیمور خان ہی کہیں گے۔ تم جاسکتے ہو۔" وہ بستر پر دراز ہو گئے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور ہاں سنو!" انہوں نے پھر پکارا۔

وہ رک گیا اور پلٹ کر ان کے قریب آیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سخت الجھن میں ہوں۔

"ہاری! ہمیں تم پر بہت بھروسا ہے، تم جانتے ہو۔"

اس نے ہاں کہا اور نہ ہی ناں۔ بس خاموش رہا۔

"قطری نے دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر پھاڑ لیا ہے۔ تم ہی تو لائے تھے ڈاکٹر کو؟"

"جی" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک قطری کا ذکر کیوں شروع ہو گیا! اسے تو مختلف قسم کے دورے پڑتے ہی رہتے تھے۔

"ہمیں اس کی بڑی فکر رہتی ہے۔ بڑی دلہن کی صحت تباہ ہو چکی ہے اس کے غم میں۔"

وہ پھر گویا ہوئے۔ وہ پھر خاموش رہا۔

"اچھا — خیر — تم جاؤ۔ جتنی جلد ہو سکے۔" انہوں نے دایاں ہاتھ مٹھی کی شکل میں اپنی پیشانی پر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

ہاری آہستگی سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آیا۔ اور دو جوڑے کپڑے نکال کر بیگ میں رکھے۔ پھر اپنا ٹوائلٹ بکس لے کر باتھ روم گیا۔ وہاں سے چیزیں سمیٹ کر لائیں۔ بظاہر وہ تیاری میں مگن تھا مگر اس کا ذہن اور سرائے میں اٹک رہا تھا۔ کیا ہوا ہے وہاں؟ کیا ہو رہا ہے وہاں؟

وہ بہت دیر تک ہاتھ منہ دھوتا رہا پھر آیا اور اپنے بیڈ کے دراز کی طرف بڑھنے لگا۔

دلاور علی خاں تو اپنی عادت کے مطابق علی الصبح ہی بیدار ہو گئے تھے۔ یہاں بھی ان کے معمول میں فرق نہ آیا۔ دالان کے اسٹول پر کر دالان میں چلے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ کچھ دیر چہل قدمی کریں گے۔ مگر انہیں اندازہ نہ تھا کہ یہاں کا بہت ہی دلکش منظر تھا۔

سفید سی چادر سے خود کو ڈھانپے سفید پیچ پر آلتی پالتی مارے ماہین کچھ سا کلام مجید لیے نہایت انہماک سے تلاوت کر رہی تھی۔ رخساروں پر ایک تواتر سے آنسوؤں کی لڑیاں گر رہی تھیں۔ جنہیں وہ وقفے وقفے سے اپنی چادر سے صاف کر رہی تھی۔ اس کے پاس ہی برابر میں سلیقہ پالتو بلی آرام سے انداز میں مگر جیسے ماتمی کے کمرے میں کوئی بیٹھی ہوئی تھی۔

تازہ غسل کی وجہ سے ماہین میں ایک محسوس کی جانے والی چمک سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بڑا اور دیکھ رہے تھے۔

وہ تلاوت کے دوران آہستہ آہستہ ہل بھی رہی تھی۔

ان کے ذہن کے پردے پر عکس سے ابھرنے لگے۔

فتاں جان کی حقیقی بہن کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی سلسلے میں قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ (حویلی میں) نازنین اور ماہین جو سپارہ پڑھ روم میں سے آ گئی تھی۔

وہ غسل کر کے باتھ روم سے باہر آئے تو ایک دم ٹھٹک گئے تھے۔ شاید انہوں نے اس کو پہلی بار دیکھا تھا۔ سفید کرتی اور ململ کی سفید چادر سے سر ڈھانپے وہ نہایت خشوع و خضوع سے سپارہ پڑھ رہی تھی۔

وہ اور سارا کمرہ تو ایک ہاتھ سے تھپکتا شروع کر رہی۔ اسلام آباد سے پہلے قرآن خوانی کا اہتمام تھا تو سارا ہی گھر آیا ہوا تھا سب ہی اس میں مصروف تھے۔

اس کی نظر اچانک ہی سامنے اٹھ گئی تھی۔

جانے دلاور علی خاں کی نگاہوں میں کیا تھا کہ اسے حجاب سا آ گیا۔ اس نے سپارہ چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔

"کون کون سے در اسے بھی ہے کے عالم۔" وہ ہنس کر باتوں میں بڑھ چلانے لگے۔

"کس کا ذکر ہو رہا ہے۔ کچھ ہوش کریں۔" نازنین نے مصنوعی ناراضگی سے انہیں ٹوکا۔

"تو کیوں اسے منظر عام پر جلوے دکھاتی ہو۔" وہ اسے آئینے میں دیکھتے ہوئے چھیڑ رہے تھے۔

"توبہ" نازنین نے سر جھٹک کر پھر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"زاہدوں کی توبہ تو ٹوٹتی ہی ہے۔ نازنین! کے وضو بھی تو ٹوٹتے ہیں۔"

"خبردار جو کبھی نامحرموں کے سامنے عبادات کی۔ شکر کرو اس وقت کمرے میں تمہارا محرم ہے۔ ورنہ دوبارہ وضو کرنا پڑتا۔"

انہوں نے چونک کر ماہین کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ ان کے اپنے ہی منہ سے نکلے ہوئے الفاظ انہیں چڑانے

گئے۔ انہوں نے واپسی کے ارادے سے قدم بڑھایا۔

"آ بیٹھیں نا۔ یاور بھائی۔ بیٹھئے۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" ماہین نے انہیں جاتے دیکھ کر جلدی سے پاؤں نیچے اتارے۔

"نہیں نہیں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ چائے اتنی ضروری تو نہیں۔ اور ملازم ہے۔ روشی ہے۔" اس کی طرف دیکھے بغیر وہ جواب دے رہے تھے۔

"تو بیٹھ جائیے نا۔ واپس کیوں جا رہے ہیں؟"

"آپ مطلبِ عبادت میں ہیں۔ مناسب نہیں لگتا۔" وہ نظر چرا کر سامنے درخت پر بیٹھی سرمستی چڑیا کو دیکھنے لگے۔ ماہین جیسے کٹ کر رہ گئی۔ پھر کچھ وقت کے بعد مسکرا پڑی۔

"ارے بیٹھئے آپ۔ آپ تو ہمارے محرم ہیں۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں۔"

یاور علی خان شاید ہی زندگی میں کبھی اس طرح لاجواب ہوئے تھے۔ کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے اور نہ بولا۔

اسے سپارہ مکمل کرنے میں پانچ سات منٹ مزید لگے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ادھر ادھر جھانکتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شاید کہیں یاور علی خان بیٹھے ہوئے ہوں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دیے۔ تم ان بھی اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ آج سوموار تھا۔ ظاہر ہے وہ انتظامات میں مصروف ہوگا۔

"تحمان۔ یاور بھائی کو اور چائے بھجوا دو۔"

"روشی بی بی لے گئی ہیں۔ ساتھ والی بیگم صاحبہ کے ہاں سے ناشتہ آیا تھا۔ وہ اسی وقت چائے لے گئی تھیں اپنے ساتھ لے۔" ملازم نے تفصیل سے جواب دیا۔

ماہین کو روشی پر ڈھیر سارا پیار آ گیا۔ بڑی ذمہ دار ہو گئی ہے یہ روشی تو۔ بہت اچھی بات ہے۔ اس کے علاوہ اور خیال بھی کون رکھے گا یاور بھائی کا۔

وہ زینے طے کر کے اوپر ان کے کمرے میں پہنچی۔ یاور علی خان اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے چائے بھی پی رہے تھے۔ روشی ان کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔

"پپا۔ خالہ تو بہت زیادہ دکھی ہو گئی ہیں۔ بے چاری کا کوئی بھی نہیں رہا۔ نہ امی نہ نانا۔ پھر ہماری امی جیسی اتنی پیاری بہن۔ پتا نہیں نانا جان نے ابھی تک ان کی شادی کیوں نہیں کی تھی۔ شاید پڑھائی کی وجہ سے۔ مگر پڑھائی تو شادی کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ شادی بھلا کیا کہتی ہے؟ بعض لوگ شادی سے پہلے بالکل بھی قابل ذکر نہیں ہوتے۔ مگر شادی کے بعد بڑے کام کرنے لگتے ہیں۔ شاید یہ قابل فاضل لائف پارٹنر کی وجہ سے۔ اچھے لائف پارٹنر سے حوصلہ بہت ملتا ہے۔ اگر خالہ کو اچھا لائف پارٹنر مل جائے تو وہ ساری ٹینشن بھول جائیں گی۔ ایم آئی رائٹ پپا؟" اس نے پلٹ کر باپ سے دریافت کیا۔

"بالکل نہیں۔" وہ ابھی تک اخبار میں منہمک تھے۔

"تھینکس پپا۔ خالہ کی شادی ہم کریں گے۔ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"کیوں نہیں۔ بالکل۔" وہ اسی طرح مصروف انداز میں بولے جا رہے تھے۔

"تو پھر"

"ابھی ایسی باتوں کا ماحول نہیں ہے۔ تم اس طرح کی باتیں اور کسی کے سامنے ذکر نہ کرنا۔" انہوں نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

"ٹھیک ہے۔"

"روشی! تم نے چائے پی لی؟" اب وہ دوبارہ دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔

"آپ اس طرح کے تکلفات میں خود کو پریشان نہ کریں۔ یہ وقت اس طرح کی باتوں کے لیے سازگار نہیں۔ اس کا گھر ہے۔ یہ اپنے کام خود کر سکتی ہے۔" یاور علی خان نے جیسے ہار کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"آ بیٹھ"

"روشی اپنی خالہ کے لیے چائے لاؤ۔ فی الحال تمہیں ان کا خیال رکھنا ہوگا۔"

روشی نے باپ کا حکم سن کر فوراً استری کا پلگ نکال دیا۔

"پھر ابھی نہیں ہے۔ تم اپنا کام کرو۔" اس نے روشی کو جاتے دیکھ کر روکا۔

"تم جاؤ روشی۔" انہوں نے روشی کو روانہ کر دیا۔

ماہین ان سے فاصلے پر پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"یہ روشی بہت سادہ اور جذباتی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھے تو آپ برا نہ منائیے گا۔ میرا مطلب ہے کوئی خیال نہ کیجئے گا۔"

"شکریہ۔ آپ کچھ بیٹی کے بھی ہوئے۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہو رہی ہے۔" ماہین نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"انسان سب سے زیادہ اپنی اولاد کو ہی ہوتا ہے۔ اولاد انسان کے اپنے وجود ہی کا تو پرتو ہوتی ہے۔ بہت برے گمان رکھتی ہیں آپ ہمارے بارے میں۔" وہ مبہم سا مسکرائے۔

"کیا کریں۔ آپ اپر جشنری ایسے رہتے ہیں۔" اس نے صفائی سے خود کو بچایا۔

"شکر۔ آپ کے تو ہم مشکور ہیں۔" وہ اخبار تہہ کرنے لگے۔

"وہ کس سلسلے میں؟" وہ واقعی حیران ہوئی۔

"بتائیں گے۔ پھر کسی وقت۔" انہوں نے ایک نظر اسے کو اس کا چہرہ دیکھا۔

"کس وقت؟" اسے جیسے بے چینی سی ہونے لگی۔

"ابھی وقت کا تعین نہیں ہے۔" انھوں نے پھر سرسری نگاہ سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"تو کر لیجیے، اور بتا دیجیے۔" وہ خاصی بے صبری نظر آئی۔

"اتنی جلدی تو میں کسی پڑھے ہوئے مصروف شخص پر بھی سوار نہیں کرتا۔" انھوں نے سگریٹ سلگانا شروع کر دی۔

ماہین نے گہرا سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ جیسے ہار مان لی ہو۔

"حالانکہ بیورو کریسی کسی وقت کی محتاج نہیں ہوتی۔" اس نے لطیف سا طنز کیا۔

یاور علی خاں بے ساختہ مسکرا دیے۔

"مجھے خوشی ہے اتنا عرصہ باہر رہنے کے باوجود آپ اپنے ہاں کے امور الحمد للہ سے بے خبر نہیں۔ اور اپنے ملک کی ریڑھ کی ہڈی پر بہت خاصی معلومات رکھتی ہیں۔"

"خیر، اب تو یہاں فوج ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آپ جانتے بھی ہوں گے فوجی سویلین کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟" وہ بڑی خود اعتمادی سے کہہ رہی تھی۔

"مگر اس سے سویلین کی اہمیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیر چھوڑیں۔ کسی نازک اندام خاتون کو وہ عموماً اس طرح کی بحث نہیں کرتے۔" انھوں نے فوراً بحث سمیٹی۔

"جی؟" اس نے چونک کر یاور علی خاں کی سمت دیکھا۔ وہ ابھی ان کا انداز سمجھ نہیں پائی تھی۔

سفید کلف شدہ کاٹن کے شلوار سوٹ میں سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے یاور علی خاں اسے نہ جانے کیوں بہت پُراسرار محسوس ہوئے۔

"بعض اوقات آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ چونکہ اپنی خاموشی پر خود ہی خجل تھی اس لیے وضاحت کرنے لگی۔

یاور علی خاں نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی اور سامنے لگے قیب احمد کے پورٹریٹ پر نظریں جما دیں۔

"بات سمجھنا یا نہ سمجھنا کوئی مسئلہ نہیں۔ اصل بات سمجھنے کی کوشش ہے۔ ویسے ایک بات کا کریڈٹ میں آپ کو ضرور دوں گا۔ پچھلے بیس سالوں میں، میں نے اتنی گفتگو نہیں کی جتنی آپ مجھ سے کروانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ جیسے میرا سارا سسٹم آپ کے کنٹرول میں چلا گیا ہے۔"

"شکر کریں صرف والیم سسٹم۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

یاور علی خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سائے کی طرح رینگنے لگی۔ وہ اپنے مخصوص دل آویز انداز میں کش لگا رہے تھے دھواں بکھیر رہے تھے۔ پیشانی کی چند افقی چند عمودی لکیریں ان کے چہرے کو ایک انوکھا سا وقار عطا کرتی تھیں۔ بڑی مونچھوں تلے ہونٹوں پر سائے جیسی مسکراہٹ ان کی پوری شخصیت میں عجیب طرح کا طلسم پیدا کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ماہین نے ان کی شخصیت میں دلبری سی محسوس کی۔ پھر وہ اپنے احساسات سے خود ہی خوفزدہ ہو گئی۔

"اچھا، میں چلتی ہوں۔ پہلے ہی بہت لیٹ ہو رہا ہے۔" وہ چادر سر پر جما کر کھڑی ہونے لگی۔

"ارے۔ روشی چائے لینے گئی ہے۔ بس آتی ہو گی پانچ منٹ میں۔"

ان کے انداز میں "اشرافیہ پن" محسوس کر کیا تھا شعوری طور پر۔ ماہم بولنے کے انداز سے واقعی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔

وہ چپ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے اس کی خود اعتمادی جواب دے رہی ہو۔

"خالہ مجھے تو آپ کے گھر میں کام کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے جب آپ ہمارے پاس شفٹ ہو جائیں گی تو آپ کو بھی اچھا لگے گا۔ حویلی میں تو اس قدر کہ میں کروں گی کوئی اعتراض نہیں۔ بعض اوقات تو دل چاہتا ہے کہ تتلی کی طرح اڑتی پھروں، ہل ہل کر چیتیاں ماروں۔"

ماہین غم اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں جاتی تھی بے اختیار مسکرا دی۔

حالانکہ مجھے یہ پوچھنا تھا کہ صاحب کب سے آئے، یقین دلا رہے تھے کہ اب وعدوں میں دستخط ہو سکے گی۔

"روزانہ مجھے پتہ نہیں چل جائے گا۔" اس نے جھالوں کو حقیقت کا چہرہ دکھایا۔

"ہاں سمجھ لیں گے۔ بیٹا اندر سے خوش ہو تو خود بخود دھیما پیدا ہوتا ہے۔ کہاں پھنسی؟"

"شاید۔" وہ دلچسپی سے روشی کو دیکھنے لگے۔

ماہین چائے پینے لگی تھی۔ اور روشی نے استری کا پلگ پھر سے لگا دیا تھا۔

عمران پریشان ہوا تو اس نے مدتوں سے چھوڑ رکھا تھا۔ فی الحال تو بس ایک کوفت کا عالم تھا۔ وہ صبح پانچ بجے کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ تیمور علی خاں ایک اذیت اور ناگواری کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر طمانیت بھرا سانس انھوں نے لیا تھا۔

"پریشان مت ہونا۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں۔ دو تین دن ہی میں دماغ درست ہو جائیں گے۔ تمہیں بس اتنا خیال رکھنا ہے کہ یہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ جو سامان تمہیں لانے کو کہا تھا، لے آئے ہو؟"

وہ اس کے ساتھ آتے ہوئے سرائے کے ملازم سے مخاطب ہوئے۔

"یہاں ہائی وے ٹاؤن میں جو کھانا ہے، یہ صرف تمہارے لیے ہے۔ یہ بچے کیسے ہیں۔ وہ کھانا مانگے تو یہ کیسے دینا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ پینے کے لیے پانی مانگے تو تھوڑا سا گرم کر کے دینا۔ ٹھنڈے پانی کا قطرہ بھی اس کے حلق میں نہیں جانا چاہیے۔ کل پرسوں تک ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر حویلی ساتھ ہی لے جانا۔ اور زیادہ ہی اذیت لگی تو ہم تمہیں جلد بھجوا دیں گے۔ تمہارا دماغ میں گھبراہٹ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ سنبھل جائے گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے اس کی بات سنے بغیر بڑی عجلت میں اپنی جیپ کی طرف بڑھے۔ جبکہ ملازم کو اشارے سے ساتھ کھڑی گاڑی کی سمت متوجہ کیا۔

"یہ گاڑی ہماری کے لیے رہنے دو۔ کوئی ضرورت پیش آ سکتی ہے ورنہ جب یہ واپس آئے گا تو ساتھ لے آئے گا تم

جیپ ڈرائیو کرو۔ حسن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔"

"وہ ہال کمرے میں ہے۔ باہر سے دروازہ چیک کر کے تم بھی آرام کرو۔ تھک گئے ہو گے۔ ساری رات سوئے بھی نہیں ہو۔"

تیمور علی خان نے جیپ میں بیٹھ کر باقی ماندہ گفتگو مکمل کی۔ اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔

"خدا حافظ خان!" اس نے ہاتھ ہلایا۔ اور چاروں طرف پھیلے ہوئے اجاڑ بیابان علاقے کو دیکھنے لگا۔

"یا الٰہی۔ ابھی کیا کیا دیکھنا ہے اس آنکھ نے؟" اس نے گہرا سانس اندر کھینچا اور بوجھل قدموں سے آگے بڑھ کر اٹھا لیے۔ حسن اور خیرو کا اس قدر رعب تھا کہ اسے رتی برابر دلچسپی نہیں تھی کہ ان تھیلوں میں کیا کچھ ہے۔ اس نے دونوں تھیلے اٹھا کر درمیان کے کمرے میں رکھی ایک کرسی پر رکھ دیے۔

ساری عمارت ہی ویرانی کا نشان تھی۔ گزارے لائق بھی سامان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب کیا کروں یہ سوچتے ہوئے وہ سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

خیر۔ اور کمرے بھی چیک کرتے ہیں۔

اوہو۔ پہلے اس کی چیکنگ تو کر لی جائے۔ جس کے سبب کالے پانی آئے ہیں۔ خدا جانے کون ہے بے چاری۔ کس کی شامت آئی ہے؟

وہ ہال کمرے کی طرف آیا۔ دروازے کو بغور دیکھا جو ہلکے سے اجالے میں واضح نہیں تھا۔ بہر حال وہ باہر سے بند تھا۔ پھر بھی اس نے ہاتھ لگا کر اطمینان کرنا ضروری سمجھا۔

پھر وہ باقی کمرے دیکھنے لگا۔

سب سے آخری کمرے میں بلا ضرورت ایک بان سے بُنا ہوا پلنگ نظر آ گیا۔ سرہانے تکیہ اور پائنتی پر ایک کھیس رکھا ہوا تھا۔

اس نے پلنگ پر بیٹھ کر تکیے پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا کہ یہ تکیہ استعمال کیا جائے یا نہیں۔

پھر شاید دل مانا نہیں۔ اس نے تکیہ ایک طرف ہٹا کر کھیس تہ کر کے سر کے نیچے رکھا اور دراز ہو گیا۔ تھکا ہوا جسم ہی تھا۔ چند لمحوں میں غافل ہو گیا۔

عام دنوں میں اس کی نیند کا دورانیہ پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر آج آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ وہ معمول سے زیادہ سویا ہے۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پہلا خیال یہ آیا۔ وہ قیدی لڑکی رات سے اب تک بھوکی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے پاؤں میں اپنی پشاوری چپل پھنسائی اور تیزی سے ہال کمرے کی طرف آیا۔

زنگ آلود کنڈی بڑی محنت سے کھلی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اچھا خاصا دن چڑھ چکا تھا مگر کمرے میں روشنی کہیں سے آتی دکھائی نہیں دی۔ نیم تاریک سا ماحول تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

ہال کے آخری سرے پر بچھا تخت نظر آیا۔ اور اس تخت پر ایک وجود۔ سفید دودھیا ہاتھ اور پاؤں جسم پر ایک ماحول میں چمک رہے تھے جیسے اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے تخت پر موجود وجود ساکت ہے۔ یہ خیال نہایت پریشان کن تھا۔ وہ بڑی تیزی سے تخت کے قریب پہنچا تھا۔

"سنو بی بی! اٹھو۔" اس نے آواز دی۔

جواب میں وہی خاموشی چھائی رہی۔

"اٹھو لڑکی۔ دوپہر ہو چلی ہے۔ کچھ کھا پی لو۔"

وجود خاموش تھا۔

اب آنکھیں تخت پر لیٹے وجود کو واضح دیکھنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ لڑکی کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ پاؤں بھی سمٹے ہوئے تھے۔ ساری طرف اس کی پشت تھی۔

اس نے آہستگی سے اس کا کندھا ہلایا۔ "اٹھو بھی۔"

جسم میں اب بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

اب تشویش پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اس نے اس کا بازو تھام کر اپنی طرف موڑا۔ وہ کسی بت کی طرح لڑھک گئی۔ سفید کھلتا چہرہ اب اس کے سامنے تھا۔ مگر دھندلے سے ماحول میں پہچان نہیں سکا۔

ایک لمحے کو وہ ساکت سا کھڑا رہ گیا۔

پھر فوراً ہی سر جھٹک کر دیواروں پر نظریں دوڑانے لگا۔ بڑے بڑے دریچے دو طرف موجود تھے۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر دونوں دریچے کھول ڈالے۔ دریچے کھلتے ہی کمرا روشن ہو گیا۔ وہ پلٹ کر لڑکی کی طرف آیا۔ اور بُری طرح چونک پڑا۔

"چھوٹی بھابی!"

وہ اتنی بُری طرح چکرایا تھا کہ فوراً خود پر قابو نہ پا سکا۔ سر تھام کر رہ گیا۔ پھر جیسے کسی خیال سے چونک پڑا۔ اور اس کی کلائی تھام کر نبض ٹٹولی۔ جو گھبراہٹ میں رکی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ اس کے دل کی جگہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک گونہ سکون اس نے محسوس کیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ وہ تیزی سے باہر آیا۔ اور پانی تلاش کیا۔ باہر دالان میں ہینڈ پمپ تو نظر آ گیا مگر آس پاس کوئی برتن دکھائی نہیں دیا۔ اب کچن تک رسائی ضروری تھی۔ وہ سامنے نظر آنے والے دروازوں کی سمت بڑھا۔ ان میں سے ایک کچن کا دروازہ تھا۔ کچن کیا تھا ایک نظر میں تو کباڑ خانہ محسوس ہوا۔ چولہے سے راکھ اڑ کر دروازے تک آ رہی تھی۔

دیواریں اور چھت دھوئیں سے اٹی ہوئی تھیں۔ چند قدیم قسم کے برتن ادھر ادھر لڑھکے ہوئے تھے۔ بڑی سی چنگیر میں باجرے اور مکئی کے کچھ ٹکڑے تھے۔ ایک طرف جھاڑو۔ دوسری طرف لکڑیوں کا گٹھر۔ اس نے زمین پر سے ایک بے ہنگم سا گلاس اٹھایا۔ اور ہینڈ پمپ کی طرف آیا۔

جلدی سے گلاس دھویا، پانی بھرا اور جمہور کے پاس آ گیا۔

پانی کے چھینٹے مارے۔ ہتھیلیاں سہلائیں۔ تلوے رگڑے۔ جو جتن کر سکتا تھا کیے مگر اسے ہوش نہیں آ رہا تھا۔ دوبارہ پانی کے چھینٹے مارے۔

بے بسی کے احساس نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔

اس نے اس کی ناک کے آگے ہتھیلی کر کے سانس کی رفتار چیک کی جو بہت کم محسوس ہوئی۔ ایسی صورت میں بار بار سانس روکنے کا عمل کرنا خطرناک تھا۔ اس نے گلاس کا سارا پانی اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ "یا اللہ میرے حال پر رحم کر، کہیں 'قتل' ہی مجھے نہ پڑ جائے۔" اس نے عالم بے بسی میں دعا کی۔ اور دوبارہ گلاس بھرنے ہینڈ پمپ کی طرف جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس ہوا۔

دوبارہ چھینٹے مارے۔ اب اس نے بزرگوں کا ٹوٹکا آزمایا۔ پاؤں سے جوتی اتار کر بے چاری کی ناک سے لگا دی۔ سونگھنے اور سانس کا عمل ہی بے حس تھا۔ ہائے افسوس وہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

پھر پانی اس کے چہرے پر پھینک دیا۔ اور آخری چارے کے طور پر مصنوعی سانس دینے کی تدبیر آزمانا چاہی۔ حالانکہ اس کا دل گوارا نہیں کر رہا تھا۔ مگر حویلی کے بااختیاروں نے اسے قطعی فیصلہ پر پہنچنے پر مجبور کر دیا۔

اسے یقین تھا اگر یہ مر بھی گئی تو اسے بچا لیا جائے گا۔ مگر بچنے کے باوجود معنی خیز نظروں کا سامنا آسان بات نہ تھی۔ قتل کے الزام کے ساتھ زندہ رہنا تو پھانسی سے بھی بڑی سزا ہے۔ وہ بھی اس شخص کے لیے جس نے کسی کے رخسار پر تھپڑ بھی نہ مارا ہو۔

وہ دونوں ہاتھ تخت پر جما کر اس کے چہرے پر جھک گیا۔

اسی لمحے جمہور نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

اور ہادی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے کند چھری سے ذبح کر دیا ہو۔ وہ ایک دم پورے قد سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پہلا لفظ کیا بولے۔ کس طرح بتائے کہ وہ ایک بے بس انسان کی مدد کر رہا تھا۔ جمہور چند لمحے حیران پریشان آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اپنا دوپٹہ سنبھالا۔ اور تخت سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر بھوک نے عجیب سی پیلاہٹ بکھیر دی تھی۔ ہونٹوں پر پیاس نے پپڑیاں جما دی تھیں۔ مگر آنکھوں میں حقارت کے جذبے نے بڑی قوت بھر دی تھی۔ اس نے فرش پر تھوک دیا اور دوسرے ہی لمحے ہادی کا گریبان دبوچ لیا۔

"ظفری کی بیوی نہیں ہوں۔ داشتہ ہوں۔

وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ وہ نارمل نہیں ہے۔ اس پر شریعت کے کسی رکن کی پابندی کا اطلاق نہیں۔ جس کا مواخذہ نہیں۔ جس کی پوچھ نہیں۔ کسی بھی عبادت کا حساب نہیں۔

پھر اس کا نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟

اور جب نکاح ہی نہیں ہوا تو کون بیوی کیسی بیوی۔ اس بھری بستی میں مجھ جیسی لڑکی پر تمہیں بڑی قدرت حاصل ہے۔"

ہادی نے ایک الزام کی تیز دھار کو اپنے وجود پر چلتی محسوس کی۔ اس نے حواس کو سمیٹتے ہوئے بچاؤ کیا۔

"بھابی! آپ پہلے میری بات تو سنیں۔" اس نے اپنا گریبان چھڑواتے ہوئے درخواست کی۔

"خبردار جو مجھے بھابی کہا۔ بیاہتا کو کہتے ہیں۔ بغیر نکاح کے کوئی لڑکی کسی کی بھابی نہیں ہوتی۔

اور تم بھی اپنی بھابی کی ہی عزت افزائی کر رہے تھے۔"

"خاموش ہو جائیں پلیز۔ آپ کو پہلے میری بات سن لینا چاہیے۔" اس کی آواز میں غصے اور احساس توہین کا واضح ارتعاش تھا۔

"کوئی بات نہیں سننا مجھے۔ سنا تم نے۔ تم حویلی کے کارندے ہو اور ان سب سے مختلف کیسے ہو سکتے ہو۔ تم بھلے"

جمہور کو چکر آ گیا۔ اس نے لپک کر تخت تھام لیا۔

"آپ بے ہوش تھیں؟"

"پھر تم اس بے ہوشی کا ہی فائدہ اٹھا رہے تھے۔" جمہور نے بھڑک کر اس کی بات کاٹ دی۔ ہادی نے بہت عجیب سی زندگی گزاری تھی۔ اور اس پر جوانی بھی ٹوٹ کر آئی تھی۔ لڑکیوں کے ساتھ ہنسی مذاق بھی چلتے رہتے تھے۔ مگر اس طرح کی بات کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ یہ اس کے سان و گمان میں نہ تھا۔ اسے اپنی توہین برداشت کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر یہی چارہ تھا کہ اسی وقت اس بے وقعت سی لڑکی کا گلا دبا دے۔

"مجھے سطحی بیانوں سے مت بہلائیے۔ گھن آ رہی ہے مجھے آپ سے۔ آپ میری بات سنے بغیر مجھے اس طرح ذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔

آپ کو معلوم ہے آپ کتنے گھنٹوں سے غشی یا بے ہوشی کے عالم میں تھیں۔ اور یہ کہ اس وقت کیا بجا ہے؟ دفتروں میں لوگ آدھا کام نمٹا کر لنچ کر رہے ہوں گے۔ میں صبح پانچ بجے سے یہاں ہوں۔ اور آپ گھنٹوں سے بے خبر۔

شرم آ رہی ہے مجھے آپ سے یہ بات کہتے ہوئے۔ کہ اس وقت آپ بے ہوش تھیں۔ اب تو ہوش میں ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ لے لیجیے اپنا جائزہ اور دیکھیے آپ کے ساتھ کیا کیا گیا ہے۔ آپ کا گواہ آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ اب کہیے کہ آپ نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔" اس کی نظروں سے خون چھلکنے لگا۔

"کیوں لوں میں اپنے الفاظ واپس۔ ہوا نہیں تو کیا ہوا۔ ہو سکتا تھا۔ وہ تو اللہ نے مجھے بچا لیا۔" جمہور کے لہجے میں نفرت کا زہر گھلا ہوا تھا۔

"آپ میں اگر شعور کی کمی نہ ہوتی تو آپ یہاں قید کیوں کی جاتیں؟ کی ہوگی کوئی بڑی حماقت جتے خانوں سے۔

آپ کی سانس بہت کم ہو چکی تھی۔ اور میں اس حویلی میں جادو کے زور پر کوئی آکسیجن سلنڈر پیدا نہیں کر سکتا۔ جس

طرح مجبوری میں مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا عمل تھا۔ اب آپ یقین کریں یا نہ کریں مجھے اس کی پرواہ نہیں۔

باہر وہ تھیلوں میں کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ آپ استعمال کر سکتی ہیں۔ حالانکہ مجھے ہدایت ہے کہ آپ کو بے ہوش رکھنے تک کچھ کھانے کو نہ دیا جائے۔ ویسے آپ کھا لیں تو بہتر ہے۔

شاید اس طرح آپ واقعی مر جائیں۔ یوں بھی ایسی زندگی کا کوئی فائدہ تو نہیں۔ مجھے افسوس ہوا ہے کہ آپ کو بچانے کی کوشش کیوں کی؟ میں نے اس سے زیادہ بدصورت چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔"

جھومر دونوں ہاتھوں کو تخت پر ٹکائے بمشکل بیٹھی ہوئی تھی۔ مسلسل فاقوں کا اثر تھا کہ اسے اب چکر آ رہے تھے۔

اس وقت تو جذباتی قوت نے اسے اٹھا دیا تھا۔ مگر نقاہت کے سبب یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی تھی۔

اس نے تخت پر رکھا گلاس اٹھا کر اندر جھانکا۔ بہت تھوڑا سا پانی تھا۔ اس نے بے تابی سے گلاس منہ سے لگا کر حلق میں انڈیل لیا۔

عجیب سے ذائقے والا۔ نمکین سا پانی۔ مگر اسے یوں لگا جیسے بہشتی مشروب ہو۔

پانی حلق میں پڑتے ہی جیسے کسی برقی قوت نے اندر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ پھر گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

پھر آہستہ سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی تیز چمکتی دھوپ کا احساس ہوا۔ راہداری کے دونوں سرے پوری طرح روشنی سے روشن تھے۔

اس نے کچھ دیر سوچا پھر دالان کی سمت کا راستہ اختیار کیا۔

باہر آ کر سب سے پہلے اس کی نظر ہینڈ پمپ پر پڑی۔ وہ سیدھی وہیں آئی۔ اور پمپ چلا کر ایک ہاتھ سے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے لگی۔ ٹھنڈے پانی کے احساس نے سارے وجود کو تقویت پہنچانا شروع کر دی۔ وہ مسلسل منہ پر پانی ڈالتی رہی۔ نہ جانے ایک دم کیا ہوا۔ پمپ سے پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جتنا رو سکتی تھی روئی حتیٰ کہ نڈھال ہو گئی۔

کافی دیر سسکیاں لیتی رہی۔ پھر دوبارہ چہرے پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔

اور بعد میں دوپٹے سے چہرہ پونچھا۔ اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے اٹھنے میں بڑی دقت پیش آ رہی ہو۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ واپس چل پڑی۔ راہداری سے گزرتے ہوئے درمیان کے کمرے میں رکھا ہوا بیگ اسے دکھائی دیا۔ کانوں میں ہادی کے الفاظ گونجے۔ وہ جیسے نئے سرے سے زندہ ہو گئی۔ بیگ کی طرف بڑھتے قدموں میں خاصی تیزی آ گئی۔ اس نے بیگ کھول کر اشیاء دیکھنا شروع کیں۔

بسکٹ کے پیکٹ، چپس، فریش ویل ایئر ٹائٹ ڈبوں میں کھانا۔ ڈبل روٹی کے پیکٹ۔ جیلی اور مارملیڈ کی شیشیاں۔ الغرض اور جانے کیا کیا۔ وہ تو جیسے ایک دم حواس باختہ ہو گئی۔

یہ سب تیمور خان نے اس کے لئے بھجوایا ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔

یقیناً ہادی اپنے ساتھ لایا ہوگا۔ اسے بہت اچھا پکانے کی عادت ہے۔ ظاہر ہے انتظام سے آیا ہے۔

اس نے ڈبل روٹی نکال کر اس پر جیلی لگا کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسی۔ جیسے چھن جانے کا خطرہ ہو۔

بھوکے اور خالی پیٹ میں خوراک کیا پڑی جیسے آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ اس نے چپس کا پیکٹ دوپٹے میں رکھا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

ہادی ابھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔

وہ ہال کمرے میں جانے کے بجائے راہداری میں سیدھی چلی گئی۔ ننگے پاؤں تھی۔ اس لئے چال بے آواز تھی۔ دوسری طرف احاطے میں ابھی نظر نہیں آیا۔ جہاں زنانے کمرے کے جھاڑ جھنکار اگے ہوئے تھے۔

اچانک اس کی نظر کھڑکی کے طویل و عریض چوکھٹ پر پڑی۔ جس کا درمیانی کھڑکی نما راستہ کھلا ہوا تھا۔ یقیناً یہ ہادی تھا۔ اس کے اندر جانے کے لئے زنانی کا شک محسوس کیا۔ ایک نظر اپنے پیچھے ہی ڈال کر اور احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتی چھلانگ سی آئی۔ اس نے جھک کر کھڑکی نما دروازے سے باہر قدم رکھا۔ اس کا بازو وہیں قبضے میں تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

"تشریف لے چلیے اندر۔ اور آئندہ اس قسم کی کوئی بہادری دکھانے کی کوشش کی تو نتیجے کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔"

ہادی نے اسے کھینچ کر اندر کیا اور دروازے کو دوبارہ مقفل کر دیا۔

"شاید مجھے آپ سے ہمدردی ہو جاتی۔ مگر اب نہیں ہو سکتی۔ کوشش کیجئے گا جب تک میں یہاں ہوں آپ میرے سامنے نہ آئیں۔"

اس نے دروازے میں تالا ڈالتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

"آپ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھیے۔ یہ کتنے بندھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انہیں کھلا رکھنے کا حکم ہے۔ اب میرا اور آپ کا سامنا نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ چابیاں اپنی مٹھی میں دبوچتا اس سے پہلے آگے بڑھ گیا۔ وہ کواڑ کی اوٹ سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اسے بچنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔ کیا میں نے اس کی اصلیت دیکھی نہیں۔ اس کے لہجے میں انکار سے ناچنے لگے۔ ہونہہ۔

اگر قدرت نے مجھے موقع دیا۔ پہلی فرصت میں اس کے منہ سے نقاب نوچ لوں گی۔

ہال کمرے میں تو جیسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ وہ دوبارہ دالان میں آ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر کچن میں چلی آئی۔

ہادی کی کارگزاری دیکھ کر تو جیسے اس کی وحشت اور بڑھ گئی۔ اس نے بکھرے پڑے ہوئے برتن سمیٹے اور ہینڈ پمپ کی طرف آئی۔ اور ایک برتن میں پانی لے کر برتن دھونے لگی۔

اچانک اس کا ذہن ماحول کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بھری دوپہر کا عالم تھا۔ اس پر برگد اور کیکر کے درختوں پر بیٹھے

کوؤں کی کائیں کائیں نے بیابان اور سناٹے میں عجیب قسم کی ناگواری سمو دی تھی۔

تنہائی اور بیابانی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کے ہاتھوں کی گرفت خود بخود ڈھیلی ہو گئی۔ وہ خوفزدہ سی

ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

پھر اسے ایک دم باری کا خیال آیا۔ دھڑکن پھر سے رواں ہو گئی۔ وہ دوبارہ برتن رگڑنے لگی۔

مگر وہ تو لٹیرا ہے شاید۔ وہ کیا میرا تحفظ کرے گا۔ اس سے تو کالو اچھا ہے۔ اچھا خاصا بڑا تھا۔ حسن علی خاں اسے

کہتے ہیں۔ بہت ہی کوری کم بخت ہے خان کی۔ وہ ہنس کر پھر سے مسکرائی۔

اچانک اس کی پیٹھ پر ایک چھوٹا سا پتھر لگا۔ برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔

وہ خوفزدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں دوبارہ بیٹھ گئی۔

ابھی برتن اٹھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ پھر ایک کنکری اس کی پشت پر پڑی۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہاں

اینٹوں کی دیوار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ خاصی دیر اسی طرف چہرہ کر کے دیوار کو گھورتی رہی مگر کچھ نہ ہوا۔ تو واپس

بیٹھ گئی مگر ذہن بہت الجھ گیا تھا۔

باری کو اس نے خود آخری کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر وہ باہر آتا تو سامنے سے آتا۔ پھر یہ کیا

ہو رہا ہے۔ وہ گم صم سی بیٹھی سوچنے لگی۔ پھر ایک نرم سی چیز دھپ سے اس کی کمر سے ٹکرائی۔

اس نے مڑ کر کمر سے لگنے والی چیز کو دیکھا۔ سیاہ رنگ کا بلی کا مردہ بچہ تھا جس کی سبز آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ اس کی

چیخ نکل گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کمرے کی طرف آئی جہاں باری کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔

باری ایک موٹی سی کتاب چہرے کے سامنے کیے لیٹا ہوا تھا۔

”باری۔ پتا نہیں کون مجھے بہت دیر سے تنگ کر رہا ہے۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”آپ سے کس نے کہا ہے آپ حویلی میں چہل قدمی کریں۔ جا کر لیٹیے اپنے تخت طاؤس پر۔“ اس نے چہرے کے

سامنے سے کتاب ہٹائے بغیر ہی جواب دیا۔

”وہ جو کوئی بھی ہے تمہیں بھی پریشان کر سکتا ہے۔“ وہ بگڑ گئی۔

”مائی فٹ!“ وہ بڑبڑایا اور قدرے لاپروائی سے صفحہ پلٹ دیا۔

”جائیے آپ یہاں سے۔ فی الحال آپ نہیں مریں گی۔ اطمینان رکھیے۔“

وہ ہونٹ کاٹتی واپس ہینڈ پمپ کی طرف آ گئی۔ اس کی آواز میں کرم از کم ذرا سا اس کا احساس تو ہو گیا تھا، کچھ دیر پہلے

والا خوف معدوم ہو گیا تھا۔ اس نے دور پڑا برتن اٹھایا اور رخ تبدیل کر کے مانجھنے لگی۔ اب پہلے کے مقام کی طرف اس کا

چہرہ تھا۔ اب وہ برتن کی طرف کم اور دیوار کی طرف زیادہ متوجہ تھی۔

سوئم سے اگلے دن صبح کی فلائٹ سے ہی انہوں نے واپسی کا سفر اختیار کر لیا تھا۔ جبکہ روشی ابھی کچھ دن اور یہیں کے

پاس رکنا چاہتی تھی۔ مگر یاور علی خان کی کچھ مصروفیات تھیں جو وہ زیادہ دیر وہاں رک نہیں سکتے تھے۔

روشی نے واپسی اڑان سے ان کے حضور درخواست بھی پیش کی تھی کہ وہ اسے کچھ دن خالہ کے پاس رہنے کی اجازت دے

دیں۔ جس کا جواب انہوں نے ایسا دیا تھا کہ آج کل یہاں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

”ابھی اس وقت یہاں کے سوگوار ماحول سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟

دیکھیں آ جا سکتی ہو۔ اور تمہاری جیسی لڑکی کو تفریح کرنا زیب دیتا ہے۔ تمہاری چھٹیاں تمہیں خوشی کے بجائے نقصان کا احساس

دیں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ تم تعطیلیں پیرس میں بسر کرو۔ اگلی بار موسم سرما کا کچھ وقت ہم ادھر یہیں گزاریں گے۔“

”اگلی بار میں اندازہ نہیں کب آنا ہو گا۔ میرا مطلب ہے پچھلی بار آئی تھی تو تین مہینے زبردست سردی ہوتی ہے۔ بچے

اس کرائسس سے جاتے ہیں۔ بیتے ہی کیسے ہیں۔“

”اس وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔“ انہوں نے اپنے دو ٹوک انداز میں جواب دیا تو اگلے سوال کی گنجائش ہی ختم ہو گئی

تھی۔

پانچیں۔ پتا کی آنکھیں۔ بعض اوقات اتنی زیادہ ریڈ (سرخ) کیوں لگتی ہوتی ہیں۔ ان کے سرمئی حرارت سے اس کا

چھوٹا سا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔

جب یاور اور روشی ایئرپورٹ پہنچیں تو منتظر تھے۔

جس وقت گھر میں داخل ہوئے تو وہ پیر احسان کے مرحلے میں آ چکی تھی۔ روشی کو سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ یاور علی

خاں اپنے بیڈروم کی طرف گئے تو روشی سیدھی کچن میں پہنچ گئی۔

”کوئی اچھی چیز ہے کھانے کی۔ مزے دار سی۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔ جہاز میں تو بس کھانے کی ڈریسنگ ہی

ڈریسنگ ہوتی ہے۔ ٹیسٹ تو ذرا نہیں ہوتا۔“ وہ ہاتھ دھو کر کرسی کی طرف بڑھی۔

”آپ کو وقت انتظار کرنا ہو گا بے بی۔ میں بڑے سرکار کو چائے پہنچا دوں۔“ خانساماں نے معذرتانہ درخواست کی۔

اور ہال کی سمت اشارہ کیا۔

”مگر تم پہلے کھانے والے کا تو پوچھ لیتے۔ بعد میں چائے دینا۔“

”میں سر کی بات نہیں کر رہا ہوں بے بی۔ ان کے والد صاحب کی بات کر رہا ہوں۔“ خانساماں نے وضاحت کی۔

روشی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”پا۔۔۔ پا صاحب!!!“

☆—☆—☆—☆—☆—☆

"کب آئے؟" اس کی تو بھوک ہی اُڑ گئی۔

"صبح نو بجے آئے تھے۔" خانساماں نے جواب دیا۔

"انہوں نے ہمارے بارے میں پوچھا ہوگا، پھر تم نے کیا جواب دیا؟" روشی بہت پریشان سی ہو گئی۔

"سر میں کہہ کر گئے تھے کہ کوئی بھی پوچھے تو کہنا پشاور گئے ہیں ضروری کام سے۔" خانساماں نے ادب سے جواب دیا۔

روشی نے سکون کا سانس لیا۔ "اچھا!"

"مگر باری کو کیسے پتا چلا کہ ہم کراچی میں ہیں؟" وہ یہ سوچ کر نئے سرے سے پریشان ہوئی۔

"ہمارے جانے کے بعد باری کا فون آیا تھا کیا؟" اس نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"باری؟" خانساماں سوالیہ انداز میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"بھئی باری —— باری کو نہیں جانتے۔ ہر وقت تو ٹیلی فون کی تاروں میں دوڑتا رہتا ہے۔" وہ جھلا کر بولی۔

"جی!" خانساماں کچھ پریشان سا دکھائی دیا۔

"میرا سر! اچھا چلو تم بابا صاحب کو چائے دے کر میرا کھانا تیار کرو۔ میں پپا کے کمرے میں ہوں۔"

وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جی ——" خانساماں اپنے کام کے مقام کی طرف بڑھ گیا۔

اور وہ تیزی سے یاور علی خان کے بیڈ روم کی سمت آئی اور دروازے پر دستک دی۔

"یس!" یاور علی خان کی بھاری آواز سنائی دی۔

وہ جلدی سے دروازہ دھکیل کر اندر آ گئی۔

"پپا! آپ کو کچھ پتا ہے، بابا صاحب آئے ہوئے ہیں، اگر وہ آپ کو کچھ کہیں تو کہہ دیجئے گا کہ روشی نے ضد کی تھی مگر پہلے معلوم کر لیجئے گا، انہیں ہمارے کراچی جانے کا پتا بھی ہے یا نہیں، ہو سکتا ہے انہیں پتا نہ ہو اور پپا! اگر یہ بات بھی تو چل جائے کہ باری کو کیسے پتا چلا کہ ہم کراچی گئے ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے وہاں فون کیا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ اسے پتا ہے بلکہ ہمارے ہوٹل کا فون نمبر بھی پتا ہے۔ انہیں کیسے پتا چلا؟ بلکہ انہیں تو یہ بھی پتا ہے کہ روشی جان کی دعوت ہوئی ہے۔ انہیں کس نے خبر دی؟ حیرت کی بات ہے۔ یہ تو بڑا اکلوتا فنکشن ہوا تھا اور ہاں ——!"

یاور علی خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ اسے جیسے بریک لگ گئے۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اٹس آل رائٹ مائی ہنی بیبی ——" وہ غالباً غسل کے ارادے سے وارڈ روب سے کپڑے نکال رہے تھے۔

"مگر پپا بابا صاحب ——!"

"میں نے کہا ناں، کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ جب مسائل حل کرنے کے لیے والدین موجود ہوں تو بچوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

"تھینکس، مگر آپ والدین نہ کہا کریں۔ صرف والد ہی کہا کریں مجھے رونا آ جاتا ہے۔ ہمیں کیا پتا، والدہ کیا ہوتی ہے؟" اس نے روہانسی آواز میں کہا اور باہر آ گئی۔

اس کا رخ کچن کی جانب تھا مگر اس مرتبہ چال میں وہ پہلا سا ذوق شوق نہیں جھلک رہا تھا۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا اور وہ باورچی خانے میں لالٹین جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جھمری کی والدہ نے بیچ پر لالٹین کی چمنی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کرچی کرچی ہو گئی۔

وہ تیزی سے اپنے رہائشی کمرے کی طرف آیا جہاں گھبراہٹ کی حالت میں ٹارچ رکھی ہوئی تھی۔ ٹارچ اٹھا کر وہ واپس کمرے میں ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر پہنچا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں چاروں طرف پھینکی۔ جھمری وہاں موجود نہیں تھی۔

معاً اس نے محسوس کیا، کتوں کے بھونکنے میں کوئی خاص بات ہے۔ اس کا ماتھا ٹھنکا، وہ بیرونی احاطے کی طرف لپکا مگر راہداری ہی میں اسے رکنا پڑا۔

جھمری چاروں شانے چت صحن کے درمیان میں بے ہوش پڑی تھی۔

جان علی کراہ کر رہ گیا، پھر بے ہوش —— وہ اس کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا۔

بجلی کیوں گئی تھی اور بے ہوش کیوں ہوئی؟ اب یہ سوال ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ ٹارچ کی روشنی اس پر ڈال کر جائزہ بھی لے رہا تھا۔ مگر بظاہر کوئی وجہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اس نے بال ہٹائے تو اس کی نظر چونک گئی اور جیسے بجلی کے جھٹکے نے اس کو چھولیا۔

اس کی کلائی سے خون رس رہا تھا۔ اس نے کلائی پر روشنی پھینکی۔ کلائی خون سے سرخ تھی۔

خودکشی! یہی خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس کے ساتھ ہی پچھلا ایک واقعہ اس کے ذہن میں گھوم گیا۔

اس نے ٹارچ ایک طرف رکھ کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ دکھ اور ہمدردی سے اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ احتیاط سے اسے ہال کمرے کی طرف لایا اور تخت پر لٹا دیا۔ اور بچوں سے چھلکتے ہلکے سے اجالے میں اس کی کلائی پر اپنا رومال باندھ دیا۔

قدرے مایوسی اور افسوس کی حالت میں پانی لینے اندرونی احاطے میں آیا۔ اور کچن خانے سے گلاس لیا۔ جس کی حالت بہت بہتر ہو چکی تھی، جو سراسر جھومر کے زورِ بازو کا نتیجہ تھی۔

ونڈ پمپ سے ایک جھٹکے میں گلاس بھرا اور ہال کمرے کی طرف واپس آ گیا۔ اور اس کے منہ پر چھینٹے مارنے شروع کیے اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب تھوڑی ہی دیر میں جھومر نے آنکھیں کھول دیں۔

"بڑی ونڈر فل ہیں، بس انتہائی حوصلہ ہے، جب کلائی کاٹ ہی لی تھی تو چیخ مارنے کی کیا ضرورت۔ خاموشی سے مر جاتیں۔ جب مرضی سے مرتے ہیں تو چیختے نہیں ہیں۔" اس نے گلاس وہیں اس کے قریب رکھ دیا اور واپسی کے ارادے سے پلٹا۔

"ہادی!" جھومر نے ہچکی سی بھری۔

"فرمایئے۔" وہ بغیر پلٹے ترخ کر بولا۔

"ہادی! میں مر رہی ہوں۔" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"میں کیا کر سکتا ہوں، مرضی ہے آپ کی۔ ویسے بھی ایسی مصیبت بھری زندگی کا کیا فائدہ؟" نہ جانے اتنی سنگ دلی اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ اس نے قدم بڑھائے۔

"ہادی! کیا وہ کالا کتا پاگل ہے؟" وہ سسک رہی تھی، کراہ رہی تھی۔

"آپ کا مطلب؟" وہ خود تیکھے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"روشی ٹھیک کہتی ہے۔ حویلی کے آسیب ہو تم، انسان نہیں ہو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

روشی کے ذکر پر اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے پلٹ کر روتی ہوئی جھومر کو دیکھا۔

"میں جو کچھ ہوں، اس سے آپ کو یا روشی بی بی کو کوئی دلچسپی نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہادی! خون بہت بہہ رہا ہے۔" وہ بری طرح رو رہی تھی۔

"آپ کو کلائی کی رگ کاٹنے سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ اس طرح کی حرکت کے بعد خون بھی بہتا ہے؟" وہ طنز کر رہا تھا۔

"میں کالا جان کو خون کرنے جا رہا ہوں، ہاتھوں کی قسم میں، پھر وہ جا چکیں اور آپ۔"

"خدا کے لیے مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں نے کلائی کی رگ نہیں کاٹی ہے۔ کتے نے کاٹا ہے۔" اور ایک جگہ تھوڑا سا ہی دیکھ

"کتنے ظالم ہیں۔" وہ چیخ کر بولی۔

ہادی کو چکر سا آ گیا۔ "اوہ! کیا اوپر کی مصیبت۔" وہ ہمدردی سے ٹارچ اٹھانے کے خیال سے آگے بڑھا۔

"ہادی... پلیز!"

"آ رہا ہوں، ہوش ٹھکانے رکھیے۔" اس کے لہجے میں خاصی تبدیلی آ گئی۔

چند لمحوں کے بعد وہ واپس آیا۔

"اور کہاں کاٹا ہے؟" اس نے ٹارچ کی روشنی اس کے وجود پر ڈالی۔

جھومر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور شلوار کا پائنچا اوپر کیا۔ پنڈلی بھی زخمی تھی۔ اس نے پائنچا اور اوپر کھسکایا۔

"اچھا... اچھا ٹھیک ہے اب جلدی سے اٹھیے۔ میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔ یہاں تو سرخ مرچ بھی نہیں ہے۔ جو کتے کے کاٹنے کا فوری علاج بھی ہوتا ہے کہ زخم پر سرخ مرچ لگا دی جائے تو زہر نہیں پھیلتا۔"

"آس پاس کوئی گھر بھی نہیں ہے۔ جلدی سے باہر آئیے، میں آ رہا ہوں۔"

"مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ سر میں دھماکے ہو رہے ہیں۔" اس نے بے بسی سے سر تھام رکھا تھا۔

"مگر میں یہاں کسی ڈاکٹر کو نہیں لا سکتا۔" اس نے معذوری ظاہر کی۔

"مجھے تھوڑا سا سہارا دو، مجھے چکر آ رہے ہیں۔" اس پر ابھی تک گویا خوف طاری تھا۔

"آ رہا ہوں ابھی۔" اس نے آہستگی اور قدرے نرمی سے کہا اور چابی لینے اپنے رہائشی کمرے کی طرف آیا۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ وہ ٹارچ کی مدد سے اپنا کام کر رہا تھا۔ بستر سے چابی اٹھائی پھر ہال کمرے میں واپس آ کر اپنے ہاتھ میں ٹارچ تھام کر سیدھا ہاتھ اس کی سمت بڑھایا۔

"اٹھیے!"

جھومر نے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی نظر انداز کر کے اس کا مضبوط بازو دبوچنے کے انداز میں تھام لیا اور پاؤں تخت سے لٹکا کر بمشکل کھڑی ہوئی۔ وہ اسی محتاط انداز میں قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ اپنی طرف سے صرف اپنے بازو کی حد تک وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ باقی سارا بوجھ جھومر پر تھا۔ اس نے تو اپنا بازو تھامنے کی اجازت بھی گویا اس طرح دی تھی، جیسے احسان سا کر رہا ہو۔

جھومر خود کو سنبھالتے ہوئے اس کے قدم سے قدم ملا رہی تھی۔ اس کی سیدھی ٹانگ پر دو گہرے زخم تھے جن کی وجہ سے چلنے میں اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

بمشکل اس کو احاطے تک لایا۔ کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے احتیاط سے بٹھایا اور دروازہ بند کر کے چابک کی طرح گھوم گیا۔ جمپور بے دم انداز میں سیٹ پر لیٹ گئی۔

ہاری ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا تو جمپور کی سسکاریاں گاڑی کے اندرونی ماحول کو ناقابل برداشت بنا رہی تھیں۔ اس نے چابی گھما کر کار کی اندرونی لائٹ آن کر دی اور گاڑی ریورس کرنی شروع کی۔

"شاید قصبے تک پہنچنے میں زندہ رہ سکوں اور راستے ہی میں مر جاؤں۔" جمپور کراہ کر بولی۔

"تو پھر جلدی جلدی اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں۔ مجھے آپ سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں آپ کو پہلے ہی خبردار کر چکا تھا کہ کتے بہت خونخوار ہیں۔" اس نے خاصے بے رحم لہجے میں جواب دیا۔

"تم خانوں کے کارندے ہو۔ تم میں انسانیت ہو بھی کیسے سکتی ہے۔" جمپور نے کراہتے ہوئے جیسے شکوہ کیا۔

ہاری نے نچلا ہونٹ دبا کر جیسے خود پر جبر کیا۔ گاڑی باہر آئی تو خود بھی گاڑی سے نکل آیا۔ پھاٹک بند کیا اور تالا لگا کر چابیاں بغلی جیب میں ڈال کر واپس گاڑی تک آیا اور ایک سرسری نظر پچھلی سیٹ پر پڑی جمپور پر ڈال کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔

"ہاری!" جمپور نے سسکاری بھری۔

"جی۔"

"ایک بات کہوں؟" وہ جیسے بہت اذیت میں بول رہی تھی۔

"بہتر ہے کہ کچھ نہ کہیں اور خاموش رہیں۔ بولنے سے بھی خون زیادہ بہتا ہے۔" اس نے خشکی سے جواب دیا۔

جمپور شاید بات کی گہرائی سمجھ گئی تھی۔ ایک دم چپ ہو گئی۔

گاڑی نہایت ویران اور اندھیرے راستوں سے گزر رہی تھی۔

کھانا کھا کر وہ سو گئی تھی۔ نیند بھی اس قدر ٹوٹ کر آئی تھی، جیسے کئی دنوں سے سوئی نہ ہو۔ مغرب کی اذانوں کے بعد ملازم نے دروازے پر دستک دے کر اسے جگایا تھا اور وہ کلاک پر نظر پڑتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

اتنی دیر ہو گئی۔ بابا صاحب کیا سوچ رہے ہوں گے کہ سلام بھی کرنے نہیں آئی۔ باپ کے پاس آ کر بدل گئی۔

وہ جلدی جلدی وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگی۔ عنابی رنگ کا سادہ سوتی سوٹ نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔ جس میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی۔

البتہ تراشیدہ بالوں کو سنبھالنے سکھانے میں تھوڑی دیر ضرور لگی، پھر دوپٹا اٹھا کر باہر آ گئی۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سارے گھر کی لائٹس آن تھیں۔ ملازمین کی ملی جلی آوازیں، فون کی گھنٹیاں، ہال کے کونے سے آتی بی بی سی پروگرام کی آوازیں، ڈرائیور کی بیوی کے کونے سے جو اس کے بچوں کی شرارتوں کے ساتھ لازم و ملزوم تھے، اکثر بیشتر اس کے کوارٹر سے نشر ہوتے رہتے تھے۔

اس نے ماحول پر نظر ڈالی تو بے ساختہ مسکرا دی اور سیدھی باپ کے بیڈروم تک گئی اور دروازہ آہستہ سے تھپتھپایا۔

"یس!" یار علی خان کی خفگی آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

یار علی خان ریموٹ ہاتھ میں لیے پر تجسس ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی انہوں نے ٹی وی آف کر دیا۔

"آ بیٹے! بہت سوئیں۔"

"جی بس چلا۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں کہ میں بابا صاحب کو سلام کرنے جا رہی ہوں۔ اگر وہ مجھ سے پوچھیں کہ اچانک جانے کے بارے میں تو کیا کہنا چاہیے مجھے۔ پتا نہیں آپ سے ان کی کیا بات ہوئی اور میں کیا کہوں ٹھیک ہے نا بابا؟"

یار علی خان بے ساختہ مسکرا دیے۔

"روشی اتنی سمجھدار ہو گئی ہے، اندازہ نہیں تھا آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ کوئی جرم کیا ہے آپ نے؟ جا بیٹے سلام کر آئیے کچھ نہیں ہوگا۔" انہوں نے ٹی وی دوبارہ آن کر دیا۔

"آپ چلیں گے؟" روشی جاتے جاتے پھر رک گئی۔

"ہوں!"

"ناراض تو نہیں ہیں؟" اسے جانے کیوں ڈر سا لگ رہا تھا۔

"نہیں روشی! وہ ساری احتیاط اس لیے تھی کہ ہماری زندگی میں کوئی مداخلت نہ ہو۔ اب ہم ہو کر چکے ہیں اس بات سے۔"

"تھینکس پاپا!" اس کے سر سے بوجھ سا ہٹ گیا۔

وہ خاصے پرسکون انداز میں بابا صاحب کے کمرے کی طرف آئی اور دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ۔" بابا صاحب کی بارعب آواز ابھری۔

وہ اندر آ گئی اور ہاتھ پیچھے کر کے ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا۔

"السلام علیکم بابا صاحب!" اس نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہے ہماری بیٹی؟ باپ کے پاس پہنچتے ہی دادا کو بھول گئی۔ بھئی ہمیں تم بہت یاد آئیں۔ سچ پوچھو یہاں آنے کا بہانہ بھی تم ہو۔" وہ مسکرا رہے تھے۔

روشی تو جیسے گرتے گرتے بچی۔ مارے حیرت کے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہم۔۔۔ میں بھی آپ کو یاد کر رہی تھی۔" اسے اس ہی جملہ سوجھا۔

"آؤ ادھر ہمارے پاس بیٹھو۔" انہوں نے اپنے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

یہ دوسرا جھٹکا تھا وہ بمشکل تاب لا سکی۔ اسے نزدیک تو کوئی بھی نہیں بٹھاتا۔ انہوں نے یہ جرأت دہی کسی کو دی تھی اور

کسی نے کی تھی۔

وہ کھڑی وہ پھر روتی رہی۔

"آؤ بیٹی!" وہ پھر مخاطب ہوئے۔

وہ جھجکتی ہوئی ان کے نزدیک چلی آئی اور بیڈ کے کنارے پر اس طرح ٹک گئی، جیسے موقع ملتے ہی بھاگ کھڑی ہوگی۔

"سنو کیسا رہا تمہارے دادا کو سن کر افسوس ہوا اور اس بات کا زیادہ کہ تم ایک بار اپنے دادا سے مل نہ سکیں۔" انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"ایک بات کہوں بابا صاحب اگر آپ اجازت دیں، مگر مجھے ڈر ہے آپ ناراض ہو جائیں گے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تم کہو، ہم ناراض نہیں ہوں گے۔" ان کا لہجہ ان کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ عجیب سے اندیشوں کا ارتعاش تھا ان کی آواز میں۔ پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔

"آپ چاہتے تو میں زندگی میں کئی بار اپنے دادا سے مل سکتی تھی۔" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا۔

بابا صاحب نے سینے میں سے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

"بیٹی ہمارے چاہنے نہ چاہنے کی بات نہیں تھی۔ تمہارا باپ نہیں چاہتا تھا۔" انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔

روشی نے نظریں اٹھا کر بابا صاحب کا چہرہ دیکھا۔ اسے یہ سوچ کر شرم آئی کہ بابا صاحب کو بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے؟ کتنے آرام سے انہوں نے سارا وزن اس کے باپ پر رکھ دیا۔

اگر پاپا نہیں چاہتے تھے تو پھر اب کیوں لے کر گئے تھے۔ فطری سوال ذہن میں آیا۔

"وہ کیوں نہیں چاہتے تھے؟" اس کے منہ سے سوال پھسل ہی گیا آخر۔

"ذمہ دار بیٹوں سے زیادہ سوال جواب اچھے نہیں لگتے۔ ہم نے ان سے پوچھا ہی نہیں۔" بابا صاحب نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

تو پھر اب پوچھنے کا کہ پہلے کیوں نہ چاہا اور اب کیوں چاہا؟ اس کے اندر کی گرہ پھر [illegible] اس کے ایک ایک رونے بھاگنے لگی۔

اس قدر نا ہموار ہیں میرے پیا، اپنے باپ کے اور بابا صاحب انہیں یہ صلہ دے رہے ہیں۔ وہ بابا صاحب سے کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

"خاموش کیوں ہو گئیں، کوئی بات کرو بیٹی۔"

"میں کچھ سوچ رہی ہوں بابا صاحب!" اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن اتر آئی۔

"ماشاءاللہ! بہت لوگ ہیں تمہاری فکر کرنے والے، یہ تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں، بس تم خوش رہا کرو، پڑھا کرو

کر بیٹے نرس میں کامیاب ہوگی تو تمہارے باپ کو بے حد خوشی ہوگی۔ یاور کو بہت شوق ہے کہ اس کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔

بہرحال جہاں ہم نے تمہارا رشتہ کیا ہے وہاں تم پڑھتے رہنے کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ شادی کے بعد تم آگے پڑھنا چاہو گی تو داخلہ لے لینا۔ ہم بہت اتفاق اور کھلے دل کے ہیں۔ وہ تمہارے کسی شوق میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ بہت اچھے لوگ ہیں، عورت کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہر بات میں تمہاری خوشی کا خیال رکھیں گے۔

وہاں بھی جا کر پڑھنا چاہو گی تو وہ تمہیں وہاں بھی بھیج دیں گے۔ ہم البتہ تمہیں یہاں اتنی آزادی نہیں دے سکتے۔

ہر بیٹی شادی تک اپنے گھرانے کی بہت بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔ شادی کے بعد عورت اپنے مرد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پھر وہ اسے جتنی مرضی آزادی دے۔ پڑھنے کی، کام کرنے کی، ملازمت کرنے کی۔

تمہاری شادی ہو جائے گی، ہمارے اور یاور کے کندھوں سے وزن اتر جائے گا اور پھر تمہیں اپنا من چاہا ماحول مل جائے گا۔

ہم اپنے بچوں کے کتنے ہی ناز اٹھالیں، مگر انہیں اس طرح کی آزادی نہیں دے سکتے، جو آج کل کے اکثر گھرانوں نے اپنے بچوں کو دی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ بس یہی ہے کہ عام دولت مند گھرانوں کے بچوں اور حکمران گھرانے کے بچوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔

شہرت بدنامی میں بدل جائے تو تخت کی قسمت ایک گھڑی میں اُلٹنے لگ سکتی ہے۔

گدی کوئی اتفاق سے نہیں ملتی، اس کے پیچھے صدیوں کی محنت ہوتی ہے۔ ہمیں احساس ہے، تم پابند زندگی پسند نہیں کرتی اس لیے ہم جلد سے جلد تمہاری شادی کر دینا چاہتے ہیں، حالانکہ گھر میں تم سے بڑی بیٹیاں ہیں مگر ہم نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ وہ آج کا آزاد خیال لڑکا ہے، ملک ملک گھومتا ہے۔ شادی کے بعد تمہیں بھی دنیا کی سیر کرائے گا اور ہم یہ سوچ کر خوش ہوں گے کہ ہماری بچی اپنی من پسند زندگی گزار رہی ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

انہوں نے پھر شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

بابا صاحب بولتے جا رہے تھے اور اس کا دل چاہ رہا تھا، اپنے بال نوچنے لگے۔ سانس بہت تیز تیز چلنے لگی تھی۔ اس سے [illegible] بابا صاحب پھر بولے۔

"علیم الدین ہمارے لیے کہہ رہا تھا مگر ہم نے اسے بتا دیا ہے کہ تمہارے دادا کے چہلم تک یہ معاملہ ملتوی کیا جاتا ہے۔

ٹھیک ہے کہ اب ہمارا ان کا تعلق پہلے والا نہیں، مگر تم سے رشتہ تو ان کا رشتہ ہمیشہ کا ہے۔ اب یہ بتاؤ حویلی کب چلو گی؟" انہوں نے اچانک موضوع بدل دیا۔

"ابھی تو سوچا نہیں ہے۔" اس کا موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔

"کیوں کہ پتا چلا کہ ہم حویلی جا رہے ہیں تو بڑی دلہن کے اصرار پر کہلا بھیجا کہ تمہیں ساتھ لیتے آئیں۔ گھومنے بہت

ناکیوں کی ہے۔"

سفید تکیوں کے بیچ ان کی چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں روشی کے چہرے پر رک گئیں۔

"ایک نہ ایک دن تو جانا ہی ہے حویلی، جلدی کیا ہے، اپنے بچوں کے پاس لوٹ رہی ہوں۔" وہ ملائمت سے [illegible]

رہی تھی۔

"مرضی ہے تمہاری، ہمارے پاس تمہاری بیٹوں کا پیغام آیا تھا ہم نے بھجوا دیا۔"

وہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔

"آپ کتنے دن کے لیے آئے ہیں بابا صاحب؟ اگر آپ زیادہ دن کے لیے آئے ہیں تو پھر میں آپ کے ساتھ چلوں، اگر جلدی جائیں گے تو میں بعد میں آ جاؤں گی۔ ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا [illegible] کے پاس سے جانے کو [illegible] یہاں دیکھے ہیں۔" نہ جانے کیوں آواز بھرا گئی۔

"کوئی بات نہیں بچی، جب تک تمہارا جی چاہے رہو، ہم تو صبح چلے جائیں گے۔"

انھوں نے اسی طرح پرسکون انداز میں جواب دیا، جس کا مظاہرہ وہ شروع سے کر رہے تھے۔

"اتنی جلدی؟" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہاں، مجبوری ہے، ادھر ہاری بھی نہیں ہے نا آج کل، اور تمہارے بڑے ابا بھی کراچی گئے ہوئے ہیں۔ تمہارے [illegible] رات بلا کر جا رہے ہیں۔"

روشی کا دل بھڑک اٹھا۔

"ہاری کہاں گیا ہوا ہے؟" اس نے اٹکتے ہوئے پوچھ لیا۔

"سسرال گیا ہوا ہے۔ خدا معلوم اسے وہاں کتنے دن لگ جائیں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔

"کیوں؟ وہاں کیا ہو گیا۔ کاکا جان تو کہتے ہی بہت ہیں۔ جب گھر والے ان سے اتنا ڈرتے ہیں تو وہ [illegible] جاری---" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"مگر تمہیں تو کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ کیا تمہیں بھی ڈانٹا؟" وہ جانے کیوں بہت سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

"میں ان کے سامنے ہی نہیں جاتی شروع سے۔ بڑی امی سب بچوں کو ان سے ڈراتی تھیں۔" اس نے [illegible] سے جواب دیا۔

"اچھا! ہمیں علم نہیں، وہ ایسا کیوں کرتی رہی ہیں۔ ہر انسان کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ تمہارے کاکا جان شروع سے گھر سے دور رہے ہیں۔ پہلے بورڈنگ، پھر ہاسٹل، پھر دوسرے ملک چلے گئے پڑھنے، اسی لیے گھر والے انھیں کم جانتے ہیں۔"

"مگر اپنے اسٹائل سے تو وہ شکاری ہی لگتے ہیں، جو بندوق تانے ہوئے نشانے پر دیکھ رہا ہو۔" وہ بچپنے کے انداز میں مسکرا پڑی۔

"ابھی کوئی بات نہیں ہے۔" بابا صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستگی سے گویا ہوئے کہ [illegible]

[illegible]

"کیا کاکا جان بہت زیادہ پڑھے لکھے ہیں؟" اس نے جانے کیوں پوچھا تھا۔

"ہاں انہیں بچپن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق رہا ہے۔" زرداد علی خان نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا ہمارے بڑے ابا سے بھی زیادہ کوالیفائیڈ ہیں؟" اسے الجھن سی ہوئی، وہ [illegible] تعلیم یافتہ نہیں۔

"دونوں کے تعلیمی میدان ذرا مختلف رہے ہیں۔ زرداد علی خان کا علمی سفر ابھی بھی جاری ہے، مختلف کورسز کرتے باہر رہتے ہیں، تمہارے کاکا جان بزنس میں پڑ گئے ہیں۔ بس یہ فرق ہے۔" انھوں نے اسی طرح دھیمی آواز میں جواب [illegible] سننے میں دشواری ہوئی۔

"یہ اچھا خاصا فرق ہے۔ صاف ظاہر ہے، چچا زیادہ کوالیفائیڈ ہیں۔" اس نے بےساختہ تبصرہ کیا۔

"کوئی شک نہیں۔" زرداد علی خان نے اس کی پشت تھپتھپائی اور مسکرا دیے۔ انھیں روشی کا اس طرح تبصرہ کرنا اچھا لگا تھا۔

"آپ کو خوشی نہیں ہوتی کہ چچا آپ سے قابل ہیں؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

"ہے۔۔۔ بے انتہا۔"

روشی نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ زرداد علی خان کی مسکراہٹ، ان کی نرمی اسے شک میں ڈالے دے رہی تھی۔

"ہاری کتنے دن کے لیے گیا ہے سسرال؟" اس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ کوئی کام ہے اس سے؟" زرداد علی خان پوچھنے لگے۔

"وہ سب کے کام کا ہے مگر میرے کسی کام کا نہیں ہے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ایسی بات نہیں ہے، بہت اچھا بچہ ہے۔ بے حد مخلص ہے۔ ہمیں یقین ہے وہ زرداد علی خان کی طرح بہت ترقی کرے گا۔"

روشی کو [illegible] آنے لگے۔ دل ہی دل میں جلنے لگا۔

"کیا وہ ہمارا ملازم ہے بابا صاحب؟"

"نہیں۔" زرداد علی خان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"تو کیا ہمارا رشتہ دار ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی صورت دیکھی۔

"نہیں۔" لہجہ ہنوز قطعی تھا۔

"تو کیا وہ ہمارے گاؤں کا ہے؟" اس نے پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ مبادا زرداد علی خان پے در پے سوالات کرنے پر ناراض نہ ہو جائیں۔

"نہیں۔" اُن کا انداز بدستور تھا۔

اب وہ چاہنے کے باوجود کوئی نیا سوال نہ کر سکی۔ ماحول کو جو حرا تھا وہ اس وقت سے متوقع نہیں تھا۔

سر جھکا کر بیڈ شیٹ کے گلابی پھولوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ان سے ماں کے متعلق پوچھے اور وہ جی بھر کے اس بے مہری کی باتیں سنتی رہے۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

"ہوں!" ولاور علی خان نے مخصوص انداز میں اندر آنے کی اجازت دی۔

دروازہ دھکیل کر اندر آنے والے یاور علی خان تھے۔ گہرے سرمئی شلوار سوٹ اور سفید واسکٹ میں وہ بے حد اسمارٹ محسوس ہو رہے تھے۔

"آؤ بھئی۔"

"تم بھی پہنچو پریس کانفرنس میں۔" ولاور علی خان بیٹے کو دیکھ کر جیسے سرے سے تازہ دم ہو گئے۔

"یہی دیکھنے آیا کہ کافی دیر ہو گئی ہے آپ کے پاس آئے ہوئے۔" وہ ہمیشہ کی طرح دھیمے انداز میں مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کیا باتیں کر رہے تھے؟" بابا صاحب نے مسکرا کر زوشی کی طرف دیکھا۔

"بابا صاحب نے کچھ بھی نہیں کہا پاپا!" زوشی نے خوشی سے بتایا۔

"کس سلسلے میں؟" انہوں نے باپ کی طرف دیکھا۔

"کراچی والے سلسلے میں۔" زوشی نے جواب دیا۔

دونوں باپ بیٹے ایک دم بہت خاموش سے ہو گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔

"ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہیں اپنی خالہ بہت اچھی لگیں۔" بابا صاحب نے ایک نیا موضوع نکالا۔

"ہماری امی بھی تو آپ کو اچھی لگی تھیں، جب ہی تو آپ انہیں حویلی میں لائے تھے۔ کوئی آپ کو پسند آ جائے یہ آسان بات تو نہیں۔ بس خالہ بھی امی کی بہن ہیں۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

جانے کیوں باپ کے سامنے خالہ کا ذکر کرتے ہوئے اب وہ بہت کانشس سی ہو جاتی تھی۔ جواب میں دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔

"اچھا آپ یہ تو پوچھیں، مجھے ان کی کیا بات اچھی لگی؟" اس نے ان کی خاموشی سے مجبور ہو کر اپنی طرف سے ایک سوال تیار کر کے انہیں دیا۔

"شاید اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت ہیں۔" ولاور علی خان نے بہرحال خیال ظاہر کر دیا۔

"ارے نہیں بابا صاحب! خوبصورت تو "ماما جانی" بھی بہت ہیں۔ بات یہ ہے کہ خالہ کم عمر ہونے کے باوجود بڑی عورتوں کی طرح سمجھدار ہیں اور پھر وہ جتنی قابل اور لائق ہیں وہ علیحدہ خصوصیت ہے۔ پھر وہ ڈریسنگ بہت غضب کی کرتی

ہیں۔ تجربات کا بہت عکس ہے انہیں۔"

ولاور علی خان۔۔۔ بغور اس کے خیالات سن رہے تھے۔ آخری جملے پر بے ساختہ مسکرا دیے۔

"تم نے دیکھا بابا؟ کتنی ذہانت ہے اس کی، کس قدر پہنچتا ہے۔ بھلا اس کے فیصلوں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟" انہوں نے بیٹے کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" یاور علی خان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں اتنی بچی نہیں ہوں۔" اس نے منہ بنایا۔

"نہیں بھئی، یہ مطلب نہیں ہے ہمارا۔ پختگی عمر سے نہیں تجربات سے آتی ہے اور تجربات سے انسان آہستہ آہستہ گزرتا ہے۔ تم آرام میں پلی ہو، پھولوں میں سوئی ہو، ابھی سوچ ابھری ہے۔ تنقید کرنے والوں کے فیصلوں کا احترام بھی سوچ کر کرنا پڑتا ہے کہ وہ جانتے ہیں، پیچھے آنے والے ابھی نہیں جانتے۔"

اس نے قدرے غور سے دادا اور باپ کی شکل دیکھی۔

کیا یہ سب اس لیے ہے کہ اس کا ذہن کسی تبدیلی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ یا آج ادھر سے بابا صاحب جو آج شفقت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کا غیر معمولی پن تو اس نے بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔

"کیا پاپا نے اپنا بیٹا کہ آپ کی طرف منتقل کر دیا ہے؟" بے اندازہ شک نے اس کا رنگ متغیر کر دیا۔ وہ بڑی گہری نظروں سے باری باری باپ اور دادا کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"نہیں ہم اپنے معاملات خود ڈیل کرتے ہیں۔" ولاور علی خان نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ پیچھے اس کا ذہن پڑھ چکے تھے اور سوچ سکتے تھے کہ اس نے یہ بات کس بنیاد پر کی ہے۔

"اچھا تو پھر یہ ہے خالہ کو پسند کرنے کی اور وجہ، یہ وجہ بہت معقول ہے۔" ولاور علی خان نے پھر بات کی۔

"ایک اور وجہ بھی ہے۔" اس نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

"وہ کیا؟" ولاور علی خان نے بے ساختہ پوچھا۔ جبکہ یاور علی خان نے اس طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

"ان سے میرا خونی تعلق بھی ہے۔ وہ میری امی کی سگی بہن ہیں۔" اس نے بڑے دانشمندانہ انداز میں جواب دیا۔

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر پھر خاموش سے ہو کر رہ گئے۔

"کیا یہ معقول وجہ نہیں؟" اس نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں بہت معقول وجہ ہے، لیکن یہی وجہ معقول ہے۔" ولاور علی خان نے جواب دیا۔

"آئیے بابا صاحب! لاؤنج روم میں چلتے ہیں، وہاں باتیں ہوں گی۔" یاور علی خان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"جی۔۔۔ ابھی سے کہاں؟ ابھی تو بابا صاحب سے خالہ کی اور باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔" اس نے کوفت بھرے انداز میں منہ بنایا۔

"وہیں کرلیں گے۔" دلاور علی خان نہ جانے کیوں مسکرا رہے تھے۔

یاور علی خان سُنی اَن سُنی کے انداز میں باہر نکل گئے۔

روشی نے چھڑی اٹھا کر بابا صاحب کو تھمائی۔

"شاید پپا کو خالہ زیادہ پسند نہیں آئیں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"وہ کیوں؟" دلاور علی خان چپل پاؤں میں ڈالتے ڈالتے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"وہ یوں کہ جو بھی خالہ کی بات ہوتی ہے وہ بات کسی اور طرف موڑ دیتے ہیں۔"

اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا جیسے اپنے اندازے پر سو فیصد یقین ہو۔

"اچھا۔ مگر ہمیں اندازہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اور بڑی گہری سوچ میں تھی۔

گریہ کا نہیں ہوں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت بھی گوارا نہیں

عارف لال خان کے گھر واپس آ چکا تھا۔ لال خان اسے سہارا دے کر لا رہا تھا۔

"اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ جلدی کریں۔ ایسے تازہ تازہ کلیوں کے گجرے بنائے تھے سب مرجھا رہے ہیں۔"

بالو کرتل کے لش لش کرتے، سنہری کام والے دوپٹے اور کرتے شلوار میں شعلہ جوالہ سی دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ بھاری کام کے خاصے قیمتی سوٹ نے اسے ایک انوکھی سی عجب بخش دی تھی۔ چلنے سے بجتے ہوئے ... اس کے گندمی رنگ والے چہرے پر بلا کی تازگی محسوس ہو رہی تھی۔

"ذرا اس بے چارے کا انتظام تو کر دوں تاکہ یہ آرام سے سو جائے۔" لال خان نے پلٹ کر بالو سے منت کے انداز میں کہا۔

"سارے محلے میں سب سے پکی سہیلی میں اوں سائرہ کی۔ وہ تو مجھے بہت پہلے اس کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔ بارات کے بعد پہنچوں گی تو کتنا ناراض ہوگی وہ۔" بالو نے عارف کے سامنے پہلی مرتبہ کھل کر لال خان سے احتجاج کیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ چل رہے ہیں اب دیکھو ناں مریض کو بغیر انتظام کے چھوڑ کر بھی تو نہیں جا سکتا۔" لال خان نے رسانیت سے جواب دیا۔

"یہ مستقل قسم کے مریض ہیں اب کیا ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جائیں؟" بالو کی آواز آہستہ مگر بے حد تلخ تھی۔

لال خان گڑبڑا کر یکدم سیدھا ہو گیا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ چلتے ہیں ابھی۔ تم خیال نہ کرنا عارف!" لال خان خجل سا ہو رہا تھا۔

"ارے نہیں یار۔ ہم تو ہر طرح کے مزاج کے عادی ہیں۔"

واں دل میں کہ صدمے دو یاں جی میں کہ سب سہ لو
ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

وہ آہستگی سے ہنس دیا۔

بالو نے سہارا دے کر پلنگ پر بٹھا دیا۔

"میں باہر گاڑی میں بیٹھتی ہوں۔ آپ جلدی آ جائیں۔" گاڑی سے مراد لال خان کی سوزوکی کیری تھی۔ جو ابھی گھر کے احاطے ہی میں موجود تھی۔

"ایک گلاس پانی میں گلوکوز ملا کر یہاں میز پر رکھ دو۔ پانی تو ویسے رکھا ہے یہاں۔ پھر بھی گلوکوز والا پانی بھی رکھ جاتے ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری بھابی کو چھوڑ کر جلدی آ جاؤں گا۔" وہ اسے تسلی دینے لگا۔

بالو نے بہت جلدی سے گلوکوز پانی میں ملا دی تھی۔ چمچ کے شور سے اس کے دانت پیسنے کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"تمہاری بھابی کی بڑی عزیز سہیلی ہے۔ اس لیے جلدی جا رہی ہے۔ ورنہ تمہیں تو معلوم ہے کتنا خیال کرتی ہے تمہارا۔" لال خان وضاحت در وضاحت کے عمل سے گزر رہا تھا۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ جلدی سنبھل جائیں گے۔ اتنی مہنگی دوائیاں، اتنا آرام۔ پر لگتا ہے انہیں ٹھیک ہونے کا تو کوئی شوق نہیں ہے۔ اور جب ان کی یہ حالت بیٹھ کے لیے ہے تو کام کیوں روکیں۔ یہ اپنے حساب سے چلتے رہیں ہم اپنے حساب سے۔"

بالو نے کرسی پر رکھا پرس اٹھاتے ہوئے نہایت کڑوے لہجے میں کہا۔

مارے تعجب کے لال خان کی آنکھیں پیشانی پر جا لگیں۔ وہ بے زبان سی بیوی کو یوں دیکھنے لگا جیسے شک ہو کہ یہ بالو ہی ہے؟

"تم کیوں پریشان ہو گئے لال خان۔ انسان دکھ اور خوشی کے موسم گزار کر ہی تو ہم جیسے لوگ ماحول بدمزہ کرنے والے لگتے ہیں۔ خوش لوگوں کی طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے۔ مزا خراب ہوتا ہے۔

وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

تو یار۔ یہ حال ہے چمن والے تو ہمارے ٹھکانے کا نام بھی اپنی مرضی کا چاہتے ہیں۔ انہیں نام اچھا ہونے ہی پر بھی اعتراض ہو گیا۔" وہ ہنس دیا۔

"تم کوئی خیال نہ کرو۔ عارف یار! ہم یار ہیں تمہارے آخری سانس تک۔ کبھی بھی زندگی میں کمی نہ کرنا میری طرف سے۔ اور آج

کے بعد تمہیں اپنی بھابی سے شکایت بھی نہیں ہو گی۔" لال خان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے حد محبت سے دبایا۔

"تو ہم بھی تمہارے یار ہیں۔ قدردان، وفا شناس، وفادار۔ اب ایسے کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں ہیں۔ ہمارے ساز و سامان میں ایک وفا ہی تو بچی ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں اس انمول شے کی کوئی قدر نہیں ہے۔

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

بڑی خوار ہے وفا۔ جانے یار! دیر ہو رہی ہے۔ بھابی! میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے کہ میری وجہ سے آپ کو الجھن ہوئی۔"

بالو ماتھے پر شکنیں ڈال کر باہر نکل گئی۔

عارف کے شانے پر تھپکی دے کر لال خان بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل گیا۔

بالو نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور بیٹھ کر کھٹاک سے بند کر لیا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا موڈ سخت خراب ہے۔

لال خان نے گاڑی باہر نکالی پھر گاڑی سے اتر کر گیٹ میں تالا ڈالا۔ حالانکہ اگر بالو چاہتی تو یہ کام خود بھی کر سکتی تھی۔ گاڑی باہر لانے کے بعد تالا ڈال کر بھی بیٹھ سکتی تھی لیکن وہ اکھڑی گاڑی میں بیٹھی رہی تھی۔

"آج کل تو ہم بہت دیر میں پہنچتے ہیں۔ تم موڈ ٹھیک کر لو۔" لال خان نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے منانے کے انداز میں کہا۔

بالو نے منہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا اور خاموش رہی۔

"خوشی میں حصہ تو سب ہی لیتے ہیں۔ دوست کو دکھ میں اس طرح نہیں چھوڑا جاتا۔ بہت احسان ہیں اس کے مجھ پر۔ میرے بھائیوں نے تو مجھے بھیک ہی منگوا دی تھی۔ خون کے رشتوں سے دغا کھائی ہے میں نے اور اس غیر ہو کر وفا کی ہے۔"

"ایک احسان تو ان کا میری جان پر بھی ہے۔ بھاری احسان۔" بالو کے لہجے میں انگارے سلگ رہے تھے۔

"وہ کیا؟" لال خان ٹرک ڈرائیور جیسی رف ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر یہ بات سوار تھی کہ بولنے کی وجہ سے بالو کا موڈ خراب ہے۔

"آپ سے میری شادی کرائی ہے۔ یہ احسان تو میں کبھی بھی اتار نہیں پاؤں گی۔" اس کا لہجہ زہر بجھا ہوا تھا۔

گاڑی کی اندرونی لائٹ آف تھی اور سڑک بھی تاریک۔ لال خان کی حسیات اس کے پیٹ سے لگی ہوئی تھیں۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔" اس نے اپنا مخصوص بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

"ارے جان لال خان! یہ احسان اس نے تم پر نہیں ہم پر کیا ہے۔ اسی وجہ سے تو اس کی خدمت اور زیادہ کرتے ہیں۔ زندگی اتنی رنگین بھی ہوتی ہے اندازہ نہیں تھا۔" لال خان کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی۔

بالو کے حلق میں آنسوؤں کے گولے اٹکنے لگے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔

"آپ کو پتا ہے کہ جب دل بے حد خوش ہو تو کیا محسوس ہوتا ہے؟" اس کی آواز کرب سے بوجھل تھی۔

"ہاں بھی۔ ہر طرف پھول کھلتے ہیں۔ زندگی بڑی بھلی ہو جاتی ہے۔ موت سے بڑا خوف آتا ہے۔ مرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کرلو بلا کے مارے ہوئے تھے۔ میں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ باہر نکل جاتا تھا۔ یار دوست کہتے سالے کو کوئی دل لگ جائے گی کسی دن۔ بڑا شور اٹھا دیتا ہے۔ اپنی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ مگر اب موت سے ڈر لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بڑی عمر ہو اور تمہارا ساتھ ہو۔"

شوہر ساتھ ہو، سوار میں ہو۔ تنہائی ہو۔ عورت بھی اس کے قریب ہو تو لطیف حسیات خود بخود طرف بڑھنے پر جاگ پڑتی ہیں۔ مگر اس تعلق میں دنیا کا خوف بھی طاری نہیں ہو سکتا۔ دل و ذہن بھرپور آزادی کے احساسات سے رواں پانی کی طرح گزرتے ہیں اور خواہشات کے تند و تیز ریلے میں تو ہر گرہ ٹوٹتی ہے۔ مگر وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔

لال خان کے شگفتہ موڈ کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔

"ہمیں، جب شوہر موت و دنیا کی باتیں کرتے ہیں تو عام طور پر عورتیں بڑا روتی ہیں اور "اللہ نہ کرے" کہہ کر کاٹتی ہیں۔ اور تم ایسی ہو جیسے تمہیں میری موت زندگی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔"

لال خان اپنی جہالت کی وجہ سے خاصا "محظوظ" تھا اب بھی ہنس کر کہہ رہا تھا۔

بالو پھر بھی خاموش رہی۔

"آج تمہاری سہیلیوں میں سب سے اچھا جوڑا تمہارا ہو گا۔ قسمت والے ہی پہنتے ہیں ایسے جوڑے۔ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی تو محبوب کا شوہر اور شاہ اللہ کے پاس بھاری بھاری جوڑے دیکھ کر سوچا کرتا تھا۔ جب میری شادی ہو جائے گی تو اپنی بیگم کے لیے بھی ایسے کپڑے لایا کروں گا۔ بڑی دھوم دھام ہوتی ہے ایسوں کی۔ اب کے کسی کی شادی ہوئی تو اس سے بھی اچھا سوٹ لا کر دوں گا۔ جو پورے خاندان میں اور کسی

"خوشامدانہ باتیں آپ "خانوں" سے کیجیے گا۔ میں آپ کے کسی کام کی نہیں۔" اس نے ترشی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"اگر تھوڑی سی انسانیت تمہارے اندر زندہ ہوتی تو میرے کام آ سکتے تھے۔ کتنے بندے کہتے پالو مجھے کسی دارالامان میں چھوڑ آتے۔" اس نے سسکاری بھری۔

"میری طرف آپ سے ہمدردی کا کوئی حساب نہیں نکلا۔ خاموش رہیں۔" وہ سنجیدگی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔

"تمہیں بھی ترس نہیں آیا مجھ پر کہ مجھ جیسے فطری انسان سے زبردستی باندھ دیا گیا ہے۔" سمجھو بھر گیا ہو۔

"میں نے وہ عورتیں بھی دیکھی ہیں جن کے شوہر معذور ہو جاتے ہیں یا غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں مگر وہ انہیں برداشت کرتی ہیں۔ گھر چلانے کے لیے نوکری کرتی ہیں۔ بچے پرورش کرتی ہیں۔ اپنے جینے کو بھی کام کرتی ہیں شوہر کے منے کا بھی کام کرتی ہیں۔

کے پاس نہیں ہو گا۔

اور اگر مجھے تم نے بیٹے کی شکل میں کوئی تحفہ دیا تو پورے دس تولے کا سیٹ بنوا کر دوں گا۔"

مادہ پرست انسان کے پیار کے پیمانے بھی مادی ہی ہوتے ہیں۔ لال خان خوشی کے عالم میں [illegible]
اپنی قسمت کو کوسنا شروع کر چکا تھا۔ اور تول تول کر اس کی جھولی کی طرف اچھالتا جا رہا تھا۔

وہ بدستور خاموش تھی۔

"کیا بات ہے ابھی تک ناراض ہو۔ دیکھو اب اگر نہیں مانو گی تو [illegible] ہے۔ سمجھ رہی ہو نا؟"

اس نے [illegible] پوچھا لیا۔

بالو اپنی جگہ پہ دہل کر رہ گئی۔

"آپ جلدی مت آئیے گا۔ کبھی اپنے اس بے کار دوست کی خاطر بھی کے پیار سے چلے آئیں۔ اگر کھانے میں دیر ہوئی تو میں ملتان کے ہاں منگوا کر آپ کو کھلا دوں گی۔ فارغ کر دوں گی جلدی۔"

"بڑی مہربانی صاحب۔ بڑی اچھی قسمت والی ہے مولا نے اپنی۔"

لال خان اتنے معنوی اور مشکوک قسم کے التفات پر ہی خوش ہو گیا۔ بالو جیسے اپنی [illegible] کر کے فارغ ہو گئی تھی۔

وہ ہار خوب سادہ کر کے باہر دیکھنے لگی تھی۔

پیچھے سے گاہے بگاہے جھومر کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"جب بہادر ہیں تمہیں [illegible] کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ دریا بستی کی حویلی کا پچھواڑا نہیں ہے۔"

"وہ سب جیل تھی آپ کے لیے یہ کھلی جیل ہے۔ خطرناک قسم کے قیدیوں میں شامل ہو گئی ہیں آپ۔ کیا ضرورت تھی باہر کی طرف آنے کی؟ کون سے پھول کھلے ہوئے تھے ادھر جنہیں دیکھنے کو طبیعت مچل رہی تھی۔ یقیناً بھاگنے کی ارادی ہو گی۔ اسی لیے جب میں اندر ہوتا ہوں تو باہر سے کھول رہتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ آپ کھلے ہوئے گیٹ دیکھ کر باہر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کریں گی۔ مگر وہ آپ ہی کیا۔"

ہاری کو اس کی [illegible] سے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔

"تم نے جان بوجھ کر کھولے تھے گیٹ؟" جھومر کراہی۔

"ظاہر ہے۔ اس طرح کے کام غلطی سے تو نہیں ہوتے۔" وہ بھنایا۔

"جب تمہیں حویلی میں چلتے پھرتے دیکھتی تھی تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ تم اور سب سے مختلف ہو۔ بہت اچھے انسان ہو۔ تمہاری شکل سے لگتا تھا۔ میں سوچتی تھی۔"

"آپ کو بیٹھے بیٹھے کھانے پینے کو مل رہا تھا۔ اسی لیے نعمتوں کی قدر نہیں ہوئی۔" اس نے بڑی تفصیل سے اسے لعنت ملامت کیا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے ہاری نہیں حویلی کا کوئی خان بول رہا ہے۔" اس بار جھومر کی آواز بے حد تلخ تھی۔ ہاری خاموش رہا۔

"جیسے ساری حویلی میں روشنی پھیلی ہے۔ وہ حویلی کے مردوں کی طرح [illegible] ہے۔ ان میں کسی کی طرح [illegible] آ جاتی ہے۔ [illegible] اسی پر [illegible] رہی ہیں۔"

"پتا نہیں وہ کس پر گئی ہے۔ شاید اپنی ماں پر ہے۔"

جھومر بہت دھیمے انداز میں کہہ رہی تھی۔

[illegible]

اسے یہ بھی [illegible] کہا تھا۔

"کتنے پیارے۔ سب سے [illegible] اس بار تمہیں بڑی [illegible] نے دیا ہے۔ کیسی لگ رہی ہے؟" وہ [illegible] تھی۔

"آپ سے بات کر کے [illegible] ہوں۔ اس انداز میں [illegible] سے باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کی [illegible] ہوں۔"

اسے لوگ کے معاملات میں خود کو شامل کرنا [illegible] تھا۔ "یہ فضول باتیں ہیں۔ اگر آپ نے مجھے کچھ کہنا ہے؟"

اس نے ابھی خاصی [illegible] تھی۔

"آج دھیان آ رہا ہے۔ وہ لوگ واقعی تمہاری ناک میں بہت [illegible] ہے۔ کس قدر [illegible] ہے جب [illegible] سے ناک چڑھاتی ہوئی تم ہے۔ [illegible] اسی طرح کرتی ہو جیسے کوئی سائنس دان اپنی نادر ترین ایجاد پر [illegible] اظہار خیال کر رہا ہو۔"

"تم اس کار میں [illegible] جا رہے ہو؟" پیچھے سے جھومر کی تپتی ہوئی آواز آئی۔

وہ ایک دم جیسے کسی اور ہی دنیا میں ڈرائیو کر رہا تھا۔

"ہاری۔ میرے پیٹ پر جو زخم ہے اس میں سے بہت خون نکل رہا ہے۔" جھومر کی آواز میں بے بسی تھی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟ کار کو ہوائی جہاز میں تو تبدیل کرنے سے رہا۔ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔"

اس نے چیخ کر جواب دیا۔

"تکلیف میں تو میں ہوں تمہیں کیا؟" جھومر نے کراہتے ہوئے کہا۔

"آپ پاگل ہوئی ہیں۔ اس لیے آپ کو سامنے نظر آنے والی لائٹس نظر نہیں آ رہیں۔" ہاری نے جیسے اسے تسلی دی۔

"لائٹیں تو میلوں دور سے بھی نظر آ سکتی ہیں۔" جھومر نے چڑ کر کہا۔

ہاری کا جی چاہا گاڑی کہیں دے مارے۔ بمشکل خود پر کنٹرول کیا اور خاموش رہا۔

گاڑی میں سکوت طاری ہو گیا۔ کافی دیر گاڑی اندھیرے میں چلتی رہی پھر روشنیاں اندر جھانکنے لگیں۔

اور آخر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔

"میں ذرا ادھر سے کسی کلینک کا پتا کر کے آتا ہوں۔" ہاری نے دروازہ کھول کر اترتے ہوئے کہا۔

جھومر خاموش رہی۔

ہاری چند لمحوں ہی میں واپس آ گیا اور وہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی چل پڑی۔ وہ جس سمت کا سفر طے ہوا۔ پھر گاڑی رک گئی۔

ہاری اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"آ جائیے۔" وہ دروازہ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

جھومر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہاری۔ میری ٹانگ اکڑ رہی ہے۔ مجھے سہارا دو۔" جھومر نے کرب سے نچلا ہونٹ دبا لیا۔ ہاری نے ہاتھ بڑھایا۔

جھومر اس کا بازو تھام کر باہر آ گئی اور کھڑی ہو کر اس کے بازو سے چپک گئی۔ وہ اسے سہارا دے کر اندر کلینک میں آیا اور برائے خواتین والے حصے میں داخل ہو گیا۔ عورتوں اور بچوں کی طویل قطار سامنے تھی۔ اس نے ایک بنچ پر اسے بٹھایا۔

"میں ابھی ڈاکٹر سے بات کر کے آتا ہوں۔" وہ فوراً ہی باہر کی طرف بڑھا۔

"آپ کیا یہاں عورتوں میں بے دھڑک چلے آئے۔ یہاں پردے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔" ایک بڑی بی نے غصے سے مخاطب کیا۔

"مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔" جھومر نے وضاحت کے بجائے مجبوری بتانے پر اکتفا کیا۔

"تو پھر وہ آپ کو مردوں کی طرف لے جاتے۔" بڑھیا ترش ہو کر بولی۔ شاید جھومر کے قیمتی سوٹ اور زیورات کا اثر تھا کہ بڑھیا غصے کے باوجود آپ جناب سے بات کر رہی تھی۔ جھومر سے بیٹھ کر بولنا محال تھا۔ اس نے آنکھیں موند کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔

"جھومر کون ہیں؟" اچانک ایک طرف سے کمپوڈر نمودار ہوا۔

جھومر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جی۔ میں ہوں۔"

"آئیے۔ آپ ساتھ والے پورشن میں آ جائیے۔ ڈاکٹر صاحب وہیں آپ کو دیکھیں گے۔" اس نے ایک جالی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

جھومر بمشکل چلتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھی۔ تمام عورتیں کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"لو بتاؤ۔ سب سے آخر میں آئیں اور سب سے پہلے چل دیں۔"

"پیسے کا کھیل ہے۔ جو پیسہ رکھتا ہے وہی سب جگہ آگے ہوتا ہے۔"

"ہم بولائے ہیں اتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔"

"ارے دیکھا نہیں۔ اس کا میاں شکل ہی سے بڑی اونچی والا لگ رہا تھا۔"

"غریب کی تو ہر جگہ ہی خواری ہے۔"

"کفتان۔ یہ عورت بڑی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر آئی ہے۔" ایک بچہ جو ابھی ابھی گود سے چھوٹ کر اندر آیا تھا۔ عورتوں کی چ

میگوئیوں کے درمیان بول پڑا۔

"وہ ڈنگ ہی رہا ہے۔ جھومر پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔" وہی بڑھیا لنگڑ کر بولی اور تھیلی اٹھا کر پہلو میں رکھ لی۔ کپڑے کی تھیلی سے پان چھالیہ نکال کر کھانے لگی۔

جھومر نے جس پورشن میں داخل ہوتے ہوئے عورتوں کے جملے سن لیے تھے۔

"آ جائیے بی بی۔ یہاں لیٹ جائیے۔" ڈاکٹر نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"یہ کتا کاٹا ہے اس کو۔ کتا پاگل تو نہیں تھا؟" ڈاکٹر ہاری کی طرف مڑا۔

"جی۔ پاگل نہیں تھا۔"

"آپ کا اپنا کتا ہے؟" ڈاکٹر جھومر کے قریب چلا آیا۔ وہ لیٹ چکی تھی۔

"جی ہمارا اپنا کتا ہے۔" ہاری نے اطمینان سے جواب دیا۔

"عجیب ہے۔ آپ کے پالتو کتے کو آنکھوں کی پہچان نہیں؟ اپنی مالکن پر ہی حملہ کر دیا۔" ڈاکٹر نے گردن موڑ کر ہاری کی سمت دیکھا۔

"مرد تو عموماً گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو آپ کی بیگم ہی گھر پر ہوتی ہوں گی۔ اسے تو سب سے زیادہ ان کی پہچان ہونا چاہیے۔" ڈاکٹر بے حد حیران تھا۔

ایک کوفت کی لہر سی ہاری کے خون میں دوڑنے لگی۔ اس نے بڑی زہریلی نظروں سے جھومر کی سمت دیکھا۔

جس کے ہوش ربا حسن نے ڈاکٹر کو بھی غیر ضروری نرمی پر مجبور کر رکھا تھا۔

"یہ بھابی ہیں میری۔" اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت کرنا پڑی۔ جیسا ڈاکٹر حسن پر ہو کر کہہ گیا تھا۔

"آئی ۔۔۔۔ ایم ۔۔۔۔ سوری۔" ڈاکٹر نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

"کہاں کہاں زخم ہے بی بی۔ ہاتھ رکھ کر بتائیے۔" ڈاکٹر اب مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

جھومر نے پیٹ پر ہاتھ رکھا تو ہاری پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"کبھی بڑے دل سے ہم عادی تھی روشانے یاور علی خان۔ پوری دریا بستی اور سرائے میں صرف ایک زبان ایسی ہے جو مجھے ہرا سکتی ہے۔"

وہ ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگا۔

معلوم نہیں۔ قیامت دریا بستی واپس آ گئی یا نہیں۔ حویلی میں سرے سے ذکر شروع ہوئے یا نہیں۔

"وہ بے چارا نعیم ۔۔۔۔" وہ نعیم پر ترس کھانے لگا۔

ایک دم سے احساس ہوا کہ نعیم کا ذکر اس کے دل پر بہت بھاری پڑتا ہے۔ کیوں؟

وہ خود پسند، خود سر لڑکی دنیا کو بہشت سمجھنے والی۔ جس کا خیال ہے کہ ساری دنیا حویلی کے باسیوں کی طرح رہتی ہے۔ مسائل اور آلام کے تجربات سے لوگ کس طرح گزرتے ہیں۔ جس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں۔ جو کبھی دریا بستی کے

کسی کے گھر میں نہیں گئی۔

جس کے بیڈ روم کا پورا مکمل کر لی۔ وی خراب ہو گیا تو صبر کر لی۔

"ہاری اشعر چاہ رہا ہے ہم آئی وی وی بہت تنگ کر رہا ہے۔ بابا صاحب سے پیسے لینے جاؤ۔ آتے ہوئے بلیک کلر ٹی وی لیتے آنا۔"

اور ایک بار اس کی کسی فضول خرچی پر جب بڑی امی نے ناراضگی سے کہا تھا۔

"پیسہ کتنا ہی ہو گھر بہت سے چلائے جاتے ہیں۔"

تو اس نے تعجب سے کہا "پھر باقی پیسوں کا کیا کرتے ہیں؟ آمیں میں اس بار چار بابا صاحب کو پیسے ادا کرتا ہے۔"

چند کو چھوڑ کر حویلی کی تمام عورتیں کسی نہ کسی کا یہی حال تھا۔ جب کمی سی دیا تھی ان کی۔ ایک بار جب میں نے کسی شو میں حاضرین کو لطیفہ سنایا تھا کہ

چالیس دن تک صبح شام ہمارا ابا کا جوس نکال کر پیا کرے تو اس کا رنگ صاف ہو جائے تو انہوں نے استہزائیہ انداز

"ایک روز کلاس میں مس نے بچوں کو مضمون لکھنے کو دیا جس کا عنوان تھا "غریب آدمی" ایک بچے نے مضمون کچھ اس طرح سے لکھا۔

"ایک آدمی بہت غریب تھا۔ اس کا نوکر بھی غریب تھا۔ اس کا ڈرائیور بھی غریب تھا۔ اس کا مالی بھی غریب تھا۔ اور اس کے بچوں کی گورنس تو بہت ہی غریب تھی۔"

اس لطیفے پر قہقہوں کا طوفان اٹھا تھا۔ بے چاری یہ تو سی بن گئی تھی۔

اس بچے سے کم بے خبر نہیں حویلی کی لڑکیاں۔

تو کیا وہ مغرور اور بے حس سی لڑکی اس کی ذات کی پاتال میں اتر چکی ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔

محض تمہاری وجہ سے میں ایک بھلے مانس سے چڑنے لگوں جس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ اس نے تیمم کے بارے میں سوچا۔

شاید یہ جذبہ میرے اندر کہیں کنڈلی مارے پڑا سوتا رہتا۔ مگر کراچی میں تم نے مجھے ہمیشہ کے لیے مضطرب کر دیا ہے۔

"آپ یہیں کام کرتے ہیں؟" ایک ادھیڑ عمر آدمی نے اسے متوجہ کیا جو بہت دیر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ چونک پڑا۔

"جی نہیں!" اس نے بہت آہستہ آواز میں جواب دیا۔

نیلی بدرنگ سی امریکن جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس اور حویلی کے بخشے ہوئے اعتماد اور انداز نشست کی دولت وہ وہاں موجود تمام مردوں میں بے حد ممتاز نظر آ رہا تھا۔

"یہ بڑا چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ہم نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نئے آئے ہیں؟" ایک اور صاحب نے اس سے گفتگو کی سعادت حاصل کرنی چاہی۔

"جی نہیں۔ میں یہاں نہیں رہتا۔" اس نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

"آپ ڈاکٹر صاحب اپنی سیٹ پر بلا رہے ہیں۔ ادھر برابر میں۔" کمپاؤنڈر نے آ کر اس کی پیچھے جان چھڑا کر اس وقت اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی قسم کی بھی گفتگو کرے۔

وہ تیزی سے ڈاکٹر کے پاس آیا۔

"جناب آپ کے لیے یہ ہے کہ ضروری ٹریٹمنٹ تو دے دی ہے مگر آپ کو اب دوائیں چاہیے وہ آپ کے لیے لانا ہو گا۔"

"دوائیں!" اسے چکر سا آ گیا۔

"جی۔۔۔ زخم بہت گہرے ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"جناب یہاں کہیں فون کی سہولت ہے۔" اب اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"جی برابر میں میڈیکل اسٹور ہے۔ وہاں ہے یہ سہولت۔"

"میں ابھی آیا۔۔۔" وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکلا تھا۔

میڈیکل اسٹور والا اس کی دور کی کال پر مشکل رضامند ہوا اور خاصے بھاری چارجز طلب کیے۔ اس وقت اسے یہ رات بڑی طویل تھی۔

اس نے نمبر ملایا۔

دوسری طرف کسی خاتون نے ریسیور اٹھایا۔

"ہاری بات کرا ہوں۔ خان سے کہیے۔"

"دوسرے ہی لمحے ریسیور سے تیمور علی خان کی آواز ابھری۔" تیمور اسپیکنگ۔"

"خان استعفیٰ ہو گیا ہے۔ جمہوری بھائی کو کتے نے بہت زخمی کر دیا ہے۔"

"تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"قصبہ گھوڑوالا سے۔۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس لایا تھا۔ گلباز کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اس کے بیچ مختصر سے محمل تھے۔

"ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اور ہماری طرف سے اس نمک حرام کو یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم اگر پہنچ گئے تو جوتی کے ہم اس پر خود چھوڑ دیں گے۔ اس دو ٹکے کی چھوکری نے ہمارا بہت قیمتی وقت برباد کیا ہے۔ ہم صرف بابا صاحب کی خاطر برداشت کر رہے ہیں۔"

حرام کیسے ہیں اس کے اب کیا لگتی ہے؟" وہ نفرت آمیز لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں خان؟" اس نے نہایت معقول جواب دینے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کل دوپہر تک پہنچیں گے۔ اطمینان رکھو۔" دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

ہاری ادائیگی کر کے میڈیکل اسٹور کے مالک سے نزدیکی کسی پٹرول پمپ کا پوچھنے لگا۔

تیمور علی خان کو فون کر کے اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

ساری عمارت پر گہری خاموشی کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

وہ بابا صاحب کے بدلے ہوئے انداز پر سوچ سوچ کر شل ہو چکی تھی۔ آنے والی کسی تبدیلی کے اندیشے نے اس کی نیند ہی اڑا دی تھی۔

کہاں تو پاپا اتنی رازداری برت رہے تھے۔ کہاں یہ کہ بابا صاحب کو سب پتا ہے۔ کیا چکر ہے یہ۔۔۔ وہ اضطراب زدہ سی اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ کیا مجھے پاپا کے ذریعے بے بس کر دیا جائے گا۔ کیا پاپا کی محبت کی مجھے کوئی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

مگر پاپا تو وہاں کے بڑے پکے سمجھے جاتے ہیں۔ پھر یہ مجبوری سی کیا پک رہی ہے؟ اسے اچانک دھیان آیا کہ سامنے پاپا کے بیڈروم کے دریچے روشن ہیں۔

پاپا ابھی جاگ رہے تھے ابھی تک۔۔۔۔ وہ کچھ سوچ کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔

اس نے بیڈ سے دوپٹا اٹھایا۔ پاؤں میں چپل ڈالی اور بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

سیاسی صورت حال کچھ بہت کشیدہ ہو رہی تھی۔ اس لیے آج کل عمارت پر پہرا بھی سخت تھا۔

باہر گیٹ کی طرف سے کسی جیپ کے روانہ ہونے کی آواز کے ساتھ سپاہیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رات زیادہ نہیں ہوئی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ رات کا ایک بج چکا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی بیڈروم تک آئی اور دستک دی۔

''کون؟'' یاور علی خان کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔

''میں ہوں پاپا۔۔۔ زرشالے۔''

دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ غالباً وہ دروازہ کھولنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔

سامنے یاور علی خاں سیاہ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس قدرے حیرت سے زرشی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی بہت گہری ہو رہی تھی۔ زرشی کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑنے لگی۔ رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا اس کے باپ کا چہرہ بہت غیر معمولی محسوسات کی کہانی سنا رہا تھا۔

''آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں پاپا؟ آپ کے بیڈروم کی لائٹ جل رہی تھی۔ میں سمجھی کہ آپ جاگ رہے ہیں ورنہ سوتے ہوئے تو آپ نائٹ بلب بھی بجھا دیتے ہیں۔''

یاور علی خان ایک طرف ہٹ گئے۔ گویا زرشی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بلا تامل اندر آ گئی۔ انہوں نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا اور اپنے بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔

''تم کیوں جاگ رہی ہو ابھی تک؟'' وہ نیم دراز ہو گئے۔

''بس ویسے ہی پریشانی میں نیند نہیں آتی۔'' وہ ان کے قریب پڑی خوبصورت سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیا پریشانی ہے؟'' وہ چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

وہ خاموش بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔

ساری عمارت پر گہری خاموشی کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

وہ بابا صاحب کے بدلے ہوئے انداز پر سوچ سوچ کر شل ہو چکی تھی۔ آنے والی کسی تبدیلی کے اندیشے نے اس کی نیند ہی اڑا دی تھی۔

کہاں تو پاپا اتنی رازداری برت رہے تھے۔ کہاں یہ کہ بابا صاحب کو سب پتا ہے۔ کیا چکر ہے یہ۔۔۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ کیا مجھے پاپا کے ذریعے بے بس کر دیا جائے گا۔ کیا پاپا کی محبت کی مجھے کوئی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

مگر پاپا تو وہاں کے بڑے پکے سمجھے جاتے ہیں۔ پھر یہ مجبوری سی کیا پک رہی ہے۔ اسے اچانک دھیان آیا کہ سامنے پاپا کے بیڈروم کے دریچے روشن ہیں۔

پاپا ابھی جاگ رہے تھے ابھی تک۔۔۔ وہ کچھ سوچ کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔

اس نے بیڈ سے دوپٹا اٹھایا۔ پاؤں میں چپل ڈالی اور بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

سیاسی صورت حال کچھ بہت کشیدہ ہو رہی تھی۔ اس لیے آج کل عمارت پر پہرا بھی سخت تھا۔

باہر گیٹ کی طرف سے کسی جیپ کے روانہ ہونے کی آواز کے ساتھ سپاہیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رات زیادہ نہیں ہوئی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ رات کا ایک بج چکا تھا۔ وہ بے تکے قدم چلتی ہوئی بیڈروم تک آئی اور دستک دی۔

"کون؟" یاور علی خان کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔

"میں ہوں پاپا۔ روشانے۔"

دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ غالباً وہ دروازہ کھولنے کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔

سامنے یاور علی خان سیاہ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس قدرے حیرت سے روشی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی بہت گہری ہو رہی تھی۔ روشی کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑنے لگی۔ روواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا اس کے باپ کا چہرہ بہت غیر معمولی محسوسات کی کہانی سنا رہا تھا۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں پاپا؟ آپ کے بیڈروم کی لائٹ جل رہی تھی۔ میں سمجھی آپ جاگ رہے ہیں ورنہ سوتے ہوئے تو آپ نائٹ بلب بھی بجھا دیتے ہیں۔"

یاور علی خان ایک طرف ہٹ گئے۔ گویا روشی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بلا تاخیر اندر آ گئی۔ انہوں نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا اور اپنے بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔

"تم کیوں جاگ رہی ہو ابھی تک؟" وہ نیم دراز ہو گئے۔

"بس ویسے ہی پریشانی میں نیند نہیں آ رہی۔" وہ ان کے قریب پڑی خوبصورت سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا پریشانی ہے؟" وہ چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

وہ خاموش بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔

"یہ پریشانی والی باتیں، یہ تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں تو کس بات سے پریشان ہو؟" انہوں نے پھر سوال کیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے آپ ناراض ہو جائیں گے۔" وہ ہچکچائی۔

یاور علی خان نے صرف ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اس کی صورت دیکھی۔ وہ ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہیں اپنی جانب دیکھتے پا کر جھٹ نظریں جھکا لیں۔

یاور علی خان نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور دو تین گہرے گہرے کش لیے۔

"روشی ابھی تمہارا باپ ہوں، تمہاری ذات سے تعلق رکھنے والا ہر معاملہ، ہر مسئلہ میرا ہے۔ اگر خدا نے مجھے اولاد سے نوازا ہے تو مقام شکر ہے کہ ذمہ داری کا احساس بھی دیا ہے۔ تم دریا بستی میں ہو، کراچی میں ہو، یا پھر امریکہ میں، ذمہ داریوں کو کم نہیں کر سکتے۔

تم آرام سے سو سکتی ہو۔ فی الحال تمہارے معاملات بہت آگے چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرے معاملات اہمیت اختیار کر رہے ہیں۔ تم اب یہ فرض کرو کہ تمہاری "فائل" خاصے عرصے کے لیے "سرخ فیتے" سے باندھ کر رکھ دی گئی ہے۔" انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں راکھ جھاڑتے ہوئے نہایت پرسکون انداز میں کہا۔

روشی حیران پریشان ان کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

"میں سمجھی نہیں پاپا!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"تمہارا مسئلہ حل ہو جائے تمہارے لیے خاص بات یہ ہونا چاہیے۔ اب تم جا کر سو جاؤ، شاباش!" ان کا انداز پہلے کی طرح باضابطہ اور اجنبی سا ہو گیا۔

وہ ڈر کر کھڑی ہو گئی۔ یاور علی خان کی سرخ آنکھوں میں سرد مہری سی جھلکنے لگی تھی۔

"پاپا!"

"تو تم کس لیے رکی ہو۔۔۔ تم جا سکتی ہو۔" ان کا انداز بلا کا سخت تھا۔

روشی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "کچھ بتانے سے کیا جاتا ہے؟ آپ جواب دینے کے پابند تو نہیں ہیں۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل ہو گئی تھی۔

یاور علی خان نے ایک لمحے کو اس کی سمت دیکھا۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

"روشانے اپنے مجھے پریشان نہیں کرو۔ مجھ پر بھروسا قائم رکھو۔ بیٹے تمہارا باپ پہلے ہی بہت مضطرب ہے اسے مزید مت الجھاؤ۔" ان کی آواز میں نہ جانے کیسی شکستگی در آئی تھی۔

انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے شاید وائرلیس سیٹ اٹھایا تھا اور آن کر کے بات شروع کر دی تھی۔

روشی کے آنسو تھم گئے تھے۔ باپ کے شکستہ لہجے نے جیسے اس کے وجود میں آگ سی بھر دی تھی، وہ ساکت سی کھڑی انہیں دیکھتی رہتی۔

"ہاں کون۔۔۔ پھر پاپا ہوں۔۔۔ یاور بات کر رہا ہوں۔۔۔ وائل ہاں کیسی طبیعت ہے۔۔۔ ہو گئے۔۔۔ سوال کی ہے بھی لائٹ سے گی۔۔۔ اوور۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ اوور۔۔۔ ہوں۔۔۔ بہت بہتر ہے مجھ پر یقین رکھیں۔۔۔ نہیں تو مجھ پر اعتماد۔۔۔ اوور۔۔۔ اوور اینڈ آل۔"

انہوں نے سوئچ آف کر دیا اور وائرلیس واپس رکھ دیا۔

"تم گئی نہیں؟"

"آپ ٹینشن پر ہیں کسی وجہ سے مضطرب بیٹھے ہیں۔ میں گئی تھی۔۔۔ آئی ایم سوری پاپا! خاور ٹھیک کہتے ہیں آپ ایک مشین ہیں اور آپ اس مشین کا ایک پارٹ ہیں اور مشینوں کو دل رکھنا نہیں آتے۔ اگر آپ ایک اچھا اور واضح جملہ مجھے پرسکون کرنے کے لیے استعمال کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ بس مجھے میٹھی نیند آ جاتی مگر ایک مشین۔۔۔"

وہ تیزی سے پلٹ گئی۔

یاور علی خان کے روم روم میں جانے کس کس رنگ کی اذیت اتر آئی۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک گھٹا ٹوپ بھیانک اندھیرے نے استقبال کیا تھا۔ آتے ہوئے وہ بڑی موم بتی کا پیکٹ لانا نہیں بھولا تھا۔

"میں ذرا اندر روشنی کر کے آتا ہوں، آپ یہیں ٹھہریں۔" اس نے کار کی پچھلی سیٹ پر دراز جمہور کو مخاطب کیا۔

جواب میں دوسری طرف خاموشی طاری رہی۔ وہ کار سے باہر آ کر راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

ایک موم بتی راہداری میں اور دوسری ہال کمرے میں روشن کی اور الٹے پاؤں واپس احاطے میں آیا۔ گیٹ بند کیا اور پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر اسے باہر آنے کو کہا۔

جمہور نے اس طرح ہاتھ بڑھایا جیسے اسے کسی سہارا دینے والے ہاتھ کی ضرورت ہو۔

ہادی نے بلا توقف اس کا ہاتھ تھاما اور اس کو باہر آنے میں مدد دی۔

جمہور باہر آ کر اس کے شانے سے ٹک گئی اور آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

اسے ہال کمرے میں بچھے تخت پر لٹا کر وہ واپس باہر آنے لگا تو جمہور نے آواز دی۔

"ہادی! کہاں جا رہے ہو؟"

"باہر احاطے میں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ میرا افسانہ وہ کوزہ ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوئی ہے وہیں جا رہا ہوں۔" اس کی آواز میں ہلکی لرزش اور کراہٹ تھی۔

"کاش ہم بھی کسی کا افسانہ ہوتے۔" جمہور کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

"سمت قریب دیکھ کر لوگ من چاہتے ساتھ کی فکر کرتے ہیں اور یہاں۔۔۔" اس نے چل کر جلدی دروازہ بھیڑ دیا اور باہر آ

گیا۔

اس کو وہ اپنے سے پہلے کچھ کھلانا چاہتا تھا، وہ اسی خیال سے درمیانی کمرے میں آیا تھا، جہاں کھانے پینے کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔

چند اسنیکس اور پانی کا گلاس لے کر وہ پانچ منٹ بعد واپس اس کے پاس آ گیا تھا۔

"اٹھیے، کچھ کھا لیجیے، پھر دوا کی باری آئے گی۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑی چیزیں تخت پر رکھ دیں اور وہ واپسی کے ارادے سے قدم آگے بڑھانے لگا۔

"ہادی۔۔۔!"

"جی۔۔۔!"

"بہت ناراض ہو؟"

ہادی کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ مڑ کر جھومر کی شکل دیکھنے لگا۔

"معاف کر دو مجھے، میں نے شاید تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ پلیز ہادی۔"

"کس بات کی معافی مانگ رہی ہیں آپ؟" وہ بس یہی کہہ سکا۔

"دراصل ہادی! میری جگہ کوئی اور بھی لڑکی ہوتی تو یہی سمجھتی، کیونکہ تم عورت نہیں ہو اس لیے ان احساسات تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر میں تم سے معافی مانگ چکی ہوں۔"

"یہ اندازہ لگانے میں جلدی نہ کریں، ابھی تو نہ جانے کتنے دن مجھے اور آپ کو کھلنا رہنا ہے۔"

"کاش! میں تم جیسے مرد کے ساتھ عمر بھر گزار سکتی۔ قطری کے بھٹکتے ہوئے بیدار، کیسے مجھے ملتے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"پلیز! بھابی خاموش ہو جائیں، یہ دعا کا میری کل طاقت سے زیادہ ہے۔ میں اسے اس وقت بالکل بھی اہمیت نہیں دے رہا ہوں کہ آپ کے ہوش و حواس قائم نہیں ہیں، لیکن اگر آپ نے آئندہ اس طرح کے الفاظ منہ سے نکالے تو۔۔۔"

وہ رک گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ سانس کی رفتار خاصی تیز ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گریبان کا بٹن کبھی کھول رہا تھا، کبھی بند کر رہا تھا، جو اس کی اضطراری کیفیت کو ظاہر کرنے والا عمل تھا۔

"بھابی! میری بات غور سے سنیں، یہ سوچ کر بلکہ یقین کے ساتھ سوچ کر سنیں کہ فی الحال آپ کے ارد گرد موجود انسانوں میں، میں آپ کا واحد خیر خواہ ہوں۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"کیسے خیر خواہ ہو، میں تمہارے سامنے خون خون پڑی ہوں۔ اگر تم میرے خیر خواہ ہوتے تو پہلی فرصت میں مجھے یہاں سے نکل بھاگنے کا موقع فراہم کرتے۔" جھومر جیسے اس پر برس پڑی۔

"میں صرف آپ ہی کا نہیں حویلی کے ایک ایک فرد کا خیر خواہ ہوں۔ آپ سے خیر خواہی کا مطلب یہ نہیں کہ باقی سب کے ساتھ وفاداری کا معاہدہ منسوخ ہو گیا۔" اس نے بہت دھیمی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہادی! انسان ہے، حسن تو روز اول سے بہترین سفارش ہے۔ میں ان کانوں پر پہرے داری کرتی ہوں تو سوا میری مرضی سے ہے، اگر کسی کے پاس جاؤں تو وہ سب سے زیادہ توجہ مجھے پر دیتا ہے۔ بھیڑ میں ہوں تو لوگ ادھر ادھر ہٹ کر پہلے مجھے راستہ دیتے ہیں۔

بچوں سے بات کروں تو مجھے شوق سے دیکھتے ہیں، اشتیاق سے سنتے ہیں۔ ہم عمر لڑکیوں میں جھومر کو میں کر کے بھی اپنی اسکول کالج میں آگے چلتی تھی تو لڑکیاں رستہ دیتی تھیں، مجھے پیچھے چھوڑ دیتی تھیں۔۔۔ کسی کمپلیکس کا شکار ہو جائے گی، کسی کی جہاں تم ہادی! ادھر کی طرف دیکھ پڑے۔

گھر میں احساس کیا ہے کہ تم کو کوئی اثر نہیں۔ تمہارے سامنے میرا حسن اور بناؤ سنگھار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں جیسی ایک سی ہوں۔"

جھومر کے لہجے میں شکایت اور لرزش تھی، مگر نہ جانے کیوں وہ اتنا کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

"اور اس روز اس غلطی کی وجہ بھی یہی تھی، کہ شاید تم بھی میرے حسن سے ظاہر۔۔۔!" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

ہادی اسی طرح اس کی پشت کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ جب چند لمحوں تک کوئی جملہ جھومر کی طرف سے نہیں آیا تو اس کے جسم میں جنبش ہوئی، وہ مڑ کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اب مکمل طور پر جھومر کے روبرو تھا۔

"حسین عورت کے ساتھ مرد کا ایک ہی رشتہ نہیں ہوتا۔ حسین عورت ماں، بہن، بیٹی، بہو، بھابی، پھوپھی، خالہ، چچی، تائی کچھ بھی ہو سکتی ہے اور ہر رشتہ اپنے اندر کچھ حدود، پاس اور احترام کے تقاضے محفوظ رکھتا ہے۔

آپ واقعی بہت حسین ہیں، مگر میرے لیے آپ کا حسن آپ کی ذات کی طرح قابل احترام ہے۔ میں آپ کو بھابی کہتا ہوں، آپ اس رشتے کا پاس مجھے کرنے دیجیے۔"

اس نے بہت پرسکون انداز میں ٹھہر ٹھہر کر ایک مفصل جواب دیا۔ وہ جھومر کے بے رحم الفاظ کے حملے سے پیچھے ہٹ گیا تھا، اسے اب خود پر مکمل کنٹرول تھا۔

جھومر نے دیر سے بند آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

شاید اس کے گریبان کا اوپری بٹن ٹوٹ گیا تھا کہ گریبان کشادہ ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی سینے اور بائیں شانے پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے اور سفید شرٹ پر بہت نمایاں تھے۔ جھومر کو سہارا دیتے وقت غالباً اس کی کلائی سے بہنے والا خون وہاں اپنی کارگزاری دکھا گیا تھا۔

"مگر میں تمہیں مطلع کر چکی ہوں، وہاں حویلی میں میرا کسی سے کوئی قانونی اور شرعی رشتہ نہیں ہے۔ تم یا کوئی اور مجھے بھابی کہتا ہے تو گالی لگتی ہے مجھے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ شادی نہیں ہادی۔۔۔ ڈاکہ پڑا ہے میرے باپ کے گھر میں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آپ یہ کچھ تھوڑا سا کھا لیں، پھر دوا بھی کھانی ہے۔ نیند کی گولیاں بھی ہیں، کھا لیں گی تو نیند آ جائے گی اور تکلیف کے احساس سے نجات مل جائے گی۔"

حیرت انگیز طور پر ہادی باہر جانے کے بجائے اس کی سمت بڑھا۔ اس نے ایک پیس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کھا لیجیے، مناسب ہے ویسے آپ کی مرضی۔"

جھومر نے قدرے حیرت سے دیکھا پھر ایک کیک پیس اٹھا کر چپ چاپ کھانے لگی۔

موم بتی کے بجھنے سے اچانک ہی وہ اندر کے خطرات سے برآمد ہونے والی آواز شکر حسین ہو رہی تھی۔

ہاری وہیں تخت کے ایک کنارے پر ٹک گیا اور ایک طرف رکھی دوائیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہی تھی اور ہاری کو اچھی طرح اس کا دیکھنا محسوس ہو رہا تھا، اسی وجہ سے اس نے نظر اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

"ہاری! یہاں بہت گھٹن محسوس ہوتی ہے۔" بالآخر وہ بولی۔

"یہ قید خانہ ہے، ظفری کا ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم نہیں۔" اس نے برجستہ کہا تھا۔

"ہونہہ، وہ دوزخ ہے وہ۔" اس نے گلاس اٹھا کر پینا شروع کر دیا۔

"تم کہاں سوتے ہو؟ تمہیں گرمی نہیں لگتی؟"

"میں دالان میں سوتا ہوں، گرمی ابھی کہاں ـــ" وہ اتنے نرم انداز میں جواب دے رہا تھا کہ وہ لمحے بھر کو ہر بات بھول گئی۔

"نیند آ جاتی ہے؟" اس نے ہاری پر تفصیلی نظر دوڑائی۔

وہ سر جھکائے ہنوز دواؤں کے لیبل پڑھ رہا تھا یا پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آ جاتی ہے۔" وہ نہ جانے کیوں آہستگی سے ہنس دیا تھا۔

"ڈر نہیں لگتا وہاں؟" اس دن والے "چھڑا" سے وہ ابھی تک خوفزدہ تھی جو ابھی تک رلا رہا تھا۔

"ڈر ـــ؟" ہاری نے بے ساختہ نظریں اٹھائی تھیں۔ "کس چیز کا ڈر؟"

"سنا ہے ویرانوں میں بھوت اور آسیب ٹھکانا بنا لیتے ہیں۔" خوف سے اسے جھرجھری سی آ گئی۔ ماحول ہی اس قدر بھیانک سا ہو رہا تھا۔

"بقول آپ کے گردوشی بی بی تو مجھے حویلی کا آسیب کہتی ہیں۔ ایک آسیب دوسرے آسیب سے کیوں ڈرے؟" وہ مسکرا دیا۔

"اور کچھ لیجیے نا۔" اس نے جھٹ سے بات کا رخ موڑ دیا۔

"نہیں بس ـــ لاؤ مجھے تم دوا دے دو۔ نیند کی ضرور دینا۔ میں بہت بے خبر سونا چاہتی ہوں۔ باہر کے ظلم کیا سہتی گے البتہ روح کے ظلم بہت بے چین رکھتے ہیں۔

اگر نیند کی ایک گولی آٹھ گھنٹے سلا سکتی ہے تو تم مجھے دو دے دینا۔ میں سولہ گھنٹے لاشعوری سے غافل رہنا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے جی بھر کر سونے کے بعد میں خود کو زیادہ طاقتور اور کارآمد محسوس کرنے لگوں اور شاید اپنے لیے کچھ کر

سکوں۔ تکلیف ابھی بہت ہو رہی ہے۔ سیدھی ٹانگ میں بہت اکڑاؤ ہے۔"

اس نے تکلیف کے احساس سے بچا ہوا دواؤں کا ڈبہ اٹھا لیا۔

"جھومر ـــ یہ لیجیے۔" ہاری نے کئی قسم کی گولیاں اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔

"اتنی ساری گولیاں ـــ اتنے سونے سونے سے لگنے والے جگمگاتے تھے وہ کس لیے تھے؟"

وہ دنگ رہ گئی گولیاں دیکھ کر بدک گئی۔

"وہ زہر بیچنے کے خطرے سے بچانے کے لیے تھے۔ یہ شاید ضرور لوگوں کے لیے ہیں۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"میں اعلان کرتی ہوں تم نے میری حفاظت قبول کر لی تم واقعی اچھے ہو۔"

"اس کا کام کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ابھی زندہ لوگوں کے بارے میں۔" اس نے صرف گولیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نیند کتنی دیر میں آ جائے گی؟" اس نے گھٹے گھٹے انداز میں سوال کیا۔

"آپ دوا کھا کر لیٹ جائیں، جلدی آ جائے گی۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔

"مگر شاید یہاں میں نیند آنے سے بہت گھٹن ہے۔ یہ تخت دالان میں نہیں جا سکتا، اگر نہیں جا سکتا تو میں وہاں بیچ ہی لیٹ سکتی ہوں۔" جھومر نے قناعت سے کہا۔

"آپ لیٹیے، میں یہ تخت باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اکیلے؟" جھومر نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے اب رات کے اس پہر فوج کہاں سے طلب کروں؟" وہ تھوڑا سا جھلایا۔

"ماشاءاللہ بہت مضبوط ہو۔ اس میں کیا شک ہے ایک مضبوط مرد ایک عورت کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے اس کا احساس کسی 'بے چاری' سی عورت ہی کو ہو سکتا ہے۔" وہ آہستہ سے تخت سے نیچے اتر آئی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔

ہاری نے دوائیں زمین پر رکھیں اور تخت اٹھا لیا۔

جھومر نے آنکھیں موند لی تھیں۔ ہاری تھوڑی دیر میں واپس آ گیا۔

"کیا تکلیف زیادہ ہو رہی ہے یا نیند آ رہی ہے؟" چند لمحے انتظار کے بعد جب اس نے آنکھیں نہ کھولیں تو اسے پوچھنا پڑا۔

"تکلیف تو خیر بہت ہے مگر آنکھیں میں نے اس لیے بند کر لی تھیں کہ تم وزنی تخت اٹھا رہے تھے کہیں تمہیں میری نظر نہ لگ جائے۔"

وہ جھومر سے بولی اور لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

ہاری نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

"آہستہ آہستہ چلیں، جلدی کیا ہے؟"

وہ اسے سہارا دے کر دالان تک لایا اور تخت پر لٹا دیا۔

تھوڑے فاصلے پر اس کا پلنگ پڑا ہوا تھا۔

"ہاری ---!"

"جی ---!"

"زحمت تو ہوگی، مجھے تھوڑا سا پانی اور پلا دو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چند منٹ بعد پانی لے آیا۔

بھوری ایک سانس میں پانی چڑھا گئی۔

"معلوم نہیں، اتنی پیاس کیوں لگ رہی ہے۔ کیا آگ بھڑک اٹھی ہے اندر۔" اس نے گلاس واپس کرتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا اور پیچھے تخت پر ڈھے گئی۔

ہاری گلاس رکھ کر آیا اور آہستگی سے پلنگ پر دراز ہو گیا۔

نیا چاند طلوع ہونے میں ابھی دو تین روز باقی تھے، راتیں اندھیری تھیں، مگر تاروں کی بن آئی تھی۔ جا بجا آسمان پر تاروں، گھروں میں چراغ روشن تھے۔

موم بتیاں اس نے بجھا دی تھیں۔ حویلی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ویرانے کی رات --- کچھ سرسراہٹ، جھینگر اور مینڈکوں کی اعصاب شکن آوازیں کسی طرح بھی تو پُرسکون سانس لینے کی رعایت نہیں تھیں۔ اس نے گردن موڑ کر ذرا فاصلے پر لیٹی بھوری کی طرف دیکھا۔

تخت پر گویا چراغ روشن تھا۔ ایک نامعلوم سا خوف کچھ بے نام جذبے اس کے اندر اترنے لگے۔

دلاور علی خاں اپنی صبح کی چہل قدمی میں مصروف تھے۔ ان --- سے کچھ فاصلے پر یاور علی خاں لان چیئر پر بیٹھے معمول کے مطالعے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

روشی بہت تیز رفتاری میں آئی تھی اور سیدھی بابا صاحب کے پاس پہنچی تھی۔

"السلام علیکم، بابا صاحب!"

"وعلیکم السلام --- جیتی رہو۔ بھئی ہمیں تمہاری یہ عادت بہت اچھی لگتی ہے کہ تم سویرے سویرے اٹھتی ہو۔" وہ بشاشت سے مسکرائے۔

"آپ کتنے بجے تک روانہ ہوں گے؟" اس نے بھرپور سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

"ڈرائیور کسی کام سے گیا ہے، وہ آتا ہے اور ہم روانہ ہوتے ہیں۔ خیریت؟ کوئی پیغام ہے بچوں کے لیے؟" انہوں نے چہل قدمی موقوف کر دی اور ایک جگہ ٹھہر گئے۔

"نہیں، میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

یاور علی خاں نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ایک لمحے کو اپنی گول عینک کے اوپر سے دیکھا، پھر عینک درست کر کے دوبارہ مطالعہ کرنے لگے۔

"بچوں سے اجازت لے لی؟" بابا صاحب بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔

"انہیں تو ساری باتیں آپ ہی سے پتا ہوتی ہیں۔" اس نے ایک اچٹتی سی نظر یاور پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ اور طرح کے کیس ہوتے ہیں۔ اب تم یہاں ہو۔ یہاں ہر بات کی اجازت اپنے باپ سے لوگی۔ ہم کہتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ورنہ گھر کا باپ ہوتا ہے۔" وہ مسکرا رہے تھے۔

"پاپا کیا کہیں گے، اور انہیں فرق کیا پڑتا ہے۔ سارے فرق تو ہمیں پڑتے ہیں۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

"پھر بھی بچی۔"

"میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ کی موجودگی میں کسی اور گھر کے فرد سے اجازت لی گئی ہو۔" اس نے خاصے تلخ لہجے میں کہا۔

دلاور علی خاں خاموش سے ہو کر رہ گئے۔

"پاپا!" وہ یک دم یاور علی خاں کے قریب پہنچی۔ "میں بابا صاحب کے ساتھ جا رہی ہوں اور مجھے جانا ہے بس۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے نظریں اٹھائے بغیر ہتک سے انداز میں کہا۔

روشی کے دل کو کچھ ہوا۔

"کاش پاپا اسے روکتے، کہتے۔ کاش اس سے پوچھتے کہ آخر وہ اچانک کیوں جا رہی ہے۔"

"بابا صاحب اجو کو چھٹیاں پڑتے ہی یہاں بھیج دیجیے گا۔ ایک ہفتے کے لیے اگر بس چاہیں تو اسے ساتھ لے جائیں گو ذرا اسے چینج مل جائے گا۔" یاور علی خاں اخبار تہہ کرتے ہوئے دلاور علی خاں سے مخاطب تھے۔

"ہاں ہاں! بابا سے نہیں آ جائے گا وہ۔"

"میں سوٹ کیس پیک کر رہی ہوں۔"

"روشی --- پہلے ناشتا کر لو۔" یاور علی خاں نے اپنے مخصوص انداز میں اسے ٹوکا۔

"ساتھ لے جاؤں گی، راستے میں کر لوں گی ناشتا۔" اس نے بے چینی سے انداز میں جواب دیا۔

"بھئی روشی کا ابھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ کل تو جانے کی جلدی نہیں تھی اور آج جانے کی جلدی ہے۔" بابا صاحب نے روشی کو اندر بڑھتے ہوئے دیکھا تو شگفتہ انداز میں بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

"نہ جانے کیوں بابا صاحب مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے جیسے میں اپنے بچوں کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ بابا، بھر بیٹھے مجھ سے ایسے ہیں۔" یاور علی خاں اخبار تہہ کرتے ہوئے بڑے گم صم سے انداز میں باپ سے مخاطب ہوئے۔

"تمہارا اندازہ درست نہیں۔ تمہاری بچی تم پر بہت فخر کرتی ہے۔ وہ تو بتانے کو تیار نہیں کہ کوئی اس کے باپ سے

"دلاور علی بھی ہو سکتا ہے۔" بابا صاحب مسکرا رہے تھے۔

"اچھا۔" یاور علی خان دھیرے سے مسکرائے۔ "مجھے لگتا ہے یہ کوئی بڑی الجھن ہوگی۔"

"ایسی بات نہیں۔ البتہ فی الحال وہ الجھی ہوئی ہے۔" دلاور علی خان نے اپنی رائے دی۔

"آپ کے لیے تو مسئلہ نہیں تھی۔" نہ جانے کیوں وہ پوچھ بیٹھے۔

"وہ مجھے بھی بے حد پیاری اولاد ہے۔ تم ہی کو گھر پالنے لگے۔ آج بہت اچھی ہو رہی ہے۔ وہ آپ سے کوئی ملاقات ہوگی؟" سمجھتی ہے۔ بطور بابا، یاور علی خان کو دیکھنے لگے۔

"اور تمہیں بابا صاحب اس پر بھی آپ کی بہو جیسی مرحومہ کا خیال آ گیا تھا۔ آپ نے جس طرح میری اماں کا ذکر کیا ہے وہ صاحب تو بچا ہی نہیں سکتا۔ کل تک روشنی لان میں تتلیاں پکڑتی پھرتی تھی اور اب آ کر مجھے میرے سامنے آ گئی۔ یہ ہمت کا کام ہے۔ مجھے نہیں احساس کہ کس طرح سے وقت گزر گیا اور سب آپ ہی کا صدقہ ہے۔ مجھے کیا پتا بچے کیسے پرورش کرتے ہیں۔ میں نے کبھی آپ کا ہاتھ نہیں بٹایا۔ جب کبھی حویلی جاتا تھا بچیوں کو کہتی تھیں کہ پاپا کو سلام کرو تو بیٹھے۔ میں بیٹھ کے چائے پیتا تھا اور محسوس کرتا تھا کہ میں ان کا باپ ہوں۔" وہ بولتے ہوئے بے بسی سے مسکرائے۔

"یہ سارا قصہ بڑی الجھن کے ہاتھوں میں طے پایا ہے۔ حقیقت میں ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اس بات کو دونوں بچوں کے واسطے بہت ہیں۔ جب ہم نے بھی حیثیت سے انہیں پسند کیا کہ ہمارے اپنے بیٹے کی ہوں تو تمہاری ماں نے بہت مخالفت کی تھی۔ وہ اپنی بھتیجی لانا چاہتی تھیں۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ہمارا فیصلہ درست ہے۔" بابا صاحب نے فخر سے کہا۔

یاور علی خان نے گہری سانس لی۔

"پھر بھی بابا صاحب کوئی کمی تو رہ گئی ہوگی۔ ماں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔" وہ بولتے بولتے رک گئے اور بابا صاحب آگے بڑھ بیٹھے۔

"کیا کہتی ہیں؟" وہ استفسار کرنے لگے۔

یاور علی خاں نظریں چرا کر ایک طرف دیکھنے لگے۔

دلاور علی خاں نہ جانے کیوں مسکرائے۔

"اس مرتبہ بات تو ہماری طرف سے پوچھتا۔ وہ ان بچوں کی محبت میں کتنا آگے بڑھ چکی ہیں۔ ہمیں ضرور دینی ہوگی تو البتہ تمہیں اپنا حصہ دیتے ہی بچے ہیں۔ جب ہم تم سے کل شام کو کہہ رہے تھے؟"

"روشنی آ رہی ہے بابا صاحب!" یاور علی خاں نے بہت دھیمی اور دبی ہوئی آواز میں باپ کو متوجہ کیا۔

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔

"میں ہاسٹل جا رہی ہوں بابا صاحب! آپ ابھی تک یہیں ہیں؟" وہ آتے ہی کہہ گئی۔

"ہم بھی جا رہے ہیں۔ تم نے ناشتہ کر لیا؟ سامان میں؟"

"جی۔ اور گاڑی درست ہے جانے والی ہے۔ راستے میں نکلیں گے تو مجھے اتار دیں گے کیونکہ آپ کی تو جیب ہی کھوٹی ہے۔ بولی ہی کہتی ہیں، آپ کی جیب میں تو بہت میں چونی بھی نہیں ہوتا۔" وہ بڑے لاڈ سے کہہ رہی تھی۔

دلاور علی خاں بے ساختہ ہنس دیے۔

"یہ تو ہمارے حق میں بہت ہی اچھا ہوا۔ ایک تو ہم تمہارے ساتھ رہیں گے، دوسرے تمہارے ساتھ ہی چلی جائے گی۔"

"پاپا میں جا رہی ہوں۔" اب وہ باپ کی طرف بڑھی۔

"اچھا بیٹے تمہاری مرضی۔ پھر ہو سکتا ہے جاتے تو مطلع کر دینا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔" انہوں نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"بابا صاحب اپنا تو اپنی بیٹی کے ساتھ بھی مہمانوں کی طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔" وہ ایک دم بولی۔

"کیا نہیں پوچھا؟"

"یہی کہ میں کیوں جا رہی ہوں؟" اس نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔

یاور علی خاں نے اس کی طرف قدرے چونک کر دیکھا تھا۔

"ہاں بھئی تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا۔" دلاور علی خاں نے تائید کی۔

"میں نے تو اس لیے نہیں پوچھا کہ ہو سکتا ہے یہ یہاں کی تنہائی سے بور ہو گئی ہو ورنہ کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔" یاور علی خاں الجھ گئے تھے۔

"چلو اب پوچھ لیتے ہیں کہ کیوں جا رہی ہو؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ بہت لیٹ ہو جاتے ہیں پاپا۔ شاید انہی باتوں کی وجہ سے میری امی جلدی چلی گئیں۔" اس نے منہ اشتعال سے کہا تھا۔

نہ جانے کیوں یاور علی خاں نظریں نہ اٹھا سکے۔ دلاور علی خاں اپنی چھڑی سے گھاس کریدنے لگے۔

"خان! گاڑی تیار ہے۔" دلاور علی خاں کا ڈرائیور آ چکا تھا۔

روشنی سامان لینے کی نیت سے اندر دوڑ گئی۔

"تم ہمارا سامان رکھو، آ رہے ہیں ہم۔" دلاور علی خاں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

ڈرائیور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"بابا صاحب! کہیں روشنی نفسیاتی کیس نہ بن جائے، مجھے اب ڈر ہونے لگا ہے۔" یاور علی خاں کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ابھی یہ تم جیسے بہت پڑھے لکھے لوگوں کی فضول باتیں ہیں۔ ہم ان پر یقین نہیں رکھتے۔" وہ کسی گہری سوچ سے چونک کر بولے۔

بابا ولی علی خاں خاموش ہو رہے۔

"چلیں بابا صاحب!" روشی اپنا پرس لئے واپس آ گئی تھی۔

"تمہارا سوٹ کیس؟" وہ پوچھنے لگے۔

"ڈرائیور لے گیا ہے۔ آپ آئیے۔ اچھا بابا! ابھی بھی ہمارا خیال کر لیا کریں۔ بعض لوگوں کو آپ سے بڑی توقعات ہوتی ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر پورچ کی طرف بڑھ گئی۔

"حویلی کب آؤ گے؟" بابا ولی علی خاں چلتے چلتے رک کر پوچھنے لگے۔

"ویک اینڈ پر ہی آ سکتا ہوں۔ ابھی تو فرانس جانے کا مرحلہ سامنے ہے۔ خیر۔۔۔" وہ الوداع کہنے کے خیال سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ روشی کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ جیپ میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ لالٹین کی آگ سے جلتا ہوا سانس سینے سے خارج کر کے چپ چاپ کھڑے رہ گئے۔ آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی تھی۔

"آپ اتنے کمزور تو نہیں ہیں کہ آپ کا پتا بھی نہ ملے۔ بندہ صاف ستھرا ہو تو جلدی صحت یاب ہوتا ہے۔ آپ سے کمال ہی کی توقع ہوتی ہے۔ ملا کر پانی تو پی نہیں سکتے۔ پتا نہیں لال خان پر کون سے احسان اور کس طرح کر ڈالے ہیں کہ وہ چاہ کے سر نہیں اٹھا سکتے۔"

بالو اس کے تیز تیز کر کے لوٹتے ہو گئی سے کہہ رہی تھی۔

مسکرا کر خطاب کرتے ہو
عادتیں کیوں خراب کرتے ہو

اس نے بالو کے انداز گفتگو پر بڑا لطیف سا طنز کیا تھا۔

"ایک تو سب سے پہلے آپ کی اس بیماری کا علاج ہونا چاہیے۔ مشین کی طرح شعر نکلتے ہیں آپ کے اندر سے۔" وہ جل کر بولی تھی۔

"اور یہ دلیے کا دیسی کھانا ہے۔ جب کھانا نہیں ہوتا تو منع کر دیا کیجئے۔ مجھے گھر میں اور بھی تو کام ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ دوسرے کا وقت برباد کرتے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی دوا کی شیشیاں ترتیب سے لگا رہی تھی۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو اپنی صحت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ آپ ٹھیک ہی نہیں ہونا چاہتے۔" وہ اس کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹھے بیٹھے تو قارون کے خزانے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر آپ کا کاروبار کیا ہے؟"

بالو بھی اور دست بستہ تھا۔

کیا حال پوچھتے ہو مرے کاروبار کا
آئینے بیچتا ہوں میں اندھوں کے شہر میں

"صاحب۔ چالاک ہوں میں۔ سیدھی سی بات کیا کچھ سمجھ میں آ جائے۔" وہ گیلا تولیہ اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے ٹھٹھک کر بولی۔

اسی دم لال خان اندر آ گیا۔ "بھئی آج تو بڑی دیر ہو گئی۔ ناشتہ کر لیا تم نے۔ یار کھانا کیا کرو۔ میں نے تم سے کہا تھا کپڑے بدل لینا، تم سے بھی حد ہے۔"

لال خان ایک تو ادھر سے بولا تھا۔ مگر عارف پر اس کے بولنے کا اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح نیم دراز چھت کی طرف دیکھتا رہا۔

"یار! کچھ کہہ رہا ہوں۔ کیا سوچ رہے ہو؟" وہ اس کے نزدیک بستر پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں، اب کیا سوچنا۔ کبھی سوچتے تھے۔

اس کی چاہت کی چاندنی ہو گی
خوبصورت سی زندگی ہو گی
اک لڑکی بہت سے پھول لئے
دل کی دہلیز پر کھڑی ہو گی!"

وہ ہنس پڑا تھا۔

"بے چاری دال ہی کی گی ہو گی تھی۔" بالو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔" لال خان نے زبردست قہقہہ لگایا۔ "یار! یہ تمہاری بھابی بھی بہت اچھا مذاق کرتی ہے۔ یوں تو زیادہ بولتی نہیں ہے اور جب بولتی ہے۔ ہو ہو۔ ہو۔ ہا ہا۔"

ناگواری کے احساس سے بالو کی پیشانی پر لاتعداد بل پڑ گئے تھے۔

"رات میں دو مرتبہ تمہارے پاس آیا۔ تم بے خبر سو رہے تھے۔ حالانکہ رات تو میں نے تمہیں نیند کی گولی بھی نہیں دی تھی۔ یہ اچھی علامت ہے۔ صحت کی نشانی ہے۔ انشاء اللہ دو چار دن میں چلنے پھرنے لگو گے۔"

"خیر چلیے یہ چلا۔ پھر تو چاہیں۔ فی الحال تو جنت میں بیٹھے ہیں۔" بالو کی طرف سے پھر بڑا کورا جواب آیا۔

"جنت تو "شراب طہور" والی بھی ہمارے لئے کشش نہیں رکھتی۔ اور آج کل تو یہاں پر بھی بڑی بدمزگی ہے۔" اس نے لال خان کو گھورا۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس نے آنکھیں بند کر کے بڑی سرمستی میں عارف کو پکارا تھا۔

"لال خان۔ یار۔ ہم پر ترس نہیں آتا۔ بالکل بے مزا کر کے رکھ دیا ہے ہمیں۔ کیسے یار ہو؟" اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"میں تمہیں اس طرح خودکشی کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اب تم اسے نہیں پی رہے تھے، وہ تمہیں پی رہی تھی۔ شروع شروع میں مشکل تو ہوتی ہی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ سنبھل جاؤ گے۔" لال خان نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"تو پھر کے لیے کیا دسترخوان چنوں؟" بالو نے دروازے میں رک کر پھر اٹھلا کے پوچھا تھا۔

"ہو۔ ہو۔ ہو۔ یار تمہاری بھابی آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔ وہ اتنی اچھی اردو بولتی ہے۔ ہو ہو ہا۔" لال خان اپنی کی قابلیت پر لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔

"کوئی خاص چیز بنانے کی ضرورت نہیں بھابی۔ جو گھر میں پکے گا کھا لیں گے۔ آپ میرے معاملے میں لال خان کو شامل نہ کریں۔ یہ تو یونہی کرتا ہے۔"

عارف نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس طرح کی سنجیدگی بالو نے پہلی بار دیکھی تھی اس میں۔ ورنہ اس کی گفتگو میں کبھی چھپا ہوا طنز، کبھی استہزا اور کبھی شوخی ہی ہوتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر باہر نکل گئی۔

"رات بڑے اچھے انار لایا تھا میں تمہارے لیے۔ تمہاری بھابی سے کہتا ہوں وہ جوس نکال کر دے دے گی۔ بس اب میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یار۔ کیوں بھابی کو تنگ کرتے ہو۔ ان کے پاس پہلے ہی کم کام ہوتا ہے۔" اس نے پھر لال خان کو ٹوکا۔

"وہ اس گھر میں بہت عیش میں ہے۔ نوکروں سے گھر بھرا پڑا ہے۔ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اس میں تمہارا ہاتھ ہے۔ سب سے بڑھ کر تم میرے یار ہو۔ اور ہم یار کی قدر پہچانتے ہیں۔ مت بولا کرو میرے معاملوں میں۔"

لال خان نے جھک کر اس کا کندھا زور سے دبایا۔ "اچھا۔ خدا حافظ۔ اپنی بھابی کو تنگ مت کرنا۔ جو دے کھا لینا۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ عارف نے پھر آنکھیں موند لیں۔

نہ زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے
ترا وجود ہے صرف داستان کے لیے

دور کہیں کوئی گاتا ہوا ایک ایسا گیت گنگنانے لگا۔ اس عرصے میں اس نے یہ گیت نہ جانے کتنی بار گنگنایا تھا۔ بلا کی خوبصورت اور پر سوز آواز تھی۔

بالو جوس کا گلاس پکڑے ہوئے چند لمحے اسی طرح کھڑی رہ گئی۔

"ہاتھ میں پکڑاؤں یا رکھ کر چلی جاؤں؟" اس نے گھبرائے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ عارف نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"رکھ دیں۔ شکریہ۔ یہ ساری خدمات مجھ پر قرض ہیں۔ زندگی رہی تو آپ کو واپس کروں گا۔"

اور گلاس رکھ کر دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی۔ پھر ایک دم رک گئی۔

"آپ بار بار میری اور اس بار پی رہے ہوں اب بھی میرے قرض نہیں اتار سکتے۔ کس خوشی میں رہتے ہیں آپ؟"

جل بھن کر بولی تھی۔

"میں تو بتا رہا ہوں میں نے آپ کو؟" عارف کی آنکھیں حیرت کا مظہر بن گئیں۔

"پھر آپ بھی کہتی نہیں ہے۔ دوسروں کی حس ہے روئیں میں اتر گئی ہے۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

عارف ششدر سا دروازے کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

اس کا ذہن بری طرح الجھ چکا تھا۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر بے حال ہو گیا۔ اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کا آخری جملہ بار بار ہتھوڑے کی طرح دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔ بالآخر اس نے گہری سانس کھینچ کر خارج کی۔

اور جوس کا گلاس پھر اٹھا لیا۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

وہ آہستہ آہستہ جوس پینے لگا۔ مگر اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بری طرح الجھا ہوا ہے۔

دھوپ کی تمازت کا احساس بہت گہرا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اور وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی خاصی دھوپ نکل چکی تھی۔ اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور پلنگ سے اتر آیا۔ آتے ہی اس نے اپنے نہانے کا سامان تو سیٹ کر لیا تھا لہٰذا کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں اس کا بڑا سا بیگ رکھا ہوا تھا۔ شیو کا سامان اور آئینہ تولیے لے کر باہر آیا اور برآمدے کے طاق میں آئینہ رکھ کر شیو بنانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ تیمور علی خان شاید گلباز کو ساتھ لائیں اور آج اس کی جان چھوٹ جائے۔ اسی امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی صبح پروگرام سے شروع ہوئی تھی۔

صبح کی چائے تو کئی روز سے جمہورہ بنا رہی تھی۔ لکڑیاں جلا کر دھوئیں میں آنکھیں ملتے ہوئے چائے تیار کرتے ہوئے جمہورہ جانے کے بعد کرچ رہا تھا۔ آخر جب چائے دریافت نہیں ہوئی تھی تب بھی تو لوگ رہتے ہی تھے ناں۔ اس نے اپنی طلب کو بہلا لیا تھا۔ کریم سے جھاگ بناتے ہوئے اس نے آئینے میں پیچھے کی طرف دیکھا۔ جمہورہ ابھی سو رہی تھی۔

اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

قریب آ کر اس کی کلائی تھام کر نبض محسوس کی۔ کیونکہ وہ کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ اس لیے اس کے سانس لینے کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ ورنہ رات کو جتنی بار بھی اس کی آنکھ کھلی تو وہ سیدھی ایک دم چت لیٹی ہوئی ملی اور اس کے جسمانی ابھار چھ ماہ اس کے سانس لینے کا عمل واضح محسوس ہوا۔

نبض ہلکی تھی۔ اور خون بھی کافی نکلا تھا۔ اس لیے اسے خاصی تشویش تھی۔ کلائی تھامتے ہی جمہورہ نے آنکھیں کھول

دیں۔

"جاگ رہی ہوں۔ اور زندہ بھی ہوں۔ مگر اٹھ بیٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

باری نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ اور واپس اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ بدستور گردش کر رہے تھے۔ آدھا جی بھاگ بھاگ ہو چکا تھا۔ اس نے ریزر اٹھا کر پانی میں ڈال دیا۔

"آپ اٹھ جائیں بھابی۔ تاکہ میں تخت واپس ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کاکا جان خدا معلوم کس وقت آ موجود ہوں۔"

اس نے آئینے میں جھومر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پلنگ پر لیٹ جاؤں۔" وہ نقاہت بھرے انداز میں اٹھ بیٹھی۔

باری شیو بنا کر نہانے چلا گیا۔ جھومر دوبارہ سو گئی تھی۔

وہ نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ برائے نام ناشتا کیا۔ پھر تخت اٹھا کر ہال کمرے میں رکھ آیا۔ اب اس کا یہی کام رہ گیا کہ بار بار گھڑی دیکھتا رہے۔

کافی دیر بعد اکتا کر بیرونی احاطے کی طرف چلا گیا۔ کتے کھول کر باہر پھینکے تاکہ وہ اپنا شکار خود کریں کہ ان کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ سدھائے ہوئے کتے تھے۔ گھوم پھر کر واپس آ جاتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ مڑا اور کتاب اٹھا لایا اور بیرونی احاطے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا۔ اس وقت چونکا جب جھومر لنگڑاتی ہوئی سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"دوا ابھی تو کھانا ہو گی باری! ابھی بہت دیر نہیں ہوئی۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"پہلے آپ ناشتا کر لیں۔ خالی پیٹ دوا نہیں کھاتے۔" اس نے کتاب سے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا رنگ سفید چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔

"اچھا!" وہ پھر اندر چلی گئی۔

باری نے کچھ سوچا پھر کتاب موڑھے پر الٹی رکھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

"آپ بیٹھیں بھابی۔ میں آپ کو ناشتا بھی دیتا ہوں اور دوا بھی۔" وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم باز نہیں آؤ گے؟" وہ پلٹ کر تیکھے انداز میں بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ واقعی حیران ہوا۔

"جب سب کچھ بتا دیا ہے تو کیوں 'بھابی' کہتے ہو؟" وہ بھنچے چڑ کر کہہ رہی تھی۔

"یہ میری مجبوری ہے۔ میں صرف ان اطلاعات پر کان دھرنے پر مجبور ہوں جو مجھے حویلی سے ملتی ہیں۔" وہ رسانیت سے گویا ہوا۔ اور درمیانی کمرے میں داخل ہو گیا جہاں اشیائے خورد و نوش رکھی تھیں۔

ابھی اسے ناشتا کرا کر دوا کھلانا شروع ہی کی تھی کہ باہر سے جیپ کے ہارن کی آواز آئی۔

"میرے خیال میں کاکا جان آ گئے۔ کوشش کیجیے گا۔ آپ کی سزا آج کی تاریخ میں تمام ہو جائے۔ بات بڑھ جائے گی تو نقصان اٹھائیں گی۔ شرائط ان کی چلیں گی۔ آپ کی نہیں۔ اب آگے آپ کی مرضی۔" اس نے کیپسول اس کی ہتھیلی پر رکھتے

ہوئے کہا اور باہر نکلنے چلا گیا۔

"سیف شرافت۔ خان کو بھی سے بچنے نہیں دوں گی۔ تم دیکھتے جاؤ۔" وہ بڑبڑائی اور کیپسول منہ میں ڈال کر نگل گئی۔ [illegible]

[illegible] گیا۔

چند لمحے گزرے اور بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ اور پھر سامنے تیمور دوڑ کر قدم گئے۔ جھومر نے جھکا کر اندر کی راحت نہیں کی۔ اور صرف جوتے دیکھ کر پہچان گئی کہ تیمور اور باری کے ساتھ تیسرا شخص کون ہے۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ نڈھال ہو گئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے بہت دھیمی آواز میں تیمور علی خان کو سلام کیا تھا۔

"اب تو تمہارے چہرے بالکل روشن ہو چکے ہوں گے۔" سلام کے جواب میں ایک حقارت بھرا جملہ اس کے حصے میں آیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر ہم ترس کھائیں گے؟ ہمیں اب تو صرف تم سے یہ پوچھنا ہے کہ تم رہنا چاہتی ہو یا حویلی بھیج دیں۔ بس یہ دو مقام ہیں جہاں تم رہ سکتی ہو۔ تیسرا کہیں رہنا پسند کرو تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ گو کہ تم سامان وغیرہ اٹھا لو گی۔" وہ بولتے ہوئے گھبرا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہاں تو پھر کیا فیصلہ ہے۔ جلدی بولو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ پھر جھومر سے مخاطب ہوئے۔

جھومر کو ماحول پر عجیب سا سناٹا طاری رہا۔

"کاکا جی۔" تیمور علی خان کی شاہانہ طبیعت پر اس کی خاموشی گراں گزر رہی تھی۔

"آپ مجھے یہیں رہنے کی اجازت دے دیں خان۔ مہربانی ہو گی۔" جھومر نے بڑی مشکل سے لب کھولے۔

باری نے ایک گہری سانس لی اور ایک لمحے کو اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ٹھیک ہے۔ علاج لے اور بچے دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تمہیں لیے ہی علاج کی ضرورت ہے۔ چلو باری۔ اپنا سامان اٹھاؤ۔ گویا اب قدرے ٹھیک ہے۔"

"تم جا رہے ہو باری!" عجب ملتجیانہ سا انداز گفتگو تھا جھومر کا۔ باری ہچکچا کر رہ گیا۔ تیمور علی خان نے قدرے چونک کر باری کو دیکھا تھا۔

"بھابی۔ یہ جگہ بچے کے لیے آپ کو پسند ہے مجھے نہیں۔ میں تو کاکا جان کو گھبرا سمیت یہاں دیکھ کر اتنا خوش ہوں جتنا انھیں روزے کی شام کو عید کا چاند نظر آنے پر لوگ خوش ہوتے ہیں۔"

باری نے نہایت ذہانت سے جملہ تیار کیا۔ تیمور علی خان نے پرسکون سا سانس لیا اور باہر کی جانب بڑھے۔

"خان!" جھومر نے انہیں پیچھے سے آواز دی تھی۔

تیمور علی خان رک گئے۔

"خان! آپ کے آنگن میں ہوش سنبھالا۔ آپ کی محبت دیکھی۔ آپ نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ اور کبھی زندگی میں آنکھ بھر کے نہیں دیکھا۔ چھوڑتے ہیں۔" جھومر کی آواز بھرا گئی۔

"ہم جس پر مہربان تھے، وہ لڑکی کوئی اور تھی۔ آج جو سامنے بیٹھی ہے یہ کوئی اور ہے۔" کہتا ہے ... وہ مڑا ہے۔

"ہر انسان کا ایک دل بھی ہوتا ہے خان!" اشک اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

"جب انسان فاقوں سے مر رہا ہوتا ہے تب بھی تو یہ دل اس کے پاس ہوتا ہے۔ کیوں کام نہیں چلا لیتا اس دل سے بھوک سے مر کیوں جاتا ہے؟" وہ پھنکارے۔

"ہم سے زیادہ کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ احسان فراموشوں کی آواز انگارہ بن کر لگتی ہے کانوں میں۔" وہ یہ کہتے ہوئے بیرونی احاطے کی طرف بڑھ گئے۔

"خان اور بھابی کی ٹریٹمنٹ کا کیا ہوگا؟" ہادی نے قدرے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

"گلباز کو گاڑی کی چابی دے دو، ڈرائیو کر کے آتی ہے۔" انہوں نے فیصلہ سنایا اور جیپ میں جا کر بیٹھ گئے۔

ہادی آخری کمرے میں اپنا کچھ سامان اور چابی لینے کے لیے آگے بڑھ گیا تھا۔ اور خاصے عجلت آمیز انداز میں کمرے کی طرف آیا تھا۔

"ہادی!" جھومر کی آواز زنجیر بن کر اس کے قدموں سے لپٹی تھی۔ وہ رک گیا تھا۔

"جی۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یار ہے ... آپ کاٹ رہی ہیں، ابھی نہیں۔ آپ کو شوق ہے۔ مجھے نہیں۔" اس نے سرد مہر انداز میں جواب دیا۔

"میں آپ کو کالا جان کے آنے سے پہلے ہی سمجھا چکا تھا۔ اور پھر آپ کو مجھ سے مطلب؟ میں خان کے حکم کا پابند ہوں۔ میں آپ کی خاطر تو یہاں خود سے نہیں آیا۔ آپ کو یہ تنہائی مبارک ہو کہ آپ کو پسند ہے۔ ہم یہاں رہتے تھے کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ تلخی بھرے لہجے میں کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جھومر نے پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

"اگر اب حویلی میں واپس بھی گئی تو تمہاری خاطر جاؤں گی۔ حویلی صرف اس لیے خوبصورت ہے کہ وہاں تم ہو۔ بہر حال۔ ابھی مجھے بہت سوچنا ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

ہادی مطلوبہ چیزیں لے کر باہر آیا اور ٹہلتی ہوئی جھومر پر ایک نظر ڈالی۔

"خدا حافظ بھابی۔ کاش آپ زندگی کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔" اتنا کہہ کر وہ بیرونی احاطے کی طرف آیا اور گاڑی کی چابی گلباز کے حوالے کی۔ اور جیپ میں تیمور علی خاں کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ان کی جیپ ڈرائیور ڈرائیو کر رہا تھا۔

"گلباز! مجھے لگتا ہے یہ ساری بات، لڑکی بہت چالاک ہے۔ بہت ہوشیاری سے ... پیچھے رکھو۔" تیمور علی خاں نے جیب سے پرس نکال کر سو کے کچھ نوٹ گلباز کو دیے۔

"میرے سائیں۔ آپ بالکل بے فکر رہو۔ لڑکی چالاک ہے، ہم اس سے زیادہ چالاک ہے۔" گلباز نے کہا۔

کمرے کو خوب صاف ستھرا کرنا شروع کر دیا۔

ہادی نے چھت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"بہت حسین حویلی ہوگی۔ یہ کیا کریں، مجبوری ہے۔ اب سرائے میں خوب آرام کرنا۔ جب بھی [illegible]

[illegible] ہو گئے؟"

تیمور علی خاں نے اس کے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر کہا۔

ہادی خاموش رہا۔

"بہت شک کیا ہوا تمہیں؟ بہت احسان فراموش اور نمک حرام لڑکی ہے۔ بغیر محنت کے سب کچھ مل گیا اس لیے قدر نہیں [illegible]

[illegible] اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی تھی۔

"محنت تو اس نے بڑی کی ہے۔"

"جی۔ محنت تو چاول اٹھانے اور جھاڑنے میں کرنی پڑتی ہے۔ اتنی محنت دنیا کے کسی کام میں نہیں کرنی پڑتی۔" ہادی نے لمبی سانس لیتے ہوئے آہ بھری۔

تیمور علی خاں اپنے موبائل فون پر کسی سے بات چیت میں مصروف ہو گئے تھے۔

ہادی اس کٹھور حویلی کی ویرانی اور جھومر کے حال پر غور کر رہا تھا۔

جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوئی، پورچ کا فرش دھوتی ہوئی سرسوتی پائپ کھلا چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔

سامنے ہی عصمہ اپنے گیلے بال سلجھا رہی تھیں۔

"بابا۔ سجی بی بی آ گئیں۔ سجی بی بی آ گئیں۔" وہ بولی اور عصمہ کے آگے دوڑتی چلی گئی۔

"کہ خیر سے آ گئیں۔" عصمہ نے اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

ہال میں ہی وہ سب راہداری میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"کاش ہم بھی کسی ڈپٹی کمشنر کی بیٹی ہوتے۔" عصمہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیں۔

"ہم سب آمنہ کریمہ کا ختم کر کے دعا کریں گے کہ آپ کسی ڈپٹی کمشنر کی بیگم ہی بن جائیں۔" روبی نے فوراً ہی حسب جواب تلاش کر لیا تھا۔

"آگے یہ ہوگا کہ ہمیں سسرال ہی میں لے گا۔ یہاں پھر بھی تم لوگ ڈانٹ ڈپٹ کیا کرو گی۔" عصمہ ہنسیں۔

ہوتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو روبی نے آنکھیں دکھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

روبی اندر داخل ہوئی تو ان سب کو سامنے دیکھ کر ایک خوشی کا نعرہ مارا۔

"آپ سب۔ یہاں ہمارے استقبال کو آئی ہیں۔ بہت بہت شکریہ۔" وہ گلے لگتے ہوئے ہنس ہنس کر کہہ رہی

تھی۔

"اگر ہمیں پتہ چل جاتا کہ تم آ رہی ہو تو ہم نہر پہ جا کر سے ہوئے استقبال کو مگر ایک قباحت ہے اس میں۔" تیمور نے اداسی سے سر جھکایا۔

"وہ کیا؟" کئی آوازیں یک وقت ابھریں۔

"نہر کے پانی میں کوئی خاص اثر آ بھی اثر ہے۔ سوچتا ہوں کہ کر بھول جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم نہر کنارے جا کر کھڑے ہوتے اور یہ آنے کا پروگرام ملتوی کر دیتی۔"

وہ سب بے ساختہ ہنس پڑیں۔ وہ سب باری باری گلے مل رہی تھی۔ شمع پیچھے سے آگے ہو گئیں۔

"بابا صاحب کے ساتھ آئی ہو؟" زری نے استفسار کیا۔

"ظاہر ہے۔" وہ مسکرائی۔ "تمنا ہے آپ لوگوں کو ہم بہت یاد آ رہے تھے۔ اس لیے ہم جلدی آ گئے۔"

"ہاں، خیر، یاد تو تم بہت آ رہی تھیں۔ مگر ماہلی بہت یاد کر رہی تھی کہ میرے کھانوں میں کوئی نقص نہیں نکال رہا، بہت بوریت ہو رہی ہے۔" زری ہنس رہی تھی۔

"باقی سب لوگ کہاں ہیں؟" روشی نے پوچھا۔

"اپنے اپنے ٹھکانوں پر۔"

"ہاری۔ سرائے گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔ باقی ممبران وہی ہیں جو تم چھوڑ کر گئی تھیں۔" شمع ان سے ذرا علیحدہ کھڑی مطلع کر رہی تھیں۔

روشی نے ایک شگفتہ سی نگاہ ان پر ڈالی۔

"میں ابھی آتی ہوں بڑی امی کو سلام کر کے۔" ہال کمرے کے نزدیک پہنچ کر اس نے دائیں طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہنگامی دورے کی رپورٹ پیش کرنے بیٹھ جانا۔ جلدی آ جانا۔" مریم نے تاکید کی۔

"ہاں۔ ہاں آ رہی ہوں۔" وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو خون میں عجیب سی سرگرمی دوڑ رہی تھی۔ مگر اب وہ تاسف انگیز ڈھیلی ہو رہی تھی۔

"کیوں گیا ہے سرائے؟

اور پھر ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ پتہ نہیں کیسا دل ہے اس کا کہ کسی مخصوص جگہ، ماحول کا محتاج ہی نہیں جہاں جاتا ہے لگ جاتا ہے۔ جاپانی مشین کہیں کا۔

اسے تو شاید یاد بھی نہیں رہتا ہوگا کہ حویلی کا ایک مستقل باشندہ کم ہے۔" وہ ماہتاب کی خوابگاہ کی طرف بڑھتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ سب کسی پُرتجسس ڈرامے کی قسط دیکھنے میں مصروف تھیں۔ [illegible] ہاری بھی

کر رہی تھیں۔

اچانک ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔

کمرے میں ماہتاب داخل ہوئی تھیں۔ سب ایک دم اپنے اپنے دوپٹے درست کر کے سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"روشی۔ بیٹی تمہارے ابا کا چہلم کس تاریخ کو ہے؟" وہ ان سب کے درمیان بیٹھ گئیں۔ اور اپنی ٹانگ کے پیچھے تکیہ جمائے تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ دیر تک بیٹھنے کے ارادے سے اور کسی خاص کام سے آئی ہیں۔ لڑکیاں بھی سنبھل کر اب بیٹھ گئی تھیں جیسے قرآن خوانی ہو رہی ہو۔

"مجھے نہیں پتہ بڑی امی۔ بیتابی کو پتہ ہو گا۔" اس نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

"روبی مریم سوتی کپڑوں کو صبح سے کرے کے سوٹ کیس اٹھا لائے۔ میرے بستر پر رکھا ہے۔" روبی ادھر ادھر سے لڑکی تھی۔ اسی کی شامت آئی۔

"بہرحال اندازاً تو یہی ہے کہ اگلے ہفتے کی چودہ سوا تک ہو جائے گا۔" وہ جیسے خود سے مخاطب ہوئیں۔

وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

روبی واپس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد سرسوتی سوٹ کیس لے کر آ گئی۔

"میں اللہ کی بندی کراچی گئی تھی۔ میں نے اس سے کچھ کلو دار سوٹ منگوائے تھے۔ اور بہاول پور سے منیزہ بھی کچھ لے کے کام کے سوٹ لائی تھی۔ تم ان میں سے پسند کر لو پھر سینے کو بھی دینا ہے۔ اور کچھ جہیز سے ہوتے ہیں شادی کے۔"

انھوں نے سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکال نکال کر اس کے سامنے ڈالنا شروع کر دیے۔

"اندازاً کتنے دن رہتے ہیں روشی کی شادی میں؟" مثال مسکرائی۔ "آخر ہم نے ابھی تو تیاریاں شروع کرنی ہیں۔"

"کم کم بھی تو لگ ہی جائے گا۔ پڑی نے چلوں کی تھیں۔" انھوں نے تسلی دی اور ساتھ کپڑے بھی الٹ پلٹ کیے۔

"ہم بازار نہیں جائیں گے بڑی امی۔ دل بھر گیا ہے بازار کا کپڑا پہن پہن کر۔ اسلام آباد کے کسی فیشن بوتیک سے شاپنگ کریں گے۔" حنا نے لب کشائی کی جرات کی۔ سب نے تائید بھری نظروں سے حنا کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ اصل کام تو جہیز کی تیاری ہے۔"

"اللہ! روشی کے تو مزے آ گئے کتنے سارے کپڑے بنیں گے اس کے۔" ہیا نے رشک سے کہا۔

"ماشاء اللہ۔ اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔ اللہ خوشیاں مبارک کرے۔ تمہاری باری آئے گی تو تمہارے بھی ایسے سارے کپڑے بنیں گے۔"

بڑی امی نہ جانے کیا ٹٹول رہی تھیں سوٹ کیس میں۔ اسی مصروف انداز میں انھوں نے ہیا کو تسلی دی اور وہ کھسیا کر رہ گئی۔ وہ سب منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔

"کوہ پر کراچی سے ظہیر الدین نے زیورات کے ڈیزائن کی کتاب بھجوائی تھی۔ اس میں سے جو ڈیزائن تمہیں پسند آئے

اس پر نشان لگا دیا۔ ہم نے تو کہا تھا اس اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی مرضی سے جو لائیں، پہننا بھی اس کی پسند ہونا چاہیے۔" انہوں نے گولڈن جلد کی بھاری سی کتاب اس کے سامنے ڈال دی۔

"ماشاءاللہ!" [illegible] نے بڑی امی کا پڑھایا ہوا سبق ذرا سا دہرا دیا۔

لڑکیوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

روشی دم بخود بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔

"ان سب کپڑوں پر بھاری کام ہے۔ شادی کے شروع دنوں میں تو اسی طرح کے کپڑے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ تمہاری ساس جس قدر محبت سے تمہیں لے جا رہی ہیں۔ اس سے تو لگتا ہے وہ تمہیں سال بھر دلہن بنا کر رکھیں گی۔ ایک ہی بچہ ہے ان کا۔ کیا کیا ارمان ہوں گے ان کے دل میں؟"

بڑی امی نے ایک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا عنابی سوٹ اس کے سامنے ڈالا۔

"مجھے اور تمہاری چچی کو تو یہ سوٹ بہت ہی پسند آیا۔ کام بھاری ہے مگر اس میں کس قدر نزاکت ہے۔"

"پھر آپ یا چچی جان ہی سلوا لیں اسے۔ آپ پر بھی بہت اچھا لگے گا۔" روشی نے بے ساختہ لہجے میں مشورہ دیا۔

وہ سب منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔

بڑی امی نے کپڑے الٹ پلٹ کرنے کا کام موقوف کر کے قدرے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"احمق کہیں کی۔ جوڑے بٹ رہے ہیں کیا۔ یہ تمہاری شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ بے وقوف۔" وہ [illegible] پھر اپنے کام میں لگ گئیں۔

"یہ گوٹے کے کام کا کالا سوٹ دیکھو۔ کس قدر خوبصورت کام ہے اور کتنا عمدہ کپڑا ہے۔ ہمارے ہاں تو خیر اس طرح کے وہم نہیں کیے جاتے۔ مگر ہو سکتا ہے تمہاری ساس نئی دلہن کو کالا کپڑا پہننا پسند نہ کریں۔ اس لیے [illegible]"

"بڑی امی انہیں دھو کر رکھوا دیں۔" سونی بے قرار ہو گئی۔ سونو نے نظروں ہی نظروں میں اسے بھانپ لیا۔

"رکھوا دیں گے دھو کر۔ اب ایسی بھی آفت نہیں آ رہی۔"

"سونو! ایسا سوٹ تو شاید تمہاری ماں نے بھی لیا ہے تمہارے لیے۔" انہوں نے ایک سوٹ سونو کو دکھاتے ہوئے استفسار کیا۔

"نہیں۔ بڑی ممانی اس کا کلر دوسرا ہے۔" سونو نے جواب دیا۔

"کھانا نہیں لگے گا آج؟" روشی نے سخت بیزار کن انداز میں دریافت کیا۔

"اتنے اچھے کپڑے دیکھ کر بھی تمہاری بھوک نہیں اڑی؟" [illegible] حیران تھی۔

"لو۔ مروت کب کے کھا چکے۔ مجھے بھی دھیان نہیں آیا۔ ماما نے کھانا کیوں نہیں لگایا؟" بڑی امی بھی چونک پڑیں۔

"کلو کس کونے کھدرے میں گھسی ہوئی ہے؟ آج تو اس نے ذرا سا بھی تنگ کر دیا۔ نری بد [illegible] ہوتی جا رہی ہے۔"

بڑبڑائیں۔

"میں چیک کرتی ہوں۔" [illegible] کھڑی ہو گئیں۔

"یہ تمہیں پسند آیا؟" انہوں نے زرد رنگ کا جوڑا اس کے سامنے ڈالا۔

وہ اندر سے بہت گھبرا چکی تھی۔ اب یہ بیچ [illegible] پڑنے والی تھی۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔

"اچھا ہے۔" روشی [illegible] کوئی خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھی۔ سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"چلو۔ پھر رکھ لیں گے یہ ساتھ۔ فی الحال یہ پانچ جوڑے الگ کر دیتی ہوں۔ اب تم روشی کھانا کھا لو۔ پھر [illegible]

ذرا بھی باقی ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔

جی ۔۔۔ یہ سامان سرسری سے [illegible] کر میرے کمرے میں پہنچا دیا۔

روشی ۔۔۔ تم ذرا یہ [illegible] پسند کر کے اور نشان لگا کر مجھے صبح تک بھجوا دو۔ کل پرسوں کوئی کراچی جا رہے ہو تو لیتا جائے گا۔"

وہ کمرے سے نکل گئیں۔

جانے کون کون سے جذبوں کو دبائے لڑکیاں کپڑوں پر ٹوٹ پڑیں۔

"ہائے روشی کیا شاندار سوٹ ہیں۔ مزے آ گئے بھئی۔ ہر روز نئی ڈریس شو ہو گا۔ نعیم بھائی انجوائے کیا کریں گے۔" [illegible]

اڑا دی۔

"تو تم پورے چودہ میں [illegible] پر نشان لگا دو۔" روبی نے مشورہ دیا۔

"ہمیں انہیں کیا فرق پڑے گا۔ ان کے ہاں تو پہلی اور آخری شادی ہے۔ پھر ہو گی تو بیس پچیس سال بعد تمہارے بچوں ہی کی ہو گی۔" لڑکیاں ہنسیں تو روبی نے برمان کر وضاحت کی۔

"اور پھر ماں کے زیور تو عام طور پر بیٹوں کی بری میں ہی چڑھ جاتے ہیں۔ اچھا ہے تمہارے بیٹوں کا بھی ساتھ ساتھ انتظام ہو جائے۔" تانیہ بڑی دور کی کوڑی لائی تھی۔

"جو زیور تمہیں یہاں سے ملیں گے، وہ تم اپنی لڑکیوں کو دے دینا۔ تو بھئی تمہارے تو آدھے مسائل ابھی بیٹھے بیٹھے حل ہو گئے۔" نعیمہ مسکرائیں۔ انداز وہی مخصوص تھا جس سے روشی کی جان جلتی تھی۔

"کہتے ہیں دور اندیش عورتیں بچے پیدا ہوتے ہی ان کے مستقبل کے لیے انتظام کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ مگر تم لوگوں کی دور اندیشی کا جواب نہیں۔ واہ بھئی واہ۔ یہ وہ جو تم [illegible] سیکنڈری تھیں یہ بھائی سے ہو گی مکمل۔" سونو نے چھیڑ کر پوچھا۔

"کیا ان سوئیٹر موزوں اور ٹوپیوں کا؟"

"رکھے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر ہنسی تھیں۔

"وہ پیک کر کے روشی کے جہیز میں رکھ دینا۔ تب مکمل ہو گی تمہاری دور اندیشی کی صلاحیت۔" سونو مسکرا رہی تھی۔ [illegible]

"اور ہاں ۔۔۔ روشی۔ تمہاری منگنی کی انگوٹھی کہاں ہے۔ بھئی پہن کر رکھا کرو۔ کوئی سیر دو سیر وزن تھوڑی ہے اس کا۔"

مریم نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"شٹ اپ۔ پلیز۔ آل آف یو۔" وہ بھی خود پر بہت ضبط کر رہی تھی۔

وہ سب حیران پریشان سی ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"ٹھیک ہی تو ہے۔ اسے پریشان نہیں کرو۔ کتنے دن کی مہمان ہے ہمارے پاس۔ [illegible] ہیں۔ اور اسے [illegible] ہو جانا، اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔"

مومنہ نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر رو پڑے۔ مگر نہ جانے آج کہاں سے اس میں اتنا ضبط کا مادہ آ گیا تھا۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب تو وہ حویلی پہنچا تھا۔ سب ہی لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ [illegible] ہی جاگ رہی تھی۔ وہ ماما کو پتا کر کے وہ نہا دھو کر آ رہا ہے۔ آپ کچن ہی میں کھانا لگا دیں۔ فوراً ہی ہاتھ منہ دھو کر [illegible] اور اب کچن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بھوک بہت شدت سے لگ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اسے تاریک حویلی میں [illegible] کا دھیان آ رہا تھا۔

"پتا نہیں بے چاری نے کچھ کھایا بھی ہو گا یا نہیں؟ آغا جان ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہو گا یا نہیں۔ پتا نہیں انہوں نے کھائی ہو گی کہ نہیں؟"

اسے حویلی کی تاریکی اور ویرانی یاد کر کے جھرجھری سی آ گئی۔ جیسے اب تصور بھی ناگوار گزر رہا ہو۔

"خاتون۔ حماقتوں کے سب سے عظیم پل سے گزر رہی ہیں آج کل۔" وہ بس کہا کر بس ہی سوچ سکتا تھا۔

معاً وہ ٹھٹک گیا۔ بلاشبہ سامنے سے روشی ہی آ رہی تھی۔

اس کی تمام حسیات جاگ پڑیں۔ اور ایک شریر مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلنے لگی۔

"السلام علیکم!" وہ اس کے نزدیک آئی تو ہاری نے سلام کرنے میں پہل کی۔

وہ بھی اسے دور سے دیکھ چکی تھی۔ سو دیکھ کے بے حد آف تھا یا کوئی اور مصلحت تھی۔ وہ اسے نظرانداز کر کے گزر رہی تھی۔

"وعلیکم سلام!" اس نے رکھائی سے کہا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کا رخ کچن کی سمت تھا۔

ہاری تیز قدم بڑھا کر اس کے برابر میں جا پہنچا تھا۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

"ناراض ہیں؟" وہ اس کے برابر چلنے لگا۔

"اگر ہوں۔۔۔۔ تو۔۔۔۔؟" وہ ٹھٹک کر گویا ہوئی۔

"اپنا قصور پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بات نہیں کرو مجھ سے۔" وہ بگڑ کر بولی۔

"یہ جو آپ کا مزاج ہے۔ اس کے کتنے موسم ہیں؟" وہ چھیڑ رہا تھا۔

"ایک لاکھ نہیں ہزار بھی ہوں تو تم سے مطلب؟" وہ بھڑک اٹھی۔

"ماشاء اللہ۔ اچھا [illegible] ہے۔ بزنس مین سے وابستہ ہونے کا عملی ثبوت۔ 'ہزاروں' میں جواب آنے لگے ہیں۔" وہ ہنس دیا۔

روشی نے اپنی چال میں تیزی پیدا کی اور اس سے پہلے کچن میں داخل ہو گئی۔

[illegible] کھانے کے لیے ہاری کی منتظر تھی۔ روشی کو داخل ہوتے دیکھ کر قدرے حیران ہوئی۔

"خان کہاں ہیں؟ کہہ رہے تھے آ رہا ہوں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔ روشی نے جواب دینا ضروری نہ

کہا۔

"ماما --- نیند نہیں آ رہی اور سر میں درد ہو رہا ہے۔ کافی بنا دیں۔"

"آپ کمرے میں چلیں۔ میں لے آتی ہوں۔" ماما نے اس سے کہا۔

"نہیں ابھی اس سے اب میں پھر اتنا لمبا سفر کروں۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ باری اندر آ چکا تھا۔

"آ گئے خان ---؟" ماما جلدی جلدی میز پر کھانے کی چیزیں رکھنے لگی۔

"بھئی ماما --- جلدی سے مجھے کافی دے دیں پہلے۔" روشی نے برا سا منہ بنایا۔

"کافی سے تو اور نیند اڑ جاتی ہے۔ کیا آج سونے کا ارادہ نہیں ہے؟" باری نے اس بار سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

وہ خاموش بیٹھی اپنے رنگین ناخن گھورتی رہی۔

"خان --- سرائے میں تو سب خیریت ہے ناں ---؟" ماما نے الیکٹرک کیتل کا پلگ لگایا۔

"پتا نہیں۔"

"تو کیا آپ "سرائے" نہیں گئے تھے؟" ماما نے تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔

"نہیں --- کام میرا کہیں اور تھا۔" جمہور پھر نظروں کے سامنے آ گئی --- دکھ اور تاسف کے احساس سے اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر روشی پر ڈالی۔

"کھانا کھائیے ---" اس نے روشی سے اخلاق برتا تھا۔

وہ اسی طرح خاموش رہی۔ اور ماما کو کافی بناتے دیکھتی رہی۔

"خان کھیرے کا رائتہ بھی ہے، مگر فریج میں ہے۔ آپ ٹھنڈا دہی نہیں کھاتے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"نہیں --- بس ٹھیک ہے۔" اس نے کھانا شروع کر دیا تھا۔

"ساری رات جاگ کر کیا شکرانے کے نفل پڑھیں گی؟" وہ مزید خاموشی برداشت نہ کر سکا۔

"کس بات کا شکرانہ۔ لڑکیاں اپنی شادی پر شکرانہ خود نہیں پڑھتیں، اُن کے بزرگ پڑھتے ہیں۔" ماما ہنسی۔

باری نوالہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے درمیان ہی میں رک گیا۔

"شادی ---؟" اس نے اس مرتبہ غور سے روشی کی شکل دیکھی تھی۔

"انشاء اللہ بہت دھوم سے ہوگی۔ اب زیادہ دنوں کی بات نہیں رہی۔" ماما کے چہرے پر خوشی نور کی طرح جھلملا رہی تھی۔

باری نے نوالہ اس طرح منہ میں رکھا، جیسے کوئی کام بہ زبردستی کرتے ہیں یا مجبوراً کرتے ہیں۔

"یہ تو اچھی خبر ہے۔" اس نے بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا۔

"بہت اچھی کہیے خان! بڑے خان کی بیٹیوں کے بعد اس نسل کی لڑکیوں میں پہلی شادی ہے۔ بڑے دنوں بعد "ولا" میں بارات اترے گی۔"

ماما نے جھکتے ہوئے کافی کا کپ باری کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ یہ احترام شاید برسوں کے ساتھ تھا۔

"ٹھیک ہے --- ماما، بہت اچھے طریقے سے کھانا کھلاتی ہو۔" باری نے آسودگی سے شکریہ ادا کیا۔

"اماں --- کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے پھر نظروں سے روشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہہ رہی تھیں، روشی بتا رہی ہے گی۔" اس نے تیزی سے کافی پھینٹتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔

"بڑی بیگم کہہ رہی تھیں۔"

"خاک کہہ رہی تھیں۔ فضول کہہ رہی تھیں۔ بند کرو ماما یہ سب باتیں۔ کافی دو مجھے جلدی سے۔" روشی جھلا اٹھی۔

ماما سہم کر ایک دم خاموش ہو گئی۔

"کیوں بے چاری ماما کو ایسے کہہ رہی ہیں۔ اس بے چاری کا کیا قصور؟" باری نے دبے دبے انداز میں روشی کو ٹوکا۔

اس سے بہت تھوڑے فاصلے پر کرسی پر بیٹھی تھی۔

"تمہیں تو اچھی لگے گی ہی۔ آدھی آدھی رات کو باہر سے عیش کر کے آتے ہو۔ تو تمہیں گرم گرم کھانا پیش کرتی ہے۔" روشی نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"عیش کر کے آتے ہیں، وہ گھر بھوکے نہیں آتے۔ اطلاعاً عرض ہے۔" وہ جانے کیوں مسکرا دیا۔

ماما نے کافی لا کر روشی کے سامنے رکھی۔ روشی کچھ بولنے لگی تھی، چپ ہو گئی۔

"ہاں تو ماما۔ کیا کہہ رہی تھیں؟" باری کا لہجہ نہایت نرم تھا۔

"تمہیں میری شادی کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟" وہ کڑے تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"کیا نہیں ہونی چاہیے؟" اس نے بہت دھیمی آواز اور عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"بالکل نہیں ہونا چاہیے۔" روشی کا لہجہ قطعی تھا۔

باری خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ اور روشی کافی کے سپ لینے لگی۔ ماما باہر نکل گئی تھی۔

باری نے بہت جلدی کھانا ختم کر لیا تھا۔ پانی پی کر وہ ہاتھ دھونے سنک کی طرف بڑھا۔

"ایک تو اس گھر کے بڑے بھی بہت بولنے لگے ہیں۔ پوری حویلی میں یہی خبر بار بار نشر ہو رہی ہے کہ تم سرائے میں ہو۔ جب تم سرائے نہیں گئے تھے تو پھر کہاں گئے تھے؟" روشی نے کپ میز پر رکھ کر بہت تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"میں بے حد اچھی جگہ گیا ہوا تھا۔ وہاں بہت مزے میں تھا۔" وہ اس ٹھنڈی حویلی کو تصور کر کے مسکرا دیا۔

"خیر مزے میں تو آپ ابھی بھی ہیں۔ ٹور کیسا رہا ---؟" وہ باہر نکلنے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اب تم حویلی سے دور چلے جاتے ہو تو کیا تمہیں حویلی یاد نہیں آتی؟" روشی کے انداز میں اس مرتبہ قدرے نرمی تھی۔

باری نے ایک لمحے کو نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے۔ حویلی کے کمرے۔ دالان۔ باغ۔ گول کمرے۔ ٹیرس۔ اسٹیپس۔" وہ انجان بن کر بڑی سادگی سے سوال کر رہا تھا۔

"ہاں۔ یہاں کے گدھے، گھوڑے، بھینس، بلیاں، کتے، مرغیاں۔" روشی نے دانت پیسے اور کپ اور کھڑکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاری نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔ اور باہر نکل گیا۔

"ہونہہ۔ پتا نہیں کس حساب میں مجھے اتنا ستاتا ہے۔" جانے کیوں اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

وہ کافی دیر کمرے میں ٹہل ٹہل کر گھڑی دیکھتی رہی۔

پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اب اس کا رخ ہال کمرے کی طرف تھا۔ ہال کمرے میں پہنچ کر اس نے لائٹ جلائی اور بہت آہستگی سے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی۔ ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ اور ہتھیلی پر لکھا ہوا ایک نمبر غور سے دیکھنے لگی۔ کافی دیر غور سے دیکھتی رہی جیسے حفظ کر رہی ہو۔ پھر زیرو سے کوئی نمبر ڈائل کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ شہر سے باہر کا کوئی نمبر ملا رہی ہے۔ رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ اس نے نمبر ڈائل کر لیا تھا۔ دوسری طرف بیل ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ دروازے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔

چھٹی بیل پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔ اور نیند میں بھری مردانہ آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔ "ہیلو (ہیلو)۔"

اس نے گلا صاف کرنے کے لیے ذرا سا کھنکارنا مناسب سمجھا۔

"مسز رحیم سے بات ہو سکتی ہے؟" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"آپ پلیز اس چکر میں نہ پڑیں کہ میں کون ہوں۔ ممکن ہے تو رحیم صاحب سے بات کرا دیں۔"

"جی --- مجھے صرف مسز رحیم سے بات کرنا ہے۔ میں اس سے زیادہ اونچا نہیں بول سکتی البتہ مسز رحیم کی اسپیکنگ بول سکتی ہوں۔"

وہ جل کر بولی تھی۔ معاً اس نے کھٹاک سے ریسیور رکھ دیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ ہاری کھڑا ہوا تھا۔ اور خاصی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

روشی نظریں جھکائے ماتھے پر ہاتھ ڈالے خاموش بیٹھی رہ گئی تھی۔

"سوری --- میں اوپر جا رہا تھا۔ ہال کمرے کی لائٹ جلی دیکھی آف کرنے کے خیال سے آ گیا تھا۔"

اس کے معذرت خواہانہ انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے "کچھ" سن لیا ہے۔

"آپ کو دروازہ بند کر لینا چاہیے تھا۔" وہ واپسی کے ارادے سے پلٹا۔

"مجھے کیا کر لینا چاہیے اور کیا نہیں --- تمہارے مفید مشوروں کی ضرورت نہیں۔" وہ جیسے چیخ کر بولی۔

ہاری نے اس پر صرف ایک نگاہ ڈالنے پر اکتفا کیا اور قدم بڑھا دیے۔

"ہاری --- !" جانے کیوں اس نے آواز دے ڈالی۔

"جی --- ؟" وہ رک گیا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس نیند کی ماری آنکھیں، مگر چہرہ صاف ستھرا --- وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے منتظر کھڑا تھا۔

"وہ بات یہ ہے کہ ---" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"جی ---؟" وہ اس کے نزدیک چلا آیا۔

"مجھ --- تمہیں کیا ---؟" اس نے سر جھٹک کر جیسے فیصلہ بدل دیا۔

"ابھی نہیں --- آپ کہیے --- شاید میں "کچھ" ہو ---"

روشی نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"کچھ نہیں --- جاؤ تم --- سو رہو --- اگر میں مر جاؤں تو میرے جنازے کو کندھا مت دینا --- بی کاز آئی ہیٹ یو ---" اس کے حرف حرف سے آگ آ رہی تھی۔

"جی بہتر --- ویسے اندازہ ہے کہ رش بہت ہوگا۔ میرا نمبر شاید ہی آئے۔" وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ "آپ بے فکر رہیں۔"

روشی کا جی چاہا کہ اسے گولی مار دے۔

"میں جا رہا ہوں، آپ اپنا کام کریں، اطمینان سے فون ختم ہو جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس راستے کی طرف بڑھ گیا، جو اس کے کمرے کو جاتا تھا۔

نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

اس نے لائٹ بند کی اور باہر آ گئی۔ اس کے قدم اپنی خواب گاہ کے بجائے حویلی کے پچھلے حصے کی طرف تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے سارے ڈر ختم ہو رہے تھے۔ وہ گھوم کر کوارٹر کے بجائے دوسرے راستے سے باہر آ گئی تھی۔ سناٹا اندھیرا اسے اتنا نہیں ڈراتا تھا۔ جتنا گھوم کر نوکروں کے کوارٹر کے سامنے سے اسے خوف آتا تھا۔

وہ بہت تیز تیز چلتی حویلی کے پچھلے حصے میں داخل ہوئی تھی۔ وہی مخصوص سی پراسراریت سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی قیامت سوئی ہوئی ہے۔ جاگ پڑنے کے لیے۔

زرد روشنی در و دیوار کا زرد رنگ واضح کر رہی تھی۔ تمام دروازے بند تھے۔

مگر انسانی نفوس کی موجودگی کا احساس در و دیوار سے اُمڈ رہا تھا۔ وہ جھومر کے بیڈ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جھومر کو باہر لانا چاہتی تھی۔ جھومر سے باتیں کر کے بہت سارا رونا چاہتی تھی --- جانے کیسی وحشت سی ہو چلی تھی اس افسردہ سی لڑکی سے رات کے اس پہر اس سے اچھا ساتھی اسے شاید ہی مل سکتا۔

اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ ایک بار --- دو بار، تین بار۔ عموماً دوسری دستک پر جھومر دروازہ کھول دیتی تھی۔ جیسے منتظر ہو۔

اس نے چوتھی بار دستک دی۔ خاموشی بدستور تھی۔

اس نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

سامنے ظفری نیم وا دروازے کی سمت گھور رہا تھا۔ منہ سے رال بہہ رہی تھی اور آنکھوں میں سرخی سی
بھر بھری آ گئی۔

اس نے اشارے سے سلام کیا۔ کچھ تو کرنا تھا۔

روشی اندر داخل نہیں ہوئی تھی۔ وہ دروازے ہی میں کھڑی تھی۔

"بھابی کہاں ہیں ظفری بھائی؟" وہ اٹک اٹک کر پوچھنے لگی۔

ظفری کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔ روشی کا دھیان ایک دم اس کے سر پر بندھی پٹی کی طرف گیا۔

"آپ کے سر میں کیا ہوا ظفری بھائی؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ظفری کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ جن میں سے اس نے ایک لفظ "پانی" سمجھا۔

اسے بے اندازہ ترس آ گیا۔ حالانکہ پانی ظفری کے بالکل قریب ہی موجود تھا۔ مگر وہ جذبہ ہمدردی سے مجبور ہو کر نزدیک آئی۔ پانی کا گلاس اٹھایا اور اس کو تھمانے کے بجائے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اور جیسے اس کی روح اس کے پنجرے میں پھڑپھڑانے لگی۔ ظفری نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لے لیے تھے۔ اس نے بمشکل اپنی چیخ پر قابو پایا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں ظفری بھائی۔ پلیز چھوڑ دیں مجھے۔" اس کا خون خشک ہونے لگا۔ "پلیز ظفری بھائی! کہاں ہیں آپ؟"

اس نے زور سے جھومر کو آواز دی۔

ظفری بھائی کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ روشی پوری جدوجہد کر رہی تھی مگر جیسے ظفری کی حیوانی قوت پوری طرح جاگ اٹھی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ کسی انسانی گرفت میں ہیں۔ یوں جیسے وہ کسی درندے کی گرفت میں آ گئی ہو۔ اسی کشمکش میں اس کا دوپٹہ پلنگ سے نیچے گر پڑا۔ ظفری کے حلق سے بے ہنگم آوازیں نکل رہی تھیں۔ جن سے ماحول اور زیادہ بھیانک محسوس ہو رہا تھا۔ روشی نے ایک لمحے کو ظفری کا چہرہ دیکھا۔ بے حد خوبصورت چہرہ کیا ایک ڈراؤنا چہرہ تھا۔

"بھابی!... بھابی... کہاں ہیں آپ؟" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "ظفری بھائی... دیکھیں۔"

"یا اللہ! کتنی بے کار ہونے پر اتنی طاقت ہے۔" اس نے ظفری کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ مگر جیسے اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ گویا اس کے حواس ساتھ چھوڑے ہوئے تھے۔

بالآخر اس نے اپنی انتہائی قوت صرف کی جس کے نتیجے میں ظفری بیڈ سے نیچے گر پڑا۔ گرنے کے ساتھ ہی بے سدھ ہو گیا تھا۔ شاید بیڈ کا کونا اس کے سر پر لگا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔

روشی کا دوپٹہ اس کے بھاری بھرکم وجود کے نیچے دب گیا تھا۔ روشی کا تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے تو

ظفری کو دیکھا تھا اور سر پیٹ رہی تھی۔

بلقیس بیگم سے ظفری کو دیکھا تھا اور ... قریب پہنچ کر اس نے دم لیا۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے چند لمحے تک صورت حال پر غور کرنے لگی۔ ظفری کا بے ہوش وجود نظروں کے سامنے آ گیا۔

"اوہ میرے خدا! کہیں مر تو نہیں گئے۔ اور یہ بھابی کہاں گئی ہوئی ہیں؟ سرتاج کو پہلے ہی ... ہے۔ کیا کروں۔ اب ... کیا وہ دوبارہ ... اب میں کیا کروں۔ کس کو بتاؤں۔ کہ ظفری نے ... اس رات کو وہاں کیوں گئی تھی؟"

"دیدی! ای تو ..." ... ایک تو تم جھومر ... "کاؤ" ... وہ دوبارہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی۔ تب ہی اس کا خیال آیا ... فیصلے پر پہنچ کر جھومر سے ہاری کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ مگر ہاری کے کمرے پر نظر پڑتے ہی اس کا دل ... اور بہت احتیاط سے دستک دینا شروع کی۔ وہ کافی بہت گہری نیند سو چکا تھا۔ اس نے بے بسی کے انداز میں دروازے کو گھورا اور جیسے اللہ کا نام لے کر زور سے ایک ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی اس کے بیڈروم کی طرف بھی دیکھا۔ ابھی نظریں موڑی ہی تھیں کہ ہاری نے دروازہ کھول دیا۔

گہرے سرخ شلوار سوٹ میں ملبوس نیند بھری آنکھوں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے بصارت کا وہم کچھ رہا ہو۔

"ہاری... میرے ساتھ چلو۔"

جھک سے ساری نیند ہوا ہو گئی۔ "...جی؟"۔

بکھرے بال، بے ترتیب بال، ادھ کھلی آنکھوں کے اوپر آستین ادھڑی ہوئی۔

"اوہ... تو واقعی آپ ہی ہیں... یوں بھی زندہ انسانوں کے بھوت نہیں ہوتے" سنا ہے۔ خیر فرمائیے کدھر چلنے کا ارادہ ہے؟" وہ اس کی طرف سے جیسے ہر طرح کی حیران کن حرکت کی توقع کرتا تھا۔ بلا کی رسانیت تھی اس کے انداز میں۔

"وہاں... ظفری بھائی کے بیڈروم میں..." اس نے جلدی سے کہا۔

ہاری بری طرح چونک پڑا۔ جھومر حویلی میں نہیں ہے۔ یہ وہاں کیسے گئی تھی...؟ وہ بھی اس وقت کہ رات ڈھل رہی تھی۔ کیا اسے علم نہیں کہ جھومر حویلی میں نہیں ہے۔

اس نے سر سے پیر تک روشی کے حلیے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں سے تشویش جھلکنے لگی تھی۔

"کیوں جاؤں میں ظفری کے بیڈروم میں...؟" اس کے لہجے میں غیر شعوری طور پر تلخی سی آ گئی۔

"وہ... بے ہوش ہیں..." وہ نظریں چرا کر کہنے لگی۔

"تو پھر دادی امی کے پاس جائیے۔ وہی نمٹتی ہیں اس طرح کی صورت حال سے۔"

اس نے رکھائی سے کہا... ہر چند کہ تجسس سے بری حالت ہو رہی تھی۔

"میں انہیں نہیں بتا سکتی... بلکہ تم بھی بتانا نہیں... پلیز..." اس کی آواز بھرا گئی۔

"مجھے پتا ہے اتنی رات کو آپ وہاں کس غرض کی وجہ سے گئی تھیں۔ نیند نہیں آتی تو دکھ اور دلیلیں شروع کر دیتی ہیں۔ کچھ مصیبتیں کھڑی کرتی ہیں دوسروں کیلئے۔"

وہ بچ بچ غصے میں تھا۔ اسی ماحول کا پروردہ تھا، اور پھر بھی نہیں تھا۔ روشی کا حلیہ۔ گھبرایا ہوا لہجہ۔ التجائیہ انداز ... خبردار کرنے کی تاکید اور ... رخساروں پر پھیلتے ہوئے آنسو۔

"یہ آپ کو سوجھی کیا تھا کہ جم صاحب کو فون کرتے کرتے پیچھے چلی گئیں؟"

نہ جانے کیوں اس نے اس مرتبہ روشی کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا تھا۔

"دوپٹہ آپ کا کہاں ہے؟" اس کا انداز بہت عجیب سا تھا۔

"ہیں ......؟" روشی نے بڑبڑا کر اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ جی چاہا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

"ہاری ......!" وہ اس کے شانے سے سر لگا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"آپ کو میرے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے بیڈروم میں چلیے۔ وہ دوپٹہ میں پہنچا دوں گا۔"

اس نے آہستگی سے روتی ہوئی روشی کو خود سے الگ کیا۔ گریبان کے بٹن بند کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

روشی نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں اور آہستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ سوں سوں کرتی ہوئی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے آئینے میں خود کو دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ شانے سے ادھڑی ہوئی آستین سے اس کا سفید بازو تھوڑا سا جھانک رہا تھا۔ اب اس نے خود کو ہاری کی نظر سے دیکھا۔ ایک بوجھ سا آ پڑا تھا اس پر۔

"کیا سوچ رہا ہوگا۔ میرا حلیہ دیکھ کر۔" ملال و خجالت سے اس کی بری حالت ہوگئی۔

وہ وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگی۔ "پتا نہیں یہ بھابی کہاں چلی گئیں؟" کچھ دیر پہلے کی صورتحال یاد کر کے اسے سر سے پیر تک جھرجھری آگئی۔ "اف توبہ کس قدر وحشت ہے بھائی میں۔ بے چاری بھابی ...... مگر وہ تو بیوی ہیں ...... میں تو بہن ہوں ...... لاحول ولاقوۃ ...... وہ تو ابنارمل ہیں انہیں کیا پہچان رشتوں کی ...... یا اللہ میری توبہ جو کبھی ان کے کمرے میں جاؤں۔" اس نے دہل کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے بستر پر آئی ہی تھی کہ ...... دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ ہاری ہے۔ اس نے دوپٹہ شانوں پر پھیلایا اور ہچکچاتی ہوئی دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔

"یہ لیجیے اپنی امانت۔" اس نے دوپٹہ روشی کو تھمایا۔ اور تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر۔

وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

پھر عجب دل شکستگی کی کیفیت میں دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر واپس آگئی۔ نیند کا تو دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ کبھی اس کروٹ کبھی اس کروٹ۔ کبھی اوندھی کبھی سیدھی۔ ہر طرح کے جتن اس نے کر ڈالے تھے۔

"کیسا عجیب حلیہ ہو رہا تھا۔ کیا سوچ رہا ہوگا ہاری۔ کیا کچھ اس کے ذہن میں آ رہا ہوگا۔" طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں نے اس کی جان ہلکان کر رکھی تھی۔ بولنا اور پوچھنا تو اس کی لغت میں شامل ہی نہیں ہے۔ کیا ہو گیا ہے سب ...... "اف"

بھابی کا خواب ہو گئیں ...... اب بھابی کن کی وجہ سے وہ اتنی رات کو کہاں نکل گئیں؟"

اس نے اپنے ہاتھ دوبارہ شروع کر دیئے۔ اسے وحشیانہ انداز میں گھری نے اس کی کانپتی روح بھی ... وہ تھا۔

وہ کتنی دیر روتی رہی۔ سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ دور بستی کی اکلوتی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔

دوپہر ہو رہی تھی ...... وہ ہانڈیوں چمچوں پر جھکی تھیں۔ کسی میں کھٹ پٹ کسی میں چھن چھن ہو رہی تھی۔ تیزی سے ہری مرچیں بھی کاٹی جا رہی تھیں۔ اور ہانڈی میں چمچ بھی چلایا جا رہا تھا۔ گرمی سے سرخ ہوتا چہرہ ...

روشی ایک تھال میں آٹا بھی چھان رہی تھی۔ جسے ابھی گوندھنا تھا۔

"اچھا بھابی ...... خدا حافظ۔"

بیل تو سے بجتے ہی بجا ...... اس نے کھڑکی کے پٹ پر لٹکتا دوپٹہ کھینچا اور جلدی سے دروازے کی طرف دیکھا۔

جیالو جیت ...... آف وائٹ شرٹ اور ہاتھ میں براؤن چمڑی بیگ تھامے عارف اندر آ رہا تھا۔

ابھی تو دل ہی دل میں وہ اسے یاد کر کے فارغ ہوئی تھی۔

"آپ ...... کہاں جا رہے ہیں؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کہیں نہ کہیں تو جائیں گے ہی۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ایسا نہ ہو طوفان آجائے اور پھر مجھے روک لے خدا حافظ۔"

"سنیں تو ...... آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اور یوں بھی اب میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ دیکھیے ٹھیک ٹھاک دکھائی نہیں دے رہا؟"

وہاں گویا ایک دم سیدھا ہو گیا۔

اس کا قد خاصا دراز تھا۔ بالو کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔

اس نے پہلی مرتبہ عارف کا قدرے بشاش چہرہ دیکھا تھا۔ تازہ شیو کی نیلاہٹوں کا عکس واضح تھا۔ مونچھیں نہایت نفاست سے تراشی ہوئی تھیں۔ سیاہ گھور آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ بالوں کا اسٹائل بہت نفیس اور پروقار تھا۔

"اپنی صحت دیکھ رہی ہیں؟" اسے غور سے اپنی جانب دیکھتا پا کر بے ساختہ مسکرا دیا۔ بالو نے جھینپ کر اپنی نظروں کا زاویہ بدل ڈالا۔

"ہماری کیا صحت ...... بقول لال خان کے آپ کے بہت مقروض ہیں وہ۔" بالو نے نظریں جھکائے جھکائے رسانیت سے جواب دیا۔

"کوئی مقروض وقروض نہیں ہے۔ وہ تکلف کرتے ہے میرا یار۔ ہمارے پاس اور ہے ہی کیا سوائے پرخلوص جذبات کے۔" وہ جانے کیا سوچ کر ہنس دیا۔ "اگر خلوص سے کوئی مقروض ہوتا ہے تو واقعی وہ ہمارا بہت ہی مقروض ہے۔"

بھلا اخلاص کیا خوبی ہے اس میں!

ارے صاحب نیت نہ ڈالا رے دل!

"ہم تو درحقیقت یہی سمجھتے ہیں کہ اس کی محبت کے جواب میں ہم مفلس ہی ہیں۔ خیر جانے دیجیے۔"

"ارے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہم سے پیچھے پڑ جائیے گا۔ وہ آ جائیں گے پھر چلے جائیے گا تو ٹھیک ہے۔ وہ میری نہیں سنیں گے۔ کیوں میری جان مصیبت میں ڈال رہے ہیں آپ۔" بالو نے شکی انداز میں اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"پلیز بھائی ـــــ مجھے جانے دیجیے۔" عارف نے پیچھے کو پر تولے۔

"چلے جائیے گا۔ روک کون رہا ہے۔ مگر "ان" کے آنے کے بعد۔" اس نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے ہلکا سا مظاہرہ کیا۔ شاید یہ عادت یوں ہوئی کہ وہ چاہ رہا تھا۔

"اچھا تو خیر میں سمجھتی ہوں کہ مردوں کو بہت سے کام ہوتے ہیں۔ کتنے دن بیٹھ کر گزارا ہو سکتا ہے؟ آپ کام بھی کرتے ہوں گے۔" بالو نے پلٹ کر ہانڈی میں چمچ ہلایا۔

"کام تو ہم سب کر چکے ہیں۔ اب تو بس اس دنیا سے روانگی کا انتظار ہے

عمر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

وہ پھر سے ہنس دیا۔

"اور ہاں بھائی۔ ایک سوال کا جواب آپ پر ادھار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب بھی میری طرف سے قدرے اطمینان ہو تو مجھے جواب سے ضرور نوازیے گا۔ ورنہ خلش رہے گی۔" وہ یک دم دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ کر اس سے مخاطب تھا جیسے امید ہو کہ جواب ابھی مل جائے گا۔ وہ اس سے وضاحت طلب کرے گی۔ جواباً وہ سوال دہرائے گا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ جواب نکل جائے گا۔

بالو نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ "کیسا جواب؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"آپ کو کیا کمی ہے؟ کسی بات کی فکر ہے؟ پھر آپ کی روح کیسے حسن سے چور چور ہوگی۔ جس دن سے آپ نے بات کی ہے۔ میں سکون سے سو نہیں پایا۔ اور آپ مجھ سے مخاطب بھی یوں تھیں جیسے خطاکار بھی میں ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو دکھ پہنچا۔"

بالو نے گھبرا کر اس کی طرف سے پشت پھیر لی۔ "خدا حافظ۔ کوئی بات نہیں۔ میں ان کو سمجھا لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ مجھ پر غصہ ہی کریں گے۔" وہ چولہے کی آنچ بڑھا کر پوری تندہی سے مسالا بھوننے لگی۔

"میں پچیس ہوں بھائی! الٹرا ساؤنڈ مشین کا نام سنا ہے آپ نے؟ دنیا کے دھکے اور جھٹکے کھا کر الٹرا ساؤنڈ مشین بن گئی ہیں میری حسیں۔ آپ ٹالنا چاہیں تو دوسری بات۔ اگر اس سارے قصے میں میں ملزم نہ ہوتا تو آپ سے بھی اس طرح کے سوالات نہ کرتا۔ مگر اس دن آپ نے مجھ پر براہ راست الزام لگایا تھا کہ میں نے آپ کی روح میں حسن اتارا ہے۔ میں تو عالم بے خبری میں بھی آپ کا بھلا چاہنے والوں میں سے ہوں۔ میری نیت خدا جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگی

ہوئی ہو۔ اس کے لیے میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں"۔

وہ بہت پر خلوص اور سچے لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

"آپ بات تک ہی ہم نہیں اترے۔" بالو نے اسی طرح اپنے کام میں مصروف رہ کر جواب دیا۔

"یہ بڑی بے ہمائی۔ پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔" عارف نے یک دم بارہ اٹھایا۔ شاید اس نے اس کی بات یاد کر لی تھی۔

"آپ نے بھی تو اپنی کہانی ادھوری سنائی تھی۔ میں نے تو آپ سے اصرار نہیں کیا کہ پورا قصہ سنا دیں۔" بالو نے آگے بڑھ کر گویا قصہ شروع کر دیا۔

عارف مسکرایا۔ "بہانے ہی ہیں۔ ہم آپ کہ ابھی تو نہیں گے۔ اور پھر کیا کہانی سنائیں آپ کو۔

اس حسن کو بہار کو مت دوست کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

وہ ہنس رہا تھا۔

"آپ بات ٹالیں نہیں۔ مجھے میرا قصور بتا دیں۔ بہت بوجھ ہے دل پر۔" اس نے پیچھے سے درخواست کی۔

"کوئی بات نہیں عارف بھائی۔ ویسے ہی منہ سے نکل گیا ہوگا کچھ۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔ ابھی"

"ہوں" بالو نے الجھن سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"کیا آپ مجھے اس کے بارے میں بتا سکتی ہیں جس کا ذکر آپ شعروں میں کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو بہت پسند تھی وہ آپ کے رشتے داروں میں تھی یا غیروں میں؟ کیا بہت خوبصورت تھی؟ جیسے اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ اس کا غم ہے آپ کو اب تک۔ مگر شادی تو آپ کی بھی ہوئی تھی۔ پہلے آپ کی شادی ہوئی تھی یا اس کی؟ جس کی شادی پہلے ہوئی ہو گی وہی دھوکے باز کہلائے گا۔ آپ کو بہت اچھی لگتی تھی؟"

وہ اس قدر تواتر سے بولی کہ عارف کو بریک لگانے کی کوشش میں کئی بار منہ کھول کر بند کرنا پڑا۔

"وہ بے چاری تو مجھے بے قصور ہی ہے۔ سوالی تو ہم ہی تھے۔ وہ تو مجھے تراشا ہوا پتھر تھا۔" اس کے لہجے میں دکھ آیا۔ اس کے ذہن کی رو موڑنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔

"ہم تو دیوانے ہیں بھائی۔ ہذیان بکتے ہیں۔ کچھ منہ سے نکل جائے تو دھیان نہ دیا کیجیے۔ میرا سوال اپنی جگہ موجود ہے بھائی۔ مجھے صفائی کا موقع ضرور دیجیے گا۔ عمر بھر شکر گزار رہوں گا۔"

"آپ تو خیال اور پیار کریں گی۔ آپ لوگوں کے درمیان رہا کریں۔ مگر میری حساسی بالو۔ اس کے لہجے کی دکھن پر

جیسے سب کچھ بھلا بیٹھی۔

”ارے نہیں بھائی ایسی کوئی بات نہیں —— جدھر جدھر ہم پاؤں رکھ دیں وہیں رونق ہو جاتی ہے۔ وہ ہم عقل [illegible] ہے۔“

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی!

وہ ہنستے ہوئے پلٹ گیا۔ ”پھر ملاقات ہوگی۔ زندگی بخیر۔ لال خان سے کہئے کھانے کا خیال نہ کرے۔ جلد ملیں گے۔“

”عارف بھائی!“

”بس بھائی اب نہ روکیں۔“ وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر جا کر رک گیا۔

”کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔“ بانو نے کہا۔ وہ عجیب بے بسی کی کیفیت میں تھی۔

”اسی لیے تو جا رہا ہوں۔ لال خان آ رہا ہوگا۔“

”آپ شاید میری وجہ سے جا رہے ہیں؟“ وہ جھکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آپ کی وجہ سے تو رکا ہوا تھا۔“ وہ مسکرایا۔

”جی؟“ بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔

بعض اوقات کہنے والا اپنی دھن میں کوئی جملہ کہہ جاتا ہے۔ مگر وہ سننے والے کے دلی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ تب ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے جو اس وقت بانو کی ہو رہی تھی۔

دل سرِشاخ تیز ہوا سے ڈولتے والے پھول کی طرح جھوم رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے اپنی پیشانی پر چمکتا پسینہ صاف کیا اور کچھ بولے بنا ہانڈی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ عارف آگے بڑھ گیا تھا۔

”ہیلو —— جی۔“

”السلام علیکم —— یاور بھائی۔ نعمان بات کر رہا ہوں کراچی سے۔“

”وعلیکم السلام۔ کیسے مزاج ہیں؟“

”اللہ کا کرم ہے۔ آپ تیس کو پہنچیں گے نا؟“

”کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔“

”بھائی صاحب! ایک اور بات یہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ میں پچیس کو کوئٹہ روانہ ہو رہا ہوں۔ ایک ماہ بعد واپسی ہوگی۔ ادھر شہر کے حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ اس لیے اگر آپ محسوس نہ کریں تو بہن کو ایک ماہ کیلئے دریا بستی میں چھوڑنے کا ارادہ ہے۔ وہاں روشی بھی ہے اس لیے اس کا وقت اچھا گزر جائے گا۔ امکان تو یہی ہے کہ میں ایک ماہ سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔“

”ویسے پشاور میں بھی آرام سے رہ سکتی ہے۔ مگر روشی کے ساتھ رہنا اس کی اپنی ’’مرضی‘‘ ہے۔“

بیٹا۔

”جی —— سن رہا ہوں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“

”آپ مناسب سمجھیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”ویسے بھائی صاحب —— اگر اس کے معیار کے مطابق کوئی رشتہ مل جائے تو اور اچھا ہوگا۔“

”آپ دیکھتے ہیں۔ بعض اپنے اپنے گھر کی ہیں۔ اور میرے سامنے یہ پھیلا ہوا کاروبار۔ یہاں پاکستان میں مجھے ویسے بھی خاصا وقت لگ جائے گا بیٹا۔“

”جی —— جی سن رہا ہوں۔“

”آپ کوشش کیجئے کسی طرح کراچی آنے کی۔ باقی باتیں پھر ملاقات ہی پر ہو جائیں گی۔ اور یہ یاد رہے بہتر ہوگا۔ ماہین کو اپنے ساتھ ہی لے آئیے گا۔ اور روشی کیا کر رہی ہے؟ بات کرائیں اس سے۔“

”وہ دریا بستی واپس چلی گئی ہے۔ اپنے دادا کے ساتھ۔“

”ٹھیک ہے —— آپ کا انتظار کروں گا۔ او کے۔ گڈ نائٹ۔“ نعمان نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ مگر یاور علی خان کے ہاتھ میں وہ مستقل ریسیور تھا۔ ان کی آنکھیں گہری سوچ کی غماز تھیں۔

انہوں نے ایک نمبر ملایا۔ ”ہاں —— جعفری —— دریا بستی ملاؤ۔ روشانے سے بات کراؤ۔“

انہیں چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔ تب جا کر جعفری کی آواز سنائی دی۔

”سر —— بی بی روشانے —— بات کیجئے۔“ ”ہیلو!“ ان کی آواز خاصی دھیمی تھی۔

”کون —— بابا؟“

”ہوں۔“

”السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟“ روشی کی آواز پژمردہ سی تھی۔

”ٹھیک ہوں بیٹے۔ تمہیں کیا ہوا۔ کیسی کمزور سی آواز ہو رہی ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

روشی جیسے ایک دم سنبھل گئی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے اس وقت کیسے یاد کیا۔ شاید ابھی فرصت ملی ہوگی آپ کو؟“ وہ بولی۔

”کچھ بچوں سے بات کرنے کیلئے فرصت کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ فرصت نکال لی جاتی ہے۔“

وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”ٹھیک کہا بابا۔“

”تمہارے پیپرز کب شروع ہوں گے؟“

"خیریت تھی پاپا؟" روشانے کی آواز میں حیرت واضح تھی۔

"خیریت ہی ہے بیٹے۔ کوئی خاص بات نہیں۔ تم بتاؤ کب تک فارغ ہو گی؟" ان کا انداز بدستور تھا۔

"میرے فارغ ہونے میں تو پندرہ بیس دن ہیں۔" اس نے الجھے الجھے انداز میں جواب دیا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

"آخری پیپر سے ایک دن پہلے مجھے مطلع کر دینا۔ ٹھیک ہے؟"

"میں کچھ سمجھی نہیں پاپا۔ آئی ایم سوری"۔ وہ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں یہاں لے آئے گا"۔

"مجھے ۔۔۔ آپ کے پاس؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی "وہ کیوں؟"

"بچے اپنے باپ کے پاس کیوں رہتے ہیں؟" وہ بھی کہہ گئے۔

"بالکل ٹھیک پاپا۔ میں خود ہمیشہ کیلئے آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا"۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ "آپ نے بہت مشکل وقت میں مجھے اچھی امید دی ہے۔ تھینکس فادر ڈیئر"۔ وہ رونے لگی۔

"روشی ۔۔۔ کیا بات ہے؟" وہ جیسے گہری نیند سے سنبھل گئے۔

"کچھ نہیں پاپا ۔۔۔ آپ بھی اتنا یاد نہیں آتے جتنا امی یاد آتی ہیں"۔ وہ رو پڑی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ تم تو بہت خوش خوش لگ رہی تھیں"۔ وہ مضطرب ہو گئے۔

"خوش نظر آنے اور خوش ہونے میں بہت فرق ہے پاپا!"

"تم کیوں پریشانی خود پر سوار کرتی ہو۔ تمہیں میرا اعتبار نہیں۔ اور پھر تمہارا اپنا بھائی وہاں موجود ہے۔ تم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ تم اپنے معاملات اس سے شیئر کر سکتی ہو۔"

"روشی ۔۔۔ بیٹے جب تم بہت چھوٹی تھیں تب تو تم نے مجھے کبھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ اور اب اتنی سمجھدار ہو کر۔"

"پاپا ۔۔۔ آپ مجھے گارنٹی دیں کہ آپ کبھی میری شادی نہیں کریں گے۔ پھر ہی میں آپ کی کوئی بات سنوں گی"۔ اس کی فطری ضد عود کر آئی تھی۔

"خدا نہ کرے کہ تمہاری شادی کبھی نہ ہو۔ فی الحال کی گارنٹی دے سکتا ہوں۔ بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں"۔

"لگتا ہے پھر کوئی بات ہو گئی ہے۔ کیا ہوا ہے؟"

"یہاں میری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایسی پریشانی میں میں پیپر دے سکتی ہوں"۔ وہ بسوری۔

یاور علی خان مسکرا دیئے "لاحول ولا قوۃ۔ بھئی ہم نے تو سنا ہے جس دن بیٹی پیدا ہوتی ہے اس دن سے اس کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ تمہاری امی کے پاس ایک بہت خوبصورت میرون دوپٹا تھا۔ بچے کام سے بھرا ہوا۔ ایک روز مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ یہ کام کبھی خراب نہیں ہو گا۔ یہ میں روشی کیلئے رکھ رہی ہوں۔ تیاریوں کا کیا ہے یہ تو ہوتی رہتی ہیں"۔

روشی دم بخود ہو گئی۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ اس نے یاور علی خان کے سینے سے لگی رہی۔ آج اسے اپنا آپ بہت اچھا لگ رہا تھا کہ جی چاہتا تھا وہ اس کی ماں کی ڈھیروں باتیں اس سے کریں۔ اور وہ چپ چاپ سنتی رہے۔

"پاپا"۔

"جی بیٹے"۔

"میری امی بہت حسین تھیں اور جب حسین عورت محبت بھی کرتی ہے تو اور بھی حسین ہو جاتی ہے۔ جب وہ مجھے پیار کرتی ہوں گی تو کتنی پیاری لگتی ہوں گی۔ کیوں پاپا؟" روشی کی رو بہک چلی تھی۔

یاور علی خان نے سانس اندر کھینچا۔ "جواد حویلی میں ہے یا کہیں گیا ہوا ہے؟" روشی اصلی ہی ہو کر رہ گئی۔

"ایک تو پاپا آپ جلدی یہاں سے وہاں ہو جاتے ہیں کہیں۔ کیا تھا جو چار باتیں امی کی اور کر لیتے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"ٹھیک ہے پاپا۔ میں پیپرز کے بعد آ جاؤں گی۔ مگر ایک شرط ہے۔ آپ مجھے امی کی بہت ساری اچھی اچھی باتیں سنائیں گے"۔ وہ بچوں کی طرح بولی۔

"ہو سکتا ہے ماضی کے دکھ کھونے اور خوشی دریافت کرنے کی بجائے اللہ تمہیں۔ زندہ موجود اور تازہ خوشی سے نواز دے۔ اس لئے اپنے باپ کو شرطوں میں مت الجھاؤ"۔ ان کے لہجے میں شوخی اتر آئی۔

"مطلب؟" روشی کی آواز میں حیرت آمیز خوشی تھی۔

"ہے نا"۔ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"اگر ایسے امکانات ہیں تو میں کوئی شرط نہیں رکھوں گی"۔

"شاباش۔ بہت سمجھدار ہے میری بیٹی۔ اچھا ۔۔۔ خدا حافظ"۔ انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ اور سگریٹ سلگانے لگے۔

"یاور۔ جب روشی کی شادی ہو جائے گی اور جواد باہر چلا جائے گا تو ہم کیا کریں گے؟"

وہ کب سے پر گھٹنوں کے بل بیٹھی جواد کو بہت اہتمام سے شوز پہنا رہی تھی۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا۔ دس بارہ بچے ٹھیک ہے۔ جو ہمارے اینڈ تک کام آتے رہیں"۔

وہ بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اخبار دیکھ رہے تھے۔ نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"حد ہے آپ سے بھی۔ بات کیا ہوتی ہے آپ کیا بناتے ہیں"۔ ستارہ نے سر پیٹ لیا تھا۔

"بھئی مجھے تو تمہاری صحت "تمہارے حسن کا خیال ہے۔ ورنہ بچے بہت سارے ہوں تو خوب رونق رہتی ہے۔ ماں باپ کی زندگی میں"۔ انہوں نے پھر چھیڑا تھا۔

"نہیں بابا۔ مجھے نہیں پسند ڈھیروں بچے جو ماں کو اتنا تھکا دیں کہ وہ ٹھیک سے ان کی تربیت بھی نہ کر سکے"۔ وہ وارننگ نظر سے گھنگھا ٹھا کر لائی اور جواد کے بال بنانے لگی۔

"اور جو بچوں کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے خوشی ملتی ہے۔ وہ بھی غارت ہو جاتی ہے"۔ اس نے جواد کے بھولے بھولے رخساروں پر چٹاچٹ پیار کیا۔

یاور علی خان ایش ٹرے میں راکھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چپا سونگ تقریباً ان کے قریب آ کر ان کا انداز دیکھنے لگے۔ کبھی کبھی ان کا موڈ بنتا تھا۔

ایک ریکارڈ لگا کر انہوں نے سوئی لگائی اور واپس اپنے بیڈ پر آ گئے۔

کمرے میں مکیش کی پرسوز آواز پھیلنے لگی۔

جانے کہاں گئے وہ دن کہتے تھے تیری راہ میں

نظروں کو ہم بچھائیں گے

ان کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔ سگریٹ سلگ سلگ کر انگلیوں تک آ پہنچا۔

وہ جی بھر کر سوئی تھی۔ شاید اس لئے کہ کئی راتوں سے بے آرام تھی۔

نہا دھو کر کمرے ہی میں ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران ہی گلو بڑی امی کا پیغام لے کر آ گئی۔ کہ وہ ہال میں بلا رہی ہیں۔

اس نے کوفت بھرا سانس لے کر چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"پھر لے بیٹھی ہوں گی جوڑے گہنے۔ کیا مصیبت ہے"۔ اس نے دوپٹہ شانوں پر پھیلایا۔ "سوچ رہی تھی ایک کپ چائے اور پیوں گی"۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر آ گئی۔

ہال کمرے میں آئی تو منظر کچھ نئے انداز کا تھا۔ گلو مشین لے بیٹھی تھیں۔ سوٹ کرتے سے گلے اور آستین کا زیگ زیگ کر رہی تھی۔ زری کپڑے تراش رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ بڑی امی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ سامنے باری لیٹر پیڈ اور قلم لے بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم"۔ اس نے باری کی طرف سے نظریں چرا کر آہستگی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو"۔

"بیٹی۔۔۔۔ دن چڑھے تک سونے سے سستی ہوتی ہے۔ یاور نے چار دن میں تمہاری عادتیں بگاڑ دیں۔ اور پھر بیٹے عمرہ سب چل جاتا ہے۔ دوسرے گھر جاؤ گی تو سب ایک ایک بات نوٹ کریں گے۔ زندگی تو سب ہی گزر جاتی ہے۔ اچھی طرح گزارنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ خواہ مخواہ کی بدمزگی سے فائدہ؟"

وہ ان سے تھوڑے فاصلے پر موڑھے پر بیٹھ گئی۔

"وہ میں نے تمہیں ایک کتاب دی تھی ڈیزائن پرنٹس لگانے کو۔ لگا دیا؟ یہ باری جا رہا ہے دو دن کیلئے کراچی۔ ضروری کام ہے۔ اسی کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں۔ کچھ چیزیں میں بھی منگوا رہی ہوں۔ تمہاری ساس کو پیسے بھجوا رہی ہوں۔ وہ خرید کر باری کو دے دیں گے"۔

"تمہیں کچھ منگوانا ہو تو لکھوا دو"۔ انہوں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آج کافی دیر تک بستر پر رہیں؟"

انہیں اس کا چہرہ بہت بدلا ہوا محسوس ہوا۔

"کچھ نہیں بڑی امی۔ ٹھیک ہوں میں۔ اور ہاں وہ ان پرنٹس لگانا مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ تھوڑی دیر بعد لے لیں"۔ وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

"ہیں! یہ حال ہے اگر تمہارے ساتھ کا اتفاق نہ ہوتا تو کل پرسوں تو تمہاری بارات بھی ہو جاتی۔ تمہیں اپنے کب سے کام ہوتے ہیں کہ یاد نہیں رہا"۔ وہ ناراض ہو رہی تھیں۔ "حد ہو گئی۔ گلو بتاؤ کہاں رکھی ہوئی ہے کتاب۔ لاؤ لے آؤ۔ میں خود لگا دوں گی نشان۔ اب دیکھو اتنی دور سے بھجوائی ہے۔ کیا سوچیں گے وہ اپنے کہ بہو نے اس طرح پروا کی ہے کی۔ اب بات دوسری ہے۔ آ کر لاؤ"۔

"گلو۔۔۔ وہ میرے کمرے میں الماری پر رکھی ہے ایک سنہری جلد کی کتاب۔ لا کر بڑی امی کو دو"۔ اس نے بیزار کن انداز میں حکم دیا۔

"رات میں یاور سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر ان کے فون بڑی لائن پہ تھے۔ تم ذرا اب ان کے دفتر ملا کر کہہ دینا۔ اور مل جائے تو پیغام دے دینا کہ ایک آدھ دن کیلئے حویلی آ جائیں"۔ وہ روشی سے مخاطب تھیں۔

"تمہارے ہاتھ پر خراشیں کیسی ہیں۔ کہیں گر پڑی تھیں"۔ عالم صاحب کی نظریں اس کے سیدھے ہاتھ کی پشت پر جم گئیں۔ خراشیں اس لئے بھی واضح ہو رہی تھیں کہ ان پر کھرنڈ آ چکا تھا۔

اس نے الٹے ہاتھ سے سیدھا ہاتھ ڈھانپ لیا۔ "کچھ نہیں بڑی امی ایسے ہی"۔ اس نے قدرے گھبرا کر باری کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر جھٹ سامنے سینری پر نظریں جما دیں۔

"ادھر آؤ۔ دکھاؤ مجھے۔ تمہاری شادی کے دن قریب ہیں۔ اپنا خیال کرنا چاہئے اور اتنے سارے نشان سجا کر بیٹھی ہو۔ دکھاؤ مجھے۔ کیا کر کے بیٹھی ہو"۔ انہوں نے تحکمانہ انداز میں اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ چار و ناچار اسے اٹھنا پڑا۔

"کچھ بھی نہیں بڑی امی۔ ٹھیک ہو جائے گا"۔

عالم صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر دیکھا۔ "کیا اس طرح رکھا ہے ہاتھ کو۔ کچھ لگا؟ اس پر لگتا ہے کسی نے کھسوٹ ڈالا ہے۔

تو! پتا نہیں کیا الٹے سیدھے کام کرتی پھرتی ہو"۔

"شکر کریں ان کی طرف سے۔ بہت بہادر ہیں"۔ باری نے پیڈ سے ہلکا سا طنز کیا۔

روشی کی جھکی نظریں نہ اٹھ سکیں۔

"یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو باری۔ تمہارا اندازہ غلط ہو بھی نہیں سکتا"۔ شیبا ایک کونے میں بیٹھی تازہ اخبار دیکھ رہی تھیں۔

"کوئی بھی بہت سارے خواص ہیں۔ وہ بھی تمہیں پتا ہوں گے"۔ شیبا براہ راست باری سے مخاطب ہوئیں۔

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں"۔ باری مسکرایا۔ "کیا مجھے اپنی طبیعت کا اندازہ بھی کرنا ہو گا؟"

لڑکیاں منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔

"میں چلوں بڑی امی۔ ابھی تیاری بھی کرنی ہے۔ اور کچھ تو نہیں لکھنا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ روشی کی ساس کو ہمارا بہت بہت سلام کہنا"۔ "اگر وہ لوگ تمہیں کھانے پر بلائیں تو انکار نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے"۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور کوئی حکم؟"

"نہیں۔ اور کچھ نہیں۔ بس کچھ بھولنا نہیں۔"

"ذرا سن گن لینے کی کوشش کرنا وہ کس تاریخ میں دلچسپی لے رہے ہیں"۔ ممانے آہستگی سے کہا۔ اب شادی کی تیاری کیلئے وقت کا تعین کرنا تھا۔ کچھ روشی کو بھی چھیڑنے کی کوشش تھی۔

"میں براہ راست بھی بات کر سکتا ہوں۔ صرف اجازت درکار ہے"۔ وہ روشی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

روشی بیٹھی اپنی ہتھیلیاں مسلتی رہی۔

جیسے ہی عالم تاب باہر جانے کو اٹھیں۔ روشی بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔

"روشی تم کہاں جا رہی ہو؟" زری نے ٹوکا۔

"آ رہی ہوں ابھی"۔ وہ تیزی سے عالم تاب کے پیچھے نکل گئی۔

بڑی امی اپنے کمرے کی طرف اور وہ اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ہادی تولیہ گلے میں لٹکائے وارڈروب سے کپڑے نکال رہا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے دروازے کے درمیان کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں تم سے لڑنے نہیں آئی ہوں ہادی! بس ایک بات کرنی ہے تم سے۔"

"مگر مجھے آپ سے کوئی بات کرنا ہے نہ سننا ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ یوں بھی مجھے ذرا جلدی ہے۔"

"اس طرح کیوں بات کر رہے ہو؟" اسے رونا سا آ گیا۔

ہادی اپنے کپڑے لے کر باتھ روم کی طرف بڑھا "مجھے افسوس ہے روشی بی بی میں واقعی جلدی میں ہوں"۔ وہ تیزی سے باتھ روم میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا۔ دکھ کی نامانوس سی لہر نے جیسے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کھڑی کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اندر آ گئی اور دروازہ بند کر لیا اور اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ کچھ میگزین اور نصابی کتب سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھیں۔ وہ اٹھا کر دیکھنے لگی۔

جانے کتنا وقت گزرا۔ شاید دس منٹ شاید پندرہ منٹ۔

وہ کچھ گنگناتا ہوا تولیے سے سر رگڑتا ہوا بڑی ترنگ میں باتھ روم سے باہر آیا تھا۔ مگر فوراً ہی ٹھٹک گیا تھا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔

اور اسے مکمل نظرانداز کر کے اپنے کاموں میں مگن ہو گیا۔ پہلے بال سکھائے پھر بیلٹ کسی۔ پھر سنگھار میز پر شیو کا سامان رکھنے لگا۔

اسی دوران چلتے پھرتے تولیہ اک ہاتھ میں لٹکائے وہ اپنے جسم پہ بھی اسپرے کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں ایک بھینی بھینی خوشگوار سی مہک سرایت کر گئی تھی۔ سیاہ پینٹ اور اسکائی بلیو شرٹ میں ملبوس وہ بہت تروتازہ دکھائی دے رہا تھا۔ پاس اس طرح ہوا تھا جیسے اسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہے۔

"ہادی!"

"جی۔"

"تم ایسے کیوں ہو رہے ہو؟"

"کیسا ہو رہا ہوں۔ اچھا تو میں کبھی بھی نہیں لگا آپ کو۔ کیا آج زیادہ برا لگ رہا ہوں"۔ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں چھوٹی بھابی کی وجہ سے تمہاری بھابی کے بیڈروم میں گئی تھی۔ اب مجھے کیا۔۔۔"

"میں بھلا یہ جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ سے پوچھ گچھ کروں۔ قدرت اللہ"۔ اس نے بیگ بند کیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"اور پھر آپ کا گھر ہے۔ آپ جدھر مرضی گھومیں پھریں۔ وقت بے وقت۔ آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟" وہ رسانیت سے پوچھ رہا تھا۔

"تم پہلے جیسے نہیں لگ رہے۔ بہت بدلے ہوئے لگ رہے ہو۔ کیا کیا ہے میں نے؟ کون سا گناہ ہوا ہے مجھ سے جو تم مجھ سے دل برے ہو اور میں اپنی نظروں میں گر رہی ہوں"۔ اس کی آواز بھر آ گئی۔

"بدل رہے ہو اور۔۔۔" وہ ہنس دیا اور اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ "اور کیا میں اتنا قابل ذکر ہوں کہ آپ میرے ہونے نہ ہونے کا نوٹس لیں۔ اپنی توانائی ضائع نہ کیجئے۔ آگے کام آئے گی۔"

"ہادی۔۔۔ تم بہت "کٹھور" ہو۔ تمہاری کچھ سمجھ میں نہیں آتے۔ مجھے تم سے بہت شرم آ رہی ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے میں مر جاؤں"۔ وہ بہت ضبط سے اپنے آنسو روک رہی تھی۔ ہادی کا دل۔۔۔ بشر کا دل تھا۔۔۔ بہت تنگ میں دھڑکا۔

"کس بات کی شرم؟"

"تم نے مجھے عجیب سے حلیے میں دیکھا تھا۔ مجھے سوچ سوچ کر شرم آ رہی ہے۔ حالانکہ مجھے پتا ہے تم کسی سے نہیں کہو گے"۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیا نہیں کہوں گا؟" اس نے انجان بن کر گویا اسے چھیڑا۔

"ہاں۔۔۔ میں تو کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کہوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اب مجھے اجازت"۔ وہ بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

(ہائے۔۔۔ یہ نظر کر ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی کتنے جتن سے دکھائی دیتا ہے)

"اور ہاں۔۔۔ وہ اس روز تم کو جو میں فون کر رہی تھی۔"

"یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے آپ کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں"۔
اس نے ہاتھ اٹھا کر رمشا کو کچھ کہنے سے روک دیا۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆

"کیوں نہیں ہے دلچسپی؟ تم اس گھر میں نہیں رہتے؟" وہ بگڑ کر بولی۔

"لیکن گھر میں رہنے کی یہ شرط تو نہیں ہے کہ میں یہاں کے تمام معاملات میں انوالو ہوں"۔ وہ عجیب سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"گھر میں رہنے والوں کیلئے "ہر" شرطیں نہیں ہوتیں۔ خود بخود ساری ذمہ داریاں ہر فرد پر آ جاتی ہیں۔ سارے گھر کی "نہ" سوچنے پر اس سو دلچسپی تو لینی پڑے گی"۔ وہ اسی لہجے میں گویا ہوئی۔

"اچھی زبردستی ہے"۔ ساری نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں ہمیشہ سے ہمارے معاملات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے "ذرا زیادہ ہی"۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اتنا کمزور ہرگز بھی نہیں ہوں کہ کوئی آسانی سے مجھ پر اثر انداز ہو سکے۔ خاصا ڈھیٹ ہوں۔ اب مجھے اجازت"۔ وہ مسکرا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تم جا کر دکھاؤ"۔ اس نے دانت پیسے۔

"اور اس کے علاوہ کوئی اور فرمائش ہے؟ میں مزید کیا کر کے دکھاؤں؟" وہ جواباً مسکرا رہا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟ جو تم ایسے اور ہے ہیں؟" وہ پھر روہانسی ہو گئی۔

"تو آپ نے کچھ کیا ہے نہ میں ایسا ویسا ہو رہا ہوں۔ میری فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے ناشتہ کرانی ہے پھر آہستہ کیلئے بھی کہہ رکھئے"۔ اس نے بیگ اٹھا لیا۔

"کوئی پیغام کراچی والوں کیلئے؟" اس نے قدم آگے بڑھاتے۔

"تمہارا سر!" وہ جھلا اٹھی۔

"وہ تو میں ساتھ لئے جا رہا ہوں اچھا خدا حافظ"۔ وہ باہر نکل گیا۔

وہ ہتھیلیاں مسلنے لگی ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔

ماہین راہداری کا مرکزی دروازہ چیک کر کے مطمئن انداز میں اپنے کمرے کی سمت بڑھی تھی۔

بہت مدھم سی کال بیل نے اسے چونکا دیا۔ اس کی نظریں لاؤنج میں سامنے ہی لگے وال کلاک پر جا ٹھہریں۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔

اس نے خود آگے بڑھنے کی بجائے نعمان کو جگانے کا قصد کیا۔ مگر ایک دم رک گئی۔ معلوم تو کروں ہے کون۔ یونہی بے چارے بھائی کی نیند خراب ہو گی۔ یہ سوچتے ہی راہداری کا دروازہ کھول کر باہر آئی اور گیٹ سے چند قدم دور ہی سے آواز دی۔

"جی..... کون؟"

"یاور..... ؟" آواز خاصی دھیمی تھی مگر رات کے اس پہر واضح تھی۔

"اوہ"۔ ایک انجانی سی خوشی اس نے اپنے اندر دوڑتی محسوس کی۔

"ایک منٹ!" وہ چابی لینے اندر دوڑی۔ جتنی تیزی سے اندر دوڑی تھی۔ اتنی تیزی سے بھاگتی ہوئی واپس آئی۔

تالا کھول کر اس نے ذیلی دروازہ فوراً ہی وا کر دیا تھا۔

سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس ریڈ اینڈ وائٹ دھاریوں کی ٹائی لگائے بھورا سا بہت خوبصورت سا لیدر قسم کا سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکائے یاور علی خان اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"السلام علیکم"۔ اس کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ ایسے نہیں بھاگتے، گر بھی جاتے ہیں"۔ ان کی آواز دھیمی اور لہجہ سپاٹ تھا۔

ماہین شرمندہ سی ہو کر اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔

"آئیے"۔ وہ انہیں لے کر آگے بڑھی۔

"کیا میرے آنے سے حفاظتی انتظامات مکمل ہو گئے ہیں؟" انہوں نے کھلے ہوئے تالے کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ"۔ ماہین تالا لگانے لگی۔ یاور علی خان بھی رک گئے تھے۔

پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج میں پہنچے۔

"فلائٹ لیٹ تھی یا ماہرہ ہی تھیں؟" وہ ان کے مقابل کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"کافی لیٹ ہو گئی تھی"۔ انہوں نے سوٹ کیس ایک طرف لٹکا دیا۔

"ہمیں چاہئے فون کر لیں اب تو آپ مضطرب ہو رہی ہیں"۔ وہ بہت سادہ اور پرسکون انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"آپ کے آنے سے میں کبھی مضطرب ہوئی نہیں تھی۔ آپ لوٹ کر لیں ایلیٹ کیلئے"۔

یاور علی خان نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی۔ عمیر ان کا ان کے سفید کرتا شلوار میں ملبوس وہ بے تکلف ہو لی بہت معصوم سی لگی۔

"ابھی بات اب آپ مجھے اس لفافے پر پہنچائیں جہاں میں پہنچ کر سکوں"۔ وہ مشکل سے انداز میں گویا ہوئے۔

"اوہ"۔ ماہین قدرے جھینپ گئی۔

"پھر آپ ادھر ہی چلئے جہاں پہلے ٹھہرے تھے۔ لفافہ بھی وہیں اوپر ہی رکھا ہوا ہے"۔

"اتنا کچھ ہی آپ نہیں"۔ وہ تبسم سا مسکرائے۔

"اس سے بھی کچھ زیادہ"۔ وہ شرارت سے گویا ہوئی اور زینے کی طرف بڑھ گئی۔

یاور علی خان اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

"پتا نہیں کیوں میرا وجدان کہہ رہا تھا آپ آنے والے ہیں میں نے کمرہ اسی لئے بالکل تیار کر دیا تھا"۔

"اچھی خاصی روحانی خاتون ہو گئی ہیں آپ تو"۔

"یہ بہت زیادہ ہے۔ ایسے خطابات کی اہل نہیں ہوں۔ اچھا یہ بتائیے کھانا کھائیں گے یا چائے کافی......"

"کچھ نہیں۔ بس ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیں اور پھر آرام کریں"۔

"بس؟" اس کے منہ سے یونہی نکل گیا۔

"جی بس"۔

"پھر میں یاد کر لیجئے۔ ہو سکتا ہے کوئی بہت ضروری چیز چاہیے ہو"۔ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

یاور علی خان کوٹ اتارتے اتارتے ایک دم رک گئے۔

"بعض چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں مگر موقع محل شرط ہوتی ہیں"۔ ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ماہین نے چونک کر ان کی صورت دیکھی۔

"جی"۔

یاور علی خان اس طرح لاپرواہ انداز میں کوٹ اتار کر بستر پر ڈال چکے تھے جیسے کمرے میں ان کے علاوہ دوسرا کوئی موجود نہ ہو۔ لہذا ماہین کا ٹھہرنا بے معنی سا تھا۔

وہ پانی لانے کے ارادے سے کچن کی طرف جا رہی تھی۔

اس نے برتن دھوئے اور چارپائی پر اوندھے رکھ دیے۔ ابھی سیدھی ہی ہوئی تھی کہ پاس ایک پتھر گرتے دیکھ کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔

وہ فکرمند سے انداز میں اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھنے لگی۔ الجھن کا اثر واضح طور پر اس کے چہرے پر موجود تھا۔ ــــ پھر ایک پتھر اس کی پیٹھ پر لگا۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی اور اس طرف دیکھنے لگی تھی جہاں سے پتھر آنے کا اندازہ تھا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔

حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ یہاں آنے کے بعد یہ واقعہ دوسری مرتبہ تھا۔

وہ گھوم کر دیوار پر نظریں جما کر کھڑی ہو گئی۔ خوف سے بری حالت ہو رہی تھی۔ مگر آج وہ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی۔

اس نے چاہا کہ باری کو آواز دے مگر یک دم رک گئی۔ اسے دیوار پر ایک بھوری سی چیز محسوس ہو رہی تھی۔ وہ غور سے گھورنے لگی۔

اور اگلے ہی لمحے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دیوار کے اس سرے سے دوسرے سرے تک ہر سائز کا بندر دانت نکوس رہا تھا۔ اس کی جان میں جان آئی گویا ــــ

اس نے پیچھے سے ایک پتھر اٹھا کر ایک بندر کی طرف پھینکا۔ سارے کے سارے دیوار پر ناچنے کودنے لگے۔ کچھ صحن میں کود گئے۔ ایک عجیب سی آفت مچ گئی۔

ایک بندر نے پلنگ سے گلاس اٹھا لیا اور جھومر کی طرف پھینکنے کی دھمکی دینے لگا۔

تانبے کا بھاری گلاس تھا۔ جھومر ڈر کر پیچھے ہٹنے لگی۔

دو تین بندر اس کے آگے پیچھے ناچنے لگے۔ وہ چیختی ہوئی دور ہٹنے لگی۔

معاً اسے کسی سے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ وہ یوں اچھل کر پیچھے مڑی جیسے کرنٹ لگا ہو۔ فوراً ہی پلٹی تھی ــــ اور حیرت بھری آواز سے نکلی تھی۔

"آپ ــ با ــ باری ــــ بندر ــــ"

"لاحول ولا قوۃ!! کوئی اچھی بھلی نہیں تھی آپ کے پاس؟" باری نے منہ بنایا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اوہ میرے خدایا۔"

"آپ اندر چلیں۔ میں انہیں بھگا کر ابھی آتا ہوں۔"

جھومر سنتے ہی اندر دوڑ گئی۔

باری نے جانے کون سی جیب سے پستول برآمد کیا اور ایک ہوائی فائر داغ دیا۔

بندروں میں کھلبلی مچ گئی۔ آن کی آن میں جانے کدھر غائب ہو گئے۔ اس نے پستول واپس جیب میں ڈالا اور اندر کی سمت چلا۔

جھومر وہیں کھڑی رہی تھی۔ باری کو اندر آتا دیکھ کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"تمہارے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔" وہ تخت کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیا حویلی والوں کے حکم پر خون بھی کرتے ہو؟" وہ تخت پر بیٹھ گئی۔

"نہیں صرف درندوں کا خون کرتا ہوں۔" وہ دوشی کا چہرہ تصور میں لا کر مسکرا دیا۔

"پھر تم تو ان سے بھی بڑے قاتل ہو۔" جھومر نے قدرے طنز سے کہا۔

"پھر جرم ہے، میں اقبالِ جرم کرتا ہوں۔ اب بس آپ جلدی سے یہاں سے چلی جائیں۔ بہتر ہے جانا ہے یا نہیں؟" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر پلٹ گیا۔

"کہاں؟" جھومر نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"آپ کے ٹھکانے پر، اور کہاں؟"

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟ کاکا جان نے یا بابا صاحب نے؟" جھومر کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"کسی نے تو بھیجا ہوگا، خود سے تو میں آ نہیں سکتا۔" اس نے جواب دیا۔

"ظاہر ہے ہمارے نصیب ایسے کہاں۔" وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

باری کو سنائی نہیں دیا۔

"میں ٹھیک سے سن نہیں سکا۔" وہ آگے کی طرف جھک کر گویا ہوا۔

"اللہ میاں نہیں سنتا ہماری، پھر تم تو تم ہو۔" وہ پیچھے ہٹ کر بولی تھی۔

"کیا سنانا چاہتی ہیں آپ اللہ میاں کو؟" وہ جانے کیوں مسکرا دیا۔

"چاہنا کیا، چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"اچھا چلیں اٹھیں پلیز! نکلیں یہاں سے۔" باری کے انداز میں درخواست تھی۔

جھومر نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"کہاں لے کر جاؤ گے؟"

"جہاں سے آئی تھیں۔" باری نے ریسٹ واچ پر نظر دوڑا کر خاصی عجلت کا اظہار کیا۔

"باری! مجھے اس مذبح خانے میں لے کر مت جاؤ۔ لاؤ اپنا پستول مجھے دو، میں خود ہمیشہ کے لیے ایک فیصلہ کر لیتی ہوں۔"

"مجھے انہوں نے آپ کی حفاظت دی ہے، حکم پر عمل درآمد کرنے کا بہرحال میں پابند ہوں۔ چلیے اٹھیے اور شکر کیجیے نوکری کی وجہ سے آپ کی بہت بچت ہو گئی۔"

"ٹھیک ہے تم مجھے نوکری کا نام لے کر چڑاؤ، میں بھی تم لوگوں کو سبق سکھا ہی دوں۔" جھومر نہایت غصے کے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو اور سیدھے دریا بستی چلو، سرائے میں حاضری لگانے کی ضرورت نہیں اور تم مجھے دھوکے سے سرائے لے جانے کی غلطی بھی نہ کرنا۔ کہیں میرے ہاتھوں تیمور علی خان اپنے انجام کو نہ پہنچ جائیں۔" اس کی نگاہ میں بھی آنچ تھی...... اور لہجے میں بھی۔

"اچھا چلئے چادر اوڑھئے زیادہ ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں۔" وہ سرد انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

جھومر پاؤں لٹکائے کچھ دیر سوچتی رہی پھر ایک فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

چادر اوڑھ کر باہر آئی، گل باز بیگ اٹھائے باہر کی طرف جا رہا تھا، وہ اسی کے پیچھے چل پڑی۔ ہاری بند جیپ میں ڈرائیونگ سیٹ پر اپنی طرف کا دروازہ کھولے اندر سے باہر آنے والے راستے کی طرف تک رہا تھا، گل باز اور جھومر کو آگے پیچھے آتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس بھرا۔

"اس قدر وحشت ہوتی ہے اندر کہ مجھے جیپ میں بیٹھ کر انتظار کرنا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اندر بیٹھنے کے اور ایک آپ ہیں، جانے کیا لڈو پیڑے مل رہے ہیں اس حویلی میں۔"

اس نے جھومر کے بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کر دیا اور بیک ویو مرر میں دیکھنے لگا کہ گل باز ایک طرف ہٹ گیا یا نہیں۔

"تم ہاری ہو اور میں جھومر ہوں۔ تمہیں کسی ظفری کے پلے نہیں باندھا گیا۔ تمہارا دل محفوظ ہے، اسے کسی نے مسلا نہیں، تمہاری روح آزاد ہے، یہ کسی درندے کو پیش نہیں کی گئی لہٰذا تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنے کی زحمت کی ضرورت نہیں۔"

جھومر نے تڑخ کر اسے جواب دیا تھا۔

ایک لمحے کو تو ہاری بھی لاجواب سا ہو کر چکرا کر رہ گیا تھا۔

"چل رہی ہوں میں اس جہنم میں، کر لیا ہے میں نے تمہاری پسند کا فیصلہ۔ اب دیکھنا ذرا۔"

جھومر نے سر سے کلپ کھسوٹ، بال ہاتھ سے سمیٹے اور دوبارہ کلپ میں قید کر دیئے اور سر پر چادر جما کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"یہ میری پسند بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑی۔ مجھ سے جو کہا جاتا ہے، میں وہ کرنے کا پابند ہوں۔"

گاڑی باہر آتے ہی اس نے بہت تیزی سے چلائی تھی، جیسے جھنجلا رہا ہو۔

"غلامی کی زنجیریں توڑنا بھی انسان کا حق ہے، پیدائشی حق۔" جھومر نے تلخی سے کہا۔

"پیسے جمع کر رہا ہوں۔" ہاری کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

جھومر نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی، بڑا پیچیدہ سا جواب تھا۔

"پیسے......؟"

"کس لئے؟"

"غلام پابند ہے کہ اپنے آقا کو منہ مانگی رقم دے اور آزاد ہو جائے۔" اس کے لہجے میں بلا کی تپش تھی۔

"کیا دام لگا رہے ہیں تمہارے؟" جھومر کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

"ان کی تو پوری جاگیر تمہارے سر سے وار کر صدقہ کر دی جائے تو بھی کم ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

"ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں مجھ میں۔" اسے یکدم غصہ آ گیا۔

"تمہیں کیا پتہ؟" وہ بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے اپنی حدود کا پتا ہے، میں عملی اور حقیقت پسند آدمی ہوں۔ اپنے بعض جذبوں کے سامنے بے بس سہی مگر ہتھیار ڈالنے کی حد تک کمزور نہیں۔ وہ کون سے مقامات ہیں، جہاں میرا ارادہ بے عمل ہوتا ہے، مجھے اچھی طرح شعور ہے۔"

ہاری کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"تم میں بھی جذبات ہیں؟" جھومر کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"کیا مجھے بتاؤ گے وہ کون سے جذبات ہیں؟"

"وہ تو شاید میں اپنے آپ کو بھی بتانا پسند نہ کروں۔" ہاری نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بڑے ضبط سے جواب دیا۔

"ایک بات کہوں، آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟" اس نے طویل راستے کے بعد پہلا موڑ کاٹا۔

"ہوں، کہو! تمہیں میرے برا ماننے کی فکر میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔" جھومر نے بے دلی سے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ پیچھے جا کر آرام سے لیٹ جائیے۔ ہو سکتا ہے، ٹھنڈے ماحول میں آپ کی نیند پوری ہو جائے اور آپ کا ذہن پرسکون ہو جائے۔ کیونکہ سرائے جا کر گاڑی بدلنا ہے۔ یہ جیپ کاکا جان کی ذاتی اور پسندیدہ سواری ہے۔ ان کی "لینڈ کروزر" کے بعد جو آج کل بابا صاحب کے استعمال میں ہے۔" اس نے رسانیت سے کہا۔

"تم مجھے وہاں نہ لے کر جاؤ تو بہتر ہے۔ پھر میرے منہ سے کچھ نہ کچھ نکل جائے گا۔"

جھومر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"مگر مجھے گاڑی لازمی بدلنا ہے۔ شاید وہ بھی آپ سے ملنا اور بات کرنا پسند نہ کریں، آپ گیٹ سے باہر کھڑی ہو جائیے گا۔ میں پانچ منٹ میں دوسری گاڑی لے کر باہر آ جاؤں گا، اب آپ پیچھے جا کر آرام کیجئے۔"

"دل نہیں چاہ رہا میرا آرام کرنے کو، تم چلاؤ گاڑی، میں تم سے کوئی بات فی الحال نہیں کر رہی۔"

ہاری نے ہونٹ بھینچ کر رفتار قدرے بڑھا دی۔

....

سب لڑکیاں اندر ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ وہ بیزار کن انداز میں دوپٹا سنبھالتی ہوئی باہر آ گئی اور بیرونی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ پورے دنوں کا چاند تھا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ تھام کر چاند کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ کھوکھر گیٹ بند کر کے اس کے پاس سے گزرا، قدرے حیرت سے اسے دیکھا پھر آگے بڑھنے لگا۔

"کھو کھو"۔ اس نے کسی خیال سے باہر آ کر آواز دے ڈالی۔

"جی بی بی"۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔

"جاؤ کھو، اب روشنی بہت ہے یہاں کی سب لائٹیں بند کرو"۔ اس نے حکم دیا۔

"جی اچھا"۔ وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے ۔۔۔ باغ کی ساری لائٹیں بند کر دیں۔

وہ پھر پہلے کے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جانے کتنی دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔

معاً وہ چونک پڑی۔ کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس سے گیٹ روشن ہو گیا تھا۔

شاید بابا صاحب آ گئے ہیں۔

گاڑی ہارن دے رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی ملازم نظر نہیں آیا۔ جانے کیا سوچ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ خاصی تیزی سے چلتی ہوئی گیٹ تک آئی اور گیٹ کھول دیا۔ تیز روشنی منہ پر پڑی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔

گاڑی ایک دم جیسے اس کے اوپر چڑھ دوڑی وہ انتہائی تیزی سے ایک طرف ہو گئی۔

"یہ کون بدتمیز قسم کا ڈرائیور ہے"۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ گاڑی پورچ میں جا کر رک گئی تھی۔

وہ کھولتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھی ان لینے کے خیال سے مگر ٹھٹک کر رک گئی۔ ایک طرف سے ہادی اور دوسری طرف سے جھومر اتر رہی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہاں گئی ہوئی تھیں یہ جھومر بھابی؟"

اسے وہ چند دن پہلے والا واقعہ ایک دم سے یاد آیا "تو یہ کہیں گئی ہوئی تھیں شاید اپنے میکے مگر ہادی تو کراچی گیا ہوا تھا یہ انسان ہے یا ہوا؟"

"وہاں کیوں رک گئی؟ آج سلام دعا بھی نہیں ہو گی"۔ جھومر نے اسے متوجہ کیا۔

"السلام علیکم"۔ وہ خاصی الجھی ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام! ٹھیک ہو؟" جھومر نے اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔

"کہاں چلی گئی تھیں آپ؟ ظفری بھائی نے اپنا سر پھاڑ لیا ہے۔ آج وہ پھر کوئی انہیں ہسپتال لے کر گئے تھے ایڈمٹ ہیں وہ۔"

روشی کا انداز اب بھی الجھا ہوا تھا۔

جھومر نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔

"شکر کرو ہم آ گئے بلکہ ان کی خاطر آئے ہیں انہی کے ساتھ واپس آئے ہیں"۔ ہادی کا انداز تھا۔

ہادی کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

روشی کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا ایک فطری امر تھا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا بھابی"۔ اسے ایک دم اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ جھومر کا انداز ہی ایسا تھا۔

ہے۔ حویلی میں نئی دلہن کی طرح انسان بھرا پڑا ہے۔ مگر ہادی میں اور ایک بھی نہیں ہے۔

"تو مجھے کس کی ضرورت ہے؟ ہادی ہے۔ اچھا اب تم چلو۔ اللہ کرے ظفری اب ہسپتال ہی میں رہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ہادی۔۔۔"

اس نے پچھلے صحن کی جانب پیش قدمی کی۔

ہادی گاڑی سے چیزیں نکال رہا تھا اور روشی اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔

"جھومر بھابی کیا دل فول ایک ہی تھیں؟" معاً اس نے متذبذب ہو کر پوچھا۔

"وہ آپ کی بھابی ہیں اور میری بھابی"۔ "کیا نہیں فرماتی ہیں۔۔۔ کیسی؟"

"مگر جھومر تو کہہ رہی تھیں وہ کوئی بھابی نہیں فرما رہیں"۔ وہ الجھ رہی تھی۔

"وہ ایک نارمل انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ کوئی نفسیاتی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہو گی۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔ اس نے تسلی دی۔

"مگر کس خوشی میں تم ان کو اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو؟" وہ بپھر گئی۔

"کون سا واقعہ؟" وہ بس اتنا ہی پوچھ سکا۔

"اگر نفسیاتی کیس بن گئی ہیں تو بابا صاحب کو اطلاع دو۔ پاگل خانے جا کر ان کا علاج کرائے کوٹھی میں اس قسم کی رواداری برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں۔ سمجھانے کی کوشش کرو کہ اپنی اوقات میں رہیں۔ ہم صرف اپنے بھائی کی خاطر ان کو لفٹ دے رہے ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں ان کا 'رنگ' ماما جی کے بعد ہی دکھتا ہے۔"

"ہم لوگوں کو کسی عزت ذلیل ہوا انہیں راس ہی نہیں آتی"۔

غصے سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"آپ کیوں خوامخواہ اپنا ضمیر لوز کر رہی ہیں۔ جانے دیں"۔ ہادی نے رسانیت سے سمجھایا۔

"تم پر ان کی بے ہودگی کا کوئی اثر نہیں ہوا"۔

وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔ بلیک اینڈ وائٹ پرنٹ کے شلوار کرتے اور دوپٹے میں وہ دھیمی چاندنی کی روشنی میں نہائی ہوئی وہ بڑی معصوم دکھائی دے رہی تھی۔

ہادی نے نظریں چرا کر گاڑی کو لاک لگانا شروع کر دیا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے؟" وہ چنگھاڑی۔

"بالفرض مجھ پر کچھ اثر ہو کسی بات کا۔ تو اس سے آپ کو کیا فائدہ یا نقصان ہے۔ یہ تو میری اپنی ذاتی واردات ہو گی"۔ وہ لاک لگا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"دیکھنا میں بابا صاحب کو خط کر رہی ہوں گی"۔ اس نے دھمکی دی۔

"گھر والوں سے جنگ کرنا کوئی اچھی بات نہیں"۔ ہادی نے اندر جانے کی نیت سے رخ موڑا۔

"حمایت لے رہے ہو ان کی؟" اسے جیسے کسی خوف سے صدمہ سا ہوا۔

"نہیں..... جن لوگوں کے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو ان سے بات نہیں ہو جاتی، آپ کا ہم سے
رکھتے ہیں"۔ اس نے پھر بہلانے کی کوشش کی۔

"خیر..... دماغ تو ان کا بھی ٹھکانے لگا دوں گی میں۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی؟"
وہ کہاں باز آنے والی تھی۔

"مرضی ہے آپ کی۔ میری طرف سے اجازت ہے"۔ وہ مسکرا دیا جیسے اسے چڑا رہا ہو۔

"ہونہہ"۔ وہ پاؤں پٹخ کر اس سے پہلے اندر بڑھ گئی۔ اور ہال کراس کر کے بیچ میں چلی آئی۔ لڑکیاں اندر ہی بیٹھی تھیں۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟" ہیبے نے اس پر سرسری نظر ڈال کر دوبارہ اسکرین پر نظریں جما دیں۔

"جہنم میں"۔ وہ صوفے پر ڈھے گئی۔

"ہاں..... کچھ..... سرخ سرخ سی تو ہو رہی ہو"۔ روبی نے شرارت سے دیکھا۔

"شاید۔ حویلی کے غائب لوگ واپس آ چکے ہیں"۔ معصومہ کا پیٹ پر بالکل چپت چلی تھی۔

روشی نے ان کے لپٹنے کے انداز کو بڑی ناگواری سے دیکھا۔ اس پر مستزاد ان کا جملہ۔

"معصومہ آپا! آپ مجھ سے مخاطب نہ ہوا کریں"۔

اس نے خاصی بدتمیزی سے کہا۔ اس وقت وہ اس ماحول میں موجود کب تھی۔ اس کے کانوں میں تو جھومر کے الفاظ انگاروں کی طرح ہنوز محسوس ہو رہے تھے۔

"گلو آپا! یہ ظفری بھائی ہاسپٹل سے کب واپس آئیں گے؟" اس نے نظری عینک لگائے ہنوز ٹی وی دیکھتی گلو سے پوچھ لیا۔

"خیریت؟" گلو نے چشمے سے اسے گھورا۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔ یونہی پوچھ رہی تھی"۔ اس نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

"وہ ہاسپٹل میں ٹھیک نہیں ہوں گے۔ ان کا علاج گھر میں ہی ہے"۔ وہ مزید گویا ہوئی۔

"یعنی"۔ گلو واقعی نہیں سمجھیں۔

"یعنی یہ کہ جھومر بھابی..... وہ گھر نہیں تھیں۔ انہیں لینے پڑنے لگے۔ انہوں نے اپنا سر پھاڑ لیا"۔ اس نے اطلاع دی۔

"وہ کہاں چلی گئی تھیں؟" گلو اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ٹی وی سے ان کی توجہ مکمل طور پر ہٹ چکی تھی۔

"پتہ مجھے علم نہیں کہ وہ کہاں گئی تھیں۔ مگر بہر حال یہ مجھے پتہ ہے کہ وہ کہیں گئی ہوئی تھیں اور اب واپس آ گئی ہیں۔ ہادی کے ساتھ"۔ اس نے سادہ انداز میں جواب دیا۔

"ہادی کے ساتھ"۔ کئی متحیر آوازیں کئی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا کہہ رہی؟" گلو حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

"پھر تو آپ دونوں اکیلے ہی گئی ہوں گی"۔ معصومہ نے حسب توقع سوال اچھالا۔

"ہادی کے ساتھ"۔ گلو انہیں گھور کر رہ گئیں۔

"ظاہر ہے"۔ وہ بڑی تیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئیں۔

"تمہیں کیسے پتا..... کہیں گئی ہوئی تھیں؟" زری نے نکتہ اٹھایا۔

"اس لئے کہ وہ میرے سامنے آئی ہیں"۔ اس نے آرام سے جواب دیا۔

"ہادی کے ساتھ"۔ مریم نے سوال کیا۔

"لاحول..... یہ تم لوگوں نے مستقل قسم کی گردان لگائی ہے۔ ہادی کے ساتھ، ہادی کے ساتھ"۔ وہ بری طرح جھلا گئی۔

"وہ تم کو بتا رہی تھیں"۔ مریم بڑبڑائی۔

"ہاں تو میں نے کہا تھا آپ نے سن لیا تھا۔ اب یہ گردان کیوں؟" وہ بگڑی۔

"یقین نہیں آ رہا تھا"۔ مونے مسکرا کر جواب دیا۔

"ابھی ہادی اس طرف آئے تو پوچھ لیتے کہ بھابی کو سیر کرانے کہاں لے گئے تھے؟" زری نے مشورہ دیا۔

"تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی تو کراچی روانہ ہوئے تھے"۔ معصومہ نے یاد دلایا۔

"یہ خیال رکھتے ہیں بابا صاحب جھومر بھابی کا"۔ حنا نے معصومیت سے کہا۔

"سب سے تحت ..... ہی تو دیتی ہیں وہ"۔ روبی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں بیوی ہیں تو ان کا حق ہے"۔ ہیبے نے بھی بڑے اطمینان سے کہا۔

"وہ بھی..... ہادی کے ساتھ"۔ معصومہ کہہ کر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنسیں۔

روشی پاؤں پٹختی خود کو وہاں سے باہر نکل گئی تھی۔

اس نے آہستگی سے دروازہ بجایا۔

"یس!" اندر سے آفیسرانہ انداز میں اجازت ملی۔

وہ دروازہ کھول کر ٹرے اٹھا کر اندر آئی۔

"السلام علیکم صبح بخیر"۔

"وعلیکم السلام"۔ یار علی خان نہا کر نکلے تھے اور اب آئینے کے سامنے کھڑے بال بنا رہے تھے۔

"رات خان آپ بہت لیٹ آئے۔ میں خاصی دیر انتظار کرتی رہی۔ پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی"۔ وہ بیٹی کے انداز میں شرمندہ تھی۔

"قصور آپ کا نہیں میرا ہے"۔ اگر شرمندہ ہونا بہت ضروری ہے تو مجھے ہونا چاہیے"۔ وہ آسمانی رنگ کے شلوار سوٹ میں خاصے ہشاش بشاش محسوس ہوئے۔

"نہیں ...... خیر ...... ایسا بھی ضروری نہیں"۔ وہ ہنس پڑی۔ بڑی مترنم اور مدھری ہنسی۔

یاور علی خان نے قدرے چونک کر اس کی سمت دیکھا (کس قدر شناسا سی ہنسی ہے) وہ کرسی پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

سرخ اور زرد پرنٹ کے جدید تراش کے سوٹ اور خوش رنگ میچنگ اسٹائل میں وہ بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

وہ اسے آئینے میں دیکھ رہے تھے۔

"کس کو تلاش کر رہے ہیں ہم میں؟" اس نے ان کی نظروں کو محسوس کر لیا تھا۔

بڑی سادگی سے مسکرا رہی تھی۔

"میں کسی میں کسی کو تلاش نہیں کرتا۔ ہر انسان کا اپنا علیحدہ رنگ ڈھنگ ہوتا ہے"۔ وہ دوبارہ چونک کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔

"اب بتائیے۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟" وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"کیسا پروگرام؟" اس نے حیرت سے ان کی سمت دیکھا اور چائے کا کپ ان کی طرف بڑھا دیا۔

"جی ..... آپ کا پروگرام ..... ہمارے ساتھ چلنے کا"۔ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کے ساتھ؟" وہ مزید حیران ہوئی۔

"کیا نعمان سے آپ کی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی؟" اس بار حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

"نہیں تو"۔ اس کے چہرے سے فکرمندی جھلکنے لگی۔

"چلیں خیر، پھر چھوڑیں اس موضوع کو۔ نعمان کے سامنے ہی بات کریں گے۔ چلیں۔ اب یہ بتائیں۔ آپ کی فیوچر پلاننگ کیا ہے"۔ انہوں نے ہلکا سا سپ لیا۔

"فی الحال تو کچھ نہیں۔ ایگزام میں تو خاصا ٹائم ہے۔ بس ہلکی پھلکی اسٹڈی ہو رہی ہے"۔ وہ اب ہلکی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

"پھر ..... اس کے بعد؟" وہ مسلسل سوال کر رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔ کچھ سوچا نہیں"۔

"تو پھر سوچنا شروع کر دیں۔ شاید نعمان آپ کی شادی کی فکر میں ہیں"۔ ان کا انداز عام سا تھا۔

"نعمان بھائی تو بس"۔ وہ خاصی جھینپ گئی۔

"انہوں نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ اس کار خیر میں میں بھی حصہ لوں۔ لہٰذا پہلے اتنا تو معلوم ہو جائے کہ آپ اپنے لائف پارٹنر میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا چاہتی ہیں؟" وہ سنجیدہ تھے۔

ماہین کو جیسے اچنبھا ہوا تھا۔ جیسے اسے یاور علی خان سے اس انداز کی باتوں کی امید نہیں تھی۔

"خوبیاں جاننے کیلئے تو بہت زیادہ قریب رہنا ضروری ہے۔ دور دور سے تو بس اندازے ہی لگ سکتے ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں"۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"پھر بھی ایک باشعور انسان کے ذہن میں کوئی خاص خاکہ تو ہو سکتا ہے"۔ یاور علی خان کے پاس ایک ہی دلیل تھی۔

"نہیں کوئی خاص خاکہ نہیں۔ بس یہ کہ مجھ سے زیادہ قابل، مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور بے حد میچور ہو۔ وہ اس لئے کہ ماں کی کمی سے جو مسائل پیدا ہوئے انہوں نے مجھے اپنی عمر سے بہت آگے کر دیا ہے"۔ اس مرتبہ وہ خاصی سنجیدہ تھی۔

"ماں اور باپ، خاندان اس کے علاوہ"۔ یاور علی خان نے اس کے سامنے شاید پہلی بار کوئی لطیف سا مذاق کیا۔

"یہ سب تو ہیں آل ریڈی ہیں میرے پاس۔ اور بہرحال رشتے بننے کی لت ہوتی ہے"۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

یاور علی خان کی تنگ سی زندگی جہاں سے وہاں تک جھلملا اٹھی۔

"آپ نے ماں کی کمی کا ذکر کیا تو مجھے دھیان آیا۔ روشی میں تو اس قسم کی کوئی مجبوری مجھے نظر نہیں آئی۔ بس ایک بات اس میں بہت واضح ہے وہ ہے ضد"۔

یاور علی خان سگریٹ سلگانے لگے۔

"اس میں مجبوری اس لئے نہیں آئی کہ اس پاس اس کے پاس ہر طرح سپورٹ اور شیئر کرنے والے بے شمار لوگ موجود ہیں۔ آپ کے علاوہ"۔

"آپ طنز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کریں۔ خیر مجھے آپ کی یہ عادت تو گراں نہیں گزرتی"۔

"آپ نے تو شاید روز اول ہی سے مجھ سے برابری کی ٹھان لی تھی۔ اور مجھے اچھا حیران کیا تھا"۔

انہوں نے کمرشل کو کراچی دیکھ کر پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

"آپ ہمارے آفیسر نہیں ہیں۔ ہم دیا بستی کی رعایا نہیں ہیں۔ پھر جرات ہونے نہ ہونے کا کیا سوال؟ ہمیں کیونکہ کوئی گھٹن نہیں اس لئے یہی مسائل ہے ہمارا مستقل قیام"۔

وہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"روشی غیر ضروری لاڈ پیار اور احتیاط سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ بالکل ایسے جیسے کرسٹل کے ساتھ غیر ضروری احتیاط کی جاتی ہے مگر ایک روز وہ بھی ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ غیر ضروری کانشس ہو گئی ہے وہ"۔

"مگر کرسٹل دوبارہ جڑ تو نہیں سکتا"۔ یاور علی خان فکرمند نظر آئے۔

"وہ کرسٹل نہیں ہے انسان ہے"۔ ماہین مسکرا پڑی۔

"پتا نہیں کیسا مزاج ہے ہمارا جو ہمیں لاجواب کر دیتا ہے۔ جی چاہتا ہے اسے بہت قریب لے آئیں۔ اور بدلے میں خود اپنا لاجواب کر کے رکھ دیں"۔

یاور علی خان نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی مگر اس کے تاثرات دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ماہین کا دل دھک سے رہ گیا۔ پلکیں کانپ سی گئیں۔ ساری خود اعتمادی ہوا ہوتی محسوس ہوئی۔

"یہ آپ کی سوچ نہیں ہے، انجانا پن ہے"۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے نہایت وقار سے جواب دیا۔ جیسے کچھ

نہیں۔

"کسی کے ڈوپلیکیٹ سے بھی کسی کی سوچ بدلی ہے"۔ وہ مبہم سا مسکرائے۔

ماہین پر اچانک آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کی بدحواسی بے حد فطری عمل تھا۔

اسے دھیان آیا اس کے اور بادر علی خان کے درمیان بس ایک چھوٹی سی تپائی ہے۔ اسے بری طرح [illegible]

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بابرہ کو بھیجتی ہوں۔ وہ آپ کے کپڑے وغیرہ پریس کر دے گی"۔

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر آ گئی۔

وہ غور کرنا چاہتی تھی۔ یہ کیا ہوا ہے۔ یہ عام بات تھی یا خاص؟

بابر کی بات کا مطلب کچھ اور تھا۔ وہ کچھ اور بھی ہے۔

یا پھر یہ کہ وہ بھی تو نہیں زچ کر رہی ہے آخر انہوں نے کچھ نہ کچھ تو کہا ہی تھا۔

وہ تو بہت سادہ اور ذہین ہیں۔ حسِ لطیف تو شاید ان کے نزدیک بھی نہیں پھٹکی۔

مگر نہیں۔

مرد کچھ کر کر مکر جائے۔ وہ الگ بات۔

راہ دکھا کر راستہ بدل جائے۔ دوسری بات ہے۔

مگر مقابل بیٹھی عورت کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

اس لئے کہ جب عورت مرد کے مقابل ہو تو اس کا پورا وجود گویا 'آنکھ کان' سا ہوا ہوتا ہے۔

وہ سر جھٹکتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی۔

لاحول ولا قوۃ۔

اس نے اپنا تجزیہ پیش کر دیا۔

نہ خوشی تھی نہ رنج۔

نہ افسوس تھا نہ ملال۔

بس حیرت تھی۔ سوچ جیسے ایک مقام پر ٹھٹک سی گئی تھی۔

اس نے کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔ وہ کتاب لے کر باغ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ تیزی سے کمرے سے باہر آئی۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔

وہ بھی قدموں کی دھمک پر رک کر پیچھے دیکھنے لگا تھا۔

"اوہ..... آپ؟" اس نے گہرا سانس لیا۔

"کیا مطلب جناب؟" اس کا انداز خاصا روڈ تھا۔

"تم تو جیسے بڑے مردِ بحران ہو۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گی بس یہ بتاؤ۔ جھومر بھابی کراچی کیوں گئی تھیں۔ جبکہ ان کے میاں یہاں سر پھوڑ رہے تھے؟" وہ بولی۔

"وہ کراچی نہیں گئی تھیں"۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو کہاں گئی تھیں؟" اس کا انداز تند تھا۔

وہ خاموش رہا۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں؟" وہ مزید طیش میں آ گئی۔

"آپ بے شک پوچھتی رہیے۔ پوچھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر جواب دینا مجھ پر فرض نہیں"۔ وہ پرسکون انداز میں گویا ہوا۔

"کیوں فرض نہیں؟ جس سے سوال کیا جائے وہ جواب دینے کا پابند ہوتا ہے"۔

"کہاں لکھا ہے؟" وہ ذرا سا مسکرا دیا۔

"میرے سر میں"۔ وہ جھلا گئی۔

"ہاں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ وہاں لکھا ہوا ہو سکتا ہے"۔ وہ حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔

"اچھا زیادہ جلانے کی کوشش نہیں کرو"۔ وہ بھی تپ کے بولی۔

"آپ کیوں ہلکان ہو رہی ہیں؟" وہ زچ سا ہو گیا۔

"میں ہلکان نہیں ہوں گی۔ تو کیا کالا چور ہلکان ہو گا؟ کیا اول فول بول رہی تھیں۔ رات جھومر بھابی۔ چکر کیا ہے؟"

"مجھے پتا نہیں رات کیا بات ہوئی تھی"۔ وہ کتاب کھولنے لگا۔

"زیادہ انجان بننے کی کوشش نہیں کرو۔ تم ان کا وہ انداز ہضم کیسے کر گئے۔ سو اگلی (So ugly) سو چیپ۔ نان سنس"۔

اس نے حقارت سے کہا۔

"کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ کیوں بے چاری جھومر بھابی کو برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے۔ اپنے قیاس کو یقین بنا کر اپنی ذات کو دکھ دینا۔ وہ آپ کی طرح ذہین اور اتنی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ نظر انداز کر دیں اور اپنی دنیا میں گم ہو جائیں"۔

بادی نے کمال رسانیت اور مہربانی سے اسے سمجھایا۔

"میں ان کے الفاظ کی طرف تو دھیان نہیں دے رہی۔ ان کا انداز میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے"۔

"پلیز..... روشی بی بی۔ مجھے پڑھنے دیں۔ حویلی کی تمام خواتین میرے لئے محترم ہیں۔ اور مستقل قرب اور مستقل بعد میں حویلی کی کسی خاتون سے میرا کوئی نیا رشتہ استوار ہونے کا امکان نہیں اور نہ ہی میں ایسا چاہوں گا"۔

وہ اتنا کہہ کر صفحات الٹ پلٹ کرنے لگا۔

روشی ہونق بنی ساکت سی کھڑی رہی۔

"تم ... شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو۔ تم اس حویلی کے ملازم نہیں ہو۔ اور یہ کہ جب چھوٹی بی بی ایسی باتیں کر رہی تھیں تمہیں ٹوکنا چاہیے تھا۔ اپنی برتری کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔" وہ اسی سابقہ انداز میں گویا ہوئی۔

"جن کاموں سے نہ مجھے فائدہ ہو اور نہ ہی نقصان۔ میں ان میں کوئی رول ادا کرنا نہیں چاہتا۔"

اس نے اپنے مخصوص پرسکون انداز میں جواب دیا۔

"مگر تم یہ تو مانو کہ ان کا انداز غلط تھا۔" وہ اپنی جگہ اڑی ہوئی تھی۔

"ہاں ... میں یہ مانتا ہوں یہ سب انہیں زیب نہیں دیتا۔" اس نے بات ختم کر دی۔

"تو بس مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ مگر تم یہ ضرور جتا دو کہ تم اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتے۔" روشی سینے پر بازو لپیٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

"میں جتا چکا ہوں۔" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"کب؟" روشی نے الجھ کر دیکھا۔

ہاری خاموش رہا۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے بھی وہ یہ حرکت کر چکی ہیں؟ اور کہاں؟" اس نے جرح کی۔

"آپ چھوڑیں اس قصے کو۔ جب بات ہی کوئی نہیں تو بات آگے لے جانے سے فائدہ؟" وہ تحمل سے کہہ رہا تھا۔

"مگر مجھے بہت غصہ ہے۔ میں ایک بار ان کی کھنچائی کروں گی ضرور۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔" وہ غالباً ابھی تک بھڑک رہی تھی۔

"مرضی ہے آپ کی۔" وہ کتاب پر نظریں دوڑانے لگا۔

"اچھا ایک بات اور بتاؤ۔" وہ اسی زاویے سے کھڑی ہوئی تھی۔

"پوچھیں۔ پوچھنے میں کیا جاتا ہے؟" اس نے کتاب سے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"تمہارا بندھن حویلی کی کسی خاتون سے کیوں نہیں بندھ سکتا۔ بابا صاحب مجھے کہہ رہے تھے۔ تم حویلی کے ملازم نہیں ہو۔" وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"یہ ان کی شفقت و محبت ہے کہ وہ ایسا سوچتے ہیں۔ مگر مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔"

اس نے ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔

"تمہیں اپنی حیثیت منوانے کی کوشش کرنا چاہیے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"مجھے جو حیثیت حاصل ہے وہ بہت ہے۔ جس کے لیے میں خان کا بہت مشکور ہوں۔" اس نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

"شاید تم میں ہمت کی کمی ہے۔" اس نے چوٹ کی۔

"شاید۔" ہاری نے کمال بے نیازی سے جواب دیا اور سامنے دیکھنے لگا۔

"تم اس طرح سے ... تم بچے تو نہیں ہو۔" وہ شاکی ہو کر گویا ہوئی۔

"یہ دوری بھی زیادہ اچھی بات ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ "اس میں تو تمہاری جیت ہے۔"

"ستی کی ہے وہ لاکھوں والی۔ اس نے تمہیں جیت لیا۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ تم صرف اس کی وجہ سے ادھر ادھر نظر نہیں ڈالتے۔" روشی نے زبردستی شوخی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ چوہدری کی عنایت ہے کہ اس نے مجھے پسند کیا۔ وہ تو خود اتنی خوبیوں کی مالک ہے کہ اس کا ساتھ کسی کیلئے بھی فخر کا باعث ہو سکتا ہے۔" ہاری نے مسکرا کر اس کی سمت دیکھا۔

روشی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

"کیا کیا خوبیاں ہیں اس میں، ہم سے کہیں بڑھ کر ہیں؟" وہ اپنا غصہ چھپا گئی۔

"نہیں ... یہ تو بتایا نہیں جا سکتا۔ یہ تو قائل ہے۔ بلکہ جب تک آنکھوں سے نہ دیکھے اس کی خوبصورتی نہیں کھلتی۔ اس کی چال تو بہت خوبصورت ہے۔" ہاری ہنس دیا۔

"ہونہہ ... جب اتنی خوبیوں کی مالک ہے تو پھر تمہیں الو بنا رہی ہے۔ اس کے اور طلب گار نہیں ہوں گے؟" وہ تیکھی ہو رہی تھی۔

"اگر الو بنا رہی ہے تو بھی مجھے الو بننا پسند ہے۔ اتنی دلکش لڑکی کے ہاتھوں۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"اگر وہ تمہارے ہاتھ نہ آئی؟" اس نے ایک اور سوال داغا۔

"تو کیا ہوا۔ زندگی کامیابی اور ناکامی کے سلسلوں کا نام ہے۔" وہ اس کی سمت دیکھنے لگا۔ مسکراہٹ ہنوز ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

"تمہیں دکھ تو ہوگا؟" اس نے نظریں چرا کر پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ بالکل فطری بات ہے۔ مگر جب دکھ ملیں تو برداشت کرنا چاہیے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہمت ہے تم میں؟" وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تو پھر اسے چھوڑ دو۔"

"آپ کے حکم پر اتنی اچھی چیز نہیں چھوڑی جا سکتی۔ آخر زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"زبان دی ہے تم نے اسے؟" اس کی آواز آہستہ تھی۔

"ظاہر ہے ... فلرٹ تو نہیں کر رہا۔ اب میں پڑھ سکتا ہوں؟" اس نے جیسے اجازت طلب کی۔

"ہونہہ۔" روشی جلدی سے پلٹ گئی۔

ہاری کتاب تھوڑی کے نیچے لگائے اسے دیکھتا رہا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے لال خان اسے تیار ہونے کیلئے کہہ کر گیا تھا کہ عارف کے ہاں چلنا ہے۔ وہ عجیب گومگو کیفیت میں تیار ہو رہی تھی۔ اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اندر سے خاصی خوشی محسوس کر رہی ہے۔ وہ اپنے احساسات سے خوفزدہ ہو گئی۔ خوبصورت ساڑھی اس نے نکالی تھی واپس رکھ دی۔ اور عام سا گھر میں پہننے والا سوٹ استری کرنے لگی۔ جیسے اپنے آپ سے احتیاط کر رہی ہو۔

وہ شادی کے بعد سے بہت اہتمام سے تیار ہوتی تھی خواہ کہیں بھی جانا ہو۔ مگر آج وہ بہت سادہ تھی۔ جانے کیوں اسے اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے چادر اوڑھ کر وہیں کمرے میں بیٹھ گئی۔ اور لال خان کا انتظار کرنے لگی۔

"ارے تم تیار نہیں ہوئیں؟" لال خان کمرے میں آ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"کپڑے بدل تو لیے ہیں"۔ وہ بیزاری سے بولی۔

"کیا اور کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس؟ عارف کی ماں تمہیں پہلی بار دیکھے گی۔ کیا کہے گی۔ میرے بارے میں کیا سوچے گی کہ تمہیں کپڑے لا کر نہیں دیتا"۔ لال خان نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

"کیا کپڑے دکھانے جا رہے ہیں آپ۔ میرا دل نہیں چاہ رہا"۔ وہ بھی تنگ سے کہہ گئی۔ لال خان چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا تمہارے دل کو؟" وہ فکر سے پوچھ رہا تھا۔

"دل کا کیا ہے۔ کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی اپنے بس کی بات ہے"۔ وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ چلو۔ ایسے ہی چلو"۔ لال خان نے بڑی جلدی ہتھیار ڈال دیے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بانو پرس اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

گاڑی گھر سے باہر کھڑی تھی۔ اس نے گیٹ کو تالا ڈال دیا۔ لال خان گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ بھی اس کے پہلو میں آ بیٹھی۔

راستے بھر ان کے درمیان عجیب سی خاموشی حائل رہی۔

تقریباً چالیس پچاس منٹ پر محیط فاصلہ تھا۔

وہ ایک نئی بستی میں آ گئے تھے۔ جہاں دور دور تک قیمتی سی فلیٹ نظر آ رہے تھے۔

وہ ایک شاندار عمارت کے سامنے رک گئے تھے۔ عارف کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر ہی تھا۔

لال خان نے کال بیل کا بٹن پش کیا۔ تقریباً دو منٹ بعد آٹومیٹک دروازہ وا ہوا۔ سامنے ہی عارف کھڑا تھا۔

"آ ہا۔۔ آپ"۔ وہ لال خان کے گلے لگتے ہوئے بانو سے مخاطب تھا۔

"بہت بے ایمان ہو بغیر بتائے چلے آئے۔ جی چاہتا ہے تم سے بات بھی نہ کروں۔ بے وفاؤں کو ابھی تک پیار کرتے ہو۔ یاروں کی پروا بھی نہیں کرتے"۔ لال خان نے شکوہ کیا۔

اے میرے جوش جنون عشق تیرا شکریہ
تو نے جو بخشی تھیں وہ رسوائیاں اچھی لگیں

وہ لال خان کو تھامے ہوئے اندر چلا گیا۔ بانو بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔

سامنے ہی تخت پر ایک نہایت ضعیف عورت بیٹھی آنکھیں سکیڑ کر آنے والوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"السلام علیکم اماں کیسی ہیں آپ؟" لال خان نے قدرے نزدیک ہو کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔ لال خان ہے نا"۔ عارف کی ماں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ٹھیک پہچانا اماں!" لال خان پہچانے جانے پر بہت خوش نظر آیا۔

"اور یہ ساتھ میں کون ہے؟" عارف کی ماں نے پھر دوسری جانب توجہ کی۔

"آپ کی بہو ہے۔۔ بانو سلام کرو"۔ وہ اس کی طرف پلٹا۔

"السلام علیکم اماں"۔ بانو نے یوں سلام کیا گویا اسے سلام کرنے کیلئے لال خان کے حکم ہی کی ضرورت تھی۔

"ادھر پاس آ بیٹی۔۔ مجھے دور سے صاف دکھائی نہیں پڑتا"۔ بڑی بی نے اسے پاس بلایا۔

"کتنے دکھ کی بات ہے عارف بھائی۔ آپ کی ماں کی یہ حالت ہے اور آپ ان کی خاطر بھی خود کو نہیں سنبھالتے"۔ بانو نے ملامت آمیز انداز میں عارف کو مخاطب کیا۔ اور بڑی بی کے پاس بیٹھ گئی۔

"ارے بھابی۔ سو طرح کی دلیلیں تو ہمارے دماغ میں بھی آتی ہیں۔ بس مگر۔۔ وہ کیا کہیں کہ

درد تو جو کرے ہے جی کا زیاں
فائدہ اس زیاں میں کچھ ہے؟

"آپ نہیں سمجھیں گی یہ میاں۔۔ مگر کوئی مجبوری ہی مجبوری ہے"۔ وہ ہنس دیا۔

اتنے میں بوڑھی پٹھانی اندر آئی۔ مگر مہمانوں کو دیکھ کر وہیں دروازے پر رک گئی۔

"آؤ بہار۔۔ کوئی کام؟" عارف نے اسے مخاطب کیا۔

"کچھ اسرار اصل کیا ہے۔ اماں سے معلوم کرنا ہے آج کیا پکے گا"۔ اردو بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"آج کچھ نہیں پکے گا۔ مہمان آئے ہیں۔ سب کچھ باہر سے آئے گا۔ اس لیے کہ شاید ہمارے ہاں کا پکا ہوا بھابی کو پسند نہ آئے۔ یہ بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں"۔ عارف نے لاپرواہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ پٹھانی واپس پلٹ گئی۔

"کیوں تکلف کرتے ہیں عارف بھائی"۔ بانو شرمندہ سی ہو گئی۔

"یہ یہاں سارے کام کرتی ہے؟" لال خان کا اشارہ پٹھانی کی طرف تھا۔

"ہاں اماں کیلئے رکھا ہے۔ اب اس کی کام کرنے کی عمر نہیں۔ آنکھوں سے بھی کم دکھتا ہے"۔ عارف نے جواب دیا۔

"کھلونوں سے بہلا رہے ہیں اماں کو۔ کوئی مستقل انتظام کیوں نہیں کرتے اماں کیلئے"۔ بانو نے فوراً ہی ٹوک دیا۔

"ارے بی۔۔ اس غم میں تو ہم دو گز زمین میں ہو گئی۔ پرائے کوئی احساس نہیں۔ یہی دکھ مجھے کھائے جاتا ہے"۔ بڑی بی

آواز بھرا گئی۔

"آپ کو اپنی ماں کے جذبات کا خیال کرنا چاہیے عارف بھائی۔ کتنی بری بات ہے"۔

بالو بڑی بی کے آنسوؤں سے ایک دم ہی موم کی طرح پگھلنے لگی۔

"انسانوں کو انسانوں سے شکایتیں تو رہتی ہی ہیں۔ کیا کر لیجئے۔ اگر میں اماں کی بات مان لوں تو انہیں کچھ اور شکایتیں ہو جائیں۔ اس لئے میں ان سب باتوں کی پروا نہیں کرتا"۔ عارف نے اپنی مخصوص بے نیازی سے جواب دیا۔ "کیا کہا ہے شاعر نے۔

وہ فرشتے آپ تلاش کیجئے کہانیوں کی کتاب میں!!
جو برا کہیں نہ برا سنیں، کوئی ان سے خفا نہ ہو

"کیوں لال خان؟" وہ مسکرا رہا تھا

لال خان بھی جواباً ہنس دیا۔ "کوئی کوئی شعر تو تمہارا ہماری سمجھ میں آ ہی جاتا ہے"۔

"دیکھ لو...... اس طرح باتوں میں اڑا دیتا ہے۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میری تو گزر گئی۔ بس اسی کا خیال آتا ہے۔ کیا اکیلا ہو جائے گا میرے بعد۔ گھر میں بہو ہوتی۔ بچے کھیلتے"۔ بڑی بی نے آزردگی سے کہا۔ "آل اولاد ہو تو نام چلتا ہے"۔

"لائی تو تھیں تم...... اسے تو تمہارے جذبات کا اتنا خیال تھا کہ پہلے بندوبست کر کے آئی تھی"۔ عارف کا قہقہہ جاندار تھا۔

"بالو کھسیا سی گئی۔ لال خان عارف کے ساتھ شریک تھا۔

"بس یہ اسی کو پیٹنے جائے گا۔ لوگ ایک جوڑا (بیوی) کے بعد دوسری نہیں کرتے؟" بڑی بی کو غصہ آ گیا۔

"چھوڑو اماں! ان باتوں کو۔ گھر میں بہت اچھے مہمان آئے ہیں۔ یہ جو بھابی ہیں نا، میری بہت ہی خدمت کرتی ہیں۔

اور بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کچھ کمی سی محسوس ہو رہی ہے آپ میں"۔ عارف اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔

بالو کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ حالانکہ وہ تو اپنی دھن میں تھا۔

مگر شاید اس کے اندر کوئی چور راستہ پیدا ہو گیا تھا۔

ناپسندیدہ ترین حالات میں انسان خود کو بالکل ہی اکیلا تصور کرنے لگتا ہے۔ ناپسندیدہ قرب نے گویا اسے امر بیل بنا دیا تھا۔ جو ساتھ کھڑے ہوئے پیڑ پر ہی چڑھ جانا چاہتی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔

"گرمی بھی تو بہت پڑ رہی ہے دلہن! سوتی کپڑوں ہی میں گھٹن پڑتا ہے۔ خیر سے دو جی سے تو نہیں ہو"۔

بالو کو بہت حیا آئی۔ وہ خاموش رہی۔

"دعا کرو اماں! سونے میں تول دوں گا اسے"۔ لال خان نے بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔

بالو اس بھولے اور کھلے سے انداز پر کٹ کر رہ گئی۔ ایک عارف ہے بڑی سے بڑی بات کتنی نفاست سے کر جاتا ہے۔ ہم جیسوں پر بھاری پڑنے لگتی ہے۔

"یہاں وہ کون تھی۔ جس کے پیچھے عارف بھائی کی یہ حالت ہے؟" مریم کا تجسس عروج پر پہنچ گیا۔

"بس کیا بتاؤں بیٹی۔ کوئی خاندانی تو تھی نہیں۔ بہت بڑی حویلی میں کنیز تھی۔ اللہ نے حسن بہت دے دیا تھا۔ اس میں ہوا لیکن یہ اتفاق ہے بڑی چلتا پرزہ تھی۔ یہ تو کم عمر اور سیدھا سادہ۔ جان کو روگ لگا بیٹھا۔ ہزار ایک تو کمبخت کا حسن، اس پر حویلی کی عورتوں کی تھی اترن۔ نخت سی پھرتی تھی۔ جانے کس کس کا ستیاناس کیا ہوگا۔ میرا بچہ تو نکل گیا میرے ہاتھوں سے۔ اس مٹی کمینی کی"۔

بڑی بی کے زخم گویا ہرے ہو گئے۔

"آپ حویلی میں رہتی تھیں؟"

"ارے نہیں بیٹی! اپنا ادھاری تھا میرا مرد گاؤں میں۔ بس آنا جانا تھا حویلی میں۔ کرم علی...... ذات کی کنیز...... پتا نہیں کیا سمجھتی تھی اپنے آپ کو"۔ بڑی بی کے لہجے میں کھولن در آئی۔

"کیا نام تھا اس کا؟" بالو کا تجسس اب کمال پر تھا۔

"بھلا سا نام تھا۔ چھوڑئیے۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں...... چائے...... آ رہی ہے چائے پیجئے۔ بہت اچھی چائے بناتی ہے ہماری بھابی"۔

عارف نے ایک دم اندر آ کر ماحول یکسر بدل دیا۔ بالو نے ایک گہرا سانس لیا۔ یہ اس کا تجسس کبھی بھی مٹنے نہیں دے گا۔ [illegible] رہتا ہے۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

لال خان عارف سے اپنی کاروباری باتوں میں مشغول ہو چکا تھا۔

وہ کسی کام کی دھن میں بڑی تیزی سے لاؤنج میں آئی تھی۔ وہاں یاور علی خان نعمان کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔

نگاہیں یونہی بے ساختہ اٹھ گئی تھیں۔ جیسے بازار میں بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے کسی سے بھی چار ہو جاتی ہیں۔

مگر اس کا وہاں رکنا دوبھر ہو گیا تھا۔ ایک دم ہی نئے احساس سے دو چار ہوئی تھی۔

"کہاں غائب ہیں بھئی۔ نہ چائے نہ ٹھنڈا"۔ نعمان نے ماہین کو مخاطب کیا۔

"مجھے پتا نہیں تھا آپ لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ ابھی بھجوا دیتی ہوں"۔ اس نے شرمندگی سے کہا اور واپس باہر جانے لگی۔

"رہنے دیجئے۔ ابھی میرا موڈ بھی نہیں...... باہر جا رہا ہوں اتفاقاً دو چار کام نمٹانے ہیں۔ روشنی کیلئے بھی دو چار چیزیں لینی ہیں"۔ یاور علی خان نے اسے روک دیا اور وہ رک بھی گئی۔

"ماہین......!" یاور علی خان نے اسے مخاطب کیا۔

"جی"۔ وہ نظر اٹھانے کا حوصلہ نہ کر سکی۔

"آپ تیار ہو جائیں، ذرا میرے ساتھ چلیں۔ میں نے ابھی روشی کی شاپنگ نہیں کی۔"

"مگر آپ کیوں کر رہے ہیں؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"آپ نے بیٹی کو قریب جو کر دیا ہے۔" وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔

"ہاں... ہاں... تو چلی جاؤ نا۔ یوں بھی تم کہیں نکلتی نہیں ہو۔" نعمان نے بھی اس سے پرزور انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے... میں تیار ہو کر آتی ہوں۔"

یاور علی خان نے اپنی سرخ آنکھیں ایک لمحے کو اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ کہ مرد پہ جھپک کر کئی بار عورت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اسے اگلے مرحلے کی تیاری کرنا ہوتی ہے۔

"آپ کتنا ٹائم دیں گے؟" ماہین آگے بڑھتے بڑھتے رک کر پوچھنے لگی۔

"جتنا مرضی لے لیں۔" وہ برجستہ بولے۔

"میرا مطلب ہے آپ لیٹ تو نہیں ہو جائیے۔" وہ مڑ کر نعمان کی طرف دیکھنے لگی۔

جواب میں صرف یاور علی خان نے اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔

ماہین کا دل پھر لٹک گیا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ پونچھا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

وہ دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ماہین گم صم سی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اور وارڈروب کھول کر خالی خالی نظروں سے کپڑوں کو دیکھنے لگی۔ پھر آہستگی سے ایک سرخ کاٹن کا سوٹ نکال لیا۔

کپڑے بدلنے میں اسے بمشکل تین منٹ لگے ہوں گے۔ میچنگ وہ کرتی نہیں تھی۔ صرف ہم رنگ چپل البتہ اس نے پاؤں میں ڈالی تھی۔ لپ اسٹک لگاتے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔

عورت کی تیاری میں بھی عجب سے بھید پوشیدہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ دل کئی بار روک چکا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ

اب تو کنواری بھی نہیں۔

اب خوش گوار بھی نہیں۔

تو پھر یہ سب کیا؟

جانتی ہو تمہاری سب سے بڑی بہن ان کے نکاح میں تھی۔

پتہ ہے۔ ان کی بیٹی بیاہنے کی عمر کو آ گئی ہے۔

خیر ہے۔ وہ تم سے کتنے بڑے ہیں؟

اس نے جھنجھلا کر لپ اسٹک کا ڈھکن زور سے بند کیا۔ انہوں نے مجھے کہا ہی کیا ہے۔ میں کیوں اتنی کانشس ہو رہی ہوں۔ بعض اوقات فطرتاً بھی تو ہو جاتی ہے۔

وہ اسٹول سے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور پرس ہاتھ میں لے لیا۔ بیڈ پر پڑی ہوئی چادر جلدی جلدی سمیٹ کر وہ باہر آ گئی۔

"چلیں؟" اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

نعمان نے جیب ٹٹول کر چابی نکالی اور یاور علی خان کو تھما دی۔ یاور علی خان اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر باہر پورچ کی طرف نکل گئے۔

مرد ذرا سی بھی بصیرت ہو تو وہ عورت کی تیاری کے انداز سے اس کے دل کا بھید جان سکتا ہے۔ اسی لئے شاید انہیں اس کی طرف بار بار دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ دل پریشان سا بھی تھا کہ وہ ساتھ چل تو پڑی ہے۔ امتحان آ پڑا تو کیا کرے گی۔

یاور علی خان گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

وہ اندر بیٹھ گئی۔ مگر ایک دم چپ چاپ۔

"آپ کو راستوں کا پتہ ہے...؟" اس نے کسی دھیان سے چونک کر ان سے پوچھا۔

"آپ ساتھ تو ہیں۔" بڑے سادہ انداز میں جواب آیا تھا۔

اس کا دل تو اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شروعات ہی مشکل تھی۔

یوں بھی کوئی خیال سارے حواس پر غالب ہو تو ہر بات اسی کا پرتو محسوس ہوتی ہے۔ گاڑی گلی شاہراہ پر آ گئی تھی۔

"کراچی میں ڈرائیونگ بہت مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ ڈرائیور اچھا خاصا اعصابی مریض بن سکتا ہے۔" یاور علی خان ایک سگنل پر ٹھہرتے ہوئے گویا ہوئے۔

"جی۔" ماہین نے مختصراً تائید کی۔

"آبادی کے لحاظ سے یہاں کی پلاننگ صحیح طور پر نہیں ہے۔" وہ پھر گویا ہوئے۔

"جی..." اس بار بھی اس کا جواب مختصر تھا۔

"ایک زمانہ تھا کہ یہ شہر سکون کے لحاظ سے آئیڈیل ہوا کرتا تھا۔"

"جی۔" ماہین کے منہ سے پھر "جی" ہی نکلا۔

"اچھی تبدیلی ہے۔ آخر آپ میری جی حضوری پر اتر آئیں۔" وہ مبہم سا مسکرائے۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ "جی" سے بہتر کوئی جواب میرے پاس نہیں۔" وہ قدرے جھینپ گئی۔

"مگر آج سے پہلے تو آپ کو مجھ سے شدید اختلاف رہا ہے۔" وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے گویا ہوئے۔

"تو ان باتوں پر آج بھی ہے۔ مگر اختلاف کا مطلب ہمیشہ کا اختلاف نہیں ہوتا۔"

"اچھی بات ہے۔ اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔ مجھے آگے سہولت رہے گی۔" یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ یاور علی خان نے اس کی

بات کاٹی تھی۔

وہ باقی بات منہ میں ہی دبا کر رہ گئی تھی۔

"کس قسم کی سہولت؟" اس نے زبردست شعوری کوشش کے بعد آخر کار اپنا اعتماد بحال کر لیا۔

"بتائیں گے ___ کیا آپ کو جلدی ہے؟" وہ آنکھوں پر سن گلاسز چڑھاتے ہوئے بولے تھے۔ آواز پہلے ہی سپاٹ تھی۔

"نہیں ___ بھلا مجھے کیوں جلدی ہوگی؟ جب آپ کا موڈ ہو تو بتا دیجئے گا ___ اچھا بتائیں رشی کیلئے آپ کیا لیں گے؟" اس نے کمال مہارت سے بات کا رخ موڑ دیا۔

"کچھ نہ کچھ تو لیں گے لیکن اصل تو یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ سے دلوائیں۔ کیونکہ مجھ سے تو وہ خفا رہتی ہے"۔ وہ دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔

"تو آپ کو اس کی خفگی دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے"۔ اس نے فوراً مشورہ دیا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی کوشش کا حصہ ہے۔ مگر شاید آپ کو یقین نہ آئے"۔ وہ ایک جدید شاپنگ سنٹر کی طرف گاڑی کا رخ موڑتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میں سمجھی نہیں"۔ وہ جان بچانے کو انجان بننا چاہ رہی تھی۔ اس لئے کہ ابھی وہ خود پر بھی واضح نہیں تھی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں سمجھا سکتا ہوں"۔ انہوں نے فراخدلی سے پیشکش کی۔

"ابھی موڈ نہیں کلاس لینے کا"۔ اس نے شرارت سے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔

وہ مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

"جب آپ نہیں سمجھیں گی تو کیسے سمجھیں گے اوپر والے؟ بتائیں آپ آخری بار کب ہنسے تھے"۔ ماہین پھر موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گئی۔

یاور علی خان کے چہرے پر اچانک سرد مہری جھلکنے لگی۔ "ہنسنا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے، آپ کوشش کر سکتی ہیں"۔ ان کی آواز بھی بے تاثر تھی۔

"یا اللہ"۔ وہ بات پلٹ پلٹ کر عاجز آ چکی تھی۔ وہ تھے کہ پھر اس کے لئے نئی بات نکال رہے تھے۔

"میں تو بہت کوشش کرتی ہوں جب بھی آپ سے ملاقات ہوتی ہے"۔

اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ "پتا نہیں کیوں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے اپنے آپ پر خول چڑھا رکھا ہے اور خول بھی اتنا مضبوط کہ توڑنا مشکل"۔ اس نے قدرے جھجکتے ہوئے بالآخر کہہ دیا۔

"آپ میں کمال ہیں۔ آپ لوگوں کے خول توڑ سکتی ہیں"۔ ان کا انداز سرد اور بے تاثر تھا۔

"خیر ___ چلیں، پہلے کچھ لے لیتے ہیں۔ واپسی میں ضروری بات کریں گے"۔ انہوں نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی روک دی۔

"ضروری بات"۔ ماہین کو نئے سرے سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆

سب سے پہلے وہ ایک دستکاری بوتیک میں داخل ہوئے تھے۔

سامنے ہی ڈیپ گرین سلک کی ساڑھی پر نظر پڑی تھی جس پر سرخ موتیوں کا نہایت نازک کام ہوا تھا۔

"کیسی ہے یہ ساڑھی؟" انہوں نے پلٹ کر ماہین کی سمت دیکھا۔

"بہت خوبصورت۔ کیا رشی ساڑھی پہنے گی؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"میں آپ کیلئے کہہ رہا ہوں"۔ ان کا انداز بالکل سادہ تھا۔

"میں ___ میرے لئے؟ مگر میں نے تو کبھی ساڑھی استعمال ہی نہیں کی۔ ہمارے ہاں عموماً شادی شدہ خواتین ہی استعمال کرتی ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔

"تو لے لیتے ہیں بعد میں استعمال کر لیجئے گا"۔ ان کا انداز وہ بدستور تھا۔

"لیکن اتنی جلدی کیا ہے؟" اس نے ان کی بات مکمل ہوتے ہی جلدی سے کہا اور مسکراہٹ کے پردے میں اپنی گھبراہٹ چھپائی۔

"بعض اوقات کوئی اچھی چیز مس ہو جاتی ہے، پھر نہیں ملتی۔ کیا آپ کو اعتراض ہے؟"

انہوں نے ملبوسات پر نظریں دوڑاتے ہوئے سرسری سا اسے بھی دیکھا۔
"نہیں بھلا اعتراض کی کیا بات؟ یہ آپ کی فضول خرچی ہے جبکہ ضرورت بھی نہیں"۔
اس نے دھیرے سے نفی کر کہا۔
"جب چیز موجود ہوتی ہے تو اس کے استعمال کی جگہ بھی نکل آتی ہے۔ آپ اسے میرا اصرار سمجھئے"۔ یاور علی خان نے سیلز گرل کو اشارے سے پیک کرنے کیلئے کہا۔
ماہین یک دم چپ سی ہو گئی۔
"یہ وہائٹ ڈریس دیکھئے۔ یہ روشی جیسی سوادی لڑکی کو بہت سوٹ کرے گا۔ بہت خوبصورت ڈیزائننگ ہے"۔ وہ ایک طرف اشارے سے بتانے لگے۔
"جی"۔ وہ بس جی کر کے رہ گئی۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ آپ خاصے چھپے رستم ہیں، سب کچھ پتہ ہے آپ کو"۔ وہ ہنس دی۔
"ہاں تو میں نے کب کہا کہ مجھے کچھ پتا نہیں"۔ وہ بہت سنجیدگی سے جواب دے رہے تھے۔
"ظاہر ہے آپ بھی کرتے ہیں"۔ وہ دھیرے سے بولی۔
"تو پھر لے لیں یہ"۔ وہ اس کی طرف دیکھتے گئے گویا اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔
"ضرور روشی بہت خوش ہوگی۔ اسے یہ ضرور پتہ ہے کہ یہ آپ کی پسند ہے"۔ ماہین نے نظریں چرا کر کہا۔
"آپ کتنی جینئس ہیں تو بتا دیں گے لیکن ایسا کیوں کرنا چاہیے"۔ وہ پوچھنے لگے۔
"آپ کی جانب سے محبت کا اظہار اسے خوشی سے پاگل کر دیگا"۔ وہ مسکرائی۔
"بہتر"۔ وہ مخصوص انداز میں مسکرا دیے۔
"آپ اس کے علاوہ بھی دیکھئے ہمیں اسے بہت زیادہ خوش کر دینا چاہیے"۔ وہ دائیں طرف مڑتے ہوئے بولے۔
"ہاؤ اسٹرینج"۔ اس نے خوش دلی سے شانے اچکائے۔
"نہیں تو ایسی بھی کوئی بات نہیں اکلوتی بیٹی ہے میری"۔ انہوں نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے جواب دیا۔
"بیٹا بھی اکلوتا ہے"۔ ماہین نے یاد دلایا۔
"ہاں مگر وہ میرے ساتھ باہر جاتا رہتا ہے۔ اس کی پسند کی شاپنگ کرا دیتا ہوں"۔ انہوں نے اسی انداز میں جواب دیا۔
ماہین کو اس قدر واضح جواب ملنے کے بعد قدرتی طور پر خاموشی اختیار کرنا پڑی۔
تین سوٹ ایک فراک ایک ساڑھی پیک کرا کر وہ باہر آئے۔
"تقریباً بیس منٹ انڈین قونصلیٹ کے پاس صرف ہوں گے۔ آپ گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کر لیں گی؟" وہ گاڑی کا

دروازہ کھولتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے۔
"شیور۔ ظاہر ہے یہ بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں"۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
یاور علی خان نے اندر بیٹھ کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ سامان پیچھے ڈال کر بیٹھ گئی۔
قونصل خانے میں وہ بیس کے بجائے چالیس منٹ میں فارغ ہو کر باہر آئے تھے۔ چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ جو ان کی اندرونی الجھن کا مظہر تھیں۔
"کیا آفیشل پرابلم؟" ماہین نے سرسری نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔
"ہوں۔ یہ پرابلم تو ہوں گی۔ ٹینشن بھی تو مستقل چل رہی ہے"۔ وہ گاڑی ریورس کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
"آپ کہاں چلیں گے؟" اس نے بات کا رخ موڑا۔
"کہیں نہیں بس گھر چلیں گے"۔ انہوں نے اسی الجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔
ماہین نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔
وہ خاصی دیر خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے۔
"میں نے آتے ہوئے آپ سے کہا تھا کہ کوئی ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔ آپ کو یاد ہے؟"
انہوں نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔
ماہین نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔
"مجھے یاد ہے"۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔
"دراصل میں بہت دنوں سے الجھ رہا ہوں اب کہنا چاہتا ہوں"۔
وہ سگنل پر نظر جمائے ہوئے بہت دھیمی آواز میں مخاطب تھے۔
"جی۔۔۔ جی ضرور کہیے"۔ وہ بے ساختہ بولی تھی۔
"میں شادی کرنا چاہتا ہوں"۔
سگنل کھل گیا تھا گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔
ایک لمحے کو ماہین کے سارے حواس معطل ہو کر رہ گئے۔ بظاہر جملے میں اس کے متعلق تو کوئی بات نہ تھی' مگر پچھلے دو دنوں میں وہ جن کیفیات سے گزر چکی تھی۔ اس حساب سے تو یہ "بم بلاسٹ" تھا۔ اسے آنے والے لمحات سے خوف آنے لگا۔
"یہ کوئی بری بات نہیں اگرچہ اس بارے فیصلے میں خاصی تاخیر ہو گئی"۔
اس نے بہت سوچ سوچ کر نپا تلا انداز اختیار کیا۔
"جب ہوا ہو وہی فیصلے کا وقت ہوتا ہے"۔ انہوں نے برجستہ کہا۔
"تو کہیے"۔ اس نے تھوک نگلا گویا کڑوا گھونٹ حلق سے نیچے اتار رہی ہو۔
"میں اجازت نہیں مانگ رہا۔ ایک شخص سے مودبانہ پرمیشن کا پابند تھا اور وہ ہیں بابا صاحب اور وہ اجازت دے چکے

لیا"۔ انھوں نے چہرہ موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔

"پھر آپ میں کیا رول ادا کر سکتی ہوں"۔ وہ فوراً خود کو سنبھال چکی تھی۔

"آپ کا تو بڑا اہم رول ہے"۔ ان کے انداز میں بہت مضبوطی تھی۔

ماہین کا دل ایک مرتبہ پھر اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"بابا صاحب ہری پور آئے تھے۔ جب میں اور روشی یہاں سے واپس گئے تھے"۔

"انھوں نے آپ کے نام سے ایک پیغام دیا ہے"۔ وہ بالکل سپاٹ انداز میں مخاطب تھے۔

"جی۔۔۔۔ میرے نام"۔ اس نے بے ساختہ ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"انھوں نے آپ سے معلوم کیا ہے آپ میرے بچوں کی محبت میں کتنا آگے جا سکتی ہیں؟" یاور خود حیران ہو گیا۔

ماہین چند لمحے خاموش رہی جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ یاور علی خان بہت سکون سے اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔

"محبتوں کو ایکسپلائٹ کرنا بالکل بھی اچھی بات نہیں ہوتی"۔ آخر کار اس نے زبان کھولی۔

"بہت ساری وجوہات اکٹھی ہو کر کسی رشتے کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ مگر وہاں ہی ایکسپلائٹ کرنے کی وجوہات ہوتی ہیں۔ اور محبت بہت ہی کمزور ہوا کرتی ہے"۔ یاور علی خان نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"وہ محبت جو مجھے بچوں سے ہے؟" ماہین نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"اس کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے"۔ برجستہ جواب آیا۔ اس کی نظریں جھک کر رہ گئیں۔

"کمال کی حساس طبیعت رکھنے والا مرد جسے دوسروں کے حواسوں پر چھا جانے کیلئے ذرا محنت نہ کرنا پڑتی ہو، جس کے نرم لہجے اور خوشگوار نظر کو خوش قسمتی کا پیامبر سمجھا جاتا ہو۔ اس کی طرف سے اس طرح کا انداز اور جواب حواس معطل کر دینے کو تو تعجب کیا ہے۔

خاصی دیر گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ وہ اپنے اعصاب پرسکون کرنے کی کوشش میں لگی رہی اور تھوڑی دیر میں کامیاب بھی ہو گئی۔

"آپ بچوں کو بیچ میں نہ لاتے تو زیادہ بہتر تھا"۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"بات کا کوئی آغاز بھی ہوا کرتا ہے، ابھی تو آغاز کیا ہے، بات آگے بھی بڑھے گی۔ میں تو آپ کے حوصلے کو دیکھتے ہوئے خاصا متاثر ہوں"۔ انھوں نے اچٹتی سی نظر اس کے پریشان سے چہرے پر ڈالی۔

"اگر آپ بھی تجزیہ کر سکتی ہیں کہ میرے بچے عمر کی وہ حدیں پار کر چکے ہیں جس کو بنیاد بنا کر دوسری شادی کی جاتی ہے"۔ ان کی سنجیدگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔

"پھر"۔ اس نے سر جھکا کر پوچھا۔

"پھر کیا اس سے تو ساری صورتحال واضح ہو جاتی ہے اور آسانی سے جواب دیا جا سکتا ہے خواہ حق میں ہو یا خلاف"۔

ماہین سر جھکائے خاموشی سے کچھ سوچتی رہی۔

"اگر جواب آپ کی خواہش کے مطابق نہ ہوا تو آپ کی جاگیردارانہ طنطنہ کو ٹھیس تو نہیں پہنچے گی"۔ ماہین نے خاصے پرسکون انداز میں ان سے کلام کیا تھا۔

"ہاں مگر مجھ میں برداشت کا مادہ ٹھیک ٹھاک موجود ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں"۔

"میں اس وقت کسی بھی طرح کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ شاید آپ کو انتظار کرنا پڑے"۔

"میں کر سکتا ہوں"۔ یاور علی خان نے اس کی طرف ایک لمحے کو دیکھا۔

"ویسے آپ سوچیں گی کیا؟ ابھی کر دیا کیجئے گی۔ جوان بچوں کے باپ سے شادی کیوں کی جائے۔ کیا تھا، عمر کا فرق بہت ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ وہ"۔ یاور علی خان مزید گویا ہوئے۔

"نہیں میں اپنا حساب کتاب رکھتی ہوں۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں۔ وہ تمام معاملات جو انسان کی زندگی پر مستقل اثرات ڈالتے ہوں انہیں دنیا یا زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اتنی بچی بھی نہیں ہوں کہ دوسروں کے زیر اثر رہ کر فیصلے کروں"۔

ستائش کا ہلکا سا تاثر یاور علی خان کے چہرے پر نظر آیا۔

"جواب کیلئے میں آپ سے رابطہ نہیں کروں گا بلکہ بابا صاحب آپ سے اور ضرورت پڑی تو نعمان سے بات کریں گے"۔

"آپ کو ڈر لگتا ہے؟" وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"ڈر تو سب ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو صرف اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے"۔

وہ کسی گہرے خیال سے چونک کر بولے۔

ماہین ہر طرح سے خود کو پرسکون کر چکی تھی۔ اس میں یاور علی خان کا بھی خاصا حصہ تھا۔ انھوں نے اتنی بڑی بات جس اسلوب سے کی تھی۔ اس کا اندازہ ماہین پہلے سے نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے ذرا بھی نظروں سے یاور علی خان کو دیکھا مگر وہ ذرا سامنے دیکھنے لگی۔ اسے ان کے پراسرار اور مقناطیسی اثر سے خوف سا آ گیا تھا۔

وہ اسے شروع دن سے ہی نیا جہان محسوس ہوئے تھے جسے دریافت کرنے کی خواہش بے ساختہ بیدار ہوتی تھی۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ اس نے نہا دھو کر پنک کلر کا سوٹ زیب تن کیا، بال خشک کر کے ہلکا سا جوڑا بنایا۔ نہایت آرام دہ سیاہ لیدر کی چپل پاؤں میں ڈالی۔ ایک نظر آئینے میں خود کو دیکھا۔ بے ساختہ خود کو مسکراتا پایا اور اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔

ایک دم احساس آیا کہ ریسٹ واچ تو باندھی نہیں۔ کمرے میں واپس جانے کے خیال سے کوفت سی ہوئی۔ ایک لمحہ کو پھر سر جھٹک کر کوکو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دھڑ سے اندر ہو گئی مگر اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ سامنے ہی سرخ گھوڑے کی زین تھامے باری گھوکھر سے بات کر رہا تھا۔

دھڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

باری نے تو گھور سا اسے کر نظریں واپس موڑ لی تھیں البتہ گھوکھر نے دست بستہ سلام عرض کیا تھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے آگے بڑھتی گئی اور دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ایک لمحے کو رکی۔

"گھوکھر! ہم پیچھے جا رہے ہیں کوئی پوچھے تو کہہ دینا سو رہی ہیں۔ کوئی ملانے تو کہہ دینا جائے نماز پر بیٹھے ہوئے ہیں"۔ باری نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی مگر خاموش رہا۔

"چھوٹی آ گھوڑیاں تو پچھتاں نماز پڑھن لگ گئیاں"۔ بے چارے نے بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔ روشی نے دانت کچکچا کر اس کی سمت دیکھا۔

"باری! اسے سمجھا دینا"۔ اس نے خفگی سے کہا اور دروازے سے باہر نکل کر بہت بڑے ویران احاطے میں داخل ہو گئی۔

قدرتی طور پر باری سمجھ چکا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ عجیب سی الجھن اس کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ بظاہر وہ گھوکھر سے بات کر رہا تھا۔

روشی چلتے چلتے فوراً ہی ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ جمہور نیوی بلیو کرتے اور سفید پاجامے پر بڑا سا ازار بند سنبھالتی ہوئی بالکل آخری کوٹھڑی سے باہر نکل رہی تھی۔ اور باہر تالا لگا رہی تھی۔ تالا لگا کر اس نے چابی اپنے گریبان میں ڈالی اور بڑی بے نیازی سے بلکہ خود اعتمادی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی مگر روشی پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم"۔ روشی نے بڑی رسانیت کا مظاہرہ کیا۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہو؟"

جمہور نے جس شان بے نیازی سے حال دریافت کیا تھا۔ وہ بالکل نیا انداز تھا' پہلے جیسا۔ قدرے عاجزانہ اور بہت مشفقانہ انداز نہیں تھا۔

"کیسے آئیں؟"۔

"ایسے آئی ہوں"۔ اس کی نظریں اس کوٹھڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں' جہاں جمہور تالا لگا کر آ رہی تھی۔ "تو آپ باتیں کرتے ہیں"۔ جمہور اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"ہاں' خیر آئی تو اسی لیے ہوں۔ ظفری بھائی ہسپتال سے آ گئے؟" روشی جمہور کے پیچھے چل پڑی۔

"ارے کہاں' بی اماں تو قسمت ہمارے ساتھ ہے"۔ جمہور نے قہقہہ لگایا۔

روشی نے تعجب سے جمہور کی شکل دیکھی۔ اس سے قبل اس نے اسے کبھی قہقہہ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"کہاں گئی تھیں آپ؟ جو اتنا دل کر آئی ہیں؟" اس نے قدرے ناگواری سے پوچھا۔

"اچھا میں مدنی ہوئی ہوں' مجھے تو پتا نہیں چلا۔ ویسے یہ "تاؤ" پہیلی اچھی ہے باری"۔ جمہور کھلکھلائی۔

"بی اماں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا"۔ جمہور نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ روشی نے اس کے پیچھے پیچھے ہوتے جواب دیا۔

"کیوں بی اماں کیوں نہیں؟" جمہور خندہ سے نئے کمرے میں داخل ہو کر حریر و مشجر اوڑھے سوئے گویا ہوئی اور بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔

"اس لحاظ سے آپ کے ظفری بھائی کا شکریہ ادا کریں۔ کیا آپ تصور کریں گی اگر آپ کو ان تمام سہولتوں کے بغیر رہنا پڑ جائے؟" وہ ایک خوبصورت اور نازک کرسی کھینچ کر جمہور کے بیڈ کے قریب لاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"ساری سہولتیں تو دل کی ہوتی ہیں۔ ظفری موجود ہوں تو ارکنڈ شتر بھی جنت بن جاتا ہے"۔ اس نے قدرے لگی سے کہا۔

"آپ ظفری بھائی کے بجائے کس کو اس کمرے میں دیکھنا چاہیں گی؟" روشی نے معرکے کا آغاز کیا۔

"بڑا خوبصورت جواب ہے میرے پاس۔ خوبصورت اس لیے کہ اس کا دھیان میں آ جانا ہی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ سانس تک خوبصورت ہو جاتی ہے"۔

وہ یوں کھلکھلائی جیسے گدگدی ہو رہی ہو۔

"ہیم۔ ہیم۔ جمہور بھابی! آپ شادی شدہ ہیں' یہ سب آپ کو سوٹ نہیں کرتا"۔ روشی کے لہجے میں بلا کی آنچ تھی۔

"تم نے پڑھایا تھا میرا نکاح؟" جمہور نے استہزائیہ انداز میں دریافت کیا۔

"کسی نے تو پڑھایا ہو گا"۔ روشی نے خفگی سے کہا۔

"چلو میرا نکاح تو کسی نے پڑھا دیا ہو گا۔ ظفری کو نکاح کے بے آتے ہیں۔ کس قدر خود غرض ہو تم لوگ۔ مصلحتوں نے تمہاری آنکھوں پر کتنے موٹے موٹے پردے ڈال رکھے ہیں۔ سوچ کر بھی شرم آتی ہے"۔ جمہور نے بھی اس بار تلخی اختیار کیا۔

"مگر شادی کا جو پروسیس ہوتا ہے' آپ اسی پروسیس سے اسی ضابطے سے گھر میں آئی ہیں"۔ روشی نے اسے لاجواب کر دیا۔

"ٹھیک۔ خوب۔ نکاح دو افراد کے باہمی ہوش و حواس قبولیت کے عمل کا نام ہے۔ جس کے ہوش و حواس ہی معطل ہوں اس کا نکاح کیسا؟" جمہور نے مسکرا کر روشی کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مگر جو کچھ ہوا' آپ کے گھر والوں کی رضامندی سے ہوا۔ کسی نے آپ کی کنپٹی پر ریوالور تو نہیں رکھا تھا؟" روشی نے ماتھے پر بل ڈال کر سوال کیا۔

''اس سے بڑا بھی ایک اسلحہ ہے مگر سب سے بڑا بم ہے اسے روٹی کہتے ہیں' سارے اسلحے بیکار ہو سکتے ہیں پہلے اس کا پیٹ میں ہونا شرط تھا۔ کوئی فاقہ مست سرنڈر ہو سکتا ہے۔ ہتھیار اٹھا نہیں سکتا۔ گھڑی دو گھڑی ہاتھ اٹھا لے بھوک کا پیٹ روٹی روٹی۔ اس وقت کوئی اس سے پوچھے کہ کیا بم ہوا ہے تو وہ پوچھے گا سارے کے سارے جانے کے گا روٹی کا بم ہے۔'' جھومر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

''اتنا بڑا بم انہوں نے میرے باپ کے پیٹ سے باندھ دیا تھا' بے چارا کیا کرتا'' جھومر نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''جب آپ ہتھیار ڈال چکی ہیں تو پھر اس بحث کا مطلب؟ بالکل بے کار ہے اور جس راستے پر آپ قدم دھرتی ہیں وہاں دور تک اندھیرے بچھے ہیں۔ کیوں خود پر ظلم کر رہی ہیں؟''

روشی نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہتھیار تو ڈال دیے تھے مگر قید خانے کے قیدیوں ہی میں سفر کر شروع ہو گیا ہے'' جھومر نے گہرا سانس لے کر چھت کی طرف دیکھا۔

''ذہن کو ادھر ادھر بھی کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جس مقدمے میں جان نہ ہو اس پر بیٹھیں گنوانے کا فائدہ؟''

روشی نے بڑے دانشوارانہ انداز میں اسے سمجھایا۔

''وکیل اچھا مل جائے تو مقدمے میں جان پڑ سکتی ہے'' جھومر مسکرائی۔

''مگر آپ کو اس ماحول میں اچھا وکیل کبھی نہیں مل سکتا'' روشی نے اس کا امکان بھی مایوس کیا۔

''تم بن جاؤ'' جھومر نے اچانک اس سے خدمات طلب کر لیں۔

''وکیل بن سکتی ہوں مگر وکیل استغاثہ وکیل صفائی نہیں'' روشی نے بے دردی سے جواب دیا۔

''کیوں' بھلا تمہارا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ تم تو بہت آگے بہت جلتی ہو''۔

''یہ نہ پوچھیں' میں صرف یہی سمجھانے آئی ہوں کہ اپنی زندگی کو طوفان کے حوالے نہ کریں اس لیے کہ کچھ حاصل نہ ہوگا''۔

روشی نے اس کی بات کاٹ کر بہت سرد مہری سے جواب دیا۔

''مجھے اپنے معاملات طے کرنے دو مجھ سے ہمدردی نہ کرو'' جھومر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''یہ صرف آپ کے معاملات نہیں ہیں۔ آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے'' روشی نے رکھائی سے کہا۔ جیسے اب اس سے برداشت نہ ہو رہا ہو۔

''وہ تو پہلے ہی مشکلوں میں ہے اور پھر میں بدصورت بھی نہیں ہوں' اسے کوئی گھاٹا تو نہیں ہوگا''۔

''صورت سے کیا ہوتا ہے؟ بعض اوقات جب کوئی اچھا لگنے لگتا ہے تو اس کی وجہ صرف صورت نہیں ہوتی۔ بعض

وجہ تو انسان کی سمجھ میں خود بھی نہیں آتی کہ کوئی اسے کیوں اچھا لگتا ہے' کیوں پیارا ہو جاتا ہے''۔

روشی نے بڑے سکون سے جواب دیا تھا۔

''اچھا تمہارے لہجے سے تو بڑی تجربہ کاری جھلک رہی ہے۔ کون ہے وہ؟''

جھومر شرارت سے اسے گھورنے لگی۔

''ہے کوئی'' روشی نے بغیر جھجک کے جواب دیا۔

''ہائے کون ہے وہ خوش نصیب جو تمہیں جیت لے گیا'' جھومر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

روشی خاموش رہی۔

''حویلی ہی میں رہتا ہے؟'' جھومر بے حد مشتاق نظر آئی۔

''ہوں!'' روشی نے صرف ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا۔

''کون ہے؟'' جھومر اس کی طرف جھک آئی۔

''نہیں'' روشی نے دو ٹوک انکار کیا۔

''مگر حویلی کے سارے لڑکے ہی تمہارے کزن ہیں سوائے جواد کے'' جھومر الجھ کر بولی۔

''چھوڑیں آپ وقت آنے پر پتا لگ جائے گا'' روشی نے ٹال دیا۔

''مگر روشی تمہاری تو منگنی ہو چکی ہے'' جھومر کو یاد آیا تو اس نے چونک کر روشی سے سوال کیا۔

''جس طرح آپ اپنا نکاح نہیں مانتیں اسی طرح میں اپنی منگنی نہیں مانتی'' روشی نے برجستہ کہا۔

''بغاوت کرو گی؟'' جھومر کھلکھلائی۔

''ایسی ویسی دیکھئے گا آپ'' روشی بھی مسکرا پڑی۔

''وہ بھی تمہیں چاہتا ہے؟'' جھومر نے سوال کیا۔

''ابھی میں اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی۔ اس وقت تو میں آپ کو سمجھانے آئی ہوں وہ اس لیے کہ ہوگا کچھ بھی نہیں مگر کوئی خوامخواہ مارا جائے گا'' روشی نے فوراً بات کا رخ پلٹا۔

''تمہیں اس مارے جانے والے سے اتنی ہمدردی کیوں ہے' تمہاری بلا سے'' جھومر نے بے نیازی سے دوبارہ لیٹتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں آپ کے حسن بے مثال کے باوجود حویلی کا کوئی فرد آپ میں اس طرح کا اعتراض نہیں لے گا' وہ اس لیے کہ حویلی کی بہو ہیں۔ خواہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں'' روشی نے پاؤں پھیلا کر بیٹھے سے ٹکا دیے۔

''تم مجھے مت سمجھاؤ' اس لیے کہ تمہیں کچھ پتا نہیں'' جھومر عجیب سے سرور میں مسکرائی۔

''کیا نہیں پتا'' روشی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کچھ نہیں'' جھومر آنکھیں موند کر مسکرائی بڑے سحر انگیز انداز میں۔

''اس سے بڑا بھی ایک اسلحہ ہے مگر سب سے بڑا بم ہے اُسے روٹی کہتے ہیں' سارے فساد اسی سے پھوٹتے ہیں۔ پہلے اس کا پیٹ میں ہونا شرط تھا۔ کوئی فاقہ مست مزدور تو نہیں لڑ سکتا ہے۔ ہتھیار اٹھا نہیں سکتا۔ بھوکے کا پیٹ روٹی روٹی۔ اس وقت کوئی اس سے پوچھے کہ کیا بم ہوا ہے تو وہ پوچھے گا' سارے کے سارے روٹی کا بم ہے۔'' جھومر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

''اتنا بڑا بم انہوں نے میرے باپ کے پیٹ سے باندھ دیا تھا' بے چارا کیا کرتا۔'' جھومر نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''جب آپ ہتھیار ڈال چکی ہیں تو پھر اس بحث کا مطلب؟ بالکل بے کار ہے اور جس راستے پر آپ قدم رکھ چکی ہیں وہاں دور تک انگارے بچھے ہیں۔ کیوں خود پر ظلم کر رہی ہیں؟'' روشی نے سنجیدگی سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہتھیار تو ڈال دیے تھے مگر قید خانے کے قیدیوں ہی میں سفر کر شروع ہو گیا ہے۔'' جھومر نے گہرا سانس لے کر چھت کی طرف دیکھا۔

''ذہن کو اِدھر اُدھر بھی کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جس مقدمے میں جان نہ ہو اس پر بحثیں کرنے کا فائدہ؟''

روشی نے بڑے دانشورانہ انداز میں اسے سمجھایا۔

''وکیل اچھا مل جائے تو مقدمے میں جان پڑ سکتی ہے۔'' جھومر مسکرائی۔

''مگر آپ کو اس ماحول میں اچھا وکیل کبھی نہیں مل سکتا۔'' روشی نے اس کو امکان بھر مایوس کیا۔

''تم بن جاؤ۔'' جھومر نے اچانک اس سے خدمات طلب کر لیں۔

''وکیل بن سکتی ہوں مگر وکیل استغاثہ' وکیل صفائی نہیں۔'' روشی نے بے دردی سے جواب دیا۔

''کیوں' بھلا تمہارا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ تم تو بہت آگے' بہت چلتی ہو۔''

''یہ نہ پوچھیں' میں صرف یہی سمجھانے آئی ہوں کہ اپنی زندگی کو طوفان کے حوالے نہ کریں اس لیے کہ کچھ حاصل نہ ہو گا۔''

روشی نے اس کی بات کاٹ کر بہت سرد مہری سے جواب دیا۔

''مجھے اپنے معاملات طے کرنے دو' مجھ سے ہمدردی نہ کرو۔'' جھومر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''یہ صرف آپ کے معاملات نہیں ہیں۔ آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔'' روشی نے رکھائی سے کہا۔ جیسے اب اس سے برداشت نہ ہو رہا ہو۔

''وہ تو پہلے ہی مشکلوں میں ہے اور پھر میں بدصورت بھی نہیں ہوں' اُسے کوئی گھاٹا تو نہیں ہو گا۔''

''صورت سے کیا ہوتا ہے؟ بعض اوقات جب کوئی اچھا لگنے لگتا ہے تو اس کی وجہ صرف صورت نہیں ہوتی۔ بعض

وقت تو انسان کی سمجھ میں خود بھی نہیں آتا کہ کوئی اسے کیوں اچھا لگتا ہے' کیوں پیارا ہو جاتا ہے۔''

روشی نے بڑے سکون سے جواب دیا تھا۔

''اچھا' تمہارے لیے تو بڑی تجربہ کاری جھلک رہی ہے۔ کون ہے وہ؟''

جھومر شرارت سے اُسے گھورنے لگی۔

''ہے کوئی۔'' روشی نے بغیر جھجک کے جواب دیا۔

''ہائے کون ہے وہ' جو تمہیں جیت لے گیا۔'' جھومر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

روشی خاموش رہی۔

''حویلی ہی میں رہتا ہے؟'' جھومر بے حد مشتاق نظر آئی۔

''ہوں!'' روشی نے صرف ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا۔

''کون ہے؟'' جھومر اس کی طرف جھک آئی۔

''نہیں۔'' روشی نے دو ٹوک انکار کیا۔

''مگر حویلی کے سارے لڑکے ہی تمہارے کزن ہیں سوائے جواد کے۔'' جھومر اٹھ کر بولی۔

''چھوڑیں آپ' وقت آنے پر پتا لگ جائے گا۔'' روشی نے ٹال دیا۔

''مگر روشی تمہاری تو منگنی ہو چکی ہے۔'' جھومر کو یاد آیا تو اس نے چونک کر روشی سے سوال کیا۔

''جس طرح آپ اپنا نکاح نہیں مانتیں' اسی طرح میں اپنی منگنی نہیں مانتی۔'' روشی نے برجستہ کہا۔

''بغاوت کرو گی؟'' جھومر کھلکھلائی۔

''ایسی ویسی دیکھیے گا آپ۔'' روشی بھی مسکرا پڑی۔

''وہ بھی تمہیں چاہتا ہے؟'' جھومر نے سوال کیا۔

''ابھی میں اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی۔ اس وقت تو میں آپ کو سمجھانے آئی ہوں وہ اس لیے کہ ہو گا کچھ بھی نہیں' مگر کوئی خواہ مخواہ مارا جائے گا۔'' روشی نے فوراً بات کا رخ بدلا۔

''تمہیں اس مارے جانے والے سے اتنی ہمدردی کیوں ہے' تمہاری بلا سے۔'' جھومر نے بے نیازی سے دوبارہ لیٹتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں آپ کے حسن بے مثال کے باوجود حویلی کا کوئی فرد آپ میں اس طرح کا اعتراض نہیں لے گا' وہ اس لیے کہ حویلی کی بہو ہیں۔ خواہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں۔'' روشی نے پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے مت سمجھاؤ' اس لیے کہ تمہیں کچھ پتا نہیں۔'' جھومر عجیب سے سرور میں مسکرائی۔

''کیا نہیں پتا؟'' روشی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کچھ نہیں۔'' جھومر آنکھیں موند کر مسکرائی بڑے مستی بھرے انداز میں۔

روشی بہت گہری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"پھر بھی"۔ روشی مضطرب ہو رہی تھی۔

"کہا ناں ابھی کچھ نہیں۔ بس یہ کہ مجھے اس کی معمولی سی تکلیف سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کی گردن پر دائیں طرف زخم کا نشان ہے۔ مجھے اس خیال سے بھی تکلیف ہوتی ہے کہ ماضی میں کبھی اسے یہ زخم لگا تو اسے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی"۔

روشی کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ وہ ایک ٹک جھومر کو گھورنے لگی۔

اس نے تو آج تک اس کی گردن پر لگے زخم کا نشان نہیں دیکھا، جبکہ دن رات جانے کتنی بار گھورا ہوتا ہے۔

"آپ نے کیسے دیکھ لیا؟" روشی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کیا؟" جھومر نے تجاہل برتا۔

"زخم کا نشان"۔ وہ اندر سے بہت بگڑ چکی تھی، بظاہر خاصی پرسکون تھی۔

"بھئی بہت قریب سے دیکھا ہے ہم نے"۔ جھومر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"جتنے قریب کا تصور کر سکتی ہو کر لو"۔ وہ پھر کھلکھلائی۔

روشی یکلخت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے جھومر کے جملے میں بلا کی صداقت نظر آئی کہ ایک خنجر جگر میں پیوست ہو گیا ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔

"ارے کھڑی کیوں ہو گئیں، بیٹھو ناں"۔ جھومر نے اس کی سمت حیرانی سے دیکھا۔

"نہیں اب میں چلوں گی۔ اندر تلاش شروع ہو چکی ہو گی"۔ روشی نے رکھائی سے جواب دے کر آگے بڑھ کر جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

باہر آ کر اندازہ ہوا کہ واقعی وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ وہ طویل راہداری سے گزر کر اسی ویران احاطے میں آ گئی۔

معاً اس نے سفید شلوار قمیص میں ملبوس باری کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"کیا مصیبت ہے اتنی دیر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ گھر آپ کو جانے کتنی نمازیں پڑھوا چکا ہے۔ حد ہوتی ہے حماقت کی۔ وہاں کھانا لگا ہوا ہے۔ سارے ملازمین آپ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں"۔ وہ اس کے نزدیک آ کر جھلا کر بولا۔

"میں کیا کروں پھر؟" اس نے بے خوفی سے تنک کر کہا۔

"بتا دیتے بڑی امی کو کہ جھومر بھابی کے پاس ہوں"۔

"مگر وہ چچی آپ کو گھر کو چڑھا کر گئی تھیں، ورنہ مجھے بتانے میں کیا جاتا ہے، اب جلدی چلیں"۔

وہ اس سے آگے لمبے لمبے ڈگ بھر کر گھر کے کوریڈور میں داخل ہو گیا۔ جبکہ اس کی چال بے انتہا سست تھی۔

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

مسلسل چل چل جانے پر پاؤں تھکا گیا وہ حویلی کے گیٹ تک آ گئی۔

وہ گومگو کی کیفیت میں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے لیے یہ بڑا عجیب وقت تھا۔

"کتنی بری بات ہے عارف بھائی آپ کو یوں نہیں کرنا چاہیے"۔ اس نے دکھ اور الجھن کی کیفیت میں کہا۔

"ارے یہ تو ہوں یہ کوئی سوال تو نہیں مانگ رہا"۔

ایک بھی تو گناہ گار نہیں
پارساؤں میں گھر گیا ہوں

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں ہنس کر کہا۔

"اذل خان آ گئے تو کیا کہیں گے آپ کو اس حال میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا"۔

وہ واقعی پریشان ہو رہی تھی۔

"بہر حال آئیے"۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے اسے سہارا دینے کی نیت سے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ زحمت نہ کیجئے میں چل سکتا ہوں"۔

ازل کے دن سے ہوں آوارہ برگ کی صورت
ہوا میں بھی کوئی مجھ کو سنبھال رکھتا ہے

وہ آگے بڑھا تو وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ گیٹ بند کیا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا اور ایک صوفے پر گر گیا۔

وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی تھی اور گہری حد تک غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس دن وہ بہت غضب ڈھا رہی تھی۔ سیاہ ستاروں بھرا آنچل کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ اس دن اس نے بہت سے پھول بھی پہنے تھے۔ حویلی میں جشن تھا۔ ساری حویلی پر چراغاں ہوا تھا۔ بس رات کیا تھی، دن تھا۔ اس دن اس نے خود بھی ڈھیر سارے پھول پہنے تھے اور حویلی کی بیگمات کے لیے بھی گجرے بنائے تھے۔

تھا سراپا تیرا نظر میں یوں
رنگ شام و سحر کو بھول گئے

میں واپس آیا تو وہ پان کی گلوریوں پر چاندی کے ورق لگا رہی تھی۔ میں نے اسے دور سے دیر تک دیکھا۔ یوں لگتا تھا سارا جہاں اس کے سامنے ماند پڑ رہا ہو۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

"عارف! آج ساری رات گیت سناؤں گی مت سمجھے آج آنے کی کسی کڑی سے لگ کر بیٹھ جانا"۔ پھر وہ ہنس پڑی۔

تھی"۔

عارف آنکھیں موندے اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

"پھر سنا تھا آپ نے اس کا نام؟" بالو نے عجب سے دکھ میں دریافت کیا تھا۔

"ہاں سب نے تھے جب اس نے آخری گیت سنایا۔

مجھے آئی نہ جگ سے لاج

میں اتنے زور سے ناچی آج کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

تو میرا جی چاہا میں اسے اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوں۔ کتنی زندگی تھی اس کی آواز میں۔ میں اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ نازنین بیگم نے مجھے آواز دے کر چونکایا کہ عارف یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ کہا کہا تھا تم نے تمہاری طبیعت ٹھیک ہے وغیرہ وغیرہ۔" "نازنین بیگم" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"اس کا نام نازنین تھا؟" بالو نے چونک کر پوچھا۔

"ارے نہیں، وہ تو ہمارے مالکوں میں سے تھیں۔ اس کا نام تو اتنا خوبصورت ہے کہ اس پاس سنتے [illegible] تھی بھی"۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں موند لیں۔

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر

میرے تخیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے

یوں اچانک تیرے عارض کا خیال آتا ہے

جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے

"نازنین بیگم چلی گئیں اور مجھے وہیں نیند آ گئی۔ پھر میں چونک کر جاگا تو یوں کہ وہ میرا کندھا ہلا کر جگا رہی تھی۔ ساری محفل خالی ہو چکی تھی میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں نے کہا عالم اینڈ میں ہم بیٹھے ہیں جاگتے ہیں تو اطلاع بھی جا سکتی ہے" کیوں جگا دیا؟"

وہ پھر ہنس پڑی تھی۔ حالانکہ وہ تو ہنس نہیں سکتی۔

وہ بہت اونچی اڑان بھرتی تھی جیسے چاہتی تھی ویسے رہتی تھی۔ اس میں کنیزوں والی کوئی بات نہیں تھی۔"

"نام تو بتایا نہیں آپ نے اس کا"۔ بالو نے وہیں کھڑے کھڑے ٹوکا۔

"بہت سے نام ہیں اس کے۔۔۔ روشنی، گیت، خوشبو، کلی، پھول"۔

وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ پھر کچھ بولے گا مگر خاصی دیر ہو گئی تو اس نے ٹوکا۔

"اب کیا سوچ رہے ہیں؟"

ہم تھانے بہار ہوتے تھے۔ آہ۔۔۔

"بھائی! کیا میں یہاں سو سکتی ہوں؟" اس نے شفقت سے انداز میں پوچھا۔

"پاگل"۔ بالو نے کس دھیان میں تھی چونک کر بولی

اس کا دل دکھ کے احساس سے بوجھل ہو گیا۔ عارف کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔

"آپ رو رہے ہیں، مرد ہو کر"۔ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"پہلے انسان ہو کر"۔ عارف نے درستی کی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"کوئی ایسی بات ہو تو کہیں کر انسان رو پڑے"۔ اس نے چوکی کہہ دیا۔

ہمیں آج ساحل پہ رونے بھی دو

کہ طوفان میں مسکرانا بھی ہے

"کبھی کبھی ہو جاتا ہے بھائی، وقت اس طوفان سی زندگی میں ہم مسکراتے رہتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں"۔

اس نے بالو کی طرف سے کروٹ لے لی جس کا مطلب واضح تھا کہ اب آپ جائیں۔

بالو خاموشی سے پلٹ آئی۔ مگر وہ بڑی گہری سوچ میں تھی۔

اوپر سے آتے آتے عثمان کے بیٹے کی رخصت بھی آ گئی۔

حویلی کی لڑکیاں بن آئیں۔ ان رات تقریبات کی ارینجنگ میں مصروف ہو گئیں۔ روشنی کا تو دل ہر شے سے اچاٹ تھا سے پر تمام رونقیں کھل رہی تھیں۔

ابھی بھی وہ اپنے کمرے کی سرگرمیوں سے بیزار ہو کر باغ کی طرف آئی تھی۔ آخری سیڑھی سے اترتے ہی اس نے گیٹ سے جیپ داخل ہوتے دیکھی۔ اور یہ بھی کہ بابا جی ڈرائیور کے علاوہ اس میں یاور علی خان بھی تھے۔

ایک عجیب سی خوشی اس کے وجود میں اتر گئی۔ وہ چھوٹی بچی کی طرح دوڑتی ہوئی پورچ میں آ گئی تھی۔

یاور علی خان کے جیپ سے اترنے سے پہلے وہ پورچ میں پہنچ چکی تھی۔ یاور علی خان نے اسے دوڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا تو ان کے اندر بھی کوئی ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"السلام علیکم بابا۔۔۔ آئی ایم وری سوری مس یو"۔ اس کے انداز میں جو چہک اور گرمجوشی تھی۔ ان کے اندر [illegible] رہ گئے تھے۔

انہوں نے بے ساختہ اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"روشی۔۔۔ بیٹے۔۔۔ کوئی بات ہو گئی؟ مجھے یاد آیا تم تو مجھ سے ناراض بھی تھیں"۔

انہوں نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ وہ اس کے رونے سے بے حد پریشان ہو گئے۔

"بچھلے سے کوئی بھی زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا"۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ بہت صاف دل ہے ہمارے بیٹے کا"۔ وہ اس کا سر چوم کر مخصوص انداز سے ہنس دیئے۔

"پھر رو کس بات پر رہا ہے؟"

"کوئی ایک بات ہو تو کہوں"۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے؟" وہ نجانے کیسی کیسی باتیں پوچھ رہے تھے۔

"ہوں — کچھ"۔ بظاہر وہ بہت پرسکون اور سرد مہر تھے۔ مگر اندر سے اتنے ہی پریشان و مضطرب۔

"آپ ماریہ کو ہمیشہ کیلئے سرائے بھجوا دیں"۔

"وہاں کیا ہے؟" ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی حیرانی تھی۔

"چاہے کچھ نہ ہو۔ مگر بس اسے یہاں سے بھجوا دیں۔ ویسے بھی کاکا جان اسے بلواتے رہتے ہیں"۔

"تمہیں اس سے کیا لینا دینا ہے۔ میں ایسی غیر اہم باتوں میں الجھا نہیں کرتا۔ وہ یہاں رہے یا وہاں فرق کیا پڑتا ہے۔ خاص طور پر مجھے اور تمہیں"۔

انہوں نے اپنی مخصوص سرد مہری سے قطعی قسم کا جواب دیا۔

"یہ میری فرمائش ہے آپ سے پاپا۔ اسے منظور کریں۔ آپ یہ سب کر سکتے ہیں"۔

"بڑی لاحاصل سی فرمائش ہے ویسے تمہیں اس سے شکایت کیا ہے؟" اس بار انہوں نے بہت توجہ سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

"بہت ساری ہیں۔ مگر آپ اسے ڈانٹتے کیوں نہیں بس آپ اسے حویلی سے دور لے جائیں" اس نے ضدی سے لہجے میں کہا۔

یاور علی خان ملازمین کے سلام لیتے اپنے بیڈ روم کے دروازے تک آ گئے تھے۔

"بہت ساری شکایتوں میں سے کوئی ایک تو بتا دو۔ تاکہ بات کرنے کی کوئی بنیاد ہو"۔

وہ بیڈ روم میں داخل ہو گئے۔ روشی نے آگے بڑھ کر لائٹیں اور پنکھے آن کر دیئے۔

"بس مجھے وہ یہاں برداشت نہیں ہو رہی"۔ وہ بسور کر بولی۔

"اچھا دیکھیں۔ اس کیلئے تو کئی آپشنز ہیں۔ وہ سرائے نہ جانا چاہے تو کراچی جا سکتی ہے۔ وہاں جانا پسند نہ ہو تو آپ کے پاس مری بھی جا سکتی ہے۔ نہیں تو خیر آباد کے فارم کی دیکھ بھال کیلئے جا سکتی ہے۔ وہاں کا گھر، باغات کس قدر خوبصورت ہیں۔ وہاں وہ زیادہ خوش رہ سکتی ہے۔ اپنے گھوڑوں کو بھی وہاں لے جا سکتی ہے۔ کیوں؟"

وہ آپشنز پیش کر کے بہت مسرور نظر آ رہی تھی۔

"ہوں۔ مگر بابا صاحب مجھے تمہیں کہیں اور بھیج سکتے ہیں مگر اسے نہیں"۔

یاور علی خان کو اچانک دھیان آ گیا تھا۔ انہوں نے موضوع سے عدم دلچسپی ظاہر کر دی اور وارڈ روب کھولنے

لگے۔

"وہ تو بابا صاحب کو دانے ڈال کر کھلاتا ہے"۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

"وہ کام جو بابا صاحب کے بیٹوں اور پوتوں کو کرنا چاہئیں۔ وہ ماریہ کرتی ہے۔ اور جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ بابا صاحب ... ان کی تمام (Deeds) ڈیڈز (Deals) ڈیلز سے متعلق ایڈز کا کنٹرول بھی ... وہی بارہ دری کر گئے اعتماد۔ ویسے بھی وہ بڑا ہی فیملی ممبر"۔

"نہیں ہے وہ ہمارا فیملی ممبر۔ کیوں بے وقوف بناتے ہیں حویلی کے بزرگ اپنے ہی بچوں کو"۔ روشی کے انداز میں ہوا کی تھی۔

"ہم بھی سمجھتے ہیں"۔ یاور علی خان نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"تو پھر پوری طرح سمجھنا چاہیے"۔ وہ معاندانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ پوری طرح سمجھیں گے۔ خوش؟" وہ بات سمیٹنے کے انداز میں بولے۔ پیچھے سے بیٹھے ہوئے۔

اسی دم ملازم ان کا بریف کیس اور چھوٹا سا سوٹ کیس لے اندر داخل ہوا۔ انہوں نے جیب سے چابی نکال کر روشی کی طرف بڑھا دی۔

"سوٹ کیس کھولو"۔

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور سوٹ کیس کھول دیا۔

یاور علی خان اپنی جگہ سے اٹھے اور سوٹ کیس میں رکھے کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگے۔

روشی غور سے ان کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہی تھی۔

یاور علی خان نے کپڑے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیئے۔ "امید ہے تمہیں پسند آئیں گے"۔

روشی نے جلدی جلدی کپڑے پھیلائے۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"آپ لاہور گئے تھے پاپا؟" اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

"ظاہر ہے۔ بہر حال پسند تمہاری خاطر کی ہے"۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

"آپ کراچی گئے تھے؟" اس نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہوں۔ جاتا رہتا ہوں"۔ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"ماما ٹھیک ہیں؟" اس کا دھیان ماما ہی کی طرف چلا گیا۔

"بالکل ٹھیک ہیں"۔

"آپ مجھے لے کر کیوں نہیں گئے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"کسی جلدی میں گیا تھا دفتر میں بھی ضروری کام تھا"۔ انہوں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"اس بار بھی جلدی چلے گئے؟" اس نے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ابھی تو نہیں"۔ انہوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

"خالہ تو نانا جان کی باتیں کرتی رہتی ہوں گی۔ ہے نا؟"

"نہیں۔ اور باتیں بھی کرتی ہیں۔ وہ مجبور ہیں۔ خود کو سنبھال لیا ہے"۔ انہوں نے سگریٹ سلگانے کے دوران جواب دیا۔

"ہاں تجربہ تو وہ بہت ہیں۔ میں بھی ان جیسی بننا چاہتی ہوں۔ مگر بن نہیں پاتی"۔ اس نے سادگی سے اعتراف کیا۔

"تم ایسے ہی ٹھیک ہو۔ بننا بھی نہیں۔ مشکل ہو جاتی"۔ یار علی خان نے کش لگایا۔

"کیا وہ مشکل میں ہیں؟" اس نے معصومیت سے باپ کی شکل دیکھی۔

"نہیں ۔۔۔ کیونکہ وہ ایسی ہی ہیں"۔ یار علی خان نے دھوئیں کے مرغولے میں خالہ اماں کو دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ تو سچ ہے پاپا۔ نیچر از نیچر۔ پاپا۔ یہ ڈریسز بہت خوبصورت ہیں۔ مجھے بہت پسند آئے"۔ اس نے گلابی فراک خود سے لگا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھینکس"۔ انہوں نے گہرا کش لگایا۔

"چلیں میری پرابلم تو سولو (حل) ہو گئی"۔ اس نے پرسکون انداز میں کہا۔

"کیسی پرابلم؟"

"وہ اماں کے بیٹے کی برتھ ڈے ہے نا۔ سب لڑکیاں تیاریاں کر رہی ہیں مگر میرا سوٹ نہیں بن پا رہا تھا"۔

"کیوں سوٹ نہیں بن پا رہا تھا؟" انہوں نے اس کی شکل بغور دیکھی۔

"بس یوں ہی۔ بہت محتاج ہوں اپنے سوٹ کی"۔ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"اوہ اچھا ۔۔۔ خالہ کچھ کہہ تو نہیں رہی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"فی الحال تو کچھ نہیں کہا"۔ وہ سرسری سے انداز میں کہہ رہے تھے جیسے ان کا ذہن حاضر نہ ہو۔

"جی ۔۔۔ فی الحال کا مطلب؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ سوال بہت کرتی ہو۔ یہ بتاؤ اسٹڈی کیسی ہو رہی ہے؟" انہوں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہی ہے۔ پاپا! آپ خالہ کو ساتھ ہی لے آتے۔ وہ وہاں اکیلی بور ہوتی ہوں گی۔ ماموں تو پہلے ہی بڑے بیزار ہیں"۔ وہ ان کی کوشش ناکام بنا رہی تھی۔

"نیکسٹ ٹائم جاؤں گا تو کوشش کروں گا"۔

"انہوں نے آنے کی مجھ سے ملنے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی"۔ اس نے بڑی پرامید نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں خیر ۔۔۔ یاد تو بہت کرتی ہیں تمہیں"۔ انہوں نے اس کی تقویت کیلئے الفاظ منتخب کئے۔

"بہت کیوٹ سی ہیں خالہ۔ کیا امی ان سے بھی زیادہ کیوٹ تھیں"۔ اس نے کپڑے سمیٹنا شروع کر دیئے تھے۔

"میں کمپیئر نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا"۔ انہوں نے سرد انداز میں جواب دیا۔

"ایم ۔۔۔ سوری پاپا۔ مجھے احساس کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے آپ کو اس کے ذکر سے تکلیف ہوتی ہو گی"۔ اس نے شرمندگی سے کہا۔

"بہت زیادہ ہوتی ہے"۔ انہوں نے ڈھیر سارا دھواں اپنے سامنے پھیلا لیا۔

"آئی ایم رئیلی ویری سوری۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی"۔

"اچھا یہ بتائیے۔ آپ کتنے دن کیلئے آئے ہیں؟" اس نے خود ہی بات شروع کر دی۔

"کل صبح تک ہوں"۔

"آپ زیادہ دنوں کیلئے یہاں کیوں نہیں آتے"۔

"میری مصروفیات اجازت نہیں دیتیں"۔ انہوں نے دو ٹوک جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ تو ٹھیک ہی ہیں۔ مگر کاکا جان تو آتے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو کبھی ایک رات بھی نہیں ٹھہرتے۔ صرف ماما جان سے ملتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ آپ کے پاس بھی ہو کر جاتے ہیں؟"

رانی کپڑے سمیٹ چکی تھی۔

یار علی خان خاموش رہے۔

"پاپا"۔

"ہوں؟"

"پتا نہیں مجھے کاکا جان سے اتنا ڈر کیوں لگتا ہے۔ میں تو ان سے بات بھی نہیں کر سکتی"۔

یار علی خان اس مرتبہ بھی خاموش رہے۔

"حالانکہ وہ تو بابا صاحب سے 'بڑے بابا' آپ سے بھی لگتے ہیں۔ مگر انہیں ان سے تو عجیب ہی قسم کا ڈر لگتا ہے۔ کبھی سامنے آجائیں تو میں بھاگ کھڑی ہوتی ہوں"۔

وہ اپنی بات کہہ کر خود ہی ہنس دی۔

"وہ ایسے کیوں ہیں بالکل غیروں جیسے؟" اس نے معصوم سے انداز میں پوچھا۔

"اب تم باہر جاؤ گی تو ماما جی سے کافی کیلئے کہنا اور کہنا ڈسپرین بھی لیتی آئے"۔

وہ سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں بجھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

رانی ان کے سرد سے انداز اور اپنی بات نظر انداز کئے جانے پر کپڑے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے پاپا۔ آپ آرام کریں۔ سوری فار ڈسٹرب"۔

وہ بجھے بجھے انداز میں باہر نکل گئی۔ یار علی خان کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔

تقریب بہت بڑے پیمانے پر تھی کہ بابا صاحب کے پوتے کی سالگرہ تھی۔

یہاں سے وہاں تک انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آتا تھا۔ وہ پارک کے عین وسط میں ایک دو پہلے ہی گئے
روشی نے اپنے پیا کا لایا ہوا وائٹ ڈریس پہنا تھا۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا مگر چہرے پر گھبراہٹ تھی
کے باوجود اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ہتھیلیوں میں چہرہ لیے وہ ساکت بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔
اسی دم ہلکی سی دستک ہوئی۔

"ہوں"۔ اس نے ہنکارا بھرا اور وہ بھی بڑی بیزاری سے۔

دروازہ کھلا تو اس نے بغیر ہلے جلے صرف نظریں اٹھا کر دیکھا کہ کون آیا ہے۔

وہائٹ شلوار قمیص میں ملبوس سامنے ہادی تھا۔

"کون پوچھ رہا ہے مجھے؟" اس نے تلخی سے کہا۔

"کوئی نہیں"۔ اس نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔

"کون بلا رہا ہے؟" اس نے سابقہ انداز میں پوچھا۔

"کوئی نہیں"۔ اس کا انداز بھی ہنوز تھا۔

"پھر کیوں آئے ہو؟" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر ترشی سے پوچھا۔

"آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ آپ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اب تو کھانا بھی شروع ہو چکا ہے۔"

"شکریہ پوچھ لی خیریت؟ اب جاؤ اور آئندہ اب خیریت بھی نہ پوچھنا"۔

ہادی کے فریش سے چہرے پر لمحہ بھر کو سایہ لہرایا مگر اگلے ہی لمحے وہ نارمل ہو گیا۔

"کوئی بات ہو گئی ہے۔ ساری رونق چھوڑ کر اندر بند کمرے میں بیٹھی ہیں؟"

"اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں۔ کسی کے سر پر تو نہیں بیٹھی"۔ اس نے بڑے کڑوے انداز میں جواب دیا۔

"آپ سب کے ساتھ کھانا کھا لیجیے"۔ اس نے بہت رسانیت سے کہا۔

"بھوک نہیں ہے مجھے"۔

"جب باہر نہیں آنا تو تیار ہو کر کیوں بیٹھی ہیں؟" آخر اس نے کہہ دیا۔

اس نے نظر اٹھا کر ہادی کی طرف دیکھا۔ بہت دلکش سادہ سے ہیئر اسٹائل کے ساتھ وہ بلا کا جاذب نظر لگ رہا تھا۔ مونچھیں البتہ پہلے سے زیادہ گھنی محسوس ہو رہی تھیں۔ سفید بے داغ لباس میں وہ کسی بہترین مجسمہ حسن کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے بے ساختہ نظریں جھکا لیں۔

"تمہاری طرح کوئی بھی میرے کمرے میں آ سکتا ہے۔ مہمانوں سے گھر بھرا پڑا ہے"۔ اس بار اس کی آواز میں وہی سادگی اور دھیما پن تھا۔

"ٹھیک ہے آپ کی مرضی۔ مگر اس طرح ہونا نہیں چاہیے"۔ وہ جانے کے ارادے سے پلٹا۔

"ہادی... ایک منٹ"۔ اس نے پیچھے سے آواز دے کر روکا۔

"جی؟" وہ وہیں کھڑا ہو کر پوچھنے لگا۔

"تمہاری گردن کے پیچھے کی جانب کیا کوئی زخم کا نشان ہے؟" اس نے بغیر جھجکے اس کی سمت دیکھا۔

"شاید... مجھے دھیان نہیں۔ خیریت؟" وہ واقعی حیران ہوا۔

"ذرا آئینے میں دیکھ کر بتاؤ... ہے یا نہیں"۔ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"مگر کیوں؟" وہ قدرے ٹھٹکا۔

"پہلے دیکھو جو میں کہہ رہی ہوں"۔ اس نے تلخی سے کہا۔

ہادی آگے بڑھ کر اس کی ڈریسنگ ٹیبل تک آیا اور چہرہ اوپر کر کے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ گردن سے ذرا سا نیچے واقعی زخم کا نشان موجود تھا۔

"یہ پیچھے مل گیا۔ دراصل مجھے اس نے دھیان نہیں دیا کہ میں خود کو آئینے میں غور سے نہیں دیکھتا"۔ وہ سادگی سے مسکرایا۔

"اب آپ بتائیں آپ نے یہ نشان کب دیکھا تھا؟" وہ اس کے نزدیک چلا آیا۔

"دکھاؤ مجھے"۔ وہ اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ اور اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ہادی نے مسکرا کر کالر ایک طرف سے پیچھے کر دیا۔

تقریباً ایک انچ لمبا زخم کا نشان واقعی موجود تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر ہادی کی سمت دیکھا۔ وہ بغور اسی کو دیکھ رہا تھا۔ سیاہ گہری آنکھیں جانے کس جذبے کے تحت مسکرا رہی تھیں۔ روشی نے جھجک کر نظریں جھکا لیں۔

"بس یہ پوچھ کر مجھے کیسے پتا چلا۔ یہ بتاؤ کہ معصومہ بھابی کو کیسے پتا چلا؟"

وہ دوبارہ اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گئی۔

ہادی کے چہرے پر بشاشت سی چھا گئی۔

"یہ آپ کے مطلب کے موضوعات نہیں ہیں۔ آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ بہتر ہے باہر آ جائیں۔ ہو سکتا ہے موڈ چینج ہو جائے"۔

اس نے واپسی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"تم پہلے میرے سوال کا جواب دو پھر باہر جانا"۔ وہ ضدی انداز میں گویا ہوئی۔

"کہاں سے لگ گئے تھے معصومہ بھابی کو؟" وہ طنزیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ان صاحب سے پوچھیں۔ یہ ان کے معاملات ہیں"۔ اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

"میں تمہارا اچھا وہ حشر کروں گی۔ ہم پر ظلم کر کے سب کو بے وقوف بناتے ہو"۔ وہ دانت پیس کر بولی۔

"وہ تو پہلے ہی کر رکھا ہے۔" وہ زہریلی مسکرایا۔

"جھومر بھابی اب سے کچھ دن پہلے ایسی نہیں تھیں۔ کس بری طرح تمہارا ایکسپوز ہوا ہے۔ [illegible]
ہے۔ دامنوں پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہو۔ کتنے معصوم بنتے ہو پر کرتے ہو۔ اندر سے کتنے کھوکھلے ہو۔ میرا دل چاہتا ہے
عمر بھر تمہاری شکل نہ دیکھوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ہادی اپنی جگہ گم صم سا کھڑا تھا۔ اس سے بہتر نہیں کہ روشی نے یہ سب کہا تھا۔ جو ہر شریف انسان کیلئے [illegible]
ہو سکتا تھا۔ بات یہ بھی تھی کہ حویلی کے کرتا دھرتا افراد کو اس کی سن گن مل گئی تو؟ اس سے جھومر کا بے خوف اور کرائی
ابھی تو قیامت کی پہلی لہر روشی تک آئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر روشی کے قریب آیا۔

"آپ جو کہیں گی۔ اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں گی؟ اگر آپ یہ کریں گی تو مجھے حویلی کے کسی فرد سے کوئی گلہ
امید نہیں رکھنا چاہیے۔

میں مجرم کی طرح اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ نہ آپ مجھ سے اس طرح کی کوئی امید رکھیے گا۔" وہ تلملا کر وہاں سے
باہر نکل گیا۔

روشی نے سر اٹھا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے الفاظ ذہن میں دہرانے لگی۔ بلکہ ایک ایک لفظ پر غور کرنے
لگی۔

"کیا صفائی بے غیرتی ہے انا ہے؟" اس کا تجربہ کار ذہن الجھ گیا تھا۔

"جھومر بھابی بلاشبہ بہت حسین ہیں۔ ان کی شخصیت بہت اپیل کرتی ہے۔ اور پھر وہ ایک بے ضرر اور معصوم سے
انسان سے وابستہ ہیں۔ سب سے بڑھ کر خود بھی آمادہ ہیں۔ سو جان سے فدا ہیں۔ پھر نہیں کم تر تقریب اٹینڈ کر رہی ہیں
نہیں۔ ویسے ان کا تعارف تو ہے نہیں۔ ہو سکتا ہے اوپر اوپر سے دیکھتی ہوں۔"

وہ... اٹھ کر باہر آگئی۔ عجیب اضطراری سا انداز تھا۔

باہر آتے ہی آنکھیں جیسے چندھیا سی گئیں۔ حویلی کا تو انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ نوکرانیاں تو پھولوں سے لدی ہوئی نظر آرہی
تھیں۔

سامنے ہی آف وائٹ شیروانی میں خوش باش ابا نظر آگئے۔

"السلام علیکم ابا۔ مبارک ہو بیٹے کی سالگرہ۔"

"وعلیکم السلام۔ میرا بیٹا تمہارا کچھ نہیں لگتا؟" وہ مسکرا دیے۔ "لڑائی تو سب سے ہوتی ہوگی۔ بیٹے سے تو نہیں۔" انہوں نے
قہقہہ لگایا۔

"جی نہیں۔ میں لڑنے والی نہیں ہوں۔" اس نے منہ بنایا۔

"پھر کون سی والی نند ہو؟" وہ بہت خوش تھے۔ بات بے بات ہنس رہے تھے۔

"میں ابھی والی نند ہوں۔ انگلش نند ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔" وہ ذرا روٹھی سی بولی۔

"آہ... وہ... بھی وہ... ستارہ... یہ لو روشی تو بڑی حاضر جواب ہو گئی ہے۔" وہ اس کے پیچھے کھڑے کسی شخص
سے مخاطب ہوئے تھے۔

لاشعوری طور پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ مگر فوراً ہی دوبارہ ابا کی طرف رخ کر لیا تھا۔ پیچھے ہادی کھڑا تھا۔

"وہ صوری صاحب بہت دیر سے آپ کا پوچھ رہے ہیں۔" ہادی نے انہیں مطلع کیا۔

"کہاں بیٹھے ہیں؟ مجھے تو خود ان کی تلاش ہے۔ استقبالیہ ملاقات کے بعد تو وہ کہیں غائب ہی ہو گئے۔"

"سوری روشانے۔" وہ معذرت کر کے ہادی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

روشی خواتین کی طرف آگئی۔ مگر جیسے اسے دھچکا سا لگا تھا۔ سرخ پشواز اور سبز بھاری کام کے دوپٹے میں ملبوس
جھومر بڑی امی کے پاس بیٹھی تھی۔

پاؤں میں خوبصورت سی پازیب جو یقیناً سونے کی تھی۔ کلائیوں میں ابھری ان چوڑیاں اور کنگن۔ موتیے کے گجرے
گجرے۔ وہ بہت ساری نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ تو حویلی کی لڑکیوں کی جگمگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"آپ یہاں کیسے؟" وہ اسے طنزیہ دیکھتی تھی۔

"ہمارے میاں بچپن ہی سے دوسرے ملک میں رہے ہیں۔ آج کل باہر ہیں۔ ہم اپنے سسرال والوں کی فرمائش پر
تقریب میں شرکت کرنے آئے ہیں۔ ہمارے میاں کو گھر والوں سے خاندان والوں نے کبھی دیکھا تو کیا ہوا ہمیں تو دیکھا
جا سکتا ہے۔"

اس نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا۔ بڑی امی کی موجودگی میں یہ انتہائی ادب کی بدتمیزی تھی۔ اس پر سے نہایت کاٹ دار
طنزیہ انداز۔ اس نے فوراً بڑی امی کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

انگوری رنگ کے قمیص شلوار میں ہم رنگ سنہری کناری والے دوپٹے کو اپنے مخصوص انداز میں اوڑھے ہاتھوں میں
کانوں میں حسب توفیق سونا پہنے بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنی خاص وضع سے جلوہ افروز تھیں۔

انہوں نے جھومر کے انداز گفتگو پر بھی کوئی تاثر نہیں دیا۔ یوں بیٹھی تھیں گویا برف کی سل ہوں۔

مگر ان کی خاموشی سب کو حویلی کی لڑکیاں خوب سمجھتی تھیں اس لئے باوجود خواہش کے وہ جھومر سے کوئی خاص بات نہیں
کر پا رہی تھیں۔

"بڑی امی تو لڑانے پر تنگ بیٹی بیٹھی ہیں۔ جب انہیں ڈاکٹر نے نکال ہی لیا ہے تو فیضیاب بھی ہونے دیں۔" روشی
بڑبڑائی۔

"ڈاکٹر سے نہیں۔ ڈاک آپ سے۔" روشی نے گرہ لگائی۔

"چپ کرو۔ موت کو ڈرانے" کی جلدی پڑی رہتی تھی۔ اس نے عادت سے مجبور ہو کر ٹوکا تھا۔ ساتھ ہی بڑی امی کی چھوٹی بہن

تھیں۔

"تو بھلا۔ اب ہم آپس میں بھی باتیں نہ کریں۔ بکواس ہو رہی ہے"۔ یہ کومو عہ کا استائی پن تو گوارا گزرا تھا۔

"یہ جھومر بھائی کو آتے ہی اچھا سے زیور بڑی ای نے جو اکر دیے ہیں؟" تانیہ کو زیور غالباً زیادہ ہی پسند آ گئے تھے۔

"نہیں۔۔۔ ظفری بھائی ڈاکٹر کر لائے ہیں"۔ لالی کو اس کی بدعقلی پر تاؤ آ گیا۔ تانیہ قتل ہی ہو کر رہ گئی۔

"توبہ۔۔۔ کس قدر حسین ہیں"۔ روبی نے بے ساختہ کہا تھا۔ ان سب کو ہنسی آ گئی۔

"توبہ کس بات کی؟ حسین ہونا گناہ ہو سکتا ہے۔ حسن کی تعریف کرنا تو گناہ نہیں۔ تو بھلا نہیں کرنا چاہیے ہمیں تعریف"۔ روبو نے شریر انداز میں کہا تھا۔

اتنے میں گھو خاصی پریشانی میں ان کی طرف آ گئی تھیں۔

"ارے تم نے زری کو کہیں دیکھا؟"

"نہیں۔۔۔ ہم تو آج ایک ہی شے دیکھ رہے ہیں"۔ روبی نے ٹکٹکی باندھ کر مبہوت ہونے کی اداکاری کی۔

گھو نے اس کی نظر کا تعاقب کیا

"ہاں بھئی ضرور دیکھو، دیکھنے کے لائق ہیں۔ مگر مجھے فی الحال زری کا پتہ دو"۔ انہوں نے عجلت بھرے انداز میں کہا۔

"آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا؟ کمال ہے"۔ لالی ان کی بے نیازی پر واقعی حیران تھی۔

"خاصی دیر زیر اثر رہنے کے بعد ہوش و حواس میں واپس آئی ہوں"۔ انہوں نے مسکرا کر موحو کو گھوری ماری۔

"تم لوگوں کے اعصاب بحال کرنے کیلئے مرچوں کی دھونی دوں یہاں؟" وہ ہنسیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اتنے بھی کمزور اعصاب نہیں ہیں ہمارے۔ کہ مرچوں سے کم پر بات ہی نہ ٹھہرے۔ اب اتنی بھی حسین نہیں ہیں"۔ شعو نے نخوت سے ناک چڑھا کر اپنے مخصوص اسٹائل میں کہا۔

"پتہ نہیں۔۔۔ اندر دل بھی ہے یا نہیں۔ جھومر بڑا ہو تو بعد کا مسئلہ ہے"۔ روشی نے استہزائیہ انداز میں روبی کے کان میں کہا۔

"لو۔۔۔ اب ایسی بھی "بے دل" نہیں ہو سکتی ہیں۔ تو کیا بے چاری قرۃ پاور اسٹیشن سے چل رہی ہیں؟" تانیہ نے سرگوشی سن لی تھی۔

بے ساختہ ہنسی کی آوازیں ابھری تھیں۔

جھومر نے عجب حسرت آمیز انداز میں ان منتشر لڑکیوں کی طرف دیکھا تھا۔

پھر ایک سرسری نگاہ عالم تاب پر ڈالی تھی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اور اس دوران ان کی مخصوص چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ جھومر نے عالم تاب کے کان میں کچھ کہا۔ اور اٹھ کر پنڈال سے باہر نکل آئی۔ روشی تو پیشہ ور جاسوس کی طرح اس پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ فوراً ہی دوسرے رستے سے باہر آ گئی۔

جھومر حوض کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ جہاں بہت سے بچے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اور شور اور برکت جھومر کو بھی دیکھ گئے تھے۔ ایک حساب سے وہ قتل ہوئی تھی۔ مگر اس نے دیکھا جھومر نے ایک بچے کو بازو سے تھام کر ایک جانب اتار لیا۔ روشی اس سے خاصے فاصلے پر جامن کے درخت کے پیچھے کھڑی تھی۔ بے تحاشا روشنیوں کے باعث سب واضح تھی۔

اسے جانے کیوں حیرت نہیں ہوئی۔ جب اس نے بچے کے ساتھ ہاری کو آتے دیکھا۔ بس اندر کہیں خوش بہت ضرور ہوئی تھی۔

ہاری حوض کے پاس ایک ضرور آیا تھا۔ مگر سامنے دیکھتے ہی واپس پلٹ گیا تھا۔ روشی کو اس پر بے حد حیرت ہوئی تھی۔

وہ ان دونوں کے وہم میں گم ہو چکا تھا۔ جھومر اپنی چپل اتار کر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔

روشی الجھن کے عالم میں کھڑی رہ گئی تھی۔

"جھومر بھابی؟ اگر بے وقوف ہیں تو کیا ہوا۔ ہاری تو بے وقوف نہیں۔ ظاہر ہے انسان بھرے پڑے ہیں۔ کسی کی بھی نظر پڑ سکتی ہے"۔

روشی اپنی کھڑکی پر بڑے مطمئن انداز میں واپس بڑھ گئی تھی۔

"کیسے کیسے رنگ نکلے تمہارے۔ صرف صورت دیکھ کر ہی اپنا سب قربان کر دیا"۔ اس کے دل سے ہوک سی اٹھی تھی۔

"ہیلو۔ السلام علیکم۔ آپ کون؟"

"خان اللہ ورد علی خان بات کر رہا ہوں"۔

"عزت افزائی ہے میری"۔ نعمان کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ غیر متوقع امر تھا۔

"کیا حال ہے بیٹے آپ کا؟"

"شکریہ جی۔ بہت اچھا ہوں۔ دعا ہے آپ کی"۔ نعمان کی حیرت ہنوز قائم تھی۔

"ماہین بیٹی کیسی ہے؟"

"جی۔ وہ بھی اللہ کا کرم ہے۔ بالکل ٹھیک ہے"۔

"بیٹے بات یہ ہے کہ ہماری طرف سے ایک دو روز میں تمہیں تفصیلی اطلاع ملے گی۔ اس اطلاع کو بہت سکون اور تحمل سے پڑھنا اور الجھن سے مشورہ کر کے ہمیں اس کا جواب بھیجنا۔ ٹیلی فون اس لئے کر رہے ہیں کہ ذہن تیار رکھو۔ ہیلو۔ سن رہے ہو؟"

"جی۔۔۔ سن رہا ہوں۔ آپ فرمایئے"۔

"بس اور کچھ نہیں کہنا۔ بس اتنی ہی بات تھی۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔ وطن سیٹل ہو رہے ہو یا واپس یوکے جاؤ گے؟"

"واپس تو فی الحال جانا ہی ہوگا۔ جانا پاکا وہ بار چند مہینوں میں تو ادھر سے ادھر واپس نہیں ہو سکتا۔ آپ خود دیکھیے"۔

نعمان کا ذہن اب آنے والے خط کی طرف منتقل تھا۔ بظاہر دوسرے موضوع پر بات چیت کر رہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے اچھا۔ خیر۔ خدا حافظ"۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

نعمان کے ہاتھ میں ریسیور چند سیکنڈ تک جوں کا توں رہا۔

"کس کا فون تھا نعمان بھائی؟" ماہین کچن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے وہیں لاؤنج میں چلی آئی۔

"خان ولادر علی خان صاحب کا"۔ نعمان کے انداز میں ہنوز گہری سوچ کا تاثر واضح تھا۔

"ماہین چونک پڑی تھی۔ اس نے بڑی جانچتی نظر نعمان پر ڈالی تھی۔ اور اسے گہری سوچ میں مبتلا پا کر دل بھی دھڑکا تھا۔

"کیا فرما رہے تھے خان صاحب؟" اس نے لب و لہجے سے خاص تکلف ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں"۔ وہ اسی طرح سوچ میں گھرا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں"۔ ماہین نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ کہہ رہے تھے انہوں نے میرے نام کوئی تفصیلی خط لکھا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ خط تو انہوں نے کبھی میرے باپ کو نہیں لکھا۔ اب کیا معاملہ پیش آ گیا ہے"۔ اس کی الجھن بجا تھی۔

ماہین کا دل دھیرے سے سکڑا۔ سمٹا۔ پھر اسی قوت سے پھیلا۔

"چائے لاؤں آپ کیلئے؟" وہ واپس ہوئی۔

"لے آؤ"۔

"ویسے کیا تمہیں حیرت نہیں ہے؟" نعمان نے اس کے نارمل انداز کو بہت محسوس کیا تھا۔ وہ بہت تعجب سے اس کا بے نیاز رویہ جانچ رہا تھا۔ ولادر علی خان کا فون اور خط آنا کوئی عام بات تو نہیں تھی۔

فون آنے کے بعد سے ماہین ایک عجیب سے انتظار میں مبتلا ہو گئی تھی۔ حالانکہ نعمان تھوڑی دیر الجھ کر اپنے معمولات میں مگن ہو گیا تھا۔

"دو دن بعد ایک رجسٹرڈ لفافہ نعمان کے نام آیا تھا۔ نعمان گھر پر نہیں تھا۔ ماہین کا بس۔ پتا تھا کہ لفافہ چیر پھاڑ کر دے۔ اس نے لفافہ نعمان کے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور پھر کمرے میں جب بھی کسی کام سے گئی لفافے پر ایک نظر ڈالنا اپنا کوئی ضروری کام سمجھا۔

جانے کیوں کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ ذہن بس لفافے کی طرف ہی لگا ہوا تھا جیسے اس میں جانے کون سا آٹھواں عجوبہ برآمد ہو گا۔

شام ڈھلے نعمان گھر آیا تھا اور حسب عادت سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ماہین دم سادھے لاؤنج ہی میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ ہر دم یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نعمان نے اسے آواز دی ہو۔

کافی دیر گزرنے کے بعد بھی جب کچھ نہیں ہوا تو وہ دبے پاؤں دروازے تک آئی۔ دروازہ بہت آہستگی سے کھولا اور

اندر جھانکا۔ نعمان کمرے میں نہیں تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ماہین نے سائیڈ ٹیبل کی طرف دیکھا۔ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ لفافہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا۔ جلدی سے آگے بڑھ کے لفافہ اٹھا لے۔ مگر باتھ روم کی طرف دیکھ کر وہیں رک گئی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

"نعمان بھائی نے تو بڑے صبر و سکون کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیا لفافے میں کوئی خاص بات نہیں تھی؟"

وہ نعمان کیلئے چائے بناتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

عجیب عجیب سوچوں میں الجھے الجھے اس نے چائے بنائی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نعمان کے کمرے میں آئی۔

نعمان اسکارف کے انداز میں تولیہ گلے میں ڈالے وارڈ روب میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے انگلی سے دروازے پر دستک دی تھی اور اندر آ گئی تھی۔

نعمان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ماہین کی تمام حسیات نے محسوس کر لیا کہ اس نے بہت خاص نظروں سے ماہین کی طرف دیکھا تھا۔

"تم بھی آج تو چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔ آفس میں بہت مصروفیت رہی اس چائے پینے کی بھی مہلت نہیں ملی"۔ اس نے بشاشت سے کہا۔

ماہین نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ٹیبل پر کپ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو؟" نعمان نے تولیے سے سر رگڑنا شروع کر دیا۔

ماہین جلدی سے یوں بیٹھ گئی جیسے بیٹھنے کیلئے اسے واقعی کسی تاکید یا حکم کی ضرورت تھی۔

"کچھ آپ بہت تھک گئے ہوں گے"۔ اس نے بھائی کا چہرہ بغور دیکھا۔

"ہاں تھکن تو ہو جاتی ہے مگر۔۔۔ رات پڑی ہے آرام کرنے کیلئے"۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"جی"۔ ماہین نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"پاپا نے کام بہت پھیلا دیا ہے سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خط بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ جبکہ یہ لگتا ہی ایسا نہیں ہے"۔

ماہین بے صبر ہو رہی تھی جبکہ نعمان کو اپنے کاروباری جھمیلوں کا ذکر زیادہ ضروری لگ رہا تھا۔

"کھانا گھر پر ہی کھائیں گے ناں؟" اس نے خاصی سرد مہری سے پوچھا۔

"ہاں آج ہم صبح تک گھر پر ہی ہیں"۔ وہ مسکرایا۔

اس کے کسی انداز سے محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ خط میں کوئی غیر معمولی بات ہے۔ ماہین الجھن میں پڑ گئی تھی۔

"اور کیا کرتی رہیں سارا دن؟" نعمان نے چائے کا کپ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

"بس وہی روزانہ کے معمولات۔ بس ذرا آج لان کی صفائی کی تھی۔ اور اسٹڈی کرتی رہتی ہوں"۔

اس نے کرسی پر بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر اطمینان سے جواب دیا۔

"ہوں"۔ نعمان نے ہنکارا بھرا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"بابا چاہتے تھے کہ اب تم یوکے نہ جاؤ۔ بلکہ مستقل یہیں پاکستان میں رہو۔ اب مجھے نہیں معلوم تمہارا کیا ارادہ ہے۔ کیا سوچا ہے تم نے آگے کے بارے میں؟" نعمان نے اچانک بات شروع کر دی تھی۔ وہ چونک کر رہ گئی۔

"بابا تو یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کی شادی یہیں کر دی جائے پھر آپ اپنی دلہن کو لے کر یوکے چلے جائیں"۔ وہ بولی۔

"یہی کچھ انہوں نے تمہارے بارے میں سوچا تھا مگر فرق اتنا ہے کہ وہ تمہاری یوکے واپسی کے حق میں نہیں تھے ان کا خیال تھا تمہیں اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ یہیں رہنا چاہیے"۔ نعمان نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔

وہ خاموش بیٹھی ناخن کھرچتی رہی۔

"دلاور علی خان صاحب کا لڑکا آیا ہے"۔ نعمان نے آہستگی سے مطلع کیا۔

"جی وہ میں نے کھانے پر دیکھ لیا تھا"۔

"مجھے بڑی حیرت ہوئی ان کا لڑکا دیکھ کر..... شاید انہیں اس طرح کی بات نہیں کرنا چاہیے تھی"۔ نعمان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کس طرح کی بات؟" ماہین نے اطمینان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"انہوں نے یاور بھائی کیلئے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ ہے نا تعجب کی بات؟" نعمان بہت ہی سنجیدہ تھا۔

"کیوں؟ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟" اس نے بہت دھیمی آواز میں سوال کیا۔

نعمان نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ اور خاصی دیر دیکھتا رہا۔

"تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟" بالآخر وہ بولا۔

"اس سے پہلے بھی تو میرے رشتے آئے تھے"۔ ماہین نے اسی اطمینان کا مظاہرہ کیا۔

"مگر اس رشتے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ہمارے بہنوئی کا رشتہ ہے۔ دوسرے تمہاری اور ان کی عمر میں بہت فرق ہے۔ تیسرے ہم تو ابھی نازبہ کا صدمہ حل نہیں کر پائے"۔ نعمان نے دلائل دیئے۔

"نازبہ کے صدمے سے تو میں ہی آئی ہوں۔ رہی آپ کی یہ بات کہ عمروں میں بہت فرق"۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

نعمان بے تابی سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں ہاں بولو رک کیوں گئیں"۔

"انسان کی ایک ذہنی بھی عمر ہوتی ہے اور دوسری ذاتی۔ میں ان سے ذہنی فرق محسوس نہیں کرتی"۔ اس نے بہت مشکل سے کہا۔

نعمان خود پر قابو پانے میں مہارت نہ رکھتا تو شاید اچھل پڑتا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ماہین ہاتھ مسلتی رہی۔

"اگر کوئی کمٹمنٹ تھی تو مجھے آگاہ تو کیا ہوتا"۔ آخر کار وہ گم صم سے انداز میں گویا ہوا۔ ماہین خاموش رہی۔

"یہ ٹھیک ہے وہ واقعی بہت نائس ہیں ہر لحاظ سے اور قابل بھی بہت ہیں مگر اب حویلی میں دوسری بہن دینے کا حوصلہ نہیں ہے"۔

"اب وہ حویلی نازبہ کے زمانے کی حویلی نہیں ہے"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"مگر دلاور علی خان آج بھی وہی ہیں اور وہیں ہیں"۔ نعمان کو بہت الجھن ہو رہی تھی۔

"مگر میں نازبہ نہیں ہوں"۔ وہ قطعیت سے بولی۔

"یہ کیسا اعتراف تھا"۔ وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

"یعنی جانا کہاں رہی ابھی تو بات ہوئی ہے"۔ نعمان دھیمی آواز میں بولا۔

"میرا خیال ہے بات مکمل ہو چکی ہے"۔ وہ بھی بہت آہستگی سے گویا ہوئی۔

"مرضی تمہاری مگر جانے کیوں میں مطمئن نہیں"۔ الجھن کے آثار نعمان کے چہرے پر بہت واضح تھے۔

"آپ پریشان نہ ہوں بھائی۔ میں بچی نہیں ہوں۔ اور نہ حویلی والوں سے کسی طرح کم تر ہوں۔ مجھے ہر طرح کے انسانوں سے ڈیلنگ آتی ہے"۔

اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

نعمان حیران پریشان سا بیٹھا رہ گیا۔

نہ مجھ سے کی دھارا نہ موتیوں کے ہار
ناری کیا سنگھار
پھر بھی کتنی سندر ہو تم ..... تم کتنی سندر ہو

ہادی ہولے سے ہاتھ پائپ تھامے پودوں کو پانی دیتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

وہ کتاب ہاتھ میں لئے پیچھے سے آ کر روش کی منڈیر پر بیٹھ گئی تھی اور اس کا خوبصورت گیت دلکش آواز میں سن رہی تھی۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ وہ واقعی اتنی حسین ہیں کہ انہیں کسی سنگھار کی ضرورت ہی نہیں"۔ اس نے کتاب ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر بڑے انداز میں گرہ لگائی۔

ہادی بری طرح چونک کر پلٹا۔ سرخ کاٹن کے سوٹ میں ملبوس سبزے کے درمیان بیٹھی وہ ماحول میں عجب سی دلکشی کا باعث بن رہی تھی۔

ہادی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ البتہ گیت کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔

"سالگرہ والے روز تو بہت ہی غضب ڈھا رہی تھیں"۔

ہادی نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔

ہادی اس مرتبہ بھی بالکل خاموش تھا۔

"مگر تم تو بہت مصروف تھے۔ تم نے شاید ہی دیکھا ہو۔ حسن ہے جیسے تصویر ہو۔ وہ تو ملنے والے کے ہوش اڑا سکتی ہیں۔ اس دن تو پھر انہوں نے سنگھار کیا ہوا تھا"۔ وہ پھر بولی۔

ہادی ہنوز خاموش تھا۔

"شاعر نے غالباً اسی کے لیے کہا ہے کہ تم جس رنگ کے کپڑے پہنو وہ موسم کا رنگ ہو" تم جس طرف جاؤ گی وہ روشن ہو جائے"۔۔۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"کیا روشنی پھوٹتی ہے ان سے"۔۔۔ وہ ہنسی۔

"تمہارا ابھی کوئی تصور نہیں، وہ چیز ہی ایسی ہے"۔۔۔ وہ اس کی پشت کو گھور رہی تھی۔ ہادی پاپ کھینچتا ہوا دوسری سمت چلا گیا۔

"ویسے آج کل ملاقات کی کیا سبیل نکلی ہے؟ حویلی سے باہر تو تمہاری موج تھی"۔۔۔ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

"ویسے یہ زخم لگا کیسے تھا۔ کیا بچپن میں گھومنے سے گر گئے تھے؟ مگر یہ تو وہی مثال ہو گئی کہ روشن گھٹنا پھوٹنے سے ابھی اس طرح زخم لگتا تھا تو ہاتھ یا ٹانگ پر لگتا۔ ہو سکتا ہے بچپن میں تم لڑکوں سے بہت لڑتے رہے ہو۔ کیونکہ تم میں ستم تو شروع ہی سے ہے۔۔۔ ہے ناں؟" وہ بے تکان بول رہی تھی۔

"اچھا بتاؤ، پہل کس نے کی تھی؟"

ہادی نے اگلی کیاری کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

"ویسے امکان ہے وہی مرتے ہوں گے پہلے پہ گت گاتے ہوئے

پیار کے بول بولے ہمیں پیار دیں گے

اور کیا ہمیں سرکار دیں گے

اس پہ پیار تو ہے۔۔۔ اف یہ انداز تو ہے۔۔۔!

آپ تو بیچے ہی ہی مار دیں گے

وہ گنگنا رہی تھی۔ بیچارے کو زچ کر کے دلی مسرت ہو رہی تھی۔

"ہائے روشی تم یہاں ہو۔ پتا نہیں چلتا تمہارا۔ کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ بابا صاحب تمہیں بلا رہے ہیں"۔۔۔ روبی اسے دور سے دیکھ کر شروع ہو گئی تھی۔

اس نے منہ بنا کر روبی کی طرف دیکھا۔ البتہ ہادی نے اطمینان بھری سانس لی۔ اور اپنے پودوں پر پانی ڈالنے لگا۔

روشی برا سا منہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ روبی اس سے پہلے اندر غائب ہو چکی تھی۔

اس نے بے دلی سے بابا صاحب کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی تھی۔

"ہوں آ جاؤ"۔۔۔ بابا صاحب کی بارعب بھاری آواز ابھری۔

وہ اندر آ گئی۔ بابا صاحب نظر کی عینک لگائے چائنیز کون سے کھاتے چیک کر رہے تھے۔

انہوں نے عینک اتار کر اوپر سے جھانک کر آنے والے کو دیکھا۔

"آؤ میں روشی بہت دیر سے تمہیں بلا رہے ہیں۔ کہاں تھیں؟ کیا سو رہی تھیں؟"

انہوں نے عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"میں کیاری میں پانی دے رہی تھی"۔

بابا صاحب بہت دھیمے لہجے میں بولے۔ انسان کی آواز کو دم کہاں جاتا ہے اسے اپنی کمزوری محسوس ہوئی۔

"وہ دیکھو یہ بہت اچھی بات ہے کہ سچ کہنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ انسان جھوٹا نہیں۔ اور تمہارے باپ کو بہت شوق ہے بیٹی کے پیچھے اگر ہم سے کچھ کہیں۔ آج ایسا کرو تم ہمارے ساتھ کرو۔"

روشی نے ذرا حیرانی سے ان کی سمت دیکھا تھا۔

"آپ نے مجھے کسی کام سے بلایا ہے بابا صاحب؟" اس نے الجھ کر سوال کیا۔ کیا ان کا اپنی شادی کے موضوع کی طرف جانا تھا۔

"اس میں کام کرنے کو تھوڑے لوگ ہیں۔ تم نے آج تک کوئی کام کرایا ہے کسی نے؟" وہ مسکرائے۔

اس بات پہ وہ بے حد حیران ہوئی۔

"جی ابھی پتا نہیں تمہیں اپنے باپ سے کتنا پیار ہے؟" وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر سکون سے بیٹھ گئے۔

"بہت زیادہ۔ میرے خیال میں سب بچوں کو اپنے باپ سے بہت پیار ہوتا ہو گا۔ پپا بھی تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

یہ روشی کو سوال عجیب سا لگا۔

"بہت اچھا جواب ہے۔ مگر گھما دیا ہے"۔۔۔ ولادر علی خان مسکرا دیے۔

روشی نے الجھ کر ان کی سمت دیکھا۔

"اگر تمہیں پتا چلے کہ تمہارے باپ کو ایک بیٹے سے خوشی مل سکتی ہے تو تم کیا رد عمل ظاہر کرو گی؟"

وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"میں ساری دنیا سے لڑ کر انہیں وہ خوشی دینے کی کوشش کروں گی۔ میں اس عمر میں محسوس کر سکتی ہوں کہ پپا نے کس قدر مجبوری میں زندگی گزاری ہے"۔۔۔ اس نے بہت پرجوش انداز میں جواب دیا۔

"شاباش تم واقعی ولادر علی خان کو اپنے بہت قریب محسوس کرتی ہو۔ تم ان کی بہت اچھی بیٹی ہو"۔۔۔ انہوں نے خوشی سے کہا۔

روشی کو ان کا جملہ کر کے یک دم حلق میں آ گیا۔

(اوہ □□□ □,□ □□ □™□ پپا نے میری ناپسندیدگی اپنے والد تک پہنچا دی ہے اور اب بابا صاحب نہایت طریقے سے بات کر رہے ہیں مگر اس طرح تو پپا نے فاؤل کھیلا ہے۔ جیت کیا ہے مجھے۔ مگر یہ سب ان پر سوٹ تو نہیں کرتا)

انہوں نے روشی کا چہرہ دیکھا جو چور ہو گیا۔

"کیا سوچنے لگیں بیٹی؟ اچھا بتاؤ تمہیں اپنی خالہ کیسی لگیں؟"

روشی کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ اب خالہ کا ذکر کیا تھی؟ اس نے کوفت بھرے انداز میں اپنے بال جھٹکے۔

"خالہ بہت تلخ ہیں۔ آج بھی انہیں ان کا بہت سوز ہے بہت کاشتہ"۔ اس نے کوفت کے باوجود روانی سے کہا۔

"اگر ہم...... ہمیشہ کیلئے انہیں یہاں لے آئیں تو......؟" [illegible] علی خان نے عینک اتار کر رومال سے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔

"ضرور لے آئیں۔ یہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہوگی مگر کیسے؟"

اچانک اسے دھیان آیا تو جیسے ہڑبڑا کر سیدھی ہو گئی۔

"تمہارے باپ سے نکاح کے بعد وہ ہمیشہ کیلئے یہاں آ سکتی ہیں"۔ انہوں نے ابتدا سیدھا کر کے اپنے ساتھ [illegible] لیا۔

روشی کے احساس پر بجلی کی طرح خوشی کوندی۔

"یہ مان جائیں گے؟ بقول آپ کے وہ تو مانتے ہی نہیں"۔ وہ بجھ سی گئی۔

"وہ مان گئے ہیں"۔ بابا صاحب نے اطلاع دی۔

روشی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور خالہ؟" اس نے کسی انجانے خدشے کو اپنے آپ پر منکشف ہوتا محسوس کیا۔

"وہ بھی مان گئی ہیں"۔ انہوں نے اپنی مخصوص دھیمے لہجے سے جواب دیا۔

"تو پھر مسئلہ کس بات کا ہے؟" خوشی مکمل ہو گئی تھی اس کو کوئی چیز اداس کرنے لگے۔

"کسی بات کا نہیں۔ بس ایک ہی پریشانی ہے وہ یہ کہ جواد کو شاید اعتراض ہے"۔ بابا صاحب نے بڑے سبھاؤ سے مطلع کیا۔

"کیوں انہیں کیوں اعتراض ہے۔ کیا بھائی کو یہ احساس نہیں کہ پاپا نے کتنی تلخ زندگی گزاری ہے۔ کوئی خوشی نہیں پچھلے انیس سال سے نہیں ملی۔ بے رنگ زندگی کے انیس سال کم تو نہیں ہوتے۔ ایک سال کی تین سو پینسٹھ راتیں اور ان کے آٹھ پہر اور آٹھ پہر کی خالص بدصورتی"۔ روشی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بابا صاحب دم بخود روشی کی شکل دیکھ رہے تھے۔ جس ردعمل کی امید انہیں جواد سے تھی وہ روشی ظاہر کر رہی تھی۔

"بھائی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ محض اس لئے کہ روگ [illegible] کچھ کہہ دیں۔ ہم ایک جیتے جاگتے انسان سے زندگی کے رنگ چھین لیں۔ جبکہ شریعت و فطرت کو کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھائی سے بات کروں گی۔ انہیں ان کی خود غرضی پر شرمندہ کروں گی"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کے ارادے سے۔

"ادھر آؤ بیٹی"۔ بابا صاحب نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔

وہ ان کے قریب آ گئی۔

"بیٹھ جاؤ"۔ ان کا حکم تھا۔

وہ بیٹھ گئی۔

بابا صاحب نے آہستگی سے بڑے شفیق انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے تمہیں بہت [illegible] اور بے [illegible] گئے تھے۔ مگر شاید تم دوسری [illegible] ہو گئی ہو"۔

"کسی کی زندگی [illegible] میں نہیں ہوں اس انسان کو اپنے اندر جھانکنا آ جائے تو وہ دوسروں کے احساسات کو سمجھنے کے قابل [illegible]"

[illegible] مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"[illegible]" "اچھی بات ہے [illegible] اب تم جا سکتی ہو"۔ انہوں نے اجازت دی۔

"بابا صاحب! یہ خوبصورت کام کب ہوگا؟ ابھی تو بے صبری سے مر جاؤں گی"۔ وہ جاتے جاتے پلٹی۔

"انشاء اللہ بہت جلدی مگر سب کچھ بہت خاموشی اور سادگی سے ہوگا اور تم فکر نہ کرو۔ تم سب سے پہلے ہی آ گئی"۔

"[illegible] پھر تو ہمیں مستقل طور پر ہری پور لے جائیں"۔

بابا صاحب نے بڑے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

روشی ایک خوبصورت سے احساس سے سرشار ان کے بیڈروم سے باہر نکل گئی۔

"امو جی! چائے پی لیں کول خان بھی آنے والے ہیں"۔ ہالہ نے [illegible] سر [illegible] اور لائٹ جلا دی۔

"امو جی! بھلا نیند کہاں [illegible] اپنی حالت ہے جانے کہاں کھو گئے ہیں ہم

تم سے تو دل کے پاس ملاقات ہو گی
میں خود کو ڈھونڈنے بہت دور تک گیا

ہالہ نے [illegible]

"ہماری [illegible] میں نہیں آتیں یہ باتیں جن کا حاصل نہ وصول [illegible] خوشی کوئی بھی آخری نہیں ہوتی چلیں [illegible] چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔

جو آج ہے خوشی کی انتہا ہے
بہت روئے تھے اس آنسو کی خاطر

وہ اٹھ کر بیٹھیں اور ہالہ کی طرف دیکھنے لگیں جو [illegible] کرتے جاپانی کپڑے کے سوٹ میں یوں تیار تھی جیسے کہیں جا رہی تھی۔

"کہیں جا رہی ہیں؟"

"کول بھیا [illegible] تعریف کیا کرتے ہیں ضرور پوچھتا ہے آنے جانے کا؟" وہ مسکرا رہی۔

ہالہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں سمجھی نہیں"۔

"[illegible] تیار ہوتے تو یہاں دیکھیے"۔ وہ [illegible] باہر نکل گئی۔

عارف کی تمام حسیات چوکس تھیں۔ نہایت دھیمی آواز کے باوجود بات اس نے سن لی تھی۔ وہ یہاں کس لیے آیا
بھول گیا تھا۔

باہر برآمدے میں بالو چائے آگے بڑھائے۔ تھال میں دال لے صاف کر رہی تھی۔

اس نے نزدیک ہی واش بیسن میں ہاتھ منہ دھویا۔ وہ بہت الجھ گیا تھا۔ سامنے جو کچھ سمجھ پا رہا تھا وہ اسے حقیقت نہیں لگ رہا تھا
وہ آہستگی سے چلتا ہوا بالو کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

بالو نے تھرماس سے چائے انڈیلی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ ساتھ ہی نمکو اور گلاب جامن کی پلیٹیں اس کی طرف
سرکا دیں۔

"لال خان نہیں آیا ابھی تک؟" اس نے چائے کا کپ اٹھایا مگر نظریں نہیں اٹھائیں۔

"آ ہی جائے گا تھوڑی دیر میں"۔ بالو نے سنبھل کر جواب دیا۔

عارف کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

خاصی دیر وہ گومگو کی کیفیت میں رہا۔

"آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے اب تو آپ کے پاس اس کی امانت ہے"۔ عارف نے بڑی روشن ضمیری کا مظاہرہ
کیا۔

"ہونہہ! امانت! میں اسے کچھ نہیں دوں گی۔ اس کیلئے اتنی محنت کروں۔ اسے دکھ اٹھاؤں؟ کس حساب میں؟"
بھڑک کر بولی۔

"کیا کریں گی آپ؟" عارف خوفزدہ سا ہو گیا۔

"میں اس کے بچوں کی ماں کبھی نہیں ہوں گی۔ ایک کانٹا مستقل میرے دل میں ہے' ایک کانٹا اس کے دل میں رہنا
چاہیے"۔ وہ بڑی سفاک نظر آ رہی تھی۔

"وہ آپ سے بے حد محبت کرتا ہے اور محبت کرنے والوں کو دکھ نہیں دیتے"۔ عارف نے سمجھایا۔

"محبت کیوں نہیں کرے گا اس کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ پانچ روپے کے ٹکٹ پر پانچ لاکھ کا انعام"۔ بالو کے منہ سے
آگ نکل رہی تھی۔

"یہ ہوش کی بات نہیں ہے"۔ عارف بس یہی کہہ سکا۔

"آپ تو خود بے ہوش رہتے ہیں"۔ بالو نے طنز کیا۔

"ہمیں ہوش کے سبق پڑھا رہے ہیں"۔

"مگر میری بے ہوشی نقصان میں کسی کے نہیں' یہ بھی دن گزارنے کا ایک انداز ہے"۔

اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا

رات آ کر گزر بھی جاتی ہے

اک ہماری سحر نہیں ہوتی
بے قراری کہیں نہیں جاتی
زندگی مختصر نہیں ہوتی !!

اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔

"موسم تو آپ بھی بڑے ترکے ہیں۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے آپ کو کھانے میں زہر دے دوں"۔ بالو کی آواز میں
شادی آنے والی تبدیلی سے وہ دوبارہ خوش ہو رہی تھی۔

"استاد! انسان آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ایسے نصیب کہاں ہمارے"۔ وہ افسردہ ہو کر چائے پینے لگا۔

"ہاں! آپ لال خان کو گھر بسانے کی بجائے اپنا گھر بسا لیجئے"۔ بالو کو آج چوٹ پڑی تھی۔

اس کے عجیب طرح انداز پر عارف چونک پڑا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

اس نے چہرہ اوپر اٹھانے کے بجائے صرف نظریں اٹھائیں اور بالو کو چند ثانیے دیکھا۔

اپنے اندر جو آتے ہیں' اِدھر سے پہلے !
دشت پڑتا ہے میاں عشق میں گھر سے پہلے

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں شاید میں آج آخری بار گھر بھی آپ کے گھر آیا تھا۔ دماغ صحرا کا خراب ہو جاتا ہے تو دیر نہیں لگتی' خدا حافظ"۔

اس نے قدم بڑھا دیا ہے۔

"ٹھہر جائیں میں بھی آپ کے ساتھ ہی گھر سے نکلوں گی۔ آپ کے آنے کے امکان تو مجھے اس گھر میں روکے ہوئے
تھے۔ اب وہ یہاں رکھا کیا ہے؟" وہ تھال رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی مگر فوراً ہی گر پڑی۔

عارف اپنی جگہ پر پتھر ہو گیا تھا۔ سامنے لال خان کھڑا تھا اور ششدر سا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

عارف نے نظریں بمشکل اٹھائی تھیں۔ لال خان اس کی طرف دیکھنے کی بجائے صرف بالو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لال خان میں دوست ہوں' دشمن نہیں ہوں۔ یہ کم عمر اور کم عقل ہے اسے کچھ نہ کہنا۔ ذرا دیر کے بعد غصے میں عقل
مرتبہ بڑی لمبی کہانیاں بن جاتی ہیں۔ جدا ملیں تو بہتر رہتا ہے۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے نہیں ملنا چاہیے' خدا حافظ"۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ لال خان نے اسے روکا نہیں۔ کچھ دیر ساکت کھڑا رہنے کے بعد وہ مردہ قدموں سے اپنے
کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بالو نے جاتے ہوئے لال خان کو ایک نظر دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا ڈر اور خوف نظر نہیں آ رہا
تھا۔ بلکہ وہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس حد تک کہ اس نے چائے کپ میں انڈیل کر پینا شروع کر دی تھی۔ البتہ اس کا جلتا پاؤں
اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

گھر میں صرف ماہین کی دو سہیلیاں بطور مہمان موجود تھیں جبکہ نعمان کے دوست ابھی نہیں آئے تھے۔ جب ہم کچھ تین دوست بھی مدعو تھے۔ جن سے ان کی برسوں کی دوستی تھی۔

ماہین اپنے مہندی لگے ہاتھ دیکھ کر جانے کیوں بار بار رو رہی تھی۔ زندگی کا یہ موڑ آتے ہوئے پچھلے موڑ جانے کیا کیا یاد دلانے لگتے ہیں۔ دوسرے سارے نعمان کی کئی روز خاموشی بھی بہت ستا رہی تھی۔

شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب دلاور علی خان اس بارہ افراد کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ خواتین میں عالم تاب، سمیہ اور یاور علی خان کی تینوں بہنیں تھیں۔ بھائی بھی دونوں یعنی ایاز اور بصیر بھی شامل تھے۔

ان لوگوں کی آمد کا سن کر تو ماہین کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔

عالم تاب نوکرانی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں اور رو رو کر پاگل ہوتی ماہین کو گلے سے لگایا۔

''جب انسان کو کسی بڑی خوشی سے نوازا جاتا ہے تو وہ لوگ بہت یاد آتے ہیں جو اس خوشی میں سب سے زیادہ خوش ہوتے ہیں' لیکن یہی زندگی ہے۔ یوں اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ ہم بھی تمہارے اپنے ہیں۔ وقت نے تو کرم ہی کیا ہے ۔۔۔ شاباش چپ ہو جاؤ''۔

وہ اپنے دوپٹے سے اس کی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ساتھ ہی نوکرانی کو چابی تھما کر سوٹ کیس کھولنے کا اشارہ کیا۔ ماہین کی دوست نے نوکرانی کے ہاتھ سے چابی لے کر خود سوٹ کیس کھولا۔

''یہ نکاح کا جوڑا اوپر ہی رکھا ہے۔ بہت اچھی سی دلہن بنانا ہماری ماہین کو۔ یاور نے تو گلے میں ایک ہار بھی نہیں ڈالنے دیا مگر ہم نے ان سے کہہ دیا ہے 'جب دلہن کے پاس جاؤ تو گلے میں ہار ضرور ڈال دینا' آخر اس کے بھی ارمان ہوں گے''۔

انہوں نے مسکرا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ماہین کی سہیلیاں اسے دلہن بنانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ اسی دم نوکرانی نے آ کر اطلاع دی کہ فون پر کوئی لڑکی ہے روشی آپ کو بلا رہی ہے۔ اس نے ماہین کی طرف اشارہ کیا۔

ماہین چونک پڑی۔

''کیا روشی آئی نہیں؟ اسے کیوں نہیں لائے؟ عجیب لوگ ہیں''۔

''رشتی! فون تو لاؤنج میں ہے یا بھائی کے کمرے میں۔ میں یہ کیسے جاؤں؟'' اس کا چہرہ حیا سے چمکنے لگا۔

''وہ سب لان میں ہیں' لاؤنج خالی پڑا ہے۔ البتہ یاور بھائی اس طرح سے بیٹھے ہیں کہ لاؤنج ان کی نظروں کی زد میں ہے' اب یہ تمہارا مسئلہ ہے''۔

''پھر تو میں نہیں جا رہی''۔ اسے ڈھیر ساری شرم آ گئی۔

کچھ فطری وارداتیں ہوتی ہیں جو عقل سے ماورا ہوتی ہیں اور سب کیلئے ایک سی ہوتی ہیں۔

''میں کہہ دیتی ہوں کہ تم نکاح پر راضی ہو مگر ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو۔ جلدی اٹھو دوسری طرف فون ملا ہوا ہے''۔

رشتی نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

''پھر تو کیسی رہی'' ۔۔۔ وہ چھیڑ رہی تھی۔

''اچھا اب زیادہ دوست' ایک گھنٹے بعد ان کے کہنے کے مطابق نکاح ہو جائے گا' تم ابھی یہیں ہو گی اور جب ہم صبح چلے جائیں گے ۔۔۔''

ماہین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''زیادہ بدتمیزی نہیں''۔ اس نے حیا آمیز خفگی سے اسے ٹوکا۔ اور دوپٹہ سر پر جما کر تیزی سے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ ملازمہ کو لاؤنج کا دروازہ بند کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو''۔ اس کی آواز میں حجاب سا در آیا۔

''ہوں ۔۔۔ س ۔۔۔ السلام علیکم ماہی حضور!'' روشی کی کھنکھناتی آواز ریسیور میں ابھری۔ ماہین کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔

''پیا کے ہاتھ تو گیلی ڈالنے والی کوئی چیز ہی نہیں۔ آپ نے کیسے مانی؟'' وہ کھلکھلا رہی تھی۔

''روشی پلیز''۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

''ویسے بھیا سے پیار تو ہر قسم کی صورتحال میں بڑے رف سے محسوس ہوتے ہیں۔ آپ کو پیار کرتے ہوئے بھی ویسے ہی لگے؟'' وہ مسلسل چہک رہی تھی۔

''تم نے یہ باتیں کرنے کیلئے فون کیا ہے؟'' ماہین بھی آخر ہنس پڑی۔

''جی نہیں' آپ کا حال احوال پوچھنے اور پیا کی اطلاعات لگانے کیلئے فون کیا ہے''۔ وہ وضاحت کر رہی تھی۔

''کیسی اطلاعات؟'' ماہین الجھی۔

''اپنی شادی میں ہمیں کیوں نہیں لائے۔ ہم بھی تو دیکھیں بڑے لوگ جذبوں میں گھر سے پیا کیسے لگتے ہیں؟ کیا ہمارا دل نہیں ہے؟'' وہ روٹھی اداسی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

''تم کیسی ہو؟ خوش تو ہو نا؟'' ماہین نے بڑے شفیق انداز میں پوچھا۔

''ایک دم فرسٹ کلاس۔ خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے''۔ وہ ہنسی۔

''کیا آپ دلہن بن چکیں؟'' وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

ماہین خاموش رہی۔

''نکاح ہو گیا؟'' دوسرا سوال ہوا۔

''بدتمیز ۔۔۔ کوئی اور بات کرو''۔ ماہین جھینپ گئی۔

''اچھا چلیں۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ پیا کیسے لگ رہے ہیں؟'' وہ شریر ہوئی۔

''دیکھنا! اگر تمہاری کیسی چال کرتی ہوں''۔ ماہین کے ہونٹوں پر شرمگیں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''اچھا ۔۔۔ تو پھر آ رہی ہیں ناں؟'' روشی کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔

ماہین نے ریسیور رکھ دیا۔ اور گھبرائے چہرے کے ساتھ اوپر چلی آئی۔

"جب بچی نے یہ حال کر دیا ہے تو آپ کیا حال کریں گی؟" اس کی دوست نے بغور اس کے چہرے کو دیکھ کر جائزہ لیا۔

ماہین اسے گھور کر رہ گئی۔

سیونتھ کی (7th C) میں ایک نئی کہانی کا آغاز ہو رہا تھا۔

باہر سمندر کی جولانیاں تھیں اور اندر، یاور علی خان کے اندر طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ اجلی چمکدار سرخ زرتار پشواز، دوپٹے اور تنگ پاجامے میں دلہن بنی ماہین گھر کی خواتین میں گھری ہوئی تھی۔ گھر کے ملازمین کے اطوار میں بھی خوشی نے تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

دلاور علی خان رونمائی میں ہیرے کا ایک کنگن دے کر اپنی خوابگاہ میں جا چکے تھے۔

یاور علی خان اپنے ایک ہم مرتبہ دوست کے ساتھ مصروف گفتگو ہونے کے باوجود ماہین پر اڑتی اڑتی نظر ڈال رہے تھے۔ جس سے سیمہ جانے کون کون سے قصے بیان کر رہی تھی۔ آج سے برسوں پہلے بھی نجیب احمد کی ایک بچی دلہن بن اس گھر میں آئی تھی۔ جس کے فرشی غرارے کو چار ملازماؤں نے سنبھالا تھا۔ بے کام سے بوجھل دوپٹے کو ان کی دو بہنیں سنبھال رہی تھیں۔ ملازماؤں اور بہنوں کی وجہ سے وہ دلہن سے خاصے فاصلے پر چل رہے تھے۔ ڈومنیوں نے استقبالی گیت چھیڑے تھے۔ ملازموں نے پھول اور سکے نچھاور کیے تھے۔

ان کی والدہ نے دلہن کے گرے پر کھڑے ہو کر اس کی پیشانی پر بطور خوش آمدید بوسہ دیا تھا۔

گھر میں شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بچوں کا شور و غل۔ نوکروں کا ہجوم، خواتین کی چہلیں، ڈومنیوں کے حلق پھاڑ ترنم کے گیت اور اس سے بھی بلند ڈھولکی کی آواز۔

جبکہ آج پتہ بھی نہیں چل رہا تھا کہ اس گھر میں نئی دلہن آئی ہے۔ جو خاصی پرسکون حالت میں بیٹھی تھی۔

جبکہ وہ دلہن سسرال پہنچ کر بھی کافی دیر روئی تھی اور کئی بار بے ہوش ہوئی تھی۔ یاور علی خان اس کے پاس جاتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ کہ نازک مزاج دلہن کہیں تماشا نہ ہو جائے۔ جبکہ دلہن کے حسن کے چرچوں نے انہیں بے صبر بنا دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے ڈورے یکلخت گہرے سرخ ہو گئے۔ انہوں نے سگریٹ سلگا لیا۔ آنکھوں میں خوشی اور سرمستی کے بجائے عجیب سی وحشت جھلکنے لگی۔

وہ معذرت کر کے وہاں سے اٹھ آئے۔ عالم تاب ان کے پیچھے لپکیں۔

"کہاں جا رہے ہو یاور؟" انہوں نے یاور علی خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ٹھہرایا۔

"میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ اور ہاں بھابی بیگم فی الحال مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں۔"

ماہین ان کے بیٹھنے بن لئے تھے۔

اپنے جیسے ہوئے وہ کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسم و جاں میں عجب سی کوفت بھر گئی۔ مہندی، نیل پالش، انگوٹھیوں سے سجے ہاتھوں کو اس نے بیزاری سے دیکھا اور

دیکھ، ہلکی گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

سیمہ اپنے بچوں کو سلا کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

"ابھی میں جو تمہیں ان لوگوں نے کے لئے گھیر جاتے تھے۔ ان کو ایسی باتیں میں اڑا رہی ہے"۔ اس نے ماہین کی کلائیوں کی طرف دیکھا۔

"آپ کو معلوم ہے میرا اور آپ کا کیا رشتہ ہے؟" سیمہ مسکرائی۔

"ہوں"۔ ماہین نے اثبات میں جواب دیا۔

"تو میں کیا ہے؟" سیمہ نے شرارت سے پوچھا۔

"ساس ہو بیٹی ہم"۔ اس نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔

سیمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیسی کیسی تاریخ رقم ہو رہی ہے۔ بہو ساس کو یاد کرا رہی ہے"۔ وہ ہنسی۔

"رانی کو تو مارے بے صبری کے نیند بھی نہیں آ رہی۔ لڑکیوں نے اس کی ناک میں دم کر رکھا ہو گا۔ کب کی تھی سیمہ بھابی آپ کی گئی ہیں۔ ہمارے باپ کی شادی میں شرکت کر رہی ہیں۔ بہت شیطان ہے۔ سب سے زیادہ اسی سے ہی الٹ پڑتی ہے۔ ورنہ پیچھے کسی کا ہے ہی نہیں"۔

ماہین کو جماہیاں سی آنے لگیں۔ گزشتہ دو دنوں سے تو اس کی نیند بالکل ہی اڑی ہوئی تھی۔

"آپ کے لیے چائے یا کافی منگواؤں۔ اس نیند کو بھگا دے۔ کسی کو بہت بور کر رہی"۔

اس نے شریر لہجے میں کہا۔

ماہین نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔

"سیمہ!" عالم تاب بہو سے مخاطب ہوئیں۔

"جی امی؟" سیمہ ایک دم مؤدب ہو گئی۔

"میرا خیال ہے کہ ماہین کو کمرے میں چھوڑ آؤ۔ اگر یاور آرام کر رہے ہیں تو کیا کہتی ہیں۔ یہ بھی آرام کریں گی۔ ٹھیک ہے ناں؟"

عالم تاب کو ایک وقت میں کئی کام نمٹانے کی عادت تھی۔ ادھر سیمہ سے مخاطب تھیں۔ دوسری جانب ملازمہ کو خاص سامان اٹھانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے امی۔ سر میں زیادہ درد ہو رہا ہو گا تو سر دبا دوں گی۔ یاور چچا کا فائدہ ہی ہو گا کوئی نقصان تو نہیں ہو گا"۔

اس نے ماہین کے کان میں سرگوشی کی۔

ماہین کے چہرے پر الوہی سے رنگ بکھر گئے۔

وہ دونوں زینے طے کرکے اوپر آ گئیں۔ اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر سبیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بھابھی جان
"بلا کی طرح سر پر منڈلا رہی ہیں"۔ سبیہ نے ڈانٹا۔

وہ ڈانٹ کھاتے ہی بھاگ لی۔

"بہت ہی شوق ہے اسے انہیں دیکھنے کا۔ اب دیکھئے کب تک آپ میں سے "تازہ دلہن" کی خوشبو آتی رہے گی سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے گی۔ ذاتی تجربہ ہے"۔ سبیہ ہنسی اور دروازہ پر دستک دی۔

ماہین بھی اس کی دلچسپی پر مسکرا رہی تھی۔

"کون؟" یاور علی خان کی بوجھل آواز آئی۔

"ہم ہیں چچا ۔۔۔ آ جائیں؟"

"ہوں"۔ غالباً یہ اجازت تھی۔

سبیہ نے دروازہ کھولا اور ماہین کو تھامے اندر چلی آئی۔ یاور علی خان سفید کرتے پاجامے میں ملبوس بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ماہین کو دیکھ کر بھی ان کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

"آپ کیلئے کافی بھجواؤں؟" ماہین کو بیڈ پر بٹھاتے ہوئے سبیہ یاور علی خان سے مخاطب تھی۔

"نہیں"۔ انہوں نے دوٹوک جواب دیا۔

سبیہ ماہین کا ہاتھ دبا کر خاموشی سے باہر چلی گئی اس نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

ماہین اس طرح بیٹھی تھی کہ یاور علی خان اس کی پشت پر تھے۔

"آپ چینج کر لیں اور ایزی ہو جائیں۔ برسوں بعد ذہن کچھ ریلیکس ہوا ہے۔ میں بہت سارا سونا چاہتا ہوں۔ صبح اب سے دیر تک۔ امید ہے آپ اچھے لائف پارٹنر کی طرح میرے احساسات کا پاس کریں گی"۔ غالباً وہ سیدھے ہو کر بیٹھے تھے۔

الفاظ اگرچہ بہت مہذب تھے مگر اعصاب کیلئے ایسے تھپڑ سے کم نہیں تھے۔

اس کے سارے لطیف احساسات ہوا ہو گئے۔

اس نے آہستگی سے دوپٹے کی پنیں نکالنا شروع کر دیں۔ اتنے دلدار، اتنا کشش اور ایک نظر بھی نہیں۔ احساس توہین سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

مرد بھی کیا ہے جیسے کوئی امتحانی پرچہ۔۔۔

ساری عمر حل کرتے رہو۔

پیدائشی ہیں۔ جو پر پوز کرتے وقت تھے۔ وہ موتی اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

چاہتا ہے۔

اچھا کیا ہو گی؟

اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

وہ آنکھوں پر بازو رکھے سیدھے لیٹے تھے۔

ماہین نے دوپٹہ صوفے پر اچھال دیا اور پاؤں سینڈل سے آزاد کر کے بے آواز وارڈروب تک آئی۔

سامنے بہت خوبصورت بے بی پنک نائٹی لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے کوفت بھرے انداز میں اسے ایک طرف سرکا دیا۔ ایک خوبصورت سلیپنگ سوٹ نکال لیا۔ اس پر بہت ہلکا کام ہوا تھا۔ سب کپڑوں میں اسے یہی آسان اور موزوں نظر آیا تھا۔

اس نے لباس تبدیل کیا اور باہر آ گئی۔ میک اپ اگرچہ بہت ہلکا تھا پھر بھی سونے سے پہلے صاف کرنا ضروری تھا۔

مگر اس پر عجیب سی کوفت اور کاہلی سوار ہو گئی تھی۔ اب جب اس نے جان بوجھ کر نہیں جگایا۔ ایک کشن اٹھا کر صوفے پر بچے کی طرح رکھا اور دراز ہو گئی۔

بات کوئی چھوٹی سی نہیں تھی۔ دل کیوں نہ بھر آتا۔ آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے۔

"میرے احساسات کیلئے کتنے کانشس ہیں۔ یہاں یہ حال کر رکھا ہے کہ میں ایک پھول بھی نہیں"۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

اس نے اپنی سوچوں پر بھی بہت کنٹرول کیا ہوا تھا۔ پھر بھی عجیب طرح کی بے اختیاری تھی۔

جانے کون سا پہر تھا جب اسے وہم سا ہوا کہ یاور علی خان نے اسے آواز دی ہے۔ اس کے سارے حواس جاگ گئے۔

"ماہین!" واقعی وہ اسے آواز ۔۔۔ دے ۔۔۔ رہے تھے۔

وہ چپ لیٹی رہی۔

"مجھے پتہ ہے تم جاگ رہی ہو"۔ اس کی بوجھل آواز نے ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

"مگر آپ ہی صاحب ضابطے کی کارروائی نظر انداز کر سکتے ہیں تو پھر ہم تو عام لوگ ہیں۔ آپ مجھے آواز نہ دیں۔ میں سونا چاہتی ہوں"۔

اس کی آواز پر آنسوؤں کا اثر تھا۔ اس نے کروٹ لے کر آنکھیں موند لی تھیں۔

"تو کیا تم انہیں امی کہو گی۔ بڑا عجیب سا لگے گا"۔ سیما کو انہیں سمجھانے کا بڑا شوق رہتا تھا۔

"تمہیں او دیدی آپ تو ایسے ہی ہیں۔ انہیں کبھی کیا کہا جا سکتا ہے"۔ لالی نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش کی۔

"کیا بے کار کی بحث کرتی رہتی ہو تم لوگ۔ جو رشتہ قائم ہو چکا۔ اس حوالے سے مگر انہیں اماں ہی کہہ دیا جائے تو کیا فرق پڑے گا"۔ شیبہ نے اپنے حصے کی ضروری مداخلت کی۔

''آپ تو بس رہنے ہی دیا کریں آپا''۔ روبی نے جل کر انہیں دیکھا۔

''بھئی، ہمیں تو بالکل بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس شادی میں سارے گھر والے کیوں شریک نہیں ہو رہے تھے؟'' سومو کو عدم شرکت کا بڑا قلق تھا۔

''دوسروں کی دلہنیں آتے ان دیکھتے رہتے ہیں۔ اپنے یہاں کی دیکھنے کو تو ہیں ترس گئی۔''

''وہ آ جائیں یہاں، ہم انہیں تازہ کر لیں گے''۔ زری نے ورلا سا دیا۔

''لو بھلا یہ دلہن تازہ کریں گی''۔ گلو ہنس پڑیں۔

زری خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

''ہائے گی تو بڑی پیاری ہوں گی۔ سیف بھائی کے بڑے مزے ہیں۔ بڑی امی انہیں ہر جگہ ساتھ لئے پھرتی ہیں''۔ روبی اپنی قمیص کی کڑھائی کے دوران رشک کرنے کی فرصت ملی۔

''وہ بہو جو ہیں اس گھر کی''۔ بینو نے یاد دلایا۔

''بہو ہونے میں بھی بڑے مزے ہیں''۔ لالی نے ٹکڑا لگایا۔

''فکر نہ کرو۔ تم بھی کل کو کسی کی بہو ہو گی۔ پھر تمہیں ساس کے ساتھ لٹکو گی''۔ سومو نے دلاسا دیا۔

''ہائے سومو باجی۔ کچھ کریں نہ کریں آپ۔ باتیں بڑی اچھی کرتی ہیں''۔

لالی نے ایک آہ سرد کھینچی۔

''خاصی ناواں ہو۔ کس طرح اتفاق ہو سکتا ہے؟'' روبی نے ہمدردی کی۔

''ظاہر ہے جلد شادی ہی سے''۔ تانیہ بہت آخر میں حصہ لیتی تھی۔ اس وقت تو ویسے بھی نوٹس تیار کر رہی تھی۔

''مگر واجد بھائی تو ابھی پڑھنے باہر جائیں گے''۔

تانیہ بچپن ہی سے اپنے کزن واجد سے منسوب تھی اس کی وجہ شاید ان دونوں کی مائیں تھی جو کزنز ہونے کے ساتھ ساتھ گہری سہیلیاں بھی تھیں۔

''کہیں انہیں ہی وہاں کوئی پٹی پڑھا نہ بیٹھ جائے۔ جیسے کریم کا کاجان لے آئے تھے۔ اپنے ساتھ گوروں کی غلطی''۔

''وہ صرف گوروں ہی کی غلطی نہیں تھی کاکا جان کی بھی غلطی تھی''۔

شمو کی ویسے بھی دوسرے کی غلطیوں پر نظر رہتی تھی۔

''کیوں بے چاری تانیہ کو ڈرا رہی ہو۔ ویسے ہی ہوا سے فل جاتی ہے۔ کوئی رنگ روپ تو گیا تو گھر کی بے چاری''۔

گلو ہمیشہ سے ہی ہمدردانہ رول ادا کرنے کیلئے وقف تھیں یا خود کو کر رکھا تھا۔

''ایک تو تم لوگوں سے بھی حد ہے۔ ہم پاپا اور خالہ کے بارے میں بات کر رہے تھے''۔ روشی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

''وہ چھوڑو... ہم اسی طرف آ رہے ہیں''۔ روبی نے تسلی دی۔

''اس طرح آئیں تو جانے کب پہنچیں گی۔ روشی آج رات پہنچ رہے ہیں۔ اطلاع عرض ہے''۔ روشی جل کر بولی۔

''اس قوم بات کہاں سے شروع ہوئی تھی''۔

''یہی تم کس طرح استعمال کرو گی۔ جیسے قفس میں بچھڑی ہوئی بیٹی ایک دم اس بیچ دریا کرنے سے لگی ہے''۔ روبی نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اسی میں بچھڑی ہوئی بیٹی نہیں ہوں''۔ اس نے سنگ کر تصحیح کی۔

''میں دروں کو وہی کہوں گی۔ میں انہیں خالہ ہی کہوں گی۔ تبدیلی یا کی زندگی میں آئی ہے۔ وہ تو ان کے ساتھ مل جائیں گی''۔ اس نے فیصلہ سنا دیا۔

''اور کیا۔ تم تو ویسے بھی پرورش ہو بچیں''۔ بینو نے گرہ لگائی۔

''آپ یہاں پہنچ جو بچیں''۔ شمو نے اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ تصحیح کی۔

''ہائے''۔ گلو ہنس ہنس کر دہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کی ایک ہی بات پر ان کی شگفتگی اور سنجیدہ طبیعت گدگدا کر رہ جاتی تھی۔

''ہے... ہاری سے پوچھو۔ پاپا روشی کب پہنچیں گے''۔ سومو نے یہ لاطائب کیا۔

''کیوں۔ کیا ہاری کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں ہو گا خوامخواہ کسی کو اتنی اہمیت دے دی''۔ روشی نے منہ بنایا۔

شمو نے چونک کر روشی کی صورت دیکھی۔ پھر ہنس کر گنگنانے لگیں

جل کے دل خاک ہوا آنکھ سے رویا نہ گیا

''بس ہمارے دشمنوں کے دل''۔ روشی بڑبڑائی۔

''وہ تو گانا گا رہی ہیں۔ تم ہر بات اپنے اوپر کیوں لے جاتی ہو''۔ زری نے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ انہیں میری ہی کسی بات پر غزلیات یاد آتے ہیں۔ بڑی آئیں کہیں کی میڈم نور جہاں''۔ اس نے اپنی فائل اور کتابیں جھٹکے کے انداز میں اٹھائیں۔

''ویسے آج کل ہاری کی چہل پہل میں خاصی کمی واقع ہو گئی ہے۔ بڑا آرام دہ سا ہے ہیں بابا صاحب''۔ گلو ہنس رہی تھیں۔

''کوئی بات تو ہے۔ اب تو دیکھ کر مسکراتا بھی نہیں''۔ تانیہ نے سادگی سے کہا۔

''تمہیں دیکھ کر مسکرایا تھا؟'' سومو نے شرارت سے اسے گھورا۔

''اس کی تو عادت ہے مسکرانے کی''۔ تانیہ جواباً گھور کر رہ گئی۔

''ہمیں دیکھ کر تو کبھی نہیں مسکرایا۔ ہم سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے کہ دانت پورے نہیں ہوں گے''۔ شمو ہنسیں۔

''ارے دانت تو اس کے بہت خوبصورت ہیں''۔ لالی نے معصومیت اور بے ساختگی سے کہا۔ ہال کمرے میں قہقہوں کا طوفان آ گیا۔

"اچھا چلو بتاؤ۔ پورے بتیس ہیں؟" وہ ذرا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

"نہیں..... ابھی عقل داڑھ نہیں نکلی۔" عشنہ نے کن انکھیوں سے روشی کی طرف دیکھا۔

"تمیزہ تو پوری خوبصورت ہے۔" روبی نے شریر انداز میں کہا۔

"کیا آپ لوگ ہر وقت باری باری کرتے رہتے ہیں؟" روشی نے آگے سے ٹوکا۔

"بھئی اس نام کی تو سب کو عادت ہے۔ فرق یہ ہے کہ کوئی منہ سے نکال دیتا ہے کوئی دل ہی دل میں لیتا ہے۔ ہمارا بھی حال وہ سب ہی کو رہتا ہے۔"

عشنہ کب باز آنے والی تھیں۔ ساتھ گنگنانا بھی شروع کر دیا تھا

دل تم کو دے دیا ہے اس کا خیال رکھنا

"اسے دل دینے والا بڑا ہی بے وقوف ہو گا۔ گھوڑوں کے چارے میں گم کر دے گا۔"

روبی نے گرہ لگائی۔

"اس کا زیادہ وقت گھوڑوں میں گزرتا ہے۔ میں تو اس کے آگے چلتے ہوئے بھی گھبرا جاتی ہوں۔ کہیں پیچھے سے ٹنک کی آوازیں نہ آنے لگیں۔"

بے ساختہ قہقہے ابھرے تھے۔

"ارے اب ایسا بھی گھوڑا پرست نہیں۔ بے چارے کی چال ہی ایسی ہے۔"

تانیہ کو کسی کی درگت بنتے دیکھ کر بڑی جلدی ترس آ جاتا تھا۔

"بعض انسانوں کی بھی پرستش کر سکتا ہے۔ گٹس ہیں اس میں۔" عشنہ نے قہقہہ لگایا۔

روشی نے اپنی کتابیں اٹھائیں جو وہ نوٹس تیار کرنے کی غرض سے ساتھ لیے ہوئے تھی اور باہر نکل گئی۔

"اونہہ..... گٹس ہیں۔ چیڑ ڈان (ڈگلس اوباش) نان سنس۔"

سامنے ہی پیازی رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس پاؤں میں ہلکی سی چپل ڈالے عصمر چلی آ رہی تھی۔

روشی ٹھٹک کر رک گئی۔ "یہ محترمہ ادھر کدھر؟"

"آپ یہاں کیسے؟" وہ اپنی سرد مہری چھپا نہ سکی۔

"بعض ضروری لوگ تو اس طرف آتے ہی نہیں۔ ہم نے سوچا چوہدرانی صاحبہ کراچی گئی ہوئی ہیں اچھا موقع ہے اس طرف کی سیر کا۔"

"یہاں کون سے غنچے چٹک رہے ہیں جو آپ سیر کی غرض سے تشریف لائی ہیں؟"

وہ بڑے تلخ اور طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

"غنچہ دہنی تو چٹکتا ہے۔" وہ بڑے سرور میں تھی۔

"مگر لگتا ہے آپ چٹکنے نہیں دیں گی۔" اس کے لہجے میں زہر ابھر آیا۔

روشی ادھر سے آ رہی تھی۔ عصمر کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر جلدی سے کوئی بات کر گئی۔

"ماما..... باری کہاں ہے؟" روشی نے ماما کو مخاطب کیا۔

"وہ ابھی اسپورٹس کار ڈرائیو کر رہے تھے۔ تیار ہو رہے ہیں۔ دو گاڑیاں جا رہی ہیں۔ ایک ذرا ادھر سے گزر جائے گا چوہدری خان، آپ بھی چلے جائیں خان کے ساتھ خوشی کا موقع ہے۔"

"کیا خوشی ملی ہے اس حویلی کو؟" عصمر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ کے مطلب کی ادھر کوئی بات نہیں۔"

"ماما..... ذرا جلدی سے باری کو بلا دیں۔" اس نے عصمر کی طرف سے منہ موڑ کر ماما کو مخاطب کیا۔

"ادھر جی؟" ماما جاتے جاتے ٹھٹکی۔

"ہاں ادھر..... دیکھو ذرا جلدی۔ کہیں نکل نہ جائیں۔ آپ کا صوفہ فائنل وہ دوبارہ نہیں کیا۔"

"اس سے شوہر یاد کریں۔" عصمر کھلکھلائی۔

روشی اپنے لفظوں میں گم گئی۔

"کتنے ہیں آپ کے؟" اس نے بظاہر مذاق کیا۔

اسی دم باری تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے آیا مگر درمیان ہی میں رک گیا جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ آگے بڑھے یا واپس پلٹ جائے۔ ایک مخالف سمت میں ٹِک ٹھک سے تیار وہ انتہائی پرسکون اور فریش نظر آ رہا تھا۔

"آگے بڑھو بھئی۔ کیا پتھر بن گئے؟" روشی بڑی زہریلی ہنسی ہنسی۔

"نہیں خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ سنبھل کر آگے بڑھا۔

"عصمر بھابی آپ کا تو صوفہ بھری ہیں۔ میں تو خود بہت مصروف ہوں پھر بھی سوچا ان کی مدد ہی کر دوں۔ کوئی اعتراض تو نہیں؟" روشی بھی تیز انداز میں مسکرائی۔

"نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ اگر آپ کو ہو تو۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"آ گئے ہیں۔ کر لیجیے ضروری بات۔ پھر موقع ملے نہ ملے۔ اب میں جا سکتی ہوں؟" اس نے باری کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ ایسا کوئی خیال نہیں کہ آپ کو غائب کرنا ضروری ہو۔ جی فرمائیے۔ کیا ہے وہ ضروری بات۔" وہ عصمر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بہت پرسکون نظر آ رہی تھی۔

"چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔" عصمر اس سے زیادہ پرسکون تھی۔

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔ راستہ خاصا لمبا ہے۔ ویسے میرے اور آپ کے درمیان کسی ضروری بات کا کوئی تعلق نہیں۔ ہو سکے تو آئندہ اس قسم کی زحمت نہ کیجیے گا۔ پلیز..... او کے؟"

"شغل بیکاری نہیں ہوتے۔ بعد میں بھی ہو جاتے ہیں۔" عصمر نے بڑے شوخ انداز میں کہا۔

"آپ نے شاید ایک بات یہاں حویلی میں نوٹ نہیں کی۔ یہاں مردانہ زنانہ الگ الگ ہوتا ہے۔ سوائے میرے

یہاں سے وہاں کوئی اندر نہ جانے نظر نہیں آئے گا۔ ایسا کیوں ہے؟

صرف اس لیے کہ کوٹ کوٹ کر میرے اندر یہ بات اتاری گئی ہے کہ حویلی کی تمام چھوٹی بڑی خواتین ہم سب کے لیے واجب الاحترام ہیں۔ مجھے ہمیشہ ان سے احترام کا رشتہ استوار کرنا ہوگا۔ اس سے ہٹ کر میں کسی سے کوئی اور تعلق تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ صرف اور صرف ہمدردی السلام علیکم۔"

جھومر نے ایک خیال سے چونک کر بڑی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ روشی کی طرف دیکھا۔

"میں ٹھیک کروں گی اسے۔ نسلاً افغانی ہوں جو جیتنے کیلئے لڑتے ہیں"۔

اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور اس راستے کی طرف چل پڑی جہاں سے آئی تھی۔

روشی کی تو خاک سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس ذرا دیر میں ہوا کیا ہے۔

"اگلی ملاقات میں دیکھنا کیسے چھکے چھڑاؤں گی۔ تم بھی موجود رہنا۔ بڑا مزا آئے گا"۔

وہ اس سے کچھ فاصلے پر گویا ہوئی اور پھر پلٹ کر چل دی۔

روشی حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی تھی۔

رات گیارہ بجے تک لڑکیوں نے پورے جوش و خروش سے دلہن کا انتظار کیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک انہیں ہلکی ہلکی جمائیاں آنے لگی تھیں۔ وہ ہال کمرے ہی میں ادھر ادھر ڈھیر ہوگئی تھیں۔

نوکروں کو جاگتے رہنے کی ہدایت تھی۔ وہ ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ ان سب میں مامی کی کارکردگی سب پر بھاری تھی۔ پونے بارہ بجے کسی نے آکر ہال کمرے میں ہلچل مچائی تھی کہ دلہن آگئی۔ سب سے پہلی چیخ روشی کی تھی۔ وہ دوپٹہ ہاتھ میں پکڑے سرپٹ دوڑتی ہوئی پورٹیکو میں آئی تھی۔

آنے والے سب وہیں رُک گئے تھے۔ سیٹ نے گود میں بچے کو لینے کے باوجود ماہین کو شانوں سے تھام رکھا تھا۔

روشی چند لمحے اپنی جگہ پر ٹھٹکی پھر ایک دم ماہین سے لپٹ گئی۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ جواباً روشی کے نتیجے میں ماہین نے بھی رونا شروع کردیا تھا۔

"ارے..... یہ کیا کرنے لگیں۔ خوشی کا موقع ہے۔ خوشی کی طرح مناؤ"۔

عالم تاب نے دونوں کو الگ الگ کیا۔ ساری لڑکیاں اور خواتین بھی وہاں آموجود ہوئی تھیں۔

"بُری بات ہے۔ بھلا رونے کا کون سا موقع ہے"۔

"چلو..... اندر"۔ بابا صاحب چھڑی نکالتے ہوئے سب سے پہلے آگے بڑھ گئے۔ باقی لوگ ان کے پیچھے ہال کمرے کی طرف چل پڑے تھے۔

ہال کمرے کی تمام لائٹیں آن کردی گئی تھیں۔ میرون ساڑھی میں ملبوس ماہین چہرے سے بہت مضمحل نظر آرہی تھی۔

روشی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔ باقی لوگ کھڑے ہوئے بڑے پرشوق انداز میں دلہن دیکھ رہے تھے۔

"آپ یقین کریں خالہ! مارے خوشی کے میری بری حالت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں آپ سے کیا بات کروں"

روشی نے ماہین کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ماہین کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ تو سفر سے بہت تھک گئی ہوں گی۔ کیا خیال ہے [illegible]"۔

اس نے محبت سے ماہین کا چہرہ دیکھا۔

"اس وقت تو ہم کھا چکے تم مامی سے کہہ کر اوپر کمرے میں دودھ بھجوا دو"۔ عالم تاب نے بیچ ہی سے کہا۔ [illegible] چلی گئی۔

"آؤ ماہین۔ اب تم بھی آرام کرو۔ صبح سے بیٹھی ہوئی ہو۔ رونمائی وغیرہ سب صبح کریں گے۔ تعارف تو تمہارا سب سے ہو ہی چکا ہے"۔

عالم تاب نے ماہین کو شانوں سے تھام کر اٹھایا۔

"چلو لڑکیو اب تم بھی سو جاؤ۔ صبح کو دلہن سے بات کرنا۔ چلو شاباش"۔

"میں بھی چلوں خالہ کے ساتھ"۔ روشی پرشوق انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوں ہوں۔ تم بھی آرام کرو"۔ عالم تاب نے اسے ٹوک دیا۔

اور ماہین کو لے کر بادل علی خان کے بیڈروم میں چلی آئیں۔

بادل علی خان صوفے پر نیم دراز اسی طرح سوٹڈ بوٹڈ سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ ماہین اور عالم تاب کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے ناں بادل؟" عالم تاب ان کے قریب جا کر پوچھنے لگیں۔

"جی بھابی بیگم۔ طبیعت ٹھیک ہے۔ اور اب ٹھیک ہو جانا چاہیے"۔

ان کا انداز پراسرار سا تھا۔ ابھی تک ایک نگاہ غلط بھی انہوں نے ماہین پر نہیں ڈالی تھی۔

"اچھا کپڑے وغیرہ تبدیل کرلو۔ چائے یا کافی بھجواؤں؟" انہوں نے جاتے جاتے پوچھا۔

"نہیں..... برسوں بعد لوٹ کر نیند آنا شروع ہوئی ہے۔ بہت سونا چاہتا ہوں"۔ ان کے لہجے میں تھکن کا تاثر تھا۔

سینڈل اتارتے اتارتے ماہین نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ مگر کچھ کھوج نہ سکی۔

"بھابی بیگم!" انہوں نے جاتے ہوئے عالم تاب کو آواز دی۔

"ہوں؟" وہ رک گئیں۔

"میرا ایک ضروری کام یاد ہے ناں آپ کو۔ پہلی فرصت میں وہاں کہلوا دیجئے کہ تمہاری بہن ماہین سے میں نے نکاح کرلیا ہے اور ماہین اب حویلی میں موجود ہیں"۔

عالم تاب نے ایک الجھی ہوئی نظر ماہین پر ڈالی۔

"کل ہی جا کر صبح اطلاع۔ فکر نہ کرو"۔ وہ بولیں۔

"صبح بہت دیر سے ہوتی ہے"۔ انہوں نے گلے سے بالی کھینچتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے"۔ وہ آہستگی سے بولیں اور باہر نکل گئیں۔

ماہین حیران پریشان ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کا مبہم سا پیغام اس کے خاک بھی پلے نہیں پڑا تھا۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

ماہین ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر زیورات اتار رہی تھی مگر اس کی ساری حسیات بہادر علی خان کی طرف متوجہ تھیں۔

اس نے چوڑیوں سمیت تمام زیورات اتار ڈالے تھے۔ صرف ایک کنگن دائیں کلائی میں رہ گیا تھا۔

بہادر علی خان عین اس کے پیچھے آ کھڑے ہوئے تھے اور بالی کی لٹ سے کھیل رہے تھے۔

"آپ تو بہت تھک گئی ہوں گی؟" انہوں نے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

"ظاہر ہے دلہن تو میں نے ہی بننا تھا"۔ وہ بڑی کوشش کے بعد اپنی جھنجلاہٹ چھپا پائی۔

بہادر علی خان کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آپ نے سارے زیورات اتار ڈالے۔ ہم نے تو ٹھیک سے آپ کو دیکھا بھی نہیں"۔ وہ بالی کھینچ کر اتارتے ہوئے وارڈروب کی طرف بڑھے۔

"آپ کو ضرورت بھی نہیں ہے مجھے دیکھنے دکھانے کی"۔ وہ تنک کر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بہادر علی خان نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ قمیص اتار کر صوفے پر پھینک چکے تھے۔

ماہین کے سامنے یہ ان کی پہلی بے تکلفی تھی۔ ماہین نظریں چرا کر اپنا سوٹ کیس کھول کر جھک گئی تھی۔ سارا دن اس نے اسے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ پہنی بھی پہلی مرتبہ تھی اس لئے بہت الجھ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد پیچھا چھڑا دینا چاہتی تھی کہ جلد سے جلد کوئی آرام دہ لباس پہن لے۔

وہ بیڈ پر اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ جیسے ابھی اٹھنے کا پروگرام نہ ہو۔ دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے بیڈ پر جمائے ہوئے ..... وہ غور سے سوٹ کیس الٹ پلٹ کرتے دیکھ رہے تھے۔

"ماہین"۔

"جی"۔ اس کا انداز چونکا ہوا سا تھا۔

"بات سنو"۔

"سنائیے سن رہی ہوں"۔ اس کے انداز میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

"اس طرح نہیں یہاں آؤ"۔

ان کے لہجے میں ایک خاص کیفیت محسوس ہوتے ہی ماہین کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا۔

جب یہ انداز نہیں تھا تو بھی الجھن تھی۔ اب انداز بدلا تو بھی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی ہونے کے بجائے اسی طرح مصروف رہی۔

"میں کچھ کہہ رہا ہوں ماہین"۔ ان کے انداز میں بلا کی رسانیت تھی۔

"میں سن رہی ہوں نا"۔ اس نے بھی قدرے جھینپ کا مظاہرہ کیا۔

"ماہین! پلیز ادھر آؤ"۔

ماہین عجیب بے بسی کے عالم میں سیدھی ہو گئی کہ بات مانے تو مشکل نہ مانے تو اس سے زیادہ مشکل۔

وہ سوٹ کیس اسی طرح کھلا چھوڑ کر ان کے قریب چلی آئی۔

"جی"۔

"بیٹھ جاؤ"۔ ان کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اس نے بیڈ پر نظریں دوڑا کر اپنے بیٹھنے کیلئے مناسب جگہ تلاش کی۔ پھر ان سے کچھ فاصلے پر بالکل کنارے پر ٹک گئی۔ اس طرح سے کہ جیسے موقع پاتے ہی بھاگ کھڑی ہوگی۔ ان کے بدلے ہوئے لب و لہجے پر اس کی گھبراہٹ دوہری ہو گئی۔ اسی وجہ سے نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم مجھ سے بہت ناراض ہو"۔

ان کی نظریں آج بالکل ہی دوسرا انداز لئے ہوئے تھیں جو اس کیلئے بالکل نیا تھا۔ لگتا تھا دل پسلیاں توڑ کر باہر آ گرے گا۔ ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس وہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کپڑے تبدیل کر کے جلدی سے سو جاؤں نیند آ رہی ہے"۔

اس نے فوراً سنبھل کر اپنا مختار جواب حوالے کیا۔

"ارے بھئی میں یوں ہی سمجھا آپ کے ارادے [illegible]"

"[illegible] ہو گئی ہیں؟"

انہوں نے انداز نشست بدلا اور آگے کی طرف جھک کر سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ کیس اور لائٹر اٹھایا۔

"اور کوئی الجھن ہے تو مجھے بتا دو اس کا مطلب یہیں کہہ رہا ہے"۔ [illegible]

"مجھے [illegible] کر رہا ہے؟" انہوں نے سگریٹ سلگا لیا۔

"یہی کوئی اپنے کسی ضروری کام میں بھی مصروف ہو سکتا ہے۔ جبکہ میں انسان مطالعہ بھی کر رہا ہوتا ہے"۔

"بعض اوقات روکھی بھی ہوتا ہے"۔

انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سارا دھواں اس کی طرف چھوڑ دیا۔ یہ ان کی اپنی منکوحہ کے ساتھ پہلی لطیف سی شرارت تھی۔

ماہین نے چونک کر ان کی سمت دیکھا۔ سامنے ہی ہاتھ سے سامنے سے دھواں ادا کیا۔ حلق میں آنسوؤں کے پھندے لگنے لگے۔

"کتنی بڑی بے بسی ہوتی ہے کہ پتا ہوتا ہے کہ کوئی رو رہا ہے اس کے باوجود اس کے احساسات نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں"۔

اس نے الجھے لہجے میں جواب دیا۔

"بعض اوقات ہمیں جن سے شکایت ہو جاتی ہے وہ ہم سے بھی بڑے دکھ سے گزر رہے ہوتے ہیں یوں بھی سوچنا چاہئے"۔

انہوں نے اس کے چہرے پر ایک گہری اور معنی خیز نگاہ ڈالی اور گہرا کش لگایا۔

"تو کوئی شیئر کرنا چاہئے نا"۔ وہ نظریں جھکائے جھکائے رسانیت سے بولی۔

"نہیں میرا اصول ذرا مختلف ہے۔ خوشیاں شیئر کرنے کیلئے اور دکھ سہنے کیلئے ہوتے ہیں۔ یعنی جس کا دکھ ہے وہ خود سہے"۔

"کیا یہ طرف کا دکھ ضروری نہیں؟" اس نے طنز کیا۔

ان کی بات کٹ گئی تھی۔

"بیوی محرم راز ہوتی ہے۔ دکھ دوسرے غیروں کے سامنے ہوتے ہیں"۔

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے۔ بظاہر کش لگا رہے تھے۔

لفظ "بیوی" پر اس کی تمام حسیات چوکس ہو گئیں۔ خفگی اور بحث میں وہ جیسے اس نئے رشتے سے تعلق کو ہی بھول گئی تھی۔ گویا ماضی کے ماحول میں پہنچی ہوئی تھی۔ ایک دم جیسے سب کچھ ہی بھول گیا کہ وہ کیا بتا رہے تھے اور وہ خود کیا کہہ رہی تھی۔ وہ تو دل ہی دل میں ڈر کے ہاتھ سہلنے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ری ایکٹ کرے۔

یاور علی خان نے سگریٹ بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کا چھوٹا سا خوبصورت ہاتھ تھام کر استحقاق استعمال کرتے ہوئے چھوٹی سی شرارت کر ڈالی۔

"کتنے دن ہو گئے ہماری شادی کو اور مجھے پتہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کے ہاتھ اتنے خوبصورت ہیں۔"

اتنا اچانک حملہ تھا کہ ماہین شپٹا کر رہ گئی مگر ہاتھ ان کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔

"جب کچھ ہماری مرضی کے مطابق نہ ہو رہا ہو تو بدگمان ہونے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ دوسری جانب کی کیا مجبوری ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی الجھن ہو یا وہ اس کی طبیعت کی وجہ سے ساز نہ ہو۔"

"جو بدگمان ہونے میں جلدی کرتے ہیں وہ اچھے رفیق کیسے ہو سکتے ہیں؟"

ماہین نے ان کی مدلل قسم کی ذات کے سامنے آج پہلی بار مکمل طور پر خود کو بے بس محسوس کیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اس کی ہتھیلی سے اتنا پسینہ چھوٹ نکلا تھا کہ یاور علی خان کا ہاتھ بھی نم ہو چکا تھا۔

"خان! مشکل وقت تے اساں دی جان تے بنی اے کہ نئیں؟" سرسوتی پچھلی راہداری میں ہاری کو روکے ہوئے سرگوشی میں مصروف تھی۔

"اس کے پاس چابی کہاں سے آئی؟" بنیادی سوال ہاری کے ذہن میں فوراً ہی آیا تھا۔

"چابی تمہارے پاس سے اس کے پاس پہنچی کیسے؟" ہاری کی پیشانی شکن آلود تھی۔

"اے ای تو تساں توں پچھ رہی آں...... اساں نی تے نیندر (نیند) موت ورگی ہوندی اے۔ میں سمجھی ہاں کہ اناں نے چابی......؟"

سرسوتی ہکلاہٹ میں اعتراف جرم کرتے کرتے ٹھہر گئی۔

"تم انتہائی ستا رہی ہو مجھے۔"

"اناں نی منتاں کر دی ساں پر اوہ نئیں منے تے فیر مجبوری تساں نوں آکھ دی آں خان۔ بچا لیو ورنہ خان نے سوائے تساں نوں رب دا واسطہ اے خان، بہت چنگی ہوئی اے تساں واں۔ دو مہینوں میں کی کرساں؟" وہ رو رہی تھی۔

"کھانے کے وقت دروازہ کیسے کھلتا ہے؟" ہاری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اوہی کھولدے نے...... اوہی بند کردے نیں...... کدی کدی مندے ساں نئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"اب رونے کا کیا مطلب ہے؟ تم جاؤ میں ادھر کے کام نمٹا کر پیچھے جاؤں گا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔ اگر انہوں نے چابی دے دی تو تمہیں دے دوں گا اگر...... خیر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کچھ نہیں ہوگا، جاؤ تم۔"

"جیوندے روو...... رب لمیاں عمراں دے۔" وہ تشکر انداز میں دعا دیتی آگے بڑھ گئی۔

اور وہ کچن کی طرف آ گیا۔

میدان کارزار میں اترنے سے پہلے کچھ سوچنا تھا اب تو بغیر پلاننگ کے وہ پیچھے جا بھی نہیں سکتا تھا۔

وہاں کچن میں اس وقت اپنی مرضی کی چائے بناتے ہوئے اچھا خاصا شور مچایا جا سکتا تھا۔ وہاں سے پیچھے اس کی طرف بغیر روک ٹوک کے اور "دوسروں" کی نظروں میں آئے بغیر جایا جا سکتا تھا۔

وہاں داخل ہوتے ہی بے چاری اکیلی مصروف ماما لالی سے سامنا ہو گیا۔

"تم ابھی تک سوئی نہیں ماما؟" اس نے پہلی رکاوٹ پر صبر کا گھونٹ بھرا۔

"آج ذرا دیر تو ہو گئی تھی خان۔ گھر میں ابھی ابھی آئی ہے"۔ ماما پر ابھی تک خوشی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

"ہوں"۔ وہ عادتاً ماما سے "ہوں" کہہ کر رہ گیا۔

"چائے بناؤں خان؟"

"نہیں ماما اب تم جا کر سو جاؤ۔ چائے آج میں خود بناؤں گا"۔ وہ اس طرح گویا ہوا کہ جیسے وہ ماما کو بہت جلدی وہاں سے غائب دیکھنا چاہتا ہو۔

"آپ ہم ہیں ناں آپ کی خدمت کیلئے"۔ اس نے لاڈ سے کہا۔

"پہلی دفعہ نہیں ماما، بعض اوقات جب تم سو رہی ہوتی ہو تو میں بنا لیتا ہوں۔ یہ تمہارے آرام کا وقت ہے۔ تم آرام کرو۔ جاؤ چلو۔ کب جاؤں میں"۔ اس نے قدرے حکمیہ انداز اختیار کیا۔

ماما خاموشی سے چادر لپیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ہاری نے نظریں دوڑا کر صاف ستھرے اور سجے ہوئے کچن کا جائزہ لیا۔ سوچ بچار کے ساتھ ہی اسے الیکٹرک کیتل نظر آ گئی۔ وہ دل جمعی سے چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

"اتنی رات گئے آپ لوگوں پر خود کام کر رہے ہیں"۔

ہاری نے زور سے چائے کا پانی بند کیا تھا۔

"یا اللہ! کیا ہو گیا ہے یہاں کے لوگوں کو، رات بھر جاگتے رہتے ہیں"۔

اس نے رومی کی آواز پر شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی جھنجھلاہٹ محسوس کی تھی مگر خاموش رہا تھا۔

رومی فریج میں تقریباً پوری ہی گھس گئی تھی۔

"کچھ بھی ہے ماما کو میری دوائیں ادھر ادھر کیا کریں۔ اگر...... !" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"دوائیں...... ! کیا ہوا ہے انہیں"۔ ہاری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب کیا ہو گیا ہے آپ کو"۔ وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکا۔

"پہلے کیا ہوا تھا میں "ازلی بیمار" ہوں"۔ وہ ترش ہو کر گویا ہوئی۔

ہاری خاموش رہا۔

"نیند نہیں آتی ہے مجھے اکثر اوقات زیادہ جاگتی ہوں اور کچھ"۔

"کیوں بار بار کر رہی ہیں آپ نے اپنی نیندیں کس چیز کی ہے آپ کے پاس؟"

وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے کپ میں دودھ ڈال رہا تھا۔

"کوئی اپنی نیند کا دشمن نہیں ہوتا' اگر کسی کی نیند غائب ہوتی ہے تو مجرم کوئی اور ہوتا ہے"۔ وہ جلے بھنے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"کیا لیتی ہیں آپ؟" اسے جیسے یہ جان کر دلی رنج ہوا تھا کہ وہ مسکن ادویات استعمال کرنے لگی ہے۔

اس نے خواب آور گولیوں کے نام گنوا دیے۔

کپ ہادی کے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا۔

"عمر دیکھی ہے آپ نے اپنی؟" اس نے دکھ سے اس کی سمت دیکھا۔

"میں نے تو دیکھی ہے تم نے نہیں دیکھی"۔ اس نے گلاس میں پانی ڈالا اور ایک گولی منہ میں رکھی اور غٹاغٹ پانی پی گئی۔

ہادی لاجواب سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا اور چپکے چپکے کپ پینے لگا۔

"ایک مشورہ ہے آپ کیلئے اگر آپ مائنڈ نہ کریں"۔ اس نے جاتی ہوئی روشی کو مخاطب کیا۔

"جی فرمائیے"۔ وہ دروازے پر رک گئی۔

"آپ ہفتے میں ایک مرتبہ کسی اسپتال کا چکر لگا لیا کریں"۔

"اس سے نیند آنے لگتی ہے؟" وہ تمسخرانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"شاید آنے لگے' وہاں آپ ایسے وارڈز کا دورہ کیا کریں' جہاں سیریس قسم کے مریض ہوتے ہیں۔ جن کی تکلیف دیکھنے والوں کیلئے بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے' جو ایسے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ تب آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ تو مراعات یافتہ طبقے میں ہی نہیں انسانوں میں بھی بے انتہا نعمت یافتہ ہیں۔ پھر آپ کو احساس تشکر ہو گا' طبیعت میں بے حد ٹھہراؤ اور سکون آ جائے گا اور خود بخود نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں گی"۔

اس نے بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھنے کے بجائے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"بس؟" اس نے طنزاً کہا۔

"بس"۔ اس نے بھی وہی انداز اختیار کیا۔

"نادان دوست ہمارے دکھ ایک طرف دل کا دکھ ایک طرف"۔ وہ اتنا کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

ہادی نے ایک گہرا سانس لیا "آخر انسان کی مت اتنی کیوں ماری جاتی ہے؟ جب سب دوست ہی دوست ہوتے ہیں انسان اپنا دشمن خود ہی بن جاتا ہے"۔

"نہ جانے کیوں یوں محسوس ہوا جیسے کہیں سے آنچ آ رہی ہو اور دل موم کی طرح پگھلنے لگا ہو۔

اس نے جلدی جلدی چائے ختم کر کے اس کیفیت سے پیچھا چھڑایا اور کپ سنک میں رکھ کر وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگا۔ ایک نئے سفر کے سے دوچار ہونے کا وقت قریب تھا۔

"تمہارے ہم سفر ہادی؟" کوئی اس کے اندر ہنسنے لگا۔

"اس لیے نہیں کیا ٹھہراؤ' سب سے دوستی ہو جاتا ہے سب کی نئے سرے کو ہونے لگیں۔

ایسی سب سے بڑی ہے جو اپنی جگہ تو آ کر گزر کر رہ جاتا ہے"۔ وہ مسکرانے ہونے پر سکون انداز میں اٹھا۔

ہادی حویلی پہنچا تو رات بہت گزر چکی تھی۔ سکون کے سے لمحے کے گھروں کے چوک کے پیچھے اور گھوڑوں کے ہنہنانے سے ماحول بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ بہت محتاط انداز میں طویل و عریض احاطہ پار کر کے حویلی کے پچھلے حصے میں آ گیا تھا۔ جہاں سے گزر کر وہاں سے اندرونی دروازہ تک جا سکتا تھا جہاں رات گئے بھی کوئی نہ کوئی جاگ رہی تھی۔

وہ ہادی میں پہنچا اور لائٹیں روشن کر دیں اور خراب سے آخر میں ہی ایک کوٹھری میں جو تمام اسٹور کی حیثیت سے استعمال ہوتی تھی کی طرف دیکھا۔ باہر آتی روشنی یہ بتا رہی تھی کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ چند لمحے کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں آگے بڑھا۔

ایک دھیمی سی آواز کمرے میں بڑا مانوس سا محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے جیب سے چابیاں نکال کر دیکھنا شروع کیں۔ بالآخر ایک چابی لگ گئی اور دروازہ کھل گیا۔ اس نے تالا نکال کر جیب میں ڈالا اور کوٹھری کی سمت دیکھا۔

وہاں دیکھنے کو کچھ تھا بھی نہیں لیکن وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر ایک دم حیران ہو کر کوٹھری کے کمرے کی طرف گیا۔ اس نے مڑ کر کوٹھری کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ دبے قدموں سے آگے بڑھا اور دروازے پر دستک دی۔ کمر بھری آواز آئی "کون ہے؟" پھر دروازہ کھل گیا۔

نیم تاریکی کے شور میں ملبوس بھری بھری وہ چپ کے اس کے سامنے کھڑی حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی۔

"آئے خوش نصیب ہیں ہم جنہیں نیند نہیں آ رہی"۔ وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

راستہ دیجئے مجھے۔ میں اندر آنا چاہتا ہوں"۔ اس نے دروازے کے درمیان میں کھڑی بھری سے بڑے تحمل سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں اس گھڑی تم آ گئے تو تمہارا اس طرح استقبال کروں کہ تم اپنا راستہ بھول کر خوشی سے بے ہوش ہو جاتے مگر افسوس فی الحال ہم تمہیں اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ایسا کرو تھوڑی دیر بعد آنا"۔

"آپ عورت ہیں اور میں مرد مگر آپ کے حصے کی جیا بھی مجھے کرنی پڑتی ہے۔ ہٹیے ایک طرف"۔ اس کا چہرہ غصے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

مگر بھری احتیاط سے اپنی جگہ اڑی رہی۔

"پلیز مجھے راستہ دیجئے اندر جانے کا"۔ وہ جیسے زچ ہو رہا تھا۔

"تم تو ہوی اندر تمہیں اجازت کی کیا ضرورت"۔ وہ بدستور شوخی سے بولی۔

"تو آپ نہیں ملیں گی؟" اس نے برہمی سے جھومر کا چہرہ دیکھا

"نہیں کیا کرو گے"۔ وہ کھلکھلائی۔

"دیکھئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں مجھے اندر جانے دیں"۔ اس نے پہلے سے بہت زیادہ ورسائیت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"میں بھی جناب سے کہہ چکی ہوں تھوڑی دیر بعد تشریف لائیے گا"۔ وہ مسکرائی۔

ہاری نے کئی گہرے گہرے سانس لئے پھر ایک جھٹکے سے جھومر کا بازو پکڑ کر آگے کی طرف کھینچا اور ایک طرف جھٹک دیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ فسادی بڑی زنجیر سمیت کھڑی ہوئی غائبانہ دونوں کی تکرار غور سے سن رہی تھی۔

ہاری کو اندر آتے دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

ہاری نے اس پر نظر ڈالنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ "اپنے ٹھکانے پر چلو"۔

"جانا اس نے اپنے ٹھکانے پر ہی ہے۔ ذرا سی دیر آزاد ہو بیٹھے وہ۔ تمہاری جیب سے کیا جاتا ہے"۔ جھومر اپنی کہنی سہلاتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

"آپ بڑے خان کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہے۔ آگے بڑھو بھئی"۔

"جو میرا جی چاہے گا میں کروں گی۔ دیکھو میں نے اس کا سر دھلایا ہے۔ بال بنائے ہیں۔ کرو جو میرا کر سکتے ہو۔ اور ہاں جو میرا کھانا آتا ہے نا وہ بھی میں اسے کھلاتی ہوں بلکہ ہم دونوں ساتھ ہی کھاتی ہیں۔ حیوانوں کی بستی میں ایک یہ انسان ہے اور ایک میں۔ جاؤ جا کر کہہ دو خان سے"۔

جھومر بستر پر بیٹھ کر اپنے دوپٹے کے کونے سے خون صاف کرنے لگی۔ شاید چوٹ زیادہ لگ گئی تھی۔

ہاری اسی کی طرف متوجہ تھا۔ خون دیکھ کر عجیب سے احساس جرم میں مبتلا ہو گیا۔ مگر ظاہراً نظر بچا گیا۔

"چلو"۔ اس نے عورت کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھی تو زنجیریں چھنک اٹھیں۔

"کہاں جا رہی ہو میری موجودگی میں کسی کا کہنا ماننے کی ضرورت نہیں"۔ جھومر نے فرش پر پڑی ایک زنجیر تھام کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"آپ مسئلہ نہ بنیں، ہمیں مسئلے حل کرنا بھی آتے ہیں، چھوڑیں آپ"۔ اس نے بھی زنجیر تھام کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"ہمیں بھی مسئلے پیدا کرنے آتے ہیں۔ ابھی یہاں سے اور بھی بند کر کے کھولوں گی بتا دیا"۔ وہ برہمی سے گویا ہوئی۔

"بھابی"۔

"بندی کو جھومر کہتے ہیں"۔ جھومر نے اس کی بات کاٹ دی اور کھلکھلا پڑی۔

"میں بہت برداشت کر رہا ہوں ورنہ مجھ میں اتنی قوت ہے کہ آپ کو اسی کے ساتھ اسی کوٹھڑی میں بند کر دوں"۔ اس

نے بہت ضبط کیا۔

"تو پھر اپنے کمرے میں بند کر دو۔ جب بندی کرنا ہے تو ہم ایک کمرے میں ---" وہ چہکتی۔

"شٹ اپ ہمت کیسے ہوئی یہ بکواس کرنے کی اس کے ساتھ میں تمہاری بھی خبر لوں گا"۔ وہ برہم ہوا۔

"خان ۔۔۔ زیاد علی خان نے دوسری شادی کر لی ہے؟" عورت نے ان کی بحث سے بالکل لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں سوال کیا۔

"تمہیں کیا؟ اگر وہ تیسری بھی کر لیں"۔ ہاری نے سنگ کر جواب دیا۔

"مرسوتی نتاری تھی بڑی گھمبیرہن ہے کہاں سے آئی ہے بدنصیب؟"

"وہ تو پہلی بیوی تھی کہ روشنی کی تلاش ہے مگر مجھے یقین نہیں آیا۔ ایسا تو قیامت تک نہیں ہو سکتا"۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

"تمہیں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ ہمارے اپنے معاملات ہیں آگے بڑھو"۔

اس نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا۔ عورت چل پڑی۔ مگر چند قدم پر جا کر رک گئی کہ جھومر کے ہاتھ میں اس کے دائیں پاؤں کی زنجیر تھی جو اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔

ہاری نے جھلا کر ایک فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

جھومر کی طرف بڑھا اس کے ہاتھ سے زنجیر چھڑا کر اس کا بازو پکڑ کر اسے بیڈ پر دھکیل دیا۔

"آرام سے بیٹھئے" کرتا ہوں ابھی آپ کا بھی انتظام ۔۔۔ تم کیا دیکھ رہی ہو چلو"۔

اس نے اپنی آواز میں جی بھر کر تلخی سمو لی۔

عورت چل پڑی۔

ہاری نے اسے کوٹھڑی میں پہنچایا اور باہر سے دروازہ بند کرنے لگا۔

"تالا چابی نہیں چاہیے کیا؟" جھومر کی شرارت بھری آواز قریب ہی سے سنائی دی۔

ہاری نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

عورت بہت پرسکون انداز میں اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی تھی کہ یہ تو زندگی بھر کیلئے طے تھا۔ جیسے کا وقتی گھومنے آزادی۔

ہاری نے دروازہ بند کیا پھر جیب سے تالا نکالا اور لگا دیا۔ جھومر اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ اس کی طرف پلٹا۔

"اپنے پاس رکھئے اپنا تالا چابی"۔ اس نے چابیاں واپس جیب میں ڈالیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

جھومر قدرے دم بخود سی اسے راہداری کے موڑ تک گھورتی رہی۔

لال خان اپنے کمرے میں تھا۔ بالو بدستور برآمدے میں بیٹھی تھی۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی، بالو صرف ایک دل گیر سے ہوتے تھا کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ کبھی کبھی سوچ آتی وہ خواہش سے آزاد ہوتی تھی تو عجیب سا خوف رگ و پے میں اترنے لگتا تھا کہ جیسے ابھی لال خان دروازہ کھول کر باہر آئے گا اور اپنے ریوالور سے اس پر فائر کر دے گا۔

موت کا کیا ہے وہ تو آ ہی جاتی ہے مگر کچھ دل تو ٹھنڈا ہو۔

کبھی من چاہے موسم کی ہوائی تو چلے۔

کبھی گھڑی بھر کیلئے خواہش تعبیر کے نشان تک تو پہنچے۔

کبھی یوں بھی تو محسوس ہو کہ ہمیں بھی زندگی کی ہوا نے چھوا ہے۔

کبھی تو یہ احساس ہو کہ چاند کسی کی تنہائی سے ڈر آیا ہے۔

کبھی تو روح وصل کی سرشاری میں سرمست ہو کر رقص کرے۔

کبھی تو انتظار حد سے گزرے، کبھی تو من چاہی آمد ہو۔

کبھی زندگی روئے تو آنسو خوشی کا آسرا جائے۔

کبھی دل چلے تو من چاہی تسلیوں کی پھوار برسے۔

کبھی مر جانے کو جی چاہے تو کوئی زندگی آنکھوں میں سجا کر لائے۔

کبھی تمنا میں آگ کر جوگ بھرنے نکلیں تو کوئی شہر سجا کر ہمیں گھیرے۔

کبھی پھوٹ پھوٹ کر روئیں تو کوئی کوٹ کوٹ کر خوشیاں دل کے دامن میں بھرنے آئے۔ کبھی شدت غم سے مر جانے کو جی چاہے تو گلابوں کے ہار آئیں۔

کبھی ناامیدی کا اندھیرا ہو تو کوئی امکان کے چراغ روشن کرنے آئے۔

"ز" سے زندگی اور "د" سے دل تو حروف میں "د" پہلے آتا ہے۔ اس کی جذباتیت خطرناک حد کو چھو رہی تھی۔

"بالو"۔ پشت سے لال خان کی آواز آئی تھی۔ وہ چونکہ لاتعلق ہو کر گہرے خیالوں میں تھی۔ چونک کر اچھل پڑی۔ دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

"اندر کمرے میں آؤ۔ ضروری بات کرنی ہے۔ جلدی آؤ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

وہ مردانہ سرد لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

وہ بمشکل سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

لال خان بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ کھڑی رہی۔

"بیٹھ جاؤ"۔ اس نے فاصلے پر پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں کیا دکھ ہے بالو؟" اس نے بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں اس سے سوال کیا تھا۔

"میں بہت دکھی ہوں۔ میرے دکھ کبھی دور نہیں ہوتے"۔ وہ بے ساختگی سے بولی۔

"کس نے پوچھنے کی کوشش کی ہے؟" ہاری ہوئی وہ حالت تو تمہیں الجھی ہوئی تھی اس طرح کے سوال لاڈ سے ہوتے ہیں۔

"ایک دل ہے جو ہر لمحہ بہت اداس رہتا ہے۔ میری بھی نہیں سنتا"۔ وہ سرد آہ بھر کر بولی۔

جواب سے لال خان کا سیاہ چہرہ سرخ ہو کر بے جان ہو گیا۔

"دل لال کو کوئی خبر نہیں؟" لال خان نے اس کا چہرہ دیکھ کر سوال کیا۔

"نہیں بڑی محنت تھی خوش ہوں کہ کوئی لمحے کو وقت بھی ہے؟" اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ سے ملا ہے، پہچانا؟" وہ بہت دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"جس دن اس نے میری رونمائی کرتے ہوئے شعر پڑھا تھا" وہ بڑے آرام سے بولی کہ لال خان دم بخود سا رہ گیا۔

"پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی؟" اس کی آواز پر لرزش غالب آنے لگی۔

"نہیں اسے ملنے کے لئے تو تعلق ہی نہیں دی۔ اسے تو مزدوروں کو پیٹنے کی عادت ہے۔"

اس نے یہ گواہی دی کہ لال خان کے وہم میں اس کی سچائی کا یقین اتر گیا کہ وہ اس پر الزام دھر کر آدھا بوجھ اس طرف بھی سرکا سکتی تھی۔

"کیا بات ہے اس میں ایسی؟" احساس کمتری سے لال خان آدھا ہو گیا۔

"یہ تو میں اپنے آپ سے پوچھ رہی ہوں اب تک"۔ بالو کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"تمہیں معلوم نہیں بالو! عورت کی بے وفائی سے مرد اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ تم نے ہمیشہ کیلئے مجھے ذلیل کر دیا ہے"۔ اس کی آواز میں شکستگی تھی۔

"تم مجھے گولی مار دو، طلاق دے کر گھر سے نکال دو۔ مجھے سب منظور ہے"۔ وہ بولی۔

لال خان نے اس کی مضبوطی اور اپنی کمزوری کو بے پناہ محسوس کیا۔

"شکر ہے کہ تم نے مجھے پھر مرنے سے بچا لیا۔ عورت کی دغابازی کا دکھ ایسی گہری چوٹ ہے کہ جو سچا عاشق ہے میں اس کی پہلے سے زیادہ عزت کروں گا۔ اپنی چھت کمزور ہو تو بارش کو برا بھلا کیوں کہیں؟

میری طرف سے اب تم پر کوئی پابندی نہیں۔ صبح یہ گھر چھوڑ دینا۔ اب تم اس کمرے سے جا سکتی ہو جو دکھ تم نے دیا ہے مجھے ایک دن قدرت اس کا حساب خود لے گی"۔ وہ اس کی طرف سے پشت کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

بالو چپ چاپ کمرے سے باہر آ گئی۔

اس کا خیال تو یہ تھا کہ ہنگامہ برپا ہوگا، صبح تک وہ اپنے زخم سینکے گی۔

یہ لال خان تو بہت گھمبیر نکلا۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے اس پسندیدہ انسان کو پہلی مرتبہ سراہ رہی تھی۔

لڑکیوں کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی جیسے وہ دلہن کا ریکارڈ توڑ رہی ہوں مگر دلہن انہیں نہیں بخشے گی۔

"تمہارے پاس بلیو چوڑیاں ہیں تو وہ کیوں نہیں پہنیں" ستارہ نے روبی کو ٹوکا۔

"کیا تو گرائی بھی ہو گی؟" روبی نے سادگی سے پوچھا۔

"جی ۔۔۔ تو گرائی کی ایسی تیسی جب تم نے ہنگنگ کی ہے تو پوری کرو۔ جب یہ دکھ کا بیر جذبہ تک بیٹھا ہے" ستارہ نے بگھارا۔

"خبردار جو تم اس بیر جذبہ کی شان میں گستاخی کی۔ یہاں کی عزیز از جان دوست پیا ماسموئی ستارہ کی بھی بازار بچھا رہی تھیں بیچارے" ہیر نے ناراضگی کا سا بھی انداز میں گھورا گیا۔

"ہاں تو لائی تھی ہاں تم کیوں جل رہی ہو؟" روبی نے خفگی سے کہا۔

"بھئی اس خوشی کے موقع پر یہ تکرار کیسی جس کا جیسے دل چاہے تیار ہو جائے کوئی دراز نہیں لے گی۔" گھر والی بیچاری لڑنے کی عادت سے مجبور تھیں۔

"ارے کیا روشی آج سوتی رہے گی۔ جا کر اسے اٹھاؤ۔ ہم سب دلہن کے پاس جائیں گے وہ ہمارے ساتھ نہ جائے گی تو وہ سو جائیں گی؟" زری نے دوسری قسم کا رونا شروع کیا۔

"میں گئی تھی اسے اٹھانے۔ یوں غرائی جیسے نگل لے گی۔" حنا نے اپنی بپتا سنائی۔

"ہیں کیوں نہیں اٹھ رہی کہاں تو ہمارے خوشی کے نیند نہیں آ رہی تھی؟" سونا نے حسب توقع حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاری سے کہو وہ دستک دے کر بس آواز دے ڈالے دنیا کے اس کونے پر بھی سو رہی ہو گی تو اٹھ جائے گی۔" شمع مسکرائیں۔

"بالکل بھی سوٹ نہیں کرتی آپا۔ آپ کی یہ مخبر چھانٹ۔ وہ دلاور علی خان کی پوتی اور یاور علی خان ڈی سی کی اکلوتی بیٹی ہے۔ مذاق بھی اس کے سٹینڈرڈ کا کیا کیجئے" لالی نے ناگواری سے انہیں ٹوکا۔

"ہا۔۔۔ آہ۔۔۔ یہ کمبخت اسٹینڈرڈ" شمع نے آہ بھری۔ بھلا وہ باز آنے والی تھیں۔

"مگر آج کل وہ اتنی دیر تک کیوں سوتی رہتی ہے" سونا پریشان بولی

"نشہ چڑھا ہوا ہے شاید" شمع نے پھر ہنس کر لقمہ دیا۔

"کس چیز کا؟" حنا نے برا مان کر ان کی طرف دیکھا۔

"بھئی اتنی کیوٹ اتنی سمارٹ سی والدہ آئی ہیں"۔ شمع نے ماحول کے تیور دیکھ کر بات بدل ڈالی۔ یوں بھی روشی تو موجود نہیں تھی۔ انہیں مزا نہیں آ رہا تھا۔

"میں جا کر اٹھاتی ہوں دیکھتی ہوں کیسے نہیں اٹھتی" گھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کھانا لیتی جاؤ۔ سنا ہے کھانے سے نشہ ٹوٹ جاتا ہے" شمع ہنسیں۔

"پھر آپ اتر جائیں اس کے معدے میں یہ ٹونکا زیادہ موثر ہو گا"۔ روبی بڑی دیر سے برداشت کر رہی تھی جل کر

بولی۔

اسی لمحے ہاری بڑی عجلت میں ہال میں داخل ہوئی اور پورے میں نشانہ لگا کر کی طرف بڑھ گئی۔

"ہاری اٹھی روشی کیا؟" گھر نے سادگی سے پوچھا۔

جیسے خلفشار کر کے اخبار کھولنے نہیں۔ لڑکیوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

گھر کی ہی کرانھیں گھورنے لگی۔ ہاری جو آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا تھا۔ انگلی حیران پریشان سی اپنی طرف لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔

"جی مجھے کیا معلوم"۔ اس نے با آواز مشتعل کر کے جواب دیا اور فون کرنے لگا۔

"بھئی میرا مطلب ہے کہ تم نے اسے یہاں وہاں کہیں دیکھا تو نہیں۔ صاحب وہ لیٹ اٹھتی ہے تو کمرے میں ناشتہ کرتی ہے" گھر نے وضاحت میں کہا کر کیوں دیکھا اور وضاحت کی۔

"نہیں جی مجھے افسوس ہے۔ میں نے انہیں کہیں نہیں دیکھا"۔ ہاری نے نمبر ڈائل کرتے ہوئے بڑے مصروف اور جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

"دیکھو بیچارے کو افسوس ہے"۔ شمع نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے روبی کو چھیڑا۔

روبی منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"جاتی ہوں۔ میں اس کے پاس۔ تم لوگ اپنا اپنا کام کرو" گھر باہر نکل گئیں۔

"یا اللہ! کیا پورا اصطبل بیچ کر سوئی ہے" گھر نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔

"کیا ہے آپا؟" روشی جھومتی ہوئی دروازہ کھولنے آئی تھی۔

"ہوش کی دوا کرو۔ دس بج رہے ہیں۔ بڑی امی کو پتہ چل گیا تو خوب کلاس لیں گی"۔ گھر چلتی ہوئی اندر آ گئیں۔

روشی دھڑام سے پھر بستر پر اوندھی گر گئی تھی۔

"کیا قبر پر کر سوئی تھیں؟" اس نے جھک کر اس کا بازو زور سے ہلایا۔

"کیا ہوتا ہے؟" وہ خوابناک آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔ جو میں پوچھ رہی ہوں کیا ہوتا ہے" وہ ہنسیں۔

"کیا ہوتا ہے؟"

"تمہارا سر ہوتا ہے۔ یہ ایک عجیب قسم کا نشہ ہوتا ہے۔ مگر بہت جلد چڑھتا ہے۔ اب تم اٹھ جاؤ شرافت سے"۔ انہوں نے ایک دھپ لگا کر اس کی پشت پر۔

"آپا مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے۔ پلیز"۔

"روشی ۔۔۔ خدا کا سوچو۔ کیا کہیں گی وہ۔ وہم پڑ جائے گا انہیں کہ شاید تم خوش نہیں ہو۔ اور یہ اچھا نہیں ہو گا۔ یاد رکھنا

سوچ رہے ہوں گے۔"

"مگر میں کیا کروں..... کوئی کہانی ہوئی ہے میں نے۔ میری آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔ تو بتائیے کیا کروں۔ آپ اگر کہہ دیتے کہ میری رات سے طبیعت خراب ہے"۔ وہ غنودگی سے بول رہی تھی۔

گل نے اسے جھنجھوڑ کر سیدھا کر دیا۔

"کیا کرتی رہی ہو الٹی سیدھی حرکتیں۔ کیوں کہانی گولی ہے؟" گل سخت ناراضگی سے پوچھ رہی تھی۔

"نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور یوں لگ رہا تھا کہ اگر چند گھنٹے اور جاگتی رہی تو میری دماغی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ اور کیا کرتی پھر؟"

وہ منہ دوسری طرف پھیرے ہنوز خوابیدہ لہجے میں بول رہی تھی۔

گل چند لمحے بڑے فکرمند انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جھک کر اس کی پیشانی سے بال ہٹائے۔

"روشی..... میری جان..... کیوں نہیں آ رہی تھی نیند؟ اور کیا سوچ رہی تھیں۔ کیوں سوچتی ہو اتنا۔ کیا آفت آئی ہے تم پر۔ اور تم تو خالہ کے آنے پر بہت زیادہ خوش تھیں۔ پھر؟"

گل درحقیقت بہت پریشان ہو گئی تھی۔

"واقعی میں ہوں۔ مگر آپ فکرمند نہ ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں ہے پلیز آپا۔ آپ مجھے سونے دیں"۔

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "سارے گھر میں سب سے بڑی سوشل سپورٹ تو آپ ہیں میری۔ بس آج سو لینے دیجئے۔ اس کے بعد جو کہیں گی کروں گی۔ عمر بھر جاگ لوں گی"۔

"پھر اٹھ رہی ہو گی۔ گل اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ بے کار محنت ہو گی۔ مشکل ہی ہے جو آنکھ وہ خود [illegible] تھی اٹھ سکے۔

وہ دروازہ بند کر کے پلٹیں تو ہاری پر نظر پڑی۔ وہ بابا صاحب کی خواب گاہ سے نکل رہا تھا۔

"اے..... ہاری کے بچے، ادھر آ"۔ انہوں نے مصنوعی قسم کی خفگی کے ساتھ اسے پکارا۔

"جناب"۔ وہ بھی مسکراتا ہوا ان کی طرف آیا۔

"یہ تم لا کر دیتے ہو اسے ڈرگز وغیرہ؟"

"فرد جرم ہے کہ تحقیق؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"ہنہ..... ہماری ڈوز لے کر سو رہی ہے۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔ یقیناً تم ہی سے منگائی ہو گی"۔

"انٹیلی جنس بیورو کو آپ جیسی اہلیت کے ہی لوگ درکار ہوتے ہیں۔ پر یقین 'اپنے شکوک' کو ایمان کا درجہ دینے والے ٹکڑی پر ہاتھ رکھتے ہی الزام لگانے والے۔ ایسا گھاس کھایا ہوا لگتا ہوں آپ کو۔ وہ منگائیں گی اور میں لا دوں گا۔ رات میرے سامنے ہی کچن میں فریج سے نکال کر کھٹ سے گولی کھائی ہے"۔

"تم نے روکا نہیں..... پوچھا نہیں؟" گل نے ہنوز ناراض لہجے میں سوال کیا۔

"روکا نہیں جا سکتا تھا۔ پوچھ سکتا تھا مگر پوچھنے سے کیا ہوتا ہے۔ سونے دیجئے۔ انہوں نے کسی سے گولی کی اچھی لی ہے"۔

"مگر بات تو تشویشناک ہے۔ وہ ایسا کیوں کرنے لگی ہے۔ کیا مسئلہ ہے اسے۔ معلوم تو ہونا چاہئے"۔ گل فکرمندی سے کہہ رہی تھیں۔

"ہوسٹل کی دین ہے۔ مسئلہ حل کرنے کے بجائے فرار حاصل کر لیتی ہیں۔ خود ہی نارمل ہو جائیں گی۔ آپ فکرمند نہ ہوں"۔ ہاری نے تسلی دی۔

"تو..... فوری کیسے نارمل ہو جائیں گی۔ اور نارمل ہوتے ہوتے تو اسے خواب آور دواؤں کی عادت ہو جائے گی۔ آخر کل کو اس کی شادی ہو گی۔ کیا سوچیں گے اس کے سسرال والے"۔ گل نے اسی انداز میں کہا۔

ہاری ان کی دوراندیشی پر مسکرا دیا۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

"کوئی بات تو بہرحال ہے۔ ورنہ یوں تو نہیں ہوتا۔ وہ تو ابھی بہت کم عمر ہے ہاری"۔

"آپ فکرمند نہ ہوں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن وہ ہو جائیں گی"۔ ہاری نے تفریحاً جواب دیا۔

"شاید تمہیں پتہ نہ ہو۔ وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔ کہیں کچھ کر نہ بیٹھے۔ حالانکہ ہاری نعیم بہت اچھا ہے اس"۔ وہ ہاری کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"جی..... کیا شک ہے اس میں؟" ہاری دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"ہمارے ہاں لڑکیاں کسی کو پسند کرنے کی جرأت تو کر نہیں سکتیں۔ جہاں بڑے رشتے کر دیتے ہیں۔ وہیں اپنے ذہن موڑ لیتی ہیں۔ اب یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ کیوں؟" وہ درحقیقت بہت پریشان تھیں۔

"جی"۔ ہاری نے جلدی سے کہا اور ریسٹ واچ پر نظر دوڑانے لگا۔

"کہیں جا رہے ہو؟" گل کو اس کا [illegible] دیکھتے ہی گوارا نہ ہوا۔

"جی سرائے جا رہا ہوں۔ کاکا جان کو وہیں پر جانا ہے۔ انہوں نے بلوایا تھا"۔ اس نے جواب دیا۔

"ایک تو کاکا جان کے سینے تھم نہیں ہوتے۔ وہاں انہیں کوئی بندہ نہیں مل سکتا۔ آگے روز سے تمہیں روز ہی بلوا لیتے ہیں..... وہ بھی"۔

"بہت عرصہ ہو گیا نیچے بھی نہیں آیا۔ اب تک خاصا بڑا ہو گیا ہو گا۔ اردو بولنا آ گئی اسے یا اب بھی انگریزی میں [illegible] ہے؟" وہ مجرمانہ ہنسیں۔

"میں نے بھی اسے خاصے عرصے سے نہیں دیکھا۔ وہ دوسری کالونی میں ہوتا ہے ناں۔ ویسے آ گئی ہو گی اسے اردو بولنا"۔ وہ ہنس دیا۔

"سرائے والی حویلی میں یہاں کی طرح۔ رونق تو نہیں ہو گی۔ کون کون ہوتا ہے وہاں؟" گل کو نیا سوال سوجھا۔

"وہاں ڈیکوریشن زیادہ ہے۔ یہاں بندے زیادہ ہیں"۔ وہ مسکرا دیا۔

"اچھا — میں چلتا ہوں — دیر ہو رہی ہے"۔

"کاکا جان سے کہنا۔ اس مرتبہ چھٹیوں میں چند دنوں کیلئے یہاں بھیج دیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں اس کو گھر پر لڑتے جھگڑتے ہوئے"۔ گلو ہنس کر آگے بڑھ گئیں۔

ہادی بھی باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیا۔

بڑی امی نے بڑے اہتمام سے تیار ہوئی لڑکیوں کو دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ یہ جان کر کہ عنقریب یار علی خان کی خواب گاہ پر حملہ کرنے والی ہیں۔ انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔

"بیٹھیں رہو تم لوگ۔ دلہن ناشتہ کر لیں گی تو میں خود لے آؤں گی یہاں"۔

اب لڑکیاں بے چاریاں منہ لٹکا کر انتظار میں بیٹھ گئی تھیں۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد عالم تاب ماہین کے ساتھ ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔ کمرے میں ایک دم ہلچل سی شروع ہو گئی۔

شاکنگ پنک کامدار کرتے شلوار اور دوپٹے میں ماہین بہت خوش اور بہت فریش نظر آ رہی تھی۔

"اللہ — کتنی پیاری ہیں یار ماموں۔ کیسی اچھی دلہن ملی ہے اس عمر میں انہیں؟" مریم روبی کے کان میں منمنائی۔

"اب بوڑھے تو نہیں ہیں وہ۔ ان کی پہلی شادی تو خاصی کم عمری میں ہوئی تھی"۔

ماہین ان سب کے سلام وصول کر کے صوفے پر بڑی امی کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔ اس کی نظریں ادھر ادھر روشی کو تلاش کر رہی تھیں۔

کہاں تو پرشوق انداز بیتاب تھا کہ بے تابی سوا ہے۔ کہاں یہ کہ اب تک نظر نہیں آئی۔

"کیا آپ یار ماموں کے ساتھ ہری پور چلی جائیں گی؟" تابیہ نے پرشوق انداز میں اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

ماہین، عالم تاب کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرا کر رہ گئی۔

"نہیں تو کیا تمہارے ساتھ رہنے کیلئے یار ماموں اتنی دور سے دلہن لائے ہیں"۔ لالی چیخ پڑی۔

"مگر کچھ دن تو آپ کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے۔ یار ماموں تو اپنی طرح کریں گے ورنہ آپ کو۔ جس طرح وہ نظر نہیں آتے۔ پتہ چلتا ہے۔ رات آئے تھے۔ ہم سو کر بھی نہیں اٹھے اور وہ چلے بھی گئے"۔ تابیہ نے اپنے خدشات ظاہر کیے۔

"روشی کہاں ہے؟" بڑی امی نے موجود لڑکیوں پر جھٹ نظر ڈال کر قدرے چونک کر پوچھا۔

"سو رہی ہیں"۔ مریم ویسے ہی لاابالی تھی۔ جھٹ بول پڑی۔

"اس — یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟" عالم تاب برہمی سے بولیں۔ ماہین بھی چونک پڑی۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بڑی ممانی۔ رو رہی تھی ناں اس نے "بس اس کی وجہ سے سو رہی ہے"۔ گلو نے جھٹ

وضاحت کی۔

"کیا ہوا اسے؟" ماہین کچھ پریشان ہو گئی۔

"کچھ نہیں — ویسے ہی ٹمپریچر سا ہو گیا تھا"۔ اس نے گھبرا کر عالم تاب کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔ میں خود چلی جاؤں گی اس کے کمرے میں"۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"گلو — اپنی ممانی کو لے جاؤ روشی کے پاس۔ ہو سکتا ہے وہ ماہین کو دیکھ کر ایک گھنٹے کے بعد ہی چھٹی رات ہو جائیں"۔ عالم تاب گلو سے مخاطب ہوئیں۔

گلو اٹھ کھڑی ہوئی اور ماہین بھی۔

"روشی کو لے کر یہیں آ جائیے گا۔ ابھی تو ہم نے ٹھیک سے دلہن کو دیکھا بھی نہیں"۔ حنا مسکرائی۔

عالم تاب نے اس کے سر پر شفقت سے بھرے انداز میں ایک چپت لگائی اور ان کے باہر جانے سے پہلے خود چلی گئیں۔

گلو ماہین کو لے کر روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔

"روشی — دیکھو کون آیا ہے؟" گلو نے اس کا بازو ہلا کر سیدھا کیا۔

روشی نے بمشکل آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ — السلام علیکم خالہ"۔

"وعلیکم السلام۔ اس قدر سوئی ہو۔ چاندنی ماند پڑ گئی ہے"۔ ماہین اس کے بستر پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

"جی بس — وہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ چلے گئے کیا؟" معاً اس نے چونک کر پوچھا۔

"کون؟" ماہین کی نظریں جھک گئیں۔ یہ دلہن کا بے ساختہ سا انداز ہوتا ہے۔ رخصتی سفر کے ہم سفر پر۔

"ہری پور؟" اس نے ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹے۔

"نہیں — شام کو جائیں گے"۔

"آپ بھی؟" اس نے چوٹی بناتے بناتے رک کر ماہین کا چہرہ دیکھا۔

"ظاہر ہے"۔ وہ مسکرا دی اس کے بچگانہ سے سوال پر۔

"میں تو نہیں جانے دوں گی آپ کو۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہم تو ابھی ٹھیک سے آپ سے ملے بھی نہیں"۔ اس کا انداز قطعی تھا۔

"کبھی بھی عالم ماموں شادی کے بعد بھی آتے ہیں"۔ گلو ہنس کر بولیں۔ وہ اس کا تصور کر کے ہنسنے لگی تھیں۔

ماہین بھی مسکرا دی۔

"چاچا کیا کر رہے ہیں؟" اس نے جانے کیوں پوچھا۔

"کاکا جی دیکھ رہے ہیں"۔ اس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"کاکا جان سے کہنا۔ اس مرتبہ پوتوں کو چھٹیوں میں چند دنوں کیلئے یہاں بھیج دیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں اس گھر کی رونق دیکھے ہوئے۔" گل ہنس کر آگے بڑھ گئیں۔

ہاری بھی باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیا۔

بڑی امی نے بڑے اہتمام سے تیار ہوئی لڑکیوں کو دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ یہ جان کر کہ عنقریب یار علی خان کی خواب گاہ پر حملہ کرنے والی ہیں۔ انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔

"تمیں رسوم لوگ۔ دلہن ناشتہ کر لیں تو میں خود لے آؤں گی یہاں۔"

اب لڑکیاں بے چاریاں منہ لٹکا کر انتظار میں بیٹھ گئی تھیں۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد عالم تاب ماہین کے ساتھ ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔ کمرے میں ایک ہلچل سی شروع ہو گئی۔

شاکنگ پنک کامدار کرتے شلوار اور دوپٹے میں ماہین بہت خوش اور بہت فریش نظر آ رہی تھی۔

"اللہ۔۔۔ کتنے گی ہیں یاور ماموں۔ کیسے اچھی دلہن لی ہے اس عمر میں انہیں؟" مریم روبی کے کان میں منمنائی۔

"اب بوڑھے تو نہیں ہیں وہ۔ ان کی پہلی شادی تو خاصی کم عمری میں ہوئی تھی۔"

ماہین ان سب کے سلام وصول کر کے صوفے پر بڑی امی کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔ اس کی نظریں ادھر ادھر روشی کو تلاش کر رہی تھیں۔

کہاں تو پرشوق انداز بیتاب تھا کہ بے تابی سوا ہے۔ کہاں یہ کہ اب تک نظر نہیں آئی۔

"کیا آپ یاور چچا کے ساتھ ہری پور چلی جائیں گی؟" تابیہ نے پرشوق انداز میں اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

ماہین، عالم تاب کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرا کر رہ گئی۔

"نہیں تو کیا تمہارے ساتھ رہنے کیلئے یاور ماموں اتنی دور سے دلہن لائے ہیں۔" لالی چہک پڑی۔

"مگر کچھ دن تو آپ کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے۔ یاور ماموں تو اپنی طرح کریں گے ورنہ آپ کو۔ جس طرح وہ نظر نہیں آئے۔ پتا چلتا ہے۔ رات آئے تھے۔ ہم سو کر بھی نہیں اٹھے اور وہ چلے بھی گئے۔" تابیہ نے اپنے خدشات ظاہر کیے۔

"روشی کہاں ہے؟" بڑی امی نے موجود لڑکیوں پر جھٹ نظر ڈال کر قدرے چونک کر پوچھا۔

"سو رہی ہیں۔" مریم ویسے ہی لاابالی تھی۔ جھٹ بول پڑی۔

"اس۔۔۔ یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟" عالم تاب برہمی سے بولیں۔ ماہین بھی چونک پڑی۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بڑی ممانی۔ رو کھائی تھی ناں اس نے۔ بس اس کی وجہ سے سو رہی ہے۔" گل نے جھٹ

وضاحت کی۔

"کیا ہوا ہے؟" ماہین کچھ پریشان ہو گئی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ ویسے ہی ٹمپریچر سا ہو گیا تھا۔" اس نے گھبرا کر عالم تاب کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔ میں خود چلی جاؤں گی اس کے کمرے میں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"گل۔۔۔ اپنی ممانی کو لے جاؤ روشی کے پاس۔۔۔ ہو سکتا ہے یاور ماہین کو لے کر ایک گھنٹے کے بعد ہی ہری پور روانہ ہو جائیں۔" عالم تاب گل سے مخاطب ہوئیں۔

گل اٹھ کھڑی ہوئی اور ماہین بھی۔

"روشی کو لے کر نہیں آ رہے گل؟ ابھی تو ہم نے ٹھیک سے دلہن کو دیکھا بھی نہیں۔" حنا بسوری۔

عالم تاب نے اس کے سر پر شفقت سے بھرے انداز میں ایک چپت لگائی اور ان کے باہر جانے سے پہلے خود چلی گئیں۔

گل ماہین کو لئے روشی کے کمرے میں چلی آئی۔

"روشی۔۔۔ دیکھو کون آیا ہے؟" گل نے اس کا بازو چھو کر سیدھا کیا۔

روشی نے بمشکل آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ پھر تھکی سی ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ۔۔۔ السلام علیکم خالہ۔"

"وعلیکم السلام۔ اس قدر سوؤ گی۔ چاندنی رات ہے۔" ماہین اس کے بستر پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

"جی بس۔۔۔ وہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یاور چچا چلے گئے کیا؟" معاً اس نے چونک کر پوچھا۔

"کہاں؟" ماہین کی نظریں جھک گئیں۔ یہ لڑکی کو بے ساختہ سا انداز ہو گیا کہ اپنے رتجگے سفر کے معاوضہ کر رہی ہے۔

"ہری پور!" اس نے ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹے۔

"نہیں۔۔۔ شام کو جائیں گے۔"

"آپ بھی؟" اس نے چوٹی بناتے بناتے رک کر ماہین کا چہرہ دیکھا۔

"ظاہر ہے۔" وہ مسکرا دی اس کے بچگانہ سے سوال پر۔

"تم تو نہیں جانے دوں گی آپ کو۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہم تو ابھی ٹھیک سے آپ سے ملے بھی نہیں۔" اس کا انداز قطعی تھا۔

"کبھی کبھی عالم سماج شادی کے بعد بھی آ جاتا ہے۔" گل ہنس کر بولیں۔ وہ اس کا بکھرا ہوا کمرہ سمیٹنے لگی تھیں۔

ماہین بھی مسکرا دی۔

"چچا کیا کر رہے ہیں؟" اس نے جانے کیوں پوچھا۔

"کتابیں دیکھ رہے ہیں۔" اس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔

"اب بھی ماتھیں دیکھ رہے ہیں؟
آپ کو برا نہیں لگا؟" اس نے ترددانہ اور خوشیوں کے لو دیتے نہال ہوتی ماہین سے پوچھا۔

"میں تو ادھر آ رہی تھی تم لوگوں کے پاس دو دیکھے ہیں۔ اچھا ہے۔ مصروف ہیں۔" ماہین نے مسکرا کر گھڑی تھام لی۔ جواباً گلو نے مسکراہٹ لبوں پر بکھیری۔

روشی منہ ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلی گئی۔

"بابا صاحب اور یاور ماموں نے ایک سے ایک چیز اس کو مہیا کی ہوئی ہے۔ مگر اس میں ذرا سلیقہ نہیں ہے۔" گلو اس کی ڈریسنگ ٹیبل ٹھیک کرتے ہوئے ماہین سے مخاطب ہوئی۔

"یہ دیکھیں۔ یہ ہیئر برش۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے۔ یاور ماموں نے باہر سے لا کر دیا تھا۔ ملاحظہ کیجئے۔ اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

"آپ لوگوں کے نزدیک سونے چاندی ہاتھی دانت کی اہمیت ہوگی۔ جب بندے کا دل ہی خاک ہو تو پھول بھی ببول سب لگتے ہیں۔ ہیں تو ہیں۔ اب کیا سر پر رکھ کر رکھوں۔" وہ تولیے سے چہرہ پونچھتے ہوئے نخوت سے کہہ رہی تھی۔

"خدانخواستہ۔ بھئی تمہارا دل کیوں خاک ہونے لگا۔ بڑی بات۔ ایسے نہیں کہتے۔" ماہین نے ٹوک دیا۔

روشی نے عجیب سے انداز میں گہری سانس لی اور بالوں میں برش چلانے لگی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں گلو آپا؟" اس نے باہر جاتی ہوئی گلو کو آئینے میں دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

"ماما کو کہتی ہوں۔ تمہارا ناشتہ بھجوا دے۔"

"تم کتنی لکی ہو روشانے! سب تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔" ماہین نے جیسے اس کا دل بڑھایا۔

"سب کیا..... بس یہ گلو آپا..... سب کا خیال رکھتی ہیں۔ بس عادت سے مجبور ہیں بے چاری۔ میں کہیں جاؤں تو یہ سب سے زیادہ یاد آتی ہیں مجھے۔ آپ کو معلوم ہے جن سے یہ انگیج ہیں وہ بڑے غصے والے ہیں۔"

روشی نے ماہین کو اطلاع دی۔

"اچھا! پھر تو بہت جچے گی۔ خطرہ وہاں ہوتا ہے جب دونوں پارٹنر غصے والے ہوں۔ کیا نام ہے گلو کے منگیتر کا؟"

"معصوم۔ بڑی امی کے سگے بھتیجے ہیں۔ زری آپی کے بھائی۔"

"اچھا اچھا۔" ماہین فوراً سمجھ گئی۔

"گلو کا اصلی نام کیا ہے؟"

"گل رز دار علی خان۔" وہ مسکرا کر ماہین کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"آپ نے مہندی پارلر سے لگوائی تھی؟" اس نے ماہین کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں، میری دوست تہمینہ نے لگائی تھی۔ بڑی ایکسپرٹ ہے وہ۔"

"واقعی بہت کلاسک ہے ڈیزائن میں۔" اس نے سراہا۔

"مجھے بھی لگانی آتی ہے۔ ابھی ہی کون سا گھر جانا ہے؟ لگا دوں گی۔" ماہین نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں شوق روز روز مہندی وہندی کا۔ میرا دل نہیں چاہتا کچھ بھی کرنے کو۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"کیوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہارے دل کو؟" ماہین نے بڑی گہری نگاہ سے اس کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"ماہ..... ایک بات پوچھوں؟" اس نے یک دم [illegible]۔

"پوچھو۔"

"آپ نے خوشی کے ساتھ اپنی شادی کی ہے؟"

ماہین اس کے انداز پر بے ساختہ مسکرا دی۔

"ظاہر ہے۔ ورنہ مجھے کون مجبور کر سکتا تھا۔"

"اچھا۔ کیا آپ کو سچ مچ میں پتا تھا کہ یاور آپ کو پسند کرتے ہیں؟"

ماہین کو ایسا سارا شرم سی آ گئی۔ اس نے روشی کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"بڑی شتاب کرنے لگی ہو [illegible] کالج جاتی ہو تم بھی کرتی ہو؟" اس نے بات گھمائی۔

"کبھی کبھی تو یقین کریں۔ مجھے سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ میں بے حد احمق ہوں۔ کوئی میری بات کو اہمیت ہی نہیں دیتا۔" وہ اداس ہو گئی۔

"ارے نہیں بھی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی ناسمجھ ہو۔" ماہین کو بہت ہنسی آ رہی تھی۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔

"اچھا بتاؤ۔ دیر تک کیوں سوتی رہی ہو؟"

"رات کو دیر سے جو سوئی تھی۔" اس کا موڈ جیسے آف تھا۔

"اور دیر سے کیوں سوئی تھیں؟"

"نیند نہیں آتی۔" اس نے صاف بات کی۔

"اور نیند کیوں نہیں آتی؟"

"پتا نہیں۔" وہ نظریں چرا گئی۔

"پتا نہیں روشانے تم مجھے اس مرتبہ اتنی بدلی بدلی ہوئی محسوس ہو رہی ہو۔ یوں جیسے تمہارے ساتھ کوئی زبردست واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر تمہاری سوچ، تمہارے انداز ہر چیز بدلی ہوئی ہے۔" ماہین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"اپنی منگنی سے خوش نہیں؟"

"یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے۔" اس نے منہ بنایا۔ "ساری دنیا میں لڑکیوں کی منگنیاں ہوتی ہیں۔"

"تو پھر کیا لاکھوں میں ایک شادی خوشی کی بات ہوتی ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"کم از کم مجھے تو اپنی شادی وادی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔" روشی نے منہ بنایا۔

"پھر اپنی دلچسپی کا کام کرتا۔" ماہین نے کہا اور ہنسی خیز انداز میں ہنس پڑی۔

روشی کا دل دھڑک گیا۔

"جی۔ میں بھی نہیں۔" اس نے تجاہل برتا۔

"بھول گئے ہیں تمہارے اچھے خان اور فرشتے بھی۔ چلو گھر جا کر بھی فی الحال یہ موضوع موقوف کر دیتے ہیں۔ پھر کسی اور وقت میں بات کریں گے۔" ماہین نے گھو کو آتے دیکھ کر موضوع بدلا۔

"بابا صاحب کہہ رہے ہیں دلہن کو ہال میں لے کر آؤ۔ سب گھر والوں کے ساتھ تصویریں بنیں گی۔"

"کھینچے گا کون؟" (دھیان اسی دشمن جاں کی طرف جا رہا تھا)۔ اس نے پوچھا۔

"آغا۔ بڑی زبردست فوٹوگرافی کرتے ہیں۔" گھو نے بتایا۔

"آغا؟" ماہین نے سوالیہ انداز میں روشی کی طرف دیکھا۔

"گھو آپا کے بڑے بھائی۔ سیہ بھائی کے شوہر نامدار۔" روشی نے غائبانہ تعارف کا مرحلہ طے کیا۔

"روشی تو ابھی ناشتہ کرے گی۔" ماہین نے گھو کی طرف دیکھا۔

"ہاں تو آ جائیں گی۔ وہاں ابھی دیر تک سیشن ہوگا۔" گھو ہنس کر گویا ہوئیں۔

"چلیں آپ تو چلیں۔" انہوں نے ماہین سے کہا۔ تو ماہین دوپٹہ سر پر درست کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لال خان نہیں آیا؟" بالو کی ماں نے اسے پہلی مرتبہ تنہا گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر تعجب سے سوال کیا۔

بالو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ساتھ لایا ہوا بیگ ایک طرف رکھ کر تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی۔

"طبیعت کیسی ہے تیری؟ چہرہ اترا اترا لگ رہا ہے۔" بالو کی ماں فکرمند سی ہوئی۔

"ابھی مجھ سے کوئی بات نہ کرو ماں۔ آرام کرنے دو مجھے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"تو کیا ہل چلا کر آ رہی ہے۔" وہ بھی چڑ کر بولی۔

"رات بھر سوئی نہیں۔ نیند آ رہی ہے مجھے۔"

"کیا ڈھول بجاتی رہی ہے رات بھر؟" اس کی ماں کھٹک سی گئی تھی۔

"ہاں۔ سارے محلے کو جگا کر آ رہی ہوں۔ بس تم چپ ہو جاؤ۔" وہ اسی طرح بیزار کن انداز میں بولی۔

اس کی ماں نے گھڑی بھر کو اس کے سراپے پر نظر ڈالی اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

بالو آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گئی۔

"اری۔ تیری سونے کی چوڑیاں کہاں ہیں؟"

اس کی ماں دوبارہ آئی تو سونی کلائیاں دیکھ کر ضبط نہ کر سکی۔ آخر سارے محلے میں اس کی بیٹی کی دلہن بھر سونے کی چوڑیوں کے چرچے تھے۔

"جس کی تھیں۔ اسے دے آئی ہوں۔" وہ دوسرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"کس کی تھیں؟" وہ ایک دم ہونق سی ہو گئی۔

"لال خان کی اور کس کی۔"

"اب وہ پہنے گا چوڑیاں؟" وہ حیرت سے بولی جس میں طنز بھی تھا۔

بالو چپ رہی۔

"کیا وہ چھوڑ آئی ہوں میں؟" اس کی ماں کے تو اوسان خطا ہونے لگے۔

"ہاں اب چپ بھی ہو جاؤ۔ کیا چوڑیاں چوڑیاں لگا رکھی ہے۔ چوڑیاں نہیں تھیں۔ وہ اس کی بیڑیاں تھیں۔ جو ڈالی ہوئی تھیں پیروں کیلئے۔"

اس کی ماں جو باہر جانے لگی تھی۔ گرتی پڑتی پلنگ تک واپس آئی۔

"تو کر آئی ہے؟"

"کوئی اچھا تو چاہیے تھی۔ مگر ہو گئی نہیں۔ طلاق لے آئی ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہیں بوجھ نہیں بنوں گی۔"

"ہائے۔" اس کی ماں نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "سمجھا کیا لے کے آئی ہے؟"

"یہی کچھ۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"کیوں کھوں بی۔ جو سوال ہے ابھی وہ ہے۔ گھر سے نکال دیا ہے اس نے تجھے؟"

اس کی ماں کا تو دل بیٹھنے لگا۔ اس میں کھڑا ہونے کی سکت نہیں رہی۔ فرش پر بیٹھ گئی۔

"جو کچھ بھی ہے۔ وہی ہوا ہے اور کیا بتاؤں؟" وہ چڑ کر بولی۔

"ارے وہ تو بڑا بھلا آدمی تھا۔ ایسا کیا اسے کیا ہوا؟ کیوں کالک مل دی اس نے ہمارے منہ پر۔ ارے ـــــ ارے اسے لات گئی میں ـــــ برباد ہو گئی۔"

وہ دونوں سر پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔

"یہ کیا بین کر رہی ہو۔ مر گئی ہوں میں؟" وہ بیزاری سے بولی۔

"ارے کاش مر جاتی۔ تو نے تو ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑا۔" وہ زور زور سے رونے لگی۔

"دیکھو ـــ اماں۔ بند کرو یہ رونا دھونا۔ جب مجھے کوئی دکھ نہیں تو تمہیں کیا ہے؟" وہ گہری گہری سانس لیتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ارے کتنی نحوس ہے تو۔ بھرا گھر راس نہ آیا تجھے۔ عورت کو روتا گھر تو اچھا ہوتا ہے۔ ارے لات مار کر یہاں کیوں آ گئی۔ کیوں نہ اب مری۔ آدھی عمر تجھے بیاہنے کی فکر میں گھوئی۔ آدھی دکھ میں جائے گی۔ کس نحوس گھڑی پیدا ہوئی تھی۔"

"اگر تمہیں اتنا دکھ ہے تو یہاں سے بھی چلی جاؤں گی۔ مگر خدا کیلئے تم چپ ہو جاؤ۔"

"کہاں چلی جائے گی۔ وہ دوسرا خصم ڈھونڈ لیا ہے۔ گھوری۔" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بالو۔ وہ بارہ لیٹ گئی۔

"اُمے بالو کے ابا۔ پہلے ہی کہا تھا۔ اچھی طرح دیکھ لو نہیں سنی میری۔ آگئی ہے بیٹے پر موسٹ کرنے۔"

بالو اٹھ کر دوسری طرف برآمدے میں پڑے تخت میں آکر لیٹ گئی۔ پڑوسنیں دیوار پر آگئی تھیں اس نے انجان بن کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔

رات ایک بجے کا عمل تھا۔

وہ بری طرح تھک کر سویا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک ہتھوڑی کی طرح لگی تھی۔ اعصاب پہ۔۔۔ تو کبھی چاہا کہ یہ بن جائے۔ پڑا سوتا رہے۔

مگر دستک...... انگوٹھی سے اور بڑی احتیاط سے دی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن فوراً رشی کی طرف گیا۔

اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا کی۔ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور تنگ آئے ہوئے انداز میں چپل گرائی۔ اگلے ہی لمحے یوں اچھل کر پیچھے ہٹا تھا۔ جیسے بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ سامنے جھومر کھڑی تھی۔

"آپ..... اس وقت؟" اس کے منہ سے یہی نکل سکا۔

"مری گھڑی دیکھ کر نہیں آتی"۔ جھومر تیز زرد رنگ کا بڑا سا مکمل سوٹ اور ایک ایک بالشت کے طلائی آویزے پہنے بڑی بے خوفی سے مسکرا رہی تھی۔

ہاری نے قدرے سمٹ کر سامنے کا اور سیہ کے بیڈروم کی طرف دیکھا۔

"کیوں آئی ہیں؟" اس نے رکھائی سے پوچھا۔

"چابی دو اس کوٹھڑی کی۔ اس نے آج دن بھر کھانا نہیں کھایا ہے"۔

"میں صبح محترمہ کی خوراک کا انتظار کر کے گیا تھا۔ آپ ہلکان نہ ہوں"۔ اس نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

"جھومر نے کہنی تک بازو دروازے اور چوکھٹ کے درمیان اڑا دیا۔

ہاری نے بے بسی سے دروازہ پھر سے کھول دیا۔

"جی؟"

"چابی چاہیے۔ ہم رات کو باتیں کرتے ہیں۔ دکھ سکھ کہتے ہیں"۔

"وہ قیدی ہے بڑے خان کی۔ آپ ان سے چابی لے لیں۔ مجھے نہیں پتا"۔

"کون سے ضابطے کے تحت قیدی ہے وہ یہاں۔ ایک منٹ میں بڑے خان کو پھنسوا سکتی ہوں۔ تمہارا نام بھی آئے گا ان کے ساتھ"۔

"خدا کیلئے میرا نام تو ضرور لے دیں۔ مجھے تو واقعی آپ پھانسی لگوا دیں۔ بہت بڑا احسان ہوگا یہ مجھ پر"۔ اس نے زچ

ہو کر جواب دیا۔

"چابی مجھے تمہارے دشمنوں کو"۔ وہ مسکرائی۔

"چلیے۔ چابی ٹھیک ہے۔ کم از کم اس طرح ہی سے ہمارا سیشن ہو جائیگا"۔ اس نے جھومر کی جان خلاصی کروائی۔

"اب آپ جائیے اور چابی بڑے خان سے لیجئے۔ آپ مجھے تو بخشیں۔ چین کرنے دیں۔ وہ چابی کی پلیٹ میں رکھ کر آپ کو دے گئے"۔ ہاری نے بڑے سبھاؤ سے اپنے گلے کا ذکر کیا۔

"مگر میں تو تم سے لینے آئی ہوں"۔

وہ ہنوز چوکھٹ کو گھیرے کھڑی تھی۔ وہ دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا۔ ہاری کے ذہن میں ایک دم ترکیب آئی۔ جیسے بجلی کوند جاتی ہے۔

"لے جائیے چابی۔ اور چھوڑیے میری جان"۔ وہ پلٹا۔۔۔۔ اور مصطفیٰ کی ایک کوٹھڑی کی چابی لا کر اسے تھما دی۔

"شکریہ۔۔۔ بے حد شکریہ۔ کاش یہ تکرار کچھ دیر اور چلتی۔ بڑا اچھا لگ رہا تھا"۔

وہ جھومر سے بلی۔ ہاری نے موقع غنیمت جان کر جھٹ دروازہ بند کر لیا۔ جیسے ہی اندازہ ہوا کہ وہ جا چکی ہے وہ اپنی چپل اٹھا کر سیدھا ابا کی بیٹھک کی طرف چل دیا۔

"جان چھوٹ جانے کے احساس سے ایک عجیب سی طمانیت جسم و جاں پر طاری ہوگئی۔

بڑے ابا کی بیٹھک میں بڑا دبیز کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ وہ تکیہ کھینچ کر دراز ہو گیا تھا۔

"اب اگر انہوں نے مزید پریشان کیا تو مقدمہ سپریم کورٹ کے حوالے کر کے میں فارغ ہو جاؤں گا"۔ فیصلہ کرنے کے بعد تو اور بھی ذہن پر سکون ہو گیا۔

بمشکل تین چار منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

ہاری کا جی چاہا کہ دروازہ اکھاڑ کر اپنے سر پر دے مارے۔

"کون ہے؟ کھلا ہے دروازہ"۔ اس کے لہجے میں تیزی، بے زاری اور جھلاہٹ تھی۔

"خان..... باہروں آؤ تساں"۔ سرسوتی کی آواز میں خوف و گھبراہٹ کا ملا جلا تاثر تھا۔

وہ فوراً باہر آیا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے قدرے سراسیمگی سے پوچھا۔

"او..... جھومر کیڑی پئی ساں۔ او بے ہوش ہو ساں۔ تے خون بھی نکل ساں"۔

(وہ قیدی نہیں ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اور خون بھی نکل گیا ہے)

"خون.....؟" ہاری بری طرح چونک پڑا۔

"آہو جی"۔ سرسوتی کی آواز کانپ رہی تھی۔

ہاری نے سرسوتی سے پہلے آگے قدم بڑھا دیے تھے۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆

وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا گو کہ ظاہری طور پر بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔

حویلی کے پچھلے حصے میں پہنچا تو جھومر اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے نظریں چرا کر جھومر سے سوال کیا۔

"کیا پتا کیسے کیا ہوا ہے؟" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اس عورت نے سر پھوڑ لیا ہے' خون نکل رہا ہے؟" اس نے قدرے ناراض انداز میں دریافت کیا۔

"اس کی کوٹھری کے اوپر جالیاں بنی ہوئی ہیں' اسٹول پر چڑھ کر خود جھانک لو۔" اس نے راہداری کے ایک کونے میں رکھے اونچے بوسیدہ اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

ہاری نے مشکوک سی نظروں سے ان کی سمت دیکھا پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھا۔ اسٹول گھسیٹا اور چڑھ کر اندر جھانکنے لگا۔

عورت جھلنگا سی چارپائی پر گھٹنوں پر سر دیے بیٹھی تھی۔ کم پاور کے بلب کی وجہ سے کچھ صاف دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے پیچھے رخ ہو کر کچھ سوچا تھا اور اسٹول سے پیچھے ہٹ آیا تھا۔

"وہ تو بے چاری ٹھیک ٹھاک ہے' آپ کو وہم ہوا تھا۔" ہاری نے بغل میں سے چابیاں نکالتے ہوئے دروازے کے تالے میں جھومر سے کہا۔

"میں نے اس کے رونے کی آواز سن کر اسٹول پر چڑھ کر اس سے باتیں بھی کی ہیں اور اسے دیکھا بھی ہے۔"

اس کی بات مکمل ہونے تک وہ تالا کھول چکا تھا۔ اس نے کنڈا کھولتے ہی کوٹھری میں سرسوتی کی طرف دیکھا۔

"پانی لاؤ سرسوتی۔" وہ کہہ کر کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" اس نے نرم انداز میں عورت کو مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں خان! یہ کوٹھری کی اداسی تو پریشان ہو جاتی ہوں۔" عورت ایک کراہ کے ساتھ چارپائی پر لیٹ گئی۔

ہاری چپ کر رہ گیا۔ عورت کا چہرہ خون سے لت پت ہو رہا تھا۔

"یہ کیا کیا ہے تم نے؟" اس کی آواز بہت دھیمی اور نرم تھی۔

"سر تو روز پھوڑتی ہوں' آج خون نکل آیا۔"

"کیوں پھوڑتی ہو سر' اس طرح انسان مرتا تو نہیں ہے؟" ہاری نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر جانے کیا کھوجا۔

"خان! اب راتیں بڑی بھاری آ گئی ہیں۔ سب لوگ خوش ہو چکے ہیں تو مجھے معافی کیوں نہیں مل رہی۔ نقصان تو سب کے ساتھ پورے ہوئے ہیں ان سب کے بھرے؟ خوشیوں کے جشن میں میری سزا میں کمی کا بھی تو اعلان ہو۔" اس کی کمزور آواز کانپ رہی تھی۔

ہاری نے پلٹ کر پیچھے کھڑی جھومر کو دیکھا۔ پھر دبی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

"کوئی نہیں ہوا جشن وشن' کام چلا رہے ہیں سب۔"

"ہائے بے چارے بے لوگ' کام چلانے کی خاطر بندے تک چلا رہے ہیں۔" جھومر نے ایک سرد آہ بھری۔

"بھائی! میں سرسوتی کے ہاتھ فرسٹ ایڈ باکس بھجوا رہا ہوں۔ آپ اتنی دیر میں اس کا زخم صاف کر دیجیے۔"

"کھلا چھوڑ جاؤ گے ہمیں اور جو ہم بھاگ گئے؟" جھومر مسکراتی ہوئی اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔

ہاری نے سرسوتی کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا لے کر عورت کو تھمایا اور ایک اڑتی پڑتی نظر جھومر پر ڈالی۔

"آپ نہیں بھاگیں گی' اتنے اچھے نصیب نہیں ہیں ہمارے۔"

وہ سرسوتی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔

"جب عورت کی مرہم پٹی ہو جائے تو مجھے آ کر بتا دینا' تالا میں خود لگاؤں گا۔"

اس نے پہلو میں چلتی ہوئی ماندی سی سرسوتی کو مخاطب کیا تھا۔

[illegible] نے ساری خواب آور گولیاں بڑی صفائی اور خاموشی سے کہیں ضائع کر رہی تھیں یا چھپا رہی تھیں۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر

کیسٹیں سن سن کر بھی رات بتا دی گئی مگر نیند نہ آ پائی تھی۔ نہائی اور اب تو جیسے صبح ہوئی جاتی تھی۔ ایک تو ان گولیوں کی عادت چھوٹ نہیں ہے۔ وہ کسی عادی نشے باز کی سی بے چینی کے ساتھ کچن کی طرف آئی تھی کہ شاید کچن کے ڈبوں سے کوئی گولی مل جائے مگر سامنے سے آتے ہوئے ہادی اور سرسوتی کو دیکھ کر دل بڑے زور سے دھڑکا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ "بچے" ساتھ تھا۔ ہادی کی حد تک تو درست تھا مگر یہ سرسوتی جو "موتے سرتے" کی حقیقی تصویر ہوتی ہے یہ اس کے ساتھ کیا کر رہی تھی؟ "کیسی" "کماری ہے" "کرپٹ" کہیں کی۔ اس نے دانت پیسے اور اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ ظاہر ہے انہوں نے اس کے پاس سے گزرنا تھا۔

ہادی تو اسے سامنے دیکھ کر ویسے ہی چکرا گیا تھا۔ بڑی دلی تیاری کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہی ہو سرسوتی؟" وہ اس کے قریب پہنچے تو اس نے سرسوتی کو مخاطب کیا۔ اور ہادی کو نظر انداز کر دیا۔

سرسوتی تو "سیکرٹ سروس" کی اولیٰ سی کارکن تھی۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ حویلی میں کس شخص سے کیا بات کرنی ہے۔ بے چاری بری طرح گھگھیا کر رہ گئی۔

"میں... وہ... گل... اے ہے... میں خان... بال...؟" اس نے مدد طلب نظروں سے ہادی کی طرف دیکھا۔

"ذرا رنگ رہا تھا خان کو اس لیے تمہیں بطور "گارڈ" ساتھ لیے پھر رہے ہیں؟" اس نے بڑے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

"جی! اصل بات یہی تھی۔ اب پلیز آپ انکوائری ختم کر کے ہمیں آگے جانے دیں۔" ہادی نے قصہ کوتاہ کرنے کے انداز میں دو ٹوک لہجہ اختیار کیا۔

"میں تم سے مخاطب نہیں ہوں میں اپنی ملازمہ سے انکوائری کر رہی ہوں۔ تم جا سکتے ہو۔" وہ بھی جواباً بولی۔

"جی تو پھر جلدی پوچھ لیجیے اسے ابھی بہت ضروری کام کرنا ہے۔"

اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر بڑی گہری سانس لی۔

"وہی پوچھ رہی ہوں آدھی رات کو کون سے "ضروری" کام ہو رہے ہیں؟" اس نے سرسوتی کو گھورا۔

"تم یہیں رکو سرسوتی' میں ایک منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

وہ بڑے جھلاتے ہوئے انداز میں تیزی سے آگے بڑھ گیا' کیونکہ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ سرسوتی کیا کچھ بک سکتی ہے اور کیا نہیں۔

روشی نے جاتے ہوئے ہادی پر ایک نگاہ غلط ڈالی اور پھر سرسوتی کی سمت متوجہ ہو گئی۔

"جھومر بھابی کا کمرا بند ہے یا وہ جاگ رہی ہیں؟" اس نے سرسوتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"جاگ رہی ساں" سرسوتی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ چھان بین کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔ بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"ہوں" روشی نے گہرا سانس لیا۔

"یہ ادھوری باتیں کرتے ہیں تم چوکیداری کرتی ہو؟ کتنے پیسے دیتا ہے خان؟"

روشی کا طرز کلام ایسا تھا۔

"اس کو تو پتا ہے؟" سرسوتی کے حلق میں گھگھی پھنس گئی۔ وہ بھی کہ روشی جھومر اور قیدی عورت کے متعلق بات کر رہی

"سچ کیوں نہیں بتاتے مجھے وہ تو خود جیتا جاگتا اعلان ہیں۔" وہ کہے روشی کو چپ کرا کر جانے۔

"کتنی بری بات ہے سرسوتی' بے ایمانی" روشی کی آواز شکستہ ہو گئی۔

"نے ۔۔۔ وہ یہ خان... تصور نہیں اے ۔۔۔ ابھی تو تے (ذرا) بھی کوئی احساس ہی آ گیا ہیں ۔۔۔ اس نے قیدی عورت کو پہلے روشی اسے جھومر بی بی اس رات چل پھر رہی تھی ہوتے کر کے گل بھی اسے خان نے اسان ای۔"

"یہ لو سرسوتی اور فوراً بھاگ جاؤ" ہادی نے مداخلت کی تھی اور سرسوتی کی بات ادھوری رہ گئی۔

سرسوتی تو "جان بچی سو لاکھوں پائے" والی خوشگوار کیفیت میں پاس سے تیر کی طرح بھاگ گئی۔

روشی نے ایک الجھی ہوئی نظر ہادی پر ڈالی جو اس کو تھمائے بنا اپنے کمرے کی سمت روانہ ہو گیا تھا۔

اس نے کچن جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ سرسوتی سامنے سے غائب ہو چکی تھی۔ اسے اب پچھلے حصے میں جانے کا خیال آ رہا تھا۔

باہر سے جائے تو اسے پہرہ سا لگتا ہے۔ اندر سے جائے تو کھوکھر کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔

سرسوتی کا تو "روٹین ورک" ہے اس لیے کمبخت کو کتوں سے ڈر نہیں لگتا۔

قیدن ۔۔۔ آخر وہ کس قیدی عورت کی بات کر رہی تھی۔

وہ تجسس کی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔

اور یہ فرسٹ ایڈ باکس کس خوشی میں اور کس کے پاس بھجوایا گیا ہے؟

اس خیال کے آتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے زینے کی سمت بڑھی تھی جو ہادی کے کمرے کی طرف جاتا تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک کے انداز ہی سے وہ سمجھ گیا تھا کہ کون ہے؟

اس نے خود کو خاصا پرسکون رکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔

"جی حکم؟" وہ یوں گویا ہوا جیسے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ وہ آئے گی اور کچھ کہے گی۔

روشی کی سمت اس کی خوابیدہ اور تھکی ہوئی نظر اٹھی تھی۔

(کمبخت کی آنکھیں ہیں کہ مے خانے (اتنی قربت کسی اور کی آنکھ میں کیوں محسوس نہیں ہوتی؟

"ہادی یاد ہے جب جھومر بھابی دلہن بن کر حویلی آئی تھیں تو تم نے میری مدد کی تھی اور مجھے دلہن دکھانے لے گئے تھے۔ آج پھر میں وہاں تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ کھوکھر گہری نیند سو رہا ہوگا" میں زنجیر ہلاؤں گی تو شور ہوگا۔ دوسری طرف

سے جانا چاہتی ہوں۔ اگر نہیں گئی تو میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی ابھی۔۔۔۔ اسی وقت مجھے پیچھے جانا ہے بس"۔ وہ جذبات سے عاری برف لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

"سنیں روشی بی بی"۔ ہاری نے بڑی رسانیت سے اسے مخاطب کیا۔

"جن باتوں سے اگلی صدیوں تک آپ پر فرق پڑنے کا امکان نہیں۔ ان میں کیوں الجھ رہی ہیں۔ آپ آرام کیجئے۔ میری بات کا یقین کیجئے' آپ کے جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا"۔

اس نے دوبارہ رسانیت سے اسے سمجھایا۔

"ہوسکتا ہے فرق پڑے' اس میں کہہ رہی ہوں ناں' چلو میرے ساتھ"۔

وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

ہاری نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ انجانی ستا ہوا اور بجھا بجھا سا تھا جیسے وہ طویل عرصے سے بیمار ہو۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میں اس وقت اب وہاں نہیں جاسکتا"۔ اس نے صاف صاف بات کرنا مناسب خیال کیا۔

"تمہارا خیال ہے تمہاری معذرت کے بعد میں اپنا ارادہ بدل دوں گی۔ حالانکہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو"۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا اور پلٹ گئی۔

ہاری نے ایک لمحہ توقف کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔

اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر روشی نے جان لیا تھا کہ وہ پیچھے آ رہا ہے' اس لئے وہ بیرونی احاطے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

مگر باہر پاؤں رکھتے ہی اندھیرے کی گھمبیرتا دیکھ کر رک گئی جیسے ہاری کے قریب آنے کا انتظار کر رہی ہو۔

"آپ نہیں مانیں گی؟ کیوں الجھنیں مول لیتی پھرتی ہیں؟" وہ اس کے قریب پہنچ کر قدرے ناراضگی سے گویا ہوا۔

روشی نے کچھ بولے بنا قدم آگے بڑھا دیے۔

جانے کہاں کہاں سے کتے سامنے آ کر بھونکنے لگے۔ روشی نے ڈر کر ہاری کا بازو تھام لیا۔

"چلیں واپس چلیں"۔ اس نے نہایت نرمی سے پھر اس سے کہا۔

"کہہ تو دیا ہے نہیں"۔ وہ بگڑی۔ اور ہاری کا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچا۔

"غصہ سے کچھ ملتا ہے؟" اس نے زچ ہو کر کہا۔

"ہاں"۔ وہ جھلائی۔

ہاری نے بے بسی سے قدم آگے بڑھا دیے۔ کتے ان کے پیچھے بری طرح بھونکتے ہوئے دوڑ پڑے۔

"ان کتوں کو گولی کیوں نہیں مارتے؟" وہ ہاری کے قریب ہوتے ہوئے ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

"کبھی ضرورت پیش آئی نہ دھیان آیا اور کیوں ماریں بے گناہوں کو؟" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑی تو گنہگار ہو جائیں گے' پھر تم مارو گے گولی؟"

"غلطی تو ہماری ہے کہ انہیں "ہوا" یا "تم" پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ تو بے چارے سالہا سال سے ہمارے ساتھ ہی یونہی آرام کر رہے تھے"۔

ہاری نے کچھ تو کہنا تھا۔

"تمہارا خیال ہے تمہیں کتوں کو انسان تو تمہاری نظر میں جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے"۔ وہ طنزیہ بولی۔

ہاری اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اندر داخل ہونے کے بعد جانے کیا صورتحال پیش آتی ہے' جانے وہ اس سے کیسے ملتے ہو۔

"آپ راتوں کو کیوں جاگتی رہتی ہیں؟ ابھی تو آپ کے امتحان بھی دور ہیں؟" اس نے پیچھے بہت تنگ آ کر یہ سوال کیا تھا۔

"مجھے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت نہیں' بلکہ تم کبھی اور کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کرو گے"۔ وہ دو ٹوک گویا ہوئی۔

"قسم تو مجبوراً خوشی سے کھائی جاتی ہے"۔ اس نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی غرض سے جواب دیا۔

اس کا بازو روشی کے نرم ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ اس کی قربت کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ لیکن وہ خود پر قابو کیے ہوئے تھا۔

"تم "اپنی خوشی" کا لفظ اپنی لغت سے نکال دو۔ غلام کی اپنی خوشی کوئی نہیں ہوتی"۔ وہ ترش رو ہوئی تھی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں"۔ اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"کبھی تو تسکین ہو جایا کرو اپنی غلامی پر"۔ وہ زہر آلود لہجے میں گویا ہوئی۔

ہاری خاموش رہا۔ وہ پچھلے حصے میں داخل ہو چکے تھے۔

ہاری راہداری میں پہنچ کر رک گیا۔ البتہ روشی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے کوٹھری کے پہلے دروازے کو کھول کر اندر جھانکا۔ کچھ نظر نہ آنے پر اس نے خاصی حیرت کے ساتھ پلٹ کر ہاری کی سمت دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہاری سینے پر بازو لپیٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر خاموشی سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔

"یہ سرسوتی کہاں چلی گئی؟" اس نے ہاری کو مخاطب کیا۔

ہاری نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر شانے اچکا دیے۔

روشی کونے پر بنی ہوئی کوٹھری سے آتی ہوئی آوازوں پر متوجہ ہوئی اور بے پاؤں اس طرف بڑھی۔

اندر جھانکا اور جیسے دم بخود سی رہ گئی۔ چند لمحے اندر جھانکنے کے بعد پلٹ کر حیرت سے ہاری کی طرف دیکھا اور کوٹھری میں چلی گئی۔

جھومر قیدی عورت کی مرہم پٹی میں منہمک تھی۔ اسے روشی کی آمد کا احساس نہ ہو سکا۔ البتہ سرسوتی چونک گئی۔

"روشی بی بی اتساں ۔۔۔۔ خان ۔۔۔۔ کتھے ۔۔۔۔ تساں؟"

وہ اٹک رہی تھی۔ جھومر اس کی آواز پر چونک کر پلٹی تھی' پھر روشی کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"آ روشی! اس وقت تم یہاں کیسے؟" وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

سے بچانا چاہتی ہوں۔ اگر نہیں گئی تو میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی ابھی ——— اسی وقت مجھے پیچھے جانا ہے پلیز۔"

وہ جذبات سے عاری برف لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

"سنیں روشی بی بی"۔ ہاری نے بڑی رسانیت سے اسے مخاطب کیا۔

"جن باتوں سے اگلی صدیوں تک آپ پر فرق پڑنے کا امکان نہیں۔ ان میں کیوں الجھ رہی ہیں۔ آپ آرام کیجئے۔ میری بات کا یقین کیجئے' آپ کے جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

اس نے دوبارہ رسانیت سے اسے سمجھایا۔

"ہو سکتا ہے فرق پڑے' بس میں کہہ رہی ہوں نا' چلو میرے ساتھ۔"

وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

ہاری نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ انتہائی ستا ہوا اور بجھا بجھا سا تھا جیسے وہ طویل عرصے سے بیمار ہو۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میں اس وقت اب وہاں نہیں جا سکتا۔" اس نے صاف صاف بات کرنا مناسب خیال کیا۔

"تمہارا خیال ہے تمہاری معذرت کے بعد میں اپنا ارادہ بدل دوں گی۔ حالانکہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا اور پلٹ گئی۔

ہاری نے ایک لمحہ توقف کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔

اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر روشی نے جان لیا تھا کہ وہ پیچھے آ رہا ہے' اس لئے وہ بیرونی احاطے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

مگر باہر پاؤں رکھتے ہی اندھیرے کی گھمبیرتا دیکھ کر رک گئی جیسے ہاری کے قریب آنے کا انتظار کر رہی ہو۔

"آپ نہیں مانیں گی؟ کیوں الجھنیں مول لیتی پھرتی ہیں؟" وہ اس کے قریب پہنچ کر قدرے ناراضی سے گویا ہوا۔

روشی نے کچھ بولے بنا قدم آگے بڑھا دیے۔

جانے کہاں کہاں سے کتے سامنے آ کر بھونکنے لگے۔ روشی نے ڈر کر ہاری کا بازو تھام لیا۔

"چلیں واپس چلیں"۔ اس نے نہایت نرمی سے پھر اس سے کہا۔

"کہہ تو دیا ہے نہیں"۔ وہ بگڑی۔ اور ہاری کا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچا۔

"غصہ سے کچھ ملتا ہے؟" اس نے زچ ہو کر کہا۔

"ہاں"۔ وہ جھلائی۔

ہاری نے بے بسی سے قدم آگے بڑھا دیے۔ کتے ان کے پیچھے بری طرح بھونکتے ہوئے دوڑ پڑے۔

"ان کتوں کو گولی کیوں نہیں مارتے؟" وہ ہاری کے قریب ہوتے ہوئے ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

"کبھی ضرورت پیش آئی نہ دھیان آیا اور کیوں ماریں بے گناہوں کو؟" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیں گے' پھر تم مارو گے گولی؟"

"غلطی تو ہماری ہے کہ ہم نے "سرو را تم" کو مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ یہ بے چارے سادہ لوح ہی ہوں کو آرام کر رہے تھے۔"

ہاری نے کچھ تو کہنا تھا۔

"کتنا خیال ہے تمہیں کتوں کا؟ انسان تو تمہاری نظر میں جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے"۔ وہ طنزیہ بولی۔

ہاری اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اندر داخل ہونے کے بعد جانے کیا صورتحال پیش آتی ہے' جانے وہ اس سے کیسے نمٹے گا۔

"آپ راتوں کو کیوں جاگتی رہتی ہیں؟ ابھی تو آپ کے امتحان بھی دور ہیں؟" اس نے پیچھے بہت تنگ آ کر سوال کیا تھا۔

"مجھے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت نہیں' بلکہ تم کبھی دوبارہ مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کرو گے"۔ وہ سختی سے گویا ہوئی۔

"ہم تو مجبوریاں بھی خوشی سے کھائی جاتی ہیں"۔ اس نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی غرض سے جواب دیا۔

اس کا بازو روشی کے نرم ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ اس کی قربت کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ لیکن خود پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"تم "اپنی خوشی" کا لفظ اپنی لغت سے نکال دو۔ غلام کی اپنی خوشی کوئی نہیں ہوتی"۔ وہ ترش ہو رہی تھی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں"۔ اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"کبھی تو شگفتہ ہو جایا کرو اپنی غلامی پر"۔ وہ زہر آلود لہجے میں گویا ہوئی۔

ہاری خاموش رہا۔ وہ پچھلے حصے میں داخل ہو چکے تھے۔

ہاری راہداری میں پہنچ کر رک گیا۔ البتہ روشی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے کوٹھری کے پچھلے دم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ کچھ نظر نہ آنے پر اس نے خاصی حیرت کے ساتھ پلٹ کر ہاری کی سمت دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہاری سینے پر بازو لپیٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر خاموشی سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔

"یہ سروتی کہاں چلی گئی؟" اس نے ہاری کو مخاطب کیا۔

ہاری نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر شانے اچکا دیے۔

روشی کونے پر بنی ہوئی کوٹھری سے آتی ہوئی آوازوں پر متوجہ ہوئی اور بے آواز اس طرف بڑھی۔

اندر جھانکا اور جیسے دم بخود سی رہ گئی۔ چند سیکنڈ اندر جھانکنے کے بعد پلٹ کر حیرت سے ہاری کی طرف دیکھا اور کوٹھری میں چلی گئی۔

جھومر کسی عورت کی مرہم پٹی میں منہمک تھی۔ اسے روشی کی آمد کا احساس نہ ہو سکا۔ البتہ سروتی چونک گئی۔

"روشی بی بی ادتاں ——— خان ——— کیسے ——— تساں؟"

وہ اٹک رہی تھی۔ جھومر اس کی آواز پر ٹھٹک کر رکی تھی پھر روشی کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"آؤ روشی! اس وقت تم یہاں کیسے؟" وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

"یہ کون ہے؟ اسے کیا ہوا؟" روشی تعجب سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اس کے جواب ہاری کے پاس ہیں' وہ نہیں ملا تمہیں؟" جھومر نے قینچی سے بینڈیج کی پٹی کاٹتے ہوئے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

"سرسوتی! ہاری باہر کھڑا ہے' بلا کر لاؤ۔" اس نے سرسوتی کو حکم دیا۔

سرسوتی یوں بھاگ گئی جیسے منتظر رہی تھی۔

چند منٹوں بعد ہاری اندر داخل ہوا۔

"آپ کا کام مکمل ہو گیا۔" وہ براہ راست جھومر سے مخاطب ہوا۔

"ہاں' ہمارا کام مکمل ہو چکا' مگر تمہارا کام شروع ہوا ہے۔" اس نے روشی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

ہاری الجھ کر روشی کو دیکھنے لگا۔

"کون ہے یہ؟" اس نے بڑی خوفناک سنجیدگی کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

ہاری خاموش رہا۔

"کیا پوچھ رہی ہوں میں؟ کون ہے یہ؟ اسے کیا ہوا ہے؟ اس کے پاؤں میں بیڑیاں کس نے ڈالی ہیں؟"

وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"یہ کچھ نہیں بتائے گا روشی بی بی! بلکہ میں بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں؟ یہ آپ کے سامنے نہیں ہیں۔ آپ اپنی خوشیوں بھری زندگی کی طرف پلٹ جائیں' آپ کیلئے یہی بہتر ہے۔" عورت اپنا سر پکڑ کر چارپائی پر ڈھے گئی۔

روشی ساکت سی کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر مزید آگے بڑھی۔

"کیا نام تمہارا؟" اس نے حاکمانہ انداز میں نام پوچھا۔

"بدنصیبی' رسوائی' اندھیرا' تاریکی' کنیز' غلام زادی۔" عورت نے جیسے چکراتے ہوئے سر کو تھاما۔

"میں نے تمہارے تخلص نہیں' نام پوچھا ہے۔" وہ سختی سے گویا ہوئی۔

"آپ نام جان لیں گی' کیا فرق پڑے گا مجھے یا آپ کو...... آہ!" وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"جھومر بھابی! کیا نام ہے اس کا' کون ہے یہ؟" وہ جیسے ہذیانی ہو گئی۔

"روشی بی بی! آیئے واپس چلیں' آپ کچھ دیکھنا چاہتی تھیں' آپ نے دیکھ لیا' آیئے جھومر بھابی! یہ پاس مجھے دے دیں۔"

ہاری کا سکون کمال تھا۔

روشی تیزی سے ہاری کی جانب بڑھی اور اس کا بازو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑ دیا۔

"میں نہیں جاؤں گی اس وقت تک جب تک مجھے یہ پتا نہ چل جائے کہ یہ کون ہے' اس کا نام کیا ہے؟" وہ بپھر گئی تھی۔

ہاری نے رسانیت سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ واقعی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر کو مڑنے لگا۔ اس کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے چھوٹے بچے کو کوئی سمجھاتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہم سے تھوڑی اسے ناراض دیکھ رہی تھی۔ اسے دو دنوں کی لت وہ وقت ہے بیکار جائے گی۔

"چھوٹی بی! آپ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں! آیئے چلیں۔"

اس کی آواز بہتے دریا کی مانند ٹھہراؤ لیے تھی۔ اس کے لہجے کی گھمبیرتا مگر اس کے دل میں کہیں اٹک گئی۔

قریب تھا کہ پھر اس کا دل جھک جاتا' بے بس ہو جاتا' وہ اس کی بات مان لیتی' "تمہارا زوال دیتی" اس کے ساتھ واپس چل پڑتی۔ مگر وہ اسی ہٹ کر دور سے اس کے آگے بڑھ گئی۔

"میں اس گھر میں رہتی ہوں مجھے حق ہے کہ معلوم کروں اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟" وہ پھر عورت کی طرف بڑھی۔

"آپ جو اس کی اتنی خدمتیں کر رہی ہیں' کس حساب میں کر رہی ہیں' کیا لگتی ہے یہ آپ کی؟" وہ جھومر سے مخاطب ہوئی۔

جھومر عورت کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا لے کر روشی کی سمت پلٹی۔

"یہ میری 'قید شریک' ہے' بس یہی رشتہ ہے میرے اور اس کے بیچ۔ باقی تم ہاری سے پوچھو' ہو سکتا ہے اس کی کچھ لگتی ہو۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

تو اس کا رخ اپنی جانب دوبارہ دیکھ کر ہاری گڑبڑا کر رہ گیا۔

"نام پوچھ رہی ہوں میں تمہارا؟" روشی ہاری کی سمت پلٹنے کی بجائے پھر عورت سے مخاطب ہوئی۔

عورت نے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا' چند لمحے تک دیکھتی رہی۔

"بہت پیاری ہو' مگر اپنی ماں جیسی پھر بھی نہیں ہو۔"

اس نے اتنا کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

"میری ماں کو کبھی جانتی ہو' دیکھا بھی ہے ان کا نام کیا ہے؟" روشی بڑے شوق سے چارپائی کی پٹی سے لگ گئی۔

"بھلا ان کا نام کیسے بھول سکتی ہوں' نام تھا...... نازنین......" عورت نے اپنی بات پر خود ہی ادھر سے ہنس دی۔

"مجھے کیسے پہچانا؟ میں نے تو تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" روشی کے اندر تجسس کا سمندر ابل پڑا تھا۔

"تمہیں کیسے نہیں پہچانوں گی۔ نازنین اور یاور علی خان کی بیٹی ہو۔ تیمور علی خان کی بھتیجی ہو۔ بھلا تمہیں نہیں پہچانوں گی روشی...... روشانے۔" عورت خودکلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

"تم مجھے اپنا نام بتاؤ' باقی میں خود پتا کر لوں گی۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔

"مطربہ' کیسا عجیب سا نام ہے' میں جاہل' ان پڑھ مجھے تو اپنے نام کے معنی بھی پتا نہیں۔" عورت نے ایک لمحے کیلئے آنکھیں کھول کر روشی کو دیکھا۔

"مسٹر۔۔! اتنا خوبصورت نام کون ہو تم؟" روشی بے قراری کے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا تجسس
بڑھ گیا۔

عورت خاموش رہی۔

"ہاری! یہ کون ہے؟" اس کی تشویش قابل دید تھی۔

"میں آپ کو بتا دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ آپ اس وقت میرے ساتھ چلیں۔"

موقع سے فائدہ اٹھانا اس کی مجبوری تھی۔

"اور جو نہیں بتایا؟" وہ اس کی طرف سے پر اعتماد نہیں تھی۔

"میں نے کہا نا بتا دوں گا۔ آپ پلیز!" غصے سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔

روشی آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"ہاری!" جھومر نے آواز دی۔

ہاری جو پلٹ چکا تھا آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ مگر مڑا نہیں۔

"اب کب آؤ گے؟"

روشی کا وجود جیسے آگ میں جلنے لگا۔ اس نے نہایت سختی ہوئی نظریں اٹھا کر جھومر کی طرف دیکھا۔

"مائنڈ یور بزنس بھابی! آپ کو ہاری کے آنے جانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہونا چاہیے۔"

"باہر آیئے آپ مجھے تماشا لگتا ہے۔ چلو سرسوتی باہر نکلو۔" ہاری نے باہر نکل کر سرسوتی کو پکارا۔

سرسوتی ششدر باہر آ گئی۔

"میں باہر نہیں آسکتی یہ بیاسی نہ مر جائے۔" جھومر نے انکار کر دیا۔

"تمہارا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہم۔" وہ تنک کر بولی۔

ہاری کی جھلاہٹ زندگی کی وجہ سے سوا تھی۔ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور کھٹاک سے کنڈی لگا کر۔۔۔ تالا لگا کر
چابیاں جیب میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ روشی اس کے پیچھے پیچھے دوڑی۔

"ارے جھومر بھابی کو بھی بند کر دیا۔"

"آپ چاہیں تو آپ بھی ان دونوں کے پاس قیام کر سکتی ہیں۔" وہ بھنایا۔

روشی تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پہلو میں پہنچی۔

"حد ہو گئی ہے تم سے بھی۔۔۔!" وہ بڑبڑائی۔

"میں صبح کو آپ کیلئے 'سلیپنگ پلز' کے پیک لے آؤں گا۔ چھپا کر رکھ دیجئے گا اب سے۔ کم از کم رات کو تو سو جایا
کریں گی۔"

وہ باہر آ چکے تھے اور کسے "اوورٹائم" پر کام شروع کر چکے تھے۔

تین چار منٹ چلنے کے بعد وہ حویلی کی راہداری میں پہنچ چکے تھے۔

"ہاری بتاؤ نا کون ہے یہ عورت؟" وہ وہیں رک گئی۔

"روشی خراب نہیں ہے میرا اپنی بھی نیند میں ضائع کروں۔ وہ رات کی صبح بھی ہوتی ہے تو آپ بھول گئیں۔"

وہ اپنے کمرے میں جانے کے ارادے سے تیزی سے چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

روشی جیسے سناٹے میں رہ گئی۔

"دل بھی چاہتا ہے کہ وہ کروں تمہارے ساتھ کہ عمر بھر یاد رکھو۔ پھر سوچتی ہوں امر سے کیا مارنا۔ بہت ترس کھانے کی
کوشش کرتی ہوں تم پر مگر عجیب طبیعت ہے۔ بدلے بغیر سکون نہیں آئے گا۔ ابھی امیر ساری راتیں قرض ہیں تم پر
ادھار ہے اتار جاؤ گے۔ میری اب کوئی دعا نہیں ہے سوائے اس دعا کے۔۔۔!

"کاش! موت سے پہلے صرف یہ دیکھوں کہ تم 'ہار' کر کیسے لگتے ہو۔ تمہارا اعتماد ٹوٹ رہا ہے تم حالت سے کسی
دن تمہارا وجود تمہاری چادر اتار کے تمہیں تمہاری مستحکم چال میرے سامنے ریت کی طرح بکھری پڑی ہے۔"

"اے خدا! اب تو سکون تب ہی آئے گا۔"

وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھتی ہوئی ایک ان دیکھی آگ میں بجز جل رہی تھی۔

"کمری ایمی! امیر امیر کیا 'دوسری' کے چکر میں تھا؟" ثانی عقیلہ پر "سوت" آئی تھی۔ اس کی جان دوسری اور تیسری پر
اٹکی تھی۔

(ایسے گن کہاں تھے اس میں کہ آسانی سے جان چھوٹ جاتی) یا جل جل کر سوچ رہی تھی۔ برتن رگڑنے میں بھی تیزی آ
گئی تھی۔

"کرے وہ تو اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا تھا۔ اس لئے حرام کا مقدر ہی خراب ہے۔"

اس کی اماں لحاف گدوں کو دھوپ لگا رہی تھی۔ وہیں سے تڑخ کر بولی۔

"سارا سودا ہو تو اٹھوا لیا اس نے۔" بی بی جی کو جیسے سونا چاہئے کا بہانہ ہاتھ تھا۔

"میں خود تو زہر کھا آئی ہوں وہ آگ میں تنگ 'سوتن'۔" اس نے پتیلی کو کھنگال کر زور سے ایک طرف پٹخ دی۔

جس دن سے آئی تھی 'اکبر' ویسے ہی رک گئی تھی۔

"اپنا گھر ہی کمزور تھا اماں اس کے سہارے نہیں تھے گھر بسانے والے۔" اس کی ماں اپنا کام پورا کر کے صحن میں
کے آ بیٹھی۔

"اماں سے تو عمر میں چھوٹا ہے اس نے اب اس زندہ جنازے کو ڈھوئیں گے عمر بھر۔"

وہ اکڑ کر بیٹھی رہے گی پر آرام ہو جائے گی۔

"میں ان دونوں کی پرواہ کر کے خون تھوک کر مر جاؤں۔۔۔ ہونہہ۔" اس نے دھلے ہوئے برتنوں کی ٹوکری ایک طرف

کسمساتے ہوئے کڑھ کر سوچا۔

"آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ میری خوشی پر خوش کیوں نہیں ہیں۔ آپ لوگ میرے ہی ماں باپ ہیں"
وہ پلّے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بچ کر عورتوں سے مخاطب ہوئی۔

"خوشی" عورتوں نے تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔

"کیا بجز کر خوش ہے؟ اور یہ وہ کوئی بالو نہیں ہے۔ کیا زبان ہو گئی ہے اتھرا کا ڈنڈا۔"

"تجھے فاقے ہوتے تھے وہاں۔ بیسیوں میں کھیلتی تھی۔ ہم نے خود دیکھا تھا تیرا گھر۔ ارے اس کے ساتھ اس کے بھائی میں ایک سے لاکھ تک راضی نہیں تھی مگر لال خان کے طور طریقے ہمارے ساتھ آتے جاتے تھے کہ کسی حالت کے دوران وہاں دیکھے کو نہیں ملتے۔ بدنصیب کے نصیب میں لکھی نہیں ہے۔ پتھر سا آبیٹھا ہے چھاتی پر۔

اس کا باپ تو پہلے ہی بیمار تھا۔ اب تو یہ صدمہ سیدھے منہ میں خاک اسے کھا ہی جائے گا۔

چھ کروں کا بھرا ہوا گھر فریج تو وہ دیتے والا، ٹیلی ویژن رنگ والا، بڑا جو آتا ہے وہ دو استریاں، پانی والے کا جو بنانے کی شربت گھولنے (جوسر) بجلی کی مشین، کپڑے دھونے کی یہ بڑی سی مشین اس میں دھو لو اس میں سکھا لو۔ ٹیلی فون جان کر نہیں لگواتا تھا کہ لالے سیدھے لوگ اس کی عورت کو چھیڑیں گے، اکیلی کا رہتا۔"

اس کی ماں گن گن کر نعمتیں یاد کر رہی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ایسا بھرا گھر محلے کی کسی لڑکی کو نصیب نہیں ہوا" بڑی خلیفہ نے تائید کی۔

(اور وہ بھرے گھر والا...... بڑی توند اور پانچ مصنوعی دانتوں کے ساتھ امریکہ کا صدر نظر آتا تھا جیسے۔ قسم جو بیٹھ کے گھر آدھا گھنٹہ اس کے ساتھ۔ بڑی بی "جن پری" کا سیل کیا تھا میرے باپ نے مشینوں سے بچی جا رہی تھی۔ ہونہہ!)

"اری! اگر جھگڑا ہوا ہے تو کوئی بات نہیں۔ میاں بیوی جھگڑا کیا ہی کرتے ہیں۔ ابھی "کاغذ" تو نہیں لکھا اس نے۔ وہ چار لوگ بیچ میں پڑیں تو صلح صفائی ہو سکتی ہے" اماں جمن نے روشنی کی کرن ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

"مجھے نہیں کرنی صلح صفائی۔ آپ لوگ اپنے دماغ میرے مسئلے میں نہ کھپائیں۔ مہربانی ہوگی" وہ تنک کر بولی۔

"دیکھ لو اماں! اس کے رنگ ڈھنگ" اس کی ماں نے شکایتی انداز میں بڑھیا سے کہا۔

"کیوں اپنے باپ کا وزن بڑھا رہی ہے۔ کل کو کیا "کی" تیری گود میں کھیلے گا۔ تیرے باپ کو تو "بس" ہے" بڑی خلیفہ ناراضگی سے بولی۔

"کوئی نہیں کھیلے گا میری گود میں اپنے لئے میں کسی فیکٹری میں نوکری کروں گی" اس نے فوراً جواب دیا۔

"طلاق لینے سے تجھے تیرے موتی ملیں گے؟" بڑھیا برافروختہ ہوئی۔

"ہاں" وہ تڑخ کر بولی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

"تو پوچھ تو کر بالو کی ماں بات کیا ہوئی ہے؟" اماں حلیمہ تشویش سے بولی۔

"کیا پتا اس کا باپ لال خان حل کر ہی نہیں دے رہا" اس کی ماں مایوسی سے بولی۔

"تو خود جا کے غلام محمد بھلا کیا بات کرے گا؟ اسی کی سن کر آجائے گا" اماں جمن نے مشورہ دیا۔

"مگر یہ نصیب تو وہاں جانے پر راضی ہی نہیں" اس کی ماں بے چارگی سے گویا ہوئی۔

"تو جا تو سہی یہ بعد کی باتیں ہیں" بڑی خلیفہ نے زور لگایا۔

"اچھا میں چلی جاؤں گی دعا کرنا تم"

دونوں بڑھیوں نے اسی وقت آنچل پھیلا کر دعا کرنا شروع کر دی۔ جیسے ابھی وہ دعا کیلئے کسی آدمی کی منتظر تھیں۔

ماہین اور یاور علی خان ہری پور جانے کیلئے تیار ہی تھے کہ بابا صاحب کا حکم آگیا۔
روشی کے سسرال والے تاریخ لینے آرہے ہیں اس لئے وہ ایک دن مزید رک جائیں۔
ماہین کو اب یہ علم ہوا وہ اس کی طرف آرہی تھی۔ اور ان کی ملاقات کی غرض سے چال کا انداز ایک دم بدل گیا۔
تاریخ لینے... مگر روشی ابھی تو اس سے کھل کر بات کر رہی تھی۔ پھر یاور علی خان سے ڈسکس کر رہا تھا۔
جب وہ نہیں تھی تو روشی کے معاملات سے بے خبر تھی۔ مگر اب وہ اس کے اہم ترین فرائض میں شامل تھی۔
وہ بہت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔
لڑکیوں نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے نعرہ مارا۔

"السلام علیکم" اس نے بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ لڑکیوں پر نظر دوڑا کر روشی کو بھی تلاش کیا۔

"خوشخبری پہنچ گئی آپ کو؟" یہ نے خوشی سے سرشار آواز میں ماہین سے سوال کیا۔

"خوشخبری؟ کیسی خوشخبری؟" اس نے قدرے انجان بن کر سوال کیا۔

"ارے! آپ کو نہیں پتہ؟ حالانکہ آپ کو تو سب سے پہلے پتا چلنا چاہیے۔ روشی کے سسرال والے تاریخ لینے آرہے ہیں۔ عظیم الدین اینڈ فیملی۔ وہ لوگ عید سے پہلے شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"آپ بتائیے کون سی تاریخ مناسب رہے گی؟"

سوہا خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔

"یہ تو روشی سے ہی ڈسکس کر رہا ہوگا" ماہین بے ساختہ مسکرا دی۔

"ارے بلاؤ نا روشی کو کیا آج اصطبل نشا کر سوئی ہے" روبی نے آواز لگائی۔

"جاؤ بلا کر لاؤ کنیز... کہو بس جاگ جاؤ۔ ہو گئیں نیندیں پوری" روبی نے یہ کو مخاطب کیا۔

"میں نہیں جاری بچھاڑی کھانے گی مجھے" یہ نے حضرت کے ساتھ ساتھ جس بھی بات کی جو خاصی خوفناک تھی۔

"مگر نہیں ہوتا ... جاؤ تو۔ دروازہ پیٹ کر روشی کی وہاں بھاگ آؤ۔ خود ہی آجائے گی پیچھے پیچھے" ...کو بڑی جلدی ترکیب سوجھ جاتی تھی۔

"کیا شور مچایا ہوا ہے آپ لوگوں نے؟" روشی جھلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔

شادی کے دن ہیں قریب
ہو ذرا دھیرے سے بولو

تانیہ زور و بی لہک لہک کر گانے لگیں۔

روشی نے الجھ کر ماہین کی سمت دیکھا۔

"کس کی شامت آ رہی ہے اب؟" وہ منہ بنا کر ماہین کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"تمہارے سسرال والے آ رہے ہیں تاریخ لینے۔" ماہین نے سنجیدگی سے اسے مطلع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ اس کے چہرے کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھی۔

روشی تو جیسے ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ چند لمحے تو اس سے بولا ہی نہیں گیا۔

"سسرال والے"۔ کس قدر اجنبی سا محسوس ہوا تھا یہ لفظ۔

"کس بات کی تاریخ لینے"۔ وہ طیش پر قابو پاتے ہوئے بس اتنا ہی بول سکی۔

"جنگ کی"۔ روبی جل کر بولی۔

"اللہ نہ کرے۔ اچھی بات منہ سے نکالو"۔ گلو نے ٹوکا۔

"آج شام چار بجے تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ تم اچھی طرح تیار ہو جانا"۔ مومو نے کہا۔

"ٹھیک ہے اعشاریہ تین چھ کا ایک ریوالور اور سیون ایم ایم کی ایک رائفل وہ بھی لوڈڈ مجھے دے دیجئے گا۔ یہی میری سب سے اچھی تیاری ہو گی"۔ اس نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا۔

گلو، زری، صبیحہ اور ماہین نے اس کے لہجے کا زہریلا پن یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ ان کی ذات سے الجھ رہا ہو۔ جبکہ دوسری لاابالی لڑکیوں نے اسے اس کا مخصوص "اسٹائل" سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

ماہین نے بڑی ہی "مطالعاتی نگاہ" سے ان کا جائزہ لیا۔ پھر اس کا نرم گداز سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"بی ہیو یور سیلف۔ اپنا ٹمپر لوز نہیں کرو"۔

"کیوں نہ کروں۔ انسانوں کو بھی یوں استعمال کرتے ہیں جیسے کچن میں ہلدی مرچ"۔ وہ بڑبڑائی۔

"اس کا مطلب ہے شام کو کھانے پر بڑی مزیدار ڈشز ہوں گی"۔ مریم تصویر کو دوسرے رخ سے دیکھ رہی تھی۔

"رات کو"۔ بینے نے تصحیح کی۔

"ہاں بھئی۔ وہی وہی"۔ مریم نے صلح جو انداز میں جواب دیا۔

"جاؤ تم اپنے کمرے میں۔ میں وہیں آتی ہوں"۔ ماہین نے شور شرابے کا فائدہ اٹھا کر چپکے سے کہا۔

"ابھی تو میں اپنے ایک اہم مشن پر جا رہی ہوں۔ ابھی فی الحال آپ ان سب سے بات چیت کیجئے آرام سے۔ ٹھیک ہے"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مشن... کیسا مشن۔ کیا گھر سے باہر جا رہی ہو؟" ماہین الجھی۔

"نہیں۔ بس گھر میں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں خود آپ سے تفصیل بات کرنے کیلئے آ رہی ہوں"۔

وہ ماہین کے ہاتھ سے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر چلی گئی۔

"کیا یہ ابھی سے تیار ہونے چلی گئی ہے؟" دور کونے میں اردو میں ناول جھکا کر الٹ پلٹ کرتی روبی نے والے میں کا پرس کر کے حیرانی سے استفسار کیا۔

"نہیں ابھی سے"۔ صبیحہ نے ٹھنگ کے دوران استوائیہ "ہونہہ" کہنے کی فرصت نکالی۔ "اب تو خیر وہ تیار نہیں ہو رہی۔ "اب" ابھی تیار نہیں ہو گی"۔

وہ بے نیازی سے کہہ کر بیٹھا لینے دھیرے دھیرے کرنے لگیں۔ وہ میزن میں بے حساب ٹھنگ کیا کرتی تھیں۔

"کیوں تیار نہیں ہو گی۔ کیا شرمائے گی؟ تو منع کیا ہے کسی نے۔ تیار ہو کر شرمائے"۔ مریم کو "بدشگونی" سے بہت تکلیف ہوتی ہوئی۔

"وہ بھی شرماتی ورماتی۔ اسے تو اپنے حصے کا کام دوسروں پر ڈالنے کی عادت ہے۔ تم سے کہے گی۔ میرے حصے کی تم شرما لو۔ میرا موڈ نہیں ہو رہا"۔ زری نے بلکہ صبیحہ نے نکتہ پیش کیا۔

ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ مگر ماہین مصروف سی صبیحہ کو جانچ رہی تھی۔ جن کا انداز یوں تو دوسروں سے قطعاً لطف۔ مگر روشی سے متعلق تو وہ خاص بجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

جلد ہی محسوس ہوا جیسے لڑکیاں اس کی "چپ" سے خاصی تشویش میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔

سب شام کی تیاری کا موضوع لے کر باتیں کرنے لگیں۔

"سرسوتی"۔ اس نے گودام سے نکلتی سرسوتی کو آواز دی۔

"آ... ساں... بی بی"۔ وہ رات کی وجہ سے بہت ڈری ہوئی تھی۔ گودام کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بھاگی چلی آئی۔

"خان کدھر ہے؟"

"تساں کھلو جاؤ بس آساں"۔ وہ اصطبل کی طرف دوڑ گئی۔

"گلو... وہ ڈریسنگ کا آئینہ صاف نہیں ہوا تھا دو دن میں"۔ باغ سے آتی ہوئی لہراتی بل کھاتی گلو کو اس نے ٹوکا۔ جو ابھی صحن میں تھی جس کے فرشتوں کو بھی امید نہیں تھی کہ وہ یوں راہ میں کھڑی ہو گی۔ وہ دہل کر اپنی جگہ رک گئی تھی۔

"میں بھول گئی تھی بی بی۔ ماں نے مجھے سبزی لینے بھیج دیا تھا۔ پھر گھر کہنے لگی کہ اس کی عورت بیمار ہے ذرا شربت پلا آؤں۔ بھری میں بڑے خان کی چلم بھرنے چلی گئی۔ واپس آئی تو بھابی (سبیہ) مجھے اپنے ساتھ ڈانگڈر (ڈاکٹر) کے لے گئی۔ منا بیمار ہے ان جی۔ آپ سوچ سمجھ کا جانا اور آنا۔ پھر وہاں سے"۔

"اچھا چپ کر۔ اداس اور بہانوں کی پوٹلی۔ جتنی بی بی اے۔ اللہ جو کوئی ادائیں تنگ جائیں تو افلاتی جائیں"۔

"تو پیچھے جاتی ہے کیا؟" (اس کا اشارہ حویلی کے پچھلے حصے کی طرف تھا)

"جی... میرا کیا کام۔ ایک بڑھا آتا ہے ادھر۔ وہ جھاڑو دے کر چلا جاتا ہے۔" سرسوتی کو ہوتے ہیں وہاں
کام۔ جب دیکھو آ رہی ہے۔ جب دیکھو جا رہی ہے۔"

"پیشہ ورانہ جیلسی" یہاں بھی تھی۔ کلثوم نے ذرا سی بھی بچ جانے کا موقع گنوانا مناسب نہیں سمجھا۔

"اور کس کو آتے جاتے دیکھا؟"

رات کے واقعے نے اس کی کھوپڑی الٹ کر رکھ دی تھی۔ نیم کے گھر والوں کی آمد تک پیچھے اس کیلئے عام سی بات ہو گئی تھی۔ جسے جب چاہے وہ اپنے طریقے سے ہینڈل کر سکتی تھی۔ دوسرے اسے اس معاملے میں اس لئے بھی تشویش تھی کہ یار علی خان گھر پر موجود تھے۔ اور ماہین کی شکل میں اسے مضبوط واسطہ میسر آ چکا تھا۔ اس کا تو حال ہی مستقل گھوم رہا تھا اس کیلئے اصل مسئلہ تو یہ تھا۔

"نہیں ادھر کوئی نہیں جاتا۔ بڑے خان کا حکم نہیں ہے۔ اور جی ادھر رکھا بھی کیا ہے۔ بس خان جی (ہاری) آتے جاتے ہیں ہر جگہ۔ وہ تو جی پوری حویلی میں پھرتے ہیں۔ بڑے کام ہوتے ہیں جی انہیں۔"

کلثوم نے بڑی اپنائیت و دلسوزی سے کہا۔ (ہاں اسی کے کندھوں پر ٹکی ہوئی ہے حویلی)

"اوہ خان... وہ رکھیں اسے"۔ سرسوتی دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔

"تو پیچھے گیا ہوا ہے؟" اس نے سرسوتی سے پوچھا۔

"ایس ویلے تو وہ کدی نہیں جاوندے جی"۔ سرسوتی نے نظریں چرا کر جواب دیا۔

جانے کیوں اسے یوں محسوس ہوا جیسے سرسوتی جھوٹ بول رہی ہے۔ اور وہ اصطبل میں ہاری سے باقاعدہ بات کر کے آ رہی ہے۔

"اور کون کون ہے اصطبل میں ہاری کے علاوہ"۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ڈنگر ڈاکٹر (جانوروں کا ڈاکٹر) وہ کھڑا ہے۔ دین محمد چوکیدار ہے۔ اور چاچا چترالی"۔ وہ انگلیوں پر گن کر سارے بتانے لگی۔

"جانوروں کو انجکشن خان لگا رہا ہے یا ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹر لگا رہا ہے۔ خان تے"۔ معاً وہ ذرا رک گئی۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ روشی اس گھوری سے روہانسا کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔

سرسوتی خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ ساری لڑکیوں میں نوکروں کو اسی سے سب سے زیادہ خوف محسوس ہوتا تھا۔

روشی چند لمحے سرسوتی کو دیکھتی رہی۔

"اچھا۔ جاؤ تم"۔ اس نے پرسکون لہجے میں اسے جانے کو کہا۔ سرسوتی نے نہایت تعجب سے اسے دیکھا تھا۔ پھر وہ الٹے

میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔

وہ جانے کتنی دیر سوچتی رہی۔ پھر دائیں جانب مڑ گئی۔ یہ راستہ اصطبل کو جاتا تھا۔

ہاری ایک سفید گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈاکٹر سے محو گفتگو تھا۔

روشی کو ایک کونے سے برآمد ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا گویا اپنی بات ہی بھول گیا۔

"السلام علیکم"۔ روشی نے قریب پہنچ کر ڈاکٹر کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام"۔ اس نے جواب دیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ہاری کی جانب دیکھا۔

"حویلی کے مالکوں میں سے ایک ہوتی ہیں"۔ ہاری نے سنبھل کر تعارف کرایا۔ ڈاکٹر ایک دم مختلف سا ہو گیا۔ اور خاصا مودب نظر آنے لگا۔

"ہاری گر" تو خاصا ٹھیک ہے۔ البتہ آگ کی حس بہت سست ہے۔ جب سے عکس فروخت کیا ہے یہ اپنی ساری چوکڑی بھول گئی ہے"۔ ہاری نئے سرے سے ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

"روپ وتی کا حال سنائیں۔ بچے کے صدمے سے سنبھلی یا نہیں؟" ڈاکٹر اصطبل میں نظریں دوڑا کر پوچھنے لگا۔

"کوئی اسلامی نام نہیں تھا ہے جاری کیلئے؟" روشی نے مداخلت کی۔

"وہ تو حویلی میں بہت ہیں"۔ ہاری نے ادھوری بات کی۔ ڈاکٹر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

روشی بے ساختہ مڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"ڈاکٹر سامنے ایک گھوڑے کی طرف بڑھا۔

"کیسے زحمت کی؟" ہاری نے کن انکھیوں سے اس کی صورت دیکھی۔

"جھومر بھابی کا پوچھنے آئی ہوں۔ آزاد ہو گئیں؟"

"وہ تو ماشاءاللہ خاصی آزاد ہیں"۔ وہ مسکرا کر ڈاکٹر کی حرکات و سکنات دیکھنے لگا۔

"میں رات والی بات کے حوالے سے بات کر رہی ہوں"۔ وہ جل کر بولی۔

"جتنا راستہ آپ طے کر کے آئی ہیں۔ اتنا ہی فاصلہ پیچھے جانے کیلئے طے کرنا پڑتا ہے"۔ ہاری نے کچھ جتانے کی کوشش کی۔

"پتا ہے مجھے۔ مجھے تم سے کچھ اور بھی پوچھنا ہے"۔ وہ تھوڑی سے گویا ہوئی۔

"جی۔ پوچھئے"۔ ہاری نے ادھورا ڈاکٹر پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔

"وہ عورت کون ہے؟"

"آپ بابا صاحب سے پوچھئے۔ میں واقعی اسے نہیں جانتا"۔ ہاری نے واضح معذرت کی۔

"کیسے ممکن ہے کہ تم نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی ہو"۔ اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ میرا یقین کریں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ شاید اس نے جھومر بھابی کو بتایا ہو۔ آپ ان سے پوچھ لیجئے"۔ وہ تھوڑی دو

صاف چھپا تھا۔

"ان کو کیوں اس عورت سے گرا دیا۔ پوری حویلی کو بلیک میل کرتی پھریں گی بابا صاحب سمیت خاص طور پر اس طرح تو وہ تم بہت آسانی سے قابو پا لیں گی۔ مگر شاید تم بھی یہی چاہتے ہو"۔ روشی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"یقین کیجئے۔ اس قصے میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ اب وہ چاہے جو بھی کرتی پھریں"۔ ہاری نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"کیا اس عورت نے بھائی کو سب کچھ بتا دیا ہوگا؟" اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"شاید۔ انہیں بہت انسیت ہو چکی ہے اس سے"۔ ہاری نے جواب دیا۔

"انسیت تو انہیں تم سے بھی بہت ہو چکی ہے"۔ روشی نے طنز سے مسکرا کر کہا۔

ہاری خاموش رہا۔ اور قریب کھڑے سفید گھوڑے کی پشت سہلانے لگا۔

"ایک بات سنو ہاری"۔

"جی؟" وہ اس کے انداز پر سنبھلا۔

"میں اتنی احمق نہیں ہوں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ اس عورت کا انداز بتا رہا تھا کہ تم اس کے محرم راز ہو"۔ روشی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ چھوٹی بی بی اردو استعمال کرنے کے شوق میں جانے آپ کیا کیا بول جاتی ہیں۔ کہ آپ کو احساس تک نہیں ہوتا"۔ وہ کھسیا کر بولا۔

"کیوں کیا بول گئی ہوں؟" وہ بگڑی۔

"کچھ نہیں۔ بہر حال میں معذرت خواہ ہوں۔ کسی بھی قسم کی خدمت سے قاصر ہوں"۔ ہاری نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"دیکھو ہاری۔ اگر مجھے پتا چل گیا ناں کہ تمہیں سب کچھ پتا ہے تو اچھا نہیں ہوگا"۔ اس نے دھمکی دی۔ ہاری نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

"ایک بات کہوں"۔ اس نے جاتی ہوئی روشی کو مخاطب کیا۔

روشی رک کر اس کی بات کا انتظار کرنے لگی۔

"اب تک جو کچھ ہوا ہے۔ واقعی اچھا نہیں ہوا ہے"۔ وہ شرارت سے گویا ہوا۔

"پتا چلے گا ناں تمہیں"۔ اس نے دانت پیسے۔

ہاری کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے واپس ہوئی تھی حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ اگر چاہتی تو حویلی کی دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے کام سے کام بھی رکھ سکتی تھی۔ مگر دماغ ہی کچھ ایسا تھا کہ جس بات کی ٹھان لی تو بس ٹھان لی۔

کتنی خوبصورت عورت۔ مگر پاؤں میں بیڑیاں۔ خون میں ڈوبا ہوا چہرہ۔ اس کے باوجود اس کی خوبصورتی واضح تھی۔

کیسی نوکیلی ناک اور غضب کی تراش کے ہونٹ۔ اف۔ کس قدر منفرد اور حسین چہرہ۔ [illegible]

وہ اس کی ذات سے [illegible] سوچتی اس پر آ کر ٹھہر رہی تھی۔

ایک بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ دوسری شروع ہو گئی۔ بڑے یہاں کے بیٹوں کی شادی کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں۔ دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں کرنے کیلئے۔ وہ تو خیر میں خاندان کو سب کچھ پتا کر کے [illegible]۔ آپا سے کرائیں بیگم کی شادی۔ انہیں بہت منع کرتے ہیں [illegible]

میں [illegible] ہے۔

وہ کچھ سوچتی ہوئی پچھلے حصے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

سب سے پہلے وہ جھومر کے کمرے کی طرف بڑھی۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ نہا رہی تھی۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ یا اللہ۔ بھری دوپہر۔ جس [illegible] میں وہ لوگ آ رہے ہیں [illegible]

"[illegible]" کی جانب بھیجے۔ جہاں داخل ہوتے ہی جہاز غائب ہو جاتے ہیں اور ان کو کچھ پتا نہیں چلتا"۔

اس نے خالی بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور دعا گنگنانا شروع کر دی۔

معاً جھٹ سے دروازہ کھلا۔ سرسوتی ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"بی بی۔ چھوٹی جلدی چلو (جلدی چلو) بڑی بیگم"۔ وہ رک کر سانس درست کرنے لگی۔

"ادھر آ رہی ہیں بڑی امی؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرسوتی نے نفی میں گردن ہلائی۔

"مجھے بلا رہی ہیں؟"

سرسوتی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"انہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟" وہ الجھی۔

"خان نے؟" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

"ہاری نے؟" اس نے نہایت حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

سرسوتی نے زور زور سے اثبات میں گردن ہلائی۔

روشی کی شریانوں میں جیسے جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔

وہ سرسوتی کو ایک طرف ہٹاتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ غصے سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔

وہ بے دھڑک بڑی امی کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی تھی۔

بڑی امی نماز کی چوکی پر جیسے منتظر بیٹھی تھیں۔ کریم کلر کے چکن ریشمی شلوار سوٹ اور نازک سی کشمیری شال میں وہ بہت ہی خوبصورت محسوس ہو رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے سنجیدگی اور بے خوفی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو۔" انہوں نے بھی نہایت خشک اور سنجیدہ انداز میں کلام کیا۔

وہ فوراً ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"کیا کر رہی تھیں؟" ان کی سپاٹ آواز ابھری۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نظریں چرائیں۔

"پیچھے کیا کرنے گئی تھیں؟" انہوں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

روشی خاموشی سے اپنے پاؤں دیکھتی رہی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟" وہ ناراض لہجے میں گویا ہوئیں۔

"ظفر بھائی کے پاس گئی تھی۔" بالآخر وہ بولی۔

"کسی کی بھائی نہیں ہے وہ۔ بس وہ ظفری کیلئے ہے۔ باقی حویلی والوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔" وہ سختی سے گویا ہوئیں۔

"جب وہ ظفری بھائی کی دلہن ہیں تو سب کی رشتے دار تو خود بخود ہو گئیں۔" اس نے بھی خاصی ناراضگی سے کہا۔

"تمہارے رشتے دار بس وہی ہیں جو ہم کہیں کہ یہ تمہارے رشتے دار ہیں۔ جن کا انکار ہم کر رہے ہوں وہ تمہارے کچھ نہیں لگتے۔" وہ برہمی سے بولیں۔

"رشتے قدرتی ہوتے ہیں۔ کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے رشتے نہیں بنتے۔" اس نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"یعنی تمہارا باز آنے کا کوئی ارادہ نہیں؟" وہ اس کی بے خوفی سے مزید غصے میں آ گئیں۔ وہ خاموش رہی۔

"روشانے..... تم ہمارے لئے مسئلہ بن رہی ہو۔ جس کا حل بابا صاحب نے ڈھونڈ لیا ہے۔ ہم آج تمہارے سسرال والوں کو کوئی قریبی تاریخ دے دیں گے۔ مگر جب تک تمہاری بارات نہیں آ جاتی۔ تم پیچھے نہیں جاؤ گی۔ اگر گیا کرو گی تو ہم تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھجوا دیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔ میں آج ہی بابا کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے صرف یہ بتا دیجئے۔ ظلم اور زیادتی کیا ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں؟" اس نے آہستہ آواز میں سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ برہم ہوئیں۔

"کسی معذور کے ساتھ ایک ہوش مند لڑکی کو باندھ دینا۔ یا کسی کمزور کو بر قانون سے بالاتر ہو کر قید رکھنا، زنجیروں سے باندھنا۔ ایک ظلم کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟"

جانے اتنی جرأت اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ یا باری کے خلاف غصے کے جذبات نے اس کے حواس گنگ کر دیئے تھے۔

"تمہیں بابا صاحب کے ذاتی معاملات میں چھان بین کی اجازت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

عالم بیگم چند لمحے دم بخود رہنے کے بعد انتہائی غصے سے بولیں۔

روشی بے خوف انداز میں کارپٹ پاؤں کے انگوٹھے سے کریدتی رہی۔

"چلو..... تیاری کرو۔ ہم آج ہی تمہیں بابا کے ساتھ حویلی بھیج رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری بارات بھی جلدی آ جائے۔" وہ غصے سے کہہ کر بیڈ سے اتر گئیں۔

روشی انتہائی فکرمند ہوئی۔ جانے سے پہلے کچھ سوچتی رہی پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

"کتنا گھٹیا انداز ہے پھپھو۔ اس ساری کی حقیقت میں باری کا پورا حصہ ہے۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ اور کس نے باری جا کر ان سے چغلی کی ہو۔ بابا کتنا معصوم ہے۔ اسے عورت کے بارے میں سب پتا ہوگا۔ پھر بھی وہ ان سے کی۔ بابا صاحب سے اس کا۔ کچھ ڈور کی تو نہیں۔ انسان تو نہیں ہے۔ بے حس گھوڑا۔ بابا صاحب کا وفادار گھوڑا۔"

وہ کھوئی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یار علی خان باتھ گاؤن پہنے باتھ روم سے برآمد ہوئے تھے۔

ماہین کو بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"آپ واپس بھی آ گئیں؟"

"جی..... یہ کام جو آ پڑا ہے۔ آپ سے مشورہ بھی تو کرنا ہے۔" اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"کیا کام آ پڑا ہے؟"

"وہ روشی کے سسرال والے آ رہے ہیں ناں تاریخ لینے۔" اس نے اس مرتبہ غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"ہوں۔" یار علی خان کے چہرے پر یکلخت گہری سنجیدگی چھلکنے لگی۔

"روشی سے مل کر آ رہی ہیں؟" وہ گویا ہوئے۔

"ہوں..... ہال میں سب ہی لڑکیاں تھیں۔" اس نے یہ باور کرا دیا کہ وہ روشی سے تنہائی میں نہیں ملی ہے۔

یار علی خان مزید کچھ بولے بغیر بالوں میں برش چلانے لگے۔

"ایک بات کہوں آپ سے؟" ماہین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" گویا اجازت دی گئی۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ روشی اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔" اس نے اپنی دانست میں دھماکہ کیا۔

"ہوں۔ ٹھیک۔ پھر؟" وہ بدستور برش چلاتے ہوئے گویا ہوئے۔

"آپ چونکے نہیں۔ حیرت نہیں ہوئی۔" ماہین نے انہیں تعجب سے دیکھا۔

"اس میں چونکنے کی کیا بات ہے۔ چھوٹے سے بچے کی بھی پسند ناپسند ہوتی ہے۔ وہ تو خیر ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہے۔" وہ بظاہر مصروف انداز میں گویا ہوئے تھے۔

"تو پھر جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ نہیں ہونا چاہئے۔" ماہین کا انداز قطعی تھا۔ یار علی خان خاموش رہے۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا اس سے بڑی عمر کی لڑکیاں حویلی میں موجود ہیں تو اس کی شادی کی اتنی جلدی کیوں ہے؟'' ماہین نے الجھ کر سوال کیا۔

''ان میں سے اکثر کے رشتے گھر میں طے ہیں۔'' یاور علی خان نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''تو روشی کا رشتہ باہر کیوں کیا۔ کیا وہ گھر کے لڑکوں کے قابل نہیں ہے؟'' ماہین نے جرح کی۔

''جس لڑکے سے روشی کا رشتہ طے ہوا ہے وہ اکلوتا ہے۔ ذاتی کاروبار میں بہت آگے جا چکا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کی تجارت کر رہا ہے۔ گڈ لکنگ ہے۔ اس کا باپ بابا صاحب کو بہت عزیز ہے۔ وہ بھی بابا صاحب کا جاں نثار ہے۔ اندازہ کرلیں کہ بیٹا اتنا کامیاب ہے۔ اس کے باوجود علیم الدین بابا صاحب کیلئے کراچی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اسی شکر گزاری کے تحت بابا صاحب نے علیم کے کاروبار کیلئے لاکھوں کا لون دلوایا تھا۔ ابھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کے اندر کا پتا چلتا ہے۔ گزشتہ بتیس سالوں سے علیم الدین بابا صاحب کے ساتھ ہیں۔ کبھی ایک پیسے کی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ بہت بااصول اور صاف ستھرے انسان ہیں۔''

''مگر اس کا کیا کریں کہ روشی راضی نہیں ہے۔'' ماہین نے بے صبری سے ان کی بات کاٹ دی۔

''تو آپ کر لیجئے ناں راضی۔'' یاور علی خان نے آن واحد میں سارا بوجھ اس پر لاد دیا۔

''یہ تو زبردستی ہوئی۔'' ماہین نے برا منایا۔

''ابھی اس کی عمر اتنی قابل اعتبار نہیں ہوئی کہ اس کے فیصلوں پر بھروسہ کیا جا سکے۔'' یاور علی خان نے دلیل دی۔

''تو پھر اس عمر کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر یہ ناپسندیدہ وجود اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا تو وہ بکھر جائے گی یا پھاڑ ڈالے گی۔'' ماہین کو ان کا انداز بے حس محسوس ہو رہا تھا۔

''اسے اچھی راہ دکھانا۔ برا بھلا سمجھانا ہمارا فرض ہے۔ ہمارے اس کے رشتے کا تقاضا ہے ہم اس کے لئے بہتر سوچیں اور مہیا کریں۔'' یاور علی خان نے ماہین کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''جب اس کی عمر نا قابل اعتبار ہے تو پھر اسے اہم فیصلوں سے نہیں گزرنا چاہیے عظیم نقصانات بھی ہو سکتے ہیں۔'' ماہین پر ان کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

یاور علی خان آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے۔

''اس کے ساتھ بہت اچھا ہو رہا ہے۔ وہ جب ان لوگوں میں جائے گی تو بہت مطمئن اور خوش ہو گی۔ آپ یقین کریں۔'' وہ سگریٹ سلگانے کے دوران گویا ہوئے۔

''اسے یہ وہم ہو گیا ہے کہ بابا صاحب سزا کے طور پر اس کی شادی کر رہے ہیں۔''

''سزا کے طور پر؟'' ماہین نے حیرانی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''کیسی سزا..... اور کس بات پر سزا؟'' وہ بے تاب ہو گئی۔

یاور علی خان ..... سر جھکائے کش پر کش لگاتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنی سرخ آنکھیں ماہین کے چہرے پر جما دیں۔

وہ اپنے ہاتھوں سے کھیلنے لگی۔

ابھی تک اب تو ماہین کے بس کی بات نہیں تھی۔

''پچھلے دنوں وہ کراچی میں اقدام خودکشی کا ارتکاب کر چکی ہے۔'' انہوں نے بہت دھیمی آواز میں سے جیسے ہوش ربا اطلاع پہنچائی۔

ماہین ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگی۔

''خودکشی؟ آپ نے اس سے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔'' ماہین اچھی طرح سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ گویا اب وہ اس پر تفصیلی بات کرے گی۔

''اس قسم کی باتوں کا کوئی موقع محل نہیں بنا۔ پھر تکلیف دہ باتوں کا دہرانا کیا معنی۔'' وہ دھواں اڑانے لگے۔

''آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ ابھی چھوٹی سی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔''

انہوں نے ایک اور کش لگا کر اپنی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ اس کی ناسمجھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔

''آپ کو پتا ہے۔ وہ بات جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کی کوشش کی؟'' ماہین کی تو بری حالت ہو گئی تھی۔

''نہیں..... مجھے اندازہ ہے کہ اسے یہاں کیا پیش آ سکتا ہے۔'' وہ بے نیازی سے کہہ رہے تھے۔

''جب آپ کو بات ہی نہیں پتا تو پھر آپ چھوٹی بڑی بات کا اندازہ کس بنیاد پر لگا سکتے ہیں۔ اب وہ اتنی بھی بچی یا احمق نہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر جان دینے کی کوشش کرے۔ کم از کم میں یہ دلیل ہرگز نہیں مان سکتی۔''

ماہین کا انداز قطعی تھا۔

''آپ میرا اعتبار کریں ماہین۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ حویلی آئی ہوئی تھیں۔ بابا صاحب نے لڑکیوں کو کراچی بھیج دیا تھا اور شاید وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ بلکہ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں تھی۔''

یاور علی خان نے بے حد مشکوک سی ماہین کو یقین دلانے کی مقدور بھر کوشش کی۔

''تو پھر ٹھیک ہے ناں۔ یہ ناجائز جبر کے خلاف اس کا احتجاج تھا۔ وہ تو میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ اسے اور دوسری لڑکیوں کو مجھ سے دور رکھنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ میں اندازہ نہیں کر سکتی کہ ایسا کیوں کیا جا رہا تھا۔'' ''کچھ ہوتا تو جواز بھی کچھ ہوتا ہے''۔ ماہین نے جواب میں بلا کی سنجیدگی اختیار کی۔

''محض آپ کی غلط فہمی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' یاور علی خان نے بجھے بجھے سگریٹ کے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا کہ وہ لہجے کے زیر و بم سمجھ گئی۔

''تو اس واقعے کے بعد تو ہمیں اور زیادہ محتاط ہو جانا چاہیے۔'' ماہین نے ان کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''آپ منع کر دیں ناں۔ جب وہ راضی نہیں ہے۔'' ماہین کا انداز یوں تھا جیسے کوئی بچہ ضد کر رہا ہو۔

''ایسا آسان ہوتا ہے ماہین۔ کتنا برا تاثر جائے گا ان کا۔ صاف نظر آ رہا ہے۔ بچے کھیلنے کو چاند مانگتے ہیں۔ تو ان کو بہلایا جاتا ہے۔ چاند لا کر نہیں دے سکتے ناں۔'' یاور علی خان نے ثابت کر دیا کہ انہیں بھی یہ رشتہ بہت پسند ہے۔

''تو پھر آپ اس کی شادی اس وقت تک پوسٹ پونڈ (ملتوی) کر دیں جب تک اسے آپ لوگوں سے حق [illegible]

خوشگوار نہیں مل جاتا۔ پھر آپ اس کی رائے لیں اور اس کے جذبات کا احترام کریں"۔ وہ خاموش تھی۔

یاور علی خان کا جاگیردارانہ مزاج ایک دم آتش فشاں بننے لگا۔ وہ خود پر قابو پانا چاہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ ان کے سامنے ان کی نوبیاہتا کم عمر بیوی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ان کے سامنے باشعور، تعلیم یافتہ اور اپنے شرعی حقوق قانونی طور پر ثابت کرنے کی اہلیت رکھنے والی ایک متوازن لڑکی تھی جس کی آواز کو حکم اور گرج سے نہیں دبایا جا سکتا تھا۔

"ملتوی کرنے کیلئے اس وقت میرے پاس کوئی ٹھوس وجہ نہیں۔ اس نے واضح طور پر میرے سامنے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ میرا خیال تھا چند دنوں میں وہ نارمل ہو جائے گی۔ لیکن اب میں اپنے ایک خیال پر سوچ رہا ہوں۔ آپ فرصت میں اس سے معلوم کریں، وہ کسے پسند کرتی ہے؟ آپ مجھے نام بتا دیں۔ باقی کام میرا ہے۔ یہ کام آپ کو ابھی کرنا ہے۔ کل مسٹر علیم الدین کی آمد سے پہلے مجھے بابا صاحب سے بات کرنا ہو گی۔

اور اسے یہ بتا دیجئے کہ اگر وہ خودکشی کرنے کی حماقت نہ کرتی تو شاید ایسے حالات اسے کبھی پیش نہ آتے۔ آئندہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے وہ سو بار سوچ لے"۔

وہ لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چپ چاپ سی ماہین پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے ضرور سوچا تھا کہ جب بچے بڑے ہو جائیں تو بیوی کتنا اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ خاص طور پر جب بیٹیاں بڑی ہو جائیں۔ انہیں ماہین کی اہمیت واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں جاتی ہوں"۔ وہ بہت بھاری بوجھ اپنے کندھے پر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆

وہ بے حد متفکر ذہن کے ساتھ روشی کے کمرے میں آئی تھی۔

وہ بستر پر اوندھی پڑی تھی۔

"سو رہی ہو روشانے؟" ماہین نے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔

"نہیں رو رہی ہوں اپنی قسمت کو"۔ وہ سیدھی ہو گئی۔

"بری بات یوں ناشکری کی باتیں نہیں کرتے"۔

وہ بیڈ پر پاؤں اٹھا کر بڑے سکون سے بیٹھ گئی۔

روشی نے بڑی دلچسپی سے اس کا انداز نشست دیکھا۔

"فارغ ہو کر آئی ہیں؟" وہ مسکرا پڑی۔

"فارغ ہی ہوتی ہوں"۔ ماہین بھی جواباً مسکرا دی۔

"لگتا ہے کسی خاص مہم پر آئی ہیں؟"

وہ ذرا سی اونچی ہو کر نیم دراز ہو گئی۔

"مہم کیا؟ بس اس دن سے ایک خلش سی ہے۔ جس دن تم نے دل نہ لگنے کی بات کی تھی اور میں نے کہا تھا کہ اپنی دلچسپی کا کام بتاؤ"۔

ماہین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"چھوڑیں خالہ! کیا فائدہ ایسی باتوں کا"۔ وہ طرح دے گئی۔

"تم تیمم سے شادی پر خوش کیوں ہو؟ اچھا خاصا تو ہے"۔ ماہین نے ماحول حق میں پا کر پوچھا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ 'اچھا خاصا' نہیں ہے"۔ اس نے ٹالنے کے انداز میں جواب دیا۔

"تو پھر؟" ماہین کی حیرت فطری تھی۔

"سب 'اچھے خاصے' لوگ سب کو اچھے خاصے نہیں لگتے"۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے بولی۔

"پھر تمہیں کون اچھا لگتا ہے حالانکہ اس سوال کا اب کوئی فائدہ تو نہیں"۔

ماہین نے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیوں فائدہ نہیں ہے؟" روشی کی تمام حسیات متحرک ہو گئیں۔

"بھئی آج تو تمہاری شادی کی تاریخیں دی جا رہی ہیں"۔ ماہین نے بظاہر بڑی لاپروائی سے کہا۔

"کون دے رہا ہے؟ خیر جو بھی دے رہا ہے بے کار ہے، شادی تو میرے اقرار سے ہی مکمل ہو گی۔ اور میں اقرار کروں گی نہیں۔ اگر یہ لوگ گھر کی بات باہر سنوارنے کے خواہش مند ہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں"۔ اس نے بے خوفی اطمینان سے کہا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے روشانے۔ یہ سب تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ کیا محبت کرنے والوں کے ساتھ یہی کرتے ہیں"۔ ماہین نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"میں نہیں مانتی ان کی محبتوں کو۔ مستقل دکھ دینے کے انتظامات کرتے ہیں اور محبتوں کے دعوے کرتے ہیں۔ آپ ان کی وکالت نہ کریں۔ یہ کسی کے نہیں ہیں۔ انہیں اپنی ہی کرنے دیں، میں بھی انہی میں سے ہوں، میں بھی اپنی ہی کروں گی"۔

"مگر نقصان میں پھر بھی تمہارا ہی حصہ زیادہ ہو گا"۔

ماہین کا انداز ہنوز تھا۔ اس میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ شاید اس لئے کہ فی الوقت سب سے قیمتی چیز اس کے پاس محفوظ تھا۔

"اور یہ بات کہ زندگی کے سب سے دشوار سے زیادہ دکھ مجھے اپنے حقیقی باپ سے ملا ہے میں انہیں بھی معاف نہیں کروں گی۔ ان کی بس اتنی ہی تو اہمیت رہی ہے میری زندگی میں کہ ضروری کاغذات و اسناد پر باپ کے خانے میں ان کا نام لکھا جاتا ہے"۔

"چونکہ تمہیں ہر کام میں جلدی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ نازک ترین مسائل کا نتیجہ بھی تم اتنی ہی جلدی چاہتی ہو جتنی جلدی تمہیں ایک کپ چائے کی ہوتی ہے" مگر روشانے! زندگی ایک چائے کا کپ تو نہیں ہے۔ مسائل کو سوجھ بوجھ کر سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ تمہارے پاپا تم سے اور جواد سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا کہ دنیا میں دوسرے باپ اپنی اولاد کو پیار کرتے ہیں۔ دیکھو وقت بہت کم رہ گیا ہے بالکل صاف۔ صاف بات ہونا چاہیے' اس لئے کہ پھر بابا صاحب سے بات چیت میں بھی

بہت ہی مشکل ہو گا"۔

روشی پھر ماہین کی شکل دیکھنے لگی۔

"تمہارے پاپا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری 'دلہنیا' کا نام پوچھ کر انہیں بتاؤں تاکہ معاملہ متفقہ انداز میں حل
وہ کہہ رہے تھے کہ روشی شادی پر آمادہ نہیں تو بابا صاحب کو ان کے ارادے سے نہیں روکا جا سکتا"۔

روشی پھر ماہین کی شکل دیکھنے لگی۔

"پاپا کہتے ہیں"۔ اسے فوری یقین دلانا مشکل ہو رہا تھا۔

"ہاں تو اب جلدی سے بتاؤ"۔ ماہین مسکرا رہی تھی۔

"خالہ ۔۔۔ وہ ۔۔؟" اس کی سوئی جیسے اٹک گئی تھی۔

"ہاں بھئی"۔ ماہین کو اس کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔

روشی پتہ نہیں کس سوچ میں ڈوبی رہی پھر ایک دم چونک پڑی۔

"ارے مزے ہو گئے ہیں آپ کو کیا؟ اپنے کئے کا کریڈٹ بھی ان کے نام لگا رہی ہیں، خالہ جی گریٹ"۔ وہ جیسے اپنی جگہ

روشی فوری ہوش میں آئی۔

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ آرام سے کسی کی باتوں میں آ جائیں"۔ ماہین برجستہ بولی۔

روشی ایک دم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ قدرت تمہارا کام آسان کر رہی ہے"۔ ماہین نے گہری نظروں سے ٹٹولا۔

روشی نے سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے ماہین کی جانب دیکھا۔

"کیا واقعی خالہ پاپا نے ایسے کہا ہے؟" اس کی آواز میں بہت دھیما پن اور بے یقینی تھی۔

"بھلا مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟" ماہین مسکرائی۔

روشی پھر خاموش ہو گئی۔

"اس میں اتنا الجھنے کی کیا بات ہے؟ بھئی نام بتاؤ اور بس"۔ ماہین نے کہا۔

"لیکن خالہ! شاید نام بتا کر اور مشکل ہو جائے بجائے کام سنورنے کے"۔ روشی نے خاصے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نام بتانے سے کیا مشکل ہو گی؟ اس کے بعد تو بس تمہارے پاپا کا کام ہے"۔

"یہ بات نہیں ہے خالہ!" اس نے کھنچے کھنچے انداز میں کہا۔

"تو پھر نام بتانے میں کیا بات ہے؟" اب ماہین کو الجھن ہونے لگی۔

"اگر میں نے نام بتایا تو شاید بابا صاحب مجھے شوٹ کر دیں۔ بالغرض کوئی مجبوری ہو جائے اور یہ سب میرے حق میں ہو جائیں تو وہ شاید مانے۔ اس لئے بہتر ہے میری شادی کا قصہ ہی ختم ہو جائے" کیونکہ میں اس کے علاوہ ادھر کسی اور کو

بھی قبول نہ کر سکوں"۔

ماہین بری طرح چونک پڑی۔ غصے کے کچھ کسی تیز جملوں کو اس نے فوراً معنی پہنا دیئے۔

"کیا مارن ۔۔۔؟"

روشی کا دل بری طرح دھڑک گیا (کتنی ذہین ہیں خالہ) وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"یہ تم نے کیا کیا روشانے؟" وہ بس یہی کہہ سکی۔

چند لمحوں تک دونوں کے درمیان گہرا سکوت طاری رہا۔

"تو پھر ارادہ ہے تمہارے بابا کو"۔ بالآخر ماہین نے خاموشی توڑنے میں پہل کی۔

"کوئی فائدہ تو ہے نہیں، آپ بس یہ کریں کسی طرح میری شادی کا قصہ ختم کرا دیں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی"۔ روشی نے بجھے بجھے سے انداز میں کہا۔

ماہین یک دم چپ سی ہو گئی۔

پھر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"وہ واقعی بہت اچھا ہے، اس کی عادات بہت پسندیدہ ہیں مگر افسوس ۔۔۔۔ خیر میں تمہیں کسی جھوٹی تسلی سے بہلانا بھی نہیں چاہتی۔ اچھا میں چلتی ہوں"۔

روشی دوبارہ وہیں دراز ہو گئی۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ماہین واپس اپنے بیڈ روم میں آئی تو دیکھا یاور علی خان بالکل گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً سے پیشتر فائلیں بند کر دیں۔

"آئیے جناب! وقت بہت کم ہے بڑی دیر لگا دی ہے"۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پاس آ کر بیٹھنے کو کہا۔

ماہین ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے تھوڑے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی

اس کا خاموش اور سرد سا انداز انہوں نے محسوس کر لیا تھا اور اب وہ اس کی آواز سننے کے منتظر تھے۔

"ایک درخواست کروں آپ سے؟" اس کے انداز میں اعتماد کے بجائے جھجک تھی۔

"خیریت؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کسی طرح بھی آپ سے ہو سکے بس روشی کی شادی کا معاملہ ختم کر دیں ورنہ وہ بہت دکھ اٹھائے گی۔ اولاد سے زیادہ قیمتی نہیں ہونا چاہیے انسان کی انا کو"۔

وہ بہت دھیمی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

"میں نے آپ کو کوئی کام دے کر اس کے پاس بھیجا تھا"۔ ان کی سوالیہ نظریں اس کا چہرہ ٹٹولنے لگیں۔

"جو میں نے آپ سے کہا اس کی بنیاد پر بابا صاحب سے کوئی واضح فیصلہ کرایا جا سکے"۔

یاور علی خان نے روکھے انداز میں کہا۔

"در اصل جہاں وہ خواہش مند ہے وہاں بھی معاملات ناممکن ہیں اور ہم سے تو وہ ایک سے لاکھ گنا ۔۔۔۔ آمادہ نہیں"۔

بالآخر اسے بات بڑھانا پڑی۔

"کون لوگ ہیں وہ؟" یاور علی خان سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"وہ آپ میں سے کسی کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتے"۔ ماہین نے جواب دیا۔

"تو اسے ایسی حماقتیں کرنے کو کس نے کہا تھا، مجھے افسوس ہے کہ کسی صورت بابا صاحب سے بات نہیں کی جا سکتی۔ آپ اسے سمجھائیے گا کہ بابا صاحب کا فیصلہ مان کر وہ بھی بیٹی ہونے کا ثبوت دے اور مطمئن ہو جائے کہ اس کے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ اس کے حق میں بہتر ہے"۔

"وہ نہیں مانے گی"۔ ماہین نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"آپ اسے آمادہ کریں، بچی ہے مان جائے گی"۔ یاور علی خان نے بھی بڑی تیزی سے جواب دیا۔

"آپ کچھ کیوں نہیں رہے ہیں میں اس سے جو بات کر کے آ رہی ہوں"۔ وہ پھر سے زچ ہو گئی۔

"آپ نے جو کچھ بھی کیا ہو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، بس اب تو یہ ہے کہ اسے ہر صورت آمادہ کرنا ہے"۔ یاور علی خان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

"وہ نہیں مانے گی"۔ ماہین نے جھلا کر جواب دیا۔

"تو پھر آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے، دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانے گی"۔ وہ برہم ہو گئے۔

"تشدد کریں گے کیا اس پر؟" ماہین نے برہمی سے استفسار کیا۔

"میں آپ کو اس قسم کا بندہ نظر آتا ہوں؟" انہوں نے الٹا سوال جڑ دیا۔

"بلوائیے آپ اسے، تماشا بنا رکھا ہے اس نے، ابھی ٹھیک کرتا ہوں"۔ وہ بپھر اٹھے۔

ماہین اندر سے سہم گئی۔ فوراً کرسی سے اٹھ کر ان کے قریب آ گئی اور اپنا دایاں ہاتھ ان کے شانے پر رکھ کر منت کے انداز میں گویا ہوئی۔

"دیکھیں! پلیز محبت سے بات کیجئے، اس کا دل ورنہ بری طرح ٹوٹ جائے گا۔ وہ آپ کا خون ہے، آپ اس کے سب سے زیادہ اپنے ہیں، آپ ہی کو سب سے زیادہ اس کا خیال رکھنا ہو گا، پلیز"۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے، میں اسے کچا نہیں کھا جاؤں گا، آپ بلوائیے اسے۔ پر اطمینان ہو جائیں"۔

ان کے انداز میں تھوڑا سا دھیما پن پیدا ہوا۔ وہ بیٹھ جانے کے انداز میں گویا ہوئے تھے۔

ماہین فوراً باہر چلی گئی تھی۔

باپ کا پیغام سن کر اس نے چونک کر بغور ماہین کا چہرہ دیکھا تھا۔

"کیا بات کریں گے وہ مجھ سے؟" اس نے دوپٹہ سنبھال کر دریافت کیا تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر ماننے والی کوئی بات نہیں۔ شاباش آؤ میرے ساتھ"۔

اس نے روشی کا ہاتھ تھاما۔

وہ اٹھ کر ماہین کے ساتھ ہو لی۔ ماہین نے محسوس کیا جیسے اس کی چال میں غیر معمولی دھیما پن ہے۔

کمرے میں ماہین پہلے داخل ہوئی اور اس کے پیچھے پیچھے روشی۔

"السلام علیکم پاپا"۔

اس نے ان سے بہت فاصلے پر بیٹھنے کیلئے جگہ تلاش کی۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہو؟" ان کا انداز بے تاثر تھا۔

"جی تھینکس"۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میں تم سے اس موضوع پر بات کرنا تو نہیں چاہ رہا تھا جس پر کرنے جا رہا ہوں اس لئے کہ مجبوری ہے تمہیں پتا چل چکا ہو گا کہ تم کے والدین تاریخ لینے آ رہے ہیں"۔ انہوں نے مختصر تمہید کے بعد فوراً ہی بات شروع کر دی۔

روشی خاموش رہی۔

"اور اب بھی میں تم سے دو ٹوک بات کرنا چاہوں گا اور یہ بھی کہ تم بھی واضح ایک دم جواب دو۔

مجھے اپنی کہی بات اچھی طرح یاد ہے تمہاری انگیجمنٹ والی رات میں نے تم سے کہا تھا میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا مگر یہ شرط ہے کہ کوئی بات کوئی قدم ہمارے اسٹیٹس سے اپوزٹ نہ ہو۔ میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں اور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ماہین بتا رہی تھی کہ وہ لوگ جن کا تذکرہ عالم تم نے ان سے کیا ہے ان پر ہم لوگ راضی نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کے تعارف کے بعد ماہین نے جو اندازہ لگایا ہے وہ یقیناً انہوں نے اپنے طور پر کو محسوس کرنے کے بعد ہی کیا ہے وہ جسٹ جو یہ کر گئی ہیں کیا اس گھر کا فرد ہونے کے ناتے تم نہیں کر سکتی تھی؟" وہ بہت نرم انداز میں کہہ رہے تھے۔

"لوگ... کون لوگ؟ کیا بتا دیا ہے خالہ نے؟" اس نے الجھے ہوئے انداز میں ماہین کی سمت دیکھا۔

"میں بھی نہیں پاپا' آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟" اس نے ماہین کی طرف قدرے پریشان کن انداز میں دیکھتے ہوئے باپ سے سوال کیا۔

"انہی لوگوں کی جن کے بارے میں تم نے ماہین سے بات کی ہے"۔ اس بار وہ خاصے تیکھے لہجے میں بولے۔

"لوگ؟" اس نے ماہین کی طرف دیکھا۔

"میری "ان" سے ابھی وضاحت کے ساتھ بات نہیں ہوئی ہے"۔

اس نے روشی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

روشی سر جھکا کر ہاتھ مسلنے لگی۔

"کون لوگ ہیں وہ؟ کہاں رہتے ہیں؟" یاور علی خان نے اس کی طرف صرف ایک نگاہ ڈالی تھی۔

"وہ لوگ... نہیں ہیں پاپا"۔ اس نے قدرے جھجک کر جواب دیا۔

"میرا دماغ خراب نہیں کرو روشانے سیدھی سیدھی بات کرو"۔

وہ برہم ہو گئے۔ ماہین یک دم کرسی سے اٹھ کر ان کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ جیسے یہ ایک بے ساختہ کوشش تھی۔

"پاپا" ایک آواز سے اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔

"اس آپ یہاں میری شادی نہ ہونے دیں میں آپ سے کبھی کچھ نہیں کہوں گی کسی معاملے میں آپ سے وہ نہیں مانگوں گی بلکہ یہاں اس طرح رہوں گی کہ شاید آپ کو یاد بھی دلانے کی ... میں بھی یہاں ہوں۔ میں آپ کو کبھی تکلیف نہیں دوں گی"۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ماہین تیزی سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ گئی۔

یاور علی دم بخود سے اپنی جگہ بیٹھے رہ گئے۔

"آپ اسٹیٹس سے آگاہی ہونے کے بعد اس طرح کی حماقت کرنے کی کیا ضرورت تھی"۔ یاور علی خان نے جیسے بہت رک کر کہا تھا۔

"جب قسمت بہت ہی اچھی ہو تو مرضی کی بات اپنے اسٹیٹس ہی میں بن جاتی ہے لیکن جب قسمت ہی"۔ جانے کیسے اس کے منہ سے یہ سب نکل گیا۔

ماہین اپنے آنچل سے اس کے رخسار پونچھ رہی تھی۔ یہ بھی تقویت دلانے کا ایک انداز ہوتا ہے۔

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں' جیسے کہ میرے ساتھ ناپسندیدہ واقعات کا ایک طویل سلسلہ جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا اب کہیں جا کر تھوڑا سا سستانے کا موقع آیا تھا مگر اس بار میری اپنی بیٹی یہ تو وہاں کیا بات ہے جو ختم میں نہیں ہے"۔ انہوں نے اتفاق کرتے کرتے اچانک سوال بھی جڑ دیا۔

"ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی اتفاق کرتا ہے تو دوسری جانب عجیب سی طمانیت اور خوشی کی لہر دوڑنے لگتی ہے انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے اور آگے کی گفتگو مزید رواں اور خوشگوار ہو جاتی ہے"۔

روشی سنبھل کر اطمینان سے باپ کی بات سننے لگی تھی مگر اس سے آگے کے ہوئے سوال پر ٹھٹک کر رہ گئی۔

"مجھے آج اپنی ہر بات کا جواب چاہئے"۔ وہ اس کی خاموشی پر برہم ہوئے۔

"میں نے کہا نا پاپا! میں کسی سے بھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ آپ یہ باب ہمیشہ کیلئے بند کر دیں"۔ وہ سکون سے گویا ہوئی۔

"ہاہا شاباش یہ تو فقط لڑکی کی ناؤ ڈوبنے والا ڈرامہ ہے"۔ انہوں نے گود میں رکھی فائل اٹھا کر دائیں طرف رکھی۔

روشی کا وہم گویا حلق میں آ گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اس انداز میں پہلی مرتبہ بول رہے تھے۔

ماہین تو خود بے حد گم صم ہو گئی تھی۔

ماہین جیسے کسی خیال سے چونک کر آگے بڑھی۔

"ایزی پلیز! دیکھیں آپ اپنا ٹمپر لوز نہ کریں۔ میں بابا صاحب سے بات کرتی ہوں، وہ جو کچھ کہیں گے میں مان لوں گی پلیز"۔ اس کا انداز التجائیہ تھا۔

"میں جانتا ہوں وہ نہیں مانیں گے۔ اٹ وِل بی ویسٹ آف ٹائم ـــــ!" ان کی پیشانی پر شکنیں سی پڑی ہوئی تھیں۔

"صرف انکاری نہیں ہے اپنے اسٹیٹس کا بھی خیال نہیں ہے۔ وہ بڑی سزا دیں گے"۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آؤ روشی! میرے ساتھ آؤ"۔ ماہین نے روشی کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

"آپ وہاں نہیں جائیں گی ماہین"۔ یاور علی خان نے اسے ٹوکا۔

وہ پھر رک گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے میں وہاں نہیں جا رہی مگر ابھی آتی ہوں ویٹ کریں"۔

ماہین صلح جو انداز میں کہہ کر روشی کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ روشی کو لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"خالہ! میں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں، پپا کو سمجھائیے اور یہ بھی کہ ان کے تمام مفادات میری زندگی ہی سے شروع ہیں ناں"۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تیزی سے بولی۔

"خبردار! جو تم نے کوئی الٹی سیدھی پہلے جیسی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی"۔ ماہین نے ڈر کر اس کی صورت دیکھی۔

"خالہ! جس شخص کے نام ہی سے میرے اعصاب ٹوٹنے پھوٹنے لگتے ہیں اس کے ساتھ عمر کیسے کٹ سکتی ہے اور شادی کوئی اتنی اہم بات نہیں کہ تمام لوگ اپنی تمام توانائیاں صرف اس موضوع پر مرکوز کر دیں۔ شادی کے بعد سپریشن بھی ہو جاتی ہے، کبھی شوہر کے انتقال سے بھی عورت پر تنہائی کی نوبت آ جاتی ہے"۔ وہ بہت دکھ سے کہنے لگی۔

"یہ بات نہیں ہے روشی! اولاد بہت بڑی ذمہ داری ہوا کرتی ہے اور بڑوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے محفوظ اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں"۔ ماہین نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر پپا تو میرے لئے کانٹوں بھری زندگی کا انتظام کر رہے ہیں"۔ وہ سسک کر گویا ہوئی۔

"یہ تمہاری وقتی سوچ ہے، وہاں تمہیں اتنا پیار اور آرام ملے گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گی"۔

ماہین نے اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ بھی خالہ؟ آپ بھی ـــــ؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

ماہین نے بے ساختہ اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"تمہارا کیس بہت کمزور ہے روشی! اگر مجھے ایک فیصد بھی امکان محسوس ہوتا تو میں تمہارے پپا کی ہر پابندی اور روک نظر انداز کر دیتی اس لئے کہ محض تمہاری ذات نے تو مجھے ان سے قریب کر دیا ہے اگر تم پیدا نہ ہوتے تو میں حویلی آنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ! کیا یاور سے تمہاری واقعی کوئی مخالفت ہے؟"

اس کی آواز اتنی دھیمی تھی بس روشی ہی سن سکی تھی۔

روشی خاموش رہی۔

"روشی پلیز!" ماہین نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کیا۔

"خالہ! میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا وہ تو ہرگز بھی اس لائق نہیں ہے"۔

وہ عجیب بے بسی سے گویا ہوئی۔

"ہیں کیا مطلب؟" ماہین کو اس نے گھما کر رکھ دیا۔

"بے وقوف کہیں کی! ابھی مجھے بھی مروا دیتی"۔ ماہین نے اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"روشی تو میں سوچ رہی تھی۔ یاور تو بڑا دانشمند، سنجیدہ اور بڑا ہی شائستہ سا ہے، وہ اس طرح کی حماقت کیسے کر سکتا ہے"۔

ماہین خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

"یہ گھوڑوں کو قابو کرنے سے انسان دانشمند ہو جاتا ہے"۔ طنز اس کے لہجے سے ظاہر تھی۔

ماہین کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

روشی نے منہ بنا لیا۔

ماہین نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا لیا۔

"روشی! اچھا! یہ سب یہاں نہیں ہو سکتا"۔

"تو پھر وہ بھی نہیں ہو سکتا جو یہ لوگ کرنا چاہ رہے ہیں"۔ وہ اس کے شانے پر سر ٹکائے قطعی انداز میں گویا ہوئی۔

"ہوں یہ قابل عمل ہے، میں تمہارے پپا کو کنونس کرنے کی کوشش کرتی ہوں"۔

اپنے لہجے کے کھوکھلے پن پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گئی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم اطمینان سے اپنے کام کرو، گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، ٹھیک ہے؟"

وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر باہر چلی گئی۔

اور روشی اس کی جانب متوجہ ہونے کے بجائے گہری سوچ میں تھی۔

شام کے چار بجے تھے لڑکیوں پر گویا آفت اتری ہوئی تھی۔ کچھ تو وہ بیچ سے اور کچھ گرمی کر کے کنواری والا سوٹ سی کر یہاں وہاں کی بے مقصد چکر کاٹ رہی تھی۔ روشی یونہی دل بہلانے کے خیال سے ہال کی طرف آئی تھی۔ وہاں عجیب بیزاری ہوا تھا۔ کوئی آئی برو بنانے میں مصروف تھی تو کوئی ویکسنگ کے عذاب میں مبتلا تھی۔

"تم کچھ نہیں کر رہی؟" روبی نے ہاتھ پکڑ کے آئینے میں اس کو دیکھا۔

"سوچ رہی ہوں کچھ کر لوں"۔ اس نے بڑا ساختہ سا جواب دیا اور واپس باہر آ گئی۔

اس کا رخ بیرونی برآمدے کی طرف تھا۔ وہ باغ میں جا رہی تھی غالباً۔

اس کی چال سے اس کی ذہنی حالت کا پتا چل رہا تھا۔ وہ بے حد گم صم تھی۔

اس کے باہر آتے ہی پھاٹک کھلا تھا اور ہاری جیپ سے کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ باغ کی طرف مڑنے کے بجائے وہیں سنگ مرمر کے زینے پر بیٹھ گئی۔

ہاری اسے دیکھ چکا تھا اس لیے بڑے محتاط انداز میں برآمدے کی طرف بڑھا تھا مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اس کے پاس سے گزر بھی گیا، مگر اس کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے ہاری کو مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا اپنے کمرے کی سمت بڑھتا چلا گیا۔

جانے کس احساس کے تحت اس کے رخسار بھیگتے چلے گئے۔ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

معاً اس نے دیکھا۔ کاکا جان کا ڈرائیور شیر گل پرانی وضع کی ایک طرف کھڑی ہوئی جیپ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی شیر گل کے پاس پہنچی تھی۔

"شیر گل! ایک منٹ بات سنو۔"

"جی بیبی صیب" ۔ وہ مؤدبانہ گویا ہوا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"ام ہرائے واپس جاتا اے"۔ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے روشی کو دیکھا۔

"کاکا جان ہیں سرائے میں؟" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

"کاکا جان! اچا اچا (اچھا اچھا) تیمور خان" ۔ شیر گل تھوڑا سا الجھ کر بات سمجھ گیا۔

"ہاں ہاں!" اسے اس کی کند ذہنی پر جھلاہٹ سی ہوئی۔

"آو... تو سندہ گیا اے شکار پر کوئی پیغام؟" اس نے اپنی ذہنی اڑان کے حساب سے سوال کیا۔

"ہوں... خیر تم اپنی جیپ باہر نکالو دیتی ہوں پیغام" ۔ وہ اس سے اور زیادہ وقت گنوائے بغیر تیزی سے اندر دوڑ گئی۔

بے چارا حیران پریشان سا اپنی جیپ کی طرف بڑھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔

"وہ جتنی تیزی سے اندر گئی تھی اتنی تیزی سے واپس آئی تھی۔ اس مرتبہ اس نے بڑی سی چادر لپیٹی ہوئی تھی اور پردہ دار عورتوں کی طرح چہرے پر بھی سیٹ کر رکھی تھی۔

شیر گل جیپ میں بیٹھا ہوا اس کے "پیغام" کا انتظار کر رہا تھا۔

دین محمد چوکیدار گیٹ بند کر کے مالی سے بات چیت میں مصروف تھا۔ اس نے صرف ایک اچٹتی سی نظر چادر میں لپٹی روشی پر ڈالی تھی۔

اس نے جیپ کا دروازہ کھولا اور پھرتی سے بیٹھ گئی تھی۔

"تم کیا کرتا ہے کون اے؟" شیر گل بے چارہ بدحواس ہو کر رہ گیا۔

"میں روشی ہوں جو تم سے ابھی بات کر رہی تھی" ۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تو کیا کرتا اے ام اے ساتھ کدھر جاتا اے ام تو ہرائے جاتا اے" ۔ بے حد سراسیمگی کے عالم میں وہ اس سے مخاطب تھا۔

"میں ہارون علی خان کی بیٹی ہوں، تیمور علی خان کی بھتیجی۔ سرائے بھی میرا ہی گھر ہے اگر میں وہاں جا رہی ہوں تو تمہیں کیا"

"وہ سخت لہجے سے گویا ہوئی۔

"پر آپ... اکیلا؟" بے چارہ گھگھیا کر رہ گیا۔

"اکیلی کہاں تم نہیں ہو میرے ساتھ" ۔ وہ پھر غرائی۔

"پر بڑا خان" ۔ شیر گل کی جان عجب مشکل میں پڑ گئی تھی۔

"چلو تم جیپ کیوں اسٹارٹ نہیں کرتے؟" وہ برہم ہوئی۔

"وہ ام... ادار مطلب اے بڑا ہرائے" ۔ وہ ہنوز متذبذب تھا۔

"اسٹارٹ کرو اب کیوں نہ ہو آخر تم ہو جاتا ہے چلاؤ جیپ ورنہ میں شور مچاؤں گی کہ تم پستول دکھا کر مجھے لے جا رہے ہو" ۔ اس نے اسے دھمکی دی۔

شیر گل کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

اس نے جیپ چلائی نہیں تھی بلکہ بھگائی تھی۔

"آپ ادھر کیوں جاتا ہے بیبی صاحب" ۔ وہ پکی سڑک پر آتے ہی روشی سے مخاطب ہوا۔

"وہ بھی میرا گھر ہے تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میں اپنے چچا کے پاس جا رہی ہوں، کسی نامحرم کے پاس تو نہیں جا رہی کہ چچا ہیں وہ میرے، سوتیلے بھی نہیں ہیں۔ خبردار جو تم نے مجھ سے سوال جواب کیے۔ اپنی اوقات میں رہو۔ سگی ہوں میں تمہاری جاگیر کی حصے دار۔"

روشی نے مجبور ہو کر اسے "ڈر" سے خاموش کرایا۔

"آپ مائی باپ اے مارا ام تو اس واسطے بولا تھا آپ جوان بچی او" ۔

"اچھا اب خاموشی سے جیپ چلاؤ میرے سر میں درد ہو رہا ہے" ۔ اس نے آنکھیں موند کر سیٹ سے ٹیک لگا لی۔

شیر گل ڈرائیو کرتے کرتے گاہے گاہے اس پر نظر ڈال لیتا تھا۔

"بیبی صیب! آپ پیچھے جا کر آرام سے سو جاؤ ابی بڑا دور جاتا اے" ۔ وہ بولے بنا نہ رہ سکا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں" ۔ اس نے زاویہ بدلے بغیر ترشی سے جواب دیا۔

شیر گل مزید کچھ بولنے کا ارادہ کر کے خاموش ہو گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

ماہین ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی بھاری کامدار دوپٹا سیٹ کر رہی تھی۔
یاور علی خان نیم دراز گہری سوچوں میں غرق سگرٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔
"ہوں۔۔۔ بس!" انہوں نے دستک کا جواب دیا تھا۔
عالم تاب اندر داخل ہوئیں۔
یاور علی خان سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "آیئے بھابی بیگم۔"
"تیار ہو گئیں ماہین؟ مہمان بھی آ چکے ہیں۔ ایسا کرو، روشی کو بھی کہہ دو کپڑے وغیرہ تبدیل کر لے گی۔ ہو سکتا ہے اس کی ساس اس کے پاس جائیں یا اسے بلوائیں۔ پھر تم مہمانوں کے پاس آ کر بیٹھ جانا۔ سب لوگ بابا صاحب سمیت ڈرائنگ روم میں ہیں۔"
"جی بس میں تو تیار ہوں کہہ دیتی ہوں روشی سے۔" بولتے بولتے ماہین کی آواز بے حد دھیمی ہو گئی۔
"یاور تم نہیں آ رہے ہو؟" انہوں نے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس یاور علی خان کو قدرے حیرت سے دیکھ کر دریافت کیا۔
"آ رہا ہوں۔ بلکہ "ہم" آ رہے ہیں۔" انہوں نے ماہین کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ عالم تاب کمرے سے باہر چلی گئی۔
"آپ روشی کو تاکید کر آئیں۔ میں چینج کرتا ہوں اتنی دیر میں۔ ٹھیک ہے؟"
ان کا انداز ہنوز گم سم سا تھا۔ جیسے وہ اندرونی خلفشار کا شکار ہوں۔
"جی۔" ماہین نے ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھ کر جواب دیا۔
یاور علی خان اٹھ کر باتھ روم میں چلے گئے۔ اور ماہین روشی کے بیڈ روم میں چلی آئی۔
روشی بیڈ روم میں موجود نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ اندر محسوس کی جانے والی خاموشی تھی۔
اس نے دو تین بار دروازے پر دستک دے کر دھکیلا اور روشی کو آواز دی۔ مگر جواب میں بدستور خاموشی تھی۔
اس نے اندر جھانکا۔ باتھ روم خالی تھا۔ وہ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔
سامنے سرخ ساڑھی باندھے سرسوتی بڑبڑ کرتی آ رہی تھی۔
"سرسوتی!" اس نے آواز دی۔
"ہاں بی بی!" وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھی۔
"ذرا دیکھنا۔ کیا روشی ہال میں ہے؟"
"ہنی ای آساں۔" وہ حکم پا کر ہال کی طرف بڑھ گئی۔ ماہین وہیں کھڑی رہی۔ دو منٹ بعد سرسوتی ہال سے واپس آتی دکھائی دی۔
"او ورتے نئیں اے بی بی۔ پر تساں کھلو جاؤ اک ہور تھاں اتاں نوں ویکھ ساں۔"

وہ پلٹ گئی۔ سامنے حویلی کے پچھلے حصے کی طرف گئی تھی۔
ماہین کو جانے کیوں پریشانی سی ہونے لگی تھی۔ عجیب سے وسوسے دل میں آنے لگے تھے۔
"ارے۔۔۔ ماہین۔ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" عالم تاب اوپر سے آ رہی تھیں۔ زینے طے کرتے کرتے انہوں نے پوچھا تھا۔
"وہ روشی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اپنے کمرے میں تو نہیں ہے۔" ماہین نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔
"ہو گی ہال میں ہو گی۔ سب بچیاں وہیں ہیں۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا۔
"دیکھ آئی ہے سرسوتی۔ وہاں نہیں ہے۔" ماہین نے اپنی بات کے دوران عالم تاب کے چہرے کے تاثرات کا بھی جائزہ لیا۔
"ہیں؟ باتھ روم میں تو نہیں تھی؟" عالم تاب کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔
"وہ سرسوتی گئی ہے کسی اور جگہ دیکھنے۔" ماہین نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
"کہاں؟" عالم تاب کے ذہن میں امکان ابھرا۔
"پتا نہیں۔" ماہین نے جواب دیا۔
"ہوں۔" عالم تاب نے پرفکر انداز میں ہنکارا بھرا۔
اسی دم باری تیزی سے زینے طے کرتا ہوا اوپر آیا اور ان دونوں کو بیچ راستے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔
"خیریت؟" اس نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔
"تم نے روشی کو تو نہیں دیکھا باری۔ باغ میں یا ادھر ادھر؟" عالم تاب نے حویلی کے سب سے باسوخ فرد سے جس کے ساتھ اعتماد کیا کہ وہ ضرور کچھ نشاندہی کر سکے گا۔
"اپنے کمرے میں نہیں ہیں وہ؟" وہ چونک پڑا تھا۔
"نہ کمرے میں نہ ہال میں۔" ماہین نے جلدی سے بتایا۔
"ہو سکتا ہے بھائی (سید) کے کمرے میں ہوں۔" اس نے امکان ظاہر کیا۔
"میں وہیں سے آ رہی ہوں۔" عالم تاب نے اس کا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔
"تو پھر۔" اس کا ذہن فوراً جھومری کی طرف گیا۔ اس نے معنی خیز انداز میں عالم تاب کی طرف دیکھا تھا۔
"گئی ہے سرسوتی اس طرف۔" انہوں نے ماہین کے چہرے پر سرسری نظر دوڑا کر باری کو جواب دیا۔
"گلی میں کھڑی ہوئی کھڑکی سے واپس آیا تو وہ آدھے میں زینے پر ٹھٹکی ہوئی تھیں۔"
"کتنی دیر کی بات ہے؟" عالم تاب نے یونہی پوچھا۔
"ایک گھنٹے سے تو کم ہی ہوا ہو گا۔"
اسی دم سرسوتی تقریباً بھاگتی ہوئی آئی۔

"اور وہ بھی نہیں ہے"۔ وہ پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بولی۔

"جاؤ باری۔ ذرا دیکھو بابا صاحب کے کمرے میں تو نہیں ہے"۔

ماہین نے بڑی جانچتی ہوئی نظروں سے باری کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ بلیو جینز اور سکائی بلیو لائنوں والی شرٹ میں وہ بہت چاک و چوبند محسوس ہو رہا تھا۔

وہ تیزی سے بابا صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

"یہ لڑکی تو مسئلہ بن گئی ہے۔ حالانکہ اسے سب پیار کرتے ہیں۔ سب خیال رکھتے ہیں"۔ عالم تاب خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھیں۔

ماہین بس ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

باری جلدی واپس آ گیا۔ اس کی چال سے اس کا ذہنی الجھاؤ ظاہر تھا۔

"آپ لوگ چلیے میں دیکھتا ہوں۔ وہ بابا صاحب کے کمرے میں بھی نہیں ہیں"۔

عالم تاب دھک سے رہ گئیں۔ وہ اس کی شدید طبیعت سے بخوبی واقف تھیں۔ طرح طرح کے وسوسے ان پر حملہ آور ہو گئے۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں تمہیں بلوا لوں گی"۔ وہ متفکرانہ انداز میں ماہین سے مخاطب ہوئیں اور سامنے کی طرف بڑھ گئیں۔

ماہین بھی آہستہ آہستہ چلتی اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

یاور علی خان تیار ہو کر صوفے پر بیٹھے ایک امپورٹڈ میگزین کا جائزہ لے رہے تھے۔ دروازہ کھلنے پر سامنے دیکھا تو چپ چاپ سی ماہین کو اندر آتے پایا۔

"روشی کیا کر رہی ہے۔ تیار ہو گئی؟" انہوں نے ماہین کے چہرے سے بہت کچھ پڑھ لیا تھا۔ جو روشی سے متعلق سوالات شروع کر دیے تھے۔ یوں بھی جس طرح کی صورتحال درپیش تھی۔ انہیں کانشس ہونا ہی چاہیے تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں تو نہیں ہے۔ سرسوتی اور باری وغیرہ دیکھ رہے ہیں اسے"۔ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

"دیکھنے کا کیا مطلب۔ وہاں ہال میں ہو گی لڑکیوں کے ساتھ"۔ یاور علی خان نے کھوج لینے والی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔

"ہوں"۔ ماہین نے فی الوقت ان سے مزید بات کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

"ابھی..... معلوم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے گھر میں ہی ہو گی"۔ اس نے خود پر قابو پا کر عام سے انداز میں جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے جواد کے پاس گئی ہو"۔ وہ اندازہ لگانے لگے۔

"جی..... ہو سکتا ہے"۔ اس نے تائید کرنا لازم سمجھا۔

"آپ اتنی گم صم سی کیوں ہیں؟" ان کی حسیات بڑی شارپ تھیں۔

"نہیں تو"۔ وہ زبردستی مسکرائی۔

"کوئی بات تو نہیں؟" وہ مشکوک سے نظر آئے۔

"نہیں نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آپ فکر مت کریں"۔ اس نے بڑی واضح مسکراہٹ کے ساتھ انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"فکر مند تو ہو سکتی ہے۔ وہ ہے ہی نہایت بے وقوف لڑکی"۔ وہ بڑبڑائے۔

ماہین کے پاس خاصی معقول دلیل تھی کہ وہ چپ رہی کہ اس طرح ایک نئی بحث کا آغاز ہو سکتا تھا۔ جس سے ماحول میں کشیدگی پیدا ہو سکتی تھی۔

وہ دونوں نہایت خاموشی سے کسی نئی اطلاع کا انتظار کرنے لگے۔

یاور علی خان کی انگلیوں میں سگریٹ پھنسا ہوا تھا۔ وہ ادھر ادھر ایش ٹرے تلاش کرنے لگے تھے۔

ماہین اٹھ کر ادھر ادھر ایش ٹرے تلاش کرنے میں جیسے ان کی مدد کرنے لگی۔ میز سے اٹھایا تو اٹھا لیا گیا۔ اس نے ان کے سوالوں کو بھلاتے ہوئے ماحول میں کچھ خوشگواری پیدا کرنے کے خیال سے کھٹاک سے ایش ٹرے ان کے سامنے رکھ دیا۔ اسے خود بھی اس عمل میں لطف محسوس ہوا۔

یاور علی خان نے آگے جھک کر سگریٹ سلگایا۔

"تھینکس!" انہوں نے دھواں اس کے منہ پر چھوڑ دیا۔ ماہین مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ رگ و پے میں عجیب سی طمانیت دوڑ گئی تھی۔

اسی دم دروازہ بجا۔ ماہین کے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

"یس"۔ یاور علی خان نے اجازت دی تھی۔

عالم تاب اندر داخل ہوئی تھیں۔ اور بڑے سراسیمہ انداز میں۔

"یاور..... روشی حویلی میں کہیں نہیں ہے"۔ وہ دل پکڑ کر صوفے پر ڈھے گئیں۔

ماہین کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔

یاور علی خان دم بخود سے بیٹھے رہ گئے۔

"وہ لان میں"۔ ماہین نے کچھ اور جگہوں کا نام لینا چاہا۔ جہاں وہ جا سکتی تھی۔

"سب جگہ دیکھ لیا۔ سب جگہ..... ہائے"۔ انہوں نے سینے پر ہاتھ مارا۔

"یاور مجھ میں تو ہمت نہیں کہ بابا صاحب کو کچھ بتاؤں۔ ارے میرے اللہ۔ یہ ہمارا کیسا امتحان ہے"۔ وہ چہرے پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگیں۔

"بھابی بیگم! پلیز۔ حوصلہ کریں۔ کہاں جائے گی بھلا وہ..... خود کو سنبھالیں"۔

وہ اٹھ کر ان کے پاس آ کھڑے ہوئے اور ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"ارے نہیں یاور، وہ کچھ کر گزری ہے"۔ وہ اور زیادہ رونے لگیں۔

یاور علی خان کی پیشانی پر لکیریں گہری ہو گئیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"آپ فکر نہ کریں بھابی بیگم۔ اگر وہ واقعی کچھ کر گزری ہے تو یاد رکھئے۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ اگر وہ زندہ ملی تو اپنے ہاتھ سے اسے شوٹ کروں گا"۔

ان کے لہجے میں جیسے کوئی درندہ غرا رہا تھا۔

"ارے... مگر اب کیا کریں؟ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں"۔ وہ روتے روتے گویا ہوئی تھیں۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ہینڈل کر لوں گا"۔

"ماہین۔ بھابی بیگم کو پانی پلاؤ۔ میں بابا صاحب کے پاس جا رہا ہوں"۔

وہ ساکت بیٹھی ماہین کی طرف پلٹ کر گویا ہوئے اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

یاور علی خان نے بابا صاحب کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی اور اجازت کا انتظار کئے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

"آؤ آؤ یاور بھئی۔ ہم تمہیں بلوانے ہی والے تھے۔ وہ مہمان تو آ چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رات کے کھانے سے پہلے تمام معاملات طے کر لئے جائیں۔ مہر وغیرہ بھی طے کرنا ہوگا۔ جو تمہاری مرضی ہو لکھوا لینا"۔

بابا صاحب ایک بھاری بھرکم سا رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔ بیٹے کو دیکھ کر ایک دم پرجوش سے ہو گئے اور رجسٹر ایک طرف سرکا دیا۔ عینک اتار کر جیب میں اٹکا لی۔

"سب کچھ آپ ہی کرتے ہیں۔ آپ ہی نے کیا ہے۔ مہر وغیرہ کا مسئلہ بھی آپ ہی نمٹا لیجئے گا"۔

وہ روکھے انداز میں جواب دے کر ان کے سامنے پڑی ایک پرشکوہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

بابا صاحب نے چونک کر ان کی شکل دیکھی جہاں ہر طرح کے تاثرات مفقود تھے۔

"نہیں بھئی۔ آخر تم باپ ہو۔ تمہیں بھی حصہ لینا چاہیے"۔ وہ پھر اسی سابقہ انداز میں گویا ہوئے۔

"ہاں باپ تو ہوں۔ مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر باپ کی حیثیت سے آپ ہمارے بارے میں ہر قسم کے فیصلے کر سکتے ہیں۔ مگر ہم باپ کی حیثیت سے اس طرح کا کوئی حق استعمال نہیں کر سکتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے باپ کی حیثیت سے خود کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے"۔ وہ اسی طرح سرد لہجے میں گویا ہوئے۔

اس مرتبہ دلاور علی خان نے غور سے ان کی صورت دیکھی۔

"نہ جانے کیوں آج مجھے تم بہت بدلے ہوئے محسوس ہو رہے ہو؟" وہ اپنی حیرت ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

"میں وہی ہوں۔ حتیٰ کہ میری قسمت بھی وہی ہے"۔ انہوں نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر سر کے پیچھے ٹکا

[illegible] کی پشت پر ٹیک لگا لی۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" بابا صاحب کے لہجے میں بلا کی نرمی اتر آئی۔

"کچھ نہیں آج بابا صاحب کیا میری اولاد پوری کی پوری ماں پر ہی جاتی ہے؟" ان کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ پہلے ہی یاور علی خان کے پراسرار انداز سے فکر مند تھے۔ بری طرح چونک پڑے۔

"مطلب ہے بابا صاحب اس مرتبہ سارا نقصان میرا نہیں ہوا۔ اس مرتبہ نقصان میں پوری حویلی ہی حصے دار ہے"۔

[illegible] رہے تھے۔

"کیا ہو گیا بھئی؟" بابا صاحب کی پیشانی پر شکنیں گہری ہو گئیں۔

"[illegible] بھاگ گئی"۔ یاور علی خان دکھ سے گویا ہوئے۔

"[illegible] کر یاور!" دلاور علی خان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو تھا۔

"وہ چلی گئی ہے"۔ انہوں نے بے حد سکون اور آہستہ آواز میں اطلاع دی۔

"کہاں؟" دلاور علی خان کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ان کا اونچا شملہ آج مٹی کی زد پر تھا۔ پھر حواس کیوں نہ جواب [illegible]

"[illegible] معلوم ہو تو [illegible] کیا تھا"۔ وہ اسی زہریلے سکون سے گویا ہوئے۔

"کس کے ساتھ؟" ان کا فشار خون بلند ہونے لگا۔

"وہ یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی"۔ یاور علی خان نے جواب دیا۔ اب وہ سینے پر بازو لپیٹے خاصے پرسکون نظر آ رہے [illegible]

"تمہارے علم میں تھی یہ بات؟" انہوں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے استفسار کیا۔

"جی"۔ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"ہمیں کیوں نہیں بتایا تھا؟" اب ان کے وجود پر لرزش طاری ہونے لگی تھی۔

"کیا فائدہ ہوتا"۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب؟" دلاور علی خان نے قدرے درشتی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ فیصلے کرنے کے بعد بدلتے نہیں ہیں۔ لہٰذا بات آپ تک پہنچانا بے کار ہی ہوتی"۔ انہوں نے [illegible] جواب دیا۔

"مگر پھر بھی ہمیں باخبر تو رکھنا چاہیے تھا۔ ہم ٹھیک کر دیتے اس کا دماغ۔ اس کی ماں ہماری بہو تھی۔ مگر وہ ہمارا خون [illegible] اسی لئے اس سے اپنا حساب کتاب۔ تم نے ہمیں بے خبر رکھ کر سخت غلطی کی۔ کیا [illegible] کو بھی پتا تھا؟" دلاور علی خان [illegible] کر رہی تھی۔

"جی... سب پتا ہے"۔ یاور علی خان نے جواب دیا۔

"کیا وہ کہیں اور" — یاور علی خان بولتے بولتے رک گئے۔ ان کے چہرے پر پسینے کی بوندیں [illegible] تھیں۔

"شاید" — یاور علی خان کی نظریں جھک گئیں۔ ان کے شاید میں بڑا یقین چھپا ہوا تھا۔

"کون ہے وہ — کیا گھر میں؟" وہ آن کی آن میں جیسے بڑھاپے کی انتہاؤں کو چھونے لگے۔

"مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔ میں نے ماہین کے ذریعے پتا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے اس [illegible] ہمارے اسٹیٹس کا نہیں ہے۔"

یاور علی خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ کس درجہ ناشکری اولاد ملی ہے ہمیں۔"

یاور علی خان جواباً خاموش رہے۔

"ہمیں پیچھے کی مار دیا ہے اس لڑکی نے یاور، تم یقین کرو۔ تمہاری بہنوں کو ہم نے اتنی چاہت اور [illegible] نے روشنی کو دی۔ اس لیے کہ تم بھی اس سے دور تھے اور اس کی ماں بھی نہیں تھی۔"

وہ بری طرح ٹوٹ رہے تھے۔

یاور علی خان اس مرتبہ بھی خاموش رہے۔

"یاور — پہاڑ ٹوٹ گیا ہے۔" ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"ہمت سے کام لیجئے بابا صاحب! مہمانوں سے ضرور ملیے اور انہیں کوئی تاریخ دے کر روانہ کیجئے۔ باقی باتیں بعد [illegible] ہیں۔" یاور علی خان نے مشورہ دیا۔

"اب کیا بات ہوگی ہم سے۔ دل ڈوب رہا ہے ہمارا۔" وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

یاور علی خان نے اٹھ کر گلاس میں پانی انڈیلا۔ اور باپ کو سہارا دے کر پانی پلانے لگے۔

"وہ کم درجہ لوگ اسے مل کہاں گئے؟ وہ تو لڑکیوں کے کالج میں پڑھتی ہے۔" وہ چھت کو گھورتے ہوئے گویا ہوئے۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" یاور علی خان نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ماہین کو پتا ہو۔ ضرور پتا ہوگا۔ بلاؤ انہیں۔" بابا صاحب کی آواز میں تیزی سی آ گئی۔ جیسے ان کی سانس بحال [illegible] ہو۔

"کوئی فائدہ نہیں اب — بے کار ہے۔ فی الحال تو آپ خود کو سنبھالیں اور ہمت سے کام لیں۔ جا کر آنے والے مہمانوں سے تو معاملات نمٹ سکیں۔" انہوں نے باپ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔

"آفرین ہے یاور تمہاری برداشت پر — بیٹے۔"

"کیا کروں بابا صاحب۔ اگر برداشت نہ کروں۔ آپ آرام کیجئے۔ تھوڑی دیر میں میں آپ کو آ کر لے جاؤں گا۔" انہوں

[illegible] کنٹرول کرنے کی کوشش کے ساتھ جواب دیا۔

"[illegible] ہم ہے اٹھ بھی جائے تو اچھا تھا۔ کاش ہمیں بستر مرگ [illegible] کو سننے کیلئے [illegible]"

[illegible] ان کی آواز میں کپکپاہٹ در آئی تھی۔

"ٹھیک ہے بابا [illegible] ہم مہمانوں کو یہیں لے آتے ہیں۔" یاور علی خان جس ضبط سے کام لے رہے تھے۔ یہ انہی کا کام تھا۔

[illegible] باپ کے کمرے میں آ گئے۔

"[illegible] روشنی کا تو پیچھے کی بار یہاں آ چکی ہیں۔" ماہین نے انہیں دیکھتے ہی سے آگاہ کیا۔

"[illegible] آپ نے؟" وہ [illegible] انداز میں گویا ہوئے۔

"[illegible] ہوں گی۔" ماہین نے ان کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا۔

"آپ بتا دیجئے۔ کسی ایک بھی لڑکی کو ساری صورت حال بتا دیجئے۔ ورنہ کہیں انہی لڑکیوں کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہیں نہ [illegible]"

[illegible] وہ جیسے ٹوٹ رہے تھے۔

"اگر عالیہ بیگم نے —" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"میں کچھ ماہین بابا آپ سے۔ پھر آپ کو فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ قدرے چڑ کر گویا ہوئے تھے۔

ماہین ہال کی طرف چل پڑی۔

لڑکیوں میں آ کے دیکھ کر کھلبلی سی مچ گئی۔

"بھائی جان! روشنی کا تو پتا ہی نہیں چل رہا۔" [illegible] بہت پریشان تھی۔

"وہ تو شادی [illegible] نہیں ہوئی۔" مریم کو اپنی تیاری بے مزہ معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ کے کمرے میں تو نہیں ہے۔" [illegible] نے تجسس کا نتیجہ پیش کیا۔

"کل ہی سے اس کا موڈ آف ہو رہا تھا۔" [illegible] نے بتایا۔

"[illegible] کو پتا نہیں جو پتا سکتا ہے کہ حویلی کی زمین کی تہہ میں کون کون سی معدنیات نکالی جا سکتی ہیں۔" [illegible] دوسری قسم کی تھی۔

ماہین چپ چاپ [illegible] کے پاس بیٹھ گئی۔

[illegible] نے گلا کھنکار کر صاف کیا۔

"آپ سب کیلئے ایک افسوسناک خبر ہے۔" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

لڑکیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ [illegible] نے بڑی ٹوٹتی ہوئی نظروں سے ماہین کی طرف دیکھا اور [illegible] ایک طرف کر دیں۔

"روشنی [illegible] کہیں چلی گئی ہے۔" ماہین کی آواز بہت دھیمی تھی۔

ہال میں اس درجہ سناٹا چھا گیا گویا کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔

''کیوں؟'' معیذ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

شمع نے دوبارہ سلائیاں اٹھا کے بننا شروع کر دی۔

''کہاں چلی گئی؟'' یہ تو فوراً رونے کو ہو گئی۔

''کیا اسے بابا صاحب نے کچھ کہہ دیا تھا؟'' کالی کا تو موڈ ہی جیسے بگڑ کر رہ گیا تھا۔

''معلوم نہیں..... بس آپ لوگوں سے یہ کہنا تھا کہ مریم کے والدین گھر میں موجود ہیں۔ کوئی بات نکلی معلوم کر..... سمجھ رہی ہیں ناں آپ لوگ''۔

ماہین نے ان کے اترے ہوئے چہرے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

چند ثانیے خاموشی کے بعد ایک جانب سے سسکیاں ابھرنا شروع ہوئیں۔

ماہین نے نظریں دوڑائیں تو گلو کو روتے ہوئے پایا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گلو کے پاس آ گئی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ آ جائے گا گھر۔ بری بات''۔ وہ گلو کو چپ کرانے لگی۔

اسی دم عالم آپا اندر داخل ہوئیں۔ لڑکیاں اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

''ماہین''۔

''جی؟'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم یاور کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔ مہمان وہیں ہیں''۔ وہ بے حد نڈھال نظر آ رہی تھیں۔

ماہین وہیں سے چلی آئی۔ سامنے ہی یاور آتا دکھائی دیا۔

''ڈھونڈ لیا حویلی میں؟'' اس نے بے تاثر لہجے میں یونہی سوال کر دیا۔

''جی..... چھان ماری ہے''۔ وہ سادگی سے گویا ہوا۔

''بڑا نقصان ہوا ہے ہمارا۔ تمہاری وجہ سے''۔ وہ سابقہ انداز میں گویا ہوئی۔

''جی''۔ اسے جیسے لڑنے کا جھٹکا محسوس ہوا تھا۔

ماہین نے اس سے مزید بات چیت کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔ یاور حیران پریشان اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''مجھے تو اس کی صورت بری لگنے لگی ہے۔ منحوس۔ ناشکری کہیں کی''۔

بالو کی ماں غلام محمد کو کھانا دیتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

''بھاگوان۔ سب نصیب کی بات ہے۔ کیوں کوستی رہتی ہے اسے ہر وقت''۔

''تم نے ہی کلموہی کو سر چڑھا رکھا ہے''۔ اس نے بھڑک کر خاوند کی بات کاٹی تھی۔

''تو کیا گلا دبا دوں؟'' وہ چیخ کر بولا۔

''تمہاری جگہ کوئی اور باپ ہوتا تو چوٹی سے پکڑ کر واپس چھوڑ آتا۔ تم نے تو واہی تباہی شروع کر دی''۔ وہ تنک کے پیر پٹخ کر باورچی خانے میں گھس گئی۔

بالو دالان میں چپکی رہی تھی۔ ماں کی گرج سے اس کا سر جھکنے لگا۔

''ابا..... اماں کو سمجھا لیں۔ پٹائی کریں گی یہ مجھے''۔ وہ جھجکتی دروازے تک آ کر کمزور سی آواز میں گویا ہوئی تھی۔

''ارے ہم کیا کریں گے تجھے پٹائی۔ تو خود کلنک بن کر آ گئی ہے ہماری جان کو''۔

اس کی ماں باورچی خانے ہی سے چلائی۔

بالو نے لوہے کا دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

''بیڑہ غرق کیا جا کے اپنے سوتوں کو''۔ اس کی ماں حلق پھاڑ کر چیخی۔

''پیال خان کی بلڈنگ نہیں ہے۔ اکیلا کمرا گھیر کر لیٹ گئی ہے۔ شرم نہیں آتی ہے۔ بچے کیا سڑک پر سوئیں گے نواب زادی''۔ اس کی ماں ہنوز چلا رہی تھی۔

''آ گئی ہے ہمیں نخرے دکھانے۔ آج اکیلی ہے۔ کل وہ ہو جائیں گے۔ بڑی کمائی کر کے لاتی ہے۔ ارے کیسے پھوٹے نصیب ہیں میرے۔ خوشی کے دن راس ہی نہیں آتے۔ ارے کسی کی آئی اسے آ جاتی''۔ اس کی ماں برابر چلا رہی تھی۔

بالو نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

''نواب زادی کہتی ہے بڑا صاحب۔ خود کو بڑی بادشاہ کی اولاد ہے۔ نخرے تو دیکھو۔ شکل نہ صورت میں تیری صورت۔ کھانے کو مل رہا تھا بیٹھے بیٹھے۔ فاقے کریں گی تو پتا چلے گا۔ کالا دال روٹی پر کان کی سیل بھی رکھ دے گا تو کھانے لگی ہے''۔

بالو کے اعصاب چٹخنے لگے۔ اس نے سر سے پٹی تو باندھ لی تھی۔ چادر اٹھا کر لپیٹ لی اور باہر آ گئی۔

''ابا..... میں ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔ میری طبیعت بہت خراب ہے''۔ وہ باپ سے مخاطب ہوئی۔

''اندھیرا ہو رہا ہے بھائی کو ساتھ لے جا''۔ غلام محمد نرم آواز میں بولا۔

''نہیں..... رہنے دو۔ ڈاکٹر کون سا دور ہے۔ نکڑ پر تو اس کی دوکان ہے''۔

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس کی ماں نے بڑی زہریلی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

بالو گھر سے نکل کر سیدھی بس اسٹاپ کی طرف بڑھی تھی۔

''یہ گلشن اقبال جاتی ہے؟'' اس نے کنڈیکٹر سے دریافت کیا تھا۔

''بی بی..... یہاں سے کوئی بس سیدھی گلشن اقبال نہیں جاتی۔ تم یہاں سے صدر چلی جاؤ۔ وہاں سے تمہیں بہت بسیں مل جائیں گی''۔

"یہ صدر جائے گی ......؟" وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر بٹوہ نکالا اور ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"ہاں۔ جائے گی"۔

وہ تیزی سے ویگن میں سوار ہو گئی تھی۔

"صدر پہنچ کر...... ویگن کے چکر میں پڑنے کے بجائے اس نے رکشہ لے لیا۔

پہلی مرتبہ اس طرح تنہا نکلنے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے خوف سا طاری تھا۔

رکشہ خاصی دیر چلنے کے بعد اس کے بتائے ہوئے مقام پر رک گیا۔ اچھا خاصا کرایہ بن گیا تھا اس نے بٹوے سے رقم نکال کر اسے دیا اور باقی پیسے واپس لے کر سڑک پار کر کے ایک عمارت کے سامنے پہنچ گئی۔ پہلے کھڑے ہو کر اس نے عمارت پہچاننے کی کوشش کی پھر اس راستے پر چل پڑی جو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ آف وائٹ دروازے پر پہنچ کر اس نے کال بیل پش کیا۔ دو تین مرتبہ پش کرنے کے بعد دروازہ کھلا۔

"کون ہے بھائی۔ ہم کہاں اتنے اہم ہیں کہ کوئی ہمیں یاد کرے اور آئے" دروازہ کھولنے والے [illegible] گئی تھی۔

دروازہ کھولنے والا...... اچھل کر پیچھے ہٹا تھا۔

"آ...... آپ......!"

"راستہ تو دیجئے۔ ہمارے مجھے پکڑ رہے ہیں"۔

یا گردش دوراں کو کوئی کام نہیں ہے
یا میری ہی تقدیر میں آرام نہیں ہے

اس نے بے ساختہ شعر کہتے ہوئے راستہ دے دیا تھا۔ حیرت اتنی تھی۔ آنکھیں جیسے ماتھے پر جا لگی تھیں۔

"ارے بیٹا عارف! کون ہے؟ کس سے باتیں کر رہا ہے؟" اس کی ضعیف آنکھوں کے نور سے محروم ماں کی کانپتی ہوئی آواز آئی تھی۔

"مہمان آئے ہیں ماں۔ کہتے ہیں مہمان کے آنے سے برکت ہوتی ہے۔ ہمارے بھی دن پھرے ہیں۔ پھر دکھوں کے سلسلے بڑے ہیں"۔

وہ شکستہ سی آواز میں جواب دے کر ہنسنے لگا۔

"مہمان؟ کون مہمان۔ ارے بولتا کیوں نہیں؟" بڑی بی جھلائیں۔

"بتاتے ہیں ماں۔ بتاتے ہیں"۔

"آئیے...... اندر آ جائیے"۔ وہ یوں گویا ہوا جیسے کہہ رہا ہوں "کیا کریں مجبوری ہے"۔

"کیسے ہیں آپ؟" وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

تو اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کر ضائع
میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے

[illegible]

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

"السلام علیکم اماں!" بالو بڑی بی کے سامنے جھکتے انداز میں بیٹھ گئی۔

"بھئی رہو کون؟" بڑی بی ہنوز الجھی ہوئی تھیں۔

"میں ہوں اماں، بالو" وہ کمزور سی آواز میں گویا ہوئی۔

"بالو..... کون بالو؟" بڑی بی کا حافظہ بالکل چٹ ہو چکا تھا۔

"لال خان کی بیوی!" عارف نے الجھی ہوئی نظروں سے بالو کی طرف دیکھا۔

"ارے اچھا..... اچھا!! کیسی آئی ہو؟ لال خان نہیں آیا؟ رات تو گھنی ہو رہی ہے" بڑی بی کو یاد آ گیا۔ بالو جواب میں خاموش رہی۔

"بیٹی! اس وقت کیسے آئی؟ ٹھیک تو ہے ناں؟" بڑی بی کی فکرمندی فطری تھی۔

بالو پھر خاموش رہی۔

"کھانا وانا بھی کھایا؟" بڑی بی نے ٹٹول کر اس کے گھٹنے چھوئے۔

"مجھے بخار ہو رہا ہے بہت تیز۔ میں کہیں لیٹ جاؤں۔" وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

"اسے تیز بخار ہو رہا ہے عارف اسے کوئی دوا دے دے چائے کے ساتھ۔"

بڑی بی پریشان ہو گئیں۔

عارف نے بھی تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"آیئے بھابی! ادھر کمرے میں آ جایئے۔ ہم تو ویسے بھی آپ کے مقروض ہیں" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک طرف کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

بالو بمشکل تمام کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

"آپ یہاں لیٹ جایئے میں چائے لے کر آتا ہوں" وہ الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

بالو گرنے کے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی پھر آہستگی سے لیٹ گئی۔

بخار بہت تیز ہو چکا تھا۔ جانے کتنی دیر غفلت رہی۔

"یہ چائے پہلے کچھ کھا لیجئے پھر گولی کھا لیجئے گا" اسے عارف کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ عارف چند لمحے اس کی بے بسی دیکھتا رہا۔ پھر ٹرے تپائی پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو آپ کو اٹھنے میں مدد دوں" وہ اس کے قریب کھڑا اجازت مانگ رہا تھا۔

"اف..... الفاظ میں چاہے عزت و احترام ہو، اثر کچھ اور" وہ چپ رہی۔

عارف نے اس کے سر کے پیچھے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔

کچھ وہ خود کوشش کر کے بیٹھ گئی۔

عارف نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے کے ساتھ نمکو اور کیک پیس تھے۔ اس نے ایک چھوٹا ٹکڑا اٹھا کر چائے میں بھگویا اور منہ میں رکھ لیا۔

پھر چائے اٹھا کر پینے لگی۔

"اور لیجئے ناں" عارف نے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بالکل قریب بیٹھ چکا تھا۔

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

عارف نے آگے جھک کر اس کی پیشانی کو چھوا۔ پھر ایک دم چونک کر ہاتھ ہٹا لیا۔

"حد ہو گئی۔ کس قدر تیز بخار ہو رہا ہے۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس حال میں گھر سے نکلنے کی۔ آپ کو تو چلنا بھی مشکل ہو گا۔ میں خود جا کر دوا لے کر آتا ہوں اگر ڈاکٹر ساتھ آ گیا تو اسے لانے کی کوشش کروں گا" وہ باہر کی طرف بڑھا۔

"رہنے دیجئے۔ مت کیجئے تکلیف، مرنے دیجئے مجھے۔ مجھے کیا کرنا ہے زندگی کا۔"

وہ شکستہ آواز میں اسے روک رہی تھی۔

عارف نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔

ہم چراغ در طلسم تو نہیں ہیں جو بجھیں

وہ اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔

بالو نے ذرا سے ایک طرف کھسکائی اور پھر اسے گئی۔

اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ خاصی دیر بعد عارف ڈاکٹر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"بہت تیز بخار ہے برف ہے گھر میں؟"

"جی"۔ عارف نے فکرمندی سے بالو کا چہرہ دیکھا۔

"آپ ایسا کیجئے' بہت ٹھنڈا پانی لا کر ان کی پیشانی پر پٹیاں رکھئے۔ فکر کی بات اس لئے بھی ہے کہ یہ بہک رہی ہیں۔" ڈاکٹر اسٹیتھو اسکوپ سے چیک اپ کرنے کے دوران گویا ہوا۔ عارف بڑی تیزی سے باہر نکل گیا تھا

ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے معائنہ کیا اور دوائیں لکھ دی تھیں۔

"اس سے قبل بھی آپ نے اپنی وائف کا چیک اپ کرایا ہے؟" عارف پانی اور پٹیاں لے کر اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر سوالیہ ہوا۔

وہ کچھ بولنے ہی لگا تھا' مگر پھر جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گیا۔

"پہلے یہ دوائیں منگوا لیجئے' انجکشن لگا دیا ہے۔ فکر کی بات نہیں تسلی رکھئے۔"

ڈاکٹر نے اپنا پھیلایا ہوا' پھیلاوا' سمیٹنا شروع کیا۔

عارف نے پانی کا برتن تپائی پر رکھ دیا۔ جس میں برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

"آیئے' میرے ساتھ ہی چلئے' میں راستے میں آپ کو کسی میڈیکل سٹور پر ڈراپ کر دوں گا۔" پچپن ساٹھ کے پیٹے میں دکھائی دینے والا ڈاکٹر۔ بہت شفیق اور مہربان محسوس ہوا۔

"شکریہ' آیئے پلیز"۔ عارف نے اپنے رد عمل سے جذبہ شکر گزاری ظاہر کی اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

عارف کو گھر واپس آتے آتے آدھا گھنٹہ سے زیادہ لگ گیا تھا۔ برف بھی ساری پگھل چکی تھی۔

آتے ہی اس نے پہلے بالو کو دوا دی' پھر پانی میں دوبارہ برف ڈال کر پٹیاں بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھنے لگا۔

بالو پر تقریباً بے ہوشی طاری تھی۔ چہرہ بخار سے لال ہو رہا تھا۔ عارف کے چہرے سے فکر و ہمدردی کا ملا جلا تاثر عیاں تھا۔

"عارف ...... عارف ...... ارے او عارف ...... لال خان کی بیوی کا بخار اب کیسا ہے۔ تو کیا کر رہا ہے؟ کہاں ہے؟" بڑی بی نے شور مچا دیا۔

عارف زچ ہو کر بڑی ماں کے پاس چلا آیا۔

"سو جاؤ' اماں' چپ چاپ"۔

"کیا کر رہا ہے تو؟" بڑی بی کو کھوج ہوئی۔

"جاگ رہا ہوں"۔ وہ جھلایا۔

"کیا ہو گیا؟"

"بے ہوش پڑی ہے بالو"۔ وہ قدرے فکر سے گویا ہوا۔

"تو کیا کر رہا ہے؟" بڑی بی نے تعجب سے دریافت کیا۔

"ذرا سے بھون رہا ہوں' سو جاؤ تم' اب آواز دی تو میں خود آ جاؤں گا تھوڑی دیر میں"۔ وہ اتنا کہہ کر دوبارہ بالو کے پاس آ گیا۔

وہ اس کی پیشانی پر گیلی پٹی ہٹا کر دوسری رکھنے لگا۔

اس کا عمل ہمدردانہ سہی مگر آنکھوں میں بے شمار سوال تھے۔

رات کی گہری تاریکی میں جیپ حویلی کے مین گیٹ پر پہنچی تھی۔

احساس سے شل تھے کہ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے پر شکوہ حویلی کا جائزہ لیا۔

چوکیدار نے گیٹ وا کر دیا تھا۔ جیپ اندر دور تک چلی پھر جھٹکا کھا کر شیشے کے پیچھے رک گئی۔

"اتر آؤ بی بی"۔ ڈرائیور کی آواز پر وہ چونک پڑی۔

اور چادر سنبھالتی اتر آئی۔

"اندر بی بی کو بولو بڑی حویلی سے مہمان آئے ہیں"۔

ڈرائیور نے دور کھڑے ملازم کو آواز دی۔

وہ اپنی جگہ کھڑی رہی جیسے اندر سے اجازت ملنے کا انتظار کر رہی ہو۔

ملازم چند منٹوں میں واپس آ گیا۔

"بی بی کہتا ہے مہمان کو گیسٹ روم میں پہنچاؤ' خان آ کر خود ملیں گے"۔

ملازم ڈرائیور سے مخاطب ہوا اور پھر اس کی جانب پلٹا۔

"آؤ بی بی"۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

ملازم نے گیسٹ روم کھول کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ انتہائی شاندار گیسٹ روم تھا۔ مکمل گولڈن فرنیچر' گولڈن چم چم کرتے پردے' سرخ قالین' سرخ ہی بیڈ شیٹ اور تکیے' سرخ گدیوں والی اونچی اونچی پشتوں والی چار کرسیاں' ہر شے نہایت صاف ستھری۔

اس نے ایک طرف بنے دروازے کو پر شوق انداز میں دھکیلا اور سر اندر کر کے جھانکا۔ نہایت ہی صاف ستھرا خوبصورت سلیقہ مندوں والا باتھ روم' گولڈن ٹبس' گولڈن فریم کا آئینہ اور گولڈن ہی تولیہ اسٹینڈ۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی فرمانروا

کا بیڈ روم ہو۔ اس کا جی چاہا فوراً ہی غسل کرے لیکن کپڑے ۔۔۔؟ اس نے بے بس انداز میں اپنے لباس پر نظر ڈالی۔

"جب تک کاکا جان نہیں آجاتے' کپڑوں کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوگا۔ کس قدر بد اخلاق ہیں کاکا جان کی سسرال والوں کا بھی لحاظ نہیں کرتیں پتا نہیں وہی "بیگم" ہیں یا کوئی اور ہیں۔ کاکا جان تو بے حد "سنگدل" ہیں۔ پتا نہیں کون سے جہاں میں رہتے ہیں۔ مجھے تو ویسے ہی اتنا خوف آتا ہے پتا نہیں کیسا سلوک کریں گے مجھ سے۔"

اس نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اور احتیاط سے بستر پر بیٹھ گئی۔ لباس گرد آلود ہونے کی وجہ سے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اب ملازم کو کیسے بلائے؟ باتھ روم میں جا کر ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پی لے وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"ہوں کون ہے؟ آجاؤ"۔

دروازہ کھلا اور وہی ملازم جو اسے یہاں پہنچا کر گیا تھا کمرے میں جگ گلاس لئے اندر داخل ہوا۔ اور خاموشی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

روشی نے نہایت بے تابی سے پانی گلاس میں انڈیلا اور غٹاغٹ چڑھا گئی تھی۔ پورا گلاس پی کر اس نے گہرا سانس لے کر ملازم کی طرف دیکھا۔

"کیوں کھڑے ہو؟"

"آپ کھانا کھائیں گی؟" وہ ہچکچا کر رہ گیا۔

"ہاں ہاں بھئی کیوں نہیں کھائیں گے بڑا مزے دار کھانا چھوڑ کر آئے ہیں' ظالم کھانا اچھا سا مگر جلدی لانا' بھوک نے دم نکال دیا ہے۔"

اس نے چھپی چادر جھاڑ کر بیڈ پر پھیلائی اور لیٹ گئی۔

"دروازہ بند کرکے جانا' پہلے بھول کر چلے گئے تھے۔ کسی نے ادب آداب نہیں سکھائے تمہیں' او ویسے تو کاکا جان بڑے سخت ہیں۔"

بے چارہ بکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔ مہمانوں کا تو نہیں البتہ مالکوں کا انداز ضرور تھا۔

"جاؤ بھئی کیا شکل دیکھ رہے ہو۔" وہ گوری سے گویا ہوئی۔

وہ جلدی سے باہر نکل گیا مگر اس مرتبہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا۔

روشی چھت پر لگے فانوس پر نظریں جما کر کچھ سوچنے لگی۔ بڑی حویلی اس کے دماغ پر سوار تھی۔

"کیا ہو رہا ہوگا وہاں۔ ایک آفت اتری ہوگی' گھر والے تو رو رو کر پاگل ہو رہی ہوں گی نانی نے کس طرح ری ایکٹ کیا ہوگا؟

بابا صاحب تو رائفل لوڈ کر چکے ہوں اور بڑی امی او وہ مجھے کچا چبانے کے منصوبے بنا رہی ہوں گی۔

یا کچھ سمجھا رہی ہوں گی۔ کیا مجھے بھی پیش کرنا چاہیے؟

اور خالہ ۔۔۔۔۔ حقیقت پریشان ہوں گی۔ لیکن میں کوئی بچی تھوڑی نہیں ہوں' مجھے انسان ہونے کے ناتے اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کا پورا اختیار ہے۔ میں حویلی کے اصطبل میں بندھی بھیڑ بکری نہیں ہوں۔ کس خوشی میں عمر بھر کا روگ پالوں' انہیں پتا چلنا چاہیے' اپنے فیصلے مسلط کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ دوسروں کی زندگی تک سے بھی گزر گئی ہے۔

اگر کاکا جان نے مجھے دوبارہ حویلی بھجوانے کی کوشش کی تو اسی حویلی میں جان دے دوں گی اور ان کے بھی ورثے چھوڑ جاؤں گی۔ ساری دنیا میں رسوا ہوتا ہے۔ اس کی تو زندگی کی خاطر ان میں وہ حق رکھتی ہوں۔ الفاظ کی آواز پہنچتا ہے مجھے تلاش کرنے کے بہانے بھوپھی جان سے ہاتھ ملا کر رہ جائیں گی۔ ... کی لیں اور مجھے کی آواز دیں' دوبارہ بھرتی کر لیں حویلی کا ہے ہوت کنٹرول۔

سارا معاملہ بابا صاحب کر کے چل جانے پر چلے اب وہ کو دیکھا بھی ہے۔

اب سارا نزلہ بابا پر گر رہا تھا۔

"بھلا کر کھا دیا ہے اس معمولی شخص نے مجھے۔ اس کا تو سب سے بڑا دشمن ہونا چاہیے۔ حویلی کی خواتین کا احترام کرتا۔"

بے بس بھوپھی جان اس کی "ڈیل" رکھتی ہیں۔

چاہیں ان غریبوں کا کیا ہوگا جو مشغلے کے طور پر لئے حویلی آئے ہوں گے۔ بیچ بیچ میں بھوکے نہیں ہوا ہے۔ خان دار خان کی پوتی بیاہ کرنے جا رہی ہے۔ ہونہہ۔۔۔۔ "خوش قسمتوں کا ٹولہ"۔

وہ خاص ورز "تماشا" بڑی حویلی میں گھومتی رہی' دل و دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا تھا مگر کوئی ڈر نہیں تھا۔

جانے کتنی دیر خیالی دنیا میں گزر رہی تھی۔ وہ اس وقت چونکی' جب ملازم ٹرالی سمیت کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کاکا جان کب تک آئیں گے؟" اس نے ملازم سے دریافت کیا۔

"کاکا جان ادھر ۔۔۔۔ خان کو پوچھتا ہے آپ وہ تو سندھ گیا ہے۔"

اس نے اپنی جانب سے اطلاع بہم پہنچائی۔

"پتا ہے مجھے آئیں گے کب تک؟" وہ چڑ کر بولی۔

"خبر نہیں وہ اطلاع کیا ہے وہ دوستوں کے ساتھ۔" ملازم نے سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا جاؤ تم تمہارے اس واری وہ آپ کی کوئی چیز نہیں ہے۔" وہ بستر سے اترتے ہوئے استہزائیہ انداز میں پوچھے گی۔

"کیا؟" بے چارا نہایت پریشان نظر آیا۔

"ارے جاؤ بابا!" وہ جھلا کر کہتی ہوئی منہ دھونے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

ملازم باہر نکل گیا۔

قورمہ، بریانی اور چکن سوپ کی خوشبو سے سارا باتھ روم مہک رہا تھا۔ اس نے بڑے خوشگوار احساسات کے ساتھ منہ ہاتھ دھویا اور سفید تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے باہر آ گئی۔

ڈونگوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر اس نے ڈشز کا اندازہ لگایا۔ ایک میں قیمہ مٹر، دوسرے میں بھنے ہوئے چکن پیس، تیسرے میں آلو کا بھرتا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے گویا کھانے سے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا۔ چھوٹی سی کٹوری میں چائنیز سلاد بھی تھا جو اسے یوں بھی بے حد پسند تھا۔

’’واہ بھئی کھانے کے معاملے میں تو ہماری چچی جان بڑی باذوق ہیں چلو یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ کم از کم کھانا تو بہت اچھا ملے گا‘‘۔

وہ بہت آرام دہ حالت میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ اس کی ذہنی کیفیت میں اس لئے بھی کوئی تبدیلی نہیں تھی کہ ایک طرح سے وہ اپنے ہی گھر میں تھی۔

ابھی وہ کھانا کھانے میں مصروف ہی تھی کہ ملازم پھر چلا آیا۔

’’آپ چائے یا کافی پیئے گا؟‘‘

’’نہیں بھئی کھانا کھا کر تو بس اب لمبی تان کر سوئیں گے‘‘۔ اس نے بڑے مصروف انداز میں جواب دیا۔

’’سنو‘‘۔ اس نے جاتے ہوئے ملازم کو آواز دی۔

’’جی؟‘‘ اس نے بڑی دلچسپی سے روشی کو دیکھا۔

’’تمہارا نام کیا ہے؟‘‘

’’سمندر خان‘‘۔ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

’’اوہ! اتنا طویل و عریض نام‘‘۔ وہ ہنس پڑی۔

’’جی‘‘۔ وہ بے چارہ خاک ــــ نہیں سمجھا۔

’’سنو! اپنی مالکن سے کہو۔ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم کوئی غیر نہیں ہیں‘ خان تیمور علی خان کی سگی بھتیجی ہیں۔ خان داور علی خان کی صاحبزادی‘ جاؤ ہمارا پیغام اپنی مالکن کو پہنچاؤ‘‘۔

ملازم چلا گیا‘ وہ پھر مکمل توجہ سے کھانا کھانے لگی۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے برتن واپس ٹرالی میں رکھے اور ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلی گئی۔

جب ہاتھ دھو کر باہر آئی تو ملازم اس کا انتظار کر رہا تھا۔

’’بی بی بولتا ہے آپ خان کے آنے تک انتظار کرو ابھی وہ کسی سے نہیں ملے گا‘‘۔

سمندر خان نے حرف بہ حرف اس تک پہنچا دیا۔

روشی کو یہ اچھا انسلٹ محسوس ہوئی۔

’’سنو! کیا تمہاری مالکن بہت حسین ہیں؟‘‘ وہ خفگی سے پوچھ رہی تھی۔

سمندر خان خاموش رہا۔ بس تعجب سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

’’اچھا یہ بتاؤ تم نے اپنی مالکن سے کیا کہا تھا؟‘‘ اسے پیغام رسانی کے معاملے میں کچھ گڑبڑ کا شبہ تھا۔

’’جو آپ نے بولا تھا وہی بولا تھا‘‘۔

’’وہی تو پوچھ رہی ہوں کیا؟‘‘ وہ جھلائی۔

’’آپ خان تیمور کی بھتیجی ہو اور خان داور علی خان کی صاحبزادی ہو‘‘۔

وہ بھی بے چارا پریشان ہو گیا تھا۔

’’ہوں‘‘۔ روشی نے کچھ سوچنے کے انداز میں ہنکارا بھرا۔

’’اتنا سننے کے بعد بھی تمہاری مالکن پر کوئی اثر نہیں ہوا؟‘‘ اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

’’نہیں‘‘۔ وہاں سے بڑا مختصر سا جواب آیا تھا۔

وہ خفا ہو کر رہ گئی۔

’’بچے گھر میں ہی ہیں؟‘‘ اس نے موضوع بدل دیا۔

’’نہیں چھوٹا خان (آصل) ہاسٹل میں ہے‘‘۔ سمندر خان نے جواب دیا۔

’’اچھا جاؤ تم یہ ٹرالی لے جاؤ اور صبح مجھے اٹھانے مت آنا‘ چاہے کالا خان بھی آ جائیں تب بھی۔ میں اپنی مرضی سے اٹھتی ہوں‘‘۔

سمندر خان ٹرالی دھکیلتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

روشی نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا‘ لائٹیں بجھائیں اور بستر پر دراز ہو گئی۔

کتنے عرصے بعد اسے فطری نیند آ رہی تھی۔

مالی نے باغ کی ساری لائٹیں آف کر دی تھیں۔

سب ہی لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ اب یہ خدا کو معلوم ہے سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ اسے تو البتہ نیند صبح تک آتی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بستر پر ہاتھ پیچھے مسلسل ٹہل رہا تھا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک قیامت سی اس پر ٹوٹنے جا رہی ہے۔

کہاں ہو گی وہ؟

اگر یہ سانحہ کراچی میں ہوتا تو سیدھا سمندر میں کود لگاتا اور ڈھونڈتا۔

کیا اس سانحے کا مجرم میں ہوں؟

کیا میں نے معمولی خود غرضی سے کام لیا ہے؟

میں نے آنے والے لمحوں سے اسے بچانے کی کوشش کی۔

میں تو اس پر کسی دکھ کا سایہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔

بچپن میں جب وہ تتلیاں پکڑتی بھاگتی بھاگتی گر جاتی۔ اس کے گھٹنے اپنی قمیص کے دامن سے صاف۔۔۔ کر کے اس کے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھتا تھا۔ اس کو ہنسانے کیلئے کیا کیا جتن کرتا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ جنگلی اسی کو میری محبت کو ترسے گی۔

وہ کس عذاب میں ہوگی؟

کہاں ہوگی؟

کس حال میں ہوگی؟

اگر اسے کچھ ہو گیا؟ یہاں پہنچ کر اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا۔

"او ہو! تم یہاں ہو؟ میں حیران کہ ابھی گئے تو کہاں گئے؟"

جھومر کی آواز پر تو اس کے بچے کچھے حواس بھی جواب دینے لگے۔

"وہ کمبخت سرسوتی تو کب کی مرکھپ گئی۔ ہمیں یہاں سے وہاں تک حویلی چھاننا پڑ گئی"۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

باری نے نہایت بے زار کن انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"فرمایئے کیسے زحمت کی؟" وہ اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے میں ناکام رہا۔

"وہ تمہاری قیدی اور سرسوتی کی 'کیدن' بخار میں دھت پڑی ہے"۔

"مجھے تو تمہاری طبیعت بھی اچھی محسوس نہیں ہو رہی"۔ جھومر واقعی اسے بہت شدت سے محسوس کرتی تھی۔ نیم تاریک ماحول میں بھی اس کی کیفیت محسوس کر چکی تھی۔

"میں آپ کو ایک ٹیبلٹ دے دیتا ہوں' آپ اسے کھلا دیں"۔ وہ بولا۔

"مگر تالا تو تم کھولو گے؟" جھومر نے تعجب سے اس کو دیکھنے کی کوشش کی۔

"میں آپ کو چابی بھی دے رہا ہوں' کھول لیجئے گا"۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"ہیں؟" جھومر کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

"اور جو وہ بھاگ گئی؟" اس نے قدرے تشویش انداز میں سوال کیا۔

"بھاگ جائے"۔ وہ بے زاری سے کہتا ہوا حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

"سخت موڈ آف ہے؟" جھومر دھیرے سے ہنسی۔

باری خاموش رہا۔

"ایسے کیوں ہو رہے ہو' کچھ کھو گیا ہے؟" وہ پھر دھیمے سروں میں ہنسی۔

"کیا لیں گی آپ خاموش رہنے کا؟" وہ سخت خفگی کے عالم میں مخاطب ہوا۔

"ہو گیا بیاہ تو پھر تم کب؟" وہ پھر ہنسی۔

"امی کا تو آج حال ہی عجب ہے' بے حد زبردست اتفاق ہوا ہے' آج ہی پتہ چلا"۔ وہ پھر ہنسی۔

باری ایک بار کیا اسے یہ پتہ چل پایا کہ وہ چاہتی ہے کہ اس بارے میں اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

"وہ تمہاری ان آنکھوں میں ہے اسے اپنے خواب دیکھتے ہوئے" وہ شوخ انداز میں ہنس رہی تھی۔

باری کو لگا جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی محسوس ہونے لگی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ تیکھے پن سے بولا۔

"میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی کہ تم کیا مطلب لے بیٹھے"۔

"بس اب یہ تو تمہاری ہے اسے تو تمہارے ساتھ جانا چاہیے تھا"۔

باری کو گویا چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا تھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟ اور آپ ایک معصوم لڑکی کو کیوں مجھ سے منسوب کر رہی ہیں؟ آپ سب کی عزتوں کو داؤ پر لگا رہی

یہ بس اندازہ لگانے کی بات ہے"۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"کہ یہ بھی ناقابل برداشت ہے۔ ایک روز وہ بہت پریشان ہو کر مجھے سمجھا رہی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس نے یہ قدم اٹھا لینا ہے

وہ اب اس طرف کو روانہ ہوئی ہے۔

"آج سخت سردی ہے۔ تم نے اسی باغ میں میلوں کا سفر کر لیا ہے۔ ادھر سیڑھیوں پر آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ میں بھی تمہیں دیکھ رہی تھی۔ جو نو دولتیا ہوا اور دوسرے لٹے ہوئے کو بچانے میں مشغول نہیں کر سکتا۔ حضور والا! اس وقت تو تمہارے نزدیک بیٹھے بھی بچے ہوئے ہیں۔ رات پونے دو بج رہے ہیں"۔ جھومر کے انداز میں اعتماد تھا اور شوخ انداز کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

"آپ ان کیلئے یہ انداز بھی اختیار نہ کریں تو بہتر ہے۔ میں اس حویلی کا ایک فرد ہوں۔ یہاں ہونے والا کوئی بھی حادثہ مجھ پر بھی اسی طرح اثر انداز ہو سکتا ہے جیسے کہ دوسروں پر' آپ اسے اپنے سر سے حق جتانے سے باز رہیے۔ اس طرح کی کارروائی کرنے کی اجازت آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے۔ یہاں اتنی بڑی بات ہو گئی ہے' آپ کو ہنسی کی سوجھ رہی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے"۔ باری چلتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔

"وہ بھاگ گئی ہے اس حویلی کو میری' میرا بس چلے تو چھت پر جا کر رقص کروں اور منوں مٹھائی تقسیم کروں۔ غریبوں کو کھانا کھلاؤں۔ پاس اشرفیاں ہوں تو تمہارے سر سے صدقہ اتار کر دلیر پر پھینک دوں۔ پورے چالیس دن نئے کپڑے پہنوں' روزانہ قرآن خوانی کراؤں اور اس کا ثواب روشنی کی ماں کو پہنچاؤں۔ کیا "شیرنی" پیدا کی ہے۔ کم از کم میں تو مرتے دم تک اس کی شکر گزار رہوں گی۔ اس کی وجہ سے میرے کلیجے میں کچھ ٹھنڈک پڑی ہے۔

کس اعضا کے طور پر البتہ اس کا خیال آ رہا ہے۔ جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی' کہیں جلدی ہی کوئی ہاتھ صاف نہ کر جائے' بیچاری وہ تو خون خرابا کرنے کی حد تک بہادر ہے۔ مگر ہے تو پھر بھی لڑکی۔

ایک دل کہہ رہا ہے خدا کرے اسے کچھ نہ ہو۔ دوسرا کہتا ہے خدا کرے مارکری اس حویلی میں آئے ایسی ماں کی
طے اس حویلی کی شان......؟"

ایک دم نے وار علی نے اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ ابھی وہ سنبھلی بھی نہیں تھی کہ دوسرے رخسار پر ایک اور طمانچہ پڑا۔

"میں آپ کا گلا دبانے کی نیت پر ہوں وقت ہو جائے یہاں سے اگر آپ نے آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی حشر لگاؤں گا اس قیدی کے ساتھ کچھ نہیں ہوا جو آپ کے ساتھ ہوگا"۔

باری کی رگ رگ میں انگارے دہک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

وہ زینے طے کر رہا تھا۔ جھومر رخسار پر ہاتھ رکھے ششدر رہ گئی تھی۔

نیند تو خیر ماہین کو بھی نہیں آرہی تھی مگر یاور علی خان جس طرح دھواں چھوڑنے والا انجن بنے ہوئے تھے وہ اس کے لئے انتہائی اذیت ناک تھا۔

کبھی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر فائلیں دیکھنے لگتے۔ کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتے۔ کبھی صوفے پر نیم دراز ہو جاتے۔ آخر وہ بستر سے نیچے اتر آئی اور ان کے قریب چلی آئی

"اتنے ٹینس نہ ہوں اللہ پر بھروسہ رکھیں"۔ اس نے ان کی پیشانی پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ کر ملائمت سے کہا۔

یاور علی خان نے اپنی سرخ آنکھیں لمحہ بھر کو کھول کر اس کی سمت دیکھا۔ نہایت ہلکے آسمانی رنگ کی نائٹی اور کھلے بالوں میں وہ بہت اپنی اپنی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی کمزور روشنی اسے مزید پرکشش بنا رہی تھی۔

"ماہین! یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے"۔ انہوں نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ کوئی چھوٹی سی بات ہے۔ مگر ہمیں یہ بھی تو زیب نہیں دیتا کہ اپنی قوت عمل ہی بزدل کر کے بیٹھ جائیں۔

بات پیدا ہوتی ہے تو آگے بھی چلتی ہے، پھر کسی منطقی انجام تک بھی پہنچتی ہے۔ ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ منطقی انجام ہمارے حق میں ہوگا"۔

اس نے اپنا ایک ہاتھ ان کے بازو پر اور دوسرا ان کے سینے پر رکھ کر بہت اپنائیت سے کہا۔

"وہ کمزور سی لڑکی ہے ماہین اور لڑکی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ صدیوں کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے"۔ یاور علی خان کے لہجے میں بلا کی تھکن تھی۔

"وہ جہاں کہیں بھی ہوگی خیریت سے ہوگی نادان نہیں ہے اپنی حفاظت کر سکتی ہے"۔ ماہین نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"نادان نہ ہوتی تو یہ حرکت کرتی؟ احمق لڑکی ہے، حماقت در حماقت کر رہی ہے"۔ یاور علی خان غصے سے بولے۔

"جائیے آپ آرام کیجئے"۔ انہوں نے بیزاری سے کہا۔

"کب تک آپ اسی طرح سوچتے رہیں گے، اس سے کیا مسئلہ حل ہو جائے گا؟" وہ تکیوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پلیز ماہین جائیے آرام کیجئے"۔

ماہین ان کی طرف دیکھتی ہوئی بستر کی طرف بڑھی اور دراز ہو گئی۔

یاور علی خان نے پھر سگریٹ سلگائی اور صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ مضطرب کیفیت میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اچٹتی سی نظر ماہین پر ڈال لیتے تھے۔

اس کے سانولے رنگ پر کھلے ہوئے بال پھیلے ہوئے چہرے کے گرد بکھر گئے تھے۔ سرخ نائٹی میں ایک دلکش رعنائی آغوش میں تھا۔

سونے کی چوڑیوں سے بھرا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے فائل بند کر دی تھی اور بستر کی طرف بڑھ آئے تھے اور کپڑے بدل کر لیٹ گئے تھے۔

جانے کتنی دیر وہ یونہی دیکھتے رہے، پھر وہ اس کے چہرے پر جھک گئے۔

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

"ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" وہ غنودگی سے پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں کیا، تمہیں تو اپنی نیند سے غرض ہے، عمر بھر کی بیداری جمع کر کے اطمینان سے سوتی ہو"۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"رات سونے کیلئے ہوتی ہے"۔ اس نے بڑے ناز سے کروٹ بدل لی تھی۔

"لوگوں کیلئے ہوتی ہے جاگنے والوں کیلئے نہیں"۔ انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا تھا۔

"کیا ہے بڑی سخت نیند آرہی ہے"۔ اس نے پھر کروٹ لینے کی کوشش کی۔

"اس میں سے آدھی ہمیں بھی دیدو تا کہ ہم بھی سو جائیں"۔ انہوں نے اسے کروٹ لینے سے باز رکھا۔

"یاور پلیز"۔ وہ بسوری تھی۔

"پلیز ویلیز دن میں چلتا ہے رات کو نہیں چلے گا۔ تمہیں میڈم تھیٹر کیمبرج؟"

"ہائے اللہ دن میں جو ڈانٹ کرتا ہے اور رات کو آپ"۔ وہ پھر بسوری تھی۔

"کافر ہے جو تاب پری جائے"۔ وہ مسکرائے تھے۔

"اچھا بتائیں آپ کو نیند کیوں نہیں آرہی؟" وہ جیسے تھک کر پوچھ رہی تھی۔

"سیکرٹ آفیشل ورک میں مصروف تھا، تم پر نظر پڑی تو شامت اعمال سے خیال آیا کس قدر ظالم ہو، کیوں نہ اس وقت تمہارا حساب کر لیا جائے۔

"پلیز یاور! صبح بھائی بیگم کے ساتھ پشاور بھی جانا ہے، رحم کریں"۔ وہ منت سے بولی تھی۔

"تم نہیں سونے دو گی؟ جو چاہے کرو"۔ وہ کھڑے ہو کر ڈریسنگ گاؤن اتار کر لٹکانے لگے۔

"بہت ہی خراب ہیں آپ" ۔ وہ کروٹ لیتے ہوئے دھیرے سے ہنسی تھی۔

"لوگ خراب ہوتے نہیں ہیں خراب کر دیئے جاتے ہیں" ۔ وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔

"لے کے آتی اچھی نیند بھگا دی" ۔ وہ بے ساختہ جھلائی تھی۔

"بھاگ گئی تھینکس گاڈ" ۔ وہ شریر ہو رہے تھے۔

"کل سے میں جواد کے پاس سویا کروں گی" ۔ وہ بولی۔

"وہاں میں بھی سو سکتا ہوں میرے بیٹے کا کمرہ ہے" ۔ وہ مسکرائے۔

"اپنی قابلیت سے زچ نہ کریں" ۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"محبت سے کر رہا ہوں" ۔ وہ شرارت سے گویا ہوئے۔

"یاور!" اس کے انداز میں بے بسی تھی۔

یاور علی خان ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی گہری ہو گئی تھی۔

وہ ماہین کے قریب آ کر غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

وہ سو کب رہی تھی۔ ان کی گرم نگاہیں اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیں تو جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں جانے کیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ رواں رواں کھڑا ہو گیا۔

وہ چپ چاپ ان کی جانب دیکھتی رہی۔

"ماہین" ۔ ان کی آواز میں برف کی سی ٹھنڈک تھی۔

"جی" ۔ اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

"اٹھو" ۔ ان کا انداز تحکمانہ تھا۔

"وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئی" "جی" ۔

"تم اس وقت یہاں سے چلی جاؤ" ۔ ان کے لہجے میں بلا کی خنکی تھی۔

"جی! مگر کہاں؟" وہ حیران پریشان اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اتنی بڑی حویلی ہے کہیں بھی جا کر سو جاؤ" ۔ وہ غرائے۔

"جی" ۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

"پلیز ماہین۔ گو آؤٹ۔ ود ان سو منٹس (دو چلی جاؤ لمحوں کے اندر اندر)

ماہین حواس باختہ سی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا" ۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔

"یو۔ شٹ اپ" ۔ انہوں نے بند مٹھی اپنی پیشانی پر ماری۔ "دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ مجھے برین ہیمرج ہو جائے گا۔ ہری اپ پلیز" ۔

ماحول ایک دم بوجھل ہو چکا تھا۔ اس نے چادر اٹھا کر لی۔ اور ان کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

چند منٹ راہداری میں کھڑے ہو کر صورتحال پر غور کرتی رہی۔ یاور علی خان میں پیدا ہونے والی اس اچانک تبدیلی پر اسے الجھن ہو رہی تھی۔ کوئی سرا ہاتھ میں آتا دکھائی نہ دیا تو وہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے آگے بڑھی اور پہلے ہی دروازے پر دستک دے ڈالی۔

"کون؟" ہادی کی آواز میں شدید جھلاہٹ تھی۔

"میں ہوں ہادی۔ پلیز دروازہ کھولو" ۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز بھر آئی۔

"میں آئیں کون؟" جھلاہٹ بدستور تھی۔ شاید اس کا دھیان بھابھی کی طرف تھا۔

"اف ۔۔۔ ہادی ۔۔۔ پلیز ۔۔۔ ماہین ۔۔۔ ہوں" ۔ اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا۔

"ہادی نے بڑی حیرت کے ساتھ دروازہ کھولا تھا۔

"آ ۔۔۔ آپ ۔۔۔ آپ خیریت؟"

ماہین کی آنکھوں سے اشک مسلسل رواں ہو چکے تھے۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔

"یاور بھائی پھر چلے گئے؟"

وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

ہادی کا دماغ اب کہیں دور تک پہنچ رہا تھا۔ بلا ارادہ اس کی نظر ماہین کے چہرے پر تھی۔

"کیا کر رہے ہیں یاور بھائی؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

وہ چپ رہی۔ آنسو پینا مشکل ہو رہا تھا۔

سو رہے ہیں؟"

ماہین نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کام کر رہے ہیں؟"

اس نے پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

"ان کی طبیعت ٹھیک ہے؟" اس کے لہجے میں عجیب سا ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا۔

ماہین نے چادر سے چہرہ پونچھا۔

"اسی لئے تو تمہارے پاس آئی ہوں۔ کچھ پوچھنا ہے تم سے" ۔

"آپ ہال میں چلتے ہیں" ۔ کس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کیا قابل ہادی تھا۔

"کیوں۔ یہاں کیا ہے؟" اس نے حیرت سے ہادی کو دیکھا۔

"پلیز آ ۔۔۔ بیٹھ کر چلتے ہیں" ۔ اس نے جیسے سنی ان سنی کر دی۔

وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی ہال میں آ گئی۔

ہادی نے سرخ مخملی صوفے کی طرف اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی فرمایئے۔ کیوں رو رہی ہیں آپ؟" اس نے خود بھی ایک نشست سنبھال کر سوال کیا۔ اس کی سوالیہ نظریں
آنکھیں کچھ حواس کرنے کی جستجو میں بڑی بے تاب نظر آ رہی تھیں۔

"ہاری... کیا... یار ’’ساتھی پر الم‘‘ ہیں" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"جی انہیں تو... سارے گھر میں ایک وہی تو بیٹس نظر آتے ہیں" وہ دوبارہ سے ہنس دیا۔

"کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟" اس نے ماہین کا چہرہ بغور دیکھا۔

"ہاں! انہوں نے میری بہت انسلٹ کی ہے" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"کیا کہتے ہیں" ہاری کو جیسے اس کے ساتھ ہاری کا بہت دکھ ہوا۔

"مجھے پتا ڈاکٹر صاحب گھر والوں کے ساتھ یہ کیسا ’’بی ہیو‘‘ کرتے ہیں؟" اس نے آنکھیں پونچھیں۔

"تمی اذانے وہی پاس ایز جنٹلمین۔ ویل مینرڈ۔ ڈونٹ وری میں بہت اچھے ہیں"

وہ کہہ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ الجھن بھری نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا۔

"یاد کرو شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ انہیں کوئی دورہ وورہ..."

"نہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کو فٹ دیکھا ہے" ہاری نے تیزی سے جواب دیا۔

"آپ مجھے بتایئے اس وقت وہ کیا کر رہے ہیں؟" اسے بہت الجھن ہو رہی تھی۔

"مجھے کیا پتا۔ میں تو اس وقت تمہارے پاس بیٹھی ہوں" اس نے جھلا کر جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے جب آپ اپنے بیڈروم سے باہر آ گئیں تو وہ آپ کے ساتھ کیسا بی ہیو کر رہے تھے؟"

"کمرے سے نکال دیا ہے انہوں نے مجھے" اس نے اطلاع بم پہنچائی۔

"جی" ہاری کو جیسے شاک لگا۔

"جی" ماہین نے بھی اس کی نقل اتاری۔

"آپ لوگوں کی لڑائی ہو رہی تھی" اس نے بے حد جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ... کاش ہوتی۔ تو اس طرح نکالے جانے پر اتنی حیرانی کیوں ہوتی" اس نے حسرت کر جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا تھا؟" ہاری کی حیرت بجا تھی۔

"اسی لئے تو تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم یہاں کے سب سے باخبر شخص ہو۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ اب روشنی کی وجہ سے ٹینشن ہے وہ تو فطری ری ایکشن ہے۔ مگر میرے ساتھ بالکل نارمل تھے۔ البتہ انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجھے سونے کا کہہ کر کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ میں ویسے ہی آنکھیں بند کرکے لیٹی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے وہ اتنے پریشان ہیں تو میں کیسے سو سکتی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فوراً کمرے سے باہر چلی جاؤ۔

میں تو ایک دم پریشان ہو گئی۔ کہ ابھی انہیں کیا ہو گیا؟"

"ہوں" ہاری نے ایک گہری سانس لی۔ اور ماہین کی سمت دیکھا۔ وہ سوچ میں کہیں دور پہنچ گیا تھا۔

"انہوں نے بہت غصے میں کہا تھا؟" ہاری ہنوز گہری سوچ میں تھا۔

"ظاہر ہے" ماہین کو پھر رونا آ گیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ وہ صبح تک نارمل ہو جائیں گے" ہاری نے تسلی دی۔

"آج رات کی صبح کتنی مشکل ہو گی۔ تمہیں اندازہ ہے؟" وہ بولی۔

"آپ ایسا کیجئے۔ گیسٹ روم میں جا کر سو جایئے" ہاری نے مشورہ دیا۔

"سونے کا مسئلہ نہیں ہے۔ سونے کو کیا ہے۔ کہیں بھی سو جاؤں گی۔ مجھے تو یہ پریشانی ہے کہ انہیں ایک دم سے کیا ہو گیا" وہ ہنوز فکرمند تھی۔

"شاید وہ روشنی بی بی کی وجہ سے بہت پریشان ہیں" ہاری نے دھیمی آواز میں کہا۔

ہاری کے کلام پر ماہین نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"تو بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اس نے آزردگی سے کہا۔

ہاری خاموش رہا۔

"ہاری" اس نے گہری نظروں سے ہاری کو دیکھا۔

"جی؟" وہ نظریں جھکائے ہوئے تھا۔

"کیا روشنی سے تمہاری کوئی بات ہوئی ہے؟" اس نے فوراً پینترا بدلا تھا۔

"ان سے تو ہمیں ہوتی رہتی ہیں" اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

"بلاوجہ نہیں مجھے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں" اس نے جیسے ڈپٹ کر کہا۔

ہاری خاموش رہا۔

"کیا پوچھ رہی ہوں میں؟"

ہاری پھر خاموش رہا۔

"کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟" اس مرتبہ وہ کھل کر بولی۔

"اگرچہ میں کسی لائق نہیں ہوں" اس کے انداز میں جیسے اقرار گناہ تھا۔

"تم بھی اسے پسند کرتے ہو؟" وہ مزید آگے بڑھی۔

ہاری پھر خاموش ہو گیا۔

"بھئی جواب دو" وہ اس کی خاموشی سے چڑ گئی۔

"میں نے کبھی اس زاویئے سے سوچا نہیں۔ میرے خیال میں مجھے اس طرح سوچنا بھی نہیں چاہئے" اس نے بڑے سبھاؤ سے جواب دیا۔

"میری طرف دیکھ کر جواب دو۔ کیا مجرموں کا سا انداز رکھا ہے" اس نے کہا۔

"جی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں"۔ اس نے نظریں اٹھا کر ماہین کی سمت دیکھا۔

"سچ محسوس ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے منہ سے اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تمہارے الفاظ کا کھوکھلا پن کچھ اور کہہ رہا ہے۔ انداز کچھ اور کہہ رہے ہیں"۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"نہیں جی ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔ وہ مسکرا دیا۔

"میری بات ہوئی ہے روشی سے باری۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولو"۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

"انہوں نے مجھے بلیم کیا ہے؟" وہ چونک پڑا۔

"وہ بڑی بہادر اور کھری لڑکی ہے۔ ایسے چھوٹے کام نہیں کر سکتی"۔ ماہین نے بڑے وثوق سے کہا۔

"پھر؟" باری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"پھر یہ کہ مجھے بتاؤ۔ تمہیں اس کے احساسات کی خبر ہے؟"

باری خاموش رہا۔

"باری ___ پلیز۔ فار گاڈ سیک"۔ وہ جھلائی۔

"جی"۔ نہ جانے کیوں اس سے جھوٹ نہ بولا گیا۔

"تم نے کس طرح ری ایکٹ کیا ہے آج تک؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے کبھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ کوشش کی ہے کہ وہ مجھ سے مایوس ہو جائیں"

اس نے سچائی سے جواب دیا۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جس بات کا انجام واضح ہو اسی حساب سے ری ایکٹ کرنا چاہیے"۔ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"تمہیں ذرا دکھ نہیں ہے"۔ ماہین نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

باری خاموشی سے اپنے ہاتھ مسلتا رہا۔

"باری۔ کیا تمہیں مجھ پر ذرا بھروسا نہیں؟" وہ الجھی۔

"دکھ کا نہ پوچھیں۔ یہ ہمت کا ہے"۔ بالآخر وہ کہہ گیا۔

"اتنے بزدل ہو؟" ماہین نے گہرا سانس لیا۔

"بات بزدلی کی نہیں۔ احسان شناسی کی ہے"۔ وہ بہت آہستگی سے گویا ہوا۔

"میرے خیال میں تمہارے پاس وہ جذبہ نہیں ہے جو روشی کے پاس ہے۔ ورنہ کوئی راستہ نکل ہی آتا"۔ ماہین جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔

باری نے خاصے تعجب سے اسے دیکھا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔

"تم نے اسے زندگی بھر کا دکھ دیا ہے۔ تمہیں احساس تک نہیں"۔ ماہین نے افسردگی سے کہا۔

"میں نے تو انہیں دکھوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش بڑی روشن ضمیری کے ساتھ کی۔ اب یہ ان کا نصیب"۔ اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"ذرا سوچو اس کو کیا ہو گا؟" ماہین نے اس کا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

"یہی تو آخری حد ہے کہ تم اس کے لئے کچھ کر بھی نہیں سکتے"۔ ماہین نے سر جھٹکا۔

"وہ بہت جلد باز اور جذباتی ہیں۔ ان کی جذباتیت نے اسے بہت مشکل میں ڈالا ہے۔ شاید کوئی راستہ نکل ہی آتا۔ جو آج ہو رہا ہے وہ بعید تو نہیں ہوتا۔ پھر بھی ایک سے نہیں ہوتے۔ آخر پھر کی آنکھ صورتیں ہوتی ہیں۔ جنہیں تھوڑا احساس اور برداشت والا بھی ہونا چاہیے"۔

ماہین نے خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ بہت آرام دہ حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ سفید کاٹن کا شلوار سوٹ جس پر شکنیں پڑ چکی تھیں۔ اسے بہت تھکا ہوا اور نڈھال ظاہر کر رہا تھا۔

"تم اسے ہی سمجھا دیتے۔ کم از کم یہ نوبت تو نہ آتی"۔ ماہین نے کہا۔

"ضرور سمجھاتا اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ سب کر گزریں گی"۔ اس نے یوں کہا جیسے اپنے کسی جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔

"یہ نرم گوشہ اس لئے ہے کہ وہ تمہاری طرف متوجہ ہے۔ یا تم بھی؟" ماہین بہت سنجیدہ تھی۔

"میں آپ سے درخواست کروں گا یہ نہ پوچھئے پلیز"۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

"چلو ٹھیک ہے۔ فی الحال یہ دعا کرو کہ وہ سلامتی سے خیریت کے ساتھ گھر واپس آ جائے۔ پھر دیکھتی ہوں کیا کرتی ہوں"۔

باری نے چونک کر ماہین کی شکل دیکھی۔ "کیا کریں گی آپ؟"

"کیوں بتاؤں۔ اچھا جاؤ تم آرام کرو۔ ہم بھی آرام کرتے ہیں۔ آخر صبح کو یہاں سے نکلنا بھی تو ہے۔ بات کو وہ ہلکا کر رہی ہیں ان کو ہم کریں گے"۔ ماہین نے خود کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔

باری اٹھ کھڑا ہوا۔

"آئیے۔ میں گیسٹ روم کھول دوں"۔ وہ آگے بڑھ گیا اور ماہین اس کے پیچھے چل پڑی۔

"اب یہ کپڑے یہاں سے سمیٹو"۔ گلو نے روبی کو مخاطب کیا۔

"ہاں اٹھا رہی ہوں۔ دھیان نہیں رہا تھا"۔ وہ بجھے بجھے انداز میں بولی۔

"صرف اٹھاؤ نہیں۔ کہیں رکھ دو"۔ لالی چیخ کر گویا ہوئی۔

"اللہ کرے کیسی باتیں کر رہی ہو جائے گی۔ بصورت دیگر دوبارہ دکھا دیا جائے گا"۔ سمعیہ ہول کر بولی۔

"آپ تو سدا کی خوش فہم ہیں۔ وہ آنے کیلئے گئی ہے۔ جانا تو بڑی بہادری نہیں ہے جتنا کہ واپس آنا۔ بابا صاحب تو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔ تانیہ اداسی سے بولی۔

"ایسا نہیں ہوتا جیسے کہ ہم سوچتے ہیں۔ اس وقت تک کے فیصلے ہیں جب تک وہ سامنے نہیں آجاتی"۔ سوہا نے دل ہی دل

بچکی۔

"ویسے اس نے بہت غلط حرکت کی"۔ زری کو غلطی نظر آگئی کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔

"اب تو جو ہو چکا..... ہو چکا..... آگے کا سوچو تم کے گھر والے تو دھوکا رکھوا چکے ہوں گے"۔ حنا نے بھی مصلحت

"ہائے میرا پانچ ہزار کا غرارہ"۔ روبی نے آہ بھری۔

"لاکھوں لگے ہوں گے اس لڑکی پر۔ اس طرح بھی سوچو"۔ سالی تنک کر بولی۔

"معصومہ آپا..... کب جان چھوٹے گی آپ کی اس شغل سے۔ کتنی بے حس ہیں آپ"۔ حنا نے چڑ کر معصومہ کو مخاطب کیا۔

"میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی ہوں، گوری دو، وہ اس طرح آجاتی"۔ وہ ہاتھ روک کر تیکھے سے گویا ہوئیں۔

"یہ پاگل پن ہی ہیں"۔ روبی بڑبڑائی۔

"یار ماموں تو بہت غصے ہو رہے ہوں گے"۔ سوہا کو ان کے غصے کا خوف محسوس ہوا۔

"سارا غصہ بے چاری ممانی پر اتر رہا ہوگا"۔

"بھلا ان بے چاری کا کیا قصور؟" گمو بولیں۔

"یہ کون دیکھتا ہے"۔ زری اداس انداز میں مسکرائی۔

"وہ گئی کہاں ہوگی؟" روبی کو ایک دم دھیان آیا۔

"شاید کراچی"۔ حنا نے معصومیت سے کہا۔

"وہ بے وقوف ہے گر اتنی بھی نہیں"۔ زری چڑ کر بولی۔

"ہائے..... بے چاری نے پتا نہیں کھانا بھی کھایا ہوگا کہ نہیں"۔ یہ گو اس کے کھانے پینے کی فکر ہوئی۔

اسی دم ہادی ہال میں داخل ہوا اور لڑکیوں پر ایک نظر دوڑائی۔

"آپ کو بڑی امی بلا رہی ہیں"۔ وہ گمو سے مخاطب ہوا۔

معصومہ نے کن انکھیوں سے اس کی سمت دیکھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ البتہ کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ وائٹ پینٹ پر آف وائٹ شرٹ اور چمکتے ہوئے جوتے پہن رکھے تھے۔

"کہیں جا رہے ہو؟" معصومہ نے بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔

"جی۔ کچھ منگانا ہے؟" اس نے بڑی سادگی سے دریافت کیا۔

"نہیں..... فی الحال تو کھوئی ہوئی چڑیل جائے تو یہی بہت ہے"۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"ہادی تمہارے ہوتے ہوئے وہ کیسے نکل گئی"۔ سوہا کو خاصا تعجب تھا۔

"کیوں۔ مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ گھر میں تیس چالیس افراد اور بھی ہیں؟"

اس نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کے اعصاب ویسے ہی شل تھے۔

"ابھی تو تم مسلسل حرکت میں رہتے ہو"۔ معصومہ مسکرائیں۔

"میری آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔ جدھر جاتا ہوں ساتھ ہی لے کر جاتا ہوں"۔ معصومہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"ہادی بھائی..... روشی کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں؟" اس نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

معصومہ جلدی جلدی کرتے ہوئے سلائیوں پر جھک گئیں۔

ہادی نے ایک نگاہ سب پر ڈالی اور واپس پلٹ گیا۔

گمو اس کے پیچھے چل پڑی تھیں۔

"سارے لڑکے جو دوست تھی اس سلسلے میں کر رہے ہوں گے"۔ زری نے بڑے رنج کے انداز میں کہا۔

"اور ان سب کے درمیان ہادی کی کیا حالت ہوگی؟" معصومہ نے تاگا اٹھایا۔

"وہ ویسے ہی غصے کے تیز ہیں۔ اگر روشی سامنے آگئی تو دیکھتے ہی شوٹ کر دیں گے"۔ روبی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"دیکھا نہیں رات سے اب تک کسی قسم کا شور شرابہ نہیں ہوا اس طرف"۔ سالی نے تعجب دلایا۔

"پتا نہیں بڑی امی نے گمو آپا کو کیوں بلوایا ہے"۔ حنا نے سوچ کا رخ موڑا۔

"روشی کے سلسلے میں کوئی بات کرنا ہوگی"۔ روبی نے سوچ کر اندازہ لگایا۔

"اب کیا بات رہ گئی ہے"۔ معصومہ تمسخرانہ مسکرائیں۔

روبی جل کر ایک میگزین اٹھا کر پیچھے لیٹ گئیں۔

اتنی لڑکیاں تھیں ہال میں مگر ایک محسوس کیا جانے والا سناٹا طاری تھا۔

"آپ ساری رات جاگتے رہے ہیں کیا؟" بالو نے اسے کرسی پر بیٹھے دیکھ کر بڑی شرمندگی سے کہا۔

"اس طرح نہ کریں مجھے کیا ہو جائے گا۔ کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہو جاؤں گی لوٹ پوٹ کر۔ آپ اس طرح میرے لیے تکلیف نہ کریں"۔

یہ وفا کیسی ساری دھوم کے ٹھہرے بھی کہاں
چھوڑو ان کی بات ہے ٹھہریں گے ہم سے بھی کہاں

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے ہنس دیا۔

"اللہ کرے اب تو جو ہو اس ٹھہرنے کیلئے ہو"۔ بالو نے بے ساختہ کہا۔

عارف کے ہونٹوں پر بڑی بے ساختہ سی مسکراہٹ آئی تھی۔ پہلی مرتبہ بالو نے اس کے کسی شعر پر ردعمل ظاہر کیا تھا۔

"بہت اداس ہو گئے تھے سکون ٹھہرے ہوئے۔ طبیعت بڑی حیران تھی۔ بار بار یہ شعر یاد آ رہا تھا۔

خدا محفوظ رکھے آفتوں سے!
کئی دنوں سے طبیعت شادماں ہے

وہ مسکراتے ہوئے اس کے نزدیک آیا اور اس کی کلائی تھام لی۔

"کیسی طبیعت ہے جناب۔ کیا محسوس کر رہی ہے؟" سفید شلوار قمیص میں ملبوس اور بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ شخص بہت اپنائیت اور ہمدردی سے اس کا حال پوچھ رہا تھا۔

بالو ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ یہ ذات ان چاہا سے در آیا تھا۔

"خدا کا شکر ہے اب تو طبیعت اچھی معلوم ہوتی ہے آپ ہاتھ منہ دھو لیں۔ میں ناشتہ لاتا ہوں۔ پھر آپ سے دو باتیں کرنی ہے۔"

وہ اس کی نظر سے انجان بن کر شکستگی اور ملامت سے کہہ رہا تھا اور بہت غیر محسوس طریقے سے اس کی کلائی چھوڑ دی تھی۔

"آئیے۔ میں آپ کو باتھ روم کا راستہ دکھاؤں۔"

"آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں۔" بالو قدرے بھرائے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مثلاً۔۔۔ کیا پوچھنا چاہیے تھا مجھے؟" اس نے تجاہل برتا۔

"بہت کچھ ہے پوچھنے کیلئے۔" اس نے دبی زبان سے کہا۔

"آپ ہوش و حواس کی دنیا میں پورے قدم تو رکھیں۔ پوچھ لیں گے۔ بلکہ پوچھنا کیا آپ خود ہی بتا دیجئے گا۔

کوئی دم اور بیٹھے ہیں ذرا فرصت پھر کہاں لوگو
چلے آؤ جو سننی ہو ہماری داستاں لوگو

کی مثال بن کر۔ کیا خیال ہے؟ آئیے۔" وہ ہنس دیا تھا۔

"آپ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی مجھے یہاں دیکھ کر۔" بالو حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"اب حیران ہونا بھی چھوڑ دیا ہے۔ پریشان ہونا بھی چھوڑ دیا ہے۔ مشتاق ہونا بھی چھوڑ دیا ہے۔

کیسی کاروبار عشق تھا یہاں
بہت نقصان ہوا ہے اے دل

وہ کمرے سے نکلا تو بالو اس کے پیچھے آہستہ آہستہ چل پڑی۔

"عارف اللال خان کی بیوی کا بخار اتر گیا کہ نہیں؟" بڑی بی نے قدموں کی چاپ محسوس کرتے ہوئے فوراً سوال کیا۔

"اتر گیا ہے اماں۔"

"تو نے چائے پانی کا پوچھا؟" ان پر مہربانی کا دورہ شروع ہوا۔

"صرف پوچھا ہی نہیں ہے۔ پیش بھی کر رہا ہوں۔" اس نے رسانیت سے جواب دیا۔

"ہاں تو پھر تو ہی پیش کرے گا۔ اور ہے کون یہاں تیرے سوا۔ میں ٹھہری آنکھوں سے کوری۔" بڑی بی کو گویا بولنے کا بہت ہی شوق تھا۔

"تو نے نہیں پوچھا اس سے کہ لال خان ساتھ کیوں نہیں آیا۔ کیسی 'بدلی' ہو گئی اس کی۔"

"ہاں۔۔۔ بڑی کنستر لگا ہوا ہے۔ 'بدلیاں' کیسی نہیں ہوں گی اس کی؟"

عارف مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔

بالو نے سب سن لیا تھا۔ جان جل کر خاک ہو گئی تھی اس کی۔

(ہونہہ۔۔۔ بڑی بی کو لال خان کے علاوہ کوئی بات ہی نہیں سوجھتی)

ناشتے کے بعد وہ کافی دیر تک کمرے میں ٹہل کر اپنا جائزہ لیتی رہی۔ پھر اس نے ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

خوبصورت لان میں بے حد خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک دم آنکھوں میں تراوٹ سی آ گئی۔ گیٹ کے پاس وہ نوکر اور ملازم کیا رنگ کھڑے تھے۔ سے نکلتے ہوئے دروازے میں آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چلتی ہوئی لان کے بیچ تک آ گئی۔

سورج کی تپش کی پیش سے بیٹھ گئی۔ نظر کے سامنے ساری حویلی تھی۔ جہاں سے وہاں تک نظریں دوڑانے لگی۔

"آپ کون ہیں؟"

وہ ایک دم چونک پڑی۔ سامنے دس گیارہ سال کی بے حد خوبصورت بچی بڑی معصوم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وائٹ یونیفارم سرخ اور لان کی جرسی ... سنہری بالوں کی پونی تر ایک لٹ لٹکی ہوئی۔

"کتنی کیوٹ ہے یہ بچی۔" روشی کو بے ساختہ پیار آ گیا۔

"ہوں۔ پہلے آپ بتائیے آپ کون ہیں؟" اس نے بچی کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہم صفوتی ہیں۔ صفوانان۔" اس نے بڑی شاہانہ تمکنت سے جواب دیا۔

"کاکا جان کی بیٹی ہو؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کاکا جان ہمارا۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"بابا صاحب کو جانتی ہو؟" روشی کا اشتیاق سوا ہو رہا تھا۔

"بابا صاحب کو جانتی ہو؟" روشی کا اشتیاق سوا ہو رہا تھا۔

"جی۔ وہ ہمارے بابا صاحب ہیں۔ مائی لونگ گرینڈ فادر۔" اس نے بڑی شان استغنا سے جواب دیا۔

"اوہ۔" روشی کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔

"آج اسکول نہیں گئیں؟" اس نے بہت محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ ہم آج کل حویلی آئے ہوئے ہیں۔ ہم یہاں نہیں پڑھتے ہیں۔ ہمارا اسکول۔۔۔ سوئٹزرلینڈ میں ہے۔" اس نے سادہ انداز میں جواب دیا۔

"اوہ۔" روشی کو اس کا منفرد سا انگلش لہجہ سمجھ میں آ گیا۔ سوئس ایجوکیٹڈ اپنے لہجے کی انفرادیت سے پہچانے جاتے

ہیں۔

"وہاں آپ کے ساتھ آپ کے اور بہن بھائی بھی پڑھتے ہیں؟"

"نہیں۔ بس وہاں ہم پڑھتے ہیں۔ ہمارے بہت سے دوست ہیں وہاں' ہمارا جو سب سے بیسٹ فرینڈ ہے وہاں اظہر ولیمز' ہے۔ حماد الکریم"۔

وہ بڑی بے تکلفی سے بتا رہی تھی۔

"آپ کون ہیں؟"

"ہم بابا صاحب کی وہی ہیں جو ان کی آپ ہیں"۔ روشی ہنس پڑی۔

"ہیں؟" بچی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"بڑی حویلی سے آئے ہیں ہم"۔ اس نے وضاحت کی۔

"بڑی حویلی؟" وہ پھر الجھی۔

"ہوں۔ بابا صاحب کے گھر سے"۔

"اوہ..... آپ ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں"۔ وہ معصوم انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ہوں"۔

"وہ آپ کے ساتھ کیوں رہتے ہیں۔ یہاں کیوں نہیں رہتے ہیں؟" اسے جیسے جیلسی فیل ہوئی۔

"یہ ان سے پوچھئے گا"۔

"آپ بڑے ابا کی بیٹی ہیں؟" اس نے انگلش میں پوچھا۔

"نہیں"۔

"نصیر انکل کی بیٹی ہیں؟" بچی مکمل معلومات رکھتی تھی۔

"نہیں"۔

"نرگس آنٹی کی بیٹی ہیں؟"

"نہیں"۔

"رئیسہ آنٹی کی؟"

"نہیں"۔

"تو..... پھر آپ کس کی بیٹی ہیں؟" وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ روشی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"آپ سب کو جانتی ہیں۔ اپنے پاپا اور انکل کو نہیں جانتیں؟" اس نے پوچھا۔

"پاپا اور انکل؟ اچھا..... ہائی ہم جانتی ہوں۔ بائی فیس نہیں کیونکہ ہم تو یہاں رہتے ہی نہیں ہیں"۔ اس نے جیسے اعتراف [illegible]

"ہائی تو ہم کو آپ جانتی ہیں؟" اسے بھی خاصی حیرت ہوئی۔

"ہائی تو وہ لوگ ہم سے ملنے آتے ہیں"۔ اس نے بتایا۔

"ملنے آتے ہیں؟" روشی کو حیرت ہوئی کیونکہ اسے تو کبھی پتا نہیں چلا کہ بڑی حویلی سے لوگ کب سرائے آتے جاتے رہے تھے۔ پاپا وغیرہ۔ کہ گھر والے لگاتار میں لندن آتے جاتے تو ضرور ہیں۔ اس سے تو آج تک کسی نے جھوٹوں بھی نہیں کہا سرائے چلنے کیلئے۔ پشاور' کراچی کے علاوہ وہ کبھی کہیں نہیں گئی تھی اور اب بڑی ہو کر بھی باپ کی جب سے۔"

"اچھا۔ اچھا تو آپ کا بھائی ہے ناں؟"

"او نہیں۔ مائی ڈیئر برادر"۔ یہ اول وہ چھیڑنے والا انداز تھا۔

"آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں آپ نے ہمارے ساتھ اور ممی کے ساتھ بریک فاسٹ کیوں نہیں کیا؟"

"اصل بات یہ ہے کہ آج جاڑے....."۔

"بے بی! آپ ادھر کیا کرتا ہے؟ ہم آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔ آپ کا کوئی پریشان ہے"۔

نیلی فراک پہنے وہ ادھیڑ عمر کی دیوار سے ہوتے ملازمہ اس کے قریب آ گئی۔

"اوفوہ ہم گھر ہی میں ہیں۔ کوئی باہر تو نہیں گئے"۔ وہ جھنجھلائی۔

"آپ کو کوئی بلاتا ہے"۔ ملازمہ نے منت سے کہا۔

"ان سے کہو ہم گیسٹ سے باتیں کر رہے ہیں تھوڑی دیر میں آتے ہیں"۔

"پہلے آپ کسی کی بات سن لو پھر آ جانا"۔ ملازمہ نے پچکارا۔

"اوفوہ آپ یہیں بیٹھئے ہم کسی کی بات سن کر ابھی آتے ہیں"۔

وہ جیسے بہت مجبوری سے بولی۔

"روشی نے مسکرا کر گویا بیٹھے رہنے کا وعدہ کر لیا۔

نصولاں چلی گئی اور روشی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆

جانے وہ کتنی دیر خیالات میں کھوئی رہی۔

معاً وہ چونک اٹھی۔ اطراف میں چمکیلی دھوپ پھیل چکی تھی اور صولت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ رائفل بردار چوکیدار ٹہلتے ہوئے گاہے بگاہے اس کی جانب دیکھ لیتا تھا۔

اس نے ایک اور ملازم کو فیروزی سوٹ پہنے مسکراتے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اس نے دو تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ غالباً سودا سلف لے کر آ رہا تھا۔

روشی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اسے اشارے سے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"سنو، اندر سے صولی کو بھیج دو۔ کہنا بہت دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔"

ملازم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، مگر بولا کچھ نہیں اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ روشی کوفت بھرے انداز میں ٹہلنے لگی۔

"بتاؤ بھلا یہ کیسے چچا کا گھر ہے۔ جیسے آزاد کشمیر والے غلطی سے مقبوضہ کشمیر میں پھنس گئے ہوں۔"

وہ جل کر سوچ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس طرف بھی نظر ڈال رہی تھی جہاں ملازم غائب ہوا تھا۔ چند منٹوں بعد ملازم اسی کی جانب آتا دکھائی دیا۔

"بے بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ آرام کر رہی ہے۔"

ملازم یوں گویا ہوا جیسے ٹیپ چلا ہو۔

"جی، ابھی تو بے بی بالکل ٹھیک تھی"۔ اس کے منہ سے تعجب سے جملہ نکلا تھا۔

ملازم الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

"اتنا تو مجھے اندازہ ہے کہ پاپا اور تایا جان کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ یقیناً ماں اور دادی ہی کا کوئی سنت ہو گا ورنہ پاپا تو بالکل بھی ویسے نہیں ہیں۔ البتہ تایا جان ضرور ویسے ہی مشکوک لگتے ہیں۔ میں نے تو زندگی میں کبھی انہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کن خوش قسمت لوگوں نے ان کی مسکراہٹ دیکھی ہو گی۔ اللہ کی دی ہوئی دولت تو ان کے پاس بے شمار ہے لیکن سکون اور آف رہتا ہے۔ حتیٰ کہ شادی تک اپنی مرضی کی کی تھی۔ بالکل انگریزوں کی طرح"۔ ہے اور تک ہیں۔ ظاہر ہے صحت کا اثر ہے۔

"پتا نہیں جتانے بے بی کی طبیعت خراب کر دی"

وہ کڑھتی ہوئی گیسٹ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ماہین صبح صبح گیسٹ روم سے نکل کر عالم جناب کے بیڈروم میں آ گئی تھی۔

وہ اسے آتی صبح اپنے کمرے میں دیکھ کر قدرے چونک پڑی تھیں۔

"تم سوہرات جیسی نہیں آئی"۔ ماہین نے ان کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے گویا وضاحت کی تھی۔

"ہاں کیا کریں بات ہی ایسی ہے"۔ انہوں نے سرد آہ بھری۔

ماہین سر جھکا کر اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"یاور بھی جاگتے رہے ہوں گے؟" عالم جناب نے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

"ظاہر ہے"۔ ماہین نے نظریں چرا لیں۔

"کیا کریں آرام تو اس بے پروا لڑکی نے حرام کر دیا ہے"۔ وہ دکھ سے گویا ہوئیں۔

"ناشتہ تو نہیں کیا ہو گا، ابھی یاور اٹھے ہیں گے؟" وہ پوچھنے لگیں۔

"نہیں اور دل بھی نہیں چاہ رہا۔ چائے منگوا لیجئے۔ صرف۔ یاور کا معلوم نہیں میں تو بہت دیر سے باہر ہوں"۔ اس نے بکھرے پن کے انداز میں جواب دیا۔

"مصروف بھی تو بہت رہتے ہیں۔ حویلی آتے ہیں تو بھی دو چار دن آرام کر لیتے ہیں۔ تم جنتو میں سے چائے کا کہتی ہوں"۔ انہوں نے سرہانے لگے بٹن کو پش کرتے ہوئے کہا۔

فوراً ہی کلثوم آ گئی۔

"کلثوم چائے لے آؤ اور ذرا جلدی، باتیں بنانے مت بیٹھ جانا"۔ انہوں نے تنبیہ کی۔

کلثوم واپس باہر چلی گئی۔

"یاور کو بھی نیند کہاں آئی ہو گی رات بھر۔ اس لڑکی نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ پتا نہیں کیا چاہتی ہے؟" وہ

جھلانے کے انداز میں گویا ہوئیں۔

ماہین خاموش رہی۔

"تو؟ کیسی جگہ جہیز کے سامان کے ہیں"۔ وہ پھر بولیں۔

"کیا کر سکتے ہیں"۔ ماہین نے چبا چبا کر جملہ ادا کیا۔

"اور بھی تو حویلی میں لڑکیاں ہیں، پتہ نہیں چلتا کہ یہاں لڑکیاں بھی ہیں"۔ وہ جو تبصرے کر رہی تھیں۔

"اتنے ملازم ہیں، کسی نے بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا، کیسی کچھ منتظر ہو گی"۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔

"ہوں، آ جاؤ بھی کون ہے؟" وہ بیزار کن لہجے میں گویا ہوئیں۔

دروازہ کھلا اور یاور علی خان اندر آ گئے۔

ایک لمحے کو ماہین کی نظر ان سے ملی۔ اس نے فوراً ہی چہرہ موڑ لیا۔

"السلام علیکم"۔ ان کی آواز بے حد دھیمی تھی۔

"وعلیکم السلام خوش رہو"۔ عالم تاب بھی آہستگی سے گویا ہوئیں۔

"تو اب کیا کرو گے تم، کیسے تلاش کرو گے؟"

"میں کوئی تلاش وتلاش نہیں کروں گا۔ میں کل ہی سے فرض کر چکا ہوں کہ میرے ہاں کوئی بیٹی ہی پیدا نہیں ہوئی۔ لہٰذا کوئی اس موضوع پر بات نہ کرے"۔

یاور علی خان نے تندی سے بھاوج کی بات کاٹ کر کہا۔

ایک لمحے کو تو وہ دونوں ہی ہکا بکا رہ گئیں۔

ماہین تو ان سے خفگی کا اظہار کرنے کیلئے بے چین تھی۔ ادھر جو رات والی صورتحال تھا۔

"یہ تو وقتی جذبہ ہے، آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا"۔ عالم تاب نے مضبوط اعصاب کے ساتھ ان کا سامنا کیا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے، آپ لوگوں کے پاس اگر وقت اور طاقت ہے تو جو چاہیں کریں۔ میں کب منع کر رہا ہوں۔ میں تو اس وقت اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو اور ماہین کو بتا سکوں کہ میں ابھی اسی وقت ہری پور روانہ ہو رہا ہوں"۔

ماہین نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ آف وہ بات بے شکن شلوار قمیض، سیاہ واسکٹ میں سیاہ چادر اور آنکھوں میں دہلا دینے والی گہری سرخی۔

"کیوں ماہین کو ساتھ نہیں لے جا رہے؟" عالم تاب نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں، بس آپ ذرا جلدی سے ایک کپ چائے کا بھجوا دیں"۔ انہوں نے آستین اوپر کر کے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

"آ رہی ہے چائے، میرا خیال ہے کہ ماہین..."

"سوری بھابی بیگم، میں کوئی کام بغیر سوچے سمجھے کرنے کا عادی نہیں ہوں"۔

ماہین اپنی جگہ سے ذرا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہو، چائے آ رہی ہے"۔ عالم تاب اٹھ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"آتی ہوں ابھی"۔ اس نے جیسے تیسے کہا اور جلدی سے باہر نکل گئی اور سیدھی اپنی خواب گاہ کی سمت چل دی۔

پتہ نہیں وہ اس وقت کس حال میں موجود تھا، اس کا مطلب تھا ابھی وہ کمرے میں آ گئے تو غصہ ہو سکتے ہیں۔ ملازم سے کہو انہیں، اس کا دل چاہ رہا تھا جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے نکل جائے اور سامنے جو کرنے آئی تھی اس کا عزم کیا ہے۔ وہ آنسو پیتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اسی لمحے ملازم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اسے موجود پا کر قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

"آ جاؤں بی بی؟"

"یہ کون سا طریقہ ہے اندر آنے کا، آندھی کی طرح منہ اٹھا کر گھسے چلے آ رہے ہو"۔

وہ ملازم پر برس پڑی۔ "آ جاؤ اب، صورت کیا دیکھ رہے ہو"۔

بے چارہ سہمے ہوئے انداز میں سوٹ کیس کی طرف بڑھا پھر رک گیا۔

"بی بی! وہ صاحب کہہ رہے ہیں آپ نے اگر ان کی چیک بک کہیں اٹھا کر رکھی ہو تو دے دیں، مل نہیں رہی"۔ وہ ہچکچاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"مجھے نہیں پتہ کسی چیک بک کا"۔ وہ درشتی سے گویا ہوئی۔

بے چارہ کان دبا کر سوٹ کیس لے کر باہر چلا گیا۔

غصے میں کہہ تو دیا تھا مگر پھر بھی چین نہیں پڑا، اٹھ کر چیک بک تلاش کرنے لگی۔

تمام دراز دیکھ ڈالیں مگر کہیں نظر نہ آئی۔ پھر اس نے ٹیبل پر رکھی فائلیں کھول کر دیکھنا شروع کیں، وہ اتنی منہمک تھی کہ اسے یاور علی خان کی کمرے میں آمد کا پتہ تک نہ چل سکا۔

آخر دو فائلوں کے درمیان رکھی نظر آ گئی۔ ماہین نے چیک بک ہاتھ میں لی، پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ ۔۔۔۔ یاور علی خان نے چیک بک اس کے ہاتھ سے اچک لی۔

"خدا حافظ"۔ یہ ان کے منہ سے نکلنے والا واحد جملہ تھا جو خاص کر اس کیلئے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی یاور علی خان کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

ماہین خود پر کنٹرول کرتے ہوئے دریچے میں آ کھڑی ہوئی۔ یہاں سے پورچ واضح نظر آ رہا تھا۔

یاور علی خان پروقار انداز و رفتار سے پورچ میں نمودار ہوئے۔ ڈرائیور دروازہ کھولے منتظر کھڑا تھا۔ وہ جیپ میں بیٹھے اور چند لمحوں ہی میں جیپ نظروں سے اوجھل تھی۔

ماہین کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔

وہ قدم قدم چل کر بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

"کیسے مار اٹھا بجرو؟ آپ کو ان لوگوں نے؟
مگر میں یوں نہیں مروں گی۔ ٹھیک ٹھاک سبق سکھاؤں گی انہیں"۔ اس نے پہلے ایک نیا عزم باندھ لیا تھا۔

ہجوم غم میری فطرت بدل نہیں سکتا
میں کیا کروں میری عادت ہے مسکرانے کی

"شکر ہے آج آپ بالکل ٹھیک نظر آ رہی ہیں۔ اب آپ ایسا کریں کہ فٹافٹ تیار ہو جائیں"۔

وہ ناشتہ کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ عارف آ موجود ہوا۔

"تیار.... کیوں کہاں لے جائیں گے مجھے؟" بالو نے حیرانی سے سوال کیا۔

"ہم نے بھلا کہاں لے جانا ہے آپ کو۔ یہ آنا جانا تو زندگی کے ساتھ ہے بھابی۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی ہونے پر تعجب پھر بھی ہر انسان ایک ٹھکانے پر پہنچتا ہے۔ اس کے پاؤں کو پکڑ کہیں لٹکتا تو ہے .... سے مسئلے بھی حل ہوتے ہیں۔

وہ کیا کہتے ہیں کہ ——

پرانے دھوپ کی شدت سے گھر کے آنگن میں
پلٹ کے آئے تو دیکھا کر سکتا تھا وہی

مگر پھر بھی ٹھکانہ پھر ٹھکانہ ہے۔

"میں سب ٹھکانے ٹھکرا آئی ہوں عارف بھائی! کسی نئے ٹھکانے تک ہی اول بے ٹھکانہ ہوں"۔ اس کی آواز رندھ گئی۔

عارف نے سوچتی ہوئی نظریں اس کی صورت پر جما دیں۔ اس کی آنکھوں کی چمک بالو نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔ اس کی نظریں کسی انجانے بوجھ سے جھک کر رہ گئیں۔

"لال خان نے گھر سے نکال دیا ہے؟" عارف کی آواز اندیشے سے چور تھی۔

"اس بے چارے میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ خود نکل آئے ہیں ہم۔ بلکہ اس بے چارے کو مشکل سے نکال دیا ہے"۔ وہ تلخی سے مسکرائی۔

"کیوں؟ اس نے آپ کے ساتھ اس دن کوئی بہت بری بدسلوکی کی تھی"۔ عارف کا اشارہ اس دن کی طرف تھا جس روز وہ دونوں گفتگو تھے اور لال خان آ گیا تھا۔

"نہیں"۔

"پھر——؟"

بالو خاموش رہی۔

"کیا میں نے آپ کو کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا گناہ کیا ہے؟" وہ سر جھکائے پوچھ رہا تھا۔

بالو نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے بے بسی کی چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔

"آپ تو مجرم نمبر ایک ہیں۔ لال خان تو آپ کے مقابلے میں پھر بھی بے گناہ ہی ہے"۔ بالو کی آواز رندھ گئی۔

"میں ۔۔ مجرم ۔۔۔ وہ ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ آپ بتائیے پہلے والا الزام دہرائیں گی جو میں سن ہی چکا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے الزام سے ہٹنے کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو سب سے پہلے اپنے والد سے سوال جواب کیجئے۔ ایک خیر خواہ اور ہمدرد کی حیثیت سے میں نے ان کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں بھی میرا گناہ ہے"۔ عارف نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔

"خیر خواہ اور ہمدرد ایسے ہوتے ہیں خیر خواہ؟ ساری دنیا میں آپ کو صرف لال خان ہی ملا تھا۔ وہ مردوں کا مسئلہ حل کرتے ہوئے آپ کو دھیان تک نہ آیا کہ ایک عورت کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے"۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ کہہ کر [illegible]"۔

"اچھا؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

عارف ایک لمحے کو خاموش ہو کر رہ گیا۔

"میرا خیال تھا وہ دل کا بہت اچھا ہے اور اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی ایک عورت تمنا کرتی ہے"۔ اس نے خاصے شرمندہ انداز میں وضاحت کی۔

"عارف بھائی میں ایک ہی دل کا اچھا ملا تھا! پاگل نہیں ہوں میں جو آپ کی باتوں میں بہل جاؤں گی۔ میرا ہر طرح کا نقصان صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے"۔ وہ غرائی۔

عارف کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"آپ مردوں کو پیچھے والے آپ کو زندہ انسانوں کی کیا سمجھ"۔ وہ پھر طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

"وہ مرد نہیں ہے بھابی!" عارف نے آہستگی سے نظریں اٹھائیں۔

"پھر بھی آپ کے بھی تو کسی کام کی نہیں۔ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ میری زندگی بھی خاک کر دی ہے آپ نے۔ اگر دل کی اہمیت نہیں ہے تو پھر آپ نے اپنے دل کی کیوں کی آج تک؟"

وہ بلبلاہٹ کرنے لگی۔

عارف دم بخود سا بیٹھا رہ گیا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ ہو کیا گیا ہے۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہم نے تو آج تک یوں سوچا ہی نہ تھا کہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردوں کی طرح بے جان ہوں گے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اور کیسے ہو گیا تھا۔

ہم سے کچھ تیرے مراسم ہی بڑے گہرے تھے
ورنہ صحراؤں میں رکتے نہیں بادل جاناں

پہلے میں اعتراف کرتا ہوں آپ سزا دیجئے"۔

اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں

بالو خاموش رہی۔

"کیا آپ نے لال خان سے علیحدگی کا پکا فیصلہ کر لیا ہے؟"

بالو نے چونک کر سر اٹھایا۔ خوشی کی لطیف سی لہر نے جسم کو چھوا۔

"فیصلہ؟ آ گئی ہوں اس کی عنایتوں کو لات مار کر۔"

"تو پھر چلئے میں آپ کو غلام محمد کے پاس واپس چھوڑ آؤں۔"

"علیحدہ ہو جانے کے بعد؟" بالو نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ۔۔۔ سوال کیا۔

"نہیں پھر باہر جا کر ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

بالو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"آپ کیلئے کوئی ایسا شخص ڈھونڈ کر لاؤں گا جو آپ کے خوابوں سے ہٹ کر نہ ہو جس کی عمر بھی کم ہو اور وہ آپ کو خوش بھی رکھ سکے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے بشرط زندگی۔"

بالو کا دل پوری قوت سے سمٹا پھر اسی قوت سے پھیلا۔

"شکریہ بہت بہت بڑی مہربانی آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں میں سونا چاہتی ہوں۔"

اس نے ترشی سے کہا اور پلنگ کی طرف بڑھ گئی۔

"شاید آپ کو پتا نہیں میں لال خان کے گھر سے نہیں اپنے باپ کے گھر سے آپ کے پاس آئی ہوں جانتے ہیں آپ یہاں
ہے۔"

اس نے بدلحاظ لہجے کے آگے پچھلے تمام پردے توڑ ڈالے۔

عارف چند لمحے مبہوت سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

"آگے کا کیا سوچا ہے؟" اس نے دم بخود سے لہجے میں سوال کیا۔

"آپ اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔" اس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔

"مگر اس طرح تو نہیں چلے گا۔" بالآخر اس نے کہا۔

بالو خاموش رہی۔ اس کی خاموشی جیسے کہہ رہی تھی "جائیے یہاں سے۔"

"آپ یہاں اس طرح کیسے رہیں گی؟" وہ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"رہ لوں گی۔ میری اور بدری کے دوسرے آپ ہیں۔ اب تو جو سوچنا ہے آپ کو سوچنا ہے۔" اس نے ترشی سے کہا۔

"آپ جانتی ہیں میرا دل کیا ہے؟ میرے دل میں کیا ہے؟" وہ شکستہ لہجے میں گویا ہوا۔

"جانتی ہوں کوئی کلثوم آباد ہے اس دل میں جس نے آپ کو کبھی کچھ نہیں دیا اور نہ دے سکتی ہے جہنم میں جائے وہ۔۔۔"

"۔۔۔ بالو جل کر بولی۔"

"خدا کرے کوئی تجھ وہ نکلے آپ کے دل سے۔"

کب تلک ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں ہے

وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

"خاک ہو جائے ہمراز۔۔۔ جو میرے سینے کی چیز بھی کھوس دوں جیسے مجھی ہے۔"

وہ آنکھوں پر بازو رکھے بڑبڑانے لگی۔

وہ ابھی شام کے سامنے تھے جب جوا نے دروازے پر دستک دی۔

"ہوں کون ہے؟ آ جاؤ۔" ماہین نے کروٹ بدل کر سرہانہ اٹھایا اور کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔

جوا نے کمرے میں داخل ہو کر بتیاں جلا دیں۔

ماہین اسے دیکھ کر چونک پڑی۔

"جوا۔۔۔ تم؟"

"جی میں، السلام علیکم۔" وہ گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"پاپا جی پھر چلے گئے؟" اس کی دھیمی آواز کمرے میں گونجی۔

"ہاں چلے گئے۔" اس کے انداز سے اداسی جھلکنے لگی۔

"آپ نہیں گئیں؟" اس نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

"نہیں۔" وہ اتنا کہہ کر اپنی انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

"کیوں؟" وہاں سے فوراً سوال آیا۔

"بس ایسے ہی۔" اس نے نظریں چرا لیں۔

"اتنا اداس ہو گیا۔ سب پر کوئی اثر نہیں ہوا؟" جوا نے جیسے دکھ سے کہا۔

ماہین کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"ویسے تو انہیں شاید کسی کی پروا نہیں ہے مگر آپ کا بھی کچھ دل بنتا ہے۔"

اس نے گویا ماہین پر تنقید کی تھی۔

"بدگمان ہونے میں جلدی نہیں کرتے جوا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"نظر آنے والی حقیقت کو بدگمانی کہنا سب سے بڑی خود فریبی ہے خالہ۔" جوا نے بہت اکھڑے انداز میں کہا۔

"آپ تو دادی کے بہت قریب ہو کر اس کو سمجھ سکتی تھیں۔" جوا نے سارا دن اس پر ڈال دیا۔

ماہین نے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ بلیک پینٹ اور سکن کلر کی شرٹ میں ملبوس وہ بہت شستہ سا نظر آیا۔ اس نے

نظریں چرالیں۔

"پوچھا تھا"۔ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"صرف پوچھا تھا محسوس کرنے کی ذمہ داری کیوں نہیں لی"۔ اس نے فوراً کہا۔

"وعدہ کیا تھا مگر اسے شاید اعتبار نہیں ہے"۔ اس نے دکھ سے کہا۔

"اعتبار دلانے جاتے ہیں ویسے مسئلہ کیا تھا؟" اس نے جیسے چونک کر سوال کیا تھا۔

"بہت الجھا ہوا"۔ ماہین کے منہ سے بہت بے ساختہ نکلا تھا۔

"جواد چونک پڑا"۔ "وہ کیا؟"

"بتا نہیں سکتی۔ بس اس سے ہمدردی نہیں دشمنی ہوگی"۔ اس نے بہت واضح معذرت کی۔

"کیا یہ مسئلہ صرف آپ کے علم میں ہے یا چاچی بھی باخبر ہیں؟" جواد نے گہری سانس لی۔

"نہیں صرف مجھے پتا ہے اور گھر میں کسی کو نہیں پتا"۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا جاسکتا۔ میں اس کا سگا بھائی ہوں"۔ جواد الجھ رہا تھا۔

"اسی لئے تو نہیں بتایا جاسکتا"۔ ماہین نے برجستہ کہا۔

"کسی کو پسند کرتی ہے؟" جواد سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بات کی گہرائی تک پہنچا۔

ماہین کا دل اچھل کر حلق میں آگیا (یہ جواد بہت مجبور ہے)

وہ کچھ نہیں بولی خاموش رہی۔

"کیا اسی کے ساتھ گئی ہے؟" جواد کا لہجہ نہایت شکستہ تھا۔

"نہیں نہیں جواد ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔ وہ تیزی سے بولی۔

"خدا کی قسم اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے"۔

"کون ہے وہ؟" جواد نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا

ماہین جواب میں خاموش رہی۔

"آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟" وہ الجھ کر کہہ رہا تھا۔

"دے نہیں سکتی"۔ وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

"کسی کا وعدہ ہے آپ پر؟" جواد نے قدرے ناراضگی سے دریافت کیا۔

"میرے ضمیر کو گھر میں کسی بھی قسم کی بدامنی کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاہتی"۔ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"آپ جانتی ہیں خالہ کے گھر میں حویلی میں اپنے کزنز کے درمیان کس طرح ہوگیا ہوں جیسے میں کوئی مجرم ہوں بہت بڑا گناہگار"۔ وہ دکھ سے بوجھل لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ تمہاری ذاتی فیلنگز ہیں جواد وہ صرف تمہاری بہن ہی نہیں ہے بلکہ حویلی کے ہر فرد سے ہی اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ ہے"

ماہین نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

"جی چاہتا ہے وہ سامنے آجائے تو اسے شوٹ کردوں۔ بیانے تو اپنی حماقت اور ضد کو ہر جان اس طرح دیا کہ وہ ادی بن گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صرف جاگیرداری کو نہیں کرتے۔ آفیسر کو بھی بیچا ہوں۔ لوگ ان کے آگے پیچھے پھرتے ہیں اور قدردانی ہوتی ہے مگر بیوقوفی تو میرے حساب سے بڑا نقصان کا سودا کرکے گئی ہے"۔

اس نے بہت طنز سے انداز میں کہا۔

"یہی دل چھوٹا نہیں کرو جواد آجائے گی گئی کہاں ہوگی یہیں۔ ادھر ادھر بس اپنی ناراضگی کا اظہار کررہی ہے"۔ ماہین نے تسلی دی۔

"اسے کوئی ضرورت بھی نہیں آنے کی اگر گئی تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا"۔

"ارے جواد تم ایم کینیڈا بنے ہو کیا جاگیرداروں کی طرح کیسی بات کررہے ہو"۔

ماہین نے صبر کی تلقین کی۔

"یہ کیسی نہیں ہیں خالہ میں اسے شوٹ کردوں گا۔ آئی عیش وعشرت کی زندگی کے بعد اسے اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا کمی تھی اسے یہاں سب سے بڑھ کر اسے عزت دار باپ والا دیا میں سمجھتے تھے تھوڑی "کمی" اگر عزت نہ ملے تو سب سے بڑی "کمی" ہوتی ہے"۔

اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں جواب دیا۔

"تمہاری بات سنت پر سست درست ہے مگر دنیا میں ہر طرح کے امکانات موجود رہتے ہیں اس لئے تحمل رکھ کر فیصلہ کن انداز اپنانا چاہیے"۔

"میں نہیں مانتا یہ ٹوٹک' عورت گھٹوتی ہے' عیش میں ہے تو بس پھرانے اور کچھ چاہنے کیلئے اتنا کر رہی اتنا شدید نہیں ہونا چاہیے"۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر وہ مل جائے تو اسے حویلی میں نہیں آنا چاہیے ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا"۔

وہ تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ کھینچتے ہوئے کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھول کر باہر چلا گیا۔

ماہین دم بخود سی بیٹھی رہ گئی۔ ان جاگیرداروں سے کچھ بعید نہیں۔ اسے خوف سا محسوس ہوا۔ یہ جواد سے دلاور علی خان سے بھی آگے جا رہا ہے۔

جانے کتنی دیر وہ گہری سوچوں کے درمیان گھری رہی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی تھی۔

"ہوں"۔ اس نے بڑے بیزار سے انداز میں آنے والے کو اجازت دی تھی۔

دروازہ کھول کر آنے والی گلو تھی۔

"بی بی! آپ کو بڑے خان بلا رہے ہیں"۔ اس نے انگلیوں میں آنچل پھنسا کر مروڑتے ہوئے خاصا مؤدبانہ کہا۔

گہرا اوون شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ ماہین کو تو پہلے سے کپڑوں میں سے "اصولی" پکار
"بابا صاحب! چلو آ رہی ہوں میں"۔ اس نے قدرے فکرمندی سے کہا۔
"پتہ نہیں کیوں بلا رہے ہیں؟ اب کیا مسئلہ ہو گیا؟"
کلثوم واپس چلی گئی۔ وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے خیال سے باتھ روم میں گھس گئی۔ باتھ روم سے باہر آ کر اس نے جلدی جلدی برش چلایا۔ ذہن مسلسل کچھ سوچ رہا تھا۔
پھر اچھی طرح سر پر دوپٹا جما کر باہر آ گئی۔ اور خاصی تیز چلتی ہوئی بابا صاحب کے بیڈ روم کی طرف آئی اور آہستگی سے دستک دی۔
"آ جاؤ"۔ ان کی بارعب آواز کسی قسم کے تاثر سے عاری تھی۔
وہ اندر چلی آئی۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھے۔ اشارے سے سامنے بیٹھنے کو کہا۔
"نہیں۔ وہ آج صبح ہری پور چلے گئے۔ بہرحال تم میرا نام لے کر کہہ دینا کہ میں نے بھیجا ہے۔ اپنے وقت پر ہی وہ جاتا ہی چھٹا ہے۔ تم بھی اس بات کا خیال رکھتے ہوئے بات کرنا۔ لیکن انہیں گھبرانے کی بات نہیں۔ کام تمہارا ہو جائے گا۔ انشاءاللہ۔ اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔ ہاں ہاں۔ اوکے"۔ انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔
"دلہن! یہ یاور کیا بہت جلدی میں گئے ہیں۔ ہمیں تو وہ بتا کر بھی نہیں گیا"۔ وہ خاصے حیران ہو رہے تھے۔
"شاید"۔ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔
"کیوں تم سے کچھ نہیں کہا؟" انہیں بہت اچنبھا ہوا۔
"نہیں مجھ سے انہوں نے کوئی بات نہیں کی"۔ اس نے سچ سچ کہا۔
"پھر تو کوئی ایمرجنسی ہی ہو گی۔ ملک کے حالات بھی تو ایسے ہی چل رہے ہیں آج کل"۔
ماہین کے پاس ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔
"تم ساتھ نہیں گئیں، ہاں مگر تم کیسے جا سکتی تھیں۔ گھر میں تو صف ماتم بچھی ہے"۔ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
(اللہ نہ کرے) ماہین دہل کر رہ گئی۔
"ہونہہ! اہتمام بھی خود کرتے ہیں اور ماتم بھی۔
"یاور کس قدر پریشان رہے ہوں گے رات بھر۔ کاش یہ لڑکی پیدا ہوتے ہی مر جاتی"۔
انہوں نے انتہائی دکھ سے کہا۔
ماہین بس ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔
"اللہ دعا کرتے ہیں مرتے دم تک ہمیں اس کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہو"۔ وہ بہت نڈھال نظر آنے لگے۔
(یہ بددعائیں سنانے کو بلایا ہے مجھے؟) اس کی جان جل کر رہ گئی۔
"دلہن"۔ وہ سوچتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

"جی"۔ اسے بادل نخواستہ جواب دینا پڑا۔
"یہ۔ اس لڑکی کا معاملہ کیا ہے؟ کیا تم سے کہا تھا اس نے؟" انہوں نے بغور ماہین کا چہرہ دیکھا۔
"جی مجھ سے تو اس نے کچھ زیادہ بات نہیں کی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ وسیم سے شادی پر رضامند نہیں تھی"۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا۔
"کیوں وہ انوکھی روح ہے حویلی میں؟ ہمارے ہاں لڑکیوں کو کبھی اتنی آزادی نہیں دی گئی ہے۔ یہ فیصلے کرتے ہیں وہ باقاعدہ قبول کرتی رہی ہیں"۔
وہ ہمیں سے گویا ہوئے۔
(ہونہہ! "خوشی" ان کے پاس کیمرہ ہے کوئی جو دوسروں کی ٹھیک ٹھیک تصویر رہتا ہے۔ قربان جائیے اس احتساب کے بھی غیر ضروری احتساب کے)
"جس کے ساتھ چاہتی تھی کیا اس کے ساتھ گئی ہے؟" ان کی آواز بے حد پست تھی۔
"خدانخواستہ ایسی کوئی بات نہیں"۔ اس نے تیزی سے کہا۔
"یہ بات تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟" انہوں نے مشتبہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
"اس لئے کہ میں نے اسے ہر زاویے سے ٹٹولا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بس وہ وسیم سے شادی پر رضامند نہیں تھی"۔
اس نے اپنے یقین کو دلیل سے ثابت کیا۔
"مگر وسیم میں کیا برائی ہے؟ شکل و صورت کا اچھا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ پیسہ بہت ہے۔ دنیا گھومتا ہے۔ دنیا کی ہر نعمت اس کے پاس ہے"۔
وہ سر سے پاؤں تک حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔
"جس طرح یہ گھر بڑی بہت پیاری ہے وہ بھی اسی طرح اگر بڑی بہت ہوتا ہے"۔
اس بار بڑی سادہ اور معصوم سی دلیل آئی تھی۔ ماہین بے ساختہ مسکرا دی تھی۔
"بابا صاحب! بعض باتیں دل کو منظور نہیں ہوتیں اور سب کچھ بے کار لگتا ہے اور جب ہر طرح کا عیش و آرام ہو تو بس دل ہی کی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ ساری چیزیں تو بغیر خواہش اور جستجو کے پاس ہی ہوتی ہیں اس لئے دل اس طرف بڑھتا ہے جہاں ہونے اور نہ ہونے کا خوف ہوتا ہے اور ایسے مقام پر انسان کامیاب ہونے کا شدید خواہش مند ہوتا ہے۔ دل و ذہن فطری مصروفیت مانگتے ہیں کہ مصروفیت ہی ان کی زندگی ہے اور پھر حاصل چیزوں میں وہ کشش نہیں ہوتی جو لا حاصل چیز میں ہوتی ہے۔ شاید اس نے کچھ اور خواب سجا رکھے ہوں"۔
ماہین نے نہایت سنبھل سنبھل کر جواب دینے کی کوشش کی۔
"لیکن ہم مانتے ہیں تم بہت پڑھی ہوئی ہو مگر بیٹی عورت بس عورت بنے ہوئے کی چیز۔ گھر کی زینت اسے تحفظ اور عزت سے زیادہ اور کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے"۔ ان کا لہجہ اس بار بے حد شفیق تھا۔

"گستاخی معاف بابا صاحب! عورت ایک وجود، ایک زندہ اور اہتمام سے تخلیق کیا ہوا وجود ہے۔ ہر کتاب کا کوئی نہ کوئی موضوع ہوتا ہے۔ ہماری پاکیزہ الہامی کتاب قرآن پاک کا موضوع "انسان" ہے۔ نہ کہ "مرد" اور انسان میں مرد و عورت دونوں شامل ہوتے ہیں اور اس کتاب میں تو انسان کے حقوق پر بحث ہے۔ تو اس میں ایسی حدود ہیں یا میرے خیال میں ہر انسان کے مطابق ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا خیال رکھا جائے تو کبھی کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہو۔"

"بیٹے! سمجھو تو کمال ذمہ داری سے ان کی بھلائی کیلئے اقدامات کرے بھی تو ایک طرح سے شرعی، اسلامی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔"

انہوں نے اس کی بات نہایت تحمل سے کاٹ کر بڑی بھاری دلیل دی کہ ایک لمحے کو تو ماہین بھی چکرا گئی۔

"جی! مگر جب بیٹے! سمجھو انسانی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ اطراف کے لوگوں کو اس کی بات ماننا پڑتی ہے۔ اس کے ذاتی ذہن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور انسان کے اپنے بنائے ہوئے بے بنیاد اصولوں کی روشنی میں تو کسی انسان کی پوری زندگی کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو استحصال کا خوبصورت چہرہ ہے۔ جس کے باطن میں صرف بدصورتی ہے۔ رزق کی زیادتی اور کمی تو اللہ کا ذاتی کام ہے۔ اس بنیاد پر تو فیصلے یوں بھی کمزور ثابت ہوتے ہیں۔"

ماہین نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"کیا وہ کوئی غریب لڑکا ہے؟ مگر تم تو کہہ رہی تھیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بری طرح چونک پڑے تھے۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" ماہین بوکھلا گئی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ ان اصولوں کی بنیاد پر جہاں انسان کا استحصال ہوتا ہے کیونکہ کسی طرح کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں۔" اس نے سنبھل کر بات بنائی۔

"تم سب بھی بڑی محنت کی کمائی ہوتی ہے بیٹی۔" وہ دھیرے دھیرے سے گویا ہوئے۔ "پتہ نہیں یہ کیا بات ہے جب انسان کسی عظیم ترین پریشانی سے گزر جاتا ہے تو اس کی برداشت بھی عظیم ہو جاتی ہے۔"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ مگر ہر شے ایک آغاز سے گزر کر آگے بڑھتی ہے۔ اگر کسی شاخ کی پیوند کاری سے زیادہ خوبصورت و خوشنما پھول آنے کی قوی امید ہو تو پیوند کاری معیوب نہیں ہو سکتی۔"

وہ جھلا بابا ماننے والی تھی۔ اور کچھ یہ بھی ہے کہ جب خلوص سو فیصد ہو تو خود بخود بات پیدا ہوتی رہتی ہے۔

"لیکن جب ایسی کوئی بات ہی نہیں تو اس طرح کی بات کیا معنی؟" وہ پھر الجھے۔

"ممکن ہے وہاں اس طرح کی کوئی بات ہو اور وہ کسی وجہ سے ہم سے نہ کہہ سکتی ہو۔ ہمیں ہر طرح کا امکان ذہن میں رکھنا چاہیے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"جو بات اس نے ہم تک پہنچائی نہیں اس باپ کے پیچھے اس نے خاندان کو ذلیل کرنے کیلئے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا۔ ہم اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے۔" ان کے لب و لہجے سے جلال چھلکنے لگا۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ۔" بابا صاحب اسی انداز میں گویا ہوئے۔

دروازہ کھول کر ہاری اندر آیا تھا۔

ماہین کی نظروں سے اس کی نظر ایک لمحے کو ملی تھی۔ وہ دوبارہ نظر نیچی کر گیا تھا۔

"ہم اس کا نام پتا ابھی جانے کہیں سے تو کچھ سے پتے ہیں۔ ذہن تم تک پہنچے تو ہم اسے شوٹ کر دیں گے۔ یا پھر اسے حویلی کے پیچھے گاڑ دیں گے۔"

وہ جلال انداز میں گویا ہوئے۔

ماہین نے چونک کر ان کی صورت دیکھی۔ اس کی نظروں میں اس تاریک رات کا منظر گھوم گیا۔ ایک بے کس لڑکی کی ... میں بے بس عورت آج تک اس کے ذہن سے محو نہیں ہو سکی تھی۔ زرینہ کا ہیولہ تصور کر کے جھرجھری آ گئی۔

کیا وہ بھی بے چاری کوئی ایسی ہی "زرینہ" ہے۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔

"وکیل آیا ہوا ہے۔ کیا آپ کل کچہری چل سکیں گے؟" ہاری کی سنجیدہ اور مدھم آواز نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔

"نہیں فی الحال ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ ہمارا ذہن بالکل مفلوج ہے۔ تم اسے فارغ کرو۔ کہہ دینا ہم خود فون کر کے بتا دیں گے۔ دعا کرو۔ ہم جلد اس کی آخری رسم ادا کریں۔ تاکہ ہمارا دماغ معمولات میں مصروف ہو سکے۔"

ماہین نے نہایت دکھ سے ہاری کی سمت دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی بالکل پھیکا پڑ چکا تھا۔

"اگر غیرت کی بات ہوتی تو ہم خود زہر کھا لیتے۔" وہ بڑبڑائے۔

"ماہین!"

"جی بابا صاحب!"

"کوئی کام تو نہیں کر رہی تھیں؟" ان کی آواز سے بہت اضمحلال ظاہر تھا۔

"نہیں۔۔۔ خیریت؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس بیٹھی رہو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کیا کریں۔"

وہ بے بسی سے گویا ہوئے۔

ماہین کا دل مچل کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے میں آپ کے پاس بیٹھی ہوں۔ ویسے بھی یہاں مجھے کام ہی کیا ہے سوائے کتابیں پڑھنے کے۔" وہ زبردستی مسکرائی تھی۔

روشنی تو نہیں وہ بہت محسوس کر رہی تھی گویا یہ معمول کے حالات ہوں۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد تک وہ کمرے میں موجود ہم کو رد کئے رہی تھی۔

آج کھانا بھی بڑا مزیدار ہر قسم کا آیا تھا۔ چکن بریانی، کوفتے، مسالہ دار قیمہ، گلاب جامن۔ بھئی... رات کو کھانا کھانے کی وجہ

سے نیند بھی بڑی زبردست آئی تھی۔

گہری نیند کا ٹوٹنا اس وقت آسان نہ تھا مگر دروازے پر دستک یوں ہو رہی تھی گویا کوئی دروازہ اکھاڑنے کے درپے ہے۔ اس نے کلاک کی سمت دیکھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

"کون؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چادر اوڑھنے کی نیت سے اٹھائی۔

"دروازہ کھولو روشانے!" ایک بھاری مردانہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔

آواز مانوس سی محسوس ہوئی مگر ذہن فوراً کاکا جان کی سمت گیا۔

"وہ اٹھ کر دروازے کے نزدیک آئی۔

"کون — کاکا جان؟" اس نے یقین کر لینا مناسب سمجھا۔

"ہوں!" وہاں سے بڑا سرد جواب آیا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ بلیو جینز اور بلیو ویسٹ میں ملبوس اپنی بارعب مونچھوں کے ہمراہ سامنے تیمور علی خان کھڑے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے نظریں جھکا کر چادر سنبھالی۔

"وعلیکم السلام۔ کس کے ساتھ آئی ہو؟" انتہائی خشک لہجہ تھا۔ ساتھ ہی اسے اشارہ کیا کہ دروازہ بند کر دے۔ اس نے فوراً تعمیل کی۔

"کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ ڈرائیور شیر گل کے ساتھ بس۔"

"کس لیے — میرا مطلب ہے کس وجہ سے یہاں آئی ہو؟" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔ روشی خاموش رہی۔ تیمور علی خان ایک کرسی پر دراز ہو گئے اور اسے بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"حویلی میں پتا ہے کہ تم یہاں آئی ہو؟" وہ بہت الجھ رہے تھے۔

"نہیں" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"کسی کو بھی نہیں؟" تیمور علی خان بری طرح چونک پڑے تھے۔

"جی نہیں" اس نے پھر واضح جواب دیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" ان کی حیرت بجا تھی۔

"اس لیے کہ — میں بس یہی کر سکتی تھی" اس کی آواز بھرا گئی۔

"مسئلہ کیا ہے؟" وہ بغور اس کی شکل دیکھنے لگے۔

"وہ میری شادی کر رہے ہیں" اس نے بھی سیدھی بات کرنا مناسب سمجھا۔

"تو پھر کیا ہوا؟ لڑکیوں کی شادی تو کرنا ہی ہوتی ہے" ان کا استعجاب سوا ہو گیا۔

"مگر میں شادی کرنا نہیں چاہتی" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"شادی کرنا نہیں چاہتی تو کیا چاہتی ہو؟" ان کو روشی کی بات انتہائی احمقانہ لگی۔ روشی خاموش رہی۔

"مگر تم بی جان سے ڈسکس کر سکتی تھیں۔ ان سے زیادہ بہتر کوئی اور تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔"

انہوں نے جس انداز میں بابر علی خان کا ذکر کیا۔ روشی کو یوں محسوس ہوا جیسے بابا صاحب کی وجہ سے یہاں تھیں اور اس کے سراپا کو آگ لگ گئی۔ جانے کیوں اسے بے اختیار رونا آ گیا تھا۔

"بابا صاحب کا فیصلہ ہے۔ وہ کیا کر سکتے ہیں؟" اچانک وہ گویا ہوئی۔ جانے کیوں اسے آج تیمور علی خان سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"تم نے یہ جو حماقت کی ہے اندازہ ہے کہ پیچھے حویلی میں کیا قیامت برپا ہو گی۔ تمہارا اب تک کیا جا چکا ہو گا اور پھر میں ابھی حویلی فون کر کے مطلع کرتا ہوں کہ تم یہاں ہو" وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

روشی بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"کاکا جان پلیز مت کیجیے۔ آپ میری یہ ساری بھاگ دوڑ بیکار نہ کیجیے" اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

"کون ہے وہ؟" وہ جاتے جاتے رک گئے تھے اور ایک دم ہی متغیر ہوا تھا۔

"کون؟" روشی بالکل نہیں سمجھی۔

"وہی جس نے تمہیں اتنا بہکا دیا ہے" وہ ہنوز اس سے رخ موڑے کھڑے تھے۔

روشی کی نظریں جھک کر رہ گئیں۔

"کون ہے وہ مردود۔ جس نے تمہیں اتنی جرأت بخش دی کہ تم نے حویلی کی عزت خاک میں ملانے میں ذرا دیر نہ لگائی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں کاکا جان" اس کے حلق میں آنسو اٹکنے لگے۔

"بے وقوف مت بناؤ۔ سیدھے سیدھے بتاؤ کون ہے وہ؟" وہ برہم ہوئے۔

"آپ میرا یقین کیجیے کاکا جان ایسا نہیں۔"

"دیکھو روشانے! زیادہ ڈرامہ بازی کر کے بہکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گھاس نہیں کھاتے ہم۔ ایک عورت اتنی جرأت صرف تب ہی کر سکتی ہے جب کوئی واضح سہارا اس کے پاس ہوتا ہے۔ ورنہ لڑکیاں بڑی خوشی خوشی شادی کر کے چلی جاتی ہیں اور والدین کی پسند کو اپنی قسمت سمجھ لیتی ہیں۔"

"کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے؟" وہ اپنی بات پر مستقل تھے۔

"کاکا جان! آپ میری بات۔"

"شٹ اپ روشانے۔ اس کا نام اور ٹھکانہ بتاؤ" وہ برہم ہو گئے۔

روشی خاموش کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

"ہم سے ہیلپ کیوں مانگ رہی ہو جو تم کیا سمجھتی ہو کہ تم بے وقوف بناؤ گی اور ہم بن جائیں گے۔ ہماری عمر کا زیادہ حصہ

انگریزوں کے ساتھ گزرا ہے۔ جو زندگی جوک سے گزارتے ہیں۔ ہم تمہاری باتوں سے بہلنے والے نہیں۔ صاف صاف بات کرو۔ عورت بہت بزدل ہوتی ہے اس کے کچھ مخصوص خواب ہی تخت و دولت والی کیفیت تک لے جا سکتے ہیں۔ کون ہے وہ خواب دکھانے والا؟" وہ بہت گرم لہجے میں ہم کلام تھے۔

"ہماری بات کا جواب دو ورنہ اسی وقت شیر گل کے ساتھ بڑی حویلی روانہ ہو جاؤ۔"

وہ جو تیمور علی خان کی پراعتماد گفتگو پر ہی حیران ہو رہی تھی۔ آخری جملے پر چونک پڑی۔

"نہیں نہیں پلیز۔ کاکا جان۔ اس سے بہتر ہے، آپ خود ہی مجھے یہاں شوٹ کر دیں۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"تو پھر بتاؤ۔ تم ہمارے بوڑھے باپ کو سلو پوائزن دے کر آئی ہو۔ ہم اس بات میں انٹرسٹڈ ہوتے تو اس لئے ہوتے کہ ہمارا باپ تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہے۔"

"کاکا جان... پلیز مجھے کچھ وقت دیجئے۔ میں آپ کو چھوٹی بڑی ہر بات بتا دوں گی۔ پلیز۔"

"مگر ہمارے پاس وقت نہیں۔ ہمیں بابا صاحب کی فکر پڑ گئی ہے" وہ اسی برہم انداز میں گویا ہوئے۔ روشی سوچ رہی۔

تیمور علی خان دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔

روشی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔

وسیع لان میں سناٹا طاری تھا۔ صرف پورچ کی لائٹس آن تھیں۔ وہ ٹہلنے لگی۔

کیا وہ کاکا جان کو سب کچھ بتا دے؟

مگر ان کو بتانے کا مطلب ہے جیسے سب کچھ بابا صاحب کو بتا دے۔ کوئی فرضی کہانی گھڑے۔ کوئی ایسی کہانی جس میں اس کی بچت ہو جائے۔

وہ ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی۔

یاور علی خان نے اس کے اعصاب ہلا کر رکھ دیئے تھے۔ حالانکہ پچھلی رات بھی وہ سو نہیں سکی تھی۔ اور آج بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر کب سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ ماریہ بھی سو چکی ہوگی کہ اس سے باتیں کر لیتی۔ وہ بے چین ہو کر اٹھی اور چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ ماریہ کی سمت جانے کے خیال سے راہداری میں آئی تھی۔ مگر راہداری کے آخری سرے پر کچن سے تیز روشنی پر چونک پڑی۔ اتنی رات کو کچن میں کوئی کیا کر رہا ہے۔ شاید کوئی جاگ رہا ہو اور ملازم اس کے لئے چائے یا کافی بنا رہی ہو۔ وہ بھی وقت گزاری کے خیال سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

کچن کا دروازہ وا تھا۔ اس نے سر اندر کر کے جھانکا اور بری طرح چونک پڑی۔ سرسوتی بڑی ترنگ میں لہک لہک کر ادھر سے ادھر آ جا رہی تھی۔ دھیان دینے پر پتا چلا۔ ایک ٹرے میں جانے کیا کیا رکھ رہی تھی۔ وہ حیران اور کشاں کشاں اندر آ گئی۔ ٹرے میں پیسٹری، شامی کباب، تلے ہوئے بادام، کوکا کولا کی لیٹر بوتل تھی۔

"جی... یہ رات گئے کس کی تواضع ہو رہی ہے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

سرسوتی اپنی جگہ پر یوں اچھلی جیسے بچھو کو کرنٹ لگا ہو۔

"آ... آ... آپ... بی بی... ایسے ویلے... سوئے نہیں تساں۔"

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل پڑی تھیں۔

"میری بات کا جواب دو۔ کون مہمان آیا ہے؟" ماہین کی حیرت بدستور تھی۔

"کوئی جی... چھوٹا سا... کوئی نہیں... وہ... وہ۔"

وہ ہکلانے لگی۔

"پھر کس کی خاطر مدارت ہو رہی ہے؟" اس کے خوفزدہ ہونے پر ماہین یہ سمجھ گئی تھی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس لئے اس مرتبہ اس کا انداز تحکمانہ ہو گیا۔

"کس کیلئے لے جا رہی ہو؟"

"سرسوتی کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔

"کیا چوری ہوں میں... یہ چپکے کس کی ضیافت ہو رہی ہے؟" اس کا انداز فطری طور پر مالکانہ ہو گیا تھا۔

"سرسوتی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"کہو اب تو... سچ بتانے میں تمہاری جیب سے کیا جا رہا ہے؟" وہ جھلا گئی۔

"وہ بی جی... چھوٹی بی بی کی سہیلی اے اس۔"

"کون چھوٹی؟" ماہین الجھی۔

"وہ گھروں... آئی ہوئی ہے" وہ ہکلائی۔

"کون آتی ہے حویلی؟" ماہین نے استفسار کیا۔

سرسوتی نے گلے میں گردن ہلائی۔ "نہیں جی... وہ بی بی اے۔"

"وہ بی بی؟" ماہین حیران ہوئی۔ "کس کی وہ بی بی؟" اس کے حساب سے تو یہاں صرف ایک ہی وہ بی بی (روشی) تھی اور وہ سو رہی۔"

"ٹھکری صاحب دی وہ بی بی"۔ سرسوتی نے کانپتے ہوئے بتایا۔

"ٹھکری؟ کون ٹھکری؟" وہ پھر الجھ گئی۔ "اچھا تم مجھے لے کر چلو اس کے پاس" اس نے حکم دیا۔

"آپ... آپ نوں؟" وہ گھبرا گئی۔

"کیوں... وہاں پار کر کے جانا پڑتا ہے کیا؟" وہ چڑ گئی۔ "جلدی چلو۔ میں بھی دیکھوں وہ بی بی جو رات کے اندھیرے میں چپکے ملاقاتیں ہیں۔ جلدی چلو... یہ بھی اٹھاؤ۔"

اس نے ٹرے کی سمت اشارہ کیا۔ سرسوتی ہچکچائی۔

"میں کہہ رہی ہوں اسے اٹھاؤ۔ جلدی کرو۔" وہ درشتی سے بولی۔

سرسوتی نے دسترخوان اس پر ڈالا اور خوفزدہ انداز میں اسے اٹھائی اور ماہین کی سمت دیکھتے ہوئے باہر کی طرف بڑھی۔ وہ آگے آگے اور ماہین پیچھے پیچھے چل پڑی۔

ایک عظیم الشان دروازہ پار کر کے جب وسیع و عریض احاطے میں انہوں نے قدم رکھے تو یوں محسوس ہوا جیسے باہر کسی میدان میں نکل آئی ہوں۔

ماہین کا حیرت سے برا حال تھا کہ یہ سرسوتی کہاں جا رہی ہے؟

اس پر مستزاد کتوں کی بھوں بھوں۔ ماہین کو ان کے بھونکنے سے نہایت خوف محسوس ہوا۔ جبکہ سرسوتی بہت آرام سے چلی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر سرسوتی کے برابر پہنچ گئی۔ کتوں نے ایک آفت اٹھا رکھی تھی۔ احاطہ پار کر کے وہ ایک دیو ہیکل دروازے سے گزریں۔ اندر قدم رکھتے ہوئے ماحول میں بلا کی پراسراریت محسوس ہوئی۔ ایک عجیب وحشت۔ بھاری بھاری بند دروازے۔ جابجا تاریکی۔ اور ایک ہولناک خاموشی۔ ماہین قدرے خوفزدہ اور بہت زیادہ حیران تھی۔

"سرسوتی کی راہداری میں داخل ہوئی جہاں دور تک صرف ایک بلب روشنی پھیلا رہا تھا۔ سرسوتی ایک دروازے کے سامنے جا کر رک گئی اور پلٹ کر ماہین کی طرف دیکھا۔

ماہین نے اشارے سے اسے اندر چلنے کو کہا۔

سرسوتی ایک راہداری میں داخل ہوئی جہاں دور تک صرف ایک بلب روشنی پھیلا رہا تھا۔ سرسوتی ایک دروازے کے سامنے جا کر رک گئی اور پلٹ کر ماہین کی طرف دیکھا۔

ماہین نے اشارے سے اسے اندر چلنے کو کہا۔

سرسوتی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے ماہین نے قدم بڑھائے۔

"توبہ ہے سرسوتی! اتنی دیر کر دی۔ بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔ رات کا کھانا ویسا کا ویسا واپس کر دیا تھا میں نے آج "بڑی بی" کو جلانے چڑانے کا زبردست موڈ ہو رہا تھا۔ ویسے ہی ڈراتی رہتی ہوں انہیں کہ ایک دن خودکشی کر لوں گی"

بات کے اختتام پر بےساختہ کھلکھلانے کی آواز آئی۔

ماہین حیران پریشان اندر داخل ہوئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر تو جیسے چکرا کر رہ گئی۔ سرخ ویلوٹ کے بھرے کمرے کے وسط میں ایک حسین و جمیل شوخ و شنگ سی لڑکی بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ادھیڑ عمر کی ایک اور خاتون تھی۔ جس کے کپڑے بوسیدہ و گرد آلود اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور ایک بھاری سی زنجیر کارپٹ پر پڑی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ذرا غور کیا تو پتا چلا زنجیر کا دوسرا سرا عورت کے پاؤں سے بندھا تھا۔ آناً فاناً اس کا ذہن اس رات تاریکی میں نظر آنے والی پابہ زنجیر عورت کی طرف گیا۔ حواس جیسے ایک دم سے گم ہو گئے تھے۔

"السلام علیکم!" جھومر بوکھلا گئی تھی۔ "آپ۔"

"یہ خاتون دیوانی ہیں۔" سرسوتی ڈرتے ہوئے سرگوشی سے گویا ہوئی۔

عطرت نے بری طرح چونک کر سر سے پاؤں تک ماہین کو دیکھا تھا۔ آنکھ وہ واقعی سرخ کرتی کے اعلیٰ اجالے کے وسط میں بھی خوبصورت تراشیدہ مجسمہ لگ رہی تھی۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں آویزاں لونگ اور وجود سے عطر کی مہک سی آ رہی تھی۔ جس نے کمرے میں اس کی موجودگی کی جھلک کو دبا رکھا تھا۔

جھومر بیٹھے سے کھڑی ہو گئی تھی۔ "آپ بیٹھیے نا"۔ اس نے کرسی پیش کی۔

"بڑی عزت بخشی آپ نے"۔ جھومر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

"جی"۔ ماہین جیسے کسی خیال سے چونک گئی۔

اس نے جھومر کو سر سے پاؤں تک دیکھا جس کے وجود سے جیسے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

"یہ عطرتی کون ہے؟" اس نے پہلا سوال کیا اور عطرت کی طرف دیکھنے لگی۔

"ارے آپ عطرتی کو نہیں پہچانتیں۔ کمال ہے۔ حویلی کے ان مہروں میں سے ایک ہیں۔ ولی عہدی کا شرف جن کو حاصل نہیں

جھومر نے نہایت غیر سنجیدگی سے سوال چٹکیوں میں اڑا دیا۔

"مگر میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی"۔ ماہین نے برملا اعتراف کیا۔

"بیگم عالم جناب کے نور نظر و چشم کی چہیتی"۔ وہ ہنس دی۔

"سمجھے"۔ ماہین کے منہ سے بےساختہ نکلا۔

"بالکل ٹھیک سمجھے۔ ہماری ساس انہیں جہیز میں لائی تھیں۔ ہمارے سسر نے انہیں رونمائی میں عطا کیا۔ اس لئے تو اس کیا جاتا ہے بالکل ٹھیک"۔ جھومر خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔

ماہین نے ایک نظر جھومر پر ڈالی۔ بڑی عجیب قسم کی لڑکی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر کمرے میں نظر دوڑائی۔

"کہاں ہیں عطرتی؟" اس کا تجسس بڑھ رہا تھا۔

"کسیلاتی ہاجس میں آرام فرما رہے ہیں۔ جس سے ہمیں تسلی ہو رہی ہے۔ ہماری قسمت ابھی بھی خراب نہیں۔ ویسے وہ بیچاری سی بے چارے ہیں۔ بس حویلی والے ہیں کہ قدرت سے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔ دراصل جہاں یہ بہت زیادہ خوش نصیبیاں بھی بہت ہوتی ہیں"۔ وہ کھلکھلائی۔

ماہین دم بخود سی بیٹھی رہ گئی۔ اسے تو یہ لڑکی بھی ابنارمل دکھائی دی۔

"کون ہے؟" اس نے اپنی حیران کن نظروں کا رخ عطرت کی سمت موڑا۔

"کن کی کہانی ابھی کی زبانی سنئیے گا"۔ جھومر پھر ہنسی۔

(توبہ کس قدر وحشی ہے یہ لڑکی۔ اگر اس قدر خوبصورت نہ ہوتی تو کتنی بری لگتی اس کی ہنسی)

"آپ ماہین بیگم کی چھوٹی بہن ہیں"۔ عطرت نے جھومر کا جملہ نظرانداز کر کے خاصے مودبانہ انداز میں اس سے سوال

کیا۔

"ہوں..... تم جاگتی ہو بخوکو؟" ماہین کے اندر جیسے طوفان برپا ہو گیا۔

"وہ حویلی کا روشن چراغ" عورت افسردگی سے مسکرائی۔

"تم کون ہو؟ تمہیں کیوں قید کیا ہوا ہے ان لوگوں نے؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔ آج تو وہ یہ تجسس کی گتھیاں سوچ حل رہا تھا۔

"نمک خوار ہوں..... ایک..... بس" وہ خاموش ہو گئی۔

"کیا یاد رکھا ہے کہ تم کون ہو۔ اور تمہیں یہاں قید کیا ہوا ہے" اس کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔

"میں کون ہوں یہ تو انہیں پتا ہے۔ اور یہاں قید ہوں یہ بھی انہیں پتا ہے" عورت نے اداسی سے کہا۔

ماہین کا دل دکھ سے جیسے پھٹنے لگا۔ وہ تو یادر علی خان کو حویلی میں سب سے مختلف سمجھتی رہی تھی۔

اتنی اہم سیٹ پر بیٹھنے والا اتنا بڑا قانون شکن۔

"تمہارا قصور کیا ہے؟" وہ خود پر قابو پا کر پوچھ رہی تھی۔

"ایک نہیں ہے" وہ آہستگی سے بولی۔

"پھر بھی" ماہین کا انداز اصرار کرنے کا تھا۔

"یہ لیجئے" جھومر نے خوبصورت گلاس میں اسے کوکا کولا مشروب پیش کیا۔

"شکریہ..... میرا موڈ نہیں ہے" اس نے اپنے مخصوص انداز میں معذرت کی۔

جھومر وہ گلاس خود لے کر وارڈ روب کے کنارے پر ٹک گئی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی" عورت کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"میرا اتنے دنوں کا دوستانہ۔ میرا مطلب ہے فرینڈ شپ ہے۔ مجھے نہیں بتایا آج تک۔ پھوپھو رونے لگی ہے۔ ویسے پوچھا بھی کیا۔ صاف ظلم کا شکار لگتی ہے" جھومر کی زبان پھر قینچی کی طرح چلی۔

"مجھے بات کرنے دو پلیز" اس نے بمشکل اپنے ناگواری کے تاثرات کنٹرول کئے۔ جھومر کانٹے سے شامی کباب کھانے میں مصروف ہو گئی۔

"ہاں..... بتاؤ ناں۔ تمہارا جرم کیا ہے۔ کس بات کی سزا مل رہی ہے تمہیں؟" وہ اس کے پاس بیٹھی زنجیر کو اپنے دل پر کوڑے کی طرح برستا محسوس کر رہی تھی۔ ایک انسان کے ساتھ اس طرح کا سلوک۔ اس کے تو اعصاب شل ہونے لگے تھے۔

"آپ کیا کریں گی؟ جبکہ یہ سزا میری خوشی میرا سکون بھی ہے" وہ بھرائی آواز میں گویا ہوئی۔

"پھر بھی"۔

"آپ اصرار نہ کریں۔ آپ کو بھی دکھ ہو گا۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے آپ کی۔ اللہ مبارک کرے یادر خان بہت اچھے

ہیں۔ یہ بہت گہرے ہیں۔ ان کے اندر کا پتا نہیں چلتا۔ اللہ بخشے ہماری بیگم صاحبہ آپ کی ساس کہا کرتی تھیں۔ نہ جینے دیتے ہیں رکھا۔ اپنے ہاتھوں اٹھایا گھر سے میں بھی نہیں سمجھ سکی۔ سارے لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ کرتے جن کو کام سن کر کانپتے تھے۔ حالانکہ کبھی زور سے بھی نہیں چیخے"۔

"بہت کچھ جانتی ہو یادر علی خان کے بارے میں۔ میری بہن کے ساتھ کیسے تھے؟"

ماہین نے نہایت ہچک کر سوال کیا تھا۔

عطیہ نے چونک کر ماہین کی صورت دیکھی۔

"بہت محبت کرتے تھے ان سے" اس کی آواز نہایت دھیمی تھی۔

"اور بابا صاحب؟" ماہین جانے کیا جاننا چاہ رہی تھی۔

"وہ اور اماں جی تو اپنے ہاتھوں پیار کراتے تھے انہیں۔ اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ حویلی کی عورتیں وہ تو ایسی گڑیا کی طرح تھی بی بی رانی تھیں کہ آنکھیں سیر نہیں ہوتی تھیں" وہ پھر خیالوں میں کھو گئی۔

"پھر کیا ہوا؟" ماہین نے پوچھا۔

"پھر..... پھر..... پھر کچھ بھی نہیں ہوا" وہ خیال سے چونک کر ایک دم چپ ہو گئی۔

"تم کس حساب میں سزا کاٹ رہی ہو۔ تمہاری باتوں سے تو میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں تم بہت مخلص اور سچی نمک خوار تھیں۔ پھر تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں ہوا؟" ماہین کو تجسس کمال کو پہنچا ہوا تھا۔

"اس کی یہ پتہ بھی" وہ پھر مظلوم نظر آئی۔

"میں کسی سے کہوں گی تو نہیں۔ اعتبار کرو میرا" ماہین نے دوسرا طریقہ آزمایا۔

"بات اعتبار کی نہیں ہے۔ دراصل کوئی فائدہ نہیں ہے"۔

"یہ نہیں بتائے گی۔ ہر طرح کوشش کر چکی ہوں"۔

جھومر منہ سے چیری کی کریم صاف کرتے ہوئے گفتگو میں شریک ہوئی۔

"کیا تم یہ بتانے کیلئے رہ گئی ہو" آخر اسی نصیحت تو وہ کیل گئی تھی۔

عطیہ خاموش رہی۔

"اس حویلی میں کون ہے جو اس سے بچا ہوا ہے؟ ابھی تو آپ نے اس طرف کا ایک ذرا سا دیکھا ہے۔ فرصت سے آئے گا اور بہت کچھ دکھاؤں گی"۔

جھومر ہاتھ دھونے کیلئے باتھ روم کی جا رہی تھی۔ رک کر بول اٹھی۔

"اوہ" ماہین کو جیسے چکر آ گیا۔ ابھی اس طرف اور بھی بہت کچھ ہے۔ جھومر کی خود اعتمادی بلکہ ڈھٹائی اسے بہت محسوس ہو رہی تھی۔

"تم بہت بے دھڑک بولتی ہو۔ ڈر نہیں لگتا؟" وہ واپس آئی تو ماہین کہے بنا نہ رہ سکی۔

"جب انسان بہت ہی بڑے نقصان سے گزر جاتا ہے تو اس کے سارے ارمان ختم ہو جاتے ہیں۔" وہ ... کہہ رہی تھی۔

"نقصان؟ کیا مطلب؟"

"آپ کیا سمجھیں گی۔ یاور چچا پانچ لاکھ کا مہر ادا کر لائے ہوں گے آپ کو۔ اور جس نے تین مرتبہ آپ سے پوچھا ہو گا یاور علی خان بن دلاور علی خان آپ کو منظور ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں آپ نے تینوں بار 'ہاں' کہا ہو گا۔ گو میری ساس کہتی ہیں۔ کوئی قاضی وحشی نہیں آیا تھا میرے پاس۔ سب ڈرا ہوا تھا۔ پاگلوں کے بھی نکاح ہوتے ہیں۔"

"پاگل؟" ماہین ڈر سی گئی۔

"نفسیاتی اسپتال میں لوگ ناک کی سرجری کرانے نہیں جاتے۔ معاف کیجئے گا۔ سرسوتی نے کہو کہا تھا...

"

اس نے بات کرتے کرتے دور بیٹھی سرسوتی کو مخاطب کیا اور بڑے انداز سے اس کی سمت بڑھا دی۔

"بالکل پاگل ہے؟" ماہین کا دل کٹنے لگا۔ اس نے اسے سر سے پیر تک جھومر کا جائزہ لیا۔ "اچھا" ۔ وہ ... کے انداز میں گویا ہوئی۔

"میران...... مگر" اس نے دانت کچکچائے۔

"تو بھلا اس کیلئے عورت لانے کی کیا ضرورت تھی؟" ماہین تاسف سے کہہ رہی تھی۔

"موصوف کو دولہا بننے کا بہت شوق تھا۔ نوالہ منہ کے بجائے ناک میں لے کر جاتے ہیں۔ باقی تمام باتوں کا ...

..." وہ جل کر کہہ رہی تھی۔

ماہین کو اس افسردہ "پہیلی" ماحول میں بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ چہرہ یکدم بھولا بھالا سا ہو گیا۔

"اب آپ شادی شدہ ہیں۔ یاور چچا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہو۔ آپ تو چاہیں گی نا کہ آپ اس جیسی ... عورت ہوتی ہے۔ اس کے خواب بھی ایک سے ہوتے ہیں۔ یہ مجھے خرید کر لائے ہیں۔ میں نے اپنے خواب ان کے ... پاگل کو سونپ دیا ہے۔ ان کا احسان ہے مجھ پر۔۔۔ یا میرا ان پر؟ بتائیے آپ؟ پھر آپ کہتی ہیں کہ مجھے ارمان نہیں گلا..." وہ ... کہہ رہی تھی۔

ماہین دم بخود سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

"بد دعا لگی ہے میری۔ مجھے تو رو رو کر روشی پر پیار آ رہا ہے۔ کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا میرا۔ حویلی کے سارے بڑے بڑبڑاتے رہے ہوں گے۔ مجھے تو سوچ سوچ کر سکون مل رہا ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

ماہین کیلئے بہت زیادہ وہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس نے افسردہ سی سطریہ پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو سرسوتی۔ اب چلتے ہیں" وہ تھکے تھکے لہجے میں گویا ہوئی۔

سرسوتی ڈرے اٹھا کر چل پڑی۔

"آتی جاتی رہا کریں۔ آپ کو کس کا ڈر پڑا ہے؟" اسے پیچھے سے جھومر کی آواز آئی۔

ابھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ اس کے باوجود جیسے اس کے حواس بے حس سے ہو چکے تھے۔ وہ صرف چادر میں یہاں سے وہاں مسلسل ٹہل رہی تھی۔ اور یاور علی خان اس کے انداز و اطوار پر مسلسل غور کر رہی تھی۔

حاشیہ کئے گیٹ گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے مزید روشن ہو گیا۔ پھر ہارن مسلسل بجا۔ ساتھ ہی نائٹ گارڈ نے چوکیدار کو آواز دی ہوا۔ پہلے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ پھر تیزی سے گیٹ وا کیا۔ سیاہ چمچماتی جیپ بڑی روانی سے اندر داخل ہو کر پورچ میں دوسری گاڑیوں کے درمیان رک گئی۔

روشنی کی پشت تھا۔ وہ غور سے دیکھ رہی تھی۔

جیپ سے اترنے والے کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ سیاہ ویسٹ اور سیاہ چمکتی جیکٹ میں ملبوس اس کی چوکیدار کو مخاطب کر رہا تھا۔

copied from web
copied from web
from web

☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆

وہ مبہوت سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

یہ کیوں آیا ہے؟ شاید اسے شک پڑ گیا ہو۔ ویسے بھی بڑا اُچکا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے اپنے معمول کے کام سے آیا ہو، ویسے بھی آتا رہتا ہے یہاں۔ اس نے خود کو تسلی دینے کے سو بہانے تراشنے شروع کر دیے۔

ہادی نے چوکیدار سے کچھ بات چیت کی۔ پھر اس طرف بڑھ گیا جہاں سے زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا۔ وہ ایک طمانیت بھرا سانس سینے سے خارج کیا۔ اس کا مطلب ہے سب خیریت ہے۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

جانے کیوں احساسات عجیب خوشگوار سے ہو گئے تھے۔ سارا وجود ایک دم ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا وہ دھم دھم کرتی اوپر جائے اور اس سے جی بھر کر لڑے۔ جو اس کی پرسکون مسکراہٹ اور لہجے سے اپنی جان جلائے۔ خوب کڑے اور پھر اسے چکنا گھڑا پا کر جی بھر کر روئے۔ اس کے بعد وہ اپنی بھیگی پھوار سے لہجے میں اسے سمجھائے۔ بڑی بے بسی سا اس کا چہرہ دیکھے۔

اس نے چادر اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے جانے کیا سوچ ڈالا۔

وہ رات کو بہت بے سکون رہی تھی۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی تھی۔ لہٰذا پھر وہ نماز پڑھ کر ہی سوئی تھی۔ مگر

جانے کتنی بار اس کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ مگر ہر بار بڑی آہستہ اور سرسری سی دستک تھی۔ لیکن اس مرتبہ دروازہ وحشی طرح دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ کسلمندی سے اٹھی اور دوپٹا سنبھالتی دروازے تک آئی۔ اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے گوری نیند سے مست سی کھڑی اونگھ رہی تھی۔

"السلام علیکم! آپ کا ٹیلی فون آیا ہے۔" وہ حسب عادت لہرا کر گویا ہوئی۔

ماہین نے نیند بھری آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔

"کس کا فون ہے؟" (شاید نعمان بھائی)

"ہری پور سے آیا ہے جی۔" اس نے پھر دانت نکالے۔

ماہین قدرے چونکی پھر سرد سی ہو گئی۔

"جاؤ کہہ دو۔ میں سو رہی ہوں۔ بعد میں، میں خود کر لوں گی۔"

اس نے گوری کے کسی اگلے جملے کا انتظار کیے بغیر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور واپس بستر پر آ لیٹی۔

"قریب ہوں تو بات نہیں کرتے۔ فاصلے سے باتیں کرنے کا ارمان آتا ہے۔ ہونہہ۔ میں کون سا مری جا رہی ہوں بات کرنے کیلئے۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔

ہادی حویلی سے ساتھ لائی ہوئی فائلیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ ابھی تیمور علی خان سے اس کی ملاقات نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی اگلے پیغام کا منتظر تھا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ قدرے چونک اٹھا۔

"ہوں... کون ہے؟ آ جاؤ۔"

دروازہ کھلا اور صفوشان اندر آ گئی۔

"السلام علیکم" وہ وہیں کھڑے کھڑے مسکرائی۔

"آہا، وعلیکم السلام۔"

"ابھی ابھی مجھے پتا چلا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ سمندر خان بابا سے باتیں کر رہا تھا۔"

"آپ کب آئے؟ ہم سے کیوں نہیں ملے؟" وہ بڑی معصوم ادا سے پوچھ رہی تھی۔

"بس... ذرا مصروف تھا۔ آپ سنائیے۔ کیا حال چال ہیں؟" اس نے فائلیں ایک طرف سرکا دیں۔

"ایسے ہی کھڑے کھڑے سنا دیں؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔ میرون شرٹ، سیاہ جینز اور سیاہ چمکتے شوز میں وہ بہت تر و تازہ اور کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

"نہیں نہیں، آئیے، ادھر بیٹھیے۔" وہ بھی جواباً مسکرایا۔

"پچھلی مرتبہ بھی آپ ہمیں لانگ ڈرائیو پر لے کر نہیں گئے تھے جبکہ پرامس کیا تھا۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"سوری۔ جلدی میں تھا۔" اس نے فوراً معذرت کی۔

"جی نہیں صرف سوری سے کام نہیں چلے گا۔" وہ بے نیازی سے گویا ہوئی۔

"پھر؟" وہ مسکرانے لگا۔

"پھر یہ کہ اس مرتبہ آپ جلدی میں نہیں ہوں گے اور اپنا پرامس فوراً پورا کریں گے، او کے۔" وہ کھلکھلائی۔

"او کے۔" وہ بھی ہنس دیا۔

"ہادی بھائی۔" وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"ہوں۔"

"وہ ادھر بابا صاحب کی بڑی حویلی میں بھی تو ہم جتنے بچے ہوں گے۔ وہ بھی آپ کے ساتھ اسی طرح اٹیچ ہیں۔ ان کی فرینڈ شپ ہے آپ کے ساتھ؟" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔ وہاں آپ جتنے بچے نہیں ہیں۔ ایک کو چھوڑ کے بہت چھوٹا اور باقی سب بڑے ہیں۔" وہ مسکرایا اس کی بزرگانہ سنجیدگی پر۔

"باقی سب کتنے بڑے ہیں۔ جتنی بڑی وہ انکل کی بیٹی ہیں؟" اس نے ہادی کا جملہ پورا کیا تھا۔

ہادی نے بری طرح چونک کر صوفیان کو دیکھا۔

"کیا وہ انکل کی بیٹی دیکھا ہے انہیں؟ آپ ملی ہیں ان سے صوفی؟" اس کے سامنے تو جیسے ذہن گھوم گیا تھا۔

"دیکھا بھی ہے۔ ملے بھی ہیں۔ بہت کیوٹ ہیں۔ باتیں بھی بہت ہیں۔ مگر پتا نہیں کبھی ان کے پاس کیوں نہیں جانے دیتیں۔ ہمارا دل چاہتا ہے ہم ان سے بہت سی باتیں کریں۔ لانگ ڈرائیو پر جائیں گے اس دفعہ تو پیچھے سے انہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" وہ اپنے آئیڈیا پر خود ہی خوش ہو رہی تھی۔

ہادی کا تو دم سینے میں اٹک گیا تھا۔

"آپ کب ملی تھیں ان سے صوفی؟" وہ گم صم انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"کل... کل ہی تو۔" وہ بے نیازی سے گویا ہوئی۔

"آپ کی کبھی ملی ہیں ان سے؟" اس کے حواس منتشر ہو رہے تھے۔

"پتا نہیں۔ مگر وہ ہمیں تو ملنے نہیں دیتے ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"ہادی بھائی۔ بھی کیوں ملنے نہیں دیتے ہیں؟" وہ جیسے جھلا گئی۔

"پتا نہیں۔ ہیں کہاں وہ؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو اور اطراف کے سارے منظر واضح ہو گئے ہوں۔ نکھر گئے ہوں۔

"گیسٹ روم میں۔" صوفی نے بتایا۔

"اچھا؟" ہادی نے معلومات لیں۔

"جی۔ وہاں تو آل بالکل اکیلے فرینڈز ہیں۔ وہ بچے ان کے گیسٹ روم میں ہیں۔ ان کے ساتھ ہیں اس وہ گیسٹ

روم" اس نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔

"اچھا اچھا۔"

اسی دم سعد خان ناک کر کے چائے کی ٹرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"او ہے جی! آپ یہاں ہو اور آپ کا سب کچھ پریشان ہے۔ سب انتظار ہے آپ کا۔" جیسے ہی سعد خان کی نظر صوفیان پر پڑی وہ بے ساختہ بولا۔

"ہم کوئی حویلی سے باہر جاتے ہیں۔ خامخواہ پریشان ہوتی ہیں۔" وہ ناراض ہو کر کھڑی ہوئی۔

"خان۔ چائے بنا دو۔" سعد خان نے ٹرے رکھ کر ہادی کو مخاطب کیا۔

"ہوں۔ ہاں۔ ہاں۔" وہ جیسے کسی دھیان سے چونکا۔

"ہادی بھائی! دیکھیں۔ اس مرتبہ آپ پرامس پورا کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔" اس نے جاتے جاتے انگلی اٹھا کر ہادی کو تنبیہ کی۔

"او کے۔ او کے۔" ہادی ہاتھ اٹھا کر مسکرایا۔

"سعد خان! وہ بچے جو گیسٹ روم میں مہمان ہیں انہوں نے ناشتہ کر لیا؟" ہادی کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"وہ... بچے والا مہمان۔ وہ۔ خان وہ تو کوئی لڑکی ہے۔ بڑا اچھا جانتی ہے۔ بڑا انتظار کرتی ہے۔ تم خان اس کا کوئی رشتہ دار ہے۔ ہم پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور وہ شیر گل کے ساتھ آیا تھا۔"

سعد خان چائے بناتے ہوئے بڑی سادگی سے بتا رہا تھا۔

"اوہ۔" ہادی نے گہری سانس لی۔ جیسے مزید مطمئن ہو گیا ہو۔

"کا کا جان لے ہیں اس سے آ ہو تو سندھ گئے ہوئے تھے۔" ہادی کو کچھ دھیان آیا۔

"ہم کو معلوم (معلوم) نہیں۔" اس نے چائے کا کپ ہادی کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا... اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں ذرا کام کر رہا ہوں۔ ابھی خان کے ساتھ کچہری بھی جانا ہے۔"

وہ بظاہر سعد خان سے مخاطب تھا۔ مگر ذہن کہیں دور اڑا کہیں بکھر رہا تھا۔

وہ بہت محتاط انداز میں گیسٹ روم کے دروازے تک آیا تھا اور بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

"ہوں... آ جاؤ بھئی۔" آواز میں زمانے بھر کی بیزاری سمائی ہوئی تھی۔ آج تو وہ ہادی کی موجودگی کے احساس سے باہر بھی نہیں نکلی تھی۔ اس وجہ سے موڈ کچھ زیادہ ہی آف ہو رہا تھا۔ وہ تو جیسے زاویے سے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلو میں کھولے رکھا تھا۔

"مسعود خان ادا رات بڑی حویلی سے جو بندہ آیا تھا وہ اس کیا یا نہیں؟" اس نے عجلت سے استفسار کیا۔

"اوہ... محترمہ کو ہماری آمد کی اطلاع بھی ہے"۔ اس کی موجودگی کے قیمتی احساس سے ہاری کے احساسات خوشی سے سبک ہو رہے تھے۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"السلام علیکم"۔

روشی بدحواس ہو کر پلٹی تھی۔

ایک لمحے کو تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ نظریں جھک کر رہ گئیں۔

"واہ صاحب... بندے کی قسمت میں فاقے ہوں تو کون اس سے چھین سکتا ہے"۔ ہاری نے کمرے میں داخل ہو کر خوشگوار شریر لہجے میں کہا۔

"اپنے گھر سے کتنے ہیں کاکا جان۔ ایک ذرا سا راز ہضم نہ کر سکے"۔ وہ خفگی سے کہہ کر چادر اوڑھنے لگی۔

"انہوں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ ہاں کاکا"۔

"بیٹا ہے... موکل ہیں تمہارے قبضے میں سب خبر دے دیتے ہیں۔ مگر ذرا سست ہیں ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہاری جیپ کے پیچھے پیچھے تمہاری جیپ ہوتی"۔ وہ طنزیہ کہہ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"آپ کو اچھا لگتا ہے اس طرح سے دوسروں کو پریشان کرنا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ آپ کو سوائے اپنے دل کے کچھ اور کوئی یاد نہیں رہتا۔ ادھر حویلی میں ایک قیامت برپا ہے۔ رات رات بھر کوئی سو نہیں سکتا۔ ایسے لگتا ہے وہاں کوئی موت ہوئی ہو"۔

"تو مر گئی ہوں ناں۔ میں سب کیلئے موت ہی تو ہوں"۔ وہ اس کی بات کاٹ کر غرائی اور اگر تم نے وہاں جا کر یہ اطلاع دی کہ میں سرائے میں ہوں تو میں یہاں سے بھی چلی جاؤں گی"۔ اس نے دھمکی دی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو ایسا تو کچھ ہوا بھی نہیں"۔

"شٹ اپ ہاری۔ جی چاہ رہا ہے تمہارا منہ نوچ ڈالوں۔ تمہارا وجود تار تار کر دوں۔ میرا ذرہ ذرہ محسوس کر رہا ہے وہ لوجیکل اور واقعی اندر میں کسی کو پیش کیا جا رہا تھا آج کمزور نہیں ہوں میں۔ ایک بار کی موت منظور ہے۔ روز روز کی نہیں"۔

"لیکن آپ کی شادی تو کہیں نہ کہیں۔ کسی نہ کسی کے ساتھ"۔

اس کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس کی طرف لپکی۔ ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا اور اس برے طریقے سے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا کہ سارے بٹن ایک جھٹکے میں ٹوٹ گئے۔ اور گریبان دامن تک پھٹ چلا گیا۔

"گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔ بی آف فار ایور"۔

اس نے نہایت وحشت کے عالم میں اسے دروازے کی جانب دھکا دیا۔ اور اپنی پیشانی دیوار سے مارنے لگی۔ یہاں تک

پھر سے مارنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔

ہاری تو اس اچانک افتاد پر بری طرح بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اس نے خود اپنی حالت پر سے نظر ہٹا کر اس کی جانب دیکھا تو اس وقت روشی کی پیشانی خون آلود ہو چکی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اسی دم دروازہ کھلا۔ اور تیمور علی خان نے اندر قدم رکھا۔

ایک لمحے کو تو ہاری کی صورتحال نے انہیں الجھا کر رکھ دیا۔ پھر روشی کی پیشانی سے بہتے ہوئے خون نے ہیجان کی [illegible] کر دی تھی۔ وہ سر پھوڑتی روشی کی سمت تیر کی طرح بڑھے اور اس کا بازو تھام کر اپنی طرف موڑا۔

"روشانے... ہوش کرو۔ کیا ہوا ہے؟"

"کاکا جان!" وہ ان کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

"کیا ہوا؟ کیا کہا ہے ہاری نے؟" انہوں نے عجب سی الجھن میں ہاری کی سمت دیکھا۔

ہاری تو پہلے ہی مجرم بنا چپ کھڑا تھا۔ تیمور علی خان کی آواز پر اسے مزید خفت سی محسوس ہونے لگی۔

"روشانے بیٹا ذرا دیکھو بھی۔ کیا ہوا ہے" اور یہ کیا حرکت کی ہے تم نے"۔ تیمور علی خان کی سفید کلف دار قمیص کا گریبان خون سے رنگین ہوتا جا رہا تھا۔

ان کے مخصوص جذبات والا چہرا جانے کس اوٹ میں چلا گیا تھا اس وقت تو ان کے چہرے پر فکرات کا جال پھیلا ہوا تھا۔ روشی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر لٹیں خون سے چپک گئی تھیں۔ تیمور علی خان نے نہایت احتیاط سے انگلیوں کی پوروں سے بال ہٹائے تو ان کی انگلیوں پر بھی خون لگ گیا۔

"کیا پاگل ہو گئی ہے روشانے؟ اب تم بچی بھی نہیں ہو۔ [illegible] ہاری وہ پھول خان سے کہو۔ میرے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس لے آئے"۔

انہوں نے ہاری کے سراپے پر ایک سخت تیز اور جتاتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"کاکا جان۔ مجھے مر جانے دیں پلیز۔ یہاں کوئی میرا اپنا نہیں ہے۔ یہ رشتے رشتے نہیں ہیں کاکا جان۔ میری جان سے لگی ہوئی جونکیں ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کیلئے میرا خون چاہیے۔ مجھے نفرت ہے ان سب سے۔ مجھے کسی رشتے، کسی تعلق کی ضرورت نہیں ہے۔ اور آپ اسے کہیے کہ اس کی صورت مجھے کبھی نظر نہ آئے۔ ورنہ میں اس پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں گی۔ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ اس سے نفرت ہے۔ یہ انسان نہیں درندہ ہے"۔

وہ اس بری طرح رو رہی تھی۔ اس قدر پھوٹ پھوٹ کر۔ تیمور علی خان تو امتحان میں پڑ گئے۔ وہ کڑے تیوروں سے ہاری کی سمت گھورنے لگے۔

"کیا کہا ہے تم نے اسے؟ اور یہ تمہارا حلیہ کیا ہو رہا ہے؟" ان کے لہجے میں غصے کی [illegible] کاٹ اور الجھن تھی۔

"میرے حلیے کے بارے میں روشی بی بی آپ کو بتا دیں گی۔ میں وضاحت نہیں دوں گا خان کہ میرے لئے اوپر سے گواہی آئے"۔

اس نے اسی سنجیدگی، اعتماد اور وقار سے کہا کہ تیمور علی خان بے ساختہ روشی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ خون روشی کے سر سے بہہ رہا تھا۔ انہوں نے قمیض کی جیب سے سفید رومال نکال کر اس کی پیشانی پر رکھا تو وہ زور سے کراہی۔ وہ اس کو بازو سے تھام کر لیے ہوئے بیڈ تک آئے۔

"سلی گرل!" عجیب سا کرب ان کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے اپنا خون آلود ہاتھ کو ایک نظر دیکھا۔ پھر اپنی سفید قمیض کے دامن سے ہی صاف کر لیا۔ ہاری باہر نکل گیا تھا۔

"تم نے یہ سب کیوں کیا روشانے؟ حالانکہ رات ہم نے تم سے تمہاری بات سننے کا وعدہ کیا تھا۔" وہ الجھے ہوئے سے پوچھ رہے تھے۔

"کاکا جان! اگر میرا بس چلے اور صرف ایک خون کرنے کی اجازت ہو تو میں پہلی فرصت میں اسے شوٹ کر دوں۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کس کو ہاری کو؟" تیمور علی خان کے لہجے میں اضطراب اور استعجاب دونوں تھے۔

وہ کچھ بولی نہیں سسکیاں لیتی رہی۔

"وہ تو بڑا ہارم لیس (بے ضرر) سا بندہ ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔"

وہ کہہ رہے تھے مگر ذہن کی اسکرین پر اس کا کچھ دیر قبل کا سراپا رقصاں ہو رہا تھا۔ پھر خود بخود ہی درست سا ہو گیا۔

"بالکل بے کار ہے ایک دم۔ مطلقاً سوائے دکھ دینے کے اسے کچھ نہیں آتا۔"

"کیا کہا ہے اس نے تمہیں۔ تم لاوارث نہیں ہو کہ اکیلی دکھ جھیلو۔ ہم پر اعتبار کرو روشانے۔ تم ہمارا خون ہو۔" انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

جسم و جان پر پھوار سی برس پڑی۔ یہ بالکل بابا پہ تھا تیمور علی خان تھا۔

"کاکا جان! آپ مجھے واپس بڑی حویلی تو نہیں بھیجیں گے ناں؟" وہ خود ان کے سینے سے لگ رہی تھی۔

"ہم تمہارے مطلقاً کو سپورٹ کریں گے روشانے۔ مگر تمہیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ اس کی پشت تھپکتے ہوئے گویا ہوئے۔

اسی دم پھول خان فرسٹ ایڈ باکس لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔

"ایک برتن میں گرم پانی لا دو اندر سے۔" انہوں نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ پھول خان سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔

تیمور علی خان باکس کھول کر ضروری چیزیں نکالنے لگے۔

پھول خان پانی لے کر آ گیا۔ تیمور علی خان نے روئی بھگو کر اس کا چہرہ صاف کرنا شروع کیا۔ روشی چپ بیٹھی سسکیاں بھرتی رہی۔

تیمور علی خان نے کسی ماہر کمپاؤنڈر کی طرح زخم کی بینڈیج کی تھی۔

"پھول خان! ایک گلاس گرم گرم دودھ لاؤ۔"

"تمہارے پاس اور کپڑے نہیں ہیں روشانے؟" انہوں نے اس کی قمیض پر لگے سرخ دھبوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ہم اندر سے ابھی کپڑے منگوا دیتے ہیں۔"

"ہم اندر کیوں نہیں جا سکتے کاکا جان؟" وہ الجھن سے پوچھ رہی تھی۔

"تم دودھ پی کر اسے چینج کرو اور آرام کرو۔ بے فکر رہو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب یہ سب دوبارہ نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ باکس بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اس کی بات صاف نظر انداز کر گئے۔

"کاکا جان! وہ ہماری بڑی حویلی جا کر سب کو بتا دے گا۔ بابا صاحب اور پاپا یہاں آ جائیں گے اور پھر وہی کریں گے جو ان کا دل چاہے گا۔" اس نے اپنے اندیشے ظاہر کیے۔

"ایسا نہیں ہو گا روشانے۔ ہاری وہی کرے گا جو ہم اسے تاکید کریں گے۔ (رات والی)۔ دیکھو، اب پھر یہ سب نہیں ہونا چاہیے۔ اب ہاری بھی یہاں نہیں آئے گا۔ ویسے وہ یہاں آ کیسے سکتا تھا اسے پتا کیسے چلا؟ تم نے بلایا تھا؟" وہ جاتے جاتے پلٹے۔

"نہیں... میں نے نہیں بلایا تھا۔ ہاں مجھے کاکا جان۔ میں تو صبح سے باہر بھی نہیں گئی۔ بلیوی۔" وہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آواز میں ابھی تک آنسوؤں کا تاثر تھا۔ تیمور علی خان باہر نکل گئے تھے مزید کچھ کہے بنا۔

ہاری لباس تبدیل کرنے کے بعد بڑی الجھن میں بیٹھا ہوا تھا۔

"خان... تیمور خان اپنے کمرے میں آپ کو بلا رہے ہیں۔" سکندر خان نے آ کر اسے پیغام دیا۔

وہ ڈرتا ورتا خود سے الجھتا ان کے کمرے میں آیا تھا۔

دروازے کی چرچراہٹ پر تیمور علی خان نے سر اٹھایا تھا۔ وہ بھی کپڑے تبدیل کر چکے تھے اور لائٹ براؤن شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔

ہاری شلوار قمیض چینج کر کے بلیو جینز اور وائٹ شرٹ زیب تن کر کے آیا تھا۔

"آؤ ہاری... کام تو آج بھی بہت ہے۔" انہوں نے سگار منہ سے لگاتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"وہ امام دین والا کیس تو میرا خیال ہے ہفتہ دس دن میں نمٹ جائے گا۔ ایک پیشی پرسوں ہے اور ایڈووکیٹ کہہ رہا تھا اس کے بعد کی پیشی پر فیصلہ ہو جائے گا۔ مجھے تو کوئی ٹینشن نہیں ہے۔ مگر بابا صاحب نے اس کیس کو خود پر طاری کیا ہوا ہے۔ ان کی اگر سنتی ہے۔ وہ کیس بھجوائی ہے انہوں نے؟"

وہ اصل ساتھ ساتھ خود سے ہمکلام تھے۔

"جی... ہاں۔" وہ بہت کانشس تھا اسے خوب احساس تھا کہ تیمور علی خان کچھ دیر قبل کا واقعہ فراموش کر کے اس سے

باتیں نہیں کر رہے بلکہ وہ سب اس وقت بھی ان کے دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے ہے اور مسلسل وہ ابھی اس ہوٹل میں کہیں آ رہے۔

"وہ بے گناہ ہونے کے باوجود بہت شرمندہ شرمندہ سا تھا۔

"قاسم خانی آیا تھا بڑی حویلی؟" وہ اس کی طرف بغور دیکھنے لگے۔

"نہیں۔" ہاری نے پھر مختصر کہا۔

"یہ بھی بس چکر باز قسم کا بندہ لگتا ہے۔ ایڈیٹ۔" انہوں نے بریف کیس کھول کر جانے کیا تلاش کرنا شروع کیا۔

"ادھر حویلی میں تو بہت ٹینشن ہوگی؟" انہوں نے ایک دم پلٹا کھایا تھا مگر ہاری ہر قسم کی صورتحال کیلئے تیار بیٹھا تھا۔

"جی" اس نے پرسکون انداز میں جواب دیا اور انجان بننے کی مصنوعی کوشش نہیں کی۔

"شوٹ کرنے کا پروگرام ہے یا کچھ رعایت ہے؟" وہ ایک فائل نکال کر اس کے کاغذات اس میں کھول کھول کر دیکھنے لگے۔

"یہ تو بہت پرسنل ہے۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

"تم سے کیوں اتنی ناراض ہے؟" وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئے۔

ہاری خاموش رہا۔

"کیا تمہیں علم تھا کہ وہ یہاں ہے؟ وہ تمہیں بتا کر آئی تھی؟" تیمور علی خان بہت سیریس تھے۔

"نہیں۔ مجھے علم نہیں تھا۔ مجھے ضوفی سے پتا چلا تھا۔" ہاری نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

"ضوفی سے" وہ چونک پڑے۔

"کیا بتایا تھا ضوفی نے؟" ان کی آنکھوں سے عجیب طرح کی خفگی چھلکنے لگی۔

"وہ لانگ ڈرائیو پر جانے کیلئے اصرار کر رہی تھی۔ پچھلی دفعہ میں نے پرامس کیا تھا مگر جلدی میں جانا پڑا تھا تو وہ یاد دلا رہی تھیں۔ پھر بڑی حویلی کا پوچھنے لگیں کہ وہاں ان کے ہم عمر بچے ہیں یا نہیں۔ میں نے بتایا کہ وہاں آپ جتنے بچے نہیں ہیں۔ سب بڑے ہیں تو کہنے لگیں یاور انکل کی بیٹی بھی بیٹھتی ہیں سب۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ کیسے جانتی ہیں۔ پوچھا تو کہنے لگیں وہ یہاں آئی ہوئی ہیں اور پاپا کے گیسٹ روم میں ہیں۔" ہاری نے تفصیل سے جواب دیا۔

"یاور انکل کی بیٹی کہا تھا اس نے۔؟" اسے۔۔۔ "خیر" انہوں نے اٹھ کر بیل پش کر کے ملازم کو بلایا۔

تھوڑی دیر بعد سمندر خان اندر داخل ہوا۔

"سمندر خان! ضوفی کو ساتھ لے کر آؤ۔"

وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ اور ہاری کو تو خاموشی کا بہانہ چاہیے تھا۔

تین چار منٹ کے وقفے کے بعد ضوفشاں اندر داخل ہوئی۔ تیمور علی خان نے سمندر خان کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔

"یس پاپا۔" ضوفشاں ہاری کی کرسی کے پاس کھڑی ہوگئی۔

"ضوفی۔ بیٹے! آپ یاور انکل کی بیٹی سے کہاں ملی تھیں؟"

"نہیں پاپا، میرا سامنے والی لان (میں اپنے پاس)۔" وہ حیرت سے باپ کو دیکھنے لگی۔

"گیسٹ روم میں؟"

"نو۔۔۔ لان میں پاپا"۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ یاور انکل کی بیٹی ہیں؟ انہوں نے خود بتایا تھا؟"

"انہوں نے بتایا تھا۔ وہ بڑی حویلی سے آئی ہیں۔ آئی ایم یور ڈسٹنٹ کزن۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ یاور انکل کی ڈاٹر ہیں تو انہوں نے کہا، یس ڈسٹنٹ کزن۔" وہ الجھی تھی۔

"نہیں۔ یہ سچ ہے۔ وہ آپ کی کزن ہی ہیں اور کیا باتیں کی تھیں آپ نے ان سے؟" تیمور علی خان کے لہجے میں ایک سرد مہری سی آ گئی تھی۔

"کوئی خاص نہیں پاپا۔ میں نے ان سے بات ہی کہاں کرنے دی بلکہ مجھ سے کہا کہ ان سے آ کر ملوں اور بات کروں وہ تو آپ ہم سے اور ہی سے ناراض ہو جائیں گے" اس نے سوچتے ہوئے بتایا۔

تیمور علی خان ایک دم تو گڑبڑا کر رہ گئے۔ ہاری پاؤں کے انگوٹھے سے کارپٹ مسلنے لگا۔

"اٹس اوکے سویٹی۔ ہم جانیں۔" وہ دونوں کو یکے بعد دیگرے خاموش دیکھ کر الجھی ہوئی سی ہوگی۔

"ہوں"۔

"پاپا کزن کا نیم کیا ہے؟" وہ جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگی۔

"رمشانے" تیمور علی خان نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"ہاری بھائی" وہ بھاگتے ہوئے واپس ہاری کے پاس آئی اور دونوں ہاتھوں کی روک لگا کر ہاری کے کان میں بولی۔

"کم از کم سوئٹ چانس۔ لانگ ڈرائیو کیلئے پاپا سے کزن کیلئے بھی پرمیشن لے لیجئے۔" ہاری نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر گویا اطمینان دلایا۔ ضوفی باہر چلی گئی۔

"ہاری تم نے جواب نہیں دیا۔ تم سے کیوں ناراض ہے اور اتنی شدت سے کہ یہاں سر تک پھوڑ ڈالا۔ تمہاری قمیض بھی پھاڑی تھی۔ کیا ادھر حویلی میں بھی اسے ہسٹریا کے اٹیکس پڑتے ہیں؟"

"جی نہیں" ہاری کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کسی اعلیٰ درجے کا ڈپریشن کہہ سکتے ہیں"۔ تیمور علی خان خود ہی بولے (Agitation) ہیجان بھی ڈپریشن ہی کا ایک انگ ہوتا ہے"۔

"اب تم ہی ڈاکٹر اب کر کے کہ یہ ڈپریشن ہے یا اس پردہ کوئی اور بات، جس کے سبب وہ تم سے اتنی نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔ اور شاید تم یہ بھی بتا سکتے ہو کہ وہ کیوں شادی نہیں کرنا چاہ رہی۔ اور یہ بھی کہ اس نے انتہائی قدم کس بنا پر اٹھایا ہے۔"

ہاری اس قدر لاجواب شاید کبھی ہوا ہوگا۔ تیمور علی خان کی آنکھیں اسے حساس ترین کیفیت محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ خاموش ہو کر رہ گیا۔

"کاکا جان! دیکھئے میری طرف سے تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ یہ تمام صورتحال کی اہمیت ان کی جانب سے ہوئی ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ جیسے ریحان انھی کی طرف سے معلوم ہے"۔ ہاری نے دبے دبے سے انداز میں جواب دینے کی کوشش کی۔

"پھر اس کے بعد کاکا جان جو کچھ آپ مجھ سے پوچھیں گے۔ میرے لئے درست جواب دینا آسان ہوگا"۔ تیمور علی خان چند لمحے اس کی جانب دیکھتے رہے۔

"پھر تم آج بڑی حویلی مت جاؤ۔ ہم بابا صاحب کو فون کر دیں گے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے ہاری۔ خاص طور بڑی حویلی کیلئے تو یہ چاؤ کی سوز ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں؟"

"جی۔۔۔ جی۔ بہت اچھی طرح"۔ ہاری نے جلدی سے اتفاق کیا۔

"ٹھیک ہے پھر کچہری چلتے ہیں۔ بعد میں بات ہوگی"۔ تیمور علی خان بیڈ سے اترتے ہوئے گویا ہوئے۔ ہاری بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

بانو دروازے پر دستک دیئے بغیر اندر آ گئی تھی۔

"کیا کر رہے ہیں؟" وہ وہیں دروازے پر رک کر پوچھنے لگی۔

دوست یہ کیوں ہے یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے
ہر طرف حرص و ہوا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے

"سوچ رہے ہیں بھائی"۔

"آپ کے دوست سے میری ملاقات ہو چکی ہے"۔ بھائی سن کر بانو کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

ہم کو یہ کب تم پہ گماں تھا شاعر بھی ہو انشا جی
اب تک تو جس بھیس میں دیکھا لگتے تھے معقول میاں

"رشتے تو ایک بار ہو جاتے ہیں اور بس ہو جاتے ہیں۔ کیا نبھائیں اور کتنا نبھائیں"۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یقین کریں جب بھی آپ کو دیکھا تھا تو یہی ذہن میں آتا تھا کہ آپ بہت سیدھی سادی سمجھوتہ کرنے والی، مشکل وقت سے حوصلے کے ساتھ نمٹنے والی ہیں"۔

"چلانے کی ضرورت نہیں اس طرح آپ کے جرم معاف نہیں ہو سکتے"۔ وہ گلی سے کہتے ہوئے ایک کرسی پر براجمان ہو گئی۔

مگر وہ اب تک زندہ ہے تو آپ نے اس سے شادی کیوں نہیں کی۔ اگر اس میں کسی طرح کے آپ قابل تھے

بانو دوسری ساتھ انداز میں بولی

کوئی ابھی بھی ہے سمجھاؤ ان پہ دل کیوں رہ گیا
جیسی چتون! ذکی جب والے تعاقب سے پھرتے ہیں

"اس سے شادی ہو بھی نہیں سکتی تھی ورنہ اس سے کرتے"۔ عارف مسکرا دیا۔

"کیوں اس نے آپ کی ماں کو دھوکا دیا تھا اور یہ انکشاف بہت بعد میں ہوا تھا"۔ بانو تنگ کر بولی۔

"کاش ایسا ہوتا"۔ عارف جھلا کر رہ گیا۔

"کہاں اتنی ہے وہ؟" بانو جانے آج کیا ٹھان کر آئی تھی۔

"یہاں سے بہت دور ایک بہت بڑے گاؤں میں"۔ عارف کے لہجے سے کرب جھلکنے لگا۔

روپ سروپ کی جوت جگاؤ اس نگری میں جو گم ہے
چاروں کھونٹ جگ لے من کر گھور اندھیرے پھرتے ہیں

"اس گاؤں کا کیا نام ہے آپ نے؟" بانو مشکوک انداز میں گویا ہوئی۔

"آں ہاں"۔ عارف نے آہ بھری مگر بولا کچھ نہیں۔

"کیا نام ہے اس جگہ کا؟"

"پہاڑی۔ تیمور آباد سے پہلے پڑتی ہے۔ بڑا سرسبز علاقہ ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی کھلیاں ہیں۔ انسان بھی خوبصورت اور بھی۔ جو ایک مرتبہ وہاں بس جائے۔ پھر اس کا کہیں اور دل نہیں لگ سکتا۔ جب ہی تو یہاں رہ کر بھی وہیں پہنچ جاتے ہیں"۔ وہ جیسے تصور میں ایک ایک منظر دیکھنے لگا۔

"کیوں گئے تھے وہاں سے آخر جب آپ کا تو سب کچھ وہیں ہے"۔ وہ چیخ کر بولی۔

"کالے پانی کی سزا پا کر آئے ہوئے ہیں"۔ وہ ہنس دیا۔

"اب ختم ہوگئی یہ سزا؟" وہ زہریلے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہمت پڑے"۔ وہاں سے درد جواب آیا۔

"اللہ کرے۔ ان کیلئے کیوں نہیں بچے جنہیں آپ کی قدر ہے؟" وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

دردمندوں کو وفاؤں کا صلہ مل کر رہا
چند افکار کے پیکر گر بار گئے

عارف نے پھر شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔

"آپ کا دل بھی نہیں چاہتا کہ کبھی وہاں ہو آئیں۔ میں نے تو کبھی آپ کو اس شہر سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اب آپ وہاں سے آئے تھے لازمی آپ کا گھر بھی ہوگا وہاں۔۔۔؟" بانو کے سوال ختم ہونے والے نہیں تھے۔

انجان فضاؤں میں سرگشت حوادث
اس واسطے ٹھہرا ہوں کہ کس واسطے گھر جاؤں

"وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے جانا نہیں چاہتا"۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اگر وہ مجھے کہیں مل گئی ناں تو میں اس کا گلا دبا دوں گی۔ زندہ انسانوں سے کھیلتی پھرتی ہے۔ لگتا ہے کوئی کالا جادو کر رکھا ہو اس نے آپ پر"۔

"آپ ناشتہ کریں گی؟" عارف یوں بولا جیسے اس کی بات ہی نہیں سنی۔

"ہوں۔ آپ کی اماں کو بھی کرا دیا تھا۔ بے چاری کچھ کھاتی ہی نہیں ہیں۔ پریشان کر کے رکھا ہوا ہے ان کو اس عورت نے۔ آپ کو ترس بھی نہیں آتا ماں پر"۔ بانو بڑبڑائی۔

"ان کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔ بہو ہوتی تو ہزار باتیں سنا کر ایک روٹی کھلاتی۔ انہیں تو شکر کرنا چاہیے۔ ان کی ناقدری نہیں کرائی"۔ عارف نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"یہ خیر آباد کہاں ہوتا ہے عارف بھائی"۔ وہ اچانک کسی دھیان سے چونکی۔

"سرحد میں ہوتا ہے۔ خیریت؟" عارف کی مسکراہٹ میں حیرت بھی تھی۔

"یونہی پوچھ رہی تھی۔ کیا گاؤں میں محل بھی ہوتے ہیں؟" وہ پھر سے کھوجنے لگی۔

"ہاں! محل جیسی حویلیاں ہوتی ہیں"۔ عارف نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔

"آپ جاتے تھے حویلی میں اس کے پاس۔ آپ کو کوئی روکتا نہیں تھا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں۔ ہم تو کہیں رہتے ہی وہیں تھے۔ آہ .... کیا دن تھے۔

اس حویلی میں اتنے پھول ہوتے تھے کہ حویلی پھولوں میں چھپ جاتی تھی۔ اور ان پھولوں کے درمیان جھولا جھولتی وہ ... اتنے حسین منظر آنکھ کیسے بھلا دے"۔

"وہ کون؟ وہی منحوس؟" بانو جل کر بولی۔

"اس کا نام مطرب ہے بھابی۔ محبت کے گیت چھیڑنے والی"۔

"زہر گھول دیا ہے جس نے آپ کی زندگی میں"۔ وہ سلگی۔

"عارف خاموش رہا۔ بانو بھی خاموشی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔

"میں سوچ رہا ہوں آج غلام محمد کے پاس جا کر اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ پھر آپ کو وہاں چھوڑ کر آؤں تاکہ آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو"۔ عارف نے موقع غنیمت جان کر موضوع بدل دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں آپ کو وہاں جانے کی۔ پہلے میرے حساب کتاب سیدھے کریں۔ میرے نقصان پورے کریں۔ کیا سوچ رہے ہیں اتنی آسانی سے معاف کر دوں گی؟" وہ جل کھا کر کھڑی ہو گئی۔

"ماہین! زیادہ کا صبح سے تیسرا فون ہے۔ تمہارے ہاں کیوں نہیں کر رہیں؟ ہو سکتا ہے انہیں کوئی ضروری کام ہو"۔ عالم صاحب اس وقت فوراً آئی تھیں۔

ناچار ماہین کو اسٹڈی سے اٹھنا پڑا۔

"کوئی ضروری کام ہی ہو گا"۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا تھا جس کا عالم صاحب نے نوٹس نہیں لیا تھا کیونکہ آج کل ان کی سوچ کے دھارے دوسری سمت بہہ رہے تھے۔

وہ نہایت بیزاری کی کیفیت میں ہال میں داخل ہوئی۔ خلاف معمول ہال میں لڑکیاں نظر نہیں آ رہی تھیں صرف صبح کے اخبارات میں الجھی ہوئی دکھائی دیں۔

"السلام علیکم"۔ اس کی آواز ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھی۔

"وعلیکم السلام۔ طبیعت ٹھیک ہے"۔ یاور علی خان کی آواز میں تشویش تھی۔

"ٹھیک ہوں۔ کوئی ضروری کام تھا آپ کو مجھ سے۔ کیسے یاد فرمایا؟" وہ اپنا سوال چھپا نہیں پائی۔

"اوہو! موڈ آف ہے۔ پریشان لوگوں کو مزید پریشان کرنا کیسی لائف پارٹنرشپ ہے۔ جب نہیں پوچھا جاتا تو بھی خیال کر لیجئے"۔ یاور علی خان سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"سب کچھ تو مجھے ہی کرنا ہوگا۔ آپ پر کسی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں"۔ وہ سابقہ لہجے میں گویا ہوئی۔

"تم تو بہت وسیع ذہن کی ہو۔ عام سی مشرقی عورت نہیں ہو"۔ یاور علی خان نے قدرے رک کے کہا تھا۔

"مشرقی بیٹیوں کے بھی بعض تقاضے مشترک ہیں اور فطرت پر ہیں۔ آپ میرے علم و تعلیم کو کارڈ بنا کر مجھے فطری حسین اور لطیف جذبات کی قربانی پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اتنی سخت زیادتی آپ نے میرے ساتھ کی اور آپ کو احساس تک نہیں بلکہ شوہر بہت خوب"۔ وہ ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔

"احساس نہ ہوتا تو فون کیوں کرتا؟" ان کی گھمبیر آواز ایئرپیس میں ابھری۔

ماہین کے دل کی دھڑکنوں میں خوشگوار تلاطم برپا ہوا۔

"بہت لیٹ ہو جاتے ہیں آپ۔ چاہے کوئی مر ہی جائے"۔ اسے رونا آ گیا۔

"اتنی اپسیٹ تو ہم نے کبھی اپنے ملازمین کی نہیں کی بڑی بڑی غلطیوں کے باوجود"۔

"سوری بیگم۔ تمہیں کیا پتا کہ ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"کیا ...؟" ماہین متجسس ہوئی۔

"کچھ نہیں ..." وہ ٹال گئے۔

"زرمی کیلئے کیا کر رہے ہیں؟" ماہین کو پتا تھا کہ اصرار کے باوجود وہ کچھ نہیں بتائیں گے۔

"کون زرمی؟" یاور علی خان کی آواز سے تلخی جھلکنے لگی۔

"یاور صاحب پلیز"۔

"ماہین۔ آج کے بعد تم کبھی مجھ سے روشی کا ذکر نہیں کرو گی"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ...... کہ ...... آخر" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"میں سوچ چکا ہوں ماہین! تمام عمر دوسروں کے پھیلائے ہوئے کوڑے کرکٹ سمیٹتا رہوں۔ مار دیا ہے میں نے اسے ذہن سے۔ نکال دیا ہے اسے دل سے بھی۔ دماغ سے بھی۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ موقع ہو تو آ جانا۔ خدا حافظ"۔

ماہین ریسیور ہاتھ میں تھامے خاموش سی بیٹھی رہ گئی۔ اب تک کی بات چیت سے جو تاثر اس کے حواس پر طاری ہوا وہ یہی تھا کہ یاور علی خان اس وقت غم سے چور چور ہیں۔ واقعی کتنی بری بات ہے۔ مجھے ایسے میں ان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس نے بڑی شرمساری محسوس کی۔ ان پر اتنی بڑی آفت ٹوٹی ہے کہ ان سے جو سرزد ہو وہ کم ہے۔ اپنی الجھن کے احساس کے مارے مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔

"خدا معلوم وہ کیا کیا۔ اور کس کس اینگل سے سوچ رہے ہوں گے۔

"ماموں جان تو خیریت سے ہیں ناں ممانی جان؟" معیشہ نے اخبار تہہ کر کے ماہین کو گم صم بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

"آ ...... ہاں ...... وہ ٹھیک ہیں۔ باقی سب کہاں ہیں شیمو؟"

"کچھ تو معمول کے مطابق کالج اور کچھ حالت سوگ میں اپنی اپنی ماؤں کے پاس"۔ وہ اخبار رکھ کر اٹھیں۔

"خدا نہ کرے سوگ ہو"۔ ماہین کو ان کا جملہ نہایت شاق گزرا۔

"اور کیا نام دیں۔ آپ ہی بتائیں؟" وہ کہاں ہار ماننے والی تھیں۔

"بے نام رہنے دو شیمو! اس قصے کو نام دینے سے کوئی فائدہ تو ہو گا نہیں"۔

"ماموں جان کیا کہہ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا تھا ناں کہ کیا کر رہے ہیں روشی کیلئے؟"

(ایک تو اس گھر میں کوئی اپنے میاں سے بات بھی نہیں کر سکتا فون پر) ماہین کی جان جل کر رہ گئی۔

"ہوں ...... کہہ رہے تھے کہ کر رہا ہوں کوشش"۔ اس نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ مبادا کوئی اگلا سوال آ جائے۔

روشی ہر ہر دستک پر چونک پڑتی تھی۔ ایک ذہنی خلفشار نے مسلسل گھیرے ہوئے تھا۔ کھانا بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا کہ کاکا جان اس سے کیا کچھ پوچھیں گے؟ اور وہ انہیں کیا جواب دے گی۔ جواب نہ دینے کی صورت میں ان کا انتہائی رد عمل کیا ہو گا؟

"کیا وہ انہیں سب کچھ بتا دے؟ مگر کس طرح؟ کن الفاظ میں؟"

وہ کبھی اس کروٹ لیٹتی تھی کبھی اس کروٹ۔ سر الگ دکھ رہا تھا۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ "روشانے"۔

"آ جائیں کاکا جان"۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

چھوٹے علی خان اندر آ گئے۔ آتے ہی ان کی نظر برتنوں پر پڑی۔

"کیوں نہیں کھایا؟" ان کا انداز سرسری سا تھا۔ شاید پوچھنا ضروری تھا۔

"بھوک ہی نہیں تھی"۔ اس نے نظریں چرا لیں۔

"پہلے کیا کیا حماقتیں کرتی پھرتی رہی ہو۔ بھوک خاک لگے گی۔ چلو تھوڑا سا کھا لو"۔ انہوں نے نرمی سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں میں تھوڑی دیر میں کھا لوں گی"۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"نو بج رہے ہیں رات کے۔ پھر کب کھاؤ گی؟"

"وعدہ ...... میں کھا لوں گی"۔ اس نے منت کے انداز میں کہا۔

"طبیعت کیسی ہے اب؟ سر میں درد تو نہیں ہو رہا؟ ...... اگر ہو رہا ہو تو تکلیف نہ کرنا"۔

انہوں نے قمیص کی اوپری جیب سے مڑا تڑا سا لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

"تھینکس"۔ اس نے لفافہ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔ صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم نے اپنے اور ہاری کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا ......" وہ اس کے سامنے بیٹھ چکے تھے۔ "یوں بھی مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنے آنا ہی تھا۔ تمہیں اندازہ ہے بڑی حویلی میں کتنا تشنج ہو گا۔ بہرحال میرے پہلے سوال کا جواب دو"۔

روشی خاموش رہی۔

"مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔ بہت غصہ آتا ہے روشانے"۔ ان کی آواز میں تلخی آ گئی۔

"بس ویسے ہی غصہ آ گیا تھا کاکا جان؟" وہ بہت پست آواز میں بولی۔

"زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے ہی کچھ نہیں ہوا کرتا۔ مجھے ہر ایک کے ساتھ بات کیا کرو"۔

"وہ مجھے گھور رہا تھا"۔ سہارے جواب سوجھ گیا۔

"اگر میں کہوں اس کا تو کیسی چیز چھوڑ میرے ساتھ ہو گی؟" وہ برہم ہو گئے۔

"کاکا جان ...... پلیز ...... آپ خود کو اس سے کمپیئر نہ کریں"۔ وہ خفیف سی ہو گئی۔

"کیسی بات تھی؟" ان کا انداز مستفسرانہ تھا۔

"جی"۔ وہ بولی۔

"ہرگز ہرگز یہ بات نہیں ہے۔ میری سمجھ داری سے بات ہوئی ہے۔ اگرچہ اس نے مجھے کچھ بتایا نہیں مگر جس انداز میں اس نے جواب دیا اس سے اندازہ ہوا کہ بات عام نہیں ہے عام ہوتی تو بغیر بحث کے بتا دی جاتی۔ روشانے اتنی برداشت ہماری عادت نہیں ہے۔ اس لئے زیادہ مت آزماؤ۔ ہم ابھی اسی وقت تمہیں بڑی حویلی چھوڑ کر آ سکتے ہیں"۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"کاکا جان! میں حویلی جانے کو تیار ہوں۔ بس میری اتنی جسارت ہے کہ ... کے ساتھ میرا رشتہ ختم کر دیجئے۔ میری

شادی کا سلسلہ روک دیجئے۔ میں وہاں جانے اور ہر طرح کے برے سلوک کو فیس کرنے کیلئے تیار ہوں"۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"نہیں سوچا کرو۔ تمہیں علی سپورٹ دینے کیلئے تیار ہیں"۔

"یہی بس ہے کاکا جان کہ میں اس رشتے سے خوش نہیں ہوں"۔ بس اس نے ناک پونچھی۔

"خوش نہ ہونے کی وجہ؟ اتنا معقول رشتہ کسی کسی کو ملتا ہے۔ ہر طرح سے ریلیکس رہو گی۔ نہ دشمنی کا خوف نہ ذمہ داریوں کا"۔

"مجھے تیمور پسند نہیں۔ بائی گاڈ کاکا جان"۔ وہ پھر رو دی۔

"ہوں"۔ تیمور علی خان گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"تمہارے پیرنٹس کیا کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تمہارے پپا تمہاری اسٹیپ مدر کے ساتھ اس موضوع پر بات ہوئی؟" (ابھی ابھی کاکا جان کتنے اپنے سے لگ رہے تھے اور ایک دم کتنے غیر اور اجنبی سے لگنے لگے تھے)

"جی ۔۔۔ مدر سے"۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

"روشانے! تم اس خاندان کی واحد لڑکی ہو جو اپنا اختیار استعمال کر رہی ہو۔ اور ہمارے ہاں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا اس کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی "مس بی ہیو" نہیں کر رہا ہے۔ سب لوگ مسئلے فیس کرتے ہیں۔ تمہاری مدر نے بات آگے پہنچائی؟"

"شاید"۔ وہ آہستگی سے بولی۔

"شاید کیا؟" انہیں اس کا "شاید" نہایت بھاری گزرا۔

"میرا مطلب ہے۔ کچھ ہوا تو نہیں"۔ وہ سنبھل کر گویا ہوئی۔

"ہوں۔ خیر۔ تم کھانا کھاؤ۔ پھر بات ہوگی"۔ وہ جانے کیا سوچ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یا اللہ ۔۔۔ پھر"۔ اس نے سر کو تھام کر گہرا سانس لیا۔ "غلطی تو خیر میری ہی ہے میں ہی بات آگے بڑھا نہیں پا رہی۔ پھر تو آئے گا"۔

تیمور علی خان اسے کھانا کھانے کی تاکید کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

تیمور علی خان اسٹڈی میں خاصی دیر تک ٹہل ٹہل کر کچھ سوچتے رہے۔ بالآخر ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور ٹیلیفون سیٹ اپنے سامنے کھسکا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگا کر پشت کرسی کی پشت سے ٹکا لی۔

"ہیلو"۔

"جی ۔۔۔ میں گلو بول رہی ہوں"۔ گلو سے ان کا براہ راست کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا اس لئے وہ ان کی آواز پہچان نہیں پائی۔

"ماہین بی بی گھر پر ہیں؟"

"جی صاحب اپنے کمرے میں ہیں"۔ دوسری طرف سے جواب آیا۔

"ان سے کہو کراچی سے نعمان صاحب کا فون ہے"۔ وہ بہت آہستہ سے بول رہے تھے۔

"آپ ٹھہریں جی۔ میں بلا کر لاتی ہوں"۔ گلو کی اپنی ہی لغت تھی۔

انہیں تھوڑا سا وقت کچھ انتظار کرنا پڑا۔

"ہیلو"۔ ماہین کی حیران پریشان آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

"السلام علیکم۔ ہم تیمور خان بات کر رہے ہیں "سرائے" سے"۔

"جی۔ ماہین کو جو پوچھنا تھا" گلو کہہ چکی تھی۔

"اس نے وہی کہا جو ہم نے اسے کہا۔ اب آپ ہماری بات غور سے سنیے۔ ہماری آپ کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر امید ہے کہ آپ ہمیں جانتی ہوں گی۔ خان صاحب یعنی بابا صاحب کے چار بیٹے اور بیٹیوں میں ہمارا چوتھا نمبر ہے۔ ہمارے خیال میں اس سے زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں۔ آپ سن رہی ہیں؟"

"جی ۔۔۔ جی میں سن رہی ہوں"۔ وہ جیسے چونک کر بولی۔

"ہماری اس کال یعنی گفتگو کا ذکر بھی آپ کسی سے نہیں کریں گی۔ اس سے بہت سے لوگوں کو اتفاق و آرام رہے گا۔ بات صرف یہ ہے کہ ہمارے خاندان پر روشی کے ہاتھوں بہت برا وقت آ چکا ہے۔ ہم اس موضوع پر آپ سے بات چیت کرنا چاہ رہے ہیں"۔

"جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ ضرور کیجئے"۔ روشی کے ذکر پر اس کے سارے حواس چوکس ہو گئے۔

"آپ کی اور اس کی کتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے؟" وہ گویا ہوئے۔

"بہت اچھی ۔۔۔ ہم بالکل دوستوں کی طرح ہیں"۔ وہ جلدی سے بولی۔

"لگتا تو نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ سب کیوں ہوتا؟" ان کا انداز قطعی تھا۔

"اتنے ڈھیر سارے رشتوں کی موجودگی میں میرا اکیلا حق کیا کرتا؟" اس نے وضاحت کی۔

"آپ اپنے جذبات کو اعتماد میں لے سکتی تھیں۔ کام آسان ہو جاتا"۔ وہاں سے دلیل آئی۔

"میں نے کوشش کی تھی"۔ وہ مجرموں کے انداز سے بولی۔

"کوشش کی تھی یا کھل کر بات کی تھی؟" بڑا ہی دو ٹوک انداز تھا۔

"کوشش پہلا درجہ ہوتی ہے۔ کھل کر بات کرنے کی نوبت بعد میں آتی ہے"۔ وہ بولی۔

"گویا کھل کر بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آنے دی گئی؟ کیوں ۔۔۔؟" وہ گویا ہوئے۔

"جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ آپ ٹھیک کہیے"۔ وہ تیزی سے بولی۔

"یہی تو کوئی بات ہے جس کے آگے بڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی"۔ وہ ماہین کو گھیرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ماہین گڑبڑا کر رہ گئی۔۔۔۔ نہ ہاں کہہ سکی نہ ناں۔ خاموش ہو کر رہ گئی۔

"دیکھئے ہماری فیملی یہاں والوں سے تھوڑی سی ڈفرنٹ ہے۔ آپ ہم پر بھروسہ کر سکتی ہیں اور یہ سوچ کر
ہم روشانے کے متعلق پوچھ چکے ہیں۔ اور اپنے معاملات میں ہم سے زیادہ حساس کوئی نہیں ہو سکتا۔"
وہ کہہ رہے تھے ہو سکتا ہے انہوں نے عام معنوں میں یہ بات کی ہو مگر ماہین کو محسوس ہوا گویا وہ کچھ جانتے ہیں۔

"ہیلو۔"

"جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ سن رہی ہوں۔"

"وہ کیا بات ہے جس کو منہ سے نکالنے کا مرحلہ ہی نہیں آیا؟"

"اب کیا فائدہ۔۔۔۔ جس کی بات ہے جب وہی نہیں۔" ماہین آزردگی سے گویا ہوئی۔

"وہ ہماری حدود سے دور کہیں بھی نہیں جا سکتی۔ ایک دن لا کھڑا کریں گے اسے آپ کے سامنے۔"

"کیا وہ آپ کے پاس موجود ہے؟" وہ ایک دم مشکوک ہو گئی۔

"یہ بات چھپانے والی تھی؟ ہم نے کہا ناں وہ ہماری رینج سے باہر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ معاملات مکمل طور پر باخبر ہوں اور جب وہ ہمارے اختیار میں آ جائے تو ہم پوزیشن ڈیل کر سکیں۔ سمجھ رہی ہیں ناں آپ؟"

"جی ہاں۔"

"جی۔۔۔۔ تو وہ مسئلہ کیا ہے؟"

"وہ۔۔۔۔ دراصل یہاں شادی پر رضامند نہیں ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں علم ہے۔۔۔۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کی کسی سے کمٹ منٹ ہے؟" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"کمٹ منٹ تو نہیں کہہ سکتے۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی "مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ سب کچھ جان کر آپ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" وہ آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔

تیمور علی خان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔ وہ آپ سے زیادہ ہماری ہے۔"

"لیکن آپ کے ہاں عزت و وقار کی خاطر اپنے خون کو قتل کرنے کی روایتیں بھی موجود ہیں۔" اس نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

"حالات و ماحول بہت تبدیل ہو چکا ہے۔ ہم نے آپ کو زبان دی ہے۔ ہمارا زبان دینا عام بات نہیں ہے۔" ان کے لہجے میں آنچ آنے لگی۔

ماہین پھر بھی خاموش رہی۔

"ہیلو۔۔۔۔ وہ آپ بات کر رہی تھیں کہ کمٹ منٹ نہیں ہے۔ پھر کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے آپ شاکڈ ہوں گے۔" وہ مسلسل ہچکچا رہی تھی۔

"ہیلو۔" تیمور علی خان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ خود پر کنٹرول کر رہے ہیں۔

"میں وہ اپنے آپ ہی کی شبیہ 'ہادی' میں دیکھ رہی ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

دوسری جانب چند لمحے سناٹا طاری ہو گیا۔ ماہین کو ہول آنے لگے۔

"ہیلو۔" بالآخر خاموشی ٹوٹ گئی۔ اس مرتبہ ان کی آواز ایک دم سپاٹ تھی۔

"جی۔"

"ہماری اور آپ کی گفتگو کا علم اور کسی کو نہیں ہونا چاہئے۔ یوں سمجھئے۔ یہ روشی کے حق میں اچھا ہوگا۔ یہاں تک کہ ہادی کو بھی نہیں۔ اوکے۔ خدا حافظ۔"

ماہین ریسیور ہاتھ میں تھامے گم صم بیٹھی رہ گئی۔

"آپ کے بیٹے سے فون آیا تھا بی بی؟" گل آس پاس ہی منڈلا رہی تھی۔

"جاؤ۔۔۔۔ تم اپنا کام کرو۔ تم نے کیا رپورٹ لکھنی ہے؟" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ بات تو ہو گئی تھی۔ مگر وہ الجھن میں پھنس گئی تھی۔

"کیا اس نے ٹھیک کیا؟ روشی کے چاچا پر اعتبار کر کے کہیں ہادی کو نقصان نہ پڑ جائے۔"

"مگر ان کے خلوص پر کیسے شبہ کیا جا سکتا ہے؟ وہ اتنی دور بیٹھ کر یہاں کے طوفان کو محسوس کر رہے ہیں۔ یا وہ کوئی پہلے سے ہی اندازہ کر چکے ہیں؟"

وہ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتی وہیں ہال میں بیٹھ گئی اور میگزین کی ورق گردانی ہونے لگی۔

لان کی ایکسٹرا لائٹس بجھائی جا چکی تھیں۔ ہادی نے کلاک کی سمت دیکھا۔ بارہ بج کر چند منٹ ہوئے تھے۔ اس نے رسٹ واچ اتار کر کلائی میں ڈالی۔ اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

"گیسٹ روم کے دروازے پر دستک دی۔

"دروازہ کھلا ہوا۔" روشی کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

روشی آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔ اس نے چونک کر بازو آنکھوں سے ہٹایا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

"کل حویلی واپس جا رہا ہوں۔ کیا پیغام دو گی وہاں کیلئے؟"

"اگر تم نے وہاں جا کر بتایا کہ میں یہاں ہوں تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ غرائی۔

"تو کیا کاکا جان کو نہیں بتائیں گے؟" ہادی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔۔۔۔ جب تک میری مرضی نہیں ہو گی وہ نہیں بتائیں گے۔"

"اوہ" باری کے منہ سے استعجابیہ انداز میں آواز نکلی۔

"پھر کب تک یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟" اس نے کہیں بیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

"جب تک کاکا جان چاہیں گے اور معاملات میرے حق میں ہو جائیں گے۔ دوسری صورت میں اس مرتبہ واپس جاؤں گی تو کر کنوؤں میں بانس ڈلوائیں گے تو بھی نہیں ملوں گی۔ اب تم بھی جاؤ یہاں سے نہ مجھے تمہاری ضرورت ہے نہ تمہاری صورت دیکھنے کی۔"

"پہلے بھی تھی کیا؟" وہ متبسم ہوا۔ "بہرحال میں اس وقت آپ سے لمبی چوڑی بات چیت کرنے نہیں آیا تھا۔ اس کی خیریت معلوم کرنی تھی۔ دعا کرتا ہوں وہی ہو جو آپ چاہیں، یقین کریں۔ مجھے آپ کے دکھ پر خوشی نہیں ہو سکتی۔"

"آپ آرام کریں۔ یہی بہت ہے کہ کاکا جان جیسے نفیس اور اسٹرک آدمی آپ کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ شب بخیر۔"

"باری"۔ اس نے بے ساختہ آواز دی۔

"جی؟"

"دیکھو... حویلی جا کر زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو پھر تم مجھے جانتے ہو۔" اس نے گویا دھمکی دی۔

"پتا ہے مجھے... اور مجھ سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ بھی پتا ہے۔ اوکے۔" وہ باہر نکل گیا۔

تیمور علی خان اسٹڈی کے آگے بنی بالکنی میں یونہی سگار پینے کی غرض سے آ کھڑے ہوئے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔ مابین سے بات کرنے کے بعد انہیں مسئلہ سمجھنے میں کوئی دشواری ہی نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ لائحہ عمل ترتیب دے رہے تھے۔

گیسٹ روم کا دروازہ کھلا تو روشنی باہر تک آئی اور کمرے سے باہر آنے والے کو پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

بالکنی کی لائٹ آن تھی۔ وہ فوراً واپس اسٹڈی میں چلے گئے۔

اور واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور فوراً انٹرکام پش کیا۔ سمندر خان کو ان سے پہلے سونے کی اجازت نہیں تھی۔ فوراً ہی اندر آ گیا تھا۔ "خان"۔

"باری کو بھیجو ادھر اسٹڈی میں۔" وہ ٹائپ رائٹر کے بٹن خواہ مخواہ پش کرنے لگے۔ ان کے چہرے کے تاثرات لمحہ لمحہ تبدیل ہو رہے تھے۔

تقریباً پانچ منٹ بعد باری اندر داخل ہوا۔

"جی خیریت؟"

"ہاں ہاں... سب خیریت ہے۔ بیٹھو۔" انہوں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"سونے لگے تھے کیا؟" انہوں نے سگار کا کش لے کر دھوئیں کے مرغولے بنائے۔

"نہیں تو۔"

"پھر کیا کر رہے تھے؟"

"ویسے ہی شام کے اخبار دیکھ رہا تھا۔ عادت ہے سونے سے پہلے کچھ پڑھنے کی۔ ادھر حویلی میں ہوتا ہوں تو بچوں کی پڑھائی کیلئے اسٹڈی کرتا ہوں۔"

"اب دو روز ہیں تمہارے پیپرز؟"

"اگلے ماہ۔"

"پھر پریکٹس کرو گے؟"

"ان شاء اللہ... اگر بابا صاحب نے اجازت دی۔"

"تم تو ہمارے کام کی چیز بنتے جا رہے ہو۔ وہ کیوں منع کریں گے ہمارا خیال ہے وہ تو تمہیں بار سامنے لانے کیلئے باہر بھی بھیجیں گے۔ ہم تمہیں جج ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ سو پلیز کی ضرورت ہوئی تو ہم بیٹھے ہیں ادھر یہاں۔" انہوں نے پھر کش لگایا۔

"ٹھیک ہے"۔ اس مرتبہ باری کچھ الجھ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ تیمور علی خان نے کبھی اس کی ذات سے متعلق اتنی تفصیل سے گفتگو کی ہو۔

"تمہیدی تھی سی بات ہے۔ اصل بات کی طرف آتے ہیں۔"

"جی؟" اس بار وہ واقعی پریشان ہو گیا۔

"کل کیا دن ہے؟"

"جی... سوموار۔"

"اچھا... ٹھیک ہے۔ کل تمہارا نکاح ہے۔ یہی بتانے کیلئے ہم نے تمہیں بلایا تھا۔"

کوئی آسمان ٹوٹا تھا اس کے سر پر۔

"جی... کاکا جان...؟" وہ اپنی جگہ گم سم ہو گیا۔

"ورشا نے یاور علی خان کے ساتھ... اور کچھ پاس...؟" ان کا انداز انتہائی پرسکون تھا۔

"آپ پہلے میری بات تو سن لیں۔"

"سب کچھ سن لیا ہے۔ سارا الزام ایک کمزور لڑکی پر ڈال کر بری ہونا چاہتے ہو؟" ان کا انداز سرد سا ہو گیا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ اگر وہ میری وجہ سے کسی نقصان سے بچ سکتی ہیں تو میں بڑے سے بڑا نقصان اٹھانے کو تیار ہوں۔ مگر پلیز۔ مجھے اپنے فیصلے کی وجہ تو بتا دیجئے۔" وہ از حد پریشان ہو رہا تھا۔

"تم خوش نہیں ہو... یاور علی خان کی اکلوتی بیٹی؟"

"اگر خود غرضی سے سوچوں تو اس وقت مجھے انتہائی خوشی ہونا چاہیے۔ پلیز وہ نہ سوچیں ان کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ شاید ان کے سارے قریبی رشتے ٹوٹ جائیں۔"

ہاری نے تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کی۔

"یہ نہایت مشکل فیصلہ ہے"۔ وہ مزید گویا ہوا۔

"اتنے بزدل ہو ہاری!..." انہیں غصہ آ گیا "تو کی کمی کہیں کی نہیں رہی اس سے زیادہ کیا نقصان ہوگا اس کا؟"

"وہ بہت جذباتی ہیں۔ میں نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی"۔

"تو اسے اس راہ پر لائے کیوں تھے؟" وہ برہمی سے گویا ہوئے۔

"میں نے انہیں، کبھی ان کے حوصلے بڑھانے کی کوشش نہیں کی اس لئے کہ وہ جتنی وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔ خلوص کا تقاضا تو یہ ہے کہ جنہیں آپ عزیز رکھیں، دور تک ان کی بہتری سوچیں۔ سچ آپ میری حالت زار دیکھ ہی چکے ہیں۔ اگر میں خود غرضی کا مظاہرہ کرتا تو بڑی حویلی سے وہ تنہا باہر نکلتیں۔ میرا ساتھ اور میری حوصلہ افزائی بھی ان کے ساتھ ہوتی"۔

اس نے اتنی وزنی دلیل دی کہ تیمور علی خان جیسا "لوجیکل بندہ" چکرا کر رہ گیا۔

"اچھی بات... ہمیں تمہاری بات پسند آئی۔

مگر فیصلہ ہو چکا۔ اب جو بھی مرحلے ہیں، وہ تم ہمارے ساتھ طے کرو گے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بخدا آپ شاباش۔ یہ معاملہ نمٹ جانے دو۔ باقی تفصیل ہم تمہیں بعد میں بتا دیں گے"۔

ہاری نے بڑی مشکل سے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

سیاہ نائٹ گاؤن میں ملبوس تیمور علی خان کے لب گھنی ڈارک براؤن مونچھوں تلے مسکرا رہے تھے۔

"کاکا جان! پھر سوچ لیں"۔

"یہی تو ہمارا مرض ہے۔ بہت ہی فیصلہ کن قسم کے بندے ہیں ہم۔ برفانی علاقوں میں شکار کھیلتے ہیں۔ صرف ایک جوسٹر مکن کر۔ جوا بھی نہیں کھیلا، مگر زندگی جواری کی طرح گزاری ہے۔ اور ہمیشہ دوسرے ہی کو "شہ" کروایا، ہم کبھی نہیں ہارے۔ البتہ ایک بازی ضرور ہارے۔ مگر ہے اس طرح جس طرح جیتنے والے رہتے ہیں۔ جیتنے والوں کو خوش نہیں ہونے دیا"۔

"یہ تو جذباتیت ہے کاکا جان" "لوجک" "تو نہیں"۔ اس نے صاف کہہ دیا۔

"یہی تو لوجک ہے بندہ خدا۔ ہارے ہم جانے والے پھر عمر بھر ہارتے چلے جاتے ہیں۔ نفسیاتی خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم صرف کامیابیوں کو گنتے ہیں۔ خیر۔ تم آرام کرو۔ کل تمہاری زندگی کا اہم ترین دن ہے"۔

ہاری سوچوں کے ایک اژدہام میں سے باہر نکلا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح خوش ہو۔ تیمور علی خان اس کی "لیک" پر آ گئے ہوئے تھے۔ یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ وہ بھی اس کی ذاتی محنت کے بغیر۔ پتہ نہیں روشی کو اطلاع دے دی گئی یا صبح کو یہ ہم وہاں چھوڑ آئیں گے۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ اتنی بڑی تبدیلی اسلامی سے خواب گاہ آنے تک وہ روشی کو "بی بی" لگائے بغیر سوچ رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے بابا صاحب اور پاور چچا کو نہایت ہی صدمہ ہو۔ مگر ان کے صدمات کا تعلق میری ذات سے ہے۔ ایک جتنی

چاچی لڑکی تھی بڑی ہاری کو بیٹھی ہے۔ اسے ٹھوکریں کھانے کیلئے ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ کتنا ظلم ہے۔ جبکہ حقیقت اس کی بہتری کے بندوبست کر رہی ہے اور میں اسے رونے کیلئے چھوڑ دوں؟ آخر اس کی بہت بڑی بھول ہے مگر تمہیں سے تو مردار بھی حلال ہے۔ وہ ایک زندہ وجود، اپنی ذات کی حفاظت کرتے کرتے اسے داؤ پر لگا دوں؟ یہ سب تو بعد میں بھی دوسرے سامنے نکل آتے۔ مگر اب تو بات ہی اور ہے۔ اب تو شاید بڑی حویلی میں ان کی واپسی ناممکن ہی ہے۔

ہمیں گئے تو کاکا جان یہاں بھی نہیں۔ کر کھلیں گے۔ تم یہاں کو ٹھیک ہے۔

"آپ تو بہت کچھ ہیں۔ ہم میں کیا نظر آ گیا آپ کو؟"

وہ حویلی میں آ گیا تھا۔ اور گیسٹ روم کے دروازے سے مخاطب تھا۔

"کاش میں دیکھ سکتا اس خبر کو سننے کے بعد اس کے تاثرات کیا ہیں؟" وہ مسکرا رہا تھا۔

"السلام علیکم کاکا جان!" وہ تیمور علی خان کو اچانک سامنے دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"وعلیکم السلام۔ ناشتہ کر لیا تھا ٹھیک سے؟"

"کیا روح رہے ہیں کاکا جان۔ اب تو تیج ختم ہونے والا ہے" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"اچھا تم ذرا چادر اوڑھ لو۔ کچھ لوگ اندر آ رہے ہیں"۔

روشی کا دل بیٹھ گیا۔ (کہیں بڑی حویلی سے تو نہیں)۔

"کک۔ کیوں کاکا جان؟" وہ جلدی سے چادر اٹھا کر اوڑھتے ہوئے بدحواسی سے گویا ہوئی۔

"گواہ ہیں، وکیل ہیں، قاضی صاحب ہیں۔ نکاح پڑھانا ہے تمہارا"۔

(یا اللہ۔ کیا مصیبت ہے؟ ساری دنیا ہی کو فکر ہو گئی ہے میرے نکاح کی، یہ اوپر کی) اسے چکر آنے لگے۔ جس جہنم سے وہاں سے نکلی۔ یہاں بھی وہی ——

"تمہارا نکاح ہاری کے ساتھ ہو رہا ہے۔ امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پھر بھی رضامندی کا یہ مرحلہ طے ہونا لازمی ہے"۔

انہوں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"آئیے صاحب!"

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

روشی اپنی جگہ دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ یوں لگا جیسے تمام حسیات سو گئی ہوں۔

ایک کرسی کھینچ کر اس کے پلنگ کے نزدیک کر دی گئی۔

"بیٹی روشانے بنت یاور علی خان! تمہیں حق مہر شرعی ساڑھے بتیس روپے عبدالباری بن عبدالعلی کے نکاح میں دیا جاتا ہے۔ قبول ہے؟"

تیمور علی خان اس کے برابر میں بیٹھ چکے تھے۔

"بولو روشانے"۔ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

روشی کو محسوس ہوا جیسے وہ بے ہوش ہو رہی ہے۔

"روشانے"۔ اس نے پھر کاکا جان کی آواز سنی۔

"بولو بیٹی"۔ قاضی صاحب کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

مگر وہ تو جیسے کسی خواب کے عمل میں تھی۔

کمرے میں اس قدر سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی نہ تھا۔

"جی۔۔۔" وہ جیسے چونک پڑی۔ یوں جیسے ہاتھ آئی چیز واپس چھن جانے کا خطرہ ہو۔

قاضی صاحب نے پھر سابقہ الفاظ دہرائے۔

اس مرتبہ اس نے انتہائی پرسکون انداز میں "جی" کہا۔

تیسری مرتبہ وہی الفاظ دہرائے گئے۔ اس نے جیسے انتہائی دل و جان سے "جی" کہا تھا۔ اور اطراف میں موجود افراد کی مرتبہ کہنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

"مبارک ہو خان صاحب"۔ اس نے قاضی کی آواز سنی۔

ذہن میں ایک دم جھماکا سا ہوا۔ ہیں۔۔۔ کیا واقعی یہ سب ہو گیا

تیمور علی خان نے اسے شانوں سے تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور اس کے سر پر آہستگی سے ہاتھ رکھ دیا۔

گویا ایک دم سارے بند ٹوٹ گئے۔ وہ ایک دم بے اختیاری ہو کر رو پڑی تھی۔ جانے کیا کچھ ایک فلم کی صورت اس کی نظروں کے سامنے متحرک ہو چکا تھا۔

تیمور علی خان اس کی پشت تھپتھپانے لگے۔ اور وہ بے ہوش ہو کر ان کی آغوش میں ڈھے گئی۔

باری ابھی بھی گزری زندگی میں اچانک در آنے والی اور سر سے پاؤں تک ہلا دینے والی تبدیلی پر گہرائی سے سوچ بچار میں مبتلا تھا۔

دوپہر کا کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے ہوئے اس نے بے ساختہ سوچا تھا۔ آج اس اہم ترین دن۔۔۔ اس نے کھانا اکیلے کھایا ہو گا؟

ہاں تو اسے بہت خوش ہونا چاہیے کہ اس انداز کی خوشی اس نے خدا سے خود مانگی تھی۔

"اچھا۔۔۔ تم یہاں کھڑے ہو۔ کتنے بجے واپسی کا ارادہ ہے؟" تیمور علی خان اچانک اس کی پشت پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

"بس۔۔۔ ابھی اسی وقت۔۔۔ آپ کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا"۔ اس نے سادہ انداز میں گفتگو کی۔

"ہاں شام کے پونے چار تو بج رہے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں کسی ہدایت یا تاکید کی ضرورت تو نہیں؟" وہ سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔

باری خاموش رہا۔

"ہاں وہ۔۔۔ اگر تم جانے سے پہلے روشانے سے ملنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کپڑے وغیرہ میں نے اس کے منگوائے تھے۔ کچھ بازار سے آگے مرتبہ۔۔۔ تم آؤ اور اپنی طرف سے کچھ دینا چاہو تو مرضی ہے تمہاری۔۔۔ او کے؟" وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر واپس پلٹ گئے۔

باری نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ریلنگ پر بازو ٹکا کر جھکنے کے انداز میں گیسٹ روم کا بند دروازہ دیکھا۔ اس کی

آنکھوں میں شریر سی چمک در آئی تھی۔

لاکھ "آپ آپ" کرتا رہا تھا مگر تھا تو آخر مرد ۔۔۔۔ ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ سفید براق شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔

"کیا ایسے ہی خالی ہاتھ؟" اچانک اسے خیال آیا۔ "خیر کون سا سب کچھ پلاننگ سے ہوا ہے اور نہ ہی "رومانس" کا موقع آیا ہے"۔

کھڑکی سے زینے طے کر کے وہ نیچے آیا تھا۔

آج اس کی چال کا انداز ہی کچھ اور تھا۔

اس نے بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

جانے کتنی دھول مٹی اتار کر وہ اسی دم باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ سرخ کڑھائی کی گہری زرد فراک اور سرخ شلوار میں وہ خود کو بالکل تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ اس کے باوجود گھٹنوں سے ایک اعصابی کشاکش جاری تھی۔

اس نے بیڈ پر پڑا سرخ دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالا۔ گیلے بال تولیے میں لپٹے ہوئے تھے۔

"ہوں"۔ اس کا خیال تھا سمندر خان چائے لے کر آیا ہوگا۔

باری دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

دھک ۔۔۔۔۔ وہ سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ جیسے دل کہیں نکل کر بھاگ جانا چاہ رہا ہو۔ خواہ مخواہ ہی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔ اندازہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کہ اس طرح کا وقت بھی زندگی میں آ جائے گا۔

"السلام علیکم"۔ باری کی شریر آواز اس کے کانوں میں آئی۔

وہ خاموش رہی ۔۔۔ بولا ہی نہیں گیا۔ بس یہی دھیان آیا کہ وہ چادر درست کر لینا چاہیے۔

باری کو اسے اس انداز میں دیکھ کر بہت لطف آ رہا تھا۔

"مسلمان سلام کا جواب دے کر بہت سا ثواب حاصل کرتے ہیں"۔ اس کے لہجے میں بلا کی شرارت تھی۔

اس نے باری کی طرف سے فوراً پشت کر لی۔ "دے دیا ہے دل ہی دل میں"۔ اسے اپنی حالت اور احساس بے بسی پر بھی غصہ آ گیا۔ اسے اپنی مظلومیت بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"کاش باقی سب کچھ بھی دل ہی دل میں کر لیا کریں۔ کم از کم اتنی تکلیف تو نہ اٹھائیں"۔ وہ کرسی کی طرف بڑھا۔

"بیٹھ سکتا ہوں؟"

"مجھے پتا نہیں"۔ وہ فطری حیا کے حصار میں آ چکی تھی کہ ہر تعلق کچھ مخصوص احساسات کا فطری پابند ہوتا ہے۔

"یعنی ۔۔۔۔ سیدھا سیدھا مطلب ہے بیٹھ جاؤ"۔ وہ باز نہیں آ رہا تھا۔ وہ دوبارہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ غالباً بال تولیے سے آزاد کرنے گئی تھی۔

پتا نہیں یہ کیا ہے۔ میں نے تو اس کے سامنے کبھی کسی بات کی پروا نہیں کی۔ آج دل جھکتا عجیب لگ رہا ہے یا اللہ یہ کیا

رہا ہے مجھے ۔۔۔ وہ الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اس نے برش سے بال سلجھانا شروع کر دیے۔ پھر پتا نہیں کیا سوچ کر ہاتھوں میں برش پکڑے ہوئے واپس کمرے میں آ گئی۔

"شکریہ ادا ہو ۔۔۔ حضرت میں طویل نشست کا ارادہ کر کے نہیں آیا۔ میں بڑی حویلی روانہ ہو رہا ہوں۔ سوچا بتاتا چلوں۔ پھر جانے کب اور کیسے حالات میں ملاقات ہو"۔

اس کے سامنے باری کا عکس نمایاں تھا۔ وہ چپ چاپ بالوں میں برش چلاتی رہی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی باری کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"کوئی بات ہی نہیں ہوئی آج ۔۔۔۔ کوئی چھوٹی موٹی لڑائی"۔

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بہت اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کا لہجہ بہت شوخ تھا اور آواز بہت دھیمی تھی۔

اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ اس کے اس انداز پر۔

"باری"۔ اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

"زہے نصیب"۔ وہ چھیڑ رہا تھا۔

"تم جاؤ یہاں سے؟" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"ایسے تو نہیں جا سکتے۔ "وقوعہ" میں قتل پرست ملوث ہیں۔ کیسا انجام دیا ہے۔ چند بیٹا ہم بھی تو سنیں۔ کس طرح؟"

"مجھے نہیں پتا ۔۔۔ پلیز باری ۔۔۔ مجھے تنگ نہیں کرو"۔

"آپ نے مجھے اتنا تنگ کیا۔ میں نے کبھی آپ سے کہا؟" وہ جھوٹ موٹ شریر انداز میں کہہ رہا تھا۔

"سوچ لیجیے خود ہمارا ہی ہیں۔ پتا نہیں اب کب آئیں۔ ویسے بھی دیکھنے کوئی چاہتا ہے بیٹا ہم مجبور ہو جائیں گے۔ شیر خان آتا جا رہا ہے"۔ وہ سرگوشی سے ذرا کچھ اونچی آواز میں مخاطب ہوا۔

"ہائے اوئے ۔۔۔ یا آج آپ کو ہو کیا گیا ہے ۔۔۔؟" اسے آج اس کی حالت دیکھ کر بہت لطف آ رہا تھا۔

"باری ۔۔۔!" روتا تو اسے یوں بھی آئے چلا جا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے روئے چلی جا رہی تھی۔ پھر رونا شروع کر دیا۔

باری ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے کھڑی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے نزدیک چلا آیا۔ اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ آنسو ایک تواتر سے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

اس نے ایک ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھ تھامے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے اس کے اشک صاف کیے۔

"روشانے! صرف اور صرف اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں' آپ کو دکھوں اور حادثوں سے بچانے کی خاطر بہت کچھ کر چکا۔

مگر اب جب یہ سب کچھ ہو ہی گیا ہے تو آپ کی مشقت کے دن ختم ہو گئے۔ اپنے اور آپ کے حصے کے سارے بوجھ اب صرف میری ذمہ داری ہیں۔

آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ بالکل ریلیکس رہیں۔
اب بالکل بھی نہیں رونا"۔

روشی کو نئے رشتے کی قربت بہت محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کی گرفت سے اپنے ہاتھ چھڑانے لگی۔

"یہ دلہن کی کلائیاں تو بالکل خالی ہیں"۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں روشی کے دونوں ہاتھ تھے۔

"ابھی میں دلہن نہیں ہوں"۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے سادگی سے کہہ دیا۔

"پھر کب.....؟" اس کے لہجے میں عجیب سی آنچ تھی۔

"ہادی"۔ وہ پھر روہانسی ہونے لگی۔

"اچھا چلو مزید تنگ نہیں کرتے"۔ ہادی نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ "اچھا خدا حافظ"۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کتنا دباؤ تھا اس کے ہاتھوں میں..... اس کے دبیز اور نرم ہاتھوں پر سرخی چھلکنے لگی تھی۔ دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا ہو گیا تھا۔

"کیسا ہے..... لگتا تو نہیں تھا"۔ چہرے پر حیا کا طلسم چھا رہا تھا۔

اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور خود کو بہت نئی سی لگی۔

ہادی کی جیپ اندر داخل ہوئی تو منتظر کھڑی ماہین دریچے سے ہٹ کر بڑی تیز تیز چلتے ہوئے باہر آئی۔ مگر برآمدے میں رک کر سوچنے لگی۔ ضروری تو نہیں ہادی ہو کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ اپنے خیالات میں الجھی ہوئی تھی کہ ہادی سامنے آ گیا۔

"السلام علیکم"۔

"وعلیکم السلام۔ شکر ہے تم آ گئے۔ سرائے گئے ہوئے تھے ناں؟ کل دراصل میں ہری پور چلی جاؤں گی اس لئے تمہارا انتظار کر رہی تھی"۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی۔

"خیریت؟" ہادی کی ساری ترنگ حیرت میں بدل گئی۔

"وہ..... بات یہ ہے کہ تم سرائے ہی میں تھے اور تیمور علی خان کا فون میرے لئے آیا تھا"۔

وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔

ہادی گڑبڑا کر رہ گیا۔ (کیا انہیں باخبر کر دیا گیا۔؟)

"جی..... مگر آپ کیلئے کیوں.....؟" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بغور ماہین کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"روشی کے سلسلے میں بات کر رہے تھے کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی؟ مجھے ضرور علم ہوگا..... اگر نہیں ہے تو ہونا چاہیے تھا۔ وہ تیمم سے شادی پر رضامند کیوں نہیں ہے؟ آیا کسی کو پسند کرتی ہے؟"

"پھر.....؟" ہادی بری طرح الجھ گیا تھا کہ ماہین کا انداز اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"پھر کہنے لگے کہ ماسی ریحانی (تقاریب) کے لئے آگے ہیں انہوں نے کہا اسی طرح گھما پھرا کر سوال کئے کہ میں بس اتنا کہہ پائی کہ وہ [illegible] آئیڈیل ہی نکلتی ہے۔ ہادی کے وہ اس کے آئیڈیل ہی پورا اترتے ہیں"۔

"ہوں ہوں..... جی....." ہادی کی دلچسپی اپنے عروج پر تھی اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ آگے بات سننے کیلئے بے تاب ہے۔

"بس پھر انہوں نے فون بند کر دیا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی کہ پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ کہیں تمہیں کوئی مشکل نہ پیش آ جائے۔ یہ تو دراصل میں تمہارے ساتھ ہادی ہوں ناں۔ روشی کا تو کوئی اتا پتا ہی نہیں ناں"۔ وہ بہت فکرمند نظر آ رہی تھی۔

"ہوں"۔ ہادی نے اطمینان کا سانس لیا۔ روشی سے متعلق وہ سوال کرنا چاہتا تھا مگر اس کے انداز سے لگتا تھا کہ ماہین انجان ہے۔ علم ہوتا تو وہ پہلی فرصت میں روشی کی خیریت پوچھتی۔

وہ تو اندازہ لگانے کیلئے بس یہی پوچھتا کہ روشی کے متعلق کیا کہہ رہے تھے۔ اب تو یوں بھی وضاحت ہو گئی تھی۔

"تم سے تو کوئی بات نہیں کی انہوں نے اس طرح کی.....؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"کس طرح کی.....؟" ہادی نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کنٹرول کی۔

"وہی جو میں ان سے کہہ چکی ہوں"۔ وہ نہایت سادگی سے بولی۔

"نہیں انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ اتنا اچھا برتاؤ کیا کہ میں خود کو وی آئی پی فیل کر رہا تھا"۔

"کیا؟" ماہین کو جیسے یقین نہیں آیا۔

"کہیں تو قسم کھاؤں.....؟" اس کا لہجہ نہایت شگفتہ تھا۔

"ہی از اے جنٹل مین۔ تھینکس"۔ ماہین کی جان میں جان آئی۔

"آپ ملی ہیں ان سے؟" ہادی کا انداز یکلخت تجسس ہو گیا۔

"نہیں..... کل انہوں نے خود اپنا تعارف کرایا تھا۔ وہ تو شاید ہماری شادی میں بھی شریک نہیں تھے۔ اور میں نے انہیں ولیمے میں بھی نہیں دیکھا۔"

وہ اتنا الگ تھلگ کیوں رکھتے ہیں خود کو..... کم از کم مجھ سے ایک بار تو ملنا چاہیے تھا؟"

"وہ ذرا اور مزاج کے ہیں۔ عمر کا زیادہ حصہ انگلش سوسائٹی میں گزارا ہے یہاں والوں سے ان کی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔ خون کے رشتوں سے چونکہ دور رہ کر زندگی گزاری ہے اس لئے بس فارمل سے ہیں۔ اور تو کوئی بات نہیں"۔

ہادی نے انگلی میں کی رنگ گھماتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔

"مگر یار صاحب..... ہی از اے ڈیسنٹ پرسنالٹی اینڈ رئیل گڈ بوائے۔ کم از کم ان سے انڈر اسٹینڈنگ ہونا چاہیے"۔

[illegible]

"جی اندازہ تو چاہیے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہے بھی۔ ابھی آپ اندازے لگانے میں جلدی نہ کریں۔" اس نے بہت احتیاط سے بات کی۔

"ایک بات کہوں، مائنڈ تو نہیں کریں گے؟" ماہین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں نہیں۔ آپ کہیے۔" وہ ایک دم اسمارٹ ہو گیا۔ بالکل چوکس۔

"نمبر ایک جب کوئی آئیں بائیں شائیں کرتا ہے تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ مجھے ایک چھوڑ دینا چاہیے۔" بحیثیت کم بیوقوف ہرگز نہیں ہوں۔

نمبر دو..... مجھے نہایت دکھ سا محسوس ہو رہا ہے کہ کہاں تو تمہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کو بھی آج آپ سوچ میں اسے محو اور گم ہو کر یہ بھی یاد نہیں کہ روشنی ہو رہی ہے۔" ماہین کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ آپ لوگوں کی خاطر بھی ہم گھر کے مردوں کو اپنے اعصاب کنٹرول کرنا چاہیں۔ سو وہ پریشان ہونے والی بات ہے۔

پلیز آپ آرام کیجیے۔ پھر آپ کو صبح لمبا سفر کرنا ہے۔ گڈ نائٹ۔"

وہ اس کے پاس سے تیزی سے گزر گیا۔

اور وہ کھڑکی پر سوچ رہی تھی۔ کہ اس کو اس گفتگو سے کیا مطلب کرنا چاہیے جو کہ نہایت بے ربط اور مبہم تھی۔

"دیکھو آپا..... تمہارا بچہ اوپر برتھ سے گر جائے گا۔"

بالو کی جان سولی پر لٹک رہی تھی۔ بچہ آمنے سامنے کی برتھوں کو اس طرح استعمال کر رہا تھا۔ جیسے فرش پر چل رہا ہو۔ ہر بار بالو کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ اب آیا نیچے کر تب۔

"کیا آپا آپ کا لڑکا ہے۔ میری عمر کی ہو بہن۔ جہاں آرا نام ہے میرا۔ باز نہیں آئے گا۔ عبدالغفار کے بچے ہو۔"

"یہ آپ کی لڑکی بار بار کھڑکی سے باہر سر نکال رہی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" بجلی کے کھمبوں کے پاس سے گزرتی یا گھنی جھاڑیوں کے قریب سے تو واقعی بالو کا دم اٹک جاتا۔

"سنے گی نہیں..... کی بچی (موٹی سی گالی)" بالو کی نشاندہی پر عورت کو چھالا ہوا کیونکہ عذاب ہو گیا۔

تیسری بچی گود سے لت پت لال فراک میں ملبوس بالو کی گود میں پڑ گئی۔

"میں بھی باہر دیکھوں گی" دوسری کھڑکی کے سامنے بالو کی سیٹ تھی۔

"اندھیرا ہو رہا ہے کیا دیکھے گی؟ تیرا باپ ناچ رہا ہے باہر۔ چل تو نیچے ادھر آ کر بیٹھ۔" عورت نے منہ سے کیلے کا نالے اور پیلے سے فرش پر پڑے ہوئے چھلکوں کے درمیان گویا مزید موتی ڈال دیے۔

"یہ جو خالی شاپنگ بیگ ہے آپ چھلکے اس میں ڈال لیتیں۔" بالو سے رہا نہ گیا۔

"بہن! ہم نے تو چوبیس گھنٹے گزارنے ہیں تم شاید یہاں رہنے آئی ہو یا یہ ڈبہ دل کا ساتھ لے کر جاؤ گی۔" عورت

بچی کر دی۔ بالو کی جان جل کر خاک ہو گئی۔

"چائے والا گرم چائے" ایک آدمی پانچ سات گلاس کی کیتلی کے ساتھ جانے کہاں سے نمودار ہوا۔

"امی چائے پیوں گی" لال فراک والی بچی چلائی۔

"امی..... میں بھی" لڑکے نے بھی اوپر سے آدھا دھڑ نیچے لٹکایا۔

"چپ کر کمینوں..... نشہ چڑھ جاتا ہے تمہیں کا" چائے والے نے رک کر "مادام سٹوکا میں" "کہا اور" کا اندازہ کیا۔ پھر باقی ڈبوں پر نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

بچی بالو کی گود سے اتر کر فرش پر لوٹنے لگی۔ "چائے پیوں گی" حالانکہ تھوڑی دیر قبل ہی سب بچے اس سمت سے بھی پکڑ کر لا رہے ہوتے تھے۔

"الو ہی ہے کر گلاس دو..... ؟" اس نے کیتلی کی چائے منہ میں ڈال کر آنکھیں نکالیں۔ کیونکہ صرف "دو" کی وارننگ تھی۔ اور بچی واقف تھی۔ بلا مطلق اثر نہ ہوا۔

بچی کی ریں ریں سے اعصاب چٹخنے لگے۔ اس نے بے چارگی سے اطراف میں نظر دوڑائی۔ دو تین عمر رسیدہ عورتیں اور ادھر عمر پٹھانیاں اور ایک ادھیڑ اسٹائلش بوڑھی عورت بھی بالو کی طرح بچی کی ریں ریں سے عاجز نظر آ رہی تھیں۔

"لے دو ناں اسے چائے۔ سارا تو سر پیٹ کر رہا ہے۔ شور سے" ایک پٹھانی سے برداشت نہ ہوا۔

"تم نے پیدا نہیں کئے نا بے اولاد ہو۔ بچے تو کرتے ہی ہیں اس طرح" عورت پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"خانہ خراب..... !" پٹھانی بڑبڑا کر رہ گئی۔

"آپ کدھر جا رہی ہیں؟" بالو نے ماحول کے اثر سے نکلنے کی خاطر پٹھانی سے بات چیت شروع کر دی۔ حالانکہ تھکن سے طبیعت بوجھل تھی۔ مگر "جہاں آرا بیگم" نے وہ آفت مچائی ہوئی تھی کہ الامان۔

"نوشہرہ جائے گی۔"

"اور یہ؟" اس نے دوسری پٹھانی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ہمارا بڑی بہن ہے۔ ہم دونوں کا شادی ایک ہی گھر میں ہوا ہے۔"

"آپ سسرال جا رہی ہیں" بالو نے بات برائے بات کی۔

"ہمارا سسرال تو سب نوشہرہ میں ہے۔ ہمارا مرد کراچی میں فروٹ کا کام کرتا ہے۔"

"پھر تو بڑی آمدنی ہو گی۔ فروٹ والے تو منڈی سے ڈبل ریٹ پر بیچتے ہیں۔ ویسے اتنا منافع بھی جائز نہیں۔ رزق حرام ہو جاتا ہے ایک طرح سے۔" جہاں آرا بیچ میں کود پڑی۔

"حرام خور تو ہم کو لگتا ہے..... کیسا اپنا مرد کو بیوی پھنکا کے جو بچے مانگتا ہے خرچتا ہے۔ ہمارا مرد تو ہم ہوٹل میں کام کرتا ہے۔"

"تو نے مجھے حرام خور کہا۔ سود خوری کی قوم سے ہے اور مجھے حرام خور کہتی ہے۔ مرد کا کمائی اپنے بچوں کیلئے ہے۔ لعنت

تیری شکل پر"۔

جہاں آرا نے زبردست "بھراڑ" کیا۔

"کس پر لعنت بھیجتا ہے۔؟" پٹھانی نے آگے بڑھ کر جہاں آرا کا گریبان دبوچ لیا۔

بالو کی طبیعت اندر کسی زاویے سے مطمئن ہوئی کہ اب ملا ہے اس جہاں آرا کی بچی کو سوا سیر۔ پہلے وہ گفتگو کی پٹھانی کو پٹھانی ہے۔

مگر جب دونوں طرف سے ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ اور بچوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تو وہ زیادہ دیر سے سہمی سی لگی۔ دوسری خواتین بھی بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ بلکہ دوسرے کمپارٹمنٹ کی خواتین نے بھی آ آ کر جھانکنا شروع کر دیا تو اٹھ کر بیچ بچاؤ کرانے لگی۔

پٹھانی نے ایک ہاتھ سے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ دھپ سے سیٹ پر جا گری۔

دوسری پٹھانی نے کھڑے ہو کر دونوں کو الگ الگ کرنے کی سعی کی تھی۔

"چھوڑو (چھوڑو) اس کو لعنت کرو بیٹو (بیٹھو) آرام سے"۔ اس نے اپنی بہن کو سیٹ پر بٹھایا۔

جہاں آرا کلائی سے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جھاڑنے لگی۔ اس کے روکھے بال جھاڑ جھنکاڑ بنے ہوئے تھے۔ بچے سہم کر ماں کے قریب آ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر کو وہاں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ صرف ٹرین کی چھکا چھک سنائی دے رہی تھی۔

"تم پشاور جا رہی ہو۔؟" اردو اسپیکنگ بڑی بی نے بالو کو مخاطب کر کے خاموشی توڑی۔

حالانکہ ابھی وہاں "جنگ" کا ماحول طاری تھا۔ دونوں حریف گم سم بیٹھے ایک دوسرے کو خونی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"ٹکٹ" والا کہہ رہا تھا۔ پشاور سے تمہاری منزل دور پڑے گی۔ اس سے پہلے کسی اسٹیشن پر اتر کر بس یا کوئی اور سواری لے لینا۔

پشاور سے پہلے کیا کیا آتا ہے؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔ بڑی بی تعجب سے بالو کو دیکھنے لگیں۔

"نوشہرہ.....حسن ابدال۔ اٹک"۔

"ہاں.....ہاں.....میں حسن ابدال اتروں گی"۔ اس نے بڑی بی کو بیچ میں روک دیا۔

"پہلی مرتبہ جا رہی ہو....." بڑی بی بڑی چنچل ہوئی تھیں۔

"لگتا ہے یہ تو ریل گاڑی میں ہی پہلی مرتبہ بیٹھی ہے"۔ جہاں آرا نے گدھے کے کان اینٹھے جانے کیا کیا کر کے پیدا کیا تھا اس کی ماں نے۔

دانش مند بڑی بی نے باقی "انٹرویو" موقوف کر دیا۔

"کچھ....." ماہین نے عالم خواب کی خواب گاہ سے تھکی تھکی آواز دی۔

"جی بی بی؟"

"سرسوتی کو بھیجنا میرے پاس۔ ابھی"۔ ماہین اسے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور دوبارہ بے سدھ ہو کر لیٹنے لگی۔ یہ صبح کی تیاری تھی۔

تھوڑی دیر بعد سرسوتی نے دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ"۔

"جی بی بی"۔

"سرسوتی مجھے جھومر کے پاس جانا ہے"۔

"ہاں بی بی..... تے فیر چلو (تو پھر چلو)"۔ وہ مستعد ہو گئی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی تو سب جاگ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آنا۔ میں اتنے میں پیکنگ کر لوں۔ کوئی فقیر ڈھونڈ کے لاؤ بہت شوق سے ملتی ہے"۔

سرسوتی واپس چلی گئی۔ ماہین سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے لگی۔

اس کے چہرے پر اتنے سوال بکھرے ہوئے تھے کہ استحالی پر چھایا ہوا تھا۔

وہ ہری پور جانے سے پہلے چند سوالوں کے جواب چاہتی تھی۔ جس نے اس کو الجھن میں مبتلا کر رکھا تھا۔

اس نے کپڑے رکھنے کے بعد دوسری ضروری اشیا بھی رکھیں۔ اچھا خاصا سامان ہو گیا تھا۔

"پھر سرسوتی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کھجور کی باسکٹ تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں تھی۔

وہ آف وہائٹ بڑی سی چادر اچھی طرح اوڑھ کر سرسوتی کے ساتھ چل پڑی۔ اور مخصوص راستے سے گزر کر جھومر کے کمرے تک پہنچ گئی۔

سرسوتی نے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

ماہین نے خود آگے بڑھ کر دروازہ دھکیلا۔ کمرا خالی تھا۔

"شاید باتھ روم میں ہے؟"

"تساں بہہ جاؤ۔ میں ای آئی"۔ سرسوتی باسکٹ رکھ کر باہر چلی گئی۔

ماہین کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور انتظار کرنے لگی۔

سرسوتی فوراً ہی جھومر کو لے کر آ گئی تھی۔

"کہاں تھیں؟" اس نے مسکرا کر جھومر سے دریافت کیا۔

"وہیں.....اپنے جوز کملی کے پاس۔ لگتا ہے آپ کا بھی دل لگ گیا ہے ہمارے گروپ میں"۔ جھومر ہنس پڑی۔

"نہیں.....وہ دراصل مجھے اس عورت سے ملنا ہے جس کا بڑا شاعرانہ سا نام ہے وہ میری بہن کے عہد کی عورت ہے

تیری شکل پر"۔

جہاں آرا نے زبردست "بھرا" کیا۔

"کس پر لعنت بھیجتا ہے۔۔؟" پٹھانی نے آگے بڑھ کر جہاں آرا کا گریبان دبوچ لیا۔

بالو کی طبیعت اندر کسی زاویے سے مطمئن ہوئی کہ اب ملا ہے اس جہاں آرا کی بچی کو سوا سیر۔ پیچھے وہ کلکتے کی پٹھانی کر پٹھانی ہے۔

مگر جب دونوں طرف سے ہاتھاپائی شروع ہو گئی۔ اور بچوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تو وہ زیادہ دیر سے گھبرانے لگی۔ دوسری خواتین بھی بالکل ٹھس بیٹھی ہوئی تھیں۔ بلکہ دوسرے کمپارٹمنٹ کی خواتین نے بھی آ آ کر جھانکنا شروع کر دیا تو وہ اٹھ کر بیچ بچاؤ کرانے لگی۔

پٹھانی نے ایک ہاتھ سے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ دھپ سے سیٹ پر جا گری۔

دوسری پٹھانی نے کھڑے ہو کر دونوں کو الگ الگ کیا کیونکہ وہی کر سکتی تھی۔

"چھوڑو (چھوڑو) اس کو لعنت کرو بیٹو (بیٹھو) آرام سے"۔ اس نے اپنی بہن کو سیٹ پر بٹھایا۔

جہاں آرا کلائی سے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جھاڑنے لگی۔ اس کے روکھے بال جھاڑ جھنکاڑ بن چکے تھے۔ بچے سہم کر ماں کے قریب آ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر کو وہاں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ صرف ٹرین کی چھکا چھک سنائی دے رہی تھی۔

"تم پشاور جا رہی ہو۔۔؟" اردو اسپیکنگ بڑی بی نے بالو کو مخاطب کر کے خاموشی توڑی۔

حالانکہ ابھی وہاں "جنگ" کا ماحول طاری تھا۔ دونوں حریف گاہے گاہے ایک دوسرے کو خونی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"ٹکٹ"۔ والا کہہ رہا تھا۔ پشاور سے تمہاری منزل دور پڑے گی۔ اس سے پہلے کسی اسٹیشن پر اتر کر بس یا کوئی اور سواری لے لینا۔

پشاور سے پہلے کیا کیا آتا ہے؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔ بڑی بی تعجب سے بالو کو دیکھنے لگیں۔

"نوشہرہ۔۔۔ حسن ابدال۔ اٹک"۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں حسن ابدال اتروں گی"۔ اس نے بڑی بی کو بیچ میں روک دیا۔

"پہلی مرتبہ جا رہی ہو۔۔۔" بڑی بی بڑی چونکی ہوئی تھیں۔

"لگتا ہے یہ تو ریل گاڑی میں ہی پہلی مرتبہ بیٹھی ہے"۔ جہاں آرا نے گدھے کے کان اینٹھے جانے کیا کھا کر پیدا کیا تھا اس کی ماں نے۔

دانش مند بڑی بی نے باقی "انٹرویو" موخر کر دیا۔

"کچھ۔۔۔" ماہین نے عالم خواب کی خواب گاہ سے نکلی تھکی آواز دی۔

"جی بی بی"۔

"سرسوتی کو بھیجنا میرے پاس۔ ابھی"۔ ماہین اسے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور دوبارہ بیگ کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔ یہ صبح کی تیاری تھی۔

تھوڑی دیر بعد سرسوتی نے دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ"۔

"جی بی بی"۔

"سرسوتی مجھے جمھور کے پاس جانا ہے"۔

"ہاں بی بی۔۔۔ تے فیر چلو (تو پھر چلو)"۔ وہ مستعد ہو گئی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی تو سب جاگ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آنا۔ میں اتنے میں پیکنگ کر لوں۔ [illegible] بہت شوق سے ملتی ہے"۔

سرسوتی واپس چلی گئی۔ ماہین سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے لگی۔

اس کے چہرے پر اتنے سوال بکھرے ہوئے تھے کہ احتیاطی پردہ چھایا ہوا تھا۔

وہ ہری پور جانے سے پہلے چند سوالوں کے جواب چاہتی تھی۔ جس نے اس کو الجھن میں مبتلا کر رکھا تھا۔

اس نے کپڑے رکھنے کے بعد دوسری ضروری اشیا بھی رکھیں۔ اچھا خاصا سامان ہو گیا تھا۔

"پھر سرسوتی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کھجور کی باسکٹ تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔

وہ آف وائٹ بڑی سی چادر اچھی طرح اوڑھ کر سرسوتی کے ساتھ چل پڑی۔ اور مخصوص راستے سے گزر کر جمھور کے کمرے تک پہنچ گئی۔

سرسوتی نے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

ماہین نے خود آگے بڑھ کر دروازہ دھکیلا۔ کمرا خالی تھا۔

"شاید باتھ روم میں ہے؟"

"تساں بہہ جاؤ۔ میں ہنی آئی"۔ سرسوتی باسکٹ رکھ کر باہر چلی گئی۔

ماہین کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور انتظار کرنے لگی۔

سرسوتی فوراً ہی جمھور کو لے کر آ گئی تھی۔

"کہاں تھیں؟" اس نے مسکرا کر جمھور سے دریافت کیا۔

"وہیں۔۔۔ اپنی بے جوڑ کملی کے پاس۔ لگتا ہے آپ کا بھی دل لگ گیا ہے ہمارے گروپ میں"۔ جمھور ہنس پڑی۔

"نہیں۔۔۔ وہ دراصل مجھے اس عورت سے ملنا ہے جس کا بڑا شاعرانہ سا نام ہے" وہ میری بہن کے عہد کی عورت ہے

"اور ——— تمہیں کیا وہ سوگئی؟"

ماہین نے بات ادھوری چھوڑ کر سوال کیا۔

"نہیں ——— اس بے چاری کو نیند کہاں۔ اور وہاں بیٹھنے کی جگہ کہاں۔ ایسا کرتی ہوں اسے یہیں لے آتی ہوں ایک منٹ"۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

ماہین سامنے لگی پینٹنگ کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد چوڑیوں کے چھنکنے کی آواز آنے لگی۔ دکھ سے ماہین کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"السلام علیکم"۔ عورت نے اندر قدم رکھتے ہی سلام کیا۔ اور وہ قدم آگے آ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔ ادھر اوپر بیٹھ جاؤ"۔ ماہین نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا سمجھ رہی ہیں آپ ——— غلام زادی ہوں' نام پر نہ جائیں۔ آپ نے سنا نہیں۔ آنکھ سے اندھے نام نین سکھ۔ یہ جھومر بی بی ہیں جو کہنے کے باوجود فرق مٹا کر بات کرتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ میں تم ہی میں سے ہوں۔ حالانکہ الگ سے ہیں تو ہماری مالکن ہی ہوئیں"۔

اناثوں کوڑی سی عورت بغیر سانس لئے بولتی چلی گئی۔

"آئے نہیں نظری"۔ ماہین نے جھومر کی طرف دیکھا۔

"کیوں تو نہ کوئیں مجھے"۔ وہ باسکٹ سے چیزیں نکالتے ہوئے سرپٹ کر گویا ہوئی۔ ماہین تو ایک ٹک اسے تک رہی تھی۔

"روشنی بی بی کا پتا چلا؟" عورت کو کتنی دلچسپی تھی حویلی کے معاملات سے۔

"نہیں"۔ ماہین نے دکھ سے کہا۔

"بے چارے یار خاناں"۔ عورت کے لہجے میں بھرپور تاسف تھا۔

"کیا مطلب 'بے چارے'؟" ماہین نے کھوجنے کے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"مطلب یہ کہ ان کی ایک ہی تو بیٹی تھی"۔

"ہے"۔ ماہین نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ دل ہول کر رہ گیا۔

"مجھے سب یاد ہے۔ میں کچھ نہیں بھولی"۔ مطربہ کی آواز ابھر آئی۔

"مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ بہت بھروسا کرتی تھیں' کہتی تھیں' مطربہ تیری شکل کتنی پیاری ہے۔ میں بہت حسن پرست ہوں۔ خوبصورتی کے بیچ رہوں تو خوش رہتی ہوں۔ آس پاس حسن نظر نہ آئے تو یوں ہو جاتی ہوں جیسے باسی سبزی۔ وہ خود ہی ہنس پڑتی تھیں۔ وہ بہت خوش رہتی تھیں۔ بہت ہنستی تھیں"۔

مطربہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ماہین' جھومر اور سروتی حیران پریشان اسے دیکھنے لگیں۔

"آپ کو پتا وہ ان کی ہنسی میں نے کچلی تھی۔ انہیں باسی سبزی میں نے بنایا تھا۔ انہیں جیتے جی میں نے مارا تھا"۔

ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اچانک ماہین کو وہ مکروہ اور بدصورت لگنے لگی تھی۔

"کیا کیا تم نے ان کے ساتھ ——— ؟ میں تو سمجھ رہی تھی وہ بھی شادی ہو کر چلی گئیں۔ جیسے لڑکیاں چلی جاتی ہیں"۔

ماہین کو گھر آنا اسے لگا تھا۔ وہ تو اپنی بہن کے ماضی کے قصے سننے آئی تھی۔ وہ یوں کر وہ علی خان کی الجھی کیفیات نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"یہ پوچھیں کہ میں نے کیا کیا ——— ؟"

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ ماہین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

جھومر تیزی سے دروازے کی سمت بڑھی اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر جھانکا۔

"آپ تو رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یہ سیاسی قیدی نہیں ہے آپ 'اے سی' میں ٹھاتی ہیں۔ لائیے چابی دیجئے۔ بہت ہو چکا تماشا۔ اور اسے بھی باہر نکالیں"۔ ماہین کے کانوں میں باری کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ مار کر دروازہ پورے زور سے کھول دیا۔ اور ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا۔

"آپ ——— یہاں اس وقت؟" وہ بس یہی کہہ سکا۔

مطربہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماہین نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"اسے کچھ مت کہو باری ——— میں نے بلوایا تھا"۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

مطربہ آگے چل پڑی۔

باری کچھ الجھی اور کھوجتی نظروں سے ماہین کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"آپ اسے کیسے جانتی ہیں"۔ اسے خاصی تشویش تھی۔

"ایک گھر میں رہتے ہوئے واقفیت ہو جانا کوئی تعجب کی بات تو نہیں"۔ ماہین کو برمحل جواب سوجھ گیا۔

"لائیے ——— چابی مجھے دیجئے"۔ اس نے جھومر کو مخاطب کیا۔

"ایک منٹ رہ رہ گئی ہو۔ آج کل تو جناب والا یوں بھی اپ سیٹ ہوں گے۔ پریشان لوگوں کو اور کیا پریشان کرنا"۔

جھومر نے بیلٹ سے چابی اتار کر اسے تھماتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

"چلئے؟" باری نے ماہین کو مخاطب کیا۔ گویا جھومر کی بات سنی ان سنی کر دی۔

ماہین اٹھ کھڑی ہوئی۔ چلی تھی سی کر خلش اپنی جگہ موجود تھی۔

"خدا حافظ جھومر! کل تو میں ہری پور چلی جاؤں گی۔ اللہ کرے روشنی کا پتا لگ جائے۔ دعا کرنا"۔

باری باہر دائیں طرف مڑ گیا تھا' غالباً تالا لگانے گیا تھا۔ سروتی بھی اپنی باسکٹ اٹھا کر روتی سسکتی ماہین کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہارا ڈراما ٹھیک کرانا پڑے گا سرائے ——— بہت زیادہ کام کرنے لگی ہو کیشن پر"۔ باری ان کی طرف واپس مڑتے ہوئے

سرسوتی سے مخاطب ہوا۔

"میں لائی تھی اسے۔ پلیز کچھ مت کہنا۔" ماہین نے سفارش کی۔

"مت سرچ جانے اتنا۔ اس حویلی کو سرچ بھی خاور ماسی راس نہیں آتی۔" وہ جانے کس دھن میں کہہ گیا

وہ بات جو کمرے میں ادھوری رہ گئی تھی۔ اس میں اور ہاری کے جملے میں کتنا واضح ربط تھا۔

"مطلب میرا مطلب ہے یعنی؟" ماہین بھلا چپ رہتی۔

"یعنی کچھ نہیں۔ آپ صبح کتنے بجے روانہ ہوں گی؟" اس نے عام سے لہجے میں بات پلٹ دی۔

"تم یہاں سے سب سے جدا ہو۔ بے وقوف سمجھتے ہو مجھے؟" وہ پوچھ گئی۔

"خدانخواستہ۔ آپ اتنی سیریس نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ روشی بی بی والا قصہ ہی فی الحال کافی ہے۔"

ایک خوبصورت سا احساس اس پر چھا گیا تھا جیسے چاند کے گرد ہالہ۔

"ہاں یہ تو ہے مجھے تو بابا صاحب کی فکر پڑ گئی ہے۔ کہیں ٹینشن زیادہ نہ لے لیں۔" ماہین فکرمندی سے بولی۔

"جی۔۔۔ خیر پریشانی کو ذہن سے جھٹک کر ابھی امید رکھنے کہ ابھی خبریں ملنے لگیں گی۔ انشاء اللہ۔"

اس کے ہونٹوں پر بڑی مبہم سی مسکراہٹ تھی جو اندھیرے میں ماہین کو نظر نہیں آسکی تھی۔

"آمین۔" ماہین نے دل و جان سے کہا۔

رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ جب عالم تاب نے ماہین کے کمرے کا دروازہ دھڑدھڑایا۔ ماہین کو یونہی جھپکی سی آئی تھی۔
وہ بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"کون؟"

"میں ہوں۔ باہر آؤ جلدی سے بابا صاحب بلا رہے ہیں۔ ان کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔" بند دروازے کے پیچھے سے سب کچھ کہہ دیا گیا۔

ماہین دوپٹہ سنبھالتی بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آئی تھی۔

"جلدی آؤ ماہین!" وہ اس سے آگے آگے چل پڑیں۔

کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ بڑے ابا اور اصغر چچا دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ تمام ملازم کہ جن سے اتفاق سے پہلے راؤنڈ میں مل چکی تھی۔ وہاں موجود تھے۔ تمام لڑکیاں، سمیہ بھابی اور بابا صاحب کی بہوئیں بیٹیاں بھی دم سادھے کھڑی ہوئی تھیں۔

"بابا صاحب! یہ ماہین آگئیں۔"

اسی دم دروازہ کھلا اور ہاری اندر داخل ہوا۔

"فون کر دیا دونوں کو؟" عالم تاب نے استفسار کیا۔

"جی۔"

"آؤ ماہین، وہاں راستہ دو۔" عالم تاب نے کہا۔ وہ فوراً ایک طرف ہو گیا۔

ماہین دم بخود سی ان کے قریب چلی آئی۔ اور بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

"ماہین! ہم نے کچھ نہیں کمایا۔ روشی نے ہمیں تلاش کر دیا۔ کچھ ایسی ہوا ہے جو دماغ کی شریان پھٹنے والی ہے۔
ہم دنیا کے مفلس ترین لوگوں میں سے ہیں۔" ان کی آنکھوں سے دو موتی ڈھلک گئے۔

"دیکھو! بابا بہت روگی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔ اور سب کے پاس سب کچھ ہے۔ اس کے پاس صرف تم اور جواد ہو۔"

"ہم تم سے کچھ نہیں چھپا سکیں گے ہم نے عالم تاب کو کہہ دیا ہے کہ۔"

"گاڑی تیار ہے خان۔" ڈرائیور نے اندر آ کر ہاری کو مخاطب کیا۔

جواد ہاری، مصطفیٰ ہاری بابا صاحب کو اٹھانے کیلئے آگے بڑھے۔ باقی لوگ ایک طرف ہو گئے۔

بمشکل بابا صاحب کو گاڑی تک لے جایا گیا۔ جتنے لوگ لینڈ کروزر میں جا سکتے تھے بیٹھ گئے۔

ساری حویلی کی لائٹیں جلا دی گئی تھیں۔

عالم تاب وہیں ستون سے ٹیک لگا کر رونے لگیں۔ وہ ان کے سسر ہی نہیں حقیقی تایا بھی تھے۔

"ہائے روشی تو تو چلی گئی دنیا سے اب تو تیری ہی ہوئی ذات بھی ہے اور بے سائبانی بھی۔"

ماہین کے احساسات عجیب سے ہو گئے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ سب لڑکیاں بھی جا چکی تھیں۔ وہ بالکل چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔

"اگر خدانخواستہ بابا صاحب کو کچھ ہو گیا تو عمر بھر کیلئے یہ بات ہو جائے گی کہ روشی کی وجہ سے یہ سب ہوا۔" روبی نے ماحول پر چھائی خاموشی توڑی۔

"اور کیا۔ اللہ کرے بابا صاحب ٹھیک ہو جائیں۔" تانیہ نے جلدی سے دعا کی۔

"انجانی سی کیفیت نہیں ہے کہ انسان اپنے علاوہ اور کسی طرف دھیان ہی نہ دے۔" شمع بھی گویا ہوئی۔

"اس طرح کی باتیں اس وقت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ بابا صاحب کیلئے دعائے صحت کی جائے۔" جگنو نے ہمیشہ کی طرح بہت سوچ سمجھ کر بات کی۔ کچھ لڑکیاں اسی وقت وضو کرنے چلی گئیں۔

ماہین کا رواں رواں جیسے اندیشہ اور دعا کر رہا تھا کہ کسی طرح بابا صاحب ٹھیک ہو جائیں ورنہ روشی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باپ کو کھو دے گی۔

اس کا ذہن تو پہلے ہی الجھا ہوا تھا۔ جاتے جاتے بابا صاحب اور الجھا گئے تھے۔ وہ کیا ہے جو آج تک چھپایا گیا۔ اور اس کا مجھ سے کیا تعلق؟ وہ مزید الجھن میں پڑ گئی تھی۔

اتنے لوگوں کی موجودگی میں مسلسل خاموشی بھی بہت محسوس ہونے لگی ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہ اس طرح بیٹھنے کا فائدہ بھی کیا۔ وہ وضو تو قضائے حاجت ہی پڑھ لے۔ اسے اگر رو رو کر کی فکر تھی تو بس روشی کی تھی۔ بس یہی دھیان میں آئے جا رہا تھا

کہ بابا صاحب کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

دستک اتنی زور سے ہوئی تھی کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"جی — کون؟"

"دروازہ کھولو روشانے!" تیمور علی خان کی آواز آئی۔

وہ ساری جان سے کانپ گئی۔ اس وقت۔ کاکا جان۔ وہ اچھل کر بیڈ سے نیچے آئی۔ بڑی بدحواسی سے دروازہ کھولا۔

"جی کاکا جان؟"

"چادر اوڑھو روشانے۔ اور چلو" وہ انتہائی سنجیدہ تھے۔

"جی کہاں؟" وہ بے حد پریشان ہو گئی۔

"وقت نہیں ہے بالکل۔ جلدی آؤ" وہ قدرے برہم انداز میں گویا ہوئے۔ روشی سہم گئی۔ جلدی سے پاؤں میں چپل ڈالی اور دوپٹہ گلے میں ڈال کر چادر اوڑھی۔ اور تیمور علی خان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

ڈرائیور جیپ کے پچھلے دروازے کھولے ہوئے منتظر کھڑا ہوا تھا۔ تیمور علی خان نے پہلے روشی کو بیٹھنے کیلئے کہا پھر خود اس کے برابر میں بیٹھ گئے۔

موبائل فون ان کے ہاتھ میں تھا۔

"شیر گل! اندر کی لائٹ جلاؤ"۔ تیمور علی خان نے فون سیٹ کیا۔

فوراً اندر روشنی ہو گئی۔ تیمور علی خان نمبر پش کرنے لگے۔

روشی کبھی ان کے چہرے کی طرف کبھی ان کی متحرک انگلیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ کون۔ بیٹا؟"

"ہوں راستے میں ہوں۔ کون سے ہاسپٹل میں؟ ٹھیک ہے اچھا دیکھو۔ ہاسپٹل سے فون آئے تو نمبر لے لینا۔ میں کال کروں گا۔ اوکے"۔

روشی دم بخود ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔ کاکا جان بیٹے سے بات کر رہے تھے۔ جس سے ظاہر تھا کہ بڑی حویلی میں گڑبڑ ہے۔ کون بیمار ہے؟ تیمور علی خان کے چہرے سے جو تاثرات اسے نظر آ رہے تھے ان کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کوئی سوال کرے۔

"بابا صاحب کی حالت بہت خراب ہے روشانے! اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ان کا قتل تمہارے ذمے"۔ وہ بہت مضطرب تھے۔

روشی کی تو جیسے جان نکل گئی۔ یوں بھی اس کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ ذہن کی اسکرین سے خواہ مخواہ غصہ جیسے جذبات کے بادل صاف ہو چکے تھے۔ اپنے تمام پچھلے اقدامات کی بدصورتیاں سامنے فوراً آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"مجھے بتائیں کہ ان کی حالت اور بھی بگڑ سکتی ہے کاکا جان؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"اب کیا کریں۔ زہر بھی تم ہو اور تریاق بھی۔

ہمیں اس وقت موجود رشتوں میں سوائے اپنے باپ کے اور کوئی نظر نہیں آ رہا۔ ان سے دکھ بھی ہے ہی مگر سب سے زیادہ چاہتیں بھی ہم نے ہی پائی ہیں"۔

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"بابا صاحب اس لئے بیمار تو نہیں ہوں گے کہ انہیں میرا فراق ستا رہا ہو گا۔ وہ تو اس لئے بیمار ہوئے ہوں گے کہ روش کیسی گئی۔ ٹھیک ہے۔ میں خود سر ہوں لیکن ایک انسان کی حیثیت سے میرا حق نہیں کہ میری بات سنی جاتی۔ مجھ میں بہت دادی میں گر ایسی جرات تو نہیں تھی کہ میں بابا کا کام نے کر حویلی میں بازگشت کا اہتمام کرتی۔

مجھے تم سے شادی کرنا تھی نا ب رنج سے نہ دیتے نہ کرتے۔ میں کسی ان چاہے مرد کو خود سے قریب برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے کوئی بوجھ سمجھا رشتہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ عمر بھر کا بوجھ بابا صاحب اتنا تو کر لیتے کہ میری بات سن لیتے۔ دادی کی حیثیت تو ہمیں دی جائے۔ ہم ان کی جاگیر کی زمین کے ٹکڑے تو نہیں ہیں۔ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ایک شخص جس کے ہم تک سے مجھے انسیت نہیں۔ اسے اپنی انمول ذات اپنی انا سونپ دوں؟ کیا میں انسان نہیں؟ استعمال ہونے والی شے ہوں گی"۔

تیمور علی خان نے اسے احساس جرم میں مبتلا کیا تو اندر سے "آگہی" کا در وا ہونا شروع ہو گیا۔

وہ خود ہی اپنی وجہ سے بیمار ہوئے ہیں۔ بے وزن دیواروں جیسے اصول بنانے والے آخر کار زحمت اٹھاتے ہیں۔

انسان کی ذات کو تو روشن اور بڑے بڑے دریچوں اور دروازوں والی عمارت کی طرح ہونا چاہیے۔

کہ فضا ماحول موسم ہر تبدیلی کا پتا چلتا رہے۔ تدبیر اور انتظام ہوتا رہے۔

باہر شور مچانے والے راستے پر اتنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ اپنی ذات کے ہونے کا احساس ہی نہ رہے۔

اگر کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو اس کی بات تو سننا چاہیے۔ باقی مراحل تو بعد کی باتیں ہیں۔

"ہیلو۔ ہوں۔ والسلام"۔

"ہاں۔ لکھو۔ ایک منٹ۔" انہوں نے جیب سے قلم نکالا اور روشی کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی سامنے کی۔ پہلے تو وہ کچھ نہیں۔ گڑبڑا گئی۔ گھبرا سی گئی۔

"آپ دیجئے کاکا جان! میں لکھتی ہوں"۔ اس نے قلم ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ تیمور علی خان نے وہ نمبر نوٹ کرائے اور فون آف کر دیا۔

"گل بتا رہی تھی ایمرجنسی میں ہیں اور ابھی کچھ پتا نہیں چلا کہ کیسی طبیعت ہے۔ سٹی ہاسپٹل میں ہیں"۔

"شیر گل! سٹی ہاسپٹل چلنا ہے"۔

ڈرائیور کو تاکید کر کے ایزی ہو کر بیٹھ گئے۔

روشی نے قلم ان کی طرف بڑھایا۔ جو انہوں نے جیب میں اٹکایا۔

کئی گھنٹے کا کرب انگیز سفر تمام ہوا۔ سٹی ہاسپٹل کے پارکنگ لاٹ میں جا کر جیپ رک گئی۔ اپنے ابا کی لینڈ کروزر روشی نے دور ہی سے پہچان لیا تھا۔ یہ تو گاڑی ہی میں پتا چل گیا تھا کہ بابا صاحب کی حالت اب خطرے سے باہر ہے جہاں یہ بات باعث طمانیت تھی وہاں آگے پیش آنے والے حالات اسے اعصابی خلجان میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔

"تم یہیں بیٹھو روشانے! ہمارا انتظار کرو۔" تیمور علی خان نے جیپ سے اترتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

تیمور علی خان کی شخصیت میں ایسی بات تو تھی کہ وہ اس سے خوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر بھی تھے۔ اس کے باوجود ان کی ذات سے عجیب تقویت کا احساس بہر حال مل رہا تھا۔

وہ اندر چلے گئے۔

وہ باہر نظریں دوڑانے لگی۔ شیر گل بھی اتر کر ٹہل رہا تھا۔

معاً اس نے محسوس کیا کہ پیچھے کوئی گاڑی آئی ہے۔ اس نے صرف گردن موڑ کر پیچھے دیکھا مگر فوراً ہی سیدھی ہو گئی۔ پھوپھا جیپ سے یاور علی خان اتر رہے تھے۔

اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے چادر پیشانی پر مزید کھسکا لی تھی۔ یہ ایک بے ساختہ مگر اضطراری عمل تھا۔ پھر اس نے یاور علی خان کو کاریڈور کی طرف بڑھتے اور ایک طرف مڑتے ہوئے دیکھا۔

"یہاں تو کچھ اور ہی سین نہ ہو جائیں۔" اسے اندیشے ستانے لگے۔

اسے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا۔ کوئی باہر آتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ شیر گل بھی ایک بنچ پر بیٹھ چکا تھا۔

معاً اس کی نظر وہاج پر پڑی جو میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"یا اللہ۔ کیا سب آئے ہوئے ہیں؟" وہ مزید فکرمند ہو گئی۔

وہاج کے اندر جاتے ہی اس نے دیکھا۔ تیمور علی خان باہر آ رہے ہیں۔ وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

تیمور علی خان نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

"آؤ روشانے!" ان کا چہرہ نہ جانے کیوں نیا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی اور ہوں۔

"کاکا جان!"

"ایزی۔ نو پرابلم۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ تم نے ہمیں فون کر کے اپنی پریشانی بتائی تھی۔ اس لیے ہم نے شیر گل کو بھیج کر تمہیں "سرائے" بلوا لیا تھا۔ درمیان میں کچھ ایمرجنسیز ہو گئیں اس لیے ہم بڑی حویلی پہنچ کر بات نہیں کر سکے۔ ہم تفصیل سے بات کرنا چاہتے تھے۔

دراصل جو ایمرجنسیز ہم نے بابا صاحب کو بتائیں وہ اتنی رئیل اور جینوئن ہیں کہ ان کو یقین کرنا پڑے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا تو دوسری صورت میں اگر وہ یقین نہیں بھی کریں تو تمہیں کیا فرق پڑے گا؟

وہیں بھلا دیں گے۔ مگر کسی بھی صورت میں وہ اسے ری ایکٹ نہیں کر سکتے کہ تم ہماری سپورٹ میں ہو۔"

اس کو ذہنی طور پر تیار کرنے کیلئے وہ اس سے آہستہ آہستہ مخاطب تھے۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں سے ان کی سمت دیکھ رہی تھی۔ کاکا جان ایسے تو نہیں تھے۔ اب کیوں ہو گئے ہیں ایسے۔

وہ تو بچپن ہی سے انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ حالانکہ انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہی کیا حویلی کے سب ہی بچے ان سے ڈرتے تھے۔

انہیں بڑی حویلی میں پا کر ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ ایک بصیر چچا ہیں جن کے کان کی میل گھر کے بچوں نے چیک کر لی ہو گی۔ بچوں میں بچے بنے رہتے تھے۔ تیمور علی خان تو بھلا ان سے چھوٹے تھے۔

اس نے بے ساختہ تیمور علی خان کا ہاتھ تھام کر ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"کاکا جان! میں اپنی نظروں میں گر چکی ہوں۔ میں اس طرح کے سلوک کی حقدار نہیں ہوں۔ مجھے میرے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ اور جیپ سے نیچے اتر آئی۔

تیمور علی خان آگے اور وہ ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔

کاریڈور میں پہنچ کر اس کی رہی سہی جان بھی نکلنے لگی۔ گھر کے تقریباً سب ہی لڑکے اور مرد وہاں موجود تھے۔ اس نے بہت نظریں جھکا لی تھیں۔ یوں جیسے کسی قبیح فعل کی مجرمہ بھری عدالت میں ہو۔

تیمور علی خان ایک لمحے کیلئے بھی نہیں رکے سیدھے چلتے گئے۔ ان کی تقلید میں وہ بھی۔

بابا صاحب نڈھال سے لیٹے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ اور تمتما رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ تیمور علی خان کی پشت پر تھی۔ انہوں نے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اور اس پر یہ احساس کہ شیشے کے اس پار سب کھڑے دیکھ رہے ہیں۔

تیمور علی خان نے باپ کا ہاتھ آہستگی سے اپنے ہاتھ میں لیا تو انہوں نے فوراً آنکھیں کھول لیں۔ تیمور علی خان ان پر جھکے ہوئے تھے۔ سیدھے ہو گئے اور روشی کی طرف اشارہ کیا۔

بابا صاحب کی آنکھوں کی پتلیاں لمحے بھر کو ساکت ہو گئیں۔ جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔ چند لمحے انہوں نے اس کی طرف دیکھا پھر آنکھیں موند لیں اور گہرا سانس لیا۔

"روشانے! تم جیپ میں بیٹھو۔ بڑی حویلی ہم خود چھوڑ کر آئیں گے۔" وہ سرگوشی والی آواز میں گویا ہوئے۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آنے لگی۔ مگر ایک دم رک گئی اور پلٹ کر تیمور علی خان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بھی اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔

وہ ان کے قریب چلی آئی۔

"کاکا جان۔ وہ سیا۔ جواد بھائی" وہ جیسے ان کے کان میں بولی۔

"اوہ" تیمور علی خان نے شیشے کے پار دیکھا۔ اور گویا ہوئے۔

"آؤ ہمارے ساتھ"۔

سیاہ شلوار قمیص' نازک وضع کی گر مطبوعہ چپل پہنے ہوئے تیمور علی خان اپنی لشکارا دینے والی مردانگی کے ساتھ سائبان سا محسوس ہو رہے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں اسے تاثرات میں وہ بہت سرد محسوس ہو رہے تھے۔

وہ آگے بڑھے اور دروازہ کھول کر باہر نکلے تو اس نے لپک کر ان کا بازو تھام لیا۔ سامنے یا دائیں بائیں دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ بس ان کا بازو تھامے چلتی چلی گئی۔

کاریڈور سے باہر آ کر اس نے تیمور علی خان کا بازو چھوڑ دیا۔

شیر گل انہیں آتا دیکھ کر جیپ سے کھڑا ہو گیا۔

"بڑی حویلی چلو شیر گل"۔ وہ جیپ کا دروازہ کھولتے ہوئے گویا ہوئے اسے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"بھائی صاحب (بڑے ابا) اور بصیر چچا کو میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ تم سے اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ ڈونٹ وری"۔

(اوہ اچھا؟) وہ پوچھنا چاہتی تھی جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہی۔

"آؤ"۔ صبح نمودار ہو چکی تھی۔ ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔

وہ تیمور علی خان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کے گھر پہلی مرتبہ آئی ہو۔ بار بار۔۔۔ عالم جاب کا خشونت بھرا چہرا سامنے آ رہا تھا۔ سرسوتی جانے کس کام سے باہر آئی تھی روشی کو دیکھ کر الٹے پاؤں دوڑ گئی۔ اس کی آواز اندر تک آ رہی تھی۔

"روشی بی بی آ ساں۔ تیمور خان ہل۔ بیگم جی روشی بی بی"۔

اندر جیسے کھلبلی مچ گئی۔

عالم جاب لڑکیوں کے ساتھ ہال میں ہی تھیں۔ جہاں نوافل کا سلسلہ جاری تھا۔

تانیہ تو نیت توڑ کر بھاگی۔

جویریہ سے آگے کے مراحل طے کر چکی تھیں انہیں سلام پھیرنے کی جلدی ہو گئی۔ البتہ عالم جاب نے بڑے سکون سے نماز مکمل کی۔ باقی خواتین اپنے اپنے کمروں میں تھیں۔ سمیہ بچے کو دودھ پلانے جا چکی تھی۔ ساجین بھی اپنے کمرے میں تھی۔

تیمور علی خان ہال میں داخل ہوئے۔

جو لڑکیاں سلام پھیر چکی تھیں وہ اپنی اپنی جگہ ٹک گئیں۔

"السلام علیکم"۔ تیمور علی خان نے اپنے مخصوص سٹائل میں عالم جاب کو سلام کیا۔ مختلف کونوں سے آوازیں ابھریں۔

"السلام علیکم کاکا جان"۔

"بھابی بیگم! آئیے آپ کے کمرے میں چلتے ہیں"۔

"روشی تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ شاباش"۔

"بابا صاحب کیسے ہیں تیمور؟ تم آ گئے؟" انہوں نے بڑی گہری نظروں سے جاتی ہوئی روشی کو دیکھا۔

"شکر ہے اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آئیے بھابی بیگم"۔

"یہ سپاپا" کہاں سے اٹھا لائے۔ کوئی کیوں نہ ساروی تم نے۔ تم بھی تو اسی خاندان سے ہو۔ کس حد سے آئی ہے

بھابی' یہ ساری وہ [illegible] کر رہی ہیں۔ لڑکیاں بھی۔

"مگر آپ کہیں گی تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے ہم۔ مگر پہلے کچھ بات چیت تو کر لیں آپ سے آ کے"۔

عالم جاب نے ان کے چہرے پر بری طرح چونک کر ان کی شکل دیکھی تھی۔

"تیمور۔ تم؟"

"چلیے بھابی بیگم؟" وہ آگے بڑھ گئے۔

لڑکیاں انتہائی ذوق و شوق سے تیمور علی خان کی شکل دیکھ رہی تھیں اور ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نکل جائے جس کا تعاقب کرتے ہوئے حقیقت کا سراغ وہ خود لگا لیں کہ اصل کیا ہوا۔

مگر وہ بے دل سی ہو گئیں کیونکہ عالم جاب تیمور علی خان کو ساتھ لے کر ہال سے باہر چلی گئی تھیں۔

"چلو روشی کے پاس چلتے ہیں"۔ بیسہ نے تڑپ کر کہا۔

"وہ دروازہ کھولے گی تب ہی تو اس تک پہنچیں گی"۔ عصمہ نے اپنا تحیر و استعجاب دبا کر طنز کیا۔

"عصمہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مشکل ہے جو وہ دروازہ کھولے؟"

گلوں نے عصمہ کا طنزیہ لہجہ نظر انداز کر کے ان کے گنج انداز سے کی تائید کی۔

"چلو ابھی سمانی کے پاس چلتے ہیں۔ انہیں خبر بھی دیتے ہیں اور پھر ساتھ لے کر روشی کے پاس چلتے ہیں۔ وہ کہیں گی تو دروازہ ضرور کھولے گی"۔ سوہا کے کچے شوق نے تدبیر سجھائی۔

"بالکل ٹھیک"۔ وہ سب کی سب کھڑی ہو گئیں سوائے عصمہ کے۔

"آپ نہیں چل رہیں عصمہ آپا؟" سوہانی نے پوچھا۔

"تم لوگ چلو۔ دروازہ کھلواؤ۔ آتی ہوں میں۔ اگر اسٹوری کا شروع تھوڑا سا نکل جائے تو بعد میں تم سنا دینا"۔ وہ مسکرائیں۔

"یہ مت بھول جانا' فجر کی نماز باقی ہے ابھی۔ "شیطان" اسی طرح وار کرتا ہے"۔ وہ سبق خیز انداز میں بولیں۔

اللہ سے عام پارسائی تعلق اپنا اپنا نسبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کتنا بد صورت ہو جاتا ہے انسان دوسروں کے کردار پر طنز کرتے ہوئے۔

نماز پڑھنا تو بڑا آسان ہے۔ کٹھن مرحلے تو اندر کا انسان ایسے ہی موقعوں پر طے کرتا ہے۔ اخلاق۔۔۔ تو تصور ہی نہ

ہوں تو بدنی عبادت بھی مسترد ہے۔ عبادت کی جزا تو اخلاقیات سے مشروط ہے۔ نہ خالی اخلاق سے بات بنتی ہے نہ خالی عبادت ہے۔ شیطان سے زیادہ تو کسی کی عبادت کا ثانی نہیں ہوئی۔ پھر بھی مردود کر دیا گیا۔ انہیں تو غالب کا یہ شعر خوشنما فریم کرا کر دینا چاہیے غور و فکر کرنے کیلئے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو!

بابا کہا کرتے تھے۔ نماز رابطے کا سلیقہ ہے، عام کنکشن ہے اور تہجد کی نماز ہاٹ لائن۔

نماز بھی رابطہ ہے اخلاقیات بھی رابطہ۔ ایک کا تعلق خدا سے اور دوسرے کا خدا کی مخلوق سے۔

گلو کو عصمہ کی بات سے دلی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ ماہین کی خواب گاہ تک سوچتی ہوئی کیفیت میں پہنچی تھی۔

ماہین ہلکی دستک پر باہر آئی تھی۔ اس نے بڑی فکرمندی سے ان کے چہرے دیکھے، سب کی سب ایک ساتھ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"ممانی جان! روشی آ گئی ہے؟" موٹو نے لب کشائی کی۔

"ہیں"۔ اسے سماعت کا دھوکا محسوس ہوا تھا۔

"جی۔ روشی آ گئی ہے" گلو نے بھی کہا۔

"کیسے؟" اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

"کاکا جان کے ساتھ اور کچھ تو ہمیں بھی نہیں پتہ"۔ روبی نے کہا۔

"کاکا جان؟" وہ ابھی۔ سارا اعصابی نظام الٹ پلٹ ہونے لگا تھا۔

"جی۔ کاکا جان تیمور علی خان"۔ زری نے وضاحت کی۔

"وہ "سرائے" والے؟" اس نے پوچھا

"جی جی۔ وہی"۔

"پرسوں رات۔ ایک بجے ان سے بات ہوئی۔ آج روشی ان کے ساتھ"۔ وہ الجھنے لگی۔

"کہاں ہے وہ؟" وہ سنبھل کر بولی تمام لڑکیاں بغور اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

"اپنے کمرے میں ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ کو اطلاع بھی دیدیں اور ساتھ لے کر اس سے ملنے بھی چلیں"۔

"ہاں۔ ہاں۔ چلو۔ وہ ہاسپٹل سے کوئی فون وون آیا؟" وہ ایک دم جیسے کسی دھیان سے چونکی۔

"فون بھی آیا تھا۔ کاکا جان بھی بتا رہے تھے کہ اب حالت بہت بہتر ہے۔ وہ وہیں سے آ رہے ہیں"۔ مینے بتایا۔

"روشی بھی۔ روشی بھی گئی تھی ہاسپٹل؟" اس نے چلتے چلتے قدرے حیرت اور قلق سے اندیشے کے ساتھ پوچھا۔

"شاید! آئی تو وہ کاکا جان کے ساتھ ہی ہے"۔ ثنا نے کہا۔

"اچھا"۔ ماہین کا ذہن الجھ گیا تھا۔

"تمہارے کاکا جان کیا واپس چلے گئے؟" اس نے موٹو کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ وہ بھی اسی کے پاس ہیں"۔ اس نے روشی کے کمرے کی طرف بڑی مشتاق نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ماہین نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" روشی کی ہلکی سی آواز آئی۔

"میں ہوں ماہین۔ دروازہ کھولو"۔

چٹخنی کھلنے کی آواز آئی مگر دروازہ نہیں کھلا۔

ماہین نے دروازہ پش کیا تو وہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم"۔ "اللہ تمہیں توفیق دے اور ستاؤ نہیں"۔

اس نے سرخ و زرد کنٹراسٹ کے خوبصورت سے لباس میں ملبوس روشی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

روشی نے بہت ضبط کیا مگر جانے کہاں سے ڈھیر سارے آنسو ابل پڑے وہ ماہین کے گلے سے لگی سسکیاں بھر رہی تھی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

لڑکیاں ادھر ادھر بکھرے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی تھیں۔

ماہین نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا اور اپنے دوپٹے سے اس کی آنکھیں صاف کیں۔

"یہ مردانہ قسم کی انتہا پسندی تمہیں بہت نقصان پہنچا رہی ہے روشی۔ مجھے آنے والے وقت سے ہول آ رہے ہیں۔"

"چھوڑیں خالہ! اب مجھے کسی تبدیلی کسی بات کا خوف نہیں۔ میں بالکل پرسکون ہوں۔"

اس نے گہری سانس لے کر باری باری لڑکیوں کو دیکھا

"میں سونا چاہتی ہوں خالہ۔ بہت تھکن ہے۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ پھر باتیں کریں گے۔" ماہین کے اٹھتے ہی لڑکیاں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں

....

ماہین فجر کی نماز پڑھ کر باہر باغ میں آئی۔ اسے شاید یاور علی خان کا انتظار تھا۔ وہ روشی کے متعلق سوچتی ہوئے ٹہلنے لگی۔

"بی بی..... پتہ نہیں سنتا۔ کہتا ہے اندر آنا ہے۔ جس کا نام لیتا ہے وہ یہاں نہیں رہتا۔ پھر بھی نہیں سنتا۔" چوکیدار نے بے اختیاری انداز میں ماہین کو مخاطب کیا۔

ماہین آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پھاٹک تک آئی۔

"گیٹ کھولو۔ بلاؤ کون ہے۔" اس نے چوکیدار سے کہا۔

چوکیدار نے تعمیل کی۔

دبلی پتلی دراز قامت سانولی سلونی لڑکی دھول مٹی میں اٹی اس کے سامنے تھی۔

"کون ہو تم؟" ماہین نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"اقبال بیگم۔ سب بالو بولتے ہیں۔" اس نے وحشی کیفیت میں جواب دیا۔

"کس سے ملنا چاہتی ہو؟" اس نے سوال کیا۔ عجیب سی یاسیت تھی لڑکی کے چہرے پر۔

"عطر سے۔" اس نے بہت دھیمی آواز سے کہا۔

ماہین کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"حویلی میں شاید کسی کو چند لوگوں کے علاوہ معلوم نہیں تھا کہ یہاں کوئی عطر رہتی ہے۔ یہ کون ہے جو اتنے یقین کے ساتھ عطر کا ذکر کر رہی ہے۔"

"کیا لگتی ہے عطر تمہاری؟ کس نے تمہیں بتایا کہ وہ یہاں رہتی ہے؟" ماہین کی حیرت ہنوز برقرار تھی۔

"بس جی۔ مجھے پتہ ہے یہیں رہتی ہے دریا بستی میں۔ اس کے علاوہ کوئی اور حویلی نہیں ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"میں پوچھ رہی ہوں تم اس کی کیا لگتی ہو؟" ماہین الجھی۔

"بس جی۔ بڑی رشتہ داریاں ہیں ان سے۔ آپ ان سے ملوا دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"اندر آ جاؤ۔" ماہین اسے ساتھ لے کر چل پڑی۔ اس کا ذہن کئی غیر مرتب سوچوں میں الجھا ہوا تھا اس لئے خاموش تھی۔

بالو چلتے ہوئے حویلی کی ایک ایک شے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

ماہین اسے بیڈ روم میں لے آئی۔

"بیٹھو۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے کپڑے بہت گندے ہو رہے ہیں۔" بالو نے جھجکتے ہوئے قیمتی صوفے پر نظر ڈالی۔

"کوئی بات نہیں اب ایسے بھی گندے نہیں۔" وہ خود اپنے بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گئی۔

"کہاں سے آئی ہو؟" اس نے اگلا اہم سوال کیا۔

"کراچی سے۔" اس نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔

ماہین ایک مرتبہ پھر چونک پڑی۔ "کراچی سے؟ اتنی دور سے؟ تمہارا سامان وغیرہ؟"

"اندر ایک لوٹ گئی ہو تو سامان کیسا؟" وہ خستہ حال سے انداز میں بولی۔

ماہین نے اس کے فصیح و بلیغ انداز پر اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

"پڑھی لکھی ہو؟"

"نہیں ان پڑھ ہوں۔ مگر اب وقت پڑا ہے تو وقت ہی پڑھا رہا ہے۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

"ابھی دور سے سو کر بھی نہیں آ رہی ہو؟" ماہین کو یکدم ایک خیال آیا۔

"جی۔" اس نے مختصراً کہا۔

"ایسا کرو۔ تم نہا دھو لو۔ میں تمہارے ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں۔ کپڑے تو تمہارے پاس ہیں نہیں۔ میں اپنا کوئی سوٹ نکالتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟ پھر تمہیں مطربہ سے ملوائیں گے۔ فکر نہیں کرو۔"

وہ اٹھ کر وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ مالکن ہیں یہاں کی؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"ہاں مگر دوسرے نمبر کی۔" وہ کوئی مناسب سا سوٹ تلاش کرتے کرتے ہنس کر بولی۔

"آپ کا نام ماہین ہے؟" پالو کو عارف کی زبان سے نکلا ہوا حرف حرف ازبر تھا۔

ماہین وارڈروب کھلی چھوڑ کر چونک کر پلٹی۔

"ہاں۔ مگر تم انہیں کیسے جانتی ہو؟" وہ الجھن بھرے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"بس نام سنا ہے۔ مگر آپ وہ کیسے ہو سکتی ہیں۔ وہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ وہ تو آپ سے بہت بڑی ہوں گی۔" پالو سوچتے ہوئے بول رہی تھی۔

"پھر بھی کس سے سنا تھا نام؟ تم تو کراچی میں رہتی ہو؟" ماہین کی حیرت سوا تھی۔

"بس... وہیں سے سنا ہے سب کچھ؟" وہ سادگی سے بولی۔

"کس سے؟" ماہین اپنا کام بھول کر پھر سوالوں میں الجھ گئی تھی۔

"عارف بھائی سے"۔ وہ سکون سے گویا ہوئی

"یہ کون ہیں؟" اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ یہاں مالکن ہیں۔ آپ نہیں جانتیں انہیں؟" اس پر حیرت سے پالو بولی۔

"مجھے زیادہ دن نہیں ہوئے یہاں آئے ہوئے۔ ہاں۔ تو عارف کون ہیں؟" اس نے وضاحت کے ساتھ سوال بھی کیا۔

"جب آپ انہیں نہیں جانتی تو بیکار ہے۔ آپ مجھے مطربہ سے تو ملوا سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کو بتا سکیں۔"

اس نے آس بھری نظروں سے ماہین کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں میں تمہیں ملواؤں گی۔" وہ کسی دھیان سے چونکی اور پلٹ کر پھر وارڈروب میں نظر دوڑانے لگی۔

"اس سے پہلے مطربہ سے کب ملی تھیں؟" اس نے ایک سوٹ نکال ہی لیا۔

"میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملی"۔ وہ فطری سادگی سے بولی۔

"پھر کیا ضرورت پیش آ گئی؟" اس نے سوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ضرورت ہی ضرورت ہے۔ سمجھیں میری پوری زندگی داؤ پر لگی ہے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔

"اچھا چلو۔ تم پہلے نہا دھو کر ناشتہ کر لو۔ پھر تم سے آرام سے بات ہو گی۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" اس نے واش روم کے آگے جا کر دیوار میں نصب ایک بٹن دو تین بار دبا دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ گہرے شوخ رنگ سوٹ میں ملبوس پازیب چھنکاتی ہوئی۔

"جی بی بی۔"

"دیکھو۔ یہ بیچاری بڑی دور سے آئی ہے۔ اسے باہر کا باتھ روم دکھاؤ اور پھر ناشتہ کرواؤ۔ ٹھیک؟" اس نے ملازمہ کو تاکید کی۔

"جی یہ کون ہے؟" اس نے اپنا استعجاب ظاہر کر دیا۔

"اپنے کام سے کام رکھو تمہیں اس سے کیا۔"

"اور ہاں سنو۔" وہ پالو کی طرف پلٹی۔ "یہاں اور کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ جو بات ہو صرف مجھ سے کہنا۔ ورنہ تمہارا مسئلہ حل ہونا مشکل ہے۔" اس نے پالو کو سمجھایا۔ کیونکہ اس کی اپنی تمام تر دلچسپی اس میں تھی۔

یاور علی خان جیپ سے اتر کر بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے۔ سامنے ہی سرسوتی نظر آ گئی۔

"سرسوتی"۔ ان کا لہجہ ہی کسی تاثر سے مضطرب تھا۔

"جی خان صاحب"۔ وہ ان کے قریب تقریباً بھاگتی ہوئی آئی۔ نوکر لوگ اپنے صاحب کے موڈ کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔

"روشنی کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہیں صاحب۔"

یاور علی خان اسی رفتار سے روشنی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

دروازے پر دستک بڑی بھرپور تھی۔ روشنی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"کون؟"

"دروازہ کھولو۔" ان کا لہجہ غضب ناک تھا۔

روشنی کا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ دروازہ تو کھولنا ہی تھا۔ اس نے تمام تر ہمت یکجا کر کے دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم۔" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

انہوں نے کوئی جواب دیے بغیر دروازہ بند کر دیا۔

"تیمور کو کہاں ملی تھیں تم؟" وہ اپنے غصے کو ضبط نہیں کر پا رہے تھے۔

"کہیں نہیں ــــ میں خود اسے ملی تھی۔ شیر گل خان کے ساتھ۔" وہ نظریں جھکا کر کہہ رہی تھی۔

"مطلب کیا ہے تمہارا ان حرکتوں سے؟ سیدھے سیدھے بات نہیں کر سکتیں۔ کیا ضرورت تھی۔ یہ ڈرامہ کرنے کی؟"

"کوئی سننے والا ہو تو کہیں۔" وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

"آرام سے نہیں رہا جاتا تم سے؟ اور لڑکیاں نہیں ہیں۔ تم میں کوئی زیادہ سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ گھر بھر کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی سزا بن گئی ہو۔ کیسے ہم اس گھر کے لوگ سوئے نہیں۔ بابا صاحب کی زندگی موت کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ کیا تم اتنی بچی اور کم عقل ہو کہ اپنے کام کے نتائج کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔"

"فائدہ محبتوں اور رشتوں کا جو کسی کی خوشی و زندگی کا احساس تک نہ کریں۔" اس نے رخ موڑ کر آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

"شٹ اپ۔ کیا کمی ہے تمہیں؟ باہر نکل کر دیکھو۔ لوگ پیٹ سے پتھر بھی باندھتے ہیں اور غلامی بھی کرتے ہیں۔" وہ برہم ہو گئے۔

"انسان کو اپنے پیدا ہونے پر اختیار نہیں۔ جو جہاں پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ پھر اس کا ذہن اسی ماحول کا عادی ہوتا ہے۔ اگر اسے نعمتیں ملتی ہیں تو وہ ان کو اپنا پیدائشی حق سمجھ کر وصول کرتا ہے۔ اگر فاقے ملتے ہیں تو وہ اپنی بدنصیبی سمجھ کر اسے قبول کر لیتا ہے۔

جاگیرداروں میں پیدا ہونا میرا قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے اس بات کی سزا ضرور دے سکتے ہیں کہ میرا شعور کیوں جاگتا ہوا ہے۔ میں مطلوبہ ڈالی کیوں نہیں۔ مجھے اپنے ہونے کا احساس کیوں ہے؟"

"بالکل بے شعور ہو تم۔ نسلوں کی ناموس سے کھیلنے والی جاہل اور بے حس لڑکی۔" وہ غرائے۔

"اقدام پر غور کیوں کرتے ہیں؟ وجہ اقدام پر کیوں غور نہیں کرتے۔ شرع اور قانون کی کون سی دفعہ یا شق ہے جس کے تحت اولاد 'انسان' میں شامل نہیں ہوتی۔ عدالت کسی مذہب کی اور دین کے ساتھ کارروائی شروع کرتی ہے۔"

"یہ زبان درازی بے حیائی اور بے ادبی ہے۔ میں تمہیں اس دانشوری پر ایوارڈ نہیں دے سکتا۔ کان کھول کر سن لو۔"

"کاکا جان اسی لئے شاید بڑی حویلی میں کسی اپ نہیں کرتے گا۔"

"مت لو نام میرے سامنے۔" وہ غضبناک ہوئے۔

"نہیں لیتی۔ کر مجھے پتا ہے بڑی حویلی میں 'اچھوں' کا گزارا نہیں۔"

"روشانے! میں تمہیں شوٹ بھی کر سکتا ہوں۔ سمجھیں۔" وہ اسی سابقہ انداز میں گویا ہوئے۔

"اس شخص کے ساتھ تمہیں دیکھ کر میری برداشت کی تمام طاقتیں جواب دے چکی ہیں۔"

"وہ آپ کے۔"

"میں نیا یا دوبارہ پیدا نہیں ہوا ہوں۔ اپنی اطلاعات اپنے پاس رکھو۔ بابا صاحب کی طبیعت ایک دو روز میں سنبھل

جائے گی۔ لہٰذا تم اپنا سوٹ کیس پیک رکھو۔ آج کے بعد تم میرے ساتھ رہو گی۔ میں اپنا قیمتی خون کھوؤں گا۔ تم میرے ساتھ موت کے منہ میں پہنچانے کی آخری حد بھی آزما چکی ہو۔ تم نے میری رعایتوں کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر تم میرا امتحان لینا چاہو میں خود نمٹوں گا۔ پھر اس کے بعد تم کبھی یہاں نہیں آؤ گی۔ تم میری اولاد ہو، میں تم سے نمٹنا جانتا ہوں۔

یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے تیاری کر لو۔ یہ تمہارے دادا کا گھر ہے۔ تمہارے باپ کا نہیں۔"

وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

ماہین کو پرسوتی کے ذریعے اطلاع مل چکی تھی یاور علی خان آ چکے ہیں۔

یہ جان کر کہ وہ روشی کے پاس ہیں، وہ ان وغیرہ اپنے کمرے سے باہر آ کر ہال کی سمت بڑھی تھی مگر یاور علی خان کو راستے میں پا کر ٹھٹک کر رک گئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے قدرے جھجکتے ہوئے ان کے چہرے کا بھی جائزہ لیا۔

"وسلام۔" وہ بغیر رکے آگے بڑھتے گئے۔

وہ بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔

یاور علی خان نے کمرے میں داخل ہو کر شرٹ اتار کر بیڈ پر پھینکی تھی اور اے سی آن کر دیا تھا۔

"پانی پلاؤ ماہین! بہت ٹھنڈا سا۔" انہوں نے بنیان اتار کر صوفے پر پھینکا۔

ماہین نے بیڈ روم فریج کھول کر سب سے ٹھنڈی بوتل تلاش کی۔ درحقیقت اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ آج یاور علی خان پھر ایک نئے انداز میں سامنے آئے تھے۔

ماہین گلاس بھر کر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"بابا صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انہوں نے جیسے ہی خالی گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ اس نے فوراً دریافت کیا۔

"ٹھیک ہیں اب۔ میرا کوئی سلیپنگ سوٹ نکال دو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

ماہین روبوٹ کی مانند وارڈروب کی سمت بڑھ گئی۔

سوٹ نکالتے ہوئے اس کا ذہن روشی کی طرف بھٹکنے لگا۔ اس نے سوٹ ان کو تھماتے ہوئے سوچا یہ جلدی سے لیٹ جائیں تو روشی کی خیریت معلوم کرنے بھاگے۔ اللہ خیر کرے ان کا موڈ تو ایب نارمل ہے۔ اسے مختلف قسم کے وسوسے ستانے لگے۔

"میرا خیال ہے ماہین! تم روشی کو آج ہی ڈرائیور کے ساتھ ہری پور بھجوا دو۔ ہم تو کل پرسوں ہی جا سکیں گے۔"

"جی۔" اسے جیسے اچنبھا ہوا۔

"میں نہیں چاہتا، اب وہ بابا صاحب کے سامنے آئے۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔"

"اکیلی ہی؟"

"کچھ نہیں کرے گی اب وہ اسٹوپڈ۔" انہوں نے خفگی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں ابھی وہ آرام کر رہی ہے تھوڑی دیر میں۔"

"اچھا... اچھا... ایسا کرو یہ پردے کھینچ دو... اور پھر اگر وہ کمرے میں گھسیں۔"

وہ سلیپنگ سوٹ اٹھا کر باتھ روم میں چلے گئے۔ اس نے پردے کھینچے اور بیڈ روم سے باہر آ گئی۔ سوچتے ہوئے اس کے ساتھ۔

سب لڑکیاں مغموم صورت بنائے بیٹھی تھیں۔

"آپا تو کرو گی ناں روشی۔" روبی نے انتہائی غمناک انداز میں پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے بڑے سے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھتے ہوئے گم صم سے انداز میں جواب دیا۔

"جا کہاں رہی ہو؟" تانیہ ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی ٹکائے اداسی سے گویا ہوئی۔

"پتا نہیں۔"

"کیا تمہاری شادی وہیں ہو گی؟" ہیبہ نے اپنے غرارے شرارے کے تصور میں ڈوب کر پوچھا۔

روشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈریسنگ ٹیبل سے چیزیں اٹھا اٹھا کر بیگ میں بھرنے لگی۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔

ماہین اس کی تیاری کے مراحل چیک کرنے کے خیال سے کمرے میں آئی تھی۔

"تیار ہو گئیں روشی؟"

"میں کاکا جان سے بات کرنا چاہتی ہوں خالہ... وہ یہاں ہیں یا ہاسپٹل میں؟" اس نے روبی سے استفسار کیا۔

"وہ تو تمہیں چھوڑنے کے فوراً بعد دوبارہ ہاسپٹل چلے گئے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"کوئی بات ہے تو باری سے کہہ دو... وہ ادھر بھیج دے گا۔" ماہین نے حل بتایا۔

وہ خاموشی سے چیزیں بیگ میں ڈالتی رہی۔

"بلواؤں باری کو... ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد ہاسپٹل چلا جائے۔" ماہین نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے ہر ایک سے نگاہ چرا کر بیگ بند کیا۔ اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں کھول کھول کر دیکھنے لگی۔

"بابا جو حکم کرو چار باتیں بھی کر لو اگر کچھ وہ بھی کیا تو بعد میں لے جانا۔" گلو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"ساری باتیں ہی ختم ہو گئیں۔ کچھ یاد ہی نہیں آ رہا۔ کیا باتیں کریں آپا۔" وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب چلی آئی۔

"اچھا یہ بتاؤ کاکا جان والا گھر کیسا لگا؟" گلو نے پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"اندر سے تو دیکھا نہیں۔ جس گیسٹ روم میں میرا قیام تھا اس سے البتہ اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر اندر سے کیسا ہو گا۔"

"ایک دفعہ بھی اندر نہیں گئیں؟" تانیہ نے تعجب سے اس کی بات کاٹ دی۔

"لگتا ہے پپا اور کاکا جان میں زبردست ٹینشن ہے۔ پھر بھی کاکا جان "گڈول" حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے

ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی وائف مجھ سے مس بی ہیو کریں۔ اسی خدشے کے سبب انہوں نے مجھ سے ملوایا نہیں تھا۔ ہمیں کاکا جان سے مطلب ہے۔"

"ہم نے تو کبھی ملنے نہیں دیا کہ یار ماموں اور کاکا جان میں کوئی ٹینشن ہے۔ کاکا جان کا تو اسی وجہ سے یہاں ہمیشہ ہی ان کو بہت نارمل دیکھا ہے۔"

سوچی وہ بھی خاموش تماشائی تھی۔ جنگ کے منظر کے تصور ہی سے ہول آ رہے تھے۔ صورتحال پہلو بچا گئی تھی۔

"پھر بھی ہم نے کبھی یار ماموں اور کاکا جان کو گھر کے افراد کی طرح بات کرتے نہیں دیکھا۔"

روبی بھی شامل ہو گئی۔

"چھوڑیں اس قصے کو۔ ابھی اچھی اچھی باتیں کریں۔ اب روشی چانس کب آئے گی۔"

گلو نے اپنی مخصوص روداری سے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"تم آ جاؤ پھر بہت دیر ہو جائے گی۔ سامان گھر لے جانا۔" ماہین نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ سب لڑکیاں بھی کھڑی ہو گئیں۔

"چاچی امی سے نہیں ملو گی؟" روبی نے دریافت کیا۔

روشی نے ماہین کی طرف دیکھا۔

"مل چکی ہے یہ۔ چلو۔" ماہین نے اس سے نظر چرا کر کہا۔ روشی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں۔

وہ سب اس کے ساتھ پورچ تک آئی تھیں۔ اسی دم وہ شفق پر جاری ذہن سے پورچ میں داخل ہوا۔ پہلے تو وہاں موجود ہجوم سے کچھ سمجھ نہ پایا پھر چابی گھما کر فرش پر پاؤں ٹکا کر سب کو باری باری دیکھنے لگا۔

"ہاسپٹل جا رہی ہیں آپ لوگ؟" وہ گلو سے مخاطب ہوا۔

"ہمیں کون لے جاتا ہے۔ یہ تو بس حویلی کی لڑکیوں کے بابا صاحب ہیں ہمارے نہیں۔" یہ تو روشی بری جا رہی ہے۔ اسے الوداع کہنے کھڑے ہیں۔"

وہ بری طرح چونک کر جیب سے گئی روشی کی سمت دیکھا۔ سفید کاٹن کے کرتہ شلوار میں ملبوس بڑا سا سفید دوپٹہ ہاتھ سے جوڑ پھیلائے وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

"یار! اچھا جا رہی ہیں کیا؟" اس نے ماہین کی سمت الجھن میں دیکھا۔

"نہیں... فی الحال صرف روشی جا رہی ہے۔"

"مگر...؟" وہ ابھی کچھ نہیں سمجھا۔

"ہوں... وہ چاہتے ہیں اب روشی وہاں ہمارے ساتھ رہے۔" ماہین نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"اور... ملاقات ہو گی روشی بی بی کی بابا صاحب سے؟" وہ بظاہر ماہین سے مخاطب تھا مگر روشی سے کچھ کھوج رہا

تھا۔

"ہاں ہو گئی جب ہی تو"۔ ماہین نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

"باقی تو سب ٹھیک ہے؟" اس کی تشویش صرف روشی سمجھ رہی تھی۔ وہ بائیک سے نیچے اتر آیا تھا۔

"ہیں! گلو کمر سے کہہ دیا کہ روشی کے کمرے سے سامان لے آئے"۔ ماہین نے بیٹے سے دریافت کیا۔

"جی"۔

"کس کے ساتھ جا رہی ہیں روشی بی بی؟" ہادی نے ماہین سے پوچھا۔

"ڈرائیور کے ساتھ"۔ ماہین نے جواب دیا۔

"بہت جلدی ہے کیا"۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نہا دھو کر کپڑے بدل چکا تھا۔ جس سے ظاہر تھا اسے خاصی دیر ہو گئی حویلی آئے ہوئے۔

"ہاں شاید ... چلو روشی بیٹھو ... گھبرانا نہیں۔ ہم پرسوں ان شاء اللہ پہنچ جائیں گے"۔ ماہین نے روشی سے کہا۔

روشی پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس نے وہاں موجود لڑکیوں میں سے کسی سے بات نہیں کی تھی۔

تھوڑی دیر میں گلو کمر اس کا سوٹ کیس اور بیگ لے کر آ گیا۔

ہادی نے چور نگاہوں سے روشی کی سمت دیکھا پھر لڑکیوں پر نظر ڈالی۔ چند لمحے کچھ سوچا پھر بائیک سے چابی نکال کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ سب لڑکیاں کہاں ہیں۔ کچھ پتا ہے؟" معیذہ سامنے آ گئیں۔

"وہ روشی بی بی کو الوداع کہہ رہی ہیں باہر پورچ میں"۔ اس نے مختصر کہا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں موصوف؟" معیذہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"ہری پور"۔ اس نے پھر اختصار سے کام لیا۔

"مگر یاور ماموں اور ممانی تو یہیں ہیں"۔ ان کی حیرت قابل دید تھی۔

"یاور چچا کے حکم پر ہی روانگی ہو رہی ہے"۔ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

"لیکن کس کے ساتھ جا رہی ہے؟" ان کی حیرت بدستور تھی۔

"ڈرائیور کے ساتھ"۔ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھا۔

"تم چھوڑ آتے۔ کیا یہ مزید خطرہ مول لینے والی بات نہیں ہے"۔ ان کے طویل جملے نے اسے آگے بڑھنے سے روکا۔

"اب کوئی خطرہ نہیں ہے آپ اطمینان رکھیں"۔ وہ جانے کس دھن میں کہہ گیا۔

"اچھا"۔ ان کا انداز بڑا معنی خیز تھا "تمہاری 'باخبری' پر تو ہمیں رشک آتا"۔ وہ دھیمے سروں میں ہنس پڑیں۔

ہادی ایک دم کانشس ہو گیا۔

"ہادی ... اب تو وہ کافی دن وہیں رہے گی؟" معیذہ کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

"تو کیا ہوا۔ ان کے باپ کا گھر ہے"۔ وہ بھی ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ مبادا کوئی اور جملہ آ جائے۔

وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے برآمدے کے زینے اتر گئیں۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" عالم تاب سخت لہجے میں گلو سے مخاطب تھیں۔

"جی ... وہ ماہین بی بی کی ملنے والی ہیں اور تو مجھے پتا نہیں"۔ گلو گھگھیا رہی تھی۔

وہ ہال نما برآمدے میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی گیلے بال سلجھا رہی تھی۔ اسے یہاں کے قاعدے قانون کا بھلا کیا ادراک تھا۔ اس نے بال سلجھانے کے دوران ہی بیٹھے بیٹھے ہوئے جواہر سے دمکتی عورت کو اپنے حساب سے اس حویلی کی اہم شخصیت سمجھتے ہوئے سلام کر لیا تھا۔ عالم تاب کی شاہانہ نازک طبیعت پر اس کا یہ انداز بہت گراں گزرا تھا۔ اس لیے بیچ میں خود پہنچ آ گئی تھیں۔

"کہاں سے آئی ہو تم؟" وہ براہ راست اس سے گویا ہوئیں۔

"کراچی سے"۔ اس نے ہاتھ روک لیے۔

"میرا مطلب ہے ٹھہری ہوئی کہاں ہو؟" وہ پیچھے پڑ گئیں۔

"جی۔ سیدھی یہیں آئی ہوں؟" وہ قدرے ہچکچائی۔

"اوہ ... ماہین سے ملاقات ہو گئی؟ کیسے جانتی ہو ماہین کو؟"

"جی ... وہ ..." اسے ماہین کی ہدایات یاد آ گئیں۔ "آپ ان سے پوچھ لیں۔ انہیں سب پتا ہے"۔ وہ بس یہی کر سکی۔

"کیا مطلب؟ تمہیں اپنا نہیں پتا؟" تعجب سے ان کی بھنویں اوپر چڑھ گئیں وہ خاموش رہی۔

"بلا کے لاؤں ماہین بی بی کو"۔ گلو نے خدمات پیش کیں۔

"نہیں۔ میں خود جا رہی ہوں ان کے پاس۔ تم بھی کنگھی چوٹی کر کے وہیں آ جاؤ"۔

"ماہین بی بی ہال میں ہیں جی۔ یاور خان آ رہے ہیں ناں"۔

"یاور کب آئے؟" عالم تاب چونک گئیں۔

"بڑی دیر ہو گئی ہے آپ آرام کر رہی تھیں۔ روشی بی بی کو سب خدا حافظ کہہ کر ہال میں بیٹھی ہوئی ہیں چائے بنانے جا رہی تھی میں سب کیلئے آپ کیلئے بناؤں؟" گلو ان کے خراب موڈ کو دیکھ کر جلد از جلد کھسکنا چاہ رہی تھی۔

سب ہی کو ان کے آف موڈ سے ڈر لگتا تھا کہ قصوروار بے قصور سب ہی کی شامت آ جاتی تھی۔

"نہیں"۔ وہ دوبارہ ایک تفصیلی نظر ڈال کر ہال کی طرف بڑھ گئیں۔

سب انہیں ہال میں موجود پا کر ایک دم سنبھل گئیں۔

"یاور آگئے ہال سے؟ کیا کہہ رہے تھے؟" وہ ماہین سے مخاطب ہوئیں۔

"کہہ رہے تھے اب تو حالات کنٹرول میں ہے فکر کی کوئی بات نہیں"۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" وہ فوراً اپنے مقصد کی طرف آگئیں۔

"کون؟" ماہین نے بے ساختہ ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ جو ابھی ادھر گئی ہے تمہارے کپڑے پہنے باہر نکلی ہے" وہ بڑے غور سے ماہین کو دیکھ رہی تھیں۔

"گلو۔" ماہین کو یکدم دھیان آگیا۔ اس نے فوراً عالم تاب کا چہرہ دیکھا۔ انہیں اپنی جانب دیکھتا پا کر بے ساختہ گویا ہوئی۔

"جی۔ ہماری جاننے والی ہے۔"

"جاننے والی۔ کیا مطلب؟" وہ الجھ گئیں۔

"کراچی سے آئی ہے۔"

"ہاں ہاں۔ وہ تو مجھے پتہ چل گیا ہے۔" وہ بات اچک کر بولیں۔

"ہماری کام کرنے والی ہے یہاں اس کی بہن ہے۔"

"مگر یہاں کیا کرنے آئی ہے؟" ان کی حیرت بجا تھی۔

"اپنے کسی سسرالی رشتے دار کے پاس آئی تھی۔ اس کا گھر نہیں ملا۔ اتفاقاً عامر اپنے ساتھ لے آئی تھی اس لئے یہاں چلی آئی۔ لگتا ہے اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے یا اس کے حالات خراب ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ چلی جائے گی۔" ماہین نے بہت سنبھل کر جواب دیا۔

"نہیں خیر اس کے یہاں رہنے سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے ذکر عمران کی آل اولاد مجھے دو ٹکوں کی نظر آتی تھیں۔ ایک یہ بھی ہوئی۔ وہ تو میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ بالکل نیا چہرہ۔ مقامی بھی نہیں لگ رہی تھی۔"

ماہین نے طمانیت کا گہرا سانس لیا۔

عالم تاب ہال سے باہر چلی گئیں۔ کچھ سوچ کر ماہین بھی اٹھی اور پیچھے پیچھے چل پڑی۔ کچن سے متصل راہداری میں بالو اور گلو باتیں کر رہی تھیں۔

"گلو! اسے ناشتہ کراؤ اور سب سے اوپر جہاں تمہارا کمرہ ہے۔ وہاں کسی کمرے میں اسے پہنچا دو۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہے تھک گئی ہوگی۔"

"بالو۔۔۔ تم ناشتہ کر کے آرام کرو اور بالکل فکر نہ کرو۔ تمہارا کام میں کروں گی۔ بس اس بات کا دھیان رکھنا جو تم نے مجھ سے کہا ہے۔ کسی اور سے نہ کہنا ورنہ تمہارا کام کبھی بھی نہیں ہو سکے گا اور تمہیں ایسے ہی واپس جانا ہوگا۔۔۔ سمجھ رہی ہو میری بات۔"

اس نے بالو کی شکل دیکھی۔ گلو وہاں سے جا چکی تھی۔

"جی۔۔۔ جی۔" بالو چوٹی میں بل ڈالنے لگی۔

صفریہ کے حوالے سے وہ اس سے پہلے بہت الجھ گئی تھی۔ اس کی بہن عجیب پراسرار انداز میں دنیا چھوڑ گئی تھی۔ یہاں کی

ایک ایک بات ایک ایک حرکت اسے یوں تو یاد تھی سب ہی ایک بات سے مکمل طور پر الجھن کا باعث بن رہی تھی۔

"ایک بات پوچھوں تم سے؟" اچانک اسے دھیان آیا۔

"جی پوچھئے۔" بالو نے گم صم سے انداز میں جواب دیا۔

"تمہارا چہرہ بالکل کم عمر لڑکیوں جیسا ہے لیکن جب تم میرے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ مجھے جانے کیوں محسوس ہوا کہ تم شادی شدہ ہو۔" ماہین کی آواز بہت دھیمی تھی۔

بالو نے چونک کر ماہین کی شکل دیکھی۔ پھر ایک دم نظریں جھکالیں۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں بیگم صاحب؟"

"ایک بھی نہیں۔" اس نے زیادہ لمبی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"پھر بھی آپ کی نگاہ۔۔۔" وہ جھجک کر رک گئی۔

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ بیاہی کنواری تم تو دیکھتی ہیں۔" یہ کوئی ایسی مشکل بات تو نہیں۔

"میں اس لئے بھی پوچھ رہی تھی کہ مجھے تمہارے حالات سے مکمل طور پر باخبر ہونا چاہیے۔ ورنہ میرے لئے مسئلے پیدا ہو سکتے ہیں۔"

"وہاں ادھر سے ہاں کراچی میں ایک سیانی ہے مائی خیراں۔ وہ بڑا اچھا علاج کرتی ہے۔ کہتی ہے اولاد ہوگی۔"

"(لاحول ولا قوۃ) تم ناشتہ کر کے اوپر آرام کرو۔ میں سوچ سمجھ کر مناسب دیکھ کر تمہیں بلوا لوں گی۔ جب تک میں نہ بلاؤں تم یہاں مت آنا۔ ٹھیک؟"

اس نے فطری انداز میں جھجک کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہیں گی ویسے ہی کروں گی۔" بالو نے تھکے سے بال نکال کر ٹھکانا شروع کیا۔

ماہین ادھر باہر ہال کی سمت بڑھ گئی تھی۔

اس نے گلو کو بالو کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اسے اس رات کا انتظار تھا پچھلی رات کیونکہ بہت پریشان گزری تھی۔ اس لئے آج رات سب جلدی اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

ہاشم خان آفیشل سٹڈی میں مصروف تھے۔ یہ وقت اس کیلئے بے حد کٹھن تھا کہ جانے کب سوئیں۔

اور پھر شاید نہ سوئیں بلکہ ساری رات بھی جاگتے رہیں۔ ان کے پل پل بدلتے موڈ کا بھلا کیا بھروسا۔

"کافی لاؤں آپ کیلئے؟" اس نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ آخر وقت بھی تو گزارنا تھا۔

"نہیں۔۔۔ موڈ نہیں ہے۔ سونا چاہو تو سو سکتی ہو۔"

کل سے آج تک وہ دونوں سرعت سے کوئی عرصہ پھلانگ گئے تھے۔ آپ سے تم پر آگئے تھے۔ اس نے محسوس کیا۔ گو ابھی تک انہیں سوچا نہ ہی برا منایا بلکہ شاید اسے اچھا لگا تھا۔ حقیقی قربت کا احساس جاگ اٹھا تھا۔

اکثر اوقات تو وہ اسے اتنے پرتکلف محسوس ہوتے تھے کہ لگتا تھا ان کے جسم میں بجلی بھری ہو۔

"فی الحال تو نیند نہیں آ رہی۔ شاید روشی بھی جاگ رہی ہو، فون کر لوں اسے؟"

"کیا ضروری ہے؟ اتنے نخرے مت اٹھاؤ۔ اس کا آل ریڈی دماغ خراب ہے"۔

انہوں نے کوفت بھرے انداز میں کہا۔

"اوں...... ہوں...... یوں نہ کہیے۔ سب کی سننا چاہیے۔ جانا کیا ہے"۔

"اب آپ موصوفہ اپنی وکالت سے میری رات کالی کریں گی؟ جائیے کر لیجیے"۔

انہوں نے جیسے جان چھڑائی۔ یا پھر یہ کہ کوئی سوفٹ کارنر موجود تھا۔

"تھینکس"۔ اس نے جانے سے پہلے فریج سے چھوٹا سا پانی کا جگ نکال کر ان کے قریب رکھا۔ ساتھ ہی گلاس رکھا اور خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

ہال میں آئی تو دیکھا۔ باری فون کرنے میں مصروف تھا۔ سر سوتی سینا ستائی میں مصروف تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اوپر "مہمان" کے ساتھ باتیں ہو رہی ہے۔

"صبح ہو سکتے ہیں یہ سب کام۔ تمہیں صبح سب سے پہلے اٹھنا ہوتا ہے۔ سو جایا کرو"۔ اس نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

"کہاں اٹھتی ہے یہ صبح۔ ماما جی سے پوچھیے کس طرح اٹھاتی ہیں اسے؟"

باری نے ڈائل کرنے کا عمل موقوف کیا اور ریسیور کان سے ہٹا لیا۔

"خیریت ہے ناں؟" اس نے ماہین سے استفسار کیا۔

"ہاں خیریت ہے۔ بس وہ ایک فون کرنا تھا ہری پور۔ روشی کو۔ مجھے یقین ہے وہ جاگ رہی ہوگی"۔ وہ وہیں کرسی کے ہتھے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھی یقین ہے"۔ وہ بے ساختہ انداز میں گویا ہوا تھا۔ مگر اپنی بے ساختگی پر شرمندہ نہیں تھا۔

ماہین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"بڑی خوار ہے لڑکی۔ بس کرو"۔ وہ ہنس رہی تھی۔

"ذرا ڈائل تو کرو۔ کہیں ریکارڈنگ تو نہیں لگی ہوئی۔ السلام علیکم اطلاع عرض ہے اس وقت تمام لائنیں مصروف ہیں۔ وہ مہربانی تھوڑی دیر بعد ڈائل کیجیے"۔ اس نے بڑے انداز سے نقل اتاری۔

باری بڑے بھرپور انداز میں ہنس دیا۔ پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"کیا بات ہے بڑے خوش نظر آ رہے ہو"۔ ماہین نے کچھ محسوس کر ہی لیا تھا۔

"خوش رہنا چاہیے۔ اگر نہیں تو خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیے"۔ وہ نمبر ملاتے ہوئے بھی جواب دینے سے باز نہ آیا۔

"جناب۔ مسز یاور علی خان مس روشانے سے بات کریں گی"۔ نمبر مل گیا تھا۔

"آ جائے۔ ہولڈ کرایا ہوا ہے۔ بڑی خوبصورت دھن لگی ہوئی ہے"۔ اس نے ماہین کو بتایا۔

"چلو پہلے تم بات کر لو۔ حال چال پوچھ لو"۔ وہ مسکراتی ہوئی قریب آ گئی۔

"آپ ہی پہلے بات کریں گی؟" اس نے ریسیور ماہین کو تھما دیا۔

"کیا مضائقہ ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے ریسیور کان سے لگا لیا۔

باری وہیں بیٹھ کر اخبارات پلٹ کرنے لگا۔

"ہوں...... وعلیکم السلام"۔

"سوئی تھی۔ سوری۔ سوری۔ رئیلی ویری سوری۔ ہائی ری وے۔ کیا یہ ڈگری کا کمال ہے۔ ہمارا تو خیال تھا شاید تم تبدیلی محسوس کر رہی ہو گی اور جاگ رہی ہو گی"۔

"قدرتی نیند سو رہی تھی؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بالکل بھی ٹینس نہیں ہو۔ وہی گڈ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی"۔

"ٹھیک ہے۔ ان کے سوا کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہیں تم سے متعلق انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ سچ"۔

"باری سے بات کرو گی؟" ماہین نے باری کی سمت دیکھا جس نے جھٹ سر اٹھا کر کوئی تاثر نہیں دیا۔

"ہاں ٹھیک۔ ہال میں مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر۔ نہیں۔ مرضی ہے تمہاری۔ اچھا چلو اب تم سو جاؤ۔ مجھے تمہاری خیریت ہی معلوم کرنا تھی۔ او کے۔ اللہ حافظ"۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اچھا جناب۔ اب خبر لینا ہے تمہاری۔ مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی کہ روشی سرائے میں بحفاظت موجود ہے۔ مجھے اب بھابی بیگم نے بتایا تو مجھے واقعی تم پر بہت غصہ آیا۔ تم بھی ڈرامہ کرتے ہو......؟

"یہ کوئی چھپانے والی بات تھی؟ وہ اپنے حقیقی چچا کے ہاں تھی۔ جبکہ وہ گئی ہی وہیں تھی۔ درمیان میں کوئی بلنڈر بھی نہیں ہے۔ پھر؟"

حالانکہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق بدگمان نہیں کیا تھا...... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے اور بڑی حویلی کے جس طرح کے تعلقات ہیں' ممکن ہے کہ باری وہاں اتفاقاً ہو اور تیمور علی خان نے باری سے بھی اسی طرح روشی کی موجودگی چھپائی ہو جس طرح خود اس سے چھپائی تھی۔ اہم بات یہ تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ روشی کی جو گفتگو پھر کو اپنی کزنز کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ دونوں بھائیوں کے تعلقات "پہ پر" ہیں۔

لیکن اس وقت تو اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ یہ تو یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ روشی سے حقائق معلوم کرے گی' وہ اس سے کوئی بات زیادہ دیر چھپا نہیں سکتی۔

"میں وہاں اتفاقاً ہی نہیں ہوں۔ وہاں اگر میرا وقت گزرتا ہے تو زیادہ تر بچیوں کے چکر یا شوگر مل میں۔ کاکا جان اس طرف گئے ہیں۔ بابا صاحب کہتے ہیں تو چلا جاتا ہوں۔ کبھی کبھار جاگیر کا بھی کوئی کام نکل آتا ہے۔ اینڈ ویٹس آل"۔

وہ مسکرا دیا۔ بڑا اعتماد تھا اس میں۔

"ویسے ماری۔ یہ تیمور علی خان کی شخصیت کچھ مسٹریس سی نہیں ہے؟ مجھے تو بہت عجیب لگا۔ اب میں نے محسوس کیا ہے
ہیں۔ یا وہ تو اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتے۔ شاید ان کے درمیان کوئی پراپرٹی اس ہوبت (تنازعہ) ہے؟ کیوں؟"

"میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یقین کیجئے میں یہاں بھی اتنا انوالو نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں"۔ وہ کسی دھیان سے
چونک کر بولا تھا۔

ماہین چونکی سے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس لئے گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

"ستو ماری۔" "بے بتائے" "کو نہیں بتاتے"۔ اس کے انداز میں شکایت تھی۔

"خدا نخواستہ...... یہ مجال نہیں ہے میری آپ تو ماشاءاللہ بہت جینئس ہیں"۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بھی تو کوئی نمبر ڈائل کر رہے تھے جب میں نے مداخلت کی تھی۔ پھر تم نے وہ دوبارہ ڈائل نہیں کیا۔ کیا بھول گئے؟"
ماہین نے یاد دلایا۔

"نہیں...... پوسٹ پونڈ کر دیا ہے۔ شاید میرا دوست سو چکا ہو"۔ اس نے بے بات کی نہیں۔ مگر الٹی۔ "دوستوں کے
معاملے میں بہت کانشس ہوتے ہیں۔ ان کی ٹائمنگ کا خیال رکھتے ہیں"۔ ماہین نے معنی خیز انداز میں اسے نصیحت کی۔

"یاد رکھوں گا"۔ وہ مسکرا دیا۔

"تم سوتے کب ہو؟" جاتے جاتے وہ پلٹ آئی۔

"خیریت؟" وہ الجھا۔

"ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ کیونکہ ہمیشہ جاگتے ہوئے ہی ملتے ہو"۔ وہ بولی۔

"سوتا بھی ہوں مگر بڑی جلدی فریش ہو جاتا ہوں۔ مجھے لمبی نیند کی خواہش نہیں ہوتی۔ ہمیشہ سے۔ اب سونے جا
رہا ہوں۔ صبح پانچ بجے اٹھ جاؤں گا۔ لیکن آپ کا جاگنا معنی خیز ہے۔ اب تو الحمدللہ سب خیریت ہے"۔

"ہاں۔ خیر اللہ کا شکر ہے۔ ویسے ہی کبھی کبھی نیند نہیں آتی۔ اچھا شب بخیر"۔ وہ باہر آ گئی۔

سرسوتی کچن میں برتن دھو رہی تھی۔

"سرسوتی۔ دیکھو اوپر سے گلو اور مہمان کو بلا لاؤ۔ میں یہیں ہوں ادھر ہی لے آؤ"۔

سرسوتی ہاتھ دھو کر فوراً چلی گئی۔ ماہین فریج سے پانی نکال کر پینے لگی۔

وہ سارا دن اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہی تھی مگر ایک لمحے کیلئے بھی اس کا ذہن بالو کی طرف سے نہیں ہٹ سکا تھا۔
ذہن تجسس کے دائرے میں گھوم رہا تھا۔ آئی دور سے یہ سٹیلا کی تلاش میں کیوں آئی ہے۔ اس عورت کی تلاش میں جو جانے
نظر میں برسوں پہلے مر چکی۔ اس لڑکی کا کیا انٹرسٹ ہے؟ ایک بے دست و پا عورت اس کے کس کام کی؟

وہ کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ اسے کس کس پوائنٹ پر بات کرنی ہے۔ اور آج ہر صورت سٹیلا کے راز سے
اٹھانا ہے۔ کیا ان راہوں سے گزرتے ہوئے ہو سکتا ہے اسے نازمین کے بارے میں کچھ پتہ چل جائے۔

لیکن اس سے حاصل کیا ہوگا۔ جو پردے میں ہے وہ پردے سے باہر آ بھی گیا تو کیا ہوگا۔ وہ کیا کر سکتی ہے وہ کیا کر
سکے گی۔

شاید کوئی بڑا نقصان ہو جائے۔ شاید کوئی بڑا فائدہ ہو جائے کہ فی الحال ذہن میں بھی تو انسان کی توانائیاں [illegible] رہتا ہے۔
انسان کو زندگی کے اگلے راستے واضح نظر آ رہے ہوں تو اس کے حال اور مستقبل کے احساس میں ایک سکون کا احساس رہتا
ہے۔ فوائد نقصان کے سودے ہی لے ہو مگر ایک ذہن بن جاتا ہے اور پھر وہ تو ایک متوازن اور آرام دہ ماحول میں پلی بڑھی
تھی۔ اسے تو معمولی تجسس بھی بھاری گزرتا تھا۔ شاید اس کی تخلیق ہی کچھ ایسے ماحول سے ہوئی تھی وہ یہاں کی کسی بات کا [illegible]
جاننا چاہتی تھی۔

بس کچھ تھا جو اسے محسوس ہوتا تھا۔

حالانکہ جس کی سمت دیکھتی تھی وہ وہ ایک صاف اور غیر جانبدار نظر آتا تھا۔ پھر بھی جانے کیا محسوس کرتی تھی۔ اس
احساس سے بڑی وحشت ہوتی تھی کہ یہاں ہر معاملے میں غیر ضروری رازداری برتی جاتی تھی۔ وہ تو اس سوچ کی حامل تھی کہ
جب انسان غلط نہیں کرتا تو کانشس بھی نہیں ہوتا۔

"بی بی جی!" اسے گلو کی آواز آئی۔

اس نے اپنے دھیان سے باہر آ کر ان کی سمت چند لمحے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں...... تم جاؤ۔ گلو آرام کرو۔ آؤ بالو تم یہاں بیٹھو۔ سرسوتی تم جلدی سے اپنے برتن سنبھالو پھر پیچھے چلا جاتا ہے"۔

گلو باہر نکل گئی۔ مگر چند لمحوں کے بعد لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آئی۔

"بی بی۔ یادو خان بلا رہے ہیں آپ کو"۔

"کون...... مالی کاکا!" اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "بالکل بھی دھیان نہیں رہا۔ نہیں جا سکتا چھوڑ کر آئی تھی"۔

"ابھی آتی ہوں۔ تم لوگ یہیں میرا انتظار کرو"۔

"یہ کون ہیں جو آپ کو بلا رہے ہیں؟" بالو نے پوچھتی ہوئی ماہین سے استفسار کیا
۔

"مہمان ہیں۔ میرے۔ اور اس وقت کس کی ہمت ہو سکتی ہے بلانے کی؟" وہ ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔

اس بھولے سے دل والی لڑکی نے کتنے رشک سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

"کتنی خوش ہیں یہ۔ ان کا مہمان ہوگا۔ ایسا کہ وہ خوش ہوں"۔ اسے جانے کیا کیا یاد آ گیا۔ آنکھوں کے کنارے بھیگنے
لگے۔

ماہین بہت مجھ بوجھتی ہوئی بیڈروم میں آئی تھی۔ اندر نائٹ بلب جل رہا تھا۔

"جی۔ خیریت؟"

"خیریت کیا آرام کیا کرو۔ کیا کر رہی ہو تو نہیں ہوا ابھی تک؟" انہوں نے کروٹ بدل کر اس کی سمت دیکھا۔

''میں ذرا ہال میں ہوں۔ ابھی آ کر سوتی ہوں''۔ اس نے دروازے کے نزدیک کھڑے کھڑے جواب دیا۔

''ہال میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا لڑکیاں ابھی تک جاگ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں ہو رہا۔ بس میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں''۔ اس نے جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔

''ٹھیک ہے؟''

''اچھا اچھا۔ یہ نائٹ بلب بند کرتی جانا۔ پلیز''۔

ماہین نے نائٹ بلب آف کر دیا اور باہر آ گئی۔

بالو اور سرسوتی اس کی منتظر تھیں۔ حسب ہدایت کوئنٹہ رنگ کی لیزر پوش سرسوتی سینے سے لگائے کھڑی تھی۔

''چلو''۔ اس کے سینے میں ایک آتش شوق بھڑکنے لگی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑیں۔

چند منٹ کی واک کے بعد اپنی منزل تک پہنچ گئیں۔

جھومر انہیں راہداری ہی میں مل گئی۔ اس نے قدرے حیرت سے بالو کی سمت دیکھا جو ماہین کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ لہٰذا اس پر نوکرانی کا احتمال نہیں ہو رہا تھا۔

''السلام علیکم''۔ اس نے ماہین کو سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہو؟''

''جی۔ الحمدللہ۔ آپ سنائیں بزرگوار کیسے ہیں؟'' وہ عجب سرخوشی میں مسکرا رہی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے۔ خطرے سے باہر ہیں۔ تم کہاں ویرانے میں چہل قدمی کرتی پھر رہی ہو؟'' ماہین نے جھومر پر ایک نگاہ ڈالی۔

''بس جی قسمت میں یہی لکھا ہے''۔ وہ بالو کی سمت دیکھنے لگی۔

''کیا یہ؟'' بالو نے ماہین کی سمت ہچکچاتے ہوئے دیکھا۔

''نہیں نہیں۔ یہ مطرب نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر تو تمہیں بہت دکھ ہوگا۔ جھومر۔ مطرب کو لے آؤ اپنے کمرے میں''۔ ماہین نے کہا۔

''آج تو بہت ہی ناممکن ہے۔ خان ہاری خود تالا لگا کر گئے ہیں۔ ان سے چابی کون لائے۔ سکھیا بھی نہیں ہے کہ رشتہ کرا لائیں''۔

''اوہ۔ یہ تو مسئلہ ہو گیا''۔ ماہین الجھن میں پڑ گئی۔ ''یہ تو بے چاری دور دراز سے محض تمہاری مطرب سے ملنے آئی ہے''۔

سارا وزن ''بے چاری'' پر پڑا۔ وہ اپنے شوق و تجسس کا تو اظہار کر نہیں سکتی تھی۔

''پھر اب کیا کریں؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''کیا اسے یہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔ عارف بھائی تو۔۔۔'' بالو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''چلو تو دو ساں بی بی''۔ سرسوتی نے خدمات پیش کیں۔

''ہاں۔ چلو تو دو اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے پہلے ایسا کرو کہ چوکی بند کر کے آؤ کہ شور باہر نہ جائے''۔ ماہین نے کہا۔

''نہیں ہاری۔ وہ۔ مجھ پر بہت خفا کریں گے''۔ جھومر نے منہ بنا کر کہا۔

''تم فکر نہیں کرو۔ میں اس سے خود بات کروں گی''۔ ماہین نے تسلی دی۔

''چلو تم کوئی بھاری سا پتھر لے آؤ''۔ اس نے سرسوتی سے کہا۔ وہ بے چاری پتھر کی تلاش میں چل پڑی۔

''یہ کہاں سے آئی ہیں؟'' جھومر نے بالو کی بابت دریافت کیا۔

''کراچی سے''۔ ماہین نے مختصراً کہا۔

''آئی ہوئے۔۔۔ صرف مطرب سے ملنے؟'' جھومر کو بڑی حیرانی ہوئی۔

''رشتے دار ہو مطرب کی؟'' فطری سوال تھا۔

''نہیں''۔ اس نے کھٹکے کھٹکے انداز میں ماہین کی سمت دیکھا۔

''یہاں کا گھر ہے''۔ اس نے جھومر کی طرف اشارہ کر کے ماہین سے پوچھا۔

''ہوں''۔ ماہین نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔

بالو نے جھومر کی اس مرتبہ بڑے غور سے دیکھا۔ سانولی رنگت جیسے گھنے جنگل یا ویرانے کے بیچوں بیچ کھلی کوئی کلی۔

وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی سب سے پہلے تو یہی کہ آپ کے اس گھر میں وہ بے چاری کیوں قید ہے؟ آپ کا گھر اتنا ویران کیوں ہے؟ اور سب سے اہم یہ کہ مطرب آپ کی کیا لگتی ہے؟ اتنا معصوم کرنے والا حسن جلوہ آرا کیوں نہیں۔ اور یہ کہ اتنی ویرانی و وحشت میں آپ کیسے سانس لیتی ہیں؟ مگر وہ چپ رہی۔ سرسوتی کچھ دیر بعد ہانپتی کانپتی آ موجود ہوئی۔

''جلدی کرو سرسوتی۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد ٹوٹے گا''۔ ماہین بے پناہ چٹانی پتھر دیکھ کر پرجوش ہو گئی۔

سرسوتی گویا تالے پر ٹوٹ پڑی۔

''کون؟'' مطرب کی سوئی سوئی آواز۔

''گھبراؤ نہیں۔ ہم تالا توڑ رہے ہیں''۔ جھومر نے دوستانہ انداز میں تسلی دی۔

''کیوں اپنی جان مصیبت میں ڈالتی ہو۔ بھلا فائدہ کیا ہے۔ جاؤ سو جاؤ''۔

''تمہارے مہمان آئے ہیں ذرا صبر کرو۔ ابھی ٹوٹ جاتا ہے''۔

''مہمان؟'' اس کی حیرت آمیز آواز آئی۔ آواز کا وہ کھویا کھویا پن ختم ہو گیا تھا۔

''ایک منٹ صبر۔ ابھی دیکھ لینا''۔ جھومر نے تالے کو غور سے دیکھ کر ''کامیابی'' کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

اندر سے آواز آنا بند ہو گئی۔

وہ تینوں بھی بالکل خاموش تھیں۔ پتھر کی ضرب تالے پر پڑتی تھی اور سناٹے میں ایک آفت سی کوشش کی۔

"اندر سے آواز آنا بند ہو گئی۔

وہ تینوں بھی بالکل خاموش تھیں۔ چھڑی کی ضرب تالے پر پڑی تھی۔ اور سناٹے میں ایک آفت سی اتر آئی تھی۔ بالآخر تالا ٹوٹ گیا۔ پرانی وضع کا بھاری دیسی تالا تھا۔ سرسوتی پسینے پسینے ہو چکی تھی۔

"شکر۔۔۔ جھومر! سرسوتی کو کولڈ ڈرنک پلاؤ۔" ماہین نے سرسوتی کا شانہ تھپک کر خوشی کا اظہار کیا اور کنڈی کھول کر سب سے پہلے خود اندر داخل ہو گئی۔

ایک لمحے کو تو سر ہی چکرا گیا۔ سیلن اور بو سے کوٹھری کا ماحول اس کیلئے ناقابل برداشت سا تھا۔ پھر جیسے جالے پر جالے کے کوٹ چڑھ جائیں اس پر مستزاد انتہائی کم پاور کا بلب۔

"السلام علیکم بی بی!" سطریہ کی آواز نے اس کے حواس قدرے بحال کیے۔

"وعلیکم السلام۔ یہ کراچی سے اقبال بیگم آئی ہے۔ تمہارا پوچھ رہی ہے۔"

ماہین نے جلدی سے تعارف کرایا۔

"اقبال بیگم۔ کون؟" اس نے بغور بالو کو دیکھا۔ جو دم بخود سی کھڑی تھی۔ "میں نے تو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ حیرت زدہ تھی۔

"میں عارف بھائی کے گھر سے آئی ہوں۔" اس نے بمشکل حلق صاف کر کے آواز نکالی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ سطریہ" بالو نے بڑے ششدر سے انداز میں ماہین کی طرف دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

"عارف۔۔۔ وہ زندہ ہے؟ کیا لگتی ہو تم عارف کی؟ اس کی کوئی بہن تو تھی نہیں۔ تو کیا بیوی؟" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

ماہین کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔

بالو کی حالت عجیب و غریب ہو رہی تھی۔ وہ تو سطریہ کا جانے کون سا سنہری سا تصور لیے یہاں تک آئی تھی۔ وہ سطریہ جس کیلئے وہ صرف شعر کی زبان استعمال کرتا تھا۔

"میں اس کی کچھ نہیں لگتی۔ تم نے انہیں کسی کا کچھ لگنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے۔" اس کے اندر کی سوئی ہوئی [illegible] ایک دم جاگ اٹھی۔

"ایسا کرو سطریہ۔ جھومر کے کمرے میں آجاؤ۔" ماہین زیادہ دیر یہ ماحول برداشت نہ کر سکی۔ یوں بھی آج "کام" [illegible] تھا۔

"جھومر! انہیں اپنے کمرے میں لے آؤ۔" وہ کہتی ہوئی باہر آ گئی اور جھومر کے کمرے میں پہنچ کر اس نے اے سی کی کولنگ بڑھائی۔ دونوں ٹیوب لائٹیں جلائیں۔ سو واٹ کا ایک بلب بھی تھا۔ اس نے وہ بھی جلا دیا اور گہری طمانیت کا سانس لے کر صوفے پر ڈھے گئی۔ اوہ میرے خدا۔ بے چاری سطریہ۔ کاش میں اسے تازہ ہوا میں لا سکوں۔ اس کے مقابلے میں کتنی خوش قسمت ہیں وہ ڈنگر اور گھوڑے جو اصطبل میں بندھے ہیں۔ ایک دکھ اس کی رگ پے میں اتر گیا۔

چند منٹوں بعد وہ تینوں بھی اندر آگئیں۔ جھومر اپنے بیڈ پر اور وہ دونوں کارپٹ پر دروازے کے قریب بیٹھ گئیں۔

بالو کھڑی تھی اور تذبذب میں تھی کہ کہاں بیٹھے۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔ کوئی بات نہیں۔ اس حویلی میں سب سے زیادہ وہ بے چاری تمہیں میرے کمرے میں دیکھ کے گا۔ بے چارہ۔" "بھی کہہ سکتے ہیں" جھومر نے اپنے مخصوص قہقہے کے ساتھ اپنے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ماہین کو بھی ہنسی آگئی (بڑے دل گردے والی ہے جھومر)

بالو نے جھجکتے ہوئے قدم بڑھائے اور بہت احتیاط سے ایک کونے پر ٹک گئی۔ پھر جیسے ایک دم چونک پڑی۔ اس کوٹھری میں تو وہ ایک بھوت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر یہاں آ کے صوفوں میں فٹ جیسے کوئی تصویر ہو۔

"تم عارف کی کیا لگتی ہو۔" سطریہ اس سے زیادہ بے چین نظر آئی۔

(تم نے اسے اس قابل ہی کہاں چھوڑا ہے کہ کوئی اس کا کچھ لگے) بالو نے اس پر ایک نگاہ کی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ میں تو تم سے یہ کہنے آئی ہوں کیوں برباد کر دیا ہے تمہیں ملا کیا؟" اس کی آواز میں تیزی تھی۔

سطریہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "جب تم اس کی کچھ نہیں لگتی تو کہاں پایا ہے؟"

"بابا کہاں ہے؟ بابا نے کے صحن میں۔ جب وہ یہاں سے گئے تو تم نے ان کے سامنے سارے دروازے بند کر کے کیوں نہ کھولے؟ کس امید نے انہیں آج تک تنہا کیا ہوا ہے؟" وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

"میں تو اسے ہمیشہ سے منع کرتی رہی ہوں۔ اگر وہ سر پھرا ہے تو میں کیا کروں؟ جو کچھ ہوا اس کے سامنے ہوا۔"

سطریہ نے یاسیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"یہ عارف کون ہے؟" ماہین سے اور زیادہ صبر نہ ہو سکا۔

"نہیں ہوا کرتا تھا۔ خواب دیکھنے والا میری طرح۔ ایک بے وقوف۔ اگر وہ حسن پرست تھا تو بھی احمق تھا۔ باقی نہ رہنے والی چیز کا سایہ بننا چاہتا تھا۔" سطریہ نے افسردگی سے کہا۔

"کیا یہاں حویلی میں؟" ماہین نے سوال کیا۔

"ہاں۔ بچھ لیس۔ گاؤں کے چند پڑھے لکھے لڑکوں میں سے ایک تھا۔ سنو تم اس کے پاس واپس جاؤ تو کہہ دینا جو زنجیریں اس کے سامنے پہنائی تھیں وہ آج بھی میرے پاؤں میں ہیں۔ وہ خوش خبریاں جو حویلی میں باندھے پھر رہا ہے وہ میرے کسی کام کی نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ تمہیں دے دے۔" سطریہ کی آواز بھرا گئی۔

"مجھے تو بڑی جلدی ہے۔ میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ وہ کس آس پر ہر طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔" بالو نے سطریہ کی اداؤں پر ترحم آمیز نظر ڈالی۔

"تم عارف عارف کر رہی ہو حالانکہ وہ تمہارا کچھ نہیں لگتا۔ پھر یہ کس کا ہے؟"

ماہین کے چہرے پر رونق گئی۔ دوسرے یہ کہ وہ اداکاری سے وہ خود اپنا تعلق ظاہر کر چکی تھی۔ اور یوں راہ راست اس پر آ پڑنے والی پڑی تھی۔ ایک تو ذرا مشکوک دوسرے عالم تاب کی کھوجتی نظریں۔ اس کا اس قدر تجسس ہونا فطری تھا۔

"کچھ تو میرے خاندان کا ہے جی۔ آپ غلط مت سوچیں۔" بالو نے نہایت دکھ سے کہا۔ وہ ماہین کے انداز پر بہت کچھ

چکی تھی۔

"پھر...... یہ عارف کا کیا قصہ ہے۔ کیا وہ مطربہ" ۔ ماہین کو حقیقت حال جاننے کی بہت بے چینی تھی۔ کہ مطربہ اعتراف کر چکی تھی کہ وہ نازنین کی مجرم ہے اور اسی وجہ سے قید تنہائی کی سزا ہوئی ہے۔ کیا معلوم عارف کے قصے میں کیا بھید ہو؟ اس لئے تجسس اپنے کمال پر تھا۔

"وہ میرا قاتل ہے۔ میرا خون ہے اس کے ذمے۔ اور یہ اسے پاک صاف نہیں ہونے دے رہی" ۔ بانو چہرا ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"جھومر، ماہین اور سرسوتی حیران پریشان بیٹھی رہ گئیں۔ مطربہ البتہ بالکل پرسکون تھی۔

"تو اسے یہاں لے آتی ناں۔ کر دیتی اس بے وقوف کو پاک صاف" ۔ اس نے سپاٹ لہجے میں بانو سے کہا۔

"میرے اس کے بیچ پابندی والا کوئی رشتہ کبھی قائم نہیں ہوا۔ وہ تو بہت بھولا آدمی تھا اور مجھے اچھے خواب دیکھنے کی عادت تھی" ۔ وہ تلخ لہجے اور مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔

"مگر تم تو شادی شدہ ہو" ۔ ماہین ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

"اسی نے یہ پھندا میرے گلے میں ڈالا تھا۔ جب ہی تو کہتی ہوں وہ میرا قاتل ہے" ۔ بانو بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تمہاری میاں سے بنتی نہیں ہے؟" ماہین ٹھیک اندازے کے قریب پہنچی۔

"میں بتانا نہیں چاہتی" ۔ وہ تڑخ کر بولی۔

"پسند نہیں ہے" ۔

"نہیں" ۔

"نکھٹو ہے؟"

"مارتا ہے؟"

نشہ کرتا ہے؟"

"بس جی...... مجھے اچھا نہیں لگتا شروع سے۔ بہت بڑا ہے عمر میں مجھ سے" ۔ اس نے آنکھیں رگڑیں۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میرے میاں بھی مجھ سے بہت بڑے ہیں" ۔ ماہین کا انداز سمجھانے کا تھا۔ کہ وہ نادان لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔

"مگر وہ آپ کو اچھے لگتے ہوں گے" ۔ بانو نے بے پروائی سے کہا۔

"ہاں۔ خیر پتہ ہے" ۔ وہ ہنس پڑی۔

"تمہارا میاں کیا بدصورت ہے؟" جھومر جو دم سادھے بیٹھی سن رہی تھی۔ ایک دم بولی۔

"جب دل ہی نہیں چڑھتا تو کیا کریں" ۔ بانو نے ایک ناک چڑھائی۔

"عادت کا کیسا ہے۔ ایمانداری سے بتاؤ۔ سچ سچ" ۔ ماہین نے اس کی صورت بغور دیکھی۔

"ابھی کم عمر اور کنواری لڑکی تھی۔ عادت تو آپ ہی اچھی ہوتی تھی جی" ۔ بانو نے اداسی سے کہا۔

"خیر پتہ ہے عادت کیلئے شرط نہیں۔ بڑی بڑی حسین بیویاں ہوتی ہیں مگر عادت خراب ہو تو مرد نہیں رکتا۔ تم نے اسے دکھایا ہے وفائی کا تو تمہارے گھر والوں کی رضامندی ہوگی۔ جب ہی تو عادت سے لڑ رہی ہو۔ تمہیں خود نہیں کیا پتہ" ۔

ماہین نے کڑوا سچ بولا۔ بانو نے گڑبڑا کر اس کی شکل دیکھی مگر بولی کچھ نہیں۔

"اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ اس نے تو شروع میں شادی سے پہلے ہی بات طے کرنے کا عزم ہے۔ کہ بعد میں اس طرح کی صورتحال پیدا نہ ہو۔ مگر ہمارے ہاں اس بات کا خیال ہی نہیں رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں والدین رضامندی معلوم کی جاتی ہے۔ جب سو آدمی دروازے پر موجود ہوتے ہیں۔ بھلا لڑکی کیا کرے گی۔ اسے اہم مقام پر شرم کا نظر انداز کیا جاتا ہے جب کہ زندگیاں داؤ پر لگی ہوتی ہیں" ۔

ماہین نے تاسف سے کہتے ہوئے جھومر کی طرف دیکھا جو دردِ مشترک کے احساس سے گم صم بیٹھی تھی۔

"کیا عارف کا حویلی میں آنا جانا تھا؟" اس نے مطربہ سے دریافت کیا۔

"اس کی ماں حویلی میں ہی رہتی تھی۔ اس کا باپ بھی پٹواری تھا۔ بڑے خان جی عارف کو پڑھا لکھا رہے تھے تا کہ باپ کے بعد یہ گدی سنبھالے" ۔ مطربہ نے جواب دیا۔

"کیا تمہارے اس قصے سے میری بہن کا بھی کوئی تعلق ہے؟ وہ کسی خیال سے چونکی۔

مطربہ چند ثانیہ خاموش رہی۔

بس کیا کہوں۔ ان کا بڑا نقصان کیا ہے میں نے" ۔ وہ رونے لگی۔

وہ موڑ آ گیا تھا جس کے لئے ماہین نے تگ و دو شروع کی ہوئی تھی وہ ایک دم سنبھل گئی۔

☆—☆—☆—☆—☆

وہ چاروں اس کی سمت بغور دیکھ رہی تھیں۔

خدا کے لئے حطریہ اب بس کرو۔ کہہ ڈالو۔ ماہین نے بہت زچ ہو کر کہا تھا۔

تم کیوں مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی ہو۔ اس نے

ماہین کی بے چینی نظر انداز کر کے بہت سکون سے کہا۔ میں تو تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے آئی تھی کہ تم بس اس سے اتنا کہہ دو کہ تم نے اسے آزاد کر دیا۔ اسے رہا کر دو۔ ایسے کرو وہ تمہاری آس میں جینا چھوڑ دے۔ بس اپنے لئے جیے ان کے لئے جو اس کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔۔۔

بانو ایک تو اتر سے بولی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی جانتی تھی بلا کہ ماہین کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ میں نے تو اسے ہمیشہ مایوس کیا ہے۔ کب اسے اپنا پابند کیا ہے۔ کیوں خوامخواہ مجھ مری ہوئی کو رو رہا ہے۔ ایک بات سنو شاید اس کا دماغی توازن درست نہیں رہا۔ تم بالکل جوان ہو۔ کوئی اور گھاٹے کا سودا نہ کر بیٹھنا۔۔۔

حطریہ نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا تھا۔ اور ایک سچے چاہنے والے کی ساکھ بری طرح مجروح کر کے رکھ دی تھی۔

بھئی تم یہ قصہ کل پہ اٹھا رکھو حطریہ مجھے بتاؤ۔ کیا کر رہی تھیں؟ ماہین سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔

کیا سننا چاہ رہی ہیں آپ؟ پتہ نہیں آپ کی برداشت کی حد کہاں تک ہے؟ وہ پھر اطمینان بھرا قدم رکھے گی کہ بولی۔

تم میری فکر نہیں کرو ماہین نے جلدی سے تسلی دی۔

جھومر کے سامنے ہی بتا دوں۔ کہیں یہ تہلکا نہ کرے۔ حطریہ دھیرے سے مسکرائی۔

بے فکر رہو۔ ماہین بی بی کو مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

جھومر حسب عادت کھلکھلائی۔ اس بات سے قطع نظر کہ ماہین اور بانو پہ اپنے ماضی کی قیامت سے گزر رہی ہے۔

"بات کچھ اس طرح سے شروع ہوتی ہے بی بی!" حطریہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"توبہ ہے۔۔۔ کتنا اچھا جوں پانی برس رہا ہے۔"

خالہ سولہ آنے بھیگی بوری بنی کانپتی گھر میں داخل ہوئیں۔ یہ اتنے بے چاری کا اچھا بھلا نوری بیگم تھا مگر پتے تھیں کام کی جب سولہ آنے مشہور ہو گئی تھیں۔

"کوئی وقت سے ریل کاٹ تھیں سولہ آنے۔ ایک تو ادھر گرمی دوسرے بارش۔"

ایک کونے میں پڑے پلنگ پر بیمار بڑی بی کراہتے ہوئے بولیں۔

"ارے کیا بتاؤں پھوپھی۔ گھر سے تو حساب سے ہی چلی تھی۔ مگر کیا کروں ضلع کبیر اعظم تحصیل چار دو مشرع گنج حمل کے اس بھولے سے گاؤں اللہ دسایا تک پہنچنا آسان سی بات ہے۔ میں تو تمہارا اتر بلتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کس کا علاج کرا رہی ہو؟"

خالہ سولہ آنے نے سر سے برقعہ کھینچ کر نچوڑنا شروع کیا۔

"ارے وہی حکیم جمن والا۔ اور کون سے شاہی طبیب آئیں گے یہاں"۔ بڑی بی تکلیف سے عاجز بے حال پر قابو پا کر بولیں۔

"خیر یوں تو نہ کہو پھوپھی۔ بڑے بڑے شاہی طبیبوں نے نبض ٹٹولی ہے تمہاری"۔ خالہ سولہ آنے نے گلے سے دوپٹہ بھی اتار کر نچوڑنا شروع کر دیا تھا۔

"کمبخت کب کی باتیں لے بیٹھی۔ کچھ کھا پی لے کپڑے بدل کر بھوکی پیاسی مر رہی ہوگی۔ ارے زعفران بانو۔ کدھر مر گئی۔ خالہ آئی ہیں"۔ بڑی بی نے پوری طاقت اکٹھی کر کے چیخ پکار شروع کی۔

چند منٹوں بعد ایک بجلی کا جھماکا ہوا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔ خالہ۔۔۔ میں تو چھت پر بارش میں نہا رہی تھی"۔ وہ خوشی سے نہال نظر آ رہی تھی۔

"ہزار مرتبہ کہا ہے بے وقت کوٹھے پہ مت کھڑی ہوا کر۔ پرسوں بھی تجھے اصغر لوہاری کا لونڈا چھیڑ رہا تھا۔ باز نہ آئی اپنی حرکتوں سے"۔ بڑی بی کا پارہ چڑھ گیا۔

"اب کیا کرے غریب 'عمری چھیڑ' وانے کی ہے"۔ خالہ نے قہقہہ لگایا۔

"لاؤ خالہ اماں جی۔ وہ تمہارے کپڑے نکال دوں۔ ان کی عادت ہی ہے بہانے بہانے سے ڈانٹنے کی"۔ زعفران بانو نے خالہ کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔

"بھئی کیا الھڑ پن ہے لونڈیا نے"۔ خالہ نے بھیگے کپڑوں میں جانے کس انجانی خوشی سے چہرہ موڑ کر اس کو دیکھا۔

"اذان بھی لے لے گی۔ کوئی وقت جاتا ہے۔ اسی لئے تجھے بلایا ہے کہ اس بھاری پتھر کو سرکانے میں میرا ہاتھ بٹا دے۔" بڑی بی کانپتی آواز میں گویا ہوئیں۔

"ارے اللہ کرے کہاں کا بھاری پتھر۔ کیسی خوشبو جیسی لونڈیا ہے۔"

خالہ نے ستائشی نظروں سے اس کا سراپا دیکھا جو سوال آنے ترتیب وار تھا۔

"یہ تو اپنی ماں سے بھی بڑی تیز نکلی ہے۔"

خالہ نے گریبان سے بٹوا نکالا اور اس میں سے چابی نکال کر زیتون بانو کو تھمائی۔ وہ اپنی تعریفیں سن کر کھلکھلا رہی تھی۔

"ارے چھوڑو مراد کا قصہ۔ جان جلتی ہے میری اس کے نام پر۔"

بڑی بی نے اپنی جان ناتواں سے خوامخواہ ایسا حسن خرچ کیا۔

زیتون بانو ہنستے ہوئے صندوق کھول رہی تھی۔ "ایسی تعریفیں تو مرد ہی عورتوں کی کرتے ہیں۔" وہ بہت مزوں میں تھی۔

"اری بدذات کس کس سے سن بیٹھی تعریف۔ ابھی سے تیرا یہ حال ہے۔" بڑی بی تو آگ بگولا ہو گئیں۔

"مردوں کی تعریف پہ نہیں جاتے بیٹا۔ اچھا پھانسنے کا دانہ ہے یہ مردوں کا۔ خبردار۔ ایسے پرکھ کرا لئے ہیں ایک طرف کر چونچ پانی تک نہ پہنچے۔" خالہ سوال آنے قدرے سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔

"اری تو نے بتایا نہیں کس نے کی تھی تیری تعریف؟" بڑی بی کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی تھی۔

"ہائے اللہ امی میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا تھا نانی!" زیتون جھلا گئی۔

"ارے ہٹاؤ بھی پھوپھی۔ بچی کے پیچھے کون سمجھائے۔" خالہ قل قل کرتی ہنسی کے ساتھ گویا ہوئیں۔

"یہ تو اسی طرح نہا دھو کر پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ جاؤ خالہ! تم نہا کر کپڑے بدل لو۔ میں تمہارے لئے کھانا گرم کرتی ہوں" زیتون بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو تو کپڑے بدل لے۔ بخار دخار چڑھ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" خالہ کپڑے اٹھا کر غسل خانے کی طرف چل پڑیں۔

"زیتون بانو!" بڑی بی نے پکارا۔

"ہوں۔"

"ذرا سا سوجی کا حلوہ بنا لے۔ بڑی دور سے آئی ہے خالہ۔ ایک پیالی چائے بھی بنا دیجو۔ پانی میں بھیگتی ہوئی آئی ہے بے چاری۔"

"سن رہی ہے؟"

"ہاں ہاں..... بہری نہیں ہوں۔" وہ چڑ کر بولی۔

"تو کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہی ہے۔ آواز دبا کر بولا کر۔ جوان لونڈیوں کے یہ ڈھنگ اچھے نہیں ہوتے۔" بڑی بی ناراض ہو گئیں۔

"بالی مجیم چلن والے کے پاس دوا لینے جاؤ تو کم بولنے کی بھی کوئی دوا لیتی آنا۔ طاقت کی مت لانا۔ وہ تو تمہارے بولنے میں کام آ جاتی ہے۔" زیتون بانو نے جھلا کر کہا تھا۔

"دیکھو اس کی زبان کیسی چلنے لگی۔ جسم اور قد کے ساتھ ساتھ کیا زبان بھی بڑھ رہی ہے۔ اب میری اس کو حاجت نہیں رہے گی۔"

بڑی بی بڑبڑانے لگیں۔

زیتون بانو چپ چاپ کھانے کے انتظام میں لگ گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں خالہ غسل سے باہر آ گئیں۔

"پھوپھی۔ شہر بانو کتنی دیر میں چکر لگاتی ہے اب؟" وہ بڑی بی کی چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گئی۔ "وہ کیوں چکر لگانے لگی۔ ہم نے ان کو کون سا اس کے قرضے دینے ہیں۔ بھولے بھٹکے کبھی پروار آ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار۔ میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ وہ نہ آئے۔ ایسی قیمتی سازشیں کرنے میں پہلی ہو کر آتی تھی کہ بچوں میں ہم سائیاں پیش کرتے پھرتے۔ میری طرف سے تو مر چکی مردار اور تو سنا تیری کیسی گزر رہی ہے؟"

"بس ٹھیک گزر رہی ہے۔ بڑی مشکل سے فرصت نکال کر آئی ہوں حویلی میں خان کے بیٹے کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بڑی کل تک سے درست ہوتا ہو رہی ہے سوا آنے۔ دیکھی تو نہیں میں نے مگر چرچے بہت ہیں۔ بڑی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بری کی تیاری تو جو ہے سو ہے سوا آنے گھر بھر اپنی اپنی بہار دار رہا ہے۔ بڑی بہو نے چار سونے کے سیٹ تو اپنے بنوائے ہیں۔ تین تین جوڑے نوکروں کے بنے ہیں۔ میرے لئے بھی کرن پھول بنوائے ہیں۔ بڑی بہو کہہ کر تم ہماری پرانی اور با اعتماد نمک خوار ہو۔"

"واہ۔ تیرے تو مزے آ گئے۔" بڑی بی پہلی مرتبہ مسکرائیں۔

"ارے کیا مزے۔ اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔ دوسروں کی صورت دیکھ دیکھ کر کٹ رہی ہے۔ نیند آ رہی ہے تو بھی آنکھوں سے پہلے نہیں سو سکتے۔ غلامی بڑا بھاری بوجھ ہوتا ہے پھوپھی۔ تم مزے کہہ رہی ہو۔"

"چل خیر۔ اب تو زیتون بانو تیرے ساتھ جا رہی ہے۔ تیرا بوجھ کم ہو جائے گا۔ چل کے چلتی ہے پر اکسر تو بالکل بھی نہیں ہے۔ جتنا مرضی کام کروا لو۔" بڑی بی نے تسلی کے حسن میں تعریف کی۔

"اب ایسی جانور بھی نہیں ہوں کہ تم لے جا کر استھان پر ہی باندھ دو۔" زیتون بانو نے ہنستے ہوئے تڑپ کر چپلی پہن لی۔

"بہت بولتی ہے کمبخت۔" بڑی بی کے انداز میں محبت تھی۔

"اگر اسے ساتھ لے گئی تو تمہارا کیا ہو گا پھوپھی؟ تم سے تو ٹل کر پانی نہیں پیا جاتا۔" خالہ نے تشویش ظاہر کی۔

"تو میری فکر نہ کر..... سردار علی مجھے لے جائے گا۔ دس مرتبہ کہہ گیا ہے کہ اماں لونڈیا کا ٹھکانہ بنا دو کہیں پھر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن۔ فکر تو مجھے اس کی تھی۔"

شہر بانو کی تو شکل ہی میں وہ نہیں ہے۔ اس کی طرف کیا دیکھتی ہے۔ بس خوف خدا کر کے اس کا خیال رکھنا۔ کوئی جوڑا وڑا کر دیں حویلی میں کہہ سن کر۔ روٹی کپڑا اور سر چھپانے کا آسرا ہو جائے یہی بہت ہے۔

"سو آنے۔ اس بات کا خیال رکھنا کس عشق بازی کا کرب ہو سکتا ہے۔ سالہ بھرا اداہر ہوگی ہے۔ ارے سی آج بھی بھو گی
تو...... سمجھ رہی ہے ناں میری بات"۔ بڑی بی سرگوشی کے انداز میں بولیں۔

"ہاں ہاں سمجھ رہی ہوں پھوپھی۔ باپ پہ پوت نسل پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا تو فرق کس کا ہے۔ بیٹا باپ پہ تو بیٹی ماں پر جا سکتی ہے۔ حیرت کیا۔ ماں بھی وہ جو اسی ماہتابی کی طرح چمکتی کہ دوسرے دیسوں کے آسمانوں تک چمک اٹھی۔ جیسے اکیلے چاند کو سر بھکوں کے لوگ دیکھیں۔ مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ خوب سمجھتی ہوں میں"۔ وہ دبے انداز سے ہنسیں۔

"بچے تیری حویلی کا ماحول کیسا ہوگا۔ دھیان رکھنا"۔ بڑی بی کی فکر کم نہیں ہو رہی تھی۔

"حویلی میں مردانہ زنانہ الگ الگ ہے۔ مگر نوکر چاکر تو سب کے سامنے ہی آتے ہیں۔ مگر تم بے فکر رہو حویلی کے لوگ اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ ان کی اپنی عمر نہیں چھائی کا وبال۔ سوتی سی۔ اوپر سے اچھا کھانا پینا۔ ان کی چھب کے آگے کس کا چراغ جل سکتا ہے۔ اب جو آ رہی ہے اس کے آگے تو چہ ہی بہت۔ جتنی بڑی بہو کے پیچھے تصویر۔ مجھے کہہ رہی تھی۔ اتنے بڑے بال ہیں اس کے کہ تیری اماں کی لکھاوٹ کی سو آنے اس کو سر دھونے کیلئے مالش کرنے کیلئے۔

"ارے پھوپھی! جس بیٹے سے آ رہی ہے وہ بھی ایک ہی دانہ ہے۔ اس سے سمجھو تو باہر پڑھتا ہے جانے کیسا ہوگا مگر ہمارے اس خان کا جواب نہیں بہت ہی نیک مزاج ہے۔ بیٹے تو یہی پڑھا کو۔ ہر وقت کتاب آنکھ سے لگی رہتی ہے۔ سنا ہے بہت بڑا امتحان دے گا۔ ارے ایک سے ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ کام بھی بڑی سے ہی کرائے گا۔ میری نوکری میں لگی ہے اس کے کمرے کی لگتی۔ بھلے آدمی رات کا کوئی کام ہو۔ مگر نہیں ہے ہماری حویلی میں"۔ خالہ نے کھانا کھاتے ہوئے بہت کچھ بتا دیا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا بی سو آنے۔ سکون آ گیا مجھے"۔ بڑی بی نے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔

"خالہ! حویلی کی شادیوں میں تو بڑا مزا آتا ہوگا۔ میں تو خوب گانے گاؤں گی"۔

زیتون بانو نے اشتیاق بھرے انداز میں کہا۔

"ہاں جاتے ہی دکھا دیجیو اپنی اوقات۔ بڑی آئی سر تال کی اولاد"۔ خالہ ہنسیں تو نوالہ حلق میں اٹک گیا۔

"ایمان سے خالہ! بڑا اچھا ڈھول بجاتی ہوں۔ حکیم چلمن والے کے لڑکے کی شادی میں ایسی ڈھولکی بجائی کہ کیا کہنا۔ ظلم ہو گیا تم گزر جیو اس وقت تک نہیں ملیں جب تک میں نے ڈھولکی بجانا بند نہیں کی۔ چاہے تم کسی سے بھی پوچھ لو"۔

"سنبھال لیجیو سو آنے۔ دیکھ رہی ہے اس کی حرکتیں"۔ بڑی بی کو وسوسوں نے پریشان کیا۔

"سو آنے سنبھالوں گی پھوپھی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو"۔ خالہ قل قل کرتی پھر ہنس پڑیں۔

"میری مانو تو کوئی ڈھنگ کا لونڈا دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دیجیو وہیں حویلی میں"۔ بڑی بی کو نئی سوجھ گئی۔

"ٹھیک ہے ہے"۔ خالہ سو آنے حلق سے اتارتے ہوئے بولیں جو زیتون بانو ابھی ابھی رکھ گئی تھی۔

"میں نہیں کروں گی وہاں کے کسی نوکر چاکر سے شادی کہ ساری عمر بیگموں کی اترن ہی پہنتی رہوں"۔

زیتون بانو فرش کے نزدیک بیٹھی خالہ کے کپڑے کھنگال رہی تھی۔

"دیکھ تو کیسی زبان ہے بے غیرت کی۔ ارے کیا نواب جادے بیگمیں لگ گئے ہے"۔ بڑی بی نے بٹوہ چاچا تو ہنس گئے پڑ گئی۔

"توبہ ہے پھوپھی۔ بچی ہے۔ تم تو سیانی ہو۔ بولنے دو۔ کیا جاتا ہے۔ اری زیتون بانو! حلوہ تو لے آ"۔ دستر خوان پر ... ہے"۔ خالہ چولہے کے حرے لے رہی تھیں۔

"دیگچی میں رکھا ہے خالہ"۔ زیتون بانو نے کپڑے سے ہاتھ پونچھنا شروع کر دیے۔

"بچھا رہ۔ مجھے بھی میں بھی دیکھوں کیا تیر مارا ہے"۔ بڑی بی نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"تو بانی! اتنی تاک کبھی اچھی نہیں ہوتی۔ سیدھے سیدھے کہہ دو حلوہ کھانا ہے"۔ زیتون بانو کھلکھلائی۔

"چل بھر مرد! بھی دل سے شغل کرتی ہے۔ لا دے ذرا سا حلوہ"۔

خالہ اپنی خوش مزاجی سے مجبور تھیں بات بے بات ہنستی تھیں۔

"ارے عالم جناب۔ یہ پازیب تو ٹوٹ گئی۔ دیکھنا کیسی ہی ہے جیسی کی تھی"۔ اماں نے ایک ڈبہ بہو کے آگے کر دیا۔

"ہائے اللہ بانی امی۔ گھنگھرو تو بہت ہی چھوٹے ڈال دیے۔ کیا آواز نکلے گی ان سے۔ پازیب میں آواز نہ ہو تو کیا خوبصورتی۔ میں تو سوچ رہی تھی۔ نئی دلہن حویلی میں چھم چھم کرتی چلے گی تو در و دیوار سے رونق پھوٹنے لگے گی"۔ عالم جناب پیچھے اداس ہو گئیں۔

"معلوم نہیں اسے پازیب پہننا اچھا بھی لگتا ہے کہ نہیں۔ یاور کو تو تمہیں پتا ہی ہے۔ کتنا تنہائی پسند ہے۔ معمولی سے شور شرابے کو پسند نہیں کرتے"۔

"ارے بانی اماں۔ ایسی دلہن آ رہی ہے کہ بس اسی کی سنا کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ بالکل بدل جائیں گے یاور"۔ عالم جناب ہنس پڑیں۔

"پتا نہیں اس کا یہ بات میں دل بھی لگے گا کہ نہیں"۔ اماں بی فکر مند ہو گئیں۔

"ارے بڑا اچھا ماحول لگنے والا سوچ رہے ہیں اسے۔ یاور خاں جیسے لوگ بڑے پیچھے ختم ہوتے ہیں۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں"۔

عالم جناب نے اپنی طرف آتے ہوئے یاور علی خان کو دیکھ لیا تھا اس لیے ان کی شوخی سوا ہو گئی۔

"کیوں ہر وقت مجھ غریب کو ستانے پر تلی رہتی ہیں بھابی بیگم"۔ وہ مسکراتے ہوئے ماں کے نزدیک بیٹھ گئے۔

"بانی اماں فکر مند ہو رہی ہیں کہ پتا نہیں ہم شہزادی کا دل بھی لگے گا کہ نہیں۔ وہ شہر کی پلی ہیں اور یہ دیہات"۔ عالم جناب بولیں۔

"ہم کچھ ہے ان کے سامنے ہی ہے، انہیں دل لگانا آتا ہوگا جب ہی تو راضی ہوئی ہیں"۔ یاور علی خان نے بظاہر سنجیدگی سے کہا مگر ان کے انداز کی شرارت سے عالم جناب سمجھ گئی تھیں۔ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

"دیکھا تائی اماں۔ کیسے پیچھے ہوئے ہیں آپ کے صاحبزادے"۔

"اللہ خیر کی گھڑی لائے۔ یونہی خیال آ گیا تھا"۔

"یونہی فکر کرتی ہیں تائی اماں۔ جن سے دل لگا ہے ان کا اطمینان تو دیکھیں۔ جیسے مقابلے کے امتحان کی پھول جھڑی ہو"۔ عالم تاب ہنس پڑیں۔

یاور علی خان بھی قدرے جھینپ کر مسکرا دیئے۔

"اتنی خوشیاں اتنی رونق میرے دل کی بے سکونی بڑھا دیتی ہیں"۔ اماں جی اچانک غمگین نظر آنے لگیں۔

"وہ کیوں تائی اماں؟" عالم تاب حیرت سے انکی شکل دیکھنے لگیں۔ یاور علی خان بھی الجھن بھری نظروں سے اماں کی طرف دیکھنے لگے۔

"کب آئے گا تیمور...... وہ کیسے جان پائے گا کہ اپنے جب خوشیاں مناتے ہیں تو دل کیا محسوس کرتا ہے۔ اجنبی شہر میں کیسے رہتے ہیں۔ زنجیر جیسے رشتوں میں بندھنے کے دکھ سکھ کیا ہوتے ہیں۔ یہاں نوکر چار چار نعمتیں کھاتے ہیں وہ وہاں چائے ڈبل روٹی کھاتا ہوگا۔ اپنے جوتے خود پالش کرتا ہوگا۔ کبھی دیر سے آنکھ کھلی ہوگی تو بھوکا گھر سے نکل جاتا ہوگا"۔

چند قطرے ان کی آنکھوں سے ٹپک کر چہرے کی جھریوں میں گم ہو گئے۔

"ہائے تائی اماں۔ اسے وہاں کوئی کمی نہیں۔ وہ کون سا نوکری کرتا ہے۔ صرف پڑھتا ہی تو ہے۔ ہر مہینے اتنی رقم بھجواتے ہیں بابا صاحب۔ وہ اسے بہت ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ وہ یہاں سے زیادہ خوش رہتا ہے وہاں۔ آپ تو غم کرتی ہیں۔ بتائیے ذرا آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کا بیٹا کتنا لائق ہے۔ آپ تو بڑی قسمت والی ماں ہے تائی اماں آپ کے سارے بیٹے لائق ہیں۔ میری طرف دیکھیے۔ ایک بدنصیب ماں ہوں جس کے ایک نہیں دو دو بیٹے"۔ ان کی آواز بھرا گئی۔

"یہ لیجیے۔ اماں جی کو سمجھاتے سمجھاتے آپ شروع ہو گئیں۔ بھابی بیگم"۔ یاور علی خان نے جیسے زچ ہو کر کہا۔

"ان کا علاج ہو رہا ہے۔ وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ آپ کیوں مایوس ہیں"۔ یاور علی خان نے تسلی دینے کے انداز میں ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں عالم تاب! دل چھوٹا نہ کیا کرو۔ انشاء اللہ بچے ٹھیک ہو جائیں گے"۔

اماں جی بھی اپنا دکھ بھول کر ان کی دلجوئی کرنے لگیں۔

"ہائے اماں جی اتنا سامان جائے گا کراچی؟" تزئین نے مارے پریشانی کے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"سامان اتنا کیسے نہ ہوگا۔ تم لوگوں کے کپڑے کی کوئی حد ہے۔ کھانے سونے نہانے گھمانے جھنجھنے تک کے جوڑے سلے ہیں"۔ وہ جل کر بولیں۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بڑے بھائی کی شادی پر ہم خاصے چھوٹے تھے۔ اور پھر بڑے بھائی کی شادی اندرون شہر ہوئی کہ آپ کا ٹے والا دوپٹہ پہن کر بھاگ کر بارات میں بیٹھے"۔

"ہاں میں نے دیکھا تھا۔ تمہارا سانس پھول رہا تھا"۔ سائرہ بھابی (عالم تاب کی بڑی بہو) نے ٹکڑا دیا۔

کمرے میں بے ساختہ قہقہے گونج رہے تھے۔

"اماں جی اس نے تو تیراکی کا لباس بھی سلوایا ہے۔ وہاں سمندر کے سامنے ہی تو سنتے ہیں بنگلہ ہے۔ خوب نہانے کا پروگرام ہے"۔ سائرہ کی جٹھانی نے گویا چٹکی بھری۔

"دیکھا اماں ہوتا ہے اور اسے کیا آفت آئی ہے ڈبکیاں لگانے کی"۔

اماں جی تعجب سے ایک ایک کی صورت دیکھنے لگیں۔

"تو کیا اماں جی ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ تمہیں تو چلو بھر کافی ہے"۔ تزئین سے بڑی ربیعہ نے گرہ لگائی۔

"سمندر تو زیادہ ہوگا"۔

"دیکھیں اماں جی۔ آپا کو"۔ تزئین نے شکایتی انداز میں ماں کو دیکھا۔

"توبہ کیا بچوں کی طرح الجھتی ہیں۔ اپنا اپنا سامان دیکھو۔ پھر وہاں پہنچ کر رونا ہوگا۔ دن کتنے رہ گئے ہیں۔"

"اماں جی۔ یاور کہہ رہے تھے میں سہرا ہرگز نہیں باندھوں گا۔ ہندو باندھتے ہیں"۔ رضیہ بیگم نے جیسے کسی دھیان سے چونک کر مطلع کیا۔

"اچھا۔ ایسے کہہ رہا تھا۔ بھئی ہم تو اپنے ہوش سے ایسا ہی دیکھتے آرہے ہیں"۔ اماں جی واقعی چونک گئی تھیں۔

"کروڑوں کی آبادی میں اکیلے یاور ہی کو دھیان آیا کہ یہ ہندو باندھتے ہیں۔ یہاں تو دلہنوں کے بھی ان کے قد جتنے سہرے باندھتے ہیں۔ ارے تو سہرا تو اس لئے باندھتے ہیں کہ بھیڑ میں پتہ لگے گا کہ دولہا کون ہے۔ کوٹ پتلون جو ہوتے انگریز پہنتے ہیں۔ وہ نہیں پہنتے یہ لوگ۔ ارے میں تو لال گلابوں کا سہرا ضرور باندھوں گی اپنے بیٹے کو۔ اصل بات تو نکاح کی ہے۔ وہ تو قاضی پڑھائے گا۔ یا نہیں؟ پھیرے تو نہیں گوارا ہی۔ اللہ دین ایمان سلامت رکھے۔ یہ تو خوشی کے رنگ ڈھنگ ہیں۔ جیسے مرضی انسان خوشی منالے۔ اللہ اپنا کرم رکھے ایسے کچے ایمان نہیں ہیں ہمارے کہ ہار پھولوں کی بحث میں گم ہو جائیں۔ بھیجو اسے میرے پاس۔ بہت پڑھ لکھ گئے ہیں یہ لڑکے"۔

اماں جی کے ارمان تو جیسے سہرے ہی میں اٹکے رہے تھے۔

"چھوڑیں اماں جی ایسا کوئی ضروری تو نہیں۔ نہیں مان رہے تو نہ سہی۔ شادی ان کی ہو رہی ہے۔ ان کے موڈ کا خیال کریں"۔

تزئین جو موجود خواتین میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ بھائی کے احساسات کے قریب تر تھیں۔

"توبہ ہے تم بہت پڑھی ہوئی ہو۔ اسی کا دماغ خراب ہو رہا ہے تمہیں۔ اسی لئے بات نہیں ہو رہی تمہارا کسی سے"۔

وہ غصے میں تھیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا۔ تزئین یکدم خاموش ہو کر رہ گئیں۔ کہنے والی ان کی حقیقی ماں تھی۔ وہ لب بحث تو کیا کرتیں۔

"اماں جی حد کرتی ہیں آپ۔ قصہ کیا ہوتا ہے۔ آپ بات کیا لال بجھتی ہیں۔ پڑھا لکھا ہونا کون سی بری بات ہوتی

ہے۔ روشنی چرانے جیسی ہستی بن جاتی ہے انسان کی۔ اب ان لوگوں کا تو ہمارے پاس کوئی علاج نہیں جو احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں"۔

"رہنے دیں آپا! آپ میرے حصے کی صفائیاں پیش نہ کریں۔ ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں وہاں طلاق یا نام نہاد شادی کی ذمہ دار صرف عورت ہی سمجھی جاتی ہے۔ اماں جی اپنے حساب سے ٹھیک ہیں"۔

تزئین نے دکھ سے رضیہ بیگم کی بات کاٹ دی اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

"حد کرتی ہیں اماں جی آپ بھی۔ آپ نے بھی اسے دکھ ہی دے دیا؟"

رضیہ بیگم دکھ سے گویا ہوئیں۔

"مجھ سے زیادہ دکھ کسے ہو سکتا ہے؟ غصہ مجھے اس بات پر آتا رہتا ہے کہ ایک ہی طرف ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ بھی تو دوسری شادی کر چکا ہے۔ کبھی بیٹے سے ملنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ نئی دنیا بسائے بیٹھا ہے۔ یہ کیسی اس طرح بے غیرتی ہے۔ کیا کوئی بے ضمیر میں؟ اس طرح کیسے وقت کٹے گا؟" "مجھے ایسی پر سانی کو جو دھرم ہی مارے۔ کون سی ماں خوش ہوگی اپنی اجاڑ بیٹی دیکھ کر"۔ اماں جی آبدیدہ ہو گئیں۔

"اماں جی! ابھی دکھ نیا نیا ہے۔ زخم تازہ ہے۔ ذرا سنبھلے گی تو ہم سمجھا لیں گے۔ وہ بچی کی وجہ سے منع نہیں کر رہی ہے۔۔ کسی سے بھی دوسری شادی کیلئے فی الحال تیار نہیں۔ کیا نام ہے بچی کا۔ ہاں شاید پیارے سے شعلے بولتے ہیں۔ وہ تو یوں بھی اپنی نانی کے پاس رہتی ہے اس کا کوئی مسئلہ نہیں۔ بات ہوئی تھی میری ضمیر بھائی سے۔ کریں گے وہ انتظام آپ مت پریشان ہوں"۔

رضیہ بیگم نے ماں کا چہرہ چھو کر محبت سے سمجھایا۔

"مجھے تو صبر ہے بیٹی۔ وہ تمہارے بابا صاحب جو روز پڑتال شروع کر دیتے ہیں تمہیں شاید معلوم نہیں۔ مرد جو اگر سخت ہو اور ماشاء اللہ بڑے کہنے والا ہو تو اس کی عورت تو جیسے ہر وقت عدالت میں کھڑی رہتی ہے۔ جیسے کہ اس سے پوچھ بچے۔۔ نافرمانیاں کر رہے ہوں۔

"بچے بڑے ہو جائیں تو اکثر مرد بچوں سے براہ راست پوچھ گچھ کے بجائے اپنی عورت ہی کو کڑی سرزنش دکھاتے ہیں۔ مجھ بڑھی پر رحم کرو اب تم لوگ"۔

وہ آزردگی سے گویا ہوئیں۔

"فکر نہ کریں اماں جی! آپا اور کی شادی ہو لینے دیں۔ پھر گھیرتے ہیں ہم تزئین کو"۔ ساڑھ بھائی نے بھی دلاسا دیا۔

"ہماری سات پشتوں میں یہ پہلا قصہ ہے بیٹی۔ ایک چھالس سی لگی رہتی ہے ہر دم"۔ وہ جیسے اندر ہی اندر گھلی ہوئیں۔

"اس دنیا میں روز ہی کچھ نیا ہو جاتا ہے۔ کسی بات نے پہلی مرتبہ ہو ہی ہونا ہے۔ اس یہ ہے کہ ماں کا پاپ گرا ہوا تو وہ بارونت ہو۔ اور کسی کے بھی ساتھ نہ ہو"۔ رضیہ بیگم بولیں۔

"آمین!" اماں جی بچوں کی طرح کھل گئیں۔

"ماما کیا اماں جی سو گئیں"۔ خالہ سوات آنے نے برقعہ اتار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ماما جی جو قدرے تعجب سے زعفران بانو کی طرف متوجہ تھیں ایک دم چونک گئیں۔

"ارے نہیں سوات آنے! آج کل تو شادی کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ سب دیر سے سوتے ہیں۔ سب ہال میں بیٹھی ہیں اماں جی کے ساتھ۔ یہ لڑکی کون ہے؟" وہ جواب دیتے دیتے اپنے مطلب پر آ گئیں۔

"ارے زعفران بانو۔ سلام کرو ماما کو۔ تیری انگریزی ہیں یہ"۔ خالہ ہنستے ہوئے اپنا ہوا اگال کر پان کھانے لگیں۔

"سلام بیگم"۔ اس نے بڑی آنکھوں والی نوجوان عورت کو جواب کے طور پر جیسے بہت ہی ناگوار محسوس ہوتی تھی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا سوات آنے"۔

"ارے اپنی لونڈیا ہے۔ یہیں رہے گی اب۔ میرے خیال میں اماں جی منع تو نہیں کریں گی۔ اماں تو دی اب دو ہیں سوات آنے"۔ خالہ نے سوالیہ انداز میں ماما کی طرف دیکھا۔

"اب کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو اماں جی کا مسئلہ ہے"۔ ماما نے جواب دیا۔

"رد یا بیوی کیا ابھی سے سو گئی؟" خالہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"ارے نہیں۔ سر سوتی کو ذرا تیز بخار چڑھا ہے اس کی پٹی کرنے لگی بیٹھی ہے"۔

"کیا لگتی ہے یہ تمہاری؟" ماما جی کو نہ جانے کیوں اس لڑکی کی غیر معمولی محسوس ہو رہی تھی۔

"بھانجی ہے میری رشتے میں۔ پھوپھی تو جو بوڑھی کے پاس رہتی تھی۔ ان کی طبیعت اب اچھی نہیں رہتی۔ پھر جوان جہان لڑکی کی ذمہ داری اور وہ بوڑھی جان۔ اسی لئے بلوایا تھا انہوں نے مجھے"۔

خالہ سوات آنے نے اپنی قسمت کا کوئی ادھورا چھوڑنے کے دوران جواب دیا۔

"ماں باپ نہیں ہیں اس کے؟" ماما نے اس کے ترتیب وار حسن کو بڑی تفصیل سے دیکھا۔

"مر کھپ گئے۔ اب کیا اکھڑو لئے جاؤ گی۔ بھوکے ہیں ہم کھانا بھی کھائیں گے۔ کیا کچھ پکایا آج؟" خالہ نے جیسے اکتا کر پہلو بچایا۔

"نیاز دلائی تھی اماں جی نے۔ سارے گاؤں میں کھانا بھجوایا ہے۔ آج کھانا باہر دیگوں میں پکا تھا۔ بکرے کے گوشت کا قورمہ ہے۔ مرغی کی بریانی ہے۔ لال روٹی ہے۔ کھوئے کی کھیر ہے۔ وہ بیر گھوٹکر میں تیار کر لئے اور ماش کی دال پکی تھی۔۔ بھی اچھا ہوا ہے۔ جو کھانا ہے کھا لو"۔

زعفران بانو کی سوکھی آنتوں میں تراوٹ اترنے لگی۔ جبکہ خالہ سوات آنے پر اس تفصیل سے کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ان کیلئے یہ معمول کی بات تھی۔

"پہلے اماں جی سے تو مل لوں پھر اطمینان سے کھانا کھائیں گے۔ چل زعفران بانو! اچھا شگون ہے تیری تو آتے ہی

دعوت ہو گئی ویسے تو خیر حویلی میں آئے دن ہی دعوتیں ہوتی ہیں۔ چل اماں جی سے ملواتی ہوں"۔

"خالہ دوپٹہ سر پر جما کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ زہتون نے بھی ان کی تقلید کی۔

"سوہا آنے تمہارا سامان پہنچا دوں تمہارے کمرے میں"۔ ماما نے ٹوکا۔

"ہاں ہاں ماما۔ بڑی مہربانی تمہاری"۔ وہ ٹھہر کے بولیں۔

ایک تنگ راہداری میں بیس پچیس قدم چل کر خالہ ایک بڑے سے کھلے دروازے میں داخل ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے زہتون بانو بھی۔

ہال میں جیسے زندگی اپنی پوری طاقت کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔ اماں جی تخت پر بیٹھی جوڑوں کی "ٹکائی" چیک کر رہی تھیں۔ باقی خواتین نیچے قالین پر مختلف قسم کے کاموں میں مصروف تھیں۔

اماں جی کیونکہ عین داخلی دروازے کے سامنے تھیں اس لئے ان کی نظر فوراً خالہ پر پڑی تھی۔

"آ گئی سوہا آنے' چل شکر ہے میں تو سوچ رہی تھی' کتنے کے دن ہیں۔ معلوم نہیں بخت لگے ۔۔۔ کہ چھ دن"۔

"السلام علیکم"۔ خالہ نے اماں جی سمیت تمام بیگمات کو سلام کیا۔ زہتون بانو تو جیسے اندر کا نقشہ دیکھ کر وہیں دروازے ہی میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

وہ کپڑے جو وہ دیباو مبارات میں پہننے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ بیگمات عام حالات میں پہنے بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کی کلائیاں کڑوں' کنگنوں' چوڑیوں سے سنہری تھیں۔ ایسے قرینے سے بنے ہوئے بال' ناکوں میں دمکتی لونگوں کے لشکارے۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے ایسی تیاری۔ وہ بھی گھر کے ماحول میں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی شادی میں شامیانے تلے مہمان بیٹھے ہیں۔

"وعلیکم السلام' یہ بچی کون ہے' پتھر پڑے ہیں تیری عقل پر سوہا آنے' اتنی خوبصورت بچی کو لئے رات کے اندھیرے میں آ رہی ہے۔ صبح نہیں ہو سکتی تھی کیا؟" اماں جی نے جانچتی نظروں سے زہتون بانو کو دیکھتے ہوئے جھاڑ پلائی۔

"اماں جی! مجھے ڈر نہیں لگتا۔ کوئی میلی بھی آنکھ سے دیکھتا تو اس کی اپنے سروتے سے آنکھیں پھوڑ دیتی' کیا سمجھا ہے آپ نے مجھے؟"

"کس قدر بھروسا ہے سوہا آنے کو اپنے "ہتھیار" پر"۔ زبیدہ بیگم نے سراہا۔

"خیر بھروسا تو اللہ پر ہے بی بی جان! آپ کو یاد نہیں رمضان کی گائے گھیری تھی میں نے' مردوں نے شاباش دی تھی"۔ خالہ نے ماضی کا ایک اہم کارنامہ بطور ثبوت پیش کرنا ضروری خیال کیا۔

"وہ بے چاری تو "گائے" تھی"۔ امینہ بھابی نے خالہ کو چھیڑا۔ سب ہنسنے لگیں۔

"یہ کون ہے خالہ' تم نے بتایا نہیں؟" تزئین نے بڑی ستائشی نظروں سے زہتون بانو کو دیکھا۔ باقی سب نے بھی اس کو نوٹس لیا تھا۔

"بھانجی ہے میری' چھوٹی بی بی جان' اماں جی سے اجازت لینے آئی ہوں میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں' بڑی ہوشیار ہے سب کاموں میں۔ آپ اس کے کام دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی"۔ خالہ نے حالات اپنے سوال

کرنے کیلئے شروع ہی میں پورا زور لگایا۔

"تو تیرے بہن بہنوئی کہاں ہوتے ہیں؟" اماں جی نے فطری سوال کیا۔

"وہ نہیں ہیں اب اس دنیا میں"۔ خالہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تو اب تک کہاں رہ رہی تھی یہ؟" اماں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ میں آپ سے اپنی بھول بھی کر نہیں کرتی؟"

"ہاں ہاں وہ کوئی دور پرے کی"۔ اماں جی نے بات کاٹی۔

"جی ان کے پاس رہ رہی تھی۔ اب ان کا بڑھاپا اس پر آئے دن کی بیماریاں اسی واسطے تو انہوں نے بھیج کر"

"اچھا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے' سمجھا دینا اسے یہاں کے طور طریقے' کچھ پڑھی ہوئی ہے"۔ اماں جی پھر کپڑوں کو الٹ پلٹ کرنے لگیں۔

"جی پانچ جماعتیں پڑھی ہے' قرآن بھی پڑھا ہے' گاؤں میں بس ایک ہی پرائمری سکول ہے' شہر دور ہے اس لئے آگے نہیں پڑھی"۔ خالہ نے جواب دیا۔

"کھانا کھایا تم نے؟" عالم تاب نے جوڑے میں ٹانکا لگاتے ہوئے سر اٹھایا۔

"کھائیں گے جی اماں جی کو سلام کرنے حاضر ہوئے تھے"۔

"لڑکی تو بہت خوبصورت ہے"۔ سائرہ بی بی نے تزئین کو ٹہوکا دیا۔

"ہوں' دیکھ رہی ہوں۔ پوری کیل کانٹے سے لیس ہے"۔ وہ سرگوشی میں کہتے ہوئے مسکرائیں۔

"مردانے میں نہ بھیج دینا غلطی سے آفت مچ جائے گی"۔ عالم تاب مسکرائیں۔

سب دبی دبی ہنسنے لگیں۔

"کیا کیا کام آتے ہیں تمہیں؟" زبیدہ بیگم اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"سب کام کر لیتی ہوں"۔ وہ گھبرا رہی تھی۔

"واہ تو ہم دیکھ رہے ہیں' "کام تمام" کرتی ہو گی"۔ امینہ بھابی نے پھلجھڑی چھوڑی۔

وہ سب قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔

"ہوں ہوں"۔ اماں جی نے تنبیہی انداز میں گھورا۔

"اماں جی نے انہیں جانے کا اشارہ کیا' دونوں باہر نکل گئیں۔

"واہ کیا نپی تلی لڑکی ہے' بچھڑا ہوا کوئی خوبصورت گیت"۔ تزئین نے جاتی ہوئی زہتون بانو پر نظر دوڑائی۔

"شاعرہ ہو گئی آن واحد میں؟" عالم تاب مسکرائیں۔

"کیا غلط کہہ رہی ہوں بھابی بیگم؟" وہ بھی جواباً مسکرائیں۔

"نہیں خیر غلط تو نہیں کہہ رہیں۔ خوبصورت تو بہت سے چہرے ہوتے ہیں مگر اس میں ایک بڑی پراسراری عجیب ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"ارے بیٹا ابھی کیا قصے لے کر بیٹھ گئیں عمر ہی ایسی ہے۔ جوانی تو گدھی کو بھی خوبصورت بنا دیتی ہے۔"

اماں جی پرانی فکروں سوار تھیں انہیں اس بحث سے الجھن ہوئی۔

"مگر اماں جی اور زیتون بانو ہے کہ گدھی نہیں۔" امینہ بھابی نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں ہاں اچھی بچی ہے۔" وہ بڑے مصروف انداز میں بولیں۔

"کمرہ نسوانی آوازوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"سیدھی سادی اماں جی حیران ہو کر ان کی صورتیں دیکھنے لگیں کہ آخر انہوں نے ایسا کیا کہہ دیا۔

حویلی کے دو تہائی افراد کراچی روانہ ہو چکے تھے۔

ملازم عورتوں میں صرف روپا دیوی اور زیتون بانو حویلی میں تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کے چلے جانے کے بعد حویلی میں عجیب سا سناٹا محسوس ہونے لگا تھا۔

نئی ہونے کی وجہ سے زیتون بانو حد درجہ حساس تھی۔ رات کو چونک چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی اور جا کر دروازے اور تالے دیکھتی تھی کہ تالے لگے ہوئے ہیں یا نہیں۔ روپا دیوی تو "ایام نجات" منا رہی تھی۔ نو بجے ہی پڑ کر سو جاتی تھی۔

نیند نہ آتی تو کچن کے کیبنٹ صاف کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ کوئی کام دھیان میں نہ آتا تو باہر باغ میں بیٹھ جاتی تھی۔ خوامخواہ کی سوچوں میں الجھ جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ کام سے فارغ ہو کر باغ کی سمت چلی آئی تھی۔

"اسی دم گیٹ پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس جگمگائی تھیں۔ ایک تواتر سے ہارن بجا تھا۔

"اس نے ادھر ادھر چوکیدار کو دیکھا پھر دوڑتے ہوئے غلام رسول کی کوٹھڑی کی سمت بھاگی کہ شاید چوکیدار وہاں ہو۔ غلام رسول سائیس تھا۔

"چاچا! وہاں پھاٹک پر کوئی موٹر آئی ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"وہ ادھر اچھو ڈرائیور کے ساتھ حقہ پی رہا ہوگا۔ تم رکو میں اس سے چابی لاتا ہوں۔"

چاچا غلام رسول اپنی کوٹھڑی کے پیچھے چلا گیا۔

وہ وہیں کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگی۔

"چند لمحوں بعد ہی چوکیدار گرتا پڑتا اپنی سمت آتے ہوئے دکھائی دیا اور تیر کی طرح اس کے سامنے سے گزر گیا۔

وہ بھی چل پڑی اور جامن کے گھنے درخت کے پیچھے کھڑی ہو کر گیٹ کی سمت دیکھنے لگی۔

چوکیدار نے بڑی پھرتی سے گیٹ کھولا تھا۔

"کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ شیر خان (ڈرائیور) ہمیں لینے گیا ہوا ہے۔ تم تو آنے والوں میں ہو تمہیں ادھر ہونا چاہئے تھا ڈیم فول۔"

ایک نوجوان جو جینز شرٹ میں ملبوس تھا بری طرح چوکیدار پر برس رہا تھا۔

"خان! ام ابی ابی ادھر حقہ تازہ کرنے گیا تھا ام تو یہیں ہوتا ہے۔" چوکیدار نے پھاٹک کی کوٹھڑی کی سمت اشارہ کیا۔

"یہ حقہ پینے کا وقت ہے نان سینس۔" نوجوان بھناتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

غلام رسول سائیس بھی وہاں آ کھڑا ہوا تھا اس کی نظر بھی زیتون بانو پر پڑی۔

"زیتون بانو اندر جاؤ۔ خان کو پانی واتی پوچھو۔ روپا دیوی تو اپنی کوٹھڑی میں ہوگی۔ اسے تو یوں بھی نیند بہت آتی ہے۔"

"چ۔۔۔ چ۔۔۔ چاچا! یہ کون ہیں؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" اس کی واقعی بہت بری حالت ہو رہی تھی۔

"ارے کوئی ڈرنے کی بات نہیں۔ خان چھوٹا ہے۔ ولایت سے آیا ہے۔ لمبا سفر کر کے تو جلدی سے اندر جا کہیں موڈ اور خراب نہ ہو جائے۔"

چاچا غلام رسول نے اس میں "قرار" پیدا کرنے کی کوشش اور وہ واقعی اندر دوڑ گئی۔

اندر پہنچ کر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس کمرے میں کہاں جائے۔ جانے خان اتنی بڑی حویلی میں کہاں گم ہے؟

معاً کسی طرف سے گھنٹی زور سے بجی۔ اس کی تو رہی سہی جان بھی نکل گئی۔

وہ خود یہاں نئی نئی تھی۔ اسے گھنٹیوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ بدحواس ہو کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔

نیچے کے سارے کمرے بھاگ بھاگ کر دیکھ لئے۔ اب جھٹ زینے کی طرف بھاگی۔ آخری زینہ طے کرتے ہی اس کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہی نوجوان عین سامنے کھڑا تھا۔

"س۔۔۔ س۔۔۔ سلام علیکم!" اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے سلام کیا۔

"کیا تم ادھر کام کرتی ہو؟" سلام کے جواب کے بجائے کرخت لہجے میں سوال آیا۔

"ج۔۔۔ جی۔۔۔ وہ مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ آپ کس طرف ہیں؟" اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"نان سینس! اور ملازم کیا مر چکے ہیں کوئی پرانا ملازم دکھائی نہیں دے رہا۔"

"جی وہ سب کراچی گئے ہوئے ہیں باقی جو ہیں وہ سو رہے ہیں۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہاں کسی نے نہیں بتایا کہ ہم آ رہے ہیں؟ تم جاؤ اور ٹھنڈا پانی لاؤ۔"

شاید اس کے آنسوؤں نے اثر کر دکھایا تھا۔ آواز اس مرتبہ قدرے نرم تھی۔

"آ۔۔۔ آپ کس کمرے میں ہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ادھر سامنے انہوں نے ایک سمت اشارہ کیا۔

وہ جلدی سے پانی لینے بھاگ گئی۔ انتہائی ٹھنڈے پانی میں اس نے مزید برف ڈال دی اور تیز تیز چلتے ہوئے کمرے میں آگئی۔

وہی نوجوان سوٹ کیس بیڈ پر رکھے بغیر قمیص کے بغیر بنیان کے صرف پتلون میں جھکا ہوا تھا۔

"خان پانی" اس نے متوجہ کیا۔

وہ قدرے چونک کر پلٹا اور سیدھا ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔

"اسٹوپڈ۔۔۔۔ ال مینرڈ۔۔۔۔ کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ کمرے میں دستک دے کر آتے ہیں؟"

"جی؟" ٹرے اس کے ہاتھ میں کانپنے لگی۔

نوجوان نے تولیہ اپنے کاندھوں پر پھیلا لیا تھا۔

"دروازے پر دستک دیئے بغیر کسی کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے۔۔۔۔ جاہل لڑکی۔۔۔۔" وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔

وہ اتنی بدحواس تھی کہ اسے تو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کس حلیے میں ہے۔ اس نے ٹرے تپائی پر رکھ دی اور گلاس میں پانی انڈیل کر اس کی طرف آئی۔

وہ پورے قد سے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا وجود اس کے سامنے چھوٹی سی گڑیا کی طرح محسوس کیا۔

نوجوان نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر۔۔۔۔ ہونٹوں سے لگا لیا۔

وہ جگ اٹھانے پلٹ گئی اور چند لمحوں کے بعد ہی جگ سمیت پھر اس کے سامنے۔۔۔۔ آ کھڑی ہوئی۔

نوجوان نے گلاس خالی کر کے اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے فوراً پانی انڈیلنا شروع کر دیا۔

"کھانا کھائیں گے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ نوجوان کے چہرے پر نظر ڈالنے کی ہمت ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔

"ہوں۔۔۔۔ مگر ادھر تو شاید بہت ہیوی ڈائٹ ہو گی اور رات بہت ہو چکی ہے۔ ایسا کرو دو سلائس اور ایک گلاس دودھ لے آؤ بس۔ مگر بیس منٹ بعد آنا۔ میں باتھ لے رہا ہوں۔"

نوجوان نے گلاس واپس کرتے ہوئے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وقتی کوئی آگ بھڑک رہی تھی جس پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا تھا۔

اسے باتھ والی بات تو سمجھ میں نہیں آئی بس یہ خیال ہوا کہ بیس منٹ بعد آنا ہے۔ اس نے واپس کچن میں آ کر دودھ گرم کرنے کو رکھ دیا۔ مکھن فریج سے نکالا جو پتھر بنا ہوا تھا۔

"یہ تو شاید بیس منٹ میں نرم نہ ہو"۔ بہر حال اس کی ترکیب نکالنے کی کوشش تو کی۔ نل کا سادہ پانی لے کر ایک بڑے پیالے میں اس میں مکھن کی ٹکیہ چھوڑ دی اور پنکھا (پیڈسٹل) چلا کر پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا اور توس سینکنے لگی۔

دماغ جنونو وارد نوجوان میں الجھا ہوا تھا یا اللہ۔۔۔۔ اس کو خوش رکھنے کیلئے گھر والوں کو بہت جتن کرنا پڑتے ہوں گے۔

وہ بھی سوچنے لگی کہ اس کی مطلوبہ اشیا اس انداز سے لے کر جائے کہ وہ خوش ہو جائے۔ ماما کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹا

رہی تھی۔ اس لیے رکھی ہوئی تمام اشیا کا پتا تو چل چکا تھا اس لیے چھوٹی چھوٹی اشیا میں اسے کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔

ایک چھوٹی سی اسٹیل کی پتیلی لے کر اس نے ایک گلاس دودھ اس میں ڈالا اور دو تین الائچیاں کوٹ کر اس میں ڈال دیں اور دودھ پکنے کیلئے رکھ دیا۔ دودھ کے جانے تک چار سلائس سینک کر۔۔۔۔ خوبصورت سی پلیٹ میں رکھے اور انہیں دوسری بھاری پلیٹ سے ڈھانپ دیا تاکہ دیر تک گرم رہیں۔ اتنی دیر میں دودھ کھول چکا تھا اس نے چولہا بند کر دیا اور دودھ کی پتیلی بھی پنکھے کے سامنے لا کر رکھ دی۔ پھر ایک چمچ شکر خوبصورت کانچ کے گلاس میں ڈال کر گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ جو ایک طرف دیوار پر بہت اونچا لگا ہوا تھا۔ اس تمام کارروائی میں بارہ منٹ صرف ہوئے تھے ابھی اس کے پاس آٹھ منٹ باقی تھے۔ اس نے سوچا وہ ٹھیک دو منٹ پہلے کچن سے نکل کھڑی ہو گی تاکہ پورے بیس منٹ پر کمرے میں موجود ہو۔

اس نے اپنا دوپٹا درست کیا۔ ٹرے میں چیزیں سیٹ کیں، دودھ چھان کر گلاس میں ڈالا اور ٹرے کو بہت سنبھال کر آہستہ آہستہ منزل مقصود کی طرف بڑھ گئی۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے سانس درست کیا اور آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

"ہوں! کم ان"۔ اندر سے سرد لہجے میں جواب آیا۔

وہ اندر داخل ہو گئی۔

دونوں ہاتھ گود میں دھرے نوجوان کرسی پر بیٹھا تھا۔ گیلے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔

دونوں ہاتھوں سے ٹرے بیڈ پر رکھ کر تپائی نوجوان کے سامنے رکھ دی۔ پھر ٹرے اٹھا کر تپائی پر رکھ دی اور خود مودب کھڑی ہو کر ہاتھ مسلنے لگی۔

"سلائس پر جیلی لگاؤ، بٹر پسند نہیں ہے ہمیں"۔ حکم صادر ہوا۔

وہ جلدی سے کارپٹ پر بیٹھ گئی عین اس کے مقابل۔

جیلی لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ بغور اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"رحمان بانو"۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔

"تم لوگوں کے کیلئے تو چھوٹا سا نام کافی ہوتا ہے اسے بڑے بڑے نام رکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟ کسی ایمرجنسی میں کال کرو تو نام لینے ہی میں اچھا خاصا ٹائم ویسٹ ہو جاتا ہے"۔

"کب گئے تھے یہ لوگ کراچی؟" وہ اکھڑ لہجے میں بات کرتے ہوئے سوال کرنے لگا۔

"آج ہی گئے ہیں"۔ وہ گھبراتے ہوئے انداز میں بولی۔

"گھر ہی کے لوگ تھے یا باہر سے بھی مہمان آئے ہوئے تھے؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"جی میں نئی آئی ہوں مجھے زیادہ نہیں پتا"۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"کہاں سے آئی ہو؟" اس نے جیلی لگا سلائس پلیٹ سے اٹھایا۔

"جی میں خالہ سولو آنے کی رشتے دار ہوں' بہت دور کے گاؤں سے آئی ہوں"۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"والدین نہیں ہیں تمہارے؟" دوسرے ہاتھ سے اس نے گلاس اٹھا لیا تھا۔

"جی؟" وہ گھبرا کر نوجوان کی صورت دیکھنے لگی۔

"والدین"۔ نوجوان نے انتہائی اختصار سے کام لیا اور دودھ کا گھونٹ بھرا۔

"نہیں جی"۔

"ہوں' یہ دودھ میں کوئی فلیور مکس کیا ہے؟ بہت اچھا ہے؟"

زیتون بانو خاموش رہی' بس یہی سمجھ سکی کہ دودھ اسے پسند آیا ہے' سکون سا محسوس ہوا۔

"بس وہ کافی ہیں"۔ نوجوان نے تیسرا سلائس اٹھاتے دیکھ کر اسے روکا۔ زیتون بانو نے جھٹ سلائس واپس رکھ دیا۔

"اور سنو! ہم بہت دیر تک سوئیں گے' کوئی فون وون آئے تو ہمیں ڈسٹرب مت کرنا' ہاں کرنے والے کا نام نوٹ کر لینا' ہم خود کال بیک کر لیں گے اور کوئی ہمیں جگانے نہ آئے۔ چاہے ہمیں کتنی دیر ہو جائے"۔

بہت ہی عجیب تھا' اتنے دن ہو گئے تھے اسے حویلی میں آئے ہوئے مگر کوئی بھی اس انداز میں اس سے پیش نہیں آیا تھا۔ حویلی کے مردوں میں کوئی بھی اس جیسا نہیں تھا۔ صورت' شکل' قد' کاٹھ' انداز اطوار ہر طرح سے مختلف محسوس ہوتا تھا۔

سب سے زیادہ خوفزدہ وہ بابا صاحب سے مل کر ہوئی تھی' مگر اب یہاں سے بھی زیادہ خوفزدہ کرنے والی "شے" محسوس ہو رہا تھا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی طرف نظر دوڑانے کی تو ہمت ہی نہیں تھی۔

چند منٹوں بعد اس نے دودھ کا خالی گلاس ٹرے میں رکھا تو وہ چونکی اور فوراً کھڑی ہو کر ٹرے اٹھانے لگی۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ آپ بڑے خان کے رشتہ دار ہیں؟" اس نے جاتے جاتے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ نوجوان نے خاصی حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"بے وقوف لڑکی! اپنے ہیں ہم ان کے' سب سے چھوٹے بیٹے"۔

یہ سن کر تو زیتون میں جیسے نئے سرے سے بجلی دوڑ گئی۔ وہ افتاں و خیزاں باہر نکلی تھی۔

"خان کو چائے ناشتے کا کیسے پوچھنا ہے زیتون بانو"۔

دوپہر ہونے کو تھی' روپا دیوی کی تشویش درست تھی۔

"انہوں نے منع کیا تھا۔ جب وہ اٹھیں گے تو خود گھنٹی بجا دیں گے"۔ اس نے برتن دھوتے ہوئے جواب دیا۔ اسی دم راہداری میں گھنٹی بج اٹھی۔

"او پروں وی آئے"۔ روپا دیوی بدحواس انداز میں دوڑ گئی' اسے اس لمحے روپا دیوی کا دم غنیمت لگا۔ شکر ہے اس کی جان چھوٹی۔

چند منٹوں بعد روپا دیوی دوبارہ اندر داخل ہوئی' گھبرائی ہوئی۔

"خان تساں نوں بلا ساں' کہو "اسے رات والی کڑی نوں بلاؤ"۔ وہ بیچاری اپنی خیر منا رہی تھی۔

زیتون بانو کو تو جیسے پتنگے لگ گئے۔ اس نے برتن ایک طرف کئے' جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور دوپٹہ درست کر کے تقریباً بھاگتی ہوئی اوپر پہنچی۔

خان بستر پر دراز تھا۔

"السلام علیکم"۔ اس نے بڑے سنبھل کر کہا۔

"تمہیں چائے لے کر آنا چاہیے تھا۔ بالکل سینس لیس ہو۔ اس کو اس لئے واپس کیا تھا کہ وہ ساری بات سمجھ نہیں آئی وہ تمہیں اس کی"۔

"وہ۔۔۔ جی مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ صبح کی چائے پیتے ہیں یا نہیں۔ اب تو دن کے گیارہ بج رہے ہیں"۔

"ہم نے تمہیں اسی لئے نہیں بلایا کہ تم ہم کو ٹائم بتاؤ۔ کمرے میں وال کلاک اور موبائل پر درست وقت موجود ہے"۔

"دیکھو پہلے تو چائے لاؤ' پھر یہ کپڑے پریس کرنا۔ اس کے بعد ناشتہ' وہ ہاف فرائی انڈے' ایک گلاس دودھ اور بس"۔

اس نے خان کی طرف دیکھا۔ وہ احکامات صادر کر کے ایک موٹی سی انگریزی کتاب میں گم ہو گئے تھے۔

بہت خوبصورت سنہری بالوں والے' نیلی آنکھوں والے اس گاؤں میں وہ پورے ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی مونچھیں حویلی کے دوسرے "خانوں" کی طرح ڈرانے والی تو نہیں تھیں مگر بہت گھنی تھیں جن کی وجہ سے اس کا اوپری ہونٹ بمشکل نظر آتا تھا۔ چہرہ بھرا بھرا تھا۔ جس پر سرخی غالب تھی۔ بال بہت قرینے سے بنے ہوئے تھے۔

وہ آہستگی سے پلٹ گئی۔

چائے تیار کرتے وقت اس پر عجیب طرح کی عجلت سوار تھی۔

"خان بڑا غصہ کرتا ہے' خیال کریں کڑیے"۔ روپا دیوی نے اسے باخبر کیا۔

"ہاں پتا چل گیا ہے' مجھے تم اور ڈراؤ"۔ اس نے چڑ کر کہا تھا۔

چائے تیار کر کے وہ کمرے میں آئی۔ وہ خود اسی زاویے سے لیٹا تھا۔

"خان چائے"۔ اس نے چمچ سے کپ بجایا۔

"ہوں رکھ دو"۔

"ناشتہ کتنی دیر میں لاؤں؟"

"چھوڑو بیس منٹ میں لے آنا' یہ کپڑے لے جاؤ' ہم شام کو کراچی فلائی کر جائیں گے۔ ڈرائیور کو کہنا کہ وہ کہیں نہ جائے"۔

"جی ٹھیک ہے"۔ وہ تابعداری سے کہہ کر نکلنے لگی۔

"لڑکی! او وہ کیا نام ہے تمہارا۔ ہاف بوائل کا مطلب پوچھ لینا روپا دیوی سے' اتنا سیدھا سادہ ناشتہ نہیں آتا تو ذرا دھیان سے سمجھ ہی لو؟" اس نے میگزین سے نظریں ہٹا کر زیتون بانو کو دھمکی آمیز تاکید کی۔

"جی"۔ اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ وہ ذرا کپڑے سنبھال کر باہر آ گئی تھی۔

"یا اللہ! حویلی کے چندرہ میں لوگ چالیس چلتے اور یہ کیا "خان" ان سب پر بھاری لگ رہا ہے۔ سر پر رکھا ہوا محسوس ہو رہا ہے"۔

وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

"تو بتائی! تمہیں بھی ابھی بیمار پڑنا تھا۔ یہ اتنی بڑی حویلی کی سجائی کھانوں کی خوشبوؤں اور پھولوں کی مہک سے مہکی ہوئی۔

ادھر وہ کیا کوٹھا ____ چار برتن دو چار پائیوں والا جہاں وہ خود کو ملکہ کی طرح محسوس کرتی تھی۔ ایک دم احساس ہوا جیسے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔

"ہائے اللہ اماں جی! تیمور آئے ہیں"۔

مہندی کو نہ حق ہوئی زبیدہ بیگم اٹھ کر بھاگی تھیں اور بھائی کے سینے سے لپٹ گئی تھیں۔ آناً فاناً "سب تک ہی" کے کمروں میں خبر پہنچ گئی تھی۔

یاور علی خان بھی آ موجود ہوئے تھے۔

"یار! اطلاع تو کر دی ہوتی"۔ وہ ان کو سینے سے لگا کر گویا ہوئے۔

"سوچا تھا شاید ہم کچھ اہمیت رکھتے ہیں جو سرپرائز دے کر دیکھیں"۔ وہ بھائی کی پشت پر تھپتھپا کر مسکرائے۔

"کتنی مبارک شادی ہے یاور علی! سب موجود ہیں"۔ زبیدہ بیگم خوشی سے نہال ہو کر کہہ رہی تھیں۔

"کوئی اور نہیں ہے تمہارے ساتھ"۔ سائرہ بھابھی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" تیمور خان حیران ہوئے۔

"بھئی کوئی میم ویم"۔ وہ مسکرائیں۔

"ابھی تو نہیں"۔ انہوں نے معنی خیز انداز میں آنکھ مار کر کہا۔

"کیا مطلب"۔ ابھی سے وہ پلٹ کر گویا ہوئیں۔

"مطلب یہ کہ ابھی تو ہم چھوٹے ہیں"۔ انہوں نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے جواب دیا۔

بے ساختہ قہقہے پڑے تھے۔

"بابا صاحب کہاں ہیں؟" تیمور علی خان نے باپ کے بارے میں پوچھا۔

"ارے وہ بشیر (یاور علی خان سے چھوٹے) کے ساتھ فیکٹری گئے ہوئے ہیں۔ حلیم الدین آئے تھے۔ ان کے ساتھ چلے گئے میں نے کہا بھی کہ بیٹے کی شادی ہے لوگ آ رہے ہیں پھر ہو جائیں گے کاروبار مگر وہ سنتے کہاں ہیں"۔ اماں جی نے شکوہ کیا۔

"تم ادھر مردانے میں جاؤ وہاں سب ہیں۔ سب بہت خوش ہوں گے تمہیں دیکھ کر"۔ عالم تاب نے کہا۔

وہ یاور علی خان کے ساتھ مردانے کی طرف بڑھ گئے۔

"کھانا سب کو لگوا دو وہ تیمور والا مرغ والا سالن نہیں کھائیں گے"۔

زرین نے حویلی کے کچن میں دوپٹہ پھنساتی خانزادی کو مخاطب کیا جو حویلی کو دان کرنے کے خاموش پیک کر رہی تھیں۔

"کھانے پینے کا مزہ کہاں بیٹھے ہیں تیمور والا تو جا کر"۔ شفیقہ بھابھی (عالم تاب کی نمبر ایک بھابھی) نے ہنس کے کہا۔

عالم تاب کے تینوں شادی شدہ بھائی ساتھ ہی رہتے تھے۔

"ہاں پتہ ہے"۔ زبیدہ بیگم نے تائید کی۔

"اماں جی! تیمور کے آنے سے تو جیسے خوشی بہت ہی محسوس ہونے لگی ہے"۔

"بڑی خوش قسمت بھابھی ہے آنے والی اور نیا آنے کا نام ہی نہ لیتے تھے"۔ زرین نے نہال ہو کر کہا۔

"ارے گلو اور سونو کے غرارے دھو رہی ہوں استری کرنے کو نکالے تھے اس رونق میلے میں پھر ان سے نکل گئے"

زبیدہ بیگم ماتھے پہ ہاتھ مار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ارے تمہیں نے غراروں پر بھی استری ہو گی؟" زبیدہ سے چھوٹی روشن آرا جو کراچی میں مقیم تھیں مسکراتے ہوئے بولیں۔

نئی نئی شادی ہوئی تھی خوب بن گئی تھیں۔

"ارے سوٹ کیس میں دب گئے نشان پڑ گئے ہیں۔ میری بچیوں کو بڑا شوق ہے غراروں کا ____ وہ چٹتے ہوئے بولیں۔

"اپنے تیمور ماموں عرف کاکا جان کو بھی کر دکھائیں گے کہ آپ جہاں پڑھتے ہیں وہاں تو بڑی عورتیں بھی اتنا کپڑا نہیں پہنتی ہیں جتنا ہم یہاں پہنتے ہیں"۔

ایمنہ بھابھی نے ہنس کر لقمہ لگایا۔ سب ان کے ساتھ ہنس پڑی تھیں۔

"ارے عالم تاب امیہ دیکھ لیا جو دلہن کے ہاں جانے کا کوئی شے کم نہ ہو۔ سوا آنے سے پہ چھوٹو میوے کے لال تھیلوں میں گو رنگ گیا یا کہیں پڑے رل رہے ہیں۔

اماں جی اپنے احساس ذمہ داری سے مجبور تھیں۔

"فکر نہ کریں اماں جی! تھیلوں میں میوہ بھر دیا ہے"۔ انہوں نے تسلی سے کہا۔

"صحیح رہو"

"مہندی بھی ابھی خاصی گندھوا لینا۔ ایک تھال تو سونو آنے اپنے ہاتھ پاؤں پر لیپ پوت کر لیٹ جائے گی۔ کمبخت الٹا ہم سے ہی گم ہوا ہے پاکستان بنتے وقت۔ جانے کون سے بور سے فال نکلوا کر بیٹھی ہوئی ہے"۔ اماں جی بڑبڑانے کے انداز میں گویا ہوئیں۔

سب ہنس ہنس کر رونے لگیں، مگر اماں جی کی سنجیدگی میں کمی واقع نہ ہوئی۔

"ارے ذری کے جوتے بھی لینے جانا تھا بازار، پتہ نہیں ذرا تیور ہے پانچیں"۔ شفیقہ بھابھی کو معاً یاد آیا۔

"اب آپ ایک جوتے کے لیے بھی بازار جائیں گی؟ دو روز بعد کو کہہ دیجیے۔ اسکول بھی تو ہے جا کر پہنا لائیں گے" زرینہ نے مشورہ دیا۔

"عالیجاہ! تیمور سید سے یہاں آئے ہیں یا وہ پاسپی گئے تھے پہلے۔ یہ تو پوچھتی تم وہاں سب ٹھیک ہے نا؟" اماں جی اٹھتے اٹھتے پھر بہو سے مخاطب ہوئیں۔

"ایک دو دن میں کیا ہو گیا ہوگا، بس آپ کو بھی فکریں لگی رہتی ہیں"۔ وہ بولیں۔

"یہ سوٹ آنے ماما کے پاس گئی تھی یا انگلینڈ پہنچ گئی؟" اماں جی کو معاً یاد آیا۔

"آ گئی اماں جی، ماما اوپر تھی۔ بچیاں تیار ہو رہی ہیں اور ہاں وہاں باغ میں خسرے آئے بیٹھے ہیں"۔ خالہ سولہ نے نئی اطلاع دی۔

"ارے تو باغ میں بیٹھا چھوڑ آئی۔ کیا بارات میں لے کر جائے گی۔ آٹا چینی پانچ روپے کر فارغ کر ابھی"۔ چڑ کر بولیں۔

"وہ کہہ رہے ہیں ششماہی سامان کے دو جوڑے لے کر جائیں گے چودھریوں کی شادی ہے۔"

"لو اور سنو! ششماہی سامان کے جوڑے.... ایک بھی نہیں بلکہ دو دو تاشے پھاڑتے ہیں کراچی کے خسرے"۔ وہ حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے گویا ہوئیں۔

"زرین! دو دوپٹے دلانے والے کپڑوں میں سے کوئی جوڑا نکال دو، سولہ آنے کو اوپر دس روپے رکھ دو۔ بارہ آنے کا سیر آٹا آتا ہے۔ دس بارہ سیر آٹے کے پیسے کیا بہت نہیں؟ سیر بھر چینی اور سوجی رکھ دینا۔ جلدی سے فارغ کر کے آ جاؤ آئے.... بہتیرا کام پڑا ہے"۔

وہ خود کلامی کے انداز میں بولتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

بارات کا ڈنر زیب احمد نے ہوٹل میں دیا تھا۔

نکاح تو صبح دس گیارہ بجے کے دوران ہو گیا تھا۔ صرف گھر کے مرد اور اماں جی گئی تھیں۔

ڈومنیاں پہلے سے گیت چھیڑے بیٹھی تھیں۔

"زرین آپا! ابھی مجھے دلہن دکھائیں۔ میں اور زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔"

تیمور دلہن کو صوفے پر بٹھاتے ہی آن وارد ہوئے۔

"لو بھئی تو دلہا سے زیادہ بے صبرے ہو رہے ہو؟" سائرہ بھابھی نے چھیڑا۔

"ابھی ان کا سامان ہیں، سنبھالتے رہیں گے، کیوں کی تھیں؟ آپ لوگوں نے اتنی تعریفیں بس سب سے پہلے ہم

دیکھیں گے..."

دلہن کے ایک طرف یاور علی خان، دوسری طرف تیمور علی خان بیٹھے تھے۔ گھر کے دوسرے مرد کرسیوں پر براجمان اور خواتین کھڑی ہوئی دلہن سے تزئین اور تیمور کی نوک جھونک دیکھ رہے تھے۔

"یاور بھائی جان، اجازت ہے؟" تزئین نے شرارت سے مسکرا کر یاور علی خان کو دیکھا۔

"ہوں ہوں... تزئین۔ کیا کر رہی ہو پہلے یہ تو پوچھو بھابھی کو دے کیا رہے ہیں رونمائی میں"۔ ہم سب اور بھابھی نے ہی سستی کا مظاہرہ کیا۔

"بھابھی ہم جاب لیس ہیں Depended ہیں ایسے ہی دیدار کرا دیجیے۔ ثواب ملے گا"۔ وہ شریر ہوئے۔

"جی نہیں... جی نہیں۔ اگر کچھ نہیں ہے تو کلائی سے گھڑی اتار کر دیجیے"۔ وہ بعد میں پیچ کر گنگنی ہوا ہیں جی... ایک رشتہ دار بھیڑ میں سے منمنائی۔

"ایکسیلنٹ... کون ہیں یہ ماہر معاشیات ذرا سامنے آئیں"۔ یاور سے چھوٹے اصیر علی خان نے آواز اٹھائی۔

لڑکی شرما کر بھیڑ میں گم ہو گئی۔

"یہ کچھ کہا ہے آپ لوگوں نے... تیمور علی خان ہیں ہم جناب"۔

تیمور علی خان نے اپنے کوٹ کی جیب سے مخملی ڈبیا نکالی اور کھول کر سامنے کی۔

"ہائے اتنی پیاری انگوٹھی"۔ تزئین ذوق و شوق سے بولیں۔

"ہائے نہیں، ماشاء اللہ۔ ہم پردیس میں رہتے ہیں مگر سبق سب یاد ہے۔ اصلی ڈائمنڈ ہے محترمہ"۔

"اب تو دیکھ سکتے ہیں؟" انہوں نے ڈبیا دلہن کی گود میں رکھ دی۔

"بالکل بالکل، ٹھہرو، میں گھونگھٹ اوپر کرتی ہوں"۔

تزئین نے گھونگھٹ اوپر کر دیا۔

"ماشاء اللہ لگتا ہے اماں جی کی ساری دعائیں آپ کو لگ گئی ہیں"۔ تیمور نے بے ساختہ سراہا تھا اور یاور علی خان کو دیکھا تھا۔

اماں جی پاس ہی کھڑی تھیں۔ ایک دم تیمور علی خان کا سر اپنے سینے سے لگایا اور پیشانی چوم کر بولیں۔

"اب تو نہیں کرے گا ناں ہم؟ تیری بھی ایسی لاؤں گی"۔

"کہاں جی صبر البر ہے"۔ اصیر علی خان نے ٹکڑا لگایا۔

بے تحاشا قہقہے بکھرے تھے۔

"اصیر، اور گھر کے پاس آپ کا رشتہ ڈال رہے ہیں۔ ان کی تو سب لڑکیاں ہی اچھی ہیں"۔ تزئین نے بھی حصہ لیا

"دیکھیں گے... پیچھے سے دیکھ لینا۔ بعد میں اماں جی سے شکایت کرو"۔

رمز بیگم نے بہت محبت سے بھائی کو دیکھا۔ جو خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے بے تحمل سے ہو رہے تھے۔

"تیمور! اٹھو تو کھینچ کر ہی اٹھو گے۔ ہماری بھی باری آگئی ہے۔" بصیر علی خان نے فوراً بات بدلنے کی کوشش کی۔

"دلہن تھک گئی ہوگی۔ آرام کرنے دو۔" اماں جی نے کہا۔

"منہ دکھائی تو ہونے دیں اماں جی۔ سب دلہن دیکھنے کے شوق میں کھڑے ہیں۔"

دلہا کی اماں تیرے اوروں کے صدقے

باہر سے ڈومنیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"ارے انہیں چپ کرواؤ۔ صبح سے حلق پھاڑ رہی ہیں۔ اکیلی دلہا کی اماں ہی بارات ہیں۔ سامرا لوگوں سے اوپر دیکھ لئے انہوں نے میری آنکھوں میں۔" اماں جی سادگی سے جھلا کر بولیں تھیں۔

بے ساختہ قہقہے گونجے تھے۔

منہ دکھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یاور علی خان اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پتہ ہے، فی الحال یہاں میرا تو کوئی رول نہیں۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔

"صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپکا رول بعد میں شروع ہوگا۔" عالم تاب نے چھیڑا۔

وہ مسکراہٹ دباتے باہر چلے گئے۔

یاور علی خان باتھ روم میں تھے۔ نازمین اپنے بال سنوار رہی تھی۔ معاً دروازے پر دستک ہوئی۔

نازمین یکدم سنبھل کر بیٹھ گئی اور دوپٹہ اٹھا کر سر پر پھیلا لیا۔ اور دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

دستک دوبارہ ہوئی۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ دروازہ کھولے یا وہیں سے آنے والے کو اجازت دے۔ کچھ سوچ کر وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ اور دروازہ کھول دیا۔

سامنے ہی تیمور علی خان کھڑے شرارت سے مسکرا رہے تھے۔

"السلام علیکم۔ ہمارے ہاں کی پہلی صبح آپ کو مبارک ہو۔"

نازمین ایک دم اچانک ایک سسرالی نوجوان کو سامنے پا کر نروس ہی ہوگئی۔

"السلام علیکم۔" وہ بس سلام ہی کر پائی۔ "وہ تو ہم آپ کو کر چکے ہیں۔ آپ بڑی بھابھی ہیں ہماری آپ ہمارے سلام کا جواب دیجئے۔" وہ تنگ کر رہے تھے۔

"وعلیکم السلام۔" وہ دانتوں تلے ہونٹ داب کر بہت آہستگی سے بولی۔

"اندر آنے کو نہیں کہیں گی۔ ہم تو رات سے اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں کہ آپ سے کب بات ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ

میں تیرا حسن، حسن بیاں تک دیکھوں

"بھائی کہاں ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ پہلے ہی دن آپ سے دروازہ کھلوالیا۔ ابھی پوچھتے ہیں ہم۔"

نازمین ابھی بدحواسی اور بے تکلفی پر ذرا سے گھبرا کر ایک طرف ہوگئی۔ تیمور علی خان اندر داخل ہوگئے تھے۔

"بھائی کہاں چلے گئے ہیں؟" وہ ادھر ادھر نظر دوڑانے لگے۔

نازمین نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ باتھ روم میں ہیں۔

"بھئی بڑی جلدی تیار ہو گئے۔ اس وقت تک تو انکا ناشتہ بھی ہضم ہو جاتا ہے۔ اور ..... آپ کے ہاں تو ابھی چائے بھی نہیں پی۔ اگر آپ کو صبح چائے پینے کی عادت ہوگی تو اس وقت آپ کا دل چاہ رہا ہوگا۔ ہے ناں؟"

تیمور علی خان آگے بڑھ کر بیل رنگ کی۔ نازمین نظریں جھکا کر بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گئی۔

"کچھ تو بولئے۔ سلام کے جواب کے علاوہ کچھ بھی نہیں بولیں گی۔" وہ شریر ہو رہے تھے۔

"کس چیز کا؟" کیا خود آہستگی سے بول پڑی۔

"ابھی پتہ نہیں چلے گا۔ آپکو کس چیز کا؟ اچھا پہلے یہ بتائیے کہ آپ ارلی مارننگ اٹھنے کی عادی ہیں؟"

"ہوں" نازمین نے اثبات میں جواب دیا۔

"پھر کیا کرتی ہیں؟"

"نماز پڑھتی ہوں۔" اسکی آواز سے اسکے وجود کی نفاست جھلک رہی تھی۔

"پھر؟"

نازمین نے مسکرا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

"کیا اسطرح کا انٹرویو لیں گے ہمارا؟"

"ہاہاہا۔" تیمور علی خان کا قہقہہ بے حد جاندار تھا۔ "اب آئی ہے بات۔ ماشاءاللہ۔ اچھا بولیں گی۔"

نازمین جھینپ کر رہ گئی۔

اسی دم ماما اندر داخل ہوئیں۔ تیمور علی خان کو وہاں پہلے سے موجود پا کر جیسے انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

"حد ہوگئی ماما! ڈولی آئی۔ بیچاری ابھی تک چائے سے محروم ہیں۔ یہ ہماری کوالیفائیڈ بھابھی صاحبہ جو اسٹوڈنٹ لائف گزار کر آئی ہیں۔ ایک دم ہمارے ہاں ٹرانسفر ہوگئیں۔ انہیں صبح کی چائے کتنی اچھی لگتی ہوگی۔ آپ کو پتہ ہے اسٹوڈنٹ ہاسٹل کے کتنے عادی ہو جاتے ہیں۔ ماما۔ سسرال میں بھابھی کے ساتھ پہلی زیادتی۔"

تیمور علی خان کشن سر کے پیچھے لگا کر اطمینان سے صوفے پر دراز ہو گئے۔

"خان آبادی بیگم نے کہا تھا جب تک یاور خان خود نہ لائیں کمرے میں کوئی نہ جائے اس لئے۔" ماما نے وضاحت کی۔

"اوہ ..... اچھا ..... اچھا، اب چائے لے آئیں۔ صرف دولہا دلہن کیلئے نہیں۔ ہمارے لئے بھی۔ ہے تو مداخلت بے جا مگر مجبوری ہے ہم تو یہاں بہت تھوڑے دنوں کے مہمان ہیں۔ آپ ہماری آؤ بھگت کیجئے بطور مہمان۔ پتہ نہیں پھر کب ملاقات ہو، ہو بھی یا نہیں۔"

وہ ادا کیجئے مسکراہٹ دبا کر کہہ رہے تھے۔

"کیا مطلب؟" نازمین یکدم چونک پڑی۔

"بھئی۔ ہم مکمل آداب غلامی سیکھ رہے ہیں۔ یعنی انگلینڈ میں زیر تعلیم ہیں۔"

"مگر مجھے تعلیم کا اثر خاص نظر نہیں آرہا۔"

یاور علی خان براؤن نائٹ گاؤن میں سفید تولیے سے سر رگڑتے ہوئے باتھ روم سے باہر آگئے تھے۔

"ہماری ریپوٹیشن خراب مت کیجیے ہم ال معزز اور "اولڈ بوائے" بہرحال ہرگز نہیں ہیں۔" تیمور علی خان نے بھائی کو بہت محبت اور چاہت سے دیکھا۔

"بھئی ہم تو تعلیم کے متعلق بات کر رہے ہیں لگتا ہے تم ادھر کچھ خاص کو سر کر رہے ہو گے۔ اچھا کوچنگ چل رہی ہے تم میں۔"

یاور علی خان کا لہجہ معنی خیز اور شرارت آمیز تھا۔

"یہ دیکھیے۔ ہونہار لوگوں کی یہ قدر ہے یہاں۔ کس قدر رشک و حسد۔" تیمور علی خان نے شاکی انداز میں نازمین کو مخاطب کیا۔ جو ان دونوں کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"بھائی! آپ کو چائے کا کہہ کر باتھ روم میں بند ہونا چاہیے تھا۔ بے چاری کب سے چائے کا انتظار کر رہی۔"

"واقعی؟" یاور علی خان نے تعجب سے نازمین کو دیکھا۔

اس کی نظریں حیا سے جھک کر رہ گئیں۔

"آپ دونوں بھائی کیا اسی طرح میری درگت بنایا کریں گے؟" خود اعتمادی تو اس میں بہت تھی اسی باعث اس کی آواز اور الفاظ قطعاً تھے۔

"ہم تو خیر چلے جائیں گے۔ پھر یاد کیجیے گی بنایا کیجیے۔"

تیمور علی خان نے بڑے معصومانہ اور سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔ یاور علی خان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ نازمین نے اپنے مہندی سے رچے ہاتھ چہرے پر رکھ لیے تھے۔

"چھوڑیے بھائی۔ بھابی کو تنگ مت کیجیے۔ گڈ ول ایج ہو رہی ہے۔" تیمور علی خان نے بہت الجھن سے نازمین کی دلنشین ادا کو دیکھا تھا۔

اسی دم ماما چائے کی کشتی کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔

"ادھر آیئے ماما۔ آج بھائی بھابی کی خدمت کا آغاز کریں گے۔" تیمور علی خان نے تپائی کھینچ کر اپنے سامنے کی اور کشتی رکھنے کا اشارہ کیا۔

"بہت ہی اہم تبدیلی ہے۔ فل کریانی نے پینے والے چائے بنا رہے ہیں۔" یاور علی خان نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے آئینے میں تیمور علی خان سے کلام کیا۔

"سارے گھر میں روشنی ہے خوشبو ہے تبدیلی سے حیرت کیا۔" تیمور علی خان نے گویا پھلجھڑی چھوڑی۔

"اوں... ہوں... یہ ہمارے حصے کے ڈائیلاگ ہیں۔" یاور علی خان نے مصنوعی خفگی سے بھائی کو دیکھا۔

"مگر بہت اچھے ہیں۔ اپنی واجب الاحترام بھابی کیلئے ہم بھی بول سکتے ہیں۔"

تیمور علی خان نے چائے کی تیاری کے دوران وضاحتی جواب دیا۔

نازمین جو تیمور علی خان کے بے دھڑک انداز گفتگو سے بڑی حیرت زدہ ہو رہی تھی۔ تیمور علی خان کے سادہ اور بے ساختہ انداز پر دل ہی دل میں شرمندہ سی ہو گئی۔

تیمور علی خان نے چائے پہلے نازمین کو پیش کی۔

"شکریہ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہیں... ارے۔ ہم رات سے خوش ہو کر برا حال کیے بیٹھے ہیں کہ اپنے گھر میں کوئی تو انگلش بولنے والا کوئی ہوا۔ آپ کی انگریزی سننے کے شوق میں بولے جا رہے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ بھابی بیگم! اللہ شکریہ بھابی بیگم نے تو قبول ان کے آپ صرف قرآن پڑھی ہوئی ہیں۔ حالانکہ یہ حالی بھی اچھی خاصی ہے۔ ہم تو انہیں کہتے ہیں آپ تھینکس کے ضمن میں "شکریہ" جدا کہا کریں۔ کیونکہ قرآن عربی میں اترا ہے۔"

"یا اللہ" نازمین کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ یاور علی خان بھی مسکرا رہے ہیں۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں اس ہم انسان کی عام طرز گفتگو سے پتا چلنا چاہیے اس کی ایجوکیشن کس طرح کی ہے۔ ہم نے آپ کا شکریہ ہیں رکھا ہے۔ سائیڈ ٹیبل پر کرکٹ پریکٹس کے ساتھ ہمیں مطلع تھینکس کیجیے۔"

"نازمین کا دل چاہ رہا تھا کہ قہقہہ لگا کر ہنس دے۔ مگر یہاں وہ ایک رات کی دلہن تھی خود پر بڑا کنٹرول کر رہا۔"

"یار۔ مت ستاؤ اپنی نئی نویلی بھابی کو۔" یاور علی خان بھائی کے قریب صوفے پر آکر بیٹھ گئے اور چائے کا کپ اٹھایا۔

"کیچ جا رہے ہیں آپ۔" تیمور علی خان نے پھر چھیڑا۔

"اچھا یہ بتائیے۔ آپ نے بھابی کی انگریزی سن لی۔ دیسی انداز میں تو نہیں بولتیں؟ ہمیں تو دیسی سٹائل میں انگریزی بولنے والے بجز اشاروں میں بات کرتے لگتے ہیں۔"

"یار آجاؤ یار!" یاور علی خان نے ایک بھرپور نظر نازمین پر ڈالی۔ جو سادہ سے چہرے پر کامدانی سے مرصع آنچل لٹکائے خود سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ تیز فیروزی لباس میں انگلی چھب اور تھی۔

سامان جیولری بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ صرف کندن لباس کی گویا پورا سجا گیا تھا۔ اسی دم دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی پھر آواز دستک ہوئی۔

"جی کون۔ آجائیں؟" یاور علی خان نے اجازت دی۔

زرق برق لباس میں ملبوس خواتین کی ٹولی اندر داخل ہوئی۔

"ارے تیمور تم یہاں ہو۔ کیا کر رہے ہو ادھر؟" تو کسی نے بہت اپنی حیرت پر قابو پا کر پوچھا۔

"خدمت کر رہے ہیں بھابی کی۔ آپ لوگوں کے بندے بیدار ہو تو تنگ ہارا تو علی واپسی کے وقت ہی کھلیں گے

۔بس ایک دم ہمیں اپنی بھابھی کا خیال آ گیا"۔

"اللہ کی شان۔ ہمیشہ ایک جراب ہاتھ میں لے کر دوسری کی ڈھونڈ مچانے والے کس قدر ذمہ دار ہو گئے ہیں۔ مگر تمہارے لیے مایوس کن اطلاع ہے کہ ناز بھابھی کی جو دو شادی کے قابل بہنیں ہیں ان کی منگنیاں ہو چکی ہیں"۔

بصیر علی خان سے چھوٹی بہن روشن آرا نے بڑی دلسوزی سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ہماری تو معلومات زیرو ہیں بھابھی کی فیملی کے متعلق۔ ہمارے لیے تو بہنوں کی اطلاع ہی کافی ہے منگنیوں کی بھی"۔

وہ تمام چونکہ خواتین کو خود پر مسلط پا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"بھئی آپ لوگ اسے کچھ نہ کہیں۔ واقعی اس نے ہمیں عین طلب کے وقت بہت اچھی چائے بنا کر پلائی ہے"۔

یاور علی خان نے خواتین کو اگلے حملے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"ذرا ٹھہرو۔ میں حیرت سے مر نہ جاؤں"۔ زرتین دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"ہائے اللہ اس نے تو بہت تنگ کیا ہوگا"۔ زبیدہ بیگم نے پیار سے نازمین کی ٹھوڑی اونچی کر کے بوسہ دیا۔

"ہم تو بہت پروگرام بنا کر آئے تھے۔ مگر کیا کریں' بھائی باتھ روم سے جلدی آ گئے"۔ تیمور علی خان باہر نکلتے نکلتے شرارت سے مخاطب ہوئے۔

وہ سب ہنس پڑیں۔ یاور علی خان بھی کپ رکھ کر آہستگی سے باہر نکل گئے۔ بہنوں سے تو نہیں بھابھیوں سے انہیں بھی سخت خطرہ تھا۔

"ہائے۔ ابھی تک زیور نہیں پہنا۔ زرتین ذرا زیور اٹھاؤ۔ دلہن کے گھر والے بھی آتے ہی ہوں گے۔"

عالم تاب نازمین کے مقابل بیٹھ گئیں۔

"آپ پہلے چوڑیاں پہنائیں۔ میں بھابھی کے بال سلجھاتی ہوں۔" زرتین نازمین کی پشت کی طرف چلی گئیں۔

"بھئی۔ کیا زیورات میں اضافہ نہیں ہوا؟" ایمن بھابھی زیورات ٹٹولنے لگیں۔

"مجھے تو نظر نہیں آ رہا۔ میرا خیال ہے۔ صرف معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔"

روشن آرا شوخی سے بولیں۔ خواتین کے مترنم قہقہے بہت بھرپور تھے۔ نازمین کے چہرے پر سرخی چھلکنے لگی۔

"بھئی ہم زیادہ دیر یہ سسپنس برداشت نہیں کر سکتے۔۔۔" زرتین نے نازمین کے سر سے دوپٹا اتار کر ایک طرف رکھا اور اس کے گھنے دراز بال انگلیوں سے سلجھانے لگی۔

"بھئی ہمیں یاور خان ایسے چھپے رستم کا کارنامہ دیکھنے کی بڑی جلدی ہے"۔

عالم تاب' نازمین کی کلائیوں میں کنگن اور چوڑیاں ڈالنے لگیں۔

"بھابی پلیز"۔ زرتین نے آگے کی طرف جھک کر نازمین کا چہرہ چھوا۔

نازمین نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کی طرف اشارہ کیا۔ "یعنی خود ہی دیکھ لو۔"

ایمن بھابی نے بےتابی سے دراز کھینچی۔ اور ایک نیلی مخملی ڈبیہ باہر نکالی۔

اور پھر اسے الٹ پلٹ کر انداز میں کھولا۔ تقریباً سب ہی اس پر جھک گئیں۔

سرخ یاقوتی انگوٹھی جسے نازک بہت خوبصورتی سے اچھالا تھا ان سب کے سامنے تھی۔

"کوہ نور دست"۔

"ہوں۔ اشارے کی زبان میں کہا ہے کہ حویلی کی "رو" والی ملکہ تو اب تم ہی بنو گی۔ دل کی ملکہ تو بنا ہی لیا ہے"۔ ناز بھابھی نے دور کی کوڑی لانے میں سبقت حاصل کی۔

"ویسے کہا بھی ہوگا"۔ زرتین نے شرارت سے گھورا تو نازمین کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

"یہ تمہاری بات کی تصدیق کر رہا ہے"۔ روشن آرا نے بھی حصہ لیا۔

نازمین نے بے ساختہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔

خواتین کی مترنم مسکراہٹ سے ماحول یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا میں غم نہیں ہوتے۔ اس سیارے میں خوشی کا سورج روشن رہتا ہے۔

اسی شام حویلی واپسی ہو گئی۔ اماں بی کا دل کراچی میں ویسے بھی نہیں لگتا تھا۔ انہیں اپنی حویلی کی مصروفیات بہت عزیز تھیں۔ کہتی تھیں۔

"کراچی میں تو میرے ہاتھ پیر بندھ جاتے ہیں۔ یہاں تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا اور حویلی میں میرے کام ختم نہیں ہوتے"۔

ان ہی کی طرف سے جلدی واپسی کا تقاضا تھا جبکہ ولیمہ تو چار روز کے بعد یعنی اتوار کو تھا۔ کہ بابا صاحب کے بااثر دوست احباب شمولیت کر سکیں چھٹی کا دن ہوتا تھا۔

دلہن بانو' زرتین کا لگتا ہوا گہرا جامنی سلیقے سے کام سے سجا ہوا پہنے ہوئے استقبالیہ حلقے میں نہایت حسین نظر آ رہی تھی۔ دلہن دیکھنے کے اشتیاق نے ان کے چہرے پر عجیب سی طمانیت پیدا کر رکھی تھی۔

"دلہن بانو' ادھر پیچھے سے آ کر دلہن کا غرارہ سنبھالو"۔ زرتین نے مستعد دلہن بانو کو حسب دستور آواز دی۔

وہ برآمدے کی سیڑھیاں ایک ہی جست میں پھلانگ گئی۔ تیمور علی خان برق رفتاری سے اپنا بیگ اٹھائے سب سے پہلے اندر داخل ہونے کی کوشش میں آگے بڑھے تھے۔

دلہن بانو کی نظر "دو جہانی اشیاء" کو دیکھ ہی کب رہی تھی ان کی نظر تو براہ راست دلہن پر تھی۔ اس بری طرح تیمور علی خان سے ٹکرائی اور دھڑام سے گری کہ ایک لمحے کو تو سب ہی مبہوت ہو کر رہ گئے۔

"ہو۔ ہو۔ چوٹ تو نہیں لگی۔ دیکھ کر چلا کرو۔ اچھا چلو شاباش اٹھو"۔ مختلف قسم کی آوازیں ابھریں۔

"نان سنس"۔ دم بخود سے تیمور علی خان نے بس اتنا ہی کہا۔

"چھوڑو جانے دو۔ تم گرے تو نہیں۔ گری تو یہ بے چاری ہے۔" امیمہ بھابھی نے تیمور علی خان کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

"گر بھی سکتا تھا۔ یہ بھاگنے دوڑنے کی کوئی تک تو نہیں ہے ادھر۔"

انہوں نے بدحواس سی زیتون بانو کے چہرے پر خشمگیں انداز میں نظریں دوڑائیں۔

"یہ عمر ہی نوک جھونک کی ہے تیمور خاں۔" نرگس نے شوخی سے دھیان دلایا۔

"ہوں۔" وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

وہ بھی کھسیائی ہوئی دلہن کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

دلہن کو ہال میں پہنچا کر وہ ماما کے ساتھ کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے تو سب کو چائے پلانے کا مرحلہ تھا۔

"ماما اب آپ آ گئی ہیں۔ تیمور خاں کے کام آپ ہی کریں۔ مجھے ان سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ابھی اگر سب لوگ نہ ہوتے تو وہ مجھے تھپڑ ضرور مارتے۔" اس نے کپ دھو کر ٹرالی میں لگانا شروع کر دیے۔

"ارے نہیں۔ ایسے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی تو تقریباً سب لوگ ہی چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تو سب کو خوش رکھتے ہیں ماما صاحب کے سامنے بھی نہیں چوکتے۔ باہر پڑھتے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں۔ حویلی کی تو ساری عادتیں ختم ہو گئی ہیں ان میں۔ اپنے بہت سے کام خود ہی کر لیتے ہیں۔ وہاں کراچی میں مجھے اندازہ ہوا تھا۔" ماما نے تسلی دی۔

"پھر بھی ماما۔" وہ کسی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئی۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ میں خود ہی دیکھ لیا کروں گی۔ ویسے آج تو تو پری لگ رہی ہے۔"

ماما نے اسے محبت سے دیکھا۔

"چھوڑو ماما! آپ بھی کیا بات کرتی ہو۔ نانی کے سامنے کوئی میری تعریف کرتا ہے تو پتہ ہے نانی کیا کہتی ہے؟" وہ ہنسی۔

"کیا کہتی ہے؟" ماما کے انداز میں دلچسپی تھی۔

"کہتی ہے جنگل میں مور ناچ رہا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ماما بھی مسکرا دیں۔ "اللہ تمہارے بھاگ جگائے۔ وہاں کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

انہوں نے شفقت سے دیکھ کر دعا دی۔ چند دنوں میں وہ انہیں بہت عزیز ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں بھی آرام کے معنی معلوم ہونے لگے تھے۔

اسی دم وہ پارو بی بی احمد داخل ہوئی۔

"زیتون بانو۔ تیمور خاں کا بلاوا ہے سن لو۔"

زیتون بانو کے تو حلق میں گھٹلی پھنس گئی۔

"میں وہاں جاتی ہوں۔ چائے دیکھ لینا۔" وہ باہر چلی گئی۔

زیتون بانو کے دم میں دم آیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔

چند منٹوں بعد ماما واپس آ گئیں۔ اس نے آتے ہی زیتون بانو کو بھی سوالی نظروں سے دیکھا۔

"زیتون بانو! خان تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"ہم۔۔ مجھے۔" وہ گھبرا گئی۔ "کیوں؟"

"یہ تو نہیں بس مجھے تو یہی حکم دیا کہ زیتون بانو کو بھیجو۔"

اس نے جلدی سے ہاتھ پونچھے۔ بری طرح گھبرا رہی تھی۔ اسی حالت میں باہر نکل گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ... اور ہلکی انگلی سے دستک دی۔

"ہیں۔" سائیں خان کی بارعب آواز آئی۔ اس نے دوپٹہ درست کیا اور اندر داخل ہو گئی۔

"جی۔ خان۔"

"وہ زیتون بانو۔ بات یہ ہے کہ تم کر دو، بہت اچھی بناتی ہو۔ یہ جیکٹ استری کر دو ہمیں ذرا باہر جانا ہے۔" خان نے بیڈ پر پڑی جیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"جی اچھا۔" وہ خان کے نرم انداز پر سنبھل گئی۔ اور آگے بڑھ کر جیکٹ اٹھائی۔

"چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟" اس کے آگے بڑھتے قدم خان کی آواز پر تھم گئے۔

اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ خان اپنی مسہری پر بیٹھے ہوئے بغور دیکھ رہا تھا۔

اس نے مزید آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ آیا یہ خان ہی ہے۔

"نہیں۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"تم گر گئی تھیں۔ اس لیے پوچھ رہے تھے۔" لہجہ عام سا تھا۔

"نہیں۔ مجھے چوٹ نہیں لگی بس وہ ذرا گھٹنے میں درد ہوا ہے۔"

"چلو۔ اچھا ہوا۔ مگر تمہارا سر ہمارے سینے سے بہت زور سے ٹکرایا تھا۔ خاصی تکلیف ہو رہی ہے۔" لہجے میں عجیب سی شرارت تھی۔

اس نے بدحواس ہو کر خان کی طرف دیکھا تھا۔ مگر وہ تو پرسکون اور نارمل تھا۔

"وہ جی۔ آپ کو ہم لگیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"وہ جی۔ وہ سرہم ہوتا ہے نا۔ بڑی تیز سی خوشبو ہوتی ہے اس میں۔"

اس نے اپنی دانست میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہارا مطلب ہے ویکس۔ نہیں تیز اب ایسا بھی نہیں ہے کہ محنت کی جائے۔ اچھا تم جاؤ۔ آتے ہوئے چائے ضرور لیتی آنا۔ تم بہت اچھا کام کرتی ہو۔ ہمیں ڈر ہے اگر ہم یہاں زیادہ دن رہ گئے تو ہماری عادتیں نہ بگڑ جائیں۔"

کس قدر بدلا ہوا تھا خان۔ اسے وحشت سی ہونے لگی۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئی تھی۔

ولیمے کی دعوت بڑے اعلیٰ پیمانے پر تھی۔ کراچی سمیت دوسرے شہروں سے بھی مہمان آئے ہوئے تھے۔ گویا ایک برسات تھی۔

نازنین کے بھی سب گھر والے آئے ہوئے تھے۔ اماں جی اور بابا صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نازنین بھی اپنے میکے والوں کی موجودگی میں بہت بے تکلف اور آزادی محسوس کر رہی تھی خود کو۔ تزئین اور سائرہ بھابھی نے اسے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن تو ویسے بھی سب کی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔ نازنین تو پھر نازنین تھی۔ حسن کی آمد سے پہلے ہی اس کے آنے سے پہلے حویلی میں داخل ہونے والے فرد کی پہلی نظر اسی کو دیکھنے کی ہوتی تھی۔

تیمور علی خان نے آج تیاری میں بہت اہتمام کیا تھا۔ آف وائٹ شیروانی اور تنگ پاجامے میں ملبوس پاس میں ہم شاہی کیا شہزادے کی سی آن بان تھی۔

زیتون بانو دلہن کے گجروں کی باسکٹ لیے بیڈروم کی طرف جا رہی تھی۔ تیمور علی خان زینہ اتر کر نیچے آ رہے تھے۔

وہ تو ان کی چھب دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی۔ مصروفیات کی وجہ سے ابھی تک اسے خود تیار ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کل کے کڑھے ہوئے کرتے شلوار میں پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ بے ساختہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ جیسے پہچان رہی ہو کہ یہ وہی ہے یا کوئی اور۔

تیمور علی خان کی حسیات بلا کی شارپ تھیں۔ انھوں نے اس کا ٹھٹکنا نوٹ کر لیا۔ ایک مبہم سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر ٹھہر گئی تھی۔ جیسے وہ خود کو سراہ رہے ہوں۔

"کیا ہوا؟" وہ میں راہ میں تھی انھیں تو کہنا پڑا اور خود پر سنجیدگی طاری کر چکی۔

"کک... کچھ نہیں... وہ... خان... میری چپل... ہے ناں... ڈھیلی ہو گئی ہے۔" اس نے بوکھلا کر بے تکا جواز پیش کیا۔

تیمور خان نے اس سطحی نقوش والی کم سن کنیز کو اپنی گہری اور چمکتی ہوئی نگاہوں سے بغور جانچا اور اپنی رسٹ واچ کا کلپ سیٹ کرتے اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"اپنی سب چیزیں فٹ رکھا کرو۔ بعض اوقات پرابلم ہو جاتی ہے۔"

وہ دم سادھے کھڑی رہ گئی۔ کچھ سمجھی اور کچھ نہیں۔

"ارے... تجھے کیا سانپ سونگھ گیا۔ کیا بت بنی کھڑی ہے۔" اسے عقب سے خالہ سوہنی کی آواز آئی۔ پھر تو جیسے اس میں بجلی دوڑ گئی۔ فوراً بھوت کی طرح خالہ چھڑ گئیں تو راگ پھر الاپ کر کے ہی دم لیں گی۔

جانے کیوں دل چاہا کہ دل بھر کے خود کو سنوارے۔ سارے کاموں سے فارغ ہو چکی تھی۔ نہا دھو کر ہلکے ہوئے بیر کے رنگ کا مخمل کرتا شلوار پہنے دھانی گوٹے کرن سے سجا دوپٹہ۔ سوچ کے گھر سے آج سے پہلے وہ کبھی اتنا نہیں سنوری تھی۔

پاؤں میں سنہری گھنگھرو والی چپل ڈال کر جب وہ پچھلی آنگن تک آئی تو تزئین سمیت کئی خواتین راہداری میں کھڑی تھیں۔ انھیں ایک دم اپنے سامنے پا کر اسے اپنی آرائش بہت محسوس ہونے لگی۔ حجاب سا طاری ہو گیا۔ اس کی رنگت خود بخود ہی پڑ گئی۔

"آہا... ارے کیا اتار کر لی ہوئی ہو آج۔ وہ زیتون بانو..." تزئین نے بے ساختہ سراہا تھا۔ "خدا کے لیے باہر جانا کوئی آپ سے باہر ہو گیا تو کہیں اپنی ہی جان نہ جلا لے..."

سائرہ بھابھی کو انجانے خطرے کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔

"جی؟... وہ ایک دم شکست ہو گئی کہ رکا گئی ساری ہمت جب اسے محل میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہی نہیں۔"

"جی... پھر کیا اوپر ہی رہوں؟" اس نے افسردہ لہجے میں سوال کیا۔

"احمق... دل ہی دل میں نہیں گھنی۔ خوشی کا دن ہے۔ پھولو گھومو پھرو۔ اگر جلدی فارغ ہو گئے تو تمہارا بھی مشورہ لیں گے... مالا ری تمہاری آواز بہت خوبصورت ہے۔ اس رنگ میں کچھ گا کر سنانا... جو روح کھنچ لو۔"

"اچھا... بی جب نام ہے تمہارا پایل کی صورت نہیں کرتی تم پر۔ تمہارا نام 'مطربہ' ہونا چاہیے۔

آج سے تمہیں ہم اسی نام سے پکاریں گے۔ کیا خیال ہے بھابھی۔ کیسا نام ہے؟" تزئین نے سائرہ کو مخاطب کیا۔

"ارے اتنا سر نہ چڑھاؤ۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔" سائرہ کے اعصاب ہر قسم کی صورت حال میں کنٹرول میں رہتے تھے۔

"ارے نہیں بھابھی یہ تو بڑی بے وقوف اور سادہ سی لڑکی ہے۔ چلو اب تم ہمارا شکریہ ادا کرو۔ ہم نے تمہیں کتنا خوبصورت نام دیا ہے۔ مطربہ... محبت کے گیت چھیڑنے والی۔" تزئین بہت فراخ دل تھیں۔

وہ گڑبڑا کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

وہ بہت سرخوشی کے عالم میں باہر بارش میں آئی تھی۔ جو کوئی بھی اس کی جانب اٹھی تھی پرستائش اور سوالیہ تھی۔ کون ہے؟ کنیز... واقعی... حویلیوں میں بھی اتنی خوبصورت کنیزیں ہونے لگیں؟ عجیب طرح کی چہ میگوئیاں تھیں۔ وہ وہاں سے وہاں تتلی کی مانند اڑی اڑی پھرنے لگی۔

اس کا لباس وہاں پر موجود خواتین کے لباس جتنا قیمتی نہیں تھا۔ مگر روپ بے مثل تھا۔

وہ کسی پیار گیت کی سنت بھی گئی۔ اسے شاید خود بھی پتہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔

شاید کسی آنکھ سے قرض وصول کر رہا تھا۔

اسے لوگوں نے ارادے سے بھارا دیا اور اسے سراہا تھا مگر سے عزیز نہیں آیا تھا۔ کوئی اور بھی ادھر روشنی سا گھوم رہا تھا اس کی روشنی بانو کے طول سے کہیں کب آ رہا تھا۔

تھک ہار کر ادھر ادھر بیٹھنے کے باوجود اس کی تشنگی پوری نہیں ہوئی تھی۔

وہ تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گئی تھی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ غیر معمولی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کھانے کی خوشبوئیں بھی اسے متوجہ کرنے میں ناکام تھیں۔
کھانا ختم بھی ہو گیا لوگ آہستہ آہستہ واپس ہونے لگے۔ سنہری فرشی غرارے میں ملبوس ماریہ بھی کچن سے باہر نکل کر پچھواڑی گئی تھی۔

"تو نے کھانا کھا لیا زیتون بانو؟" گہرے نیلے کپڑوں میں ملبوس کرن بھول چبتے ہوئے ہونٹ پان سے سرخ کیے خالہ سولا آنے اس کے سر پر کھڑی اسے تعجب سے دیکھ رہی تھیں۔

"کھا لوں گی خالہ۔۔۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔" وہ بددلی سے بولی۔

"کب کھائے گی۔ کیا سویرے۔ آدھی رات ہو چلی۔ چل اٹھ۔ پھوپھی بی بی جان بلا رہی ہیں۔" وہ بولیں

"کون تزئین بی بی؟" وہ چونکی۔

"ہاں ہاں اور ادھر ہال میں ہیں سب۔ جلدی سے چلی جا۔ وہ بار بار پوچھ رہی ہیں تجھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تو یہاں بیٹھی ہے۔ ڈھونڈتی پھر رہی تھی ادھر ادھر۔ چل شاباش۔" وہ اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہال میں آ گئی۔ وہاں کا تو منظر ہی اور تھا۔

دلہن صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ خواتین جن سے پر کچھ بیٹھے ہوئے مہمان تھیں۔ قہقہے اور ہنسی کی آوازوں سے ہال گونج رہا تھا۔ وہ تزئین کے بائیں طرف آ کھڑی ہوئی۔

"جی بی بی جان!"

تزئین جو اپنی کسی بات میں کھوئی تھیں ایک دم چونکیں۔

"لو بھئی۔۔۔ مطربہ آ گئی۔"

"مطربہ۔۔۔ یہ سب تمہارا گیت سننے کے لیے بے تاب بیٹھی ہیں۔ ابھی جب ماما نے بتایا کہ بڑی سریلی اور پاٹ دار آواز ہے۔ لگتا ہے کوئی بڑی ہنرمند گلوکارہ گا رہی ہو۔ ہم نے تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس کے گیتوں سے محفل ضرور سجائیں گے۔"

"ہم۔۔۔ مجھے گانا نہیں آتا بی بی جان۔ ماما تو ویسے ہی کہہ رہی ہوں گی۔" وہ اتنے ہجوم کی نظریں خود پر پڑتے ہوئے دیکھ کر ہکلا گئی۔

"اچھا اب گلوکاروں والے نخرے نہ کرو۔ چلو جلدی سے سناؤ شاباش۔" تزئین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ حلق میں جیسے کچھ اٹک رہا تھا۔

"بات نہیں کریں گے ہم تم سے۔" تزئین خفا ہونے لگیں۔

اس نے چند منٹ تھوک نگلنے میں لگا دیے۔ پھر اداس سی آواز میں اس نے گیت گانا شروع کر دیا۔

آئے گا۔۔۔ آئے گا۔۔۔ آئے گا آنے والا

آئے گا آنے والا

دیپک بغیر جیسے پروانے جل رہے ہیں

کوئی نہیں چلاتا اور تیر چل رہے ہیں

تڑپے گا کوئی کب تک بے آس بے سہارے

لیکن یہ کہہ رہے ہیں دل کے مرے اشارے

آئے گا آئے گا

محفل پر ایک سکوت طاری ہو گیا تھا۔ کیا غضب کی آواز تھی بلا کا سوز اور چاؤ تھا۔ جیسے یہ عالم کوئی واردات پیش کرتی ہو۔ سانس پر مکمل کنٹرول۔ جیسے بہتا ہوا پانی رواں ہو اور کوئی معمولی سی رکاوٹ سامنے نہ ہو۔

اس کے خاموش ہوتے ہی جیسے سب سوتے سے جاگ پڑے۔

"واہ ماما۔ بڑی زبردست شے دریافت کی ہے۔" ساتھ آرا نے پلٹ کر دروازے کے پاس بیٹھی ماں کو داد دی۔

"بی بی جان اسے کہیں۔ وہ سنائے۔ تنہائی سنایا کرتی ہے کچھ بیتے دنوں کا فسانہ۔"

"ہاں۔ ہاں۔ سناؤ۔ ہم نے نہیں سنا ابھی یہ گیت۔ گیت ہے یا غزل ہے؟" سائرہ نے اشتیاق سے اصرار کو فوری مطالبہ کیا۔

"گیت ہے۔ میں نے بچپن میں سنا تھا۔ مجھے بتا رہی تھی کرن میں نے کسی کے پاس گراموفون پر سنا تھا سالہا سال ہی۔" ماما نے جواب دیا۔

"جلدی سے سناؤ مطربہ۔ دیکھو دلہن بھابی کتنے شوق سے سن رہی ہیں۔ یقیناً تمہیں انعام بھی دیں گی۔"

تزئین شریر انداز میں گویا ہوئیں۔ سائرہ نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔

"دیکھیں بھئی۔ سب موجود ہیں۔ غور سے سن لیں ہم نے اس کا نام بدل دیا ہے آج سے سب اسے مطربہ پکاریں۔ حویلی میں بھی کسی اچھوتے نام کی پکار ہونی چاہیے۔"

"واہ تزئین کتنا پیارا نام ہے۔ اپنی آنے والی نسل کے لیے ہی سنبھال رکھتیں۔" عالم آپا نے برجستہ کہا۔

تزئین نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بس ایک سایہ سا چہرے پر لہرا کر رہ گیا۔

"ہاں شروع کر دو ناں۔ کیوں اتنی منتیں کروا رہی ہو۔" سائرہ بھابی نے قدرے خفگی سے کہا۔ مہمان خواتین کی طرف سے بھی اصرار ہوا۔

تنہائی سنایا کرتی ہے کچھ بیتے دنوں کا فسانہ

نظروں کو کسی سے ٹکرا کے اک دم سے وہ دل کا رک جانا

وہ میرا کسی کی چاہت میں جینے کو مصیبت کر لینا

کھانے کو کوئی تو ٹھکرا دے بہلانے کوئی تو روٹھ جانا

"بی بی جان۔۔۔ بی بی جان۔" وہ گھبرائی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔

"سب چونک پڑیں۔ کیا ہوا؟"

"تیمور خان نوں سانپ ڈنگ ساں۔ تے او بے ہوش ساں۔ تساں چھیتی چلو۔"

"ہائے اللہ۔ ارے" مختلف قسم کی آوازیں ابھریں۔ سب ہی کچھ بھول گیا۔ وہ سب گرتی پڑتی اور بھاگتی ہوئی۔ دیوی ان کے آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ وہ بڑے بھائی کی بیٹھک کی طرف جا رہی تھی۔

ابھی وہ سب دروازے کے قریب پہنچی تھیں کہ بڑے بھائی اور یاور علی خان۔ تیمور کو اٹھائے ہوئے گاڑی کی سمت جاتے نظر آئے۔

ترئین تو جیسے چکرا کر گرنے لگی۔

"دیکھو ماما اماں جی کو سنبھالنے لگے اور بیگم تم دلہن کو ان کے کمرے میں پہنچا دو۔"

"ہائے اللہ۔ کیا ہو گیا یہ" عالم تاب نے مضبوط اعصابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے احکامات جاری کیے۔

ترئین روشن آرا بیگم وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ابھی مہمانوں کی چہل پہل موجود تھی۔ سارا گھر روشنی سے روشن تھا۔ مگر اب چہار سو وحشت سی طاری ہو گئی تھی۔

گاڑی باہر جا چکی تھی۔

"ترئین۔ خود کو سنبھالو۔ انشاءاللہ کچھ نہیں ہوگا"۔ ترئین کی غیر حالت دیکھ کر عالم تاب نے ان کا سر اپنے سینے پر رکھ کر دلاسا دیا۔

زیتون بانو کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھی پر دم بخود کھڑی تھی۔

بمشکل سب واپس اندر آئیں اور ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گئیں۔ انسانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ مگر ایک ہولناک سناٹا چہار سو پھیلا ہوا تھا۔

نازنین اپنے کمرے میں بری طرح رو رہی تھی۔ اس کے میکے والے اپنے رشتے داروں کے ہاں چناب روانہ ہو چکے تھے۔

یہاں کے دقیانوسی ماحول کو دیکھتے ہوئے ایک خوف اس کے وجود میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔

خدانخواستہ تیمور علی خان کو کچھ ہو گیا تو ہمیشہ کیلئے منحوس کا ٹھپہ اس پر لگ جائے گا۔ اور یہ داغ دھونے نہ دھلے گا۔ اس نے فوراً سے پیشتر لباس تبدیل کیا۔ زیورات اتارے۔ نیل پالش صاف کی اور وضو کر کے نفل پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

اماں جی تو دس بجے ہی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں کہ وہ بہت تھک چکی تھیں۔ دوسرے عشا کی نماز بھی پڑھنا تھی۔

زیتون بانو بے قراری سے اندر ہی اندر ٹہلتی رہی۔ یوں کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور تیمور علی خان اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوں۔ اور وہ اپنے تھکے ہوئے وجود کو بستر پر ڈال کر پرسکون ہو کر سو جائے۔

کافی دیر ٹہلنے کے بعد وہ اندر چلی آئی۔ بجائے ہال میں جانے کے وہ نازنین کے کمرے میں چلی آئی۔

دروازے پر دستک دی تو نازنین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جلدی جلدی دعا پوری کی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرے اور

اجازت دے دیجیے کے جانے کے گرتی پڑتی دروازے تک آئی اور کانپتے ہاتھ سے دروازہ وا کیا۔

"اوہ" زیتون بانو کو سامنے دیکھ کر اس نے گہرا سانس لیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

"خیریت ہے ساس"۔ عجیب سہما انداز تھا۔

"پتا نہیں چھوٹی بیگم۔ ابھی تو کچھ خبر نہیں"۔ اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

"اندر آ جاؤ زیتون بانو۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے اکیلے میں"۔ وہ بستر کی طرف پلٹتے ہوئے روہانسی آواز میں گویا ہوئی۔

وہ دروازہ بند کر کے چلی آئی اور کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"پتا نہیں سانپ کہاں سے آ گیا۔ کیا اس سے پہلے بھی سانپ نکلتے ہیں یہاں؟" نازنین نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ مجھے بھی زیادہ دن نہیں ہوئے یہاں آئے۔ اتنا بڑا باغ ہے۔ پھول بوٹے ہیں۔ سانپ تو ہو سکتے ہیں۔ رات کی رانی جہاں ہوتی ہے وہاں سانپ آ جاتے ہیں۔ باغ میں تو رات کی رانی کھوئی پڑی ہے۔ پوری حویلی مہکی ہوتی ہے رات کو"۔ زیتون بانو نے جواب دیا۔

"تم کہاں سے آئی ہو؟" نازنین نے اس کے حسین اور دلکش حسن کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"بہت دور کے ایک گاؤں سے آئی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں بھی بڑے سانپ نکلتے ہیں۔ کھیتوں میں پانی لگاتے ہوئے رات کو عام طور پر بڑے لوگوں کو کاٹتے ہیں۔ مگر وہ لوگ انتظام رکھتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک بڑا اچھا حکیم ہے۔ سب حکیم جی والا بولتے ہیں۔ اس کو ہی بڑا اثر ہے۔ کوئی دوا لگاتا ہے اور پتا نہیں کیا کھلا کر اچھی کرتا ہے۔ ذرا سی دیر میں آدمی بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔ میرے ہوش میں تو آج تک وہاں سانپ کے کاٹنے سے کوئی نہیں مرا۔ بس ذرا وہ دور جائے تو بے ہوش ہو جاتا ہے"۔ اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

"دعا کرو۔ تیمور بخیر سلامت واپس آ جائیں۔ ورنہ میں تو گئی تھی کام سے"۔ نازنین نے بےقرار لہجے میں کہا۔

زیتون بانو نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ چاند گوری پہلے کام کا سوٹ پہنے ہوئے اور پیشانی تک دوپٹہ سجائے ہوئے وہ کچھ پہلے سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی۔

"کیوں جی" (سانپ نے تو تیمور خان کو ڈسا ہے خدانخواستہ اور خان کو تو نہیں) ہمارا گاؤں میں تو بڑی بہت سہاری ہوئی۔

نازنین نے اس کے حیرت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

"وہ ساتھ گئے ہیں تیمور کے؟" اس نے زیتون بانو کے استغراق میں مداخلت کی۔

"جی۔"

"تمہارے بڑے خان کو پتا چل گیا؟"

"پتا نہیں۔"

"تمہارے ہاں سانپ بھی نکلتے ہیں؟" خاصی دیر کی خاموشی کے بعد نازنین نے پوچھا۔

"نہیں"۔

"گاؤں میں ہیں؟"

"نہیں"۔

"پھر"۔ نازنین نے تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔ کسی خبر کے آنے تک جو اندر کی وحشت تھی اسے بھی تو بہلائے رکھنا تھا۔ اس لئے وہ اس سے سوال جواب کرنے لگی تھی۔

"مجھے میری نانی نے پالا ہے چھوٹی بیگم"۔ اس نے بڑے سبھاؤ سے جواب دیا۔

"ماں مر گئی تمہاری؟" نازنین نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"سمجھ لیں"۔ بڑا عجیب انداز تھا۔

"ہیں؟" نازنین نے بغور اسے دیکھا۔ "یا تو بندہ زندہ ہوتا ہے یا مرا ہوا۔ یہ سمجھ لیں۔ کیا ہوتا ہے؟"

"بعض لوگ کسی کیلئے جیتے جی مر جاتے ہیں چھوٹی بیگم!" اس نے خاموشی سے لہجہ آلودہ کر کے جواب دیا۔

"اور باپ؟"

"اسے بھی مرا ہوا سمجھ لیں"۔ وہ زہر خند سے گویا ہوئی۔

نازنین کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

"اچھا چلو چھوڑو۔ جاؤ باہر دیکھ کر آؤ کوئی فون وون آیا"۔ اسے پھر وسوسوں نے آگھیرا۔

زیتون بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اللہ اپنا کرم کرے جی"۔ وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔

نازنین بستر سے اتر کر دریچے میں آ کھڑی ہوئی۔ یہاں سے پورچ کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ باغ میں لگے ہوئے رنگ برنگ قمقمے بھی جیسے دھندلا رہے تھے۔

دوسرے پاؤں تک دعا مانگی ہوئی تھی۔ جان سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کی خوش قسمتی اور بدقسمتی آج کے واقعے سے مشروط ٹھہری تھی۔

خوشی سے نہال زندگی گزارتے گزارتے۔ یہ عجیب و غریب موڑ آیا تھا۔ ذہن ان مقامات پر اڑان بھر رہا تھا اور ان گوشوں کو بے نقاب کر رہا تھا جو شاید وہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچتی۔

اسے آگہی ہوئی کہ ہر تبدیلی اپنے اندر معلومات و احساسات کے ہزار ہا پہلو لئے آتی ہے۔ ورنہ شاید عمر بھر اسے پتہ نہ چل پاتا کہ خوش قسمتی و بدقسمتی بھی مشروط ہوا کرتی ہے۔ اور لوگوں کی رائے پر زندگی کا انحصار بھی ہوا کرتا ہے۔ اتنا بے اختیار ہے انسان؟ اس کے اعصاب شل ہونے لگے۔

وہ بمشکل قدم کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ جانے کتنی دیر بیٹھی رہی۔ عجیب بے خبری تھی۔ اسی دم یاور علی خان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

"نازنین چونک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شکر ہے۔ کیسے ہیں تیمور؟" اس نے یاور علی خان کا چہرہ گہری نظروں سے دیکھا۔

"الحمد للہ۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ زہر بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ مگر بچ گیا ہے۔ اب ٹھیک ہیں مگر پوچھیں کیوں ایک دم وہ بیہوش ہو گیا ہے"۔ وہ فرحت سے بولے۔

نازنین کو احساس ہوا جیسے اس کے اعصاب کسی شکنجے میں کسے ہوئے تھے، ایک دم آزاد ہو گئے۔ پلکوں پہ جھلملاتے ہوئے کو احساس اسے پوری شدت سے ہوا۔ بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

یاور علی خان شیروانی کے بٹن کھول رہے تھے۔ ایک دم رک گئے اور تیزی سے نازنین کے قریب آئے۔ "کیا ہوا؟"

"نازنین نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

"ناز۔ کیا بات ہے بیٹا زندگی؟" وہ بے حد فکر مند ہو گئے۔

"کچھ نہیں۔ خوشی کے آنسو ہیں۔ اب سے کچھ دیر پہلے میں بہت ٹینس تھی۔ خدانخواستہ تیمور کو کچھ ہو جاتا تو میں شاید آپ کی حویلی کے کسی سے بدتر ہوتی"۔ وہ خود پر قابو پا کر کہنے لگی تھی۔

"ہائیں۔ مگر وہ کیوں؟" یاور علی خان دم بخود رہ گئے۔

"آپ کے ہاں تو سب مجھے منحوس کہنے لگتے"۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اوہ۔ ہاں۔ لوگ توہم پرستی کرنے میں اگرچہ دن تو گنتے ہیں لیکن آغاز تو ہونا چاہیے۔ ایسے گنتے ہیں ہم آپ کو اپنی ارتقا بہرحال ہے مگر ہم تو پہلی پہلی شب سے ہی خوش قسمت لگ رہی ہے"۔

وہ فرحت سے اس کی تھوڑی انگلیوں سے اٹھا کر اشک صاف کرنے لگے۔

"آپ کی بات نہیں کرتی۔ ماحول کے حساب سے ایک سوچ آ گئی تھی"۔ وہ جھینپ کر دیر سے مسکرائی تھی۔

"میں جب ہم آپ کے ساتھ ساتھ ہیں تو آپ کو دوسروں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تعلق میں اعتبار ہو تو پھر خوش گیا"۔ وہ جیسے اس کی دلکش مسکراہٹ پر نثار ہو گئے۔

"شکریہ"۔ اس نے اعتبار دلانے والے کے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرے سکون کا احساس کر کے کچھ دیر پہلے کی اذیت کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔

ہلا کیا تھا پچے بھی رہے تھے۔ زرینہ نے سب کو سونے کے لئے بھیج دیا تھا اور خود تیمور کی پیشانی پر پٹیاں رکھ رہی تھی۔ زیتون بانو تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی بدل رہی تھی۔

"ہائے اللہ۔ جرابیں ابھی تک چڑھی ہوئی ہیں۔ ذرا اتارو"۔ زرینہ کی نظر سیدھی تیمور علی خان کے پاؤں پر پڑی تھی۔

زیتون بانو فرحت سے آگے بڑھی اور جرابیں کھینچنے لگی۔ گہری گہری بادامی آنکھوں کو اس نے نرمی سے چھوا۔ پھر ایک دم سے گھبرا کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ آرام کریں بی بی جان۔ پٹیاں میں رکھ دیتی ہوں"۔ اس نے محتاط سی زرینہ کو مخاطب کیا۔

"بس اب آرام ہی کرنا ہے۔ شکر ہے اللہ نے میرے بھائی کے حال پر رحم کیا۔ ہم سب پر رحم کیا۔" انہوں نے جھک کر تیمور خان کی پیشانی سے بال ہٹائے اور بوسہ دیا۔

"آپ آرام کریں آپا۔ اب پہلے سے بہتر ہیں ہم۔ یوں بھی سارا دن مصروفیت رہی ہے۔" وہ بہت دھیمی آواز میں ان سے مخاطب ہوا۔

"چاہو تو میں بالکل بھی تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔" انہوں نے تیمور علی خان کا چہرہ محبت سے چھو کر کہا۔

"پھر بھی۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ اماں جی تو ٹھیک ہیں ناں۔ نظر نہیں آ رہیں۔" معاً انہیں ماں کا دھیان آیا۔

"وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ انہیں بتایا نہیں۔ وہ تو ویسے ہی دل کی مریضہ ہیں۔ انہیں تو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔" زرمین نے جواب دیا۔

"بہت اچھا کیا۔" تیمور علی خان نے آنکھیں موند لیں۔

"بی بی جان۔ اٹھیے۔ آرام کیجیے۔ میں خان کے پاس ہوں۔ جب تک خان نہیں کہیں گے میں یہاں سے اٹھ کر نہیں جاؤں گی۔ آپ اطمینان رکھیے۔" اس نے پھر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ بہت کام کرتی ہے یہ۔ بڑی محنتی ہے۔ اماں جی کہہ رہی تھیں، یہ تو میرے ہاتھ پاؤں بنتی جا رہی ہے۔ میں نے اس کا نام زرجون بانو سے بدل کر ... رکھ دیا ہے۔ سب کو بہت پسند آیا۔" زرمین بھائی سے ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگی۔

"بہت خوب۔ آپ اپنی صلاحیت۔ سنوارتی رہتی ہیں آپا۔ اسلام ہونے کا تو ہم بھی سوچ رہے تھے۔ بڑا الہام بھی ہے اس کا۔ وہ کون سی بانو۔" انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ "زرجون بانو۔" زرمین نے مسکرا کر ان کی پیشانی سے پٹی ہٹا کر دوسری رکھی۔

"ہوں۔ جائیے آپ آرام کیجیے۔ ہم پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہے ہیں۔"

"اچھا۔ ایک منٹ ذرا تھرمامیٹر چیک کر لیں۔"

انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے تھرمامیٹر اٹھا کر جھٹکا اور تیمور علی خان کے منہ میں دے دیا۔

"ایسا کرو۔ تیمور کے لیے ایک کپ چائے بنا لاؤ۔ انہوں نے تو شاید کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔" زرمین نے زرجون بانو سے کہا تو وہ ایسے باہر نکل گئی جیسے منتظر رہی تھی۔

پانچ سات منٹ بعد واپس آئی تو زرمین بدستور پٹیاں کرنے میں مصروف تھی۔

"اب بخار کیسا ہے خان کا بی بی جان۔" اس نے کپ انہیں تھماتے ہوئے پوچھا۔

اسے بھی گویا تھرمامیٹر کے رزلٹ سے بڑی دلچسپی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے اب تو بہت فرق ہے۔ میرا خیال ہے اس پندرہ منٹ اور پٹیاں رکھی جائیں تو بہت ٹمپریچر نارمل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بدل دوں گی۔ آپ آرام کریں۔"

"بہت اچھا۔ تیمور تم چائے پی لو۔ کچھ کھاؤ گے؟" وہ اٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"نہیں۔" انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

زرمین کمرے سے باہر چلی گئی۔

"دیکھا آپ نے کیسے اس لیا؟" اس نے کپ دونوں ہاتھوں میں لیے تیمور علی خان کی پشت سے لگاتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

"پہلے وہ دوسروں کا کھاتا ہے۔" وہ بھی کچھ اور قدرے سختی سے بوجھل لہجے میں بولے۔

"بہت تکلیف ہوتی ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں، کم کم ہوتی ہیں۔" انہوں نے بے تاثر لہجے میں جواب دے کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

وہ یکدم خاموش ہو کر رہ گئی اور بستر کے قریب ہی قالین پر دوزانو بیٹھ گئی۔

"تم تھکی نہیں ہو؟" انہوں نے کھلتے ہوئے سبز دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ پھر ایک لمحے کو دیکھا۔

"نوکروں اور غلاموں سے مالک یہ سوال تو کبھی نہیں کرتے۔" اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

"ہوں۔۔۔ ہمارا خیال ہے حویلی میں اتنے غلام ہیں کہ کسی ایک پر سارا بوجھ نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں تم سب سے زیادہ وقت میں نظر آتی ہو۔ کبھی اس بیڈروم میں، کبھی اس بیڈروم میں۔ کبھی ڈرائنگ روم میں۔ کبھی ہال میں، کبھی باغ میں، کبھی سیڑھیوں پر، کبھی کچن کی طرف۔"

"وہ جی۔۔۔ جب کوئی بلاتا ہے تو جانا ہی ہوتا ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"سب تمہیں ہی آواز دیتے ہیں؟" تیمور علی خان نے الجھن سے دیکھا۔

"وہ۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ آپ تو بلاتے ہی بھاگتی ہیں۔" اس کے منہ سے بے ساختہ جملہ نکل گیا۔

"وہ تو اس لیے کہ ہم اتنے عرصے بعد حویلی آئے تو تم سے مڈبھیڑ ہوئی۔ بس اس لیے کوئی کام دھیان میں آتے ہی تمہارا خیال آ جاتا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر لاپرواہی سے جواب دے رہے تھے۔

"تم چاہو تو جا سکتی ہو۔ بخار خاصا کم ہے۔" چند منٹ کی خاموشی کے بعد وہ کپ اسے تھماتے ہوئے ڈھیلے انداز میں لیٹ گئے۔

"جی نہیں۔ ابھی کچھ دیر اور پٹیاں رکھوں۔ اللہ کرے بخار تیز ہو گیا تو بی بی جان مجھ پر بہت غصہ ہوں گی۔"

اس نے ٹھنڈے پانی میں پڑی ہوئی پٹیوں میں سے ایک نچوڑتے ہوئے جواب دیا اور کپڑے سے ان کی پیشانی پر تہ کر دی۔

"روشنی بہت محسوس ہو رہی ہے۔ ڈائریکٹ آنکھوں میں پڑ رہی ہے۔ اسے بند کر کے پچھلا لیمپ آن کر دو۔ اس طرح شاید ہم بھی سو جائیں۔ پلیز۔" ان کا انداز بلا کا مہذب اور دھیما تھا۔

مزاج طلب میں بھی کیسا جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ اور کم مرتبہ انسان تو یوں بھی معمولی سے حسن سلوک کو بہت محسوس کر سکتے ہیں۔

اس نے پہلے دونوں لیمپ روشن کیے پھر دونوں ٹیوب آف کر دیں۔ اور خود کو مشین کی طرح دوسری بتی بجھانے لگی۔ اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ جب وہ بتی رکھنے یا ہٹانے کیلئے جھکتی ہے تو اس کا گوٹے سے چمکتا آنچل اس کے پیر کو چھو جاتا ہے۔

معاً تیمور علی خان نے اپنی پیشانی سے خود اتار کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ لو..... ہمارا خیال ہے کہ اب ضرورت نہیں۔ اور تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ"۔

وہ ہکا بکا ان کی سمت دیکھنے لگی۔

"کک..... کوئی غلطی ہو گئی؟" اس کے حلق میں کانٹے اگنے لگے۔

"نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ سسٹم ہی غلط ہے"۔ وہ جیسے خود سے گویا ہوا۔

"جی!" وہ مزید حیران ہوئی۔

"تم سے نہیں کہہ رہے۔ جاؤ تم اور ہاں سنو"۔

وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"جی؟" دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کچھ۔

"آئندہ حویلی کے کسی لڑکے یا مرد کی طبیعت خراب ہو تو رات میں بے شک اپنی خدمات پیش کرنے سے انکار کر دینا۔ بھابی بیگم سے ہم بات کر لیں گے۔ مگر تم بھی نوٹ کر لو۔ اب جاؤ"۔

وہ حیران پریشان باہر نکل آئی۔ یہ کیا ہوا؟ یہ کیا تھی اس سے تو نہیں سمجھ رہی تھی۔

بس یہی سوچ آ رہی تھی کہ خواہ کچھ ہو مگر تیمور علی خان کو اس سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ شاید یہ برداشت نہ کر سکے۔

اس کی جگہ پر کوئی بھی ہوتی۔ چہ جائیکہ ایسی باشعور عورت ہوتی تو شادی خان کی بہ جائی پر شاد ہو جاتی۔

مگر وہ عقلتوں مرحلوں کی پرکھ پہچان سے بہت دور فقط لطف و سرور، خوشی و سرخوشی کے بجائے کچھ بچے کی طرح سوچتی تھی کہ بس کچھ بہت اچھا ہونا چاہیے۔ خوشی کا احساس مسلسل ہو۔ من چاہا کھانے کو ہو۔ اس سے کوئی غلطی نہ ہو۔ کوئی اونچی آواز میں نہ آ سکے۔

انسانوں کی پیشانی پر پڑے بل اسے جن بھوتوں سے زیادہ ہولاتے تھے۔ خان کے نرم انداز سے گرچہ اطمینان تو ہو گیا تھا مگر عجیب الجھن سی تھی۔ کہ آخر بڑی بیگم سے وہ "بات" کیا کریں گے؟

"بس اماں جی! ایسے تو بعد میں پتا چلا کہ مراد پان کی بیل کے پیچھے بل بنائے بیٹھا ہے۔ سارا ایک ادھ گیا سب کے دل میں۔

رات جدا رات بند و آخر الحقا ہی ہے۔ رات بھر آنگنائی میں آوازیں آتی تھیں۔ … الجھیں دورا میرے سنگ غسل خانے تک۔ اب آپ خود سوچو …

حیث دن بھر اور رات بھر ہول اور بھاگی"۔

خالہ آتے نے گھٹ گھٹ کر جملے کہتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"اسے اٹواٹ کسی کو سانپ نہیں؟" اماں جی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کا گیسے پھر سے سنا پایا۔ ادھ جس میں بیٹھے ہوتے سے شور کرتے تھے۔ سامنے نظر آ گیا … گیا۔ بولو ٹھے پھرے … مری خالہ (گونے) کو رستے آئی ہوئی تھیں۔ دوسری مرتبہ انہوں نے دیکھا۔ بچے کا شوق تھا … خانے میں وہ نہانے جاتی تھیں آدھی رات کو۔ پانی کے پیچھے آتے تھے … جاگ گیا۔ آفت آن پڑی۔ سامنے چھوں سے بچے کھٹ چور گھس گیا ہے۔ ڈانٹے لگیں میں دوڑتے پھرے۔ اور گھر کے مرد لاٹھے ہوتے نے آنگنائی میں بھاگے پھرے۔ کمبخت پھر کا گیا"۔

اماں جی..... دو پتاسہ پر رکھ کر خوب ہنسیں۔

"تو پھر..... سو آئے..... خوب سنائی تو تے۔" ان کا بھاری بھرکم وجود ہنس ہنس کر ہل رہا تھا۔

"اچھا تو پھر مارا پکڑا کس نے؟"

"خالو نے مارا ہو گا"۔ پروین نے اندر داخل ہو کر چھیڑا۔

"نہیں بی بی جان! سانپ مجھ سے بڑا ڈرتی ہوں۔ بھلے پہاڑ میں سوراخ کروا لو مجھ سے۔ اگر چاہو کر لو۔ کھلے دشمن سے نپٹ سکتی ہوں۔ کمبخت سانپ مجھ تو بے خبری میں ڈسے ہیں۔ اسے گاؤں میں مری پھوپھی کو دیکھ جنور (جانور) پیچھے آیا ہوا تھا۔ ایک رات وہاں رہ وہاں ٹھہرا۔ جو سانپ سانپ کا شور سنا تو صبح ہی سے لگ گیا۔ لوٹا پان کی بیل کے پیچھے بل بنایا ہوا تھا۔ اس نے ہی کوئی ترکیب کی۔ موذی بل سے نکلنے لگا۔ وہیں سر کچل دیا۔ تو بچوں کی نیندیں پوری ہو گئیں پھر۔"

"اب جو رات بچھوے خان کا"۔

"توبہ خالہ..... کچھ نہیں رکتا پیٹ میں"۔ پروین نے ایک دہوکا کا۔

"ہاں بس تم لوگ مجھ سے ہر بات چھپایا کرو۔ پتا چل گیا ہے مجھے صبح ہی سے … کیا رات کیا ہوا تھا۔

میں تو پو بھی نکل گئی تھی۔ مجھ سے پوچھتے تو تیمور خان کی طبیعت کیسی ہے؟ میں حیران کہ کیا پوچھ رہی ہے۔ رات کو پھر اچھے بھلے کھیلا تھا۔

"میں نے کہا کیا ہوا دشمنوں کو؟"

"کا ہے کا ہوا ہے پھر چوہدرائن ہی دشمن تو موج میں ہے تیمور خان کو رات سانپ نے ڈس لیا تھا۔"

اسے میں تو کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"احمق"۔ پروین نے دانت کچکچائے۔

"بھری حالت دیکھ کر بولا رات ڈاکٹر نے زہر نکال دیا تھا مگر اس کو بخار چڑھ گیا تھا۔ پر شکیں کیا کرو تم لوگ۔ اگر میرا …

دل بند ہو جاتا؟ جب وہ واپس آ گیا تھا۔ تب تو بتا دیتیں۔ تمہارے بابا صاحب بھی رات بھر میری طرف نہیں آئے۔ ... میرے بچے کی جان پر بنی ہوئی تھی اور میں بے خبر سوتی رہی تھی۔"

"اسی لئے نہیں بتایا تھا امی جی کہ آپ کی اپنی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔" زرتین نے قدرے تحمل اور ادب سے کہا۔

"تو پورے انتظام کر لیں۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"اب ہمیں کیا پتا تھا کہ صبح کو چوکیدار سے صاحب سلامت ہو جائے گی۔ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ صبح کو آرام سے آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔" زرتین نے کہا۔

"کمرے میں گئی تھی۔ بے خبر سو رہا ہے۔ سو کر اٹھے تو ہاتھ چھو کر کے صدقہ کروں۔ اللہ نے میرے حال پہ احسان کیا۔ مر گئی تھی ورنہ میں تو جیتے جی۔"

"اللہ نہ کرے اماں جی آپ کے دم سے تو حویلی میں رونق ہے برکت ہے۔" خالہ سوراں نے لقمہ دیا۔

"اماں جی! دلہن سلام کرنے آ رہی ہیں آپ کو۔" ماما نے اندر آ کر اطلاع دی۔

"ہاں ہاں لے آؤ۔ اللہ بھاگ جگائے رکھے۔"

"یہ زعفران بانو کی کیا عقل گم ہو گئی ہے۔ صبح کے دس بجے تو میرے کمرے میں ہوتے ہیں اس کے۔" اچانک اماں جی کو دھیان آیا۔

"سونے دیں آپ اسے رات بھر جاگی ہے اور ہاں ہم نے اس کا نام بدل دیا ہے۔ مطرب کہا کریں اسے حویلی کی ہے اماں جی۔ نوکرانی بھی خوبصورت نام بھی خوبصورت۔"

"یہ کیا نام ہوا بھلا؟" اماں جی سادگی سے زرتین کو دیکھنے لگیں۔

"بہت اچھا نام ہے۔ محبت اور خوشی کے گیت گانے والی۔" زرتین نے تشریح کی۔

"یہ نام تو بچے گانے والیوں پر جچتا ہے۔" اماں جی نے بچے کی بات کی۔

"یہ بھی بہت اچھا گاتی ہے' رات ہم نے اس سے گانے بھی سنے تھے۔ کیا غضب کی آواز ہے۔" وہ ہنسیں۔

"مگر وہ پیشہ ور تو نہیں ہے ناں؟ کیسی سوراں آئے؟" اماں جی نے کہا۔

"جی۔ جی۔" خالہ سوراں نے جلدی سے بولیں۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

"بہت تیز بخار تھا اماں جی تیمور کو۔ گویا ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں پڑ گئے تھے۔" زرتین نے موضوع بدلنے میں عافیت جانی۔

"ارے نظر لگ گئی ہوگی میرے بچے کو نگوڑی بھی تو منہ بھر کر بولی تھی کہ بڑی اچھی اٹھان ہے تیمور خاں کی۔ لوگوں کو تو نہیں ماشاءاللہ کہنا کیوں یاد نہیں رہتا۔ میرے بچے مٹھن اوڑھ کر سامنے آتے ہیں مارے ڈر کے میں نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتی کہ کہیں میری اپنی نظر نہ لگ جائے۔

"کل مجھے کتنا تنگ کر رہا تھا کہ تائی اماں جی کہا نگا رہا ہوں۔ مجھے مہمانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ دھیان ہی نہ دیا کہ

پھر جا کر بھوک دور۔ جب کچھ ہوتا ہے تو یونہی مت ماری جاتی ہے۔"

"اپنے بابا صاحب کو کہلوا کر دو بکرے صحت مند سے اندر حویلی میں بھجوا دیں۔ صدقہ اتاروں گی فرصت میں۔"

اسی دم نازنین زرد جھلملاتے لباس میں ماما کے ساتھ سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔"

"ارے میری پیاری بھابی۔" زرتین نے بڑی خوشی کے جذبے سے لپک کر اسے گلے سے لگایا۔ اور تھام کر اماں جی کے قریب لائی۔ اماں جی نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

"خوش رہو۔"

نازنین ساس کے پہلو میں ہی بیٹھ گئی۔

"کل تو تم بہت تھک گئی ہو گی۔"

"تم نے بھی حد کر دی تھی زرتین! گھنٹوں لگا دیئے دلہن تیار کرنے میں۔ مہمان پوچھ پوچھ کر تھک گئے۔ جان حلق میں آ گئی میری۔ کیا ارادے سے بیٹھی تھیں؟"

زرتین اور خالہ سوراں تو ہنس ہنس کر بری ہونے لگیں۔ نازنین بھی مسکرا دی۔

"ارے میری بھولی اماں جی!" زرتین نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے شانے سے سر ٹکا دیا۔

"دلہن دلہن ہوتی ہے اماں جی۔ سر سے پاؤں تک سجانا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں بی بی جان۔" خالہ سوراں نے لقمہ دیا۔

"تو چپ کر سوراں تو کوئی دین ایمان نہیں تیرا بھی ادھر کی ادھر۔ میری بہو کو تو اللہ نے چاند کر بھیجا ہے۔"

اماں جی نے شفقت سے نازنین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اسی دم زعفران بانو افتاں و خیزاں اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔" وہ اماں جی دیر سے سوئی تھی ناں تو صبح آنکھ نہیں کھلی۔"

"کوئی بات نہیں بتا دیا تھا زرتین نے۔ اور سو جا تو سوچا جا کر کام ہوتے رہتے ہیں۔ جو میرے بچے یہاں کو ٹھکری۔ اللہ انہیں سکھی رکھے۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔ بچے ہیں مجھے تو کام چور نہیں ہے۔"

"دیکھ تیمور جاگ رہے ہیں یا نہیں؟" زرتین نے اسے باہر جاتے دیکھ کر کہا۔

"میں بھی چلوں اماں جی ..... ماما تاریخ کہتی تک (گندم ڈھکی ہے پیچھے تو" خالہ سوراں نے بھی اپنا پاندان بند کر کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔

زعفران بانو اوپر جانے کیلئے زینے کی طرف بڑھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایک لڑکا نازنین کو صدقہ کے اوپر جا رہا تھا۔ ... اور بے تکلف انداز میں وہ اسے مطرب کہہ رہی تھی۔

"ارے۔ کون ہو تم۔ اوپر کس سے پوچھ کر جا رہے ہو"۔ اس نے اپنی دانست میں بڑی ذمے داری کا مظاہرہ کیا۔ ابھی تک وہ ویسے کی تیاری میں تھی۔ سوچ ہی نہیں ملا تھا کہ لباس تبدیل کر لیتی۔

"آپ یہاں لیڈی پولیس لگ گئی ہیں؟" لڑکے نے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"تم کس سے پوچھ کر آئے ہو اندر؟" وہ سختی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہم پوچھ کر نہیں آتے۔ اپنی مرضی کے مالک ہیں"۔ شان بے نیازی سے جواب آیا۔

"حویلی میں بہت مرد نوکر ہیں مگر ہر کوئی اندر نہیں آ سکتا۔ تمہیں تو پہلی دفعہ دیکھ رہی ہوں۔ کیسے جانے دوں اوپر؟" وہ ڈٹ گئی تھی۔

"آپ کو محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلا جاؤں گا اوپر"۔ وہ مسکراہٹ دبا کر مزید ایک قدم آگے بڑھا۔

"سچ بتاؤ کون ہو تم۔ ورنہ شور مچا کر بلا لوں گی سب کو"۔ اسے تو وہ ایک دم مشکوک لگنے لگا۔

"بلا لو۔ میں بھی دیکھوں شور مچاتے ہوئے کیسی لگو گی۔ ویسے تو خیر اچھی ہو"۔ شرارت لڑکے کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

اتنا بے لگام وہ بھی پہلی دفعہ میں وہ غصے اور حیرت سے گھور کر دیکھنے لگی۔

"ارے ــــ عارف ــــ آ گئے تم؟" جانے کس طرف سے زبیدہ بیگم نکل آئی تھیں۔

"ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے۔ مگر پہنچ تو چلا کوٹھے کی مرمت ہو رہی ہے۔ بس ادھر ہی ہیں۔ یہ "بچی" کون ہے مجھے اوپر جانے نہیں دے رہی؟" اس نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"کیوں تم کیا اپنی سرپرستی میں لینا چاہتے ہو؟ پسند آ رہی ہے یہ تمہیں؟" زبیدہ بیگم مسکراہٹ چھپا کر پوچھنے لگیں۔

"اچھا ــــ وہ ــــ میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ حرکتیں تو بچوں والی تھیں میری قمیص پیچھے سے پکڑ لی اور کہنے لگی نہیں نہیں"

"کیا نہیں نہیں؟" زبیدہ بیگم نے تعجب سے پہلے مطربہ اور پھر عارف کو دیکھا۔

"مطلب یہ کہ مجھے اوپر جانے سے منع کر رہی ہیں"۔

"مگر کیوں؟" زبیدہ بیگم نے گھورا۔

مطربہ ڈر گئی۔ "وہ جی مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہیں؟" احساس توہین سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"عارف!" زبیدہ بیگم جاتے جاتے پلٹیں۔

"اوپر سے اپنی اماں کو بھیجنا۔ میں اماں جی کے کمرے میں ہوں"۔ وہ دوبارہ چل پڑیں۔

"جی..... اب فرمائیے اجازت ہے۔ اوپر جا سکتا ہوں؟" وہ ایک زینہ طے کر کے آگے بڑھا۔

اس نے رخ موڑ کر اپنی آنکھوں میں آتے ہوئے چند قطرے انگلیوں کی پوروں سے صاف کیے۔

"آپ رو رہی ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات تو ہوئی نہیں ہے جس سے آپ کی توہین ہوئی ہو یا دکھ پہنچا ہو۔ مگر نہیں۔ بعض انسان ایسے مغرور ہوتے ہیں کہ انہیں ہر دوسری بات اپنی توہین محسوس ہوتی ہے۔ [illegible]"

وہ تیزی سے زینے طے کر گیا۔ وہ حیران پریشان سے انداز میں اوپر ایک موڑ پر اسے غائب ہوتا دیکھ رہی تھی۔

"مطربہ تیمور کا کمرہ اتنا گندہ ہوتا ہے کہ رات کو وہ کہہ رہا تھا۔ میرا بستر باغ میں ڈال دیں وہاں کم از کم گندگی کا احساس تو نہیں ہوگا۔ وہ دن کو میرا اچھا آیا ہے۔ اتنی فالتو چیزیں دل میں لے کر جائے گا۔ دل کرے گا بھلا وہ دوبارہ آئے گا۔"

"اماں جی میں نے پرسوں ہی تو بستر کی چادریں بدلی تھیں۔" اس کا گلہ بھی حلق سے رہ گیا۔

"وہ خواہ مخواہ تو بات کرتا نہیں۔ جا سب سے پہلے اس کا کمرہ اور غسل خانہ چمکا کر۔ پھر کوئی دوسرا کام کرنا۔"

انہوں نے حکم دیا اور پھر اپنی وارڈروب میں جانے کیا تلاش کرنے لگیں۔

وہ ڈرتی ڈرتی اوپر آئی اور آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

"ہوں۔ اجازت آگئی۔"

وہ اندر داخل ہو گئی۔ "السلام علیکم" اس نے دن کا پہلا سلام کیا۔

"ہوں۔ وعلیکم السلام۔" وہ ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھے بڑی تیزی سے کچھ لکھ رہے تھے۔

"کیسے آئی ہو؟" انداز ہنوز مصروف تھا۔

"وہ جی..... صفائی کرنا ہے۔ اماں جی نے کہا ہے۔" وہ ڈرے ڈرے انداز میں گویا ہوئی۔

"خاک صفائی کرتی ہو۔ جس چیز پر ہاتھ رکھو دھول مٹی۔" وہ چڑ کر بولے۔

"جاؤ پہلے باتھ روم کی ٹیپس صاف کرو۔ اگر ٹائل ہے تو باتھ روم کی دیواریں اور فرش اچھی طرح دھو۔ ایک ایک چیز اس طرح چمکنی چاہیے جیسے نئی ہو۔" انہوں نے حکم صادر کیا۔

"اوہ وہ جی..... ٹیپس کیا ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ٹونٹی بھئی۔ کچھ پتہ نہیں۔ بالکل گنوار ہو۔" وہ جھلائے۔

وہ جلدی سے باہر کی طرف بھاگی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" انہوں نے تعجب سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ جی..... ٹائل لینے جا رہی ہوں ماما سے۔" وہ ڈر کر رونے کو ہو گئی۔

"ہوں" وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹائل کا ڈبہ لے کر واپس آ گئی تھی۔ پائپ کھینچ جائے..... وہ پڑھ کر..... وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

اتنی ساری تو ٹونٹیاں تھیں..... وہ کھول کر الجھ گئی۔ شاور بند کرنا مشکل ہو گیا۔ ایک بند کرتی تو کبھی دوسری۔ بری طرح بھیگ گئی وہ تو پہلے ہی جانتے تھے۔ وہ نکال کر باہر آ گئی۔

"خان..... وہ شاور بند نہیں ہو رہا۔ اوپر والا بند کرتی ہوں تو نیچے والی ٹونٹی میں پانی آنے لگتا ہے۔ وہ بند کرتی ہوں تو وہ کھل جاتا ہے۔" وہ روہانسے انداز میں گویا ہوئی۔

"کیا..... وہ کیا؟" وہ جھلائے۔

"شاور جی۔ بڑی تیزی کا پانی آ رہا ہے۔" وہ بولی۔

وہ بیزار کن انداز میں اٹھ کر باتھ روم میں آئے۔ وہ ایک دم سائیڈ میں ہو گئی۔

تیمور اندر داخل ہوئے شاور کھلا ہوا تھا وہ گھستے ہی بھیگ گئے۔ وہ بری طرح آف ہو گیا۔ "نہیں نہیں۔ مگر میں کوئی احمق کالا کوئی نہیں ہے۔" انہوں نے شاور بند کیا اور بڑبڑاتے ہوئے باہر آئے۔

"اب کسی ٹیپ کو کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام کے لیے پانی چاہیے تو صرف نیچے والا ٹیپ کھولو۔ کسی اور ٹیپ کو کھولنے کی ضرورت نہیں۔

میرے کمرے میں کام کے لیے آیا کرو تو ضروری معلومات لے کر آیا کرو۔ میرا دماغ فالتو نہیں ہے کہ تمہیں ہر اس کو کوچ بھی کروں یا انہیں ٹریننگ دوں۔ ایڈیٹ آف دی فرام ہیر..... وہ جھلا کر پانی سر سے جھاڑتے ہوئے بولے۔

سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا سوائے اس کے کہ وہ ڈانٹ رہا ہے اور اسے کام شروع کر دینا چاہیے۔ وہ اندر گھس کر بری طرح جت گئی۔ اس قدر جانفشانی کا مظاہرہ کیا کہ باتھ روم کی ٹائلوں سے آئینہ بن جھلکنے لگا اور دیوار پر لگا سا آئینہ روشنی میں جگمگ کرنے لگا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑا کر اطمینان کیا اور باہر آ گئی۔

"خان" وہ ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوئی۔

"پھر کھل گیا؟" وہ جیسے برس پڑے۔

"نہیں..... وہ آپ دیکھ لیں۔" اس نے چند سانس بمشکل آزاد کیے۔

"کیا دیکھوں؟" وہ چیئر پر گھوم گئے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔

بھیگے ہوئے کپڑوں میں خوفزدہ سی حالت میں وہ جانے کیا محسوس ہوئی۔ پیشانی پر بھیگی ہوئی لٹیں چپکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں یوں جھکی ہوئی تھیں۔ گویا کوئی منوں بوجھ ہو کہ پلکیں اٹھانا محال ہو۔

ایک جادو سا سر چڑھ کر بولنے لگا۔

دلکشی جوانی کا لباس ہے۔ جوانی حسن سے بوجھل ہو تو دلکشی کا معاملہ صنف نازک سے زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔

انہوں نے چیئر واپس گھما لی۔ "ٹھیک ہی ہو گا۔ میرا ایسا کچھ نہیں کہ صفائیاں اپنی نگرانی میں کراؤں۔ ماما سے چیک کرا لینا۔ پھر اب اپنا باقی کام کرو۔" ان کے لہجے میں پھر حیرت سے مارے جانے والی رسائیت اتر آئی۔ اب وہ کمرے میں مصروف ہو گئی تھی۔

تیمور علی خان نے لکھنا بند کر دیا تھا اور ریوالونگ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

وہ تو ہے دم کے ساتھ عاشقی ہے چار دن کی بات
میں بھی آتا ہوں چار دن میں لوٹ کر یارو

مہدی حسن کی آواز میں کوئی غزل چھڑی ہوئی تھی۔

اس نے جانے کیوں پلٹ کر تیمور کی طرف دیکھا تھا۔

اسے یوں محسوس ہوا کچھ کمی ہے۔ اور یہ کمی پوری نہ ہونے کے اندیشے بھی پورے تھے۔

کسی قرب، کسی تعلق میں یہ خیال ابھرتا ہے جیسے رات کوئی شجر ہو جو روشنی اور ہوا پانی کا محتاج ہو۔ مگر سورج بادلوں سے ڈھکا ہوا ہو۔ جو برسنے والے نہ ہوں۔ جیسے ایسا ہو کہ دور تک ہوا کا امکان نہ ہو۔

کتنی سخت اور مشروط ہو جاتی ہے ایسے موسم میں شجر کی زندگی۔ سرسبز کیسے نظر آئے؟

ہریالی کہاں سے اوڑھے؟

اس کے ساکت ہونے سے ایک محسوس ہونے والا جمود کمرے میں طاری ہو گیا تھا۔ چوڑیوں کی چھن چھن خاموش تھی۔ کچھ دیر قبل کمرے میں زندگی متحرک تھی۔ سناٹا نہایت قابل ذکر اور قابل غور تھا۔

تیمور چہرہ پر بے ساختہ گھوم گئے تھے۔ وہ ان کے چمکتے ہوئے بالوں پر نظریں جمائے مستقل کا گمان ہاتھوں میں لئے جانے کون سے جہان میں گم تھی۔ اتنی گم اور بے خبر کہ اسے خان کے چہرہ گھمانے کا احساس بھی نہ ہوا۔

خان کے تمام لطیف احساسات متاثر ہو گئے۔ انہوں نے آہستگی سے چہرہ مجمل کی طرف موڑ لیا۔

وہ کسی سمت دیکھ نہیں رہی تھی۔

اس کا نقطہ دور کہیں بلندیوں میں روشن تھا۔ یوں جیسے کوئی جسم مرقد میں ہو اور روح کہیں ماورائی جہانوں میں سیر کر رہی ہو۔

ان کے رویئے میں البتہ ایک فطری اشتیاق جاگا۔

وہ کیا سوچ رہی ہے۔

وہ کون سا خیال ہے جس کی وجہ سے روح اور جسم کا رابطہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا ہے۔ انہوں نے ریسٹ واچ ٹیبل سے اٹھا کر کلائی میں ڈالنے کی کوشش کی۔ ان کا دھیان کیونکہ بٹا ہوا تھا اس لئے ریسٹ واچ ہاتھوں سے چھوٹ کر مجمل پر جا گری۔

ایک کھٹک کی آواز پیدا ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی چوڑیاں بج گئیں۔

حالانکہ ریڈیو بھی آواز میں بج رہا تھا مگر ایک خاموشی کا احساس چہرہ پر قفل کی طرح تھا۔

"خان یہ کتابیں ٹھیک سے رکھ دوں"۔ اس نے بستر پر پڑی کتابوں کی بابت پوچھا۔

"نہیں انہیں اسی طرح رہنے دو"۔ انہوں نے قلم بند کر کے جیب میں اٹکاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

"پھر چادر کیسے جھاڑوں"۔ اس نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔

"مت جھاڑو صاف ہی ہے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں صاف کرنے کے لئے۔ کرنے کے انداز ذرا دھیان دو"۔ وہ بولے۔

"کمرے میں اور دو سے کپڑا نہیں مار سکتی۔"

"کیوں؟" سوال فطری تھا۔

"آپ جو بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ صاف کرنے میں دھول اڑے گی اور آپ پریشان ہوں گے۔"

"اوہ۔ ہم شہر جا رہے ہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرنا۔"

وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شہر جا رہے ہیں۔ پھر کب آئیں گے؟" اس کا انداز بالکل بے ساختہ تھا۔

تیمور علی خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

آنے جانے کا حساب رکھنے والے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان کا منصب اور قرینے بھی خاص ہوتے ہیں۔

تعلق کی کتاب میں ان کا ذکر بھی خاص صفحات میں درج ہوتا ہے۔

یہ کہاں سے آئی۔ ایک ناقابل ذکر طبقے کی بے وقعت سی لڑکی۔ وہ گوری کا نشہ چڑھی پر شکن سی پیشانی کے ساتھ اس کی سمت متوجہ ہوئے۔ بر بنائے کرم وہ اللہ کے کیسے کام مراعات یافتہ تھی۔ مروت و رعایت کی ایڑی سے چوٹی تک عمر گئی ہوئی تھی۔

کس قدر بااعتماد تھی یہ بے حیثیت سی لڑکی۔ کروفر سے گویا ہوئے۔

"دیکھو لڑکی! کیا نام ہے تمہارا۔ کیونکہ تم ان پڑھ ہو اور کافی گنوار بھی اس لئے تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ کس سے کس طرح کے سوالات جائز ہوتے ہیں اور کس طرح کے ناجائز۔ تم فالتو وقت میں ماما جی سے سیکھنے کی کوشش کیا کرو۔ تم صبح اٹھ کر اپنے آپ سے اتنا ضرور کہا کرو کہ تم اس حویلی کی کنیز ہو۔ ملازم ہو۔ جنہیں صرف اپنے کام سے غرض ہوتی ہے۔ جو اپنے مالکوں سے اپنے طور کبھی بات نہیں کرتے صرف مالکوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ دوسری صورت میں خاموش رہتے ہیں۔

ہمیں اماں جی کے ساتھ بھی تمہارا بے احتیاط انداز پسند نہیں ہے۔ وہ بہت سیدھی سادی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم سر پر چڑھ جاؤ۔ وہ تمہاری کفیل نہیں ہیں مالکن ہیں۔ ہم اپنی باتیں بار بار نہیں دہراتے۔ ہمیشہ کیلئے یاد کر لو۔"

وہ سانس روکے کھڑی بغور سن رہی تھی۔ کیسی بے رحم گھڑیاں تھیں۔ خوبصورت حریری پردے جو تصور میں لہرایا کرتے تھے۔ ہر جملہ شعلہ بن کر پردوں سے لپٹ رہا تھا۔

خاکستری کا عجب تماشا تھا۔

شاید دکھ کے بھی اوقات ہیں۔ کم مائیگی کا احساس گراں کم حوصلہ انسان کا قبلہ بدل دیتا ہے۔

کوئی بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔

تیمور علی خان باہر نکل گئے۔

اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ پھر سانس کھینچا، اور فرنیچر پر کپڑا مارنے لگی۔ کوئی احساس تھا کہ جسمانی قوت ایک دم زائل ہو گئی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی۔ اسے رونا آتا ہی بہت کم تھا۔ جب کبھی روتی تھی تو وجہ بھی معلوم تھی۔

لیکن اس وقت ایک تواتر سے اشک رخساروں پر بہہ رہے تھے اور اسے احساس بھی نہیں تھا۔ دل دکھ کے درخت کی شاخ میں جا اٹکا تھا۔

درخت بھی وہ جس کی شاخیں آسمان چھوتی تھیں۔

"اماں جی! اتوار کی اتوار ڈھنگی جاتے تھے سارے محلے کی عورتیں۔ بیٹھک بھر جاتا تھا۔ ایک دن بڑی سڑک پہ ٹانگہ گر گیا۔ سب سے زیادہ بلو کی اماں کو چوٹیں آئیں۔ پنڈلی کی ہڈی کھسک گئی۔ چھ مہینے بستر پر پڑی رہی بے چاری۔ محلے سے چھپ کر جاتی تھی اس سے الگ پٹی تھی۔۔۔"

خالہ سوال آنے نہایت تیزی اور مہارت سے لفافوں میں ڈورے ڈال رہی تھی۔ اماں جی بن کر آنے والے تکیوں کے منہ بند کر رہی تھیں۔

"ارے آگ لگے ایسے شوق کو، کہ انسان ہلکان ہو جائے، اب یہاں گھر ہی میں دیکھ لو۔ بیٹھک کی رات کیسی آفت کی جاتی ہے کہ قسم آ رہی ہے۔ نوکر باغ میں تیل روشن رکھ رہے ہیں۔ یہ تمام لڑکیاں اسے جلدی جلدی کام نمٹا رہی ہیں کہ گاڑی چھوٹی جا رہی ہو۔"

میں نہیں بھاگی کبھی ان چیزوں کے پیچھے۔ تمہارے بڑے خان کہتے بھی تھے تو مجھے حیا آ جاتی تھی۔"

ان کا چہرہ گلگوں ہو گیا۔

"اپنے مرد کے ساتھ بھی اماں جی؟" خالہ نے ایک ذرا رک کر لطیف سی شرارت کی۔

"ہاں بھئی۔ حیا تو مجھے آج بھی آتی ہے ان سے۔ اب بھی کبھی مجھے اپنے کمرے میں بلواتے ہیں تو قدم من من کے ہو جاتے ہیں۔ اور فلموں میں تو ایسے منہ پھاڑ کر بولتے ہیں کہ ڈوب مرنے کو جی چاہے۔ جب گھر میں یہ آیا تھا ٹی وی تو تمہارے خان پر خفا ہوئی تھی کہ لڑکیوں پر برا اثر نہ ہو۔ وہ باتیں جو ہم بیاہی عورتیں نہ کر سکیں۔ فلموں میں بن بیاہی لڑکیاں ناز کرتی ہیں۔ بھئی مجھے تو بڑی حیا آتی ہے۔"

"خان تنگ نہیں پڑے اماں جی! آپ کی اس طبیعت سے۔" خالہ شریر ہوئیں۔

بڑی بے لگام ہے تو سوال آنے اور وہ تو خود اتنے مصروف آدمی ہیں۔ بھول جاتے تھے کہ گھر بار بھی ہے۔ ہمارے خاندان کی ساری عورتیں ہی ایسی تھیں۔ کوئی میں اکیلی ایسی تو نہیں تھی۔ جو انہیں کوئی تعجب ہوتا۔"

"آپ تو بہت ہی سیدھی ہیں۔ آپ کی تو بارہ پشتوں میں محبت کی شادی نہیں ہوئی ہوگی۔" خالہ ہنسیں۔

"بھول ہی جاؤ تو۔" اماں جی بری طرح ہنس پڑیں۔ "ہمارے ہاں تو پانچ ہی میں رشتے ہو جاتے تھے۔ باپ اس کے … اٹھی جانے۔ اس میں ہو جاتی ہوگی یہ سمرا والی … اپنے تو مجھ میں ہی نہیں آیا یہ چکر۔"

ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"آپ کو نہیں ہے بڑے خان سے محبت؟" خالہ نے چھیڑ خانی کی۔

اماں جی کے چہرے پر قوس قزح بکھرنے لگی۔

"شرم کرو سوال آنے، اپنی اور میری عمر دیکھو۔ اس عمر میں مجھ سے ٹھٹھول کرتی ہے؟"

"تو محبت کا کوئی ... نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مرد سے محبت کرنے میں تو بڑا ثواب ہے۔" خالہ اداس ہو گئیں۔

"ایک عورت عمر بھر کسی کا گھر سنبھالے بیٹھی تو سب کیا ہے۔ یہی اس کے دل کا بھید ہے۔ ہم تو بڑے ہیں تیری حس"

پر اماں کے چہرے پہ روشنی سی بکھر گئی۔ خالہ ان کی ساری پرسش کرتی گئیں۔

"السلام علیکم۔ خیر سے آج ہے خالہ؟ کیسی اتنا ہنس رہی ہیں" آتشی گلابی جوڑا پہنے نازمین اندر داخل ہوئی۔

"خوش رہو۔ بھولو بھلو۔ اس کی تو عادت ہے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کی۔ خود ہی ہنس ہنس کر دوہری ہوتی ہے۔" اماں جی مسکرائیں۔

پیچھے پھوپھی نازمین اماں جی کے نزدیک یہ اوٹ پٹانگ باتیں ہیں جن کے دم سے زندگی میں دم ہے۔ میں تو کہہ رہی تھی ..."

"چپ کر سوال آنے، ابھیوں کے سامنے کیسی باتیں کرتی ہے۔" اماں جی نے گھبرا کر خالہ کو ٹوکا۔

خالہ کی بھرپور ہنسی چھوٹ گئی۔

"اماں۔ جی۔ میں وہ والی بات تھوڑا ہی کر رہی تھی۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ..."

"میں کہہ رہی ہوں نا چپ ہو جا۔ بیٹھ وہ والی نہ یہ والی۔ اور نازمین تم سناؤ ٹھیک تو ہو ناں۔ جی تو نہیں گھبرا رہا تمہارا یہاں۔ خیر تمہارے ماں باپ تم سے دور نہیں جب جب چاہے ہوائی جہاز میں بیٹھو اور دل آ جائے تو دو گھنٹے میں ادھر سے ادھر کر رہتے ہے۔" انہوں نے مسکرا کر گویا تسلی دی۔

"نہیں اماں جی! میرا دل نہیں گھبراتا۔" ماشاء اللہ سے لوگ ہیں کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ رات بھی ایک بج گیا تو ہم سب ہال میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تو ماما نے آ کر بتایا تو پتہ چلا۔"

نازمین نے اپنی شفیق سی ساس کو جواباً تسلی دینا ضروری خیال کیا۔

"پر کل شام سے تو نازمین دکھائی نہیں دی۔ رات میں اس کی طرف گئی تو ماما نے بتایا کہ سو رہی ہے۔"

"جی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کل ہمارے پاس بھی نہیں آئی رات کو۔" نازمین نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

اماں جی خاموش ہو کر رہ گئیں۔ پھر توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

"ناز۔۔۔ دیکھو بیٹی! اب تم اس حویلی کی ایک فرد ہو۔ مجھے اس لڑکی کی طرف سے بہت پریشانی ہے۔"

"کیوں۔ کیا ہوا؟" وہ چونک سی گئی۔ "اتنی خوش اطوار اور خوش شکل سی تزئین۔ بھلا اسے کیا ہوا۔"

"اس کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ شاید بادو نے تمہیں بتایا ہو۔ شادی کے ایک سال بعد ہی طلاق لے لی تھی اس نے۔ بیٹی

بی یہ تو اللہ کو ہی معلوم ہے۔ مگر مجھے یہ لگتا ہے۔ اسے پڑھائی کا دماغ ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ وہ پڑھی ہے۔ اپنی اور

ہے۔ مرد عورت کو بیوی بنا کر لاتا ہے استانی تھوڑا ہی۔ وہ ذرا اس سے کم پڑھا ہوا تھا۔ مگر تھا تو اپنا ہی۔ بہت بڑی امیدیں

ہے ان کی۔ خیر اب اس کا ذکر کیا۔ جو رشتہ آیا ہوا ہے۔ یہ بھی ہمارے دور پرے کے عزیز ہوتے ہیں۔ بیوی مر گئی ہے

۔ پڑھے ہوئے بھی بہت ہیں۔ تمہارے بابا صاحب بتا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ شمیم نام ہے۔ بہت ہی

تمہارے بابا صاحب۔ کراچی میں اوزار بنانے والی فیکٹری ہے۔ اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ سب کچھ ہے اللہ کا دیا ہوا۔"

"تزئین کیا کہتی ہے؟" نازنین نے اماں جی کے خاموش ہوتے ہی فوراً سوال کیا۔

"ہاں نہیں رہی۔ کہتی ہے کہ میں تو اس کی بچی کی ماں بن جاؤں گی مگر کیا وہ میرے بیٹے کو باپ کا پیار دے سکے گا۔ گر کچھ ہوا تو کیا میرا بیٹا مجھے معاف کرے گا؟ اب یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کیے ہیں۔ سنا ہے آدمی اور گھر کی پہچان بہت مشکل ہے۔ مگر زندگی بہت سے تجربوں کے سامنے میں آگے بڑھتی ہے۔ بہت بھلا مانس ہے۔ دور قریب کے سب ہی لوگ اچھا کہتے ہیں۔ پڑھا لکھا ہے۔ صورت شکل اچھی ہے۔ اب تم لوگ اسے اس طرح سمجھاؤ کہ وہ خوشی سے راضی ہو جائے۔ تعلیم میں بھی ہزار خوبیاں ہیں۔ اگلی عورت مر گئی ہے دنیا کی اونچ نیچ بھی ساتھ ہیں۔ اسے تو بیوی کہیں بھی مل جائے گی۔ لیکن اسے طلاق ہوئی ہے۔ اسے آگے مشکل پڑ جائے گی۔"

ان کی آواز بھرا گئی۔

"آپ فکر نہ کریں اماں جی۔ ہم سب تزئین کی بہتری کے لئے جو کچھ ممکن ہو سکا کریں گے۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" نازنین نے اپنے پن سے لہجے میں ساس کو تسلی دی۔

"یہ اطہر، مطہر، پر نظر پڑی تمہاری سو گئے؟" اماں جی نے خالہ کو پانی کا گلاس اور جگ لئے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو فوراً پوچھا۔

"ہو گی یہیں کہیں کسی کام دھندے میں۔ بلاؤں کیا؟"

"تیمور کے کمرے کی صفائی کرنے گئی تھی۔ بہت دیر ہو چکی۔ تم رو بادو بی کو اور اسے ساتھ لگا لو۔ یہ تین رضائیاں تو آج ہی نکال لو۔ اندر ہو جائیں گی ورنہ پھیلاوا کل تک رہے گا۔"

"اے لو..... وہ آ ہی گئی۔" خالہ نے مطہر کو اندر داخل ہوتے ہوئے پہلے دیکھا۔

اس نے نازنین کو دیکھ کر سلام کیا اور بڑی سنجیدگی سے اماں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اماں جی۔ تیمور خان کا کمرہ تو صاف کر دیا ہے۔ آپ ماما سے چیک کروالیں۔"

"ہیں؟" اماں جی نے تعجب سے اس کی شکل دیکھی۔

"صاف کر دیا اچھا کیا۔ اب یہ چیکنگ کیوں کوئی کلکٹر ڈپٹی کلکٹر آ رہے ہیں انعام بانٹنے۔" وہ اس کی انتہا پر ...

پیچھے بھاگ گئی۔

"وہ تیمور خان کہہ رہے تھے اماں۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟" اماں جی کی حیرت مزید بڑھی۔

"وہ کہہ رہے تھے۔ بیچارہ کام نہیں ہے کہ میں صفائیاں چیک کروں۔ ماما کو دکھا دینا۔"

"ہاں تو ٹھیک تو کہا انہوں نے۔ تو جو لڑکی ہو گی سوال جواب کرنے۔" خالہ فوراً بیچ میں کہہ گئیں۔

"بے وقوف اگر گھر کے مرد گھر میں رہتے ہیں۔ صاف ستھرے گھر میں۔ عورتوں کی موجودگی میں گھر کی صفائیاں نہیں کرتے۔ یہ کام گھر کے ناز کرتے ہیں یا گھر کی عورتیں۔ کیا کیا ہوتی تھے۔"

"عورتیں صفائی کرتی ہیں اور مرد دیکھتا۔" نازنین نے شوخی سے کھلکھلایا۔ مطہر تو جھینپ گئی۔ خالہ ابھی حسب عادت خوب ہنسیں۔

"یہ بھی تو بتا دیجیے۔ چھوٹی دلہن بیگم سے کہ صفایا کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" خالہ نے شوخی کو ریک لگایا۔

"سیدھا سا مطلب ہے۔ مرد کے ہاتھ میں آ کر تو ایک ذمہ دار سمجھدار عورت کا تو واقعی صفایا ہو جاتا ہے۔ بڑی مشقت مانگتی ہے گرستی۔" اماں جی نے مسکرا کر بہو کی طرف دیکھا۔

"تیرے دھندے نمٹ گئے کہ نہیں۔ یہ اور سے آؤ میرے ساتھ کر کام نمٹے۔ اور دیکھنا یہ بادو بی کیا کسی کام میں لگی ہیں۔ رات تو بچے سے غائب ہے۔ ان چیزوں کیا بھلا اسے ساتھ لے کر۔" خالہ نے اسے مزید کام سے لگایا۔

"تو بے خالہ خود بھی اس عمر میں ادھر سے ادھر اسی طرح لڑکی کو بھی دوڑا رہی ہو۔"

تزئین اپنے صحت مند اور خوبصورت سے بچے کو گود میں لئے کمرے میں آ چکی تھی۔

"چھوٹی بی بی جان! ہم تو پالنے سے سیدھے بڑھاپے میں کود گئے ہیں۔ یہ بیچ کے ماہ و سال بھلا کون جانے۔ تیرے دو ... تو ساس کے ہی داب رہے تھے۔

تین برس کی تھی بی بی جان میں چولہا جلانا شروع کر دیا تھا۔"

"اب اتنی بھی سنا لگا کر سو آئے۔ تین برس کی بچی سے کون چولہا جلوائے گا؟"

اماں جی نے ٹوکا۔ ان کے حساب سے تو مبالغے کا ریکارڈ ٹوٹ رہا تھا۔

"پوری بات تو سنیں اماں جی۔ گھر میں اور کوئی بچہ جو نہیں تھا۔ گاؤں کے کسی بھی گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی تو اس سے چولہا جلاتی تھی۔" خالہ نے وضاحت کی۔

"خوب کہی سولہ آنے۔ اگلے وقتوں میں آگ تک مانگی جاتی تھی۔ اب تو بغیر مانگے لگ جاتی ہے۔" تزئین نے مسکراہٹ کے پردے میں غیر شعوری تلخی کو چھپاتے ہوئے لقمہ لگایا۔

نازنین بہت لطیف مذاق مزاج رکھتی تھی۔ اس نے ننھی تلخی تزئین پر ڈالی۔

"کیا ہو رہا ہے صاحب؟" اس نے پیار سے بچے کا رخسار چھو کر ماحول کا رنگ بدلنے کی کوشش کی۔

"آ رہی ہیں خالہ اور یادی۔ بکری کا دودھ نکالنے گئی ہوئی تھی۔ اس کی لڑکی بیمار ہے ناں"۔ مطربہ نے اسی طرح تفصیل سے جواب دیا۔

"اب تم بتاؤ کیا کرتا ہے"۔ وہ سب کو نظر انداز کر کے خالہ کے مقابل بیٹھ گئی۔

"تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کیسا رویا رویا چہرہ ہو رہا ہے۔ دکھاؤ ذرا بخار تو نہیں ہے"۔ خالہ کو اس کی چپ اور سنجیدگی سے تشویش ہوئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہے مجھے"۔

"ہاں۔ خیر یہ تو میں بھی نوٹ کر رہی تھی کہ آپ بہت چپ چپ ہے"۔ تزئین نے بھی خالہ کی تائید کی۔

"نہیں بھئی۔ گھنٹہ پہلے تو بہت چہک رہی تھی۔ شاید تھک گئی ہے۔ جا فرج میں ٹھنڈی لسی رکھی ہوئی جا کر پی لے"۔ اماں جی نے بڑی شفقت سے اس کی جانب دیکھا۔

"پی لوں گی۔ اماں جی اچار کا تھوڑا سا ہاتھ تو بٹا دوں"۔ اس نے خالہ کے ہاتھ سے سودا لے لیا۔

"یہ آج آپ کے دیور صاحب کہاں غائب ہیں؟ بہت تنگ تو نہیں کرتے۔ تیمور آپ کو"۔ تزئین نے بھائی کا ذکر کیا تو لہجہ خود بخود محبت سے بھیگ گیا۔

"ارے نہیں۔ ان کی وجہ سے تو گھر میں بہت رونق ہے"۔ نازنین نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ ماشاءاللہ میرا بچہ جہاں بیٹھتا ہے۔ رونق ہو جاتی ہے۔ مگر کیا کروں۔ تمہارے باپ نے کتنا دور کر دیا ہے مجھ سے۔ وہ کیا پڑھاتے ہیں جو یہاں والے نہیں پڑھا سکتے"۔ اماں جی کا دکھ ہرا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے چودہ دن بھی نہیں رہ جاتے میں۔ ہے ناں اماں جی!" تزئین بھی بھائی کی جدائی کے خیال سے افسردہ ہو گئیں۔

"ارے کہاں۔ گیارہ دن۔ بارہویں دن تو صبح کو چلا جائے گا"۔ اماں جی تو انگلیوں پر دن سوتے میں بھی گن رہی تھیں۔

"تزئین اگر کہتا بھائی سے شاید تمہاری بات سمجھ میں آ جائے۔ تم بھی پڑھی ہوئی ہو"۔

"کیا اماں جی؟"

"یہی کہ زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ دماغ کی طاقت خرچ ہوتی ہے اور تمہارا تو کام زمینداری ہے۔ تم نے کون سا سرکاری جوتیاں سیدھی کرنا ہیں"۔ تزئین ماں کے بھولپن پر مسکرا دیں۔

"کہہ دوں گی اماں ۔۔۔ مگر وہ مانیں تب"۔

"صبح صبح مجھے اپنے بچوں پر دم کر کے کیسا سکون ملتا تھا۔ اور اب چہروں کو ترستی ہوں۔ یہ تو بہت چھوٹا تھا تب ہی تمہارے باپ نے مجھ سے دور کر دیا تھا"۔ اماں جی نے پیشگی رخصتی منانا شروع کر دی۔

"[illegible] کیسے جاتے ہیں تیمور خان باہر تک؟" اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔

"پاس ہونے کی بات ہوتی تو کیا بات تھی۔ سالوں سڑتی ہوں اپنے بچے کی صورت کو"۔ اماں جی افسردہ سے انداز میں سنا رہیں۔

"اماں جی! ایک آپ کیلئے فخر کی بات ہونا چاہیے کہ آپ کو لوگ کہیں کہ آپ لائق بچوں کی ماں ہیں۔ پتہ نہیں کسی بھی ماں کیلئے بہت خوشی کی بات ہوتی ہے"۔ نازنین کا انداز دلاسہ دینے کا تھا۔

"تو اپنے وطن میں سب نالائق ہوتے ہیں؟" اماں جی نے فوراً جواب کر دیا۔

"مجھے تو ایک ہی ڈر کھاتا رہتا ہے"۔

"ہائے اماں جی ۔۔۔ ڈر ۔۔۔ وہ کیا؟" تزئین دہل گئیں۔

"کسی میم کے چکر میں نہ پڑ جائے"۔ وہ فکرمندی سے بولیں۔

"کیا پتا بھی گئے ہوں اور اسے لے کر آئے ہوں کہ بس آ رہا ہوں وہ چار دن میں"۔

خوف ہی۔ کمزوروں کی پناہ گاہ۔

دھاگے کا گولہ ہاتھ سے چھوٹ کر کرسی کے نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ جیسے کوئی اس سے پیمان باندھ گیا ہو اور دھاگہ مرتب ہوا ہو۔ بچا تو ہیں لگا تھا۔ تزئین کے شرح ملنے سے ذات کے اندر ایک اور چور دروازہ کھلا اور گرم ہوائیں اندر آنے لگیں۔ خوب لو چلنے لگی۔

"آپ فکر مند نہ ہوں۔ اگر میم بھی کریں گے تو کوئی اچھی ہی کریں گے۔ ہمیں پوری امید ہے"۔ خالہ نے ٹکڑا لگایا۔

"تیرے منہ میں خاک سو آنے۔ مجھے نہیں چاہیے گوری میم۔ اس دن کے لئے اولاد جوان کی ہے"۔ اماں جی تو ہول کر رہ گئیں۔

(ہائے اماں جی زنجیریں پہنا کر رکھئے۔ آپ پہنا سکتی ہیں۔ کسی کو بھی تس سے مس کرنے کا کوئی حق نہیں آپ کا وقت گزر) اماں جی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔

"کیوں مطربہ کرے گی میم کی خدمت؟" تزئین شرارت سے ہنسیں۔ "تو تو بڑی خوش ہو گی؟"

"آپ لوگ ہوں گے تو میں بھی ہو جاؤں گی"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"قربان جاؤں تیری اطاعت گزاری کے"۔

"تم لوگ کیا بدفالیں نکال رہی ہو۔ میرے بچے کیلئے۔ کوئی چائے وائے لاؤ گی لڑکیو؟" اماں جی نے ڈانٹا۔

"چاول اوپر سے نہیں اتری ابھی تک؟" معاً انہیں دھیان آیا۔

"وہ تو صبح سے شہر گئی ہوئی ہے اسپتال۔ اس کی آنکھوں میں کئی دن سے تکلیف ہے۔ اس کا لڑکا لے کر گیا ہے"۔ خالہ نے مطلع کیا۔

"اچھا ۔۔۔ مجھے بھول کر گئی ہوتی۔ ایک دو کام تھے شہر میں"۔ اماں جی خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئیں۔

"آپ کو کیا کام تھے۔ تیمور بھی تو گئے ہیں شہر"۔ تزئین نے بتایا۔

"اس کے کرنے کے نہیں تھے۔ وہ پتہ نہیں کر گئے تھے؟ وہ کہتے تھے" اماں جی کی سوئی سے دھاگہ نکل گیا تو انہوں
نے دھاگہ کچھ لے کے سوئی دھاگہ سطریہ کی طرف بڑھایا۔

"اماں جی۔ یہ پھوہڑ ہے پھر نکل جائے گا بڑا ڈال دوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں ڈال دو۔"

شرمین اور سازین اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔

"لڑکی! بات سنو۔" وہ بڑے پھاٹک کی طرف جا رہی تھی۔ چونک کر رک گئی۔
پلٹ کر دیکھا۔ عارف تھیلا اٹھائے کھڑا تھا۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"دو نام ہیں میرے۔ سازین بانو اور سطریہ" وہ چیخ کر گویا ہوئی۔

"یہ تین ہیں۔ گنتی آتی ہے؟" وہ مسکرا کر جان جلا رہا تھا۔

"اور یہ سطریہ کیا نام ہوا۔ جیسے لیکسا بڑپ۔ مگر کھنڈر اتنے بھی خوبصورت نہیں ہوتے۔"

"کام بتاؤ۔" وہ جھڑک کر بولی۔

"کرو گی؟" وہ بہت شوخ تھا۔

"اماں جی سے شکایت کروں گی اگر زیادہ بات کی۔" وہ مزید بھڑک گئی۔

"کیا کہو گی؟" اس نے دلچسپی سے اس کا سراپا جانچا۔

"یہی کہ یہ لڑکا مجھے چھیڑتا ہے۔" وہ اسے گھور رہی تھی۔

"میرا نام عارف ہے۔ ایک ہی نام ہے میرا۔" اس نے قرض لوٹایا۔

"احمق مجھے مت روکنا۔ میں ہر کسی سے بات نہیں کرتی۔" وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"ارے بھئی بڑپ سوئٹ جواز تو بات تو سنو۔ یہ تھیلا ماما تک پہنچا دو۔ وہ انکار کر رہی ہوگی"۔ عارف نے تھیلا فرش پر
رکھ دیا۔

"اس میں کیا ہے؟" وہ ترخ کر بولی۔

"سانپ بچھو ہیں۔ آج ماما تمہیں یہی ڈش بنا کر کھلائیں گی۔"

"آخ۔" سطریہ کو تے آنے لگی۔ "تم بدتمیز ہو وہ الگ بات منہ سے بھی بہت ہو۔" وہ جل بھن کر کباب ہو رہی تھی۔

"تم واقعی اتنی بھولی ہو یا احمق ہو۔" عارف کو پھر گدگدی ہوئی۔

"خالہ! خالہ! ایرز کا" اس نے شور مچا دیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ عجیب لڑکی ہو۔" وہ اصطبل کی طرف بھاگ گیا۔

"کیا ہو گیا سازین بانو؟" چوکیدار موجود ہوا۔

"کچھ نہیں چاچا" وہ تھیلا کھینچتی ہوئی اندر چلی۔

"تو پھر چیخا کیوں تھا" وہ متعجب ہوا۔

"دماغ خراب ہے میرا" اس نے بھی پیشانی پر ہاتھ مار کر صورت ذکر میں سے پھیری۔

چوکیدار آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تو یہیں کی اولاد ہے بھائی۔ لیکن اتوار کی اتوار مصر سے پارلیمنٹ کی ملاقات کرتی ہے۔ میری تو جان ہی نکل جاتی ہے۔"
تیمور علی خان نے فخریہ بتایا۔

"آہستہ۔۔۔ اماں جی سن لیں۔۔۔ ابھی کل ہی انگریز ہونے کے اندیشے سے کانپ رہی تھیں" سازین نے ہونٹوں پر
انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"انگریز ہو۔۔۔ !! انہیں کس نے بتایا۔۔۔؟" وہ حیرت زدہ ہو گئے۔

"انہیں بتانے کی کسی کو ضرورت نہیں۔ انہیں گھر بیٹھے ہی سب پتا ہے" سازین ہنسی۔

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہے بھائی۔ آپ انہیں بتا دیجیے کہ انگریز ضرور ہے مگر سات گز کا دوپٹہ اوڑھتی ہے۔"

"میں سات گز کا جھوٹ نہیں بول سکتی" سازین نے صاف انکار کیا۔

"مگر یہ جھوٹ بھلائی ہے۔ اور بھلائی نیکی ہوتی ہے" تیمور نے دلیل دی۔

"مگر میں اپنی سیدھی سادی ماں کے ساتھ منافقت ہرگز نہیں کر سکتی۔ آپ اپنا مقدمہ خود لڑیں" اس نے واضح
طور پر معذرت کی۔

"وہ بھی بہت سیدھی ہے۔ ہم نے اسے بتایا۔ ہماری اماں کو پائے بہت پسند ہیں۔ کھانے میں تو کھیں گی۔ بیٹے میں کچی
کریں گی کا خرچا ہے؟"

سازین ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔

"سطریہ ماما کا بنایا ہوا سوپ لے کر ہال میں داخل ہوئی تھی۔ تیمور علی خان بھاوج کو بتا کر مسکراتے ہوئے سر کھجا رہے
تھے۔

سطریہ نے تپائی پر رکھ دی۔

"وہ کیا نام ہے تمہارا لڑکی۔۔۔ کیا لائی ہو؟" تیمور علی خان یکدم سنجیدہ ہو گئے۔

اکثر لوگ نام کے معاملے میں بڑے غیر محتاط ہوتے ہیں۔ حالانکہ نام ہر انسان کی آرائش ہوتا ہے اور اسے بہت عزیز
ہوتا ہے۔

اور جو لوگ کسی کے دل میں اتر جاتے ہیں ان کے منہ سے اپنا نام سننا ایک سعادت لگتا ہے اور اگر وہی نام بھولنے
لگیں تو انسان اپنی نظروں میں خود کو بہت بے توقیر لگتا ہے۔

"خان۔۔۔۔ اصطبل میں بہت خوبصورت گھوڑیاں ہیں"۔ اس نے ایک پیالے میں سوپ نکالا۔

"پھر۔۔۔؟" وہ الجھے۔

"ان کے بہت خوبصورت نام ہیں"۔ وہ آہستگی سے بولی۔ نازنین بھی حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"پھر۔۔۔؟" ان کا پارہ چڑھنے لگا۔

"ان کے نام خاتون کو ایک دفعہ میں یاد ہو جاتے ہیں۔ آپ مجھے بھی کوئی گھوڑی سمجھ لیں"۔

اس نے تپائی ان کے نزدیک رکھ دی۔

نازنین ششدر سی اس کی شکل دیکھنے لگی۔ تیمور علی خان خاموش سے ہو گئے۔

"یہ سوپ ہے، ماما نے بنایا ہے۔ آپ کیلئے چائے بنا کر لاؤں چھوٹی بیگم؟" وہ نازنین کی سمت مڑی۔

"نہیں۔۔۔۔ میں اس وقت چائے نہیں پیتی۔ البتہ یاور صاحب سے پوچھ لو۔ وہ اپنے بیڈروم میں اسٹڈی کر رہے ہیں"۔

اس نے ملائمت سے کہا۔

سطریہ ایک لمحے کو ٹھہری پھر باہر نکل گئی۔

"کچھ سمجھ نہیں آئی"۔ اس نے تیمور علی خان کی چپ کو بہت محسوس کیا۔

"ویسے خاصی بے وقوف سی ہے۔ آپ جانے دیجئے۔ کچھ کہنے کا نہیں"۔ اس کو سطریہ کے مشری گھر پڑ گئی تھی۔

"اس کو زیادہ آئینہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ بھابی۔۔۔۔ ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی"۔ وہ بہت ناراض سے انداز میں گویا ہوئے۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ بے حیثیت انسان کتنا ہی حسین و ذہین ہو مگر ہے تو پھر بھی بے چارا۔۔۔۔ اور بے چاروں کے ساتھ درگزر کرنا بڑائی کی بات ہے۔ ویسے میں سمجھا دوں گی۔ آپ ریلیکس ہو جائیں"۔ نازنین نے ان کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

ترئین بالآخر تیمور علی خان کے دلائل کے سامنے بے بس ہو گئیں۔

اماں جی کا خیال تھا۔ تیمور علی واپسی سے پہلے ترئین کا نکاح ہو جائے تو اچھا ہے، وہ بھی ایک اہم خوشی میں شریک ہو جائیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان جس سے بغیر شرط محبت کرتا ہے، وہاں محبت ہی سب سے بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ بچے دور ہونے کی وجہ سے دلوں کے مزید قریب آ گئے تھے۔ پھر یہ کہ ترئین کی خیر خواہی کے جذبے نے ان میں مزید تحریک پیدا کر دی تھی۔

نکاح بے حد سادگی سے ہوا تھا۔ صرف گھر کے افراد اور چند بہت قریبی دوست احباب شریک تھے۔

ترئین نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نکاح سے پہلے کوئی رسم وغیرہ نہیں ہو گی۔ ۔۔۔ مہندی ہو گی۔۔۔ وہ اداس بیٹھی ہوں گی۔

خالہ سوا آئے اشعر کا پیالہ لے کر دادی جی کی کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ ۔۔۔ کا یہ عالم تھا کہ گویا ترئین دم سے بھاری

ہوں تم خواہ مخواہ زمین سے بڑ گئی ہوں۔

"لے۔۔۔ دادی جی۔۔۔۔ اشعر ہے۔ اصلی شیلی کے تیل میں گوندھا تھا۔ ترئین لیجئے۔ تیرا آدمی بھی مہندی بھی آ رہا ہے ۔۔۔ ہے"۔

اس سے قبل کہ دادی جی اس "مہربانی" کی تفصیل پوچھتیں۔ وہ واپس بھی پلٹ آئی تھیں۔ البتہ عالم جب نے جب ترئین کے ہاتھ تھام کر مہندی لگانا شروع کی تو وہ خاموش رہیں۔

خالہ نے مہندی گوندھتے ہوئے اپنی دلی ۔۔۔ کی خواہش اس بار کی اور مہندی کو ۔۔۔ پر سطریہ ۔۔۔ اٹھا لائے۔ یہاں تک کہ سطریہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے الٹے پلٹے برتن اٹھائے اور سب سے پہلے ہاتھوں پر مہندی لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

"مشقیاں بند کے یہاں وہاں جل رہی تھی کہ بیرونی برآمدے سے تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔ ایک عجیب سی نگاہ اس پر ڈالی۔

"محترمہ سطریہ یار جان بانو صاحبہ۔۔۔۔ عرض یہ ہے کہ وہ ان سے کپڑے استری نہیں ہوئے۔ اگر مہارانی جی مہندی فرما چکی ہیں تو ابھی کر دیں۔ کیونکہ آج کیلئے میرے پاس کوئی ڈھنگ کا ڈریس نہیں ہے"۔

وہ اتنا کہہ کر بغیر رکے آگے بڑھ گئے۔ سطریہ نے اپنے مہندی لگے ہاتھوں کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا۔ اس نے تیمور علی خان کا طریہ لب و لہجہ۔ ابھی تو آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا لگے۔ وہ ان کے پیچھے دوڑی۔

"خان"۔

تیمور علی خان زینے کی طرف بڑھتے ہوئے رک گئے۔

"خان۔۔۔۔ آدھے گھنٹے بعد کر دوں گی۔ یہ مہندی لگی ہوئی ہے۔ ابھی تو رنگ بھی نہیں چڑھا ہو گا"۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی شکل دیکھی۔

"مجھے کپڑے چاہئیں ابھی۔ تم یہاں کام کیلئے ہو۔ مہندی لگانے کیلئے نہیں سنا۔۔۔۔ اپنی اوقات پہچانو۔۔۔۔ چاند نہیں کتے سوراخ میں رہتے ہیں"۔

وہ سختی سے کہہ کر زینے چڑھنے لگے۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے تھے۔ وہ واش روم میں لگے ہوئے ٹیپ کی سمت بڑھ گئی تھی اور ذرا سی دیر میں مہندی اتار کر ہاتھ دھو ڈالے تھے۔ پھر اپنی زرد زرد ہتھیلیاں دیکھتے ہوئے تیمور علی خان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"سب کپڑے یہی ہیں خان؟" اس نے صوفے پر پڑے کپڑے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آواز آنسوؤں کی چغلی کھا رہی تھی۔

"نہیں اور بھی ہیں"۔ وہ بک شیلف کے سامنے سے ہٹ کر وارڈروب کی طرف آ گئے اور کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر جھٹکنے لگے۔

''وہ پیچھے ہال میں بڑا ہنگامہ ہے۔ وہاں کام کروں گی تو صبح تک ہی ہوگا یہیں استری کر لوں۔''

''وہ تو ماما کپڑے استری اور بچھانے کیلئے دری چادر وغیرہ لینے چلی گئیں۔''

اتنی دیر میں تیمور علی خان باتھ روم میں بند ہو چکے تھے۔

وہ خاموشی سے واپس آ کر استری کرنے لگی۔ ہتھیلیوں سے اٹھتی مہندی کی مہک سے اس کا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ ساری محنت ہی اکارت ہو گئی تھی۔

اماں جی کتنی اچھی ہیں۔ ماما کام کرنے کیلئے بلانے آئی تو اماں جی نے کتنی محبت سے کہا تھا۔ کام تو ہوتا رہے گا لگنے دو اسے مہندی۔ شوق کی عمر ہے۔ حویلی کی سب سے بڑی تو وہ ہیں۔ انہیں تو بالکل بھی غرور نہیں۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

تیمور علی خان غسل سے فارغ ہو چکے تھے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے تولیے سے سر رگڑ رہے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے وسیع آئینے میں وہ بالکل واضح نظر آ رہی تھی۔

کبھی دوپٹے سے ناک پونچھتے ہوئے کبھی آنکھیں۔۔۔۔ وہ چونک کر مڑے۔

''کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟''۔

وہ ہڑبڑا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اپنی دانست میں تو بڑی ''خفیہ'' اشک باری تھی۔

''کچھ نہیں۔۔۔۔'' اسے بوکھلاہٹ میں کوئی مناسب جواز بھی نہ سوجھا۔

''ہمیں اپنی بات دہرانا پسند نہیں۔ کیا مسئلہ ہے؟'' وہ واقعی حیران تھے۔

''ک۔۔۔ کچھ نہیں خان۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ بس''۔

''اتنا عذاب لگتا ہے تمہیں کام کرنا کہ رو پڑتی ہو۔ ہمیں ڈیکوریشن پیس نہیں چاہیے۔ ہم اماں جی سے کہہ دیں گے صبح ہوتے ہی واپس چلی جاؤ۔ جہاں سے آئی ہو۔ رہنے دو یہ کپڑے وہیں پڑے۔ جاؤ آرام کرو۔'' وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف پلٹ گئے۔ وہ برہم ہوئے۔

''اٹھو بھی۔۔۔۔ نہیں کروانا ہمیں تم سے کام''۔ وہ برہم ہوئے۔

''خ۔۔۔ خان۔۔۔۔ میں کام کی وجہ سے تو نہیں رو رہی''۔ وہ اتنا کہہ کر بلک کر رو پڑی۔

''نان سنس۔۔۔۔ پھر کس وجہ سے رو رہی ہو۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ ہم صبح تمہاری صورت نہ دیکھیں گے''۔ وہ اب ناراض ہونے کے بجائے پریشان تھے۔

''وہ۔۔۔ م۔۔۔ مہندی۔۔۔۔ لگائی تھی ناں''۔ اس نے ہتھیلیاں پھیلا کر وضاحت کرنا چاہی۔

''مائی گاڈنس۔۔۔۔ کیا مہندی دوبارہ نہیں لگ سکتی؟'' وہ متعجب ہوئے۔

اس نے سفید کرتا پاجامے میں ملبوس مشین جیسے انسان کو دکھ سے دیکھا۔

شوق کی ایک ان چھوئی گھڑی ہوتی ہے اس میں خوشی کا جو بڑا حصہ ہے۔ اس گھڑی کو ادھر ادھر نہیں ہونا چاہیے۔ فوراً ہی

کے سنگ چل جائیں تو گھڑی پوری نہیں ہوتی۔ اگر یہ گھڑی خطا ہو جائے۔

اس بے رحم آدمی کو کیسے سمجھائے۔۔۔ کہ کام کرنے کیلئے طاقت، وقت چاہیے اور طاقت، وقت، شوق کی گھڑیوں سے جڑتے ہیں۔ خوشی کے کنوئیں سے کھینچتے ہیں۔ شوق بار بار نہیں جاگتے میرے مالک۔ اس نے ساتھوں میں بھری جانے لگی سرحدیں پھلانگ لی تھیں۔ شعور کیلئے دکھ کتنے ضروری ہیں۔

تیمور علی خان تو اس کے اندر تک پہنچ ہی نہ سکے۔

اس کے آدھے سنگ حرف پر کسی شوق کی قربانی کا بھاری دن آ پڑا۔

وہ کچھ نہیں بولے۔ عجیب سے احساس سے ملامت سے وہ دو چار ہو گئے۔ اب ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

''ہم پاپا صاحب کے کمرے میں ہیں کوئی پوچھے تو بتا دینا''۔ وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولے۔

نیلی فراک، سرخ پاجامے اور دوپٹے میں وہ بہت مصروف تھی۔

بارات آنے میں ابھی وقت تھا۔ وہ دلہن کیلئے گجرے بنا رہی تھی۔ کہ خالہ آ گئیں۔

''تو یہاں بیٹھی ہے'' وہ تعجب سے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''اور کہاں بیٹھوں۔۔۔'' وہ تنک کر بولی۔

''کیا تھک گئی؟''

''کیوں؟'' وہ پھر تیکھے لہجے میں گویا ہوئی۔

''کاٹ کھانے کو نہیں اسے کوئی کرتا ہے۔۔۔ زہر بھرا ہے میرے اندر''۔ وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

''اوئی''۔ خالہ نے ناک پر انگلی رکھی۔ ''کیوں بول رہی ہے اتنا۔ کسی نے کچھ کہا؟''

''کوئی کچھ کہتا ہی کہاں ہے۔ ہم اس قابل ہیں کہ ہمیں کوئی کچھ کہے۔ کھری کھری سناتے ہیں لوگ''۔ وہ خالہ کی بوکھلاہٹ پر بالآخر مسکرا دی۔

''کون سناتا ہے۔۔۔۔ کتنا خیال رکھتے ہیں سب تیرا۔ تیرا دماغ ہی عرش معلیٰ پر رہتا ہے۔ اچھا چل اٹھ وہاں ہال میں بلا رہی ہیں۔ پھوپھی دلہن اور بڑی بی بی جان''۔

''ہیں۔۔۔۔ دونوں ایک ساتھ۔۔۔۔ مگر کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''یا تو زبان کاٹ کر پھینک دے ''یا یہ'' کیوں'' نکال دے اپنی زندگی سے گھڑی ہو''۔ جلدی سے وہ ڈانٹ کر واپس چل دیں۔

اس نے گجرے کے پھول واپس باسکٹ میں ڈالے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہال میں آئی تو گھر کی خواتین اور مہمان خواتین نے خوب شور برپا کر رکھا تھا۔ اس کے داخل ہوتے ہی سناٹا چھا گیا۔ مہمان خواتین اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھیں۔

"یہ ہے مطربہ۔۔۔ مطربہ سلام کرو۔۔۔ مہمان ہیں"۔ رخشندہ بیگم نے اسے سامنے کھڑے ہوتے دیکھ کر کہا تو اس نے چونک کر آداب بجا لایا۔

"بھئی بڑی تعریف ہوئی ہے تمہاری آواز کی۔ یہ سب مہمان تمہارا گیت سننا چاہتی ہیں"۔ روشن آرا نے کہا۔

"جی"۔ وہ سٹپٹا گئی۔

"اب جی جی مت کرو۔ جلدی سے کوئی اچھا سا گیت سنا دو۔ بارات بھی آنے والی ہے"۔ عالم جہاں نے کہا۔

وہ ان کا قطعی حکمیہ انداز دیکھ کر ہی دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اپنی چمکتی رنگت والی مہندی لگی انگلیاں دیکھنے لگی۔

"کوئی خوشی والا سناؤ"۔ کسی طرف سے فرمائش آئی۔

"خوشی"۔ اسے ایک دم کھوئے سامان کی طرح خوشی یاد آئی۔

وہ خوشی کے گیت یاد کرنے لگی۔ جو اسے بھولتے جا رہے تھے۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا

ایک تو جو ملا ساری دنیا ملی
کھلا جو میرا من ساری بگیا کھلی

کتنی میٹھی مدھر آواز تھی۔ سب ہی محو ہو چکے تھے۔

گیت ختم ہوتے ہی ایک اور گیت کی فرمائش زور و شور سے ہوئی۔ تیمور علی خان جو اتر کر باہر کی سمت بڑھنے ہی والے تھے ٹھٹک کر رک گئے

اوڑھ کے تاروں کا یہ آنچل
پیروں میں باندھی میں نے پائل۔ ہو۔۔۔ او۔۔۔ او
آج نہ روکو کوئی اڑان کو
رستہ دیا۔۔۔ آ۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ا

آج پھر جینے کی تمنا ہے
آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

اتنی دلفریب آواز۔۔۔ اتنی رواں اور نفیس جیسے کوئی پائے کی مغنیہ۔۔۔ کون گا رہا ہے؟ بے حد فطری تجسس تھا مگر زنان خانے کی طرف بڑھتے ہوئے جھجک تھی کہ آج اس طرف مہمان خواتین بھی تھیں۔

اسی دم ماما بلی دالان کی طرف سے اندر داخل ہوئیں۔

"ماما۔۔۔ ایک کپ چائے مل سکتی ہے"۔ انہوں نے ماما بلی کو روکنے کا جواز پیدا کیا۔

"کیوں نہیں خان۔۔۔ ابھی لائی۔۔۔ کیا آپ اپنے کمرے میں ہیں؟"

"ہوں۔۔۔ باغ کی طرف جا رہا ہوں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ ماما۔۔۔ یہ کون گا رہا ہے؟"

ماما بلی کا دھیان ابھی اس طرف نہیں گیا تھا۔ تیمور علی خان کے سوال پر وہ متوجہ ہوئیں پھر مسکرائیں۔

"یہ مطربہ ہے"۔ وہ بے نیازی سے گویا ہوئیں۔ جیسے کوئی معمولی سی بات ہو۔

"مطربہ"۔ انہیں اچنبھا ہوا۔

"اتنی چھوٹی اور اس آواز۔۔۔ واقعی ماما؟"

"جی خان۔۔۔ جتنی خوبصورت وہ خود ہے اتنی خوبصورت آواز بھی ہے۔ ہمارے تو زنان خانے میں تو اس کی وجہ سے رنگ آ گئے ہیں"۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔

وہ بھی کسی دھیان میں گم باہر کی طرف بڑھے۔ کانوں میں مترنم گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

آج پھر جینے کی تمنا ہے آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

کیا غضب کی آواز ہے۔ ایک لمحے کو بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ جی تو چاہا تھا گیت پورا سنیں۔ مگر یوں سر راہ کھڑے ہونے میں بھی قباحت تھی۔

"کیا بات ہے عارف۔۔۔ اکھڑے اکھڑے ہو؟" یاور علی خان بڑے تھکے تھکے انداز میں اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہے تھے۔ عارف کو ادھر ادھر بھٹکتا پا کر چونک پڑے۔

"وہ۔۔۔ خان باہر موڑ میں ایک عورت آئی ہے۔ کہہ رہی ہے خالہ سرور آنے کی بھابھی سے ملنا ہے"۔ اس نے بڑے بے نیازانہ انداز میں مطلع کیا۔

"اندر کیوں نہیں بلایا؟" ان کا تھکا ہوا ذہن موڑ اور عورت سن کر ایک دم مستعد ہو گیا۔

"وہ اندر نہیں آ رہی۔ کہہ رہی ہے اسے یہیں بلا لاؤ۔ اس کے ساتھ دو آدمی بھی ہیں۔ خوب بڑے لگتے ہیں"۔ عارف نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔

"یاور علی خان چونک پڑے۔ آدمی؟"

"چلو میں دیکھتا ہوں"۔ وہ آگے بڑھنے کی بجائے بیرونی دروازے کی طرف چلے۔ عارف بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔

پھاٹک سے باہر آئے تو تیمور علی خان وہاں ان سے پہلے موجود تھے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ روشنی ناکافی ہونے کی وجہ سے اندر بیٹھی عورت واضح نہیں تھی۔

"کیا بات ہے تیمور۔۔۔ کون ہے یہ؟" انہوں نے بھائی سے سوال کیا۔

"یہی میں پوچھ رہا ہوں۔ چوکیدار نے بتایا ہے کہ یہ مطربہ کو بلا رہی ہے"۔ تیمور علی خان نے الجھن بھری نظروں سے ان کی سمت دیکھا۔

"السلام علیکم"۔ یاور علی خان تیمور کے پہلو میں آ کھڑے ہوئے اور سلام کیا۔

"وعلیکم السلام"۔

"جی فرمائیے...... کیا مسئلہ ہے؟"

"یہاں حویلی میں ایک سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔ اتنی خوبصورت کہ میں حیران رہ گئی ہوں کہ آپ کے ہاں کی خواتین میں سے کوئی بھی اس کے برابر نہیں ہوگی...... یہی اس کی نشانی ہے۔ اس کا حسن ہی اس کا کام ہے۔"

شاہانہ انداز میں بیٹھی ہوئی عورت نے بڑے عجیب انداز میں کلام کیا۔

"آپ کو اس سے کیا کام ہے؟" یاور علی خان نے پرتشویش انداز میں سوال کیا۔

"آپ اسے بلائیں تو سہی...... پتہ چل جائے گا سب۔"

"ہم معذرت خواہ ہیں...... اس طرح اسے یہاں نہیں بلا سکتے...... آپ اندر تشریف لے آئیں۔ وہاں اس سے ملاقات کرلیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

تیمور علی خان نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پہلوان نما آدمیوں پر نگاہ ڈال کر جواب دیا۔

عورت نے کچھ دیر سوچا پھر گاڑی سے اتر آئی۔

"غیرت خان...... ابھی آتے ہیں ہم"۔ اس نے دونوں آدمیوں میں سے کسی کو مخاطب کیا پھر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"چلیے"۔ یاور علی خان اور تیمور علی خان اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ اور وہ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ملازم ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

تیمور علی خان نے ڈرائنگ روم میں پہلے داخل ہو کر تمام لائٹس آن کر دیں۔ اور پنکھے بھی چلا دیے۔ اور پھر گویا ساکت سے ہو گئے۔ سفید پلیٹن ساڑھی میں ملبوس بالوں میں، کلائیوں میں موتیے کے گجرے پہنے، انتہائی دلکش سٹائل میں بال بنائے وہ ایک انتہائی طرحدار عورت نظر آئی۔ میک اپ اتنا بھرپور اور نفاست سے کیا ہوا تھا کہ اس پر تصویر کا گمان غالب آجاتا تھا۔ مصور کے برش سے وجود میں آئی ہو۔

سر سے پاؤں تک اتنی مرتب۔ ایک لمحے کیلئے تو دونوں کے حواس ہی جواب دے گئے۔

"تشریف رکھئے"۔ یاور علی خان نے سنبھل کر صوفے کی سمت اشارہ کیا۔

"مطربہ جیسی غلام زادی سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" تیمور علی خان کے ذہن میں یہ سوال ہتھوڑے کی طرح بج رہا تھا۔

"جاؤ عارف مطربہ کو بلا لاؤ......" بالآخر انہوں نے عارف کو حکم دیا۔ وہ جیسے منتظر ہی تھا فوراً باہر نکل گیا۔

یاور علی خان نے تیمور کی سمت دیکھا۔ دونوں الجھن میں تھے کہ اس سے کیا بات کریں۔

"آپ سے تعارف ہو جائے تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا؟" عورت نے باری باری دونوں کی سمت دیکھا۔

"ہم دونوں بھائی ہیں...... یہ ہماری حویلی ہے اور مطربہ ہماری خادمہ۔"

یاور علی خان نے بڑے وقار سے مختصراً جواب دیا...... انداز یوں تھا کہ ہمیں آپ سے گفتگو کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

ایک تو اپنے ظاہر سے وہ ویسے ہی مغرور محسوس ہوتے تھے۔

"پتہ نہیں محلوں میں رہنے والوں کو یہ شوق کیوں ہوتا ہے کہ ان کی خادمائیں تک حسین ہوں۔ دراصل ہماری حسین عورت زمانے میں ہوتی ہے اور خود پر قابو نہیں آنے دیتی کسی کو۔ بلکہ خادمہ کی شکل میں دیواروں میں لگے ماتھے تک کے ہوتی ہے...... اس کا آسانی سے۔"

"کام ہوا تو گے"۔ دونوں بھائی سٹپٹا گئے۔ بظاہر طرحدار عورت کس قدر بھونڈی گفتگو کر رہی تھی۔

"وہ ہماری درخواست پر یہاں نہیں پہنچائی گئی۔ بلکہ ہماری والدہ نے ایک صاحب سے لے کر رکھا ہوا ہے۔ آپ کسی فرصت میں تصحیح کرلیں"۔ یاور علی خان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"اوہ کیا بات...... یہ تو بہت اچھی بات بتائی آپ نے...... بلکہ ایک طرح سے میرا بوجھ کم کردیا۔ شکریہ"۔ عورت نے پرس کھول کر رومال نکالا اور چہرہ تھپتھپانے لگی۔

دونوں بھائیوں نے اس کی حرکات و سکنات سے تنگ آکر یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے طور پر اس عورت سے کوئی بات نہیں کریں گے۔

اسی دم دروازے سے مطربہ کے بجائے خالہ سوال آتے نمودار ہوئیں۔ عورت کو دیکھ کر ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ انہوں نے خوفزدہ انداز میں یاور علی خان اور تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

"تت...... تم کیوں آئی ہو؟" وہ سوال عورت سے کر رہی تھیں اور سہمی سہمی دونوں بھائیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں تو باہر سے واپس ہو جانا چاہتی تھی مگر تمہارے مالک اندر لے آئے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں...... ساری زندگی ایسی ہی آؤ بھگت دیکھی ہے آپا"۔ وہ خالہ سے گویا ہوئی۔

دونوں بھائی اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے بڑی شرمندگی محسوس کرنے لگے۔

"محترمہ آپ صرف کام کی بات کیجئے"۔ تیمور علی خان کا لہجہ تیکھا تھا۔

"کس سے کروں؟ جسے بلایا تھا وہ تو آئی نہیں"۔ اس نے نخوت بھرے انداز میں جواب دیا۔

"وہ نہیں آئے گی"۔ خالہ نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

"جس جوان جسم کو تم نے مشقت پر لگا رکھا ہے وہ میرے پیسے سے پروان چڑھا ہے۔ اس کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ میرے پاس میں ہے۔ پرچہ کٹوا دیا تمہارے خلاف تو بے حیا خود ہو جاؤ گی"۔ وہ چنگھاڑی۔

"جوتی میں آئے کرلو۔ یہاں بھی محنت کر کے کھاتی ہوں۔ جیل میں بھی چکی پیس لوں گی"۔ خالہ نے بڑے مضبوط انداز میں جواب دیا۔

"اپنے جاگیرداروں پر پھول رہی ہو؟ انہیں بھی پھنسوا دوں گی"۔ وہ زہریلے لہجے میں گویا ہوئی۔

"جی بھرلو"۔ خالہ کا انداز ہنوز تھا۔

"آپ ہمیں بتائیے مسئلہ کیا ہے؟" یاور علی خان کو ان کی بحث و تکرار لاحاصل نظر آئی تو بول پڑے۔

"خان" یہ مطربہ کو لینے آئی ہے"۔ خالہ نے نہایت ناگواری سے عورت کی جانب دیکھا۔

"کیوں ۔۔۔ کس حیثیت سے"۔ سوال میں طنز تھا۔

"ماں ہوں اس کی"۔ دروازے میں کھڑا عارف بدحواس سا ہو گیا اور عورت کو گھورنے لگا۔ دونوں بھائیوں نے ازسرِ نو اس عورت کا جائزہ لیا ۔۔۔ ماں"۔

اتنی عمر چور عورت؟

"اگر آپ اس کی ماں ہیں تو یہ نوبت ہی کیوں آنے دی کہ وہ حویلی میں چلی آئی؟" تیمور علی خان نے ناگواری چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"فراڈ کیا ہے ان لوگوں نے میرے ساتھ ۔۔۔ راتوں رات اسے یہاں پہنچا دیا"۔ عورت نے غضبناک نظروں سے خالہ کی جانب دیکھا۔

"مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا ۔۔۔ بظاہر تو اس میں ان کا کوئی فائدہ نہیں؟"

تیمور علی خان کی استدلالی قوت پوری طرح کام کر رہی تھی۔

"کیوں ۔۔۔ پیسے نہیں دیئے ہوں گے آپ نے ۔۔۔ اس لالچی عورت کو"۔ عورت نے جان جلا کر رکھ دی۔

"دیکھئے محترمہ! آپ ذرا احتیاط سے گفتگو کیجئے۔ ہمارے ننانوے فیصد ملازم وہ ہیں جن کے باپ دادا ہمارے بڑوں کے ملازم تھے۔ ہم کبھی منڈی سے انسان خریدنے نہیں گئے۔ وہ ایک فیصد وہ ہیں جن کو کہیں بھی ملازمت چاہیے تھی ہمارے ہاں کام مل گیا تو یہاں رہنے لگے۔ یہ جب چاہیں نوکری چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ ان پر کوئی زبردستی نہیں۔ اب یہ حاضر ہیں ۔۔۔ ان کے تمام پچھلوں نے حویلی میں کام کیا ہے"۔

یاور علی خان نے خود پر کنٹرول کر کے وضاحت کی۔

"اب بھی تسلی نہیں ہوئی ۔۔۔؟" خالہ نے خود اعتمادی کی نئی رمق اپنے اندر محسوس کی۔

"تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ فی الفور میری بچی کو میرے حوالے کیجئے۔ یہ دیکھئے میں تو اسے ہر قیمت پر ساتھ لے جانے آئی ہوں"۔

عورت نے چیک بک پرس سے نکال کر ان کے سامنے لہرائی۔

"خان! اگر آپ حج اکبر کا ثواب کمانا چاہتے ہیں تو اللہ کے واسطے زیتون بانو کو اس کے ساتھ مت بھیجئے گا"۔ خالہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"مت بولو تم ۔۔۔ تمہیں یہ حق دیا کس نے ہے؟" عورت غرائی۔

"خان! آپ کو اندازہ تو ہو گیا ہوگا یہ کون ہے ۔۔۔ خان! وہ بچی بہت معصوم ہے"۔ خالہ کی آواز بھرا گئی۔

"ہوں ۔۔۔ ہوں ۔۔۔ ایک منٹ"۔ یاور علی خان نے انہیں خاموش کرا دیا۔

"دیکھئے ۔۔۔ آپ کا کیس بہت کمزور ہے۔ اس کیلئے ایک ہی دلیل کافی ہے کہ اگر وہ آپ کی بیٹی ہے تو آج تک وہ آپ

سے دور کیوں رہی اور آپ کو آج سے پہلے کیوں خیال نہ آیا کہ اپنی اولاد کو اپنے ساتھ رکھنا چاہیے؟"

"میری مصروفیات مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ میں بچے کی نگہداشت کر سکوں۔ مگر میں اس کی پرورش کا مستقل معاوضہ ادا کرتی رہی ہوں۔"

عورت نے ساڑھی کی فال درست کرتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اگر وہ معاوضہ واپس کر دیا جائے ۔۔۔؟" تیمور علی خان بولے۔ عورت کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ تو کہہ رہے تھے ہم انسان خریدنے منڈی نہیں جاتے؟"

"بردہ آزاد کرنے کا ہمارے مذہب میں بڑا اجر ہے۔ خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ اس کی بچی معصوم ہے۔ وہ آپ کے ماحول کیلئے نہ ۔۔۔ آپ کا ماحول اس کیلئے مناسب نہیں ہے"۔ یاور علی خان اب مکمل پرسکون حالت میں بات کر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں اصل بات آ گئی تھی۔

"ہم آپ کو لکھ کر دے سکتے ہیں کہ ہماری آپ سے کوئی سودے بازی نہیں ہوئی"۔

"وہ میری اولاد ہے۔" "بردہ" نہیں ہے۔ کیا آپ کو شک ہے؟ اگر میں آپ کا شک دور کر سکتی ہوں"۔ عورت پھر بھڑکنے لگی۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں ہمیں کوئی شک نہیں"۔ تیمور علی خان نے جلدی سے کہا۔ ان کے کانوں میں سریلی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

آج پھر جینے کی تمنا ہے آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

"آپ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اسے حاصل تو میں ہر قیمت پر کروں گی۔ ہم بااثر لوگوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ انہیں لوگوں سے تو ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے"۔ عورت کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔

یاور علی خان اور تیمور دونوں نے عورت کے تیور بھانپ لئے تھے۔ وہ محض ایک ملازمہ کی خاطر طاقتوروں کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔

بابا صاحب تک وہ معاملہ پہنچانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ گرہ کھولنے کا نہیں بلکہ ڈوری توڑنے کا مزاج رکھتے تھے۔

"عارف! مطربہ کو بلا کر لاؤ۔ بہتر ہے کہ اس سے پوچھ لیا جائے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اور خالہ! آپ کو بھی اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں"۔ انہوں نے ایک لمحے میں فیصلہ کن مرحلہ طے کیا۔ یہ سراسر اس بچی کا معاملہ ہے

تیمور علی خان نے کچھ بولنا چاہا تو یاور علی خان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموشی کی تلقین کی۔ عارف مطربہ کو بلانے جا چکا تھا۔

"اگر اس نے آپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو آپ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے"۔ یاور علی خان نے عورت کو مخاطب کیا۔ خالہ ایک دم چپ ہو گئی تھیں۔

"کیوں میں اس کی ماں ہوں ۔۔۔ زبردستی بھی کر سکتی ہوں"۔ اس نے غرور سے ناک چڑھائی۔

"شہر بانو! تم وقت ضائع کر رہی ہو۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی"۔ خالہ نے ناگواری سے دوٹوک بات کی۔

"تم چپ رہو —— میں کون کر خواہ مخواہ۔ یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ ابھی اسے پوری بات سن لینے دو پھر یہ خود فیصلہ کرے گی"۔ عورت نے خالہ کو ڈانٹ دیا۔

"مجھے پتہ ہے پوری بات۔ مجھے نانی نے بہت پہلے سمجھا دیا تھا کہ —— میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی"۔ سطریہ نے خود پر قابو پا کر قدرے سکون سے جواب دیا۔

"یہاں غلامی ہے میری جان اور جہاں میں تجھے لے جا رہی ہوں وہاں تیری بادشاہت ہوگی۔ راج ہوگا۔ تیرے ملکوں جیسے سینکڑوں تیرے پاؤں چھوئیں گے۔ موٹا میرا وہ کھائیں پہنیں جن کا کوئی نہ ہو۔ میرے پاس تو جو ہے وہ سب تیرا ہے۔ تو راج کرنے کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ غلامی کرنے کیلئے نہیں۔ میری اپنی ماں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میری پھول جیسی بچی کو بیگار پر لگا دیا ہے۔ میرا تو کلیجہ پھٹتا ہے۔ ماں کا یہ حال جو جوتی اپنے ہاتھ سے نہیں پہنتی اور بچی دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرتی ہے"۔ عورت نے لہجے میں بڑا دکھ سمو کر کہا۔

"ماں ایسی نہیں ہوتی۔ مجھے ماں کے بغیر رہنے کی عادت ہے۔ اور میں خوش ہوں"۔ اس نے خالہ کا بازو تھام کر بہت سکون سے جواب دیا۔

"اپنا ایک ٹکڑا سیدھا کرنے کیلئے خوب پٹی پڑھائی ہے میری اولاد کو۔ خالہ کو شوق تھا تو خود پیدا کرتیں ایک بچی۔ ہونہہ۔ حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ ہو رہی ہے"۔

عورت نے غضبناک لہجے میں خالہ پر چڑھائی کی۔

"دھیان سے بات کرو بی بی۔ منہ سنبھالو (سنبھالو) میں نے کسی کو کوئی پٹی نہیں پڑھائی۔ تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ تمہارے پیٹھ پیچھے تمہارا ذکر کیا جائے"۔

خالہ نے از حد برا مان کر جواب دیا۔

"ہونہہ —— میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ ورنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔ صبح شام مالش کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلو لڑکی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو"۔ عورت نے ایک دم پینترا بدلا۔

سطریہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔

"دیکھئے محترمہ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جا سکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو ہم کوئی زیادتی برداشت نہیں کریں گے"۔

تیمور علی خان نے نہایت برہم لہجے میں مداخلت کی۔

"تو پھر ابھی قاضی کو بلوا لیجئے اور میرے سامنے نکاح کر دیجئے اس سے"۔

ڈرائنگ روم میں رواں دواں سانسیں یکلخت ساکت ہو گئیں۔ اتنا غیر متوقع حملہ تھا کہ خالہ تو مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگیں۔ سطریہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

یاور علی خان نے پہلو بدلا۔ اس بے ہودگی سے ان کا خون کھولنے لگا۔

تیمور علی خان ایک لمحے کو ہچکچائے تھے مگر فوراً ہی معقول اصحاب ہونے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"یہ اس لڑکی کی ذاتی پسند اور ناپسند کا معاملہ ہے۔ ہمارا کوئی پرسنل نہیں ہے اس لئے آپ ہم کو بھی اس معاملے سے قطعی باہر رکھئے۔ اس طرح تو کبھی اس وقت دیا جاتا ہے جب جاگیرداری کی بنیاد پر ہو۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو ہم اسے نہیں روکیں گے۔ پلیز آپ اپنے ذاتی مسئلے میں ہمیں شامل مت کیجئے۔ ہم اپنی طرف سے مورل سپورٹ کر رہے ہیں اپنا لنگو کیجئے پلیز"۔

تیمور علی خان نے بڑی ذہانت سے صورتحال سنبھالی۔

"اچھا تو بس پھر آپ خاموش رہیں۔ اپنی مورل سپورٹ اپنے پاس رکھئے۔ یہ ماں بیٹی کا معاملہ ہے"۔

عورت نے بڑی شاہانہ تمکنت سے ایک حساب سے تیمور علی خان کو ڈانٹ دیا۔

"آؤ لڑکی اٹھ جاؤ۔ تم ٹھہریں بے وقوف۔ یہ کیسے کھانے لوگ۔ ماں پر بھروسہ کرو۔ آؤ شاباش"۔ عورت نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اسے پچکارا۔

"خان"۔ سطریہ نے بدحواس ہو کر تیمور علی خان کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"م —— میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جہاں خالہ ہوں گی میں بھی وہیں رہوں گی"۔

"ہوں ہوں —— ٹھیک ہے ٹھیک ہے"۔ تیمور علی خان نے بڑے وقار سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا دیے۔

اس بے ساختہ اضطراری حرکت پر ان کا کوئی ردعمل نہیں تھا۔ وہ اس کی کیفیت محسوس کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

"جاؤ سطریہ اپنا کام کرو"۔ یاور علی خان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

خالہ کے چہرے کی رونق پلٹ آئی۔

"یہ میرے ساتھ جائے گی۔ یقین کریں جاگیردار صاحب آپ کو بڑی سہولت رہے گی۔ کیوں خود کو مشکلات میں ڈال رہے ہیں؟" بڑے مطمئن انداز میں دھمکی دی گئی۔

"جاتی کیوں نہیں ہو۔ کیوں کھڑی ہوئی ہو؟" یاور علی خان نے اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے پیچھے کھڑی سطریہ کو برہم لہجے میں مخاطب کیا۔

سطریہ نے یوں دوڑ لگائی جیسے گھوڑا ریس جیتنے کے لئے پر تولتا ہے۔ دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا ہوا عارف فوراً ایک طرف نہ ہو گیا ہوتا تو بہت برا تصادم ہوتا۔

عورت چند ثانیے دم بخود سی کھڑی رہی۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر کھینچ کر دونوں بھائیوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بہت اچھا —— اگر آپ کے پاس فالتو وقت ہے بیکار ضائع کرنے کیلئے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ پھر ملیں گے۔ مگر ذرا اور انداز سے"۔ وہ پراسرار انداز میں مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

خالہ بھی پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ انہیں خاتون سے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خود کو سوال جواب کے قابل نہیں پا رہی

تھیں

وہ پادو بی کے سر پر تھال تھا اور عطریہ کے ہاتھ میں باسکٹ دونوں کھلکھلاتی ہوئی بڑے پھاٹک کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ نئی صبح کا تاثر ابھی قائم تھا۔

"پھول خان"۔ تیمور علی خان نے کچی پکی پر بیٹھے مالی کو آواز دی۔ وہ کھرپا وہاں پھینک کر دوڑا چلا آیا۔

"جی خان"۔

"دیکھو وہ کالے کپڑوں میں جو لڑکی ہے اسے بلاؤ"۔ انہوں نے کتاب گھٹنوں پر الٹ کر رکھ دی۔

"وہ تو زیتون بانو ہے سرکار"۔

"ہاں ہاں —— وہ جو کوئی بھی ہے بلاؤ"۔ وہ جھلائے۔ مالی دوڑتا ہوا ان دونوں کی طرف گیا اور انہیں روک کر تیمور علی خان کی سمت متوجہ کیا۔

عطریہ نے ٹوکری وہیں رکھ دی۔ شاید وزنی تھی اور قدرے ڈرے ڈرے انداز میں ان کی طرف چلی آئی۔

"السلام علیکم خان!" اس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

"ہوں..... کہاں جا رہی ہو؟" انہوں نے اس کے سلام کا نوٹس نہیں لیا۔

"وہ جی —— ملکوں کے گھر جا رہے ہیں۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ اماں جی بھجوا رہی ہیں وہاں"۔ اس نے بہت آہستہ آواز میں بتایا۔

"دماغ تو خراب نہیں ہے تمہارا؟ تمہاری عمر کی لڑکیاں اتنی احمق بھی نہیں ہوتیں۔ حویلی سے باہر قدم بھی نہ نکالا کرو۔ کیا تم رات کا واقعہ بھول گئیں"۔

ان کے انداز میں بلا کی ناراضگی تھی۔

"نہیں جی —— وہ مگر"۔ وہ بوکھلا کر یکدم خاموش ہو گئی۔ خالہ کی ہدایات یاد آ گئی تھیں۔

"اغوا کر لے جائے گی وہ عورت تمہیں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو سیدھے راستے سے اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ ہمارے لئے کیوں دردِ سر پیدا کرتی ہو؟"

وہ اسی آف موڈ میں بات کر رہے تھے۔

"میں کیوں جاؤں اس کے ساتھ۔ خالہ کہہ رہی تھیں وہ صحیح نہیں ہے"۔ اس نے اتنی سادگی اور معصومیت سے کہا کہ تیمور علی خان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ اپنے اطراف میں ڈالی پھر ایک لمحہ کو اس کی سمت نظر اٹھائی۔ مگر فوراً ہی واپس موڑ لی۔

"تمہیں پتا ہے صحیح لفظ کا کیا مطلب ہے"۔ ان کی حسِ لطیف میں تحریک ہوئی۔

"پوچھا تھا میں نے خالہ سے"۔

"کیا بتایا انہوں نے؟" تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

"پہلے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا پھر ایک لمبی تقریر کی جہالت اور ویلیو سے... جیل جانے کو کہا"۔

تیمور علی خان کے ہونٹوں پر ملازمین نے بہت کم مسکراہٹ دیکھی تھی۔ عطریہ تو حواس ہی کھو گئی۔

"وہ عورت غیر نہیں ہے۔ ماں ہے تمہاری"۔ انہوں نے اس کا روشن چہرہ دیکھا۔

"نہیں خان —— ماں ایسی نہیں ہوتی۔ نانی کہتی ہیں کہ جب میں ڈھائی سال کی تھی تو گاؤں میں کوئی وبا پھیلی تھی وہ میں مرتے مرتے بچی تھی۔ نانی نے بتایا کوئی سواری نہیں تھی وہ مجھے اٹھا کر چوکی والے پیدل چلی تھی۔ آگے وہ ڈاکٹر نہ ملتا تو اس وقت مر جاتی تو —— نانی نے مجھے بہت پہلے سمجھا دیا تھا کہ زندگی میں کبھی کوئی عورت تیری ماں بن کر آئے تو کبھی اعتبار نہ کرنا۔ تو بس ماں کی ہے۔ میں ہی تیری ماں ہوں۔ میں ہی تیرا باپ ہوں۔ بس —— سردار ماموں نے بھی مجھے یہی بتایا ہے کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں جب میں چھوٹی تھی بہت بیمار آتی تو نانی مجھے چند دن میں بھیج دیتی تھیں سردار ماموں کے پاس"۔

"یہ سردار ماموں کون ہے؟" گفتگو میں دوسری مرتبہ سردار ماموں کا تذکرہ آیا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

"میں شروع سے ان کو سردار ماموں کہتی ہوں۔ ماموں ہی ہوں گے"۔ اس نے عجیب بے ربط سا جواب دیا۔

"تمہیں اندازہ ہے کہ وہ تمہیں کیوں لینے آئی تھی؟" انہوں نے خاصی دلچسپی سے اس کی شکل دیکھی۔

"نہیں —— میں تو خود حیران تھی کہ یہ مجھے کیوں لینے آئی ہے۔ شاید اس سے گھر کا کام نہیں ہوتا ہوگا"۔

کیا سادگی تھی تیمور علی خان نظریں نہ اٹھا سکے۔

"بہرحال نوٹ کر لو تم حویلی سے باہر خواہ کتنا ہی ضروری کام ہو نہیں جاؤ گی سن لیا؟"

"جی —— آپ نے تو جی اس کی باتوں کا بہت برا مانا ہوگا"۔ اس نے چوری چوری تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

ان جیسے ذہین آدمی کیلئے اس کی بات سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ وہ کتاب کے صفحے پلٹنے لگے۔

"جاؤ، پادو بی کو کہو، اکیلی چلی جائے۔ وہ کھڑی ہوئی تمہارا انتظار کر رہی ہے"۔

انہوں نے واضح اشارہ دیا کہ وہ اس موضوع پر اس سے اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔

وہ آہستگی سے پلٹ گئی۔ تیمور علی خان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں مگر وہ کتاب کی سطریں نہیں اس کے دور ہوتے پاؤں دیکھ رہے تھے۔

بڑی ظالم ساس تھی میری۔ ہاتھ چھٹ بھی بہت تھی۔ جو چیز ہاتھ میں آتی کھینچ مارتی۔ چار بالشت کا گھونگھٹ گود میں بچہ۔ سلور کا طباق کھینچ مارا۔ اب گھونگھٹ میں روتی بھی جا رہی ہوں۔ روٹیاں بھی پکاتی جا رہی ہوں۔ اور جو بچی ناک سے سرسر کرتی تو سلوا تمہیں بھی شروع کہ کون مر گیا ہے کس کو رو رہی ہے"۔

خالہ سوا آنے نے چاول پھٹکتے ہوئے سسرالی مظالم کا نقشہ کھینچا۔

"توبہ ہے۔ اللہ کو جان بھی دینی ہوتی ہے۔ مرنا یاد نہیں رہتا لوگوں کو"۔ اماں جی نے تاسف کا اظہار کیا۔

"آپ لوگ تو بہت خوش قسمت ہیں کہ اماں جی جیسی عورت آپ کی ساس ہے"۔

خالہ سول آنے نے عالم تاب اور نازنین کو خوش قسمتی کا احساس دلایا۔

"ارے ۔۔۔ بہوئیں تو گھر کی رونق ہوتی ہیں۔ گھر کی بہار ہوتی ہیں۔ مجھے اپنی بہوئیں بہت پیاری ہیں۔ میں تو زیبا، روشن آرا اور ربیعہ کو کہتی ہوں کہ تم دوسرے گھروں کی رونق ہو۔ میری تو بہوئیں ہی بیٹیاں بھی ہیں۔ یہ کہو انہیں کسی کی ریس کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تو جو کچھ کرنا ہے اسی گھر میں کرنا ہے۔ اللہ سے دعا کیا کرو۔ اللہ تمہارے بچوں کی گود ہری بھری رکھے"۔ اماں نے اپنے مخصوص سادہ انداز میں کہا۔

"اماں جی! میری امی بہت شفیق اور محبت والی ہیں۔ میں ان کے بغیر ایک دن نہیں رہتی تھی۔ مگر آپ نے تو مجھے سب کچھ بھلا دیا"۔ نازنین نے بہت محبت سے ساس کو دیکھا۔

"اللہ انہیں خوش رکھے۔ تمہاری امی بھی تیز دی ہے تمہیں۔ بات کرتی ہو تو جیسے منہ میں شہد پڑ جاتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ جیسی ماں ویسی جائی"۔

اماں جی نے ہاتھ بڑھا کر نازنین کے سر پر پھیرا۔

"میں تو اپنی نوکرانیوں سے اونچی آواز میں بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ بہوئیں تو اس گھر کی شان ہیں۔

"یہ عالم تاب اتنا کام کرتی ہے۔ بہت کہتی ہوں کیوں اپنی جان ہلکان کرتی ہے۔ بہوئیں کام کے لئے تو نہیں آتے۔ جب ذمے داری پڑتی ہے تو سب ہی اچھا برا کر لیتی ہیں۔ کام دھام کے پیچھے کیا فضیحتہ کرنا جس کا سوچ لے کرے۔ اتفاق ہو تو سب کام نمٹ جاتے ہیں"۔

"توبہ اماں جی۔ میری ساس تو خالی بیٹھا دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ بچے کو دودھ پلاتے پلاتے بھی دوپہر کو ٹھوکر مار کر اٹھاتی تھی۔ کہ حرام خور اٹھ۔ شام کیلئے آٹا نہیں لے۔ خصم آئے گا تو کیا ریت پھانکے گا"۔

خالہ نے ایک اور زیادتی یاد کی۔

"اے ہے توبہ توبہ"۔ اماں جی کو تو بہت ہی دکھ ہوا۔

"بچے والی عورت کی تو جان یوں بھی آدھی ہوتی ہے۔ اللہ توبہ"۔

"بچہ بھی چلا گیا اللہ کے پاس۔ وادی کی کل کل کھا گئی اسے۔ پھر تو گود ہری ہی نہ ہوئی"۔ خالہ آواز بھرا گئی۔

"یہ بچے بھی تیرے ہیں سول آنے۔ آج تک تجھ سے کوئی بھی تڑخ کر تراخ سے بات کی کسی نے؟" اماں جی تو خالہ کی بھرائی آواز پر تڑپ کر رہ گئیں۔

"اماں جی۔ آپ نے تو ہیرے کی جوتی کو سر پر بٹھایا ہے"۔ خالہ نے آنکھیں پونچھیں۔

"ہاں خالہ! انہیں تو تم جنتی اچھی لگتی ہو۔ وہ دن کو گاؤں کیا گئیں ہماری تو حویلی ہی سونی ہو گئی"۔ ربیعہ بیگم نے اماں کا دھیان بٹایا۔

"یہ جہاں بانو نظر نہیں آئی صبح سے"۔ معاً عالم تاب کو دھیان آیا۔

"میں نے بھیجا ہے۔ وہ پارو بی کے ساتھ ملکوں کے ہاں"۔ اماں جی نے جواب دیا۔

اسی دم معطر بیگم اندر داخل ہوئی۔

"امی! آج کہاں گئی تھی ملانی؟" اماں جی نے پوچھا۔

"میں نہیں گئی۔ خان نے باہر جانے سے منع کر دیا ہے۔ وہ پارو بی اکیلی گئی ہے"۔ معطر خالہ کے مقابل بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

"خان نے؟ کون سے خان نے؟" اماں جی متعجب ہوئیں۔

"تیمور خان نے"۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔

"ہائیں ۔۔۔ کیوں؟" انہیں خاک سمجھ نہیں آئی۔

"وہ کہہ رہے تھے"۔

"ہاں ۔۔۔ ہاں ہر جگہ لونڈے لپاڑے کھڑے رہتے ہیں۔ اس لئے منع کر دیا ہو گا خان نے"۔

خالہ نے انتہائی حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹکڑا بھی لگایا اور چھالیہ اس کے گھٹنے پر زور سے رکھا گویا خاموش رہنے کی تنبیہ کی۔ معطر نے چونک کر خالہ کی شکل دیکھی اور چاولوں میں ہاتھ مارنے لگی۔

"تائا ۔۔۔ یہ تیمور کب سے اتنا ذمہ دار ہو گیا؟" اماں جی کو جیسے بہت خوشی ہوئی تھی۔

"بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ انگلستان میں رہتے ہیں اماں جی جو پوری دنیا کو غلام بنا کر بھی نہیں تھکے"۔ نازنین ہنس کر گویا ہوئی۔

"واقعی یہ گورے تو بہت ہی ہوشیار ہوتے ہیں"۔ اماں جی نے تائید کی۔ "مگر تیمور میں چالاکی والی نہیں بہت سیدھا ہے میرا بچہ"۔

"سب ماؤں کو اپنے بچے سیدھے لگتے ہیں اماں جی"۔ ربیعہ بیگم شرارت سے بولیں۔

"لو ۔۔۔ تو تم نے کچھ دیکھا ہے اس میں۔ ایک کونے لگا پڑا رہتا ہے۔ زیادہ ہوتی ہے تو ماں بہنوں بھاوجوں سے جھگڑ جھاڑ کر لیتا ہے"۔ اماں جی مذاق دل پر لے گئیں۔

"ہائے اماں جی ۔۔۔ برا مان گئیں؟ آپ کا بیٹا ہے تو میرا بھائی ہے۔ بہنوں کو بھی اپنے بھائیوں میں کوئی برائی نظر نہیں آتی"۔ ربیعہ بیگم نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"معطر بیٹا کیسے ہیں تیمور خان؟" ربیعہ بیگم یونہی پوچھ بیٹھیں۔

"مجھے تو جی ان سے بڑا ڈر لگتا ہے"۔ وہ بے ساختہ بولی۔

"ہاں اتنا تو خوبصورت ہے میرا بھائی"۔ ربیعہ بیگم مصنوعی ناراضگی سے گویا ہوئیں۔

"کس کی تعریف ہو رہی ہے؟" تیمور علی خان کتابیں ہاتھ میں لئے ہال میں داخل ہوئے۔

"ماشاءاللہ بڑی عمر ہے"۔ عالم تاب مسکرائیں۔

"مگر ابھی ہونا چاہیے یعنی جیسی ہم چاہیں ورنہ کیا فائدہ لمبی عمر کا"۔ وہ ماں کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

"ماشاءاللہ..... ابھی ہی گزر رہی ہے۔ کم نہیں بولتے بیٹے"۔ اماں جی نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آخر کار خیر کس سلسلے میں ہو رہا تھا؟" انہوں نے بہن کی سمت دیکھا۔

"ارے یونہی الٹی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ان کی عقل چلی گئی۔ لو اس بچی سے پوچھ رہی تھیں جیسے وہ بھی صفائی بیچتی ہی ہو کہ تیمور کیسے ہیں؟" اماں جی نے اپنے سیدھے پن میں ٹھیک ٹھیک..... رپورٹنگ کی۔

تیمور علی خان کی آنکھوں میں الجھن اور ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے رضیہ بیگم کی سمت دیکھا۔

"اوں..... دی کو بھی دیکھو سوال گندم جواب چنا۔ کہہ رہی تھی مجھے تیمور خان سے ڈر لگتا ہے۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ مارتا ہے تجھے؟" اماں جی مزید گویا ہوئیں۔

مطربہ کے چہرے پر شرمندگی کا عکس جھلکنے لگا۔ وہ مزید تیزی سے چاولوں میں ہاتھ مارنے لگی۔ تیمور علی خان نے دوپٹے کے ہالے میں اس کا معصوم اور شرمندہ شرمندہ سا چہرا ایک لمحے کو دیکھا۔

"لیکن ہمارے کریکٹر سرٹیفکیٹ پر اتنی اہم اسٹیمپ لگانے کی ضرورت کس سلسلے میں پیش آئی"۔ ان کا انداز پہلی طرح پر اعتماد تھا۔

"ارے ویسے ہی ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ ان لڑکیوں کی تو عادت ہی ہے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کی"۔ اماں جی نے قصہ کوتاہ کرنے کا انداز اختیار کیا۔

"کیوں بھئی۔ تمہیں کیوں ڈر لگتا ہے ہم سے؟" تیمور براہ راست مطربہ سے مخاطب ہوئے۔

وہ خاموش رہی مگر دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"اب بتا دے کیوں ڈر لگتا ہے؟" خالہ نے بھی زور ڈالا۔

وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔

"ارے ہٹاؤ..... بچی ہے ویسے ہی کہہ دیا ہوگا۔ کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے غریب کے"۔ اماں جی کی پرسکون نشست تکرار سے بوجھ بن رہی تھی۔

"نہیں نہیں اب تو بتانا ہی پڑے گا"۔ نازنین نے شرارت سے تیمور کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا پتا کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ ہر وقت ہمیں لاجواب کرتے رہتے ہیں"۔ وہ ہنسی۔ "ہاں بتاؤ نا مطربہ"۔

"آپ سے زیادہ ہمیں اشتیاق ہو رہا ہے بھابی جان"۔ تیمور علی خان بھلا ہار ماننے والے تھے۔

مطربہ اسی طرح خاموش رہی۔

"نہیں بولے گی اب شرط لگا لو"۔ عالم تاب گویا ہوئیں۔

"ابھی بلواتا ہوں۔ ایک ویک پوائنٹ ہے میرے پاس"۔ تیمور علی خان گردن موڑ کر بھاوج سے مخاطب ہوئے۔

"وہ..... کیا نام ہے تمہارا راز کی؟" وہ دوبارہ بھتیجی سے مخاطب ہوئے۔

"آپ 'لوری' ہی کہہ لیا کریں"۔ وہ گمبھیر آواز میں بولی تھی۔

ہال میں بے ساختہ قہقہے گونج اٹھے۔ تقریباً سب ہی نے تیمور کے یادگار انداز کو سراہا تھا۔ بس اماں جی اور خالہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے سب کو دیکھے گئیں کہ بھلا ہنسنے کی کیا بات ہے؟

"لائیے ہمارا انعام"۔ تیمور نے عالم تاب کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔

"جی نہیں..... پہلے یہ پتا چلنا چاہیے کہ یہ تم سے خوفزدہ کیوں ہے؟" وہ بھی اپنی ضد پر اڑی تھیں۔

"یہ چیٹنگ ہے۔ بات بلوانے کی ہو رہی تھی۔ کیوں مسز خواتین؟"

"نہیں نہیں اصولی بات ہے بھابی بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں"۔ رضیہ بیگم نے انصاف کا میزان سیٹ کیا۔

"چلیں یہ بھی کر لیتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں ڈرتی ہو ہم سے؟" وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

"آپ مالک ہیں جی اور مالکوں سے سب ہی ڈرتے ہیں"۔ وہ بلک کر رو پڑی تھی۔

"لیجیے تو سب ہی ستانے میں رہ گئے۔"

"حد ہو گئی۔ خوامخواہ بچی کو پریشان کر دیا۔ کیا کہتی ہے غریب؟" اماں جی کو بات کا دکھ ہوا۔

"اے احمق، ستانا کہتے ہیں"۔ وہ خفگی سے گویا ہوئیں۔ "چپ کر جا بچی۔ چل اٹھ۔ جا شاباش۔ پانی پی جا کر۔ حد ہو گئی تم لوگوں سے بے ماں باپ کی بچی ہے۔ خیال کرنا چاہیے"۔ ان کا انداز خفگی بھرا تھا۔

"آپ کو کس نے بتایا کہ بے ماں باپ کی ہے"۔ تیمور علی خان نے خالہ پر سرسری نگاہ ڈال کر ماں سے سوال کیا۔

"لو بھئی یہ بات ہے ماں باپ ہوتے تو سوال آنے کے ساتھ کیوں بند ہی ہوتی۔ کیوں سوال آتے"۔ وہ تخت سے اترتے ہوئے بولیں۔

خالہ خاموش رہیں۔

مطربہ آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"اچھا بھئی ہم بھی چلتے ہیں"۔ تیمور اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اماں جی ہم ایک رات کیلئے سیر کے لیے جا رہے ہیں وہاں سے ..... دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام ہے"۔

"بیٹے کیوں بے زبانوں کو خون میں نہلاتے ہو۔ جیسے وہ رب اللہ نے انہیں زندگی دی ہے۔ تمہیں کیا بھاری ہے۔ کیا کہہ رہے ہیں تمہیں"۔

رفیق القلب اماں جی نے بساط بھر دل نرمانے کی کوشش کی۔

"تیمور ہنس دیے۔

"اماں جی یہ جو عربی لوگ ہیں ناں۔ ایک کھیل کھیلتے ہیں جو بیٹے کی طرح کا۔ اونٹوں پر انسانوں کے معصوم بچوں کو باندھ کر اونٹ بھگاتے ہیں۔ بچہ ڈر کر چیختا ہے تو اونٹ اور تیزی سے بھاگتا ہے۔ جس کا اونٹ سب سے آگے نکل جاتا ہے وہ

جیت جاتا ہے۔ اور جب اونٹ تیزی سے بھاگ رہے ہوتے ہیں تو بچے گر بھی جاتے ہیں۔ وہ اونٹ بچوں کو روند ڈالتے ہیں۔ معصوم بچے ہمیشہ کیلئے معذور ہو جاتے ہیں"۔

"ہائے میرے اللہ"۔ اماں جی سینے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ تخت پر بیٹھ گئیں۔

"کون ظالم اپنے بچے ان کو دیتے ہیں۔ کیا اندھیر ہے"۔

"دے گا کون؟ ایک الگ کاروبار ہے۔ بچے اغوا کر کے سمگل کر دیئے جاتے ہیں۔ بعض ملکوں میں اتنی غربت ہوتی ہے کہ ماں باپ خود اپنی اولاد کو بیچ دیتے ہیں"۔ تیمور نے مزید معلومات بہم پہنچائیں۔

"میں نہیں مانتی..... یہ اغوا والی بات تو خیر سچ ہو سکتی ہے۔ مگر ماں باپ اپنی اولاد کو بیچ دیں تو پھر کہو۔ اتنا اندھیر ہو گیا ہے کیا؟"

اماں جی دہل کر رہ گئیں۔

"کیا واقعی تیمور؟" عالم جناب نے بھی دکھ اور تعجب کا اظہار کیا۔

"جی..... بھابی بیگم۔ یہ سب ہو رہا ہے"۔ انہوں نے یقین دلایا۔

"کیا قیامت ہے۔ لڑکیوں، بچوں کا دھیان رکھا کرو۔ اللہ اپنا کرم کرے سب پر"۔ اماں جی کو پوتوں نواسوں نواسیوں کی فکر پڑ گئی۔

"اچھا بیٹے! جب بچے معذور ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا کیا کرتے ہیں"۔ اماں جی تو اپنے سب کام بھول بیٹھیں۔

"کیا کرتے ہوں گے یتیم خانوں میں ڈال دیتے ہوں"۔ تیمور کو افسوس ہونے لگا کہ کیوں اماں کے سامنے یہ بات کی۔

"اللہ کسی کو اولاد کا دکھ نہ دکھائے سب کی مامتا ٹھنڈی رکھے"۔ وہ ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے لگیں۔

تیمور نے ماں کے ہاتھ تھام کر چوم لئے۔ "دنیا میں جتنی روشنی نظر آتی ہے شاید ماؤں کی دعاؤں کی وجہ سے ہے"۔

اماں جی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"ماما..... عطریہ نظر نہیں آئی صبح سے"۔ تیمور نے اخبار سے نظریں ہٹا کر ماما کی سمت دیکھا۔

"وہ تو چھوٹی دلہن اور بڑی بی بی جان کے ساتھ بازار گئی ہوئی ہے کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں"۔ ماما نے برتن سمیٹتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔

"بازار گئی ہے۔ کب گئی تھیں یہ لوگ بازار؟" انہوں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور فکرمندی سے گویا ہوئے۔

"وہ تین گھنٹے... ساتھ گئے نہیں۔ کیا خریدنے گئی ہیں ایسا؟ اور کون ڈرائیور ان کے ساتھ گیا ہے"۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی..... یہ تو مجھے پتا نہیں"۔ ماما نے لاعلمی ظاہر کی۔

"موتی بازار گئی ہیں؟" وہ اضطراری انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"شاید"۔ ماما اب پریشان ہو گئی۔

"اسے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی اسے کیا خریدنا ہوتا ہے"۔ وہ بڑبڑا رہے تھے۔

"سامان ہی پکڑ رکھتی ہے خان"۔ ماما کو ان کی کیفیت سے احساس ہونے لگا۔

"اچھا جاؤ اور بھائی سے گاڑی کی چابی لے کر آؤ"۔ وہ جھلا کر بولے۔

ماما نے انتہائی تعجب سے ان کی شکل دیکھی پھر کچھ بولے بنا باہر نکل گئی۔

تیمور کمرے میں ٹہلنے لگے۔

ماما جلدی واپس آ گئی تھی۔ اس نے چابی تیمور علی خان کو تھما دی۔ وہ بجلی کی تیزی سے باہر نکلے تھے۔

ماما بری طرح الجھ گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

وہ اپنے کام میں ضرور مصروف تھی مگر ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ کہ آخر عطریہ کے باہر جانے میں کیا قباحت ہے؟

اسی دم تینوں راہداری سے گزرتی نظر آ گئیں۔ عطریہ نے دونوں ہاتھوں میں سامان اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہال کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ماما تقریباً بھاگتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

"بی بی جان..... وہ تیمور خان آپ کو راستے میں نہیں ملے؟"

تینوں کی تینوں اپنی جگہ ٹھٹک گئیں۔

"خیریت؟" زبیدہ پریشان ہو کر پوچھنے لگیں۔

"وہ آپ لوگوں کو لینے گئے ہیں شاید"۔ ماما نے جلدی سے کہا۔

"ہمیں لینے؟ مگر کیوں؟ تم نے بتایا نہیں کہ ہم ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں گئے ہیں؟" نازنین نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ جی انہیں پتا ہے"۔ ماما کی سمجھ میں تو نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بات کس طرح سمجھائے۔

"تو..... کیا ہو گیا ہے ماما۔ مسئلہ کیا ہے؟" زبیدہ بیگم زچ ہو گئیں۔

"وہ جی..... انہوں نے عطریہ کا پوچھا تھا۔ میں نے بتایا آپ کے ساتھ بازار گئی ہے تو خفا ہونے لگے کہ اس کے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر پوچھا آپ لوگوں کو گئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے۔ جب میں نے بتایا دو تین گھنٹے ہو گئے تو مجھ سے یاور خان کی گاڑی کی چابی منگوائی اور فوراً حویلی سے چلے گئے"۔ ماما نے تفصیل سے بتایا۔ وہ دونوں عطریہ کی شکل دیکھنے لگیں۔

"تجھے کوئی کام کہہ رکھا تھا؟" زبیدہ بیگم کو بھائی کی نازک مزاجی کا دھیان آیا تو عطریہ سے پوچھنے لگیں۔

"نہیں جی۔ میں ان کے کسی کام میں دیر نہیں کرتی"۔ اسے کیونکہ احساس تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا اس لئے نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔

"پھر؟" نازنین اور زبیدہ بیگم دونوں الجھ گئیں۔

"تو ضرور اس کا کوئی اہم کام بھول گئی ہو گی"۔ زبیدہ بیگم کو اس کی یادداشت پر شک ہوا۔

"آپ قسم لے لیں۔ میں نے تو صبح سے انہیں دیکھا بھی نہیں"۔ وہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔

"اچھا چل۔ ہال میں سامان تو رکھ۔ اور ذرا دماغ پر زور ڈال ہو سکتا ہے کل رات کوئی کام کہا ہو"۔

رئیسہ بیگم کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی بات ان کے دھیان میں نہیں آ رہی تھی۔

مطربہ آگے بڑھ گئی اسے دماغ پر زور ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے سب علم تھا کہ یہ سب کیوں ہوا ہے۔ البتہ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ معلوم نہیں تیمور علی خان اس کے ساتھ کس طرح پیش آئیں گے؟

اس نے سرخ مخمل کی چادر اور گاؤ تکیوں سے آراستہ تخت پر تھیلے پھینکنے کے انداز میں رکھے اور چادر اتار کر گولا بنا کر ایک طرف رکھ دیا اور پنکھا چلا کر پسینہ سکھانے لگی۔ گھبراہٹ بھی بہت تھی۔

تھوڑی دیر بعد گھر کی تقریباً تمام خواتین ہال میں چلی آئیں۔ کی ہوئی شاپنگ پر ابھی تبصرے باقی تھے۔

"مطربہ! اللہ پانی تو پلا۔ تپتی دھوپ میں تو حلق میں کانٹے پڑ گئے"۔ رئیسہ بیگم ایک صوفے پر لیٹ گئیں۔ "اور ماما سے کہنا چائے ذرا جلدی بنائے"۔

وہ بمشکل سنبھلتی باہر چلی گئی۔ راہداری میں اس نے ڈرے ڈرے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور دو تین گلاس ٹرے میں رکھے پھر ماما کی طرف چلی۔

"ماما! بی جان کہہ رہی ہیں کہ چائے ذرا جلدی بنا لو"۔

"تیرا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟ کیا تھک گئی؟" ماما نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ماما"۔ اس نے ماما کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"ہوں؟" ماما سر سے پاؤں تک متوجہ تھی۔

"کیا تیمور خان غصے میں تھے؟" وہ دل سنبھالنے کے جتن کر رہی تھی۔

"تھے تو غصے میں۔ بات کیا ہے مطربہ! مجھے بتا دے کسی سے نہیں کہوں گی"۔ ماما اس کے قریب چلی آئی۔

"کوئی بات نہیں ماما۔۔۔۔۔ بس تم خان کو ذرا سمجھا دو کہ مجھے گاؤں بھجوا دیں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے حویلی میں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ جیسے کوئی گناہ کر کے چھپے پھر رہے ہیں"۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

مغرب کی نماز کی وجہ سے حویلی میں ایک سکوت طاری تھا۔

وہ اماں جی کے کمرے میں چلی آئی۔ اماں جی ابھی نماز میں مصروف تھیں۔ وہ دروازے کے قریب بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

اماں جی نماز سے فارغ ہو کر طویل دعا میں مصروف ہو گئیں۔ وہ ان کے پہلو کی طرف آ کھڑی ہوئی۔

"اماں جی! آپ کے پاس تو سب ہی کچھ ہے آج دعا چھوٹی مانگ لیں"۔ اس سے رہا نہ گیا اور بول پڑی۔

اماں جی نے جلدی جلدی دعا پوری کی چہرے پر ہاتھ پھیرا اور نہایت حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"اماں جی۔۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کس سے؟" وہ قدرے حیران ہوئیں۔

"تیمور خان سے"۔ اس کی آواز میں بھی آنسوؤں کا اثر تھا۔

"آ۔۔۔۔ ادھر بیٹھ میرے پاس"۔ اماں جی کے چہرے پر فکر مندی جھلکنے لگی۔

وہ قالین پر بیٹھ گئی۔ "آپ کی نماز کی جگہ ہے پھر وضو نہیں ہے"۔ اس نے فاصلے پر بیٹھنے کی توجیہہ پیش کی۔

"کیوں ڈر لگ رہا ہے تجھے تیمور سے؟" وہ بہت تشویش سے پوچھ رہی تھیں۔ اس کا حسین چہرہ انہیں ہولانے لگا۔

"وہ میں بی بی جان کے ساتھ بازار چلی گئی تھی"۔

"تو کیا ہوا اس سے پہلے بھی تو گئی تھی"۔ ان کا ذہن ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ کل بھی اس نے رحمو دادی کے ساتھ جانے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے تو آج تک کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں لگائی۔ حتیٰ کہ کبھی دھیان بھی نہیں دیا تو پھر ایک دم دیا ہے۔ وہ یکدم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"آپ کہہ دیں کہ اب کہیں نہیں جاؤں گی میری توبہ"۔ وہ رو پڑی۔

"ہے ناں بے وقوف۔ کہہ دوں گی بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ پاگل تو نہیں ہے۔ کہاں نہیں جانے کو تجھے۔ پر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ وہ تیرے باہر جانے پر غصہ کیوں کرنے لگا ہے"۔

ان کی تشویش بجا تھی۔ انتہائی لاپرواہ انسان ایک معمولی ملازمہ پر اتنی توجہ کیوں دے رہا ہے۔ کچھ تو بات ہے ورنہ اس کی بلا سے سارا گھر باہر گھومنے لگے تو وہ پوچھے۔

"آپ خود ہی پوچھ لینا اماں جی۔ میں تو آج آپ کے کمرے سے باہر نہیں جاؤں گی۔ یہیں پڑی رہوں گی"۔

"خدا نخواستہ بندوق تانے بیٹھا ہے تجھ پر پاگل کہیں کی"۔ وہ ناراض ہو گئیں۔

"اماں جی مجھے کسی کا غصہ بھی برداشت نہیں اور خان کا تو بالکل بھی نہیں۔ مجھے ہر کسی کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ کی قسم اماں جی"۔

"تو بے وجہ رائی کا پہاڑ بنا رہی ہے۔ کہہ دوں گی میں اس سے کہ تجھ سے آرام سے بات کیا کرے۔ تیرا دل کمزور ہے۔ جا اب۔ شاباش کام کر"۔

وہ کیونکہ حقیقت حال سے بے خبر تھیں اس لئے بے نیازی ظاہر تھی۔

اسی دم ماما اندر داخل ہوئی۔

"تیمور خان بلا رہے ہیں تجھے"۔ وہ مطربہ سے مخاطب ہوئی۔

"اماں جی!" اس نے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔

"تیمور کو یہیں بھیج دو ماما"۔ اماں جی اپنی نماز کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔

مطربہ بے آواز باہر نکلنے لگی۔

"تو کہاں چلی۔ ٹھہر ابھی۔ تیرے سامنے ہی بات کروں گی سب کچھ۔ آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ معاملہ کیا ہے۔ کہاں طویل فسانہ بن رہا ہے"۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائیں۔

وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ چند منٹ گزرے کہ تیمور اندر داخل ہوئے۔

"کہاں ہے وہ مصیبت؟" وہ تھکن کی وجہ سے شاید خاصے بدمزاج ہو رہے تھے اور شاید وقت کے زیر اثر بھی۔

"کیا بات ہے بیٹے! کیوں غصہ کر رہے ہو اس بے ماں باپ کی بچی پر۔ نوکر تو خود بھی چاہتا ہو گا کہ وہ نوکر ہے۔ ہزار بار جتاتا ہے کہ وہ نوکر ہے۔ جو کام وہ کرتا ہے۔ وہ کام ہی اسے یاد دلانے کو کافی ہے کہ وہ نوکر ہے۔ ضرور بھی خریدا ہوا نہیں ہے۔ ہمارے نوکری پشتوں سے چلے آ رہے ہیں لوگ سمجھتے ہیں ہم نے خریدے ہیں۔

تمہارے بابا صاحب برما سے دو لڑکیاں لائے تھے۔ مول۔ ایسی سونی جیسی۔ گوری گوری چھوٹے چھوٹے قد کی۔ میں نے تو تمہارے بابا صاحب کی جان کھالی۔ ایسی کبوتروں کی طرح سہمی ہوئی تھیں کہ میرا تو دل ہی دکھ گیا۔ واپس بھجوا دیا تھا میں نے تو۔ وہ غصے بھی ہوئے تھے کہ تمہاری خدمت کو لایا تھا۔ میں نے کہا میں نہیں لیتی زر خرید کی خدمت۔ مول میں مجھے کوئی اوپر سے دکھاوے کو ٹھنڈا پانی پلائیں۔ سو منہ پھلائیں۔ نہ بابا۔

جس کی خدمت کرنے کو جی نہ چاہے۔ چلا جائے حویلی سے ہم روکیں گے نہیں۔ اگر اس کا کام میں دل نہیں لگے گا تو سولہ آنے سے کہہ دوں گی واپس گاؤں چھوڑ آ۔ بس۔

بیٹے اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو آہستہ بھی نہیں ہو گی۔ اب تم میرے پاس بیٹھ کر بھی خوشی کی باتیں کرو۔ چائے منگوا لا کرے تا خان کیلئے"۔

اماں جی نے امن کی فاختہ کا رول یوں ادا کیا جیسے کوئی یاد کیا ہوا سبق سناتا ہے۔ کیونکہ وہ خود اونچی آوازوں اور بگڑے ہوئے تیوروں سے گھبراتی تھیں۔ اس لیے بھی مستعدی کا قائل ذکر تھی۔

"اماں جی"۔ تیمور علی خان زچ سے ہو گئے۔

"جب آپ کو کچھ پتا ہی نہیں تو کیوں اس احمق اور گنوار کی حمایت کر رہی ہیں"۔

"ہاں تو پھر بتا کر دو ناں مجھے؟" وہ برا مان گئیں۔

"تمہیں ہم نے کہا تھا ناں کہ حویلی سے باہر قدم نہ نکالنا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟"

وہ ماں کو جواب دینے کی بجائے اس سے مخاطب ہوئے۔

"میں اکیلی نہیں تھی خان۔ بی بی جان اور"۔

"شٹ اپ۔ جب تمہیں کہہ دیا تھا تم باہر نہیں جاؤ گی نہ اکیلی نہ کسی کے ساتھ۔ حویلی یہاں عزت کی علامت ہے۔ کوئی تماشہ ہوا تو گاؤں والے بابا صاحب کے بارے میں کیا سوچیں گے کہ وہ کن لوگوں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ ہماری طرف سے تم جہنم میں جاؤ مگر ہم تمہیں اپنے خاندان کیلئے مصیبت نہیں بنا سکتے"۔ وہ برہم ہوئے۔

"کیا بات ہے بیٹے! کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ خدانخواستہ کیا بات ہوئی ہے کہ عزت کا مسئلہ ہو گیا ہے۔

مجھے بتا دو میں خود سنبھال لوں گی"۔

اماں جی تیمور کو غصے سے کچھ کہتا دیکھ کر بے حد پریشان ہو گئیں۔

"جب خالہ اسے لائی تھیں آپ نے انکوائری کیا تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کے گھر والے کون ہیں کہاں رہتے ہیں؟" وہ ماں کی طرف پلٹے۔

"انکوائری کیا کرنا تھا بیٹے! خالہ چودہ سال سے حویلی میں ہے۔ عزت دار ہے گھر والی ہے۔ آج تک کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ محنت کرکے کھاتی ہے۔ خوشی خوشی خدمت کرتی ہے۔ کبھی نہیں کہا اس نے کہ مجھ سے سوال جواب کرتی"۔

اماں جی نے خاصی حیرت سے ان کی صورت دیکھی۔

"لیکن جب کوئی حویلی میں آئے آپ کو اس کا نام پتہ معلوم کرنا چاہیے"۔ تیمور نے اسی انداز میں کہا۔

"بس یہ پتا بہت ہے کہ یہ سولہ آنے کی بھانجی ہے۔ اور سولہ آنے ایک بھلی دکھی عورت ہے"۔ اماں جی نے سادگی سے جواب دیا۔

"تم نے بچی کی کوئی غلطی دیکھی ہے؟" سارا وہ چونک کر پوچھنے لگیں۔ تیمور خاموش رہے۔

"اماں جی! انہیں اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ بہت کم عمر اور بے وقوف ہے۔ اور کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بھی اس حویلی کی ملازمہ ہے۔ اگر اس کے ساتھ زیادتی ہو گی تو ہمیں بہت دکھ ہو گا"۔ وہ اتنا کہہ کر باہر چلے گئے۔

عطیہ کو یہ جملہ بڑی محنت کی کمائی لگا۔ یہاں وہاں رنگ برنگی آتش بازی چھوٹتی محسوس ہوئی۔

جن کا دھیان و خیال ہر آن رہتا ہو ان کی خبرگیری کے انداز حسن اعتبار کو کافی رہتے ہیں۔

"تو تو ذرا الجھ کر رہ گیا ہے مجھے۔ بیٹھی سوچ سوچ کر تھکتی رہوں۔ تو بتا اگر کوئی بات ہے"۔ سیدھی سادی اماں جی بہت الجھ رہی تھیں۔

عطیہ نے نظریں اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔

"آپ خالہ سے پوچھ لیں اماں جی! مجھے تو خود بھی کچھ پتا نہیں"۔ وہ آہستگی سے بولی۔

"تیری بات تجھے نہیں پتا تو سولہ آنے کو خاک پتا ہو گی"۔ اماں جی جھلائیں۔

"آپ یقین کریں اماں جی! انہی کو پتا ہے سب۔ بھیجیں انہیں آپ کے پاس؟" وہ باہر کی طرف بڑھی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بھیج دے۔ تو میرا تو سر دکھنے لگا ہے"۔ اماں جی نے سر تھام لیا۔

"آپ نے بلایا ہے اماں جی؟" خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ہاں۔۔۔ آ سولہ آنے۔ بیٹھ"۔ اماں جی نے بھی نشست کا آرام دہ انداز اختیار کیا۔

"جی"۔ خالہ قالین پر بیٹھ کر پاندان کا ڈھکنا کھولنے لگیں۔

"سوہا آنے تو نے بتایا تھا اس بچی کے ماں باپ مر کھپ گئے؟" اماں جی خالہ کو گہری نظروں سے دیکھ کر
خالہ ایک دم ٹھٹک گئیں مگر نظریں نہیں اٹھائیں۔

"مرے ہوئے ہی سمجھ لیں۔ خیریت ہے؟ آپ کو یہ کیا دھیان آیا؟" ان کے لہجے میں فکر مندی کا تاثر تھا۔

سیدھا سیدھا جواب دے سوہا... کیا سمجھوں؟" اماں جی کا تو ویسے ہی سر دکھنے لگا تھا۔ ناراضی سے بولیں۔

"وہی بات ہو گئی اماں جی؟" خالہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"مجھے تو نہیں پتا چین لگ رہا ہے کہ کوئی بات ہو گئی ہے۔ تیمور شکر کرے ہے تجھے زیتون بانو پر ورا را کہہ دیتا ہے یہ گھر سے باہر نہیں جائے گی۔ کیوں کہہ دیا ہے ایسا۔ تجھے ضرور پتا ہو گا" اماں جی گویا ہوئیں۔

خالہ سر جھکائے سوچتی رہی۔ پھر گلا صاف کر کے بولیں۔

"اماں جی آپ کو تفصیل اس لیے نہیں بتائی تھی کہ بچی کو حویلی والے ذلیل نہ کرنے لگیں۔ وہ تو معلوم ہے بے قصور ہے۔"

"ہیں؟" اماں جی گاؤ تکیے سے لگی ہوئی تھیں چونک کر اٹھ بیٹھیں۔

"یہ میری سگی بھانجی نہیں ہے۔ مگر ہے بہت مظلوم۔ ہندوستان میں اس کی نانی کا گھر میرے میکے کے برابر تھا۔ رشتے داروں سے بڑھ کر سلوک تھا دونوں گھروں میں۔ پاکستان بنا تو ہجرت بھی ساتھ کی۔ پھر ایک ہی جگہ ہے۔ اس کی نانی انبالے کی نامی گرامی گانے والی تھی۔ مشتری انبالے والی کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور تھی۔

ایک سیدزادہ اس پر فدا ہو گیا۔ دلی کے رئیسوں میں سے ایک تھا اس کا گھرانہ۔ اس نے زیتون کی نانی سے چھپ کر شادی کر لی تھی اور کہا تھا کہ آہستہ آہستہ راستہ بنا کر اپنے خاندان میں لے جائے گا۔ اس سے شادی کے بعد مشتری انبالے والی نے دکان بڑھا لی اور گمنامی میں چلی گئی تھی۔ مگر تھی بالا خانے میں ہی اپنی ماں کے پاس۔ بہت عرصہ تھا۔ بس اس کی کوکھ ہی تو پیلی ہو بیٹھی۔

وہیں زیتون بانو کی ماں شہر بانو پیدا ہوئی۔ مشتری کی ماں نانو آپ کی کتنی لالچی ہوتی ہیں یہ عورتیں اس کی تو روح فنا ہو رہی تھی کہ سیدزادہ مشتری کو جب اپنے ساتھ لے جائے گا تو حلوے مانڈے کیسے چلیں گے۔ مکار نے بچی چھپا لی اور اس کے آدمی کو کہہ دیا کہ لونڈا پیدا ہوا تھا۔ مگر فوراً ہی مر گیا۔ آپ جانو اماں جی ان عورتوں کی چالاکیاں۔ کچھ عرصے بعد مشتری کو اس کا مرد لے گیا۔ مگر اس بدنصیب کو چار دن بھی خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے مرد کو کسی نے دشمنی میں گولی مار دی۔ اس کے گھر والوں کو تو مشتری ایک سے لاکھ تک منظور نہیں تھی۔ اکلوتی اولاد کے سامنے جھک گئے تھے۔ جب بیٹا ہی نہ رہا تو وہ کیا گنتی۔ ان کی عدت بھی پوری کرنے نہیں دی کھڑے کھڑے دو کپڑوں میں نکال باہر کیا۔ یوں وہ دوبارہ بڑی ماں میں آ آباد ہوئی۔ میرے اماں نے بہن کہہ دیا یوں ہم سب اسے پھوپھی کہنے لگے۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتی رہی۔

ایک روز دلی میں اسے اپنے وہاں کا خوبیہ سرا مل گیا۔ اس نے بھید کھول دیا پھوپھی پر کہ اس کے وہاں لونڈا نہیں لونڈیا ہوئی تھی اور وہ زندہ ہے اور تیری ماں اس کی ٹریننگ کر رہی ہے۔ پھوپھی کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے سیدزادے کے سامنے حلف اٹھایا تھا کہ مر جائے گی مگر دوبارہ اس دنیا میں نہیں جائے گی۔ اب اس کی اولاد وہاں تھی۔ اس بے چاری کی تو نیند

حرام ہو گئی۔ ایک دن جگت کر کے انبالہ پہنچی خوب فضیحتہ ہوا مگر وہ مکار بڑھیا اس کی چال میں نہ آئی۔ بس ہتھیا لی کر کسی طرح پر بچی چھینے میں آخر بار وہ ادا کی کی تو نہیں دے گی۔ پھوپھی بے چاری اکیلی کمزور عورت سسرال والوں سے بھی ملی تو وہ کب اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گویا ان دیے والا تو حسن ہی تھے سو ہا تھا۔

"اس بے چاری نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ مل کر آتی تھی تو دنوں روتی تھی میرے ماں باپ کے آگے۔ بس اتنی سمجھائی ہوئی تھی اس عالم نے کہ بچی سے ماں کو ماں ہی کہلوائے گی۔ یوں شہر بانو اپنی ماں کو پہچانے گی۔

وہ لوگ انبالے سے ہجرت کر کے سندھ میں آباد ہوئے تھے۔ پھوپھی پالی ہوئی تھی بچی سے ملنے کے لیے۔ جو اس آتا تھا تو وقت سے پہلے ہی بہت بوڑھی ہو گئی تھی۔ غربت اور پھر مستقل غم۔ بیٹی کی شادی کی اولاد ہوتی ہے۔ شہر بانو تو پھر اس کے پیار کی بھوکی تھی۔ اس نے بڑے جتن کر کے شہر بانو کو اس ماحول سے نکلنے کا گر بھی سکھا دیا۔

پھر بیچ نے اپنے آپ کو وہ راز... سندھ کے ایک وڈیرے کا دل شہر بانو پر آ گیا۔ چھپ کر نکاح کر لیا۔ مگر شہر بانو کے باپ جیسا مرد نہیں تھا۔ کچھ شہر بانو کے اپنے مزاج کا بھی عمل دخل تھا۔ بچوں کی چلی نہیں یہ واپس آ گئی اپنی نانی کے پاس۔ وہیں زیتون بانو پیدا ہوئی۔

پھوپھی بے چاری گئی تو اس کی اپنی ماں کا آخری وقت چل رہا تھا۔ پھوپھی کہہ رہی کہ بچی کو میں پال لوں گی۔ اکیلے دل گھبراتا ہے۔ زیتون بانو کو ساتھ لے آئی۔ شہر بانو کمزور اور اکیلی ماں سے خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس کی تو جیسے جان چھوٹی۔ اسے تب لڑکی رہی تھی۔ محنت بچی اس کے حوالے کر دی۔ سوچا ہی ہو گی کہ اس پال پوس کر جوان کرے گی تو وہ لا کر اسے دکان پر بٹھا دے گی۔

اب پھوپھی اتنی بھی سیدھی نہیں تھیں کہ اپنے طور پر کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ زیتون بانو ابھی بہت چھوٹی تھی کہ پھوپھی نے مجھے کہہ دیا تھا کہ جب یہ بڑی ہو جائے تو اسے حویلی لے جائیو اور وہیں اس کی شادی کر دیجو۔ پھوپھی کو اس ماحول سے نفرت ہو گئی تھی۔ پھر گاؤں میں لوگوں نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ گاؤں کے چوہدری کی بیوی مہرالنساء ہو گئی تو اس کی اولاد کو بھی پھوپھی نے پالا پوسا۔ انہوں نے پھوپھی کا بہت خیال رکھا۔ چوہدری کے تینوں بیٹے پھوپھی نے پالے۔ تینوں پھوپھی کو اپنی سگی بہن سمجھتے ہیں۔ پھوپھی کہتی ہیں۔ ایک لڑکا ہے سردار وہی خیال رکھتا ہے۔ اب پھوپھی کا اسی کو زیتون بانو سردار اسموں لگتی ہے۔ خیر سے بیوی بچوں والا ہے۔"

خالہ اب خاموش ہو گئیں۔

اماں جی جیسے سانس روکے سن رہی تھیں۔ خالہ کے چپ ہوتے ہی چونک گئیں۔

"سوہا آنے... اتنے بڑے باپ کی اولاد ہے زیتون بانو۔ کچھ پتا نہیں کون ہے وہ دودھیال؟" اماں کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"ہائے اماں جی اچھن کے ساتھ وہ ڈول پڑے تھے کبھی پلٹ کر انہیں پوچھا۔ ایسے عیاش آدمی ادھر ادھر کی اپنی اولاد کب تو لتے ہیں۔ آپ بھی بہت سیدھی ہیں۔" خالہ نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کیا نکاح کے بعد اسے پتا نہیں چلا ہوگا کہ اس کی عورت کے بچہ ہونے والا ہے؟" اماں جی کو کچھ کچھ یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اب کیا پتا ان کے چکروں کا۔ ایسا غیرت مند ہوتا تو بیاہ کر عورت کو اس ماحول میں چھوڑتا ہی کیوں؟" خالہ نے منہ بنایا۔

"یہ تو تو بہت گھروالی سوال آئے"۔ اماں جی نے خالہ کی سمجھ کو بڑی فراخدلی سے سراہا۔

"بتاؤ یہاں وہاں اپنی اولاد چھوڑتے پھرتے ہیں۔ کیسے مرے ہوئے ضمیر ہوتے ہیں لوگوں کے۔ سنا تھا بھی ملکوں میں اتنی غربت ہے کہ لوگ پیٹ کی خاطر اپنی اولاد بیچ دیتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مگر اب آ رہا ہے۔ یہ تو اللہ کے کلام میں بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں پر مہر لگی ہوتی ہے اندھے بہرے کہتا ہے اللہ ایسے لوگوں کو۔ توبہ —— توبہ —— توبہ —— بتاؤ بے قصور بچے۔ میرے بچوں کو بخار چڑھ جائے تو مجھے ساری رات نیند نہیں آتی۔ وہ سورۂ حشر کی آخری چار آیتیں پڑھ کر اپنے بچوں پر دم نہ کروں تو چین نہیں آتا۔ میں تو دم کے بغیر بچوں کو باہر نہیں نکلنے دیتی۔ کتنی بری آگ ہوتی ہے اولاد کی۔ کتنا مہنگا ہوتا ہے سہاگ کا جوڑا۔ اسے پہننے کے بعد عورت اپنے لئے کب رہتی ہے۔ بتاؤ کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔ کس قدر حسین بچی اور کتنی بدنصیب"۔ اماں جی کی جان کو ملال لگے تھے۔

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اماں جی؟" خالہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"کس بات پر؟" وہ حیران ہو گئیں۔

"زیتون بانو کے حویلی میں رہنے پر؟" خالہ نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔

"بھلی کہی۔ یہ تو میرے اونچے نصیب ہیں کہ کسی دکھیا بے آسرا کو میری چھت کے نیچے اماں ہے۔ اللہ میرے بچوں کا بھلا کرے۔ یہ توفیق خوش بختوں کو ملتی ہے۔

اس کی نانی کے نام کی روٹی بھی بھجوا دیا کر ہر جمعرات کو غریبوں میں۔ نیاز فاتحہ بھی دلایا کر اس کے نام کی۔ بڑی مظلوم ہوتی ہیں یہ عورتیں۔ معلوم نہیں کیا کیا مجبوریاں ہوتی ہوں گی انہیں۔ تجھے پتا نہیں زمانے کا حال۔ کتوں کو سونے پر نوالہ کھلاتے ہیں۔ اور ان عورتوں کی چادریں خود اتارتے ہیں۔ اور پھر —— اب کیا کہوں سوال آتے۔ بہت بری ہے دنیا۔ ایک میری اکیلی جان۔ اور اتنے دکھ۔ اور اچھا سن۔ یہ تیمور کو کیسے پتا چلا۔ تو نے بتایا تھا؟" اماں جی کو دھیان آیا۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی اماں جی۔ پرسوں آئی تھی وہ بدنصیب"۔ خالہ نے بیزاری سے کہا۔

"کون؟" اماں جی سمجھیں نہیں۔

"وہی —— شمر بانو —— اس کی ماں"۔ خالہ نے ناگوار تاثرات کے ساتھ بتایا۔

"ہیں —— کب —— تو نے مجھے کیوں نہیں ملوایا"۔

"بس مجھے یہی خیال تھا کہ حقیقت کھلنے پر کہیں بے چاری دربدر نہ ہو جائے جو اسے اتنی توجہ اور محبت ملی ہے کہیں نہ جائے۔ اب بھی اماں جی آپ سے یہی درخواست ہے حویلی میں اور کسی کو نہیں بتائیے گا"۔

"ارے مجھے کیا بتانے کی پڑی ہے۔ اتنا پڑا ساتھ ہے میرا تیرا۔ اب بھی نہیں سمجھی مجھے۔ مگر یہ تو بتا کیوں آئی تھی وہ یہاں؟" اماں جی نے تعجب سے سوال کیا۔

"اماں بن کر بیٹی کو لینے آئی تھی۔ عمر ڈھل رہی ہے پوچھ نہیں پڑا ہوگا"۔ وہ جل کر بولیں۔

"توبہ استغفار —— کیسی پھول جیسی معصوم بچی ہے۔ کتنی بھر ہوتی ہیں عورتیں —— پھر کیا ہوا؟"

"تیمور خان اور یاور خان نے منہ توڑ جواب دے دیا کہ ہماری اولاد ہے ہماری مرضی کے بغیر کہیں نہیں جا سکتی"۔

"یاور بھی ملا تھا اس عورت سے؟" اماں جی چونکیں۔

"جی —— دونوں بھائیوں نے بات کی تھی"۔ خالہ نے جواب دیا۔

"اچھا پھر؟"

"پھر کیا —— دھمکی دے گئی۔ غصہ دکھانے لگی۔ تب یاور خان نے کہا کہ زیتون بانو کو بلا کر پوچھ لو جانا چاہتی ہے تو تھا"۔

"تو پھر —— اسے بیچ میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو بے عقل ہے جو ساتھ چل پڑتی۔ تم مجھ سے کیوں چھپایا کرتے آئے"۔ اماں جی کو غصہ آ گیا۔ "پھر بتا کیا زیتون بانو نے؟"

"اس نے انکار کر دیا۔ بولی میں تو اس عورت کو نہیں جانتی"۔

"شکر ہے اللہ"۔

"پھر کچھ نہیں بولی اس کی ماں؟"

"دھمکی دے کر چلی گئی بولتی کیا"۔ خالہ نے کہا۔

"اچھا تب ہی تیمور ایسے کر رہا ہے۔ ٹھیک ہی کر رہا ہے۔ کیا بھروسا ایسے لوگوں کا۔ کہیں ——؟" اماں جی نے کہا۔

"جی —— ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ —— میری تو اس دن سے نیندیں ہی اڑ گئی"۔ خالہ فکرمندی سے بولیں۔

"تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ دونوں بھائیوں کو یہ سارا قصہ پتا لگ گیا۔ تیرے سے خان کو پتا لگ جاتا تو اس عورت کا دماغ اسی وقت ٹھیک کر کے رکھ دیتے۔

چل خیر اللہ نے کرم کیا۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جا تو اپنا کام کر"۔

اماں جی پرسکون ہو گئیں۔ خالہ فوراً اٹھ کر چل پڑیں۔

تزئین آئی ہوئی تھی خوب رونق ہو رہی تھی۔ سب باغ میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یاور علی خان کسی ضروری کام سے پشاور جا رہے تھے۔ نازنین گھومے باغ میں بھی آ موجود ہوتیں پھر واپس اپنے کمرے میں چلی جاتیں کہ یاور علی خان تیار ہو رہے تھے۔

''اماں جی ٹھیک نہیں کہتی تھیں۔ کیسے اچھے ہیں شمیر۔ تمہاری ایک ایک حرکت سے ظاہر ہے کہ خوش ہو۔ خوش ہو گھومتی تھیں''۔

ربیعہ بیگم نے بہت ہی پیار سے رائل بلیو کرتہ شلوار اور دوپٹے میں ملبوس کھلکھلاتی تزئین کو دیکھا۔

''شروع میں تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں''۔ تزئین ہنسیں۔

''پھر وہی بدشگونی کی باتیں''۔ اماں جی نے ڈانٹا۔

''جب خوش ہوتے ہیں تو بس خوش ہوتے ہیں۔ اتنا بلاوجہ کیوں نہیں سوچتے''۔ نازش نے تزئین کی جھمکیوں کو درست کرتے ہوئے ان کے رخسار پر چٹکی بھری۔

''چھوٹی بھابی کو دیکھ کر تو فرشتے دنیا کے بارے میں ''سب اچھا ہے'' کی رپورٹ لکھتے ہوں گے''۔ تزئین نے شرارت سے کہا۔

''اماں جی آج آپ نے ہمارے لئے کیا پکوایا ہے۔ وہاں سسرال میں تو ہم تکلف کے مارے بھوکے رہتے ہیں''۔

''ہے ناں ناشکری۔ کیوں کرتی ہے تکلف۔ تیرا گھر ہے وہ''۔

''ہائے اماں جی اتنے مہمان رکے ہوئے تھے وہاں کل تک۔ مجھ سے نہیں کھایا جاتا نئے لوگوں کے ساتھ کھانا''۔

''جب اندر سب اچھا ہو تو باہر بھی سب اچھا نظر آتا ہے''۔ نازش نے شوخی سے انہیں چھیڑا۔

''دعا دیں میرے بھائی کو جنہوں نے عالم فاضل بنا دیا ہے آپ کو''۔ تزئین نے بھی جوابی کارروائی کی۔ نازش کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

''کون سے والے بھائی کی بات کر رہی ہیں آپ؟'' تیمور ان سب کو ڈھونڈتے ہوئے وہیں آ گئے تھے۔

''جن کا یہ سامان ہیں' ظاہر ہے انہی کی بات کریں گے۔ تمہارا کارنامہ دیکھنے کا اشتیاق ضرور ہے مگر ابھی ہم ان ہیں''۔ تزئین کھلکھلائیں۔

''نہیں' آپ حکم کریں تو ابھی یعنی جلدی دکھا دیتے ہیں کارنامہ''۔ وہ بڑی سعادت مندی سے گویا ہوئے۔

''جی نہیں..... ہمارے ہاں جوتیاں گھس کر دلہن لانے کا رواج ہے۔ آپ روایت توڑ کر انقلابی بننے کی کوشش نہ کریں''۔

''بعض اوقات انقلاب بہت ضروری ہوتے ہیں آپا؟'' تیمور نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ والا تو بہت برا ہوگا''۔ ربیعہ بیگم نے دھمکی دی۔

''آپ لوگوں کو نئے نئے جوتوں سینڈلوں کا اتنا ہی شوق ہے تو فکر مند نہ ہوں اپنا اپنا ناپ دے دیجئے گا۔ انگلینڈ کے سینڈلیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ وہاں سے بھجوا دیں گے''۔

''اماں جی..... ماما پوچھ رہی ہیں کھانا لگا دوں''۔ سطریہ تیمور کی پشت کی طرف کھڑی اماں جی سے مخاطب تھی۔

''مردانے میں لگوا دو۔ ابھی تو لڑکیاں ہنسی مذاق کر رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد لگا دینا۔ وہ پارٹی کو ساتھ لگا کیوں لگی ہلکان ہو رہی ہو''۔

''اماں جی..... مجھے تو گڑبڑ کی بو آ رہی ہے۔ بس آپ تیمور کا نکاح فوراً پڑھوا دیں۔ ذرا جلدی سے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اول جلول ولایتی بڑا انقلاب لے آئیں''۔ نازش نے ساس کو مشورہ دیا۔

''تو یہ بیچاری سعدیہ آپا تو مست ہو جائیں گی۔ اماں جی کو اس عمر میں انگلش سیکھنا پڑے گی۔ کیونکہ وہ اماں جی سے تو کھانے میں باتیں کرنے سے بھی پرہیز نہیں کریں گی''۔ تزئین زور سے ہنسیں۔

''ارے آگ لگے اس انگریزی کو بڑی مشکل سے تو جان چھوٹی ہے میری۔ شادی سے پہلے میرے باپ کے پاس جتنی بھی انگریزی ہوں گی۔ گوروں کی طرح لگتی ہے میرے دماغ پر''۔ اماں جی بیزاری سے بولیں۔

''جب ہی تو کہہ رہی ہیں اس مرتبہ باندھ کر رکھیں''۔

''چلو تم لوگ بتاؤ۔ کہ بھابی بجا کہتی ہیں تمہاری۔ خاندان ملنے جلنے والے سب ہی کی لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں تم بہنوں نے''۔ اماں جی نے مسکرا کر گویا شرارت میں بیٹیوں بہوؤں کا ساتھ دیا۔

''چلو بیٹے مردانے میں۔ کھانا لگ رہا ہے پہلے کھانا کھاؤ''۔ اماں جی نے کہا۔

''بھوک نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم پر سفر سوار ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم سرائے روانہ ہو جائیں گے''۔

''اس اندھیرے میں آئی ہو کا سفر کرو گے۔ عجیب کام ہوتے ہیں تمہارے بھی''۔

''اماں جی! کراچی سے ٹیلی فون آیا ہے''۔ سطریہ بلانے آئی تھی۔

''کس کا..... کون سے ٹیلی فون پر پوچھا تو نے''۔ اماں جی کھڑی ہو گئیں۔

''تیمور خان کے کوئی دوست ہیں''۔ وہ آہستگی سے بولی۔

''پاگل ہی ہے بالکل۔ مجھ سے باتیں کرے گا تیرے خان کا دوست؟'' اماں جی ماتھے پر ہاتھ مار کر دوبارہ بیٹھ گئیں۔

''کسے تیمور سے ڈر لگتا ہے ناں اس لئے آپ کی لائن پر بات ہو رہی ہے''۔ تزئین ہنسیں۔

تیمور جھاڑ کر تقریباً اس وقت اندر کی سمت بڑھے تھے۔ سطریہ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

اسی دم بڑے پھاٹک پر تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ تیمور علی خان جو سطریہ کو اپنے پیچھے آتا محسوس کر چکے تھے۔ ایک دم تیزی سے پلٹے۔

''اندر بھاگ جاؤ لڑکی!''

☆......☆......☆......☆......☆......☆

مطربہ تو گویا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔

باغ میں بیٹھی ہوئی دیگر خواتین میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ وہ اسی طرف حویلی کے پچھلے حصے کی طرف دوڑ گئیں۔ رضیہ بیگم نے اماں جی کا بازو تھام رکھا تھا۔ دلوں میں گویا پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اماں جی بلند آواز سے آیۃ الکرسی کا ورد کرتی جارہی تھیں۔

"ارے یہ تیمور بیٹا کتنے پاس بیٹھا ہے۔ کہیں پھاٹک کی طرف نہ چلا گیا ہو۔ مار کون سی فوج آ گئی۔ اللہ رحم کرے"۔ اماں جی کو یک دم تیمور علی خان کا دھیان آیا۔

"اب اتنے بھی احمق نہیں ہیں تیمور... اماں جی کیا ہوائی پستول چلا رہے ہیں؟ کون سا ہر دم اپنے ساتھ ہتھیار لئے پھرتے ہیں"۔ نازنین نے حواس پر قابو پا کر ساس کو تسلی دی۔

"ارے اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ آگے پیچھے نہیں دیکھتا"۔ اماں جی کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔

"آپ اندر تو چلیں"۔ نازنین جھلائیں۔

دوسری طرف تیمور علی خان احمد سے گن لے کر واپس بھی آ چکے تھے اور تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چوکیدار نے جوابی فائرنگ کر رہا تھا۔ جب کہ اس کے بائیں بازو سے گاڑھا گاڑھا سرخ خون دوری سے بہتا نظر آ رہا تھا۔

"خان! آپ اندر چلو... ہم نپٹ لے گا۔ صرف دو ہیں..."۔ چوکیدار نے اذیت پر قابو پاتے ہوئے تیمور علی خان کو مخاطب کیا۔

"تمہارا بازو زخمی ہے۔ تم اندر جاؤ۔ ہم دیکھتے ہیں"۔ تیمور علی خان کا انداز قطعی تھا۔

اسی دم ایک گولی شعلے کی صورت ان کی طرف آئی۔ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ اگر تیمور تیزی سے ایک طرف نہ ہو گئے ہوتے تو کھوپڑی پار نکل جاتی۔

"خان... اللہ کا واسطہ آپ اندر جاؤ۔ یہ افغان ام کو گولی مارے گا اگر آپ کو کچھ ہوا"۔ چوکیدار نے منت کی۔

"ویسے کچھ نہیں ہوگا مگر اس بحث میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا"۔ تیمور علی خان چڑ کر گویا ہوئے۔

"ام احمق (ایموشنل) ہے خان"۔ چوکیدار کو حملہ آوروں سے زیادہ "اپنے خان" کا خوف تھا۔

اسی دم بابا صاحب اپنی گن کے ساتھ باہر آتے نظر آئے۔ ساتھ ہی باہر سے فائرنگ پھر شروع ہو گئی۔

"تیمور! ادھر سے"۔ بابا صاحب کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"کاکا جان... خون"۔ گلگلاتی فراک پہنے فرش پر گیند مارتی ننھی گلو برآمدے میں آئی تھی چوکیدار کے بازو سے بہتا خون دیکھ کر ایک دم زور سے چیخی۔

ایک لمحے کو تو تیمور علی خان کی تمام اعصابی قوت ایک دم ہوا ہو گئی۔ ایک طرف بابا صاحب کا حکم دوسری طرف چوکیدار اور پھر گولی چلی۔

"بابا صاحب... پلیز آپ گلو کو اندر لے جائیں..."۔ اس وقت سب سے پریشان کن مرحلہ بچی کی وجہ سے آیا تھا اور بس اتنی ہی دیر میں۔

چوکیدار ایک دیو کی گرفت میں آ چکا تھا۔

"ٹھک... گولی چلی تھی اور گن تیمور علی خان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ نشانہ تیمور علی خان نہیں بلکہ ان کی گن تھی اور مقصد انہیں نہتا کرنا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھلتے دو فولادی بازو انہیں جکڑ چکے تھے۔ چوکیدار کا اندازہ غلط تھا۔ وہ دو نہیں چار تھے۔ دو نے پھاٹک پر مورچہ سنبھال رکھا تھا اور دو تیمور علی خان اور چوکیدار کو گرفت میں لئے ہوئے تھے۔

بابا صاحب نے گلو کو اندر دھکیلا تھا بس اتنی مہلت حملہ آوروں کیلئے کافی تھی۔

"گولی چلانے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا خان۔ چھوٹا خان ہمارے نشانے پر ہے... ادھر تم گولی چلاؤ ادھر ام چلائے گا"۔ پھاٹک پر کھڑے ہوئے دیو قامت "انسان نما" نے دھمکی دی۔

"کون ہو تم لوگ؟ کیا ارادہ ہے تمہارا؟ ہماری کسی سے دشمنی نہیں"۔

بابا صاحب کا ایک پاؤں برآمدے کی نچلی سیڑھی پر اور دوسرا دوسری سیڑھی پر تھا۔ انہوں نے فکرمندی سے تیمور علی خان کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمارے پاس سوال جواب کا ٹائم نہیں ہے خان۔ لڑکی ہمارے حوالے کر کے اپنا بیٹا زندہ سلامت اندر لے جاؤ"۔ ان میں سے ایک نے درشتی سے کہا۔

"لڑکی..... کون لڑکی"۔ اسے اونچے شملے والوں کے ہاں سے آتی کم عمر لڑکی کی طلب..... ایک لمحے کو تو ان کو پسینہ آ گیا۔

"زیتون بانو..... شہر بانو کی لڑکی"..... فوراً جواب آیا۔

"کیا بک رہے ہیں یہ لوگ تیمور؟" بابا صاحب گرجے۔ (اس قدر فتنہ انگیز ہے اس لڑکی کا حسن؟)

"وہ ہماری نوکرانی ہے تمہیں اس سے مطلب؟" وہ اپنی الجھن پر قابو پا کر بے ڈھنگے انداز میں گویا ہوئے۔

"جاتی (زیادتی) کرتا ہے تم اس کے ساتھ..... اس کی ماں کا چار گولی اے..... وہ ملکن اے امارا..... ہم بھی کرے گا مجاخ (مذاق) ہمیں اسے تمہارے ساتھ امارا"۔

"دو منٹ میں لڑکی باہر لاؤ ورنہ خان کو گولی لگے گا"۔ پھاٹک پر کھڑا بدبخت دہاڑا۔

"کیا بک رہے ہیں یہ لوگ تیمور؟" بابا صاحب غضب ناک ہوئے۔

"زیتون بانو کو لینے آئے ہیں"۔ تیمور علی خان نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" ان کی مجال کیسے ہوئی کہ وہ حویلی کی کسی لڑکی کا نام اپنی زبان پر لائیں۔ خواہ وہ ہماری اولاد ہو یا نوکرانی..... دونوں حویلی کی عزت ہیں"۔

بابا صاحب منہ سے جھاگ اڑانے لگے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فائر کر دیں۔

"دیر نہیں کرو خان..... ٹائم نہیں ہے"۔ ایک غنڈے نے خشونت بھرے انداز میں کہا۔

"بابا صاحب..... نہیں..... آپ اسے باہر نہیں لائیں گے"۔ تیمور علی خان بلا کے شوریدہ بخت ہو رہے تھے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ام ادھر پولیس گھسنے دیتا اے۔ خان کو ساتھ لے جاتا اے..... لڑکی کو اس کے گھر پہنچاؤ..... ام ہیں سے لے جائیں گے۔ ابھی خون خرابہ کرنے کا آرزو نہیں ہے۔ اگر دو دن میں لڑکی نہیں پہنچا تو ام بڑی عزت کے ساتھ خان کو لاش اور چھوڑ جائیں گے۔ اب کچھ بولنے کا نہیں۔ چلو خان"۔

ان میں سے ایک نے اپنی بات مکمل کر کے تیمور علی خان کو آگے دھکیلا۔

مطربہ ہال کمرے کی کھڑکی سے ناک لگائے باہر کی کارروائی بغور دیکھ رہی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گمان یہی غالب تھا کہ بس بابا صاحب اب بلوانے ہی والے ہیں۔

مگر باہر کا بدلتا منظر دیکھ کر جانے کیا ہوا۔ باہر کی جانب سرپٹ دوڑی۔

"رکو..... رکو..... ٹھہرو۔ خان کو چھوڑ دو..... میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ"۔

بابا صاحب کیلئے یہ اچانک افتاد تھی۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پائے کہ وہ پھاٹک پر پہنچ گئی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی اگلا قدم اٹھاتے وہ دو غنڈوں کی گرفت میں تھی۔

جب تک جیپ اسٹارٹ نہیں ہو گئی انہوں نے تیمور علی خان کو نہیں چھوڑا۔ بابا صاحب گن اٹھانے کے باوجود کچھ نہ کر سکے۔ جیپ دھیرے سے آگے بڑھی۔ دونوں غنڈے تیمور علی خان کو چھوڑ کر چلتی جیپ میں کود گئے۔

تیمور علی خان ہونٹ کاٹتے ہوئے دھول اڑاتی جیپ کو دیکھتے گئے مگر پھر فوراً ہی وہ باپ کی سمت بڑھے جو چوکیدار کو ساتھ لئے اس کی کوٹھڑی کی طرف جا رہے تھے۔ بے چارے چوکیدار کا خون بہت بہہ گیا تھا۔

بابا صاحب کو کتنی حیرت اور دلچسپی تھی اس واقعے سے مگر چوکیدار کی جان بچانے کے عمل سے زیادہ اہم تو اب کچھ بھی نہیں تھا۔

شکار کھیلنے والے اس طرح کے معاملات بہت آسانی سے ڈیل کر لیتے ہیں۔ اس لئے دونوں باپ بیٹے دہشت و خدشات کا شکار نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا انہیں کیا کرنا ہے۔ کس طرح بہتا خون روکنا ہے۔

"خان..... اس بے وقوف کو بچی نے سارا محنت ہی بے کار کر دیا"۔ چوکیدار نے تکلیف پر قابو پاتے ہوئے بہت دل سوس کر رہا تھا۔

وہ دونوں خاموش رہے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

خانم بی آیات کا ورد کر رہی تھیں۔

"یا اللہ..... کیسی ناگہانی ہے..... پتا تو کرو لڑکے تیمور اور تمہارے بابا صاحب کہاں ہیں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ ہتالا کماد کی فصل کٹ رہی ہے حویلی کے سارے نوکر آج کل زمینوں پر ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو صرف تیمور اور تمہارے بابا صاحب ہی تھے۔ ضمیر اور اصیر تو شہر کی طرف گئے ہوئے ہیں"۔

اماں جی کے دل میں تو جیسے پتنگے لگے ہوئے تھے۔

"تو آپ مردانے میں کھانا کس کیلئے لگوانے کو کہہ رہی تھیں؟" نازنین نے پوچھا۔

"تمہارے بابا صاحب تو وقت پر کھاتے ہیں تیمور اور اصیر بھی کہہ کر گئے تھے کہ وہ کھانے کے وقت تک واپس آ جائیں گے۔ مگر تیمور بھی مردانے جا رہا تھا اس لئے کہہ رہی تھی"۔

اسی دم ماما جی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"اماں جی..... بابا صاحب آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں"۔ اس نے پیغام دیا۔

"تیمور کہاں ہے؟" انہوں نے پیغام نظر انداز کر کے پہلی فرصت میں بیٹے کی بابت دریافت کیا۔

"خان بھی وہیں ہیں"۔ ماما نے جواب دیا۔

"اماں جی..... آپ جائیں ناں۔ پتا نہیں بابا صاحب نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟"

"ہے" کے فوراً بعد اماں جی کی طلبی بڑی معنی خیز تھی۔ فطری طور پر سب ہی کو تجسس تھا کہ اب سے کچھ دیر پیشتر ہونے والے واقعے کا بھید کیا ہے؟

"خیر ہے تو ہے ناں ماما.....؟" اماں جی کی چھٹی حس جیسے بیدار ہو چکی تھی۔

"یہ سونا آنے ابھی تک نہیں آئی پٹواران کے ہاں سے؟" انہوں نے ماما کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں آئی"۔ ماما نے اسی سابقہ انداز میں جواب دیا۔

"تاؤ...... اندھیرا ہو گیا" اس کی باتیں ختم نہیں ہو رہی تھیں...... "ماما مجھے پتا چلا کہ گولیاں کون چلا رہا تھا؟"

"پتا نہیں اماں جی"۔ ماما کا جواب مصلحت آمیز تھا۔

"تو یہ...... میری تو جان نکل گئی۔ سیدھی سی بات ہے' مجھے اپنے بیٹے کی فکر مار رہی تھی کہ مارے جوش کے باہر نکل گیا ہو۔ شکر ہے میرے رب کا۔ میرا بچہ محفوظ ہے۔ یا اللہ کل کی خیر ہو"۔ وہ دعائیں مانگتے ہوئے بابا صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"آؤ ریحان کی ماں"۔ بابا صاحب گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئے۔

"خیریت تو ہے"۔ اماں جی نے پرتشویش نظروں سے باری باری باپ بیٹے کی طرف دیکھا۔

"یہ کون گولیاں چلا رہا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ابھی تک ٹھنڈے پڑے ہیں"۔

اماں جی تیمور کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ کمرے میں ایک محسوس کیا جانے والا گہرا سناٹا طاری تھا۔ فضا میں ایک عجیب سا غیر معمولی پن چھایا ہوا تھا۔

"یہ جنون بانو کس علاقے سے تعلق رکھتی ہے؟" بابا صاحب نے وہ سوال کیا جو اماں جی کے دماغ میں دور دور کہیں نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ بری طرح چونک گئیں۔

"خیریت؟ سوا آنے کی بھانجی ہے۔ اسی کے گاؤں سے تعلق ہے"۔ ان کے دل میں عجیب خدشے پیدا ہونے لگے۔

"سوا آنے کدھر ہے؟ اسے بلوائیں"۔ بابا صاحب کا لہجہ قطعی بے تاثر تھا۔

"آپ مجھ سے پوچھیں' جو پوچھنا ہے۔ مجھے سب پتا ہے"۔ وہ بے حد پریشان ہو گئیں۔

"کیا پتا ہے؟ کیا آپ کو یہ بھی پتا ہے کہ اس کا کسی شہر بانو نامی عورت سے کوئی تعلق ہے؟" ان کا انداز قطعی بے رحم تھا۔

"جی...... پتا ہے"۔ وہ مجرموں کے انداز میں بولیں۔

تیمور علی خان نے چونک کر ماں کی شکل دیکھی۔ خان ولاور علی خان بھی الجھے۔

"ماں تھی وہ جنون بانو کی"۔ وہ بہت آہستہ آواز میں گویا ہوئیں۔

"تو کیا مائیں اس طرح بیٹیوں کو لفظوں سے الجھاتی ہیں؟" ان کے انداز میں محسوس کی جانے والی ناگواری تھی۔

"ہیں؟" اماں جی دہل کر رہ گئیں۔ "ک...... کہاں ہے جنون بانو؟"

"وہ گولیاں اسی لئے چل رہی تھیں اماں جی"۔ تیمور نے بہت تھکی تھکی آواز میں انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

"ک...... کیا مطلب؟" اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑنے لگا۔

"لے گئے ہیں وہ اسے"۔ تیمور علی خان نے مطلع کیا۔

"ارے میرے اللہ"۔ اماں جی نے سر پیٹ ڈالا اور دل کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ "آپ لوگوں کے سامنے؟" انہوں نے تڑپ کے تیمور کی صورت دیکھی۔

"یہاں سے اٹھنے کے بعد پہلے تو صدقہ بانٹئے گا اپنے بیٹے کی جان کا۔ شکر ہے کہ زندہ سلامت آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ آپ اپنے طور پر بڑے بہادرانہ کام انجام دیجئے۔ انسان کو کسی معاملے میں ہاتھ ڈالتے وقت چاروں طرف سے اطمینان کر لینا چاہیے۔ آپ نے ہمیں اندھیرے میں رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ اگر آپ کے بیٹے کو کچھ ہو جاتا خدانخواستہ"۔

خان ولاور علی خان کے انداز سے ہنوز ناراضگی جھلک رہی تھی۔

"خدانخواستہ...... وہ بھی بے آسرا بچی ہے"۔ وہ سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے نظریں جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئیں۔

"اس حویلی سے باہر لاکھوں انسان مسائل سے دوچار ہیں۔ کیا ہم پر تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے؟"

"ہمیں اس بات سے الجھن ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہی کیوں؟ اس کی سراسر ذمہ داری آپ پر آتی ہے"۔ بابا صاحب کو بس دوٹوک بات کرنا ہوتی تھی۔

"جب آپ نے اسے حویلی میں رہنے کی اجازت دی تو کیا آپ اس کے تمام حالات سے باخبر تھیں؟" انہوں نے بیوی کے نرم اور پریشان چہرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ کی۔

"پہلے تو نہیں تھی باخبر...... البتہ بعد میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا"۔ وہ دھیرے سے گویا ہوئیں۔

"اچھا کیا معلوم ہوا بعد میں؟" خان صاحب کی مجبوری تھی کہ وہ اس سادہ مزاج اور دھیمی عورت کے سامنے کھل کر برہمی کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اماں جی نے تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

"بیٹے! تم بتا دو ناں اپنے بابا صاحب کو"۔ وہ بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں اماں جی...... مجھے بھی تو صرف اتنا پتہ ہے کہ وہ شہر بانو کی بیٹی ہے اور بس"۔ تیمور علی خان نے انہیں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"جانے دیجئے اب اس قصے کو...... وہ بدنصیب تو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اب ان باتوں سے کیا حاصل ہو گا ہائے...... اس کی تو عمر بھی بہت کم ہے۔ اس پر بے عقل ہے۔ اللہ امان دے"۔

"تاؤ...... آپ دونوں کے سامنے وہ اسے لے گئے؟...... ایسی بزدل بلی میں رو دینے والی...... کیا حال ہو رہا ہو گا اس کا...... کیا کھاتی ہے وہ عورت؟...... کیسا پتھر دل ہے اس کا"۔ اماں جی کی آواز بھرا گئی۔

"تاؤ...... لڑکیوں کو کتنا دکھ ہو گا۔ کتنا پیار کرنے لگی تھیں سب اس سے...... کم از کم اس بے حیائی کی زندگی سے تو بچ جاتی"۔ اماں جی آنسو پونچھنے لگیں۔

"تیمور! جاؤ بیٹے تم اپنا کام کرو۔ اب کیا ہو سکتا ہے"۔ بابا صاحب نے کہا۔

تیمور کسی گہری سوچ سے جاگے تھے' پھر الجھے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

"آپ ادھر آ جائیں ہمارے پاس"۔ بابا صاحب نے اماں جی کو اپنے پاس بلایا۔ وہ جھجک سے چلتی ہوئی آ گئیں اور بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گئیں۔

"یہ حد سے زیادہ نرم دلی جہاں آپ کی بہترین خوبی ہے وہاں آپ ہی کے حق میں وبال بھی ہے۔ نرم دل ہونا اچھا ہے لیکن یوں بھی نہیں ہونا چاہئے کہ انسان اصول سے ہی ہٹ جائے۔ اگر ہمیں آپ سب کچھ بتا دیتیں تو ہم کوئی فیصلہ کرتے"۔

"بس غلطی ہو گئی...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب بھی ہو سکتا ہے"۔ وہ جیسے جرم کا اقرار کر رہی تھیں۔

"کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے اس کیلئے؟" انہوں نے مدد طلب نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

"غیروں کے ساتھ معاملہ ہوتا تو بہت کچھ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بقول آپ کے کہ یہ حرکت تو اس کی اپنی ماں کی ہے۔ ہم ہی الٹا کسی مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔ چار کوٹھیوں کی مالک عورت اپنے ہاتھ بہت چلانا بھی جانتی ہوگی"۔

وہ جیسے کچھ سوچتے ہوئے بول رہے تھے۔

اماں جی نے چونک کر خان صاحب کی شکل دیکھی۔

"چار کوٹھیوں کی مالک......؟" "آپ کو کس نے بتایا؟" وہ متعجب تھیں۔

"وہی جو اسے لینے آئے تھے انہی کے منہ سے سنا ہے"۔

"اتنی باتیں بھی ہو گئیں آپ سے؟" ان کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

بابا صاحب نے اپنی سیدھی سادی بیوی کو ایک لمحے کیلئے بغور دیکھا۔

"کیا خاندان ہے سولہ آنے کا؟"

اماں جی کا دل بڑے زور سے دھڑکا...... اضطراری انداز میں دوپٹہ درست کرنے لگیں۔ مزید بچ نکلنے کا موقع نہیں تھا۔

"وہ سولہ آنے کی سگی بھتیجی نہیں ہے۔ اس کی نانی سے سولہ آنے کے خاندان کا منہ بولا بہناپا چل رہا تھا۔ سگوں کی طرح ایک دوسرے کے ہیں مدتوں سے"۔ وہ دھیمے لہجے میں بتا رہی تھیں۔ "پاکستان بننے سے پہلے کے تعلقات ہیں ان کے"۔

"کیا یہ لڑکی ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے جہاں صرف نانیاں ہوتی ہیں "دادیوں" کا کوئی اتا پتہ نہیں ہوتا؟" بابا صاحب نے گہری نگاہ ان کے چہرے پر جمادی۔

"زیتون کے باپ نے اس کی ماں سے نکاح کیا تھا"۔ اماں جی نے زیتون بانو کی ساکھ بحال کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کے پاس امانت رکھا ہے اس کی ماں کا نکاح نامہ؟" بابا صاحب کا موڈ آف ہو گیا۔ انہیں پتا تھا کہ اماں جی ہر شخص کی بات کا اعتبار کر لیتی ہیں۔

اماں جی ایک لمحے کو خاموش ہو کر رہ گئیں۔

"آپ کو تمام باتوں کا کیونکہ علم نہیں ہے اس لئے آپ اس طرح کی باتیں کر سکتے ہیں"۔ اماں جی نے حقیقت پسندانہ انداز اختیار کیا۔ انہیں کیونکہ علم تھا کہ خان صاحب آسانی سے مطمئن نہیں ہوتے اس لئے وہ بھی کہہ گئی تھیں۔

"تو پھر آپ ہمیں بات بتا دیتے۔ اگرچہ اب اس کا کوئی فائدہ تو نہیں ہے۔ مگر اس بہانے آپ ہمیں کچھ وقت ہی دے دیں گی"۔ وہ نیم ناراض ہو گئے۔

"عورت کو شادی کے بچے ہی چاہیے ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہی بھول جاتی ہیں"۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر حقہ قریب کیا اور حقے کی نے منہ سے لگائی۔

"بچے بھی بہت بڑی ذمہ داری ہوتے ہیں۔ بڑے کام ہوتے ہیں گرہستی کے"۔ وہ نظریں جھکا کر گویا ہوئیں۔

"اتنے بڑے کنبے کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھنے والی کو کبھی اپنے سرتاج کی چھوٹی سی ضرورت کا خیال نہیں آتا؟" کہنے کے اختتام پر حقے کی گڑگڑاہٹ گونجی۔

"آپ کے اپنے کام دھندے ہیں۔ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ مجھے آپ کی خدمت کے خیال سے ہی ہول اٹھتا ہے۔ ماما کو ہی لے لیجئے کبھی کہتی ہوں کہ کھانا بڑے خان کی مرضی کا بنایا کرے۔ اب یہ چاروں لوگ گھر کا کھانا ہی تو کھاتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ بڑے ہے بڑے کام مانگتے ہیں۔ ماشاء اللہ بیٹے جوان ہیں۔ جاگیر کے کام ان پر ڈالے۔ آپ نے بھی تو بڑی چھوٹی عمر میں یہ سب کچھ سنبھالا تھا"۔

وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں اور ان کی نیک تمنائیں ان کے چہرے پر پوری طرح جھلک رہی تھیں۔

خان صاحب کا سارا غصہ، ساری کوفت ہوا ہو چکی تھی۔

"آپ نے زمانے کے ہزار رنگ دیکھے مگر کوئی اثر نہیں ہے۔ آپ تو وہی کی وہی ہو ویسی کی ویسی"۔ بابا صاحب کو ان کے سیدھے پن کی ایک ایک ادا یاد آنے لگی۔

اماں جی قدرے جھینپ گئیں۔

"مجھے اس بچی کا دھیان آ رہا ہے"۔ انہوں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"ہاں تو آپ بتا رہی تھیں اس کی کہانی...... بتائیے تاکہ ہمیں بھی پتا چلے اندازہ ہو کہ کون کتنا چاہتی ہے آپ کو......؟"

"سولہ آنے مجھ سے جھوٹ نہیں بولتی۔ کیا میں اسے جانتی نہیں۔ چار دن کا ساتھ تو نہیں ہے میرا اس کا...... اس کا کیا لالچ ہے اس بچی سے اور یہ کوئی ٹھکانہ؟ روٹی کا ٹکڑا پانی کا پیالہ بھی سب اسے ملا ہوا ہے"۔

"بات دراصل یہ ہے"۔ اماں جی نے خالہ سولہ آنے کی وکیل صفائی کا کردار ادا کرنے کے فوراً بعد حقیقت بیانی شروع کر دی۔

"ماما...... اماں جی کہاں ہیں؟" تزئین نے کچن میں آ کر پوچھا۔

"بڑے خان نے بلایا تھا۔ وہیں ہیں"۔ ماما کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

"کیا تیمور سرائے چلے گئے؟" وہ جاتے جاتے پھر پلٹیں۔

"نہیں چھوٹے خان بھی اپنے کمرے میں ہیں"۔ ماما نے جواب دیا۔

"ہیں...... ویسے تو بڑی جلدی ہو رہی تھی۔ یہ عطر بھی اتنی دیر سے نظر نہیں آئی۔ کچھ پتہ چلا ماما یہ فائرنگ کیسی تھی؟"

"چھوٹے خان سے پوچھیں بی بی جان"۔ ماما نے پیٹھ موڑتے ہوئے جواب دیا۔

تزئین داخلی طور پر اتنی مضطرب تھیں کہ وہ ماما کے غیر معمولی انداز پر دھیان نہ دے سکیں۔ اور سوچتے ہوئے انداز میں تیمور کے کمرے میں جانے کیلئے زینے کی طرف بڑھیں۔ کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر سوچا بہت آہستہ سے دستک دی۔

"ہوں...... کون ہے؟" تیمور علی خان کے انداز میں جھلاہٹ تھی۔ تزئین دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔

"آپ...... آیئے آپا"۔ تیمور بستر پر نیم دراز سر کے پیچھے ہاتھوں کا تکیہ بنائے جانے کس دھیان میں تھے۔ بہن کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔

"گئے نہیں؟" وہ نزدیکی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"کہاں؟" وہ گم صم انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"سرائے...... اور کہاں؟ کہاں تو تم پر سفر سوار تھا کہ کھانا بھی نہیں کھا رہے تھے"۔

"ہوں...... بس...... ویسے ہی موڈ نہیں بن رہا اب"۔ وہ نظریں چرا کر گویا ہوئے۔

"یہ فائرنگ کیسی تھی تیمور؟ وہ ادھر ساری خواتین ابھی تک سہمی بیٹھی ہیں"۔

وہ جانے کیوں ٹھٹک گئی تھیں۔ اس پر سے تیمور کا روانگی ملتوی کرنا، گم صم سا نظر آنا۔ ان کے بے نام شبہات کو تقویت مل رہی تھی۔

"ایک حادثہ ہو گیا ہے آپا۔ حیرت ہے آپ ابھی تک بے خبر ہیں۔ کسی ملازم نے بھی نہیں بتایا"۔ وہ بہت آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے۔

"کیا؟ کیسا حادثہ؟" وہ ڈر کر بھائی کی صورت دیکھنے لگیں۔

"عطر کو اس کی ماں کے کارندے اٹھا کر لے گئے ہیں"۔ انہوں نے گویا دھماکہ کیا۔

"ہیں...... اس کی ماں کے کارندے؟ کیا کہہ رہے ہو؟ اس کی کوئی ماں واں نہیں ہے"۔ انہیں تیمور کی ناقص معلومات پر افسوس ہوا۔

"آپ کو دراصل حقیقت حال کا علم نہیں ہے۔ اس لئے آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔ اس کی ماں بھی ہے اور یقیناً دنیا کے کونے میں باپ بھی ہو گا"۔ وہ پرسکون انداز میں بہن کی معلومات میں اضافہ کر رہے تھے۔

"پتہ نہیں کہاں سے سن کر آ رہے ہو۔ خالہ سوار نے کبھی بھی ہم میں سے کسی کے ساتھ غلط بیانی نہیں کی"۔ تزئین کسی طور ماننے کو تیار نہ ہوئیں۔

"ہو سکتا ہے انہوں نے اماں جی کو بتایا ہو اور آپ سب سے چھپایا ہو۔ اماں جی غالباً اسی قسم کا تذکرہ کرنے دادا صاحب کے کمرے میں۔ وہاں سے آ گئیں تو پوچھ لیجئے گا"۔ تیمور نے پرزور انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے مان لیا۔ لیکن اس کی ماں کو اس طرح سے لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر وہ اماں جی سے بات کر کے لے جاتی تو کون سا اماں جی اسے روک لیتیں؟" تزئین کی الجھن کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔

"وہ سیدھے طریقے ہی سے لینے آئی تھی مگر ہم نے اور دادا بھائی نے شاید اس کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا"۔

"آپ لوگ ملے ہیں اس سے؟ کب؟ کہاں؟" تزئین سر سے پاؤں تک مستفسر ہو گئیں۔

"یہیں...... حویلی میں...... آئی تھی وہ"۔ تیمور نے جواب دیا۔

"تو ہمیں کیوں نہیں ملوایا؟ ہم بھی تو دیکھتے۔ ویسے کیسی ہے؟" تزئین کے انداز میں اشتیاق در آیا۔

"جیسی اس علاقے کی عورتیں ہوتی ہیں"۔ تیمور علی خان نے بہن سے نظریں چرا لیں۔

"کس علاقے کی؟" تزئین کی سوچ وہاں تک نہیں پہنچ سکی تھی جس طرف تیمور علی خان اشارہ کر رہے تھے۔

"آپ نے اس کے گیت سنے ہیں۔ کیسی آواز ہے اس کی؟" انہوں نے سوال کر دیا۔

"اف...... بہت خوبصورت آواز ہے۔ میں تو سن کر حیران رہ گئی تھی۔ کئی فنکشن وغیرہ میں گائے تو لاکھوں کمائے"۔ وہ مسکرا دیں بے ساختہ۔

"اس کی ماں کر رہی ہے لاکھوں کمائے"۔ تیمور علی خان نے بے ساختہ کہا۔

تزئین یک دم سناٹے میں رہ گئیں۔

"تیمور"

"جی...... امید ہے آپ سمجھ گئی ہوں گی"۔

"ہوں...... سمجھ گئی ہوں...... کچھ نہیں۔ اس کی نانی تو خالہ سوار آنے کی پھوپھی ہے۔ اور خالہ سوار تو سر سے پاؤں تک "بے سُر" ہیں۔ اس علاقے میں خالائیں تو ہو سکتی ہیں مگر پھوپھیاں نہیں"۔ وہ در حقیقت الجھی تھیں۔

"لگتا ہے خالہ اماں جی کو سب کچھ بتا چکی ہیں۔ اماں جی کو سب معلوم ہے۔ مزید معلومات ان ہی سے مل سکتی ہیں آپ کو"۔ تیمور نے انہیں الجھن سے نکالنے کی کوشش کی۔

"وہ اسے زبردستی خطرہ مول لے کر گئی۔ جب کہ عطر اس کے سامنے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر چکی تھی"۔ تیمور گویا ہوئے۔

"پتہ نہیں...... ان عورتوں کا پیٹ کیوں نہیں بھرتا۔ کتنا جی لے گی؟ کتنا کمائے گی؟ کون سا خاندان بنا کر بیٹھی ہے کہ آل اولاد کی فکر میں کما رہی ہو۔ چچ چچ۔ یہ عطر تو بہت معصوم بہت ہی بے وقوف ہے۔ بڑی زیادتی ہو گی اس کے ساتھ"۔ تزئین کو بہت سے ملال ستانے لگے۔

"اگر وہ ان کا کہا نہیں مانے گی تو اور مصیبت۔ یہ لالچی اور حریص قوم۔ یہ لوگ تو تشدد بھی بہت برا کرتے ہیں۔ ایسی پھول جیسی نازک لڑکی۔ کم بخت کو ابھی پورا ہوش بھی تو نہیں آیا۔ تیمور! کچھ ہو نہیں سکتا؟ مجھے تو بڑا ترس آ رہا ہے غریب پر"۔ تزئین بے حد افسردہ ہو گئیں۔

"ماں بیٹی کا معاملہ ہوتا تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ اب تو مشکل ہے۔" تیمور نے مایوس کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

"ہائے ۔۔۔ تیمور یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ ہائے ہائے۔"

"اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟" وہ عام سے انداز میں گویا ہوئے۔

"تب ۔۔۔ کتنا ڈرتی تھی تم سے۔ خدمت گزار تھی۔ آدھی رات ہو یا دن۔ ایک سا انداز تھا کام کرنے کا۔ چلتی ہوں۔ اماں کو دیکھتی ہوں۔ وہ تو یوں بھی دل پر لیے بیٹھی ہوں گی۔" اب انہیں ماں کی فکر پڑ گئی۔

"کھانا یہیں بھجواؤں؟" وہ دروازے کے قریب جا کر رک گئیں۔

"نہیں ۔۔۔ صرف ایک گلاس دودھ بھجوا دیجیے گا۔ تھینکس۔" وہ بیڈ سے اتر کر رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے گویا ہوئے۔

تو بیگم باہر نکل گئیں۔

تیمور رائٹنگ ٹیبل کے نزدیک ہی کرسی چھوڑ کر کھڑے تھے پھر واپس پلٹ کر دریچے میں آ کھڑے ہوئے تھے۔

پھاٹک کے نزدیک ایستادہ مرکزی گھوڑے کی روشنی میں پورچ تک منظر واضح تھا۔

ایک لڑکی تھکے پاؤں دوڑتی ہوئی جیپ میں بیٹھ رہی تھی۔ بار بار اس منظر کی تکرار سے ان کا دماغ سن ہونے لگا۔

وہ اس کا دیوانہ وار ۔۔۔ نڈر بے خوف انداز ۔۔۔ وہ دریچے سے ہٹ گئے۔

"اوہو ۔۔۔ ہو ۔۔۔ بچ گئے چاچا۔ کوئی ذرا ادھر ادھر ہو جاتی۔ ہو گیا تھا تمہارا تو کام۔" عارف چوکیدار سے تمام تر رپورٹ وصول کر رہا تھا۔

"ام چونک گیا تھا۔ ادھر وہ بڑا خان آ گئی۔ ام ذرا ادھر سوچی۔ غلط وقت فائدہ اٹھا گئی۔ افسوس کا بات ہے ہمارا فون بے کار گئی۔ چوکری تو پھر بھی چلا گیا۔ چھوٹا خان نشانے پر تھی ورنہ ام سمجھ گئی۔ ابی ام بوڑھا ہے پر ایسا ابی نہیں۔" چوکیدار اپنی ساکھ بحال کرنے کی کوشش میں بولے چلا جا رہا تھا۔

"مگر جب بڑے خان گن اٹھائے ہوئے تھے تو لڑکی کیسے چلی گئی لالہ؟" عارف نے نکتہ اٹھایا۔

"بس وہ اندر سے بھاگتا ہوا آیا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔" چوکیدار نے بڑے معصومانہ انداز میں بتایا۔

"خود ہی"۔ عارف کی حیرت بڑھ رہی تھی۔

"خود ہی ۔۔۔ ام دیکھتا رہ گیا بس۔" چوکیدار نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"خان نے پوچھا نہیں کیا؟" عارف نے الجھ کر سوال کیا۔

"بڑا تیزی میں معاملہ ہوا۔ کچھ سمجھائی نہیں آیا۔" چوکیدار نے سادگی سے جواب دیا۔

عارف چند ثانیے گم صم سا کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

اسی دم رو بابو بی اپنے مخصوص گھاگھرے میں ملبوس سر پر ٹوکری بغل میں پچھواڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی۔

"رو بابو بی اندر خالہ سو رہی نہ ہوں گی؟ انہیں کچھ معلوم ہوا ہے؟" عارف نے دوبی بے تابی سی کیفیت میں پوچھا تھا۔

چند لمحوں بعد سفید چادر میں لپٹی بھی خالہ باہر آتی دکھائی دیں۔ ان کی چال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت نڈھال ہیں۔

"ہاں بیٹے کچھ کیا بات ہے ۔۔۔؟" وہ قریب آ کر گھٹے گھٹے انداز میں بولیں۔

"میں نے سنا ہے کل؟"

"ٹھیک سنا ہے بچے۔ لونڈیا کے نصیب پھوٹ گئے۔ کم ذات ہے ماں اس خاندان کی چھوٹاں۔ ایک اس مردار جیسی ماں ہوتی ہے بے غیرت بے ضمیر۔" وہ رونے لگیں۔

"ارے میں تو تیری ماں کی خیریت پوچھنے گئی۔ دکھیا سے باتیں کرنے میں دیر ہو گئی۔ ادھر ادھر سب ہو گیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"اس کا کوئی اتا پتا نشانی نہیں۔ کچھ کرتا ہوں۔" وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"میں صدقے"۔ خالہ نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"پرانے وقتوں کی طرح کوئی تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ بے تعیش سے دھندا کرتی ہے۔ بڑے بڑے سرکاری افسروں سے تعلق ہے۔ تو اس کے آگے کل کا بچہ ۔۔۔ اللہ تیری ماں کو غیر عطار کرے۔" انہیں عارف پر ڈھیروں پیار آ گیا۔

یوں بھی عظیم دکھ کے دورانیے میں عموماً دکھ بتانے والے یوں محسوس ہوتے ہیں جیسے اندھیرے میں ستارے۔

"لیکن خالہ ۔۔۔ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا تو اس کے ساتھ بہت زیادتی ہے۔" وہ بہت فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ مجھے اس کی نانی کا پتا دیں۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔" وہ پھر گویا ہوا۔

"ہائے ۔۔۔ اس کے پاس چلے بھی نہ جانا۔ غریب سنتے ہی دم دے دے گی۔ اس کی تو ساری صحت ہی اٹھانے لگ گئی۔" خالہ نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"پتہ چلا ہو گا کہ اس کی ماں سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان چاروں صوبوں میں سے کس میں رہتی ہے۔" اس کی سوچ میں خالہ کی باتوں سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

خالہ نے شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"پہلے کیوں نہ کچھ پھوٹا؟ تیرے ساتھ ہی بیاہ دیتی۔ پھر تو وہ حرام خور ساری زندگی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایسی اشرف ہے ۔۔۔ بڑے سلجھے کاموں تھی ۔۔۔ شکل صورت بھی بھلی۔"

عارف ہونٹ کاٹتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ خالہ کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو بہنے لگے۔

"اماں جی...... آپ نے ہم سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا تھا؟" ترئین نے شکایت آمیز انداز میں کہا تھا۔

"ارے میں نے کہا رات گئی بات گئی۔ کیا کسی کے دکھوں سے مزے لینا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہوتی"۔

"سو لا آنے تو ظلم نہ کر۔ تیرے بڑے خان نے کہا ہے میں نے کہ کچھ کریں"۔ وہ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے"۔

اماں جی نے سبزی بناتی ہوئی خالہ کو اب بست بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"آہ...... اماں جی...... کھیل تو پورا ہو گیا۔ اب تو یہ خود کو دھوکہ دینے والی باتیں ہیں۔ اس کے نصیب کی لڑائی میں ہمارا آپ کا کیا دخل؟" خالہ نے قطعی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔

"نہ...... مایوس نہیں ہوتے۔ اللہ کے پاس ہر مشکل کا حل ہے۔ مشکل تو انسانوں کیلئے ہوتی ہے۔ بس دعا کرو اللہ پاک اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین"۔ اماں جی کی فطرت میں مایوسی کا عنصر کبھی بھی نہیں آیا تھا۔

"ایک عورت ہی تو ہے خالہ۔ کیا کر سکتی ہے۔ ٹھیک ہے اس نے اپنا سارا زور لگا دیا ہے اب جب بابا صاحب کچھ کریں گے تو ظاہر ہے کچھ اچھا ہی بندوبست کریں گے"۔

ترئین نے بھی انہیں مایوسی سے نکالنے کی کوشش کی۔

"وہ عورت بہت پہنچ رکھتی ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے سلامی لیتی ہے چاہے جوتے پر"۔ وہ ہچکی سے سسک گئیں۔

"کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، سو لا آنے۔ نعوذ باللہ۔ اللہ سے بڑا تو نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ کسی کی مدد کرے تو کوئی روک سکے گا اسے۔ بری بات۔ اللہ پر بھروسہ کر تو نے رات بھی کھانا نہیں کھایا۔ کچھ کھا پی لے"۔

اماں جی کا دل ان کی حالت پر پگھلا جا رہا تھا۔

"بھوک ہی نہیں لگ رہی۔ نہ نیند آ رہی ہے۔ جیسے سکتہ سا ہو گیا ہے۔ میرا تو بس ہی نہیں اب کہ اس کی بوٹی کاٹ سکوں کر تیر آبدار ہوتی"۔ ان کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"آپا...... وہ میرا بلیو سوٹ کیس ہے ناں...... اس کا لاک خراب ہو گیا ہے۔ کوئی اچھا سا سوٹ کیس ہو گھر میں تو نکال دیں پلیز"۔

تیمور علی خان دالان میں داخل ہو کر ترئین سے مخاطب ہوئے۔

"ابھی تو چار پانچ روز ہیں تمہاری روانگی میں...... اتنی جلدی پیکنگ شروع کر دی"۔ ترئین نے تعجب سے ان کی جانب دیکھا۔

"اس دوران جو کچھ یاد آتا رہے گا وہ رکھتا رہوں گا۔ کسی چیز کے مس پلیس ہونے کا خطرہ تو نہیں رہے گا۔ پھر بعد میں بہت کوفت ہوتی ہے"۔

"تمہارے بابا صاحب کے کمرے میں دو تین سوٹ کیس ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔ اور بڑے بڑے ہیں ان میں سے کوئی لے لو"۔

"کہاں جا رہے ہو اس وقت؟" تیمور علی خان فل سوٹنگ کئے ہوئے تھے اس لئے اماں جی نے پوچھا۔

"ایک دوست کے پاس...... بہت ضروری ملنا ہے"۔ انہوں نے سرسری نگاہ خالہ پر ڈال کر جواب دیا۔

"بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہارے جانے میں۔ زیادہ سے زیادہ میرے پاس بیٹھا کرو۔ موت زندگی کا کیا بھروسہ۔ جانے پھر اس کی شکل دیکھ بھی سکوں کہ نہیں"۔

"اماں جی...... ایسی باتیں نہیں کرتے۔ جہاں ہم پڑھتے ہیں وہاں دنیا کے کونے کونے سے لڑکے آئے ہوئے ہیں پڑھنے کیلئے۔ اور ان سب کی مائیں ہیں۔ جو اس خوشی میں جدائی برداشت کرتی ہیں کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہم تو مرد ہیں اماں جی وہاں تو دوسرے ملکوں سے لڑکیاں آئی ہوئی ہیں پڑھنے کیلئے۔ وہاں دو بیسٹ فرینڈز ہیں لڑکیاں میں ہماری کلاس فیلوز ہیں"۔ تیمور نے ترئین کی طرف دیکھ کر مزید وضاحت بھی کر ڈالی۔

"ایک تو مشہور انڈین ایکٹریس کی بیٹی ہے۔ دوسری اولیں ہے۔ نسلاً انگلش ہی ہے مگر پیدا انڈیا میں ہوئی تھی۔ ابھی کے کسی دور افتادہ گاؤں میں ہوتی ہے اس کی ماں۔ دیکھیں اماں جی وہ بھی تو ماں ہے"۔

"تو تمہیں کیا ضرورت ہے لڑکیوں کو سہیلیاں بنانے کی۔ لڑکے پورے نہیں پڑتے؟"

اماں جی کو لڑکیوں کے ساتھ دوستی کی بات بالکل نہ بھائی۔

"اماں جی دوست سہیلیاں تو بس خود بخود بن جاتے ہیں۔ اچھا ہم چلتے ہیں، دیر ہو جائے گی"۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ماں کے پہلو سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹے...... وہ اپنے بابا صاحب پر دباؤ ڈالو۔ دیکھو خالہ کا کیا حال ہو گیا ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ سوتی ہے"۔

اماں جی کو پتا تھا بابا صاحب ان کی بہت سنتے ہیں۔ تیمور علی خان نے بائیں ابرو اچکا کر آنکھوں سے خالہ کی سمت دیکھا۔

"کیا ہم بھی آپ سے وہیں جملہ کہیں جو سب کہتے ہیں کہ "فکر نہ کریں"۔ دیکھئے وہ اس حویلی میں کام کرتی تھی سب اس سے خوش تھے۔ اس کی خدمات کے صلے میں اس کا حق بنتا ہے کہ اس کیلئے کچھ کیا جائے"۔ تیمور علی خان کے انداز میں ان کا آبائی وقار جھلک رہا تھا۔

خالہ نے پھرتی دکھائی اور تیزی سے اٹھ کر تیمور علی خان کے ہاتھ تھام کر چوم لئے۔ ان کی آنکھوں سے چند قطرے بھی تیمور علی خان کے ہاتھوں پر ٹپک گئے تھے۔ سب نے خالہ کو تسلی دی تھی مگر ایسا مضبوط دلاسا کہیں سے نہیں آیا تھا۔

"اتنی خوشیاں دے رب العالمین آپ کو کہ آپ سے سنبھل نہ پائیں"۔

"آمین"۔ اماں جی نے بے ساختہ کہا۔

"کتنی دعائیں دیتی ہے تو سو لا آنے میرے بچوں کو...... تو نے تو خرید لیا ہے مجھے"۔ اماں جی نہال نظر آئیں۔

"ہائے نہیں اماں جی۔ آپ کے پیر کی جوتی ہوں"۔ خالہ نے آنکھیں پونچھیں۔

تیمور علی خان صدر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"اچھا...... تیمور اور بابا صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا گھر میں؟" یاور علی خان سفری تھکن اتار کر سو کر فارغ ہوئے تو

نازنین نے انہیں مطلع کیا۔ وہ ایک دم خاصے پریشان نظر آنے لگے۔

"لیکن وہ لوگ چوکیدار، بابا صاحب اور تیمور کے ہوتے ہوئے اندر کیسے آ گئے؟ صرف صدر دروازے کی طرف تین گن (بندوقیں) لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ہر گزرنے والے نے پہلے وہیں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس پر گیٹ پر موجود گن مین جتنی دیر وہ گن مین سے الجھے ہوں گے۔ اتنی دیر اندر موجود لوگوں کیلئے کافی تھی۔ جب کہ تیمور اور بابا صاحب تو ہر وقت اندر ہیں"۔

یاور علی خان کو اس نکتے پر سخت الجھن ہو رہی تھی۔

"چوکیدار بے چارہ تو جلدی زخمی ہو گیا تھا"۔ نازنین نے تاسف سے کہا۔

"تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟" یاور علی خان در حقیقت بہت فکرمند نظر آ رہے تھے۔
اس معصوم سی لڑکی کے ساتھ زیادتی کا انہیں بھی بہت دکھ تھا۔

"وہ اندر نہیں آئے۔ سطریہ خود بھاگ کر ان کی جیب میں بیٹھ گئی تھی"۔ نازنین نے کہا۔

"یار..." یاور علی خان نے بے بسی سے نازنین کی طرف یوں دیکھا۔ گویا اس کی ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

"پوری بات تو سنیں ..... یہ اپنی شیطان ..... گھر کی بچی اس طرف آ نکلی تھی۔ اس نے شور کر دیا۔ بس اتنی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے تیمور پر قابو پا لیا۔ بابا صاحب بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ لوگ تیمور کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ بس شاید اسی وجہ سے سطریہ خود ہی باہر آ گئی۔ بہت ہی نمک حلال نکلی اس نے سوچا ہو گا۔ کیوں اپنی وجہ سے مالکوں کو نقصان پہنچائے۔ ایسی بزدل دکھائی دیتی تھی۔ مگر حیران کر گئی"۔

نازنین نے چائے تیار کر کے یاور علی خان کے سامنے رکھی۔

"وہ جذبہ بہت ہی طاقتور ہوتا ہے جو دوسروں یا کسی کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ کرتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

یاور علی خان نے بیوی کی سمت تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"وہ بیوقوف ضرور ہے۔ میرا خیال ہے مگر اتنی بھی نہیں ..... آپ نے اتنی بڑی بات کس بنیاد پر کہہ دی"۔ نازنین نے الجھ کر پوچھا۔

"اتنی ڈرپوک سی لڑکی۔ جو کسی قیمت پر بھی ماں کے پاس جانے کیلئے راضی نہیں تھی۔ ادھر اس پر کوئی پریشر بھی نہیں تو۔ اور آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ بے وقوف لوگوں ہی سے اس طرح کی احمقانہ و بے سروپا حرکتوں کی توقع کی جا سکتی ہے"۔

یاور علی خان سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر جیبوں میں لائٹر ٹٹولنے لگے۔

"وہ تیمور کا بالکل مالکوں کی طرح احترام کرتی ہے۔ گھگھی تو بندھ جاتی ہے ان کے سامنے"۔ نازنین نے ان کے خیال سے بالکل اتفاق نہیں کیا۔

"چلیں خیر ..... ہم اس سے بہت متاثر ہوئے کہ اس نے ہمارے بھائی کو کسی مشکل میں پھنسنے سے بچایا۔ کوشش کریں کہ کسی بھی طرح حتیٰ الامکان اس کا انعام اسے دیں۔ جس مشکل میں ہے اسے نکالنے کی کوشش کریں"۔

"فی الحال تو اس عورت کا تو کچھ اتا پتا نہیں اور اس کی حد تک بھی کچھ معلوم نہیں۔ بے چاری خاصی پریشان ہے۔ بہت بری حالت ہے ان کی"۔ نازنین نے افسوس سے کہا۔

"ظاہر ہے فطری عمل ہے۔ ان کے پاس وہ کسی کی امانت تھی"۔ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں چھوڑا۔

"تیمور کہاں ہے؟" انہوں نے چائے کے درمیان میں چونک کر سوال کیا۔

"پتا نہیں ..... بڑی زبردست تیاری کے ساتھ باہر نکلے تھے۔ اور چائے والا آپ کیلئے؟" نازنین نے ان کا کپ اپنے قریب کرنے کی نیت سے ہاتھ بڑھائے۔

"نہیں ..... کیا کسی کو بھی بتا کر نہیں گیا؟" یاور علی خان کی توجہ ایک جگہ مرکوز تھی۔

"نہیں ..... شاید بابا صاحب کو علم ہو"۔ نازنین نے جواب دیا۔

"ہوں ..... اچھا ہم ابھی آتے ہیں ..... بابا صاحب کو سلام کر لیں"۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

نازنین نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر بہت الجھے ہوئے ہیں۔

تیمور علی سامان کی پیکنگ کے عمل سے تھک گئے تھے۔ اس لئے کمرے کی لائٹ بجھا کر برآمدے میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان تین چار دنوں میں ایک لمحے کو بھی وہ مظلوم ان کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔

سلیقے سے اوڑھنی سر پر جما کر نگاہیں جھکا کر بات کرنے والی ..... اس کی دوشیزگی ہی تو اس کا اثاثہ تھی۔ اس کے لٹ جانے کی تو کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ان کے گھرانے میں تو عورتوں کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ بابا صاحب تو اس معاملے میں زیادہ گہرائی میں جاتے ہوئے بھی دیکھے گئے۔ لیکن ان کے والد صاحب اور اماں جی خواتین کی عزت و احترام کے متعلق اتنے حساس تھے کہ یہاں کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ اہم بات ہی کوئی نہیں۔

سامان کی نظر چوکیدار پر پڑی۔ وہ گیٹ کی سمت جا رہا تھا۔ انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس وقت کون آ سکتا ہے۔ وہ دلچسپی سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

گیٹ کھلتے ہی کوئی اندر داخل ہوا اور ایک دم فرش پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ چوکیدار بھی دوزانو ہو کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ نوارد اور چوکیدار میں کیا گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے سن نہیں سکتے تھے۔ بجلی کی سی تیزی سے اپنے کمرے سے نکلے تھے اور چند جستوں میں زینے طے کیا تھا۔

"کیا ہوا خان بابا؟ ..... کون ہے یہ؟" چوکیدار اپنی کوٹھڑی کی طرف جا رہا تھا۔ تیمور نے درمیان میں ہی جا لیا۔

"زیتون بانو ہے ..... بہت زخمی ہے ..... ہم پانی لینے کے واسطے جاتا ہے چھوٹا خان"۔

تیمور علی خان کو گویا زبردست شاک لگا تھا۔

"ارے بھائی...... کیا نام ہے وہ؟ اندر چلو جلدی۔" انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"پ...... پ...... پانی......" اس نے جیسے کسی کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔

"یہاں سے تو اٹھو...... پانی بھی مل جائے گا۔" وہ جھلائے اور خود آگے بڑھ کر کھلا گیٹ بند کیا۔

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"پ...... پانی...... میں مر رہی ہوں خان...... پانی......"۔

"اسی دم خان بابا جگ سے گلاس میں پانی لے کر بھاگتا ہوا آ گیا۔ اور جھک کر مطربہ کو گلاس تھمایا جو فوراً ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"مائی گاڈ نہیں...... اٹھو" تیمور علی خان نے اس کا بازو تھام کر اٹھایا۔

"بابا...... پانی بیٹھک میں لے آؤ"۔

وہ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھے۔ مطربہ ان کے ساتھ جیسے گھسٹتی جا رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ وہیں دہلیز پر بے دم انداز میں بیٹھ گئی۔ چوکیدار بھی پانی لے کر پہنچ چکا تھا۔

"خان بابا...... خود پلاؤ اسے" تیمور علی خان نے کمرے کی لائٹس آن کرتے ہوئے کہا۔

چوکیدار نے تعمیل کی...... اتنا بڑا گلاس مطربہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

تیمور لائٹس آن کر کے پلٹے تو بری طرح چونک پڑے۔ مطربہ کے ہونٹوں کے دونوں کناروں پر خون جم کر لکیروں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کے سارے چہرے پر ورم محسوس ہو رہا تھا۔

"چاچا...... ایک گلاس اور" وہ تیز تیز سانس لینے لگی۔

چوکیدار ایک دم تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

تیمور دو زانو ہو کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"وہ...... کیا نام ہے...... مطربہ...... کیا ہوا ہے؟ کہاں سے آ رہی ہو؟" وہ بغور اس کی شکل دیکھنے لگے۔

"خان پنکھا تیز کر دیں...... آگ لگ رہی ہے اندر" اس نے دوپٹہ اتار کر دور پھینکا۔

تیمور علی خان روبوٹ کے انداز میں اٹھے اور پنکھے کی اسپیڈ بڑھا دی۔ پھر دوبارہ اس کی طرف چلے آئے۔ اسی چوکیدار بھی اندر داخل ہوا۔ مطربہ ہتھیلیاں کارپٹ پر جمائے بے دم انداز میں جھکی ہوئی تھی۔

"زرمان بانو...... لو پانی پیو...... ارے چھوٹے خان...... اس کا قمیص تو خون سے خراب ہے۔" چوکیدار گلاس اس کے منہ سے لگاتے ہوئے بدحواس ہو کر بولا۔

تیمور علی خان نے اس کی پشت کی طرف نگاہ کی تو واقعی سناٹے میں رہ گئے۔ "گاڈ"۔

انہوں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض دیکھی۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم بھی آتے ہیں"۔

ان کے تیز تیز اٹھتے قدم زبیدہ بیگم کے کمرے کی طرف تھے۔

ان کی دستک میں خاصا شور تھا۔

"کون؟" ان کی جھنجلی سی آواز آئی۔

"ہم ہیں تیمور...... بی بی جان کو بھیجئے"۔

تھوڑے سے توقف کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ زبیدہ بیگم نیند بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"خیریت...... کیا بات ہے تیمور؟" وہ پریشان ہو گئیں۔

"ہمارے ساتھ آئیے"۔ وہ بس اتنا کہہ کر پلٹ گئے۔ زبیدہ بیگم حیران پریشان ان کے پیچھے چل پڑیں۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ مطربہ نڈھال انداز میں کارپٹ پر ڈھیر ہو چکی تھی۔

"ہائے اللہ" زبیدہ بیگم سینے پہ ہاتھ رکھ کر جہاں تھیں وہیں تھم گئیں۔ "یہ مطربہ ہے تیمور" وہ بدحواس ہو گئی تھیں۔

"جی...... بی بی جان یہ بہت زخمی ہے۔ اس کے کپڑے تبدیل کرائیے۔ خون لگا ہوا ہے۔ ہم فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتے ہیں۔ اور کوئی مرہم وغیرہ دیکھتے ہیں"۔

وہ زبیدہ بیگم کو ششدر کھڑا چھوڑ کر باہر گئے۔

"بی بی جان۔ اس کو بہت خون لگا ہے۔ کمزوری ہو گیا ہے" چوکیدار نے دکھ سے کہا۔

"مطربہ......" زبیدہ بیگم نے اس کا رخسار دھیرے سے چھوا۔ کتنی جلدی سب کے منہ پر اس کا نیا نام چڑھ گیا تھا۔

"مطربہ...... دیکھو میں ہوں تمہاری بی بی جان" ان کے لہجے میں بلا کی محبت تھی۔ مطربہ نے ذرا دیر کو آنکھیں کھول کر ان کی سمت دیکھا۔

"بی بی جان" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"ہاں...... ہاں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ ابھی دوا لگاتے ہیں۔ فوراً آرام آ جائے گا۔ انشاءاللہ"۔

"ہمت کرو۔ اس طرف آ جاؤ۔ ہم کشن رکھ دیتے ہیں۔ تمہارے سر کے نیچے۔ آؤ شاباش"۔

انہوں نے مطربہ کو اٹھنے میں مدد دی۔ اور اسے بیٹھک کے بیچ لا کر لٹا دیا اور صوفے سے کشن اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا۔

"بی بی جان...... میں مر رہی ہوں" اس کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔

"نہیں نہیں...... ایسے نہیں کہتے بری بات...... تمہارے کپڑے تو خاک کی کوٹھری میں ہوں گے۔ تیمور ہم اپنا کوئی جوڑا لاتے ہیں" وہ باہر نکلیں تو تیمور آ گئے۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"کپڑے لینے جا رہی ہوں۔ جگہ جگہ خون لگا ہوا ہے" وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"خان بابا! کسی بڑے برتن میں پانی لاؤ..... ہلکا گرم کر کے..... بی بی جان اس کے زخم صاف کریں گے۔ اور ہاں ایک گلاس میں پانی پہلے دے جاؤ۔ یہ ٹیبلٹ بھی کھانا ہے"۔

مطربہ نے آنکھیں موندے موندے تیمور علی خان کی مہربان آواز کی تمام روشنیاں اپنے اندر اتاریں۔ یہ وہ تیمور علی خان تو ہرگز بھی نہیں تھے جن کے چہرے پر برف بھی رہتی تھی۔ جن کے حافظے میں اس کا نام محفوظ نہیں ہو پاتا تھا۔ کتنے پیارے لگتے بلند نظر آتے تھے۔ وہ اسے "لڑکی" کہتے ہوئے۔

چوکیدار پانی لے آیا تو انہوں نے دو ٹیبلٹس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے کیں۔

"لو یہ کھا لو..... درد کم ہو جائے گا"۔

وہ کہنیوں کے بل اونچی ہوئی۔ بمشکل پہلے ان کی ہتھیلی سے ایک گولی اٹھا کر منہ میں رکھی اور پانی کے چند گھونٹ لیے۔ پھر دوسری گولی اٹھائی۔

"خان بابا۔ ہم اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔ بی بی جان آ رہی ہیں۔ ان سے کہنا کسی طرح کوشش کر کے اسے اندر پہنچا دیں۔ پھاٹک میں تالا ڈالو اب پھاٹک اس وقت تک نہیں کھلے گا جب تک ہم اجازت نہ دیں"۔

وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں حکم دے کر باہر چلے گئے۔

صبح کو ہال کمرے میں ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مختلف آوازوں سے ایک شور سا ہو رہا تھا۔ خالہ بار بار اسے چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اسے سامنے دیکھ کر یقین نہ آ رہا ہو۔

"بتاؤ..... بچی کا کیا حال ہو گیا۔ بیٹی! کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے؟" اماں جی اس کی حالت پر بہت اذیت محسوس کر رہی تھیں۔

"یہ اتنے زخم تجھے آئے کیسے؟" خالہ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

"بہت مارا ہے انہوں نے"۔ مطربہ نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

"اے ہے..... ستیاناس ہو کم بختوں کا۔ کیا حشر کیا ہے پھول سی بچی کا"۔ خالہ آبدیدہ ہو گئیں۔ "لے یہ چائے ڈبل روٹی کھا لے"۔

"رات تو میں امتحان میں پڑ گئی اماں جی۔ کپڑے زخموں سے چپکے ہوئے تھے"۔ زبیدہ بیگم نے بتایا۔

"تو یہ تو بتا ان خونیوں سے بچ کر کیسے آ گئی؟ بڑی ہمت دکھائی تو نے"۔ اماں جی کہہ رہی تھیں۔

"کوٹھی میں کوئی فنکشن تھا۔ وہ چڑیل ادھر لگی ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں میں بے ہوش پڑی ہوں اور اتنی زخمی ہوں کہ مجھ سے اٹھا بھی نہیں جائے گا اور مجھ سے واقعی اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی"۔

"ہاں! بس اللہ ہی ہمت دیتا ہے"۔ اماں جی نے بڑی دل سوزی سے کہا۔

"مگر انہوں نے تجھے مارا کیوں؟ تو کیا بھاگتے ہوئے پکڑی گئی تھی؟" تزئین بھی گم صم حالت میں باہر آ گئی۔

"وہ مجھے دلہن بنا رہی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ میں نے زیور کھول کے پھینک دیا اور غرارہ پھاڑ دیا تھا۔ وہ دوسرا لے آئی اور مجھے زبردستی کپڑے پہنانے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا"۔

حاضرین نے جیسے ہی لفظ "تھوک" سنا اپنے اپنے ہونٹوں میں لفظ چاٹی محسوس کی اور اس کے اس "کارنامے" پر تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

"پھر.....؟" تزئین نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر اس نے وہ مارا ہے میرے منہ پر..... آہ"۔ مطربہ کراہی۔

"میں نے بھی کہہ دیا کہ انشاء اللہ مجھے کفن پہنا کر ہی بھیجو گی اس "عیسے" کے گھر۔ ہائے بی بی جان ایسا موٹا کالا..... آدھا گنجا۔ وہ تو بہت چھپا رہی تھی لیکن میں بھی بڑی چالاک ہوں..... آہ..... ہائے"۔

"تیری چالاکی ہوشیاری کے تو آگے پٹ رہے ہیں"۔ خالہ نے اس کے بازو پر مرہم لگاتے ہوئے جل کر کہا۔

"میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اتنا ہی اچھا ہے تو خود کر لو نکاح۔ کیوں اماں جی ٹھیک کہا ہے؟"

سب کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"ہاں..... ہاں ٹھیک کیوں نہیں ہے؟" اماں جی نے شفقت سے اس کا دل رکھا۔

"وہ تو تیرے "آئیڈیے" پر بڑی خوش ہوئی ہوگی"۔ تزئین نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے کہا۔

"کہاں بی بی جان..... وہ اور لگا دیے..... اف"۔

"چل لعنت بھیج اس کالے موٹے پر۔ میں نے تیرے لئے بڑا اچھا لڑکا دیکھا ہے۔ تیرے جوڑ کا ہے۔ رنگ بھی گورا ہے۔ اور پیسے والا بھی بہت ہے"۔ خالہ نے ٹیوب بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

سب ہی ایک لمحے کو ہونق ہو گئے۔ مطربہ تو اپنی تکلیف ہی بھول گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالہ کو دیکھنے لگی۔

"خالہ..... کیا رشتہ بھی ہو چکا چپکے چپکے۔ ہم سے بھی چھپاتی ہو؟" تزئین نے شاکی انداز میں کہا۔

"یہ تو بڑی نئی بات ہے۔ آپ سے کیوں چھپاؤں گی؟ جو کروں گی آپ سب کی اجازت سے ہی کروں گی"۔ خالہ نے رسانیت سے جواب دیا۔

"کس کا لڑکا ہے؟" اماں جی بھی خوشگوار حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

"بتاؤں گی اماں جی..... فکر نہ کریں"۔

مطربہ نہایت الجھن میں نظر آنے لگی تھی۔ اور جیسے اپنی تکلیف ہی بھول گئی تھی۔

"چلو خیر..... اچھا ہی ہے سر سے اترے۔ جتنی جلدی ہو سکے تیرا وزن کم ہو"۔ اماں جی نے فطری خلوص کا اظہار کیا۔

"اب تو خوش ہو جا..... گورے رنگ والے سے تیری شادی کر رہی ہیں خالہ"۔ زبیدہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

مطربہ خاموش رہی۔

"ویسے ایک بات ہے۔ ثابت ہو گیا کہ بہادر تو بہت ہے۔ بڑا دل گردہ ہے"۔

ترئین نے ایک نگاہ اس کے زخموں پر ڈالی۔

"بھاری قسمت ہماری" "آہ" ہوتی ہے بی بی جان۔" "آہ" جتنا زور دار ہو غلام کو اتنا ہی ابھارا ہوتا ہے۔ ... بہت کمزور اور ڈرپوک ہوں۔"

اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ سب ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"تو تو زخمی ہو کر بڑی گہری باتیں کرنے لگی۔" سارینہ نے مسکراتے ہوئے گویا داد دی۔

"وہ کون سی قسمت ہے جس کی تو مالک بن گئی ہے۔" ترئین کو اس کے جملے پر ابھی تک حیرت تھی۔

عطر خاموش رہی۔ بلکہ آنکھیں موند لیں۔

"زیب... اپنے بابا صاحب سے کہہ کر اس کا کوئی بندوبست کرو۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔" اماں جی غصے سے یہ بات کہنا چاہ رہی تھیں۔

تیمور علی خان کو دوست ہوئے تھے اس طرف آتے ہوئے۔ وہ اس کا جملہ سن کر تحیر سے دروازے ہی میں رک گئے تھے۔

"ہو گیا ہے بندوبست۔ اسے کراچی بھجوا دیتے ہیں۔ وہاں بھی تو ملازموں کی ضرورت رہتی ہے یہ بہت محنتی ہے اس کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح کرے گی۔ اشرف کی ماں وہاں پہلے ہی ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ وہاں بیا گیا ہوگی وہ اس کی بھال کرے گی اور یہ بھی کی اور ہم آپ کو بتانے آئے ہیں کہ ہم سرائے جا رہے ہیں۔ رات ایک بجے تک ہی واپسی کی فرصت ملے گا۔ حویلی پر پہرہ ہے۔ اطمینان رکھئے۔" وہ اتنا کہہ کر واپس پلٹ گئے۔

"پہرہ اللہ کا ہے... تمہیں بھی اللہ کی امان میں دیا۔" اماں جی نے دعا دی۔

"میں اکیلی رہوں گی کراچی میں؟" عطر نحیف آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"اور کیا بارات لے کر جاتی۔ اشرف اور اس کی ماں گاؤں کے ہیں اپنے۔ بھلی عورت ہے۔" خالہ نے ٹوکا۔

"مگر میرا تو دل نہیں لگے گا۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"جان کی خیر منا... جان کے ساتھ ہیں دل لگانے کے سودے۔" خالہ نے ڈانٹا۔ "یہ کیا کم ہے کہ اللہ نے بچا لیا ہے۔ لگا بیچ دل 'وحشت' پڑا ہے۔"

"یہ لڑکیاں تو آتی جاتی رہتی ہے۔ اور اب تو چھوٹی دلہن بھی جاتی رہتی ہیں۔ ان کو تو بیگ ہے ولی۔" اماں جی نے سمجھایا۔

"تو کیا اصیر خان کی شادی میرے پیچھے ہو جائے گی... آہ۔"

"بڑی پہلی ایک ہوئی پڑی ہے۔ مگر دل ہے کہ شادی بیاہ میں اٹکا پڑا ہے۔" خالہ نے ڈانٹا۔

"لیکن میں کراچی کس کے ساتھ جاؤں گی؟"

"اب یہ ہمارا مسئلہ ہے تو کیوں ہلکان ہو رہی ہے؟" زیب بیگم نے ڈانٹ پلائی۔

"اماں جی... آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ تیرا علاج کریں گے۔ کوئی عمر بھر تھوڑا ہی بھیج رہے ہیں کراچی۔ بے وقوف کہیں کی۔" خالہ نے دلاسا دیا۔

"میں نہیں کروں گی یاد وہ... گورے سے نکالے۔" وہ بڑبڑائی۔

"سن رہی ہیں اماں جی۔ اس حال میں بھی کیسی چٹر چٹر زبان چل رہی ہے۔ چاہو نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟" خالہ ہار مان گئیں۔

"دنیا میں ایسے بھی تو لوگ ہوں گے جو پیار نہیں کرتے۔ دنیا میں ایک ہی تو کام نہیں کرنے کیلئے ہوتے۔" اس نے اپنا بازو ہلایا۔

"چھوڑو سوال... اس وقت اس کا دل اچھا نہیں۔ تو کیوں اپنی جان جلا رہی ہے۔"

اماں نے لاحاصل بحث سمیٹی۔ مگر خالہ جانے کیوں کھٹک رہی تھیں۔

ایک تو لڑکیاں شرم کی وجہ سے شادی بیاہ سے لاتعلقی کا اظہار کرتی ہیں مگر اس کا انداز کچھ اور تھا۔ مگر وہ اماں جی کی وجہ سے چاہنے کے باوجود کچھ بولیں نہیں۔

"چل عطر! اٹھ جا۔" خالہ نے آہستگی سے پکارا تھا۔

وہ ہڑبڑا کر جاگ گئی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ "کیا ٹائم ہو رہا ہے خالہ؟"

"صبح کے ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ بی بی جان نے ایک بیگ دیا تھا۔ تیرے چار پانچ جوڑے اس میں رکھ دیے ہیں۔ یہ لے وضو کر... پڑھ لے۔" خالہ نے وہ لوٹا اس کے ہاتھ پکڑا دیا۔

ایک تو وہ ابھی پوری نہیں جاگی تھی۔ اس پر مستزاد وضو کا پانی۔

"مگر کیوں؟ کپڑے بیگ میں کیوں رکھے ہیں؟ اور وضو کر کے میں کیا کروں؟"

"بیٹی... تجھے تیمور خان اس ہوائی جہاز سے کراچی لے جا رہے ہیں۔" خالہ نے کہا۔

"ہائیں" ساری نیند اڑ گئی۔ ایک عجیب سا احساس نے اس کی رگ رگ میں لطافتیں بھر دیں۔

"یہ وضو کا پانی بھی اسی بیگ میں رکھ دو خالہ۔ میرے پاس تو کوئی پرس یا بٹوا نہیں ہے۔" اس نے چارپائی سے اترتے ہوئے کمزور سی آواز میں کہا۔

"تم ذرا وضو کرا دو خالہ۔ میرے ہاتھ سے تو کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

خالہ نے تڑپ کر اسے تھام لیا اور غسل خانے کی طرف لے گئیں۔

خالہ ہی نے وضو کرایا پھر خود ہی صاف کیا۔

"کپڑے تو تیرے ٹھیک ہیں۔ اب دواؤں کی بو کا کوئی علاج نہیں۔ یہ میں نے سفید بکس کی چادر تیرے لیے نکالی

ہے۔ اسے اچھی طرح لپیٹ لے۔ میں یہ پیسے بیگ میں رکھ دوں"۔

خالہ اس وقت مشین کی سی تیزی سے کام کر رہی تھیں۔ اس نے چادر سنبھال کر [illegible] میں ڈالی۔ خالہ کا بازو تھام کر وہ بہت آہستہ آہستہ نیچے آئی تھی۔

"سب تو سو رہے ہوں گے۔ اماں جی سے تو مل لیتی"۔ اس نے منت سے خالہ کی سمت دیکھا۔

"کوئی بات نہیں ۔۔۔۔ چھوٹوں کی تو بات ہے۔ کیوں بے آرام کرتی ہو ۔۔۔۔ بی بی جان جاگ رہی ہیں انہی سے مل لو"۔ وہ اسے لیے ہوئے پورچ میں آ گئیں۔

بی بی جان ڈرائیور کے ساتھ کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

"اگر بیٹھنا مشکل ہو تو پیچھے لیٹ جاؤ"۔ رضیہ بیگم نے اس سے کہا۔

ڈرائیور نے جیپ کا دروازہ کھولا' خالہ نے سہارا دے کر اسے بٹھایا۔

"دیکھو گھبرانا نہیں۔ وہ بھی ہمارا اپنا گھر ہے"۔ رضیہ بیگم نے اسے تسلی دی۔

"اشرف کی ماں بہت اچھی عورت ہے۔ بہت خیال رکھے گی تمہارا"۔

"بی بی جان! اللہ آپ کو آل اولاد کی خوشیاں دکھائے ۔۔۔۔ کتنے بھلے لوگ ہیں آپ۔ ایک بے کس بچی کیلئے جو آپ لوگوں نے تکلیف اٹھائی ہے اللہ ہی اس کا اجر دے گا"۔

خالہ کا دل بھر آیا تھا۔ کچھ جذبہ سپاس سے اور کچھ اس کی جدائی کے خیال سے۔

"خالہ رونا نہیں ۔۔۔۔ ورنہ میں سارے راستے روتی جاؤں گی"۔ سطوت کو خود بھی رونا آ رہا تھا۔

"آ گئی وہ؟" اسی دم تیمور علی خان سیاہ کوٹ پتلون میں ان کے قریب آ گئے۔

"ہاں بیٹھ گئی"۔ رضیہ بیگم نے جواب دیا۔

"میرا بیگ رکھا ہے؟" وہ بہن سے پوچھ رہے تھے۔

"ہوں ۔۔۔۔ رکھ دیا ہے۔ اب بس بیٹھ جاؤ' وقت بہت تنگ ہے"۔

وہ پیچھے متوجہ ہوئے بغیر بہت آرام دہ انداز میں اگلی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

جیپ ریورس میں چلنا شروع ہوئی۔ خالہ بے تاب سے انداز میں ۔۔۔۔ ساتھ ساتھ چلے گئیں۔

"آؤ خالہ اندر چلیں"۔ رضیہ بیگم کو ان پر ترس سا آ گیا۔

خالہ بے ساختہ آتے ہوئے اشک پونچھنے لگیں۔ "اللہ۔ تیری امان میں دیا"۔

تیمور علی خان بورڈنگ کارڈ کے سلسلے میں کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کسی ہوئی شیشے کی دیوار سے کر نکالے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ روشنیوں کی چکاچوند۔ ایک سے ایک خوش لباس و خوش شکل زن و مرد بڑے مصروف انداز میں آ جا رہے تھے۔ اسے اپنے لباس پر نظر ڈال کر بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ بے تو قیمتی لباس پر اس نے بہت خوبصورت کڑھائی کی چادر پھیلا رکھی تھی جس سے آدھا چہرہ بھی چھپایا ہوا تھا۔

"آؤ"۔ تیمور علی خان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ گھبرا کر ان کے پیچھے بھاگی تھی۔ گویا بھیڑ میں گم ہو جانے کا خوف ہو۔ لاؤنج میں الگ ہی نظارہ تھا۔ لوگ جیسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

دو تین بچوں نے غالباً بلا کلام پکڑائی شروع کر رکھا تھا۔ پورے لاؤنج میں بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ دونوں جس صوفے پر بیٹھے تھے اس کی پشت پر آ کر ایک بچے نے چیخ ماری۔ وہ دونوں ہی بوکھلائی ہوئی تھی ایک دم اچھل پڑی۔ پھر اپنی حرکت پر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔ اس وقت تو بچے گھروں میں بے خبر سوئے ہوتے ہیں۔ ادھر تو جیسے پکنک ہو رہی تھی۔

معاً اس کا دھیان آگے بیٹھے ہونے والی اناؤنسمنٹ کی طرف گیا جب وہ متوجہ ہوئی تو اناؤنسمنٹ انگلش میں ہو رہی تھی۔

"خ۔۔۔ خان اشاید کسی کا بچہ کھو گیا 'اعلان ہو رہا ہے'۔" وہ بہت آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

تیمور علی خان نے گہری سانس لے کر چہرہ موڑا تھا۔ گویا اپنی جھلاہٹ پر قابو پایا تھا۔

"ابھی اردو میں بھی بولے گی۔ غور سے سن لینا۔" وہ اس خیال سے گویا ہوئے تھے کہ وہ مزید کوئی احمقانہ ذکر چھیڑے کیونکہ اس کے پہلو میں ایک بڑی فیشن ایبل خاتون گود میں شیر خوار اٹھائے براجمان ہو چکی تھی۔ وہ اس کے پہلو میں غالباً اسی کی بہن تھی۔ دونوں کی شکل میں خاصی مشابہت تھی۔

"ایکسکیوزمی انکل! آپ کے اس سائیڈ میری بال ہے۔" ایک بچہ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا صوفے کے پیچھے جھانک رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ وہاں کیا کر رہے ہو تیمور؟" سامنے صوفے پر بیٹھی ایک طرح دار خاتون نے بچے کو پکارا۔

تیمور علی خان نے دلچسپی سے اپنے ہم نام بچے کو دیکھا اور ایک طرف کو ہو گئے تاکہ بچہ آسانی سے اپنی بال نکال لے۔

"سوری انکل۔۔۔ ادھر نہیں ہے 'آپ کی آنٹی کے پاؤں کی طرف ہے'۔" بچے نے قدرے بلند آواز سے کہا اور مطربہ کی طرف ہو کر ہاتھ ڈال کر گیند اٹھانے لگا۔ پھر ایک دم اٹھا۔ اب اس کے ہاتھ میں وائٹ کلر کی پنگ پانگ بال تھی۔

"تھینک یو آنٹی"۔

"ڈیئر بابا۔ یہ انکل کی آنٹی نہیں ہیں آپ کی آنٹی ہیں۔ انکل کی تو غالباً 'وہ' ہیں"۔

مطربہ کے حسن سے دم بخود پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت بچے کو ٹوکتے ہوئے مسکرائی۔ جو بھی متوجہ تھا مسکرا دیا۔

"کراچی جا رہی ہیں آپ؟" وہی خاتون مطربہ کے چہرے کو پر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"جی"۔

"شادی شدہ ہیں ناں؟" اس مرتبہ اس نے پروقار بہت شاندار سے تیمور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔

مطربہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"پھر یہ آپ کے کون ہیں؟" خاتون کچھ دیر قبل بولے گئے جملے پر شرمندہ نظر آئی۔

مطربہ خاموش رہی۔

"کزن ہیں؟"

مطربہ خاموش رہی۔

"بڑے بھائی ہیں؟"

مطربہ پھر خاموش رہی۔

تیمور علی خان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میڈم! ہم زمیندار قسم کے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کی زیادہ تر خواتین اردو انگلش نہیں بولتی ہیں۔ یہ صرف مقامی زبان جانتی ہیں"۔

"سوری فار دیٹ"۔ عورت کھسیانی ہو کر بیگ سے پانی کی فیڈر نکالنے لگی۔

مطربہ نے بھی اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

اسی وقت کوئٹہ کی فلائٹ کیلئے اناؤنسمنٹ ہوئی اور مطربہ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی دونوں خواتین اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"جب کوئی بات کرتا ہے تو جواب ضرور دینا چاہیے۔ ابھی وہ اپنے میاں کو کہہ کر سیٹ لیتی وائس کو یقینی کرا کر اٹھو کر کراچی لے جائی جا رہی ہے۔ تین سیں۔ بیوقوفی پر اہلم"۔ تیمور علی خان کی طبیعت ازک برہم ہو گئی۔

ان کے انداز پر تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"خان! مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا جواب دوں؟" وہ روہانسی ہو گئی اس خوف سے کہ جانے کب تک وہ ناراض رہیں۔

"مگر کوئی اور پوچھے تو کیا جواب دوں؟" وہ سہمے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"بس اب کوئی نہیں پوچھے گا۔ فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے"۔ وہ اسی طرح آف موڈ میں گویا ہوئے۔ وہ چادر درست کرنے لگی۔

"خان۔۔۔ وہ بیگ تو آپ نے انہیں دے دیا ہے۔ اس میں میرے دو سوٹ پڑے بھی تھے۔ کہیں وہ نکال نہ لیں"۔ معاً وہ پریشان ہو گئی۔

"پیچھے بیگ میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ جھلائے۔

"میرے پاس کوئی دوسرا نہیں ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اماں جی سب کچھ دلا دیتی ہیں۔ کبھی بی بی جان دلا دیتی ہیں"۔ وہ ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔

تیمور علی خان اس کی آواز کے زیر و بم میں اتر گئے۔ چہرہ موڑ کر ایک بار پھر اس کی سمت دیکھا۔ سفید چہرہ گلابی کا پیچ ہونٹ 'چادر' کا ٹھیک ٹھاک گھونگھٹ۔

غصہ حسن کی شعاع میں جل کر خاک ہو گیا۔

"ڈونٹ مائنڈ۔۔۔ کوئی نہیں نکالے گا۔ ڈومیسٹک فلائٹ میں اتنی چھان بین نہیں ہوتی"۔

وہ شیشے کے پار دور تیز تیز آثار دیکھنے لگے۔

اسے اور تو کچھ سمجھ آیا سوائے اس کے کہ پیچھے کوئی نہیں نکالے گا۔

"اور یہ دو سو روپے تمہارے پاس آئے کہاں سے۔ لیکن خاصی رقم ہے۔ ایک جوڑی سونے کے بندے آ سکتے ہیں؟"
تیمور علی خان نے بنظر غائر اس کا چہرہ دیکھا۔

"خالہ نے دیئے تھے اور خالہ کو نائی نے دیئے تھے۔ اور سائی کو۔"

"کتنی عجیب لڑکی ہو (مسلسل سفر) اسٹاف پلیز۔ اب کراچی جا کر خیرات کر دینا۔ جان چھڑا لینا اس وزن سے" بد تمیز پوائنٹ بات کرنے والے تیمور علی خان بیچ جھلا کر رہ گئے۔

وہ سہم کر خاموش ہو رہی۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ جاتے ہی اشرف کی ماں کے حوالے کر دے گی۔

وہ سہمی سہمی سی داخل ہوئی تو سراپا حیرت تھی۔ راستے میں بھاگ ادا تا سمندر دیکھ کر تو وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے بہتا دریا بھی دیکھا تھا۔ اور دریائے جہلم بھی اتنا بڑا سمندر اف خدایا۔

وہ کوٹھی میں داخل ہوئے تھے اشرف منتظر ملا۔

"خان آپ کے دوست رات کو آ گئے تھے میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ صبح آ جائیں گے۔"

"اچھا۔ کیا سو رہا ہے؟"

"جی۔۔۔ رات کو لیٹ شو دیکھ کر آئے تھے۔ زیبا محمد علی کی نئی فلم لگی ہے ناں اتوار سے وہی دیکھ کر آئے ہوں گے۔"
مطربہ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ لیکن خاک حماقت برس رہی تھی چہرے پر۔

"بات مختصر کیا کرو۔" تیمور علی خان ناگواری سے ٹوک کر آگے بڑھنے لگے۔ وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی چل پڑی۔

اسی دم ایک سمت سے ایک ادھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی۔ اور بہت ادب سے جھک کر تیمور علی خان کو سلام کیا۔

"یہ تمہارے ساتھ رہے گی صابرہ۔ اس کا خیال رکھنا تمہاری سب سے خاص ڈیوٹی ہے۔ باہر کے کسی کام سے یہ نہیں جائے گی۔ یہاں کے کاموں میں تمہارا ہاتھ بٹائے گی۔ باقی ہدایات اماں جی فون پر تمہیں دے دیں گی۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں آرام کریں گے۔ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" وہ گول چکر دار زینے کی جانب بڑھ گئے۔

اشرف کی ماں دم بخود کھڑی مطربہ کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔

"تت۔۔۔ تمہیں خان حویلی سے لائے ہیں؟" عورت کا ذہن اس کا حسن دیکھ کر کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ میں وہاں کام کرتی تھی۔ خالہ سولہ آنے کی بھانجی ہوں۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

"ارے۔۔۔ تو سولہ آنے کی بھانجی ہے۔ میں صدقے۔ پھر تو میری بھی بھانجی ہے۔ سولہ آنے نے کہاں چھپا کر رکھا تھا یہ دانہ۔" صابرہ نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"آہ۔۔۔ ہا۔۔۔ آ۔۔۔ خالہ میرا جسم بہت دکھ رہا تھا زخم لگے ہیں۔" وہ اذیت سے دوہری ہو گئی۔

صابرہ نے بدحواس ہو کر اسے ایک دم خود سے الگ کر دیا۔

"ز۔۔۔ ز۔۔۔ زخم۔ کیسے آئے زخم بیٹی؟" وہ بری طرح پریشان و مضطرب نظر آئی۔

"میں وہاں کی خالہ۔۔۔ اب تو تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ سب کچھ بتاؤں گی۔۔۔ آئے" اس نے درد کی ٹیس پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ تو یہاں بیٹھ جا۔" اس نے مطربہ کو آہستگی سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"یہ مشٹنڈا اوس تیرے لیے؟" وہ اس کی پیشانی سے بال سمیٹ کر بہت محبت سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ اس میں سو دن کی۔ یہ مشٹنڈا جہاز میں کر رہا تھا۔ بہت نیند آ رہی ہے۔ پتا نہیں کتنی راتیں ہو گئیں۔ ٹھیک سے سو نہیں پائی۔" اس کی آواز میں ادھوری تھکن اتر آئی۔

"چل آ جا پھر۔۔۔ میرے بستر پر آرام سے سو جا۔ اور جتنا مرضی سو۔ تجھے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ جب تو سو کر اٹھے گی تو میں تجھے بہت اچھا سا پراٹھا کھلاؤں گی مرغی والا۔"

جانے اس کی صورت میں کیا جادو تھا کہ وہ موم کی طرح پگھل رہی تھی۔ اس سے بہت ہی محبت محسوس ہو رہی تھی۔

"یہاں کام ہی کتنا ہوتا ہے بیٹی۔ کام تو بندوں سے ہوتا ہے۔ جب چھوٹے سرکار ادھر آتی ہیں تب ہوتی ہے بڑی رونق۔ رات ایک بجے تک سونا نہیں ملتا۔ ویسا بندہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ آتی ہیں تو میں بڑی خوش ہوتی ہوں۔ اماں جی کہتی ہوں صابرہ گھر چمکا کر رکھا کر۔ کیا پتہ کب نظر آ جائے۔ تم ادھر ادھر دیکھ لینا۔ آس پاس کی کوئی کوٹھی ہماری کوٹھی کی طرح نہیں چمکتی۔ جیسے آج ہی بنی ہو۔ بڑے خان دو سال میں ایک دفعہ لازمی پوری کوٹھی میں رنگ و روغن کراتے ہیں۔ میری بڑی بہو جب کراچی (کراچی) آتی ہے تو مذاق کرتی ہے کہ اماں یہ تو تیری کوٹھی ہے۔ خانوں کا تو بس نام ہے۔ یہی ہوئی تو تو ہے اس میں۔"

صابرہ اسے اپنے کمرے تک لے جاتے ہوئے ایک تواتر سے بولے چلی جا رہی تھی۔

"اور آج سے تو یہ کمرہ تیرا بھی ہے۔" صابرہ قل قل کر کے ہنس پڑی۔

(ہائے۔۔۔ آگے پیچھے کوٹھیاں بنی ہیں میرے۔ گر دل حویلیوں کوٹھیوں پر راضی ہی کب ہے۔ یہ تو وہ مٹھی بھر جو ماں کی دی ہوئی مٹھائی پھینک کر تیز ہرن رہا گئے۔ رہا ہو اور وہ تھکے ذہن سے سوچ رہی تھی۔)

وہ شام پانچ بجے کے قریب سو کر اٹھی تھی۔ گہری نیند سے جاگنے کی وجہ سے کچھ دیر تو اسے کچھ سمجھ ہی نہ آئی کہ کہاں ہے۔ خاصی دیر چھت کو گھورتی رہی۔ پھر ایک دم اٹھ بیٹھی۔ دوپٹا سنبھالتی باہر آئی۔ سامنے ہی ڈائننگ ہال میں واش بیسن لگا تھا۔ وہ اسی سمت بڑھ گئی۔ بازو میں ابھی تکلیف تھی۔ اس نے بمشکل منہ دھویا۔ بازو اور کمر میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ کراہ کر سیدھی ہوئی تو محسوس ہوا وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ وہ چونک کر مڑی۔ سامنے تیمور علی خان چھوٹا سا ایک بیگ پکڑے کھڑے تھے۔

"اس میں تمہاری دوائیاں اور ٹیوبس ہیں۔ اشرف کی ماں سے کہہ کر زخموں پر دوا لگوا لینا۔ ویسے اب حال کیا ہے؟" وہ بیگ ایک کرسی پر رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"درد تو اب بھی بہت ہے خان اور الٹا بازو تو بہت دکھ رہا ہے۔" وہ اپنے دوپٹے کو دائیں ہاتھ سے چھ۔۔۔ بھی نے

ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ہوں"۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

"ویسے ہماری حیرت کسی طرح کم نہیں ہو رہی کہ اس رات تم نے اتنی ابتر حالت میں اتنا لمبا سفر کیسے کر لیا۔ سارا علاقہ جانتا ہے تمہاری ماں کا گھر حویلی کے نزدیک تو نہیں ہو سکتا۔ پہلے تم شہر آئی ہو گی پھر وہاں سے اتنی رات کو پیدل گاؤں"۔

"میں پیدل نہیں آئی تھی خان"۔ اس نے فوراً تیمور علی خان کی بات کاٹ دی۔

"پھر...... اتنی رات کو تمہیں سواری مل گئی تھی؟" وہ متعجب ہوئے۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔

"بولو"۔ وہ چیخ گئے۔

"مجھے ایک آدمی چھوڑ گیا تھا خان"۔ وہ بہت آہستہ بول رہی تھی۔

"تمہاری ماں کی طرف کا آدمی؟" وہ مزید حیران ہوئے۔

"نہیں...... جب میں دیوار کود کر باہر آئی تو ایک آدمی اپنی دوائیوں کی دکان بند کر کے تالا لگا رہا تھا اس نے مجھے دیوار سے کودتے دیکھ لیا تھا۔ وہ دکان چھوڑ کر بھاگ کر میرے پاس آیا۔ وہ سمجھا تھا کوئی چور ہے۔

شہر والے تو اُدھر سب جانتے ہیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ عورت مجھے اغوا کر کے لائی ہے اور میں بہت زخمی ہوں۔ میرے کپڑے خون میں تر بتر ہیں۔ بے چارے کو بہت دکھ ہوا۔ کہنے لگا "یہ عورت بہت خطرناک ہے۔ نہ میں تمہیں کسی اسپتال لے جا سکتا ہوں نہ اپنے گھر۔ میرا بھی جوان بیٹیوں کا ساتھ ہے۔ یہیں میرا گھر ہے۔ البتہ میں تمہیں وہاں ضرور پہنچا سکتا ہوں جہاں سے تم آئی ہو۔ میں اپنی بیوی کو بتا کر آتا ہوں اور گاڑی بھی لے کر آتا ہوں تم تب تک دکان کے اندر بیٹھ جاؤ۔ میں باہر سے بند کر کے جاؤں گا۔ گھبرانا نہیں"۔

پھر خان میں دکان میں بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے پتا پوچھا۔ مجھے تو خود بھی صحیح سے معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا اور گاؤں لے چلو۔ وہاں سے تو میں بتا سکتی ہوں۔

تھوڑی دیر میں وہ آ گیا تھا اس نے مجھے دکان سے نکال کر گاڑی میں بٹھایا۔ پیچھے اور دکان میں تالا ڈالا۔ حویلی تو بہت دور ہے اس کا گھر بہت دیر گاڑی چلی تھی۔ میں تو پتا نہیں سو گئی تھی یا بے ہوش ہو گئی تھی۔

راستے میں اس نے گاڑی میں پٹرول بھی ڈلوایا تھا۔ میں نچلی ہوئی تھی۔ پیچھے مجھ سے بولا اٹھ کر بیٹھ جاؤ کہیں کسی کو شک ہو جائے۔

"خان...... وہ بہت نیک آدمی تھا۔ اس نے مجھے حویلی سے تھوڑی دور اتار دیا تھا۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ آپ ہمارے خان سے مل لیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ کہنے لگا نیکی بھلائی کا زمانہ نہیں۔ نیکی گلے پڑ جاتی ہے۔ ایک تو جوان لڑکی پھر اس پر اس قدر زخمی۔ اس نے اللہ کا نام لے کر خطرہ مول لیا"۔

"واقعی وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ یا یہ کہ تمہاری لک (قسمت) بہت اچھی ہے اس اجنبی خاتون سے بچ کر جانا کوئی

آسان بات نہیں تھی"۔

"پتا نہیں خان قسمت اچھی ہے یا۔ قسمت اچھی ہوتی تو کہیں اور پیدا ہوئے ہوتے"۔

چھوٹی عمر میں بہت بڑی بات تھی۔ تیمور علی خان تو ایک دم گم ہو گئے۔

"یہی اچھی قسمت کی علامت ہے کہ تم جہاں پیدا ہوئی تھیں وہاں نہیں رہیں"۔ انہوں نے گویا اسے تسلی دینا چاہی۔

"اس نے تم پر اتنا تشدد کیوں کیا تھا؟" وہ جاتے جاتے پھر رک گئے۔

"ایک موٹے سے میری شادی کر رہی تھی۔ میں نے تو کہا بھی نہیں کہ کیا تھا وہاں اس پر بھی بڑا غصہ تھا۔ ایک چنڈال بڑھیا بھی تھی وہاں۔ اس سے کہہ رہی تھی کہ ایک دفعہ یہ وہاں بھاگ کر واپس آ گئی سارا زور ٹوٹ جائے گا گردن جھکا کر نہیں کر بھاگ کر چلے گی۔ سارا نشہ ہرن ہو جائے گا بس ایک دفعہ بس چل جائے اس پر کسی کا۔ اس لئے جلدی کر رہی ہوں ورنہ یہ بھوکی پیاسی مر جائے گی"۔

عطرت نہایت سادگی سے حرف بہ حرف بتا رہی تھی۔

اتنی سی بات میں کوئی الفاظ نہیں تھا کہ تیمور علی خان کی آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بغیر باہر نکل گئے تھے۔

"خیر سے آ گئی۔ دیکھو کسی تیرے آنے سے کتنی رونق ہو گئی ہے گھر میں۔ تیرے ملنے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ گرم گرم پکوڑے بنائے ہیں اور چٹنی بھی ہے۔ باہر لڑکوں کو بھی دے کر آئی ہوں۔ سب بڑے خوش ہوئے۔ بندہ اکیلا ہو تو کہاں دل کرتا ہے اس طرح کھانے پینے کو"۔

صابرہ اندر داخل ہوتے ہی شروع ہو گئی۔ احساس تشکر کی سینے میں ایک موج سی اٹھی تھی۔ اس نے بہت اپنائیت سے صابرہ کو دیکھا تھا۔

"خان کو تو میں نے پکوڑے نہیں بھجوائے۔ لال مرچوں کی چیزیں پسند نہیں کرتے ہیں وہ۔ اب یاد آیا کہ خان کا دوست بھی تو آیا ہوا ہے رات سے۔ اسے ہی بھجوا دیتی مگر اب تو وہ جا بھی چکے"۔

"یہ کیا ہے؟ تیرا ہے؟" صابرہ کی بات کرتے کرتے نظر بیگ پر پڑ گئی۔

"دوائیاں ہیں اس میں میری۔ اور مرہم ہے۔ جو تم ہی لگاؤ گی۔ کام بڑھ گیا ہے تمہارا"۔ وہ زیر لبی کے انداز میں مسکرائی۔

"صدقے جاؤں۔ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ مگر۔ صابرہ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"بیٹی ایسا ظلم تجھ پہ آئے کیسے؟" وہ بہت فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"کہاں...... بتیں ہوں اب۔ سب کچھ بتاؤں گی"۔ وہ اس کے ساتھ باہر کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"کیا خاتون نے؟"

"ارے نہیں خالہ...... خان لوگ تو بہت اچھے ہیں۔ یہ کچھ اور بات ہے۔ پہلے چائے پلاؤ۔ پکوڑے کھلاؤ۔ پھر سب کچھ بتاؤں گی۔ فکر نہ کرو"۔

"اچھا... آپا"۔ صابرہ اسے کچن کی لے کر چلی۔

صابرہ اللہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی؟ وہ دبے پاؤں کی بلی بنی ایک ایک کمرہ جھانک رہی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور روشنی ایک لکیر کی صورت باہر آ رہی تھی۔

اس نے آہستگی سے دروازہ دھکیلا اور دھک سے رہ گئی۔ ایک نوجوان سے جوان مرد ہی کہا جا سکتا تھا بیڈ پر کوئی نقشہ سا پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے دروازے کی چرچراہٹ پر چونک کر سر اٹھایا تھا اور ٹھٹک سا گیا تھا۔

"جی... تشریف لائیے۔ آپ کون؟" اس نے ہاتھ میں پکڑی پنسل نقشے پر ڈال دی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"جی... وہ... جی... السلام علیکم"۔ وہ گھبراہٹ میں بدحواس ہو گئی۔

"وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ بے نصیب"۔ اس شخص کی آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔

"وہ جی... تیمور خان ادھر نہیں ہیں؟ میں بھی"۔ وہ پلٹنے لگی۔

"سنیے"۔ اس شخص کی دھیمی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ تیمور کی کون ہیں؟" وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس قدر آپ جناب سے گھبرا کر وہ آدھی ہو گئی۔

"میں جی... کوئی بھی نہیں ہوں ان کی"۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی۔

"جب کوئی کسی کو ڈھونڈتا ہے یا پوچھتا ہے تو وہ اس کا ضرور کچھ نہ کچھ ہوتا ہے"۔ وہ بہت اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"آپ یقین کریں"۔

"اس انداز میں یقین نہ دلائیے۔ کہ مجھے ہی کسی تعلق کی ضرورت محسوس ہونے لگے"۔ عجیب شرارتی سا انداز تھا اس کا جو سر سے گزر گیا۔ اسے ایک دم اپنی اوقات یاد آ گئی۔

"آپ مہمان ہیں خان کے؟ چائے بھجواؤں آپ کیلئے"۔ اس سے نجات کی یہی آسان صورت نظر آئی۔

"چائے ہی پلوانا ہے تو بھجوائیے نہیں۔ خود لے کر آئیے"۔

وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پیچھے آئی۔ صابرہ اب بھی منظر پر نہیں تھی۔ وہ کچن میں چلی آئی۔

"اسے یہاں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ چینی کہاں رکھی ہے؟ پتی کہاں رکھی ہے۔ اول تو ذرا سا چلنے ہی سے اسے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ایک طرف ٹک کر گہری سانس لینے لگی تھی۔

"بیٹی! تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ کچھ چاہیے تجھے۔ جا تو آرام کر۔ میری آنکھوں میں تو ابھی تک تیرے سارے زخم ہیں۔ ہنے ہنے۔ ظالم کو اپنی اولاد پر رحم نہ آیا تو اوروں کے ساتھ کیا کرتی ہو گی"۔

"کہاں چلی گئی تھیں خالہ! میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ پریشان ہو گئی تھی میں تو"۔

وہ روہانسی ہو کر صابرہ کے گلے سے لگ گئی۔

"تو آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ میں سمجھی سو رہی ہے۔ میں پڑوس کی کوٹھی میں چلی گئی۔ وہاں حلیمہ کام کرتی ہے۔ یہ باتوں کے بعد پتہ چلا ہے۔ میں سارا کہا وہ بہت گئی تھی۔ ابھی تو گئی تھی۔ زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ ابھی ریشم والی تھک سے آئی ہے۔ ہاں سنتے سے گھبرا گئی ہو گی"۔

"خالہ! اوپر کوئی مہمان ہے چائے کا کہہ رہا ہے"۔ وہ پرسکون ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تو گئی تھی اوپر؟" صابرہ نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ تمہیں ڈھونڈنے گئی تھی"۔

"بیٹی! ارے کچھ تیرے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ ہر ایرے غیرے کے سامنے نہ جایا کر۔ اللہ نے تجھے بہت روپ دیا ہے۔ یہ آنکھوں کو آزمائش میں ڈالنے والی بات ہوئی۔ جتنا خود کو چھپا سکتی ہے چھپا۔ اللہ تجھے ساتھ خیریت کے اپنے گھر کی کرے۔ میں دے آؤں گی چائے"۔ صابرہ نے بڑی محبت سے سمجھایا۔

"تیمور خان بھی پتا نہیں کہاں چلے گئے"۔ وہ بڑبڑائی۔

صابرہ نے کیتلی اٹھاتے ہوئے ایک دم مڑ کر اس کی سمت دیکھا اور بہت غور سے دیکھا۔

"ایک بات اور گرہ میں باندھ لے بیٹی۔ مالکوں کی... وہ دوری' قربتیں' حاضری' غیر حاضری محسوس نہیں کرتے۔ نوکر ذات کو جتاتے نہیں ہے۔ تو لاکھ پیسے والی کی اولاد سہی مگر ادھر تو نوکر ہے۔ یہ عیب کی بات ہے بیٹی! ان سے دور رہنا"۔

عطرت خاموشی سے ہاتھ مسلنے لگی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

صابرہ نے باتیں کرتے کرتے چائے تیار کی۔ عطرت ہوں ہاں کرتی رہی۔ اوپر والے مہمان کے انداز وہ گردش میں آ رہے تھے۔

"یہ کیک بچا رکھا ہے صبح کو باسی ہو جائیگا۔ کھائے گی؟" صابرہ نے سنہری پلیٹ میں رکھا کیک اس کے سامنے رکھا ساتھ خوبصورت دستے والی چھری تھی۔ وہ گم صم سے انداز میں کیک پر چھری چلانے لگی۔ صابرہ چائے لے کر باہر نکل گئی۔

ابھی اس نے ایک پیس پورا کھایا بھی نہیں تھا کہ صابرہ ٹرے سمیت پھر سے موجود تھی۔

"کیوں۔ چائے نہیں پی مہمان نے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کہہ رہا ہے اب دل نہیں چاہ رہا۔ باہر جا رہا ہوں"۔

"اللہ نیکی دے لوگوں کو۔ اب میں ایسی بڈھی بھی نہیں ہوں کہ سمجھ ہی نہ سکوں۔ اس کی رہی ہوئی عقل تھوڑی بہت ہمارے پاس بھی ہے۔ ہر کوئی ہمارے خانوں جیسا تھوڑا ہی ہوتا ہے"۔

صابرہ برتن واپس رکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

رات کو کیونکہ وہ جلدی سو گئی تھی اس لئے صبح پو پھٹتے ہی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر باغ میں چلی آئی۔ آج دھوپ کی تپش میں بہت کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اعصاب بھی قدرے پرسکون تھے۔ وہ روش کی شکل میں بنی ایک سنگی بنچ پر بیٹھ

گی۔

اس کے سامنے حویلی کی صبح کا منظر ابھر کر رہ گیا تھا۔ کیسی بڑی رونق لگی ہوئی تھی۔ صبح کچن میں ماما ...... وہ بابو جی ناشتہ لو
وہ خود مشین بنی ہوئی تھیں۔ تقریباً حویلی کے سارے ہی مرد صبح صبح ناشتہ کرتے تھے۔ چائے کی اسے عادت نہیں تھی۔ سو ہاتھ منہ
دھوتے ہی کام میں لگ جاتی تھی۔ ایک افسردگی سی اس کے ذہن پر چھانے لگی۔

"آپ نے خود ہی چائے کیلئے کہا تھا۔"

وہ بری طرح اچھل پڑی۔ رات والا مہمان شیری ڈریسنگ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے کھڑا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم جی۔" وہ گھبرا کر بس یہی کہہ پائی۔

"وہ چائے ...... ویسے وعلیکم السلام۔" وہ پر شوق نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"وہ ...... خالہ نے کر دی تھی۔" اس نے مودبانہ کہا۔

"مگر مجھے خالہ کی بنی ہوئی چائے سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تو چائے کیلئے آپ نے کہا تھا۔" وہاں سے خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ ہوا۔

"مگر ...... خالہ مجھ سے اچھی چائے بناتی ہیں۔" وہ اس کی نگاہوں سے بہت گھبرا رہی تھی۔

"اچھی بری کا سوال نہیں ہے۔ چائے بنانے اور لانے والے کا مسئلہ ہے۔"

"آپ خان کے رشتے دار ہیں؟" اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا اور ماحول کا تاثر بدلنے کی لاشعوری کوشش کی۔

"آپ خان کی کون ہیں؟" وہاں سے الٹا سوال کر دیا گیا۔

"میں ان کی ملازمہ ہوں۔" وہ بڑے سکون سے اور اعتماد سے گویا ہوئی۔

"اوہ!" مہمان نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔ اور پہلے سے زیادہ بے خوف انداز میں اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔

"بڑے خوش قسمت ہیں یہ خان زادے، میں حسد کی آگ میں جلنے لگا ہوں۔" مطرب کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ اس جملے میں سے محسوس ہو رہا تھا وہ اس کے وجود سے آنے والی آنچ اس کا تن من جھلسا رہی تھی۔

"ویسے ایک بات بتائیں۔ ہم بھی خان زادے ہی ہیں۔ بس قبیلے کا فرق ہے۔ مگر تم خان زادوں میں فرق کرنے بیٹھ جاؤ۔" وہ فوراً آپ سے تم پر آ گیا تھا۔

سرخ ڈھیروں ڈھیر پھولوں کا کرتہ شلوار اور سر پر خوبصورت کڑھائی والا سیاہ آنچل۔ صبح کے دودھیا اجالے میں اس کی رنگت بے موتی کی طرح چمک رہی تھی۔

"ایک بات بتاؤ۔" وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جما کر گویا ہوا۔

وہ خاموشی سے اس کی بات کا انتظار کرنے لگی۔

"تم خان زادوں سے خوش ہو؟" اس کا انداز عجیب سا تھا۔

"جی بہت خوش ہوں۔ سب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔" وہ اپنی ازلی سادگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"کیا مجھے بتاؤ گی کہ کس طرح کا خیال رکھتے ہیں؟" وہ بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"جیسا کسی کا کیا جاتا ہے۔ میں اس لئے بھی اپنے خانوں کی بہت عزت کرتی ہوں کہ سب عورتوں کی عزت کرتے ہیں۔"

اس نے اپنی طرف سے بڑی بات بہت سمجھداری سے کی۔ شاید مہمان کی نظروں سے آن کی آن میں طنز سا جھلک کر گزر گئی تھی۔

"شاید تمہارے خانوں کی نظر کچھ نظر کرم ہے۔" اس نے سرد آہ بھر کر پھر سے لہجہ بدلا۔

(تمہاری اس بات سے تو مجھے بھی پورا اتفاق ہے) وہ صرف سوچتی رہ گئی کہہ نہ سکی۔

"میں اندر جاؤں؟" اس نے ناگواری چھپاتے ہوئے خادمانہ انداز میں اجازت چاہی۔

"اس شرط پر کہ دوبارہ چائے لے کر آؤ گی۔" اس نے پھر دوبارہ جیسے احسان اتارا۔

"میں آپ سے معافی چاہتی ہوں گی۔ خالہ صبح کرتی ہیں۔" اس کی ازلی سادگی عود کر آئی۔

"کون خالہ ...... وہ بڑی بی جو ادھر کام کرتی ہیں؟" اجنبی مہمان نے ناگواری سے پوچھا۔

"جی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہوں ...... کیسی خالہ ہے تمہاری۔" لہجہ قدرے اکھڑا اکھڑا تھا۔

"نہیں ...... مگر ماں جی نے انہیں میرا خیال رکھنے کو کہا ہے۔" وہ اسی سادہ انداز میں گویا ہوئی۔

مہمان کے دل پر چوٹ کر گئے سے لگا کر پڑا ایسا ریمارک اور خاص انداز۔

"ماں جی ...... تیمور کی والدہ؟" مہمان قدرے الجھا۔

"جی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"یعنی خالہ تمہارا خیال رکھتی ہیں۔ ہوں۔ اچھی بات ہے ...... تو اب پھولوں کے گرد خاردار باڑ ضرور ہونا چاہئے۔ ماں جی بہت سمجھدار عورت ہیں۔"

"جی ...... ماشاءاللہ سے انہیں اللہ نے بڑی عقل دی ہے۔" وہ سنجیدگی سے ماں جی کی تعریف میں جت گئی۔

اتنی سادگی۔ کہ مہمان کو پیار آ گیا۔ جانے اپنی کس سوچ پر۔

"ٹھیک ہے ...... تم جاؤ ...... ہم تم سے چائے کیلئے نہیں کہیں گے۔"

اس نے حیرت سے مہمان کی شکل دیکھی۔ بہت عجیب سی محسوس کی جانے والی تبدیلی تھی۔ وہ اجنبی سے گھبرا کر اس کا تعاقب پار کرنے لگی۔

وہ کچن میں تھی کہ خالہ نے کہا اسے تیمور خان بلا رہے ہیں۔

وہ جیسے دوڑتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی۔ پورے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے انہیں دیکھے ہوئے۔

"جی —— جی خان"۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔

"اماں جی تم سے بات کریں گی"۔ تیمور علی خان مڑ کر اس کی سمت دیکھنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں ریسیور تھا۔ "آؤ گی
اماں جی۔ بات کریں"۔

"ہائے اللہ —— اماں جی"۔ وہ فرطِ شوق سے گرتی پڑتی آگے بڑھی۔

"السلام علیکم اماں جی۔ اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں جی۔ جی۔ نہیں آپ فکر نہ کریں۔ صابرہ خالہ بہت اچھی ہیں۔ جی۔
مجھے تو خان کل سے دکھائی نہیں دیے۔ پھر خیال کیا رکھیں۔ انہوں نے کل گھر میں چائے پی کھانا کھایا۔ نہیں۔ جی۔ ہاں
چائے تو پی تھی۔ کوئی مہمان بھی ہے اس گھر میں اس کے ساتھ۔
جی مجھے تو نہیں پتا۔ شاید خان کے دوست ہیں۔
نہیں جی —— بالکل نہیں روئی۔ بس آپ بہت یاد آ رہی ہیں۔ جی خان تو باہر چلے گئے ہیں"۔

"اچھا —— خدا حافظ"۔ اس نے اداس سی کیفیت میں ریسیور رکھ دیا۔

وہ باہر آئی تو کچن کی طرف بڑھنے لگی۔

"مطربہ"۔ اسے پشت سے آواز آئی۔

وہ چونک کر مڑی "جی خان"۔

"زخم کیسے ہیں اب؟" وہ عام سے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"پہلے جیسے درد نہیں ہیں مرہم بہت اچھا ہے"۔ وہ خاکساری کے انداز میں گویا ہوئی۔

"وہ ایک بات ہے"۔ وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

"جی خان —— حکم"۔

"دیکھو —— کوٹھی میں ادھر ادھر نہیں گھومنا۔ بس صابرہ کے ساتھ رہو اور اپنے کام سے کام رکھو"۔

"جی خان"۔

"اوپر بھی نہیں جانا جب تک ہم یہاں ہیں"۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔

اس نے چونک کر تیمور علی خان کا چہرہ دیکھا۔ دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"گئی تو نہیں تھیں اوپر؟" وہ جاتے جاتے پھر پلٹے۔

"وہ گڑبڑا گئی۔ بلکہ پسینے پسینے ہو گئی"۔ وہ —— جی —— جی نہیں —— نہیں تو۔ وہ جی مجھے تو کوئی ضرورت ہی نہیں
اوپر جانے کی"۔ اس کی آواز تھرا گئی۔

تیمور علی خان اپنے کسی خیال میں گم تھے۔ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کی طرف سے بری حالت ہو رہی
تھی۔ اگر کچھ پوچھ لیتے تو ضرور اٹک جاتی۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے"۔ وہ اپنی راہ چل دیے۔

وہ جیسے سانس درست کرتی رہی۔ اور پیشانی آنچل سے پونچھتی رہی۔

ادھر صورت حال کچھ اور تھی۔ ادھر حویلی میں تو کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کام کے وقت تو نوکرانیاں بھی مردانے میں چلی
جاتی ہیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ الجھے الجھے انداز میں چل رہی تھی۔

تیمور علی خان اور ولید کی تیاریوں میں از حد مصروف تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس؟" وہ اسی طرح مصروف رہے۔

"اوہ —— علی آؤ —— نہیں یار ایسا کوئی خاص بزی نہیں۔ یہ سب ویسی ہی تیاریاں ہیں"۔

"ابھی کھانا لگنے میں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی"۔ تیمور علی خان سوٹ کیس بند کر کے مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"چھوڑو یار —— تمہیں کھانے کا بھلا کیا ذوق۔ گھی سبزی زیادہ ڈالی ہوئی ہوتی ہے۔ پیاز کر اوپر سے ایک چٹکی کالی مرچ
چھڑک لیا کرو"۔ علی نے جل کر کہا۔

تیمور علی خان کا قہقہہ بے حد جاندار تھا۔

"سو جی۔ چلو تمہیں تو کھانے کا ذوق ہے ناں۔ وہ میں کو بھی تمہارے لئے بڑے پائے اور تنور والی روٹی کا اہتمام
کیا تھا۔ اب بھی دیکھنا صابرہ نے ٹھیک ٹھاک مشرقی مسالہ جات کا استعمال کیا ہو گا۔ مجھے پورا یقین ہے"۔

"یہ تو ہے یار۔ یہ صابرہ کھانے بہت اچھے بناتی ہے۔ پائے تو کل انتہا کے تھے۔ میں نے بے اختیار پوچھا تھا
کہ اس کی ضرور کوئی اسپیشل ترکیب ہو گی۔ کہنے لگی جیسے پکاتے ہیں ویسے ہی پکایا ہے بس دیسی گھی ڈالا ہوا ہے مرچ زیادہ
ڈالی ہے۔

ویسے یار کھانا بنانا بھی بہت بڑا آرٹ ہے۔ ویسے وہ جو میرے پاس بڑی بی ہے اس کی عمر تو اتنی ہو گئی ہے کہ اس سے
زیادہ محنت کا کام ہوتا نہیں ہے۔ اب اتنے دنوں سے کام کر رہی ہے کہ نکالتے ہوئے اچھا محسوس نہیں ہوتا۔ پھر اس کی اصل
کام تو بچے کی دیکھ بھال کا ہے۔ جو وہی کر رہی ہے"۔

"شادی کرو —— بہت سے پرابلم آٹومیٹک سولو ہو جائیں گے"۔ تیمور علی خان نے اٹھ کر جگ سے پانی انڈیلا اور
پینے لگے۔

"ہاں یار اب تو میں خود بھی سوچ رہا ہوں۔ سول سروسز کے ایگزام کا رزلٹ بھی آنے والا ہے۔ یوں بھی فراغت
ہو گئی ہے"۔

"تو پھر کس بات کی دیر ہے؟" تیمور علی خان نے دریافت کیا۔

"دیر تو خیر کسی بات کی نہیں ہے۔ ایکچوئلی جو میرے ساتھ پرابلم ہے وہ تمہیں پتا ہی ہے۔ گلے سے بچھڑی بھیڑ

ہوں۔ آل ریڈی شادی شدہ ہوں"۔

"ڈونٹ وری... سو واٹ... نو پرابلم"۔ تیمور علی خان بے نیازی سے گویا ہوئے۔

"پھر سے سوچیے ڈیڈ... میری جان... یہ لندن والا سین نہیں ہے۔ یہی اپنے والے بال کی کھال نکالتے ہیں اور شک کا فائدہ تو ذرا نہیں دیتے"۔ علی نے بغل سے تکیہ اٹھا کر دوسری بغل پر دوبارہ رکھ دیا۔

"ایک بچے کا باپ۔ جس سے اس کے خاندان والے کیوں نہیں ملتے۔ اس کا جواب تو کوئی معذرت بھی نہیں دے گا۔ اور اس سیدھے سادے جواب میں شک کی سو شقیں برآمد کر لی جائیں گی۔ ہمارے فرشتوں کو فیلڈ بھی نہیں کی گئی ہوں گی۔

یار مجھے پتا چل جاتا کہ وہ اتنی جلدی چھوڑ جائیں گی تو میں اتنا بڑا رسک ہی نہ لیتا۔ سمجھدار تو کہتے ہیں کہ ان کی شان کو بڑھ لگ گیا ہوں"۔

"ارے نہیں پارٹنر... خوامخواہ وہم نہ کرو، فراخی کرو"۔ تیمور علی خان اتنی باریکیوں سے پریشان سے ہو گئے۔

"ابھی جب تم خیر ہو جھوٹ نہیں بول رہے تو سچائی کی قدر کرنا چاہیے"۔ وہ حیران سے تھے۔

"پتا نہیں کون سی دنیا میں ہو تم... بہرحال لگتا ہے اچھی دنیا میں ہو"۔ علی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "خوش رہو"۔

"اس طرح تو بات نہیں بن رہی۔ پرابلم فیس کرو... سولوشن نکالو پارٹنر"۔ تیمور علی خان نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہاں تو کرو ناں پرابلم سولو"۔ علی نے صوفے پر نیم دراز ہو کر اطمینان سے کہا۔

"تم جو کہو ہم مدد کرنے کو تیار ہیں۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوا"۔

"بس اب تم تمہارے ہی اختیار میں ہے ڈیڈ"۔ علی نے بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔

"واٹ"۔ حیرانی سے تیمور علی خان گلاس رکھنا بھول گئے۔

"ہاں یار... بات تھوڑی سی غیر معقول تو ہے مگر"۔ علی نے کچھ توقف کیا۔

"ہوں ہوں... کہو"۔ تیمور علی خان اچھل کے قریب آ گئے۔

"یار... قسمت نے اسے ملازمہ بنا دیا ہے۔ مگر کسی طرح ملازمہ نہیں لگتی"۔ علی نے بات کرتے کرتے نظریں جھکا لیں۔

"کون؟" تیمور حقیقت میں نہیں سمجھے۔

"نام تو مجھے پتا نہیں۔ البتہ جلاوطن لگتی ہے"۔

"یار... کیوں الجھا رہے ہو"۔ تیمور زچ ہو گئے۔

"واقعی... مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ اس کا نام تو تم بتاؤ گے۔ بہت چھوٹی عمر ہے۔ گہرائی بھی بہت ہے۔ بات کو سمجھتی ہے۔ کچھ نہیں"۔

تیمور علی خان چونک پڑے۔ اور ششدر سے علی کی شکل دیکھنے لگے۔

"مطربہ"۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہائی گڈنیس... واٹ اے فیلنس... سو پریٹی نیم"۔ علی تو اچھل کر بیٹھ گیا۔

"کیا واقعی یہ اس کا نام ہے۔ بہت ہی پیارا نام تھا جس نے بھی یہ نام رکھا ہے"۔ علی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"تھا نہیں... ہے... تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ نام"۔ وہ جیسے گہرے کنویں سے بول رہے تھے۔

"تو کیا خیال ہے۔ کوئی قباحت تو نہیں ہے اس میں؟" علی کی آنکھوں میں تجسس کی لہر جاگ گئی تھی۔

"نہیں... کوئی قباحت نہیں ہے۔ ہم سب تو خود اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کی شادی کل کی ہوتی آج ہو جائے۔ پرابلم سولو ہو جائے گی۔ یہ تو بڑی سیریس بات ہوتی ہے۔ تمہارا اعتراض ذرا سمجھ نہیں آیا ہے۔ کیا واقعی تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" تیمور علی خان نے الجھی ہوئی نظروں سے علی کو دیکھا۔

"ابھی کر لو یار"۔ علی کا جواب بڑا بے ساختہ تھا۔

"بہت ہی سنجیدہ مسئلہ ہے... دراصل ادھر بھی کچھ پرابلم ہے۔ پہلے حقیقت جان لو۔ پھر غور کر کے فیصلہ کرو"۔

"مجھے غور نہیں کرنا اس شادی کے لیے۔ یار کام ہے۔ لگتے ہیں اگلے روز"۔ علی نے جھلا کر کہا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب تو یہی تو کرنا ہی کے طور پر ہمارے لیے اس سے زیادہ کچھ بھی قبول نہیں کرتے۔ اور ہم بھی چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس کی شادی ہو جائے مگر۔ تم پہلے تمام حقائق جان لو"۔

"تمہیں اتنا اصرار ہے تو جلد سے جلد بتا دو اور نوٹ کر لو مجھے کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کچھ ادا سے جنہیں لے کر کے مجھے منزل تک جانا ہے"۔ علی کے انداز میں بڑی بے صبری تھی۔

تیمور علی خان نے جانچتی نظروں سے علی کی طرف دیکھا۔ "ابھی تم پرانی... کہاں دیکھا تم نے اسے؟"

"چھوڑو یہ قصہ... حقائق بتاؤ"۔ علی نے کوفت بھرے انداز میں کہا۔

"اس کا بیک گراؤنڈ "ریڈ لائٹ ایریا" سے ملتا ہے۔ مگر وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اس ماحول میں رہی نہ گروان اپ (پرورش) ہوئی۔ اس کی نانی نے چھوٹے سے گاؤں میں اسے پالا۔ نکاح ہوا تھا اس کے پیرنٹس کا۔ ہماری بہت پرانی ملازمہ کے تعلقات ہیں اس کی نانی وغیرہ سے۔ اس کی نانی نے ہماری حویلی میں کام کیلئے بھیج دیا۔ کیونکہ وہ اسے اس ماحول میں بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ اس کی اپنی ماں ریڈ لائٹ ایریا کی کسی ماڑی میں اب بھی رہتی ہے۔ وہ اسے لینے ہماری حویلی آئی تھی مگر یہ اس کے ساتھ گئی نہیں۔ مگر بعد میں وہ اسے اغوا کر کے لے گئی۔ شی از اے وری گڈ گرل۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی اور حویلی واپس آ گئی۔ اس کی ماں کی وجہ سے ہی اسے کراچی شفٹ کرنا پڑا۔ اب گھر میں سب ہی یہ چاہتے ہیں کہ اس کی جلد سے جلد شادی ہو جائے۔ اسی صورت اس کا پیچھا اپنی ماں سے ہمیشہ کیلئے چھوٹ سکتا ہے"۔

"چلو پھر آج ہی کر لیتے ہیں شادی"۔ علی نے گہری سوچ سے چونک کر بڑی ہی بشاشت سے کہا۔

"واقعی؟" تیمور علی خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یس... آف کورس... شی از... ابسولیوٹلی پرفیکٹ (وہ معصوم ہے یہی کافی ہے)"۔

"مگر فی الحال تو وہ انجرڈ (زخمی) ہے۔ تمہیں پرابلم ہو گی"۔ تیمور علی خان شرارت سے مسکرائے۔

علی نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔ "میں"۔

"شادی کے بعد بہت ہارٹ کیا تھا ان لوگوں نے"۔ تیمور علی خان نے بتایا۔

"واقعی میں۔ لوگوں نے"۔ علی نے الجھ کر پوچھا۔

"ہر دو اینڈ ہر پیرنٹس"۔ تیمور علی خان نے وضاحت کی۔

"یار۔۔۔ مگر بے چاری کی مرہم پٹی بھی ہو رہی ہے نا"۔

"ایک دن میں اس قدر ہمدردی"۔ تیمور علی خان قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"یار! تمہاری رضامندی کے بعد اب تو جائز ہے"۔ علی کامیابی کے نشے سے سرشار تھا۔

"ٹھیک ہے پارٹنر! صبح ہم بابا صاحب سے بات کریں گے اور کوشش کریں گے ہماری لندن واپسی سے پہلے پہلے یہ کام ہو جائے"۔ تیمور علی خان نے مزید تقویت بہم پہنچائی۔

"یار تیمور! ایک بات ہے جو ابھی ذہن میں آئی ہے۔ تم کہو اور کچھ لیکن میں لائن پر جا رہا ہوں اب کوئی مسئلہ یا پوائنٹ مجھے اٹیک نہیں کر سکتا"۔

"ہوں"۔ تیمور علی خان بھی سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اس کے پیرنٹس نے نکاح کیا تھا۔ تو اس کا باپ"۔

"وہ سندھ کی کوئی بڑی آسامی ہوتا ہے۔ وہ بڑی بیٹی رونس کو ڈس اون کر چکا ہے۔ ڈونٹ وری۔ یہ سب معلومات ہمیں بابا صاحب سے ملی ہیں اور انہیں اماں جی سے"۔ تیمور علی خان نے درمیان سے ہی بات اچک لی۔ "مطلب یہ کہ تم ہیں ہے"۔ انہوں نے شرارتاً کہا۔

"اتنی مجبوری بھی اچھی نہیں ہوتی الفاظ ہی تو ہیں۔ ماسٹر ہیں کہو"۔ علی کی خوشی اس کے ایک ایک انداز سے چھلک رہی تھی۔

"اگر سندھ کی طرف سے چلو تو پھر ماسٹر ہی کہنا زیادہ سوٹ ایبل ہے"۔ دونوں کے مشترکہ قہقہے سے کمرہ گونج اٹھا۔

"یار! ہم تو یونہی چھوٹے موٹے سرکاری افسر ہیں تب تم ہمیں رنگین مزاجی کا الزام دیتے ہو۔ اصل کام تو تم لندن والے لارڈز دکھاتے ہو"۔

"ہمیں نکال دو پارٹنر۔ یقین کرو ہم خاصے ٹھیک ٹھاک ہیں"۔ تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لگائیں گے عنقریب ہم لندن کا بھی ایک چکر۔ دیکھیں گے تمہارے رنگ ڈھنگ"۔ علی نے اپنے اگلے پروگرام سے باخبر کیا۔

"فکر ہی کوئی نہیں"۔ تیمور علی خان نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ خوبصورت سی کرسی پر علی کے عین سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"خان"۔ دروازے پر دستک ہوئی اور صابرہ کی آواز آئی۔

"ہوں"۔

"کیا ٹائم لگ گیا ہے۔ اور وہی مہمان اپنے کمرے میں گھسے ہیں"۔ صابرہ نے مزید کہا۔

"ہم ایک وقت میں دو جگہ کیسے ہو سکتے ہیں کیونکہ ہم تو یہاں ہیں"۔ علی کے ایک ایک انداز میں تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور تیمور علی خان کو اس پر قطعاً کوئی حیرت نہیں تھی۔

وہ صفائی کیلئے ہاتھ میں استری لئے لاؤنج میں آئی تھی۔ تیمور علی خان فون پر مصروف تھے۔ خالی بیٹھے بیٹھے وہ اکتا گئی۔ صابرہ نے تو اسے بہت منع کیا تھا اور آرام کی تاکید کی تھی۔

"ایک منٹ پلیز"۔ تیمور علی خان نے فون کرتے کرتے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا۔

"وہ۔۔۔ کیا کام ہے؟ ابھی ہم فون کر رہے ہیں۔ بعد میں ادھر آؤ"۔

اس نے ایک افسردہ سی کیفیت میں گلدان واپس کارنر ٹیبل پر رکھ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

"جی بابا صاحب! اچھا۔ فون پر بھی آپ کو وہی لگی یا کسی اور بات ہوئی تھی؟

اچھا۔۔۔ اچھا۔ ہماری قانونی حیثیت کمزور سہی۔ لیکن ہم اسے ایسے نہیں دیں گے اتنی بات۔

یہ چال۔ اچھا۔ عارف اچھا لڑکا ہے۔ لیکن ابھی کلیئر نہیں ہے کہ کیا کرے گا۔ ہمارا خیال ہے ابھی اس کی عمر خاصی کم ہے۔ جی جی وہ تو ٹھیک ہے۔ وہ ملازم ہے۔ تسلیم۔ لیکن اب وہ اپنے سارے بیک گراؤنڈ سے باخبر ہے۔ اس کی جان بچانے کیلئے شادی کا ڈرامہ کھیلنا بہت بے اصولی کی بات ہوگی ہمارا خیال ہے۔ تمام حالات سے باخبر ہونے کے بعد اس کی ذہنی حالت (طرز فکر) بہت منتشر ہوگئی ہوگی۔ اور وہ اتنی آسانی سے کمپرومائز والی لائف نہیں گزارے گی۔ ہمارے پاس آلٹرنیٹ ہے ناں تب ہی تو آپ سے اتنی بات کی ہے۔ ہم تو خود ابھی آپ کو رنگ کرنے والے تھے۔

"جی جی۔ بتا رہے ہیں۔ وہ علی ہے ناں۔ جی جی۔ مہدی۔ اس کو بہت پسند آگئی ہے۔ رات ہی اس سے بات ہوئی ہے۔ جی نہیں نہیں۔ وہ گھر بسانا چاہتا ہے۔ ہم نے اس سے تفصیلی بات کی ہے۔

جی اسے سب بتا دیا ہے۔ اسے اونڈ کیا۔ اب یہ تو وہ خود بہتر سمجھتا ہوگا۔ ہم نے تو اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ کیا بات کریں گی اماں جی۔ ہمارا اور علی کا خاندان حسب نسب سب واضح ہے۔ آپ اتنی گہرائیوں میں مت جائیں۔ دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ اگر نسب کی اہمیت ہر شے کو سموئے ہوئے ہے۔ ڈونٹ۔ وہ بڑی خاندانی نسبت ہو چکی ہے۔ یہ تو اس کے اپنے سوچنے کی بات تھی۔ ہمیں کیا؟

نہیں نہیں۔۔۔ بابا صاحب وہ سیریس ہے۔ اگر وہ رخصت پر بھی آگئی ہے تو اسے منظور ہے۔ ڈونٹ وری۔

نہیں۔ ابھی اسے نہیں معلوم۔

جی جی۔۔۔ بہت بہتر ہوگا۔ وہ اس لئے کہ ہماری واپسی میں بھی چند دن رہ گئے ہیں۔ ٹھیک ہے جب فیصلہ تقریباً ہو چکا ہے تو ضرور اماں جی کو بھی ساتھ لے آئیں۔ ظاہر ہے وہ انہیں خاص لگتی ہے۔ وہ بھی ضرور آ جائیں گی۔

اس کی اب فکر نہ کریں اس سے ہم خود بات کرلیں گے۔ یوں لگے کہ کوئی مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

اوکے"۔

انہوں نے بہت ریلیکس انداز میں ریسیور رکھ دیا اور لاؤنج سے باہر آ گئے۔

"صابرہ"۔

"جی خان!" صابرہ فوراً کہیں سے نمودار ہو گئی۔

"دیکھو اسے تکلیف ہے۔ اس سے کام مت کراؤ۔ اسے ریسٹ دو اور کھانے پینے کیلئے اچھی چیزیں دو جن سے انرجی گین ہوتی ہے۔ ہمارا مطلب ہے۔ طاقت آتی ہے۔ اسے جلد سے جلد فریش ہونا چاہیے۔ کچھ بہت اچھی چیزیں تیار کرنا۔ تاکہ مہمان خوش ہوں"۔

"اتنا خیال کر رہے تھے تیمور خاں اس کا۔ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے چکا چوند کر دینے والی روشنی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

انگ انگ میں سرمستی سی اترنے لگی۔

"اماں جی اور بابا صاحب۔ ممکن ہے رات کو آ جائیں ورنہ صبح کو ضرور آ جائیں گے۔ ان کا کمرہ ٹھیک کر لینا ہو گا۔ ہم باہر کام سے جا رہے ہیں۔ علی واپس آئے تو اسے کہنا لنچ پر ملاقات ہو گی"۔

وہ جیب میں چابیاں ٹٹولتے آگے بڑھ گئے۔

"ہائے اللہ..... اماں جی آ رہی ہیں"۔ مسرت جیسے خوشی سے ناچ اٹھی۔

"جو بات سب سے پہلے بتانا چاہیے تھی وہ بعد میں بتائی۔ تیمور خاں بھی بس۔ اماں جی کو انڈے آلو والی بھاجی بہت پسند ہے۔ میں خود بناؤں گی۔ اماں جی کیلئے۔ انہیں کھچوری اور پودینے کی چٹنی بھی بہت پسند ہے۔ یہ بھی بنائیں گے۔ ٹھیک ہے ناں خالہ"۔ وہ سر سے پاؤں تک خوشی سے چہک رہی تھی۔

"ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔ ہماری مالکن تو بہت ہی سادہ ہے۔ کتنا لمبا دسترخوان ہے حویلی کا۔ اور اماں جی کے کھانے میں بھی سادگی۔ میں تجھے غور سے دیکھ رہی تھی ابھی۔ کتنی محبت کرنے لگی ہے تو اماں جی سے"۔

صابرہ نے اس کی شکل خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"لو..... وہ ہیں ہی اتنی اچھی۔ سنبھال لیتی ہیں۔ سنوار بخشتی ہیں۔ غلطی ہو جائے تو انجان بن جاتی ہیں۔ اکیلے میں سمجھاتی ہیں۔ اگر اماں جی مجھے کہیں کہ ساری رات میری ٹانگیں دباؤ تو میں ساری رات دباؤں"۔ وہ سادگی سے کہتی کچن میں گھس گئی۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اماں جی بہت اچھی ہیں۔ مگر تو بھی بڑی اصیل ہے۔ محبتوں کی قدر پہچانتی ہے۔ اللہ تیرے نصیب اچھے کرے۔

سیب کاٹ کر دوں۔ کھائے گی۔ تیمور خاں کہہ کر گئے ہیں تجھے اچھی چیزیں کھلاؤں"۔ صابرہ نے فریج کھولتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں کون سے خزانے میں بھیجیں گے مجھے خان۔ فالتو کی طاقت کا کیا کروں گی میں؟" وہ شرارت سے

ہونٹ دبا کر مسکرائی۔

صابرہ ہنس کر رہ گئی۔

"بے وقوف! ابھی طاقت بھی فالتو ہوتی ہے"۔

"اتنی بھلی کی تو ہوں۔ اماں جی کہتی ہیں کہ بجلی سے چلتی ہوں۔ تھکتی نہیں ہوں"۔

"نہ بیٹی اس طرح حد بھر کر نہیں بولتے۔ اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ اپنی بھی نظر لگ جاتی ہے بندے کو"۔ صابرہ نے ہول کر کہا۔

"سب ہانی کی کھلائی پلائی کا کمال ہے۔ اچار مربے کھانے نہیں دیتی تھی کہ کھٹائی زیادہ کھانے سے روگ لگ جاتے ہیں۔ عورت جلدی ادھ جاتی ہے۔ بیسن روٹی پر مکھن کا ڈلا صبح صبح کھلاتی تھی اور چھنے کے جیڑ جاتی تھی کہ سارا کھانا پڑے گا۔ چائے بھی نہیں پینے دیتی تھی کہ خون جلاتی ہے۔ میں چپ کر کے سردار ماموں کے ہاں پی آتی تھی"۔

"خالہ"۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

صابرہ جو بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی ایک دم چونکی۔ "ہوں؟"

"خالہ میں اپنی ہانی کو کب دیکھوں گی؟" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "میں نے خالہ سے آنے سے کہا بھی تھا کسی کو بھیج بلوا لو۔ اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی"۔

"پھر کیا بولی سردار نے؟" صابرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔ یہی کہ ہانی کہتی ہیں پورا گاؤں ہمارا رشتہ دار ہے مر کر ہی یہاں سے نکلوں گی"۔ وہ ہانی کو یاد کر کے یکدم اداس نظر آنے لگی تھی۔

وہ سونے کیلئے لیٹ گئی تھی جب ہی صابرہ آ گئی۔

"بیٹی..... خان بلا رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ہیں"۔

"غصے میں ہیں؟" وہ اٹھ بیٹھی۔

"نہیں۔ غصے میں تو نہیں لگ رہے"۔ صابرہ مسکراتے ہوئے بولی۔

وہ دوپٹہ سر پر جما کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔

ڈرتے ڈرتے اس نے قدم اندر رکھے تھے۔

"آؤ بھئی..... دودی؟" تیمور علی خان دروازے کے مقابل صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"جی!" اس نے دھک دھک کرتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے جواب دیا۔

"دل لگ گیا ہے یہاں؟" وہ عام سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

اس نے نظریں اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔

"اماں جی اور خالہ بہت یاد آ رہی ہیں"۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"آج رات بالکل صبح وہ یہاں آجائیں گی۔ تمہاری لائف سیٹ ہو جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اچھا ... یہ بتاؤ ... تم اوپر گئی تھیں؟" وہ اصل موضوع پر آگئے۔

مطربہ کا دل زور سے دھڑکا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"آپ نے تو منع کر دیا ہے۔" وہ بمشکل گویا ہوئی۔

"خانابا ہمارے منع کرنے سے پہلے تم اوپر کا چکر لگا آئی تھیں۔" وہ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

مطربہ کی پیشانی پر موتی چمکنے لگے۔ (خان کو کیسے پتا؟)

وہ خاموش رہی۔ کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"جواب دو ہمیں۔"

"جج ... جی۔ وہ خالہ کو ڈھونڈنے گئی تھی۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کوئی ملا تم سے؟" وہ سینے پر بازو لپیٹے اطمینان سے پوچھ رہے تھے۔

"نن نہیں تو۔" ڈر سے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

"جھوٹ بول رہی ہو تم۔" وہ ناراض ہوئے۔

"خان اللہ کی قسم مجھے تو پتا نہیں تھا۔ خالہ نے منع کر دیا تھا۔ ورنہ میں چائے لے آتی۔" وہ رو پڑی۔

"چائے۔ نان سنس یہ چائے کہاں سے آگئی؟" وہ الجھے۔

"چائے ہی کی تو بات ہوئی تھی۔ مہمان نے کہا تھا کہ چائے خود لے کر آؤ۔ مگر خالہ کہنے لگیں۔ خان لوگ تو [illegible] تو ہر کسی کے سامنے مت جایا کر۔ اسی لیے میں نہیں گئی تھی۔ خالہ چائے خود لے کر چلی گئی تھیں اور انہوں نے اسی بات پر آپ سے میری شکایت لگائی ہوگی۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ہم سے کسی نے شکایت نہیں کی۔" تیمور علی خان نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"جی۔" وہ ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگی۔

(یہ کیا کر دیا اس نے خود ہی ساری بات کھول دی)

"تم نے اندازہ لگایا کہ کیسا ہے وہ شخص؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

وہ خاموش کھڑی آنکھیں صاف کرتی رہی۔

"کچھ پوچھ رہے ہیں ہم تم سے۔" وہ پھر گویا ہوئے۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ "وہ آپ کے مہمان ہیں آپ برا مانیں گے۔" وہ بہت ہچکچاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نہیں ہم بالکل برا نہیں مانیں گے۔" انہوں نے اطمینان دلایا۔

"وہ ... پتا نہیں کیسی باتیں کرتے ہیں دل کو اچھی نہیں لگتیں۔ کل صبح باغ میں۔" وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئی۔

"ہوں تو باغ میں بھی ملاقات ہوئی ہے۔" تیمور کا لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ بری طرح سہم گئی۔

"وہ تو آگئے تھے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"مطربہ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم نے تمہیں یہ بتانے کیلئے بلایا ہے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے اس مہمان کے ساتھ۔ یہ تمہاری گڈ لک ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص تم سے شادی کا خواہشمند ہے۔ ہم تمہیں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ تم تعلیم یافتہ نہیں ہو۔ تمہیں ایڈجسٹمنٹ کیلئے بہت محنت کرنا ہوگی۔ امکان ہے کہ جلدی وہ حسن و اعلیٰ عہدہ حاصل کرے گا اور تمہیں جلدی بور کرنے لگے گی۔ شادی ایک ڈیل اور اپوائنٹمنٹ ہوتا مطلب بڑی ذمہ داری ہے۔ اس وقت وہ صرف تمہارے حسن سے امپریس ہے اور اس شادی کی بنیاد ہی تمہاری صورت شکل ہے لیکن جب لائف پر بیلنس ہو جاتی ہے تب لوگ کہتے ہیں کہ گلی تو صورتحال بدل جاتی ہے۔ حسن صورت بیک گراؤنڈ میں چلا جاتا ہے۔ جب ضرورتیں اور حقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے تو مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اب تک جب ایک اچھا ساتھی تمہیں مل رہا ہے تو اسے کسی موڑ پر پچھتاوے کا احساس نہ ہونے دینا۔ مقصود شادی تمہارے اپنے حق میں ہر طرح سے بہتر ہوگی۔ تمہیں اس جیسی فیملی بیک گراؤنڈ سے ہیبٹ کیلئے جلد ڈھل جانا ہوگا۔ تم پڑھنا لکھنا شروع کر دینا۔ آس پاس رہنے والی سمجھدار خواتین سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرنا تاکہ تمہارے ساتھی کو زندگی میں کبھی بھی اپنے فیصلے پر ندامت محسوس نہ ہو۔

وہاں گاؤں میں بھی ایک پرپوزل ہے تمہارے لئے۔ شاید تم نے اس لڑکے کو دیکھا بھی ہو عارف نام ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ جو قسمت کے ہاتھوں ظلم ہوا ہے جس کے ذمہ دار تمہارے والدین ہیں اس میں مزید اضافہ نہ ہو۔ اور تمہیں ایک اچھی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہے تو ہمیں زیادتی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ آخر کار تم ایک بڑے آدمی کی اولاد ہو۔"

وہ کلام کئے جا رہے تھے اور مطربہ ششدر آنکھیں پھاڑے ساکت و صامت ان کی سمت دیکھ رہی تھی۔

ڈرائنگ روم کے حریری پردوں میں آگ لگ گئی تھی۔ کمرے میں تندور کی سی تپش تھی۔

اسے تیمور کی صورت یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی سفاک دیو ہم قاتل کسی کو مار کر مردہ جسم کے ٹکڑے کر رہا ہو۔

"خان!" اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔

"ہوں ... بولو۔"

"خان امی اتنی عزت دار تھیں تو حویلی کی نوکر کیوں ٹھہریں، کسی تخت پر کیوں نہ بٹھا دیا حویلی والوں نے مجھے۔" پتہ نہیں کہاں سے اتنی جرات آگئی تھی اس میں ایک لمحے کو تو تیمور علی خان بھی چکرا کر رہ گئے۔

"حویلی میں تم خود اپنی خوشی سے آئی تھی تمہیں کوئی دھوکہ دے کر نہیں لایا۔ تمہارے باپ سے ہمارے باپ کی دوستی نہیں تھی کہ لحاظ مروت میں تم سے کوئی اور رشتہ قائم کر لیا جاتا۔ حویلی میں جو نوکری کی غرض سے داخل ہوتا ہے وہ نوکر ہی کہلانے کا مستحق ہے۔" وہ قدرے تلخی سے بولے۔

"پھر مجھے نوکری رہنے دیجئے' میں اسی میں خوش ہوں"۔ اس کے سینے سے ایک ہوک سی اٹھی۔

(مجھے صاف ستھرا ابھی کہتے ہو خان بڑے آدمی کی بیٹی ہونے کا اعتبار بھی کرتے ہو پھر بھی بھرے ہوئے ہو۔ تمہیں دیکھ کر جو بات کی وجہ مجھ میں آ گئی وہ بتا دی۔ جو مان کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑتی ہے شاہ روتی ہے میں۔ اتنا اللہ کو دھیان میں رکھتی تو اللہ والی ہو جاتی۔ چاروں کو پانی دم کر کے دیتی تو انہیں شفا ہو جاتی۔ کون سے سمندر سے چٹان سے بنے ہو۔ کبھی کچھ احساس نہیں ہوا؟)

"ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تمہیں فیصلہ سنائیں اور آگے کی اونچ نیچ سمجھا سکیں۔ تم ہمیں کوئی لڑکی نہیں لگی۔ تمہیں پتا ہے تمہاری ماں وہاں حویلی میں بابا صاحب کو فون پر دھمکی دے رہی ہے۔ تمہاری وجہ سے کچھ لوگوں کی لائف ڈسٹرب ہو رہی ہے۔

تمہارے احمق پن کی انتہا تو یہ ہے کہ تمہیں اپنی خوش قسمتی کا اندازہ نہیں ہے"۔

"خان! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے کنیز ہی رہنے دیں۔ اختیار اور عزت والی زندگی کی کمی ایک بات کی کمی عمر بھر ستائے گی"۔

تیمور علی خان کو وہ یکلخت ہی بہت بردبار اور بڑی محسوس ہوئی۔

"ایک ٹھیک ٹھاک بندے سے تمہاری شادی ہو جانا ہر طرح سے تمہارے حق میں ہے۔ تم ہمیشہ کیلئے اس عورت سے چھٹکارا پا لو گی"۔

"خان!"

"شٹ اپ طوبیٰ! تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری شادی ہو جائے یا پھر یہ کہ تم اپنی ماں کے ساتھ واپس چلی جاؤ۔ ہم انگلینڈ جا رہے ہیں۔ بصیر بھائی زیادہ تر سرائے میں ہوتے ہیں۔ یاور بھائی ادھر ادھر ہوتے رہتے ہیں۔ ہم بابا صاحب کیلئے مفت کا درد سر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے۔ بڑے بھائی ہیں تو وہ یوں بھی بہت سیدھے سادے ہیں۔ صبح اماں جی آ جائیں گی۔ دونوں میں سے جو تجویز بھی پسند آئے۔ اماں جی کو بتا دینا"۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خان۔ کوئی تیسرا راستہ؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"بہت۔ بلکہ سب سے آسان ہے۔ مگر ہمارا ضمیر ہمیں اجازت نہیں دیتا۔ ورنہ یہ آسان راستہ ہم تمہیں ضرور بتاتے۔ فی الحال۔ رات پڑی ہے۔ دونوں راستوں پر خوب غور کرو۔ حویلی میں کبھی اتنا ٹینشن نہیں ہوا۔ تمہاری وجہ سے سب ڈسٹرب ہوئے ہیں۔ نوکر بننے پر اصرار تو کرتی ہو مگر نوکر بننا نہیں آیا تمہیں۔ اس میں ہماری غلطی ہے۔ اماں جی کی غلطی ہے"۔

وہ اس کے واضح انکار پر سخت برہم نظر آ رہے تھے۔

"ہم نے اپنی زندگی میں اتنا احمق کوئی نہیں دیکھا"۔ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئے۔

وہ بے دم انداز میں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"مجھے پتا ہے خان کہ میں غلط ہوں۔ مگر"۔

دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ رو پڑی تھی۔

ساری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی تھی۔

کہیں جا کے فجر کے بعد آنکھ لگی تھی۔

اسے کسی نے نہیں اٹھایا تھا وہ خود ہی جاگ گئی تھی۔ اتنا سونے کے باوجود سر بھاری سا محسوس ہو رہا تھا۔

جو ویرانی اور وحشت تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کل رات تک وہ ایک حسین خواب کے طلسم میں تھی۔

کوئی حسرت جاگ رہی تھی حصار باندھ کر یہ حالی میں کچھ بھول ہوئی۔ حصار ٹوٹ گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔

ایک اذیت ناک احساس زیاں تمام وحشت کا حاصل رہا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں آئی تو بے ساختہ خوشی اس کے خون میں دوڑنے بھاگنے لگی۔

برآمدے میں اماں جی آ گئی تھیں اور نازنین بیگم سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور اماں جی کے سامنے سر جھکا دیا۔

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"طبیعت اچھی نہیں ہے شاید تیری۔ بہت دیر سوئی۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ تو جاگ کر کھڑی ہو گی"۔

"جی اماں جی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔ اس نے جھک کر ان کے پاؤں تھام لئے۔ اور فرش پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہو گیا؟" نازنین نے پوچھا۔

"ذہن میں بہت الجھن ہو رہی ہو گی۔ کیوں؟" اماں جی نے ہمدردی اور دکھ سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی اماں جی۔ اتنی الجھن تو زندگی میں کبھی نہیں ہوئی"۔ وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

"پاگل نہ ہو۔ جب چوٹ تازی تھی تو روتی نہیں تھی۔ اب اتنا رو رہی ہے؟" اماں جی نے سر پہ ہاتھ پھیر کر پیار سے کہا۔

"آ وے گی گی ظالم کو تیری"۔ خالہ سوراں نے بھی کچن سے اس کی پشت پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"چل چپ ہو جا۔ مت پلا کر خود کو۔ اللہ نے تیرے بھاگ جگا دیئے۔ سب کچھ بھول جائے گی۔ کیا گھبرو جوان ہے۔ کیا پتر انگریزی بولتا ہے۔ پولیس والا ہے۔ خوب وحشت ہوگی تیری۔ پولیس والی کہا کریں گے لوگ تجھے"۔ تزئین نے اسے چھیڑا۔ وہ خاموشی سے آنکھیں پونچھتی رہی۔

"یہ تو جی آپ لوگوں کا بڑا پن ہے اور اس کے بھلے نصیب ہیں"۔ خالہ سوراں تو جذبہ تشکر سے چور ہو رہی تھیں۔

"اماں جی کیا شادی کرنا بڑا ضروری ہوتا ہے؟" اس نے ناک پونچھتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

تزئین کو گدگدی ہوئی۔ مگر اماں جی کے لحاظ میں کچھ بولی نہیں تھی۔

"شادی تو عورت کی طاقت ہوتی ہے۔ نصیب کھلنا کہتے ہیں۔ عورت پوری ہوتی ہے۔ گود میں بچے کھیلتے ہیں۔ اولاد سب سے بڑی خوشی کی پہچان ہوتی ہے۔ اس کا مرد اس کا سنگھار بھی ہوتا ہے اور ڈھال بھی۔ اس لیے ضروری ہوتی ہے شادی"۔ اماں جی نے ہلکے سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"شادی تو ہونے دے پھر پوچھیں گے تجھ سے"۔ نازنین کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"اللہ اسے عقل دے"۔ خالہ سوراں بھی مسکرائیں۔

"اماں جی ابٹن ملنے کے تو قابل نہیں ہے یہ۔ ایسے ہی دلہن بنے گی یہ؟" تزئین نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے اسے تو اللہ نے سجا کر بھیجا ہے"۔ اماں جی نے محبت سے کہا۔

"ان کو بھی کھلوا دیں کڑھی ہے"۔ نازنین نے تزئین کو آنکھ ماری۔ دونوں بے ساختہ ہنس پڑیں۔

اماں جی تو ان کی شرارت نہیں سمجھیں۔ البتہ خالہ مسکرا کر یہ کہتے ہوئے واپس پلٹ گئیں۔

"حد ہو گئی چھوٹی دلہن"۔

شام کو ہی نکاح ہو گیا تھا۔

علی کے حیدرآباد روانہ ہونے میں دو دن تھے۔ دو دن تک اسے "سہاگ کوٹھی" میں رہنا تھا۔ سنہری تمازت اور سرخ دوپٹے میں وہ ہوش اڑائے دے رہی تھی۔ میک اپ کے نام پر صرف سرخ لپ اسٹک اور کاجل کا استعمال ہوا تھا۔

نکاح میں علی اور تیمور علی خان کے چار پانچ دوست، حمیم الدین اور بابا صاحب شریک ہوئے تھے۔

اس کا چہرہ قطعی بے اثر تھا۔ گویا سکتے کی کیفیت تھی۔ وہ کسی شور وغم میں مبتلا محسوس ہو رہی تھی۔

تزئین اور نازنین اسے رات اس بیڈ روم پہنچا گئی تھیں۔ وہ دل میں سخت الجھی جانے کیا سوچتی رہی۔ پھر ایک دم بستر سے نیچے اتر آئی۔ عجیب وحشت و گھبراہٹ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر باہر لان میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

نظر کے سامنے جھاگ اڑاتا سمندر تھا۔ اور ایک تلاطم جو برپا تھا اس کے اندر شور مچا رہا تھا۔

وہ ایک جہازی لائٹیں ننھے ننھے قمقموں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر سامنے گھورنے لگی۔ معاً اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جی کرتا تھا کہ بھاگ جائے۔ اس نے رخ موڑ کر پیچھے دیکھا۔

"وہ بھی۔ کیا نام ہے تمہارا۔ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" تیمور علی خان کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"کوئی ایک دفعہ میں نام دل پر لکھ دیتا۔ اور انہیں یاد نہیں رہتا"۔

دھڑکتی ایک تیز لہر اس کا وجود کیا گئی۔ اس میں ان کی طرف دیکھنے کا یارا نہ تھا۔

"کیا پوچھ رہے ہیں ہم؟" وہ بولے۔

"ٹھنڈی ہوا میں کھڑی ہوں خان۔ آگ لگی ہوئی ہے میرے اندر"۔ اس نے بے تاثر سرد لہجے میں زاویہ بدلے بغیر جواب دیا۔

"وہ بھی بات یہ ہے کہ اس طرح نہیں کھڑے ہوتے"۔

وہ قدرے الجھ کر گویا ہوئے جیسے اپنی بات کہنے میں انہیں بہت دقت ہو رہی ہو۔

"کس طرح خان؟" اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

"بھئی وہ تمہاری شادی ہوئی ہے"۔ وہ اپنی بات کہہ نہیں پا رہے تھے۔

"شادی کے بعد کیا ٹھنڈی ہوا میں کھڑے نہیں ہوتے؟" اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

تیمور علی خان کی طبع کے برعکس تھا یہ سب۔ مگر انہوں نے بہت ضبط کیا۔

"ہم کہہ رہے ہیں نا، کمرے میں جاؤ"۔ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"آپ مجھے مجبور نہ کریں خان ورنہ میں نیچے چھلانگ لگا دوں گی"۔ اس کے اندر سے جیسے آتش فشاں ابل پڑا۔

"نان سنس۔ نہایت احمق اور احسان فراموش قسم کی لڑکی ہو۔ شاید ہم غلط جگہ پر بھلائی کر بیٹھے ہیں"۔

"جو زیادتی آپ نے میرے ساتھ کی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول پاؤں گی"۔

وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور غرارے میں الجھتی کمرے میں چلی گئی۔

تیمور علی خان اپنی جگہ دم بخود سے کھڑے رہ گئے۔ ایک بھاری پتھر وہ ان کے اعصاب پہ مار گئی تھی۔ ابھی بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ سب کہہ گئی ہے۔

وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہے پھر آگے بڑھ گئے۔

علی پھولوں کا ہار ہاتھوں میں تھامے گم صم اسے تکے جا رہا تھا۔

"خوش قسمتی کا یقین نہ آئے تو کیا کرنا چاہیے محترمہ؟" وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آیا۔

جواب میں سکوت طاری رہا۔

"یہ تو کچھ منتر ہوا ہے۔ سنا ہے' لوگ تو عشق کی راہ میں بڑے کشٹ کرتے ہیں پھر بھی گوہر مقصود ہاتھ نہیں لگتا۔ کیا واقعی آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں یا مرنے کے بعد سیدھا سیدھا جنت میں پہنچ گیا ہوں؟" وہاں ایک شوخی کا عالم طاری تھا۔

"مطہر یہ ابھی چھو کر دیکھتا ہوں۔ شاید پھر یقین آجائے" وہ آہستگی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے چھونے کی" وہ بیچ ہی چیخ گئی۔

"واہ... کیا بولی ہیں۔ ویسے پتا ہے کہ آپ زخمی ہیں۔ مگر خیر کوئی بات نہیں۔ اب مرہم رکھنے کیلئے ہم جو ہیں۔ اس ہنر سے مرہم رکھیں گے کہ زخم پھول بن جائے گا" وہاں ایک شرارت ہو رہی تھی۔

"یقین کیجئے۔ آپ نے تو ہمیں مار ہی دیا ہے" اس نے مطہر کا ہاتھ تھام لیا۔

مطہر کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ ایک دم اچھل گئی۔

"آپ مجھے ہاتھ نہیں لگائیں"۔

"اچھے رستے میں کون ہاتھ لگانے کی اجازت دیتا ہے۔ نان نفقے کی ذمہ داری لی ہے عمر بھر کیلئے۔ اگرچہ آپ کے حساب سے بہت معمولی سی بات ہے۔ آپ تو موتیوں میں تولنے کے لائق ہیں۔ سچ تو یہ ہے" وہاں انداز ہی جدا تھا۔

"دیکھئے' پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتی"۔

"میں آپ کو اس بات کی اجازت بالکل نہیں دوں گا کہ آپ مجھے الٹی چھری سے ذبح کریں' مرے کو کیا مارنا؟"

علی تو اس کے انداز پر اپنے حواس ہی کھو بیٹھا۔ اور اس کی بات بے ساختہ کاٹ دی تھی۔

"دیکھئے... میں بہت دکھی ہوں" مطہر بے بسی سے چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"آپ کے ایک ایک دکھ میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔ عمر بھر کیلئے آپ کو اپنایا ہے" وہ قدرے جھکا تھا۔

"آپ میرا دکھ دور نہیں کر سکتے" اس نے بہتے اشک صاف کئے۔

"کم کرنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں"۔

علی جیسے حاضر جواب مرد کے سامنے اس کی سادگی بے بسی میں بدلنے لگی۔

"مجھے آپ کے تمام حالات کا پتا ہے۔ یہ بھی کہ ایک گھٹیا کردار کی لڑکی معمولی خادمہ بن کر رہ رہی تھی۔ آپ کے اس چلن نے تو جیسے مجھے خرید ہی لیا۔ ایسا موتی جو سیپ کی کوکھ سے باہر ہی نہیں آیا۔ بے سوچ کی کرن نے ابھی

چھوا بھی نہیں۔ مجھے تو اپنی اس پہلی نظر پر شرمندگی ہے جو بے حجاب آپ کو سر سے پاؤں تک چھو گئی تھی۔ جتنی نفاست و نزاکت آپ کے ظاہر میں ہے اس سے کہیں زیادہ آپ کے باطن کی آرائش ہے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہو رہا ہے کہ اس موتی کو چھونے والی پہلی روشنی کی کرن میں ہوں۔

میں آپ کو سونے چاندی میں تولنے کا وعدہ نہیں کرتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کی خوشی میرا مقصد ہو گی۔ میرا ایک بیٹا ہے۔ آپ کو پیار ہو گا۔ بہت چھوٹا ہے ابھی۔ بہت پیارا بچہ ہے۔ آپ اس ذمہ داری میں میرا ہاتھ بٹائیں گی تو میں احسان مند ہو جاؤں گا۔ آپ کا مقروض رہوں گا اور چاہوں گا کہ بدلے میں آپ کو ہر طرح سے خوش رکھ سکوں۔

اسے ابھی ٹھیک طرح سے بولنا نہیں آیا۔ وہ آپ کو امی کہے گا تو آپ کو بہت اچھا لگے گا۔ آپ اسے پیار دیں گی تو ہمیں اور پیاری ہو جائیں گی۔

اس نے آج تک لفظ "امی" نہیں بولا۔ مجھے خوشی ہے کہ جب وہ ہوش کی عمر میں آئے گا تو اس کے پاس سب کچھ ہو گا۔ ماں باپ اور دنیا کی دوسری ڈھیروں نعمتیں۔ ہماری دنیا اب بہت مکمل اور خوبصورت ہو گی۔ میرا خواب ہے کہ آپ کو میرے گھر میں ہر طرح کا آرام ملے"۔

اس نے باتیں کرتے کرتے ایک خوبصورت انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی۔

مطہر پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ بمشکل اس کے لب پھڑپھڑائے۔

"آپ کا بچہ۔ کہاں ہے؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"یہ پہلی رات تو آپ کی ہے۔ وہ بھلا یہاں کیوں آ سکتا ہے۔ کسی نو خیز لڑکی کے خوابوں کا حاصل ہوتی ہے یہ رات۔ میں کم از کم یہ زیادتی تو نہیں کر سکتا تھا آپ کے ساتھ۔ وہ حیدر آباد میں ہے اپنی آپا کے پاس۔ جب ہم حیدر آباد جائیں گے تو وہ اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کرے گا۔ وہ اتنا پیارا ہے کہ شاید آپ ہمیں بھول جائیں گی لیکن آپ ایسا کریں گی تو بہت زیادتی ہو گی"۔

علی نے اس کا ہاتھ تھام کر پہلی بار اپنے استحقاق کی مہر ثبت کی۔

مطہر کی جان کانپ کر رہ گئی۔ ابھی تک وہ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

"آپ کا بچہ... تو آپ کی بیوی؟" اس کا دل جانے کیوں ڈوب رہا تھا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر وہ ہوتی تو خان زادہ اتنی آسانی سے آپ کو میرے حوالے کیسے کرتے؟" علی نے بھرپور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"خان زادہ؟" مطہر نے چونک کر پلکیں اٹھائیں۔

"تیمور علی خان۔ میری جان! ابھی بھی نہیں جانتیں؟" وہ ہنس دیا۔

مطہر کا چہرا جیسے ایک دم پتھر کا ہو گیا۔ باطنی کیفیت کی ایک ایک لہر چہرے پر جیسے نقش ہو گئی۔

"ایک بات ہے" اس کی آواز قطعی سپاٹ تھی۔

"بسم اللہ... ارشاد ہو" علی گاؤ تکیہ پہلو میں لے کر نیم دراز ہوتے ہوئے شوخی سے گویا ہوا۔

"جب آپ مجھ سے بات کریں تو حویلی کے کسی شخص کا ذکر بیچ میں نہ لائیں"۔

اس کی آواز میں کسی پاتال کی سی گہرے دکھ کی کاٹ تھی۔

عجیب تاثر ہے نکاح کے چند بولوں کی وہ اجنبی رفاقت کی ہر ہر کو دل سے گزرتا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ترئین اپنی جگہ آپ ہلانے لگی ہیں۔

حالانکہ اس نے کتنا مصمم ارادہ کیا تھا کہ وہ علی کو ہر ہر طرح سے مایوس کرے گی۔ تم اوڑھے گی۔ یہ گی لہجے لے گی۔

اور علی کے وارفتہ اور اپنائیت بھرے لب و لہجے نے اسے بے حد کمزور کر دیا تھا۔ اس پر سے وہ "نفسیاتی ارتجنٹ" جو عموماً دلہن کو دی جاتی ہے۔ ترئین نے اسے یہاں پہنچانے سے پہلے کتنی قسم کی نصیحتیں کی تھی۔ علی کیلئے اس کے دل میں ایک دروازہ بے آواز کھولنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت تو وہ بغاوت ولی کے مرحلے طے کر رہی تھی۔ ترئین کا ایک ایک لفظ اسے چھلنی کر رہا تھا۔ مگر علی کے لب و لہجے کی خواب پرور حلاوت یادداشت کے خفیہ گوشوں سے ترئین کے نفسیاتی داؤ پیچ ڈھونڈ لائی تھی۔

ایک بے توقیر اور حقیقی رشتوں کی محبت سے محروم اور پھر بے حد کم عمراتی چنچل کہاں تھی کہ ایک بھرپور مرد کا مقابلہ کر پاتی۔

اس پر مستزاد ایک بے ماں کے معصوم بچے کا ذکر۔ اس کی تمام تر دنیا کمرے کے اندر گردش کرنے لگی۔

"آپ کی بیوی"۔ اس نے کچھ بولنا چاہا۔

"وہ تو اب آپ ہیں"۔ وہاں سے برجستہ جواب آیا۔

"میرا مطلب ہے کہ"۔ حیا نے اس کی قوت منتشر کر کے رکھ دی۔

"وہ عشق کرتی تھی مجھ سے۔ میرے اپنے قبیلے کی تھی۔ بچپن کی مانگ تھی مگر پھر ایسا ہوا کہ ہمارے خاندانوں میں قتل کی وجہ سے دشمنی ہو گئی اور دشمنی بھی اعلیٰ درجے کی۔ اس وقت میں پڑھ رہا تھا اس دشمنی کے نتیجے میں ہماری منگنی بھی ختم ہو گئی۔ دکھ تو خیر مجھے بھی بہت تھی۔ میں کیونکہ مرد تھا اور میرے باپ دادا مجھے صبح شام غیرت و مردانگی جس کا مطلب خون کے بدلے خون تھا۔ کا سبق پڑھاتے تھے۔ اس لئے میری توجہ کی جگہ بٹ گئی تھی۔ مگر اس کی توجہ صرف ایک سمت تھی۔ یعنی میری طرف۔ وہ مجھ سے جدا ہونے پر کسی قیمت پر راضی نہیں تھی۔ ایک رات وہ ڈھیروں سونا پہن کر میرے کمرے میں آ گئی اور فرار ہونے کیلئے ضد کی۔ اس کی شادی کہیں اور طے کر دی گئی تھی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بزدلی کا طعنہ دیا اور کہا اگر میں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ کنوئیں میں چھلانگ مار دے گی یا اپنی شہ رگ کاٹ لے گی۔ وہ جس انتہا پر پہنچ چکی تھی' کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ یہ کچھ کر گزرے گی۔ میں اتنا کمزور اور مجھے اس کی شدید محبت نے سب کچھ بھلا دیا۔ پانچ ہزار روپے اور ایک رائفل لے کر میں اپنے قبیلے کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ آ گیا۔ ہمیشہ کیلئے اس لئے کہ اس اقدام کے بعد نہ میں اپنوں کیلئے قابل قبول تھا اور نہ اس کے رشتے داروں کیلئے۔ آج بھی وہ میرے سر کی قیمت لگائے ہوئے ہیں"۔

سطریہ نے لرز کر پہلی مرتبہ اس کی سمت بغور دیکھا۔ تیکھا اور سرخ رخساروں والا صحت مند چہرہ، گھنی سیاہ مگر روشن کھلی آنکھیں۔ گہری تراش کے خوبصورت ہونٹ جن پر پیاری سی مسکراہٹ جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سطریہ کو اپنی سمت دیکھتے پا کر بلا کی شرارت آنکھوں میں سمو کر جواباً اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ساتھی پسند آیا؟" بہت اعتماد سے سوال ہوا۔

سطریہ نے جھجک کر پلکیں جھکا لیں۔ "پھر؟" اس کے لبوں نے جنبش کی۔ اس کے حساب سے ابھی بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"پھر یہ کہ ہم نے پہلی فرصت میں شادی کر لی۔ میں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران چھوٹی موٹی ملازمت بھی کرتا رہا۔ دو برس بعد ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اور ٹھیک اس کی پیدائش کے ایک سال بعد وہ مجھے اور اپنے بیٹے کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر اپنی حقیقی منزل کی طرف لوٹ گئی۔

مجھے اس کے چلے جانے کا بہت دکھ تھا۔ وہ مجھے چاہے جانے کے عظیم جذبے کی لذت سے آشنا کر گئی تھی۔ اس نے صرف مجھے دیا۔ مجھ سے کبھی کچھ مانگا نہیں۔ انسانوں کی اس بستی میں اس نے مجھے ہر ہر موڑ پر بہت اہم ہونے کا احساس دلایا تھا۔ بہت خود پسند بنا دیا تھا اس کی محبت نے مجھے۔ میں نے اسے کچھ دینے کا جب بھی سوچا تو محسوس ہوا کہ میں تو بال بال اس کا مقروض ہوں۔ قرضے اتارنے تو کجا کچھ دینے کے مرحلے آتے۔ اس سے پیشتر کہ ایسا کچھ ہوتا وہ چلی گئی۔

آپ بھی تو مجھے اس کے حوالے سے ملی ہیں۔ اس رات وہ اپنی جذباتی طاقت سے مجھے قبیلے سے نہ لاتی تو میرے آپ کے ملنے کے لیے کیا کرتے۔ ایک پیارا سا بیٹا اور ایک بے حد حسین اور سادہ جیون ساتھی۔ یہ اسی کی طرف سے آئے ہوئے پیش بہا تحفے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس پردہ کی ہوئی بہت اچھی عورت سے کبھی رقابت محسوس نہیں کریں گی"۔

"جی؟" سطریہ کچھ نہیں۔

"مطلب یہ کہ آپ کو اس کا ذکر ناگوار تو نہیں گزر رہا؟" علی کے انداز میں سنجیدگی تھی۔

"وہ کھوٹی اور بزدل نہیں تھی۔ اتنی اچھی عورت تو ہوتی بھی نہیں ہے"۔ اس نے سادگی سے کہا۔

علی نے بے ساختہ اس کا مہندی سے سرخ ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"چشمے کا صاف پانی دیکھا ہے؟"

سطریہ نگاہیں جھکائے خاموش رہی۔

"آپ کو دیکھ کر اس کا خیال آتا ہے"۔ وہ بھرپور جذبے سے مسکرایا۔

"آپ مجھے آپ کیوں کہہ رہے ہیں"۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ٹوکا۔

"رعب حسن کے آگے بے بس ہوں"۔ وہ شریر ہوا۔

"آپ کو میں نے اپنی عزت بنایا ہے۔ میں صرف آپ سے محبت نہیں کروں گا بلکہ آپ کی عزت بھی کروں گا۔ ہمیشہ۔ یہ میرا پہلا اور سچا وعدہ ہے آپ سے"۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کوٹ اتارنے لگا۔

مطربہ کو جانے ایک دم کیا ہوا۔ اس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

علی کوٹ صوفے پر اچھال کر اس کی سمت متوجہ ہوا۔

"مطربہ.... جان.... کیا ہوا؟"

وہ مزید ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"پلیز بتاؤ ناں' کیا میری کسی بات سے تمہیں تکلیف ہوئی؟" وہ بہت پریشان ہو گیا۔

"نہیں جو کچھ آپ مجھے دے رہے ہیں۔ وہ میری اوقات سے بہت زیادہ ہے"۔

"بڑی قناعت پسند ہو' ابھی کچھ دیا ہی کب ہے"۔ وہ ہنس دیا۔

"دیکھو' چپ ہو جاؤ ورنہ مجھے تمہیں سو سالہ طریقوں سے چپ کرانا آتا ہے۔ اپنے اسٹائل میں چپ کرایا تو پھر نہیں پھر اور نہ مجھے کوئی الزام دینا"۔

مطربہ کے تمام حواس اس کی وارفتگی کے سامنے ڈھیر ہو رہے تھے۔

"بی بی جان! کیا یہ کپڑے بھی رکھ لوں؟" مطربہ نے بیگ کی سمت اشارہ کیا۔

"بے وقوف۔ اب یہ کپڑے پہنے گی؟ اماں جی نے دس بارہ سوٹ جوڑے ہیں تجھے اور تیرے 'وہ' بھی تو لائے ہیں اچھے کپڑے۔ ابھی تو 'تو روز نیا جوڑا پہنے گی'"۔ نازنین ہنسیں۔

"مطربہ' اللہ کی قسم قیامت لگ رہی ہے۔ ویسے رات کو خیریت تو رہی تھی ناں۔ ویسے تجھے بے ہوش انسانوں کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں تو آتی ہیں ناں؟" تزئین شرارت سے ہنسیں۔

مطربہ کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

"اب بتا.... اب بھی رویا کرے گی؟" تزئین نے چھیڑا۔

اسی دم تیمور علی خان ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ وہ اسی سمت رخ کیے کھڑی تھی۔

"السلام علیکم خان"۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ بمشکل سنی جا سکی تھی۔

"وعلیکم السلام.... آپا.... اماں جی کہاں ہیں؟" انہوں نے اچٹتی سی نگاہ اس پر سے دوڑاتے ہوئے تزئین سے پوچھا۔

"برآمدے میں ہی تو بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہاں نہیں ہیں کیا؟" تزئین کی بجائے نازنین نے جواب دیا۔

"نہیں' وہاں تو نہیں ہیں"۔ انہوں نے پھر ایک الجھی ہوئی نگاہ مطربہ پر ڈالی۔

گہرے میرون کامدانی سے مرصع سوٹ میں ایک نئی زندگی کا انکشاف اس کے ایک ایک نقش پر ثبت تھا۔ اس نے یکدم تیمور علی خان کی سمت سے رخ موڑ لیا تھا۔

"بی بی جان۔ اگر میں ان سے کہوں تو کیا یہ مجھے نانی سے ملانے لے جائیں گے؟"

"کہہ کر دیکھو۔ افق کے اس پار بھی لے جائیں گے۔ ہمارے علی ہمدانی صاحب"۔ نازنین کھلکھلا رہی تھیں۔

مطربہ کو تیمور کی موجودگی کے خیال سے کچھ زیادہ ہی حیا آ گئی تھی۔

"ہوں.... نانی تو نانی اب تو تم اس کے ساتھ اپنی ماں کے پاس بھی جا سکتی ہو۔ اب تمہیں پتا چلے گا کہ ہم نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے یا برائی"۔ تیمور علی خان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"بعض انسانوں پر اتنی شفقتیں آ پڑتی ہیں کہ انہیں بھلائی برائی کی تمیز ہی نہیں رہتی"۔

وہ عجیب سے انداز میں بیگ بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

"ویسے تو تو بہت ہے مطربہ! کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی اگر تو کچھ دن بعد علی ہمدانی کی اصلی نہ ہوتی"۔ تزئین نے اپنی حیرت کو شوخی میں چھپایا۔

"ارے تم لوگ یہاں ہو۔ بتاؤ۔ مطربہ بھی ہے۔ اس کا سامان دیکھ لیا"۔

"تیمور! اس نے تمہارے بابا صاحب سے کہا تھا کہ علی کو کچھ نقد دے دیں اپنی طرف سے۔ گھر کی ضرورت کی چیزیں مطربہ اپنی پسند سے لے لے گی۔ اب اتنی جلدی کیا ہو سکتا تھا"۔

"اماں جی! وہ صوفے پہ ہیں میرے پاس"۔ وہ سادگی سے بولی۔

نازنین تزئین کے قہقہے بلند اور اماں جی اور تیمور علی خان کی مسکراہٹیں مبہم تھیں۔

"گویا ابھی تک پوچھا نہیں کچھ؟ ان دو صوفے پہ ہے"۔ تیمور علی خان صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اماں جی! علی نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا ہے۔ بابا صاحب نے بہت اصرار کیا تھا مگر وہ نہیں مان رہا تھا"۔

"اماں جی! کیا ضرورت ہے۔ میری اوقات سے بڑھ کر سلوک کیا ہے آپ نے؟" مطربہ کی آواز بھرا گئی۔

"کیوں نہیں کہتے۔ تیرا اتنا تو حق بنتا ہے والا اصل تھا اور کہیں نہ ہوتے۔ سیدزادہ تھا۔ کم نسب تو نہیں ہے.... ذات کی تو بے کہ ذرا کمتر ذات ہو گئی ہی تھی۔ اللہ نے تیرا نصیب کھول دیا۔ خوش رہ"۔

"مزاج واقعی بہت ہیں اماں جی! آج اس کی حقیقت بتائے دیتے ہیں"۔

تیمور علی خان کے لہجے میں جانے کیا تھا۔ اس نے بے ساختہ ان کا چہرہ دیکھا تھا اور انہوں نے پہلی مرتبہ اس سے نگاہیں چرائی تھیں۔

"دیکھ بچی۔ اپنے مرد کی توجہ و محبت چاہیے تو اس کی اولاد کو پال کر لینا پھر دیکھ کتنی قدر کرے گا تیری۔ بچے ضرور ہے اس کا گھرانے اتنی محبت اچھی ہے علی کی۔ تیمور سے سال دو سال ہی بڑا ہو گا"۔

کوئی بات ہو.... کوئی مسئلہ ہو۔ یہ تیمور کہاں سے آ جاتے ہیں بیچ میں جبکہ یہ کبھی بیچ میں نہیں ہوں گے۔

"اور میری بات سن.... ہر صورت نباہ کرنا ہے۔ کوئی مشکل پڑے تو جان چھڑانے کی جلدی نہیں کرنا۔ سمجھ رہی ہے۔ مرد کا نباہ آسان نہیں ہوتا لیکن نباہ آ جائے تو عورت کی ساری زندگی سنور جاتی ہے۔ خدمت اور محبت دو ہی ہتھیار دیے ہیں اللہ نے عورت کو۔ ان سے کام لینا سیکھ گئی تو بھلی گزر جائے گی"۔

اماں جی بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔

''سن رہی ہے ماں میری بات؟''

''جی اماں جی۔''

''اللہ بھاگ جگائے رکھے۔ نصیب اچھا کرے۔ حویلی کے دروازے کھلے ہیں۔ جب چاہے ملنے آجایا کرے۔ وقت بہت آتی تھی مجھے۔ بڑی خدمت کی ہے میری۔''

''اماں جی! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے رونا آرہا ہے۔'' وہ رونے کو ہوگئی۔

''اچھا اچھا۔ دھیان سے اپنی چیزیں رکھ لے۔ کبھی بعد میں پریشان ہو۔ چھوٹی دلہن۔ وہ شال بھی دیدو اسے جو میں لائی تھی۔ ساتھ ہی رکھ لے گی۔ کبھی بعد میں دھیان نہ دے۔''

''وہ رکھ دی ہے اس کے کپڑوں میں۔'' نازنین نے جواب دیا۔

''یہ علی کہیں گیا ہوا ہے؟'' معاً انہیں دھیان آیا۔

''پتا نہیں میں تو صبح سے اوپر نہیں گئی۔'' وہ اپنی مخصوص سادگی سے بولی۔

''کیوں؟'' تزئین نے شوخی سے سرگوشی کی۔

وہ حیا آمیز انداز میں خاموشی سے کپڑے تہہ کرنے لگی۔

''پاگل ..... کیوں نہیں گئی اوپر۔ اس کا سامان نہیں باندھے گی۔'' اماں جی مسکرائیں۔

''اصل سامان تو ساتھ بندھا چلا جا رہا ہے۔'' نازنین بہت سرور میں ہنسیں۔

''یہ چلی جائے گی تو تم بھی اپنے میکے ہو آنا۔'' اماں جی نازنین سے مخاطب ہوئیں۔

''جی اماں جی۔ امی بھی فون پر پوچھ رہی تھیں کہ کب آؤ گی۔ تزئین بھی رات کو اپنے سسرال جا چکی پھر آپ اکیلی کیا کریں گی' آپ میرے ساتھ چلئے گا۔''

نازنین نے ساس کو بہت محبت سے دیکھا۔

''ہاں خیر' ملنے تو مجھے بھی جانا چاہیے۔ چلوں گی۔'' وہ بولیں۔

''آپ کے کپڑے استری کرنے کو دے دوں؟'' تزئین بولی۔

''ہماری بھی سن لیجئے۔ سیٹ کنفرم ہوگئی ہے ہماری' پرسوں رات کی فلائٹ ہے۔ آج ہم حویلی جا رہے ہیں۔ پرسوں شام کو پہنچیں گے واپس۔ ہم سے الوداعی ملاقات جس جس کو کرنا ہے۔ ابھی کرلو۔''

''پرسوں ..... بس جا رہا ہے؟'' اماں جی نے دل گرفتہ ان کی سمت دیکھا۔

''جانا تو ہے اماں جی!''

''تجھے مجھ پر ترس نہیں آتا تیمور۔'' وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

''اماں جی ..... پھر وہی ..... ہم ہمیشہ کیلئے تو نہیں جا رہے۔ آنے کیلئے جا رہے ہیں جہاں اتنی ہمت دکھائی ہے تھوڑی اور سہی۔''

وہ ماں کے قریب آکر بیٹھ گئے۔

''کہاں کی ہمت۔ گھل گئی ہوں تیری جدائی میں۔'' ان کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

مطربہ کا جی ایک دم چاہا وہ مڑ کر تیمور علی خان کو پیچھے کرتے جانے سے بچا لے۔ وہیں تیزی سے کمرے سے دور کرے گی

اور ان کی سمت سے بالکل پشت کرلی۔

وہ رات کے حیدرآباد پہنچے تھے۔ سارا شہر نیند کی آغوش میں تھا۔ تیمور علی خان نے گاڑی صبح ارا ایمان کے ساتھ روکی تھی۔

پرانی وضع کا گھر تھا جس کے باہر ایک زرد رنگ کا بلب سا ٹنگا ہوا تھا۔ دستک پر ایک بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی تھی۔

''کھولو اماں۔ میں ہوں علی۔''

دروازہ فوراً ہی کھل گیا تھا جس شوق سے بوڑھی عورت دروازے میں آئی تھی اتنی ہی حیرت سے پیچھے ہٹی تھی۔ کافی سبز سوٹ اور سنہری بارڈر والی چادر' پھولوں کی خوشبو۔ چوڑیوں سے بھری کلائیاں۔ اور جھکی ہوئی آنکھیں۔ اس پر مستزاد حسن بھی غیر معمولی۔

''اندر آنے نہیں دو گی اماں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے پیارے کیلئے ماں لایا ہوں۔''

علی کے انداز میں اس کی فطری شوخی جھلک رہی تھی۔

عورت پیچھے ہٹ گئی مگر حیرت اپنی جگہ بدستور تھی۔

''اماں! اندر بہت تھک گیا ہوں گا۔ بیٹھک کھول دو اور اسے چائے پانی کا پوچھو۔''

''وہ تو ہے پھولوں کی۔ مگر یہ؟''

''اُفوہ۔ یقین نہیں آیا ابھی تک جب ہی تو دلہن کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا نہیں دی۔ تمہاری قسم اماں۔ نکاح کیا ہے۔''

بڑی بی کے اوسان ذرا بحال ہوئے۔ وہ آگے بڑھیں اور مطربہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کہاں سے ملی یہ چاند سی دلہن۔ سارے گھر میں روشنی سی ہوگئی ہے۔'' وہ بہت پرشوق انداز میں جائزہ لے رہی تھیں۔ ''آؤ بیٹی۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔''

انہوں نے اسے تھام کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

''میں نے آپ کو بیٹی کہا۔ آپ نے برا تو نہیں منایا۔ دراصل علی میاں نے میری عادت بگاڑ دی ہے۔ ہوں تو میں نوکر مگر مجھے ماں کی طرح عزت دیتے ہیں۔''

''تو اماں! تم بھی تو ہمارا' میرا مطلب ہے ہم اپنے بیٹے کا اتنا خیال رکھتی ہو جیسے سگے رکھتے ہیں۔''

اس کی تو خود کی ذات سے بڑی اونچی ترقی یکلخت ہوئی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اب اپنی ملازمہ کو دیکھا۔ ایک دم جانے کیوں دل بھر آیا۔ وہ تیزی سے پلکیں جھپکا کر آنسو چھپانے لگی۔

''علی میاں! دلہن بہت پسند آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ خوشیاں دکھائے۔ آمین۔'' وہ دعا دیتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

"کہاں جا رہی ہو؟" علی نے کوٹ اتار کر اس کی سمت بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
عطریہ نے درمیان ہی میں اٹھ کر کوٹ تھام لیا۔ علی نے بہت خوشی اور دلچسپی سے اس کی سمت دیکھا۔
"منہ تو میٹھا کرا دوں۔ دلہن پہلی بار گھر آئی ہے۔" وہ رکے بغیر آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔
وہ علی کا کوٹ بازو پر لٹکا کر ادھر ادھر لٹکانے کی جگہ تلاش کر رہی تھی۔ نظروں ہی نظروں میں۔
"اتنا حسین روپ، سروپ اور پھر یہ ادائیں۔ محترمہ بندہ ہلاک بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو یوں بھی ابھی خواب و وہم کے سلسلوں میں بھٹک رہا ہوں۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔" علی نے اپنے بازو اس کے شانوں پر ٹکا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اماں آ جائیں گی۔" اس نے گھبرا کر دروازے کی سمت دیکھا۔
"تو کیا ہے، آنے دو۔" علی نے شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔
"شرم نہیں آتی آپ کو۔" حیا سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔
"دھیان نہیں دیا کبھی اس پوائنٹ پر۔" اس نے قہقہہ لگا کر بازو ہٹا لئے۔ عطریہ سے پلکیں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔
"فی الحال تو یہی ہے گھر میں۔ شام کو بچے کیلئے یہ کسٹرڈ بنایا تھا۔" اماں ٹرے اٹھائے تھوڑی دیر بعد آ گئی تھیں۔
"اماں! تم نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا؟ بہت سامان آیا ہے کھانے پینے کا ان کی طرف سے کھانا بھی ہے۔ پھل ہیں ڈھیروں مٹھائی ہے۔ صبح اٹھ کر محلے میں بانٹنا شروع کر دینا۔ کئی دن میں بٹے گی۔ تب جا کر ختم ہو گی۔"
علی نے قمیص کے اوپری بٹن کھول کر کسٹرڈ پیالی میں ڈالتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔
"ماشاء اللہ بڑے دل والوں کی اولاد ہے۔"
عطریہ کا چہرہ یکلخت سفید سا پڑ گیا۔ ان دیکھے روشن چراغوں کی لوئیں لہرانے لگیں۔
"یہ لیجئے محترمہ۔" علی نے بہت شوخ انداز میں اس کے سامنے پیش کی۔ اس پر اماں کے جملے نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا یا پھر اسے اپنے اعصاب و افعال پر بہت کنٹرول تھا۔
عطریہ نے پیالی تھام لی۔
"کھانے کیلئے دی ہے۔" علی نے اسے پیالی کی سمت گھورتے دیکھ کر چونکایا اور وہ حقیقت میں چونک پڑی۔
"کس دھیان میں ہیں آپ؟ یہ دنیا بڑے دل والوں کیلئے ہے۔ چھوٹے حوصلے اور چھوٹے دل والے ان خوشیوں سے بھی محروم رہتے ہیں جن پر ان کا جائز حق ہوتا ہے۔ بہت تنگ کرتی ہے انہیں یہ دنیا۔ کسی قسم کی فکر خود پر طاری کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ہمیشہ خوش دیکھوں۔ جس دن کسی غم میں مبتلا دیکھا۔ بہت لڑائی ہو گی۔ اور اپنا پلنگ باہر گلی میں ڈال کر سو جایا کروں گا۔ لوگ پوچھیں گے کہ باہر کیوں سو رہا ہوں تو صاف کہہ دیا کروں گا کہ بیوی کہنا نہیں مانتی۔"
عطریہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل ہنسی ضبط کی۔
"ابھی ہم آپ کو اپنے بیٹے سے ملائیں گے۔ بڑا پنکچوئل (وقت کا پابند) ہے۔ نو بجے ہی سو جاتا ہے۔ صبح چھ بجے سے پہلے ہی جاگ جاتا ہے۔ بڑی فوجیوں کی سی عادت ہے۔ لگتا ہے پکا نمازی بھی بنے گا اور باقاعدہ جماعت سے لازمی

پڑھا کرے گا۔"
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" عطریہ نے دھیرے سے کہا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔
"ابھی ہم آپ کو ایک اور سرپرائز دیں گے۔ چلیں تو دیتے ہیں۔ آپ کیلئے یہ کراچی کے بہت خوبصورت ڈریس لائے ہیں کراچی سے۔ بہت ترس آتا ہے آپ پر۔ یہ پیچھے والے کپڑے میں کیسی لگ رہی ہیں کہیے آ جاتی ہے۔"
عطریہ نے پیالی واپس رکھ دی تھی۔
"آئیں چلیں۔ پہلے اپنا شہزادہ دکھاتے ہیں آپ کو۔" علی نے اٹھ کر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔
وہ پیچھے پیچھے چل پڑی۔
علی اوپر جانے کیلئے زینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔
وہ بھی اس کی تقلید میں زینے چڑھنے لگی۔
زینے طے کرتے ہی چھت کی خالی جگہ کے بعد سامنے ہی کمرا تھا۔ علی آہستگی سے دروازے پر پڑا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ اور پھر وہ بھی۔
چھوٹا سا کمرہ بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت بچوں اور جانوروں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ رنگین میں بے شمار کھلونے کارپٹ پر اور سیدھے پڑے ہوا گھوڑا اور گاڑیاں۔ کھڑکی پر گلابی جالی کا پردہ۔ چھوٹا سا سنگل بیڈ اور اس کے ساتھ ہی وارڈ روب الماری۔ کھڑکی کے ساتھ گول سفید میز پر بچے کی کتابیں قاعدے وغیرہ۔ ایک بچے کیلئے اس قدر اہتمام تو اس نے حویلی میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہاں ایک کمرے میں کم از کم تین بچوں کا اہتمام ہوتا تھا اور اسی حساب سے بے ترتیبی بھی ہوا کرتی تھی۔
"یہ ہے ہمارے ولی عہد۔ وہ جو آپ ہمیں دیں گی وہ ان کے جانشین ہوں گے۔"
"ہائے اللہ۔" عطریہ کو تو مارے حیا کے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ "یہ علی تو بس بولے چلے جاتے ہیں۔"
"آؤ بھی۔ رک کیوں گئیں۔ دیکھئے کیسے ٹھاٹھ سے سو رہے ہیں۔ باپ کی تو ذرا پروا نہیں۔"
عطریہ نے بچے پر نگاہ ڈالی۔ وہ ڈھائی سال کا نہایت صحت مند اور خوبصورت بچہ تھا۔ بے خبر سویا ہوا اسے بے ساختہ پیار آ گیا کہ وہ ان بچوں میں سے تھا جنہیں راہ چلتے ہوئے بھی پیار کرتے ہیں۔"
اس نے آہستگی سے اس کی پیشانی سے بال سمیٹے اور جھک کر بوسہ دیا۔
"محترم عبدالباری ہمدانی! دیکھئے تحفہ ابھی ابھی لائے ہیں آپ کیلئے۔" علی نے عطریہ کو شانوں سے تھام کر سرگوشی کی۔
چند روز قبل تک یہ شخص اس کو کتنا بھاری تھا۔ محض عزت و محبت نے جو وہ اسے دے رہا تھا۔ گھٹنے کی راہ کتنی آسان ہموار کی تھی۔
خواب کے طلسم اتنی آسانی سے کب جان چھوڑتے ہیں۔ مگر محبت بھی ایک قیامت ہے انقلاب ہے بشرطیکہ محبت ہو۔

"کیسا لگا آپ کو ہمارا بیٹا؟"

"ماشاءاللہ۔ بہت پیارا ہے"۔ اسے واقعی بچہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

اسے حیدر آباد میں رہتے ہوئے ٹھیک ایک ماہ ہو رہا تھا۔ دس دن پہلے علی اسے نانی سے ملوا کر لایا تھا۔ نانی بہت بیمار تھی اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس نے کہا بھی تھا کہ وہ ساتھ چلے اب تو اس کا اپنا گھر ہے۔ مگر اس کی "ناں" کو وہ ہاں میں نہ بدل سکی تھی۔

سردار ماموں نے علی کی بہت آؤ بھگت کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مطربہ کو گلے سے لگایا تھا سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ چلتے ہوئے ایک جوڑا اور دس روپے بھی دیئے تھے۔ اور ساتھ ہی کہا تھا کہ تھوڑے بہت پیسے اس نے کفن دفن اور سردار کے بچوں کیلئے اٹھا رکھے ہیں۔ کفن دفن کا سن کر اسے بہت رونا آیا تھا۔ وہ بہت بوجھل دل کے ساتھ واپس ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ اس کی آخری ملاقات تھی نانی سے۔

چلتے ہوئے نانی نے کہا تھا۔

"زیتون بالو۔ علی تیرا امیر ضرور ہے مگر یہی میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ عمر بھر کوشش کی کہ اس کا احسان میرے سر پر نہ ہو۔ اپنی محنت مزدوری کی روٹی کھاؤں مگر سو اب آئے اور حویلی والوں نے جو احسان کیا ہے میرے پاس اس کا بدل نہیں ہے۔ سوائے اس دعا کے کہ حویلی کی جتنی بیٹیاں ہیں۔ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔"

وہ حیدر آباد آ کر بہت دن اداس رہی پھر ایک روز علی نے اسے خوشخبری سنائی کہ بصیر علی خان کی شادی ہو رہی ہے۔ آج آفس میں اماں جی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ پہلی فرصت میں مطربہ کو حویلی بھجواؤں۔ اسے بصیر علی خان کی شادی کا بہت انتظار تھا اور یہ بھی کہ کوئی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کیلئے کپڑے بنوا لئے ہیں۔

اماں جی کے اس اپنائیت بھرے پیغام پر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت معتبر باپ کی بیٹی ہے۔

علی نے تو کوئی ایسا تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ بچے کو ساتھ لے کر جائے اس نے خود کہا تھا وہ بچے کو ساتھ لے کر جائے گی۔

اور جب وہ گلابی سوٹ اور سرخ چادر میں بچے کو اٹھائے حویلی میں داخل ہوئی تو وہاں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک لمحے کو تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ حویلی والوں کو اتنی پیاری ہے۔

"واہ مطربہ۔ کیا ریڈی میڈ اولاد لی ہے۔ ماشاءاللہ کتنا پیارا بچہ ہے"۔

تزئین نے بے اختیار بچہ گود میں لے کر رخسار چوم لیا تھا۔

"ماشاءاللہ۔ بڑی جلدی مل گیا تجھے"۔ بچے نے منہ بسور کر مطربہ کی طرف ہاتھ بڑھائے تو اماں جی نے بہت خوشی سے کہا۔

"آخر کس باپ کی اولاد ہے۔ جو اس سے ایک لمحے کو مل گیا تھا"۔ نازنین کی خوبصورت ہنسی فضا میں بکھری تھی۔

"اچھی تو ہے؟" اماں جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا۔

"آپ کی دعا ہے اماں جی"۔ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"اللہ خوش رکھے۔ ایک اجنبی سے عمر بھر کو تیری جان چھوٹ گئی"۔ وہ جیسے چین سے پر سکون انداز میں جیسے شکر ادا کر رہی تھیں۔

"آج کل تو بڑا نام ہوگا حویلی میں"۔ اس نے بچے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مگر ہم تجھ سے کام نہیں کروائیں گے۔ تیرا امیر کبیر دولہا کام نہیں کرنے دے گا آخر پولیس والا ہے"۔ اماں جی نے مذاق کیا۔

"نہیں اماں جی۔ میں تو اب بھی آپ کی باندی ہوں"۔ وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"ہاں ہاں تو تیری بارہ پشتوں میں ہوتی آئی ہوں گی۔ ایک ذرا سا داغ ہی بس تجھ پر"۔

"جن بارہ پشتوں کا ایک اچھے گھر کا رزق کھایا میں نے۔ میں کیا جانوں ان کو"۔ وہ بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھا اماں جی ایک مہینے میں ہی کتنی سمجھ دار باتیں کرنے لگی ہے"۔ تزئین نے ہنس کر کہا۔

"نہیں خیر سمجھ دار تو ہے یہ"۔ اماں جی نے شفقت آمیز انداز سے اسے دیکھا۔

"مگر سچ تو یہ کہتے ہیں کہ سر سے گزر جاتی ہیں اس کے ہماری باتیں۔ بہت آسان انداز میں بات کرتی ہے اس سے"۔ نازنین نے کہا۔

مطربہ جیسے ایک دم چونک پڑی۔ یہ تو خیال ہی نہیں آیا کہ نازنین حسن۔ احمق کہنے والا اب اس حویلی اس وطن ہی میں نہیں ہے۔

اسے حویلی میں یکایک بہت بڑی کمی کا احساس ہوا۔

چھوٹی بہوؤں کی چہچہاہٹ۔ زینہ اترتے ہوئے قدموں کی مخصوص دھمک ان کی آمد سے قبل ہی ان کی آمد کا اعلان۔ ایک مخصوص خوشبو کی زبانی۔ ایک خاص انداز کی گفتگو۔

جانے کیا کیا کم ہو گیا تھا حویلی میں۔ اس کے اندر وحشت کے بگولے سے ناچنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ علی کی ذات اتنی ہنگامہ پرور اور پرجوش و پرشور ہے کہ ذات کے بند دروازے کھلنے کی فرصت اور مہلت نہیں ملی۔ محض اتنی سی دوری نے اندر کا محاذ بچھانا شروع کر دیا تھا۔

اس نے گھبرا کر بچے کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

"بچے کا نام کیا ہے"۔ اماں جی کو وہ بہت اچھی لگی بچے کو پیار کرتے ہوئے۔

"باری"۔ اس نے دوبارہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"بڑا اچھا ہے یہ نام بچے پر"۔ تزئین نے بہت خوش ہو کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"میرے خیال میں تو پورا نام عبدالباری ہوگا"۔ وہ پھر گویا ہوئیں۔

"جی۔۔۔ عبدالباری مہدی"۔ اس نے تائید کرتے ہوئے پورا نام بتایا۔

"واہ صاحب! کیا بارعب نام ہے"۔ نازنین نے بچے کا رخسار چھو کر کہا۔

"اسے نیند آ رہی ہے۔ اوپر سلا آؤں، نیچے تو بہت شور ہے"۔ وہ وہاں کھڑی ہوئی۔

"سونے کی کوٹھری میں نہ چلی جانا۔ اماں جی نے اوپر والا کمرہ کھلوایا ہے"۔ عالم تب بھی آ گئی تھی۔

"دودھ پلا دے پہلے، آرام سے سوتا رہے گا"۔ اماں جی نے تاکید کی۔

"اسے کیا پلاتی ہو گی"۔ تزئین نے شرارت سے کہا۔

"جی"۔ وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

"تو اس عمر میں تو یوں بھی اپنا چھوٹ جاتا ہے"۔ اماں جی مذاق نہیں سمجھیں، سیدھے پن میں کہہ گئی تھیں۔

"ہیں۔ اماں جی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے"۔ نازنین مسکرائیں۔

"ارے میں بچے کی بات کر رہی ہوں۔ ماشاءاللہ دو سال کا تو ہو گیا ہے ناں؟" اماں جی نے پھر سادگی سے وضاحت کی۔

"جی ___" "یہ بتا رہے تھے کہ دو سال کچھ مہینے کا ہو گیا ہے"۔ وہ بولی۔

"ہائے ظالم کیا آفت لگی ہے"۔ "وہ" "ان" کہتے ہوئے۔ اب تو بہت رو رہی تھی کہ شادی نہیں کروں گی"۔ تزئین نے کھنچائی کی۔

"واقعی لگ رہا تھا کہ میں نکاح کے وقت انکار کر دے گی"۔ نازنین بھی گویا ہوئیں۔

مطربہ کا چہرہ ایک دم بے تاثر ہو گیا۔ نئے سرے سے جیسے حواسوں پر برف پڑ گئی۔ اس کی نظریں بے ساختہ اس درست کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے جھپ کر اس نے دل کی ویرانی کا پہلا مرحلہ طے کیا تھا۔ زرخیز زمین پر پہلی بارش کا تھا۔ سبزے کے شوق میں جیسے زمین کو روندے جانے کی تکلیف نہیں ہوئی یا یہ کہ روئیدگیاں پھوٹنے کی لذت ہر اذیت بھلا دیتی ہے۔ ایسی روئیدگیاں پھوٹی تھیں کہ بے پھل پھول کے جھاڑ اگے تھے۔

اس نے خود پر قابو پا کر بچے کو شانے سے لگایا اور اندر کی سمت بڑھ گئی۔

بصیر علی خان کی رسم ابٹن کا ہنگامہ تھا۔ وہ بچہ ماما جی کو تھما کر اپنی تیاری میں مصروف تھی۔ ہال میں صوفے پر پڑے استری شدہ کپڑے اٹھانے آئی تھی۔ تقریب باہر باغ میں ہو رہی تھی۔ فی الحال سب اپنے اپنے کمروں میں تیار ہو رہے تھے۔ وہ کپڑے بازو پر لٹکا کر باہر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

"کون؟"

"کون نہیں تیمور علی خان"۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ وہ تو جیسے اچھل پڑی۔

"السلام علیکم خان"۔

"مطربہ؟" وہاں سے استفسار ہوا۔

"جی خان"۔ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ (شکر ہے آپ کو میرا نام تو یاد رہا۔)

"علی کیسا ہے؟"

(شاید زندگی میں کبھی پوچھ لو کہ تم کیسی ہو؟)

"جی ٹھیک ہیں"۔

"اچھا سنو۔ پہلے ناز بھابی کو بلاؤ پھر تین چار منٹ کے وقفے کے بعد اماں جی کو بلانا"۔

عجیب طرح کا پیغام تھا اس نے ریسیور رکھ دیا۔ تبھی اسی لمحے نازنین ہال میں داخل ہوئی۔

"آپ کا فون ہے۔ چھوٹے خان ہیں"۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

"وہ ___ تیمور"۔ نازنین ذوق شوق سے آگے بڑھیں۔ "ہیلو تیمور، وعلیکم السلام۔ اچھا، ٹھیک ہو؟ ہاں ___ ہاں ___ بتاؤ"۔

وہ بولتے بولتے ایک دم رکی اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مطربہ کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ یوں بھی جانے والی تھی۔ اماں جی کو بلانے۔ ہدایت کے مطابق وہ وقت کا وقفہ گزار رہی تھی۔ عجیب الجھے ہوئے انداز میں وہ اماں جی کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

تیمور کی آواز نے ایک مرتبہ پھر اس کا اعصابی نظام چیک کر کے رکھ دیا تھا۔ علی کی سہاگن ہونے کے احساس کے ساتھ آج وہ سجنے سنورنے کا ہر شوق پورا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر اب ایسی کیفیت ہو رہی تھی گویا کوئی لمبی بیماری کاٹ کر اٹھا ہو۔

وہ اپنی سوچوں میں گم اماں جی کے کمرے میں آ گئی تھی۔

"اماں جی ___ چھوٹے خان کا فون ہے"۔ اس نے عام سے انداز میں مطلع کیا۔

"اچھا؟" وہ ایک دم پلنگ سے اتر آئیں۔ "نالائق۔ کچھ دن اور رک جاتا۔ بھائی کی شادی میں شریک ہو جاتا۔ اس لڑکے کی بھی اپنی الگ دنیا ہے۔ تیری بات ہوئی تھی تیمور سے؟" خوشی سے وہ جیسے اپنا آپ بھول رہی تھیں۔

"جی"۔ وہ ان کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"بہت خوش تھا تیرے بیاہ سے۔ کہ اماں جی۔ بہت اچھا کام کرایا ہے اللہ نے میرے ہاتھوں۔ مطربہ ٹھکانے پہنچ گئی۔ اتنا خوش تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ یوں بھی گھر بسانا تو کسی مجبور کا بڑے ثواب کا کام ہے۔ جیتی رہے میرے بچے نے ___ اللہ اسے خوشیاں دے"۔

اماں جی ساتھ چلتے ہوئے بولتی جا رہی تھیں۔ دعائیں دے رہی تھیں اور وہ زمان و مکان سے ماورا۔ جہاں میں ناگہاں آنے والے دکھ کی چھاؤں میں بیٹھ گئی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے کسی کی عظیم خوشی، کسی کا عظیم دکھ۔ جیسے ایک تصویر کے دو رخ۔ تمہاری تو دین دنیا سنور گئی تیمور خان۔ میری ادا ہی لگی ہوئی ہے کوئی کسی کو کتنا سمجھا سکتا ہو گا۔ جتنا میں خود کو سمجھاتی ہوں علی۔ میری صورت میں [illegible] حالانکہ میں اس پر قربان ہونا چاہتی ہوں۔ میں اسے خوشیاں ہی خوشیاں دینا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے اپنی سمجھ نہیں آ رہی۔

وہ اماں جی کو ہال تک چھوڑ کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑی تھی۔

ویسے ہی شام وہ روپہلی کام کے اورنج شلوار کرتے میں ڈھیروں پھول پہنے باری کو گود میں اٹھائے پنڈال سے باہر کھڑی علی کو ڈھونڈ رہی تھی جو صبح ہی حویلی پہنچا تھا۔

"خیریت سے ہو مطربہ؟" ایک جانی پہچانی آواز پر وہ چونکی۔ بائیں جانب براؤن جینز اور سفید قمیص میں ملبوس عارف کھڑا تھا۔

"ہوں۔ خیریت سے ہوں۔" اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

"تم تو بڑی خوش ہو گی۔ سنا ہے۔ کسی پولیس والے سے شادی ہوئی ہے۔" وہ اس کے سراپے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اسی طرح ایک دن سب کاموں کی طرح شادی بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں خوشی غمی کا کیا سوال۔ انسان کو خوش رہنے کا شوق ہو تو شادی کے بغیر بھی خوش ہو لیتا ہے اور نہ ہونا چاہے تو شادی سے بھی کیا ہوتا ہے۔"

اس نے قدرے سرد مہری سے اسے دیکھ کر جواب دیا۔

"لیکن وہ تو اپنی شادی پر بہت خوش ہوتا ہو گا جسے اپنی مرضی کا ساتھی ملتا ہو گا۔ جیسے کہ تمہارا خاوند۔" وہ بغور گھور رہا تھا۔

"شاید۔ مجھے تو یوں بھی یہاں وہاں ہر شخص ہی خوش دکھائی دیتا ہے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"ہاں ۔۔۔ دراصل تمہیں غور سے دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"تو ضرورت بھی کیا ہے۔ اور ہاں سنو تم مجھے تم نہیں کہو۔ میرے میاں نے سن لیا تو برا منائیں گے۔ وہ بھی مجھے تم نہیں کہتے۔ گھسیارے نہیں ہیں۔ خاندانی ہیں۔"

اس نے ناگواری سے ٹوکا۔ اسے عارف کا یوں تفصیلی بات کرنا بہت کھل رہا تھا۔

"تمہاری چال سے لگتا تھا کہ تم بہت اونچے خواب دیکھتی ہو۔ خوشی کی بات ہے۔ خواب پورے ہو گئے۔" وہ بہت سادہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"شاید تمہیں میرے اونچے خوابوں پر اعتراض تھا۔" وہ قدرے تلخی سے مسکرائی۔

"آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ کیا تنگ کر رہا ہے؟" علی کسی سمت سے نمودار ہوا اور باری کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ تنگ تو نہیں کر رہا۔ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ کھانا کھا چکیں تو اسے لے جائیے گا۔ میں اطمینان سے کھا لوں گی۔"

"میں آپ سے کہہ بھی رہا تھا کہ اماں کو ساتھ لے جائیں۔ خیر۔ ٹھیک ہے۔ اور ہاں آپ کو اس طرح باہر نہیں کھڑا ہونا چاہیے ابھی خطرہ موجود ہے۔ میرا شناختی کارڈ آپ کے ماتھے پر لگا ہوا نہیں ہے۔"

وہ پھر شوخ ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک دم سنبھل گیا۔

"آپ کی تعریف؟" اس نے مطربہ سے سوال کیا تھا۔

"یہاں گاؤں میں ہی رہتے ہیں پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے انہیں۔ حویلی میں بھی آتے جاتے ہیں۔ ان کے والد بڑے خان کے خاص آدمی ہیں۔ بچے پڑھاتا ہے ہاں؟"

وہ کھلکھلائی۔ علی کی ایک ابرو پر سوالیہ نشان لگنے پر اسے بتلا دیا تھا۔

"بالکل ٹھیک بتایا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ بہت غور سے اس نے علی کا جائزہ لیا تھا۔

"اچھا چلیں اب آپ اندر جائیں۔ باہر آنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ ٹھیک؟"

وہ بشاشت سے کہہ کر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے کے انداز میں مردانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مطربہ بھی عارف پر نگاہ ڈالے بغیر پلٹ گئی تھی۔

اور عارف جوتے کی نوک سے گھاس مسلتے ہوئے جانے کس دھیان میں تھا کہ ایک لڑکے نے اسے مخاطب کیا۔

"یہاں اکیلے کھڑے کیا سوچ رہے ہو یار؟"

وہ بہت وقار سے مسکرایا تھا۔

کتنی آوازوں کے اسرار تھے پنہاں ان میں
آج تک سوچ رہا ہوں وہ نشیلی آنکھیں!

علی تو اگلے ہی دن چلا گیا تھا۔ مطربہ کو خالہ سوال آنے نے دو تین دن کیلئے روک لیا تھا۔ شادی کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا۔ مہمانوں کی تھکن اتر رہی تھی۔ بہت جلد سب پڑ کر سو جاتے تھے۔ وہ گرم پانی کا فلاسک لے کر اوپر چڑھنے لگی تو وہ سامنے آ گئی۔

"مطربہ۔"

"جی۔" وہ رک گئی۔

"بچہ سو گیا یا سلا دو گی ابھی؟" عجیب جلد بازی کا سا انداز تھا۔

"وہ تو کبھی کا سو چکا۔ کوئی کام؟"

"ہاں۔ وہ بات یہ ہے کہ تیمور کا لندن سے فون آنے والا ہے۔ بہت تھوڑے سے ٹائم کیلئے اور بار بار مجھے بلا رہے ہیں اس لئے میں ہال میں نہیں بیٹھ سکتی۔ ماما اور روما بی بی سے میں یہ کام نہیں لینا چاہتی کہ اماں جی کو پتہ چل گیا تو ان کو بھی برا ہو گا کہ تیمور کی ان سے بات کیوں نہ کرائی۔ آج دراصل یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا تم گھنٹہ آدھ گھنٹہ یہاں ہال میں بیٹھ سکتی ہو؟ بچے کے پاس میں روما بی بی کو بھیج دیتی ہوں۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔" وہ درحقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی تھی۔

"ہاں۔ جب مجھے بلانے آؤ تو کچھ کہنا مت۔ بس دستک دینا۔ میں آ جاؤں گی۔ ٹھیک؟"

"جی۔" اب ذرا سی پریشانی اس کے چہرے پر جھلکنے لگی تھی۔

نازنین دوپٹہ سر پر ڈالتے ہوئے پرسکون انداز میں آگے بڑھ گئی۔

اور وہ صوفے پر ڈھے گئی سوچنے لگی کہ بغیر کسی کام کے کتنی دیر تک بیٹھا جا سکتا ہے؟ اس نے کارپٹ سے کشن اٹھا کر صوفے پر رکھے اور دراز ہو گئی۔ ذہن میں بے ترتیب سوچیں گردش کرنے لگیں۔

وہ تو اپنے حق میں بہتری سمجھ رہی تھی کہ تیمور علی خان وطن میں نہیں تھے۔ ان کی موجودگی اسے کم سے کم بے سکون ضرور کرتی۔

مگر اب پھر ان کی آواز سننا تھی۔ جو وہ اب بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔

وہ جانے کیا کیا سوچتی رہی اور جانے کب اونگھ آ گئی۔

فون کی بیل جانے کب سے بج رہی ہوگی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی اور بدحواس انداز میں ریسیور اٹھایا تھا۔

"جی خان...... السلام علیکم۔ جی میں کافی دیر سے انتظار کر رہی تھی آپ کے فون کا" اس کی آواز میں نیند کا خمار ہنوز تھا۔

"کون سے خان کے فون کا انتظار کر رہی تھیں۔ حالانکہ اب تو صرف میرے فون کا انتظار کرنا چاہیے آپ کو۔"

وہ دھک سے رہ گئی دوسری طرف علی تھا۔

"آپ؟" اس کے منہ سے بس یہی نکلا۔

"کوئی شک؟ کیا میرا فون آنا کوئی حیرت کی بات ہے؟" وہ دوسری طرف بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں تو۔ وہ جی۔ بس۔ وہ یہ ہے کہ" وہ گھبراہٹ میں بے ربط ہو گئی۔

"ہادی کہاں ہے؟" وہ بہت بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"سو رہا ہے۔"

"کیا؟ اس کی آیا کو یہاں چھوڑ گئی ہیں آپ؟"

"نہیں! وہ وہ پاس ہی ہے اس کے پاس۔" وہ جانے کیوں اس کے بدلے ہوئے انداز پر گھبرا رہی تھی۔

"تم کیا ہوا ہے اس وقت؟" وہ اپنی نیند کا اندازہ کرنا چاہ رہی تھی۔

"حیرت ہے آپ کو نہیں پتا؟ ہادی کی وجہ سے اس وقت فون کرنے کا خیال آ گیا تھا۔"

"کہاں سے فون کر رہے ہیں؟" اس نے یونہی پوچھ لیا۔

"اسٹیشن سے آج ابھی تک یہاں ہی ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ صبح تک یہاں ہی رہوں۔ بچے کا خیال رکھنا۔ مجھے بہت فکر ہے۔ خدا حافظ۔"

وہ۔ وارفتگی۔ وہ بے ساختگی۔ آج کچھ بھی نہیں تھا۔ جن کو بھرپور چاہت ملنے کا ادراک ملتا ہے وہ کسی جیتی کا ادراک اس سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ اس کا گم ہونا عین فطرت تھا۔ یہ چند دنوں کی قربتیں اس کی زندگی کا اہم موڑ تھیں۔ سادہ سے سادہ عورت کو بھرپور مرد کی بھرپور رفاقت جو شعوری ترقی دیتی ہے وہ کسی کے سکھانے پڑھانے سے کبھی نہیں آ سکتی۔ اس نے بے دلی سے ریسیور رکھ دیا تھا۔

ریسیور رکھتے ہی گھنٹی بج گئی تھی۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھایا تھا۔ اور بہت شگفتہ انداز میں بولی تھی۔ "ہیلو کون؟"

"اس وقت بھی انتظار ہو رہا ہے فون کا" دوسری جانب تیمور علی خان مخاطب تھے۔

"السلام علیکم ابا! کر رہی ہوں خان۔ ہو تو کہیے۔"

اس نے کوئی بات کرنے اور سننے سے پہلے ہی ریسیور رکھ دیا اور تیزی سے ہادی علی خان کی خواب گاہ کی سمت بڑھ گئی تھی۔

بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

"ٹھیک ہے مطربہ۔ چلو آ رہی ہوں۔ ایسا کرو تم اوپر چلی جاؤ۔" وہ دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے اپنی بات مکمل کر چکی تھی۔

مطربہ کچھ کہے بنا ہی اپنے راستے پر چل پڑی تھی۔

رات اس کی بہت بےکل گزری تھی۔ نہایت فطری امر تھا کہ ایک شخص اس کی زندگی کا اہم حصہ بن چکا تھا۔ وہ اپنے والہانہ انداز اس پر نچھاور کرتے تھے۔ چاہے جانے کی عظیم لذت سے آشنا تھا۔ صرف "ربط" کیا ہوتا ہے یہ سمجھ آ گئی تھی۔ پھر اس کا بدلا ہوا انداز اس پر کیسے اثر انداز نہ ہوتا۔

صبح ہی اس نے اماں جی سے کہہ دیا تھا کہ اسے حیدرآباد بھجوا دیں۔

"ہیں اب ایسا کیا ہوا؟ وہ چار روز کیلئے تو تو اپنی خوشی سے رکی تھی۔ نہیں رکنا تھا تو علی کے ساتھ ہی چلی جاتی۔" وہ فکرمندی سے بولی تھیں۔

"بس اماں جی میرا دل چاہ رہا ہے جانے کو۔"

"اہم!" ترئین شرارت سے کھنکھاری۔

"اب تجھے بچے کے ساتھ اکیلا بھیجنے سے تو رہی۔ علی نے کہا تھا علیم الدین کے ساتھ بھیج دیجئے گا۔ حیدرآباد ایئرپورٹ سے میں لے جاؤں گا۔ خیر میں تیرے خان سے بات کرتی ہوں۔ تو فکر نہ کر۔ تیرا تو حویلی سے زیادہ کہیں دل ہی نہیں لگتا تھا۔" اماں جی مسکرائیں۔

"اب تو بہت سدھر گئی تھی کہ شادی نہیں کروں گی۔" نازنین نے چھیڑا۔

اس نے جانے کس دھیان سے چونک کر نازنین کی سمت دیکھا۔ پھر خالی خالی نظروں سے اماں جی اور ترئین کو باری باری دیکھا۔

"کل کیا ہوتا ہے۔ کسی کو پتہ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

ترئین کو اس میں کوئی خاص بات محسوس ہوئی تھی۔

"اچھا اچھا۔ فکر نہ کر۔ کرتی ہوں بندوبست۔ اس سے اچھی کیا بات ہے کہ تجھے اپنے گھر کا خیال ہے۔"

"پھر بھی۔ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟ مجھے تو بڑی چپ چپ سی لگ رہی ہے۔" ترئین نے پوچھا۔

"نہیں بی بی جان! ویسے ہی کچھ طبیعت سی خراب ہے" اس نے خالی خالی نگاہوں سے شازمین کی سمت دیکھا
تھا۔

"اماں جی! ابھی سامان باندھ رہی ہوں۔ بس آپ مجھے بھجوا دیں"۔

"ہاں ہاں۔ کہہ تو دیا۔ تیرے سفر کا انتظام ہو جائے تو علی کو بھی فون کروا دوں گی ٹھیک ہے۔ تسلی رکھ"۔

"علیم الدین کو بھی تیری وجہ سے جلدی جانا پڑے گا۔ تیرے بڑے خان اکیلی کو تو بھیجیں گے نہیں"۔

وہ خاموش رہی۔ اسے کسی اور کے مسئلے سے دلچسپی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ اس شخص کو قریب سے ایک مرتبہ پھر دیکھنا چاہ رہی تھی جو اس کے سوکھے دھان جیسے وجود پر ابر بن کے برس رہا تھا۔ اتنا گھمبیر حال کہ اس کی بے ریائی کی طلب بڑھ گئی تھی۔ ضرورت طمع بن گئی تھی۔ اسے کچھ دیئے بغیر بہت کچھ مل رہا تھا۔ ایسا نفع کا سودا کر خسارے کے خیال ہی سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

علی اس کو لینے آیا تھا۔ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس لیے رسمی بات چیت کے علاوہ انہوں نے آپس میں اور کوئی بات نہ کی تھی۔

مگر رسمی بات چیت کے دوران بھی علی اسے بہت دور محسوس ہوا تھا۔ اس لیے اس کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ وہ خود سے کوئی عام سی بات بھی کر لیتی۔

حالانکہ اسے بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے کھانا خود بنایا تھا۔ علی اس کو گھر چھوڑ کر دوبارہ اپنے اسٹیشن جا چکا تھا۔ اور یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ گھر واپس کب آئے گا۔

وہ ہاری کو سلاتے سلاتے خود بھی سو گئی تھی۔ حالانکہ ایسا ارادہ تو نہیں تھا۔

رات کو اچانک آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ریک پر رکھے ٹائم پیس پر نگاہ ڈالی۔ رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔

اس نے ہاری کے ہاتھ پاؤں درست کیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیچے کارپٹ پر اماں بے خبر سو رہی تھی۔

وہ آہستہ سے زینہ اتر کر اپنی خواب گاہ میں آئی۔ خواب گاہ میں روشنی تھی۔

علی جاگ رہے ہیں؟ وہ حیرت سے سوچنے لگی۔

اور دھیرے سے دروازہ کھول کر جھانکا۔ علی اپنے دفتری کام میں مصروف تھا۔ مگر اس نے دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سن لی تھی اور سر اٹھا کر سامنے دیکھا تھا۔

"ہاری کو سلاتے سلاتے میں خود ہی سو گئی پتا ہی نہیں چلا"۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے غیر اہم وضاحت کی۔

"کھانا بھی نہیں کھایا تھا آپ کے انتظار میں۔ آپ نے کھا لیا ہے ناں؟"

وہ وارڈ روب سے علی کا پسندیدہ خوابی کا لباس نکالتے ہوئے بولی۔

"ظاہر ہے آدھی رات گزر چکی ہے۔ ایسا کریں کھانا کھا لیں۔ صبح ہونے میں بہرحال کافی وقت ہے"۔

وہ مصروف انداز میں اس کی سمت دیکھے بغیر گویا ہوا۔

"آپ نے مجھے تو مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟" وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے سوچا آپ تھکی ہوئی ہیں"۔ وہ اسی طرح مصروف انداز میں قلم استعمال کر رہا تھا۔

وہ لباس تبدیل کر کے واپس آئی تو علی کمرے میں نہیں تھا۔ طبیعت اور بھی پریشان ہو گئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اس کے کاغذات کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

تقریباً آٹھ دس منٹ کے وقفے کے بعد دروازہ کھلا اور علی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔

"آپ نے کیا کیا؟" وہ بہت شرمندگی محسوس کرنے لگی۔

"نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کھانا نہیں کھائیں گی۔ کچھ اچھا نہیں لگا"۔ علی نے آگے بڑھ کر ٹرے
لی۔

"اس طرح نہ کریں آپ میرے ساتھ۔ میں اس قابل نہیں تھی"۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"علی جواب میں خاموش رہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ تھوڑا سا سالن پلیٹ میں نکال کر کھا
گی۔ حالانکہ دل تو بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

"آپ... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" وہ ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"الحمدللہ۔ بالکل ٹھیک ہوں"۔ وہاں سے برجستہ جواب آیا۔

"پھر کیا بات ہے"۔ اس نے مزید ہمت کی۔

"کوئی بات نہیں۔ کیوں؟" وہاں انداز قطعی سادہ تھا۔

"جب انسان کچھ کہنا چاہتا ہے تب ہی اس طرح ہوتا ہے"۔ نوالہ اس کے حلق میں اٹک رہا تھا۔

"مثلاً کس طرح کا؟" وہ بہت پرسکون تھا۔

"جس طرح آپ ہو رہے ہیں؟" وہ روہانسی ہو گی۔

"اچھا"۔ مسکراہٹ بہت مصنوعی تھی۔

"کوئی بات نہیں ہے تو آپ فکرمند کیوں ہیں؟" بہت سکون سے سوال ہوا۔

"فکرمندی کی تو بات ہے۔ آپ بہت بدلے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں"۔ وہ بہت ہمت کر رہی تھی۔ مگر دل
تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

"وہم ہے آپ کا۔ دراصل مصروفیت بہت ہے"۔ علی نے سادہ لہجے میں کہا۔

"نہیں وہم نہیں ہے۔ دراصل وجہ جو ہیں ناں یاور خان کی بیگم۔ شازمین نام ہے ان کا"۔

"ہوں... پھر؟" علی نے قدرے دلچسپی ظاہر کی۔ مگر اس کی طرف دیکھا نہیں۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

''وہ میرے پاس آئیں اور بولیں۔ تیمور خان کا فون آئے گا۔ میں بچے کے پاس ہوں وہ باہر ہی کہیں بیٹھی رہیں...
یہاں ہال میں بیٹھی رہو۔ فون آئے تو مجھے بلا لانا۔ اور کسی کو بتانے سے پہلے کہ تیمور خان کا فون آیا تھا''۔

وہ ایک تواتر سے بول رہی تھی۔ علی بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو ہر طرح کی باطنی کشمکش سے صاف تھا۔

''ہوں..... پھر؟'' علی کا چہرہ اس کی گہری سوچ کا مظہر تھا۔

''میں پھر سونے پر بیٹھ کر فون کا انتظار کرنے لگی۔ جب آپ کا فون آیا تو میں ہی گئی..... تیمور خان کا فون آیا ہے''۔ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

''ہوں''۔ علی کی ہوں بہت لمبی اور گہری سوچ کا اظہار تھی۔

''پھر وہ کیسے انسان ہیں تمہاری نظر میں؟'' علی کا سوال قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ بری طرح چونک پڑی۔

''بہت شریف آدمی ہیں۔ اچھے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا؟ آپ کے تو دوست ہیں''۔ وہ حیرانی سے بولی۔

''میں بھی مرد ہوں، وہ بھی ایک مرد ہے۔ ایک عورت کی رائے لینا چاہوں گا کہ کوئی عورت اسے کس نظر سے دیکھتی ہے''۔ علی کا لہجہ عام سا تھا۔

''میں نے تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جیسے حویلی کے دوسرے مرد ہیں، ویسے ہی وہ ہیں''۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''البتہ..... بابا صاحب کی طرح ذرا سخت ہیں۔ غصہ بڑی جلدی آجاتا ہے''۔ وہ مزید گویا ہوئی۔

''ناز بھابی کی شادی تو ان کے سامنے ہی ہوئی ہے۔ حویلی میں پہلے سے آنا جانا تھا ان کا؟'' علی کا سوال بڑا عجیب سا تھا۔ وہ الجھ کر اس کی سمت دیکھنے لگی۔

''میرا خیال ہے نہیں۔ جب میں حویلی آئی تھی تو اس وقت بابر خان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بعد میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ جس سے پتا چلتا۔ وہ حویلی میں پہلے بھی آتی تھیں۔ میرا خیال ہے وہ لوگ بالکل غیر ہیں۔ ناز بھابی کی امی تو بڑی فیشن ایبل ہیں۔ ان کے بال بھی کٹے ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ حویلی میں تو ان کی عمر کی عورتیں ساڑھیاں نہیں پہنتی ہیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غیر لوگ ہیں۔ کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟'' وہ الجھی۔

''یونہی''۔ علی مسکرا دیا۔

''آپ مسکرائے کیوں؟'' وہ کچھ سمجھی نہیں۔

''چلو نہیں مسکراتا۔ برا لگتا ہوں مسکراتے ہوئے؟''

''نہیں''۔ وہ جھینپ گئی۔

''اچھا لگتا ہوں؟'' وہ شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

حمیرا کے سر سے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا تھا۔ اس نے حیا آمیز انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اور پھر زندگی بے حد مصروف ہو گئی۔ علی نے بھی ترقی کے کئی مدارج طے کیے اس دوران کئی شہروں میں ٹرانسفر ہوئے۔ حال ہی میں وہ نواب شاہ آئے تھے۔ ایس پی کی حیثیت سے علی نے چند روز ہوئے چارج سنبھالا تھا۔ حویلی میں تو وہ کئی مرتبہ گئی مگر ایک دو دن سے زیادہ قیام نہیں رہا۔ علی کے ساتھ گئی اور اسی کے ساتھ واپس آگئی۔

حال ہی میں جواد کی سالگرہ کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اس کے ساتھ حویلی کی تقریبات کے سارے منظر گھوم گئے..

بے بس سی ہو گئی۔ اور پھر تقریب بھی کراچی میں تھی۔ علی نے تو اپنی مصروفیات کی بنا پر جانے سے انکار کر دیا البتہ انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی ضروری شاپنگ بھی کرا دی۔ ایک عرصے کے بعد اس نے سسرال میں قدم رکھا تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ گئی تھی۔ اماں جی تو اسے دیکھ کر یوں خوش ہوئیں جیسے برسوں بعد جاں بلب بیٹی لوٹ آئی ہو۔

نازنین ماں بن کر کچھ اور نکھر گئی تھی۔ دوسرے بچوں کا بھی خاندان میں اضافہ ہو چکا تھا۔ تزئین کی ہنسی اسی طرح جلترنگ بجا رہی تھی۔

ہادی کے ساتھ کھیلنے کو اب کئی بچے تھے جنہیں گودوں میں دیکھا تھا وہ بھاگتے پھر رہے تھے اور کئی ایسے تھے جنہیں وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

اسے وہی گیسٹ روم ملا تھا جس میں اس نے شادی کی پہلی رات گزاری تھی۔

"تو یہ ... مطربہ ... تم تو بالکل ہی بگڑ گئی۔ تیری فیکٹری میں کچھ نہیں بنا ابھی تک؟" تزئین نے چھیڑا۔

"تو یہ بھی جان!" وہ بھری محفل میں ٹوکے جانے پر لال لال ہو گئی۔

"علی نے تو نہیں کہا۔ ایک ہی ٹھیک ہے۔" روشن آرا نے اصل کھوج لگانے کی کوشش کی۔

"نہیں وہ تو نہیں کہتے۔ وہ تو کہتے ہیں" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گئی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

"ہاں ... ہاں۔ کیا کہتے ہیں" نازنین نے اس کی بات پکڑی۔

"کچھ نہیں" اپنی حماقت پر وہ بری طرح خجل ہو رہی تھی۔

"ہمیں بھی نہیں بتائے گی" تزئین نے مصنوعی خفگی ظاہر کی۔

"وہ خاموش رہی۔

"مجھے پتا ہے وہ کیا کہتا ہو گا" روشن آرا نے اطمینان سے کہا۔

"کیا؟" وہ سب سنجیدگی سے ان کی سمت دیکھنے لگیں۔

"یہی کہ بھنڈیوں نے مجھے اپنے قبیلے سے نکال دیا۔ اب میں اپنا قبیلہ الگ بناؤں گا" وہ اتنے اعتماد اور سنجیدگی سے بولیں۔ گویا ان کے سامنے ہی یہ بات ہوئی ہو۔

بے ساختہ قہقہے برسنے لگے تھے۔

"تو آپا دیر نہیں ہو گئی کچھ؟ اتنی دیر سے قبیلہ بننا شروع ہوا تو مسئلہ ہو جائیگا۔ اسے تو بڑی دیر تک کام کرنا پڑے گا۔"

تزئین فکرمندی سے گویا ہوئیں۔

ایک مرتبہ پھر ہنسی کا طوفان برپا ہوا تھا۔ مطربہ کا چہرہ گلال ہو گیا۔

"ارے لڑکیوں! کتنے بجے کا جہاز ہے تیمور کا؟" اماں جی ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

"اماں جی! رات دو بجے کی فلائٹ ہے۔ گھر پہنچتے پہنچتے انہیں چار بج جائیں گے۔ آپ آرام سے سو جائیں۔"

رحیم بیگم نے انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ مطربہ گہرے جامنی رنگ کا بھاری کامدار آنچل سر پر رکھ رہی تھی۔
ہاتھ ایک لمحے کو فضا ہی میں معلق ہو کر رہ گیا۔

ماحول پر یکلخت دھند سی چھا گئی۔ اسے اپنے آپ سے خوف آنے لگا۔ یہ روز کوئی نہ کوئی بات ہی ہو جاتی تھی۔ ہر بیان پچھلے دن سے کچھ مختلف ضرور آ جاتا تھا۔ دن کی شکل کچھ اور رات کی کچھ ہوتی تھی۔ اسے ڈھیر سارے ... کے بیچ گہرے رنگ کا منظر کیوں نہیں بدلتا۔ نہ دھندلاتا ہے۔

کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اس کے مختلف رنگ اس کے سامنے موجود ہونے کا احساس دلا رہے ہیں۔

اس نے ڈھیر سے آنچل سر پر جمایا۔ ذہنوں پر بھی گھر کر میں پھر کھچاؤ محسوس ہونے لگا۔

"کہاں چلی مطربہ؟" وہ لمحے بھی کی آواز پر ابھریں۔

"ہادی کو دیکھتی ہوں۔ کہیں اٹھ نہ گیا ہو" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ امتحان کی تاریخ کا غیر متوقع اعلان ہو گیا تھا۔

اسے امتحان سے پہلے کی تیاری درپیش تھی۔

"خالہ سو آنے دو کہاں آپ بیٹھیں۔ آج تو ہم تم سے باتیں کریں گے" تزئین کے انداز میں اصرار تھا۔

"نہیں جب وہ جاگ جاتا ہے تو میرے بغیر بہت گھبراتا ہے" اس کا انداز بھی قطعی تھا۔

"یوں کیوں نہیں کہتی کہ تمہیں خود نیند آ رہی ہے" وہ خفگی سے گویا ہوئیں۔

"واقعی بی بی جان! مجھے نیند آ رہی ہے۔ سفر کی وجہ سے تھکن بہت ہے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو بہت فریش لگ رہی تھی" نازنین نے حیرانی سے کہا۔

"نیند تو نیند ہے۔ پوچھ کر تھوڑا ہی آتی ہے" وہ بے دلی سے مسکرائی۔

"ارے سونے دو اسے۔ کیوں زور ڈال رہی ہو" اماں جی نے محبت سے اس کی سمت دیکھا۔

"تو بھی تھکنے لگی مطربہ؟" خالہ سوہا آنے نے منہ سے پان نکالتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"انسان ہی تھکتے ہیں خالہ" وہ اداسی سے مسکرائی جیسے گہرے بادلوں کے بیچ ذرا سی دھوپ چمکے۔

"ناز ... ہم تو سوچ رہے تھے تم سے گپ شپ سنیں گے" روشن آرا نے مایوس انداز میں شکست کا اعتراف کیا۔

"گپ تو میں تمہیں سناؤں گی۔ لیکن آج نہیں۔ کل" اس کا انداز واضح اور قطعی تھا۔

"ہیں ... وہ کیوں؟" سب کی سب چونک کر رہ گئیں۔

"کہیں علی ناراض نہ ہوں۔ بقول اماں جی کہ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھر بگڑ جاتے ہیں" وہ بہت آہستہ انداز میں بات کر رہی تھی۔

"خدانخواستہ" اماں جی تو دہل کر رہ گئیں۔

"تو ... علی کو بتانے کو کون کہتا ہے" نازنین نے کہا۔

"پھر بھی۔ ان سے چوری تو ہوئی نا؟"

ایک دم بجلی روشن ہو دعیا تھا اس کے قلب سے نمودار ہوا۔ ایک طمانچہ اس کے رخسار پر رسید کیا۔ وہ تھرا کر رہ گئی۔

"آپ لوگ مجھے معاف کر دیجئے۔ پھر سارا دن کی شکل ان کا خون آئے گا تو پھر لوں گی"۔ وہ ساری سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

"واہ صاحب! کیا اطاعت ہے۔ سیدھی جنت میں جائیں گی"۔ روشن آرا نے ہنس کر کہا۔

"ہاں تو اچھی بات ہے ناں۔ اپنے مرد کا خیال رکھنا چاہیے"۔ اماں جی نے اس کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے کہا۔

"بہت ہی سیدھی ہیں اماں جی! آپ بھی۔ اس طرح کی گھریلو عورتوں میں تو سب جگہ چلتا ہے۔ کسی کی آواز بھی ہوتی ہے تو اس سے کانا سن لیتے ہیں مگر لگتا ہے کہ یہ بہت گہری ہو گئی ہے۔ ہمیشہ کیلئے اندر سے اداس۔ اس کی 'بے خبری' اس کا سب سے بڑا المیہ تھی"۔

نرمین کا تجزیہ دل کو لگ رہا تھا۔

محفل میں عجیب اداسی اتر آئی تھی۔

رات نیند بار بار ٹوٹی تھی۔ اور صبح ہادی کے جلد اٹھ جانے کی وجہ سے اسے بھی اٹھنا پڑا تھا۔ کوٹھی میں سناٹا طاری تھا۔ یوں لگتا تھا سب سو رہے ہیں۔ وہ ہادی کی انگلی تھام کر کچن میں آ گئی تھی۔ صابرہ معمول کی مصروفیات میں لگی تھی۔

"ناشتہ کریں گی مطربہ؟" وہ اس کی شکل دیکھتے ہی گویا ہوئی۔

"نہیں خالہ! مجھے تو بس ایک کپ چائے دے دو۔ البتہ ہادی کو ناشتہ کرا دوں گی۔ ایک انڈہ ابال دو۔ سلائس میں تو بس سینکتی ہوں"۔ وہ تھکے تھکے انداز میں ہادی کو کرسی پر بٹھا کر ٹوسٹر آن کرنے لگی۔

"میں کروں گی سب۔ رہنے دو"۔ صابرہ نے ٹوکا۔

"کوئی بات نہیں خالہ۔ اتنے میں تم ایک کپ دودھ ٹھنڈا کر لو۔ چینی بھی ڈالنا"۔ وہ اسی کیفیت میں گویا ہوئی تھی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں لگتی تیری"۔ صابرہ غور سے اس کی شکل دیکھ کر بولی۔

"نہیں ٹھیک ہوں"۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"گھر والا یاد آ رہا ہو گا؟" صابرہ نے ماحول خوشگوار کرنے کی کوشش کی۔

"وہ بھولتا ہی کب ہے۔ وہی تو اب راستے کی روشنی ہے۔ کیسے بھولوں؟" وہ یاسیت سے گویا ہوئی۔

"آج تو سب دیر سے اٹھیں گے۔ تیمور خاں رات ساڑھے تین بجے آئے تھے۔ سب صبح تک جاگتے رہے۔ اب دیکھو ناشتہ کتنے بجے ہو گا"۔ صابرہ جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔

اس کا دل پھر بڑی زور سے دھڑکا۔ "آ گئے"۔ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ماشاء اللہ بڑی اچھی صحت ہو رہی ہے۔ بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ کالے کوٹ پتلون میں"۔

صابرہ کے انداز میں جانثار ملازم کا وارفتہ بے لوث تاثر تھا۔

اس کے سامنے دیوار پر ایک عکس روشن ہو گیا۔ وہ جلدی سے ہادی کی سمت آئی۔ وہ گڑگڑوں کی سرگرمیاں دیکھ

وہ تھا اس کے عاشق معصوم انداز پر اسے بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس نے ہادی کا رخسار چوم لیا۔

"اللہ نظر سے بچائے۔ بڑا نصیب والا بچہ ہے۔ قسمت سے ہی سوتیلی ماں اچھی ملتی ہے"۔ صابرہ کو اس کی سادگی اچھی لگی۔

"یہ تو قرعے سے جیت جاتے ہیں اس کے باپ نے مجھ سے۔ بہت ہوشیار ہے۔ جیتنا آتا ہے"۔

وہ تو بس پھنس جاتے ہوئے عجیب ادا سے انداز میں مسکرائی۔

"وہ ہادی کیا جو صورت کو جیت گئے"۔ صابرہ دودھ میں چینی ملاتے ہوئے ہنسی۔

"بعض لوگ تو کھیل میں شریک ہوئے بغیر بھی جیت جاتے ہیں"۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"تیری بات سمجھ میں نہیں آئی"۔ صابرہ تعجب سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"وہ عاشق رہی اور ہادی کو ناشتہ کرانے لگی۔

"ویسے اس کا باپ تو خوش ہے اس تھے سے؟" صابرہ نے جانے کیوں پوچھا۔

"بس وہ تو خوش ہے"۔ وہ پھر عجیب انداز میں مسکرائی۔

"کیوں تو خوش نہیں ہے؟ اتنا تو افسر ہے وہ تو"۔ صابرہ کو حیرت ہوئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ میں بھی خوش ہوں۔ بلکہ مارے خوشی کے برا حال ہے"۔ وہ کھلکھلائی۔

صابرہ بھی اس کی بے جھجکی پر مسکرا دی۔

"اسے کہتے ہیں بھاگ جاگنا۔ جب دل مل جائیں"۔ وہ گویا ہوئی۔

"اچھا؟" اس کا چہرہ یکلخت سپاٹ ہو گیا تھا۔

وہ ہادی کو نہلا کر خود بھی نہا دھو کر باغ میں چلی آئی تھی۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ چمکیلی دھوپ نے باغ میں بہت حسن پیدا کر دیا تھا۔ ابھی دھوپ میں تیزی نہیں تھی۔ وہ ہادی کے ساتھ بیٹ بال بھی لائی تھی۔ چھوٹا سا اور اس کا واحد گھوڑا بھی لے کر جانے کس موڈ میں کیا طلب کر بیٹھے۔ بیٹ بغل میں تھا اور گھوڑا سینے سے لگا ہوا تھا۔ اور چھوٹی سی گیند ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی جگہ جگہ ہادی پیچھے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ بہت ہی دلچسپ منظر تھا۔

"امی۔۔۔ گھوڑا۔۔۔ گھوڑے پہ بیٹھوں گا"۔ وہ بھاگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بیٹا گھوڑے پر بیٹھ کر کرکٹ نہیں کھیلی جاتی۔ البتہ گھوڑے پر بیٹھ کر ہاکی کھیلتے ہوئے تصویروں میں دیکھا ہے"۔ وہ ہنستی ہوئی کہتی جا رہی تھی "اب تو وہ گھوڑے پر بیٹھتا ہے یا کرکٹ کھیلتا ہے"۔

"اسے پولو کہتے ہیں۔ جس کی آپ بات کر رہی تھیں یعنی گھوڑے پر بیٹھ کر ہاکی کھیلنے کی"۔

سامنے کی سمت سے ایک وضاحتی جملہ کانوں تک آیا۔

وہ بری طرح چونک پڑی۔ بھلا یہ آواز نہ پہچانتی۔

"السلام علیکم خان!" سامنے تیمور علی خان اسے نئے انداز میں دیکھ کر خفیف سا مسکرا رہے تھے۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہے۔ لگتا ہے بہت دوستی ہو گئی ہے بچے سے؟" انہوں نے بچے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"دوستی تو ہماری بس اپنے آپ سے ہے۔ دوستی بہت جلدی ہو جاتی ہے سب سے"۔ وہ خود کو سنبھال کر بہت دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔
"علی کیسا ہے؟" انہوں نے سبز کپڑوں میں ملبوس بھیگے بالوں والی مطربہ کو بغور دیکھا تھا۔
"اچھے ہیں۔ خوش ہیں"۔ اس نے خاصی بے توجہی سے جواب دیا۔
"یعنی تم نے خوش رکھا ہوا ہے۔ گڈ"۔ انہوں نے کسی استاد کی طرح شاباشی دی۔
"آپ کا، اماں جی کا حکم ہے"۔ اس نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔
"یعنی تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم اپنے شوہر کا خیال رکھو"۔ انہوں نے تعجب سے سوال کیا۔
وہ خاموش رہی۔
"ہماری اس سے دو تین بار فون پر بات ہوئی۔ ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ وہ تم سے بہت خوش ہے اور تم اس کے بیٹے سے بہت پیار کرتی ہو"۔
"اتنا پیارا بچہ ہے۔ اسے تو سب ہی پیار کرتے ہیں۔ پھر میں کیوں نہ کروں گی کہ یہ اس شخص کی اولاد ہے جس نے مجھے عزت دی"۔ وہ زیر لب انداز میں مسکرا رہی تھی۔
تیمور علی خان نے اس کی سمت ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ان کے سامنے وہ الہڑ مطربہ نہیں تھی بلکہ ایک سمجھ دار بیوی کھڑی تھی۔
"یعنی بات عقل میں آ گئی۔ اچھی بات ہے"۔ وہ اظہار خیال کرنے لگے۔
"بعض لوگ دو زندگیاں گزارتے ہیں خان ایک عقل کے ساتھ۔ ایک دل کے ساتھ۔ اور یہ بڑا مشکل کام ہوتا ہے"۔
وہ گھاس پر بیٹھ کر باری کے گھوڑے کو دیکھنے لگی۔
تیمور علی خان ایک جانب کو دم بخود سے رہ گئے۔ انہیں ہرگز یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مطربہ ہے۔ بڑی ہی لاابالی سی و بے خوف۔ مگر بہت ناراض ناراض سی۔ کیوں؟
وہ گھنے جنگل میں شکار کھیلتے تھے مگر اس کیوں کے صحرا سے انہیں ہمیشہ خوف آتا تھا۔ وہ اس کی سرحدوں کے پاس سے بھی گزرنا نہیں چاہتے تھے۔ تھوڑی بہت خود غرضی سب ہی کو جائز ہے۔
"تو یہ بے وقوفانہ حرکت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیوں خود کو مشکل میں ڈالتی ہو۔ اسے اچھے پارٹنر کے ساتھ تو یوں بھی زندگی بہت آسان ہو سکتی ہے"۔
وہ اپنے فطری مالکانہ سبھاؤ سے گویا ہوئے حالانکہ اب وہ ان کی کنیز نہیں تھی۔
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بچے کی طرف ساری توجہ کر لی۔ تیمور علی خان کو اس کے اس انداز سے بڑا احساس توہین ہوا۔ مگر برداشت کیا کہ اس مقام تک وہ اسے خود ہی تو لائے تھے۔ وہ بے اماں زندگی [illegible]

بی بی جان علی حیدری کی بیگم تھیں۔ سخت مشکل مرحلہ تھا۔ وہ الٹے قدموں کھڑے ہوئے۔ وہ یوں گم سی تھی جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں تھے۔

وہ اماں جی کو ڈھونڈتی ہوئی ڈائننگ ہال میں آئی تھی۔ وسیع و عریض ڈائننگ ٹیبل پر تیمور علی خان اور نازنین آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ جھجک کر رک گئی تھی۔
"آؤ مطربہ۔ کوئی کام؟" نازنین فوراً متوجہ ہوئی۔ کسی بات پر دونوں مسکرا رہے تھے۔ مسکراہٹ کا تاثر ابھی تک نازنین کے چہرے پر تھا۔
"جی۔ وہ اماں جی کو دیکھ رہی تھی"۔ وہ جانے کیوں گڑبڑا رہی تھی۔
"کہاں چلی گئیں اماں جی۔ ابھی پچھلے برآمدے میں تو تھیں"۔ نازنین نے کہا۔
"جی پیچھے تو نہیں ہیں۔ سب جگہ دیکھ لیا"۔ وہ پلٹنے لگی۔ اسی دم ڈائننگ روم میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
"مطربہ ذرا فون سننا۔ شاید اماں جی کا ہے"۔
نازنین نے گھوم کر اسے مخاطب کیا۔ ڈائننگ اور ڈرائنگ کے بیچ صرف ایک پردہ تھا، وہ بھی ہٹا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو"۔
"کیا حال ہے بیگم صاحبہ کے"۔ دوسری طرف علی کی شوخ آواز ابھری۔
"السلام علیکم"۔ شوخی کا جواب بڑا سادہ سا تھا۔
"کیا ہو رہا ہے؟"
"کچھ نہیں۔ اماں جی تو اب مجھ سے کوئی کام کراتی نہیں ہیں۔ یہاں والوں کا خیال ہے آپ برا مانیں گے"۔ وہ بہت آہستہ آواز میں بات کر رہی تھی۔
"بالکل برا مانیں گے۔ بہت سمجھدار ہیں حویلی کے لوگ"۔ اسی سادہ انداز میں علی کی چہک تھی۔
"مجھے پتا ہے۔ مگر یہ سب لوگ مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں"۔ وہ مسکرائی۔
"سب کی محبتوں کا ٹھیک ٹھاک اندازہ ہے سوائے ہماری محبت کے"۔ وہ دھیرے سے پیار کرنے لگا۔
"اوں...... ہوں...... اکیلی نہیں ہوں میں ادھر"۔ اس نے گھبرا کر ٹوکا۔
"کون کون بیٹھا ہوا ہے؟" لاپروائی کے انداز میں سوال ہوا۔
"تیمور خان آئے ہوئے ہیں۔ اپنی بھابی سے باتیں کر رہے ہیں"۔
اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔
"پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ بلاؤ تیمور کو"۔
"خان آپ کو بلا رہے ہیں"۔ اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے کہا۔

"کون؟" وہ اٹھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"یہ ہیں"۔ اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا اور ریسیور واپس کر دیا۔

"خاندان تو چھوٹا ہی تھا۔ تم ابھی چھوڑ دو یار نم؟" تیمور علی خان نے مسکرا کر گفتگو کا بے ساختہ آغاز کیا۔

"کیا مطلب؟" علی کے لہجے میں حیرت آمیز استفسار تھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کی بیگم صاحبہ سے پوچھا۔ فون پر کون ہے تو فرماتی ہیں۔ نان (Noun) تم پرو نان (Pro Noun) سے گزارا ہو رہا ہے"۔

"بس یار! ہم تو اسے بھی ادا ہی کہتے ہیں۔ اس قدر حسین ہو تو پھر ہر ادا ہی جچتی ہے"۔ علی کا قہقہہ بلند ہوا۔

"بس اپنی اپنی قسمت بھی ہے۔ تم تو ڈارلنگ کہہ کر ماشاءاللہ بلاتے جاؤ گے اور ہمیں "یہ"، "وہ" پہ گزارا کرنا پڑ رہا ہے"۔

وہ تیمور کو ہنستا مسکراتا اور زمین کو فون بند ہونے کا منتظر چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی۔

سالگرہ کا ہنگامہ رات گئے تک جاری رہا۔ اس نے کھانا بھی لیٹ کھایا تھا اور شاید پانی پیے بغیر ہی سو گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ نہایت گہری نیند سے چونک کر جاگی تو دھیان آیا شاید پیاس لگی ہے۔

اس نے ٹیبل پر رکھے جگ کی سمت دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اس وقت نہایت ٹھنڈا پانی پینے کی خواہش ہو رہی تھی۔ وہ زینہ اتر کر نیچے آئی تو یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی کہ لاؤنج اور ڈرائنگ روم کی لائٹیں روشن تھیں اور دھیرے دھیرے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ دل تو پہلے ہی گھبرا رہا تھا اس کی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی۔

اس نے کھڑکی کے شیشے سے یونہی چلتے چلتے جھانکا تو حیرت سوا ہو گئی۔

اماں جی، بابا صاحب اور تیمور علی خان نہایت فکرمندی بلکہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے وحشت سی ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ اور بلا ارادہ دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی۔

"کیا ہو گیا اماں جی۔ اتنی رات ہو گئی آپ سوئیں نہیں ابھی تک؟"

اسے ان کا چہرہ دیکھ کر ڈر سا لگنے لگا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ مرجھائی ہوئی کلیاں ابھی تک اس کے بالوں میں جھول رہی تھیں۔ مٹے مٹے میک اپ کے نشان باقی تھے۔ نیند سے جاگنے کی وجہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پپوٹے بوجھل تھے۔

"ادھر آ میری بچی۔ میرے گلے سے لگ جا" اماں جی کی آواز بھرا رہی تھی۔

"اوں ۔۔۔ ہوں۔ کیا کرتی ہیں آپ۔ بچی ہے۔ رات کا وقت ہے"۔ بابا صاحب کا ٹہوکا تھا۔ تیمور نے بھی بے قراری سے پہلو بدلا۔

اس کا دل بیٹھ گیا۔ "کیا ہوا اماں جی؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کچھ نہیں"۔ بابا صاحب نے تیمور کی سمت دیکھا۔

"کچھ نہیں تو آپ سب اتنی رات کو کیوں جاگ رہے ہیں؟" اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"اسے نہیں بتائیں گے تو کیا کالے چور کو بتائیں گے"۔ اماں جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"بتائیے نا خان! کیا ہوا ہے؟" اس کی نیند ایک دم ہوا ہو گئی تھی اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ جانے کیوں اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہے اس کی ذات سے متعلق ہے۔

"بات یہ ہے کہ علی زخمی ہو گیا ہے۔ ڈاکوؤں سے مقابلے میں۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے"۔ تیمور علی خان نے ٹھہر ٹھہر کر دلاسے کے انداز میں بتایا۔

اسے رتی برابر ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اماں جی کے چہرے پر لکھی اور ہی کہانیاں تھیں۔ وہ وحشت بھری نظروں سے صرف انہی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

بعض اوقات چہروں سے اتنا روشن اور تیز سچ جھلکتا ہے کہ الفاظ کھوکھلے اور بے جان محسوس ہوتے ہیں۔ وہ بھاگ کر اماں جی کے نزدیک آئی اور قالین پر بیٹھ کر ان کے گھٹنے تھام لیے۔

"اماں جی! مجھے بتائیں نا۔ کیا بات ہے؟" اس کے حلق سے اٹکتی آواز نکل رہی تھی۔

اماں جی کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک کر جھریوں میں گم ہو گئے۔ اور اسے زور سے بھینچ کر وہ ہاں ہی ہوت گئے۔ اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔

"سحر بیٹی! حوصلہ رکھ۔ خبردار جو تو نے کسی کے کہنے پر چوڑیاں اتاریں۔ یہ سب جاہلانہ رسم و رواج ہیں۔ سچی بات ہے تیری کلائیاں ان رنگ برنگی چوڑیوں سے"۔ اماں جی اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

وہ ایک پتھر کی سل کی طرح ان کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں صحرا کی طرح خشک تھیں اور تیمور علی خان پر جمی ہوئی تھیں۔

"اب بتایا ہے تو اسے رلاؤ بھی۔ ورنہ اس کی جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں"۔

بابا صاحب نے اداس آواز میں گمبھیر خاموشی توڑی۔

"سحر"۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بیٹی! بہت سی عورتیں یہ دکھ اٹھاتی ہیں اور پھر تیز دھوپ میں بڑے حوصلے سے راستہ کاٹتی ہیں۔ دکھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جھیلنا تو پڑتا ہے"۔ اماں جی نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر گلوگیر آواز میں سمجھایا۔

"علی چلے گئے اماں جی؟" اس کی آواز بہت گہرے کنویں سے آئی۔

"سب نے جانا ہے بیٹی!" وہ رو پڑیں۔

"وہ تو جب جانا ہے جانا ہے۔ مگر آپ خان سے پوچھیے۔ انہیں کھیلنے کو میں ہی ملی تھی؟ آپ انہیں کوئی بڑی سی گڑیا دیتیں۔ اماں جی۔ یہ میرے دل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ ذرا ان کی طرف دیکھیے قصائی نظر آ رہے ہیں۔ اماں انہیں ہر وہ بات پسند ہے جس سے میرا دل کانپ جائے۔ جس سے میری آواز کمزور پڑ جائے۔ جس سے میری آنکھیں خون روئیں۔ جو مجھے راتوں کو رلائے جگائے۔ آپ کو پتا ہے آج ان کی خوشی سے بری حالت ہو گی۔ اماں جی

اس میں رہ بھی رہی ہوں"۔

وہ بلک بلک کر رو دی۔

تینوں اپنی جگہ دم بخود سے بیٹھے تھے جیسے حرکت محال ہو۔ بابا صاحب الجھی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"اماں جی! مجھے تو پڑھنے کا شوق تھا۔ یہ وہ کیوں پڑ گیا ہے؟ اماں جی میں بیٹے کی گلیاں بنوں گی۔ میں نہیں بنوں گی سفید کپڑے۔ خان۔ میری جان کے دشمن۔ اللہ کرے۔"

"ہوش کر مطربہ!" اماں جی نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کلیجہ کانپ کر رہ گیا تھا ان کا۔

"بیٹی وہ کسی سے پوچھ کر تھوڑی نہیں لکھتا۔ تیرا خان اسے تیرے لئے خوشی خوشی ما کر لایا تھا۔ تیرا گھر بسایا تھا جی۔"

"میرا دل اجاڑ دیا تھا اماں جی"۔ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

بابا صاحب کو ایک گہری چپ نے گھیر رکھا تھا۔ تیمور اپنی انگلیاں چٹخا رہے تھے۔ نہایت اضطراری کیفیت تھی۔

شاید کوئی اور موقع ہوتا تو دلاور علی خان اس کی زبان پر انگارہ رکھوا دیتے مگر اب یہی سمجھا جا رہا تھا کہ پوتی کے صدمے سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔

"یہی لائے تھے اسے میرے لئے۔ انہوں نے قسمت کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تو یوں بھی گولی کے نشانے پر تھے۔ وہ کہتا تھا کہ مہندی اس کے نام کی گولی سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے مذاق میں کہتا تھا۔ کبھی بھی خدا حافظ کر سکتا ہوں۔ ہر ملاقات کو آخری سمجھا کرو۔ وہ ڈاکوؤں کی گولی سے نہ مرتا تو مہندی اسے مار دیتے۔ اماں جی انہوں نے اجاڑنے کیلئے بسایا تھا۔ اماں جی انہیں مجھ سے بہت چڑ ہے۔ انہیں میرا ہر کام غلط لگتا تھا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں کا غصہ نکالا ہے انہوں نے مجھ پر۔۔۔ ہائے میرے اللہ۔ علی"۔

وہ بری طرح دھاڑیں مار مار کر رو دی۔

"تیمور!" بابا صاحب کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جی بابا صاحب"۔ وہ کسی دھیان سے چونکے۔

"بیٹے! تم اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ جاؤ اور پتا کرو میت یہاں کب تک پہنچے گی"۔

وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے مگر اس نے سن لیا۔

"میت۔۔۔۔ ہائے اماں جی!" وہ تیورا کر قالین پر ڈھے گئی تھی اور اسی لمحے دوسرے گھر والے اقبال وغیرہ اندر داخل ہوئے تھے۔ سب سے آگے بدحواسی کے عالم میں خالہ سوہا آئی تھیں۔

"کیا ہوا اماں جی؟" تزئین حواس باختہ نظر آ رہی تھیں۔

"پانی لاؤ سوہا آنٹی۔ اسے ہوش میں لاؤ"۔ اماں جی نے جیسے تزئین کی بات نہیں سنی۔ خالہ سوہا [illegible] گئیں۔

"اماں جی۔۔۔ بابا صاحب کیا ہوا ہے؟" تزئین بیگم کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"علی۔۔۔ اب دنیا میں نہیں ہے بیٹی"۔ بابا صاحب نے بہت وقار سے مضبوط لہجے میں سب کے سروں پر بم پھوڑا۔

"ہیں اماں۔۔۔ کیا؟" مختلف قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"کس نے بتایا؟" تزئین نے بہت دکھ سے مطربہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"فون آیا تھا اس کے اسٹیشن سے۔ وہاں گھر پر کیا ہوگا۔ ملازم نے یہاں کا نمبر دیا ہوگا"۔ تیمور نے بتایا تھا۔

انہوں نے بیوی کی سمت ایک نگاہ اپنے مخصوص انداز میں ڈال کر جواب دیا۔

"ہمیں بہت دکھ ہوا۔ بڑی زندگی گزری ہے۔ جتنا غم کرے کم ہے"۔ وہ دھیرے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"اللہ ہے صبر دینے والا۔ ورنہ مرنے والے کے ساتھ مر جائیں لوگ۔ مجھے تو فکر لگی ہے۔ اس کا دماغ نہ پلٹ جائے"۔ اماں جی بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

اسی دم خالہ سوہا آنے جگ گلاس لئے ہوئے تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔ تزئین بیگم نے جگ ان کے ہاتھ سے لیا اور جلدی جلدی اس کے منہ پر چھینٹے ڈالنے لگیں۔ تزئین بھی دونوں ہاتھوں سے اس کے رخسار تھپتھپا رہی تھیں۔

"مطربہ۔۔۔ اٹھو۔۔۔ دیکھو۔ یہاں سب ہیں۔ دیکھو اماں جی بہت پریشان ہو رہی ہیں۔ شاباش"۔

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ہوش میں آئی۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہم میڈیکل ٹریٹمنٹ کرتے ہیں"۔ تیمور باہر نکل گئے۔

"ہائے۔۔۔ کیسی مشکل آن پڑی ہے بچی پر"۔ اماں جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"آپ اپنے آپ کو سنبھالو تزئین کی ماں۔ ورنہ بچی کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا"۔

دلاور علی خان کو بیوی کے بہتے آنسوؤں سے اور طرح کی پریشانی لاحق ہوئی۔

"میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ شام کو نیلی ستاروں بھری ساڑھی میں کیسی ہنستی کھیلتی پھر رہی تھی۔ ستاروں کی طرح کی جوت تھی۔ کہہ رہی تھیں۔ ایسا حسن نہیں دیکھا۔ کہیں کوئی کمی نہیں۔ نظر لگی ہے غریب کو"۔

"اماں جی۔ پلیز آپ ایسے نہ بولیں"۔ تیمور علی خان اندر داخل ہوتے ہوئے گویا ہوئے۔

"اس طرح تو وہ دوبارہ بے ہوش ہو جائے گی"۔

"تیمور ٹھیک کہہ رہا ہے تزئین کی ماں؟"

تیمور نے روئی میں کوئی دوا لگا کر اس کے نتھنوں کے قریب کی۔ مطربہ نے تڑپ کر چہرہ ادھر ادھر کیا۔ پھر دوبارہ ساکت ہو گئی۔

تیمور نے پھر عمل دہرایا۔ مطربہ کے جسم میں زور سے جھٹکا لگا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تیمور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مطربہ! اٹھو شاباش!" تزئین نے بہت پیار سے کہا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا

"بی بی جان!" وہ ان کے شانے سے لگ کر پھر بلک بلک کر رو دی۔ ترتین کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ گئے۔
تیمور علی خان فوراً باہر نکل گئے۔

"یہ کہاں گئے ہیں۔ کیا علی کو لینے گئے ہیں"۔ وہ زور سے چیخی۔

اماں جی اپنی جگہ سے اٹھیں۔ "خود کو سنبھال بیٹی چل اپنے کمرے میں"۔

"اٹھو"۔ زبیدہ بیگم نے بھی اسے اٹھایا۔

"بی بی جان! اسے اوپر نہ لے کر جائیں۔ بچہ اٹھ گیا تو اور مشکل ہو جائے گی"۔ ترتین نے زبیدہ بیگم سے کہا۔

"ہاں ٹھیک کہتی ہو چلو اسے میرے کمرے میں لے چلو"۔ ترتین نے زبیدہ بیگم کے ساتھ مل کر اسے بمشکل کھڑا کیا۔

"بی بی جان! ہادی کو تو بتا دیں کہ اس کا باپ تیزی دکھا گیا۔ ہائے اماں جی میں بچے کو کیا کہوں گی؟"

وہ بے ربط ہو گئی۔ وہ سب خاموش رہیں۔

"کیا کرتے ہیں بچے کا۔ تیرے مرد کی اولاد ہے۔ تو رکھے گی اس کا خیال اور کون رکھے گا"۔ اماں جی نے دکھ سے کہا۔

وہ باہر آئیں تو دیکھا تیمور علی خان پشت پر ہاتھ باندھے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔

"وہ بچہ مجھ سے زیادہ ان کا ہے۔ انہیں دے دیں۔ یہ لائے تھے ناں؟ انہوں نے ہی [illegible] میں۔ انہی کے ہوتے سوتے کا ہے وہ بچہ۔ میرا کچھ نہیں لگتا"۔

وہ تیمور علی خان پر نظر پڑتے ہی پھر ہذیانی ہو گئی۔

"اب دیکھیے گا۔ اگلے ایک دن میں نے بھی اپنے گلے میں پھندا ڈال کر دکھایا انہیں۔ دیکھیے گا آپ سب دیکھیے گا کتنا خوش ہوں گے"۔

وہ پھر بے ہوش ہو کر زبیدہ بیگم کے بازوؤں میں آ رہی۔

تیمور علی خان نے ماں کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو اسے بتا دیا تھا کہ میت یہیں آ رہی ہے۔ اچانک دیکھتی تو اور برا ہوتا"۔ وہ شرمندگی سے وضاحت کرنے لگیں۔

قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ جنازہ برآمدے میں تھا۔ غسل دیا جا چکا تھا، ماحول میں کافور اگربتی کی خوشبو سوگواریت پھیلا رہی تھی۔

عطیہ بڑی سی کالی چادر اوڑھے کمرے میں بت بنی بیٹھی تھی۔ اور بچے ہی کا انتظار ہو رہا تھا کہ روانگی کے سارے انتظامات مکمل تھے۔ ترتین اسے دو مرتبہ بچے آنے کا کہہ آئی تھیں اب اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اسے بلا لے۔

بابا صاحب بار بار گھڑی دیکھتے تھے پھر اماں جی کی طرف دیکھتے تھے مگر وہ کیا کر سکتی تھیں۔

آدھا گھنٹہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔

ہادی خانساماں کے پاس تھا۔

تھوڑی دیر بعد بیرونی قدموں کی چاپ ابھری۔ سب نے چونک کر سر اٹھائے تھے۔ قیامت حسن سیاہ چادر میں سوگ منائے ہوئے نکھرے ہوئے رنگ میں آ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی جنازے کے قریب پہنچی۔ سب کے دل تیز تیز دھڑکنے لگے۔

پھولوں میں گھرا علی کا چہرہ دیکھ کر احساس ہوتا تھا گویا گہری نیند سو رہا ہو اس نے جھک کر غور سے دیکھا۔

"اتنی خوبصورت چمکدار آنکھیں۔ اب انہیں کبھی نہیں دیکھیں گے۔ میں تو ویسے ہی دیکھ نہیں پاتی تھی۔ کیا چمک تھی ان آنکھوں میں"۔ "تیمور خان!" اسے دور کھڑے تیمور کو مخاطب کیا۔ ساری خواتین ششدر رہ گئیں کہ جانے کیا بول پڑے۔ گھر سے باہر کی خواتین بھی ترتین کی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

"آپ نے بڑی زیادتی کی تھی اپنے دوست کے ساتھ۔ میں اس کے قابل نہیں تھی کھوٹا سکہ۔ علی۔ بے قیمت۔ علی مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میں کمتر تھی اس لئے مجھے علی نہیں آئے۔ مجھے معاف کر دیجئے"۔

وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اماں جی اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔

"بس زیتون بانو! اب خدا حافظ کہہ دے۔ مرد انتظار میں کھڑے ہیں"۔

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر انہوں نے تیمور کو اشارہ کیا کہ مردوں کو بلا لو۔ پھر عطیہ کو اٹھایا۔

"چلو اندر چلتے ہیں"۔ دوسری تمام خواتین بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اماں جی اسے لے کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ اب بالکل بت بن چکی تھی۔ ایک دم خاموش اور بے تاثر۔

اسی دم کلمہ طیبہ پڑھنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ترتین نے گھبرا کر عطیہ کی طرف دیکھا۔

"میں نے علی سے معافی مانگ لی ہے۔ کیا مرا ہوا انسان معاف کر دیتا ہے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں اماں جی کو مخاطب کیا۔

"اسے تم سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ تم سے بہت خوش تھا۔ بہت تعریف کرتا تھا"۔ انہوں نے دلاسا دیا۔

"اسی بات پر تو رونا پڑ گیا ہے۔ مگر کسی کے میری بات سمجھ میں نہیں آئے گی"۔

"مجھے ٹیلی فون پر کہتا تھا۔ اماں جی آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔ عطیہ بہت اچھی ہے۔ تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟" وہ پھر گویا ہوئی۔

عطیہ نے سرد آہ بھری۔

"آئینہ جتنا صاف ہو۔ شکل کے عیب بھی اتنے ہی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بہت صاف آئینہ تھا اماں جی"۔ وہ دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔

"تجھے تو وہ دنوں میں پڑھا گیا، مشکل باتیں کرنا سیکھ گئی ہے"۔ انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

"اماں جی! اب کوئی عورت بیوہ ہوتی ہے تو سب سے زیادہ دکھ اس کی ماں کو ہوتا ہوگا۔"

اماں جی خاموش رہیں۔

"پتا نہیں وہ سب بھی کیوں یاد آ رہے ہیں جنہیں یاد نہیں آنا چاہیے۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"اماں جی! اصل کو یہ لوگ کب لے جائیں گے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

سب نے چونک کر اس کی شکل دیکھی اور شکر ادا کیا کہ وہ بے خبر ہے۔

شاید جنازے کی روانگی کے وقت وہ وقتی طور پر ماحول سے کٹی ہوئی تھی۔

حالانکہ کلمہ پڑھنے کی آوازیں دیر تک اندر آتی رہی تھیں۔

"لے جائیں گے آرام سے۔ تم یہاں بیٹھو۔" ثمرین نے کہا۔

سوئم کے بعد وہ لوگ حویلی واپس آ گئے تھے۔ جبکہ روشن آرا اور ثمرین اپنے اپنے سسرال چلی گئی تھیں۔

وہ کیسی بھی ہوتی تھی اسے ثمرین ہمیشہ ہر وقت یاد آتی تھیں۔ ان کی شوخ فطرت جھگڑ جھگڑ کرنے کی عادت کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ اماں جی تک سے سہیلیوں کی طرح مذاق کرتی تھیں اسی وجہ سے ان کی غیر موجودگی بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اور اب تو بہار اور طرح کا موسم تھا۔

اسے ایک گہری چپ لاحق ہو چکی تھی۔ جانے کیا سوچتی رہتی تھی۔ جہاں بیٹھتی تھی بس بیٹھی رہ جاتی۔ ملازمائیں ہی ہادی کو سنبھال رہی تھیں یا وہ اماں جی کے پاس رہتا تھا۔

اتنے عرصے میں اس کا تیمور سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی عدت میں تھی۔ اماں جی کی ہدایت تھی کہ گھر کے نوکروں کے بھی سامنے نہ آئے۔ اسے پیچھے آخری ہال کونے کا کمرہ ملا ہوا تھا۔ جہاں وہ زیادہ وقت گزارتی تھی۔ باقاعدگی سے قرآن پاک پڑھ رہی تھی تاکہ ایصال ثواب کیلئے۔ آخر عدت پوری ہوئی مگر اس کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی اس کا زیادہ وقت اسی کمرے میں گزرتا تھا۔ اماں جی اسے بہت کہتی تھیں کہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کرے۔

آج وہ سورج چھپنے سے کچھ دیر پہلے باغ میں آئی تھی۔

ہادی بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کسی بچے کے ساتھ شرارت کر کے پناہ کی تلاش میں اس کی طرف بھاگا۔

"امی! امی!" وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"ہادی! مجھے تنگ نہیں کرو۔" اس نے افسردگی و بیزاری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے پیچھے ہٹایا۔

مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پہلے سے زیادہ گرمجوشی سے لپٹ گیا۔

"ہٹو ہادی! خدا کیلئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" اس نے چٹاخ سے ایک طمانچہ اس کے پھول سے رخسار پر رسید کیا۔

پہلی مرتبہ اس کا یہ بدصورت رویہ بچے نے دیکھا تھا۔ سہم کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اسی دم تیمور علی خان اس کی پشت سے سامنے آئے۔ اور ہادی کا ہاتھ تھام کر اس کے مقابل کھڑے ہو گئے۔

"ہم آئندہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے۔ ہمیں علی کی بیوہ سے زیادہ اس کے بچے کی فکر ہے۔

اور پھر تم کسی ایسے شہید کی بیوہ نہیں ہو جو جنگ کے دوران کافروں کے ہاتھوں شہید ہوا ہو۔ اگر چہ وہ بھی وجہ شہادت پر جائز ہوا ہے مگر اس کا رنگ اور ہے۔ تمہاری شادی کبھی بھی کسی اور کے ساتھ ہو سکتی ہے مگر اس بچے کا نہ کوئی باپ ہے نہ ماں۔ ہم اس کے ساتھ معمولی سی زیادتی بھی برداشت نہیں کریں گے۔ جانتی ہو اس کے باپ سے ہماری دوستی کب ہوئی تھی۔ جب ہم پانچ سال کے تھے۔ گھر کے بڑے بچوں اور بابا صاحب کے ساتھ تیر آباد چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔

جس شخص نے تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزت دی۔ اس کی اولاد سے تم اس طرح کی بدسلوکی کرو گی؟"

"میرا دل بہت پریشان ہے خان! کچھ سمجھ نہیں آتا۔ آپ کو یاد تو ضرور ہوگا کہ ان سے آپ یہ شادی ہوئی تھی میرے سامنے بھی دیکھیے گا۔ آپ سے درخواست ہے۔ ابھی تو ان کو ستانا بھی جائز نہیں۔ کیا میں آپ کی نظروں سے بھی گر گئی ہوں؟"

وہ علی کی وہی ہوئی شناخت کے بعد اب بہت اعتماد سے بات کرتی تھی پھر حویلی میں بھی اس کی "ترقی" ہوئی تھی۔ اس کا اثر بھی اس کی بول چال پر تھا۔ اور وہ "فیشن ایبل" عورت جو اس کی ماں تھی۔ اس کی ذات میں حلول ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ذات میں ایک سحر کے پار رہتا تھا۔ اس کا اثر بھی چہرے سے جھلکتا تھا۔ تیمور "بہت کچھ" کے خود بھی اسیر تھے۔ اس لئے برداشت کا عمل ایک اصولی بات تھی۔

بچے ان کے ارد گرد کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"کاکا جان! ہادی کی پٹائی کیوں ہوئی؟" ایک بچے نے افسوسناک لہجے میں دریافت کیا۔

"جاؤ کھیلو آپ لوگ۔ جاؤ بیٹا آپ بھی۔" انہوں نے ہادی کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"حویلی میں رہنا ہے تو بچے سے بہت پیار کرنا ہوگا۔ اب تم اسے جو چاہے کہو تم یا حویلی میں کوئی اور اس کے ساتھ معمولی سی بدسلوکی کرتا پایا گیا تو اسی دن سے ہماری اس سے دشمنی ہو جائے گی۔ یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تمہیں پتا چلے کہ یہ بچہ ہماری نگاہ میں کتنا اہم ہے امید ہے بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔"

وہ اتنا کہہ کر پورچ کی طرف بڑھ گئے۔

اسے اب کوئی کسی کام کیلئے تو نہیں کہتا تھا۔ وہ خود ہی کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ آج اس نے ہال میں سجے تمام پیتل کے پھول سرف کے جھاگ میں دھوئے تھے۔ اور باغ میں سکھانے تھے۔ اب سمیٹ کر ہال میں آئی تھی۔ دروازے ہی میں اسے نازنین مل گئی۔

"تیمور اپنے کمرے میں ہیں طبیعت؟" اس نے رک کر پوچھا۔

"جی! مجھے تو نہیں پتا۔ اب تو مجھے اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔" وہ بے چینی سے کہہ کر اندر داخل ہو گئی۔

"اچھا ہم اوپر ہیں۔ پلیز ابھی ہی چائے بھجوا دو۔" وہ لجاجت بھرے انداز میں بولی۔

"خان کے کمرے میں؟" اس نے جاننا ضروری خیال کیا۔

"ہوں۔ وہیں"۔

وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ تیمور کا کام کا آف وائٹ پاجامہ اس پر بہت اٹھ رہا تھا۔ وہ پیچھے بندھا تھا اور گھنی چوٹی پشت پر لہرا رہی تھی۔ چال میں عجیب سرمستی و بے نیازی تھی۔ مطربہ نے گہری سانس لی اور کیتلی اور پھول بھی ڈال کر چائے بنانے کیلئے کچن میں آ گئی اور جانے ماما خالہ سے کہنے کے خود چائے بنانے لگی۔

"کس کیلئے بنا رہی ہو؟" ماما نے پوچھا۔

"چھوٹی دلہن نے کہا ہے"۔ اس نے جواب دیا اور ٹرے میں برتن رکھنے لگی۔

"لاؤ میں بنا دیتی ہوں"۔ ماما نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کیوں اتنا تکلف کرنے لگی ہوں ماما۔ میں وہی ہوں کم ذات"۔ وہ تلخی سے مسکرائی اور اپنا کام کرنے لگی۔

ماما نے خالہ کی سمت بہت دکھ بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ مگر خاموش ہو رہی تھی۔

اس نے بہت اہتمام سے چائے بنائی اور ٹرے اٹھانے سے قبل ماما کی طرف بڑھی۔

"ماما! اچھے اچھوں کی بیٹیاں بہو ہو کر بیچنے واپس آ جائیں تو کر کے کھاتی ہیں۔ میں تو پھر؟"

وہ اسی سے مسکرا دی اور ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔

حالانکہ وہ بڑی سیدھی اور صاف نیت سے چائے تیار کر کے لائی تھی۔ مگر تیمور علی خان کے کمرے کے قریب پہنچ کر جانے کیا ہوا۔ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ شاید اسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔

"مجھے تو اس کی آواز ہی اتنی پیاری لگی تھی کہ بس کیا بتاؤں۔ ویسے بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ کو اب گھر میں بتا دینا چاہیے"۔ نازنین کہہ رہی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ بابا صاحب کے ہاں تو پھر بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔ اصل فکر تو ہمیں اماں جی کی ہے۔ یقین کریں سخت ٹینشن ہے"۔ تیمور کی آواز بہت سنجیدہ تھی۔

"آپ بابا صاحب کو ہینڈل کر لیں۔ باقی وہ خود سنبھال لیں گے"۔ نازنین نے تحمل سے سمجھایا۔

"ہوں۔ یہ تو ہے۔ اماں جی بہت اموشنل ہیں۔ کہیں بات بہت سیریس نہ ہو جائے"۔

"آپ کی شادی کی بات پر تو شاید اتنی سیریس نہ ہوں لیکن یہ جان کر انہیں بہت دکھ ہو گا کہ ان کا بہت پیارا سا پوتا ایک آپریشن کے بعد دنیا میں نہیں رہا۔ اس کے دادا دادی اس معصوم کی شکل تک نہ دیکھ سکے"۔

نازنین نے بہت افسردہ لہجے میں کہا۔

مطربہ کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

"شادی اور پوتا"۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

تیمور خان کی شادی بھی ہو چکی۔ بچہ بھی ہو گیا۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔

"اس دن اس سے بات ہوئی۔ بہت خوشی ہوئی مشرقی اداؤں کی مطربی لڑکی ملی ہے۔ آپ سے تو عشق کرتی ہے۔

پھر اقبال ہے دعا کر کے واپس اور بلاوجہ امید ہے کہ اماں جی کو پتہ نہ چل جائے"۔ نازنین کی آواز آئی۔

"سوچ تو ہم بھی رہے ہیں۔ وہ بھی اصرار کر رہی ہے۔ بچے کی ڈیتھ کے بعد بہت اپ سیٹ ہو گئی ہے۔ ہمیں آنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ بہت مشکل تھی"۔ تیمور علی خان کی آواز میں تھکن تھی۔

"پہلے تو وہ وہاں بچے پر ہی آمادہ نہیں تھی۔ کہتی تھی بچہ ہو گا۔ پاکستان میں ہو گا۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ بچے کے ساتھ قبولیت کا مرحلہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ تب جا کر سمجھی تھی۔ مگر وہی جو قسمت میں تھا"۔

مطربہ کی نگاہوں کے سامنے تیمور علی خان کے مختلف انداز گھومنے لگے۔ جس کا دل چکر چکر ہو اسے دلوں پر توڑی فیاضیوں کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟ اس کے دل سے ہوک سی اٹھنے لگی۔ پھر سارا برا تھا۔ اس نے بے اختیار دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔

"یس"۔ تیمور علی خان کی آواز ابھری۔

وہ اندر داخل ہو گئی۔ دونوں دیور بھابی ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے کمرے میں وہ خاموشی چھا گئی جو اچانک آ جانے والے تیسرے فرد کیلئے ہوتی ہے اور گفتگو اپنے تسلسل کیلئے اس تیسرے فرد کے واپس جانے کا انتظار کرتی ہے۔

"ارے۔ تم کیوں لے آئیں۔ تمہاری تو طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کسی سے کہہ دیتیں"۔

نازنین نے محبت پر ترس کھاتی ہوئی مطربہ کو مخاطب کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ خالی بیٹھنے سے تو طبیعت اور الجھ جاتی ہے"۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"چائے بناؤں؟" وہ خود کو کمرے میں بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ جیسے وہ دونوں اس کے باہر جانے کا انتظار کر رہے ہوں۔ اسے یقین تھا کہ نازنین کہے گی ہم خود بنا لیں گے اور وہی ہوا۔ نازنین نے کپ اٹھا کر خود بنانے لگی۔

مطربہ نے سیدھے کھڑی ہو کر آنچل درست کیا اور تیمور علی خان پر ایک نگاہ ڈالی۔

دل ان کی طرح آباد ہوتے ہیں کہ ادھر ادھر دیکھنے کی کب فرصت ہوتی ہے۔ وہ سکن کلر شرٹ اور بلیک پینٹ میں بہت نکھرے نکھرے محسوس ہو رہے تھے۔

اسے کیا پتہ تھا آگے کون سے انکشافات کی کہانی ہے۔ اسے تو نازنین کے پراسرار انداز ہی چونکاتے تھے۔ آج پتہ چلا۔ وہ سب تو ہم رازی کی ادائیں تھیں۔

وہ خاموشی سے باہر آ گئی۔ جانے کیوں تیمور کی آبادی پر دل میں محشر برپا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس طرح کا ہیجان برپا ہو گیا جس طرح کاظم علی کے انتقال والی رات ہوا تھا۔ وہ سیدھی باغ میں آ گئی اور سر پکڑ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔

تیمور علی خان اپنی انگریز بیوی کے ساتھ اسے باغ میں چہل قدمی کرتے نظر آنے لگے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ایک نشہ ان کے وجود پر طاری تھی۔ وہ دنیا کے مطمئن ترین انسان دکھائی دے رہے تھے۔

اسے ان کے لہجے کی رتی رتی سفاکی یاد آئی۔ دل کے معاملے کو اتنی اہمیت دینے والے کو دوسروں کے دلوں کے ساتھ اتنی زیادتی زیب دیتی ہے۔ اسے اپنی شادی کی پہلی رات بھی یاد آئی جب وہ دوزخ کی آگ میں جل رہی تھی۔

اور زہر کھا کر مر جانے کا جی چاہتا تھا۔

کاش اماں جی مان کر ہی نہ دیں۔

اس کے دل میں شرارے اٹھنے لگے۔ جلی کی سادگی اور سچائی پر وہ کس طرح دن میں سو سو بار مرتی تھی۔ اس کی کھلی
کے بوجھ سے آج تک اس کی کمر ٹوٹی جاتی تھی۔

وہ ابھی تک سیاہ لباس پہنتی تھی۔ سیاہ رنگ 'سوگ' کا رنگ۔ اور آج تک جنگ ہوتی تھی کہ دل کے وہ کونے کیا ہے
اس کا جی چاہا۔ جلد سے جلد انکشاف ہو جائے۔ اور تیمور علی خان ہمیشہ کیلئے حویلی سے نکال دیئے جائیں گے۔ ابھی
اسے دکھ نہیں کہ وہ اس کے دکھوں پر غور کرنے لگیں۔ رابطے کا یہ سلسلہ ابھی بہت ہوگا۔ کسی طرح تو وہ ان کے معیار پر
آئے گی۔

"سطریہ! یہاں کیا کر رہی ہے؟ یہ ہاری اتنی دیر سے تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ بہت رو رہا ہے۔"

خالہ سولو آنے کی آواز اسے خیالات کے جہنم سے باہر کھینچ لائی۔ وہ ہاری کی انگلی تھامے سامنے کھڑی تھیں۔

ہاری کے رخساروں پر آنسو رواں تھے۔ وہ ہچکیاں بھر رہا تھا۔

"یہ مجھے سامنے نہ پائے تو دکھ محسوس کرتا ہے۔ کتنا گہرا رشتہ ہے میرا اس کے ساتھ۔" اس نے ہاری کا ہاتھ کھینچ کر
اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"کیا ہوا میری جان! کیوں رو رہا میرا بیٹا؟" وہ اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر چومتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"آپ کہاں چلی گئی تھیں امی!" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں آپ کے بغیر باہر نہیں جاتی جان۔ آپ کو پتا نہیں۔ تو پھر آپ کیوں روئے؟ اس طرح نہیں روتے، ابو
پریشان ہو جاتے ہیں۔"

"یہ تیری ذمہ داری ہے اب۔ دھیان رکھ کر۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ تو بہت الگ الگ رہنے لگی ہے۔"

"یہ زندگی تو خود بھاری جنازے کی طرح میرے کندھوں پر دھری ہے۔ اس پھول کا کیا بوجھ خالہ!" وہ آگے
مسکرائی۔ اور ہاری کا رخسار چوم لیا۔

"اللہ نہ کرے ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ قسمت کا لکھا تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ حویلی والوں نے تو اپنی طرف سے تو
تیری بہتری چاہی تھی۔ کسی کی دشمنی تو نہیں تھی تیرے ساتھ۔ ایک عزت دار آدمی سے بیاہا تھا۔ اب تقدیر کو کیا پتا تھا کہ
جانے کس کی یہ دھوپ چھاؤں کیوں ہوئی؟" وہ افسردگی سے گویا ہوئیں۔

سطریہ خلا میں گھورنے لگی۔

"خالہ! بعض لوگوں کی بات بات میں عزت جاتی ہے۔ وہ انجانے میں بدلے لیا کرتے ہیں۔"

"پتا نہیں کیسی باتیں کرتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتیں۔" وہ بھولا کر بولیں۔

"خالہ! اسے دودھ کے ساتھ کچھ دیا تھا؟" اس نے ہاری کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ہاں بس ایک توس کھایا تھا وہ کیا کہتے ہیں لگا کر۔ ہی جیب کی بنی ہوئی کھٹی کھٹی۔" وہ دماغ پر زور ڈالتے ہوئی تھیں۔

"اچھا چلیں۔"

"ہاری اب آپ کو سکول میں داخل کرا رہے ہیں اور سکول جانے والے بچے روتے نہیں ہیں۔ بڑے ہو جاتے
ہیں نا۔" وہ بہت شفقت بھرے لہجے میں اس سے ہم کلام تھی۔

"ماشاء اللہ۔ سب ہی پیار کرتے ہیں اس سے۔ بڑے خان ہر گھڑی بچوں کو ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ وہ بھی
اسے ہر جگہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ سب کتنا ڈرتے ہیں بڑے خان سے۔ یہ نہیں گھبراتا۔ بے دھڑک ان کے کمرے میں
چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے۔ "خان! گھوڑے کی سیر کرائیں۔"

"یہ خان کہتے ہیں بیٹا! آپ انہیں بابا صاحب کیوں نہیں کہتے۔ خان کیوں کہتے ہیں تو پتا ہے کیا جواب دیا؟"
خالہ ہنس کر پوچھنے لگیں۔

"کیسے بھلا؟ امی بھی تو آپ کو خان کہتی ہیں۔" بڑے خان بہت ہنسے۔ بڑے خان کہتے ہیں بہت ذہین بچہ ہے۔

"اس کا باپ کم حاضر جواب تھا کہ کسی کو پڑا رہے۔ مجھے تو اس کے سامنے جواب ہی نہیں سوجھتے تھے۔ اور
جواب سوجھتے بھی تو کہتا تھا۔ اس سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ اس لئے چپ ہی رہتی تھی۔"

اس کی آواز بھر آئی۔ چند قطرے آنکھوں سے نکلے اور ہاری کے سیاہ بالوں میں جذب ہو گئے۔

"اس طرح اکیلی نہ بیٹھا کر۔ ورنہ یہ سوچیں تجھے کھا جائیں گی۔" خالہ نے اسے سمجھایا۔

"یہ چھوٹی دلہن پتا نہیں کہاں ہیں۔ بیا رخاناں دو تین مرتبہ پوچھ چکے ہیں۔" انہیں اچانک ہی دھیان آیا۔

سطریہ نے خالی خالی نظریں خالہ کے چہرے پر جما دیں۔

"وہ خوشیوں میں شریک ہیں۔ تو اب کہاں ہیں۔" اس کی آواز بے تاثر تھی۔

"ہائیں۔" خالہ سولو تعجب سے اسے دیکھنے لگیں۔ "کیا بولی؟"

"کچھ نہیں۔ آ ہاری اندر چلیں۔" اس نے ہاری کو گود سے اتارا اور کھڑی ہو گئی۔

وہ ہاری کو سلا کر دریچے میں کھڑی جانے کن سوچوں میں مستغرق تھی۔ سازمین اور تیمور علی خان کی شام کی گفتگو بار بار
دماغ میں دھمکے کر رہی تھی۔

اسی لمحے رہا پاری اندر داخل ہوئی۔

"اماں جی بلا رہی ہیں۔" اس نے پیغام پہنچایا۔

سطریہ نے کارنس پر رکھے کلاک کی سمت دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔

"چلو آتی ہوں۔" وہ ہاری کی طرف آئی۔ اسے درست کیا۔ اوپر بڑی چادر ٹھیک کی۔ اور کھلی کھلی سی اماں جی
کے کمرے میں چلی آئی۔

"جی اماں جی۔" وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔ اماں جی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے اسے سامنے
بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ خاموش ہو کر اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

"ہاری سو گیا؟" اماں جی نے تسبیح پوری کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جی" اس نے اختصار سے کام لیا۔

"تیری طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ مجھے بھلا کیا ہوگا" وہ تلخی سے بولی۔

"اللہ نہ کرے۔ عمر پڑی ہے آگے۔ اپنے آپ کو سنبھال۔ ماں بھی اپنے مرے ہوئے بچے کے ساتھ قبر میں جا کر نہیں لیٹتی اور دنیا میں ماں کی محبت سے بڑی کوئی محبت نہیں۔ کیا تجھے احساس ہے کہ تیری یہ کالی چادر مجھے کتنا دکھ دیتی ہے" اماں جی نے بہت دکھ سے کہا۔

"اب کیا کریں۔ اس میں ہمارا قصور کیا" وہ بے دلی سے بولی۔

"کر کیوں نہیں سکتے۔ اللہ کی ذات راستے بنانے والی ہے" اماں جی کا انداز تمہید باندھنے کا سا تھا۔

وہ چونک کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ دل وسوسوں میں گھرنے لگا۔

"شرع میں حکم ہے کہ بیواؤں اور طلاق والی عورتوں کے گھر بسانے میں جلدی کرو۔"

اماں جی نے کہنا شروع کیا۔

اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اب کیا ہونے والا ہے اب کون عزت دار آ گیا ہے؟

"پٹھانن آئی تھی میرے پاس۔ عارف نام ہے اس کے لڑکے کا۔ پہلے بھی پیام دیا تھا اس نے مگر تیمور نے کہا علی زیادہ بہتر ہے۔ اس کی زندگی خطروں میں گزری ہوئی ہے۔ اسے کوئی مضبوط سہارا چاہیے۔ اب قسمت کا تو کوئی پتا نہیں ہوتا۔ علی کی موت والے دن تو جو بولی سب کے سامنے۔ وہ تو شاید تجھے یاد نہ ہو۔ تجھے ہوش ہی کہاں تھا۔ مگر پگلی بات دل کی بات دیوانے پن میں ہی منہ سے نکل جایا کرتی ہے۔ تو نے اپنے سارے دکھ کی ذمہ داری تیمور کے سر ڈال دی تھی۔ مگر دنیا کی عدالت ہو یا اللہ کی۔ یہی بات ظاہر ہوگی کہ اس نے تیرا بھلا چاہا تھا۔ تو اس گھر کی نوکرانی بن کر آئی تھی۔ تجھے اس نے اپنے دوست کی بیوی بنایا تھا۔

میں نے تیمور اور عمیر سے ذکر کیا تھا۔ تیمور بہت خوش ہوا کہ اللہ نے تیرے آباد ہونے کا پھر سے آسرا بنا دیا ہے۔ کہنے لگا اماں جی پہلی فرصت میں نکاح کر دیجیے۔"

"یہ کہا تھا خان نے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں یہی کہا تھا۔ کیوں؟" وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کتنا خیال ہے انہیں میری خوشیوں کا" اس کا انداز بدستور تھا۔

"کیوں نہیں۔ اسے سب کی خوشیوں کا احساس رہتا ہے" وہ خوش ہو کر بڑے فخر سے کہہ رہی تھیں۔

"تو پھر سب سے زیادہ انہیں اپنی ماں کی خوشیوں کا احساس کرنا چاہیے۔ کیوں؟"

وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

"بالکل۔ بہت خیال رکھتا ہے میرا بچہ۔ اللہ خوشیاں دکھائے" وہ دعائیں دینے لگیں۔

"پٹھانن کہہ رہی تھی کہ عارف بچے کو بھی اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہے۔ اس نے تو یہ بھی کہا کہ اس کی شادی کسی طرح تیرے ساتھ ہو جائے۔ ہر شرط پر راضی ہے۔"

وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

"ہر شرط پر؟" وہ عجیب لہجے میں پوچھ کر مسکرانے لگی۔

"ہاں۔ ہاں۔ یہی کہہ رہی تھی پٹھانن۔ تیمور اور تیرے بڑے خان بچے کو تو شاید اب کبھی حویلی سے نہ جانے دیں۔ اب تو سب کا بچہ ہے تو فکر نہ کر۔"

"اس سے کہیے گا۔ ہر شرط کی بات نہ کرے۔ معاملات میں زیادہ ہی سچائی آ گئی تو ڈر کر بھاگ جائے گا" اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"ہیں۔ کیا باتیں کر رہی ہے؟ اب کچھ پتا ہے انہیں۔ خدانخواستہ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ دنیا سے چھپاتے پھریں۔ تیری ماں تو اس کے سامنے ہی آئی تھی" اماں جی کو الجھن ہوئی۔

"تیمور کہہ رہا تھا کہ بس جلد سے جلد کر دیں۔ سب سے الگ تھلگ رہنے لگی ہے۔ کہیں وہم میں نہ پڑ جائے۔ کیا کہتے ہیں" وہ دماغ پر زور ڈالنے لگیں۔ "ہاں نفسیاتی"۔

"وہ کہہ رہا تھا۔ اس سے بہت سنکے ہو جاتے ہیں" وہ سادگی سے بولیں۔ وہ خاموش رہی۔

"کچھ تو بول" اماں جی کو اس کی گہری خاموشی کھلنے لگی۔

"اماں جی! مجھے بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ ہاری کو بھی اکیلا چھوڑ کر آئی ہوں۔ جاؤں" وہ یوں گویا ہوئی جیسے ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہو رہی تھی۔

اماں جی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ پر ان کی اتنی اہم بات کا جواب دیا تھا۔

"اچھا... جا آرام کر۔ غور کر لینا" وہ پھر الجھن میں پڑ گئی تھیں۔

وہ اٹھ کے باہر آ گئی۔ اس کے قدموں کا رخ اپنے کمرے کے بجائے تیمور علی خان کی خواب گاہ کی طرف تھا۔

وہ زینے طے کر کے اوپر آئی۔ چند لمحے رک کر کچھ سوچا پھر آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

"یس۔ دروازہ کھلا ہے" تیمور علی خان کی آواز سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ مصروف ہوں۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم خان!"

"وعلیکم السلام" وہ رائٹنگ ٹیبل پر مصروف تھے۔ اس کی آواز پر ریوالونگ چیئر کا رخ اس کی سمت موڑ کر وہ قدرے حیران سے اسے دیکھ رہے تھے۔

☆……☆……☆……☆……☆……☆……☆

"السلام علیکم خان!" اس کا لہجہ قطعی سپاٹ تھا۔

"وعلیکم السلام"۔ انہوں نے جواب دینے کے دوران سامنے لگی وال کلاک کی طرف نگاہ کی۔

"خیریت؟" ان کی ایک ایک ادا میں استعجاب تھا۔

"جب سے حویلی میں آئے ہیں۔ خیریت کے علاوہ سب کچھ ہے"۔ وہ دروازے ہی پر کھڑی تھی اور ایک انچ آگے نہیں بڑھی تھی۔

تیمور علی خان نے کالی چادر میں لپٹی مطرب کی سمت ایک لمحہ دیکھا اور قلم کا کیپ لگا کر قلم بغل پر رکھ دیا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہاں اب بات کرو۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے اس کے غیر معمولی حسین چہرے پر یوں نگاہ ڈالی جیسے راستے کے سنگ میل کو سرسری دیکھتے ہیں۔

"میں نے آپ سے درخواست کی تھی خان۔ کہ اب کبھی میری شادی کی بات نہ کیجئے گا"۔ اس کی آواز پست اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

"احمق ہو تم۔ مگر یہاں تمہاری طرح کا کوئی غیرت دار اور بے وقوف نہیں۔ کیا سمجھیں؟" وہ اپنی کرسی گھوم گئے اور اپنے کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگے۔

"میں آپ سب سے رحم کی درخواست تو کر سکتی ہوں"۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"عارف پسند نہیں ہے تمہیں؟" ان کے ذہن میں ایک خیال سرعت سے آیا تھا اور انہوں نے چونک

کر پوچھا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

"ہاں پھر..... اتنا تو ہم سمجھتے ہیں کہ علی جیسے کوالیفائیڈ بندے کے بعد عارف جیسا نوجوان جو ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے تمہیں قابل قبول کیسے لگ سکتا ہے"۔

وہ خود ہی ایک نتیجے پر پہنچ کر گویا ہوئے۔

"یہ بات بھی نہیں ہے خان!" اس کی آواز بوجھل تھی۔

"پھر"۔ وہ قدرے حیران نظر آئے۔

"خان۔ میں نے خواب تو علی سے بھی اونچے بندے کے دیکھے تھے مگر پھر علی کے ساتھ بھی نباہ ہو گئی تھی۔ اب اگر اس سے کم مل رہا ہے تو کیا ہوا؟ میرے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے"۔ اس کی نگاہیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

تیمور علی خان کی گہری خاموشی طویل ہوتی چلی گئی۔

کمرے کے سناٹے میں مطرب کے دل کے سینکڑوں شور مچانے لگے۔ کہ مزید کسی گفتگو کی گنجائش بھی نظر نہ آئی۔

چند منٹ اسی کے شور میں گزرے۔ تیمور علی خان نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"تمہاری آمد کا مقصد؟" ان کا انداز قدرے سخت و سنجیدہ تھا۔

"آپ کی یہاں بہت سنی جاتی ہے۔ اماں جی اور بڑے خان آپ کی بات نہیں ٹالتے۔ اگر آپ انہیں کہیں گے کہ وہ میری شادی کا ذکر بھی نہ کریں تو وہ کبھی نہیں کریں گے۔ اور پھر آپ کو کیا میں ایسے رہوں یا ویسے؟" اس کا لہجہ یکدم تلخ ہو گیا۔

"ہم سے کام بھی کرانا ہے اور ہم سے الجھتی بھی ہو۔ بات کرنے کا سلیقہ سیکھو پہلے"۔ وہ برہم ہو گئے۔

مگر ایسی برہمی جس میں تسلی پنہاں تھی۔ تسلی دراصل تھی۔

"الجھ کہاں رہی ہوں خود پر اختیار نہیں رہتا۔ دکھ بھی تو بڑھتے ہی جا رہے ہیں"۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

"تمہارے دکھ ہی تو کم کرنا چاہ رہے ہیں سب"۔ تیمور علی خان نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"اگر میں قسم کھا کر کہوں کہ دکھ بڑھا رہے ہیں تو پھر؟" وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

"تمہیں ابھی اپنے برے بھلے کا سینس نہیں ہے۔ صرف جذباتی ہو۔ جب کوئی تمہیں ہر طرح کا سکون دے گا تو سب کچھ بھول جاؤ گی۔ یہی زندگی ہے"۔ وہ لاپرواہی سے کہہ رہے تھے۔

"ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے خان؟" وہ ہچکچائی۔

"ہوں..... بولو۔ پہلے تم نے ہمارے برا ماننے کی پرواہ کی ہے؟"

وہ ایک دم چوکس نظر آنے لگے (ان کے لحاظ سے تو بالکل حد ہو گئی تھی)

"اگر آپ کی شادی زبردستی کر دی جائے جبکہ آپ کہیں اور شادی کرنا چاہ رہے ہوں تو کیا آپ سب کی بات مان لیں گے۔ اگر مان لیں گے تو آپ کے دل کا کیا حال ہو گا"۔

وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بے خوف انداز میں بول رہی تھی۔

تیمور علی خان کیلئے یہ حملہ بالکل غیر متوقع تھا۔ ایک لمحے کو تو چکرا کر رہ گئے۔ پھر سے بجلی کی طرح تڑپ کر پلٹے۔

"تم کہاں کرنا چاہتی ہو؟" انہوں نے جلدی اپنے مضبوط اعصاب ہونے کا ثبوت دیا۔ لہجے میں اشتعال کی جھلک رہی تھی۔

صارم نے ایک لمحے کو ان کی سمت دیکھا۔ بہت خوبصورت سنہری پروں والا پرندہ۔ جو بہت بلندی پر اڑان بھر رہا تھا۔ اس کے دل کے قید خانے میں صرف اس کے حسن کی یادداشت محفوظ رہ سکتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

"کہیں نہیں خان۔ کہیں بھی نہیں"۔ وہ بے ساختہ بول پڑی تھی۔

"ہم جانتے ہیں تمہارا دکھ تازہ ہے اور جب انسان بہت دکھی ہو یا بہت خوش ہو تو اس کا ذہنی توازن قائم نہیں رہ سکتا پھر اس کے فیصلوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ فی الحال تم آرام کرو۔ دراصل بابا کی وجہ سے تم ہمارے لئے پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو گئی ہو۔ ہم اس بچے کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں"۔

"وہ بچہ ہے تو کیا ہوا سرداروں کی اولاد ہے۔ اونہہ۔ میں شادی نہیں کروں گی خان آپ سن لیجئے"۔

"وہ تمہیں کرنا پڑے گی"۔ حد ہو گئی تھی۔ وہ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ احساس توہین سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"اماں جی نے آپ کیلئے شیخ رفیع کی لڑکی پسند کی ہے آپ وہاں شادی کر لیجئے۔ پھر جہاں آپ کہیں گے میں چپ چاپ کر لوں گی۔ وعدہ"۔ وہ تلخی سے مسکرائی۔

"تیمور علی خان دم بخود سے اس کی صورت دیکھنے لگے۔

"تم علی کی بیوہ ہو اس لئے برداشت کر رہے ہیں۔ مت دکھاؤ ہمیں اپنی کم ظرفی کے رنگ۔ ایک بے حیثیت لڑکی ہے ہم تمہاری ماں سے چند مربع کے عوض خرید کے لائے تھے۔ یہ صلہ ہے ہمارے احسانوں کا"۔ وہ چیخ پڑے۔

"ہم سے برابری کرنے چلی ہو۔ ہم یہ کریں تو تم وہ کرو گی۔ تم ہو کون؟ فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ بلکہ ہماری طرف سے جہنم میں جاؤ۔ اور کبھی ہمارے سامنے نہ آنا۔ احسان فراموش۔ بد جنس"۔

(احسان کرتے تو سہی۔ آپ کے قدموں میں سر رکھ دیتے پھر کبھی نہ اٹھاتے)

ایک دھن دولت والا آدمی اپنے سے کمتر کے ساتھ جو بھی کرے وہ احسان۔ کاش کہیں یہ رسم بھی ہوتی کہ کمتروں سے پوچھ لیا جاتا کہ ظلم و احسان میں فرق کیا ہوتا ہے۔ جس پر احسان کیا گیا ہے اس کے دل کا کیا معاملہ ہے۔ یہ احسان لینا چاہتا ہے بھی یا نہیں۔ اپنی دانست میں احسان کرنے والے کو خبر کس جہنم سے دیا تھا۔ نہیں آؤں گی میں آپ کے سامنے۔ کاش میں کبھی آپ کے سامنے ہی نہ آتی"۔

وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر روتی ہوئی پلٹ گئی۔ قریب ہی لیٹے مریضوں کے ہوش۔ آخری حملہ کیا تھا۔ یہ اس کا سلسلہ تھا۔ اعصاب کی جنگ سے شکست کے مرحلے میں داخل ہونے لگے تھے۔

وہ یونہی کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔ اس پر ساتھ ساتھ انہیں افسوس بھی ہو رہا تھا۔ قطعاً کچھ اس کی شکست کم حقی کی وجہ سے اس کی حدود کے سامنے بد بخت بنی ضروری تھی۔

غصے سے زیادہ وہ حیران پریشان تھے کہ آج وہ کیسے عجیب رنگ میں تھی۔ جیسے ہوش بھلائے ہوئے تھی۔

انکی موت۔ اب وہ گستاخ۔ بے خوف۔ وہ اپنا کام جاری رکھنے کے قائل ہو رہے تھے۔

"یہاں بیٹھی ہے۔ لے لو۔ سب اموڑ رہے ہیں تجھے"۔ چاروں خالہ سو کر آنے کے ساتھ بابا کے انتظار کرنے میں ابھی اموڑتی چلی آئی تھی۔

اس نے بڑی بی ہے تم سر دکھائی سے چاروں اور خالہ سو کر آئے کو دیکھا اور پاؤں کی انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

"نیک بخت سلام کر"۔ خالہ سو کر آنے نے ٹوکا۔

"مت خوش کیا کرو خالہ ایسے چھوٹے ہاتھ جوڑ کر سلام رکھنے سے کیا قسمت بدل جاتی ہے؟" اس کا طرز حرف سنگ رہا تھا۔ سلام پھر بھی نہیں کیا تھا۔

"میں صدقے جاؤں سلامتی چاہا تو قسمت ضرور بدلے گی۔ یہ صاحب جیسا کہ اس کا کھیل تو سب بی کے ساتھ ہے بچی ہی"۔ چاروں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا اور پیشانی چوم لی۔

ناگواری اور بیزاری کی صورت اس کی پیشانی پر نمودار ہوئی مگر وہ خاموش رہی۔

"صبح سے صبر اول کر رہا تھا اپنی بچی کی صورت دیکھ کر آؤں۔ اب آئی ہو تو تجھے اموڑ رہے تھے۔ ہمیں کیا پتا تو یہاں بیٹھی ہے۔ چل اندر چل سب گھر میں بیٹھے ہیں کہ جانے کہاں گئی"۔ چاروں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"ہونہہ۔ گھر۔ سب کون گھر میں ہی ہیں"۔ وہ ہاتھ چھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بابا کہاں ہے؟" اس نے خالہ کی طرف دیکھا۔

"وہ سب خان کے ساتھ گیا ہے"۔ خالہ نے بڑی گھورتی نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

"اچھا"۔ وہ گھر کی صحن میں چل پڑی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔

ہاتھ چھوڑ کر کے وہ برآمدے میں آ گئیں تو یار علی خان اور تیمور علی خان انہیں دروازے کے بیچ میں سامنے کھڑے باتیں کرتے ملے۔

"کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟" یار علی خان نے قدرے حیرانی سے چاروں کی طرف دیکھا تھا۔

"گھر ملنے آئی تھی۔ خان!" خالہ نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"یہ کیا بچی جانے کون سے بار پڑی ہوئی تھی اسے اموڑنے گئے تھے"۔ وہ مزید گویا ہوئیں۔

"ہاں ــــ اس کا خیال رکھنا چاہیے یہ بہت الگ تھلگ رہنے لگی ہے"۔ یاور علی خان نے ہمدردانہ نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"خیال رکھنے کی کوشش تو کرتے ہیں۔ پنجاورن تو اسے بیٹی سمجھنے لگی ہے"۔ خان نے جواب دیا۔

"سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یوں تو میں بھی جانے کیا کیا سمجھوں"۔ وہ یہ کہہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

وہ چاروں ایک لمحے کو خاموش سے ہو کر رہ گئے۔ اس کا گستاخانہ انداز یاور علی خان نے پہلی بار دیکھا تھا۔ انہوں نے ایک چبھتی نگاہ بھائی پر ڈالی تھی۔

"بڑا مسئلہ ہے"۔ تیمور علی خان نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

"میرے خیال میں اماں جی کا فیصلہ درست ہے"۔ یاور علی خان نے پنجاورن کی طرف دیکھ کر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر کہا۔

"ہمارا بھی یہی خیال ہے"۔ تیمور نے تائید کی۔

"ہمارا خیال ہے آج نہیں"۔ تیمور علی خان کے انداز میں الجھن تھی۔

"جو کام آخر ہونا ہی ہے اس میں پھر آج اور کل کیا؟" یاور علی خان نے حیرت سے کہا۔

"مسئلہ ہے۔ یاور بھائی ابھی فی الحال یہ ذہنی طور پر تیار نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں ہر طرح سے بدلا ہوا لگی ہے۔ غصہ بہت آتا ہے مگر اس کے دکھ کا اندازہ کر کے برداشت کر جاتا ہے۔"

لیکن جلد تبدیلی اسے جلد تبدیل کر دے گی۔ یہ سب تو کچھ نہ ہونے تک ہے۔ یاور علی خان کیونکہ قطعی غیر جانبدار تھے اس لئے ان کا ذاتی رویہ بہت واضح تھا۔

"ہوں ــــ تو کوشش کر دیکھیے"۔ تیمور نے گویا اتفاق کر لیا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ اماں جی پیچھے دالان میں ہیں"۔ یاور علی خان نے اپنی شکل دیکھتی دونوں خواتین کو گویا احساس دلایا کہ انہیں یہاں سے اب چلے جانا چاہیے۔

وہ دونوں فوراً وہاں سے آگے بڑھ گئیں۔

پنجاورن تو یاور علی خان کی صورت اتنے انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ گویا وہی ان کا ساتھ دیں گے۔

"ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے تیمور؟" یاور علی خان نے گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

روپا دیوی تیمور علی خان کے کمرے میں یہ پیغام لے کر آئی تھی کہ اماں جی نے فوراً بلایا ہے۔

وہ چونک پڑے تھے۔ جب انسان خود اپنے اندر سے دھڑکا کر تیز راز لیے پھر رہا ہو تو ہر ہر بات پر چونک پڑتا ہے کہ کہیں کسی کو بھنک تو نہیں پڑ گئی۔ وہ بھی بڑی الجھی الجھی کیفیت میں ماں کی طرف آئے تھے۔

لیکن کمرے میں پہنچتے ہی انہوں نے گہرا سانس سینے سے خارج کیا۔ سامنے ہی صفیہ بیٹھی تھی اور وہ پلو سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔

"جی ــــ اماں جی ــــ اس وقت کیسے یاد کیا؟" انہوں نے متفکرانہ انداز میں نگاہ صفیہ پر ڈالی تھی۔

"آؤ ــــ بیٹا ــــ ایک بات ہے۔ میں چاہتی ہوں تمہارے بابا صاحب تک پہنچنے سے پہلے اس کمرے میں بات طے ہو جائے۔"

وہ پریشان نظر آ رہی تھیں۔

"خیریت"۔ انہوں نے بغور ماں کا چہرہ دیکھا۔

"اسے سمجھاؤ۔ قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں رہتی۔ ایک ہی بچہ ہے۔ اپنی ماں کا اور پنجاورن بھی بہت سیدھی سادی ہے۔ واری صدقے ہوتی ہے اس پر۔ لڑکا بھی خوش راضی ہے۔ مگر یہ نہیں مان رہی۔ روئے چلی جا رہی ہے۔ اور مجھ سے کسی کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔ بہت بے وقوف ہے یہ"۔

اماں جی نے انہیں بلانے کی وجہ تفصیل سے بیان کی۔

"بے وقوف تو ہے یہ اس میں کوئی شک نہیں۔ آپ اس کے انکار پر نہ جائیں اور کوئی مناسب تاریخ طے کر لیں۔ بعد میں ٹھیک ہو جائے گی سب"۔

"ٹھیک ہے پھر اماں جی ابھی مجھے کہا گیا ہے۔ میں ایک غلام زادی ہوں۔ مجھے اپنی اوقات پہچان لینا چاہیے تھی۔ مگر آپ لوگوں کے رویے نے مجھے اپنی اوقات بھلا دی تھی۔ علی کی موت کے بعد گورنمنٹ نے جو پیسہ دیا ہے۔ وہ میں آپ لوگوں کے حوالے کرتی ہوں۔ اسے میری آزادی کی قیمت سمجھیں یا کچھ اور۔ بس مجھے اجازت دیں"۔

وہ چادر سنبھال کر آنکھیں پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ نے مجھے بہت پیار دیا۔ میں کبھی نہ بھول پاؤں گی"۔

"کیا مطلب؟" اماں جی ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"مطلب یہ کہ حویلی میں میرا دانہ پانی اتنا ہی تھا"۔ اس نے قدم بڑھا دیے۔

"ایک قدم آگے بڑھایا تو ٹانگیں توڑ دوں گی تیری۔ آئی کہیں سے پیسے والی"۔ اماں جی تو خاصی غضبناک ہو گئیں۔

"اپنا چھوڑا انہیں بچا کچا پھر بڑے ہیں حق پر۔ چل بیٹھ یہاں"۔ انہوں نے ڈانٹا۔

"اماں جی! آپ سب اب جو کام مجھ سے لے رہے ہیں۔ وہ میری طاقت، ہمت سے بہت زیادہ ہے۔ مجھ میں طاقت نہیں ہے اماں جی۔ میں اندر سے بالکل ختم ہو چکی ہوں"۔ وہ اماں جی کے گھٹنوں پر جھک کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"بھلا۔ اس میں طاقت ہمت کی کیا بات۔ گھر بس جائے گا تیرا۔ سنبھالنے لگے گی"۔

"وہ جس طرح روئی تو اماں جی کا دل پگھل پگھل گیا۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تیمور بیٹے اسے سمجھاؤ"۔

"انہیں میرے معاملے میں مت ڈالیے بلکہ انہیں کہیے یہ جتنی جلد ہو سکے۔ شیخ رفیع کی لڑکی سے شادی کر لیں۔ آپ کو ان کی شادی کا بھی تو بہت ارمان ہے"۔ وہ چیخ پڑی۔

اماں جی تو ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئیں۔ بھلا اس وقت شیخ رفیع کی لڑکی کا ذکر کیا معنی جبکہ یہاں تو مسئلہ ہی اور ہے۔

"اماں جی اس سے کہیے کہ ہمارے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کرے"۔ تیمور علی خان کا پارہ چڑھ گیا۔

"ارے یوں نہ کہو اسے ابھی تو اپنے چھوٹے خان کے پیار کا ارمان ہوگا۔ اس لئے کہہ رہی ہے۔ میں نے بھی لیکن لڑکی یوں ہی تو پسند نہیں کر لی۔ صورت، سیرت، تعلیم ہر طرح تو ادھر سے میل کھاتی ہے بلکہ وہ تو اس سے زیادہ پڑھی ہوئی ہے۔ بھلا کیوں انکار کرے گا۔ ابھی کہو تو ابھی چل دے گا"۔

اماں جی کے لہجے میں بلا کا مان اور اعتماد تھا۔

"تو پھر ذرا کہہ کر دیکھیے"۔ وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک کر استہزائیہ انداز میں گویا ہوئی۔

"لے بتا کیوں تو جب کر کے مجھے تنگ ہو تو اپنی بات کر"۔ وہ مسکرا دیں۔

"گو ٹو ہیل"۔ تیمور علی خان جھنجھلا کر کھڑے ہو گئے۔ "ہمیں اس احمق کے معاملے میں مت الجھائیے اماں جی۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہم چلتے ہیں۔ آئندہ آپ اس سے متعلق کوئی بات ہم سے نہیں کیجیے گا"۔ انہوں نے قدم آگے بڑھا دیے۔

"تیمور ۔۔۔ بیٹے ۔۔۔ اس نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی کہ تم برا مان گئے ہو"۔ سیدھی سادی اماں جی تشویش میں پڑ گئیں۔

"ہم نے کہا ناں اماں جی۔ ہماری طرف سے یہ جہنم میں جائے۔ بس آئندہ آپ اس کے معاملے میں ہم سے کوئی بات نہ کیجیے گا۔ بلکہ ہم آپ کو یہ مشورہ دیں"۔ وہ بولتے بولتے رک گئے۔

"ہاں ہاں ۔۔۔ بولو"۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں"۔ ان کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"تو ایسے کیسے چھوڑ دوں۔ میں نے تو رو رو کر دو دو پہر تک اپنے ہاتھوں کیا ہے"۔

"اچھا ۔۔۔ زمن بانو ۔۔۔ جاؤ تو آرام کر۔ ہاری کو دیکھ پھر بات کریں گے تجھ سے۔ آؤ تیمور تم یہاں بیٹھو ہمارے پاس"۔

انہوں نے جاتے ہوئے بیٹے کو بصد اصرار روکا۔ جو ان کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔

تیمور ماں کے قریب جا بیٹھے۔ وہ باہر نکل آئی۔ مگر جانے کیوں دل بہت اندیشہ مند سا تھا۔ وہ دروازے کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ آخر اس کی زندگی بھر کی بات تھی۔ اتنی حساس بات کیوں نہ ہوتی۔

"اماں جی ہماری مانیں اسے نخرے اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سیدھے سیدھے ان لوگوں کو بلائیں اور نکاح پڑھوا دیں۔ ایسی کون سی انوکھی لڑکی ہے۔ جسے ایڈجسٹمنٹ میں مشکل ہوگی نہ ہی باشعور اور بااختیار ہے۔ اسی طرح انسان بہت آسانی سے ہر رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ شروع شروع میں ذرا مشکل ہوتی ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں ۔۔۔ ہم خاطر کریں"۔

مطربہ کی روح اس کے وجود میں یوں پھڑپھڑاتی محسوس ہوئی جیسے خالی برتن میں چکراتی ہوئی کوئی شے۔

اس کے حواس کی ایک لہر اتنی ہی پُرہیجان خیز اور بے اختیاری تھی کہ اس نے شعور کے اس مقام سے اتصال تو چھین لیا اور بے ساختگی کا وار ایک ایسے مقام پر پایا جس دھڑنے کا خیال عام حالات میں نہیں آتا تھا۔

ویلیاں کی جاگیر ان کی دل ان کا خوشی ان کی سیر اور ان کا خدا ایک ہی تو ہے۔

جب کوئی تقاضا نہیں۔

مطالبہ نہیں۔

خاموشی ہے' بے چارگی کے اعتراف کے ساتھ ایک گونہ شعور ہے تو انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ میں سرے سے انکار کر دوں۔ ہر روز نئے سرے سے خود سے لڑوں اور انجام کے دیا ہے۔ کچھ طلب کرنے کی خواہش نہیں۔

اپنے دل کا اتنا خیال۔ ہر صورت جیت کر خوش ہو کر ایک ذرا دور ہیں تو اداس ہو جاتے ہیں۔ بھاوج کے دکھڑے روتے ہیں۔ جانے کی جلدی ہے۔

نانی وہاں تیمور علی خان تمہیں اچھی طرح گر کے دکھ میرے ساتھ رہتی۔

وہ ان دیکھی آگ میں جلتی بجھتی اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"ہندو کو اور کس طرح کی کہے میں چھوڑ دیا ساری"۔ خالہ سواتے نے پان کا ہوا انگال کر کھولا اور بڑبڑانے لگیں۔

"یوں نہ بول سو آتے ۔۔۔ نئی نئی مصیبت ہے۔ زخم ہرے ہیں۔ بچی ہے۔ پھر ابھی وہ ملا تھا کہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ بہت دکھ ہے اسے"۔ اماں جی کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

"تو ہم بھی تو اس کے دکھ دور کرنے کے جتن کر رہے ہیں۔ اسے سنبھل جانا چاہیے ہماری"۔ خالہ کا موڈ آف تھا۔

"سمجھ جائے گی۔ ہمیں بھی اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ تو کیوں غصہ کرتی ہے۔ قسمت کا غصہ اس پر کم ہے؟ اور دکھی ہو گی۔ اکیلی محسوس کرے گی۔ اب کچھ نہ کہنا اسے۔ میں سمجھا لوں گی"۔ اماں جی کے انداز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔

"ہاری سو گئے نہیں ابھی ٹھہرو ابھی بتاتی ہوں"۔ ہاری بھاگتا ہوا دالان میں آیا تھا اور مطربہ ایک کرتا ہاتھ میں پکڑے پیچھے تھی۔ ہاری نے پاجامہ اور بنیان پہنا ہوا تھا اور شرارت کے موڈ میں تھا۔

"دیکھو نا ڈنڈے سے پانی کروں گی ۔۔۔ اماں جی دیکھ رہی ہیں آپ؟"

"ہاری بیٹے ۔۔۔ کیوں تنگ کر رہے ہو ماں کو آ میرے بچے میں پہناؤں تجھے کرتا"۔ اماں جی مسکرا رہی تھیں۔

وہ بھاگتا ہوا اماں جی کی آغوش میں دبک گیا۔ "میں بھی ویسا لوں دادا جان کا جان والا سوٹ یوں دا"۔ وہ کہہ رہا تھا۔

اماں جی نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

"میرے چاند اتنے بڑے کپڑے تجھے نہیں آتے۔ میں سلواؤں گی کاکا جان جیسا سوٹ ۔۔۔ لا زمن بانو مجھے کرتا میں اپنے بچے کو خود پہناؤں گی۔ میرا لال اپنی اماں جی کا کہنا مانے گا ناں۔"

"تیمور بڑے خان سے کہوں گی وہ ابھی تیرا سوٹ لے آئیں گے اور گھوڑے کی سیر بھی کرائیں گے"۔

اماں جی نے اسے باتوں میں لگا کر کرتا پہنا دیا۔

"اماں جی! میں کاکا جان جیسی ٹلی والی (ٹیڑی والی) رائفل بھی لوں گا۔" اس نے اصرار کیا۔

"ہاں ہاں — تجھے رائفل بھی لا کر دیں گے۔"

"اور میں کاکا جان والے شوز (شوز) بھی لوں گا۔"

"لو بتاؤ — تیرے کاکا جان کی تو دلہن بھی آنے والی ہے۔ تو کیا کل کو تم بھی ایسی دلہن لو گے؟" خالہ ہوا نے ہنس ہنس کر رونے لگیں۔

اماں جی بھی مسکرانے لگیں۔

اسی دم تیمور علی خان ماں کو تلاش کرتے ہوئے دالان میں چلے آئے۔

"ماشاءاللہ اتنے مرد ہیں حویلی میں۔ مگر جب دم ہے تو کاکا جان کا۔" خالہ نے تیمور علی خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا ہو رہا ہے پارٹنر؟" تیمور علی خان نے ہادی کا رخسار چھوا۔

"تنگ کر رہا ہے ماں کو۔ کپڑے نہیں بدل رہا تھا کہ کاکا جان جیسا سوٹ پہنوں گا۔" اماں جی نے بتایا۔

"ارے ہم ضرور بنوائیں گے اپنی جان کے سوٹ۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہارا باپ تمہارے لیے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے۔ عیش کرو پارٹنر۔"

تیمور علی خان نے اس کا سر تھپتھپایا۔ اور ایک اچٹتی ہوئی نظر کھڑی مطربہ پر ڈالی۔

"اماں جی! آپ فوراً اس کی پسند کے کپڑے سلوائیں۔"

"بیٹے! بچوں کو بہلایا کرتے ہیں۔ ہر ضد پوری نہیں کرتے۔ آگے مشکل ہو جاتی ہے۔ کل تمہارے اپنے بچے ہوں گے تو اتنی توجہ اس پر دے سکو گے؟"

"اگر ایسی بات ہے تو یہ ہمارا پہلا بچہ ہوگا۔ اماں جی ہماری اتنی گہری دوستی کبھی کسی سے نہیں ہوئی۔ اس دوستی میں بھی اس کے باپ ہی کا زیادہ حصہ ہے۔ ہر طرح کے عیب ہنر باپ جیسے کی ساری ہی ادائیں تھیں۔"

"چلو ہادی — باہر چلتے ہیں۔" انہوں نے اپنی اداسی پر فوراً بشاشت کا پردہ ڈالا۔

"اسے کہاں لے جاؤ گے؟"

"کچہری جا رہے ہیں ہم بابا صاحب کے ساتھ۔ ہم تو پھر وہاں سے شہر چلے جائیں گے۔ یہ بابا صاحب کے ساتھ واپس آ جائے گا۔ چلو پارٹنر۔"

ہادی فوراً تخت سے نیچے اتر آیا۔

"کاکا جان امی بھی۔" اس نے مطربہ کی طرف دیکھا جو اپنی کالی چادر درست کر رہی تھی۔

"نہیں — جان — وہاں امی نہیں جاتیں۔"

"امی کہاں جاتی ہیں؟" اس کی نگاہوں میں معصوم سی حیرت تھی۔

"امی گھر رہتی ہیں۔" وہ دھیرے سے گویا ہوئے۔

"بابا پولیس پکڑ لیتی ہے؟" اس نے تعجب سے سر اٹھا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

"پکڑا تو تھا ایک پولیس والے نے تیری ماں کو — آ — ہ —" خالہ ہوا نے ٹھنڈی سانس لے کر بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

ماحول پر یکلخت سکوت طاری ہو گیا۔

ہادی نے خوفزدہ ہو کر مطربہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ خالہ کی بات سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔

تیمور علی خان نے ہادی کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔ "آؤ بیٹے۔ خالہ! بچوں کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں کرتے۔" وہ بہت آہستگی سے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

"امی — آپ سمجھتی ہیں۔ میں آپ کیلئے چاکلیٹ اور آئس کریم لے کر آؤں گا۔"

اس کے حساب سے اس کی ماں باہر جانے پر نہایت غمگین تھی اور اسے تسلی دے رہا تھا۔

بہت بے ساختہ سمجھدار اور بھولا انداز تھا۔ مطربہ اس معصومانہ محبت کی ادا پر اندر سے بکھر کر رہ گئی۔

اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس بچے کی سوتیلی ماں ہے۔ کتنا پیار کرتا ہے اس سے۔ حویلی میں گھستے ہی اسے ڈھونڈتا ہے۔"

خالہ نے اماں جی سے اس انداز میں کہا گویا وہ ان تمام باتوں سے بے خبر ہوں۔ مطربہ نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"کہاں چل پڑی — ادھر آ میرے پاس بیٹھ جایا کر۔ نہ جانے کہاں گم رہتی ہے۔" خالہ نے ٹوکا۔

"کسی کے پاس بھی بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک ہی بات رہ گئی ہے سب کے پاس۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"یہ تیرے بھلے نصیب ہیں کہ سب کو تیری فکر ہے۔ کون کرتا ہے ورنہ اتنی پرواہ۔" خالہ نے بہت نرم آہستگی سے کہا تھا۔

"بھلے نصیب ہوتے تو؟" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اچھا چل — ادھر آ کر بیٹھ — نہیں کریں گے ہم وہ باتیں جو تجھے بری لگ رہی ہیں۔" اماں جی کا انداز صلح کن تھا۔

وہ آہستگی سے چلتی ہوئی آئی اور اماں جی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

"کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ اچھی طرح وقت سے کھایا پیا کر۔" اماں جی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اسی دم نازنین دالان میں بڑی تیز رفتاری سے آئیں۔

"پتا نہیں سب ملازم کہاں چلے گئے۔ تیمور کہاں ہیں؟ اپنے کمرے میں بھی نہیں ہیں۔ ان کا فون آیا ہے۔" وہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔

"وہ تو اپنے باپ کے ساتھ کچہری گیا ہے۔ کس کا فون ہے؟" اماں جی نے بہو کی شکل سرسری دیکھ کر جواب دیا۔

"اماں جی! خان کے کسی دوست کا ہوگا اور کس کا ہوگا۔" خالہ ہوا نے بے نیازی سے کہا۔

"ہاں تو کہہ دو کام سے گیا ہے۔"

"کب تک آنے کا کہا ہے؟" نازنین کی فکرمندی چھپائے نہ چھپی۔

مطربہ نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"لندن سے آیا ہوگا"۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

اس بار نازنین نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ (اسے کیسے پتا؟)

"لندن سے"۔ اماں جی نے ہول کر پوچھا تھا۔

"نہیں..... اماں جی..... لندن سے نہیں ہے"۔ وہ عجلت میں کہتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ ظاہر ہے دوسری طرف کوئی منتظر تھا۔

"ہونہہ..... چھوٹی دلہن آپ کے تو چہرے پر لکھا ہے کہ فون لندن سے آیا ہے۔ اور یقیناً بیگم صاحبہ کا ہوگا"۔

اس کے اندر لاوا ابھرنے لگا۔ آنکھوں سے تپش آنے لگی۔

وہ ہال کی صفائی کی غرض سے جھاڑن ہاتھ میں لئے اندر آئی تھی مگر ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ تیمور علی خان نہایت روانی سے انگریزی میں فون پر بات کر رہے تھے۔ اس کی آمد کا انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ انگریزی یوں بھی اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ مگر ان کا رازدارانہ اپنائیت بھرا انداز چغلی کھا رہا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی کے کان میں سرگوشی کر رہے ہوں۔ عجیب سے رنگ ان کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ جو اس کیلئے بالکل نئے تھے۔

یہ چہرہ جو کئی بار خواب میں اسے اپنے قلب میں جھلکتا نظر آیا تھا۔ ہوش کی دنیا میں ابھی رنگوں کے ساتھ کہیں اور حسین تھا۔

وہ بے خبری کی کیفیت میں انہیں دیکھتی رہی۔

"وہ بھی کیا نام ہے۔ کیسے۔ کھڑی ہو؟"

وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سرد لہجے میں مخاطب ہوئے۔

وہ چونک پڑی۔ "کام کر رہی ہوں خان۔ آپ فکر نہ کریں میرے۔ انگریزی سمجھ میں نہیں آتی"۔

وہ مطربہ مسکرا کر ڈیکوریشن پیس پر کپڑا پھیرنے لگی۔

"جانے کیوں تیمور علی خان جھنجھلا کر رہ گئے۔ مگر کچھ مزید بولے بغیر دوبارہ فون میں مصروف ہو گئے۔

"نو..... نو..... ڈارلنگ..... ڈونٹ مائنڈ..... کم سی نو پلیز۔ ہوں۔ ہوں۔ یس"۔

"دل کسی گڑھے میں پھنسا تھا۔ اس نے چادر درست کی اور کام ادھورا چھوڑ کر باہر آگئی۔

"مطربہ..... تیمور کو دیکھا ہے کہیں؟" سامنے ہی اسے یاور علی خان مل گئے۔ بہت زبردست سوٹ کر رکھی تھی۔

"خان ہال میں ہیں۔ لندن بات کر رہے ہیں"۔ وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

"او کے..... وہ دیکھو ایک کپ چائے میرے کمرے میں بھجوا دو۔ ذرا جلدی"۔

وہ زینے کے قریب کھڑے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اوپر سے آرہے ہیں۔

"جی..... خان....." وہ جھاڑن ایک طرف ڈال کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خود چائے تیار کر رہی تھی۔

ماماجی نے اس سے بہت سی باتیں کیں مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ جانے ذہن کہاں الجھا ہوا تھا۔

ایک خوبصورت مرد کے ساتھ شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد وہ اس شخص کی اب دیکھنے کی طرف آشنائی رکھتی تھی۔ فرموں کے زیر اثر اس پر عمل چکے تھے۔ ایک عجیب سا ملال اس پر طاری تھا۔ اس نے بہت اہتمام سے چائے بنائی تھی۔ اسے پتا تھا یاور علی خان چائے میں کوکو بہت پسند کرتے ہیں۔

اس نے قہوے میں کوکو ملا کر کوئی نئی بات میں احساس دی تھی۔ اور ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

یاور علی خان صوفے پر بیٹھے کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ وہ کارپٹ پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

"چھوٹی دلہن کیا ناراض لگی ہوئی ہیں خان؟"

"اں..... ہاں..... شاید..... پتا نہیں"۔ وہ اپنی مصروفیت کے دوران قدرے چونکے۔

"آپ کو نہیں پتا؟" وہ تعجب سے مسکرائی۔

"وہ خود حویلی میں بہت مصروف رہتی ہیں۔ پتا ہے"۔ وہ اسی انداز میں گویا ہوئے۔

"جی آپ کے ساتھ تو وہ کم ہی نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں تیمور علی خان سے ان کا مزاج زیادہ ملتا ہے۔ اسی لئے بس انہی کے ساتھ رہتی ہیں"۔

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ان سے مخاطب تھی۔

"ہوں..... پتا ہے"۔ انہوں نے اسی مصروف انداز میں تائید کی۔

"ایک دن کہہ رہی تھیں کہ تیمور خان اس گھر میں نہ ہوتے تو حویلی میں رہنے کا کوئی مزا نہ ہوتا۔ وہ مجھ سے کتنے زیادہ ہیں اور باتیں بھی بہت اچھی کرتے ہیں۔ پھر بولیں۔ کاش حویلی کے سب مرد تیمور خان جیسے ہوتے"۔

اس نے چائے کا کپ یاور علی خان کے سامنے رکھتے ہوئے سادگی سے بتایا۔

"ہوں"۔ یاور علی خان کے انہماک میں کوئی کمی نہیں آئی۔

"اماں جی سے کہہ رہی تھیں کہ یاور تو بس بزرگ بنے رہتے ہیں۔ ہر وقت کتابیں اور فائلیں"۔

وہ باوجی کہنے لگی کہ "اگر ان کی شادی تیمور خان سے ہو جاتی تو جوڑا بہت سیٹ ہوتا"۔

"شٹ اپ..... واٹ اے نان سینس"۔ یاور علی خان نے فائل صوفے پر پٹخ دی۔ "اتنی بڑی ہو چکی ہو تمہیں ابھی تک بات کرنے کی سینس نہیں ہے کہ کس سے کس طرح کی بات کرتے ہیں"۔

اس روباجی کو بھیجو ادھر "کہتا ہوں اس کا بھی دماغ سیٹ"۔ یاور علی خان یکدم غضبناک ہو گئے تھے۔ "ان نوکروں کی اتنی ہمت"۔

حیرت کی بات تھی کہ ان کے غصے کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ایسی سکون کی کیفیت میں تھی جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"جاؤ تم یہاں سے۔ بری اپ" وہ اسی آف موڈ میں کہہ رہے تھے۔

"خان — حویلی کے سارے نوکر سب سے زیادہ آپ سے پیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ ادھر بہت کم ہوتے ہیں۔ نوکروں کو بہت کم بلاتے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں کہتے" وہ اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اچھا بس جاؤ"۔

"خان آپ غصہ نہ ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں کہ آپ کو مفت میں پریشان کریں۔ بھلا آپ تیمور خان سے پوچھ لیں۔ وہ کبھی بھی شیخ رفیع کی لڑکی سے شادی نہیں کریں گے۔ بلکہ آپ لوگ اگر انہیں کہیں کہ وہ پاکستان کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کرلیں تب بھی نہیں کریں گے"۔ وہ یہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

"نیسو لوٹلی ال لٹریری گرل۔ اتنا بھی نہیں پتا۔ پاکستان میں بادشاہت نہیں"۔ انہوں نے جھلا کر کاغذات سمیٹنا شروع کر دیے۔

ہال کمرے میں عجیب شور و غل مچا ہوا تھا۔ روشن آرا بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ پشاور سے بھی اماں جی کے میکے سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ کچن میں بھی خاص اہتمام تھا۔ عالم تاب اور اماں جی گاہے بگاہے کچن میں بھی چکر لگا لیتی تھیں۔ یاور علی خان شہر سے آئے تو بہن کی آمد کا سن کر سیدھے ہال میں ہی چلے آئے تھے۔

نازنین — اماں جی کے دوپٹے پر کروشیے کی بیل بنا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی چل رہی تھی۔

"یہ تیمور بچے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دے رہا۔ اب تم ہی بتاؤ بھلا ہم کیا کریں۔ شیخ رفیع کے گھر والے بھی کئی بار جتا چکے ہیں کہ ان کی لڑکی کے بہت پیام آ چکے ہیں۔ وہ لوگ جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہے ہیں"۔ اماں جی نے روشن آرا سے کہا تھا۔

"ارے چھوڑیں اماں جی۔ ایک منٹ میں سمجھا لیں گے انہیں۔ فکر ہی نہ کریں۔ مگر وہ ہیں کہاں؟ بلوائیں انہیں پھر دیکھیں کیسا تماشا دکھاتے ہیں آپ کو ابھی"۔

روشن آرا کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

"ارے روپا دیوی۔ دیکھنا تیرے چھوٹے خان کدھر ہیں؟ کہنا گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں"۔

اماں جی نے روپا دیوی کو برتن اٹھا کر باہر جاتے دیکھا تو ساتھ ہی نیا کام بتا دیا۔

"ان کے انداز کچھ اور کہہ رہے ہیں' بلاوجہ محنت کر رہے ہیں آپ لوگ"۔ نازنین نے دھاگے کا لٹکتا ہوا گولا سنبھال کر گرہ لگایا۔

یاور علی خان نے لاشعوری طور پر نگاہ ایک لمحے کو نازنین کے چہرے پر جما دی تھی۔

"ارے یوں نہ کہو اماں جی کی تو جان اٹکی ہوئی ہے شیخ رفیع کی لڑکی میں"۔ عالم تاب نے ٹوکا۔

"تم سے کچھ کہا ہے اس نے؟" اماں جی پریشان ہو گئی تھیں۔

"کہتے تو وہ کسی سے کچھ نہیں ہیں۔ آپ خود ان سے بات کریں"۔

نازنین کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ یاور علی خان کی نظریں مسلسل اسے فوکس کیے ہوئے تھیں۔

تھوڑی دیر بعد تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔ بہت دھیمی آواز میں انہوں نے حاضرین کو — السلام علیکم کہا تھا۔

"آؤ — آؤ — تیمور کہاں ہو تم۔ مہمان کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں"۔

عالم تاب نے ہمیشہ کی طرح بہت محبت و شفقت سے انہیں مخاطب کیا۔

"سیدھی سیدھی بات کریں بھابی بیگم ان سے۔ ڈرانے کی ضرورت نہیں"۔ روشن آرا نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔

"ہیں۔ کون سی بات؟" تیمور ماں کے پہلو میں بیٹھ کر کچھ حیران نظر آئے۔

"آپ کی منگنی کی رسم ادا کرنے اکٹھے ہوئے ہیں یہ سب۔ بس چلنے کا عالم ہے۔ اب تو آپ بھی کچھ بھی سوچ کر لیجئے"۔

یاور علی خان تیمور بھائی کی؟ دیکھتے ہوئے بظاہر مسکرا رہے تھے۔

"منگنی!" تیمور علی خان کو گویا شاک لگا تھا "واٹ"۔

"کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے کیا لوگوں کی منگنیاں میرا مطلب ہے منگنی نہیں ہوتی"۔ یاور علی خان نے جوابی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"پلیز — ٹاپک چینج کریں۔ بالکل بھی اچھا ٹاپک نہیں ہے"۔ تیمور علی خان کے لہجے میں بلا کی لاپروائی تھی جیسے انہیں درحقیقت اس قسم کے موضوع سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"تو اسی ٹاپک کیلئے تو آج شام آپ کو یہاں بلوایا گیا ہے"۔ نازنین کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔

تیمور علی خان کے چہرے سے یکدم سنجیدگی جھلکنے لگی۔

"سوری — فی الحال ہم اس ٹاپک پر بات کرنا پسند نہیں کریں گے۔ کوئی اور بات کریں آپ لوگ"۔ وہ غیر معمولی سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"واہ — کیوں اور بات کریں۔ ہم نے تمہیں یہاں بلوایا ہی اس لئے ہے کہ تمہیں بتائیں کہ کل ہم سب شیخ رفیع کے ہاں جا رہے ہیں۔ اور بس"۔ اماں جی کا انداز قطعی فیصلہ کن تھا۔

"ہرگز نہیں — فی الحال ہم لندن واپس جا رہے ہیں۔ ہمارا شادی منگنی کا دور دور تک پروگرام نہیں۔ آخری بات کے طور پر اماں جی آپ سے عرض کر رہے ہیں۔ آپ کے ملنے والوں میں کہیں کوئی لڑکی ایسی نہیں جس سے ہم شادی منگنی کریں۔ پلیز"۔

"خوبصورت ہے۔ نازنین جیسی انگریزی بولتی ہے۔ بڑے خاندان کی ہے اور کون پسند آئے گی۔ کون سے سرخاب کے پر لگے ہوں گے اس میں؟"

اماں جی کا خواب چکنا چور کیا ہوا صدمے سے ان کا لہجہ تھرتھرانے لگا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

یاور علی خان کی سوئی نازنین جیسی پر اٹکی ہوئی تھی۔ حالانکہ کوئی بات بھی تو نہیں تھی۔ اس سے پہلے ہزار مرتبہ اس قسم کی بات ہوئی تھی۔ مگر وہ آج بات بات پر چونک رہے تھے۔ انہوں نے وہ گھڑیاں انگلیوں پر گن ڈالی تھیں۔ جو نازنین کی ان کے ساتھ گزری تھیں۔ اور وہ بھی جو نازنین کی تیمور کے ساتھ گزری تھیں۔ انہیں از سرِ نو ہر واقعہ یاد آ رہا تھا۔ جب از خیال ان کے گھر میں موجود ہونے کے باوجود تیمور کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی ملی تھی۔ مطلب ..... اس نے زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں کی ہوگی۔ کم از کم ان سے تو ہرگز بھی نہیں۔ اتنی ڈرپوک بزدل لڑکی۔ اتنی بڑی بات بلاوجہ کیسے منہ سے نکال سکتی ہے جس کی واحد جائے پناہ یہ حویلی ہے۔

"اچھا تو یہ شرط ہے کیا کہ تمہاری دلہن بالکل چھوٹی بھابی جیسی ہونا چاہیے"۔ روشن آرا نے استفسار کیا۔

"ان کے جیسی تو شاید ہی کوئی ہو۔ مشرق کا نادر نمونہ۔ جب اس سیر وزنی کام کا سوٹ پہن کر اگر جی میں بات کرتی ہیں تو بس دیکھنے والی چیز ہوتی ہیں"۔

تیمور علی خان نے اپنے مزاج کے مطابق بہت کھل کر اپنے تاثرات بیان کیے۔

سب خواتین کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ "میرے خدا! اس سیر وزنی کام کا سوٹ"۔ عالم تاب کی بجائے شفیقہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ رہی تھیں۔

"آپ کوئی تبصرہ نہیں کریں گے یاور بھائی! آپ کی بیگم کی تعریف میں زمین آسمان ایک ہو رہے ہیں"۔ روشن آرا نے سوچ میں گم یاور علی خان کو چونکایا۔

"ایسا تو بہت عرصے سے ہو رہا ہے۔ شاید ہم لوگوں نے دھیان نہیں دیا"۔

"ہماری چھوڑیئے اپنی کہیے۔ آپ نے واقعی نہیں دیا ہوگا۔ آپ کو اپنی کتابوں سے فرصت کہاں۔ کتابیں سامنے ہوں تو آپ بندوں سے گزر جاتے ہیں"۔

روشن آرا نے تنقید کی۔ یاور علی خان کا جملہ درمیان ہی میں کٹ گیا تھا۔

"واہ آپا ..... کیا شاعرانہ وزن میں جملہ کہا ہے"۔ تیمور علی خان نے بے ساختہ داد دی۔

"اچھا ..... تم باتیں نہ بناؤ۔ ہمیں چلاؤ۔ سیدھی بات کرو۔ کیوں منع کر رہے ہو۔ کیوں نہیں کرنا چاہتے شادی"۔ اماں جی پر درمیان میں در آنے والی جملے بازی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ان کا ذہن ہنوز ایک نقطے پر اٹکا ہوا تھا۔

"کہہ تو دیا ہے اماں جی۔ ابھی نہیں کرنی ہے ہم نے شادی۔ جب کرنا ہوگی ہم خود کہہ دیں گے"۔

"پھر کب کرو گے۔ اچھی لڑکیاں اتنی آسانی سے بھی نہیں ملتیں۔ اپنی بہنوں بھابھیوں سے پوچھ لو۔ دیکھی ہوئی ہے انہوں نے۔ کیوں نازو؟" انہوں نے محسوس کیا کہ سب سے مضبوط گواہی نازنین کی ہو سکتی ہے۔

"یاور علی خان نے فوراً نازنین کی سمت دیکھا۔ وہ خاموش تھیں اور یاور علی خان کو اس کی خاموشی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

"ہمارا دور دور تک شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ سوری۔ آمین"۔ انہوں نے اس مرتبہ پھر دو ٹوک انداز اختیار کیا۔

"اماں جی ..... یہ لندن جا کر لاہور سے باہر ہو گئے ہیں۔ بگڑ گئے ہیں"۔ عالم تاب کی چھوٹی بھاوج سائرہ نے تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کی۔

(یہ بھی تو ہو سکتا ہے) یاور علی خان چونک کر بھائی کو بغور دیکھنے لگے۔

"آپ لوگ جو مرضی کہیں مگر شادی کا نام نہ لیں"۔ ان کا موڈ آف ہونے لگا تھا۔

"تیمور ..... یوں نہ کرو میرے بچے۔ بڑی خوشی ہے میری۔ ایسے نہیں کرتے بیٹے"۔

اماں جی کی آواز میں صدمے کی کیفیت محسوس کی جا سکتی تھی۔

"اماں جی ہو جائیں گی آپ کی خواہشیں پوری۔ فی الحال میری خوشی کی خاطر یہ معاملہ ختم کر دیں"۔ وہ دو ٹوک لہجے میں گویا ہوئے۔

"ختم کر دیں"۔ اماں جی سناٹے میں رہ گئیں۔

"جی"۔ تیمور علی خان کے انداز میں قصہ ختم ہونے کی علامت واضح تھی۔ یاور علی خان بہت جانچتی نظروں سے بھائی کو دیکھ رہے تھے۔

"چلو ٹھیک ہے۔ فی الحال معاملہ تو موقوف کر دیتے ہیں۔ مگر کچھ عرصے کے بعد تو کر لو گے نا شادی؟ یا انکار ہمیشہ کیلئے تو نہیں ہے؟"

انہوں نے بہت رسانیت سے تیمور علی خان سے سوال کیا۔

"ماشاءاللہ ہم اتنے بہن بھائی ہیں۔ سب ہی کی شادیاں ہو چکی ہیں اور دھوم دھام سے ہوئی ہیں۔ ہم نہ کریں تو کیا کمی ہے۔ شادی تو انسان کی اپنی ذات کیلئے ہوتی ہے۔ جب ہمارا موڈ ہی نہیں ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

بہت ہی عجیب و غریب جواب تھا۔

"شادی کا موڈ سے کیا تعلق ہے؟ ماں باپ کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ وقت پر اپنے بچوں کے نکاح کا بندوبست کریں"۔

اماں جی کے لب و لہجے سے شدید قسم کی ناراضگی کا اظہار تھا۔

"آپ نے آغاز ہی اہتمام کر کے اپنا فرض پورا کر دیا۔ آپ نے تو اپنی طرف سے فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اب تو یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ اچھا ہے یا برا ہم خود ہی ذمہ دار ہوں گے نا۔ آپ پر تو کوئی الزام نہیں ہے۔ پھر آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ پلیز اماں جی۔ آپ اتنا سیریس نہ لیں ہمارے انکار کو"۔

تیمور علی خان نے ماں کے ہاتھ تھام کر گویا انہیں منانے کی کوشش کی۔

"وکیل بننے کی ضرورت نہیں میرے سامنے۔ میں نہیں آنے کی تمہاری باتوں میں"۔

انہوں نے ناراضگی سے منہ موڑ لیا۔

"اماں جی کبھی بھی کوئی بات ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتی۔ گنجائش ہوتی ہے۔ بس وقت ہے۔ سمجھیں اماں جی"۔ تیمور علی خان

نے پھر ماں کو منانے کی کوشش کی۔

"کوئی خیال نہیں ہے تمہیں میرا۔ بس اوپر اوپر سے ہو"۔ ان کی ناراضی اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو سکتی تھی۔ ایک انسان جس کی ہر امید اللہ نے پوری کی ہو اس کیلئے تو خلاف امید کچھ ہو جانا سامنے سے گزرنا نہیں ہوتا"۔

"آپ بھی سمجھائیں ناں یاور بھائی پلیز"۔

"ضرور ہیلپ کریں گے۔ مگر ریزن تو بتائیں۔ موصوف"۔

یاور علی خان کی دلی کیفیت اعلیٰ درجے کے انتشار سے دوچار تھی۔ وہ "سب اچھا ہے" سننے کے عادی تھے۔ انہیں یہی سننے کی آرزو تھی۔ وہ یہ خوفناک انکشاف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں عجلت تھی کہ "سب اچھا ہے"۔ جلد سے جلد ہو جائے اور وہ مطربہ کو سرعام کوڑے لگوائیں۔ انہوں نے بہت اچھی امید کے ساتھ بھائی سے ریزن دریافت کی تھی۔

تیمور علی خان نے ایک لمحے کو نازنین کی سمت نظریں اٹھائیں۔ "سوری ابھی ہم کوئی ریزن نہیں دے سکتے"۔

یاور علی خان کے دل میں کچھ ہوا۔ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ سب ایک روز سامنے آ جائے گا آپ لوگ کیوں بے کار کی بحث کر رہے ہیں"۔

وہ عجیب انداز میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

تیمور علی خان اور نازنین ان کے اس انداز پر چونک سے گئے تھے اور خاصی حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

آج وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ حال ہی میں انہیں یہ لت لگی تھی مگر آج تو جیسے اسموک کر رہے ہوئے تھے۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کسی دھیان سے چونک پڑے۔

نازنین تو نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی خواب گاہ میں دستک دے کر کیوں آنے لگی۔

"یس ___ کم ان"۔ وہ دروازے کی سمت دیکھنے لگے۔

دروازہ کھلا اور مطربہ اندر داخل ہوئی۔

"خیریت"۔ وہ بہت عرصے بعد ان کے بیڈ روم میں بن بلائے داخل ہوئی تھی۔

"جی۔ سب کیلئے چائے بنائی تھی۔ خیال آیا کہ آپ تو رات دیر تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ آپ کو بھی پوچھ لوں"۔

"ہوں ___ ٹھیک ہے لے آؤ"۔

وہ واپس مڑ گئی۔

"مطربہ"۔ انہوں نے بے ساختہ انداز میں آواز دی تھی۔

"جی خان؟" وہ پلٹی۔

"تمہاری چھوٹی دلہن کیا کر رہی ہیں؟"

"وہ"۔ ایک لمحے کو کچھ سوچنے کے انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"خان۔ وہ تو چھوٹے خان کے ساتھ شطرنج کھیلنے اوپر چلی گئی ہیں۔ بہت دیر ہو گئی۔ میں انہیں بھی چائے دینے جا رہی تھی۔ آپ کہیں تو بھیجوں؟"

"شطرنج کھیلنے۔ اس وقت؟"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے تم جاؤ اور ہاں سنو"۔ انہیں پھر کچھ یاد آیا۔

"جی"۔

"باقی لوگ سو گئے؟"

"نہیں سب جاگ رہے ہیں۔ اماں جی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہیں"۔

"اچھا ٹھیک ہے"۔ وہ سگریٹ کا کش لینے لگے۔

مطربہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

"چوہدران جواب لینے کیلئے چکر پہ چکر لگا رہی ہے۔ دیر سے آئی بیٹھی ہے۔ بتاؤ کیا جواب دوں؟ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی"۔

اماں جی آج خود حویلی چل کر تیمور کے کمرے میں آئی تھیں۔

مطربہ نے چوہدران کو بھی دیکھ لیا تھا اور اماں جی کو بھی تیمور کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فوراً سے پیشتر دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی تھی کہ آج اسے اپنی اوقات اپنے اختیار کی حد دیکھنا تھا۔

"ایک نان سینس لڑکی کو آپ نے وہ درجہ دیا ہے۔ نٹ اے بزنس۔ ہمارا جواب۔ آپ چوہدران کو صراحت سے بارات لانے کا کہہ دیں۔ اینڈ دیٹس آل"۔ وہ جھلا کر گویا ہوئے۔

"یہ انگریزی میں اتنا آسان لگ رہا ہے۔ اردو میں اتنا آسان نہیں ہے"۔

اماں جی کی جان جل کر رہ گئی تھی۔ جھلا کر بولی تھیں۔

"نو پرابلم اماں جی۔ آپ غیر ضروری حد تک کنسڈر کر رہی ہیں۔ میرا مطلب ہے نرم ہیں۔ کیا کریں گی جب اس کے تمام وعدے سکیور ہو جائیں گے اور ہول ایٹ موسٹ"۔

"اللہ کا واسطہ تیمور۔ میرے کانوں میں انگارے اترتے ہیں۔ اس مردود انگریزی سے۔ اس سے تو بہتر ہے تم مجھ سے مقامی بولی میں بول لیا کرو۔ کم سے کم میری سمجھ میں تو آتی ہے"۔

"سوری اماں جی۔ ہمارا مطلب ہے آپ ان تاریخ طے کر دیں اور چوہدران سے کہیں زیادہ شور شرابہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے چار آدمیوں کی بارات لے آئے"۔

"اور جو عین وقت پر اس نے"۔ اماں جی کا دل جانے کیوں نہیں مان رہا تھا۔

"شوٹ کریں گے ہم اسے۔ اسے اچھے برے کی تمیز آج نہیں ہے تو کیا ہوا کل تو ہو گی۔ پتا چل جائے گا کہ کس کے ساتھ اچھا کیا تھا یا برا۔ اور وہ جو اس کی نام نہاد ماں ہے۔ اگر اسے ہوا لگ گئی کہ بیٹی 'فارغ' ہے تو کیا پتا ... یوں بھی اس کا بگڑا ہی کیا ہے۔ بچہ ہے تو وہ کون سا اس کا اپنا ہے"۔

"تمیز، یہ تو تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر ایک سوچ یہ آتی ہے کہ اللہ جانے وہ دوسری شادی سے کیوں انکار کر بیٹھی۔ کہیں کوئی اور جذبہ نہ ہو اور وہ ہمیں کہنے نہ پا رہی ہو"۔ اماں بی کا انداز ابھی تک فیصلہ کن نہیں تھا۔

"ہم آپ کو کہہ رہے ہیں ناں۔ چلیے۔ ہم خود بابا صاحب سے بات کرتے ہیں۔ وہ خود کہہ دیں گے ... نا آپ۔ اب آپ پرسکون ہو جایئے اور ذہن سے ہر قسم کا بوجھ اتار دیجیے۔ پھر ان سے کہہ دیجیے کہ بابا صاحب خود دیکھ لیں گے وہ اب زحمت نہ کرے۔

"آیئے۔ بہت کوفت ہوتی ہے ہمیں دیکھ کر کہ ایک خواہ مخواہ کی پریشانی میں مبتلا ہیں آپ۔ آپ چلیے اپنے کمرے میں ہم بابا صاحب کے پاس جا رہے ہیں"۔

معطر فوراً دروازے سے ہٹ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور بھاگتی ہوئی سیدھی باغ میں آ گئی اور گہری گہری سانس لینے لگی۔

"مجھے تو نکاح ہو گا میرا۔ اس سینگ سلائی پڑھا کو کے ساتھ۔ بچے کے ساتھ راتوں کو میں نے جتنی ... اور میرا کچھ نہیں"۔

جتنا تیز سانس چل رہا تھا اس سے ہزار گنا تیز اور دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔

"اب میں اپنے دل کے ساتھ زبردستی نہیں ہونے دوں گی۔ اب کسی کے پہلو میں بیٹھ کر میں تمہیں نہیں بھلا سکتی یاور علی خان۔ اب یہ نہیں ہو گا کہ کوئی قریب ہو اور میں تمہاری خوشبو محسوس کروں۔ تم چاہنے والی ماں کے احساس کو ہم ... تو پھر میرے کیا لگتے ہو؟ اس سے تو تمہارا انکار ہو تو کیا خوب تماشا ہو۔ دل صرف جاگیرداری کا ہوتا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔ جو ہونا تھا ہو ...

"۔

ایک ان دیکھی آگ کے شعلوں میں وہ جل کر خاک ہو رہی تھی۔

"تم... اس وقت؟" یاور علی خان نے چونک کر گھڑی دیکھی۔

"جی خان... آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ آپ یہاں چھوٹی دلہن کا انتظار کر رہے ہیں"۔ وہ دروازے کے قریب کھڑی تھی۔

یاور علی خان جواباً خاموش رہے۔

"خان... آپ بہت اچھے ہیں۔ بہت نیک آدمی ہیں۔ مجھے بھی آپ کے ساتھ اس زیادتی کا دکھ ہے"۔ وہ دھیمے

سے کہہ رہی تھی۔

"کون سی زیادتی؟" وہ چونکے۔

"تیمور خان کو آپ کے ساتھ یہ نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں ایک سے ایک حسین چھوٹی مل سکتی ہے۔ پھر آپ تو ان کے بھائی ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے"۔ معطر کے انداز میں تاسف تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" یاور علی خان کا ضبط جواب دے گیا۔

"آپ جتنا غصہ کریں کم ہے خان۔ میں حویلی کے ہر دو میں سے ہوں اور آپ تو اتنے اچھے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ یہ زیادتی برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ آپ یہ دیکھیں کہ میں بیٹھ کر ... تیمور خان اور چھوٹی دلہن کے سامنے بھی لا کر کچھ پوچھیں گے تو میں حاضر ہو جاؤں گی۔ اور مجھ سے جو پوچھیں گے میں ان دونوں کے سامنے جواب دوں گی"۔ یاور علی خان۔ ایک سکتے کی کیفیت میں اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔

"آپ چاہیں تو ابھی بلوا لیں۔ میں یہیں ہوں آپ کے کمرے میں"۔ وہ بہت سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا"۔ یاور علی خان کی شریانوں میں طوفان برپا ہو چکا تھا۔

"کچھ تو تمیز آپ کو ہے ناں خان۔ مگر آپ کو یقین نہیں آ رہا۔ اور آ بھی کیسے سکتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات تو نہیں ہے۔ آپ ان دونوں کو ابھی میرے سامنے بلوا سکتے ہیں"۔

اتنی بزدل لڑکی۔ یہ سب کہہ رہی تھی۔ سامنا کرنے کو تیار تھی۔ ان کی ہستی آخر کیسے تہس نہس نہ ہوتی۔

"کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟" وہ بہت تھکی تھکی آواز میں پوچھ رہے تھے۔

"اس لیے کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ میں آپ کی سب سے زیادہ عزت کرتی ہوں۔ بس مجھ سے برداشت نہیں ہوا یہ سب"۔

"کیا جانتی ہو تم... تم یوں بھی خاصی بے وقوف لڑکی ہو"۔ وہ ہنوز کسی الجھن میں مبتلا تھے۔

"بے وقوف ضرور ہوں خان۔ مگر چھوٹی سی بچی نہیں ہوں۔ شادی کی تھی آپ لوگوں نے میری۔ ایک جاہل آدمی کے ساتھ"۔ وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

"تمہیں کیا حاصل ہو گا اس ہمدردی سے؟" وہ دکھ سے پوچھ رہے تھے۔

"اپنی اپنی برداشت کی بات ہے۔ مجھ سے نہیں ہوا یہ برداشت۔ مجھے پتا ہے تیمور خان مجھے گولی بھی مار سکتے ہیں۔ میں یہ سب آپ کو بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں نے تو آپ کو موقع دیا کہ آپ خود دیکھ لیں سب کچھ اور میں اس معاملے میں نہ پڑوں مگر آپ"۔ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"تمہیں علم ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ اگر غلط بات ہوئی تو تمہارا انجام کیا ہو گا؟" انہیں اتنی آسانی سے یقین آتا تو کیونکر۔ حالانکہ بہت سارے واقعات ان تمام باتوں کے حق میں جاتے محسوس ہو رہے تھے۔

"ٹھیک ہے ناں خان۔ مجھے ہر سزا منظور ہو گی"۔ وہ بولی۔

یاور علی خان تو جیسے کوما میں چلے گئے۔ ایک رات سے تھر تھر کانپنے والی لڑکی ایک دم اتنی نڈر کیسے ہو گئی۔ یہ تو بہت سادہ اور معصوم لڑکی ہے۔ درحقیقت جو کچھ وہ کہہ گئی وہ کوئی بے وقوف ہی کہہ سکتا ہے۔ ورنہ اچھے اچھوں کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ اتنے با اختیار لوگوں کے سامنے ایسی حقیقت پیش کر سکیں۔ جو حق ہونے کے باوجود ان کو نقصان پہنچا سکتی ہو۔

"سنو" یاور علی خان نے اسے مخاطب کیا۔

"جی خان"۔

"آئندہ...... ہم سے اس قسم کی بات نہ کرنا۔ ہم میں جتنی برداشت ہے وہ ہم کر چکے۔ مگر ہو سکتا ہے ہم آئندہ یہ سب نہ کر سکیں اب تم جاؤ"۔

وہ ان کے تیور دیکھ کر ایک لمحے کو واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی اور جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

"آپ نہیں چلیں گے خیر آباد؟" نازنین نے کوفت بھرے انداز میں یاور علی خان سے پوچھا۔

"نہیں...... نہیں کا مطلب نہیں ہوتا ہے نازبیگم"۔

"دیکھیے اماں جی۔ یہ کراچی بھی نہیں گئے تھے میرے ساتھ۔ دو دن کی تو بات ہے۔ آپ کہیے ناں انہیں"۔ اس کے انداز میں زبردست اصرار تھا۔

"چلے جاؤ یاور۔ ہر وقت اپنی نہیں کرتے"۔ اماں جی نے بھی بہو کا دل رکھا۔

"تیمور جا رہے ہیں ناں...... بس ٹھیک ہے"۔

"یہ لیجیے۔ آپ ہیں 'تیمور تیمور' ہیں۔ ہم آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہے آپ بالکل ہی چھٹی پر چلے جائیں"۔ وہ بسوری۔

معطر اماں جی کے پیچھے بیٹھی ان کے کرتے کی تُرپائی کر رہی تھی۔ اور ان کی تکرار سے بے نیاز نظر آ رہی تھی۔

"دل اور سا ہو جاتا ہے۔ ادھر ادھر سیر و تفریح کرنے سے۔ یہ پڑھائی تو بہو کی سوت بنا رکھی ہے تم نے"۔ اماں جی نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے اماں جی...... ان کی سیر و تفریح پر ہماری غیر حاضری سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں انہیں تو منع نہیں کر رہا"۔ وہ بہت بے دلی سے کہہ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے پھر میں نہیں جا رہی"۔ نازنین کا موڈ آف ہو گیا۔

"بیٹے۔ بہو دوسرے ہی سے ہے کیوں جان جلاتے ہو اس کی۔ ایک دو دن سے ہو کیا جاتا ہے"۔ اماں جی کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔

"میری اور ان کی ملاقات ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ رات کو ہوتی ہے۔ چھ گھنٹے یہ رات کو سوتی ہیں اور دو گھنٹے دوپہر کو۔ باقی رہے چودہ گھنٹے یہ کہاں صرف ہوتے ہیں۔ یقیناً خوشگوار ہی بسر ہوتے ہوں گے"۔

"تو...... بیٹھ پڑھ کر یہ بڑی تاثیری ہو گئی ہے۔ کیا حساب لگا ہے۔ بیٹے تم تھوڑے مصروف ہے تو وہ بے چاری کیا کرے"۔ اماں جی کو بہو کے ساتھ اعداد و شمار پر تبادلہ کا انداز پسند نہیں آیا۔ نازنین بھی چپ ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ سب کے سامنے یہ حساب کتاب اچھا نہیں لگا تھا۔

"نہیں جانا تو نہ جائیں مگر اس طرح سب کے سامنے انسلٹ دے کر تو نہ جائیں گا"۔ وہ دوپٹہ سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

"ہم کہیں نہیں جا رہے بیٹھیے اماں جی...... ایک کونے میں پڑے رہیں گے۔ آپ ان سے کہیے ہمیں بھی اپنے ساتھ ہی کہیں سرکاری نوکر رکھوا دیں۔ کرسی میں بالکل ان کے برابر ہونا چاہیے"۔ وہ ناراضگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ یاور علی خان نے چونک کر کتاب سے سر اٹھایا تھا۔ حیرت مزید بڑھ گئی۔ سامنے اماں جی تھیں۔ وہ ایک دم سنبھل گئے۔

"آپ اماں جی...... خیریت...... مجھے بلوا لیا ہوتا آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"سنا ہے۔ مرد کی شادی ہوتی ہے تو بیوی کے پیچھے سب بھول جاتا ہے۔ مگر جس کو بیوی دھیان نہ دیتی ہو وہ ماں باپ کا کہاں دھیان کرتا ہوگا۔ آگے مجھے اس پڑھائی کو تم اتنے دور محسوس ہوتے ہو کہ لندن گیا ہوا تیمور قریب لگتا ہے"۔

وہ شکست خوردہ اور شفیق لہجے میں بولتی ہوئی ان کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"بہت ناراض لگ رہی ہیں؟" وہ زبردستی مسکرائے تھے اور ماں کو بہت محبت سے دیکھا تھا۔

"ناراض نہ ہوں تو پھر کیا کروں۔ کتنی غلط بات کی تم نے چھوٹی دلہن کے ساتھ۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ سب کے سامنے اس نے اپنی بہت بے عزتی محسوس کی ہے تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انکار کے اور بھی بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ مجھے تم سے ایسی بے تکی حرکت کی امید نہیں تھی۔ وہ میری پسند ہے۔ بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھی۔ اور یہی بات مجھے اپنی پسند پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اتنی انگریزی پڑھی ہوئی ہے مگر حویلی کے اصولوں پر چلتی ہے۔ کتنے نوکر ہیں گھر میں مگر میرے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اپنے ہاتھوں میری کنگھی چوٹی کرتی ہے پتا نہیں کیا کیا طاقت کی چیزیں بنا بنا کر مجھے کھلاتی ہے۔ بیٹے! اس گھر میں اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں۔ ہمارے پوتے کی ماں ہے۔ پہلے سے زیادہ وہ اس کا رشتہ گہرا ہو چکا ہے ہم سے۔ مت پریشان کیا کرو اسے مجھے تکلیف ہوتی ہے"۔

وہ بہت سنجیدہ تھیں۔

"جی اماں جی...... اب تو سب کچھ اسی کا اس گھر سے وابستہ ہے۔ گھر آباد ہو جائے تو خاص بات نہیں ہوتی۔ دل آباد ہو جائے تو زندگی مکمل ہو جاتی ہے۔ انسان قیامت تک کیلئے پُرسکون ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات دل کا معاملہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ انسان کی خوشی غم، جنت دوزخ، دنیا آخرت سب اسی دل سے مشروط ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کسی نفع نقصان کی پروا نہیں کرتا"۔

"پتا نہیں کیا زمین آسمان کی جوڑ رہے ہو۔ بات کیا ہو رہی ہے۔ کہاں ملا رہے ہو۔ اللہ کا شکر ہے اس کا دل تم سے آباد

یاور علی خان تو جیسے کوما میں چلے گئے۔ ایک ولن سے تھر تھر کانپنے والی لڑکی ایک دم اتنی نڈر کیسے ہو گئی۔ وہ بہت سادہ اور معصوم لڑکی ہے۔ درحقیقت جو کچھ وہ کہہ گئی وہ کوئی بے وقوف ہی کر سکتا ہے۔ ورنہ ابھی تک تو کسی کی ہمت نہیں ہو سکی کہ اتنے بااختیار لوگوں کے سامنے ایسی حقیقت پیش کر سکیں۔ جو جانتے ہوئے کے باوجود ان کو انہیں نقصان پہنچ سکتا ہو۔

"سنو۔" یاور علی خان نے اسے مخاطب کیا۔

"جی خان۔"

"آئندہ...... ہم سے اس قسم کی بات نہ کرنا۔ ہم میں جتنی برداشت ہے وہ ہم کر چکے۔ مگر ہو سکتا ہے ہم آئندہ یہ سب برداشت نہ کر سکیں اب تم جاؤ۔"

وہ ان کے تیور دیکھ کر ایک لمحے کو واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی اور جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

"آپ نہیں چلیں گے خیر آباد؟" نازنین نے کوفت بھرے انداز میں یاور علی خان سے پوچھا۔

"نہیں...... نہیں کا مطلب نہیں ہوتا ہے نازبیگم۔"

"دیکھیے اماں جی۔ یہ کراچی بھی نہیں گئے تھے میرے ساتھ۔ دو دن کی تو بات ہے۔ آپ کہیے ناں انہیں۔" اس کے انداز میں زبردست اصرار تھا۔

"چلے جاؤ یاور۔ ہر وقت اپنی نہیں کرتے۔" اماں جی نے بھی بہو کا دل رکھا۔

"تیمور جا رہا ہے ناں...... بس ٹھیک ہے۔"

"یہ لیجیے۔ آپ ہیں، تیمور، تیمور ہیں۔ ہم آپ کو دعوت نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہے آپ بالکل ہی چھٹی پہ چلے جائیں۔" وہ بسوری۔

معطر اماں جی کے پیچھے بیٹھی ان کے کرتے کی ترپائی کر رہی تھی۔ اور ان کی تکرار سے بے نیاز نظر آ رہی تھی۔

"دل اور سا ہو جاتا ہے۔ ادھر ادھر سیر و تفریح کرنے سے۔ یہ پڑھائی تو بہو کی سوت بنا رکھی ہے تم نے۔" اماں جی نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے اماں جی...... ان کی سیر و تفریح پر ہماری غیر حاضری سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں انہیں تو منع نہیں کر رہا۔" وہ بہت بے دلی سے کہہ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے پھر میں نہیں جا رہی۔" نازنین کا موڈ آف ہو گیا۔

"بیٹے۔ بہو درست ہی تو ہے۔ کیوں جان جلاتے ہو اس کی۔ ایک دو دن سے ہو کیا جاتا ہے۔" اماں جی کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔

"میری اور ان کی ملاقات ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ رات کو ہوتی ہے۔ چھ گھنٹے یہ رات کو سوتی ہیں اور دو گھنٹے دن کو۔ باقی رہے چودہ گھنٹے یہ کہاں صرف ہوتے ہیں۔ یعنی خوشگوار بسر ہوتے ہوں گے۔"

"تو...... پانچ بجے کر جو رات کتابی ہوگی ہے۔ کیا حساب لگا ہے۔ بیٹے تم تو واقف ہو مصروف ہے۔ وہ بے چاری کیا کرے۔" اماں جی کو بہو کے ساتھ اعداد و شمار پر تل کا انداز پسند نہیں آیا۔ نازنین بھی چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ سب کے سامنے یہ حساب کتاب اچھا نہیں لگا تھا۔

"نہیں جانا تو نہ جائیں مگر اس طرح سب کے سامنے انسلٹ دے کر تو نہ جائیں۔" وہ دوپٹہ سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

"ہم کہیں نہیں جا رہے اماں جی...... ایک کونے میں پڑے رہیں گے۔ آپ ان سے کہیے ہمیں اپنے ساتھ ہی رکھیں مرکزی تو کر رکھا ہے۔ کرسی بھی بالکل ان کے برابر ہونا چاہیے۔" وہ ناراضگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ یاور علی خان نے چونک کر کتاب سے سر اٹھایا تھا۔ حیرت مزید بڑھ گئی۔ سامنے اماں جی تھیں۔ وہ ایک دم سنبھل گئے۔

"آپ اماں جی...... خیریت...... مجھے بلوا لیا ہوتا آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"سنا ہے۔ مرد کی شادی ہوتی ہے تو بیوی کے پیچھے سب بھول جاتا ہے۔ مگر جس کو بیوی دھیان نہ دیتی ہو وہ ماں باپ کا کہاں دھیان کرتا ہو گا۔ آگ لگے اس پڑھائی کو۔ تم آتے ہو تو محسوس ہوتا ہے ہو کر لندن گیا ہوا تیمور قریب لگتا ہے۔"

وہ شکوہ اور شفیق لہجے میں بولتی ہوئی ان کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"بہت ناراض لگ رہی ہیں؟" وہ زبردستی مسکرائے تھے اور ماں کو بہت محبت سے دیکھا تھا۔

"ناراض نہ ہوں تو پھر کیا کروں۔ کتنی غلط بات کی تم نے چھوٹی دلہن کے ساتھ۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ سب کے سامنے اس نے اپنی بہت بے عزتی محسوس کی ہے تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انکار کے اور بھی بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ مجھے تم سے ایسی بے تکی حرکت کی امید نہیں تھی۔ وہ میری پسند ہے۔ بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھی۔ اور یہی بات مجھے اپنی پسند پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اتنی انگریزی پڑھی ہوئی ہے مگر حویلی کے اصولوں پر چلتی ہے۔ کتنے نوکر ہیں گھر میں مگر میرے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اپنے ہاتھوں میری کنگھی چوٹی کرتی ہے پتا نہیں کیا کیا طاقت کی چیزیں بنا بنا کر مجھے کھلاتی ہے۔ بیٹے! گھر میں اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں۔ ہمارے پوتے کی ماں ہے۔ پہلے سے زیادہ اس کا رشتہ گہرا ہو چکا ہے ہم سے۔ مت پریشان کیا کرو اسے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ بہت سنجیدہ تھیں۔

"جی اماں جی...... اب تو سب کچھ اسی کا اس گھر سے وابستہ ہے۔ گھر آباد ہو جائے تو خاص بات نہیں ہوتی۔ دل آباد ہو جائے تو زندگی مکمل ہو جاتی ہے۔ انسان قیامت تک کیلئے پرسکون ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات دل کا معاملہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ انسان کی خوشی غم، جنت دوزخ، دنیا آخرت سب اس دل سے مشروط ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کسی نفع نقصان کی پرواہ نہیں کرتا
"

"پتا نہیں کیا زمین آسمان کی جوڑ رہے ہو۔ بات کیا ہو رہی ہے۔ کہاں ملا رہے ہو۔ اللہ کا شکر ہے اس کا دل تم سے آباد

ہے۔ ایک عمر شہر میں گزارنے کے بعد وہ یہاں اُم میں رو رہی ہیں اس طرح جیسے ہمیشہ ایسے ہی ماحول میں رہی ہوں۔

"اسے فرق کیا پڑتا ہے اماں جی —— حویلی میں بھی پڑھا لکھا ماحول ہے۔ کھیتوں میں ہل چلانے تو نہیں جا رہی ہیں۔"

وہ قدرے جھلائے جیسے وہ اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہ رہے ہوں۔

"تمہیں کوئی شکایت ہو گئی ہے اس سے؟" اماں جی نے گہری نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں دراصل بہت مصروف ہوں۔ میرے ایگزام ہونے والے ہیں۔" انہوں نے نگاہیں چرا لیں۔

"نہیں اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔" وہ شاید گہرے وجدان کے تحت بات کر رہی تھیں۔

"اماں جی! کوئی بات نہیں ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔"

"فکرمند کیسے نہ ہوں۔ میری بہو پریشان ہے رو رہی ہے۔ حد کرتے ہو تم" وہ ناراضگی سے بولیں۔

"اٹھو۔ چلو میرے ساتھ۔ اسے ساتھ یہاں لے کر آؤ" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "چلو"۔

"آپ اسے لے آئیں۔ پھر میں سنبھال لوں گا" وہ جزبز ہو رہے تھے۔

"نہیں —— تم میرے ساتھ چلو —— اٹھو شاباش۔ یہ کوئی ناک کی بات نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے گھر مضبوط ہوتے ہیں۔ خوشی ملتی ہے۔ آؤ"۔

"اماں جی کے انداز میں قطعی حکم تھا۔ وہ چارپائی سے اتر آئے۔

اماں جی چل پڑیں اور وہ ان کے پیچھے ہو لیے۔

ان کا خیال تھا کہ اماں جی ہال کی طرف جائیں گی مگر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"واقعی بہت ذہین ہو نازنین بیگم" وہ دل ہی دل میں گویا ہوئے۔

اماں جی کے پیچھے وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ مگر پھر وہ بے اختیار میں گھر گئے۔ نازنین اماں جی کے بستر پر نیم دراز تھی اور تیمور علی خان کرسی پر ان کے قریب جھکے ہوئے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے تھے۔ جبکہ نازنین کی آنکھیں رو رو کر متورم ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟ طبیعت خراب ہے؟" وہ بظاہر انجان بن کر پوچھنے لگے۔ آواز بالکل سپاٹ تھی۔

نازنین خاموش رہی۔

"یہاں اماں جی کے کمرے میں کیوں لیٹی ہو؟ اپنے بیڈروم میں چلو"۔ وہ پھر اسی سرد و سپاٹ انداز میں گویا ہوئے۔

نازنین پھر خاموش رہی۔

"ہاں بیٹی —— جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔ میرے کمرے میں تو سب کا آنا جانا لگا رہتا ہے"۔

اماں جی بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اماں جی! میں یہیں ٹھیک ہوں"۔ اس نے منہ دوسری طرف موڑتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔

"ہوں ضد کر رہی ہیں؟ یہاں آپ کو آرام نہیں ملے گا۔ ہر دوسرے منٹ تو یہاں کوئی نوکر ہدایت لینے آ جاتا ہے۔"

"پھر یاور بھائی آپ کو لینے آئے ہیں"۔ تیمور علی خان کے لہجے میں شرارت تھی۔

"یہ میری بیوی ہے اسے اس طرح رہنے دو۔ یہاں بھی انہیں کا کام ہوتا ہے"۔ وہ سپاٹ انداز میں گویا ہوئے۔

"پلیز —— جھگڑا نہیں۔ آپ اس طرح کی صورتحال نہ بنائیں ورنہ اماں جی پریشان ہوں گی"۔ تیمور علی خان مسکراتے ہوئے سمجھا رہے تھے۔

نازنین بے دلی سے اٹھ بیٹھی۔ "ٹھیک ہے پھر آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ بیڈروم میں"۔ اس نے دوپٹہ سنبھالا۔

"ارے آگ رہا ہے آیا، بھائی ڈانٹیں گے نہیں"۔ وہ پھر شرارت سے گویا ہوئے۔

"جی نہیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ سے باتیں کریں گے"۔ اس کے انداز میں ابھی بھی خفگی کا عنصر تھا۔

"ہاں چلو تیمور! یہ بھی ان کی سب سے زیادہ انڈرسٹینڈنگ تم ہی سے ہے"۔ یاور علی خان نے بھی خشک انداز میں کہا۔

"تو اس میں شک بھی کیا ہے"۔ نازنین نے ترنت کہا۔

"اگر کسی کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ نہ بھی ہو تو پیدا کرنے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے"۔

تیمور علی خان اس وقت مکمل شرارت کے موڈ میں تھے۔ وہ ذو معنی بات کہہ رہے تھے۔

یاور علی خان اس کے قدم بڑھ جانے سے پہلے باہر نکل گئے تھے۔

"بات بڑھ جانے کا کیا فائدہ دلہن؟ اب وہ چل کر تمہارے پاس آ ہی گیا تھا"۔

اماں جی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی۔ یاور بھائی ویسے بھی بہت سیریس ہیں۔ آپ نہ اتنا سیریس ہوا کریں۔ خوامخواہ کی پرابلم کری ایٹ ہوتی ہے"۔

انہوں نے بھی اماں جی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بہت روادار سودائی ہیں یاور۔ اگر آپ جیسے کھلنڈرے اور سوفٹ نیچر لوگ حویلی میں نہ ہوتے تو میں بہت پریشان ہو جاتی"۔ وہ ناراضگی سے کہہ کر چل پڑی۔

"کیا بولی دلہن؟" اماں جی نے الجھ کر تیمور سے پوچھا۔

"آپ کی تعریف کر رہی تھیں"۔ تیمور علی خان مسکرا رہے تھے۔

"وہ "لوگ" کہہ رہی تھی؟" ان کی فکرمندی بڑھ رہی تھی۔

"تو یہاں لوگوں کی سردار تو آپ ہی ہیں ناں"۔ تیمور علی خان نے وضاحت کی۔

"مجھے نہیں چاہیے سرداری۔ میرے بچے خوش رہیں اور کیا چاہیے مجھے۔ جاؤ تمہیں بلا گئی ہے۔ اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں یاور سے نہ الجھ پڑے۔ خوامخواہ بات بڑھے گی"۔

اماں جی نے تیمور علی خان کو اس طرح کہا کہ وہ الجھنے میں مزید دیر نہ کریں۔

"کچھ نہیں ہوتا اماں جی۔ بھابی اتنی اچھی ہیں کہ بڑے بھائی ان سے زیادہ دور رہ ہی نہیں سکتے۔ آپ تو جانتی ہوں۔ بہر حال چلا جاتا ہوں"۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

کوئی سایہ کھڑکی سے فوراً ہٹا تھا۔ جس کا گمان ابھی تک اس بیٹے کو نہ ہو سکا تھا۔

"اماں جی اپنی مہمان سے کہیے ایک مہینہ ٹھہر جائے۔ ابھی میرا دل لگا نہیں ہے۔ وہ ماحول پریشان رہتا ہے"۔

عطریہ کارپٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور ہاری کو بیچ سے کوئی ویڈیو دکھا رہی تھی۔

اماں جی نے خوشگوار حیرت سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

"تیرا دل ہی تو لگانے لگا چاہ رہے ہیں۔ بے لگانہ جو ہو گیا ہے"۔ خالہ نے ہنس کر کہا۔ وہ بھی پیچھے خود کو بہت پھیکا محسوس کرنے لگی تھیں۔

"تو وہ تو ٹھہر جائے گی۔ وہ تو ہمیں ہی جلدی ہے"۔ اماں جی نے بہت مسرور انداز میں کہا۔

"آپ کو کیوں جلدی ہے؟" اس نے قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں تو تمہیں کپڑوں میں شوخ کھلتی اچھی لگتی ہے۔ ان کالے کپڑوں میں تو بہت بے رونق ہو گئی ہے"۔ ان کے انداز میں حد درجہ حلاوت و اپنائیت تھی۔

"اماں جی بعض اوقات رنگ تو دوسروں ہی کیلئے ہوتے ہیں۔ کسی کو کیا پتہ چلے کہ ماتم تو رنگوں میں بھی ہوتا ہے۔ انسان اپنے دیکھنے کا اتنا اعتبار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ غیب کا حال اللہ جانتا ہے یونہی تو نہیں کہہ دیا کسی نے؟" اس نے بات کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر آپ آس پاس موجود بندوں کو خوشی دینے سے بھی انسان کو سچی خوشی مل جاتی ہے۔ ایسی ہی خوشی کے پاؤں بھی ہوتے ہیں جم کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ تیری عمر کیا ہے ابھی تجھے زندگی پوری سمجھ نہیں آئی"۔

اماں جی نے پوری سنجیدگی مگر مخصوص نرمی سے کہا۔

"ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں۔ آپ کر سکتی ہیں خالہ کر سکتی ہیں"۔ اس نے قدرے تلخی سے کہا تھا۔

"چل چھوڑ اس بحث کو۔ مہینہ چھوڑ دو مہینے کا کہہ دوں گی مہمان سے۔ تو اتنے میں اپنا دل سنبھال، خود کو سنبھال۔ یہی بہت ہے کہ "ہاں" پر تو آئی"۔

اماں جی نے بات سمیٹنے کی کوشش کی ان کے حساب سے جو اس پر ہو گزری تھی بہت کٹھن تھی۔ اسے رعایت ملنا چاہیے کہ دکھ اسے جو کم ہے۔

"اماں جی اب آپ چھوٹے خان کی شادی بھی جلدی سے کرنے کی کوشش کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی بہو پر ان کا دل آ جائے"۔ عطریہ نے تمکین سے ہاری کا منہ صاف کیا۔

"میں تو آج کرلوں مگر چھوٹا خان ابھی راضی نہیں ہے۔ انہوں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانا"۔

"کیا کہتے ہیں؟" وہ بغور ان ہی سے پوچھ رہی تھی۔

"کہتا کیا ہے۔ کہ ابھی پڑھ رہا ہوں"۔ وہ بے بسی سے بولیں۔

"تو کیا ہوا۔ شادی کے بعد بھی تو پڑھ سکتے ہیں۔ انہوں نے کون سا گھر چلانے کیلئے نوکری کرنی ہے۔ کیوں خالہ؟"

"تو بھلا... ہم کون ہوتے ہیں انہیں مشورے دینے والے۔ وہ دوارے مالک ہیں جو چاہیں کریں۔ البتہ بچیاں ان کے ماں باپ ہیں۔ ان کو بھلا سوچنے والے۔ اتنی باتیں نہ کیا کر، خان کو پسند نہیں"۔ خالہ نے جھاڑ پلائی۔

"آپ کو پتہ ہے خان کو کیا پسند ہے؟" اس نے کسی قدر تیز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"ہمیں جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ مناسب سمجھیں گے تو خود بتا دیں گے۔ انسان کو اپنی حیثیت کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ امیری غریبی سے انسان کی عزت نہیں ہوتی۔ انسان اپنا مقام پہچان کر بات کرے تو سب جگہ اس کی عزت ہوتی ہے بھلے امیر ہو کر غریب"۔

خالہ نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ انہیں کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ وہ خان کی شادی کے موضوع پر اماں جی سے بات چیت کرے۔

"کیوں ٹوک رہی ہے آسیہ بھی بچی ہے۔ اسے اپنے خان کی شادی کا ارمان ہے۔ اس میں بھلا کیا برائی ہے؟" اماں جی نے اس کا دل رکھا۔

"کیا کریں۔ اس نے تو اپنی ماں ہی کا دل توڑ دیا۔ مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ تو نے دیکھی ہے سوات نے اشتہار کی لاڑی ہمیں تو خیالوں میں اسے حویلی میں چلتا پھرتا بھی دیکھ چکی"۔ اماں جی کا لہجہ مغموم ہو گیا۔

(ہاں اماں جی — جو ماں کا دل توڑ دے وہ کس کا دل رکھے گا؟) وہ ہاری کو گود میں بھر کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا تو اسے گود میں لیے پھرتی ہے؟ ماشاءاللہ بھاگنے کھیلنے والا بچہ ہے۔ بڑا ہو رہا ہے"۔ خالہ نے ٹوکا۔

"بس مجھے اچھا لگتا ہے۔ سارے یقین کھو چکے ہیں۔ اسے ساتھ لگا کر کچھ زندگی کا یقین سا ہونے لگتا ہے"۔ عطریہ نے ہاری کا رخسار آہستگی سے چوما۔

"دیکھیں اماں جی۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا اسے کہاں سے آ گئیں"۔

خالہ نے بڑی حیرت سے پہلے اسے پھر اماں جی کو دیکھا۔

"وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے سوال آتے"۔ اماں جی نے گہری سوچ کے دوران جواب دیا۔

"جا — اسے بڑے خان کے پاس چھوڑ دے اور تو باورچی خانے میں ماما کا ہاتھ بٹا دے۔ دوپہر کے کھانے پر بڑے خان نے کچھ لوگوں کو بلایا ہے"۔

"رہنے دے سوال آتے۔ اسے کام کو نہ کہا کر۔ تیمور منع کرتا ہے۔ کہتا ہے اب یہ ہماری ملازمہ نہیں ہے۔ دوست کی بیوہ ہے۔ اس کے بیٹے کی ماں ہے۔ اپنا گھر سمجھ کے اپنی خوشی سے کچھ کرے تو وہ دوسری بات ہے"۔ اماں جی نے خالہ کو ٹوک دیا۔

"بظاہر ماتھے کی مہربانیاں بارش کی طرح برستی ہیں۔ مگر جب دل کسی چیز پہ بگڑ کسی ایک مہربانی کا انکار کر دے تو وہ دعا ہے۔ نیم شبی کا علم ظہری ہو تو بن مانگی مہربانیاں اسی چیز پہ بے پرواہ ان کے اترتی ہیں"۔
اس کے بیچنے سے سانس یوں خارج ہوئی جیسے بڑی بعد راستہ ملا ہو۔ پھر ایک دم باہر نکل گئی۔

"مطربہ"۔ وہ بڑے انہماک سے وہ پنے پر کروشیا کی بیل بنا رہی تھی۔ یاور علی خان کی آواز پر تیزی سے آنچل پاس کی سیدھی دم کھڑی ہو گئی۔

"جی خان"۔ اس نے آنچل سر پر ڈال کر مودبانہ جواب دیا۔

"کام کر رہی ہو؟" وہ ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

"جی..... بس ایسے ہی"۔ وہ انگلیاں مروڑنے لگی۔

"ہوں..... ہاری کہاں ہے؟" انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ جیسے خاص بات سے پہلے تمہید باندھی جاتی ہے۔

"وہ بڑے خان کے پاس ہے۔ زیادہ وہ انھی کے پاس رہتا ہے۔ بہت پیار کرتے ہیں خان اس سے"۔
اس نے قدرے الجھ کر ان کی جانب کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"وہ پٹواری والا کیس نمٹ گیا؟"

اس نے بڑی حیرت سے یاور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے یاور علی خان اس کے ذاتی معاملات میں اتنی دلچسپی لے رہے تھے کہ خود چل کر آئے تھے۔

"نمٹ ہی گیا خان"۔ وہ بےزاری سے گویا ہوئی۔

"ہوں اچھی بات..... اچھا ہے تم جلد سے جلد پھر سے شادی شدہ ہو جاؤ۔ تمہاری ماں سے تو ہر وقت کا خطرہ رہے گا"۔
وہ خاموش رہی۔

"اور کوئی بات تو نہیں ہوئی تمہارے سامنے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"کیسی بات خان؟" وہ سرے سے حیران ہوئی۔

"کس قدر بے وقوف لڑکی ہو۔ ہماری زندگی میں آگ لگا کر کتنی معصومیت سے پوچھ رہی ہو کیسی بات؟ ایک بات بتائے دیتے ہیں تمہیں اگر تمہاری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو پھر شہر جانے والے چوک پر تمہارے کوڑے لگوائے جا سکتے ہیں"۔
ان کا انداز برہم بھی تھا اور شکستہ بھی۔

"خان..... بھلا مجھے ایسی بات کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا مجھے اندازہ نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ پھر آپ نے میرے ساتھ کیا برائی کی ہے۔ اگر میں جھوٹ بولتی تو آپ سے یہ کیوں کہتی کہ مجھے چھوٹے خان کے سامنے بلا کر پوچھ لیں"۔

"میں تو شاید اس طرح سوچتی بھی نہیں۔ وہ تو علی نے بھی اس طرح کے شک کا اظہار کیا تھا"۔

"علی نے؟" یاور علی خان کی دنیا میں پھر دوسرے زلزلے کا جھٹکا تھا۔

"علی..... کیا کہا تھا علی نے؟" ان کی آواز میں بلا کی شکستگی تھی۔

"وہ میں حویلی آئی ہوئی تھی نا۔ تب چھوٹے خان لندن میں تھے۔ ایک رات چھوٹی دلہن میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔ یاور جاگ رہے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ لندن سے تیمور کا فون آنے والا ہے۔ تم ہاری کو ہاری کے پاس چھوڑ کر ہال میں بیٹھ جاؤ۔ جیسے ہی تیمور خان کا فون آئے تم مجھے بلا لینا مگر کسی کو بتانا نہیں۔ اور حویلی میں کسی کو بتانا کہ تیمور خان کا فون لندن سے آیا تھا۔ میں تیمور علی خان کے فون کا انتظار کر رہی تھی کہ اسی میں علی کا فون آ گیا۔ میں گھبرا گئی کہ چھوٹے خان ہیں۔ میں نے "جی خان" بول دیا۔ علی شک میں پڑ گئے کہ اتنی رات کو میں کس خان کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ جب میں واپس گئی تو وہ چپ چپ تھے۔ تب میں نے ساری بات ان کو بتا دی۔ انہوں نے مجھ سے کئی سوال کیے پھر کہنے لگے۔ ہاں تیمور نازنین کا بہت ذکر کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اب تو شاید وہ زندگی بھر شادی نہ کرے"۔

وہ ایک تواتر سے بولتی جا رہی تھی اور یاور علی خان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کا تختہ دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔

"اور"۔ ان کی آواز کسی پاتال سے ابھر رہی تھی۔

"اور کچھ نہیں خان اور جو کچھ تھا وہ میں پہلے بتا چکی ہوں"۔ وہ آرام سے بولی تھی۔

"مگر..... جانے کیوں دل نہیں مانتا"۔ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"جلدی مان جائے گا..... آپ ساتھ عزت کے اپنی جان چھڑا لیں خان۔ پھر دیکھیں تیمور خان کیا کرتے ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے گا۔ وہ حویلی چھوڑ دیں گے۔ چھوٹی دلہن کی خاطر۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ ایک سے لاکھ تک شادی پر راضی نہیں ہیں۔ اماں بی کہتی ہیں۔ شیخ ربیع کی لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ بہت پڑھی لکھی ہے مگر پھر بھی چھوٹے خان راضی نہیں"۔

"بس خاموش ہو جاؤ مطربہ۔ سر پھٹ جائے گا میرا"۔ واقعی ان کا سر گھوم رہا تھا۔

"خان..... یہاں میں ایک بے حیثیت لڑکی ہوں۔ اپنی اوقات پہچانتی ہوں۔ پھر بھی آپ سے یہی کہوں گی کہ آپ پہلی فرصت میں بات صاف کر لیں۔ اگر آپ دونوں سے اکیلے اکیلے بات کریں گے تو وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ آپ ایسا کیجئے کہ کبھی نہیں بلکہ آپ جب بھی بات کریں مجھے بلوا لیں۔ میں نے ہی بات شروع کی ہے۔ پھر آپ کیوں ڈر رہے ہیں؟"

یاور علی خان نے بغور اس کی شکل دیکھی۔ اتنی جرأت ایسی ہمت۔ کہاں سے آئی اس میں؟ بھلا اس سارے قصے میں اس کا اپنا کیا فائدہ؟

"تم اتنا بڑا خطرہ مول کیوں لے رہی ہو۔ تمہیں ثبوت بھی کیا جا سکتا ہے"۔ انہوں نے اپنی دانست میں اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

"مجھے..... یوں بھی یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے"۔ وہ بےزاری اور بےخوفی سے گویا ہوئی۔

"ہوں"۔ وہ زانوؤں پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ دوبارہ مڑ رہے تھے۔ بے وقت لڑکی کے سامنے اب وہ جھکے ہی گیا۔

"کہنے کو تو بہت کچھ ہے خان۔ مگر کہنے کی ہمت نہیں ہے"۔

وہ خود فراموشی کے عمل میں تھی۔ وہ نہ جانے کب سے گھر میں کسی رکی ہوئی رمق کے تحت تھوڑا بہت تو کچھ ہو۔

یاور علی خان تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئے۔

وہ بے حس سے انداز میں دوبارہ بیل بجانے لگی۔

"بھئی وہ کیا نام ہے تمہارا۔ ہاں مطربہ، اور کچھ لندن سے فون آنے والا ہے۔ کوئی فون پر بات کرے تو ذرا دوڑ دون بڑی شد کرنا۔ بہت مشکل ہو جاتی ہے"۔

"تم بھی ہوتی ہو یہاں پر؟" وہ جاتے جاتے پلٹے۔

"جی"۔ وہ نگاہ اٹھائے بغیر گویا ہوئی۔

"او کے۔ فون پر کوئی خاتون ہوگی۔ وہ مجھے بلائیں گی۔ سمجھ رہی ہو نا؟" وہ پھر اسی عجلت بھرے انداز میں گویا ہوئے۔

"جی"۔

تیمور علی خان تیزی سے باہر نکل گئے۔

"ہونہہ ...... خاتون ...... جانتی ہوں۔ کون خاتون ہوں گی۔ کاش تم سے پوچھ سکوں تیمور علی خان۔ کیسی لگی ہے دل پر؟ کیوں بکھر رہے ہو مارے مارے۔ سارے حکمت جس لندن میں گروی رکھ کر آئے ہو۔ قرض بہت ہے۔ اتارے نہیں اترتا۔ دل تو سب کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ تیمور علی خان تمہارے بھی دل پر نہ لگائی تو نام نہیں"۔ اس کی رگ رگ میں آگ دہکنے لگی تھی۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے مگر کسی کو اس کے حال پر تو چھوڑ سکتے ہو"۔

وہ سر جھکائے بیل بجاتی رہی۔ سوچتی رہی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا اسے احساس تک نہ ہو سکا۔

فون کی بیل ہوئی تو چونک پڑی۔ اور تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔

دوسری طرف کسی مرد کی آواز تھی۔

"آصف حسین خان اسپیکنگ۔ تیمور ہیں؟ لندن سے کال ہے"۔

"بلاتی ہوں"۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ تو کوئی آدمی ہے۔ خان تو کہہ رہے تھے کسی عورت کا فون آئے گا۔ وہ الجھی ہوئی تیمور علی خان کو بلانے چل پڑی۔

وہ بھی شاید انتظار کی کوفت سے بیزار ہو کر خود ہی آ رہے تھے۔ راہداری میں ہی مل گئے۔

"فون آیا ہے خان!" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "مگر کسی آدمی کا ہے"۔

"ہوں ...... آصف ہوگا"۔ وہ جیسے خود سے کہہ رہے تھے۔ رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی۔

وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔

تیمور علی خان نے بڑی عجلت میں ریسیور اٹھایا تھا۔

"ہوں۔ بیٹا۔ بول رہا ہوں ...... ہوں ...... ہوں ...... بات کراؤ۔ تھینکس"۔

پھر وہ اس کی جانب پلٹے۔

"وہ کیا ہے کہ تم باہر جاؤ"۔

"کوئی بات نہیں خان۔ مجھے پتا ہے آپ اپنی انگریز بیوی سے بات کر رہے ہیں۔ فکر نہ کریں۔ مجھے انگریزی نہیں آتی"۔

وہ مصنوعی انداز میں مسکرا کر بڑی بے نیازی اور ڈھٹائی سے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے تیمور علی خان کے تاثرات دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی اور اسے سر سے بیل بجانے لگی۔

تیمور علی خان بہت آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے اور دوسری طرف شاید بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس لئے خان کو بات دہرانا پڑ رہی تھی۔

تین چار منٹ بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟" اسے پشت سے ان کی غضبناک آواز سنائی دی۔

"کب؟" وہ چونک کر پوچھ رہی تھی۔

"ابھی کچھ فرما رہی تھیں آپ"۔ وہ چبا چبا کر کہہ رہے تھے گویا یوں کہہ رہے ہوں کہ کیا بک رہی تھیں آپ؟"۔

"ہم کیا فرما سکتے ہیں خان۔ ہم تو نوکر ہیں آپ کے۔ بھلا ہماری کیا مجال"۔ بلا کا بے خوف انداز تھا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ کسی سے نہیں کہوں گی"۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"اس طرح کی بکواس کرنے کی تمہیں ہمت کیسے ہوئی"۔ وہ بے حد برہم ہو رہے تھے۔

"سچ بھی کبھی چھپا ہے خان ...... بے چاری اماں جی کو تو آزمائیں۔ اگر آپ انہیں بتا دیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تھوڑا سا پریشان ہو کر رو لیں گی پھر انہیں صبر آ جائے گا"۔ وہ بے حد پرسکون تھی۔

"کس نے دی ہے تمہیں یہ غلط خبر؟" لگتا تھا غصے سے ان کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

"ہم بھلا اس قابل کہاں کہ کوئی ہمیں خبر دے"۔ اس نے دوپٹہ انگلی میں لپیٹتے ہوئے بہت سکون سے جواب دیا۔

"ہمارا صبر مت آزماؤ۔ کیوں اپنا ٹھکانہ کھونے پر تلی ہو؟" وہ بمشکل خود پر قابو پا رہے تھے۔

"مجھے پتا ہے۔ آپ کو حیرت ہے کہ مجھے اتنی اہم خبر کیسے مل گئی۔ چھوٹی دلہن آپ کی رازدار ہیں۔ مگر جب وہ اپنے میاں سے بات چھپا سکتی ہیں تو مجھے کیوں بتائیں گی۔ میں بھلا ان کی کیا لگتی ہوں۔ آپ ان پر شک کیجئے گا بھی نہیں"۔

"چپ"۔ وہ ضبط کی اعلیٰ حدود سے گزر رہے تھے۔

"پھر کچھ بھی نہیں۔ چائے لاؤں آپ کیلئے؟" وہ اٹھ کر ان کے سامنے آ گئی۔ سیاہ چادر کے گھونگھٹ سے اس کا صبیح چہرہ

بہت تروتازہ محسوس ہو رہا تھا۔ ہونٹ تو ہونٹ آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔

"اپنے پاس رکھو اپنی خدمات۔ چند دنوں کی بات ہے پھر دیکھتے ہیں تمہیں"۔ وہ اس سے پہلے باہر نکل گئے۔

وہ ہاری کو بہت خوبصورت لوری سناتے ہوئے تھپک رہی تھی۔ دن بھر کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک تسلسل سے گزر رہے تھے۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ اسی دم دروازے پر دستک ہوئی اور وہ اپنے دھیان سے چونک پڑی۔

"کروٹ لے کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ گہرے سبز کپڑوں میں ملبوس نازنین اندر داخل ہو رہی تھی۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"آپ... مجھے بلوا لیا ہوتا"۔ وہ گہری نظروں سے نازنین کا چہرہ دیکھتے ہوئے بہت انجان بن کر کہہ رہی تھی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل تو تم ہم سب پر حکومت کر رہی ہو"۔ نازنین پہلی بار بہت طنزیہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"خیریت؟ بہت ناراض دکھائی دے رہی ہیں"۔ وہ پھر بڑے انجان پن سے پوچھ رہی تھی۔

"خیریت کہاں..... ہم تو اس تبدیلی کا مزا دیکھ رہے ہیں جو تم میں اچانک آ گئی ہے"۔ وہ بہت تلخ ہو رہی تھی۔

"کیوں ناراض ہیں؟ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے"۔ وہ بڑے بھولپن سے پوچھ رہی تھی۔

"غلطی تو ہم حویلی والوں کی ہے کہ ایک کم ظرف پر اپنا خلوص نچھاور کیا۔ انسان بنیاد سے صحیح ہو تو برے ماحول میں بھی اچھائی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ بنیاد غلط ہو تو اچھے ماحول سے بھی کچھ نہیں لے پاتا"۔ نازنین کی برہمی بہت واضح ہو گئی۔

"آپ مجھے گالی نہ دیں۔ نکاح کیا تھا میرے باپ نے میری ماں سے اور میرے نانا نے میری نانی سے"۔

"نکاح گناہ کی طرح رات کے اندھیرے میں چھپ کر ہوں تو نکاح نہیں ہوتے دل کا بہلاوا ہوتے ہیں"۔

نکاح وہی ہوتا ہے جس کی گواہی دور دور تک پہنچے۔ تو لگتی پھرتی ہو حویلی میں۔ حویلی والوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتی ہو۔ کیا ملے گا تمہیں ایسی حرکتوں سے؟" نازنین جیسے پھٹ ہی پڑی۔

"ہر وقت سودے بازی نہیں ہوتی"۔ وہ طنزیہ مسکرائی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھ سے کیا حرکت ہو گئی ہے۔ آپ کیوں مجھ سے خفا ہو رہی ہیں؟"

"حکومت۔ کیوں بدتمیزی کی تم نے تیمور سے۔ اس شخص سے جس نے تم پر احسان کی انتہا کر دی۔ ادب مروت کوئی شرم ہے"۔ نازنین کا غصہ واقعی بہت انتہا کو چھو رہا تھا۔

"میں غلام زادی ہوں چھوٹی دلہن۔ میری کیا مجال؟" وہ پھر بڑے بھولپن سے گویا ہوئی۔

"ہاں تو پہچانو اپنی اوقات۔ کیوں مالکوں کے منہ لگتی ہو۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ سرداروں کی اولاد تمہاری کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی تو بہت ہی اچھا ہوا۔ تم تو کسی سردار کی ماں بن کر ہمیں کھڑے بیچ کھاتیں"۔

"آپ کو پاس ہی دینے جائیں گی وہ ہمارا قصور بھی بتا دیں گی"۔ وہ بہت ہی اطمینان سے بول رہی تھی۔

"زیادہ انجان بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف یہ جاننے کی بے چینی ہے کہ تم نے تیمور سے بدتمیزی کیوں کی؟"

نازنین نے اپنی بکھری ہوئی سانسیں کنٹرول کیں۔ "تم کون ہوتی ہو ان سے سوال جواب کرنے والی؟"

مطربہ خاموشی سے ہاری کو تھپکنے لگی۔

"انہوں نے شادی کی ہے گناہ تو نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے بھی اسی طرح کی شادی کی جس طرح کی میرے ماں باپ نے کی تھی اور آپ تو ایسی شادی کو مانتی ہی نہیں ہیں"۔ وہ بہت آرام سے چھریاں چلا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے انہوں نے شادی کی۔ تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم نے کس حیثیت سے ان سے یہ بات کی۔ تمہارے لئے مناسب یہی ہے کہ تمہیں تمہارے اصل مقام پر رکھا جائے اور بچہ تم ہمارے حوالے کرو۔ ہم خود پال لیں گے"۔

نازنین نے آگے بڑھ کر ہاری کو اٹھانا چاہا۔

"تو یوں کہیے ناں..... آپ کو خان نے اس کام کیلئے بھیجا ہے۔ حد ہو گئی۔ آخر میں نے کیا کہہ دیا؟ آخر ایک دن تو ان کی شادی کا سب کو لگ جانا ہے اور لگنا بھی چاہیے۔ شادی کوئی بری بات تو نہیں ہے"۔

وہ نازنین کے غصے کی پروا کئے بغیر بہت معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"یہ ہمارا دردِ سر ہے۔ تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں"۔ نازنین جیسے برس پڑی۔

"ادھر لاؤ۔ ہاری کو مجھے دو۔ تیمور اسے تمہارے پاس چھوڑنے پر راضی نہیں ہیں"۔ نازنین نے ہاری کو اٹھانے کی کوشش کی۔

"آپ اسے نہیں لے جا سکتیں چھوٹی دلہن۔ خان سے کہہ دیجئے۔ بچہ میرے مرحوم شوہر کا ہے۔ دوست دوست ہے اور شوہر شوہر ہوتا ہے۔ ان کا حق میرے حق سے زیادہ نہیں"۔ اس نے ہاری کو گود میں بھر لیا۔

"یہ ان کا حکم ہے"۔ نازنین چیخ گئی۔

"میں ان کی نوکر نہیں ہوں عبدالعلی بھٹی کی بیوہ ہوں۔ وہ خود ہی تو کہتے ہیں"۔ وہ ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

"مگر تم دوسری جگہ شادی کی حامی بھر چکی ہو۔ اب تمہارا علی کی چیزوں یا اس کی اولاد پر کوئی حق نہیں ہے سمجھیں"۔

نازنین بھڑک گئی۔ اس سے یہ گستاخی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"کس نے کہا؟" وہ مسخرانہ انداز میں مسکرائی۔

"کیا؟" نازنین سمجھی نہیں۔

"یہی کہ میں اس سوکھے کھجور سے شادی کی حامی بھر چکی ہوں"۔ مطربہ کا انداز خون کھولا دینے والا تھا۔

"تم حد سے بڑھ چکی ہو مطربہ۔ حویلی سے تمہاری چھٹی بھی ہو سکتی ہے"۔ نازنین نے دھمکی دی۔

"دے دیجئے چھٹی۔ چلی جاتی ہوں میں بچے کو لے کر"۔ وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

"بچہ چھوڑ کر جاؤ۔ کچھ نہیں ہے اب یہ تمہارا۔ ادھر دو مجھے ورنہ تیمور خود آ کر لے جائیں گے اور جو تمہارا حشر ہو گا وہ

"—

نازنین نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورا۔

"مجھے مت ڈرائیے۔ اب مجھے کسی بات سے ڈر نہیں لگتا۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"ٹھیک ہے' میں بتاتی ہوں تیمور کو۔ وہ خود نمٹ لیں گے۔"

"آپ اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہیں۔ مجھے تو خان کی شادی کی بات کب سے پتا ہے۔ میں نے تو کسی سے نہیں کہا۔ اگر چاہتی تو کہہ سکتی تھی۔"

وہ جان جلانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ نازنین سنگ کر رہ گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بڑی تیزی سے باہر چلی گئی۔

عطرینہ باری کو کاندھے سے لگائے بڑی عجلت میں باہر آئی اور اماں جی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بہت دیر اماں جی کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آئی تھی اس کا خیال تھا تیمور علی خان اس کی جھاڑ جھپاڑ کرنے جلدی آ پہنچے لیکن خاصا وقت گزرنے کے بعد جب محسوس ہوا کہ وہ نہیں آ پہنچے تو اطمینان سے واپس کمرے میں آ گئی تھی۔

اسی دم پاروی کمرے میں چلی آئی۔

"تیمور خاناں تسانوں بلاساں"۔

"کہاں ہیں؟" اس کا دل دھڑک اٹھا۔

"اپنے کمرے وچ۔" وہ روبوٹ کی طرح پیغام دے کر باہر نکل گئی۔

عطرینہ نے باری پر ایک نگاہ ڈالی اور چادر اٹھا کر لپیٹی اور گہری سوچ میں تیمور علی خان کے کمرے میں چلی آئی۔

"جی خان"۔ اس نے دستک دے کر ان کی اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور فوراً ہی اندر آ گئی تھی۔

"سنو —— کیا نام ہے تمہارا۔ ہم تمہیں سرائے بھیج رہے ہیں۔ اب تم ہمیشہ وہیں رہو گی۔ تیاری کر لو۔ صبح تمہیں اکرام چھوڑ آئے گا۔ اور پھر جب تک ہم اجازت نہ دیں۔ تم دوبارہ بستی واپس نہیں آؤ گی۔"

"میں —— میں خان؟" وہ ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئی۔

"ہاں صرف تم —— باری نہیں جائے گا —— وہ یہیں رہے گا۔" وہ حتمی انداز میں گویا ہوئے۔

"مگر وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ بھی قطعی انداز میں گویا ہوئی۔

"جب وہ اپنی سگی ماں کے بغیر رہ سکتا ہے تو تمہارے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ اب ہم تم سے کوئی مزید بات نہیں کرنا چاہتے۔ تم جا سکتی ہو۔"

"وہ بہت ناراض لہجے میں ہمکلام تھے۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جب تک یاور خاناں مجھے کہیں جانے کو نہیں کہیں گے میں یہاں سے ایک قدم بھی نہیں اٹھاؤں گی۔"

وہ بڑی بے خوفی سے گویا ہوئی۔

"ان کو اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے بابا صاحب سے بات کر لی ہے۔ جاؤ تم جا کر تیاری کرو۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔" وہ مشتعل اپنے غصے پر قابو پا رہے تھے۔

"انہوں نے مجھے منع کیا ہے۔ آپ پوچھ لیں ان سے۔" وہ نڈر انداز میں بات کر رہی تھی۔

"کیا منع کیا ہے؟" غصے کی جگہ حیرت نے لے لی۔

"یہی کہ میں حویلی سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ پوچھ لیں نا ان سے۔"

"کہاں ہے یاور؟" وہ مشتعل ہو گئے۔

"آؤ —— ہمارے ساتھ۔"

وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھے' وہ بھی پرسکون انداز میں ان کے پیچھے چل پڑی۔

تیمور علی خان اس سے کہیں پہلے یاور علی خان کی خواب گاہ تک پہنچ گئے تھے اور دستک دے چکے تھے۔ وہ ان سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

دروازہ نازنین نے کھولا تھا۔

"یاور بھائی جاگ رہے ہیں؟" تیمور کا انداز بہت ناراض سا تھا۔

"ہوں —— پڑھ رہے ہیں۔ البتہ میری آنکھ ابھی ابھی لگی تھی۔" نازنین نے حیرت سے پہلے انہیں پھر عطرینہ کو دیکھا۔

"سوری بھابی۔ بس ایک ایمرجنسی ہے۔" انہوں نے جلد بازانہ انداز میں معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں۔ آ جاؤ۔ مگر یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟"

نازنین نے ناراضی نظر اس پر ڈالی۔ اور دروازے کے ایک طرف ہو گئی۔ یاور علی خان آوازوں کے سبب دروازے کی سمت متوجہ ہو چکے تھے۔ تیمور کو سامنے پا کر چونک سے گئے۔ مگر ان کا چہرہ بھی غیر معمولی جذبات کا حامل ہو رہا تھا اور حیرت مزید بڑھ گئی۔ جب عطرینہ کو بھی اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔

"خیریت؟" انہوں نے الجھی ہوئی نگاہ سے بھائی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ کس عذاب کو داخل کیا تھا اماں نے حویلی میں۔" وہ برہمی سے گویا ہوئے۔

"کیا ہو گیا؟" وہ الجھے۔

"ہم اسے سرائے بھیج رہے ہیں۔ یہ حویلی میں پراسرار کردار ادا کر رہی ہے۔ اپنی حیثیت بھول گئی ہے۔ محترمہ فرما رہی ہیں آپ نے انہیں منع کیا ہے کہ یہ حویلی سے باہر نہیں جائیں گی۔"

"ٹھیک فرما رہی ہیں۔" یاور علی خان نے قلم میز پر رکھ دیا اور بہت آرام سے گویا ہوئے۔

"جی؟" تیمور علی خان تو گویا حیرت کے مارے جامد ہی ہو کر رہ گئے۔

"آپ نے سنا نہیں کہ ہم نے کیا کہا۔" انہیں یاور علی خان کا تمسخر برا لگا تھا۔

"جی جناب...... اس لیے کہ مفلس خطرہ ابھر نہیں رہا۔" ان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"یاور بھائی پلیز...... آپ بہت سادہ دل انسان ہیں۔ آپ کو پتا نہیں کہ"

"تیمور تو پتا ہے کہ بہت احمق ہوں۔ ستانے کی ضرورت نہیں۔" یاور علی خان نے خشک لہجے میں کہا۔

"پلیز یاور! آپ تیمور کی بات سنیں تو سہی۔" نازنین کو یوں لگا کہ یاور علی نے بھائی کی جی بھر کے توہین کی ہو۔

"قانع...... آپ کی اور تیمور کی رائے ایک ہے۔ ایک بے حیثیت سی لڑکی۔ کیا تکلیف پہنچ رہی ہے آپ کو اس سے۔ ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے کیا کہتی ہے کسی کو؟"

ان کا انداز گفتگو بہت چبھتا ہوا تھا۔

"آپ فرصت نکالیں تو ہم بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے۔" نازنین نے بے زار ہو کر کہا۔

"میرے پاس واقعی فرصت نہیں ہے۔ بس اسے میری درخواست یا سفارش سمجھا جائے کہ اسے کہیں نہ بھیجا جائے۔"

"یاور بھائی۔ اس نے ہماری مہربانیوں کا مطلب بہت غلط لے لیا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو"

"تم نے تو اسے احسانات تلے دبا دینا چاہا تا کہ تمہاری ممنون و مشکور ہو مگر بے چاری کی قسمت ہی پھوٹی تھی۔"

انہوں نے بہت برہمی سے تیکھے لہجے میں تیمور علی خان کی بات کاٹ دی۔

"آپ کو اندازہ نہیں ہے یاور بھائی"۔

"ڈونٹ ڈسٹرب می۔ پلیز" یاور علی خان جھلائے۔

"آپ بھی اس لڑکی کے سامنے ہماری انسلٹ نہیں کیجیے۔ ہمیں حیرت ہے آپ ہماری بات سننے کے بجائے صرف اس کی بات کو اہمیت دے رہے ہیں۔" تیمور علی خان کے لہجے سے ناراضگی بہت واضح تھی۔

"بات یہ نہیں ہے۔ اصول کی بات ہے۔ کہاں تو اس پر اتنی مہربانی ہوئی۔ کہاں یہ سلوک' کہیں اتنی اہمیت دے رہے ہو۔ یہ کہیں بھی رہے کیا فرق پڑتا ہے۔" یاور علی خان کا لہجہ دھیما ہو گیا۔

"پہلے آپ تیمور کی بات تو سن لیں۔" نازنین کو پھر مداخلت کرنا پڑی۔

"آپ سے سن لیں گے۔ ایک ہی بات ہے۔" وہاں ہنوز ایک ضدی پن تھا۔

"یہ وہی نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" نازنین نے زچ ہو کر کہا۔

"اور ہم بھی اتنے بے وقوف نہیں ہیں جتنا آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔" یاور علی خان نے ایک کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

"خدا کی پناہ... کیا ہو گیا ہے آپ کو...... پہلے تو کبھی آپ نے ایسے نہیں کیا۔" نازنین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"ضروری نہیں ہمیشہ وہی ہو جو پہلے ہوا ہو۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہ ہرگز اتنی اہم نہیں ہے کہ ہم لوگ اپنا وقت ضائع

کریں۔ دیٹس آل۔"

"پرابلم یہی نہیں ہے یاور... اس کا انداز آپ نے نہیں دیکھا۔ بہت گستاخ ہو گئی ہے۔ چند دنوں بعد ہی سب کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گی۔"

"چند دنوں بعد ہم اور کہیں ہوں گے۔" یاور علی خان نے نازنین کی بات کاٹ کر بے نیازی سے کہا۔

"اس بات کو بھی سوچ کر دیکھیں...... میں کہہ رہی ہوں ناں آپ سے؟" نازنین ہار نہیں مان رہی تھی۔

"تمہیں یہی ضروری ہے تو پھر آپ کراچی چلی جائیں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔" وہاں سے پھر بے نیازی سے جواب ملا۔

"یاور آپ اس طرح میری انسلٹ نہیں کر سکتے۔" نازنین کی آواز بھرا گئی۔

"یاور خان...... یہ الگ مجھ سے پوچھ نہیں رہے ہیں۔" عطیہ نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ زبان کھولی تھی۔

"حد ہو گئی عطیہ کی... یہ بچے کے قابل نہیں تھی تو پہلے اس پر مہربانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" یاور علی خان کی پیشانی پر واضح شکنیں پڑ گئیں۔

"دیکھیں یاور بھائی آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ بھابی کا خیال کیجیے۔" تیمور علی خان ضبط کے کڑے مرحلوں سے گزر رہے تھے۔

"تم ان کا خیال کر سکتے ہو۔ اجازت ہے۔" وہ سپاٹ انداز میں بولے۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" نازنین پر حیرت کا دورہ پڑنے لگا۔

"آج ہوا نہیں۔ اظہار ہوا ہے۔ اس سے پہلے آپ کی اتنی واضح یک طرفی جو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔"

"بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بھابی۔ ہم یاور صاحب سے بات کر لیں گے۔"

تیمور علی خان ناراضگی سے کہتے ہوئے پلٹے۔

"عطیہ کے معاملے پر ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی بھابی کے کراچی جانے کا انتظام کرو۔ جب کبھی اگلی ریذیڈنسی کا انتظام ہو جائے گا ہم بلا لیں گے۔" یاور علی خان نے بہت سکون سے دھماکہ کیا۔

ایک پل کو تو نازنین ششدر سی ان کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

تیمور علی خان بھی ٹھٹک کر رک گئے۔

"ہم کسی کی لڑائی کی وجہ سے بھابی کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔"

"گیٹ لاسٹ یو...... آئی مین آل آف یو۔"

یاور علی خان کتاب بیڈ پر پٹخ کر کسی طرح دھاڑے۔ ان کی آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگی تھی۔

تیمور علی خان سہم کر رہ گئے۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ نازنین نے ان کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔ تھرا کر رہ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے یاور آپ کو؟" وہ ہمت کر کے آگے بڑھی۔

یاور علی خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس گہری گہری سانسیں لیتے رہے۔

"بھائی..... امی ابو اسے کہیں اپنی شکل گم کرلے۔ جی تو چاہ رہا ہے اس شکل پر تیزاب پھینک دیں۔" تیمور علی خان نے انتہائی نفرت سے کہا۔

علیزے نے نازنین کو بولنے کی زحمت نہیں دی اور تیزی سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"دکھ اٹھاؤ تیمور علی خان ..... انسان کو دکھ بھی اٹھالینا چاہئیں۔ کوئی حرج نہیں۔" کس درجہ سفاکی اتر آئی تھی اس کے اندر۔ جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہو۔

"دکھ دینے اور دکھ سہنے میں کیا فرق ہوتا ہے، بندہ بشر کو جاننا چاہیے۔"

وہ بڑے مطمئن انداز میں سوچتی ہوئی اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"کچھ چھین سکتے ہیں؟ اسے تو میں تمہاری طرف کا جرمانہ سمجھتی ہوں۔ میرے دکھوں کا حساب ہوگا اس کے ذریعے۔"

نازنین تیمور کے پیچھے پیچھے نکل آئی تھی۔

"تیمور کیا ہوگیا ہے انہیں؟" وہ روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"کچھ نہیں بھابی! ہم سب نے زبردست دھوکا کھایا ہے۔" وہ در حقیقت بہت پریشان تھے۔

"کیسا دھوکا؟" وہ حیران ہوئی۔

"یہ لڑکی بہت ہوشیار نکلی ہے۔ سب اسے بہت انوسنٹ سمجھ رہے تھے۔" وہ فکرمندی سے گویا ہوئے۔

"یاور اس کو اتنا سپورٹ کیوں کررہے ہیں؟ آج تو اس سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔" وہ عجیب سے اندیشوں میں گھری ہوئی تھی۔

"پریشان نہ ہوں۔ ہینڈل کرلیں گے۔" وہ جیسے اس کے دل کی بات سمجھ رہے تھے۔

"کس قدر توہین کی ہے انہوں نے میری بھی اور تمہاری بھی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ ایسے کیوں ہورہے ہیں۔ مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"تیمور..... کمبخت حسین بھی تو بہت ہے۔" نازنین اندیشوں سے باہر نہیں آرہی تھی۔

"بھابی! کیا سوچنے لگی ہیں؟ یاور بھائی ایسے نہیں ہیں۔ ڈونٹ میٹر۔" وہ بھاوج کی دلجوئی کرنے لگے۔

"اماں جی کا اندازہ غلط ہے تیمور۔ یہ شادی پر ابھی بھی رضامند نہیں ہے۔ مجھ سے اس نے خود کہا۔ کیا مطلب ہوا اس کا؟" وہ گھبرا کر پوچھ رہی تھی۔

"کچھ مطلب نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے۔ ہم یاور بھائی کو جانتے ہیں۔ وہ اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کرسکتے۔ ایک دم جاہل گنوار ان پڑھ لڑکی۔ یاور بھائی اس طرح کی کمپنی کبھی نہیں پسند کرسکتے۔ صرف حسن سے کیا ہوتا ہے؟" وہ سمجھانے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"مگر پتا نہیں مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔ پہلی فرصت میں بات بابا صاحب تک پہنچا کر معاملہ نمٹائیں۔" وہ بہت پریشان تھی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم بھی سوچ رہے ہیں۔ اب اس کی حرکتیں دنوں سے چھپانا بہت ہی حماقت ہوگی۔"

"میرا تو سر پھٹ جائے گا۔ یاور نے کبھی اس طرح نہیں کیا۔" وہ بولی۔

"پتا چل جائے گا وہ ایسا کیوں کررہے ہیں۔"

"ایسا کریں پہلی فرصت میں اپنی شادی اناؤنس کریں۔ اس طرح اس کی ایک بیٹنگ سے تو نجات ملے گی۔ پھر کچھ نہیں ہے۔" وہ جلد بازی کے انداز میں گویا ہوئی۔

"ہماری شادی کا اس معاملے سے تو بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مگر جیسی آپ کی مرضی کرلیتے ہیں۔ کچھ دن بعد سہی۔ آج ہی سہی۔" انہوں نے گویا نازنین سے اتفاق کرلیا۔

"ہمیں بس اماں جی کا خیال تھا۔ باقی تو آسانی سے ہینڈل کیا جاسکتا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔

"آخر ایک دن تو اماں جی کو پتا چلنا ہی ہے۔ بس دعا کریں۔ میں زیادہ دیر یاور کا یہ رویہ برداشت نہیں کرسکتی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"بھابی۔ اپسیٹ نہ ہوں..... یہ تو زندگی میں آہی جاتے ہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" وہ تسلی دے رہے تھے۔

"آمین..... خدا کرے۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"اچھا اب آپ اپنے کمرے میں جائیں۔ اور ریلیکس ہونے کی کوشش کریں۔" انہوں نے نرمی سے اسے مشورہ دیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے یاور سے۔ پھر کوئی بات نہ ہوجائے۔" وہ واقعی خوفزدہ تھی۔

"اوں..... ہوں..... کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ کوئی مسئلہ ہوتو ہم حاضر ہیں۔ آپ اکیلی تو نہیں ہیں۔" وہ اس میں حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

نازنین نے چند لمحے سوچا پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو یاور علی خان سوئی ہوئی حالت میں دکھائی دیئے۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

اماں جی بہت فکرمندی سے بابا صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

یاور علی خان باپ کے پہلو میں اخبار کھولے بیٹھے تھے۔ دلاور علی خان اپنی چھڑی سے قالین کرید رہے تھے۔

"جی خیر تو ہے۔ آج صبح صبح مجھے کیوں بلایا؟" وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"اس ضروری کام پڑ گیا تھا آپ سے۔"

"وہ دھیمی آواز میں بات کررہے تھے۔ پیشانی پر شکنوں کا جال بن گیا تھا۔ ایک دکھ کا تاثر چہرے سے واضح تھا۔

"جی..... کہیے۔" نہ جانے کیوں ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"آپ—— آپ نے چھوٹی دلہن کو یاور کیلئے پسند کیا تھا۔ کیا بات اچھی لگی تھی آپ کو؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے مخاطب تھے۔

"جی—— کیا مطلب؟ یہ کیا سوال ہوا۔ ساری دنیا میں مائیں بہوئیں پسند کرتی ہیں۔ میں نے کون سا انوکھا کام کیا تھا؟" وہ بہت ہی حیرت سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔

"یقیناً آپ ان کے حسن و جمال سے متاثر ہوئی ہوں گی"۔ وہ جیسے خود ہی کسی نتیجے پر پہنچ گئے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ حسن و جمال زیتون بانو کا کیا کم ہے؟ صرف حسن دیکھ کر اتنے بڑے فیصلے نہیں ہوتے۔ ماشاءاللہ انگریزی پڑھی ہوئی ہے اور خاندان بہت اچھا ہے۔ پشتوں سے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ ان کی ماں بہت وضع دار عورت ہیں۔ یونٹ الگ ہو جانے سے پہلے وہ ہمارے ہاں آ کر رہیں۔ آپ سے بھی بات چیت رہی۔ اب تک تو ان سے آپ کی بس سلام دعا ہوئی تھی۔ آپ نے نہیں دیکھا کتنی عقل مند اور طریقے کی عورت ہیں۔ اور شادی کے اتنے دنوں بعد بھلا کون سو سیانے کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ یہ آپ کو کیا سوجھی؟" ان کی حیرت سوا تھی۔

"خاندان تو خیر بہت اچھا ہے یہ تو ہم بھی جانتے ہیں"۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"یہ بتائیے۔ کیا وہ مطربہ کو پسند نہیں کرتیں؟" انہوں نے بالکل ہی مختلف سوال کر دیا۔

اماں جی ہکا بکا ان کی صورت دیکھنے لگیں۔ "کیا مطلب؟ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مطربہ تو ناز سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس کے کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ دلہن کے بال بال موتی پروئے"۔ انہوں نے وثوق سے کہا۔

"پتا نہیں آپ کون سی دنیا میں رہتی ہیں؟ اتنی محبت ہے۔ جب ہی اس کا وجود حویلی میں برداشت نہیں"۔ وہ خاصے ناراض ہوئے۔

"ہیں؟" وہ پھر دھک سے رہ گئیں۔ "نہیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے"۔ انہوں نے باری باری بیٹے اور شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور بھلا مطربہ سے کسی کو کیا بیر۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ حد ہو گئی"۔ انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"ہوا کیا ہے؟ کبھی آپ چھوٹی دلہن کی بات کرتے ہیں۔ کبھی زیتون بانو کی۔ سیدھی سیدھی بات بتائیں مجھے"۔ وہ پریشانی چھپا نہ پائیں۔

"بقول آپ کے وہ چھوٹی دلہن سے بہت محبت کرتی ہے۔ پھر چھوٹی دلہن اس کی دشمن کیوں ہو رہی ہیں؟" بابا صاحب نے دریافت کیا۔

"کیا دشمنی ہو گئی ہے۔ کل دوپہر تو وہ ناز کے بالوں میں تیل ڈال رہی تھی۔ دونوں ہنسی خوشی باتیں کر رہی تھیں"۔ اماں جی کا حیرت سے برا حال تھا۔

"کل دوپہر کی نہیں کافی دن پہلے کی بات ہو گی۔ آپ شاید بھول رہی ہوں عیسیٰ کی ماں"۔

"سیدھے سیدھے کہیں سٹھیا گئی ہوں"۔ اماں جی برا مان گئیں۔

"بھئی اگر ایسی بات ہے تو وہ اسے حویلی سے نکالنے پر اصرار کیوں کر رہی ہیں"۔ انہوں نے یاور کا اصل سوال سامنے کر دیا۔

"ہیں!" وہ پھر چونک گئیں۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ نوبت یہاں تک پہنچے۔ لو بھلا"۔ وہ بڑبڑا گئیں۔

"صرف نکال ہی نہیں رہیں۔ بچہ اس سے لے رہی ہیں؟" بابا صاحب نے مزید انکشاف کیا۔

"بچہ تو اس کے مرد کا ہے کوئی کیسے لے سکتا ہے اور بچے سے اسے کیا الجھن۔ اس کا اپنا بچہ اس کی گود میں کھیل رہا ہے۔ اللہ کے حکم سے ابھی دنیا میں آنے والا ہے"۔ ان کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"ہم نے آپ کو اس لئے بلایا تھا کہ آپ سے ضروری معلومات حاصل کریں گے۔ مگر یہاں تو بے خبری ہی بے خبری ہے"۔

وہ کسی دھیان میں گم کہہ رہے تھے۔

"یاور بیٹے—— کیا بات ہو گئی ہے۔ تمہارے بابا صاحب تو الجھا رہے ہیں۔ میرا دل یوں بھی بہت کمزور ہے"۔ وہ یاور علی خان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"بابا صاحب کو سب علم ہے یہی آپ کو بتائیں گے اماں جی۔ میرا تو اپنا دماغ پھٹنے کو ہے"۔ ان کی آواز سے شکستگی ظاہر تھی۔

"ہیں"۔ اماں جی دہل کر رہ گئیں۔

ان کا دل خوفناک اندیشوں سے سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔ یاور علی خان کی ٹوٹ پھوٹ ان کے ایک ایک جملے میں اتر گئی تھی۔

"تیمور اور چھوٹی دلہن کسی قیمت پر بھی مطربہ کو حویلی میں رکھنے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ ابھی اس کا ہاتھ پکڑ کر حویلی سے باہر کر دیں"۔

"ہیں—— اب تیمور بھی آ گیا بیچ میں"۔ اماں جی نے بابا صاحب کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بے تابی سے کہا۔

"یہی بات آپ کو سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ بات کچھ اور ہو گئی ہے۔ ان دونوں کو مطربہ کا وجود حویلی میں گوارا نہیں ہے۔ یہ بات البتہ سمجھ میں نہیں آ رہی کہ وہ بچہ اس سے کیوں لینا چاہ رہے ہیں"۔ بابا صاحب نے بتایا۔

"دوسری بات—— یاور کہہ رہا ہے اب وہ حویلی میں نہیں رہ سکتا"۔ انہوں نے بہت دکھی انداز میں اماں جی کو مطلع کیا۔

اماں جی حیران پریشان یاور علی خان کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ استعجاب اتنا حاوی تھا کہ وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہی تھیں۔

"آپ مطربہ کو بلاؤ—— اپنے پاس اکیلے میں—— اس سے بات کرو پوچھو حقیقت کیا ہے؟ اس لئے کہ جو کچھ ہم نے سنا ہے ہم اس کا یقین نہیں کر پا رہے اور خدا کرے جو سنا ہے وہ غلط ہو"۔

"بیٹے—— دلہن انگریزی پڑھی ہوئی ہے۔ تھوڑی آزاد خیال ہے۔ طبیعت میں ذرا غفلت اور لاپرواہی ہے۔ تم اتنا آگے جا کر سوچو"۔

دلاور علی خان نے یاور علی خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بہت شفیق لہجے میں کہا۔

"میں قیامت تک اس طرح کی کسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر بابا صاحب مطربہ جیسی بے وقوف اور دوغلی
ان دونوں کے سامنے اپنی کہی ہوئی بات دہرانے کو تیار ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ وہ بے وقوف ہے مگر اتنی نہیں کہ
اندازہ نہ ہو۔ وہ کیا کہہ گئی ہے اور بات غلط ثابت ہونے پر آپ کے ہاتھوں اس کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ آپ اس بات پر غور
کریں"۔ یاور علی خان نے تھکے تھکے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"اسی بات نے ہمیں بے حد پریشان کر رکھا ہے"۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں گویا ہوئے۔

"اماں جی!" نہایت سہمے ہوئے انداز میں دونوں کو دیکھ رہی تھیں ان کا وجدان کسی بہت بڑے خطرے کی گھنٹی بجا رہا
تھا۔ جس کے سبب ان کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

"اب یہی ہے کہ تمہاری ماں مطربہ سے تنہائی میں حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد ہی سوچا جا سکتا ہے
کہ آگے کیا کرنا چاہیے"۔

"کیا پوچھنا ہے زیتون بانو سے؟" اماں جی کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہی کہ وہ بات جو آپ سے کرنا چاہتی تھی اس نے یاور سے کیوں کی؟ کیوں اسے پریشان کیا؟ ہو سکتا ہے جو کچھ
اس نے کہا وہ صرف اسی کی احمقانہ سوچ ہو"۔

طوفان سر پر پہنچا ہوا محسوس ہو رہا ہو تو پھر دعا طوفان ٹالنے والے کسی معجزے کی ہوتی ہے۔ معجزہ بھی وہ جو اگلے ہی لمحے
ہو۔ اب خان دلاور علی خان معجزے کے مرحلے پر آ گئے تھے۔ انہیں اب صرف معجزہ چاہیے تھا۔ ایسے میں خود غرضی پہلا
مرحلہ ہوتی ہے معجزے کا۔

"کیا بات کی اس نے یاور سے؟" اماں جی کی معصوم آنکھوں سے خوف اور تشویش برسنے لگی۔

حالانکہ وہ بات جو ان تک پہنچنے والی تھی اس نوعیت کا خیال تو انہیں بہت گہرائی میں جا کر بھی نہ آ سکتا تھا۔ ان کا وجدان
کسی اور ہی سنگین قسم کے جرم کی طرف آ رہا تھا۔

"یہی کہ تاڑ یاور کے ساتھ خوش نہیں ہے اور تیمور"۔

"ارے آسمان پھٹ جائیگا۔ کچھ خوف خدا کریں"۔

ان کی حسیات تو اتنی چوکس تھیں کہ ادھوری بات سے انہوں نے پوری کہانی اخذ کر لی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میں مری نہیں، حیرت ہے زندہ ہوں۔۔۔ ارے میرے اللہ"۔ وہ ایک طرف ڈھلک گئیں۔ دونوں
باپ بیٹے ان کی طرف تیزی سے بڑھے۔

"یاور! اپنی ماں کو بستر پر لٹاؤ"۔ دلاور علی خان نے ملازم کو بلانے کیلئے گھنٹی بجائی۔

"یہی خطرہ تھا ہمیں"۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"یاور! تمہاری ماں کا دل بہت کمزور ہے بیٹے"۔ وہ دکھ سے گویا ہوئے۔

"مجھے اسی بات کا تو خطرہ تھا۔ بابا صاحب۔ اسی لئے تو آپ سے کہا تھا مجھے خاموشی سے خدا حافظ کہہ دیں"۔ وہ کہتے
ٹوٹے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"ہم ایسے کیسے کہہ دیں۔ تم اولاد ہو ہماری۔ بیٹا ہو کوئی کپڑا تو نہیں"۔

وہ اماں جی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ یاور علی خان ماں کے تلوے سہلا رہے تھے۔ چند لمحوں
بعد رشیدہ بی کمرے میں داخل ہوئی۔

"رحمو۔۔۔ بڑی دلہن کو بلاؤ۔ اور ایک گلاس پانی گلوکوز ملا کر لاؤ"۔ دلاور علی خان نے فوراً حکم دے کر اسے واپس
روانہ کیا۔

مطربہ سوپ لئے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر قدم ایک دم من من بھر کے ہو گئے۔ سامنے ہی تیمور علی خان
ماں کے بالکل قریب بیٹھے تھے۔ انہوں نے دروازے کھلتے ہوئے دیکھا پھر مطربہ کو اندر آتے ہوئے۔

وہ سوپ تپائی پر رکھ کر اماں جی کو بغور دیکھنے لگی کہ آیا جاگ رہی ہیں یا سو رہی ہیں۔ تیمور علی خان نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں
کیا۔ خاموش بیٹھے ماں کا ہاتھ سہلاتے رہے۔

"اماں جی! آپ جاگ رہی ہیں؟" اس نے براہ راست اماں جی کو مخاطب کیا۔ تیمور علی خان کو مخاطب کرنے کی جرأت
نہیں ہوئی تھی۔

"کون؟ زیتون بانو؟" اماں جی نے آنکھیں کھول دیں۔

"جی۔۔۔ سوپ بنایا ہے بڑی بیگم نے آپ کیلئے"۔ وہ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"لے جاؤ اپنا سوپ واپس۔ میرا جی نہیں کر رہا کسی چیز کو"۔ وہ بیزاری سے گویا ہوئیں۔

"تھوڑا سا لے لیں۔۔۔ آپ نے دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ مرغی کا سوپ ہے"۔ وہ اصرار کے انداز میں گویا ہوئی۔

"مرغی کا ہو یا اونٹ کا۔ کہہ دیا ناں۔ میرا دل نہیں کر رہا۔ لے جاؤ یہاں سے"۔ وہ اسی سابقہ بیزار کن انداز میں گویا
ہوئیں۔

"لے لیجئے اماں جی۔۔۔ کمزوری بڑھ جائے گی۔ پلیز"۔ تیمور علی خان نے بہت خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"یا تو آپ پریشانی بتایئے یا سوپ لے لیجئے۔ پتہ تو چلے ماں آپ کیوں پریشان ہیں"۔ تیمور علی خان نے محبت سے ماں
کا ہاتھ دبایا۔

"کچھ نہیں۔ جاؤ تم بھی اپنا کام کرو۔ میں ٹھیک ہوں"۔ انہوں نے بیزاری سے جواب دیا۔

"ایسے کیسے چلے جائیں۔ اتنی دیر سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو کیا پریشانی ہے۔ آپ بتائیں گی تو دور کرنے کی کوشش
کریں گے"۔

وہ بھلا بتانے والی تھیں۔ وہ خاموشی سے گہری سانسیں لینے لگیں۔

"مجھ سے زیادتی برداشت نہیں ہوتی تیمور۔ تم اس بے آسرا بچی کو کیوں پریشان کر رہے ہو۔ کیوں نکال رہے ہو اسے

حویلی سے"۔ وہ پھٹ پڑیں۔

"کمال تو نہیں رہے۔ سارے بیچے جا رہے ہیں۔ یہ آہستہ آہستہ مسئلہ بن رہی ہے۔ اب آپ کو کیا بتائیں اور کیا نہ بتائیں"۔

"اس کی جگہ کوئی اور انسان ہوتا تو وہ ہمارے لئے نعمت بن جاتا۔ ہمیں بھی سکون پہنچاتا اور خود بھی سکون سے رہتا۔ مگر اسے صحرا ہی راس نہیں آئیں۔ ہم تو لندن چلے جائیں گے۔ مگر پھر یہ آپ کیلئے مسئلہ بن جائے گی۔ اماں جی آپ نے جو صحرائی اس کے ساتھ کی۔ ہم سب کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ یہ اپنا آپ بھول بیٹھی ہے۔ برابری کرنے لگی ہے۔ ٹھیک ہے ہم بیاہ کر لائے تھے۔ مگر کہاں کو بھی تو سوچنا چاہیے۔ آپ نے اس کی گستاخی دراصل دیکھی نہیں ہے"۔

"ارے ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے کیا کہہ رہی ہے کسی کو"۔ اماں جی نے ان کی بات کاٹ دی۔

"کاش ایک کونے میں پڑی رہنے والی ہوتی۔ حویلی کے معاملات میں مداخلت کرنے لگی ہے۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے"۔

☆—☆—☆—☆—☆

تیمور علی خان ماں کی حالت کے پیش نظر اٹھ کر آ گئے تھے مگر بہت الجھ گئے تھے۔ جانے انہیں کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ پس پردہ کوئی بڑا طوفان متحرک ہے جو سامنے آنے ہی والا ہے۔

وہ پھر بے کل انداز میں ماں کے پاس دوبارہ آ گئے تھے۔ یہاں کیلئے مزید ٹھہرنا کسی طرح ممکن نہیں تھی۔

اماں جی آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ وہ خاموش انداز میں ان کے قریب پڑی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

"میرا بچہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں تو کنیزیں بھی سر ڈھانک کر پھرتی ہیں۔ اور بڑی آبرو کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں"۔ وہ بے اختیار بڑبڑا رہی تھیں۔

"میرے اللہ تو مان رکھ لے میرا۔ میری عزت رکھ لے"۔ وہ پھر بڑبڑائیں۔

تیمور علی خان بری طرح چونک پڑے۔ جانے کیا کیا ان پر الہام ہونے لگا۔ پھر کسی یوسف کا دامن پیچھے سے پھٹا ہے؟ نہایت مضبوط اعصاب ہونے کے باوجود ان کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔ دل بیٹھنے لگا۔

وہ احمق جاہل لڑکی۔ اتنا نہیں گر سکتی۔ لیکن کیا پتا گر گئی ہو اور رات کی تاریکی میں چھپ کر کسی طوائف سے نکاح کرنے والا ایسا روشن ضمیر ہوتا تو نکاح روشنیوں میں ہوتا۔

"خالی کاغذی نسب سے کیا ہوتا ہے۔ کہہ تو دیا سرکارِ دو عالم ﷺ نے کہ تقویٰ سے بلند کوئی نسب نہیں۔ آج بھی ہے وضاحت ساری کی ساری خطبہ حجۃ الوداع میں۔ یہ ہم زنگ کھائے ہوئے انسان ابھی تک نسب کی حقیقت سمجھ ہی نہیں پا رہے۔ تو یہ بات ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر کارروائی کا آغاز کس سے ہونا چاہیے۔ ہم نہیں چھوڑیں گے اسے۔" ان کی آنکھوں سے لہو ٹپکنے لگا۔

"اماں جی! ہم عام سے آزاد خیال، تھوڑے سے نافرمان اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے معاملے میں تھوڑے سے تلخ اور سنگدل ضرور ہیں۔ مگر اس درجہ کمینے اور گھٹیا نہیں ہیں"۔

وہ خود پر کنٹرول کھو چکے تھے اور کچھ اس بات کی بھی جلدی تھی کہ ماں کو تکلیف دہ مشکل سے نجات دلا دیں۔ جس کے سبب ان کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ انہوں نے بے اختیار ماں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔

اماں جی نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ تیمور کے جملے نے انہیں تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

"ہاں مجھے یقین ہے میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا"۔ اماں جی کی آنکھوں میں نئے سرے سے جگمگاہٹ آ گئی۔

"جب آپ کو یقین ہے تو پھر آپ کی یہ حالت کیوں ہوئی؟" تیمور علی خان کے انداز میں شکوہ تھا۔

"یہ تو اس بات کا صدمہ ہے کہ میرے گھر میں اس طرح کی بات ہوئی کیوں۔ غلط خواہ مخواہ۔ ہمارے ہاں ایسی بات کا کبھی بھی تصور نہیں کیا جا سکتا"۔

اماں جی میں نئے سرے سے توانائی آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تو پھر جھگڑا کیا ہے۔ جب کوئی بات ہی نہیں ہے۔ پڑی ہوئی ہے ایک طرف تمہارا کیا لگتی ہے بیٹے۔ چھوڑو اسے اس کے حال پر"۔

وہ تیمور علی خان سے گویا سفارش کر رہی تھیں۔

"حد ہو گئی اماں جی ---- ابھی بھی آپ اس کی سفارش کر رہی ہیں۔ اب تو آپ کو چاہیے کہ پہلی فرصت میں اسے یہاں سے شفٹ کر دیں تاکہ آئندہ اس قسم کا کوئی مسئلہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ اتنی گھٹیا الزام تراشی وہ بھی ہم پر۔ خفگی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت تھی اس وقت ان کی۔

"کم عقل ہے ---- سمجھاؤں گی اسے۔ بے سہارا بچی ہے۔ اسے بھرے کنبوں میں رہنے کا تجربہ بھی نہیں اور رشتوں کی نزاکتوں تک اس کے دماغ کی پہنچ نہیں۔ جانے کس بات کو کس رنگ میں لے بیٹھے۔

"میں تمہارے بابا صاحب کو بھی سمجھانا چاہ رہی تھی کہ اس طرح غصے اور تیزی میں نہیں سوچیں۔ میرا تیمور اپنی بھاوجوں کی جتنی عزت کرتا ہے شاید ہی کسی دیور نے بھی کی ہو۔ نہ ہی نازنین کوئی ایسے گرے پڑے گھر کی ہے جہاں گدھے گھوڑے ایک ہو رہے ہوں"۔

"یہ نازو بھابی کا اس قصے میں کیا ذکر؟" تیمور علی خان نے تعجب کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ اندر کہیں ایٹم بم گرا تھا۔

اماں جی ان کی شکل غور سے دیکھنے لگیں۔ (تو پھر کس کا ذکر؟) مگر وہ صاحب چپ ہو کر رہ گئیں۔

دونوں ماں بیٹے اپنی اپنی خاموشی میں کچھ سوچنے لگے تھے۔ دونوں کو احساس تھا کہ بات وہ ہے جو کھل چکی ہے اور نہ ہی وہ ہے جو سمجھائی جا چکی ہے۔ بلکہ بات تو وہ ہے جو ابھی زبان پر آنا ہے اور طرف کس مرحلے سے گزریں۔

دکھ، خوشی دونوں کیفیات ان کو سوز دیتی ہیں ان کی لاتعداد حسرتیں منتظر ہیں۔ مرحلے کٹھن ہیں۔

دونوں ماں بیٹے۔ اس وقت دو ملی جلی کیفیات سے گزر رہے تھے۔

اماں جی کی حیرت، تکلیف، دکھ، الجھن میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں اماں جی کہ نازو بھابی کا اس قصے سے کیا تعلق؟ ہم تو اس بے حس دوسرے شخص کا ذکر کر رہے ہیں جس نے ہمیں آپ کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی ہے۔ بھلا یہ بھاوجوں کا اور دیور بھابی کے رشتے کا ذکر درمیان میں کہاں سے آ گیا؟"

اونچے پورے تیمور علی خان کے سینے میں ایک ذرا سے دل نے جانی پکار بکی تھی۔ وہ بات جو سمجھ میں آ رہی تھی اتنی خوفناک تھی کہ اس وقت انہیں اصل ڈر سے بھی گھبراتی اور دکھا رہی تھی جو انہیں کسی انتہائی اقدام سے باز رکھ سکے۔

"آپ چپ کیوں ہیں اماں جی؟ ایک بات بتا دیں ہم آپ کو اگر ہم اس کے سوگئے سے یا اور بھابی کے سامنے ذکر کریں تو پھر کیسا ہو گا"۔

وہ مٹھیاں بھینچے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اتنی ہمت اس کم ظرف کی۔ ابھی نمٹتے ہیں"۔

اماں جی روکتی رہ گئیں مگر وہ باہر نکل گئے تھے۔

سامنے ہی ماما ملی آ گئی تھی

"ماما صفیہ کہاں ہے؟"

سنا ہے جب انسان پر خون سوار ہوتا ہے تو اس کے خون سے بھاپ اٹھ رہی ہوتی ہے۔ ماما کو ان کے وجود سے پکے گوشت کی بو آنے لگی۔ کہ ان کی آنکھیں اندر کا بھید بتا رہی تھیں۔

ماما تو تھر تھر کانپنے لگی۔

"خ ---- خ ---- خان۔ ابھی تو یہیں تھیں۔ باورچی خانے میں۔ نہیں نہیں اپنے کمرے میں۔ نہیں وہ ادھر باغ میں"۔ ماما کی بدحواسی نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"ماما ہمیں ٹھیک جگہ بتا دو ورنہ ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے"۔

ان کی غراہٹ بتا رہی تھی کہ بشریت کے دائرے سے نکل کر اتنی دور آ گئے ہیں کہ انہیں واپس لوٹنے کی کوشش میں اصل درجے کی ناکامی ہوگی۔

"اسی دم اماں جی بھی ہانپتی کانپتی چلی آئی تھی۔

"ارے میرے بچے میری بات تو سن ---- تو نے بات تو سنی نہیں"۔ وہ یوں پچکارنے لگیں جیسے چھوٹے بچے کو بہلاتے

ہیں۔

مگر تیمور علی خان کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اسی دم مطربہ باری کی انگلی تھامے ایک موڑ سے راہداری میں نمودار ہوئی۔ وہاں کی صورتحال پر قدرے عقل جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''تیمور علی خان اس کی طرف عقاب کی طرح جھپٹے تھے۔ مطربہ کے حواس اتنے چوکس تھے کہ وہ آن کی آن میں بہت کچھ سمجھ گئی۔

وہ باری کو وہیں چھوڑ کر بابا صاحب کے کمرے کی طرف سرپٹ بھاگی۔

دلاور علی خان ٹیلی فون پر کوئی بہت ضروری بات رازدارانہ انداز میں کر رہے تھے۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور مطربہ گرتی پڑتی اندر گھستی نظر آئی تو انہوں نے مخاطب کو مطلع کئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

''کیا بدتمیزی ہے لڑکی؟'' وہ حیران بھی تھے اور ناراض بھی مگر صرف ناراضگی ظاہر کر رہے تھے۔

''خ ۔۔۔ خان!'' وہ ان کے بیڈ کی پشت پر آ کھڑی ہوئی'' خان وہ تیمور خان ۔۔۔ مجھے بچا لیں''۔

ابھی وہ اتنا ہی بول پائی تھی کہ تیمور تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ باپ کی موجودگی کو شاید وہ کسی بھی طور نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ عجیب بے بسی ان پر چھا گئی تھی۔

ادھر اماں جی نے ''امدادی کارروائی'' کا کورم پورا کرنے کی غرض سے یاور علی خان کو پکار لیا تھا۔

''کیا ہوا بیٹے ۔ ہوش میں آؤ۔ عورت ذات ہے''۔

وہ بہت ہی گھبرائے ہوئے انداز میں تیمور علی خان کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ یاور علی خان بھی بابا صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوئے۔

''یہی بھول ہم سب سے ہو گئی ہے۔ یہ عورت ذات نہیں ہے''۔

عزت نفس پر ایسی کاری پڑی تھی کہ سارا اکتساب۔ ساری سیکھا اَن سیکھی ہو گئی تھی۔ اب تو منظر پر ایک خونخوار حیوان رہ گیا تھا۔

''بیٹے اس نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا۔ تم میری بات تو سنو''۔ اماں جی پھر لجاجتی انداز میں تیمور علی خان کی تھوڑی چھو کر بولیں۔

''اچھا اس نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ایسا کیا ہے کہ یاور بھائی ہماری شکل سے بیزار ہیں۔ بات ابھی ابھی سمجھ میں آئی ہے''۔

وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بمشکل گویا ہوئے۔

''ہمارا نام مت لو تیمور۔ ہم تم سے پہلے سے مطلع کر چکے ہیں کہ غلط بیانی ثابت ہوئی تو اس کا انجام ہمارے ہاتھوں بہت عبرتناک ہو گا۔ یہ بے وقوف ضرور ہے، پاگل نہیں ہے''۔ یاور علی خان کا لہجہ قطعی غیر جانبدار اور سپاٹ تھا۔

''آپ لوگ بیٹھ جائیں''۔

''بابا صاحب کی پرجلال آواز گونجی۔ اماں جی تو چھوٹے بچے کی طرح جھٹ بیٹھ گئیں۔ اس آس میں کہ خان صاحب اس عذاب سے نکالنے کیلئے کوئی بہترین اقدام کرنے والے ہیں۔ ان کی نازک طبع اس قدر تناؤ کا بار دوبارہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

یاور علی خان باپ کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھے۔ تیمور علی خان بادل نخواستہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

''تم ادھر آؤ لڑکی ۔۔۔ ہمارے سامنے کھڑی ہو''۔

وہ اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے کھڑے تھے۔ بغیر حرکت کئے انہوں نے مطربہ کو مخاطب کیا۔

مطربہ سر پر چادر لٹکاتی آہستہ چلتی ہوئی ان کے بہت قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس زاویے سے کہ دونوں بھائی کسی بھی وقت اگر اسے نقصان پہنچانے کی کیفیت میں آ جائیں تو بابا صاحب سے گزرے بغیر اس تک نہ پہنچ سکیں۔

بابا صاحب کا بیڈ داخلی دروازے سے کافی فاصلے پر دیوار سے بالکل ساتھ لگا ہوا تھا۔ دیوار اور بیڈ کے درمیان بمشکل آدھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ جہاں کچھ دیر قبل مطربہ پھنسی ہوئی تھی۔

جس صوفے پر تیمور بیٹھے تھے۔ وہ داخلی دروازے کے بالکل ساتھ تھا اور جس کرسی پر یاور علی خان بیٹھے تھے۔ وہ بیڈ کی پائنتی کی طرف تھی۔

جبکہ یاور علی خان اور مطربہ کے درمیان بابا صاحب سر وقد کھڑے تھے۔ اماں جی یاور علی خان کے قریب بیڈ پر ٹک گئی ہوئی تھیں۔ ہونقوں جیسی حواس باختہ تھیں۔ کبھی اضطراری انداز میں دوپٹہ سنبھالتیں۔ کبھی بیٹوں کی شکلیں دیکھنے لگتی تھیں۔

''تمہیں نہ آداب غلامی آتے ہیں نہ آداب وفاداری۔ اے بدنصیب لڑکی تمہیں اتنی جرأت ہوئی کیسے کہ تم یاور علی خان سے اس قسم کی بات کر سکو۔ جرأت کو بھی نظر انداز کر دیں تو یوں کیوں نہ کہیں کہ تم اس قدر بے حیا ہو چکی ہو۔ عورت کے پاس حیا کے سوا دوسرا کون سا ہتھیار ہے۔ ہمارے منہ میں خاک اگر کسی قسم کی ان بن تمہیں مل ہی گئی تھی تو کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ تم بالغ ہوتے ہوئے گھر کے لڑکوں سے براہ راست بات کرو۔

''کیا غلط پھر بھی اس کی پیٹھ میں اتارو جس نے تمہاری بھلائی کیلئے سب سے زیادہ جرأت دکھائی۔ عمل کام کیا؟''

''کیوں کی تم نے یہ حرکت؟'' وہ بغیر نگاہ اٹھائے مطربہ سے مخاطب تھے۔

وہ خاموش کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہی۔

''کیا تمہیں ادھر حویلی میں کسی نے مشورہ دیا تھا کہ یاور علی خان سے تم خود بات کرو''۔ وہ پھر خاموش کھڑی رہی۔

''دیکھ رہے ہیں آپ اس کی ڈھٹائی؟'' تیمور علی خان نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورا۔

مطربہ نے نگاہیں اٹھا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

''میں مجھے کانچ پر لوٹتی تھی خان۔ تمہارے شعلے میں جلنے لگ رہے تھے۔ تمہارا دوست صبح اٹھتا تھا جیسے جنت سے ہو کر آتا تھا۔ تم نے مجھ پر احسان کیا پائے سر سے مجھے بچ ہونے کا احساس دلایا۔ خود تو تم نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ میری بھی کوئی ہستی ہے مجھے تو گھڑی گھڑی بڑی خاموشی تو کیسے گی کہ اپنی اوقات پہچانوں۔

اور نہیں تو میرا دکھ ان لیا تھا۔ بغیر آواز کے تو بغیر کچھ بے ایک طرف ہو جاتے۔ نہیں۔ نہیں۔ تم کچھ پاگے تھے۔ اس لئے مجھے سزا دی تھی۔ حفاظت کیلئے اور دوسرے راستے بھی تھے۔

میرا تن من روندا گیا ہے۔ میرے دل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ میں بغیر خوشی کے رہ سکتی ہوں تو اور سب کیوں نہیں رہ سکتے؟ جب میں برباد ہو کر سانس لے سکتی ہوں تو دوسرے ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ میں ہوئیں کھلی آنکھوں سچ کی پچھے دیکھتی ہوں۔

اگر یہ سب بے قصور ہیں تو میں بھی بے قصور تھی۔ ان کی کوئی اور دنیا اور کوئی اور خدا نہیں ہے۔

تمہیں کیا پتا خان۔ اپنا وجود پیش کرنا عورت کی سب سے بڑی حماقت اور سب سے بڑی ہار ہے۔ مگر یہ ہار مرضی کی ہو تو عورت گلاب اٹھاتی ہے اور مرضی کی نہ ہو تو اس وار کے بعد کبھی خود کو معاف نہیں کرتی۔ میرے اندر آگ دہک رہی ہے۔ میرا بہت نقصان ہوا ہے۔ میں کسی پر رحم نہیں کھاؤں گی۔ سب کچھ جلا کر خاک کر دوں گی۔ جب میں رہ سکتی ہوں تو دوسرے کیوں نہیں رہ سکتے۔ جب میں مر مر کے جی سکتی ہوں تو اور کیوں ایسا نہیں کر سکتے۔

جب میری ہنسی کے بغیر آس پاس خوشی برس سکتی ہے۔ جب علی کے بغیر اس کے بچے جی اس کے ماں باپ زندہ رہ سکتے ہیں۔ جب اس کے بغیر اس کا گھر چل سکتا ہے۔ جب میرے بغیر میری ماں زندہ رہ سکتی ہے۔ جب میرا باپ اپنا نسب ایک طوائف کی جھولی میں ڈال سکتا ہے تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ میرے ہاتھ آئے پھر بتاؤں گی اسے بھی بھول کی قیمت۔

"بے ادب —— کیا گونگی بنی کھڑی ہے۔ کیا پوچھ رہے ہیں تیرے بڑے خان؟"

اماں جی نے اس کی مسلسل خاموشی پر نہایت ناراضگی سے ٹوکا۔

"کیا؟" وہ بری طرح چونک کر ان سب کی صورتیں دیکھنے لگی۔ "جی خان —— کیا پوچھا آپ نے؟"

"تو نے یاور علی خان سے کیا الٹی سیدھی بات کی۔ شرم آنا چاہیے تجھے خانوں سے اس طرح کی بات کرتے ہوئے؟"

اماں جی کو اندازہ تھا کہ ولاور علی خان اس وقت خون کے گھونٹ پی رہے ہیں تبھی انہوں نے شریک حیات کی معاونت کی۔

"یاور خاناں بہت مہربان بہت نیک انسان ہیں۔ وہ سب کی عزت کا حق پہچان کر بات کرتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ ان کا اپنا بھائی ان کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کر رہا ہو اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔"

کمرا تھا یا پوری حویلی۔ یا چھت سر پر آ رہی تھی۔

کمرے میں اس طرح کی خاموشی تھی جیسے کسی مرنے والے کی آخری ہچکی سے پہلے ماحول میں سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے پلنگ کے پاس ہر طرح کا رشتہ موجود ہوتا ہے مگر لب بستہ ہوتا ہے۔

تیمور علی خان یوں بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے جیسے کسی حکم کے منتظر ہوں جیسے وہ بولا کچھ اور جا رہی ہو اور بول کچھ اور گئی ہو۔ یا پھر انہیں مغالطہ ہوا ہو۔

"آپ خود تو کبھی بڑے خان انہیں یہ بات اور کسی سے کیوں کہتی۔ اس کا کیا فائدہ ہوتا؟ یاور خاناں بھی اپنی بیوی سے

بات کر سکتے تھے۔ میں بہت دیر سے بہت کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں نے یاور خاناں سے کہہ دیا۔"

یاور علی خان نے جوتے کی نوک سے قالین کو مسلا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔

اماں جی سکتے کی کیفیت میں دل پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھیں۔

تیمور علی خان دکھ اور حیرت سے پتھرا کر رہ گئے تھے۔

ولاور علی خان انتہائی شکستہ انداز میں بیوی کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

ہاتھ چھڑی پر مضبوطی سے جمائے تھے مگر سر جھکا ہوا تھا۔

"زیب کی ماں اس سے پوچھو ایسا کیوں کر رہی؟"

ان کی کمزور آواز کمرے میں ابھری۔ اگر ایسا کچھ تھا بھی تو اسے زبان سینا چاہیے تھی یا سب کرنا چاہیے تھا۔

اماں جی خالی خالی آنکھوں سے عطریہ کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

چند ثانیے بعد تیمور علی خان اپنی جگہ سے اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عطریہ کے قریب آئے۔ بابا صاحب نے اپنے انداز نشست میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اماں جی میں سکت نہ تھی۔

عطریہ پچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

تیمور علی خان تیرہ پونڈ مالیت کی بلیک اسٹائلش پتلون اور بلیک کرشرٹ میں ملبوس بلا کے خوبصورت اور پرکشش نظر آ رہے تھے۔

"کیا چاہیے تمہیں؟" ان کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔

عطریہ سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ بابا صاحب کی موجودگی میں تھوڑی بہت تقویت ضرور تھی مگر تیمور علی خان سے اس وقت ہر طرح کی امید کی جا سکتی تھی۔

"ہم پوچھ رہے ہیں تم سے کچھ۔ کیا چاہیے تمہیں؟ بابا صاحب اماں جی اس وقت یہاں موجود ہیں ہم تمہیں اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم ان تینوں کی موجودگی میں صرف بتا دو کہ تمہیں کیا چاہیے آخر میں —— حویلی —— یا ——" وہ قدرے جھجک کر رکے۔ "یا تیمور علی خان۔"

جیسے بم گرا پڑا ہوا تھا۔

تیلی دکھانے کی دیر تھی۔ ایسی بھڑ بھڑا کر آگ لگی کہ تن من خاکستر ہونے لگا۔

وہ دو قدم مزید پیچھے ہٹ گئی۔

اماں جی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔ جیسے وہ کہیں اکھڑ کر بھاگ رہا ہو۔

بابا صاحب پورے ضبط اور وقار سے صورتحال کا سامنا کر رہے تھے۔

"تو خود غرض لڑکی! تم اتنا آگے نکل جاؤ گی۔ ہمیں یہ امید نہیں تھی۔ انسان کا پہلا کفر خود روئی کے بعد یہ ہے کہ سوسائٹی میں اس کی عزت ہو۔ دل کی تمام خواہشات اس کے بعد آتی ہیں اور جنگلی۔ ہم نے اسی کا بندوبست کیا تھا۔ تمہارے پاس آل

ریڈی یہ سب کچھ ہوتا تو ہم تمہاری دوسری ضروریات کو اہمیت دیتے مگر تم علم و فضل کی یہ دار ہو تم سے تو یہ تک بھی نہیں ہوا۔

"بتاؤ بابا صاحب کو کس عمل میں تمہیں کیا چاہئے۔ بتاؤ؟"

انہوں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر چہرہ اونچا کیا۔

اس کی حیرت سے پھٹی آنکھیں تیمور علی خان کے چہرے پر ٹک گئیں۔

وہ "بے خبری" کے عالم کرتے کرتے پاگل ہو گئی۔ مگر جہاں تو خبری خبر تھی۔

پہلے کبھی اتنا بھی ہو جاتا تو وحشتیں یہ مقام کیوں دیکھتیں۔ اس کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس نے یوں تیمور علی خان کو دیکھا جیسے قربان ہو جائے گی۔

"یہ تم اس سے کس طرح کی باتیں کرنے لگے تیمور؟" بابا صاحب زیادہ دیر خاموش رہ نہ سکے۔ بڑی ناگواری تھی۔

"تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ ہم تم پر تھوک ہی دیں۔ بتاؤ۔ بابا صاحب کو اور بھائی کو نہ ہم نے جو تمہیں بتایا تم نے یہ حرکت کس لئے کی؟ بولو۔ خاموش کیوں کھڑی ہو؟" ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"بتاؤ ورنہ ہم تمہارا حشر کر دیں گے۔"

ایک زنانے دار تھپڑ انہوں نے مطربہ کے گلابی رخسار پر جڑا تو پانچوں انگلیوں کے نشان واضح طور پر ابھر آئے۔

اماں جی کانپ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور مطربہ اور تیمور علی خان کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔

"بیٹا کرو میرے بچے تم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" انہوں نے تیمور علی خان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"پہلے کبھی ایسا ہوا بھی تو نہیں۔ اماں جی! ہم کھڑے کھڑے لٹ رہے ہیں۔ آپ درمیان میں نہ آئیں۔ بیٹھ جائیے۔"

وہ بمشکل خود پر قابو پا کر مخاطب تھے۔

"آپ ادھر آرام سے بیٹھ جائیں۔" بابا صاحب نے بھی انہیں ٹوکا۔

مطربہ رخسار پر ہاتھ رکھ کر نظریں جھکائے چپ کھڑی تھی۔

"تم بھی ادھر آؤ تیمور۔ جتنی بات ہم سمجھے ہیں اس حوالے سے ہم خود اس سے بات کرتے ہیں۔" وہ تیمور علی خان چھڑی پر زور ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اپنا مقام پہچانتی ہو لڑکی۔ یہ وہ جاگیردار ہے جسے انگلستان کا کوئی لارڈ بھی خوشی سے بیٹی دے دے گا۔"

"تم نے یہ سب اندازہ کر لیا تھا تب ہی یہ گھناؤنا کھیل۔ کیا تیمور ٹھیک کہہ رہا ہے؟ ہم ٹھیک سمجھے ہیں؟"

وہ بہت رسانیت سے پوچھ رہے تھے۔ مطربہ نے نظریں اٹھا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

نفرت سے اس کا چہرہ جھلس رہا تھا۔ پھر اس نے بابا صاحب کی سمت دیکھا۔

"جو بات آپ کے اس میں نہیں چھوٹے خان۔ وہ آپ نے منہ سے بھی کیوں نکالی؟ میں نے تو کبھی آپ سے کوئی

کیا آپ اس حد تک جا سکتے ہیں۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا۔"

اس کی حس جاتی رہی تھی پھر بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ خان کے سامنے بات بول کر اپنے بدترین انجام کو دعوت دے۔

"تم کسی کے سامنے اپنی غلط چالوں کا اعتراف کر کے گھر والوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو ورنہ ذرا تمہاری حماقت جہالت کا تم سے یہ سب کروایا۔ اور تم ہمیشہ کیلئے سر اٹھا کے چلی جاؤ۔ ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ تمہیں دھکے دے کر حویلی سے باہر کر دیا جائے مگر ہم اپنی بچیوں کے صدقے میں تمہارے ساتھ رعایت کر رہے ہیں۔"

"لیکن ایک بات اور ہے کہ ہم کبھی تمہیں اپنے سامنے نہ دیکھیں۔ اگر ہم مر جائیں تو ہمارے جنازے سے تمہیں دور کیا جائے۔"

وہ تیمور علی خان نے اپنے اعلیٰ ورثے کا غضب بہت اچھے انداز میں ظاہر کیا تھا۔

"مگر میں خان! میں نے آپ کو کہا کہ میں نے جو کیا غلط کیا ہے۔ یہ احتجاج ہے کہ مجھے یاور خان کے بجائے اماں جی کو کہنا چاہیے تھا۔"

اس نے رخسار پر ہاتھ رکھ کر نہایت سنگدلی سے تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

"جانتے ہو ہمیں مجھے دکھ ہے۔ ذلیل کیا۔ کیوں دیا تھا کسی کے ہاتھوں میں؟"

کھلونا دیا تھا دوست کو کھیلنے کیلئے۔ میرے نزدیک سے بے حسی کا وہ احساس رس رہا ہے جب میں روز جیتے جی مرتی تھی۔ اب ہم ایک جیسے ہیں گے۔ کوئی فرق نہیں ہو گا۔ اگر کوئی بھول کر فرق ہوا تو میں اس پر تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گی۔"

بچی اس کا اول تو ذہن بگڑ چکا تھا۔

اماں جی نے تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

"کس سے ہو کیا کہہ رہی ہے؟"

"اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ لوہے کی سلاخ سے اس کا جسم داغا جائے۔ پھر تو بچ جائے گی۔" وہ غصے میں غرائے۔

"ارے توبہ! کیا آفت آئی اب یہ بھی ہو گا۔ یوں تو گھوڑے سے بھی گدھا کھلواؤ گے۔" اماں جی نے اپنا چہرہ سہلایا۔

"بابا صاحب۔" تیمور علی خان باپ سے مخاطب ہوئے۔

"تیمور! تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔"

"کہاں سے اس وقت ہی جائیے جب اپنے ماں باپ کی نظروں سے سرخرو ہوں گے۔ یہ بہت مکار ہے۔ ہمیں مزید نقصان پہنچا سکتی ہے آپ یاد کریں۔ تاریخ گواہ ہے میدانوں میں جتنی ہوئی جنگیں عورتوں کی سیاست سے ہار میں تبدیل ہوئیں۔ عورت درمیان میں آئی اور فتح شکست میں بدل گئی۔ حالانکہ بہادری میں کمی تھی نہ ہتھیاروں میں۔"

بابا صاحب اور اماں جی چونک کر تیمور علی خان کا چہرہ دیکھنے لگے۔ دل تو یہی کہتا تھا کہ تیمور یہ سب نہیں کر سکتے لیکن انھوں نے اتنا عطریہ کو صرف الزام ٹھہرایا تھا۔ جس کے بعد بھی جان نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ دل کی بات کی اب کیا ناز مین کو بھی بلا لیں۔ اس خیال سے دونوں ہی کو شرم آ رہی تھی کہ وہ بہو سے اس موضوع پر بات کریں۔

دلاور علی خان بہت سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا چاہتے تھے۔

"دیکھو تیمور...... ہم بلاوجہ تم سے بدگمان کیوں ہوں گے جبکہ حقیقت ابھی بھی پوشیدہ ہے۔"

"کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے بابا صاحب۔ ہم ان کی تمام سیاست سمجھ چکے ہیں۔" وہ برہم ہوئے۔

"وہ ہم اس سے قبول کروا لیں گے مگر یاور کے سامنے۔ جائیے آرام کرو۔ ہم تمہارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی برداشت نہیں کریں گے۔ آپ بھی آرام کیجیے۔ اس بات کا خیال ہے کہ اس واقعے کی ہوا بھی کو نہ لگے۔"

بابا صاحب نے اماں جی سے بہت نرمی سے کہا۔

"جی...... اب کیسا آرام۔ ارے دلہن بانو بھی تنگی کی بیٹی آ نے ہمارے ساتھ۔"

اماں جی کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

ایک لمحے کو عطریہ کے دل کو کچھ ہوا۔ بے ساختہ اس کا جی چاہا اماں جی کے پاؤں تھام کر معافی مانگ لے۔ مگر ان خاتون کی سمت نگاہ اٹھانا قہر کر گئی۔ اب تو زندگی کی شرط اسی زبان پر قائم رہنا ٹھہری تھی۔

پھر تیمور علی خان کی موجودگی میں تو وہ یوں بھی بہت سنگدل ہو جاتی تھی۔

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔" عطریہ نے گہری سانس لے کر تیمور کی سمت دیکھا تھا۔ اسی دم عالم آپا گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"اماں جی ناز کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی نکلوا لی ہے۔ آپ بھی چلیے۔"

اماں جی ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ "یاور کہاں ہے؟"

"وہ تو کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔ بس آپ جلدی کیجیے۔ اسی اسپتال چلنا ہے جہاں ناز نے نام لکھوایا ہے۔"

وہ بے چینی میں گویا ہوئیں۔ وہ اتنی پریشان تھیں کہ انھوں نے کمرے کی غیر معمولی صورت حال کی طرف بھی توجہ نہیں دی تھی۔

"اوہ" اماں جی کی سمجھ میں بات آ گئی۔ انھوں نے بابا صاحب کی طرف دیکھا۔

"مجھے چھوٹی دلہن کے ساتھ جانا ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ عالم آپا کے پیچھے لپک گئیں۔

"لڑکی تم بھی جاؤ...... یاری کو ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔ آج سے اس کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میرے ساتھ کیا کرنا چاہیے سوچ کر بتا دیجیے۔"

"بابا صاحب کا لہجہ بالکل سرد و سپاٹ تھا۔

"اب تم جا سکتی ہو۔" گویا انھوں نے بتا دیا تھا کہ اب اس کی کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

"دلہن اسپتال جا رہی ہے۔ یاور کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے مگر وہ ہے کہاں؟" وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

تیمور علی خان خاموش رہے۔

بابا صاحب جانے کیا کچھ سوچتے رہے پھر باہر چلے گئے۔

چار گھنٹے کو ہر ہنگامی چھوڑ لیں سے پہلا ابھی نہیں تھا کہ حویلی میں خبر آ گئی کہ یاور علی خان ایک بہت خوبصورت بیٹی کے بھی اب بن گئے ہیں۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد بیٹی کی خبر بہت خوشی کے ساتھ سنی گئی۔

مگر سب خوشی منانے والے افراد کے درمیان بابا صاحب اور تیمور علی خان بہت پریشان تھے کہ رات سے اب تک یاور علی خان کا کچھ پتہ نہ تھا۔

تمام حکموں میں فون کروا لیے تھے مگر سب جگہ سے لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔ ناز مین بار بار یاور علی خان کا پوچھ رہی تھی۔

صورت حال سنگین ہو رہی تھی۔ تیمور علی خان ہزار پریشان سہی مگر ان کے حواس بے حال نہیں تھے۔ یاری کو ملازمہ کے پاس پہنچا کر انھوں نے عطریہ کو کمرے باہر سے بند کروا دیا تھا۔ ان کا دماغ جیسے آگ میں سلگ رہا تھا۔ وہ بھتیجی کو دیکھنے اسپتال بھی نہیں گئے۔ جانے کیوں ناز مین کے سامنے جانے کا حوصلہ وہ خود میں نہیں پا رہے تھے۔ ایک دم ہی اس سے بہت فاصلہ محسوس ہونے لگا تھا۔

ایک دہشت بیٹھی تھی کہ یاور علی خان کچھ کر نہ بیٹھیں کیونکہ ان کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ انھیں عطریہ سے مکمل اتفاق ہے اور اس میں حیرت کی بات بھی کیا تھا ایک کمزور لڑکی اسے مضبوط لوگوں کے درمیان انتہائی جرأت سے کچھ کہہ جاتا ہے تو سننے والے کچھ سوچنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

اسی سبب انھیں بھائی کی طرف سے بہت زیادہ پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ بھی کام کرنے کے قابل نہیں تھے۔

انھیں اسپتال سے کئی فون آ چکے تھے۔ اماں جی انھیں بلا رہی تھیں۔ باقی خواتین واپس حویلی آ چکی تھیں۔

اب کچھ سوچتے ہوئے ان کو جوش ہونے لگا تھا۔ آخر کوئی فیصلہ کر کے اندر آ گئے۔ اپنے کمرے سے بائیک کی چابی اٹھائی اور تھوڑے فاصلے پر موجود شہر کے اس اسپتال کا رخ کیا جہاں ناز مین موجود تھی۔

داخلے ہی میں اماں جی مل گئیں۔

"مبارک ہو اللہ نے بہت پیاری بھتیجی دی ہے۔" خوشی کم کھل رہی تھی ان کی آواز۔

"شکریہ اماں جی...... آپ کو بھی مبارک ہو۔" ان کا انداز بھی بجھا بجھا سا تھا۔

"یاور کی کوئی اطلاع آئی؟" اماں جی نے ان کی شکل بغور دیکھی۔

انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اماں جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"مجھے تو نازو کے سامنے جاتے ہوئے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اللہ اسے ہر بری چیز سے بچائے۔ تم بھی اس کی رضا سے یہ کچھ کرائے۔ اچانک ضروری کام سے حسن ابدال جانا پڑ گیا۔ کوئی سرکاری مسئلہ ہے ایک دو دن میں آ جائیں گے۔" اماں جی نے راہ بھائی۔

"وہ زندگی موت کی جنگ لڑ کر نڈھال پڑی ہے۔ اسکو بس ہر طرح سے پرسکون کرنا ہے۔ مجھ سے ہو نہیں پا رہا ہے۔" ان کا انداز درخواست گزار کا سا تھا۔

"جی ۔۔۔ جی آپ فکر نہ کریں۔ کس طرف ہے ان کا کمرہ؟" انہوں نے اپنے منتشر ذہن کو مشکل سمیٹ کر پوچھا۔

"آؤ ۔۔۔ میرے ساتھ۔" اماں جی نے اپنی چادر درست کر کے چہرہ ڈھانپ کر ایک طرف کو چل پڑیں انہوں نے بھی تقلید کی۔

طویل راہداری میں دونوں جانب دروازوں کا ایک طویل سلسلہ تھا اماں جی ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے اندر قدم رکھتے ہوئے چند لمحے رک کر کچھ سوچا تھا اپنے چہرے پر شگفتہ مسکراہٹ سجانے کی کوشش کی تھی۔ اندر داخل ہوئے تو نازنین کو باتھ روم کے دروازے سے باہر آتے دیکھا۔ ایک نرس اس کو سہارا دیے ہوئے تھی۔

اس کے سر پر دوپٹہ سا رکھا تھا جیسا اماں جی کی ہدایت پر ہی ڈالا گیا تھا۔ خوب کس کر چوٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرے پر کمزوری میں وہ بہت ہی زرد محسوس ہو رہی تھی۔

کان، ناک، گردن ہر طرح کی جیولری سے آزاد تھے۔ حتیٰ کہ کلائیاں تک سونی پڑی تھیں۔ اس کے باوجود اس کا حسن اسی طرح دو آتشہ تھا جس طرح کبھی بنی سجی حالت میں ہوتا تھا۔

وہ تیمور کو دیکھ کر بڑے پھیکے انداز میں مسکرائی۔

"السلام علیکم۔" تیمور نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ تم تو بڑے لبرل اور ماڈرن ہو۔ کیا بھتیجی کی پیدائش سے خوشی نہیں ہوئی۔ ایک اور بھتیجا چاہیے تھا؟"

وہ نقاہت بھری آواز میں بولتے ہوئے بیڈ پر ٹک گئی۔

"ایسا نہیں ہے۔ سنا تھا کہ آپ کی طبیعت خاصی ناساز ہے۔ سنبھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔" انہوں نے جلدی سے سنبھل کر جواب دیا۔

"چلو خیر ۔۔۔ تم تو چچا ہو کر بھی آ گئے۔ باپ کو تو ابھی تک ہوش نہیں۔" وہ دکھ چھپاتے ہوئے مسکرائی۔

"کیسی باتیں سوچنے لگی ہیں بھابی۔ ابیر جیسی بھی ہماری زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ آتے ہی ہوں گے بھائی۔ آپ اتنی جلدی دل برا نہیں کرتے۔"

"اچھا جانے دو نہیں مجھے۔ کیا تمہیں پتا نہیں ان کا موڈ کیسا ہو رہا تھا؟"

"یہ تو فضول باتیں ہوتی ہیں بھابی! آپ خواہ مخواہ ذہن نہ الجھائیں اب ذرا آرام کریں۔"

وہ کہتے ہوئے کاٹ کی طرف بڑھے۔

اماں جی دونوں کو ہدایات کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"کتنے معصوم ہیں میرے بچے ۔۔۔ اے میرے رب اللہ تجھے ہدایت کی روشنی دکھائے۔" ان کا دل بھر آیا۔

"اماں جی آپ بیٹھ جائیے نا۔" نازنین نے کسی دھیان سے چونک کر اس سے کہا۔

"میری بیٹی اتنا دل اچھا رکھ۔ دادی کی طرف سے تو پریشان نہ ہو۔ اس کی تو بچپن سے عادت ہے یونہی ایک دم کھنچ جاتا ہے۔ کبھی بچی جیسی ہے اپنی گود میں اس کے کام آتے ہیں۔ مگر بیٹی تو تو بہت ہی سمجھ دار ہے تو ہی سمجھنے کی کوشش کر۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر نازنین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس ہاتھ پھیرنے پر غضب ہو گیا۔

وہ اماں جی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"اماں جی! وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ ابھی بھی نہیں آئے۔ مجھے ان سے بہت ڈر لگنے لگا ہے اس لئے میں نے رات کو کمرے میں سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بستر گول ہوا تھا۔ کیل لگا ہوا بچھونا ہو گیا۔"

"اماں جی میرا قصور کیا ہے؟" وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

"میں صدقے واری جاؤں اپنی بچی کے۔ میری بچی بہت اچھی ہے۔ زندگی میں چھوٹی موٹی پریشانی تو آتی ہی رہتی ہیں۔ سب ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا تو اپنا دل سنبھال۔ دودھ پینے والی بچی گود میں آ گئی ہے۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔ تو خوش ہو گی تو بچی کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔"

وہ بہت شفقت و محبت سے اس کی پشت سہلا رہی تھیں۔

"کیسے خوش رہوں اماں جی؟" وہ بری طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بھابی! بہت غلط بات ہے۔ اتنی جلدی ہمت ہار رہی ہیں۔ یہ سب وقتی ہے۔ دیکھئے آپ کی روتی ہوئی آواز سن کر گڑیا نے بھی رونے والا منہ بنا لیا ہے۔

ہمیں پتا چلا ہے ابھی تک آپ لوگوں نے اس کا نام ہی نہیں رکھا

واٹس اے پرابلم ۔۔۔ اماں جی ہم آپ کی اجازت سے گڑیا کا نام رکھ رہے ہیں جو ہمیں بے حد پسند ہے۔ روشانے۔ روشانے یار علی خان۔ ہے نا بڑا بارعب سا نام؟"

"بڑا خوبصورت نام دیا ہے چچا نے۔ سب سے اچھا تھا۔ کیوں بیٹی؟ مجھے تو بہت اچھا لگا۔" اماں جی نے خوش ہو کر نازنین کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

"ایسے تو وہ گھبراتے ہیں جو اکیلے ہوتے ہیں۔ حویلی میں جتنے ہیں۔ سب تیرے اپنے ہیں۔ تیری خوشی کی خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔"

وقتی تسلی خواہ کچھ ہوں ۔۔۔ اماں جی کا معاملہ ان کے اپنے دل کی گواہی کے ساتھ ساتھ تھا۔ نازنین کا رونا ان کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ گزرے دنوں میں کیا ہوا کیا نہ۔ اس وقت ان کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔

"تو اور کیا ۔۔۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں جی اب تک آپ کی پریشانی دور کر دیں۔ حویلی کے ایک ایک فرد پر حق بہت

جرم ہے۔ کیا سمجھی ہیں آپ اور ہم آپ کی خوشی آپ کے سکھ چھیننے کی کوشش کرے۔ اس کا گوشت ہم چیل کوؤں کو ڈالیں گے۔

اب اگر آپ یہ کہیں گی تو بہت غلط بات ہو گی۔ اس کا مطلب ہو گا آپ یہاں خود کو پرایا سمجھتی ہیں۔ دیکھئے ہم کرایں سے یار اور بھائی کو واپس آمد کرکے آپ کے حضور پیش کریں گے۔ معافی مانگیں گے وہ آپ سے۔ آپ تو اس سال سنت کریے تھوڑی سختی دکھائیے گا تا کہ آئندہ اس قسم کی زیادتی کرنے سے پہلے وہ سو بار سوچ لیں۔ ٹھیک ہے؟"

وہ نازنین کے قریب آ کر بہت اپنائیت و خلوص سے کہہ رہے تھے۔

"مگر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" اس کی الجھن بدستور تھی۔

"آپ اس بات کو اہمیت مت دیں۔ ہم آپ سے کہہ رہے ہیں ناں۔ ان شاء اللہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

"اماں جی کا دل بہت کمزور ہے۔ بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ ان کی خاطر خود کو سنبھال لیجئے۔"

نازنین دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اماں جی سے آ لگی۔

"اچھا بیٹا۔ آپ کا کھانا پرہیزی تو نہیں بن رہا؟ تا کہ ہم ماما سے کوئی اچھی سی ڈش بنوا کر بھجوا دیں۔"

"اتنا۔ کیا زچہ کو سری پائے کھلاؤ گے ابھی اس کو کچھ نہیں کھانا بس۔ ہلکی پھلکی طاقت کی چیزیں۔"

"میں نے اپنے ہاتھوں سے گوند بنایا ہے۔ دیکھنا کیا گھوڑوں کی سی طاقت آ جاتی۔"

اماں جی نے تیمور کو بڑی تفصیل سے بتایا۔

"گوند ہم بھی کھا سکتے ہیں؟" تیمور نے برجستہ کہا۔

"پہلے ۔۔۔۔ اس طرح کے کام تو کرو۔" اماں جی نے مسکرا کر بچی کے پھیلے ہوئے کپڑے بیگ میں رکھے۔ نازنین پشت پھیر کر مسکرانے لگی۔

تیمور علی خان کھسیا کر سر کھجانے لگے۔

نازنین بہت بھلی تھی۔ حویلی میں عید کا سماں تھا۔ خیرات کا کھانا باہر پک رہا تھا۔ اور اندر کچن میں گھر والوں کیلئے دعوت کا اہتمام تھا۔

نازنین پر پچھلی کی دلہن کا گمان ہو رہا تھا۔ روشنا نے کاٹ میں اور جو اس کی گود میں تھا وہ ماں کے چمکیلے بھڑکیلے کپڑوں سے بہت پریشان تھا۔ زیورات کھینچ کھینچ کر اتارنے کی ضد کر رہا تھا۔ ویسے تو وہ خود بھی تھی مگر اماں جی کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

تزئین اور روشن آرا بھی آئی ہوئی تھیں۔ ابھی انہیں یار علی خان کی غیر موجودگی کی حقیقی وجہ معلوم نہیں تھی۔ ادھر ادھر جانا حویلی کے معمولات کا حصہ تھا۔ بعض اوقات تو حویلی کے سب ہی مرد کہیں نہ کہیں گئے ہوتے تھے۔ بڑے ابا کراچی کے کسی کام سے، بصیر علی خان کسی دوسرے شہر بابا صاحب لاہور یا پشاور، خیر آباد وغیرہ۔ یار علی خان اپنے کام سے۔ تیمور علی

خان لندن اور جو دوسرے ساتھ رہتے تھے عالم ہے کے بھولی وغیرہ وہ اپنے کام سے۔ ایسے دنوں میں حویلی میں بڑی خاموشی اور فرصت ہو جایا کرتی تھی۔

"ہائے بھابی ۔۔۔ آج تو بس غضب ہو رہا ہے سب پر۔ ایک دو بار حویلی میں آپ کی جگہ ہوتی ہیں تو سب کی ان کی کتنی خواتین کو اس کام میں ہی چکی ہوتی۔"

تزئین نے روشن کو اپنی گود میں لے کر چٹ چٹ پیار کرنے لگی ہوئے۔

"تیمور بھی نہیں ہیں۔ بڑی بے رونقی ہے۔ بھائی کہاں ہیں؟" وہ نازنین سے پوچھنے لگی تھی۔

"بہت پہلے ابا جی نہیں کھیلے ہوئے انہیں پشاور لے گئے ہوں گے" نازنین نے سر دبا کر کہا۔

"کچھ بھی ہو ۔۔۔ ابھی ہو سکتا ہے حساب ہی کرتے ہوں گے جب حساب کرتے ہوئے پوچھا کریں۔"

تزئین نے اماں جی کی ... تعجب چھپا کر مسکرا کر کہا۔

اسی دم اماں جی نے کمرے میں آکر اطلاع دی کہ تیمور علی خان آگئے ہیں۔ نازنین نے چونک کر ان کے چہرے کی ایک ایک لکیر میں کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔ اماں جی ایسی کھلی کتاب جیسی عورت کچھ چھپانے میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

نازنین نے اپنے اندر کوئی گہری کاٹ محسوس کی۔

"ابھی ہم ذکر کر رہے تھے۔ بھائی تو ابا جی کیلئے گئی کرنیں تھیں۔ کیا کر رہے ہیں تیمور؟ ہم سے ملنے بھی نہیں آئے۔"

تزئین نے روشن کو اماں نازنین کی گود میں ڈالا اور چیٹے اترتے ہوئے ... کے انداز میں گویا ہوئی۔

"تم ابھی یہیں بیٹھو۔ بھائی تھکا ہوا آیا ہے بچی۔ نہا دھو لے پھر مل لینا۔"

اماں جی کی آواز کی لرزش صرف نازنین محسوس کر سکی تھی۔

اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کئے تھے۔

"چائے بھجواؤں تم دونوں کیلئے۔"

اماں جی کے قدم جو من من بھر کے ہو رہے تھے چلتے چلتے ایک دم رک گئے۔

"بھجوا دیجئے اماں جی ۔۔۔ ملک روشن آرا وغیرہ کو بھی بھیج دیجئے۔ بھائی بھائی کیلئے بہت اداس ہیں۔ ذرا ان کا دل بہلے گا۔"

تزئین نے شرارت سے کہا۔

"بھیجتی ہوں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

اماں جی میں اتنی ڈھیر ساری ہمت جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ بہت مضبوط محسوس ہونے لگی تھیں۔

اماں جی باری باری کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ وہ بہت ضدی ہو رہا تھا۔ بمشکل قابو میں آ رہا تھا۔

"سطر کی طبیعت زیادہ خراب ہے اماں جی؟" تزئین اماں جی کے دوپٹے میں ... اٹکی ہوئی تھی۔

اماں جی نے دور صوفے پر بیٹھے ہوئے تیمور علی خان کی سمت دیکھا جو ٹیلی فون ڈائل کر رہے تھے۔

"ہوں"۔ انہوں نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

"کیا ہو گیا؟" تزئین نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ایسے ہی بخار وغیرہ ہے"۔ وہ جھوٹ بولتے ہوئے بہت الجھن محسوس کر رہی تھیں۔

"بہت ہی غم لگا لیا ہے اس نے اپنی جان' سنبھال نہیں پا رہی"۔ تزئین نے دکھ سے کہا۔

اماں جی خاموش رہیں۔

"یاور بھائی کب تک آ جائیں گے؟ اگر قیصر آ گئے تو ان سے تو ملاقات نہ ہو سکے گی"۔

اماں جی کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"لے بیٹا! تھوڑا سا اور کھا لے۔ شاباش"۔ اماں جی نے توجہ ادھر ادھر کی۔

"اماں جی! بھابی کچھ گم صم سی لگی ہیں اس مرتبہ۔ کیا بچی کی پیدائش پر خوش نہیں ہیں؟"۔

"نہیں۔ تمہارا وہم ہے۔ کمزوری ہے' نڈھال ہے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائے گی"۔ اماں جی نے نوالہ بنا کر ہاری کے منہ میں دیا۔

"آپ کہتی ہیں تو مانے لیتی ہوں۔ مگر مجھے تو کچھ اور محسوس ہو رہا ہے۔ روشن آپا بھی کہہ رہی تھیں"۔ تزئین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

اسی دم ماما ہال میں داخل ہوئی۔

"بی بی جان! آپ کو بڑی بیگم اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں"۔

"اچھا...... چلو...... آ رہی ہوں"۔ وہ دوپٹا چارپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی...... شیروانی صاحب۔ جی تیمور علی خان بات کر رہا ہوں۔ بتایا تھا آپ کے پی اے نے؟"

"جی جی...... ہوں"۔

"پرسوں...... کچھ بتایا نہیں کہ پھر کہاں چلے گئے؟ ہوں۔ ٹھیک۔

اب کب آنے کا امکان ہے؟ کچھ اندازہ تو ہو گا؟

"جی۔ جی۔ ٹھیک ہے۔ تھینکس۔ او کے"۔

تیمور نے ریسیور بے دلی سے کریڈل پر ڈال دیا۔ اماں جی تو کان کھڑے کیے بڑی توجہ سے سن رہی تھیں۔

"پرسوں کہاں آیا تھا؟" وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھیں۔

"نوشہرہ چھاؤنی"۔ انہوں نے نہایت اختصار سے جواب دیا۔

"اب کہاں ہے؟" اماں جی تو اس احساس کے تحت کہ یاور علی خان کو کہیں تو دیکھا گیا ہے۔ ہاتھ ملا بیٹھیں۔

"پتہ چل جائے تو مسئلہ کیا ہے؟" وہ تھکے تھکے انداز میں گویا ہوئے۔

"اماں جی"۔

"اماں صدقے جائے کیا بات ہے بیٹے؟" وہ تڑپ کر بولیں۔

"اماں جی۔ بھائی اتنا قابلِ اعتبار اور ایک بہت اچھی لڑکی اس قدر حقیر؟

وہ ہم سے کچھ کہتے تو...... شوٹ کر دیتے ہیں۔ مگر اب جو کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ کیا کیا عذاب پیچھے لگے

ہیں اس کا اندازہ نہیں ہے آپ کو؟"

ان کے انداز میں بلا کی شکستگی تھی۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔ زہرہ بانو سب کے سامنے ایسی بول گئی۔ یہ بڑی بات ہے۔ اس کی جھجک کسی بھی طرح" وہ رک

گئیں۔

"بیٹے ایسا تو نہیں کہ صدمے سے زہرہ بانو کے دماغ میں فرق آ گیا ہو اور اسے خود بھی نہ پتا ہو کہ وہ کیا کر رہی

ہے"۔ ایک دم ان کے دماغ میں نیا خیال آیا۔

"دیکھا نہیں علی کی موت والے دن بھی اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ کیسے کیسے الٹے سیدھے کام کر رہی تھیں"۔ وہ دھیرے

گویا ہوئیں۔

تیمور علی خان نے تھکی ہوئی نگاہ ماں پر دوڑائی۔

"بہت سیدھی ہیں اماں جی آپ...... ہم سب آپ کا کیا کریں"۔ وہ قدرے خفگی سے گویا ہوئے۔

"اگر ہمیں بھائی کا خیال نہ ہوتا اس کا واقعہ اس تو آج بحال کر دیں۔ مگر ہم نہیں چاہتے کہ بھائی کے کان میں اس قسم کی

کوئی بات بھی پہنچے"۔ اماں جی نے بیٹے کی شکل دیکھی۔

بھاوج کی نیک فطرت کا اندازہ لگانے والا آج وہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟

"تم مجھے زہرہ بانو کے کمرے کی چابی دو۔ میں اس سے پوچھوں تو کہ اس نے اس طرح کی بات کس دشمن کی شہ پر منہ

سے نکالی"۔

"بیکار ہے اماں جی...... ہم خود نمٹ لیں گے۔ بس ذرا یاور بھائی ہاتھ لگ جائیں۔ ان کے بغیر دراصل کچھ بھی نہیں

ہو گا۔ ان کا یہاں موجود ہونا بہت ضروری ہے"۔ وہ بہت الجھے ہوئے تھے۔

عشا کا وقت ہو چکا تھا۔ اماں جی نماز کیلئے اٹھنے والی تھیں۔ انہوں نے رومال سے ہاری کا منہ صاف کیا۔

"جاؤ بیٹے! آکا جان سے باتیں کرو۔ اماں جی اتنے میں نماز پڑھ لیں۔ میرا اچھا سا بچہ چند دنوں میں کیسا سمجھ دار ہو گیا

ہے"۔

انہوں نے ہاری کی پیشانی سے بال سمیٹتے ہوئے نہایت دکھ سے کہا۔

"ادھر آؤ پارٹنر"۔ تیمور علی خان نے ہاری کو بلایا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔

اماں جی نے دور صوفے پر بیٹھے ہوئے تیمور علی خان کی سمت دیکھا جو ٹیلی فون ڈائل کر رہے تھے۔

"ہوں"۔ انہوں نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

"کیا ہو گیا؟" ترئین نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ایسے ہی بخار وغیرہ ہے"۔ وہ جھوٹ بولتے ہوئے بہت الجھن محسوس کر رہی تھیں۔

"بہت ہی غم لگا لیا ہے اس نے اپنی جان سنبھال نہیں پا رہی"۔ ترئین نے دکھ سے کہا۔

اماں جی خاموش رہیں۔

"یاور بھائی کب تک آ جائیں گے؟ اگر میں آ گئی تو ان سے تو ملاقات نہ ہو سکے گی"۔

اماں جی کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"لے بیٹا! تھوڑا سا اور کھا لے۔ شاباش"۔ اماں جی نے توجہ ادھر ادھر کی۔

"اماں جی! بھابی کچھ گم صم سی لگی ہیں اس مرتبہ۔ کیا بچی کی پیدائش پر خوش نہیں ہیں؟"۔

"نہیں۔ تمہارا وہم ہے۔ کمزوری ہے نڈھال ہے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائے گی"۔ اماں جی نے نوالہ بنا کر ہاری کے منہ میں دیا۔

"آپ کہتی ہیں تو مان لیتی ہوں۔ مگر مجھے تو کچھ اور محسوس ہو رہا ہے۔ روشن آپا بھی کہہ رہی تھیں"۔ ترئین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

اسی دم ماما ہال میں داخل ہوئی۔

"بی بی جان! آپ کو بڑی بیگم اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں"۔

"اچھا...... چلو...... آ رہی ہوں"۔ وہ دوپٹا تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی...... شیروانی صاحب۔ جی تیمور علی خان بات کر رہا ہوں۔ بتایا تھا آپ کے پی اے نے؟"

"جی جی...... ہوں"۔

"پرسوں...... کچھ بتایا نہیں کہ پھر کہاں چلے گئے؟ ہوں۔ ٹھیک۔

اب کب آنے کا امکان ہے؟ کچھ اندازہ تو ہو گا؟

"جی۔ جی۔ ٹھیک ہے۔ تھینکس۔ او کے"۔

تیمور نے ریسیور بے دلی سے کریڈل پر ڈال دیا۔ اماں جی تو کان کھڑے کیے بڑی توجہ سے سن رہی تھیں۔

"پرسوں کہاں آیا تھا؟" وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھیں۔

"نوشہرہ چھاؤنی"۔ انہوں نے نہایت اختصار سے جواب دیا۔

"اب کہاں ہے؟" اماں جی تو اس احساس کے تحت کہ یاور علی خان کو کہیں تو دیکھا گیا ہے۔ ہاتھ ہی چھوڑ بیٹھیں۔

"یہ پتہ چل جائے تو مسئلہ کیا ہے؟" وہ کچھ کھچے کھچے انداز میں گویا ہوئے۔

"اماں جی"۔

"اماں جی صدقے جائے کیا بات ہے بیٹے؟" وہ تڑپ کر بولیں۔

"اماں جی۔ بھائی اتنا قابل اعتبار اور ایک بہت اچھی لڑکی اس قدر مجبور؟

وہ ہم سے کچھ کہتے تو...... شوٹ کر دیتے ہمیں۔ مگر اب جو کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ کیا کیا عذاب جھیل رہے ہیں اس کا اندازہ نہیں ہے انہیں؟"

ان کے انداز میں بلا کی شکستگی تھی۔

"وہ ایسا نہیں ہے زیتون بانو سب کے سامنے اول فول بولی۔ بڑی بات ہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتی"۔ وہ رک گئیں۔

"بیٹے ایسا تو نہیں کہ صدمے سے زیتون بانو کے دماغ میں فرق آ گیا ہو اور اسے خود بھی نہ پتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے"۔ ایک دم ان کے دماغ میں نیا خیال آیا۔

"دیکھا نہیں علی کی موت والے دن بھی اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ کیسے چیخے جا رہے تھے ہکلا کر"۔ وہ دھیرے سے گویا ہوئیں۔

تیمور علی خان نے تھکی ہوئی نگاہ ماں پر دوڑائی۔

"بہت سیدھی ہیں اماں جی آپ...... ہم سب آپ کا کیا کریں"۔ وہ دقت سے گویا ہوئے۔

"اگر ہمیں بھائی کا خیال نہ ہوتا اس کا وقار اور عزت عزیز نہ ہوتی تو آج بحال کر دیں۔ مگر ہم نہیں چاہتے کہ بھائی کے کان میں اس قسم کی کوئی بات بھی پہنچے"۔ اماں جی نے بغور بیٹے کی شکل دیکھی۔

بھاوج کی نیک فطرت کا اندازہ لگانے والا آج وہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟

"تم مجھے زیتون بانو کے کمرے کی چابی دو۔ میں اس سے پوچھوں تو کہ اس نے اس طرح کی بات کس شہ پر منہ سے نکالی"۔

"بیکار ہے اماں جی...... ہم خود نمٹ لیں گے۔ بس ذرا یاور بھائی ہاتھ لگ جائیں۔ ان کے بغیر دراصل کچھ بھی نہیں ہو گا۔ ان کا یہاں موجود ہونا بہت ضروری ہے"۔ وہ بہت الجھے ہوئے تھے۔

عشا کا وقت ہو چکا تھا۔ اماں جی نماز کیلئے اٹھنے والی تھیں۔ انہوں نے رومال سے ہاری کا منہ صاف کیا۔

"جاؤ بیٹے! آغا جان سے باتیں کرو۔ اماں جی اتنے میں نماز پڑھ لیں۔ میرا اچھا سا بچہ چند دنوں میں کیسا سمجھدار ہو گیا ہے"۔

انہوں نے ہاری کی پیشانی سے بال سمیٹتے ہوئے نہایت دکھ سے کہا۔

"ادھر آؤ پارٹنر"۔ تیمور علی خان نے ہاری کو بلایا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔

"کیسی قلعہ بندی ہے پڑھائی لکھائی ہو بس پڑھ جاتی ہیں۔ سر پڑھ جاتے ہیں؟"

"کاکا جان انشاءاللہ بس چند روز ہے۔ وہ تو لیا (بڑھیا) ہے۔ انھیں میڈم کہتے ہیں"۔ وہ سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

ایسے اعصاب شکن ماحول میں مسکراہٹ کا تصور بھی محال تھا۔ مگر وہ اپنے ہونٹوں پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ روک نہیں سکے۔

"دیکھا ـــ ماشاءاللہ کیسی پیاری باتیں کرتا ہے"۔ اماں جی بھی مسکرا دیں۔

"کاکا جان"۔

"میری جان؟"

"امی! ڈاکٹر کے پاس سے کب آ جائیں گی؟" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"آ جائیں گی ـــ پارٹنر ـــ یہ اتنے سارے لوگ آپ کے پاس ہیں۔ آپ اکیلے تو نہیں ہیں"۔ انھوں نے اس کو پچکار کر کہا۔

"ہم آپ کو گھوڑے کی سیر کرا دیں گے۔ آپ کو شیر دکھانے لے جائیں گے"۔

"کتنے؟ بہت سارے شیر؟" ہادی کے اندر ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔

"بہت سارے تو نہیں۔ ایک شیر۔ ایک شیرنی اور ان کے دو بچے"۔

"شیرنی بچوں کی امی ہوتی ہے؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"کر لو اور دو چار روز امی امی پارٹنر۔ اس کے بعد تو تمہیں ایسا بنا دیں گے کہ آگے چل کر تم دوسروں کا سہارا بنو اور خود کسی سہارے کی آس رکھو اور نہ جستجو"۔ وہ پھر کسی خیال میں ڈوب گئے۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو تیمور؟ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

اماں جی جاتے جاتے پلٹیں اور بہت فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

تیمور علی خان بڑی تلخی سے مسکرائے تھے۔ عین اسی لمحے نازنین نے اندر قدم رکھے تھے۔

وہ بالکل سادہ سوتی لباس میں تھی۔ اس کے بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ دیر قبل غسل ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ سوائے ناک میں چمکتی ہیرے کی لونگ کے کسی قسم کے زیور کا بوجھ نہیں تھا۔

پاؤں میں ربڑ کی وہ چپل تھی جو باتھ روم کے استعمال کیلئے مخصوص تھی۔

"اماں جی! کہاں ہے وہ منحوس؟" اس کے انداز میں ایک دیوانگی سی تھی۔

"کون بیٹی؟ بری بات۔ کسی کو منحوس نہیں کہتے"۔ اماں جی نے گھبرا کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

"کہاں چھپا دیا ہے آپ لوگوں نے اسے۔ اگر نہیں تو پھر جان لیجئے کہ وہ یاور کے ساتھ چلی گئی ہے"۔ وہ بپھری ہوئی تھی۔

"نہ اس کا چاچا ہے نہ یاور کا۔ اماں جی دیکھیے گا۔ میں اس ناگن کا پھن کیسے کچلوں گی؟ آئے تو سہی میرے سامنے"۔

"آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں۔ پوچھ لیجئے ان سے۔ ان سے پوچھئے۔ ہادی نے میرے سامنے ان کے سامنے منہ کھولا تھا۔ کیسے چھوڑ دیا تھا اور ان کی شہ پر اس نے مجھ سے اور تیمور سے کتنی بدتمیزی کی تھی۔ پوچھئے ان سے کیا ہوا ہے۔ بیچارے ہیں ان سے حقیقت۔ اماں جی۔ مجھے وہ ناگن چاہیے۔ وہ رنج ہونے سے پہلے میرے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ وہ جا چکی"۔

نازنین پر پاگل پن کی وحشت سوار تھی۔

"اماں جی! وہ صرف خوبصورت ہی نہیں ہے۔ اور وہ کسی چیز میں وہ میرے برابر نہیں ہے"۔

نازنین اماں جی کے شانے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"پاگل نہیں تو۔ یہ کیسے ہم سنانے لگے بیٹی الٹی سیدھی تو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تو کیوں قسم کھاؤں گی تیری تسلی کو"۔

اماں جی نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تیمور! آپ کیوں چپ ہیں۔ بتا کیوں نہیں دیتے اماں جی کو کہ اصل بات کیا ہے؟ آپ کی بڑی پراسرار خاموشی ہے اس وقت آپ کی۔ مجھے اس وقت آپ کی مورل سپورٹ کی سخت ضرورت ہے اور آپ ہیں کہ چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ بتا کیوں نہیں دیتے اماں جی کو کہ کیا ہوا تھا"۔

"آپ ہم میں سے کسی سے بھی بدگمان نہ ہوں۔ یہاں موجود ہر شخص دل و جان سے آپ کا مخلص ہے۔ پھر آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں"۔

تیمور علی خان نے بہت ملائمت سے صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں۔ آپ میرے سامنے بتائیں اماں جی کو"۔ وہ جیسے کچھ سننے کو تیار تھی۔

"بیٹی! مجھے سب پتا ہے۔ یقین کرو بات وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو"۔

"تو پھر بات کیا ہے؟" اس نے تیزی سے اماں جی کی بات کاٹ دی۔

اماں جی تیمور کی سمت ایک نگاہ ڈال کر خاموش ہو گئیں۔

"نہیں بات یہی ہے۔ پھر وہ کہاں ہے۔ یہ ہادی اکیلا کیوں ہے۔ آپ کے پاس کیوں ہے۔ آپ نے کیسے اسے کھانا بھی آپ نے کھلایا ہے"۔ اس نے لڑکے کی سمت اشارہ کر کے کہا۔

"آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ اس کے خون کا تقاضا ہے۔ کچھ انہونی نہیں ہوئی۔ مگر اپنا ہر اس کی فطرت کا تقاضا ہے"۔

"بری بات بیٹی! ایوں کسی کے نسب کو گالی نہیں دیتے"۔

اماں جی نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"تیمور علی خان حیران پریشان ہاری کو صوفے پر لٹا کر ان دونوں کی سمت بڑھے۔

"ہاں کاکا بھائی اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم آپ کو اس سے ملوا دیں گے۔ وہ سکتی ہے ہمارے پاس۔"

نازنین نے بے یقینی کے انداز میں ان کی سمت دیکھا۔

"کہاں ہے؟" اس کی بے چینی قابل دید تھی۔

"بابا صاحب نے اسے حویلی سے بے دخل کر دیا ہے۔ اب یہاں چلتی پھرتی وہ نظر نہیں آتی۔ البتہ ہم آپ کو اس سے ملوا دیں گے۔"

مگر بابا صاحب نے اسے بے دخل کس وجہ سے کیا ہے؟ اسی وجہ سے نا جو میں کہہ رہی ہیں؟"

"نہیں ——— بات بگھار ہے ——— ہاں کاکا ——— پلیز آپ میری زبان کا اعتبار کریں۔"

"پلیز تیمور ——— آپ مجھے بتائیں کہ کیا بات ہے آغا کاکا ایک پلیز۔"

اماں جی بلا ارادہ تیمور کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مگر تیمور کو ان کا دیکھنا بہت محسوس ہو رہا تھا۔

وہ نگاہ چرا کر ایک طرف ہو گئے۔ دکھ سے اماں جی کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ یہ کیسا وقت ہے۔ کیسی بات ہے جو ان سے اوجھل ہے اور وہ بد نصیب کتنے آرام سے کہہ گئی۔

"آپ مجھے ابھی اسی وقت اس سے ملوائیں۔" نازنین بچوں کی طرح مچل گئی۔

"ایزی ——— بھائی۔ ایزی پلیز۔ ہم کہہ رہے ہیں نا کہ ضرور ملوائیں گے۔ آپ کو ہماری زبان پر اعتبار کرنا چاہیے۔ بابا صاحب نے اس سے ملنے پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ وہ اس سے کچھ اگلوانا چاہتے ہیں۔"

"دیکھیے یہ ہاری بھی ہمارے پاس ہے۔ پلیز آپ آرام کریں۔" وہ اسے پرسکون کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کیا اگلوانا چاہ رہے ہیں بابا صاحب؟ وہی نا جو ہم سوچ رہے ہیں۔" نازنین نے تڑپ کر ان کی طرف قدم بڑھائے۔

"ہرگز نہیں۔ جو آپ سوچ رہی ہیں وہ تو ہرگز بھی نہیں ہے۔ اماں جی آپ بھابی کو لے کر ان کے کمرے میں جائیں۔ آؤ ہاری۔ باہر چلتے ہیں۔"

انہوں نے بیٹھے ہوئے ہاری کی سمت ہاتھ بڑھایا تو وہ جلدی سے صوفے سے اتر آیا۔

تیمور علی خان اسے لے کر باہر نکل گئے۔ اور ان کے پیچھے اماں جی نازنین کو شانوں سے تھام کر چل پڑیں۔

"ماما مطہرہ کے کمرے کی چابی آپ کے پاس ہے کیا؟ تو آپ ہی لے کر جاتی ہیں۔"

تیمور علی خان کچن کے دروازے میں کھڑے ماما سے مخاطب تھے۔

"جی خان ——— آپ ٹھہریں میں اپنے کمرے سے لے کر آتی ہوں۔" ماما دوپٹہ درست کرتی باہر نکل گئی۔

تیمور علی خان راہداری میں پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ماما واپس آ گئی۔ اور چابی انہیں تھما دی۔

تیمور علی خان ایک لفظ کہے بغیر مطہرہ کے کمرے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ جو راہداری کے اختتام میں واقع تھا۔ جہاں حویلی کا اندرونی حصہ ختم ہو جاتا تھا اور ایک دروازہ اس کے بعد ایک دستی احاطے میں کھلتا تھا جسے کراس کرنے کے بعد حویلی کا دوسرا حصہ شروع ہو جاتا تھا۔ جو حویلی کے ملازمین کے تصرف میں زیادہ رہتا تھا۔ اس طرف زیادہ تر ملازمین اور ان کے بال بچے رہتے تھے۔ کم کام ہی ہوتے تھے۔ فصلوں کی کٹائی کے زمانے میں اس طرف زیادہ چہل پہل ہو جاتی تھی۔

تیمور علی خان نے تالا کھول کر بہت آہستگی سے دروازہ دھکیلا۔ مطہرہ بیڈ کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک کر پلٹی تھی۔

سامنے تیمور علی خان کو دیکھ کر کپکپاہٹ دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں کی سمت دیکھا تھا۔ کوئی خنجر کوئی پستول نظر نہ آیا۔ اس نے قدرے حیرانی سے ان کی سمت دیکھا تھا۔

"دیکھو لڑکی ——— وہ کیا نام ہے تمہارا۔ ہم تمہارے پاس آخری بار آئے ہیں۔ خود پر رحم کرنے کا یہ آخری موقع دے رہے ہیں۔"

"نہیں کر سکتی مجھے خود پر رحم اور کسی سے کوئی بات بھی نہیں کرنی۔ آپ کے پاس دولت اور خاندان کی طاقت ہے۔ آپ اسی سے کام لیں۔" وہ بھڑک کر بولی تھی۔ ان کا خیال غلط نکلا۔ اس کا دماغ درست ہونے کے بجائے اور زیادہ خراب ہو چکا تھا۔

"کیا چاہتی ہو تم۔" وہ بہت ضبط سے کام لے رہے تھے۔

"اب کچھ نہیں چاہتی۔" وہ سفاک لہجے میں پھنکاری۔

"دیکھو نازو بھابی کی حالت بہت خراب ہے۔ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ انہیں کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ ہم نے تمہاری شادی ایک بہترین انسان سے۔"

"بس بھی کریں خان وہ آدمی بہترین تھا مان لیا۔ شیخ رفیع کی لڑکی بھی تو بہترین ہے۔ کیوں قبول نہیں ہے وہ آپ کو۔ اگر ہاری سے نکاح کرتے ہوئے آپ نے سوچا تھا کہ اماں جی کو اس پر کتنا اعتراض ہو گا۔ مگر آپ تو دل سے ہار گئے تھے۔ ماں ہار گئی دل جیت گیا۔ کیا دل صرف آپ ہی کے پاس ہے؟"

"مگر وہ اگر ہماری بیوی ہے تو صرف ہماری وجہ سے نہیں بلکہ خود بھی ہمارے لیے اتنی ہی بے ... ہے جتنے ہم اس کے ساتھ ہیں۔ یہ دونوں طرف کی بات ہے۔"

"تمہیں اپنے حسن پر غیر ضروری اعتماد یا غرور تھا۔ اسی وجہ سے تمہارا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے کیونکہ غرور بھی پاگل پن کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ صرف حسن سے بات نہیں بنتی مطہرہ بیگم۔"

تیمور علی خان کے انداز میں واضح سفاکی جھلک رہی تھی۔

"ہم تم پر ہرگز بھی ظاہر نہ کرتے کہ ہم تمہارے دل کی بات شروع سے ہی سمجھتے ہیں۔ مگر نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ تم نے اپنی خود غرضی کی آگ میں ہمارے بھائی کا گھر بھی جلانے کی کوشش کر ڈالی ہے۔"

"مطہرہ بیگم ایسے نہیں ہوتا جیسے تم سوچ رہی تھیں۔ جی تو چاہتا ہے تمہیں ہمیشہ کیلئے یہاں سے دور کر دیں اور اخبار میں

اشتہار دیں تمہاری تصویر کے ساتھ کہ یہ جہاں نظر آئے اسے ہمارے حوالے کیا جائے کہ تم نے ہمیں بہت پریشان کیے رکھا۔
سنگین جرم کیا ہے اس پر جو سزا ہو کم ہے۔

"ہم اس وقت صرف تمہارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ تمہیں بابا اور بھائی کے سامنے اعتراف جرم کرنا ہوگا۔ عدالت ہوگا کہ تم نے محض اپنی تسکین کیلئے یہ قدم اٹھایا۔ صرف ہم سے انتقام لینے کی نیت سے۔

...اور انتقام بھی اس بات کا کہ تمہارے حسن کو خراج ہم نے خود کیوں نہیں دیا۔ کیوں ایسے سادہ سے شخص سے تمہارا رشتہ کیوں جوڑا۔ یہی بات ہے ناں؟

"اگر تم ایسا کرو تو ہم تمہیں ضمانت دیتے ہیں کہ ہم تمہیں معاف کر دیں گے کوئی بھی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

"زرمینہ تو اب بھی مجھے اپنی نظروں میں کے ساتھ ہے۔ جب میں دکھ اٹھا سکتی ہوں تو دوسرے کیوں نہیں اٹھا سکتے۔"

"میرے نقصان پورے نہیں ہو سکتے خان۔ بلکہ آپ کو دیکھتے ہی ایک ایک زخم نے ہرا ہونا شروع کر دیا ہے آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھئے تو میرے دل پر زور کیوں چلایا۔ اگر یہ اتنا آسان کام ہوتا تو آپ نہ کر لیتے؟ یہ تو اتنا مشکل کام ہے کہ انسان اپنی پرواہ بھی نہیں کرتا"۔

وہ زور سے رونے لگی۔

"مطربہ! تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ ہم اپنے بھائی کا گھر بچانے کیلئے یہاں تک کرنے کو تیار ہیں کہ اپنی بہن کو چھوڑ دیں۔ اماں جی کی پسند سے شادی کر لیں۔ مگر تمہیں بابا اور بھائی کے سامنے قسم کھانا ہوگی کہ تم نے ان کے اور بھائی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ یہ حلف اٹھانا ہوگا بلکہ پس پردہ جو کچھ ہے وہ بھی تفصیل سے بتانا ہوگا۔ سن رہی ہو ہماری بات؟"

وہ بھی سے پوچھ رہے تھے۔

"یہ تو صرف آپ کے نقصان پورے ہو رہے ہیں" وہ سنگدلی سے بولی۔ تیمور علی خان کا جی چاہا اس کا گلا دبا دیں۔

"ہم اپنا گھر برباد کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں صرف اپنی بے گناہ بھابی کی خاطر" ساتھ ہے یا اس لڑکی نے انہیں کس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆

وہ بظاہر سرسری مگر باطن بہت گہری نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ یہ چال چل رہے تھے کہ کسی طرح وہ حقیقت بیانی پر آ جائے اور یہ طوفان تھم جائے۔ بادل علی خان کے حویلی واپس آنے سے پہلے پہلے وہ صورتحال کنٹرول کرنا چاہ رہے تھے تا کہ جب وہ واپس آئیں تو حقیقت ان کے سامنے ہو اور اس بحران سے نجات حاصل ہو۔

مطربہ نے ان کی سمت ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

(مجبوری میں شادی بھی کر لیتے تو شیخ رفیع کی لڑکی کے ساتھ میں کم ذات اپنے نقصان کے ساتھ اسی جگہ ——— بلکہ شاید بادل خان اور بابا خان کی گولی کھا کر قبر کے اندھیرے گڑھے میں)

بہت بھاتا ہے ایک مجبوری ہوتی ہے۔ اب وہ کچھ میں لات چت تھی۔

محبوب سامنے کھڑا انگارے بھی چبا رہا تھا اور انگاروں پر بھی چلا رہا تھا۔ اب تو ایک سے جئیں گے۔ اس کی نس نس میں زہر بھرنے لگا۔

"آپ جائیے تیمور خان۔ اب مجھے کچھ نہیں کہنا"۔ وہ بددلی سے بستر کی جانب بڑھی۔

"نازنین بھابی بالکل بے قصور اور مظلوم ہیں اور بھائی بھی۔ ہم سے انتقام ہی لینا تھا تو کوئی اور تدبیر سوچ"۔ وہ ایک

وہ شکستہ حال نظر آئے۔

"میں کیوں کسی سے انتقام لینے لگی" وہ بدستور رندھے گلے سے گویا ہوئی۔

ایسا عظیم الشان سا جاگیردار اس کے سامنے بے بس کھڑا تھا، اندر کہیں سسکتے گھٹنوں سے پانی پڑ رہا تھا

"کیا ہمیں اپنے بھائی کا گھر بچانے کیلئے تم سے شادی کر لینا چاہیے؟" وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نظر نہ آتے تھے۔

علیزے نے چونک کر پوری قوت سے گھوم کر ان کی سمت دیکھا تھا۔

گلے میں گلابوں کے ہار ڈالے یہ حسین شہزادہ اسے محبت سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

مگر وہ جو اس کوشش کے یہ تصور تھا نہیں۔ یہ مسکراتے کیا اچھے تھے نہیں..... ایک ذرا اقبال جرم کی وجہ سے اس کے سامنے سے روح کھینچی جا رہی تھی۔ یہ جاگیردار ہیں۔ لینے والے نہیں دینا نہیں آتا۔ یہ احسان کرتے ہیں اور کرتے ہی دیتے نہیں ہیں۔ ویسا تو یہ ہے کہ جواب میں کوئی طلب نہیں ہو۔ احسانات سے بوجھل کاندھے بھی کرنی ان کی آزمائش ہیں۔ محبت بھی وحشت ہیں۔

"آخر کار انجام یہ ہے کہ عمر اس قتل کو وں کو کھلایا جائے گا۔ جب یہ طے ہے تو آپ کیوں اپنے انتقام سے پیچھے ہٹ رہے ہیں؟" وہ سرد و سپاٹ لہجے میں کہہ کر پھر پلٹ گئی۔

"یہ تو بہت 'سچ' کہی ہے" انہوں نے اپنے کھوتے ہوئے لہجے پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"ہم تمہیں آسان موت سے مرتا ہوا نہیں دیکھیں گے۔ اگر نقصان ہوئے کہ جو ابھی محض اندیشے ہیں تو اس بے گناہوں کو نقصان سے بچانے کیلئے اپنی حیثیت تک فراموش کر دی۔ مگر..... دیکھو ابھی وقت ہے" وہ مشکل راستوں سے گزر رہے تھے۔

"کیا چاہتے ہیں آپ؟" وہ ان کی طرف سے پشت کئے کھڑی تھی۔

"پتا ہے تمہیں کیا چاہتے ہیں ہم۔"

"مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ سزا سنا دیجئے۔ جو بالآخر آپ نے سنانا ہے" اس میں کسی طرح کی کوئی لچک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"از روئے حساب جو سزا تمہاری بن رہی ہے وہ تو یہ ہے کہ تمہیں اس طرح زندہ رکھا جائے کہ موت کے دروازے بھی بند کر دیئے جائیں لیکن تم اس طرح جیو کہ سوائے موت کی دعا مانگنے کے تمہیں کچھ یاد نہ رہے۔"

تیمور علی خان اب زیادہ دیر اپنی مستقل اندرونی کیفیت چھپا نہ سکے جو پہلے روز سے ان کے اعصاب پر طاری تھی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے وجود کے ایک ایک خلیے کو موت و زندگی کی کشمکش میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں لہو چھلکاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اب بھی اس سے کم نہیں ہو رہا" وہ بے خوفی سے گویا ہوئی۔

"پتا چلا تمہیں۔ حضرت تمہارا اسی وقت کرنے کو کوئی چارہ ہوتا ہے مگر بڑے بھائی کی غیر موجودگی ہمیں بے بس کئے ہوئے ہیں۔ تم پر شک کر کے ایک مدت میں اصلیت معلوم کی جا سکتی ہے کہ اس صورتحال میں ہم بڑے عرصوں کی تلاش نہیں چاہتی۔ تم تو کیا چیز ہو۔ مگر وہ ہمیں کہیں لے کر تمہیں مجبور کر کے ہم اپنی مرضی کا بیان لے سکتے ہیں۔ وہ گمان دل ہے پیچھائی کے راستوں پر چل نکلا ہے۔ اتنی آسانی سے ہماری طرف نہیں پلٹے گا۔ لہٰذا ہم یہ کرو گھوم صرف ان کی آمد تک ہی دے رہے ہیں۔ جو کاروائی کریں گے ان کے سامنے کریں گے۔ تب تک تیار رہنا۔"

وہ ایک دم تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئے۔

ان کے لہجے کی غرابت ان کے آہنی عزم کا پتہ دے رہی تھی۔

تیمور علی خان تھکے تھکے قدموں کے ساتھ گہری سوچ میں مستغرق بابا صاحب کے کمرے کی طرف آئے تھے۔

دستک بھی اس انداز میں دی تھی گویا ہاتھوں میں کوئی وزن اٹھا رکھا ہو۔

"ہوں..... کون ہے آ جاؤ" بابا صاحب کی آواز میں بھی تھکن واضح تھی۔

تیمور علی خان اندر داخل ہو گئے۔ بابا صاحب نیم دراز حالت میں تھے کتاب پر سے نگاہ ہٹا کر دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ تیمور علی خان کو دیکھ کر ایک دم چونک سے گئے۔

"آؤ..... تیمور! ہم تمہارے بارے ہی میں سوچ رہے تھے کہ جانے تم اس وقت کیا کر رہے ہو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں چابی ہے۔ کہیں سے آ رہے ہو؟" انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی شکل دیکھی۔

تیمور علی خان نے چونک کر اپنے ہاتھ کی سمت دیکھا۔

"اوہ..... یہ اسی شقی القلب اور منحوس کے کمرے کی چابی ہے۔ ہمیں دھیان ہی نہیں رہا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ آئے ہیں۔ کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔ ہم ابھی آتے ہیں" وہ پلٹنے لگے۔

"رہنے دو۔ ہم بابا کو بلاتے ہیں۔ وہ تالا لگا آئے گی۔ بے فکر رہو وہ فرار نہیں ہو گی۔ اس کے انداز فرار ہونے والوں کے سے نہیں۔ ہم نے تو تالا اس لیے ڈلوایا ہے کہ اس سے تمام مراعات واپس لے لی گئی ہیں۔ اب اس کی حیثیت وہ نہیں جو پہلے تھی۔"

"بابا صاحب! آخر آپ اس کی کھال کیوں نہیں اتار دیتے۔ ہمیں تو بس مصلحتیں روکے ہوئے ہیں۔ آپ اتنا ضبط کیسے کر رہے ہیں؟" وہ اپنے شل اعصاب کے ساتھ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔

"کیا کچھ ہمارے ساتھ ہے۔ کچھ وقت جاتا ہے۔ کریں گے اس کے ساتھ بھی حساب کتاب" وہ نرمی سے گویا ہوئے۔

"آپ کے انداز سے ظاہر ہے کہ آپ کو ہم پر کتنا اعتماد ہے۔ بڑے بھائی بھی تو ہمارے بھائی ہیں۔ آپ کو کیا پتا ہے ان کو کتنی اذیت میں ڈالے ہوئے ہے" وہ بہت شکستہ لہجے میں باپ سے مخاطب تھے۔

"حوصلہ رکھو تیمور۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بابا صاحب نے شفقت کے ساتھ بیٹے کو تسلی دی۔

"ہم نے زندگی میں کبھی گالی نہیں سنی۔ یا آج گالی۔۔۔؟" وہ روتے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

"اس لڑکی کے بارے میں سب کے اندازے غلط ہو گئے۔ ہماری سات پشتوں میں ایسا واقعہ نہیں گزرا مگر [illegible] ہم اس پر قابو پالیں گے۔" بابا صاحب نے وثوق سے کہا۔

"مگر کیسے؟ اور بھائی نے تو حد ہی کر دی ہے۔ وہ ہمارے بھائی ہیں ہم انہیں اتنا جانتے ہیں۔ اس کی توقع ہی [illegible] تک نہیں پہنچاتے۔"

"کوئی بات نہیں۔ دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو ٹھیک طرح سے پہچان لیں۔ بائبل تو ایک ہی نازل ہوئی تھی پھر اس کی کئی شکلیں کیسے ہو گئیں۔ اس کی جتنی شکلیں ہیں وہ سب حضرت عیسیٰ کے حواریوں سے ہی موسوم ہیں۔ باہر کے آدمیوں سے نہیں۔ یوحنا کی بائبل کہلاتی ہے۔ حتیٰ کی بائبل کہلاتی ہے [illegible] حواری تھے۔ وہ پیغمبر کے ساتھ تھے۔ کیا یہ بھی پیغمبر کو نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ آسمانی پیغام کی شکلوں میں کیسے تبدیلی ہو جاتی؟ بات انہونی تھی کہ بغیر باپ کے انسان کا جنم کیسے ہو گیا؟ سمجھ میں نہیں آئی تو حسب توفیق دماغ کو استعمال کر کے مسخ کر دی۔ سب کے پاس الگ الگ دماغ ہے۔ سب اپنے اپنے حساب سے سوچتے ہیں۔ تم سوچنے [illegible] کے بجائے اس سے ہمدردی محسوس کرو۔ اصل عذاب تو اس کی جان پر پڑا ہے۔"

تیمور علی خان باپ کے قریب ہی جا بیٹھے تھے۔ بابا صاحب نے ان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر بہت تحمل سے کہا۔

"انشاء اللہ وہ جلد آ جائے گا۔ اچھا ہے۔ تنہا ہو گا تو سہولت سے غور و فکر کرے گا۔" وہ مزید گویا ہوئے۔

"بابا صاحب! آپ سے ایک بات کرنا ہے۔ اصولاً تو کوئی ٹینشن والی بات موجودہ صورتحال میں کرنا [illegible] ہے مگر۔۔۔ مگر جو بات ہم آپ سے کرنے جا رہے ہیں اس کی اہمیت کا تعلق موجودہ صورتحال ہی سے ہے۔" وہ [illegible] رک گئے۔

بابا صاحب نے بیٹے کے لب و لہجے سے کچھ پالیا تھا۔ ان کے حواس ایک دم متحرک ہو گئے کہ [illegible] موجودہ صورتحال [illegible]

"ہاں۔ ہاں۔ کہو۔" وہ بظاہر بہت پرسکون نظر آ رہے تھے۔

"ہم ایک نافرمانی کر بیٹھے ہیں۔ شاید آپ ہم سے ہمیشہ کیلئے ناراض ہو جائیں۔" وہ پھر رک گئے۔

دلاور علی خان پلکیں جھپکانا بھول گئے۔ ان کا لاڈلا بیٹا نافرمانی کا اعتراف کر کے کون سی اعصاب شکن خبر سنانے جا رہا [illegible] کہ ہمیشہ ان کی ناراضگی پیدا ہونے کا امکان کسی چھوٹی موٹی بات سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کچھ بولے نہیں بلکہ [illegible] کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

"بابا صاحب! ہم وہاں لندن میں شادی کر چکے ہیں۔ دراصل صورتحال ایسی ہو گئی تھی کہ ہمیں یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔" وہ پھر خاموش ہو گئے۔

کمرے میں شور مچاتا سناٹا متحرک ہو گیا۔ بابا صاحب نے دو تین مرتبہ [illegible] گزرا۔

"کون ہے وہ؟" تیمور کہاں کی آواز کمرے میں گونجی۔ بالکل سپاٹ لہجہ تھا۔

"مگر [illegible] ہے۔ ماں سوتیلی ہے۔ باپ مگر گیا تھا۔" تیمور علی خان کی آواز مجرموں کی طرح دبی تھی۔

"تو اس کا کیا مطلب؟" بابا صاحب کا انداز ہنوز سپاٹ تھا۔

"وہ لارڈ تھا۔ جہاز کے ایک حادثے میں چل بسا تھا۔ وہ ایک لینڈ لارڈ کی واحد اولاد تھی۔ اس کے علاوہ اس کی تین بہنیں تھیں۔"

"صورتحال کیا تھی؟" اس مرتبہ بابا صاحب کے انداز میں عجلت تھی۔

"اس کی ماں نے وہیں دوسری شادی کر لی تھی۔ جس شخص سے اس نے شادی کی تھی وہ اس کی وراثت میں ملنے والی دولت کے لالچ میں دوسری شادی کر لی تھی۔ مگر پراپرٹی ہماری وائف کے نام ہے۔ جب یہ بات کھلی تو وہ ہماری وائف کے ساتھ پالیسی چلنے لگا۔ [illegible] وہ اس قدر حراست میں رکھا گیا۔ اس کی زندگی اس طرح گزر رہی تھی گویا وہ زیر حراست ہو۔ وہ [illegible] ہے۔ ہماری ملاقات لائبریری میں ہوئی تھی۔ سب لوگوں پر اس کا [illegible] تھا۔ اس کے ساتھ [illegible] گارڈز ہوتے تھے۔ بعد میں ہم پر کھلا کہ درحقیقت وہ گارڈز اس کے سوتیلے باپ کے مسلط کردہ تھے۔ یعنی ایک جاسوسی زندگی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اس قدر [illegible] ہے کہ اپنے ہاتھ صاف رکھتا ہے۔ قانون کی مدد بھی اس کے ہاتھ میں [illegible] ہے۔ اس کی ماں کی حیثیت اس کے ہاتھ میں کھلونا کی سی تھی۔ وہ انتہائی خوفزدہ تھی کہ [illegible] اس نے ہمیں [illegible] کرتے تھے۔ زبان سے ایک لفظ نہیں نکالتا تھا۔ کہتی ہے۔ مجھے ہر وقت محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دیوار سے کان لگائے کھڑا ہو اور وہ ہر وقت گن پوائنٹ پر ہو۔"

"ہوں۔" بابا صاحب نے ہنکارا بھرا۔ "کیا نام ہے لڑکی کا؟"

"لیزا۔۔۔ ہمارا مطلب ہے [illegible] براؤن۔"

"کیا تم نے اس سے چرچ میں شادی کی ہے؟" دلاور علی خان نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"کیا؟ کیا مطلب؟" تیمور علی خان کچھ کہے نہیں۔

"ہمارا مطلب ہے اس نے اسلام قبول نہیں کیا؟"

"پہلے اس نے اسلام قبول کیا۔ بعد میں ہمارا نکاح اسلامک سنٹر میں ہوا تھا۔" انہوں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"مگر پھر اس کا نام مسلمانوں والا کیوں نہیں؟"

بابا صاحب کے پرسکون سے انداز سے تیمور علی خان کے اعصاب کا تناؤ ڈھیلا پڑنے لگا۔

"نام تو اس کا ہم نے عائشہ رکھا ہے۔ بس وہ عادتاً منہ سے لیزا نکل جاتا ہے۔" وہ قدرے جھجک کر گویا ہوئے۔

"اور تم اسے اتنے خطرات میں چھوڑ کر یہاں آرام سے اتنا وقت گزار رہے ہو؟ پھر تم نے اس سے شادی کر کے کیا فائدہ دیا؟"

دلاور علی خان نارمل انداز میں کہہ رہے تھے جیسے ان کے درمیان کوئی انوکھی یا غیر معمولی بات نہ ہوئی ہو۔

"اسے بچپن ہی سے نفسیاتی مریضہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کی عقلی پاور ہرو ہو کر رہ گئی تھی۔ وگرنہ اس کا کوئی تحفظات والا کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود ہی طور پر مضبوط اور پر اعتماد ہوں۔ ہم نے اپنی اسے دوبارہ خوش سلیقگی سے نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا وہاں ایک ہم وطن دوست ہے جو ہمارا یہاں لا دیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی بھی پاکستانی ہے۔ یہاں ہم اسی کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیز ابھی انہی کے پاس ہے۔ جس ڈاکٹر نے اس کا نفسیاتی علاج کیا ہے اس نے کافی تحفظات حاصل کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اب لیز خود بھی پر اعتماد ہے کہ وہ ایڈجسٹ کر سکتی ہے۔ وہ جہاں آپ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ ہم اس مرتبہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ حویلی میں اس کی جگہ بنا کر ہی واپس جائیں گے۔ ہم نے کوشش کی۔ مگر اماں کی وجہ سے ہر بار رک جاتے تھے۔ وہ بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی صحت کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ آج سے پہلے ہم نے یہی فیصلہ کیا تھا آپ کو سب کچھ بتا دیں گے پھر آپ خود ہی اماں جی کو ہینڈل کر لیں گے۔ ہم نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ پھر آپ خود ہی اماں جی کو ہینڈل کر لیں گے۔ ہم ان سے براہ راست بات کریں گے ہی نہیں۔ ہمیں پتا ہے ہمارے اس اقدام سے آپ کو صدمہ ضرور پہنچا ہوگا۔ مگر بابا صاحب شادی تو انسان کا سب سے زیادہ پرسنل معاملہ ہوتی ہے۔ دو انسانوں نے ایک عمر ساتھ گزارنی ہوتی ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟"

تیمور علی خان نے اعتراف خطا کے ساتھ ساتھ اپنی صفائی کا بھی بندوبست کیا۔

"ہوں"۔ بابا صاحب نے ہنکارا بھر کر حقہ گڑگڑایا۔

"صدمہ تو ہمیں واقعی ہوا ہے کہ ہمارا عزیز ترین بیٹا گھر بسا کر بیٹھ گیا اور ہمیں پتا تک نہ چلا۔ اپنے بچوں کی بارات لے جاتے ہوئے ماں باپ کے جو احساسات و جذبات ہوتے ہیں۔ وہ خوشی جو دولہا کے باپ کو ہوتی ہے وہ تو ہر باپ کا حق اور جائز حق ہے۔ بڑے انتظار کے بعد ماں باپ وہ دن دیکھتے ہیں۔ اپنی زندگی ہی میں اس سے محروم ہوئے۔ بڑی کمی ہوئی ہے بیٹے زندگی میں"۔

"مقام شکر یہ ہے کہ تم نے ولایت میں بھی نام و نسب والوں ہی سے رشتہ جوڑا۔ اگر کسی وجہ سوم کی لڑکی کو بیاہ لاتے تو شاید یہ دکھ ہمیں قبر میں لے جاتا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا کریں کیا کہیں۔ اتنا بڑا طوفان حویلی میں اٹھ چکا ہے کہ ہر طوفان اس سے چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ تم ایسا کرو جتنی جلد ہو سکے عائشہ کو حویلی میں بلا لو۔ اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ بادر سے کسی طرح رابطہ ہو اور ہم اسے تمہاری لو میرج کی اطلاع دیں۔ اب یہ فتنہ بہت آسانی سے رفع کیا جا سکتا ہے"۔

تیمور علی خان کی سمجھ میں فوراً ہی یہ بات آگئی کہ اتنی اہم خبر پر دلاور علی خان نے اتنے صبر و سکون کا مظاہرہ کیوں کیا۔ ان کی لو میرج تو حویلی کے حق میں بھی انتہائی نیک ثابت ہوئی تھی۔

مدتوں سے وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھے۔ وہ ایک دم ہوا ہو گیا۔ انہیں محسوس ہوا وہ گھٹن سے نکل کر اچانک کسی پرفضا مقام پر آگئے ہوں۔

"ہم لیز کو بھی فون کر کے خوش خبری سناتے ہیں"۔ وہ جاتی چوبارے کھڑے ہو گئے۔

"ہاں ضرور"۔ بابا صاحب نے ٹوکا۔

"سوری"۔ تیمور علی خان اتنا کہہ کر جھینپ گئے۔ پھر باہر نکل گئے۔

"بادشاہ والی کہانی سنائیں اماں جی!" ہادی اماں جی کے بازوؤں میں مچل گیا۔

"دن میں کہانیاں نہیں سناتے بیٹے! ارے رات کو سنائیں گے کہانی"۔ اماں جی نے پیار سے اس کی پیشانی پر سے بال ہٹائے۔

"بادشاہ کو دن میں کہانی نہیں سنا رہی تھیں۔ اماں جی کبھی بھول ہے"؟

روبا ہادی نازنین کے سر میں مساج کر رہی تھی۔ ماہ لقا کمرے کے دروازے کے قریب بیٹھی وضو کرتے ہوئے کپڑے گن رہی تھی۔ خادم بیگم بیٹھی چھالیہ کتر کتر کر ڈبے میں ڈال رہی تھیں۔

"اماں جی! آپ پولو میں پاؤں پڑے آپ سے خان سے معافی مانگ لوں۔ اللہ سے دعا کر رہی ہوں۔ اللہ بھرپور دعا کے ساتھ"۔ اماں کی آواز بھرا گئی۔

اماں جی نے خادم کو بتا کر اشارہ کیا کہ نازنین موجود ہے۔ خاموش رہو۔

"کیوں آپ کو کیا ہوا ہے؟ آفت تو ہم پر ٹوٹی ہے"۔ نازنین نے تڑخ کر کہا

خادم بیگم کر گئیں مگر اماں جی کی تاکید کے سبب خاموش رہیں۔

"ہماری تو عقل حیران ہے۔ یا ر عیسا سو ہو رہی ہے۔ آخر ایسا ہوا کیا ہے۔ ایسے تو کہیں بھی نہیں ہوتا"۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں گویا ہوئی۔

"تم اپنے دماغ پر زور مت ڈالو۔ بچی پر برا اثر پڑے گا۔ اللہ بہتر کرے گا"۔

"بچی صرف میری تو نہیں اماں جی۔ جو مجھے برے اثر کا صرف میں ہی سوچوں"۔

وہ بہت جھنجھلاہٹ اور بدمزاجی کا شکار ہو رہی تھی۔

"ماں کے کام بڑے ہیں اس لئے درجے بھی بڑے ہیں۔ اللہ تمہیں ہر طرح کی خوشیاں دے۔ (آمین)"۔

"اماں جی! کسی بات سے دل نہیں بہل رہا۔ عجیب سے وسوسے ستا رہے ہیں"۔

وہ ایک دم شکستہ خاطر نظر آنے لگی۔

"ماشاء اللہ بھرے گھر میں بیٹھی ہو۔ پریشان ہونے کی کیا بات ہے"۔ وہ تسلی دینے سے زیادہ کیا کر سکتی تھیں۔

"اس کم ذات سے میری ایک مرتبہ بات تو کرا دیں اماں جی۔ ذرا پوچھوں تو وہ قاتل بھول کر اب کس پر بہک گئی۔ تیمور پر تو بھٹ جاتی۔ وہ تو اکیلے اور فارغ ہیں۔ میرا میاں ہی ملا تھا پھانسنے کو"۔

نازنین کی ذہنی حالت گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ ایک تو زچگی سے ذہنی و جسمانی کمزوری

دوسرے یا تیسری بڑی پریشانی۔ جب تک تو زائیدہ بچے کا باپ بچے کے چہرے پر سرسری نظر ڈالنے والے بچے کی ماں کی جگہ بھی اترتی۔ بچہ تو پیدا ہونے سے پہلے ہی قبول کر لیا جاتا ہے۔ جب ہی تو اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جذباتی موڑ ایسے ہیں جن سے گزرے بغیر اندر کی تشنگی دور نہیں ہوتی۔

"ہیں۔ یہ کیا اول بول بولنے لگیں؟" اماں جی بھونچکی سی رہ گئیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں میری بچی۔ تو کہے تو قسم اٹھالوں۔"

اماں جی اپنی جگہ سے اٹھ کر نازنین کے قریب چلی آئیں۔

"تو پھر کیا بات ہے۔ اتنا تو خیر میں محسوس کر سکتی ہوں جو بات بھی ہے وہ آپ کو بابا صاحب کو اور تیمور کو پتا ہے مگر میں ذہن اپنا دوڑا دوڑا کر تھک گئی۔ سرا ہاتھ نہیں آرہا" نازنین نے سر تھام لیا۔ "وہ کیا بات ہے جو آپ لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں"۔

ماما اس بحث میں کہیں بھول گئی۔ ایک لمحے کو ساس بہو کی طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ سے کپڑے تہ کرنے لگی۔

روپا بی بی اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی کہ کب نازنین اپنا تھاما ہوا سر آزاد کرے اور وہ پھر سے مساج شروع کرے۔

"اماں جی! چھوٹی دلہن آپ سے لڑائی کر رہی ہیں؟"

ہاری اماں جی کی پشت پر کھڑا ہوا تھا اور قدرے پریشان کن انداز میں دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اماں جی نے اسے کھینچ کر گود میں بھر لیا۔

"ماں صدقے! نہیں بیٹے لڑائی تو گندے لوگ کرتے ہیں۔ ہم تو بات کر رہے ہیں۔"

"چھوٹی دلہن کہہ رہی تھیں یاور خاناں رستہ بھول گئے ہیں۔ آپ نے انہیں ان میں کہانی سنائی تھی اماں جی؟"

وہ انگلی اٹھا کر بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ ایک لمحے کو وہ سب دم بخود رہ گئیں۔

"ماشاء اللہ۔۔۔۔ اللہ نظر سے بچائے کتنا ذہین ہے۔ ہر بات پر دھیان رکھتا ہے۔" اماں جی نے اس کا منہ چوم لیا۔

خالہ سولہ آنے منہ ڈھانک کر بے اختیار رونے لگیں۔

"اماں جی! مجھے معاف کر دیں۔ وہ غلطی میں ہی نے کرائی تھی۔"

"سولہ آنے! بچوں سے بھی گزری ہو گی۔ پیغمبروں کے ہاں بھی صرف پیغمبر نہیں ہوئے۔ نوح کا بیٹا بھی نافرمان تھا جسے اللہ نے طوفان میں غرق کر دیا تھا۔ وہ کون سا تیری اولاد ہے۔ جو تجھے کوئی کچھ کہے کہ ٹھیک سے نہیں پالی اور وہ بھی بچی ہے بے وقوف، کم عقل۔ اپنی کم عقلی کا احساس ہوگا تو خود ہی معافی مانگے گی شرمندہ ہوگی۔"

"چاہے میں اسی میں برباد ہو جاؤں۔" نازنین گلے سے گویا ہوئی۔

"اللہ نہ کرے۔ اللہ میرے بچے کو سلامت رکھے۔ اس سے تجھے عمر بھر خوشیاں ملیں۔ آمین۔ بری بات بچی ایسے نہیں کہتے۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔"

انہوں نے نازنین کے ہاتھ تھام لیے۔

"اب بھی تو آپ خود کو دکھ دینے کی عادی ہیں۔ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی بھاگ نہیں جاتی۔"

"بھابی پلیز! آپ اماں جی سے اس طرح بات نہیں کریں۔ وہ بھی آپ کی طرح بہت پریشان ہیں۔" تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔

"کوئی بات نہیں بیٹے۔ بچی ہے یہ میری۔ اس کا دل دکھانے نہیں ہے۔ میں اس کی باتوں کا برا نہیں مانتی۔" اماں جی نے بہت دلسوزی سے کہا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے کن انکھیوں سے تیمور علی خان کی طرف دیکھا۔

"جی۔ ہم کوہاٹ جا رہے ہیں۔ پتا لگا ہے یاور بھائی پرسوں وہاں پہنچے ہیں۔"

"اچھا!" اماں جی کے چہرے سے خوشی چھلکنے لگی۔ "وہاں پہنچتے ہی فون کرنا اور یاور سے میری بات ضرور کرانا۔"

"جی ضرور۔۔۔۔ ان شاء اللہ۔۔۔۔ بس ہم آپ کو یہی اطلاع دینے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔ خیر کی خبر لاؤ۔ اللہ کی امان میں دیا۔"

"کاکا جان! یاور خاناں راستہ بھول گئے ہیں۔ اماں جی نے انہیں ان میں کہانی سنائی تھی۔ ہے نا اماں جی؟" ہاری نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

تیمور علی خان نے الجھی ہوئی نظروں سے ماں کی سمت دیکھا۔

"کاکا جان۔۔۔۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ یاور خاناں کا ہاتھ پکڑ کر لے آؤں گا۔ مجھے راستہ پتا ہے۔"

ہاری اماں جی کی گود سے نکل کر تیمور علی خان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"انہیں ہم لے آئیں گے۔ آپ یہاں روشی کے پاس رہو۔ ورنہ وہ رونے لگے گی۔" انہوں نے اس کا سر چوم کر کہا۔

"کاکا جان! روشی آئس کریم کیوں نہیں کھاتی؟ آئس کریم تو اچھی ہوتی ہے۔" اس نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

"جب وہ آپ کی طرح بھاگنے لگے گی تو آئس کریم بھی کھائے گی۔"

"کوئی لیگ پیس (مرغی کی ٹانگ) بھی؟" وہ ان کی بات کاٹ کر بے تابی سے بولا۔

"اوہ۔۔۔ شیور۔۔۔ پارٹنر۔۔۔ ضرور کھائے گی۔"

"اچھا ہم چلتے ہیں۔ بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خالہ! آپ سب کا خیال رکھیے گا۔" وہ خالہ سولہ آنے سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹے! ابھی تو یہاں کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں ہوں۔" وہ روتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئیں۔

"ایسا نہیں سوچیں۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا اماں جی۔ بھابی۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ کاکا جان!" ہاری بڑی بردباری سے مخاطب ہوا۔

"خدا حافظ پارٹنر۔۔۔۔ اماں جی کو پریشان نہیں کرنا۔ ٹھیک؟" وہ باہر نکل گئے۔

"پارٹنر نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے۔"

اماں جی نے سکون کا سانس لیا مگر نازنین کا چہرہ اسی طرح بے تاثر رہا۔

"جب سے لڑکیاں (روشن آرا، نازنین) گئی ہیں گھر بالکل ہی سونا ہو گیا ہے"۔
اماں جی عالم تاب سے مخاطب ہوئیں۔
"بابا صاحب نے بلایا ہے آپ کو، وہ کہہ رہے ہیں شام کی چائے آپ ان کے کمرے میں ہی پئیں"۔
عالم تاب نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی سوچ سے باہر آ کر ساس کو پیغام دیا۔
اماں جی کا دھیان پوری طرح سطوت کی طرف گیا۔
"کیا کچھ بول پڑی دلہن بانو؟ کیوں اسے کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ کہیں نہیں جانے دیتی وہ"۔
"اماں جی! کسی قیدی کے ساتھ اتنی نرمی رعایت ٹھیک نہیں بہت بڑا گناہ ہے' آگ لگا رکھی ہے وہ حویلی میں اس جیسی کر"۔

عالم تاب کی آواز سے ناراضی واضح تھی۔
اماں جی ۔۔۔۔ بچے کی طرح گھبرا کر چپ ہو گئیں۔
"اچھا میں عصر کی نماز پڑھ لوں۔ اپنے بابا صاحب کو کہو، آ رہی ہوں ابھی"۔
وہ دھیمی آواز میں کہہ کر وضو کیلئے چل پڑیں۔ عالم تاب زہرہ پاری کو بلا کر بابا صاحب کو پیغام پہنچا چکی تھیں۔
اماں جی نے عصر کی نماز کے بعد معمول کے مطابق تسبیح پڑھی۔ اپنے کانپتے دل کو قرار ملنے کی دعا کی اور بابا صاحب کے کمرے میں آ گئیں۔
"آؤ۔ رئیس کی ماں۔ بہت دیر لگا دی"۔
"نماز پڑھ رہی تھی"۔ اماں جی نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
"آؤ بیٹھو۔ بہت سی باتیں جمع ہو گئی ہیں جو آپ سے کرنا ہیں"۔
بابا صاحب نے اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"اتنے دنوں میں کتنی باتیں جمع ہو گئیں"۔ وہ بڑے معصومانہ اور حیا آمیز لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔
"ایک تو آپ ساری عمر رشتے کا سامان بنی رہیں۔ آپ سے کوئی بات کرنا ہو تو ہر طرف سے انتظام کرنا پڑتا ہے"۔ بابا صاحب نے آج واقعی جھلا کر کہا تھا۔
اماں جی سہم کر رہ گئیں۔
"کوئی شکایت ہو گئی مجھ سے؟" وہ سادگی سے پوچھ رہی تھیں۔
دلاور علی خان اٹھتے ہوئے جھاگ کی طرح پھر بیٹھ گئے۔
"رئیس کی ماں۔ یہ دنیا مشقت گاہ ہے۔ ہر وقت مرضی کی خبر نہیں آتی"۔

"یہاں ہر کسی کو کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے۔ یہ انسان کی تقدیر ہے۔ اور ایسا قیامت تک ہوگا۔ اب ہم ہیں۔ اللہ نے عزت دی ہے۔ مگر اور دوسری الجھنیں ہمارے ساتھ ہیں۔ جو بعض اوقات اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ زندگی ہونے کا احساس تک مٹا دیتی ہیں۔ مال و دولت کے انبار ہونے کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے"۔
"ہزار طرح کے جھمیلے ہیں۔ خوشیاں ہیں تو ان کے اپنے ڈھنگ۔ دشمنیاں ہیں تو طیش اور پاکیزہ دوستی، دشمنی 'یہ ساری' کے ساتھ ساتھ اولاد کے مسئلے مسائل"۔
"کہیں یہ سب نہیں ہے تو روٹی کا مسئلہ ہے۔ جہیز کا مسئلہ ہے۔ کہیں یہ کچھ بھی نہیں ہے تو۔ بے اولادی کا دکھ ہے۔ زندگی میں مسئلے مسائل تو چلتے رہیں گے۔ انسان کو ہمت سے کام لینا چاہیے"۔
"آپ کیا ہو گیا؟" اماں جی کا دل کانپ گیا۔ بات سے پہلے اتنی لمبی تمہید۔ اللہ خیر کرے۔
"کچھ نہیں ہوا۔ خبر تو اچھی ہے۔ آپ پریشان ہو دوسری بات ہے"۔ دلاور علی خان نے کہا۔
اماں جی کے دل کو کچھ تقویت پہنچی وہ خبر کا انتظار کرنے لگیں۔
"ماشاء اللہ ہمارے چار بیٹے ہیں۔ تین بچوں کی آپ باراتیں لے کر گئیں۔ اللہ نے بڑی عزت دی۔ ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اب اگر تیمور اپنی پسند سے وہیں ولایت میں شادی کرلے تو کیا حرج ہے؟ وقت اور زمانہ صرف ہمارا نہیں ہمارے بچوں کا بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر اگر کسی شخص کے ذریعے آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا دیا جائے کہ آپ کا بچہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کر چکا ہے تو یہ بات خوشی کی ہونا چاہیے نہ کہ افسوس کی۔ بچوں کی خوشیاں تو ماں باپ کی عمر بھر کی کمائی ہوتی ہیں"۔
"مجھے پتہ ہے وہ شیخ رفیع کی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ اس کی مرضی پر خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔
"مگر یہ کیسا ستم ہے میں اپنی آنکھوں کے تارے کی دلہن سے کبھی دل کی بات نہ کر سکوں گی۔ وہ تو انگریزی بولے گی"۔
وہ آنکھوں پر آنچل رکھ کر رونے لگیں۔ وہ اپنے دکھ پر کسی اور بہانے سے رو رہی تھیں۔ دلاور علی خان نے انہیں شانوں سے تھام لیا۔
"ہمارا بیٹا انگریزوں میں الفت بیٹھتا ہے۔ عقل کا کورا نہیں ہے۔ وہ اسے اردو سکھائے گا۔ وہ آپ سے اردو میں بات کرے گی"۔
"آپ کو بھی تو ہم ریاست رامپور سے یہاں لائے تھے۔ کیا چھنی ہوئی اردو بولتی تھیں۔ اب کس طرح مقامی بولی بولتی ہیں کہ اپنی اصل زبان بھول چکی ہیں۔ ہمارے رشتے پر آپ کی بھابیوں اور بہنوں نے کتنا اعتراض کیا تھا کہ نسلاً افغان پٹھان کو بیٹی دے کر آپ کے گھر والے گناہ کبیرہ کر رہے ہیں۔ ان کی تو عقل موٹی ہوتی ہے۔ گھر میں فارسی آمیز پشتو بولی جاتی ہے۔ جبکہ آپ کو اردو کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تھی۔
ہمارے خاندان میں آپ کے علاوہ کوئی باہر کی عورت نہیں تھی۔ مگر کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ اس خاندان کی نہیں ہو؟"
دلاور علی خان مزاج آشنائی کے سبب جن دلائل کو استعمال کر رہے تھے اس سبب اماں جی بہت پرسکون اعصاب کے

ساتھ بھرتی کوش تھیں۔

"پھر آپ مجھے لندن بھجوا دیجئے تیمور کے ساتھ۔ خود اپنے ہاتھوں جا لاؤں گی... شیخ رفیع کی لڑکی۔"

"بس آج کے بعد شیخ رفیع کی لڑکی کا ذکر ان سنوں میں حویلی میں نہیں ہو۔ ختم کر دو اس قصے کو زینب کی ماں" دلاور علی خان نے قطعیت سے کہا۔

"پتا نہیں اس کی عادتیں کیسی ہوں گی۔"

ان کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔ خلاف توقع خبر پر عجیب طرح کی بے اختیاری تھی۔ وہ دلاور علی خان کا پرسکون انداز اور بیٹے کی حمایت میں دلائل کے ساتھ کی گئی پیش بندی کی وجہ سے ان کے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے۔ مگر جانے کیوں اس پہلو کو تنہا محسوس کر رہی تھیں۔

"زینب کی ماں! تمہارے بیٹے کا گزارا اس کی عادتوں سے ہو سکتا ہوگا۔ جب ہی تو اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے" انہوں نے سمجھایا۔

اماں جی سر جھکا کر کسی سوچ میں گم ہو گئیں۔

"آ... آپ نے... اس طرح کی باتیں کبھی پسند نہیں کیں... بی بی جی کہیں۔ جب آپ کو پہلے پہل یہ خبر ملی ہو گی تو آپ کو صدمہ نہیں ہوا ہو گا۔ حالانکہ میرے حساب سے تو آپ کو غصہ آنا چاہیے۔"

وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد گویا ہوئی تھیں۔

دلاور علی خان جواب میں خاصی دیر خاموش رہے۔

"آپ ہماری شریک حیات ہو۔ شریک راز ہو۔ اللہ سے دعا ہے کہ وقت آخر بھی اسی طرح آپ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہو۔ ایک بات بتاتے ہیں آپ کو" وہ بہت گہری سوچ میں ڈوب کر مخاطب ہوئے تھے۔

"جب زیتون بانو نے ہمارے سامنے زبان کھولی اور بعد میں تیمور نے اس پر الزام لگایا... ہمارے آپ کے سامنے... تو ہمارے دل کو بہت وسوسوں نے گھیر لیا تھا۔

یہی خیال دل میں جم رہا تھا کہ تیمور سے غلطی ہو سکتی ہے ورنہ ایسی کمزور بے سہارا لڑکی ہمارے سامنے اس طرح کی جرأت کم از کم نہیں کر سکتی۔ یقین جانو زینب کی ماں اس رات ہم ایک لمحے کو بھی نہیں سوئے۔ اگرچہ ہم نے سعدیہ پر بھی ظاہر کیا تھا کہ ہم تیمور کو بالکل بے قصور مان چکے ہیں۔ جو خطا ہے اسی لڑکی کی ہے۔

اس منصوبہ وعدے کے پیچھے بھی بہت سی حقیقتیں ہیں۔ تیمور ماشاء اللہ موجود لوگوں میں سب سے حسین جوان مرد ہے۔ انگلستان میں رہتا ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ اس پر کسی کا دل آ جانا ایسی کوئی انہونی بات نہیں۔ نازنین ہو کہ زیتون بانو یہ کم عمر لڑکیاں ہیں۔ غلطی ہو سکتی ہے۔"

"اللہ سے پناہ مانگتی ہوں خان صاحب! نازنین ایک ہیرا ہے جو ہمیں غیب سے ملا ہے۔" اماں جی تڑپ کر رہ گئیں۔

دلاور علی خان جیسے حوصلے وہ کہاں سے لاتیں۔

"آپ بات تو مکمل ہونے دو، وہ خیال ہی ہے اسے تو آ کر گزر ہی جانا ہے ہم اللہ نے ہماری مدد کی تیمور کی شادی کی بات سامنے آ گئی۔

اب یہ خبر آپ حویلی کے چپے چپے پر پھیلا دیں کہ تیمور اگلے ماہ اپنی دلہن انگلستان سے لا رہے ہیں۔ تیمور تو تمام الزامات سے بری ہو رہا ہے زینب کی ماں۔ اب اس لڑکی کو پتا چلتا ہے کہ اس نے یہ سب کیوں کیا۔ وہ کیا چاہتی ہے اب صرف اور صرف بات کو اچھالنا ہے۔ سوچئے تو کیا مقام ہے جس بات نے اس کی عقل میں کمی کیوں کیا۔ وہ کیا چاہتی ہے... زمین میں ہمیں جگہ رکھا۔ وہ ہماری کیا حالت ہوگی۔ بات بیٹے اور بچی ہے کہ آسمان سے فرشتے نہیں آتے وہ تو ہم ہی ہیں۔ گواہی لے کر ہمیں اس کی اتنی فکر ہے کہ جان سے باہر ہے۔ کم حوصلہ ہو تو شاید خود کو گولی مار لیتا۔ اس کی گھر نے پہلے حرام کیا ہوا ہے۔"

دلاور علی خان کی پیشانی کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

اماں جی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"اللہ میرے بچے کا حامی و ناصر ہو" وہ بے اختیار ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

"تیمور گیا تو ہے کہ وہاں سے بتا رہا تھا کہ پتا چلا ہے یا وہ اس کی ذہنی کے ذاک بنگلے میں ہے اللہ کرے وہیں ہو۔ ہمارے سروں سے یہ مصیبت ٹل جائے۔ میں تو زیتون بانو کو کراچی میں صابرہ کے پاس ہی بھیج دوں گی وہیں ٹھیک ہے۔"

"اب یہ ہمارا کام ہے ہم خود نے کریں گے کہ اسے کس مقام پر رکھنا ہے۔ خواہ کچھ ہو ہماری اب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ ہم خود اس کی پرورش کریں گے۔ وہ ہماری نسل کا 'پچھا' ہے ہم اتنی سی بات میں اسے ضائع نہیں ہونے دیں گے۔"

دلاور علی خان نے بیوی کی بات کاٹ کر فیصلہ کیا۔

"وہاں سے بہت پیار کرتا ہے" وہ دبے لہجے میں بولیں۔

"ہم سب کچھ بھلا دیں گے۔ آپ فکر نہ کرو۔"

"ہم عمل ہے۔ معافی مانگ لے تو معاف کر دیجئے گا" حیات علی لاگزاری کے انداز میں سفارش کی گئی۔

"زینب کی ماں! انجام کا تیر خود اپنی گنجائش بنا دیتا ہے۔ حقیقت کو سامنے آنے تو دو" وہ دور خلا میں کوئی نوشتہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بس دھیان رہے کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ ہم بھی بال بچوں والے ہیں" انہوں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ہوں... فی الحال تو زیادتی ہمارے ساتھ ہو رہی ہے ہمارے بچے اپنے اپنے کام بھول کر دربدر ہیں" دلاور علی خان نے کھوئے کھوئے انداز میں بیوی کی طرف دیکھا۔

"انشاء اللہ۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تیمور نے اطمینان دلایا ہے کہ لڑکی اچھے باپ دادا کی اولاد ہے مسلمان ہو چکی ہے عائشہ نام رکھا ہے۔"

"تو کیا لڑکا انگریزی میں پڑھتی ہوگی؟" وہ بڑی معصومیت سے پوچھنے لگیں۔

"جب آئے گی تو پوچھ لینا۔ نماز تو سب کو ایک ہی طرح پڑھنا ہوتی ہے۔ خواہ انسان کسی قوم کا ہو۔"

"ویسے قرآن تو میں اسے خود پڑھاؤں گی۔ ساری حویلی کی لڑکیوں کو قرآن میں نے ہی پڑھایا ہے۔" وہ خاصی پرسکون محسوس ہو رہی تھیں۔

"اچھی بات ہے۔" دلاور علی خان نے حقے کا پائپ اٹھا کر منہ سے لگایا۔ "آپ کہاں چلیں جانے لگیں اٹھ کر؟"

"وہی دیکھنے جا رہی ہوں کیا کر رہی ہے ماہ لی۔" وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے چل پڑیں۔ مگر ایک گہری سوچ ان کی چال سے واضح تھی۔

نازنین کمرے میں بچی کو فیڈ کر رہی تھی۔ ماہ لی نے ایک سفید سا لفافہ لا کر دیا "آپ کے نام ہے۔" کوئی لفافہ اس کے نام کی ڈاک آنا معمول کی بات تھی۔ اس نے لفافے پر سرسری نظر ڈالی اور روشی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"تیمور آ گئے؟"

"نہیں ابھی تو نہیں آئے۔" ماہ لی نے بہت بجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"جیسے ہی آئیں مجھے فوراً اطلاع دینا۔" اس نے کہا۔

"جی بہتر۔" ماہ لی نے مودبانہ کہا اور باہر نکل گئی۔

نازنین نے فیڈ کرنے کے بعد روشی کو کاٹ میں لٹایا اور لفافہ اٹھا کر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ دل ایک دم سکڑ کر تیزی سے پھیلا تھا۔ حیرت اور خوشی سے اس نے "سینڈر" کا نام پڑھا۔

"یا — او مائی گاڈ۔" اس نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا۔ کئی کاغذ نکل کر قالین پر گر پڑے۔

اس نے نسبتاً بڑا کاغذ اٹھا کر کھولا۔ اس کے نام خط تھا۔ وہ انداز تخاطب پر چونک پڑی۔

محترمہ نازنین حبیب احمد!

السلام علیکم۔

آپ کی خیریت کی نیک تمنا کے ساتھ بات بڑھاتا ہوں۔ ممکن ہے حویلی میں میری غیر حاضری سے بہت پریشانی ہو رہی ہو۔ مگر میں اس ماحول سے دور اس لیے چلا آیا تھا کہ میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ اس طرح کہ کوئی شخص بھی میری سوچ پر اثر انداز نہ ہو اور مجھ سے کوئی بہت بڑی بھول نہ ہو جائے۔

پہلے میں شروع ہی سے محسوس کرتا آ رہا ہوں کہ آپ تیمور کی کمپنی کو حویلی میں سب سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ میں اس تعلق کو پاکیزگی اور وقار کے واسطے سے دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ ہم بھائیوں میں جو جذباتی وابستگی ہے اس میں اماں جی کی تربیت کا بہت دخل ہے۔ اس لیے قیامت تک کوئی الٹی سیدھی سوچ مجھے مضطرب نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن حویلی کا ایک بہت مظلوم اور بے بس کردار عطیہ ہے۔ وہ اتنی سادہ اور مخلص لڑکی ہے جس کے ایک ایک انداز سے تابعداری ظاہر ہوتی ہے۔ ہماری اس سے بہت کم بات ہوئی ہے اس نے بھی کبھی ہم سے غیر ضروری بات نہیں کی۔ اس نے

جس انداز سے حویلی میں خدمت کا حق ادا کیا، وہ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ ہمارے سونے سے پہلے وہاں موجود ہو کر سب کچھ درست کر کے جب ہماری روانگی کے وقت سوٹ کیس میں رکھتی تو ہمیں اس کی خدمت کی ادا بہت اچھی لگتی تھی۔ کیونکہ ہم اپنی بیشتر چیزیں سوٹ کیس میں رکھنا بھول جاتے تھے۔ ہماری اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھنے والی لڑکی جس نے کبھی ہم سے اپنی خدمات کے جواب میں کسی قسم کی رعایت نہیں مانگی۔ رات بارہ ایک بجے تک ہماری چائے کافی کا دھیان رکھنے والی نے ہم سے سلام کے علاوہ کبھی کوئی بات کرنے میں پہل نہیں کی۔

جب تیمور علی خان نے اپنے دوست سے اس کے نکاح کا عندیہ دیا تو ہمیں دلی خوشی ہوئی تھی کہ ہمارے بھائی نے ایک طرح سے بہت بڑی انسانیت کی خدمت کی ہے۔ اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

پھر آپ کے ساتھ اس کا پیار۔ وہ آپ کیلئے بیشتر ان تھک ہو جاتی تھی۔ ہم نے اسے آپ سے بہت محبت کرتے دیکھا ہے۔ وہ آپ کی دوست محسوس ہوتی تھی۔ ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ حویلی میں آپ کو اچھی کمپنی مل رہی تھی اور آپ خوش تھیں۔

ہم نے تو یہ دیکھا کہ حویلی کا ہر فرد عطیہ سے پیار کرتا تھا۔ تیمور سے وہ بہت ڈرتی اور گھبراتی تھی۔ مگر جب تیمور نے اپنے دوست کیلئے اسے پسند کیا تو ہمیں تیمور کے اچھے اقدام پر بہت خوشی ہوئی تھی۔

لیکن پھر ایکا ایکی کیا ہو گیا؟ آپ اور تیمور اس کے دشمن بن گئے۔ اس کے نام سے آپ دونوں برہم نظر آنے لگے۔ وہ بے وقوف، سادہ سی لڑکی ایک دم آپ کے زیر عتاب آ گئی۔

میں نے اس میں کبھی کوئی "چھوٹی بات" نہیں دیکھی، جس نے عزت دار زندگی حاصل کرنے کیلئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ آج بھی اس کے وجود پر زخموں کے نشان اس کی نیت کی گواہی دے رہے ہوں گے۔ وہ معصوم سی زخم زدہ لڑکی آپ دونوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ کیوں؟ ہم اس بات کی طرف آ رہے ہیں۔

وہ میرا خیال تو شروع دن سے رکھ رہی تھی مگر اس نے خیال رکھنے میں حد ہی کر دی۔ ہمیں حقیقت کے دروازے تک لے آئی۔ اس لیے کہ شاید وہ واقعی خیر خواہ ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو بات اس نے میرے سامنے کہی وہی تیمور اور بابا صاحب کے سامنے کہی۔

ایسا بھی ہوا کہ آپ کے انتظار میں گھنٹہ بھر راستہ دیکھا مگر آپ تیمور کو کمپنی دے رہی تھیں۔

تیمور اس قابل ہیں کہ دل ان کے راستے میں بچھائے جاتے ہوں گے۔ میں اپنے بھائی کو اتنا قصور وار نہیں مانتا جتنی کہ آپ ہیں۔ عورت کی آمادگی کے بغیر مرد کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

مرد کی پہل اس کے جیت جانے کی علامت نہیں ہوا کرتی۔ مرد کی جیت عورت کے تعاون کے بغیر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔

میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میری موجودگی میں آپ بہت چپ ہوتی تھیں۔ جبکہ تیمور کے ساتھ آپ کو اتنا خوش اور ہنستا ہوا بولتا کسی اور کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا۔ مگر تب بھی میرے ذہن میں کوئی الگ خیال اس لیے نہیں آیا کہ مجھے خود پر ہمیشہ بہت اعتماد رہا ہے۔

مطربہ نے جب اس پوائنٹ کی طرف میری توجہ دلائی تو میں نے بغور جائزہ لیا۔ شک کہ یقین میں بدلنے کی حد تک
اس رات تو اچھا خاصا یقین ہو چلا جب آپ دونوں مطربہ کو حویلی سے نکالنے کے درپے تھے۔ کہ پوری حویلی میں شاید کوئی
مظلوم حقیقت سے باخبر تھی اور اسی وجہ سے آپ دونوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔

مگر اس رات بھی میں نے خود کو سمجھایا کہ ابھی مجھے مزید تحقیق سے کام لینا چاہیے مگر جس روز اس نے تیمور کے سامنے
بابا صاحب سے واشگاف الفاظ میں اپنی بات دہرائی تو پھر شک نہیں اب کیا رہ جاتا ہے؟

کوئی لاکھ بے وقوف ہو مگر خان اولاد علی خان کے سامنے غیر ذمہ دارانہ بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ ایک
کمزور بزدل اور بے سہارا لڑکی۔ سوچنے کی بات ہے۔ تیمور تو اس کے محسن ٹھہرے۔ ان کے وسیلے سے تو اس نے باوقار
عزت دار زندگی کی لذت چکھی۔ وہ محسن کشی کیوں کر رہی تھی؟ پھر آپ سے تو اس کی بڑی دوستی تھی۔ مگر بے وقوف انسان ہمیشہ
مخلص ہوتا ہے مصلحتوں سے عاری ہوتا ہے

مجھے مصلحت ہیں سے وہ زندہ باد و خوار اچھا

یا شاید وہ زندہ دل تھی کہ کسی کے ساتھ کوئی خوفناک زیادتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

نازنین حبیب احمد!

میرا واسطہ دن رات قانون دان حضرات کے ساتھ رہتا ہے۔ میں انصاف کے تقاضوں سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ مگر
حویلی کی عظمت کے کنگرے اتنے بلند ہیں کہ وہاں گواہیاں خرید لی جائیں گی۔ اس قسم کا انصاف ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا
جس سے حویلی کی عظمت پر آنچ آتی ہو۔ میں جانتا ہوں بابا صاحب اپنے حسب نسب کی نمائش میں کسی قسم کی کوئی کمی
برداشت نہیں کریں گے۔ وہ اپنی اولاد کو قربان کر دیں گے مگر باپ دادا کی عزت کو ضائع نہیں جانے دیں گے۔

ان میں اتنا دم اتنی قوت ہے کہ وہ تیمور کو راتوں رات لندن بھیج سکتے ہیں۔ اور اپنے شملے کا ایک بل جانے کیلئے
مجھے اور آپ کو ایک جگہ جانوروں کی طرح باندھ رکھنے پر صرف اصرار ہی نہیں کریں گے بلکہ ایسا کر کے دم لیں گے۔ مگر میں یہ
اذیت ناک زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک ذرا سی پھانس چبھ جائے تو دل اس کام سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ عمر بھر کا معاملہ ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ہمارا ساتھ اتنا مختصر رہا۔ اسی لئے میں نے کوشش کی ہے کہ اس مختصر رفاقت کے سبب سے کوئی سستا چھوٹا
جملہ آپ کیلئے استعمال نہ کروں۔ بابا صاحب کے نام ایک الگ لفافہ ہے۔ اس میں بھی لکھا ہے اور آپ سے بھی استدعا ہے
کہ اس مظلوم پر اتنا تشدد (ٹارچر) نہ کیا جائے کہ وہ خوفزدہ ہو کر یہ علاقہ ہی چھوڑ جائے۔

آپ کانونٹ سے فارغ التحصیل ہیں۔ حویلی کا ماحول یوں بھی آپ کیلئے بڑا اجنبی سا تھا۔ مگر میں نے کوشش کی تھی کہ
آپ کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ رفیق سفر کا اعتماد حاصل ہو مگر۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو اور مجھے آپ
نے اپنے آئیڈیل سے بہت مختلف پایا ہو۔ کتنی حیرت کی بات ہے ہم چاروں بھائی ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔

نازنین حبیب احمد! کیا آپ یقین کریں گی کہ آج میں بہت دنوں بعد خود کو بالکل پرسکون محسوس کر رہا ہوں جیسے دہک
دھوپ میں چلنے والا سائے میں آ بیٹھا ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے آپ سے معذرت کرنا چاہیے یا آپ کو میرا شکریہ

ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ کافی اقدامات پہلے تیار کرنے ہیں اسی لئے بعد میں لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں اس میں کسی وجہ سے تعلق کا شائبہ
نہیں ہے۔ اسی سبب سے آپ کو نازنین حبیب احمد کے نام سے مخاطب کیا ہے۔
یکی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے آپ اس معاملے میں مجھے نہیں الجھائیں گی۔ اب صورت حقیقی معنوں میں اس کا
پیچھا چھوڑ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ اس معاملے میں
کردار ادا کرنے کی ہے تو دوسری دلچسپیوں کی اسے فرصت ہی کب ہوتی ہے۔ اللہ حافظ

یادر علی خان

پچھلی بار نازنین نے پورا خط پڑھا۔ ہوش و حواس پر حاوی تھا اور میان ہی میں ٹھہر گئی تھی۔ سارا دن کچھ نہ کچھ سوچتی رہی تو نازنین
پھر کچھ ہوئی تھی۔ خط اس کے ہاتھ میں تھا۔

ماما جی کہہ گئی کہ وہ کافی عرصے سے بیٹھی ہے اور اپنا کوئی ذاتی کام کر رہی ہے یادر علی خان کی چیزیں سنبھال رہی ہے۔

''روشی سو رہی ہے چھوٹی دلہن، نصیر خان اور ان کی دلہن کراچی سے آ گئی ہیں۔ اماں جی نے کہلوایا ہے آپ اماں جی
کے کمرے میں آ جائیں۔ ساری حویلی میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ تیمور خان کی دلہن آ گئی ہے۔ وہ اسے لینے جا رہے ہیں۔
اس یادر خان کا انتظار ہے''۔

ماما نے سوئی ہوئی روشی کے چہرے پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی دھن میں کہا۔

''اماں جی کہہ رہی تھیں کہ نازو کو خبر کیسے سناؤں وہ کہے گی میری پریشانی کا کسی کو کوئی احساس نہیں۔ اپنی اپنی پڑی
ہے''۔

جواب میں پھر خاموشی تھی۔

''نصیر خان کی دلہن کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی ہے۔ ماشاء اللہ۔ اب تو سب سے باتیں بھی کرنے لگی ہیں۔
پہلے تو بہت چپ چپ رہتی تھیں''۔

اس مرتبہ ماما چونکی۔ جواب میں کوئی ردعمل ہو یا نہ ہوتا۔ وجود میں کوئی حرکت تو ہوتی جو انسان عام حالات میں فطری
طور پر کرتا ہے۔ ماما قریب چلی آئی۔ مگر خوفزدہ ہو کر نازنین کو دیکھنے لگی تھی۔ نازنین کے دونوں ہاتھ جن میں خط تھا۔ گود میں
رکھے تھے۔ وہ اسی انداز میں وہ بیٹھی ہوئی تھی اور آنکھیں دل پر پڑے کرتے آبشار پر لگی ہوئی تھیں۔

ایک نگاہ میں تو کسی مجسمے کا گمان ہوتا تھا۔

''چھوٹی دلہن''۔ ماما نے خوف و تعجب سے اسے چھوا۔

اب وہ الٹے پاؤں سرپٹ بھاگی تھی۔ عالم تاب سامنے سے آتی نظر آ گئیں۔ وہ خود ماما کے بدحواس انداز پر ٹھٹک کر
رک گئی تھیں۔

''کیا بات ہے ماما؟'' وہ پریشان نظر آئیں۔ یادر علی خان کے اچانک چلے جانے سے یوں بھی ایک دھڑکا سا سارا کو لگا
ہوا تھا۔

''بڑی بیگم! وہ چھوٹی دلہن پتا نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے آپ چل کر دیکھیں''۔

ماما نے بے اختیار انداز میں عالم تاب کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ عالم تاب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چل پڑیں۔

نازنین ان کی نگاہ کے سامنے مورتی کی طرح نصب تھی۔

"نازو!" انہوں نے اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑا۔ وہ ڈھلک کر ان کی گود میں آ رہی۔ عالم تاب ایک دم جیسے کوما میں رہ گئیں۔

"ماما! بصیر سے کہو کہ چھوٹی دلہن کو اسپتال لے کر جانا ہے جلدی کرو۔"

وہ گود میں گری نازنین کے ہاتھ پاؤں درست کرنے لگیں۔

ماما فوراً دوڑ گئی۔

چند لمحوں بعد ہی بڑے ابا (عالم تاب کے شوہر) اور بصیر علی خان اندر تیزی سے داخل ہوئے۔

"کیا ہوا بھابی بیگم؟" بصیر علی خان پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔

"ہٹو ایک طرف۔" بڑے ابا کے اعصاب شاید سب سے زیادہ مضبوط تھے۔ انہوں نے نازنین کو بازوؤں میں اٹھایا۔

"آپ کوئی چادر لے کر گاڑی میں آؤ۔" انہوں نے باہر کی سمت بڑھتے ہوئے بیوی کو مخاطب کیا۔

قدموں کی دھمک سے راہداری اور پورچ گونج اٹھے۔ گاڑی کے دروازے کھٹاک کھٹاک کھلنے کی آواز اس میں شامل تھی۔ جو شور برپا ہو رہا تھا۔ عالم تاب پچھلی سیٹ پر بیٹھیں اور نازنین کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ آگے بصیر علی خان اور عالم تاب کے شوہر بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی ایک زنّاٹے سے ریورس ہوئی پھر ایک شور کے ساتھ موڑ کاٹتی اور دوڑ پڑی۔

اتنی دیر میں گھر کے بہت سے لوگ پورچ میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ اور حیران پریشان دھول اڑاتی گاڑی کو سامنے سے غائب ہوتا دیکھ رہے تھے۔

خط نازنین کے ہاتھوں میں ابھی تک بھنچا ہوا تھا۔ مڑے تڑے انداز میں۔ عالم تاب نے بہت رسانیت سے خط اس کے ہاتھوں سے آزاد کرایا اور تہہ کر کے اپنے گریبان میں رکھ لیا اور بہت افسردگی سے نازنین کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ کار پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

پورے گھر میں موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اماں جی اور بابا صاحب بھی اسپتال گئے ہوئے تھے۔ روشی نے رو رو کر ایک الگ مسئلہ پیدا کر رکھا تھا۔ ماما اسے گود میں لیے ٹہل ٹہل کر آدھی ہو رہی تھی۔

عشاء کی اذانوں سے کچھ دیر پہلے تیمور علی خان نے حویلی میں قدم رکھا تھا۔ سامنے برآمدے ہی میں ماما پر نظر پڑ گئی۔

"السلام علیکم خان۔"

"وعلیکم السلام۔ یہ؟" انہوں نے روشی کی سمت اشارہ کر کے کچھ پوچھنا چاہا۔

"روشانے ہے خان" وہ افسردہ سے انداز میں گویا ہوئی۔

"بھابی کہاں ہیں؟" جانے کیوں ایک وسوسہ سا خود ہی اندر در آیا تھا۔

"اسپتال میں" ماما نے مختصر جواب دیا۔

"کیا ہوا؟" ڈھیروں ناکردہ گناہوں کے ملال ان کے قلب پر خون آشام جنگلی پرندوں کی طرح منڈلانے لگے۔

"شاید سکتہ ہو گیا ہے۔ ٹوٹ گئیں ہیں وہ۔" وہ بھی آواز میں اس طرح مخاطب ہوئی جیسے اس حادثے میں اس کا بھی قصور ہو۔

"سکتہ ہوا ہے۔ کیا اور بھائی آ گئے؟" ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح ان کے ذہن میں لپکا۔

"نہیں شاید اسی صدمے سے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اپنے مقام کا ادراک کرتے ہوئے اسے بات ادھوری چھوڑ دینا پڑی۔

"کیا ہوا تھا؟ کس کی بات ہے؟"

وہ یک دم رک کر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پریشانی کی ایک ایک لہر ان کے چہرے سے واضح تھی۔

"پتا نہیں جی۔ میں تو روشی بی بی کو دیکھ رہی تھی۔ چھوٹی دلہن بہت سے کاغذ لیے بیٹھی تھیں۔ میں بھی پاور خانوں کے کاغذ سنبھال رہی ہیں۔ میں نے ان سے دو چار باتیں کیں۔ وہ کچھ بولیں نہیں پھر میں نے انہیں دیکھا تو چپ ہی بیٹھی تھیں۔ میں بھاگ کر بڑی بیگم کو بلا لائی۔ وہ بولیں یہ تو سکتے میں ہے۔ بڑی بیگم اور میاں خان (بڑے ابا) انہیں موٹر میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ بصیر خان بھی ساتھ ہیں۔ موٹر وہی چلا رہے تھے۔

بعد میں جب ٹیلی فون آیا تو باقی لوگ بھی اماں جی کے ساتھ چلے گئے۔ بڑے خان مغرب کی نماز کے بعد گئے تھے۔"

ماما نے تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

"خالہ ماں کو بہت تیز بخار ہے وہ بھی پریشان ہیں۔" ماما نے مزید بتایا۔

"ہوں۔" تیمور علی خان نے گہری سوچ میں ڈوبے ہنکارا بھرا۔

"نازو بھابی کو اسپتال لے جانے کے بعد کوئی اور بھائی کے بیڈ روم میں گیا تھا؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"جی۔ بی بی جان (زہرہ بیگم) گئی تھیں۔" ماما نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بتایا۔

"بی بی جان بھی اسپتال گئی ہیں؟" تیمور علی خان نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"وہ گئی تھیں بصیر خان کے ساتھ۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی واپس آئی ہیں۔"

"بصیر بھائی کہاں ہیں؟ آج ہی آئے ہیں کراچی سے؟"

"یہ بیگ اوپر کمرے میں پہنچا دینا۔ ہم بی بی جان کے پاس ہیں۔ اسپتال سے فون آئے تو ہمیں بتانا۔" وہ نہایت تیز رفتاری سے زینے کی طرف بڑھے تھے۔

زہرہ بیگم کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ جائے نماز پر بیٹھی ہوئی باہر ہی سے نظر آ رہی تھیں۔

پھر بھی انھوں نے احتیاطاً دستک دی کہ شاید ان کے بھولی کرے کے کسی حصے میں موجود ہوں۔

رئیسہ بیگم دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے بیٹھی تھیں۔ دستک پر چونک پڑی تھیں۔

تیمور کو دیکھ کر ان کی نظریں جھک گئیں۔ جھکی نظریں ہزار معنی رکھتی ہیں۔ بعض اوقات تو مقابل کی ساری قوت گویائی سلب کر لیتی ہیں۔

"ہم اندر آ سکتے ہیں"۔ وہ بہن کی آواز سن کر جلدی سے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔

"ہوں"۔ وہ بس ہوں کہہ کر رہ گئیں۔

"آپ اپنا کام پورا کریں۔ ہم بیٹھے ہیں"۔ وہ بظاہر اطمینان سے گویا ہوئے۔

"کر لیا ہے میں نے اپنا کام۔ تم سناؤ کب پہنچے۔ ملاقات ہوئی پادری سے؟"

وہ جائے نماز کا کونہ موڑ کر ان کے قریب چلی آئیں۔

"ابھی آئے ہیں اب کیا ہوا ہے بی بی جان؟" انھوں نے آدھے سوال کا جواب دے کر اپنی طرف سے سوال کر دیا۔

"بس اب تو کھیل ختم ہو گیا۔ اب تو بس نئے آغاز ہوں گے فی الحال تو دور تک پریشانی نظر آتی ہے"۔

وہ بھائی کے پہلو میں بیٹھ کر نہایت دل گرفتہ انداز میں گویا ہوئیں۔

"کیا مطلب؟ ناز بھابی؟" ایک خوفناک خیال سے ان کی جڑیں تک ہل گئیں۔

"فی الحال تو موت سے لڑ رہی ہے"۔ وہ دکھ سے بولیں۔

"پھر آپ کی بات کا کیا مطلب لینا چاہیے؟" وہ بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔

رئیسہ بیگم نے جیسے خود پر قابو پایا۔ ایک خیال یونہی اچانک آ گیا تھا جو سراسر چھٹی حس کے تحت تھا۔

"بابا صاحب تو نہیں آئے ناں ابھی؟" یہ سوال اسی خیال کے تحت تھا۔

"شاید نہیں"۔ تیمور نے جلدی سے کہا جیسے کہہ رہے ہوں چھوڑیے اس بات کو اصل بات بتائیں۔

"ہوں۔ میرا خیال ہے رات ختم ہونے سے پہلے ناز کو ہوش آ جائے گا"۔

"آپ ہماری بات کا جواب دیجیے بی بی جان [illegible] ہمیں پتا چلا ہے جب ان کی یہ حالت ہوئی تو وہ کچھ کاغذات لیے بیٹھی تھیں اور ان کے اسپتال جانے کے بعد صرف آپ ان کے کمرے میں گئی تھیں۔ کیسے تھے وہ کاغذات آپ نے اٹھائے ہوں گے۔ پڑھے بھی ہوں گے؟ بتائیے ہمیں"۔ وہ بہت تلخی اور ضدی لہجے میں بہن سے مخاطب تھے۔

رئیسہ بیگم بری طرح گھبرا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے لاڈلے دلارے لائق فائق خوبرو وجیہہ بھائی کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ ان کی جان تو اسی دن سولی پر ٹنگ گئی تھی جب ان کی ماں نے بڑی بیٹی کی حیثیت سے انھیں شریک غم کیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بچھے سے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ اگر پڑھی تو مجھے کوئی خاص نہیں آئی۔ میں نے سمیٹ کر بابا صاحب کو دے دیے تھے"۔ وہ نظریں چرا کر کمزور سی آواز میں گویا ہوئیں۔

"نہیں۔ معاف کیجیے گا۔ آپ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ آپ کی ایک ایک بات سے فرار ہے۔ آپ ہم سے کچھ چھپا رہی ہیں؟" وہ دو ٹوک انداز میں گویا ہوئے۔

"میں کیا چھپاؤں گی میری جان۔ میرے چاند"۔ وہ تیمور کے کاندھے سے پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

تیمور علی خان کی ساری اعصابی قوت ریزہ ریزہ ہونے لگی۔ انھوں نے بہن کو اپنے بازو کے حصار میں سنبھالا۔

"آپ ہمیں ستا رہی ہیں بجیا۔ جو کچھ بھی ہے ہم اطمینان سے سنیں گے"۔

"کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ناز کی طبیعت خراب ہے تو دل بہت پریشان ہے"۔ وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں بی بی جان؟ جو بات آپ برداشت کر سکتی ہیں۔ کیا ہم نہیں کر سکتے؟" وہ بے بسی سے گویا ہوئے۔

"جب کوئی بات ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔ ناز کی وجہ سے"۔

"بی بی جان! ہم کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے جس کی وجہ سے ہمارے گھر کا سکون برباد ہوا ہے ہم ابھی آپ کے سامنے اسے خون میں نہلا دیں گے۔ آپ اسی خوف کے سبب حقیقت چھپا رہی ہیں ناں تو دیکھیے"۔

انھوں نے دائیں طرف کی جیب (پینٹ کی) کو تھپتھپایا۔ جدید وضع کا ولایتی پستول ان کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔

رئیسہ بیگم ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں مگر انھوں نے اتنی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ بس بے بسی سے انھیں کمرے سے نکلتا دیکھ رہی تھیں اور پھر ننگے پاؤں ان کے پیچھے دوڑی تھیں۔

"تیمور۔۔۔ بات تو سنو"۔ مگر وہ آندھی طوفان کی مانند زینہ عبور کر گئے تھے۔ رئیسہ بیگم بھی شاید زندگی میں پہلی بار اتنا تیز دوڑی ہوں گی۔

عطریہ کے کمرے کا دروازہ لاک تھا۔ تیمور علی خان نے وحشت بھرے انداز میں ایک فائر لاک پر کیا۔ پھر دوسرا کیا اور دھڑ سے دروازہ کھولا۔ اتنے میں رئیسہ بیگم بھی ان کے قریب جا پہنچی تھیں۔

عطریہ پہلے فائر پر تو کچھ نہیں سمجھی تھی مگر دوسرے فائر پر اس نے سامنے کی دیوار کی طرف ایک شعلہ جذب ہوتے دیکھا تو بجلی کی تیزی سے ساری صورتحال سمجھ گئی۔ ایک سرعت سے اس نے دریچے کے پٹ کھولے اور چوکھٹ پر ہاتھ جما کر اچھلنے کی کوشش کی مگر مضبوط گرل دیکھ کر جو جھٹکے کی شکل میں لگی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے موت کا اندھیرا چھانے لگا۔

تیمور کے پستول سے شعلہ نکلا اور اس کے بائیں شانے میں جذب ہو گیا۔

"تیمور"۔ رئیسہ بیگم کے حلق سے ایک چیخ ابھری اس چیخ میں عطریہ کی چیخ بھی شامل ہو گئی۔ ایسی درد ناک چیخ کہ دل پھٹ جائے سن کر۔

رئیسہ بیگم نے تیمور کو دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا۔

"اس لڑکی حرام کی وجہ سے میں تمھیں برباد نہیں ہونے دوں گی۔ تیمور میرے شہزادے۔ میرا پیارا سا بھائی"۔

وہ پوری قوت سے انہیں دروازے سے ہٹا کر مطربہ کو بھاگنے کا موقع دے رہی تھی۔

"چھوڑیے بی بی جان آپ ہمیں"۔

ان کے پستول سے ایک شعلہ اور نکلا۔ مگر ربیعہ بیگم کی کشمکش کی وجہ سے نشانہ خطا ہو گیا مطربہ نے شانے پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور خون ابل ابل کر بہہ رہا تھا۔ خوف سے وہ سفید پڑ چکی تھی۔

"خان...... مجھے ایک موقع دیں۔ میں ... آپ"۔

"شٹ اپ" ایک فائر اور ہوا۔ مطربہ نے بستر کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ گولی اس کی ران میں گھس گئی تھی۔ اس نے دل ہولا کر چیخ ماری تھی۔ ربیعہ بیگم نے اپنی پوری قوت صرف کر کے تیمور علی خان کا رخ موڑا۔ ان کے اندازے کے مطابق اس وقت پستول میں ایک گولی بچی ہوئی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں یہ گولی کسی طرح ضائع ہو جائے کہیں دیوار میں گھس جائے۔ ان کو آتشی اسلحے کے استعمال کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مگر اس وقت ان کا ذہن کارکردگی کے لحاظ سے اپنے کمال پر تھا۔ انہوں نے تیمور کے ہاتھ پر دباؤ ڈال کر گولی دیوار پر ضائع کرنا چاہی۔ یہ تو وہ جان چکی تھیں کہ تیمور کو ان کے ارادے سے باز رکھنا مشکل ہے۔

دوسرے یہ کہ تیمور اس طرح کھڑے تھے کہ مطربہ بھاگ کر کمرے سے باہر بھی نہیں جا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ربیعہ بیگم کی کھینچا تانی کی وجہ سے تیمور علی خان جیسا نشانے باز کامیاب ہو کر نہیں دے رہا تھا۔

مطربہ دم اندازے میں ایک طرف لڑھک گئی تھی اور تیمور علی خان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے پھر نشانہ لینا چاہا۔ اسی دم ماما چیخیں مارتی ہوئی ان سے آ کر لپٹ گئی تھی۔ اب ربیعہ بیگم اور ماما دونوں انہیں دروازے سے باہر لے جانے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ ان کی مزاحمت سے تیمور علی خان زخمی شیر بنے جا رہے تھے۔

تیمور ہوش کی دوا کرو۔ اس کی ماں زندہ ہے۔ کچھ ہو گیا تو خدانخواستہ وہ نہیں چھوڑے گی۔ وہ اتنی شاطر عورت بلاوجہ خاموش نہیں بیٹھی ہے۔ ضرور اس کی منصوبہ بندی ہو رہی ہو گی۔ اس بدنصیب کی خاطر کیوں مصیبت کو آواز دے رہے ہو۔ میرے چاند میرے بھائی اپنے اوپر نہ سہی ہمارے اوپر رحم کرو کوئی ایسے ہی مل جاتے ہیں بھائی۔ سارے روگ لگ جائیں گے ہمیں۔ ایسا ہی خون سوار ہے تو مجھے مار دو گولی۔ میں بھائی کو کھو کر کیسے زندہ رہوں گی"۔

وہ تیمور علی خان کے سینے سے لگ کر بری طرح رو پڑیں۔

تیمور علی خان نے نہایت بے بسی سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹ ڈالا۔

انہیں کمزور پڑتا پا کر ربیعہ بیگم نے بڑی سرعت سے ریوالور ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور ماما کو مطربہ کی طرف اشارہ کر کے تیمور کو لے کر باہر نکل گئیں۔

"کچھ ہو جاتا تو اچھا تھا بی بی جان! اب یہ آگ ہمیں عمر بھر بے کل رکھے گی۔" وہ نڈھال سے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"اور جو ہمیں عمر بھر کے روگ لگ جاتے اس کا تمہیں ذرا خیال نہیں۔" وہ ناراضگی کے انداز میں گویا ہوئیں۔

"اچھا اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ ہمیں اب اس کی فکر ہے۔ خون بہت بہہ رہا ہے۔ کہیں واقعی کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔" وہ زینے کے قریب ٹھہر کر بولیں۔

تیمور علی خان دھیرے دھیرے سے زینہ طے کرنے لگے۔ ان کی چال سے ان کا اپنا داخلی خلفشار بہت واضح تھا۔

ربیعہ بیگم الٹے پاؤں مطربہ کے کمرے میں واپس آئی تھیں۔ ماما نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔ اور اپنا دوپٹہ پھاڑ کر پٹی سے اس سے خون روکنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔

مطربہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا زرد چہرہ آہستہ آہستہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ ربیعہ بیگم کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پہلے باپ کو مطلع کریں یا کسی ڈاکٹر کو۔ ایک ڈاکٹر جو حویلی آتا تھا اس کا نمبر بھی یاد نہیں تھا۔ عجیب طرح کی بدحواسی ان پر طاری ہو رہی تھی۔ روپا ربوی حویلی سے باہر تھی۔ جو مرد ملازم تھے وہ اس وقت کی چوپال پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حویلی کے اندر یوں بھی انہیں بے تکلف آنے کی اجازت نہیں تھی۔

معاً ان کے ذہن نے بالکل درست کام کیا کہ وہ بابا صاحب کو مطلع کریں اور کہیں کہ وہ ڈاکٹر ساتھ لیتے آئیں۔

وہ بڑی تیزی سے ہال میں آئیں اور اس ہاسپٹل کا نمبر ڈائل کیا کہ وہ بابا صاحب کو مطلع کریں اور کہیں کہ وہ ڈاکٹر ساتھ لیتے آئیں۔

وہ بڑی تیزی سے ہال میں آئیں اور اس ہاسپٹل کا نمبر ڈائل کیا جہاں نازنین ایڈمٹ تھی۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔

حالانکہ اگلے دو منٹوں میں خان دلاور علی خان کی آواز ریسیور سے خارج ہوئی تھی۔

"بابا صاحب۔ میں ربیعہ۔ گھر سے بات کر رہی ہوں۔ آپ جلدی سے گھر آ جائیں۔ کسی ڈاکٹر کو ساتھ لے کر۔ مطربہ کے گولی لگ گئی ہے۔"

"لگ گئی ہے یا کسی نے ماری ہے؟"

ان کی سپاٹ آواز ربیعہ بیگم کے کانوں سے ٹکرائی۔

خیر آ رہے ہیں ہم۔ تیمور کہاں ہے؟" انہوں نے جیسے چونک کر پوچھا تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہے۔ بس آپ جلدی آ جائیں۔" انہوں نے ریسیور بے دھیانی میں پٹخا اور تیز تیز چلتی ہوئی واپس مطربہ کے کمرے میں آ گئیں۔

"ماما خون تو بہت بہہ گیا ہے۔ کہیں" وہ کہتے کہتے لرز کر خاموش ہو گئیں۔

"دل مضبوط رکھیں بی بی جان۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ بازو میں ہاتھوں کے اوپر پیچھے سے اس کے پار ہو گئی ہے۔ گولی پار ہو گئی ہے۔ یہ دیکھیں۔" ماما نے انہیں زخموں کی طرف متوجہ کیا۔ "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بہت ہمت دکھائی اس وقت تم نے ورنہ مجھ سے تو اس وقت حواس ہی جواب دے رہے ہیں۔ یا اللہ ماما نے حال پر رحم کر۔ بھلا کیا ضرورت تھی اسے باپ کے سامنے جانے کی آگے لگ کر۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"اس کو اصل سے کون جانے گا بی بی جان؟" ماما نے تشویش بھرے انداز میں ان پر نگاہ ڈالی۔

"بابا صاحب ڈاکٹر کو لے کر آ رہے ہیں۔" وہ انہیں پوچھ کر گویا ہوئیں۔

"آپ نے انہیں گولی کا بتایا ہے۔ بس آتا ہی ڈاکٹر کا انتظام کر کے ساتھ آئے۔" ماما نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بتا دیا ہے۔" وہ پریشانی کے عالم میں بولیں۔

"پریشان تو نہیں ہوئے خان؟" ماما نے دریافت کیا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب ثابت ہو رہی تھی۔

"پتا نہیں۔ اب فون پر کیا پتا چلتا ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولیں۔

ربیعہ بیگم بے قرار سے انداز میں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ماما مطربہ کے سرہانے بیٹھ گئیں۔

چند لمحوں بعد روپا ربوی، ماما کو ڈھونڈتی ہوئی بوکھلائی ہوئی کمرے میں آئی۔

"کوئی رہی اے اس نوں۔ کی ہو ساں ماما؟"

تو ویریں کرتی پھر رہی ہے۔ ہوش نہیں تجھے کہ حویلی خالی پڑی ہے۔ جیسی تو ہے ویسا تیرا مرد دونوں جانے کہاں گم رہتے ہیں۔" ماما نے جھاڑ پلائی۔

"ہائے وے ربا ای اندروں گولی چلی اے۔ میں تے ڈنگراں دے گھا لین گئی ساں ماما۔" وہ مجرموں کی طرح سر جھکا کر بولی۔ اس نے دو بھینسیں پالی ہوئی تھیں۔ شام انہیں کے لئے چارہ لینے گئی تھی۔

مطربہ کے بستر پر خون دیکھ کر وہ خود ہی سمجھ گئی تھی کہ حادثہ کس کے ساتھ ہوا ہے۔

اچھا اچھا۔ دیکھ خان آتے ہوں گے انہیں لے کر سیدھی ادھر آ۔"

ماما نے اسے روانہ کر دیا۔ جبکہ وہ ماما سے تفصیلات جاننے کے لئے بے چین ہو رہی تھی اور بہت فکرمندی سے مطربہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اے زندہ اے کہ مر گئی؟" وہ بہت احمقانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

"خاک پڑے تیری عقل پر۔ بات کرنے کا ڈھنگ نہیں۔ زندہ ہے تو جا یہاں سے۔" ماما کا دل کانپ گیا۔ تبھی تو اسے غصہ آ گیا تھا۔

روپا ربوی جلدی سے باہر نکل گئی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد بابا صاحب ڈاکٹر کے ہمراہ حویلی میں داخل ہوئے۔ رات میں بجے آنکھ پوری کھل

رہے تھے۔ ان کا نیوز گرمیوں میں سب کو یہیں دالان میں پڑھاتا تھا۔ کچھ دیر قبل ہی اس نے بچوں کو چھٹی دی تھی اور خود گیٹ سے باہر کھڑا ہوا تھا۔

دلاور علی خان نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ غالباً وہ اس کے چہرے پر کچھ پڑھنا چاہ رہے تھے۔

''منشی صاحب خیریت۔ آپ ابھی تک؟''

''جی خان۔ آج ادھر کوئی حویلی میں نظر ہی نہیں آیا۔ اجازت کے لیے آپ کا انتظار تھا۔ تیمور خان شاید آرام کر رہے ہیں۔'' اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ جاؤ تم۔'' انہیں اس کی بے خبری کی طرف سے اطمینان ہوا۔ راہداری میں ریحانہ بیگم بڑی بے تابی سے ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ باپ کے ساتھ ڈاکٹر کو دیکھ کر فوراً چہرہ دوپٹے سے ڈھانپ کر آڑ میں ہو گئیں۔

''اپنے کمرے میں ہے وہ بابا صاحب۔'' وہ مطلع کر کے زینے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تیمور کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکیں پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گئیں۔

ڈاکٹر ابتدائی طبی امداد کے بعد فوراً اسپتال میں ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ وجہ یہ بتائی تھی کہ خون بہت بہہ چکا ہے۔

ایک لمحے کو تو خان دلاور علی خان سوچ میں پڑ گئے۔ سیاسی صورت حال خاصی سخت جا رہی تھی۔ ایوب خان کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ یحییٰ خان مسند اقتدار پر متمکن ہو چکے تھے۔ ایک جرنیل گیا تھا دوسرا آ گیا تھا۔ سیاسی فضا بہت برہم تھی اختیار و رسوخ کا استعمال بہت احتیاط کا تقاضا کر رہا تھا۔ بیوروکریسی کے اہم مہرے جگہ بدل چکے تھے فوجی حکومت میں اثر و رسوخ رکھنے والے ابھی کم اعتماد ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ہوش میں آ کر کچھ بول پڑی اب تو اسے انتقام لینے کا زیادہ اچھا موقع مل رہا ہے۔

''بہتر ہے کہ اسے مرنے دیا جائے۔ اس طرح قصہ ہی تمام ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ مر گئی تو اس کی خطرناک روح جاگیرداروں کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔''

انہیں بہت دور تک سوچنا تھا۔ وہ کم عمری سے جاگیر کا انتظام چلا رہے تھے۔ وہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

جبکہ مطرب تو ایک مسئلے کی شکل میں ثابت ہو چکی تھی۔

''کیا سوچنے لگے خان صاحب؟ جتنی دیر ہوگی اتنی مشکل ہو جائے گی۔''

ڈاکٹر انہیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر قدرے حیران ہوا۔ کہاں تو انہیں اتنی جلدی تھی کہ ایک منٹ کی تاخیر برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''ہوں۔ اللہ مالک ہے۔ اچھا اچھا چلتے ہیں۔ ملازم نوکروں کو بھیجتے ہیں۔ تم روپے دے کر کوئی پلنگ کمرے میں منگوا لو۔ اسے پلنگ پر لٹاؤ اور چادر ڈال دو۔ وہ پلنگ اٹھا کر پورچ میں لے آئیں گے ہم اللہ بخش سے کہہ کر بڑی گاڑی نکلواتے ہیں۔''

وہ جھرجھری لگاتے ہوئے راہداری کے موڑ پر غائب ہو گئے۔ ڈاکٹر ان کے پیچھے چل پڑا تھا۔ ریحانہ بیگم اوپر بالکنی میں ملا

بابا صاحب کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار کر رہی تھیں۔ خالہ اماں جی کی خراب حالت کے پیش نظر ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ اماں جی کو سب ہی نے اسپتال جانے سے منع کیا تھا۔ مگر وہ پہلے کب کسی کی سنتی تھیں۔ ان پر ایک قیامت نازل تھی۔

تیمور علی خان نے کھانا ابھی نہیں کھایا تھا۔ بس فون سے لگے بیٹھے ہیں۔ اب تک دونوں بہن بھائی مطرب کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ریحانہ بیگم نے البتہ یہ ضرور بتایا تھا کہ بابا صاحب مطرب کو لے کر اسپتال گئے ہیں۔ تیمور علی خان نے جواب میں یہ پوچھا تھا کہ بڑی بھابی کی طبیعت کے بارے میں بابا صاحب نے کیا بتایا۔ ریحانہ بیگم کو یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پھر وہ کیا جواب دیتیں۔

کتنی دیر دونوں بہن بھائی خاموش بیٹھے بس ایک دوسرے کے وجود کو محسوس کرتے رہے تھے۔ جب کہیں جا کر رات پونے گیارہ بجے گاڑیاں حویلی میں داخل ہوئیں۔ وہ دونوں گاڑیوں کے رکنے کی آواز پر فوراً باہر آ گئے تھے۔

سب سے پہلے اماں جی خالہ سوزن کے ساتھ اگلی گاڑی سے اترتی نظر آئیں۔ ریحانہ بیگم بے تابی سے ماں کی طرف بڑھیں۔

''کیسی طبیعت ہے اماں جی نازی کی؟''

''اچھی ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہوش میں ہے۔'' وہ نڈھال سے انداز میں گویا ہوئیں۔

تیمور علی خان اتنا سنتے ہی آگے بڑھے اور ڈرائیور سے چابی مانگنے لگے۔

''بیٹے! کہاں جا رہے ہو۔ بہت رات ہو گئی ہے صبح چلے جانا۔''

وہ پلٹ کر تیمور علی خان سے مخاطب ہوئیں۔

''اسے روکو ریحانہ! کہیں ایسا نہ ہو اسے دیکھ کر نازی کی حالت پھر بگڑ جائے۔''

وہ بہت کمزوری محسوس ہونے لگی تھیں۔

''تمہارے بابا صاحب آ گئے کیا؟ پتا نہیں اسپتال سے ایک دم کہاں چلے گئے تھے۔''

''ہاں تیمور! اماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ رات ہو رہی ہے صبح چلے جانا۔''

''یہ بات صبح کی نزاکتوں کا احوال نہیں ہے بی بی جان۔ کمال کرتی ہیں آپ۔''

وہ جھلائے اور جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ چوکیدار نے گاڑی کی لائٹس آن ہوتی دیکھ کر پھرتی سے پھاٹک وا کر دیا۔ تیمور علی خان زن سے گاڑی لے اڑے۔ وہ سب دیکھتے رہ گئے۔

پہلے تو ڈاکٹرز نے ان سے درخواست کی تھی کہ ابھی وہ مریضہ کے پاس نہ جائیں لیکن جب انہوں نے تحکمی انداز میں کہا کہ وہ صرف انہیں دیکھنا چاہتے ہیں اور کوئی بات چیت کا ارادہ نہیں ہے تو تھوڑی سی پس و پیش کے بعد انہیں نازی کے کمرے میں جانے کی اجازت مل گئی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا نازنین چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ نرس کرسی پر بیٹھی ایک ٹک دیوار کی سمت دیکھ رہی تھی۔ تیمور علی خان کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ"

"جی۔ ہم پرمیشن سے آئے ہیں آپ چاہیں تو یہیں تشریف رکھیے۔ چاہیں تو کمرے سے باہر جا سکتی ہیں۔" وہ شائستہ انداز میں کہہ کر بیڈ کے نزدیک آ گئے۔

"کیسی ہیں بھابی آپ؟"

نازنین نے خالی خالی نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ نظر کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا دماغ حاضر نہیں ہے۔

خاصی دیر خاموشی چھائی رہی۔

"کیا فیل کر رہی ہیں؟" وہ بہت دھیمی آواز میں پوچھ رہے تھے۔ نازنین نے ان کے چہرے کی سمت خالی خالی نگاہیں دوڑائیں۔

"او کے۔ آپ آرام کیجئے۔ ہم یہاں کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ پھر چلے جائیں گے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ نازنین ان کی طرف اسی سابقہ انداز میں دیکھتی رہی۔ تیمور علی خان نے نظریں جھکا لیں۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا دس منٹ یا پندرہ منٹ۔ بالآخر مسلسل خاموشی نے انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا ہم چلتے ہیں۔ صبح آئیں گے۔" انہوں نے قدم بڑھا دیئے۔

"تیمور!" وہ دروازے کے قریب پہنچے تو نازی کی آواز نے انہیں بری طرح چونکا دیا۔

"جی۔" وہ نہایت تیزی سے اس کے بیڈ کے قریب دوبارہ آئے۔

"تیمور!" اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

"جب انسانوں کے دلوں میں وحشتیں نہیں ہوتیں تو وہ اپنے گھر کا ماحول اس طرح کا کیوں بنا دیتے ہیں کہ بھائیوں سے بیوی کو پردہ کیوں نہیں کراتے۔ اعتمادی بے اعتباریاں ہوتی ہیں تو ظاہر کیوں نہیں کر دیتے۔ ایک لمحے میں بازاری عورت کو کتنا اوڑھنا دیتے ہیں۔ کیوں آئے ہیں آپ یہاں۔ ہم عدت میں ہیں۔ اتنی عمر دراز عورتیں ہیں حویلی میں کسی نے نہیں سمجھایا آپ کو۔ حویلی کے اسی دوغلے پن نے آج ہمیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔ وہ شگفتہ لگا اور یاور علی خان اس سے اچھا تو وہ اصطبل کا جاہل سائیس ہے جس کی بیوی تنہا کھیت میں کام کرتی ہے۔ رات بھر سے پانی لے کر آتی ہے۔ گاؤں سے شہر تو تانگے والے کے ساتھ بچے گود میں لے کر چلی جاتی ہے۔ لیفٹ پنساری کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتی ہے اور وہ ہے کہ اس کے ناز اٹھاتے نہیں تھکتا۔ یہ اعتبار کے اعتماد کے رشتے ہوتے ہیں تیمور علی خان غیرت کی آواز کے بند معنی ہوتے ہیں۔"

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ دل و جان سے بھڑاس نکال رہی ہے۔ تیمور علی خان تو پتھر کے بت کی طرف ساکت و صامت ہو گئے تھے۔ "ہم عدت میں ہیں" جیسے ہتھوڑے کی طرح ان کے دماغ پر پڑ رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ بمشکل گویا ہوئے۔

"مطلب بتانے کو حویلی میں لوگ کم ہیں؟ آپ چلے جائیں یہاں سے۔ یہ ہماری اور آپ کی آخری ملاقات ہونا چاہیے۔" نازنین نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"بھابی!" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"اب میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں۔ صرف آپ اپنے بھتیجے بھتیجی کے چچا ہیں اور بس جائیے آپ یہاں سے۔" وہ بےزاری لہجے میں گویا ہوئی۔

"آپ ہم سے اس طرح کیوں بات کر رہی ہیں۔ ہمارا کیا قصور ہے؟" عظیم صدمے سے وہ چور ہو گئے۔ آواز بمشکل حلق سے نکل رہی تھی۔

"قصور تو میرا ہے کہ بے بصیرت لوگوں میں آ پھنسی تھی۔" دیکھتے عظیم اولاد سے آنکھیں چھلک گئیں۔ اب ان میں کوئی آنسو نہیں۔ انہوں نے انتظار کیا کہ حقیقت پر رونے کو آنسو نہیں بچے۔ دیکھ رہے ہیں آپ میرا حوصلہ۔ کبھی بھائی سے ملاقات ہو تو کہہ دیجئے گا۔ قیامت کا قرض چڑھ گیا ہے۔ قیامت کے دن ہی اتاروں گی تب تک وہ میرے مجرم ہیں اتنی معافی آپ اس میں عمر تمام ہو جائے گی مگر کسی نہیں لے گا۔"

"بھابی!"

"اگر آپ نے مجھے بھابی کہا تو یقیناً میں اپنی رگ کاٹ لوں گی۔"

اس نے بہت پر سکون انداز میں دھمکی دی۔

تیمور علی خان بے بسی سے اس کی شکل دیکھنے لگے۔

"پھر کیا کہیں ہم آپ۔" وہ کس قدر شکستگی سے پوچھ رہے تھے۔

"آپ بھائی کی پسند کی کوئی گالی دیجئے۔" وہ اذیت بھری آواز میں گویا ہوئی۔

"بھائی بھائی ہے۔ ہم ہیں۔ آپ بھی جانتی ہیں۔ یہ بڑا بابا ہے۔" وہ تڑپ کر بولے۔

"تیمور! میں آپ کو خبردار کر رہی ہوں میرا دماغی توازن بگڑنے والا ہے۔ کچھ ہو جائے گا۔ اس سے پہلے آپ یہاں سے چلے جائیں پلیز۔"

تیمور علی خان گھبرا کر باہر نکل گئے۔

پھر وہ کہیں رکے بغیر تیزی سے اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔

"ہو تو وہ سب ہو گیا۔ مطلب خوب شیں تم ہے۔ اور یاور بھائی۔ بھائی تو بھائی۔ ہم بھی قیامت تک آپ کو معاف نہیں کریں گے۔ ہمارا آپ کا آج سے کوئی تعلق نہیں۔ یاور علی خان ہم کو کوئی بھائی نہیں ہے۔ آپ نے بھائی کو نہیں ہمیں گالی دی ہے۔ ایسی گالی جس پر قتل جائز ہو جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ زندگی بھر آپ کا چہرہ دیکھنے کے شناخت نہ ہوں۔ اگر کبھی دیکھا تو ہو سوچیں گے۔ بھائی ایسا نہیں ہوتا۔ جو ایسا ہوتا ہے وہ بھائی نہیں ہوتا۔"

تیمور علی خان کی رگ رگ میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

اماں جی تکیے کے سہارے بیٹھی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب حد ہو گزری ہے اور انہیں کچھ ہونے والا ہے۔

روبا دیوی انہیں وہ دھڑکا سے آئی تھی۔ اور اپنی حالت میں انہیں مطربہ والے حادثے کی اطلاع کر گئی تھی۔ انہوں نے زبیدہ بیگم کو بلا بھیجا تھا۔ ان کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔

زبیدہ بیگم تھکے تھکے قدموں سے ماں کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آپ نے بلایا اماں جی؟" وہ ماں کے قریب بستر پر بیٹھ گئیں۔

"ہاں۔ تم لوگ کیا ہمیں بچہ سمجھتے ہو جو اتنی اہم باتیں چھپاتے ہو۔" وہ ناراضگی سے گویا ہوئیں۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں اماں جی آپ تو پہلے ہی پریشان تھیں۔ سوچا اور کیا پریشان کریں۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"تمہیں میری قسم۔ سچ بتاؤ وہ زندہ ہے۔ خون تو نہیں ہو گیا میرے بیٹے سے؟" وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

"اللہ نہ کرے اماں جی۔ وہ تو شکر کریں گھر میں، میں موجود تھی۔ ورنہ تو تیمور پر واقعی خون سوار تھا میرے تو قابو میں نہیں آ رہا تھا۔"

وہ دہشت سے بولیں۔

"تو اسے تم نے بتا دیا تھا کہ۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"میں کیسے بتا سکتی تھی۔ باہر ماما جی سے سوال جواب ہوئے تھے اسی سے اس نے کچھ نتیجہ نکال لیا ہوگا۔ پہلے تو مجھے پوچھتا رہا پھر۔" وہ بولتے بولتے رک گئیں۔

"پھر کیا؟" اماں جی نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر کیا اماں جی۔ آگے تو آپ کو پتا چل ہی گیا ہے۔" زبیدہ بیگم جیسے تھکن سے چور چور تھیں۔

"بچ تو جائے گی ناں۔ گولی کہاں لگی۔" وہ خوفزدہ انداز میں بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

"بس۔ اللہ نے کرم کیا۔ میری کھینچا تانی میں نشانے خطا ہوتے رہے۔ بس ایک منٹ کی اگر دیر ہو جاتی تو وہ تو نشانے باز ہے۔" زبیدہ بیگم نے دھیمی آواز میں بتایا۔

"ناحق کسی کا خون سر لگ جاتا۔" اماں جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"خیر ناحق تو نہیں۔ حشر تو اس کا بہت برا ہونا چاہئے۔ چاروں طرف آگ لگا دی ہے۔ منحوس نے۔ اللہ کرے مرتے دم تک سکون کی سانس کو ترسے۔ زمیں اسے نہ قبولے۔ جسم جسم میں کیڑے پڑیں۔ بس یہ کہیں اللہ نے میرے بھائی کے گھر خون نہیں لگایا۔"

"یوں نہ کوسو۔ پہنچ جائے گی اپنے انجام کو تم کیوں اپنی زبان خراب کرتی ہو۔ بدی کا تو یوں بھی انجام برا ہی ہے۔ قدرت کا اصول ہے۔"

اماں جی اپنی فطرت سے مجبور تھیں۔ دل گرفتہ بیٹی کو ٹوکنے لگیں۔

"یہی فطرت کا اصول ہے اماں جی انسان کو وہ کچھ ملتا ہے جو اس کے کرتوت ہوں۔ دکھ دینے والوں کو بددعائیں ہی لگتی ہیں۔ دکھ پہنچانے والوں کے لئے برباد ہو گئے ہم سب۔" زبیدہ بیگم اسی لہجے میں بولیں۔

اب مر بھی جائے تو ہمیں کیا فائدہ ہے جو عزت جانی تھی وہ تو چلی گئی۔ دس لپا گئی تو۔

زبیدہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اماں جی اپنے آنسو روک کر بیٹی کو سہلانے لگیں۔

"میری طرف بھی دیکھو زبیدہ۔ مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ کرن جیسی سکھ کے دن۔ اب ادھر سے بھی جانے کہاں تک چلا جائے۔ میری بچی میں بوڑھی ہوں۔ مجھے تو حوصلہ دو۔"

ان کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ زبیدہ بیگم ماں سے لپٹ گئیں۔ دونوں طرف طوفانی آ گئی۔ یوں بلک بلک کر رو رہی تھیں گویا گھر میں کوئی فوتگی ہو گئی ہو۔

"ہم لٹ گئے اماں جی!" زبیدہ بیگم کی چیخیں نکل گئیں۔ "اماں جی میرے بھائی۔ ہائے اماں جی میرے بھائی۔" دونوں رو رہی تھیں۔ آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔

"ارے نصیبوں جلو۔ کیا حال کیا تجھے۔ یا اللہ میرے کس گناہ کی سزا ہے۔" اماں جی سسکیاں بھرنے لگیں۔

ماما کسی کام سے کمرے میں آئی اور الٹے پاؤں بھاگ گئی اور بصیر علی خان کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔ وہ چند منٹوں بعد اماں جی کے کمرے میں تھے۔ ان کی بیوی بھی ان کے پیچھے آنے لگیں۔ تو انہوں نے وہیں کمرے میں رکنے کا کہہ دیا کیونکہ ابھی ان کے اور حویلی کے درمیان بہت سے حجاب تھے۔ ان کے سامنے کھل کر باتیں نہیں ہوتی تھیں۔

"کیا ہوا بی بی جان۔ چپ ہو جائیے۔ دیکھئے اماں جی کی حالت خراب ہو جائے گی۔" انہوں نے بمشکل ماں بہن کو چپ کیا۔

"تو کیا تمہیں نہیں پتا کیا ہو گیا۔" زبیدہ بیگم کراہیں۔

"مگر اس طرح بھی تو بات نہیں بنے گی بی بی جان۔" وہ بہن کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

"بات تو بگڑ گئی میری جان! اب نہیں بنے گی۔"

وہ بصیر علی خان کے شانے سے پیشانی لگا کر پھر رونے لگیں۔

"میرے بھائی عظیم دکھ، عظیم رسوائی۔ ذرا سوچ کیا ہو گیا ہمارے ساتھ۔"

"اس طرح پریشان ہونے سے بھلا کچھ ہو سکتا ہے؟ حوصلہ کیجئے۔ اماں جی کی طرف دیکھیے انہیں ہمت دلائیے بی بی جان۔"

بصیر علی خان نے بڑی بردباری سے سمجھایا۔

"مطربہ کا بھی اتنا قصور نہیں ہے بصیر جتنا کہ یاور کا ہے۔ بہت خود غرض ثابت ہوا ہے۔ قربانی کا جذبہ ہوتا تو بہت کچھ برداشت کر لیتا۔ ہماری خاطر اپنے بچوں کی خاطر۔ اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ اسے کسی کا خیال نہیں آیا۔ اپنی بوڑھی ماں کا بھی نہیں؟" وہ پھر سے رو پڑیں۔

بصیر علی خان کی قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی۔ وہ بہن کا شانہ سہلانے لگے۔

"ساری جاگیر رہن رکھ کر بھی نقصان پورے نہیں ہو سکتے۔ ذرا سوچو بصیر۔"

"رکھیہ یوں دہائی نہ دے بچی! میرا دل رک جائے گا۔ میری خاطر چپ ہو جائیں اور مجھے کچھ ہو جائے گا۔" اماں جی نے بڑی ہمت سے اپنے آنسو روکے۔

"دیکھو تیمور آتا ہوگا۔ خود کو سنبھالو۔ جانے کیا کچھ سن ہوئی ہوگی وہاں۔ کس حال میں گھر آئے۔ جاؤ تم اپنے کمرے میں۔ ماما سے کہنا تمہارے بابا صاحب آ جائیں تو مجھے بتا دے۔ جانے کس پریشانی میں ہوں گے۔ چلو شاباش بچی۔"

اماں جی کی ہمت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ جس کی امید کسی کو بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

"بصیر! تم تیمور کا راستہ دیکھو۔ بھائی کو سنبھالنا ہوگا بیٹے۔ بڑی گردش ہے اس پر۔"

"ٹھیک ہیں اماں جی! آپ فکر نہ کریں۔ ادھر بیٹھک میں ہوں میں۔ آپ آرام کیجئے۔ آ جائیں بابا جان تو آپ بھی آرام کر لیجئے۔"

بصیر علی خان نے انہیں زبردستی اٹھایا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اماں جی اپنی نماز کی چوکی کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کی چال سے لگتا تھا گویا خود کو گھسیٹ رہی ہوں۔

بصیر علی خان بہن کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ اماں جی سمجھیں کہ ماما رو پا ہوئی ہے۔ انہوں نے رخ موڑے بغیر ہی اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ وضو جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز تو آئی مگر آنے والا کچھ بولا نہیں۔ کارپٹ پر قدموں کی چاپ تو محسوس ہوتی تھیں۔ وہ خود ہی بول پڑیں۔

"ہوں۔ کیا بات ہے آگئے تیرے خان۔"

"ہم ہیں اماں جی۔" تیمور علی خان کی آواز نہایت دھیمی اور افسردہ تھی۔

ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اماں جی جواب میں متوجہ ہونے کے بجائے دوبارہ تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

وہ بے قرار سے انداز میں چوکی کے بالکل ساتھ کارپٹ پر بیٹھ گئے۔

"ایک تو آپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا مسجد میں داخل ہو رہے ہوں۔ طبیعت خود بخود مؤدب ہو جاتی ہے اور اگر اس پر آپ کلام نہ کریں تو آنے والے کی تو ہمت ہی جواب دے جاتی ہے۔ ناراض ہیں آپ ہم سے؟"

تمہاری ہمت جواب نہیں دے سکتی۔ بڑی ہمت دی ہے تمہیں اللہ نے تم تیمور علی خان ہو۔ خوفناک درندوں پر گولی چلاتے ہو خنجر سے ان کا سینہ چاک کرتے ہو۔ ان کی کھال اتارتے ہو پھر اپنا خاص شکار کو کر اس کمال سے جاتے ہو۔

مرتے ہوئے شیر پر جھپٹ کر قصہ کھینچتے ہو پھر اسے بڑی شان سے جا کر شکار والے کمرے کی دیوار پر لگاتے ہو۔ سب جاں والے تمہاری بہادری کی داد دیتے ہیں۔ تمہیں بہادر مشہور کرتے ہیں۔ تمہاری ہمت کیسے جواب دے سکتی ہے؟"

"اماں جی! یوں نہ کریں۔ خلوص کی اس بھیڑ میں آپ شامل نہ ہوں۔ پلیز اماں جی ہم پر بہت بڑی مصیبت آئی ہے۔"

اماں جی ہنسیں۔

"اتنا دکھ ہے دل چاہتا ہے خود کو شوٹ کر لیں۔"

اس سے زیادہ اماں جی میں برداشت کی طاقت نہیں تھی۔ انہوں نے بے اختیار ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یہ ضرورت تھی اس پر گولی چلانے کی؟ قسم کھائی ہے میرے بیٹوں نے ماں کو کبھی بھی دکھ نہ دینے کی؟" وہ آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"آپ کو کیا معلوم ہمیں کتنا افسوس ہے اس کے زندہ بچ جانے کا؟" وہ پھر اشتعال میں آنے لگے۔

"بیٹے! انسانی خون ہے۔ ایسی باتیں نہیں سوچتیں۔ ابھی بڑی عمر ہے۔ اسے کال کوٹھری کے نام لگا دو یہ چاہتا ہے۔ آج کل کچھ بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کتنا ہی ایڈوانس کس طرح گھیرا جس کے انتظے چاہنے والے ہیں۔ یہ بات جس مولوی مودودی کا معاملہ جاگیردار بہت تیز والا ہوتا ہے مگر شریں بھی ایسے ہی موقعوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انسان کا خون کرنا کوئی کھیل ہے۔ تم سے زیادہ لمبے ہاتھ ہیں اس کی ماں کے۔ اس ملک کا بادشاہ اس کا گواہ بنتا ہوگا۔ ملوا ماں کی قسمت اچھی تھی۔ ورنہ بہت بری طرح گھیرے گئے تھے۔ چاہتی لگا تو تھا بادشاہ (صدر) اوسے میں کس کس کے دکھ کو روؤں گی تم کہ میرے حال پر آگے پیچھے رکھ چھوڑے ہیں۔ مگر میں قربان۔ اللہ کرے میرے بیٹے مجھے اپنی جوانیوں پر رونے پیچھے چھوڑ جائیں میرے منہ میں خاک۔"

ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"اماں جی! ہم انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں۔"

"بیٹے! بس مجھ پر رحم کرو۔ حد ہو چکی ہے اب۔"

"آپ کو کیا پتا آج تو بچ گیا مر جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ جب ہمیں ناز بھائی نے کہا کہ انہیں آئندہ بھائی نہ کہیں۔ آپ کو پتا ہیں اماں جی؟"

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے وہ۔ اب اس کے سامنے مت جانا۔ عدت شروع ہو چکی ہے اس کی۔ اس وقت بھی روک رہی تھی میں۔ آ بیٹے! مجھے سہارا دے کر بستر تک لے چلو۔ سر چکرا رہا ہے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔"

انہوں نے تیمور علی خان کا شانہ تقریباً دبوچتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم گھبرا گئے۔ ان کو سہارا دیا اور بستر پر لٹا کر جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا۔

"پانی پی لیجیے اماں جی۔"

اماں جی نے چند گھونٹ پیے اور دوبارہ تکیے پر سر ڈال دیا پھر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

"تیمور! رکنا تمہارے بابا صاحب آ گئے؟ اب تو بہت رات ہو گئی ہے۔ جانے کن حالوں میں ہیں۔" وہ واقعی فکرمند ہو گئیں۔

"اچھا ہم دیکھتے ہیں۔" جانے کس احساس کے تحت ان کی نظریں جھک گئیں۔ "آپ کے پاس ماما کو بھیج دیں، آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا اماں جی؟"

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں تم اپنے باپ کی خبر کرو۔ جاؤ بیٹے۔" وہ الجھن بھرے انداز میں کمرے سے باہر نکل گئے۔

حویلی میں اگر انجان آدمی داخل ہوتا تو پہلا تاثر یہ ہوتا کہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔

سجا سجایا باغ، تراشیدہ گھاس، پھولوں کے تختے، گھنے سایہ دار درخت۔ سفید سنگ مرمر کے برآمدے دھوپ میں چمکتے ہوئے جیسے ابھی دھوئے گئے ہوں۔ سیاہی مائل چم چم کرتے ہوئے دروازے جو مختلف سمتوں اور گزرگاہوں کو جاتے، کھلے ہوتے تھے۔ سرخ بجری والی گزرگاہ جو شاندار پورٹیکو تک جا کر تمام ہوتی تھی۔ شام کو سلوٹ لائٹ جلتے ہی برقی روشنی کا نہایت خوبصورت اور مرتب سلسلہ۔ صفائی اتنی کہ تنکا پڑا نظر نہ آتا۔

اس کے باوجود اتنی گہری خاموشی اور ویرانی تھی کہ بعض اوقات مکینوں کے دل وحشت سے پھڑپھڑانے لگتے تھے۔ [?] مستقل طور پر حویلی آ گئی تھیں۔ ان کے شوہر وہیں کہیں بسنت فیکٹری لگا رہے تھے۔ وہ اپنی دونوں بچیوں روبی اور [?] (جو گود میں تھی) کے ساتھ وہیں آ گئی تھیں۔ اس میں اماں جی کے اصرار کو بھی بہت دخل تھا۔ تزئین اپنے شوہر کے امریکہ چلے جانے کے بعد خاص طور پر دونوں بچوں شیثہ اور حماد کو لے کر معمول کے انداز میں آ گئی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ کن قیامت کی گھڑیوں میں انہوں نے حویلی میں قدم رکھا ہے۔

ہر طرف ہو کا عالم محسوس ہوتا تھا۔ ایسی تو بڑی بات تھی مگر ابھی تک گم ہو گئی تھیں۔ ہر فرد یوں کان دبائے پھرتا نظر آتا جیسے کوئی جرم کر بیٹھا ہو۔ کھانے کے وقت ابتدائی مرحلہ جو بچوں کے سلسلے میں ہوتا صرف اس وقت کچھ چہل پہل اور شور ہوتا تھا۔ بچوں کے کمروں میں گھستے ہی پھر سکوت طاری ہو جاتا تھا۔ صرف برتنوں کی کھڑکھڑ باقی رہ جاتی تھی۔

[?] کے بارے میں خان والا اور علی خان کسی سوال کا جواب نہیں دیتے تھے۔ نازنین کمرے میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر کوئی اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ باری کو روشنی آرا ہی سنبھال رہی تھیں۔

تیمور علی خان دن کی روشنی میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ چند دنوں کے لئے لندن جانا چاہتے تھے۔ مگر بابا صاحب نے اجازت نہیں دی بلکہ بہو کو خود فون کر کے تسلی دے دی تھی۔

یاور علی خان ہنوز لاپتہ تھے۔ خالہ سولہ آنے کے مرنے کی گٹ گٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ نہ وہ کسی کے پاس بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔

ان ہی وحشتوں میں عدت کے دن گزرتے رہے۔ صرف ماما جی ہی نازنین کے کمرے میں آتی جاتی تھی۔ یا اماں جی تین چکر لگا لیتی تھیں مگر وہ بالکل خاموش رہتی تھی۔ لہٰذا وہ تھک کر واپس آ جاتی تھیں۔ ان کی اپنی طبیعت گری گری سی

تھی۔ کبھی ماں بیٹیاں اکٹھی بھی ہو جاتی تھیں تو یوں خاموش رہتی تھیں گویا خاموشی کے راستے ایک دوسرے کے حال سے واقفیت حاصل کر رہی ہوں۔

اماں جی کی سرد آہیں انہیں کوئی بات کرنے سے روک دیتی تھیں۔

ہاں جب ان کے درمیان اماں جی نہیں ہوتی تھیں تو [?] سرگوشی کرتی تھیں۔ رضیہ بیگم تو باقاعدہ کوستے ہوئے آ گئی پھیل جاتی تھیں۔ پھر بری طرح رو پڑتی تھیں۔

دور دور تک اس ویرانی اور خاموشی کا توڑ نظر نہیں آ رہا تھا۔ زندگی گویا ایک جگہ ٹھہر گئی تھی۔

بستی کی عورتوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ مہمانوں کا آنا بہت کھٹکنے لگا تھا۔ عارضی مہمان داری ایک مصیبت بن جاتی۔ حویلی کا ہر فرد چاہتا تھا کہ گھر میں مہمان نہ آئیں۔

عدت ختم ہونے میں چند دن باقی رہ گئے تو بابا صاحب نے ایک رات تیمور علی خان کو بلا بھیجا۔ کافی دنوں بعد دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ خان صاحب اس حادثے کے بعد کھانا اپنے کمرے ہی میں کھا رہے تھے۔

"جی؟" تیمور علی خان کا سر مجرم کی طرح جھکا ہوا تھا۔

"ابھی تک ناز کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع نہیں پہنچائی۔ اب تم سے مشورہ کرنا ہے۔ کہ اب کیا اسٹیپ لیا جائے۔"

"ان کے [?] کا انتظار کریں۔ جو ہم سب میں عالم فاضل ہیں۔" تیمور علی خان گویا پھٹ پڑے۔

خان صاحب دایاں ابرو چڑھا کر جھکا سر اٹھائے بغیر نظریں اٹھائیں اور بیٹے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اور چند لمحے خاموش رہے۔

"اس طرح مسئلوں کے حل نہیں نکلتے۔ اب کچھ سوچنا ہے۔ کچھ کرنا ہے تیمور!"

"میرے کچھ کرنے کی تو اب اس مسئلے میں گنجائش نہیں ہے۔ آپ بتائیے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے ناگواری پر قابو پا کر باپ کی بات کاٹ دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ منیب احمد کو اس حادثے سے مطلع کر دیا جائے۔ ان کے اس دوران میں دو تین فون آ چکے ہیں۔ مگر ہم نے ناز کو نہیں بتایا۔ ہر مرتبہ عالم تاب ہی کی ان سے بات ہوئی۔ اس نے کہہ دیا ناز یاور کے ساتھ سیر کرنے سوات گئی ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے ناز اب ان سے خود بات کرنا چاہے گی۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے جیسے کچھ سوچنے لگے ہوں۔

"ظاہر ہے وہ انہیں بھی اطلاع دینے کے لئے فون کرے گی۔"

وہ پھر خاموش ہو گئے۔ تیمور علی خان بات آگے بڑھنے کا انتظار کرنے لگے۔

"مشکل یہ ہے کہ اس کے بعد وہ بچوں کو لے کر [?] چلی جائے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ بچے حویلی سے باہر نہ جائیں۔ یہ جاگیر کے وارثوں میں ہیں۔"

اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہمارے وارث کی ماں باہر کے کسی آدمی کے ساتھ دوسرا نکاح کرے۔ وہ بچے ہمارے
پھر لوگ ہیں اس بات کا ہمیشہ خطرہ رہے گا کہ وہ قانون کے راستے سے بچے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ پھر ہم
ہم بچے حویلی سے باہر نہیں جانے دیں گے۔
ہم اپنے خون کو دور نہیں ہونے دیں گے۔"

وہ اتنا کہہ کر پھر خاموش ہو گئے اور سوچ میں پڑ گئے۔

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ بچوں کے نانا اور والد کو آنے دیجیے ان کا انتظار کیجیے۔ ان رات قانون والوں کے ساتھ کچھ ہیں۔ بڑے آغا صاحب مشورہ دے سکتے ہیں آپ کو۔"

تیمور علی خان گنگ سے گویا ہوئے۔

"یہ بیٹے پھوپھی پھولنے کا وقت نہیں ہے تیمور، حقیقت کا سامنا اور مقابلہ کرنے کا وقت ہے۔"

"آپ کے خیال میں ہم کیا رول ادا کر سکتے ہیں؟" وہ جیسے زچ ہو کر پوچھ رہے تھے۔

پھر ایک بے معنی خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔

"ہمارے ہاں بیٹے۔ بزرگوں کی وہ دو تین بیبیاں رہی ہیں۔ مرد جوان ہو تو بھی ہو تو بہت آسانی سے دوسرا بیاہ ہو سکتا ہے۔"

بہت مشکل بات تھی بہت مشکل سے کی تھی۔

تیمور علی خان نے بے تحاشا چونک کر باپ کی سمت دیکھا۔ جیسے انہیں سماعت کو دھوکا ہوا ہو۔ ان کی تو گویائی ہی سلب ہو گئی۔

"ہم نے بہت سوچا ہے تیمور۔ بڑی راتیں جاگ کر سوچا ہے۔ دیکھو، بہو کے ساتھ زیادتی کی حد ہو گئی ہے۔ ہمیں ازالہ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

"کیجیے بابا صاحب! ضرور ازالہ کیجیے۔ مگر ہم بھی اتنے ہی بے قصور ہیں جتنی کہ ناز بھابی۔ آپ تو کم سے کم ہمارے ساتھ زیادتی نہ کیجیے۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹے بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" خان صاحب نے بڑی نرمی سے کہا۔

"بابا صاحب! ہماری چادر رہا ہے۔ ہم بھی یاور بھائی کی طرح لاپتہ ہو جائیں۔ پلیز بابا صاحب بھائی کی چھوڑی ہوئی کرسی میں آپ شریک نہ ہوں۔ ورنہ ہمیں آپ سے عمر بھر کے لیے شکایت ہو جائے گی۔ جو کچھ ہوا ہے وہ بھی رسوائی کی بات ہے اور جو آپ کہہ رہے ہیں یہ اس سے بھی بڑی رسوائی ہے۔ مفادات سے ہٹ کر ذرا سکون سے سوچیے۔ مفادات انسانوں کے لیے نہیں ہوتے۔ ہمیں آپ کی بات سے کتنا دکھ ہوا ہے۔ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ ہمیں اجازت دیجیے اور یہ وعدہ بھی کیجیے کہ آئندہ آپ ہم سے اس طرح کی کوئی بات کبھی نہیں کریں گے۔"

"بیٹھ جاؤ تیمور!" وقار علی خان کی آواز میں تحکم تھا۔

تیمور علی خان نے بے بسی سے باپ کی شکل دیکھی۔

"تم اپنی عمر کے حساب سے ٹھیک ہو مگر ہماری بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ناز حویلی سے باہر قدم رکھے گی اور بچے۔ یہ تم غلط سوچ رہے ہو۔ جو جرم ہے۔ ہم اس کا بندوبست کر چکے ہیں۔"

"یہ رشتہ بہت حساس، بہت نازک ہوتا ہے تیمور۔ اختیاری باتیں پہنچتے پہنچتے باز پرس ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک لمحے میں ختم ہو جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ بہت سی اطلاعات مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی ہیں مگر اس طرح کی افواہیں زمانے کو اعتبار کرنے کی بڑی جلدی ہوتی ہے۔

ہماری طرف دیکھو تیمور، انگلیوں کی سمت اٹھنے لگ رہی ہے۔ ہمارا سکون پہلے ہی حرام ہو چکا ہے۔"

"اس کے باوجود آپ اس کی جان بچا رہے ہیں۔ شکاری کتے چھوڑ رہے آپ اس پر ہمارے گلے پر پھندا کیوں کسا جائے۔"

"ہم نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اسی لیے نہیں کہا کہ تم سے تمہارا فیصلہ آج ہی سنیں۔ تم غور کرو۔

ہم وقت دے رہے ہیں۔ پھر بات ہوگی۔ تم جا سکتے ہو۔"

خان وقار علی خان نے حقے کا پائپ منہ سے لگا کر گویا زبان بندی کا اشارہ دیا۔ تیمور علی خان نے بے بسی سے باپ کو دیکھا پھر ایک گہری سانس کھینچ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

انہیں ایسا لگا جیسے گنج کی مصیبت میں اب گھیرے ہوں۔ جی تو چاہ رہا تھا۔ اماں جی کے سامنے جا کر بے تحاشا روئیں۔ خوب دل کی بھڑاس نکالیں۔ زیادتی ورنہ زیادتی پر دہائی دیں۔

اگلے ہی خیال نے سارے جھاگ بٹھا دیے۔

وہ بھی دو روٹی والی زندگی۔ جب ہم حیا سے اندر سے ابھی وہ نہیں جو اپنے ظاہر سے دکھائی دیتے ہیں تو ایسا تو ہو سکتا ہے۔ ابھی تک یہاں عورت اتنی کمزور سمجھی جاتی ہے جسے ابھی تک خواہش کی تکمیل سے لے کر رسوائی چادر کا نصاب از بر نہیں ہوا۔ تو قابل بھروسا بے وقوف جذباتی۔

ابھی یہاں عورت کو وہ اختیار ہی کہاں دیا گیا ہے۔ اس کی نگرانی کی جاتی ہے کہ وہ خاندان کی عزت پامال تو نہیں کر رہی؟ اسے یہ اعتماد دے کر پروان نہیں چڑھایا جاتا کہ دوسرے اس کی نگرانی کیوں کریں؟ وہ اپنی نگرانی خود کیوں نہ کرے۔ اسے یہ کیوں نہیں یقین دلایا جاتا کہ سوسائٹی میں حیثیت، عزت حاصل کرنے کا اسے بھی اتنا ہی اختیار و حق ہے جتنا مردوں کو عزت نفس اور چادر اس کا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا مرد کا۔ ہم اپنی عورت کو تعلیم دیتے ہیں اعتبار نہیں دیتے۔ اس کی نگرانی کرتے ہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کی طرف سے چوکس رہتے ہیں۔ کبھی کوئی اس بیٹھی گوری کو پیچھے سے نگل نہ جائے۔

اس کو یہ شعور ہے۔ یہ مان کیوں نہیں دیتے کہ وہ اپنی عزت نفس کی حفاظت کے معاملے میں تمام خیر خواہوں سے زیادہ حساس ہے۔ انسان خود سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتا۔ اس لیے اپنے چادر اپنی عزت نفس کا معاملہ اس سے بہتر کوئی دوسرا کیسے طے کر سکتا ہے۔

اس حقیقت کا ثبوت و دلیل یہ ہے کہ پھر یہ جذباتی اندھیرے کیوں آتے ہیں۔ خون خون سے دھاندلی کیوں کرتا ہے؟ نگرانی و پہرے کے باوجود قانونی و اخلاقی اداروں کے باہر جھوٹے کیوں لگا جاتے ہیں۔ جیتی جاگتی زندگی کو سامانی کی بھینٹ چڑھ جانے سے بچانے کے لیے یہ اقدام کیوں کیے جاتے ہیں؟

تربیت یہ نہیں کہ دوسرے نگرانی کریں۔ تربیت یہ ہے کہ اپنی نگرانی انسان خود کرے۔

ابھی ہم نے اپنی عورت کو یہ اعتماد نہیں دیا۔ اس لیے جب چاہیں اسے گھٹی گھولی دے دیتے ہیں۔ اس کا حوصلہ توڑ دیتے ہیں۔ اس کا اعتماد چھین لیتے ہیں۔

دوسروں کی دیکھا دیکھی ہم اپنی عورت کو پڑھا رہے ہیں۔ اکیلا نکلنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس کی گرد صاف ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ اور اپنے شعور کی گرد پر دھیان نہیں۔

جب عورت پر اس طرح کی الزام تراشی ہوتی ہے۔ ہم پہلی فرصت میں یقین کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ ہم نے ابھی تک اس حقیقت کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ یہ بھی اس کائنات کا باشعور اور اجتماعی اہل جز ہے۔

یہ داخلی زندگی کا عذاب ہے۔ حویلی میں ابھی پر اعتماد، اعلا تعلیم یافتہ عورت کی جگہ نہیں بنی۔ اور اس وقت تک نہیں بنے گی جب تک ادھر کے مرد یہ امر تسلیم نہیں کر لیتے کہ باشعور عورت عام عورت سے زیادہ مضبوط اور صاحب چادر ہوتی ہے۔

یہ دہری سوچ کا عذاب ہے۔ اندر کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ وہ گہرا تجزیہ کرتے کرتے اپنے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔

کتنا ہی اپنی جگہ حقیقت اپنی جگہ۔ بابا صاحب نے انہیں نے عذاب کا راستہ دکھایا تھا۔ اتنی مشکل بات نہایت آسانی سے کہہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سنی ہوئی بات کس طرح ذہن سے کھرچ ڈالیں۔ اور پرسکون ہو جائیں۔ دل تو ان کی طاقت سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس بات پر پچھتا رہے تھے کہ ایک عمر دیار غیر میں بسر کرنے کے بعد یہاں آئے کیوں؟

اذیت مسلسل اور بے حد تھی۔ کوئی ایسا حل نہیں تھا جس سے حالات معمولات پر آنے کا امکان روشن ہو۔

وہ اب سو نہیں سکتے تھے۔ کبھی کتابیں الٹنے لگتے۔ کبھی دریچے میں آن کھڑے ہوتے۔

"توبہ ہے۔ رسوائی ہی رسوائی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس رسوائی کو برداشت کر لیں۔"

اماں جی نے بجھتے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار کہا تھا۔

"زینب کی ماں۔ وہ ابھی کم عمر ہے۔ اللہ نے شکل اچھی دی ہے۔ باپ کے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ اگر وہ یہاں سے چلی جاتی ہے تو اس کے ماں باپ ہر صورت اس کا نکاح کریں گے۔ ہمارے ہاں جو عورت آتی ہے پھر وہ غیر خاندان میں نہیں

جاتی ہے۔ اگر وہ بچوں کو ساتھ لے گئیں تو ہمارے بچے دوسرا باپ پا لیں گے۔ بہتر نہیں۔ ہم اپنے بچوں کو در بدر نہیں ہونے دیں گے۔" ان کا انداز حتمی تھا۔

"دنیا کیا کہے گی۔ ایک بھائی نے طلاق دی دوسرے نے نکاح کر لیا۔ اس مشکل کو سمجھیں۔"

اماں جی کی آواز کمزور اور لرزتی تھی۔

"اب کیا مصلحتوں کی خاطر اپنی اولاد کو سونپ دیں؟ کسی غیر مرد کے حوالے کر دیں۔"

"میں یہ الٹ بھری زندگی نہیں جی سکتی خان صاحب۔ دعا کریں اللہ میرے پردے ڈھک لے۔" وہ رو دی تھیں۔

"آپ صورت حال سمجھنے کی کوشش کریں زینب کی ماں۔ بہ نازک، بہت مشکل وقت ہے۔"

"بڑی شرم کی بات ہے خان صاحب۔ تیمور بھی اس پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "یا اللہ کس مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے ہمیں۔"

"یہ کڑا وقت ہے اس میں بڑا حوصلہ چاہیے۔ آپ عورتیں بہت جلد بھولے دل کی ہوتی ہو۔ دور تک نہیں دیکھتیں۔ دور تک کی سوچو زینب کی ماں۔" دادا علی خان نے نرمی سے سمجھایا۔

"نکاح کے بعد ہم اسے سرائے بھیج دیں گے۔ یہاں رکھیں گے۔ آپ اس تک ہماری بات پہنچاؤ۔ اسے ادھر تک سمجھاؤ۔ ساتھ میں یہ بتاؤ کہ ہم اسے اس صورت میں یہاں سے جانے دیں گے جب وہ دوسرا نکاح نہ کرنے کا وعدہ کرے۔ ہر دو صورتوں میں ہم اسے بچے ساتھ لے جانے نہیں دیں گے۔ بلکہ اسے یقین دلاؤ کہ ہم اس کے ہمدرد ہیں۔ ہمارے بیٹے نے اسے جو زخم لگایا ہے۔ ہم اس پر مرہم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسے اپنا سمجھتے ہیں۔ اس کے تحفظ اور بہتری کے لیے یہ سب کرنا چاہتے ہیں۔" وہ مزید گویا ہوئے۔

"میں تو اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہوں۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسے ایک نظر میں یاد رکھنے کے لیے پسند کیا تھا۔ میں کب چاہتی ہوں کہ وہ یہاں سے جائے۔ آپ اسے دیکھیں گے تو پہچان نہیں سکتے۔ میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ میں جاتی ہوں تو سوتی بن جاتی ہے۔ میرے دکھ کا اسے یقین نہیں آ سکتا۔ نہ وہ حساب کر سکتی ہے۔ جب وہ مجھے دیکھ کر منہ موڑتی ہے تو برچھی سی دل پر پڑتی ہے۔"

اماں جی کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔

ایک لمحے کو دادا علی خان بھی گم صم سے نظر آئے۔

"اگر آپ سے یہ کام نہیں ہو سکتا تو زینب یا عالم تاب سے کہو۔ وہ بات کریں گی۔"

انہوں نے دوسرا حل بتا دیا۔

"بے کار ہے۔ وہ نہیں مانے گی۔" اماں جی آنکھیں پونچھنے لگیں۔

"ہم منوا لیں گے۔ ہم کوئی کھلونا نہیں ہیں کہ بیٹے بہوئیں ہم سے کھیلیں۔ جیسے سوچا ہے یہی ہونا چاہیے۔ جو بیٹا ہم سے انحراف کرے اور جا کر پھر چھوڑ دے۔ بہت ہو چکا۔ یا تو یہ ہو جو ہم نے سوچا ورنہ کوئی ہم سے تعلق نہ رکھے۔"

خان وِلا اور علی خان۔ اب مزید ضبط سے کام نہ لے سکے اور اپنی حاکمانہ وضع پر واپس آ گئے۔ نازک سی اماں جی لرز کر رہ گئیں۔

"اس حادثے سے پہلے تک کی ہماری نرمی مصلحت تھی اور مصلحت یہی تھی کہ یہ حادثہ نہ ہو۔ مگر حادثہ ہو چکا۔ جناب آپ احکامات کی تعمیل کرائیے۔ بس۔"

خان وِلا اور علی خان اس وقت پوری طرح جلال میں آ گئے تھے۔ اماں جی کھڑی ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات پہنچا دیتی ہوں۔"

"پہلے اونچ نیچ اور مصلحت بتاؤ۔ نہ مانے تو صرف ہمارا حکم سنا دو۔ جس کو ہمارے فیصلے سے اختلاف ہو وہ اپنی [illegible] دے۔ اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔"

"گنجائش رکھ کر بات کیجیے خان صاحب۔" اماں جی لرز کر بولیں۔

"ختم ہو گئی گنجائش۔ الفتنة الا كبر من القتال (فتنہ قتل سے بڑا جرم ہے) یہ اللہ کا فرمان ہے۔ ہم ایک عذاب سے گزر رہے ہیں۔ حادثہ بڑا ہے۔ بڑے حوصلے سے بڑے فیصلے کرنے ہیں یہ کل کے بچوں کی بات نہیں اب آپ جائیے اور جیسا ہم نے کہا ہے ویسا کرو۔"

دونوں نزدیک سرکا کر کوئی نمبر ملانے لگے۔

اماں جی چل پڑیں۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

رئیسہ بیگم کی تو ہمت نہیں پڑی تھی نازو کے پاس جانے کی کہ وہ یاور کی بہن تھیں اور ڈرتی تھیں کہ بھائی کی طرف سے اس طرف جو غبار ہے وہ ان پر نہ ڈال دیا جائے۔ اور کہیں نہ رہ جائے۔

لہٰذا عالم تاب تنہا کمرے میں آئی تھیں۔

نازو شانے کو کاٹ میں اتار رہی تھی۔ الجھی ہوئی چوٹی سے ظاہر تھا کہ کئی دنوں سے سر میں کنگھی نہیں ہوئی۔

اس نے دروازہ کھلنے کی آواز پر گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔ عالم تاب چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔

"آپ کو بھی بلوانے ہی والی تھی بھابی بیگم!" وہ بے تاثر آواز میں کہتی ہوئی ان کی طرف پلٹی عالم تاب کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کی سمت دیکھنے لگیں۔

"محسوس تو یہی ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے میری بدبختی کی خبر میرے ممی پاپا کو نہیں پہنچائی۔ اگر ایسا ہے تو بہت مہربانی آپ سب کی۔ یہ اندازہ مجھے اس لیے ہو رہا ہے کہ اگر انہیں اطلاع ہو گئی ہوتی تو وہ بھی آ پہنچے ہوتے۔

دنیا میں شادیاں بھی ہوتی ہیں علیحدگیاں بھی ہو جاتی ہیں مگر یاور نے میرے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا ہے۔ جس طرح

مجھے میری نظروں میں گرایا ہے وہ میں اپنے ماں باپ کو نہیں بتا سکتی کیسے بتاؤں انہیں کہ جس شخص کے گن گاتے آپ لوگ نہیں تھکتے اتنا سفاک ہے۔ اتنا خود غرض اس قدر ظالم۔

ایک حرافہ کی اولاد کے لیے اتنا اعتبار و یقین۔ بھابی بیگم میرے اندر ایک آگ دہک رہی ہے۔ ایک بے غیرتی کی حالت ہے۔ وہ جو یہ بہتان لگتا ہے تو آسمان سے گواہی آ جاتی ہے۔ اور آسمان سے اس قسم کا ظلم روکنے کے لیے ساتھ ہی قانون بھی آتا ہے۔ ہم جیسی کمزور اور بے سہارا عورتوں کے لیے ہوتا ہے۔ مگر کون لیتا ہے اس قانون سے کام۔ وہ کتاب جزدانوں میں بند پڑی ہے۔ میری چادر اوڑھا ہے مجھ پر یاور نے ایسا بھیانک انتقام لیا ہوں۔ اس ذلت کا کیچڑ پھینک کر گئے ہیں کہ یہ بچی بھی تمہاری نہیں ہے۔ اس مفت کی ذلت میں یاور کے نام کے ہم بھی دھکے ہیں۔ وہ ایسے ہی دہرے عذاب سے گزرے جس سے میں گزر رہی ہوں۔ بھابی بیگم مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔"

وہ عالم تاب کے شانے سے لگ کر سسک پڑی۔

عالم تاب کی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔ وہ اس کی پشت سہلانے لگیں۔

"بھابی بیگم! میری ماں کا دل بہت نازک ہے۔ میرا باپ بہت حساس ہے۔ وہ جیتے جی مر جائیں گے۔ بتائیں میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ تیمور نے اسے گولی کیوں مار دی؟ اسے اتنی آسان موت کیوں دی؟ میں اسے ایڑیاں رگڑتے دیکھنا چاہتی تھی۔ موت کی دعائیں مانگتے دیکھنا چاہتی تھی۔"

عالم تاب نے اس کی پیشانی چومی۔

"مجھے بابا صاحب نے تمہارے پاس بھیجا ہے نازو جو میں کہہ رہی ہوں بہت صبر اور حوصلے سے سننا۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہاں سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"یا اللہ۔ پھر کوئی امتحان؟" وہ عالم تاب سے الگ ہو کر خوفزدہ انداز میں ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"نہیں کوئی امتحان نہیں۔ بابا صاحب نے بچوں کے مفادات سامنے رکھ کر ایک فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا نکاح۔"

"بھابی بیگم! حد ہو گئی۔ اگر یہ نکاح حلالہ کے چکر میں کرنے کا کوئی پروگرام ہے تو سن لیجیے۔ یاور قیامت تک کے لیے میرے دل سے نکل چکے ہیں۔ آپ لوگ کچھ کر لیں۔ میں زندگی کے کسی موڑ پر ان سے کسی مصلحت کے نام پر کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گی۔ اگر مجھ پر دوبارہ کوئی شب ابتلا کی گئی تو میں خودکشی کر لوں گی۔ میں شرفا کی اولاد ہوں۔ بازار کا مال نہیں ہوں۔"

"بات تو پوری سن لو۔" عالم تاب نے اس کا ہاتھ تھام کر ملامت سے کہا۔

"اگر اس سے ہٹ کر ہے تو سنائیے اگر اسی طرح کی کوئی منصوبہ بندی ہے تو مجھے کچھ نہیں سننا۔"

وہ ضدی انداز میں بولی۔

عالم تاب نے اس کے زرد اور ویران چہرے کو غور سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

"یاور بہت کٹر اور قطعی قسم کا انسان ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کبھی اپنے فیصلے پر پچھتائے۔ لہٰذا اس طرح کی بات نہ ہم نے سوچی نہ تم سوچو۔"

نازنین نے اپنی شفاف و حسین آنکھیں حیرت سے ان کے چہرے پر جما دیں۔ جیسے کہہ رہی ہو کیوں؟

"بابا صاحب کا خیال ہے اگر تم اپنے والدین کے پاس چلی گئیں تو وہ ضرور تمہاری دوسری شادی کر دیں گے۔ ہمارے ہاں ہمارے وارثوں کی ماں غیر خاندان میں نہیں جاتی۔ خواہ وہ بیوہ ہو یا طلاق یافتہ۔ جو عورت جاگیر میں شامل ہو جاتی ہے پھر اس پر کسی اور خاندان کا حق نہیں رہتا۔

تیمور کی بیوی انگریز ہے وہ وہیں رہے گی۔ تیمور دوسری بیوی یہاں رکھ سکتا ہے۔"

بات بہت مشکل تھی اور بڑی مشکل سے کہی گئی تھی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

عالم تاب تو جیسے دھماکہ کر کے اپنی جگہ سہم کر رہ گئی تھیں۔ ان کی جھکی نظروں کو اضطراب کا عالم تھا۔ انہیں طویل ہوتی خاموشی سے خوف سا آنے لگا۔ مگر آواز پھر بھی نہ نکلی۔ انہیں اندازہ تھا کہ وہ کیا کہہ چکی ہیں کہ نسلوں کے جنت اس طوفان کی زد میں لرز رہے ہیں۔

نازنین نے نہ نظریں اٹھائیں نہ سر۔ اپنی ہتھیلیوں کو غور سے دیکھتی رہی۔

"آپ کو اندازہ ہے بھابی بیگم! آپ کیا کہہ گئی ہیں؟" بالآخر خاموشی ٹوٹ گئی۔ نازنین کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

عالم تاب جواب میں خاموش رہیں۔

ایک مرتبہ پھر دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔

"ابھی مجھے کچھ طے کرنا ہے۔ آپ لوگ انتظار کریں۔" اس نے بہت سکون سے کہا۔

عالم تاب نے کمال حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ ان کا تو خیال تھا کہ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ وہ جانے کیا کیا بولے گی۔ لحاظ ادب کی ہر منزل طے کر جائے گی مگر اس کے سکون نے تو انہیں پریشان کر دیا وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جیسے کچھ ہوا

نہیں تو ہو جانے کا ڈر رہو۔ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ بڑی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

وہ کئی بار روشانے کو گود میں اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی مگر پھر دوبارہ واپس آ گئی۔ ایسی اضطراری کیفیت تھی جس میں انسان کو خود اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

چند لمحوں بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور روشانے کو کاٹ میں لٹا کر ہال کی سمت آئی اور دور دور سے اندر جھانکا۔ کوئی ملازمہ نظر نہیں آئی۔ وہ وہاں سے دالان کی طرف بڑھی وہاں روپا دیوی فرش دھوتی نظر آ گئی۔

"روپا۔۔!" اس نے اپنی تمام منتشر قوت کو اکٹھا کر کے آواز دی۔ اپنی دھن میں مگن روپا دیوی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر نازنین کو دیکھ کر جھاڑو پھینک کر دوڑی آئی۔ کتنے عرصے بعد اس نے نازنین کو پہلے جیسی بے تکلف حالت میں دیکھا تھا۔

"ہاں چھوٹی دلہن جی۔؟"

"تیمور خان سے کہنا، چھوٹی دلہن نے بلایا ہے۔ اور یہ بھی کہنا جب بھی آ جائیں۔ دن میں آئیں رات یا شام کے وقت آنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ روپا دیوی کے تاثرات دیکھنے کے لیے رکی نہیں بلکہ یہ کہتے ہی واپس پلٹ گئی۔ ابھی وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر وارڈ روب کھول کر کھڑی ہی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"ہوں۔ کون ہے آ جاؤ۔" وہ اسی مصروف انداز میں گویا ہوئی تھی اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

اس کا خیال تھا۔ روپا دیوی کوئی جوابی پیغام لے کر آئی ہے۔ مگر جب آنے والے نے دیر تک کچھ نہ کہا تو وہ ادھر پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوئی۔

مگر ایک دم ہی بدحواس ہو گئی۔ جانے سارے اعتماد و اعتبار کہاں گم ہو گئے تھے۔

تیمور علی خان پشت پر ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ نازنین کی کمزوری غالباً ان پر عیاں ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم۔!" انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پہل کی۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھیے۔" اس نے دوپٹہ درست کیا۔

تیمور علی خان بڑے اعتماد سے آگے بڑھے۔ کاٹ میں لیٹی روشانے کے رخسار چھو کر پیار کیا اور صوفے پر بیٹھ گئے۔

نازنین جیسے کسی لمحے میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک بے خبری کی کیفیت تھی۔

"آپ بیٹھیے ناں۔ بھابھا۔!" وہ بولتے بولتے ایک دم رک گئے۔ نازنین جیسے گہری نیند سے جاگی اور اپنے پلنگ پر ٹک گئی۔

"آپ نے یاد فرمایا تھا۔" وہ اس کی خاموشی سے الجھنے لگے۔

"جی۔ سنا ہے۔ آپ کو بھی یاور علی خان سے اتنی ہی شکایتیں ہیں جتنی ہمیں ہیں۔ سو آپ تو دوڑے لپکے آئے ہیں۔"

اس مرتبہ اس کا انداز پر اعتماد تھا۔

"ہمیں ان کے ذکر میں بھی حصہ نہیں لینا۔" تیمور علی خان کا انداز قطعی تھا۔

"بے شک ان کے ذکر کے لیے نہیں ہو رہی۔ بات یہ ہے اس نام سے گزرے بغیر بات آگے بھی تو نہیں بڑھ سکتی۔"

اس نے نگاہ اٹھا کر تیمور علی خان کو دیکھا۔ ان کی نظریں انداز پر ٹکی تھیں۔ وہ چند لمحے ان کی سمت دیکھتی رہی۔ وہ اس کی نظریں محسوس کر رہے تھے اس لیے نظر اٹھا نہیں رہے تھے کہ نگاہ ملانے کا مرحلہ بہت اذیت ناک تھا۔

"بابا صاحب نے ایک حل دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے؟" نازنین نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ تیمور علی خان گویا سناٹے میں رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس موضوع پر براہ راست بات کرے گی۔ وہ لب بستہ بیٹھے رہ گئے۔

"میرے خیال میں بہت ہی مناسب حل نکالا ہے۔ انہوں نے اس کرائسس کا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ عام سے انداز میں بولی۔

"ہمارا خیال ہے اب تو حویلی میں دور دور تک مذاق کا ماحول نہیں ہے۔" ان کا انداز اس مرتبہ قدرے تیکھا اور برا ماننے والا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ نکاح شادی کی باتیں مذاق میں صرف پاگل ہی کرتے ہوں گے۔ میرے اس عظیم نقصان میں آپ کا برابر کا حصہ ہے۔ میری زندگی کے اگلے مرحلے آپ کے نام آپ کی ذات کے ذکر کے بغیر کیسے طے ہو سکتے ہیں؟" اس کے لہجے میں طوفان کے آثار جھلکنے لگے۔

"لیکن ہم قسم کھا سکتے ہیں کہ ہم نے کبھی آپ کو نقصان پہنچانے کا تصور تک نہیں کیا نہ کر سکتے ہیں۔"

وہ یکدم اجنبی محسوس ہونے لگے۔

"تو پھر میرے بارے میں بھی قسم کھائیے کہ میں نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کا نہ کبھی پلان بنایا نہ عملاً کچھ کیا۔" وہ جیسے پھٹ پڑی۔

تیمور علی خان یکدم خاموش سے ہو کر رہ گئے۔

"پھر۔ اس مسئلے کا صرف یہی تو حل نہیں ہے۔"

"مسئلہ تو کسی کے لیے ہے ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہے ہی صرف میرا۔ حل بھی مجھے چاہیے۔ حویلی کے ہر فرد کی اپنی اپنی ایک محفوظ اور مگن زندگی ہے۔ کچھ عرصہ میرے نقصان پر سب ماتم کر کے پھر مگن ہو جائیں گے۔ آپ لندن تشریف لے جائیں گے وہاں آپ کی اپنی ایک الگ زندگی شروع ہو جائے گی۔ میں حویلی سے صرف راشن پانی پاتی رہوں گی اور گاہے بگاہے میرے ذکر خیر سے محفلوں میں رونق ہو جایا کرے گی۔ یہ ہے میری باقی ماندہ زندگی کا نقشہ۔"

وہ تلخی سے ان کی بات کاٹ کر ایک تسلسل سے بولی۔

"ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کی زندگی بھی نئے موڑ سے شروع ہو سکتی ہے۔ اب سے پہلے ایسا بہت ہوا ہے۔ یہ نئے

زمین کا کیا واقعہ نہیں ہے۔ دوسری شادی کسی اور سے آپ کی بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں ہو سکتی ہے۔ مجھے طلاق ہوئی ہے اور عورتوں کو طلاق ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس طلاق کے پیچھے جو وجہ ہے آپ کی سوسائٹی کی نظر میں اس قدر قبیح فعل ہے کہ بہت وسعت سے مجھے اپنانے والا بھی مجھ سے احسان کی طرح پیش آتا رہے گا۔

میں کسی ایسے شخص کی رفاقت برداشت نہیں کر سکتی جو رات کو میرے ہاتھ دم جانے پر بھی چونک اٹھے۔ میں کسی کے ساتھ مشکوک زندگی گزارنے سے بہتر یہ سمجھتی ہوں کہ اپنے بچوں کو لے کر ایسی گمنامی کی زندگی میں گم ہو جاؤں کہ میرا رونے والوں میں کوئی میرا جاننے والا نہ ہو۔"

بولتے بولتے نازنین کی آواز بھرا گئی۔

"صرف اور صرف آپ ہی واحد انسان ہیں۔ جس کی نگاہ میں میری اصلیت روشن ہے اور مجھے یہی کہنا ہے، یا تو میری اتنی مدد کیجئے کہ مجھے حویلی سے بچوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نکل جانے دیجئے یا پھر..."

وہ خاموش ہو کر آنسو پینے لگی۔

"یوں کہ ادھر تو قریب کی شناسائیاں نہیں ہیں، ادھر تو صرف آپ کے والدین ہیں اور والدین تو..."

"جی ہاں۔ وہاں میرے والدین ہیں۔ جن کی نگاہ میں یاور کا قبیح اقدام جو رہے گا۔ کہ وہ بھی مجھ میں کچھ ڈھونڈتے رہیں گے۔ صرف ذلت کی شکل بدلے ذلت عزت میں نہیں بدلے گی۔ وہ چار روز کی بات ہو تو انسان ہنس کے دکھ سے بھی گزر جائے۔ میں اسے زندگی بے قصور ہو کر کیوں مجرموں کی طرح شرمندگی کی زندگی گزاروں؟"

وہ پھر رونے لگی۔

"بالفرض ایسا ہو جائے تو کیا زندگی میں کبھی آپ کو افسوس نہیں ہوگا کہ ہمارے ساتھ آپ نے بہت زیادتی کی ہے؟" تیمور علی خان نے بہت شکستہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔ اس لیے کہ آپ نے اپنے بھائی کو مجھے بغیر اپنی زندگی کے اصول کیوں بنائے، دکھ اٹھا اور عادت جانے گا تو وزن کم ہو جائے گا۔ میرے دل پر بددعاؤں کا کام پڑ جائے گا۔ بددعا میرے منہ سے نہیں دی جاتی اور کھا دل خود ایک بددعا کی طرح گزر گیا ہوتا ہے۔"

وہ بدستور رو رہی تھی۔ تیمور علی خان گم صم بیٹھے تھے۔

(کتنا خوفناک موڑ ہے زندگی کا۔ سارے بے رحم فیصلوں کا رخ ہماری طرف ہے۔)

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہمارا خیال ہے آپ کی بات ہم تک پہنچ گئی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

نازنین نے سر نہیں اٹھایا بس آنچل سے آنکھیں پونچھتی رہی۔

تیمور علی خان بہت آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھے تھے، جیسے وہ کوئی تیسری تجویز دینے کے لیے ان کو آواز دے

گی۔

رات کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ کھانا کھانے کا سلسلہ ابھی ابھی تمام ہوا تھا۔ تیمور علی خان باپ کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگئے تھے۔ بابا صاحب نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں ان کی طرف دیکھا تھا اور پھر ٹہلتے ہوئے کھڑکی کی ایک طرف گئے تھے۔

تایا پھر اپنے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔

یہ بھی اضطراری حرکت کا ایک اشارہ ہوا کرتا ہے کہ کوئی انسان بے چین ہے تو بے ترتیب حرکات و سکنات کرتا پایا جاتا ہے۔

تیمور علی خان بیٹے پر ہاتھ لپیٹے اس بات کے منتظر تھے کہ کب ان کو بیٹھنے کا حکم ملے۔

"بیٹھ جائیے کھڑے کیوں ہو۔" بالآخر انہوں نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟ اتنا تو ہم بھی اندازہ کر سکتے تھے کہ تم ہمیں کس امتحان میں ڈال چکے ہیں وہ کوئی چھوٹا امتحان نہیں ہے۔ جس میں حواس بھی گم ہو سکتے ہیں اور الفاظ بھی اس لیے بات کی ابتدا میں حوصلہ بڑھانا بھی انہی کے بیچ کا کام ہے۔"

"جی"

"ہوں تو پھر کہو جو بھی کہو گے ہم بہت غور سے سنیں گے۔ تمہارے سامنے تو یوں بھی ہم بہت کمزور پڑ جاتے ہیں۔ تم ہمیں اپنی سب اولادوں میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ یہ بات ہمارے بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ کیوں؟ تمہاری ماں کہتی ہیں شاید اس لیے کہ تم سب سے چھوٹے ہو۔ شاید وہ ٹھیک کہتی ہوں۔" وہ یوں مخاطب تھے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔

"بھابی نے بلایا تھا ہمیں۔"

"عالم آپ نے؟"

"جی نہیں۔ نازنین بھابی نے۔"

"اب وہ تمہاری بھابی نہیں ہے۔" بابا صاحب گاؤ تکیے سے پشت لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

"یہ رشتہ بہت مضبوط ہو کر منقطع ہوا ہے۔ وہ ہمارے بھائی کے بچوں کی ماں ہیں۔ بچے ہمارے بھتیجے بھتیجیاں ہیں ہمارا خون ہیں اور وہ ان کی ماں ہیں۔ اس لیے۔"

"خیر۔ چھوڑو تم اس بات کو۔ یہ کہو اس نے کیوں بلایا تھا؟"

"آپ کی بات ان تک پہنچ گئی ہے" وہ نظریں جھکا کر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"انہوں نے تو مجھے حیران بلکہ پریشان کر دیا ہے"

بابا صاحب نے حیرت آمیز انداز میں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

تیمور علی خان اس طرح خاموش ہو گئے جیسے الفاظ ترتیب دے رہے ہوں۔

"ہم آپ کی بات سن کر پریشان ضرور ہوئے تھے مگر اس قدر نہیں جتنے اب ہیں۔ ہمارا خیال تھا وہ آپ کے اس پروپوزل کو پہلی فرصت میں مسترد کر دیں گی اور معاملہ از خود رفع دفع ہو جائے گا۔ ہم آپ سے غیر ضروری بحث نہیں کرنے ... مگر۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔

بابا صاحب اسی طرح خاموش تھے۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر گویا تیمور علی خان کو بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

"انہوں نے آپ کے پروپوزل سے اتفاق کر لیا ہے۔ اور جو وجوہات بتائی ہیں ہم انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارا خیال ہے وہ باپ اور بھائی سے انتقام لینا چاہتی ہیں، اسی لیے انہوں نے یہ پروپوزل منظور کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔" انہوں نے اپنی بات تمام کی۔

"ہوں۔ وجوہات کیا بتائی ہیں؟ یہ جان کر ہی ہم تم سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ تمہارا خیال درست ہے۔"

انہوں نے کروٹ بدل کر مکمل طور پر ان کی طرف رخ کر لیا۔

تیمور علی خان نے اسی انداز میں بلکہ مزید آہستہ آواز میں نازنین کی کہی ہوئی ایک ایک بات دہرا دی۔

"ہوں۔!" بابا صاحب نے سوچنے کے انداز میں ہنکارا بھرا۔

"ہم تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کرتے، کوئی بھی بات ہو ہمیشہ کے لیے دفن نہیں ہوتی۔ کبھی بھی سامنے آ سکتی ہے جو امکانات اس نے ظاہر کیے ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"اب تمہارا کیا خیال ہے؟ اسے حویلی سے نکلنے میں مدد دو گے یا حویلی میں رہنے کا بندوبست کرو گے؟"

انہوں نے بہت رسانیت سے سوال کیا تھا۔

"بابا صاحب ایسا اتنا آسان نہیں ہے۔ پلیز، ہمارا خیال کیجئے۔"

"تم بھی ہماری اولاد ہو اور جواد اور روشانے بھی ہمارا خون ہیں ہمیں ان کا بھی خیال کرنا ہے۔ ہم یا نازنین تمہیں اس بات پر مجبور تو نہیں کر رہے کہ تم عائشہ (لیزا) کو چھوڑ دو۔ بلکہ نوے فیصد تم اس کے رہو اور دس فیصد نازنین کے۔ بچوں کی خاطر، ہماری خاطر۔ ہم تو تمہیں یہ بھی نہیں کہہ رہے کہ نازیا بچوں کے خرچ حساب کتاب تک تم کرو ہم تمہیں اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش کرتے ہیں۔ اپنا ذہن کے سوچ تیمور۔"

"لیزا کسی صورت میں نہیں مانے گی۔"

"ہم سمجھ لیں گے اسے" بابا صاحب نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

"آپ اسے نہیں سمجھتے، ہم بتا رہے ہیں ناں آپ کو وہ اور طرح کی لڑکی نہیں ہے۔ اس معاملے میں وہ انتہائی جذباتی ہے۔ وہ خودکشی کر سکتی ہے۔" انہوں نے گویا باپ کو ہولایا۔

بابا صاحب نے قدرے پریشانی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تو پھر اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ اس کو چھوڑنے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔" انہوں نے گویا

یہ حکم/فیصلہ صادر کیا تھا۔

تیمور علی خان ساکت سے ہو کر باپ کی شکل دیکھنے لگے۔

نہ جانے کیوں آن واحد میں لیزا ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ہمارا نقصان ہوا ہے تیمور خان، انہیں انگاروں میں پھینک کر دوسرے کی زندگی میں پھول کھلانے تھے؟"

تیمور علی خان جیسے سوتے سے یکدم جاگ گئے۔

"وہ ہماری بچی کہاں ہے بابا صاحب؟"

"آپ کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ مری نہیں ہے کہ ہم سے اس کے موضوع پر کوئی بات کرنے سے پہلے سے ہمارا حق جتا رہے ہو۔" ان کے لہجے سے ہمارا اشتعال جھلکنے لگی۔

"مری نہیں ہے زندہ ہے۔ اپنی طرف سے تو تم نے بھی ہمیں مروا کر آزمائش میں ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

تیمور علی خان خاموش رہے۔

"یہ تو بہت لیٹ ہوا ہے بابا صاحب ہماری بچی کوئی اور ہوتی تو وہ بہت پہلے اس دنیا سے جا چکی ہوتی۔ اس کے دل کی نہیں ہوئی تھی تو کیا ہوا۔ اس کے ساتھ بھلائی تو ہوئی تھی۔ ورنہ اس کی حیثیت تو یہ تھی کہ اسے کسی کی، جو کہ ہمارا ساس کے پلے باندھا جاتا ہم نے جو کیا وہ بیسٹ پاسیبل ایکشن ہے۔"

تیمور علی خان نے خود ہی خاموشی کو توڑ کر بہت اعتماد اور بے نیازی سے جواب دیا۔

"لیکن جب کچھ ہو چکا ہوتا ہے تو نقصانات پر غور کر کے وقت ضائع کرنا حماقت ہوتی ہے۔ نقصان کا تو ازالہ کیا جاتا ہے۔"

بابا صاحب زندگی میں بہت اہم اور بڑے فیصلے کیے تھے مگر جس کی منزل عبور کر چکی تھی وہ اتنی آسانی سے جوان خون سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔

"ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ فی الحال کوئی حکم صادر نہ کریں اور کچھ غور کریں۔ پلیز۔" انہوں نے زچ ہو کر استدعا کا انداز اختیار کیا۔

"ہوں۔ ہم غور کر چکے ہیں۔ جب غور زیادہ ہو جاتا ہے تو پھر کچھ نہیں ہوتا۔ ہم تمہیں مشورہ دیتے ہیں کہ سکون سے تھوڑا غور کرو اور خاندان کو سامنے رکھ کر غور کرو، عائشہ کو نہیں۔ وہ ذاتی اجتماعی مفادات کو اہم بتاتی ہے۔ اب تم جاؤ آرام کرو۔ ہم بہت تھک چکے ہیں۔ البتہ تھوڑا سکون محسوس کر رہے ہیں۔ کہ تم نے ہمارا راستہ آسان کر دیا ہے۔"

وہ دوبارہ سیدھے ہو کر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔

تیمور علی خان بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جب فطری محبت میں بھی اتنا دم نہیں کہ وہ فیصلہ اپنے حق میں کرا سکے تو پھر محبت کے ہونے اور نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

انہوں نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

"اچھا" اماں جی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ "میری تو نیندیں اڑی ہوئی تھیں کہ بچوں کو لے کر وہ بھی چلی جائے گی وہ بھی غیر ملک، بچوں کو ترستی ہوئی مر جاؤں گی۔"

"مگر یاور۔؟" ان کی آواز بھرا گئی۔ "اس کی صورت کو تک دیکھوں گی، بہت زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔"

"اس نے اپنے ساتھ خود زیادتی کی ہے۔ ہم میں سے کسی پر اعتبار کرتا کچھ کہتا سنتا تو بات سنبھل بھی سکتی تھی۔" بابا صاحب نے حقہ گڑگڑایا۔

"اگر یہ سب ہو جاتا ہے تو وہ۔"

"اس نے اپنی اولاد کی قدر نہیں کی۔ وہ بھی نہیں کرنا پڑ رہی ہے۔ مگر خیر آئے گا اسے ایک دن ہوش مگر افسوس وہ کرتا رہ جائے گا۔"

بابا صاحب نے واقعی بہت تاسف سے کہا۔

"ایسا تو نہیں بات اور بگڑ جائے؟" وہ پھر خدشات میں گھر گئیں۔

"اب بگڑنے کو کچھ نہیں بچا جب ہی تو بگاڑ پر سمجھوتا کر رہے ہیں۔"

انہوں نے پائپ منہ میں سے ہٹا کر بہت بردباری اور متانت سے جواب دیا۔

"پھر تو شاید وہ کبھی گھر آئے۔" اماں جی کو بیٹا یاد آیا تو وہ سب کچھ بھول بیٹھیں۔

"آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ اس کا بھی بندوبست کریں گے کہ وہ بے دھڑک یہاں آنے لگے۔ آپ بے کار پریشان نہیں ہوا کریں۔ فی الحال تو مسئلہ حل نہیں ہوا۔ تیمور راضی نہیں ہے۔ وہ ایک مرتبہ باغیانہ فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کی مجبوری بھی ہے۔ اب صرف آپ ہی اس سے بات منوا سکتی ہو۔ یہی سمجھانے کے لیے آپ کو بلایا ہے۔"

انہوں نے اماں جی کی طرف بہت تجزیاتی نگاہ سے دیکھا۔

"میں کمزور سی عورت۔ میری کون سنے گا۔؟" وہ شکستہ سے انداز میں بولیں۔

"انسان ہار کا اندیشہ کر کے میدان میں اترے تو ضرور ہارتا ہے۔ آپ کے پاس محبت کی وہ طاقت ہے جسے آپ کمزوری کہہ رہی ہو۔" بابا صاحب نے نکتہ سمجھایا۔

"اب تک تو یہ طاقت میرے کسی کام نہ آئی۔ زندہ ناں تو ہی کو دیکھیں۔ کیا خوب انعام دیا ہے میری محبت کا۔" ان کی آنکھوں میں اشک چمکنے لگے "آپ مجھے پتہ تو دیں کہ وہ ہے کہاں۔"

"اب کوئی ہم سے اس کے موضوع پر گفتگو نہ کرے۔" بابا صاحب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ "سب کو ہم ہے آپ سے درخواست ہے۔" بابا صاحب کو اماں جی کی سہمی ہوئی صورت پر نظر ڈال کر لہجہ نرم کرنا پڑا۔

"زندہ تو ہے ناں؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولیں۔

"زندہ نہ ہوتی تو ہم یہاں نہیں اسلام آباد میں ہوتے۔ آپ کو تاکید ہے کسی کو پتا نہیں ہے۔ حویلی کے آس پاس بہت دنوں سے باہر کے لوگ نظر آتے رہتے ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ وہ دیہات کے بندے نہیں ہیں۔ اگر وہ ہمیں پھنسانے کے لیے کوئی چال چل رہے ہیں تو ہم اس کا بھی بندوبست کر چکے ہیں۔ اور یہ بندوبست اس وقت قائم رہے گا کہ زندہ ہو۔ امید ہے آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی۔"

"کیا وہ اسے اٹھانے کی فکر کرتے ہیں۔" اماں جی دہل کر رہ گئیں۔

"ہمارا خیال ہے کہ اس کو بیٹی کی چوری کی خبر مل گئی ہے کیونکہ جب تک وہ یہاں واپس نہیں آئی تھی۔ اس طرح کے سلسلے […] کی خبر بھی نہیں آئی تھی۔ اس طرح کی عورتوں کی بہت پہنچ ہوتی ہے۔ جن کے پاس بہت پیسہ ہوتا ہے وہی ان عورتوں کو جانتے ہیں یا جو ان عورتوں کو […] زر و دولت کنٹرول کرتے ہیں۔"

"بہرحال یہ سب آپ کے کھیڑے نہیں ہیں بس آپ تو ہم پر مہربانی کریں۔ بیٹے کو کسی طرح راضی کریں ہم ٹھیک سے کوئی کام کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر کام کمزور رہے گا۔ پھر اس میں ہمیشہ کا کوئی خطرہ لگا رہے گا اور ساری بھاگ دوڑ بے کار جا سکتی ہے۔"

بابا صاحب نے حقے کا پائپ دوبارہ منہ سے لگایا۔

"کوشش کروں گی، ویسے بھی بچوں ہی کا سوچا ہوگا۔ ورنہ اتنی آسانی سے کیسے راضی ہو جاتی؟" وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھیں۔"

بابا صاحب جواب میں خاموش رہے۔

"میں چلوں۔ کوئی کام تو نہیں ہے کسی سے؟" وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ گئیں۔

"نہیں۔ بس یہی کام ہے جو آپ سے کہا ہے۔" وہ کہہ کر حقہ گڑگڑانے لگے۔

تیمور ماں کے بلاوے پر سمجھ تو گئے تھے کہ ان سے وہ کیا بات کریں گی مگر یہ بھی خیال تھا کہ شاید کوئی اور بات ہو۔ اور ابھی بات ان تک مکمل طور پر پہنچی ہی نہ ہو ورنہ تو ان کا کئی دنوں سے جی چاہ رہا تھا کہ ماں کے سامنے دل کا غبار نکال ڈالیں کہ وہ ابھی سننے والی ہیں۔ زندگی بہت الجھن میں پھنس گئی تھی۔ وہ تین دن سے نازمین کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ ایک خاموشی تھی جیسے بہتا پانی ایک جگہ ٹھہر گیا ہو مگر ماں کے پیغام نے جیسے ماحول میں دوبارہ ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

انہوں نے کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اماں جی اپنی نماز کی چوکی پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں۔ وہ اندر آ کر ان کے بستر پر بیٹھ گئے۔

بہت طویل دعا ہوتی تھی اماں جی کی۔ تمام زندہ اور مرحومین کا ان کی دعا میں حصہ ہوتا تھا۔ اس لیے تیمور علی خان بہت صبر و سکون سے ان کی دعا مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگے

تھوڑی دیر بعد اماں جی نماز کی چوکی سے اتر آئیں۔

"السلام علیکم اماں جی!"

اماں جی نے ان کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

"وعلیکم السلام کہاں ہو تم؟ دن بھر دکھائی نہیں دیے؟"

"ابھی تک اس قید خانے میں پھڑ پھڑا رہے ہیں آزادی کے دن بہت یاد آ رہے ہیں اماں جی!" ان کے لہجے کی شگفتگی پر اماں جی تڑپ اٹھیں۔

"ناشکری ہے بیٹے، گھر میں ہو یہاں سب ہی تم سے محبت کرتے ہیں۔"

"رہنے دیجیے اماں جی۔ ہم باز آئے ان محبتوں سے بہت گھٹن بھر رہے ہیں ہم ان محبتوں کا" انہوں نے جھلا کر تلخ کلامی کی۔

یک لخت اماں جی خاموش سی ہو کر رہ گئیں۔

"آپ نے ہمیں یاد کیا" اماں کی خاموشی پر جیسے وہ کسی احساس جرم میں مبتلا ہو گئے۔

"یاد تو ہر وقت ہی آتے ہو۔ کیسی مشکل پڑی ہے میرے بچوں پر۔" اماں جی نے اداسی سے کہا۔

"یوں کہیے بچے کی وجہ سے دوسرے بچے پر۔" تیمور علی خان کے لہجے میں زہر گھل گیا۔

"یوں نہ بولو بیٹے! میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔" اماں جی کی آواز رندھ گئی۔

"دیکھو بیٹے! مشکل بڑی ہے۔ مگر زندگی کا راستہ بھی اسی میں سے نکلنا ہے۔"

اماں جی نے ان کا شانہ تھام کر نرمی سے کہا۔

"ہم سمجھ گئے آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے۔ کم از کم آپ ہم سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں ہم آپ کے احسان مند ہوں گے۔"

وہ عاجز آنے والے انداز میں گویا ہوئے۔

"مت مارو مجھ کمزور کو تم سب چاروں طرف سے۔" اماں جی بھی خلاف توقع ناراض ہو گئیں۔

"اب تو میری اور تمہاری بات ہو گی تو یہی اور اس وقت تک ہو گی جب تک تم ہاں نہیں کرو گے۔

ہم اپنا سامان اپنے گھر میں رکھنا چاہتے ہیں۔"

وہ اسی طرح خفا خفا لہجے میں بولیں۔

"رکھیے شوق سے، رکھیے مگر یقین کیجیے ہم بالکل بے گناہ ہیں آپ کی قسم اماں جی!" اس بار لہجہ التجائیہ سا تھا۔

"تو تمہیں قصوروار کون کہہ رہا ہے۔"

"تو پھر سزا کیوں دے رہے ہیں؟ سزا تو قصوروار کو دی جاتی ہے۔" وہ خفگی بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"میری زندگی ماں تو تیرے دکھ پر اندر سے مر رہی ہے مگر دکھ کتنے ہی بڑے ہوں، اس نے زندگی کبھی [illegible] ہے۔"

اماں جی ان کے شانے سے پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"میرے اختیار میں ہو تو مر جاؤں۔ بڑے بیٹے سرور، بچے اور عصمت ان بچوں کا باپ [illegible] ماشاءاللہ انہیں [illegible] کریں۔ [illegible] ہر نماز میں دعا مانگتی ہوں کہ [illegible] (اے ہمارے رب ہم پر ہماری طاقت سے بڑھ کر بوجھ (نہ ڈال)

تمہارے پردادا نے بچپن میں ہمیں سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات زبانی یاد کرائی تھیں۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ [illegible] ابھی طاقت ہے جب ہی آزمائش ایک کے بعد ایک آ رہی ہیں مگر کسی وقت میری ہمت جواب دے سکتی ہے بیٹے! بات سنبھال لو۔ یہ گھر بکھر رہا ہے، بات بگڑ رہی ہے۔ اس وقت جس کو ذرا سا بھی ہوش ہے اس پر ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ بچے اور وہ گھر ہے۔ اس کی اولاد [illegible] سب ہم سے الگ ہیں۔ وہ ہماری ہو کر بھی ہم میں سے نہیں ہو سکی۔ مگر یہ تو اب ہماری ہے اسے غیر نہ کرو۔"

"یہ سارا بوجھ ہمارے لیے کیوں، وہ جو روپوش ہیں ان کی ذمہ داری کچھ نہیں؟" تیمور علی خان بات کاٹ کر تلخی سے بولے۔

"بیٹے اصول ہے کہ پانی ڈھلان کی طرف بہتا ہے۔ اس طرف ڈھلان نہیں ہے چڑھائی ہے تمہاری سمجھ میں بات آ سکتی ہے اور کچھ ہو سکتا ہے۔"

اماں جی بہت بھرے لہجے میں دلیل سے کام لیا۔

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ ہماری سمجھ میں بات آ سکتی ہے۔ نہیں آ رہی ہماری سمجھ میں بات۔" انہوں نے جھلا کر کہا۔

"جان کر انجان بن رہے ہو تیمور! یہ دوسری بات ہے۔" اس مرتبہ اماں جی کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔ "آپ یقین کریں اماں جی! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس زیادتی میں کتنی آسانی سے شریک ہو گئیں۔"

"وہ" کا صیغہ استعمال ہوا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ ذہن میں چور راستے سے کوئی تبدیلی در آئی ہے وہ [illegible] سے کہہ رہے تھے۔

"وہ عورت ہے بیٹے اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے اسے اس وقت سنبھالا بھی چاہیے اور سہارا بھی۔"

اماں جی نے ابھی تک ہار نہیں مانی تھی نہ ان کا لہجہ تبدیل ہوا تھا۔

"اماں جی! آپ ماں ہیں ہماری، ہماری طرف بھی دیکھیے۔"

"تمہاری ماں ہوں ان بچوں کی بھی تو کچھ ہوں۔"

"کیوں نہیں ہو گی اماں جی! بچوں کے باپ میں اتنے گٹس ہیں کہ وہ بچوں کو اپنی کسٹڈی میں لے سکتے ہیں۔"

"اس کا کیا کروں وہ نہ یہاں رہنے کو تیار ہے نہ اپنے ماں باپ کے پاس جانے کو۔" اماں جی نے بے چارگی سے سر ہلا دیا۔

"ابا صاحب چاہیں تو ان کو ہینڈل کر سکتے ہیں مگر آپ لوگ ایسا چاہتے ہی نہیں ہیں۔" ان کا انداز خفا خفا سا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹے! اگر تم اس کی اس بے دردی پر پرسکون رہ سکتے ہو تو نصیحت میں تمہارے باپ تک تمہاری بات پہنچا دوں گی۔ اب تم جاؤ مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔"

انہوں نے پاؤں اوپر کر کے لیٹنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

یہ حلیم الطبع ماں کی خفگی کا بہت واضح انداز میں تھا۔ تیمور علی خان نے اتنی بے بسی محسوس کی کہ جی چاہا خودکشی کر لیں۔ وہ سست سے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ بولے بنا باہر نکل گئے۔

عصر کی نماز کے بعد حویلی میں چہل پہل شروع ہو جانا روز کا معمول تھا۔ گاڑیوں کے ہارن بچوں کی چہل پہل کے برتنوں کی کھنکھناہٹ گھوڑوں کی ہنہناہٹ۔

اس لیے سب نہیں تو حویلی کے بہت سے لوگوں نے نازنین کے کمرے سے سامان اٹھتا دیکھا تو چونک پڑے۔ ایک بڑا سا سوٹ کیس ایک بیگ ایک پرام۔ جو نوکر اٹھا کر بڑے پھاٹک کے سامنے کھڑے تانگے کی طرف لے جا رہے تھے۔ پھر بڑی سی چادر میں آدھا چہرہ چھپائے گود میں روشانے کو لیے جواد کی انگلی تھامے نازنین اپنے کمرے سے نکل کر اماں جی کے کمرے کی طرف بڑھی مگر اماں جی درمیان ہی میں مل گئیں ننگے پاؤں کھلے سر حواس باختہ پیچھے پیچھے عالم جاب، رضیہ بیگم اور روشن آرا۔

اماں جی نے چیل کی طرح جھپٹ کر جواد کو اپنی جانب کھینچا۔

"کہاں جا رہی ہے بیٹی! بغیر کچھ کہے سنے۔"

وہ بھر آئی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئیں۔ ان کا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"میرا اس گھر سے کوئی رشتہ نہیں اماں جی اگر میں آپ کی محبتوں کی مقروض ہوں۔ میں بچوں کو آپ سے ملانے کبھی کبھی آ جایا کروں گی۔ مگر اس شرط پر کہ آپ لوگ میرے ماں باپ کو اس حادثے کی اطلاع نہیں دیں گی۔ اگر آپ لوگوں نے ایسا کیا تو نہ میں اپنے ماں باپ سے ملوں گی اور نہ بچے آپ سے۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مگر آپ جا کہاں رہی ہیں چھوٹی بھابی!"

روشن آرا نے آگے بڑھ کر نازنین کے شانے تھام لیے۔

"کیوں کہہ رہی ہیں آپ مجھے چھوٹی بھابی۔ کالک لگی ہے میری شکل پر اور ایسی عورت سے کسی کو رشتہ قائم کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہوتی۔"

وہ اسی طرح سرد مہری سے گویا ہوئی۔

"ہمیں پتا ہے تم کیا ہو۔ تم ہماری ہو۔ ہمیں تم پر فخر ہے کہ اتنے آزاد ماحول میں پرورش پانے کے بعد بھی تم نے حویلی میں خوش رہنے کے طریقے سیکھ لیے۔ یہاں کے ہر قاعدے قانون کو اپنایا سب سے بڑھ کر ہم سب کے دل جیت لیے تمہیں

دیکھ کر تو ہمارے سینوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔"

"یہی اپنا یہاں کے قانون قاعدوں کو ہی تو سزا بھگت رہی ہوں۔ بس اتنی سی خطا تھی میری کہ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی کی بیوی ہوں۔ وہ اس دور کی آگہی اور پڑھی لکھی عورت کی فضیلت سمجھتا ہے۔ آپ لوگ مجھے دعا دیں۔ اگر ہو سکے تو مجھے پیار کریں کیونکہ مجھے ہر صورت جانا ہے۔"

آپ لوگ مجھے اس طرح کہہ رہی ہیں بچوں کو آپ سے ملانے جلدی آؤں گی۔" اس کا لہجہ قطعی انداز ظاہر کر رہا تھا۔

اماں جی روتی ہوئی آگے بڑھی تھیں۔ اور نازنین کو لپٹا لیا تھا۔

"میں بے موت مر جاؤں گی میری بچی۔"

"یقین کریں اماں جی مجھے آپ کو دکھ پہنچا کر خوشی نہیں ہو رہی۔ مگر اس چلتے وقت میں آنکھ میچنے کی خواہش ہے آپ کی دعائیں ہوں۔ مجھے جانے دیں۔ اماں جی میں مجبور ہوں۔"

تیمور علی خان تانگے میں سامان دیکھ کر چونکے تو تھے مگر دوسرا خیال یہی آیا تھا کہ شاید کوئی مہمان آیا ہے۔ مگر حویلی کے سامنے کشادہ اور طویل راہداری میں ان سب کو کھڑا دیکھ کر خاص طور پر سیاہ چادر میں چھپی ہوئی عورت کے گلے لگی روتی ہوئی ماں کو دیکھ کر تو جیسے ان میں بجلی سی بھر گئی۔ جواد کو رضیہ بیگم نے گود میں اٹھا لیا تھا۔

"کیا ہوا ہے بھابی بیگم؟" وہ بری طرح پریشان ہو گئے۔

"نازنین جا رہی ہے۔ تم بھی خدا حافظ کہہ دو۔"

رضیہ بیگم نے سفاکی سے انداز میں بھائی کو جیسے کچھ جتایا۔ جیسے واقعی وہ اس حادثے کے ذمہ دار ہوں۔

"کہاں؟" ان کی مضبوط اعصابی قوت امتحان میں پڑ گئی۔

"میکے جا رہی۔"

"کیوں؟" وہ در حقیقت بری طرح پریشان ہو رہے تھے۔

"کیا کیوں لگا رکھی ہے۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔"

رضیہ بیگم نے جواد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ناراض لہجے میں کہا۔

"تو کیا بچوں کو بھی۔"

"حد ہو گئی عقل نہیں کی۔" روشن آرا نے کچھ جتانے کے انداز میں بھائی کو گھورا۔

"یعنی تمہاری طرف سے یہ چلی جائے بچوں کو چھوڑ جائے؟ بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ انہیں ماں سے جدا کر کے گناہ کریں کے برابر ہے۔ ہم اس کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتے۔ اول تو ہم اسے جانے ہی نہیں دے رہے۔ بالفرض اگر یہ چلی جاتی ہے تو بچے اس کے ساتھ جائیں گے۔ ہمیں بچوں سے کتنی محبت سہی مگر ہم اس سے زیادہ تو اس کی اولاد کو نہیں چاہ سکتے۔" عالم جاب نے گویا ماں کی بھڑاس نکال دی۔

اماں جی نے اب تو نازنین کا سر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔

"ہمارا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"تیمور! تم ہمارے معاملات میں حصہ نہ لو۔ کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہو۔" زبیدہ بیگم نے بھی بھاوج کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔" تیمور علی خان نے بہت دکھ سے نازنین کو مخاطب کیا۔

"پھر کس طرح کرنا چاہئے۔ مزید ملت کی ذلت کا انتظار کرنا چاہئے؟"

اس مرتبہ اماں جی بولی تھیں اور نازنین نے ان کی طرف حد درجہ عقیدت و محبت سے دیکھا تھا۔ اس کے لبوں تک آیا جملہ اماں جی نے کہہ دیا تھا۔

"خدانخواستہ۔ اگر یہ اپنے گھر جانا چاہتیں تو ہم خود سارے انتظامات کرتے مگر اس طرح تو ہم بھی انہیں نہیں جانے دیں گے۔ پلیز آپ اپنے کمرے میں چلئے۔ اماں جی سامان اتروائیے۔"

"ہم جواد کو لے کر باہر جا رہے ہیں۔" انہوں نے جواد کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

"میں بچی نہیں ہوں، جو آپ کے الفاظ کے ہیر پھیر میں الجھ جاؤں۔ آپ مجھے نہیں روک سکتے۔ آپ لوگ مجھے پریشان نہ کریں حق مہر کا چیک میرے پاس ہے میں بچوں کی کسٹڈی کا مقدمہ لڑ سکتی ہوں۔"

آؤ جواد اس نے بیٹے کو پھوپھی کی گود سے اتارنے کی کوشش کی۔

"ہم بابا صاحب کو لے کر آتے ہیں تب تک آپ انہیں روکیے۔" تیمور علی خان کو بھی حل سجھائی دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے بابا صاحب کو بلانے کی۔ بات نہ الجھائیں کوئی فائدہ نہیں۔ آؤ بیٹے اس نے پھر جواد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

زبیدہ بیگم نے روشن آرا کو آنکھ بچا کر اشارہ کیا کہ وہ بابا صاحب کو بلا لائیں۔

اس طرح جانا مناسب نہیں ہے ناز۔ آرام سے بیٹھ کر بابا صاحب سے بات کرو۔ وہ تمہاری ہر الجھن دور کریں گے۔ تمہاری بات سنیں گے۔ کوئی ایسا حل نکالیں گے جو تمہارے حق میں ہر طرح سے بہتر ہوگا۔"

زبیدہ بیگم نے بہت نرم لہجے میں بہت اپنائیت کے ساتھ اسے سمجھایا۔

روشن آرا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کھسک گئی تھیں۔

تیمور علی خان اب خاموش کھڑے تھے۔

"آؤ بیٹی! تم میرے کمرے میں چلو۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

اماں جی نے اسے شانوں سے تھام کر کہا۔

"مجھے معاف کر دیجئے اماں جی اب بس مجھے جانے دیں۔" نازنین کی نرمی میں ضد پوشیدہ تھی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں یہاں نہیں رکھیں گے۔ خود گاڑی کا انتظام کر دیں گے۔" عالم جاہ نے پچکارنے کے انداز میں کہا۔

تیمور علی خان نے الجھ کر عالم جاہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں زبان بندی کا اشارہ کیا۔

اسی دوران بابا صاحب چھڑی ٹکا کر تیز تیز چلتے ہوئے ان کی طرف آتے دکھائی دیے۔ روشن آرا ان کے ہمراہ نہیں تھیں۔

نازنین انہیں اچانک سامنے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس نے آج تک ان سے بھی وہ بات نہیں کی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ انجان بن کر پوچھ رہے تھے۔ روشن آرا نے نہایت اختصار سے انہیں مکمل رپورٹ دے دی تھی۔ اس کا لفظ لفظ پتھر بنا ہوا تھا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اور کانوں سے لگتا تھا۔ خون ٹپک رہا ہے۔

"یہ جانے کا کون سا انداز ہے ناز۔ ہمیں تمہارے اس اقدام سے بہت دکھ ہوا۔"

"سب کے دکھ دور ہو جائیں گے۔ مگر میرے دکھ میری موت تک ساتھ رہیں گے۔"

نازنین نے بے بسی سے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ہم تمہیں اس طرح کیسے جانے دے سکتے ہیں ناز؟ اگر تم یونہی جانے پر راضی ہو تو ہم انتظام کیے دیتے ہیں۔" انہوں نے بمشکل خود پر قابو پایا۔

"اگر وہاں اس حادثے کی اطلاع ہوئی تو میں زہر کھا لوں گی۔"

بابا صاحب ایک دم بے حد خاموش ہو کر رہ گئے۔ سب کھڑے ہوئے اترا ان کی شکل دیکھنے لگے۔ "تم بے قصور ہو۔ عفت کی رہائی ہے ہم چاہتے ہیں کہ کسی بھی صورت تمہارے تحفظ کا بندوبست کریں۔ تم نقصان کے سودے اپنے ساتھ کر رہی ہو۔ تو ہم خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔"

"عزت اور موت کا نقصان کبھی پورا نہیں ہوتا۔ یہ ہمیشہ کے نقصان ہوتے ہیں بابا صاحب۔"

نازنین کے رخساروں پر اشک رواں ہو گئے۔ چاروں طرف جیسے سناٹا چھا گیا۔

"آپ اسے اپنے کمرے میں لے کر چلو۔ اس کو اچھے کپڑے پہننے کو دو۔ خوشبو لگاؤ۔ دلہن بناؤ۔" وہ اماں جی سے مخاطب ہوئے۔

"جاؤ تیمور! تم بھی نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ مغرب و عشاء کے درمیان تمہارا نکاح ہے۔ اپنے دو تین دوستوں کو بلاؤ۔" پھر وہ عالم جاہ کی سمت بڑھے۔ "کھانے میں اچھا سا میٹھا ہو۔ خوشی کی تقریب میں خوشی نظر آنا چاہئے۔ اسے ماتم نہ سمجھا جائے۔"

وہ چھڑی ٹکاتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ تیمور علی خان تو سکتے کی کیفیت میں باپ کو جاتا دیکھتے رہے۔ زبیدہ بیگم نے روشا کو اپنی گود میں لے لیا۔

نازنین کی کیفیت اس کی اپنی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے وجود کی کالی رات کٹ رہی ہو۔ وہ پھر اجالا سحر طلوع ہو رہی ہو۔

"آخر کیوں تمہاری ساری زندگی حرام یاور علی خان تمہاری اولاد۔ تمہاری جاگیر تمہارا ایمان سب کچھ میرا ہے۔ تم نے

بڑی بے رحمی سے میرے سر سے چادر اتار رہی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح میرے دل کی حالت میں ثابت ہو جاؤ۔ اور نہ ہی تو جو میں مجبوراً چاہ رہی ہوں۔ مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے اندر کی کھولن کو ختم انہیں کر پا رہی۔ سوچیں غلطی ہو گی جب تمہاری ہمیشہ کی نیندیں حرام ہوں گی۔"

"آؤ بیٹی اندر چلتے ہیں۔" اماں جی نے اسے تھام کر بہت محبت سے کہا۔

نہ جانے کیوں تیمور کی طرف دیکھ کر انہیں یوں محسوس ہوا۔ کہ ان کا دل کسی اتھاہ میں اترتا جا رہا ہو۔

"اگر میں ایسی ہوں جیسا تم نے سمجھا اور مجھ پر طلاق کا داغ لگایا تو پھر ایسی ہی سہی۔"

وہ اماں کے ساتھ چلتے ہوئے طمانیت سے سوچ رہی تھی۔

"آج ہی کیوں۔ وہ چار روز بعد چلے جائیں گے۔" اماں جی نے ہچکچا کر دلاور علی خان کی طرف دیکھا۔

"نہیں آج ہی۔ آج کہانی کا باب مکمل ہوا۔ نئی کہانی۔ نئی جگہ سے۔ آپ اگر کچھ روز ان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہو تو ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔ فی الحال ہم بچے ان کے ساتھ نہیں بھیج رہے تاکہ وہ دونوں بالکل تنہا رہیں۔ اور ایک دوسرے کے لیے گنجائش پیدا کریں۔ اور حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں اور دور تک کی سوچیں۔

ہمارا خیال ہے ان دونوں کے درمیان آپ کی موجودگی انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے میں کارآمد ثابت ہو گی۔"

وہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گئے جیسے اب ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔ اماں جی زینے کی طرف بڑھ گئیں۔

تیمور علی خان کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔ زبیدہ اور بصیر علی خان کی دلہن دروازے ہی میں کھڑی تھیں۔

"خیریت اس طرح بیچ دروازے میں کیوں کھڑی ہو۔" وہ حیرانی سے بولیں۔ آواز میں افسردگی کا تاثر بھی تھا۔

"بہت رو رہی ہے ناز۔ دو مرتبہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ ابھی اسے سکون کی دوا دے کر لٹایا ہے۔"

"دیکھو تو بے ہوش تو نہیں ہے" اماں جی گھبرا گئیں۔

"تیمور کہاں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ابھی تو سوٹ کیس پیک کر رہے تھے۔" بصیر علی خان کی دلہن بولیں۔

"اچھا میرے بھی دو تین جوڑے رکھ دو۔" اماں جی بہت اداس نظر آ رہی تھیں۔

"آپ کے۔ کیوں؟" زبیدہ بیگم حیران ہوئیں۔

"تمہارے بابا صاحب کہہ رہے ہیں۔ کہ مجھے ساتھ جانا چاہیے۔"

اسی لمحے تیمور علی خان تیزی سے اپنے کمرے کی سمت آتے دکھائی دیے۔

انہیں دروازے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹکے۔ پھر بغیر بات کیے ان کے درمیان راستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے میں

داخل ہو گئے۔

وہ سب بھی ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

ناز بیڈ پر خوبصورت کمبل اوڑھے ہوئے تھی۔ دلہن بننے کی کوئی علامت اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ بالوں میں پھول لگے ہوئے تھے۔ تیمور علی خان وارڈروب کھول کر کچھ تلاش کر رہے تھے۔

"سر کھانا کھا رہے ہیں تم پہلے کھانا کھا لو تیمور۔" زبیدہ بیگم نے انہیں مخاطب کیا۔

"بھوک نہیں ہے بس۔" وہ بات بیچ میں کہہ کر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگے۔

"تھوڑا بہت تو کھا لو بیٹے۔ بہت دور جانا ہے۔" اماں جی کا انداز خوشامدانہ سا تھا۔

تیمور علی خان نے کچھ نکال کر وارڈروب کی ایک نگاہ ناز پر ڈالی۔

"سفر بہت دور کا ہے بی بی جان۔ اگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو۔"

اب تو بہت دنوں تک اس کی طبیعت اسی طرح رہے گی۔ تھوڑا تماشا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ بڑی گاڑی ہے پیچھے لیٹ جائے گی تم فکر نہ کرو۔"

انہوں نے دکھ بھرے انداز میں تسلی دی۔

تیمور علی خان نے ماں کی طرف دیکھا۔

"خوش ہیں ناں اماں جی آپ؟" ان کے انداز میں جانے کیا تھا۔ اماں جی تیزی سے آگے بڑھیں۔ اور ان کا سر سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "بیٹے احسان کیا ہے تو بار بار جتاتا ہے اماں جی مر جائے گی۔"

"اماں جی۔ چپ ہو جائیں۔" زبیدہ بیگم نے گھبرا کر پہلے ناز کی طرف دیکھا پھر دونوں کو الگ کیا۔

"اب اسے بھی کیسے نہیں ہیں اماں جی اگر آپ سے بدلے لیں۔" تیمور علی خان نے انگلیوں کی پوروں سے ماں کے اشک صاف کیے۔

"میں صدقے جاؤں اپنے بچے کے۔" وہ پھر رونے لگیں۔

"تم تھوڑا سا کھانا کھا لو تیمور۔" زبیدہ بیگم نے اصرار کیا۔ "ورنہ اماں جی بوجھ محسوس کرتی رہیں گی۔"

"ٹھیک ہے ہم کھا لیں گے آپ فکر نہ کریں۔" وہ اپنا سوٹ کیس کھولنے لگے۔

"ناز کا سامان رکھ دیا زبیدہ؟" اماں جی نے پوچھا۔

"جی وہ تو شام ہی کو رکھ دیا تھا۔ ماما ساتھ جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ سب سنبھال لے گی۔" انہوں نے اماں کو تسلی دی۔

اسی لمحے ناز نے کسمسا کر آنکھ کھولی۔ اور سر جھٹک کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"کیا نام ہوا ہے؟ میں کہاں ہوں۔" وہ گھبرا کر پوچھ رہی تھی۔

وہ سب تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

"تم یہاں حویلی میں ہو۔ تیمور کے کمرے میں۔" یہ کہتے ہوئے رضیہ بیگم کے دل کو کچھ ہوا۔

اور نازنین گویا ایک دم حواسوں میں آ گئی۔ "اماں جی! اروشہ کہاں ہے؟"

"وہ عالم تاب کے پاس ہے بیٹی۔ وہ وہیں پر سو چکی ہے۔"

"اماں جی میں بچوں کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ مجھے وہم آ رہے ہیں۔"

اس نے اماں جی کی طرف التجا کے انداز میں دیکھا۔

"ارے نہیں بیٹی۔ بچے اپنے گھر میں ہیں۔ تمہارے بابا صاحب کی تو جان ہے بچوں میں۔ جب وہ اس کو اتنا پیار کرتے ہیں تو پھر روشی اور جواد تو ان کی اولاد ہیں تم فکر نہ کرو۔"

اماں جی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میرا دل نہیں مان رہا۔" وہ ضد کے انداز میں گویا ہوئی۔

"تمہارے بابا صاحب کا حکم ہے بیٹی؟ انہوں نے سوچ سمجھ کر ہی کہا ہوگا" انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جواد تو پھر بھی بڑا بچہ ہے اماں جی اروشی بہت چھوٹی ہے مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"اماں جی! آپ بچوں کو ساتھ لے چلیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

تیمور علی خان نے مداخلت کی۔ "اور پھر سب کچھ بچوں کے نام پر تو ہوا ہے۔ ہم بھی بچوں کو یہاں چھوڑنے کے حق میں نہیں ہیں۔"

وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئے۔

کمرے میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

"کتنا اونچا ہو گیا ہے، ایکا ایکی میرا تیمور۔ رضیہ سب سے چھوٹی اولاد ہے یہ میری۔ سب کا پیارا، آنکھوں کا تارا اور کام بڑے بڑے کر گئے ہیں اس پر۔"

اماں جی روتی ہوئی بڑبڑاتی ہوئی خود بھی باہر نکل گئیں۔

سرائے آئے انہیں ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ ماما جی اماں جی بچوں کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ نازنین زیادہ تر اپنے بیڈ روم میں بند رہتی تھی۔ تیمور علی خان دن کی روشنی میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ رات کے پچھلے پہر ان کی جیپ پورچ میں داخل ہوتی تھی۔

آج تو کچھ زیادہ ہی وقت ہو گیا تھا۔ پریشانی فطری تھی۔ روشی کو ایک نظر دیکھ کر جب وہ واپس آئی تو دل بڑا پریشان سا تھا۔ وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

تیمور علی خان جانے کب خاموشی سے اوپر چلے آئے تھے۔

"خیریت۔ یہاں اس طرح کیوں کھڑی ہیں آپ" وہ چونک پڑے۔

"ایسے ہی۔" وہ مڑ کر دروازے سے ہٹ گئی۔

"آپ لندن کب جا رہے ہیں۔" اس نے گیلے بالوں کا جوڑا کھول کر بال پھیلائے اور پیچھے کی ہوا میں سکھانے لگی۔

"ابھی نہیں جا رہا۔" انہوں نے کوٹ اتار کر بیڈ کی طرف اچھالا۔ جو فوراً ہی نازنین نے آگے بڑھ کر اٹھایا اور ہینگ کرنے لگی۔

"اب آپ کو چلے جانا چاہیے۔"

تیمور علی خان نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے قدرے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ زرد کرتے سرخ دوپٹے میں ملبوس گھٹنوں سے نیچے تک ہوتے ہوئے ریشمی سیاہ گھنے بال۔ میک اپ سے عاری سادہ مگر حسین سا چہرہ۔ رشتہ بدل گیا تھا۔ دیکھنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ کسی طرح بھی وہ بچوں کی ماں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ روشی ابھی صرف کا عکس ہوا تھا، ان کے ابھرے نقش اتنی آسانی سے نہیں مٹتے۔

انہیں یاد تھا نازنین نکاح کے بعد اس سے ملاقات کی کس وجہ سے بے قراری تھی۔ ایک ایک پل پہاڑ بن کر گزر رہا تھا۔ لیکن ان کی شدتوں پر گھبرا اٹھی تھی۔ باقاعدہ اس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اور وہ اس کی اس ادا پر نثار ہو کر رہ گئے تھے۔

مغربی لڑکی کا کس درجہ مشرقی حیا آمیز انداز تھا۔

نازنین ان کے نکاح کو سات دن ہو گئے تھے۔ رات کے آخری پہر بستر پر آتے ہوئے وہ ایک نامعلوم سے احساس جرم میں گرفتار ہو جاتے تھے صبح آنکھ کھلتی تو وہ بستر پر نہیں ہوتی تھی۔

نازنین ان کے اس طرح دیکھنے پر گھبرا سی گئی تھی۔

"کیوں اب انہیں کیوں چلے جانا چاہیے؟"

"وہ آپ کا دن گن گن کر انتظار کر رہی ہوگی۔ اور پھر سب کچھ تو ہو ہی آ چکا ہے۔ یہی میرا گھر ہے۔ یہی میری مرقد ہے۔ میں ہمیشہ آپ کی مشکور رہوں گی۔ اور اتنا یقین رکھیے۔ کبھی بھی آپ کی پرسکون زندگی اور خوشیوں بھری زندگی میں کوئی الجھن ڈالنے درمیان میں نہیں آؤں گی۔ میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ میں بے ٹھکانہ نہیں ہوں۔ یہ سرائے بے گھروں کے لیے۔ میں احساس ملکیت عطا کرنے پر ایک بار پھر آپ کی مشکور ہوں۔

بری عورت سے کوئی شریف مرد شادی نہیں کرتا۔ آپ نے مجھ سے نکاح کر کے مجھ پر پہلے بہت حد تک صاف کر دیے ہیں۔ اس حد تک کہ نفسیاتی طور پر میں جس احساس بے بسی و تنہائی سے دوچار ہو گئی تھی وہ دور ہو چکا ہے۔ اب آپ لندن چلے جائیں اور اپنی حقیقی زندگی گزاریں۔"

وہ کوٹ لٹکا کر ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

"بس؟" تیمور علی خان نے ٹائی بھی بستر پر اچھال دی۔ اور شرٹ اتارنے لگے۔ روزانہ وہ لباس تبدیل کر کے اسٹڈی میں چلے جاتے تھے مگر آج بیڈ پر بیٹھ گئے۔ جیسے انہیں کہیں جانے کی جلدی نہ ہو۔

"بس۔" وہ ناسمجھی کے انداز میں گویا ہوئی۔

"نکاح ایک ذمہ داری کا کام ہے۔ ہم اسے کھیل تماشا نہیں سمجھتے۔" وہ بردباری سے گویا ہوئے۔

"مگر یہ نکاح اور طرح کا ہے۔ اس میں سیکنڈ پارٹی آپ سے کوئی تقاضا نہیں کر رہی۔"

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ اتنی رات کو دونوں ہی چونک پڑے تھے۔

یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ وہ کبھی ڈائریکٹ فون ریسیو نہیں کرے گی۔ اس لیے وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی تیمور علی خان نے ہی آگے بڑھ کر فون اٹھایا تھا۔

"ہیلو۔ السلام علیکم۔ کیا حال ہیں۔ اتنی رات کو فون کیا آپ نے خیریت۔؟"

"کب۔؟ ابھی۔ ابھی۔ لگ گیا ان کا سراغ۔ ہمارے حصے کی جنگ ان سے لڑنا اب آپ پر فرض ہے اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو یہ بے مثال ناانصافی ہو گی۔"

"جی۔ جی۔ ہم سن رہے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا وہ قیامت تک اس پر راضی نہیں ہوں گی۔ ظاہر ہے آپکی خاندانی آن محفوظ ہو گی کوئی عورت اور خاندان میں آ کر واپس غیر خاندان میں نہیں گئی۔ آپ کا کام ہو گیا اس لیے آپ ان کی وکالت کر رہے ہیں۔ بچے ان کے پاس نہیں جائیں گے، وہ کسی قیمت پر رضامند نہیں ہوں گی۔"

"جی۔ وہ پریشرائز کر رہے ہیں آپ کو۔ آپ ان سے پوچھیے پہلے ان پوائنٹس پر غور کیوں نہیں کیا تھا۔ بچے نہیں ملیں گے ان سے کہیے جو کرنا ہے کر لیں۔"

"نہیں بس۔ پلیز آپ بہت کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہیں کر سکتے ہیں۔"

"جی۔ جی ہاں۔ ہم سن رہے ہیں۔ تو ٹھیک ہے انہوں نے کسر ہی کیا چھوڑی ہے یہ تماشا بھی کر کے دیکھ لیں لیں گے ہم انہیں کورٹ میں۔" تیمور علی خان نے شدت جذبات میں ہونٹ کاٹے۔

نازنین سینے پر ہاتھ دھرے ساکت و صامت کھڑی تیمور علی خان کی سمت دیکھ رہی تھی۔

تیمور علی خان فون بند کر کے اس کی سمت متوجہ ہوئے تو اسے گھبرائی ہوئی حالت میں دیکھ کر ایک دم گھبرا گئے ہوئے اس کی طرف بڑھے اور بے ساختہ اسے شانوں سے تھام لیا۔

"کچھ نہیں ہو گا پریشان نہ ہوں ڈونٹ وری۔ ہمیں اندازہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم تو منتظر تھے کہ کب ان تک یہ بات پہنچے منظر پر آئیں اور یہ معاملہ بھی ہمیشہ کیلئے نمٹ جائے۔ آخر کب تک انڈر گراؤنڈ رہتے؟ یا شاید انہیں ہوش ہی اب آیا ہو کہ بچے یوگنڈا پہنچ گئے ہوں۔ مگر اتنا اندازہ تو انہیں بھی ہو گا کہ بابا صاحب کے پیچھے ہی بچے حویلی سے باہر نہیں جا سکتے۔ ان کے حساب سے تو آپ یوگنڈا پہنچ چکی ہوں گی۔"

"تیمور! مجھ پر احسان کی انتہا کر دیجئے۔ بچوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیجئے۔" اس نے تیمور علی خان کی سمت التجائیہ انداز میں دیکھا۔

"آپ کیوں وقت سے پہلے اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ ایزی پلیز۔"

"میں آپ کو بتا رہی ہوں تیمور۔ اگر مجھ سے بچے چھین لیے تو میں حویلی والوں کے لیے بھی مر جاؤں گی۔ بچے میرے پاس ہوں گے تو کم از کم وہ واپس ان کو جائیں گے تو سہی۔ کہیں بھیجے تو سہی ______ جہاں ہو کر انہیں معلوم ہو گا کہ ان کی ماں ان کے چچا کے نکاح میں ہے جبکہ باپ زندہ ہے تو وہ اپنے باپ کی طرح مجھ سے نفرت کریں گے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی تیمور۔ وہ میرے پاس ہوں گے تو میں انہیں اسٹیپ بائی اسٹیپ تمام صورت حال تو سمجھا سکوں گی۔ پلیز تیمور۔"

"ہم نے آپ سے کہا ناں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" انہوں نے ایک جذباتی لمحے میں عہد کر دیتے ہیں۔ ہم ابھی زندگی میں کوئی آسانی آنے نہیں دیں گے اطمینان رکھیے۔"

جذبات کی شدت سے ان کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"اور کیا کہہ رہے تھے بابا صاحب؟" اس نے خوف زدہ ہرنی کی طرح تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ بس یہی کہ چوہدری کریم صاحب فرما رہے تھے۔ بچے طلعت کی ابھی تک ان تک پہنچ جائیں ورنہ قانونی مدد سے وہ بہت آسانی سے بچے حاصل کر لیں گے۔ اور یہ کہ مقدمہ میں ہم کمزور پارٹی ہیں۔ کوئی اچھا وکیل سرے سے مقدمہ لڑنے کے لیے ہی نہیں، کیونکہ ان کی ایکس وائف ان کے حقیقی بھائی کے نکاح میں ہے جو کیریکٹر وائز کمزور ورنہ تو خود۔"

"اب ہمارا مقدمہ ہی کمزور ہے تو آپ مجھے جھوٹی تسلیاں کیوں دے رہے ہیں؟"

نازنین کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ سب سن کر۔ اس نے بے دلی سے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"یہ تو ان کا جائزہ ہے غور کرنے پر پوائنٹس ہمارے ذہن میں بھی آ سکتے ہیں۔ اس لیے ڈونٹ کیئر۔ کوئی ضرورت نہیں زیادہ ہونے کی۔ ہم دیکھ لیں گے سب۔ اب آرام کیجئے۔"

"میری تو بھوک نیند اڑ گئی ہے۔ اور کیا انہیں پتہ چل گیا ہے کہ۔"

وہ کہتے کہتے جھجک کر رک گئی۔

"ہوں۔ تب ہی تو تیزی سے ایکشن لے رہے ہیں۔" تیمور علی خان کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

چھن چھن۔ اندر کہیں دیکھتے کانچوں پر پانی کے چند چھینٹے پڑے۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے تیمور۔" اس کا دل کانپنے لگا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ ہمیں کچھ اندیشے تھے اسی وجہ سے ہم مطمئن نہیں تھے۔" وہ گویا ہوئے۔

"اسی وجہ سے صرف۔؟" نازنین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ظاہر ہے۔ یہ وجہ کوئی چھوٹی وجہ نہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔ بچوں کے صدقے میں کچھ کھانا ہے۔ اللہ میرے بچوں کو ہر وہ خوشی دے جو مجھے نہیں ملی۔"

وہ آگے بڑھی اور برتن اٹھا کر یاں سمیٹنے لگی۔

تیمور علی خان یکدم گم صم سے ہو گئے تھے۔

چند دن بہت خاموشی سے گزرے تھے مگر دلوں میں طوفان برپا رہے تھے۔ خون کی ہر جنبش پر نازنین کا دل ابھی لرز آ جاتا تھا۔ تیمور علی خان پہلے کی نسبت اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ اماں جی بچوں کو لے کر اسی کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ خالہ کا دل اماں جی کے بغیر نہیں لگ رہا تھا۔ یوں بھی مطربہ کے غائب ہو جانے کے بعد وہ بہت چپ اداس اور بیمار رہنے لگی تھیں۔

اس لیے دلاور علی خان سے اجازت لیکر وہ بھی سرائے آ گئی تھیں۔ نازنین کے سامنے اس طرح بیٹھی تھیں جیسے اس حادثے کی سب سے بڑی ذمہ دار وہی ہوں۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ حویلی میں روشنیاں جل چکی تھیں۔ نازنین اماں جی اور بچوں کے ساتھ لان میں بیٹھی تھیں اسی دم گیٹ پر کوئی بھاری انجن کی گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ ہارن بجا۔ چوکیدار کسی کونے سے نکل کر بھاگا۔ اور چھوٹی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکا نازنین اور اماں جی اسی سمت دیکھ رہی تھیں۔

چوکیدار کی پھرتی بتا رہی تھی کہ آنے والا اہم اور جانا پہچانا ہے۔ گیٹ کھلا بجائے گاڑی اندر آنے کے صرف دلاور علی خان اندر داخل ہوتے دکھائی دیے نازنین اور اماں جی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

دلاور علی خان چھڑی زمین پر ٹکاتے تیز تیز قدم رکھتے ان کے قریب پہنچے۔

"السلام علیکم!" نازنین نے سر پر آنچل ڈال کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ خوش رہو۔" انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

"تیمور کہاں ہے؟" انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

"خیریت؟" دونوں ساس بہو ٹھٹک سے گئیں۔

"وہ تو ابھی نہیں آیا۔ رات ہی کو آتا ہے۔" اماں نے بتایا۔

دلاور علی خان نے سرسری نگاہ نازنین کے چہرے پر ڈالی۔ اس کو کوئی کچھ خبر ہے؟"

"جی مجھے تو پتا نہیں۔ کبھی درمیان ہی نہیں آیا۔" وہ یوں بولی جیسے کسی غلطی کا اعتراف کر رہی ہو۔

"اچھا۔ بیٹی ہماری بات غور سے سنو، اصل معاملہ تم ہی سے ہے۔"

نازنین کا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا، یوں بھی بابا صاحب کے انداز شروع سے ہی کھٹک رہے تھے۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"دیکھو بیٹی اپنے اس حویلی میں رہیں یا اس حویلی میں ہیں تو ہمارے پاس ہماری نگرانی میں۔"

"کیا کیا۔ مطلب آپ کا؟" اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"یاور باہر جیپ میں ہے بچوں کو لینے آیا ہے۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو بیٹی اپنے تو وہ کورٹ کے ذریعے بھی لے سکتا ہے مگر بیٹی آگے تھوڑی رسوائی ہو چکی وہ تمہیں بھائی کورٹ میں دلاور علی خان کی بہو سمیت دیکھو بیٹے بات اونچی آواز کے بجائے انجام کو پہنچ سکتی ہے۔ بس اب تماشا ختم ہو جانا چاہیے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اس پر حویلی کے دروازے بند کر سکتے

ہیں ہمیشہ کے لیے نہیں۔ اس کے دل میں کوئی گنجائش نہیں وہ سب کچھ کر گزرے گا۔ بات کو سمجھو۔"

اماں جی تو یہ سن کر گویا باہر ہی چپل چھوڑ کر بھاگی تھیں۔ نازنین پر گویا سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ تیمور بیٹے ہوتے آج نہیں تو کل۔ پھر تماشا کیوں کیا جائے۔ ہم اس جھگڑے کے کھیل کا نتیجہ اسی طرح دیکھ چکے تھے۔ کہ ردتم حویلی اور بچے تم بھی گھر میں رہو اور بچے بھی۔ کوئی کسی سے دور نہیں۔"

نازنین نے آگے بڑھ کر روتی کو یوں اٹھایا جیسے چیل چوزے پر جھپٹی ہے۔

"خدا کے لیے بابا صاحب۔ خدا کے لیے۔" وہ گڑگڑائی۔

"فیصلہ کر دیا بیٹی اب یہ ہوتا ہے جو ہم نے طے کر لیا ہے اب کوئی نیا تماشا نہیں ہو گا۔ تیمور انہوں نے بلند آواز سے پکارا۔

بابا۔

"جی خان!" شمشیر دوڑا چلا آیا۔

"دیکھو بچوں کو باہر جیپ میں بٹھاؤ اور سامان کو کہو وہ بھی گاڑی میں بیٹھے۔"

"نہیں نہیں۔" نازنین زور سے چیخی۔ مگر دلاور علی خان نے روتی کو اس کی گود سے اپنی گود میں لے لیا اور نازنین کا سر جھنجھنانے لگے۔

باہر گھٹے گھٹے کرتی پردے سے بے نیاز اماں جی بدحواس ہو کر اندر بھاگی آئی تھیں۔

نازنین بابا صاحب کے پاؤں پکڑ رہی تھی۔ اماں جی نے اسے اٹھا کر اپنے گلے سے لگایا۔

"مت کریں اس پر یہ ظلم۔ آخر یہ آپ کی بہو ہے کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ بلا احتیاط سے بولی تھیں۔

"بھلا بھی ہے تو آپ لوگ اور شرارتیں کیوں پیدا کرتے ہو۔ وہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ کو چھوڑنے ہو گھر بچوں کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ اس کی محبت نہیں ہے "آن" کا مسئلہ ہے۔ بات کو سمجھو آپ کے بچے کہیں نہیں جا رہے ہیں حویلی ہی میں ہیں۔"

بابا صاحب اتنا کہہ کر پلٹ گئے۔ شمشیر جو روتی کو لیے ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ صدمے سے اماں جی کے اعصاب ٹھٹھر گئے تھے مگر وہ چونک پڑیں۔ نازنین کا سر ان کے سینے پر ڈھلک گیا تھا۔

دلاور مطربہ کے پاس سے ... وہ بے جھک اٹھ آئی تھی مگر آج ریسٹ ہاؤس پر ... ہو گی۔ فجر کا وقت ہونے والا تھا۔ اس نے ایک نگاہ مطربہ پر ڈالی اس میں دکھ بھی تھا اور ملامت بھی۔

"تمہارا بہت شکریہ مطربہ۔ تم فکر نہ کرو۔ میں جو بھی کروں گی اس میں تمہارا نام نہیں آئے گا۔ اپنے حصے کی تو تم پہلے ہی سے بھگت رہی ہو۔ میرے تو یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں کہ میں اپنی بہن سے ملوں گی۔ جسے تصویروں میں دیکھتی رہی اور مرحومہ جان کر ایصال ثواب پہنچاتی رہی۔ اسے اپنے سامنے دیکھوں گی۔"

"آپ ان سے ملیں گی۔" بالو نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تو یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ میں نازو نعم کی پلی نہیں ہوں، میرے حصے میں نہ کوئی زعفران زار آیا ہے نہ شہزادہ علی خان۔"

"آپ نے مجھ پر بھروسہ نہیں۔؟" مسٹر کی آواز بھرا رہی تھی۔

"تم نے مجھے بہن کے زندہ ہونے کی نوید دی ہے شاید اس لئے۔"

ماہین کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نشان نہیں تھا، وہ لاؤنج سے نکل کر باہر آئی۔ تو اس کے اندر جوش ابلتا محسوس ہو رہا تھا۔ بالائی زینہ چڑھ گئی۔ وہ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھی تھی تو یاری اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

"جلدی جاگ گئے یا سرے سے سوئے ہی نہیں میری طرح؟" اس نے بڑی سی خوبصورت نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

"نہیں، سو کر آ رہا ہوں۔ روزانہ اسی وقت اٹھتا ہوں۔ البتہ آپ۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

ماہین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

"تمہاری عمر اتنی نہیں ہے یاری۔ مگر کمال سمندر سے ہو تم۔ اتنا سیلف کنٹرول؟" وہ دوستانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ارے نہیں۔ میں تو خاصا آؤٹ آف کنٹرول ہوں۔" وہ ہنس دیا۔

"مگر کسی سے کام لے رہے ہو، تازہ ترین ثبوت تو یہ ہے کہ تم نے مجھ سے آج صبح یہاں نظر آنے کی وجہ نہیں پوچھی حتی کہ چونکے تک نہیں۔"

وہ اسے گرفت میں لے رہی تھی۔

"اس میں چونکنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ آپ کا گھر ہے۔ آپ جب چاہیں۔ جہاں چاہیں نظر آ سکتی ہیں۔" یاری کا انداز بدستور تھا۔

"خیر تمہارے بھی پیچھے پڑوں گی ایک دن۔ فی الحال تو اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ امتحان کی تیاری رکھنا۔" وہ اس کی سمت دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔

"آل ریڈی پیچھے بھولے ہوئے ہیں۔ وہ بھی کئی لوگ ہیں ادھر پیچھے چھڑانے کے لیے۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"خالہ! وہ لوگ ہری پور پہنچے ہوئے ہیں۔" ماہین رکی اور پلٹ کر بولی۔ ہادی بڑی بے ساختگی سے ہنس دیا۔

داور علی خان تین دن کراچی گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے کمرے میں جاتے ہوئے تو کوئی الجھن نہیں تھی۔ آنکھوں میں نیند تھی کہ سونے کی جلدی ہو۔ نہا دھو غسل کر کے پہلے نماز بھی پھر قرآن کی تلاوت کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں پھر سورۂ فتح شروع کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو بہنے لگے۔ بمشکل سورۃ تمام کی اور قرآن کو واپس رکھ دیا۔

اس کی کیفیت خود اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ ڈھیر سارے پیچھے اور ماہین کے گلے لگ کر رو رو کر دل ہلکا کر دے۔

وہ بے قرار سے انداز میں باہر نکل آئی اور ہال کی طرف بڑھی۔ وہاں فون کے ساتھ چھوٹی سی ڈائریکٹری رکھی ہوئی تھی۔ وہ بے تابی سے سرائے کا نمبر تلاش کرنے لگی۔ "ایس" کے کالم میں سرائے کے حساب سے دیکھا۔ پھر "ٹی" (T) کا کالم دیکھا کہ شاید تیمور علی خان کا نمبر درج ہو۔ پھر "کے" (K) کا کالم کہ شاید "خان" کے حساب سے نمبر درج ہو۔ مگر کسی طرح بھی کوئی نمبر ہاتھ نہیں لگا۔ مارے کوفت کے اس کا جی چاہا ڈائریکٹری دیوار پر دے مارے۔

سوا اسے خیال آیا کہ چلتی پھرتی ڈائریکٹری تو ہادی کی صورت میں موجود ہے۔ اور اس سلسلے میں تو وہ کوئی جواب نہیں سکتا۔ اس کے اندر جیسے برقی رو دوڑ گئی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اوپر پہنچی۔ اور آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

"ہادی اپنے کمرے میں نہیں ہے ماہین! ابھی تو میں نے کچھ دیر ہوئی باہر جاتے دیکھا تھا۔" اسے پیچھے سے عالم جب کی آواز آئی۔

وہ چونک کر پلٹی۔ دل میں کچھ عجیب سی بے کلی ہونے لگی۔

"وہ۔ مجھے ہادی صاحب سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔ مگر ان کا نمبر مجھ سے کہیں مس ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا شاید ہادی کو پتا ہو۔" وہ ذرا سنبھل گئی۔

"ہاں اسے سب نمبر پتا ہوتے ہیں مگر اس وقت تو وہ باہر ہے۔ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں۔" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں بھابی بیگم! پریشانی کی تو کوئی ایسی بات نہیں۔ بس ہوتے ہیں کچھ پرسنل۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"ہاں، جب میں نماز پڑھ کر لیٹے گی تو وہ باہر جاتا دکھائی دیا تھا۔ جانے کون کون سے کام اپنی جان کو لگا رکھے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور بس شروع۔ میں تو بس اسے مصروف ہی دیکھتی ہوں۔ اللہ اسی طرح چلتا پھرتا رکھے۔ صحت تندرستی دے۔ ماشاء اللہ کسی کام سے نہیں گھبراتا۔ جب ہی بڑے خان اس کی اتنی قدر کرتے ہیں۔ وہ چار روز کو کراچی یا سرائے چلا جائے تو بڑے خان کو بات بے بات غصہ آنے لگتا ہے۔ وہ آگے سے آگے ان کے کام سنبھال لیتا ہے۔"

عالم جب بہت بہت سے اس کا ذکر کر رہی تھیں۔

"مگر میرا خیال ہے یاور صاحب تو اسے بہت معمولی آدمی سمجھتے ہیں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ عالم جب اس کے لہجے سے کچھ چونکی تھیں۔ اور اس کی شکل بغور دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یاور کا انداز تو سب ہی کے ساتھ بہت مختلف والا ہوتا ہے۔ تم آؤ میرے کمرے میں۔ وہاں چلتے بیٹھتے ہیں۔ یہ تو جنگ میں جا چکے ہیں۔ دادا جان کے پاس جا رہے ہیں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ ماہین چپ چاپ ان کے پیچھے چل پڑی۔

"تمہاری ساس کی کوئی تصویر نہیں ہے بھابی بیگم۔ حیرت کی بات ہے۔" وہ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

عالم جب کی حیرت فطری تھی۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد آج اسے یہ کیا خیال آیا تھا۔ مگر انہوں نے حیرت چہرے سے ظاہر نہیں کی۔

"اماں بیگم اماں جی کو بہت ہی شرم و حیا والی تھیں۔ کبھی تصویر نہیں کھنچوائی۔ بڑا سخت پردہ کرتی تھیں۔ اصل میں ان کی تربیت ہی اس طرح کے ماحول میں ہوئی تھی۔ تمہیں حیرت ہوگی یہ سن کر کہ وہ زندگی میں کبھی بازار نہیں گئیں۔ ان سے کبھی پوچھتے کہ آپ کا دل نہیں چاہتا کہ گھومیں پھریں، خریداری کریں تو بڑی سادگی سے کہتی تھیں کہ عورت کو گھر کے کام تھوڑے ہیں۔ گھر سے اچھا کچھ نہیں ہوتا۔"

"سنا ہے وہ بہت اچھی تھیں، بہت ہی اچھی۔"

عالم جب نے ایک مرتبہ پھر تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔ (آج صبح صبح اماں جی کیسے یاد آ گئیں؟)

"خیریت۔ کیا رات خواب میں آئی تھیں اماں جی؟" وہ کچھ حیران سی تھیں۔

"یونہی بس۔" وہ بھی مسکرا دی۔

"ہاں وہ بہت بھلی عورت تھیں۔ ٹھنڈی چھاؤں۔ محبت کا سمندر۔ حویلی کا اجالا۔ بس صدمہ اتنے سے کر بیٹھی تھیں۔ حسرت ہی رہی کہ ہم ان کی خدمت کرتے۔ بس ایک رات سوتے ہی میں چل بسیں۔ بڑے خان کو پہلے اتنی جلدی غصہ نہیں آتا تھا۔ بڑا صدمہ تھا ان میں۔ کہتے تھے کہ غصہ تو بہت آتا تھا مگر اس بھلی عورت کی موجودگی کے احساس سے خود بخود جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔ نہ ان میں شور تھا نہ اونچی آواز۔ بہت دبی چال چلتی تھیں۔ اس کے باوجود گھر کے کونے کونے میں محسوس ہوتی تھیں۔"

"وہ صدمے کیا تھے جو انہیں لے کر رہی تھیں؟" ماہین نے ان کے جملے پر گرفت کر لی تھی۔

"ہزار باتیں ہوتی ہیں گھروں کی۔ میرے بچوں کا تو بہت غم کرتی تھیں۔" عالم جب نظریں اٹھائے بغیر یوں بولیں جیسے انہیں موضوع بدلنے کی جلدی ہو۔

"بہت خوش قسمت لوگ ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ وقت گزارا۔" ماہین نے عام سے انداز میں ٹکڑا لگایا۔

عالم تاب خاموش ہو کر اپنی ہتھیلیاں غور سے دیکھنے لگیں۔ یہ حرکت غمازی کر رہی تھی کہ وہ کچھ سوچ رہی ہیں۔

"اچھا میں نے ایک بات اور نوٹ کی کہ آپ لوگوں کی بھی تصویریں نہیں ہیں۔ ایسا تو نہیں ہیں انہیں تصویریں کھنچوانے کا بہت شوق تھا؟" جانے کیوں بلا ارادہ اس کے منہ سے کچھ نہ کچھ نکل جاتا تھا۔

اسی دم ماما چائے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

"ماما! باری نظر آئے تو اسے کہنا ماہین بلا رہی ہیں۔ انہیں کوئی کام ہے۔" عالم تاب نے ماما کو تاکید کی۔

ماما خاموشی سے چائے تیار کرنے لگی۔

"ہاں بس۔ حویلی میں رواج نہیں ہے عورتوں کی تصویریں وغیرہ لگانے کا۔ ہوں گی تو کسی بکس میں رکھی ہوں گی ادھر ادھر دیکھوں گی میں۔"

وہ ٹالنے کے انداز میں جواب دے رہی تھیں۔

ماما نے کپ اٹھا کر پہلے عالم تاب کو تھمایا پھر ماہین کو۔

"جس زمانے میں یہ جوان تھیں۔ اس وقت تو ماما بھی ایک دم جوان ہوں گی۔ کیوں بھابی بیگم؟"

ماہین نے دلچسپی سے ماما کا سراپا دیکھا۔ "شادی کیوں نہیں کی ماما تم نے؟" اس نے ماما کے زرد چہرے کو دیکھا۔ "تمہارے لیے تو بہت رشتے آئے ہوں گے؟"

"ضروری تو نہیں کہ ہر عورت کی شادی ہو۔ شادی کرتے نہیں ہیں ماہین بی بی شادی تو ہوتی ہے۔ اب دیکھیں آپ اتنا وقت یوگنڈا میں گزار کے آئیں کتنے لوگ ہوں گے جو آپ کو وہاں پسند کرتے ہوں گے مگر آپ کا دانہ پانی تو حویلی میں لکھا تھا۔ کیوں بڑی بیگم؟" ماما بہت شفیق انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

"بڑی موتیوں میں تولے جانے والی بات کہی ہے ماما تم نے؟" عالم تاب نے تائید کی۔

"کبھی دل تو چاہا ہو گا ماما کہ تبدیلی آئے۔" ماہین نے ماما کو چھیڑا۔

"دل کے چاہنے کو چھوڑیے ماہین بی بی۔ دل تو جانے کیا کیا چاہتا ہے۔ دل کے چاہنے پر چلیں تو زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ جو گھڑی خیر کی گزر جائے شکر ہے۔" ماما گھٹنوں پر ہاتھ جما کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آج ماہین بی بی کو جانے کیا کیا خیال آ رہے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے عالم تاب سے مخاطب ہوئی۔

"یہی میں سوچ رہی ہوں۔ دراصل آج کل یہ اور کہیں ہیں تنہائی میں غور و فکر ہو رہا ہو گا۔" عالم تاب بھی مسکرا دیں۔

"باری کا دھیان رکھنا ماما۔ ملے تو کہنا ماہین بی بی بلا رہی ہیں۔" عالم تاب نے مزید تاکید کے طور پر کہا۔

"جی اچھا۔ ویسے مشکل ہے خان اگر باہر گئے ہیں تو وہ پہر سے پہلے نہیں آئیں گے۔ انہیں کچہری جانا تھا شاید تاریخ لینے۔ ناشتہ انہوں نے مکن میں کیا تھا۔ تیار ہو رہے تھے۔" ماما باہر نکلتے ہوئے بولی تھی۔

"چلیں خیر۔ کوئی بات نہیں اگر میں سو گئی تو انہیں روک کر رکھنا آ جائیں۔ تو ویسے بھی ادھر پاس میں ہی چکر ہے۔" ماہین نے کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

"ابھی سونے کا پروگرام ہے اس وقت۔ رات دیر سے سوئی تھیں؟" عالم تاب نے الجھن بھرے انداز میں سوال کیا۔

"جی۔ بس نیند ہی نہیں آئی رات بھر۔" اس نے نظریں چرا کر جواب دیا۔

"روشی کی طرف سے فکر ہو گی۔ مگر فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ اب وہ بچی نہیں ہے۔" عالم تاب نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی تسلی دی۔

"بہت ضد ہے اس کی طبیعت میں۔ لڑکیوں میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔ عورت کی تو تمام عمر سمجھوتے کرتے گزرتی ہے تم اسے سمجھانا۔ باری بھی بہت اڑیل ہے اور باپ سے الجھنا تو یوں بھی کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔" عالم تاب نے اسے روشی کی اصلاح کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی۔

"بات تو سننا چاہیے بھابی بیگم۔ عورت مرد کا فرق کیا معنی۔ نکاح سے تو دونوں ہی کے مشترک ہوتے ہیں اور باپ تو خاص طور پر اپنی اولاد کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے تب ہی وہ سمجھانے کی پوزیشن میں آ سکتا ہے۔"

ماہین نے نرم انداز میں اختلاف کیا۔

عالم تاب نے ایک نظر ماہین کو دیکھا اور مصلحت آمیز خاموشی اختیار کی۔

شام ڈھلنے میں کچھ دیر تھی مگر حویلی میں مکمل طور پر روشنی ہو چکی تھی۔ جب تھکے ہارے باری نے حویلی میں قدم رکھا تھا۔ ہال کمرے کے قریب سے گزرے بغیر وہ اپنے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ فون کی گھنٹی اس کے راہداری میں قدم رکھنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں دروازے کی سمت دیکھا اور اندر داخل ہو کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔"

"کون؟ باری؟" دوسری طرف روشی تھی۔

باری کے اونگھتے ہوئے حواس ایک دم جاگ پڑے۔ "روشی! تم؟"

"جناب!" خود بخود اس کا لہجہ شریر ہو گیا۔

"جناب کے بچو! وہ۔ یہ کیا طریقہ ہے فون تک نہیں کیا؟" روشی کے لہجے میں بلا کی برہمی تھی۔

"خیر۔ جناب کے بچے تو نہیں اب تو سب ہی کچھ ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے فون کس سلسلے میں کرنا چاہیے تھا۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"باری! میں رو رو کر پاگل ہو چکی ہوں۔ مجھے مزید تنگ نہیں کرو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بتائیے۔ آپ کو تنگ کر کے مجھے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا مگر آپ یہ تو بتائیں مجھے فون کیوں کرنا چاہیے تھا۔" وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرا دیا۔

"باری! امیر اول جلول ہے میں مر جاؤں۔"

"واہ صاحب! کیا دل ہے آپ کا۔ موت بھی ایسے چاہ رہا ہے جیسے آئس کریم۔"

"تم بھی میری جان جلانے والی حرکتیں کرتے رہنا۔ بعد میں میری قبر کے سرہانے سر پکڑ کر روتے رہنا۔" وہ جھلائی۔

"سر پکڑنے کی پابندی ہوگی؟" وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے بس کی بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ کاغذ کے شیر ہو۔ یہ تو میری جراتوں کا نتیجہ ہے۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی جیسے کوئی اور خیال آ گیا ہو۔ توقف کے بعد پھر بولی۔

"ہادی! میں بے لگام نہیں ہوں اور میں نے کسی طمانیت سے قدم گھر سے باہر نہیں نکالے تھے۔

میں تو کاکا جان کے پاس اس لیے گئی تھی کہ وہ مجھے بخشیں پھر حویلی والوں کو سمجھائیں۔ مجھے پتا ہے بابا صاحب کاکا جان کی بات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ سب تو کاکا جان نے خود..." اس نے جیسے خود کو روکا۔

ہادی بہت توجہ اور دلچسپی سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس لمحے اپنے چہرے کا تحفظ کرتی روشی رونق بن کر اس کے حواسوں پر چھانے لگی۔

"آپ کیا ہیں، اس وجہ سے ہیں مجھے سب پتا ہے۔ آپ کیوں خود کو اتنا الجھاتی ہیں میری جان؟"

اس نے بہت آہستگی سے اسے تنگ کرنے کی انتہا کر دی تھی اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" روشی ایک دم حواس باختہ سی ہوگئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل بھاگے گا۔

"مجھ سے آئندہ اس طرح بات مت کرنا۔" اس نے ناراض انداز میں درحقیقت گھبرا کر فون بند کیا تھا۔ ہادی نے ریسیور کان سے ہٹا کر سر کھجاتے ہوئے ریسیور کو کچھ دیر گھورا۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی ہوگی کیوں فون کیا تھا۔

"غلطی ہوگئی میڈم۔ مگر معاف کیجیے گا بالکل بے کار ہیں آپ۔ ایک جملہ نہیں سہہ سکیں۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر لٹکا دیا اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی پر کوئی خوبصورت سی دھن بجاتا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ سارا اضمحلال، ساری تھکاوٹ اڑن چھو ہوگئی تھی۔ چال بتا رہی تھی کہ طبیعت بہت ہلکی ہے۔

"خان! آپ کا فون ہے" مرسوتی نے دروازے سے جھانک کر ہادی کو مخاطب کیا۔

ہادی نے چونک کر کتاب بند کی۔ "کس کا ہے؟" اس کا دھیان روشی کی طرف گیا تھا۔

"جی یاور خان کا ہے۔ کراچی سے" وہ اتنا کہہ کر پلٹ گئی۔

ہادی سوچنے کے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب تو جیسے یہی چونکا رہی تھی۔ انسان بہت سے رازوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہو تو خواہ مخواہ کے دھڑکے لگے رہتے ہیں۔

وہ بڑی تیزی سے زینے طے کر کے نیچے آیا تھا۔

"السلام علیکم خان۔" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"وعلیکم السلام۔ ایکچلی ایسا ہے ہادی کہ تمہیں ہری پور جانا ہے۔ وہاں میرے پی۔ اے شیخ اسد اللہ سے کہنا کہ وہ جو

ووٹ ہوا تھا۔ اس کی تاریخ چیک کر کے بتائیں اور اس کی فائل تمہیں دے گا۔ میں وہاں سے سیدھے پہنچیں گے وہ فائل لے کر سیدھے حویلی جانا ہوگا۔ حویلی میں بھی کچھ کاغذات ہیں وہ لے کر میں پشاور نہیں جا سکتا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم خود ان پر نظر کر کے ہری پور چلے جانا۔ یہ فائل نہایت اہم ہے۔ بہت احتیاط کرنا۔ وہاں ہو سکتا ہے کوئی شخص تم سے فائل لے کر دیکھنا چاہے تو ہرگز ایسا نہ ہونے دینا۔ کوشش میں اسی کام کے لیے تمہیں بھیج رہا ہوں۔ جب تم ہری پور پہنچو تو شیخ اسد اللہ سے کہو وہ مجھے کراچی رنگ کر لیں۔"

ہادی توجہ سے ہدایت سن رہا تھا۔

"جی خان۔ اور کچھ؟"

"نہیں۔ ماہین ٹھیک ہیں۔ ان کو بتا دینا میں پرسوں صبح حویلی پہنچوں گا۔ اوکے۔" انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

ہادی نے ریسیور رکھتے ہوئے کچھ سوچا اور مسکرا دیا۔

"اللہ کی مہربانی ہے اور کیا ہے۔ کسی کی پریشانی میں کسی کا سکون پوشیدہ ہوتا ہے۔ پیارے کھیل ہیں میرے مولا۔" اس کے انگ انگ سے سرور جھلک رہا تھا۔

وہ جا کر ماہین کو کمرے سے بلا لایا۔

"السلام علیکم۔ ٹھیک ہیں آپ۔ ڈی سی کی لائف بہت بزی (Busy) ہوتی ہے۔ جیجی صاحب۔"

"ہو سکتا ہے پریشانی بھی بہت ہوتی ہو مگر ڈی سی صاحب ظاہر نہ کرتے ہوں۔"

ماہین پھیکی سی ہنسی ہنس کر گویا ہوئی۔

"آپ کے ساتھ تو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اب تو انہیں بہت ایزی فیل کرنا چاہیے" ہادی نے مسکراتے ہوئے برجستہ کہا۔

"اور کوئی کہے تو کوئی بات نہیں۔ مگر تم نہ کہو۔ تمہاری بیوقوفی تمہارا اسپیشل (جوہر) ہے۔ وہ تو بات تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔" ماہین اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہ رکھ سکی۔

ہادی کی مسکراہٹ ایک دم ہوا ہوگئی۔ اس نے بہت الجھ کر ماہین کی طرف دیکھا۔

آج وہ اسے بہت بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔ بدلے بدلے انداز تو گزشتہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا مگر اس کے ساتھ وہ اب سے پہلے تک سابقہ انداز میں بات کرتی رہی تھی۔ تبدیلی جو دوسروں کے ساتھ اس نے نوٹ کی تھی وہ یہی تھی کہ وہ حویلی کی خواتین سے بہت دور دور نظر آنے لگی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔

"یاور صاحب کا فون تھا؟"

"جی۔" اس نے سنجیدگی اور احتیاط سے جواب دیا۔

"مجھ سے بات کرنے کی خواہش نہیں کی تمہارے خان نے؟" وہ بے حد تلخ لہجے میں مخاطب تھی۔

"وہ بہت جلدی میں تھے۔ آپ کا پوچھ رہے تھے اور آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ پرسوں صبح حویلی پہنچیں گے۔" اس نے

"یاور صاحب! کیا دل ہے آپ کا۔ موت بھی ایسے چاہ رہا ہے جیسے آئس کریم۔"

"تم بھی میری جان جلانے والی حرکتیں کرتے رہنا۔ بعد میں میری قبر کے سرہانے سر پکڑ کر روتے رہنا۔" وہ جھلائی۔

"سر پکڑنے کی پابندی ہوگی؟" وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے بس کی بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ کاغذ کے شیر ہو۔ یہ تو میری جراتوں کا نتیجہ ہے۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی جیسے کوئی اور خیال آ گیا ہو۔ توقف کے بعد پھر بولی۔

"ہادی! میں بے لگام نہیں ہوں اور میں نے کسی طمانیت سے قدم گھر سے باہر نہیں نکالے تھے۔

میں تو کاکا جان کے پاس اس لیے گئی تھی کہ وہ مجھے سمجھیں پھر حویلی والوں کو سمجھائیں۔ مجھے پتا ہے بابا صاحب کاکا جان کی بات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ سب تو کاکا جان نے خود..." اس نے جیسے خود کو روکا۔

ہادی بہت توجہ اور دلچسپی سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس لمحے اپنے چہرے کا تحفظ کرتی روشی بن کر اس کے حواسوں پر چھانے لگی۔

"آپ کیا ہیں، اس وجہ سے ہیں مجھے سب پتا ہے۔ آپ کیوں خود کو اتنا الجھاتی ہیں میری جان؟"

اس نے بہت آہستگی سے اسے تنگ کرنے کی انتہا کر دی تھی اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" روشی ایک دم حواس باختہ سی ہوگئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل بھاگے گا۔

"مجھ سے آئندہ اس طرح بات مت کرنا۔" اس نے ناراض انداز میں درحقیقت گھبرا کر فون بند کیا تھا۔ ہادی نے ریسیور کان سے ہٹا کر سر کھجاتے ہوئے ریسیور کو کچھ دیر گھورا۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی ہوگی کیوں فون کیا تھا۔

"غلطی ہوگئی میڈم۔ مگر معاف کیجئے گا بالکل بے کار ہیں آپ۔ ایک جملہ نہیں سہہ سکیں۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر لگا دیا اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی پر کوئی خوبصورت سی دھن بجاتا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ سارا اضمحلال، ساری تھکاوٹ اڑن چھو ہوگئی تھی۔ چال بتا رہی تھی کہ طبیعت بہت ہلکی ہے۔

"خان! آپ کا فون ہے۔" سرسوتی نے دروازے سے جھانک کر ہادی کو مخاطب کیا۔

ہادی نے چونک کر کتاب بند کی۔ "کس کا ہے؟" اس کا دھیان روشی کی طرف گیا تھا۔

"جی یاور خان کا ہے۔ کراچی سے۔" وہ اتنا کہہ کر پلٹ گئی۔

ہادی سوچنے کے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب تو ہر بات ہی چونکا رہی تھی۔ انسان بہت سے رازوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہو تو خواہ مخواہ کے دھڑکے لگے رہتے ہیں۔

وہ بڑی تیزی سے زینہ طے کر کے نیچے آیا تھا۔

"السلام علیکم خان۔" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"وسلام۔ ایک تو کیا ایسا ہے ہادی کہ تمہیں حویلی پہنچنا ہے۔ وہاں میرے پی۔ اے شیخ اسد اللہ سے کہنا کہ وہ جو فائل

وہ سوٹ کیس میں ہوا تھا۔ اس کی تاریخ چیک کر کے بتائیں اور اس کی فائل تمہیں دے دے گی۔ میں وہاں پہنچوں گا اور وہ فائل لے کر پہنچنا ہے۔ حویلی میں بھی کچھ کاغذات ہیں وہ بھی لے آنا۔ میں خود نہیں جا سکتا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم خود ان کو لے کر جلدی پہنچ جاؤ۔ یہ فائل بہت اہم ہے۔ بہت احتیاط کرنا۔ وہاں موجود اگر کوئی شخص تم سے فائل لے کر دیکھنا چاہے تو ہرگز ایسا نہ ہونے دینا۔ کوشش میں اس کام کے لیے تمہیں بھیج رہا ہوں۔ جب تم حویلی پہنچو تو شیخ اسد اللہ سے کہنا وہ مجھے کراچی رنگ کر لیں۔"

ہادی توجہ سے ہدایت سن رہا تھا۔

"جی خان۔ اور کچھ؟"

"نہیں۔ ماہین ٹھیک ہیں۔ ان کو بتانا میں پرسوں صبح حویلی پہنچوں گا۔ اوکے۔" انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

ہادی نے ریسیور رکھتے ہوئے کچھ سوچا اور مسکرا دیا۔

"اللہ کی مہربانی ہے اور کیا ہے۔ کسی کی پریشانی میں کسی کا سکون پوشیدہ ہوتا ہے۔ پیارے کھیل ہیں میرے مولا۔" اس کے انگ انگ سے سرور چھلک رہا تھا۔

وہ پلٹا تو ماہین کو کھڑے پایا۔

السلام علیکم۔ ٹھیک ہیں آپ۔ ڈی سی کی لائف بہت بزی (Busy) ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ۔"

"ہو سکتا ہے پریشانی بھی بہت ہوتی ہو مگر ڈی سی صاحب ظاہر نہ کرتے ہوں۔"

ماہین پھیکی سی ہنسی ہنس کر گویا ہوئی۔

"آپ کے ساتھ تو پریشان نہیں ہونا چاہیے اب تو انہیں بہت ایزی فیل کرنا چاہیے" ہادی نے مسکراتے ہوئے برجستہ کہا۔

"اور کوئی کہے تو کوئی بات نہیں۔ مگر تم نہ کہو۔ تمہاری بیوقوفی تمہارا اسمنس (جوہر) ہے۔ وہ اصلی بات تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔" ماہین اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہ رکھ سکی۔

ہادی کی مسکراہٹ ایک دم ہوا ہوگئی۔ اس نے بہت الجھ کر ماہین کی طرف دیکھا۔

آج وہ اسے بہت بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔ بدلے بدلے انداز تو گزشتہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا مگر اس کے ساتھ وہ اب سے پہلے تک سابقہ انداز میں بات کرتی رہی تھی۔ تبدیلی جو دوسروں کے ساتھ اس نے نوٹ کی تھی وہ یہی تھی کہ وہ حویلی کی خواتین سے بہت دور دور نظر آنے لگی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔

"یاور صاحب کا فون تھا؟"

"جی۔" اس نے سنجیدگی اور احتیاط سے جواب دیا۔

"مجھ سے بات کرنے کی خواہش نہیں کی تمہارے خان نے؟" وہ بے حد تڑخے لہجے میں مخاطب تھی۔

"وہ بہت جلدی میں تھے۔ آپ کا پوچھ رہے تھے اور آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ پرسوں صبح حویلی پہنچیں گے۔" اس نے

ماہین کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگانا چاہا کہ نکاح کے بعد کیا تبدیلی آئی ہے۔ مگر وہ نارمل محسوس ہوئی۔

"ہاری۔"

"جی؟"

"وہ تمہارے تیمور خان جو ہیں۔ ان کی حویلی کا فون نمبر ڈائریکٹری میں نہیں ہے۔ میں نے بہت کوشش کی۔ تم تو اس حویلی کے آپریٹر بھی ہو۔ تمہیں تو زبانی یاد ہوگا" ماہین نے بہت مہارت سے گھیرا۔

"تیمور خان۔ آپ کیا بات کرنا چاہتی ہیں ان سے؟" وہ اچانک گڑبڑا گیا۔

"کیوں۔ کیا میں ان سے بات نہیں کر سکتی؟ وہ یاور صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔ میری ان سے بہت قریبی رشتے داری ہے"

ماہین نے تیکھے انداز میں جواب دیا جس کی وجہ سے ہاری کو بات کرنے میں دشواری محسوس ہوئی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں۔ تو ایک بات کہوں آپ سے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"جب بات کہے بنا چارہ نہ ہو تو یہ پروا نہیں کرتے کہ کوئی مائنڈ کر جائے گا۔ بس بات کر دینا چاہیے"

وہ بہت ناراض سی محسوس ہوئی۔

"وہ بات صرف اتنی ہے کہ آپ تیمور خان سے بات کرنے سے پہلے یاور خان سے اجازت لے لیں۔ میرا خیال ہے اگر آپ نے ان کی اجازت کے بغیر بات کر لی تو وہ ناراض ہوں گے۔ میں آپ کو کسی خواہ مخواہ کی الجھن سے بچانے کے لیے ایڈوائس۔ یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ یا پھر آپ بڑے خان سے ڈسکس کر لیں۔"

"کیوں؟ یاور صاحب کیوں اعتراض کریں گے۔ میں فیملی ممبر ہوں۔ کسی دوسرے فیملی ممبر سے بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ یہ تو روٹین لائف کا ایک حصہ ہے۔"

وہ تو یوں بھی دلیل دینے میں ایکسپرٹ تھی۔ خفا خفا سے انداز میں گویا ہوئی۔

"آپ ابھی تک نہیں سمجھیں۔ دونوں بھائیوں کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو یہ مشورہ دیا تھا۔" وہ نروس ہونے لگا۔

"کیوں؟ کس وجہ سے؟" اس نے ہاری کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

"شاید پراپرٹی وغیرہ کا مسئلہ ہوگا۔ فیوڈل لارڈز میں اس طرح تو ہوتا رہتا ہے۔" وہ نگاہیں چراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بابا صاحب کی موجودگی میں اس طرح کا مسئلہ تو نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور بات ہوگی۔" وہ بدستور اسے کھوج رہی تھی۔

"میں تو اندازے سے بات کر رہا ہوں۔ حقیقت کیا ہے وہی جانتے ہوں گے۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔

"ہاری! مجھے فون نمبر چاہیے" وہ قطعی انداز میں بولی۔

"آپ یقین کریں پرمیشن نہیں ہے۔ کیوں مجھے حویلی سے نکلوائیں گی۔" وہ سنجیدگی سے انکار کر رہا تھا۔

"حویلی سے کوئی نہیں نکالے گا۔ یاور صاحب کو تو میں خود ہینڈل کر لوں گی۔" وہ مصر تھی۔

"بڑی پرابلم ہو جائے گی۔ پلیز آپ سمجھیں۔"

"ہاں اگر اجازت دیں تو میں بڑے خان سے بات کرنے کے بعد آپ کو نمبر دے سکتا ہوں۔"

اس نے جان چھڑانے کے لیے ایک حل نکالا۔

اور ماہین واقعی اس کے دام میں آ گئی۔

"ٹھیک ہے تم ابھی بڑے خان سے بات کرو اور مجھے نمبر دو۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" وہ واپسی کی نیت سے پلٹ گئی۔

"ویسے اف یو ڈونٹ مائنڈ آپ تیمور خان سے بات کیا کرنا چاہتی ہیں ہو سکتا ہے اس سلسلے میں آپ کی کچھ ہیلپ کر سکوں۔" اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"ساری حویلی میں صرف تم ہی میری ہیلپ کر سکتے ہو۔ مگر افسوس تم کرتے نہیں۔ فی الحال تو میری ہیلپ یہی ہے کہ تم مجھے تیمور علی خان کا نمبر دو۔" وہ یہ کہہ کر چل پڑی۔

ہاری ایک دم کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

ایک تو طویل ڈرائیو دوسرے ماہین کا بدلا بدلا انداز پھر اس کا تیمور علی خان کے فون نمبر کے لیے اصرار۔ حویلی پہنچتے پہنچتے اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ ساری سرمستی ہوا ہو چکی تھی۔ رات کو دس بجے وہ حویلی پہنچا تھا۔ سبزے کی کثرت نے ماحول میں رات کے وقت گہرے سائے اندھیرے پھیلا دیے تھے۔ وہ کوٹھی میں داخل ہوا تو صرف ایک ملازم جاگتا ہوا ملا۔ اس کی متلاشی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک کر ملازم پر آ کر ٹھہر گئیں۔

"سب سو گئے؟"

"جی خان۔ سردیاں ہوتے ہی تو سب جلدی سونے چلے جاتے ہیں۔" ملازم نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"اور۔ وہ تمہاری روشنی بی بی؟" اس نے دبے دبے انداز میں پوچھا۔

"وہ جی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کمرے سے باہر نہیں نکلیں۔ آج تو انہوں نے نہ دوپہر کو کھانا کھایا اور نہ رات کو۔ بہت فکر ہو رہی ہے مجھے۔"

ملازم کا انداز بہت اپنوں جیسا تھا۔

"چائے وغیرہ پی؟" ہاری کی پریشانی چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔

"نہیں جی انہوں نے تو دروازہ ہی نہیں کھولا۔"

"ناک کیوں نہیں۔ آواز وغیرہ تو دی تم لوگوں نے۔" وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔

"جی خان۔ جب دستک دیتے ہیں تو بولتی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں اس طرف آنے کی۔" ملازم نے فکرمندی سے

جواب دیا۔ "میں تو دعا کر رہا تھا کہ جلدی سے آ جائیں یا بیگم صاحبہ ہی آ جائیں۔" وہ مزید گویا ہوا۔

"اچھا تم ایسا کرو، کھانا گرم کرو۔ میں ذرا ہاتھ لے لوں۔ چینج کر کے آتا ہوں۔" وہ تیزی سے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ایک رات ہی تو تھی اس کے پاس۔

جلدی جلدی ہاتھ لے کر شب خوابی کا ہی لباس پہن لیا تھا اور تولیے سے بال خشک کر کے تولیہ کندھے پر پھیلایا ہوا بال سلجھائے بغیر باہر آ گیا۔ ملازم ہراساں سمیت اسے منتظر ملا۔

"کس طرف ہے بی بی کا کمرا؟"

ملازم نے ایک سمت اشارہ کر دیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ملازم ہراساں کھسیانا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

ہادی نے کمرے کے سامنے رک کر ملازم کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ "یہی ہے؟"

ملازم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

ہادی نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ جواب میں وہی خاموشی۔ ہادی نے دروازہ دھکیل دیا۔

"کیا بدتمیزی ہے اسی کے ملازم ہوا ہو گی؟" روشی کے چلانے کی کیفیت عیاں تھی۔

ہادی نے پھر دروازے پر دستک دی۔

"کہہ دیا ناں مجھے پریشان نہیں کرو۔ جاؤ یہاں سے۔" وہ بری طرح دھاڑی۔

"بی بی! خان آئے ہیں آپ سے ملنے۔" ہادی کو مسلسل خاموش دیکھ کر ملازم سے رہا نہ گیا تو بول ہی پڑا۔

"تم نے بتایا نہیں تھا۔ بتا دو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" روشی کی جھلی جھلی سی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ روشی ایک دم چونک کر پیچھے ہٹی تھی۔

وہ اس طرح ہادی کو دیکھ رہی تھی جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

ہادی نے آگے بڑھ کر دائیں بائیں سوئچ بورڈ تلاش کیا پھر لائٹ آن کر کے نائٹ بلب آف کر دیا۔

کمرے میں تیز روشنی ہو چکی تھی۔ روشی ابھی تک حیران پریشان کھڑی آنکھیں جھپک رہی تھی۔

"یہ ٹرالی یہاں لے آؤ اور جا کر ایک کپ کافی بنا لاؤ ابھی۔" ہادی نے منتظر ملازم کو مخاطب کیا۔ وہ مشینی انداز میں ٹرالی کمرے کے درمیان میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

روشی ابھی تک جیسے ساکت سی کھڑی تھی۔

ہادی نے قدم بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔

"دروازہ بند نہیں کرو۔" وہ بے ساختہ انداز میں ٹوک رہی تھی۔

"دروازہ تو پہلے بھی بند تھا۔" ہادی نے ایک نگاہ پرشوق اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ پنک کلر کے سوٹ میں جس پر پھولوں

سے جال بن چکا تھا۔ چہرہ وہ بہت زرد اور بیمار سی محسوس ہوئی۔ بال بھی بے ترتیب تھے البتہ ناک میں چمکتی ڈائمنڈ کی لونگ اس کی سب سے بڑی آرائش تھی۔ بہت سج رہی تھی اس پر۔

"پہلے میں نے کہا تھا۔" وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"اچھی پہلے آپ کیا کہتی تھیں مگر اب ہم وہیں مگر ایک۔" ہادی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور شانوں پر سے تولیہ اتار کر سر رگڑنے لگا۔

"تو یہ ہے، یہ بھی کوئی انداز ہے۔ بندہ اتنی دور سے آیا ہے تھکن سے چور چور ہے۔ نہ سلام نہ دعا نہ خیر خیریت۔ چلو کھانے کو دوڑ رہے ہیں لوگ۔ لوگوں کا بھی کیا قصور۔ وہ بھی بھوکے ہیں آخر۔"

وہ تولیے سے سر رگڑتے ہوئے ایک تواتر سے کہہ رہا تھا۔

"کس نے کہا تھا آنے کو۔ میں نے تو نہیں کہا تھا۔ آپ کسی کام یا مطلب ہی سے آئے ہوں گے۔ یقیناً میری وجہ سے میری خاطر تو زحمت نہیں کی۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں۔"

وہ دوپٹا درست کرتے کھڑے کھڑے کہہ رہی تھی۔

ہادی نے اس کی سمت قدرے حیرت سے دیکھا تھا۔ ایسی گہرائی کی انداز سے ٹھیک ٹھیک لگنے لگی۔

"اچھا یہ بتائیں۔ کھانا کیوں نہیں کھایا؟" ہادی نے اس کا دھیان ادھر ادھر کرنے کی کوشش کی۔

"آ گئے بڑے وہاں سے خیال رکھنے والے۔ جاؤ ہادی یہاں سے۔ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔ خون کھول رہا ہے میرا۔" وہ آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اب کیا خطا ہو گئی؟" وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گیا اور برش اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "اجازت ہے؟"

اس نے جیسے جل کر پشت کر لی۔

"پلیز آپ کھانا کھا لیں۔"

"باہر ٹیبل پر رکھا ہے، اسے ڈال دو۔ اور چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے لاوارثی کے احساس کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے کسی کی ہمدردی، کسی کا ساتھ۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"آپ بھی کمال ہیں۔ اپنائیت کا اظہار کرو تو فرماتی ہیں "کیا بدتمیزی ہے؟" نہ کرو تو طعنے مار مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔"

وہ بالوں میں برش چلاتے ہوئے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کورٹ میں جا کر کرنا یہ الجھانے والی باتیں۔ جتنا الجھاؤ گے، اتنے پیسے ملا کریں گے۔ مجھ سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یا اللہ۔ یہ اب کس بات کا طعنہ ہے؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ خاموش رہی۔

"کھانا کھا لیں پلیز۔ روشانے۔ کیوں بلاوجہ کی اذیت دیتی ہیں مجھے؟" وہ بہت ہارے ہوئے انداز میں بولا۔

"ہونہہ۔ اذیت۔ تمہیں اذیت کے معنی بھی پتا ہیں؟ اذیت؟" اس نے سر جھٹکا۔

"زندگی بچوں کا کھیل نہیں ہے روشانے۔ بڑی تکلیفوں سے بچنے کے لیے چھوٹی موٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ وقتی خوشی کی خاطر پائیدار مفادات کو قربان کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

"یہاں فون ڈائریکٹ نہیں ہے۔ اور میں بلاوجہ کی بہادری دکھا کر آپ کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔"

"مجھے احساس ہے آپ نے فون کی ہر گھنٹی پر دوڑ لگائی ہوگی کہ ہادی کا فون ہوگا حویلی سے مجھے آپ کے جذبات احساسات کا اندازہ ہے۔"

"حد ہوگئی خوش فہمی کی۔" روشی نے ناک سکوڑی۔

"اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ ہو جاتی ہے انسان کو۔ یہ بھی ایک مرض ہے۔ خیر آپ کھانا کھالیں۔ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔ دیر ہو جائے گی حویلی پہنچتے پہنچتے۔ بابا صاحب پریشان ہو جائیں گے" وہ رک کر بولا جیسے بہت جلدی میں ہو۔

"اس وقت؟ کیا صبح نہیں ہوگی۔ ڈرائیور ہے ساتھ میں؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔ سب بھول بھال گئی تھی۔

"نہیں۔ خود ہی ڈرائیو کی تھی۔ خیر آپ کھانا کھائیں۔ میں چلتا ہوں۔" وہ عجلت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

"کیا نوکر ہو حویلی والوں کے۔ یہ کوئی انسانیت ہے۔ رات کے اندھیرے میں دوڑیں لگوا رہے ہیں۔ اتنی طویل ڈرائیو بغیر ریسٹ وقفے کے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس وقت جانے کی۔ تمہیں بھی تابعداری کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ کتنے بجے چلے تھے وہاں سے؟ کھانا کھایا تھا؟"

وہ کتنی فکرمند نظر آ رہی تھی کہ ہادی نے خود کو بمشکل کنٹرول کیا۔

"کہاں کھانا کھایا۔ وہ بسکٹ کھائے ہوئے ہیں شام سے" وہ بڑی سادگی سے بولا۔

"یہ کھانا ہے تو کیوں نہیں کھا رہے؟" اس کے انداز سے بڑی اپنائیت جھلکنے لگی

"جب آپ کھانے بغیر رہ سکتی ہیں اور یہ آسان کام ہے تو میں بھی یہ آسان کام کر سکتا ہوں۔"___ ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ روک کر کہا۔ روشی کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ جیسے کسی عظیم مشکل میں پھنس گئی ہو۔

"آپ کھائیں گی تو تھوڑا سا ہم بھی کھالیں گے" اس نے گویا اس پر احسان کیا۔ انداز تو ایسا ہی تھا۔ روشی چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اور ایک خالی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"ویسے اس وقت اگر کاکا جان آ جائیں تو خوب تماشا ہو۔ وہ سمجھیں گے کہ اب ہم اسی طرح کھانا کھانے لگے ہیں مل جل کر۔" وہ شریر انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

روشی کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ہادی کی قربت اسے بہت محسوس ہونے لگی۔

"کھانا شروع کیجیے ناں۔" وہ اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا دیکھ کر ٹوکنے لگا۔

"میں نہیں کھا رہی تمہارے ساتھ۔ مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"پھر میں بھی نہیں کھا رہا۔"

"میں کہاں کی ہاری۔ نگ۔ پر اس۔" اس کے چہرے پر حیا کے رنگ بہت کھل رہے تھے۔

"پر اس کا مطلب جانتی ہیں؟" ہادی نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔

روشی نے اپنی ہتھیلیاں یوں بند کرلیں جیسے وہ زبردستی اپنے ہاتھ پر دھرنے لگے۔ وہ اس کے مقابل بیٹھی پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ حسب وعدہ کھانا کھائیے"

"تھوڑا سا تو کھالو۔" روشی نے کہا جیسے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ (اتنی جلدی جا رہا تھا)

"میں کھا چکا ہوں۔ اوسطی۔ آپ کی خاطر دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ مگر آپ تو ہمارے سامنے تیر۔ ساری عمر ساتھ ہی کھانا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے تو ڈر سا لگتا ہے کہ ساری زندگی آپ کے ساتھ گزارنا ہے۔"

روشی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکی فوراً ہی نظریں جھکالیں۔

"اچھا۔ گڈ نائٹ۔ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ اب آپ آرام سے کھانا کھائیں۔ فی الحال میرا قیام آپ کی کوٹھی کے گیسٹ روم میں ہے۔"

روشی منہ کھولے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ خوشی جو چھپائے نہ چھپ سکی تھی آنکھوں سے عیاں تھی۔

"ذرا ایک دم" اس نے نوالہ دھکیل کر ایک طرف کر دی۔ "ہمیشہ ستاتے ہو۔ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کتنا اس تفصیل۔ کیا کیا بگاڑا ہے" وہ دوبارہ چیئر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"ویسے بابا جان بھی کیا مہربان انسان ہیں۔ دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ اللہ ان کے دل کو بھی ایسے ہی خوش رکھے جیسے انہوں نے میرا دل خوش کیا ہے۔ کیا ماحول ہے۔ اتنی بڑی کوٹھی۔ سوئے ہوئے ملازم۔ وہی پھولوں کی مہک۔ گوری رات اور۔ بڑی زبردست سین۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو کر جمائیاں لینے لگا۔ روشی کی جان میں جان آئی۔ کتنا نیا سا انداز تھا اس کا وہ تو ڈر ہی گئی تھی۔

صبح آٹھ بجے وہ بابر علی خان کی رہائش گاہ سے نکلا تھا۔ حویلی پہنچنے کی اسے بہت جلدی تھی روشی سو رہی تھی۔ اس نے اسے جگانے کا خیال ملتوی کر دیا تھا۔ اسے فائل لے کر بابر علی خان سے پہلے حویلی پہنچنا تھا۔ اسے اندازہ تھا اس سے ملے بغیر ہادی اسے۔ اگلی ملاقات میں اس کا کیا حشر ہونا ہے۔

حویلی پہنچا تو راستے ہی میں شبو مل گئیں۔ بڑی سی چادر لپیٹے کتابیں اٹھائے اوپر سے آ رہی تھیں۔

"السلام علیکم" اس نے فوراً سلام کیا۔

"الحمد للہ۔ سب خیریت ہے" وہ طرح دے کر مسکرایا۔

"روشی کا دل لگ رہا ہے بہت سے اہم لوگوں سے ملوا رہے ہیں؟ اس کی بیگ اور نئی نویلی دلہن" شبو کا لب و لہجہ بھی

بہت محسوس ہوتا تھا۔ مگر اب صورت حال بہت تبدیل ہو چکی تھی۔ ان کی سمی تیز باتیں اب اسے بری نہیں لگتی تھیں۔ دلچسپ لگتی تھیں۔

"پاسیبل۔ میری ان سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ آئندہ ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا۔" اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"وہ۔ یاور خالو آ گئے؟" وہ کچھ سوچ کر پھر شیبہ کی طرف پلٹا۔

"نہیں۔ بڑی امی ماما لی سے کہہ رہی تھیں وہ آنے والے ہیں۔ اب مزید پتا نہیں۔ ویسے یاور ماموں کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بے چاری روشی کو قید تنہائی میں ڈال دیا۔ صالی کو بھی ساتھ ہی بھیج دینا چاہیے تھا۔ اب انہیں روشی کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ یاور ماموں تو ویسے بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کا بریف کیس ہر وقت تیار رہتا ہے کہ پتا نہیں کب کہاں کے لیے نکل کھڑے ہوں۔"

"یہ باپ بیٹی کا معاملہ ہے، ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" اس نے جان چھڑائی۔

"ویسے تم بھی کمال ہو۔ یہاں روشی کی ڈھنڈیا پڑی تھی اور تم نے بتایا تک نہیں کہ وہ سرائے میں ہے۔ بابا صاحب نے تمہیں آڑے ہاتھوں نہیں لیا۔"

شیبہ کی تیز نگاہیں اس کے وجود کے آر پار ہو رہی تھیں۔

"لیں گے" وہ ہونٹ دبا کر مسکرایا۔

"بہت ڈھیٹ ہو گئے ہو۔ کیا ہوا ہے؟" شیبہ کی مسکراہٹ طنز سے بوجھل تھی۔

"دراصل میں تو سرائے جاتا رہتا ہوں۔ اور وہاں میرا قیام بہت مختصر ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سرائے میں ہونے والا ہر حادثہ یا واقعہ میرے علم میں لایا جائے۔ مجھے کاکا جان نے حویلی کے لیے کوئی میسج دیا ہوتا تو میں ضرور پہنچاتا۔" اس نے بہت شائستگی سے جواب دیا اور چل دیا۔

(یہ شیبہ تو اس حویلی میں زیر و زبر دست ہی رہتی ہیں۔ بڑا مشکل ہو جاتا ہے انہیں فیس کرنا۔)

ماہین سو کر اٹھی تو باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سن کر سمجھ گئی کہ یاور علی خان آ گئے ہیں۔ اس نے کچھ سوچا پھر ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے ہیئر بینڈ اٹھا کر بالوں کو سمیٹا اور وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور تفکر تھا۔

یاور علی خان باتھ روم سے باہر آئے تو اس نے رخ بدلے بغیر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہیں؟" وہ تولیے سے سر خشک کرتے ہوئے اس کے قریب آئے۔

"جی۔ آپ تو لگتے سفر کے لیے سفر سے لوٹ آتے ہیں میرے لیے بھی اگلا حکم صادر فرمایئے۔ اب میرا کیا کرنا ہے؟ تو میں یہاں کس خوشی میں رکھی گئی ہوں؟" وہ بہت خشک انداز میں بات کر رہی تھی۔

"آپ کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے وہاں۔ دادا جان ورنہ" وہ خشک تولیے سے بال خشک کر رہے تھے۔

"میں روشی کے ساتھ بھی جا سکتی تھی۔ آپ کو اسے تنہا نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے بابا صاحب نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

"خیریت۔ خیال کچھ جلدی نہیں آ گیا؟" وہ مسکرائے۔ بڑے دنوں بعد مسکرا رہے تھے۔

ماہین پر ان کے خوشگوار موڈ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے کپڑے نکالنے میں مصروف رہی۔

"ابھی اب بڑی پوری نہیں گے۔ بہت مجھے پتا ہے اور پھر بڑی ہوں۔" انہوں نے تولیہ ماہین کو تھمایا، اور بریف کیس کھول کر کچھ تلاش کرنے لگے۔

"میرا خیال ہے ہاری آ چکا ہوگا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

ماہین خاموش رہی۔

"چائے نہیں پلائیں گی؟" یاور علی خان اپنی تمام حسیات سے اس کے اندر خاموشی سے در آنے والی تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ گمان یہی تھا کہ ان کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس کا موڈ آف ہے۔

"کہتی ہوں ماما سے" وہ دوپٹہ اٹھا کر سر پر جمانے لگی۔

"آپ تیاری مکمل کر لیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" ماہین کچھ نہیں بولی۔ باہر نکل گئی تھی۔

یاور علی خان نے کچھ دیر بریف کیس الٹ پلٹ کیا پھر بند کر دیا۔ اسی وقت دستک ہوئی۔ وہ سمجھے کوئی ملازمہ ہوگی۔ وہ "ہوں" کہہ کر برش چلانے لگے۔

دروازہ کھول کر آنے والا ہاری تھا۔ اس کے ہاتھ میں براؤن بڑا سا لفافہ تھا۔

"السلام علیکم خان۔"

"ہوں۔ وعلیکم السلام۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟" وہ بہت اہتمام سے بالوں میں برش کر رہے تھے۔

"جی نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔" وہ عام سے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

"روشی تو پرابلم نہیں کر رہی۔ ملازم بتا رہا تھا وہ کھانا وغیرہ کھانے میں ہچکچا نہیں رہی۔ مگر اس لڑکی نے بہت ہی پر اطمینان طرز کی ایکٹ کی ہیں میرے لیے۔ اب بس جلد سے جلد اس کی شادی ہو جانا چاہیے۔"

انہیں نے سر سے پھر کچھ یاد آ گیا تو موڈ آف ہو گیا۔

ہاری ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہا تھا کہ ماہین واپس آ گئی۔ اسے ہاری دونوں کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کیا بات ہو رہی تھی۔

"اچھا۔ میں بابا صاحب کے کمرے میں ہوں۔ آپ چائے وہیں بھجوا دیجیے گا۔"

یاور علی خان یہ کہہ کر وہ فائل جو ہاری لے کر آیا تھا اور دوسرے کچھ کاغذات سمیت کمرے سے باہر نکل گئے۔ ہاری نے بھی جانے کو قدم بڑھائے۔

"آپ کدھر چلے مسٹر باری تشریف رکھیے"
باری کے چہرے پر قدرے بے بسی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ واپس بیٹھ گیا۔
"ایک کام بگڑا ہوا ہے آپ کے ذمے۔ شاید آپ بھول گئے۔" وہ کپڑے ہاتھوں میں لیے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔
باری یکدم گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر جیسے کسی دھیان سے چونک کر ماہین کو دیکھنے لگا۔
"آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک گزارش کروں۔"
"یہاں تو ہر دوسری بات پر مائنڈ کرنا ہوتا ہے آپ فکر نہ کریں۔ کہو۔" وہ قدرے بے لحاظ انداز میں گویا ہوئی۔
"آپ کیا کریں گی چھوٹے خان کا نمبر لے کر۔ جب یاور خان ان سے تعلق ختم کیے ہوئے ہیں تو آپ کا ان سے کیا حساب بن رہا ہے۔ یہ میں نہایت خلوص دل سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کسی الجھن میں نہ پڑ جائیں مفت کا کوئی درد سر۔ پلیز میری بات پر غور کیجیے۔" وہ بڑے سبھاؤ سے بات کر رہا تھا۔
"حساب تو بہت بن رہے ہیں۔ مسٹر عبدالباری محمدی۔ آپ تو بس یہ بتائیے آپ ہماری یہ بہت بڑی خدمت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تا کہ ہم کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں۔ آپ کے انکار کی صورت میں۔"
"آپ اس راستے کی طرف نہ جائیں۔ میرا پرخلوص مشورہ ہے" اپنا پورا نام ماہین کے منہ سے سن کر وہ بری طرح چونک پڑا تھا مگر یہاں بھی اس نے اپنی سماعت کنٹرول پاور سے کام لیا تھا اور بہت سکون سے اس سے ہم کلام ہوا تھا مگر اندر عجیب سی کھدبد شروع ہو گئی تھی۔ "اس چار دیواری میں خلوص راس نہیں آتا ہے۔ میں ایسی دلدل میں آ پھنسی ہوں کہ آس پاس کوئی گرا ہوا درخت نہیں ہے کہ کوئی امکان روشن ہو۔ صرف جواد اور وشانے کا مضبوط بندھن ہے جو مجھے کسی انتہائی فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ میں اب اپنے ان پیاروں کو فطری محبتوں سے مزید محروم نہیں کرنا چاہتی۔ ان کی اتنی عمر نہیں ہے جتنے امتحان سے گزر رہے ہیں۔ میں ان کے عظیم دکھوں اور محرومیوں پر بہت سارا رونا چاہتی ہوں۔"
اس کی آواز بھرا گئی۔
باری کا خود پر اختیار اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ حیرت سے ساکت و جامد اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔
"آپ۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔
"مجھ سے کوئی اور بات نہیں کرو باری۔ بس یہ نمبر دے دو پلیز۔ دیکھو میں بہت سکون سے وہ سب کرنا چاہتی ہوں جو میرے ذہن میں ہے لیکن اگر مجھے مسلسل بندشوں سے گزرنا پڑا تو میں تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دوں گی۔ جواد اور وشانے کے سر سے اس کی زد میں آ سکتے ہیں۔" وہ ناراضی سے لہجے میں گویا ہوئی۔
"آپ ایسا کریں یاور خان سے اس سلسلے میں کھل کر بات کریں۔ یہ بہت آسان راستہ ہے۔"
"وہ انتہا پسند شخص ایک جملے میں میرے پر کاٹ کر رکھ دے گا۔ اور مجھے اب کام بہت ہے۔" اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔
"کیا آپ مجھے اس لائق سمجھتی ہیں کہ مجھے اپنے کام کے بارے میں کچھ بتا دیں۔ ہو سکتا ہے میں اس انداز میں آپ کی

مدد کر سکوں۔ جو آپ کے ذہن میں ہے۔ مگر اب میں ایسا کروں تو آپ سے معافی کروں۔"
"نہیں۔ مجھے کسی سیکنڈ تھرڈ پرسن کو انوالو نہیں کرنا۔" ماہین نے دو ٹوک سا جواب دے دیا۔
اسی وقت سرسوتی دروازہ بجا کر اندر آ گئی۔
"آپ کو بڑے خان بلا رہا ہے بی بی۔"
"مجھے؟" اس نے اچنبھے سے باری کی طرف دیکھا۔ "چلو تم۔ میں آتی ہوں۔"
وہ کپڑے صوفے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ "باری مجھے آج ہر صورت میں نمبر چاہیے۔ یہ تمہارا صاف انکار۔"
وہ تاکید کرتی باہر چلی گئی۔ سرسوتی اس سے پہلے نکل چکی تھی۔
باری کی آنکھوں سے پریشانی جھلکنے لگی تھی۔ وہ سیدھا ہال میں چلا گیا۔
اب وہ نمبر ڈائل کر رہا تھا۔
"خان جی؟" وہ دبے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تہور علی خان کی آواز ریسیور میں ابھری تھی۔
"باری بات کر رہا ہوں خان حویلی سے۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے قدرے آہستہ آواز میں کہا۔
"خان۔ وہ ماہین بی بی آپ سے کانٹیکٹ کرنا چاہتی ہیں۔ اور آپ کا نمبر مجھ سے مانگ رہی ہیں۔ کسی اور سے اس موضوع پر بات نہیں کر رہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"
"نمبر دے دو۔ وہ ڈپریشن میں مبتلا ہے۔ اب کسی بات سے پریشانی نہیں ہوتی باری تم ابھی دے دو۔ پرابلم سیٹل کریں گے ہم۔"
"مگر خان ان کو پتا چلے تو پرابلم ہو سکتی ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔
"وہ اتنی ہوش مند تو ہیں کہ نفع نقصان سوچ سکیں۔ خیر ان شارٹ۔ تم نمبر دے دو۔
تمہیں کوئی پرواہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پارٹنر۔ اوکے۔"
انہوں نے مزید کوئی بات کیے بغیر فون بند کر دیا تھا۔
باری ریسیور ہاتھ میں تھامے کچھ سوچنے لگا۔
"آج کل بہت سوچنے لگے ہو۔" وہ مجھو کی آواز پر چونک پڑا جو بہت قریب سے آئی تھی۔
"سوچنا بھی تو اچھی بات ہوتی ہے" وہ مسکرایا جبکہ وہ مسکرا رہی تھی۔ جیسے کوئی بوجھ ذہن سے اتر گیا ہو۔
"زیادہ سوچنے سے قوت عمل کمزور پڑ جاتی ہے اور خواہ مخواہ تمہارے ساتھ ہو گیا تو جہاں کیا ہوگا۔" وہ اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ کے ساتھ ہم کلام ہوئیں۔
"ہم تو تمہیں ادھر سے تلاش کر رہے ہیں۔ بڑی پورے آئے ہو۔ بتاؤ کیسی ہے یہ یاور ماموں کو اس طرح کیا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اب تو اس کی طرف سے دھڑکے ہی لگے رہتے ہیں۔ کتنی بے وقوفی کر چکی ہے پہلے بھی۔" وہ فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

"آپ فکرمند نہ ہوں۔ وہ ٹھیک ہیں۔ زندگی سے بہت محبت ہو گئی ہے۔ وہ دو سال مزید جینا چاہتی ہیں۔" وہ ثمن کے میں ان سے مخاطب ہوا۔

"ہیں۔ کیا واقعی آپ بڑا گولڈن ریولوشن ہے۔ مگر کیا اسی طرح ایسے؟ کیا وہ دو سال میں پوری نہیں ہو جائے گی؟" گھو نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

جواب میں ہاری کا قہقہہ بھی بڑا بے ساختہ تھا۔

"یہ پوچھیے گا ان سے۔ فون پر بھی بات نہیں ہوئی ان سے؟" اس نے پوچھا۔

"بات۔ ایک کال اور سات کی لائن پیچھے۔ صرف آواز ہی سن سکتے ہیں اس طرح سے تو۔" وہ پھر ہنس پڑیں۔

"کیا واقعی وہ خوش ہے؟" انھیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"فون کر کے دیکھ لیں۔ بری حالت ہے خوشی سے" اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"مگر کیوں؟" گھو کی حیرت بجا تھی۔

"ویسے ہی کہہ دیا۔ خوش محسوس ہوئی تھیں" اس نے ٹال دیا۔

"کچھ کہہ رہی تھیں؟"

"نہیں۔ زیادہ بات نہیں ہو گی مجھے حویلی پہنچنے کی جلدی تھی۔ صبح جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو سو رہی تھیں۔"

"ویسے صحت کیسی لگی تھیں۔ کمزور تو نہیں ہو رہی؟"

انھیں باتوں کے دوران چاچی نے چا کی بالو آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔

"وہ جی ماہین بی بی کہاں ہیں؟"

وہ دونوں آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اپنے کمرے میں ہوں گی۔" گھو نے جواب دیا۔

"نہیں وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ بابا صاحب کے کمرے میں ہیں۔ وہاں یاور خان بھی ہیں۔" ہاری نے مطلع کیا۔

"یہ ابھی تک یہیں ہے؟" ہاری نے گھو سے استفسار کیا۔

"ہوں۔ ملکہ میرا خیال ہے۔ ممانی اسے بری پور ساتھ لے کر جائیں گی۔"

"کوئی خاص وجہ۔ اتنا اعتبار کیسے کر لیا اس پر؟"

"اب کیا کہہ سکتے ہیں ویسے تو بڑی سیدھی سادی لڑکی ہے۔" گھو نے کہا۔

اف یہ سیدھے سادے لوگ۔" ہاری نے گہری سانس لی۔

گھو نے کچھ الجھ کر ہاری کی طرف دیکھا تھا مگر کچھ بولیں نہیں۔

سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ ماہین حویلی کی خواتین سے الوداعی ملاقات کر رہی تھی مگر اس کی حساس نگاہیں ہاری کو تلاش کر رہی تھیں۔ کئی بار وہ ان دو دن بھر کے حویلی کے پچھواڑے بھی پہنچا تھا۔ بی جان تھا صبح سے وہ چار باتیں۔ یہ کرنی کی روشنی میں ایسا کوئی نہ تھا۔ وہ بڑی غائب دماغی کی کیفیت میں سب کے درمیان بیٹھی تھی۔

"اس لڑکی کو ساتھ لے کر جا رہی ہو؟" عالم تاب کا اشارہ یاور کی طرف تھا۔

"جی۔ وہاں بھی تو ملازمہ کی ضرورت ہو گی یاور صاحب بتا رہے تھے۔ وہاں تو سب مرد ملازم ہیں اچھا ہے ایک عورت بھی ہو جائے گی۔ یوں بھی یہ بے سہارا بے ٹھکانا ہے۔ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔" ماہین نے بہ استفسار سے تفصیلی جواب دیا۔

"اس طرح کسی انجان پر بھروسا ٹھیک نہیں ہوتا۔ آگے پیچھے دیکھ لیا نا۔" روشن آرا نے دبے لفظوں میں گویا خبردار کیا۔

"جی میں بھی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔" وہ ان کے اس طرح کے اشارے اب بھی نہ سمجھی۔

"بعض لوگ بہت سیدھے نظر آتے ہیں مگر ہوتے نہیں ہیں۔"

اصیر علی خان کی دلہن نے بھی حصہ لیا۔ وہ جوان بیٹیوں کی ماں تھیں مگر آج بھی اصیر خان کی دلہن کہلاتی تھیں۔ حتیٰ کہ کہا کرتی تھیں بلکہ چھیڑتی تھیں کہ ہم آپ کو دلہن ہی کہا کریں گے۔

"جی بھابی جان ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" ماہین نے اتفاق نہیں کیا۔

"فون کرتی رہنا۔ یہاں سے تو جب فون کرتے ہیں۔ بزی ملتا ہے۔ اگر ملتا ہے تو پھر آپریٹر ملتا ہے۔ جو اطلاع دیتا ہے کہ ڈی سی صاحب بزی ہیں۔" سارہ ممانی (عالم تاب کی بھاوج) نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"جی۔ میں فون کرتی رہوں گی۔" ماہین نے تسلی دی۔

"روشی بہت ضدی ہو گئی ہے۔ ذرا تم ہی اسے قابو کرنا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ جلد سے جلد اس کی شادی ہو جائے یاور کو بہت پریشان کیا ہے اس نے۔ الجھ کر رہ گئے ہیں۔" عالم تاب فکرمندی سے گویا ہوئیں۔

"جی۔ آپ فکر نہ کریں۔" اس نے پھر بے قراری سے ادھر ادھر نظر دوڑائیں۔

"سامان رکھوا دیا ہے بی بی۔ یاور خان بلا رہے ہیں۔" گھو نے آ کر مطلع کیا۔

اتنے میں تو لڑکیاں بھی آ گئیں۔ جو روشی کے لیے مختلف قسم کے پیغامات دے رہی تھیں۔

"بھائی جان! آپ جب بھی حویلی آئیں روشی کو ضرور ساتھ لائیے گا خواہ آپ کو یاور ماموں کے ساتھ لڑائی کرنا پڑے" روبی نے تاکید کی۔ سب مسکرا دیے۔

"یعنی ماموں ممانی کی لڑائی کرانے کے درپے ہو۔" گھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی کچھ لیں۔" روبی نے تڑ تڑ جواب دیا۔

"بری بات۔ اللہ انھیں شاد و آباد رکھے۔" عالم تاب نے بڑی شفقت سے ماہین کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ گھو ہمراہ سر جھکا کر بڑی سی چادر لپیٹے پورچ میں پہنچنے سے آگے پورچ کی سیڑھیاں اتری تو ہاری کو یاور علی خان کے

ساتھ باتوں میں مصروف پایا۔ گہری سانس لے کے رہ گئی۔ بہت ہوشیار ہے یہ باری۔

اسے آتا دیکھ کر یاور علی خان پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ان کی طرف کا دروازہ بند کیا۔ اور ماہین کے لیے دوسری طرف کا کھول دیا لیکن ماہین گاڑی کی طرف بڑھنے کے بجائے باری کی طرف بڑھی۔

"وہ ایک درخواست کی تھی آپ سے۔" اس نے قدرے جتانے والے لہجے میں بہت آہستگی سے باری کو مخاطب کیا۔

"پابند انسانوں پر طنز نہیں کرتے۔ گناہ ہوتا ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔ لبوں پر ہلکی سی مبہم مسکراہٹ تھی۔

"یہ آپ کی کتاب۔ انٹرنیشنل لاء۔" اس نے ایک مجلد کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ "اس میں آپ کا مطلوبہ پیرا ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں کہہ کر دور ہٹ گیا۔

ماہین نے اچانک خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ سر سے بوجھ سا اتر گیا۔ جیسے کسی کٹھن مہم میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہو۔

بڑی تیزی سے وہ گاڑی کے کھلے دروازے تک آئی اور ہاتھ ہلا کر برآمدے میں کھڑی خواتین کو خدا حافظ کہہ کر بیٹھ گئی۔

یاور علی خان بہترین سوٹنگ کیے ہوئے اور کوئی لاجواب خوشبو لگائے ہوئے تھے۔ گاڑی کے بند ماحول میں ایک خوبصورتی اتر آئی تھی۔ ایسا حسن جو بیرونی دنیا سے بیگانہ کر کے رکھ دے۔

"اس طرح کی فارمیلٹیز سے مجھے بہت الجھن ہوتی ہے۔ صرف خدا حافظ کہنے میں تین منٹ صرف ہو گئے۔" یاور علی خان کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"کیا یہ میرا قصور ہے؟" ماہین کو ان کے آف موڈ پر غصہ آ گیا۔

یاور علی خان کچھ بولے نہیں۔ بلکہ اس کے ہاتھ میں تھمی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ماہین بڑبڑا کر رہ گئی۔

"آپ کے کس کام کی۔ آپ تو ایسی کتابیں گھول کر پی چکے ہوں گے۔" اس نے کتاب اس طرح سینے سے لگائی جیسے کسی قیمت پر انہیں نہیں دے گی۔

"پڑھی ہوئی کتاب میں سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے پوائنٹس ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ دکھاؤ یار۔ ابھی تو فاصلہ بھی طے کرنا ہے۔" انہوں نے کتاب کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا بلکہ کتاب کو تقریباً پکڑ ہی لیا۔

ماہین نے بے بسی سے کتاب کی طرف دیکھا اور کتاب پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"آپ کتنے آرام سے انسان کی توہین کرتے ہیں اور پھر آپ کو کچھ فیل بھی نہیں ہوتا۔"

اب ایک یہی تدبیر رہ گئی تھی کہ وہ انہیں کسی بحث میں الجھائے تاکہ وہ کتاب کی طرف متوجہ ہی نہ ہوں۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ واقعی حیران ہوئے۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔

"کیسے لائف پارٹنر ہیں آپ۔ گاڑی تک میں تو پارٹنرشپ نبھا نہیں سکتے آپ کتاب پڑھیں۔ میں کیا کروں؟" وہ خفا خفا سے انداز میں بولی۔

"پڑھ تو نہیں رہا۔ صرف سرسری دیکھ رہا ہوں۔ دراصل کتاب بھری گری ہے۔ کتاب دیکھ کر ہی بے اختیاری کیفیت ہو جاتی ہے۔ اوکے۔"

انہوں نے تو جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ اور بیک سے بریف کیس کھینچ کر کتاب اس میں رکھ دی۔

"ظاہر ہے آپ بھی اسے منزل پر پہنچ کر پڑھیں گی۔ اس لیے رکھ دی ہے۔ جیسے اب پارٹنرشپ کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ یہ بتائیے وقت کیسے گزرا۔ حویلی کی خواتین سے آپ کو کوئی شکایت تو نہیں ہوئی۔"

انہوں نے بریف کیس واپس پیچھے رکھتے ہوئے بہت خوشگوار موڈ میں گفتگو شروع کی۔ وہ اس طرح بیٹھی تھی کہ اس نے جیسے یاور علی خان کا ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ خالی خالی نظروں سے اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

"کہاں گم ہیں۔ ماہین آپ؟" ان کا لہجہ بہت دھیما تھا۔ جیسے سرگوشی کر رہے ہوں۔

"اں۔ ہاں۔ کہیں نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ پشاور سے روشی کے لیے کچھ کپڑے وغیرہ لے لوں گی۔ ریڈی میڈ۔ اس کے پاس سیزن کے کپڑے نہیں ہیں۔" اس نے پریشان ذہن کے ساتھ بات بنائی۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ پانچ گھنٹے ہوں گے ہمارے پاس۔ میں اپنا کام کر لوں گا۔ آپ شاپنگ کر لیجیے گا۔ اوکے۔"

انہوں نے فوراً مستقل حل سے نواز دیا۔

"آپ بے کار کی باتیں ہیں۔ آپ کو کبھی اپنی مصروفیات میں خیال آتا ہے کہ روشی کو اس عمر میں کس کس چیز کی خواہش ہوگی اور وہ خواہش وہ کس طرح پوری کرتی ہوگی۔ انسان اپنے ہوش سے بے حوصلہ اظہار کر سکتا ہے۔ ہر کسی سے تو نہیں۔ اور آپ تو اسے کبھی کبھی میسر آتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات کا اظہار بھابھی بیگم یا بابا صاحب سے کس حد تک کرتی ہوگی؟"

ماہین نے ان کا ذہن ادھر ادھر کرنے کی کوشش میں یونہی روشی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"آپ اس کا ذکر کر رہی ہیں۔ اس نے مجھے جتنا ہرٹ کیا ہے جتنی میری انسلٹ کی ہے شاید میں عمر بھر اسے معاف نہ کر سکوں۔"

یاور علی خان کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

"کیا کیا ہے اس نے۔ روشی تو ابھی لڑکی ہے۔ اس سے عمری باپ سے دوری نے اسے کمپلیکس میں مبتلا کر دیا ہے۔ جو اس کے نقصان ہیں۔ وہ بھی شاید آپ کے سرخ فیتے کی نذر ہو گئے ہیں۔"

"وہ ایک کمفرٹ لائف گزار رہی ہے۔ اسے باپ دادا کی وجہ سے سوسائٹی میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اور انسان کو کیا چاہیے ہوتا ہے؟"

ان کے لہجے سے خفگی کا تاثر بدستور جھلک رہا تھا۔

"بھرپور کھوکھلا پن انسان اسے امتیاز کو۔ جب انسان انتشار اور دکھ کی ایسی سطح پر پہنچ جائے کہ اسے کمفرٹس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہو تو کمفرٹس ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ اس سے خفا ہوئے تو وہ اندر سے [illegible] ہو جائے گی۔ تو کیا آپ کو دکھ نہیں ہوگا؟"

ہری پور پہنچنے سے پہلے اسے برین واشنگ کا اچھا موقع ملا تھا۔

"کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب اس کے لیے بہت برا کیا ہے اس نے۔" ان کے لہجے میں ایک قطعیت تھی۔

"اپنے خون، وہ بھی بیٹی سے برابری کی بنیاد پر اس طرح جنگ تو نہیں لڑی جاتی۔ ہو سکتا ہے اسے راشد علی وجیہہ گیلانی ہوں جن کے نتیجے میں آج اس سے غلطیاں ہو رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ والدہ سے کبھی بھی رابطہ نہ رکھ سکے۔" ماہین نے بھی قدرے آف موڈ میں جواب دیا۔

"آپ اس کی وکالت نہ کریں۔ اب میں جو کر رہا ہوں۔ مجھے کرنے دیں۔" انہوں نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

ماہین خاموش ہو گئی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

"میں سوچتی ہوں، انسان سے کس قسم کا عمل سرزد ہوتا ہو گا کہ پھر اسے زیادتی راس آ جاتی ہے۔ پھر بے اختیار بولی۔" وہ کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔

یاور علی خان کے لہجے سے آنچ آنے لگی۔ ان کے کانوں کی لووں سے گویا خون چھلکنے لگا۔ اتنی بڑی بات کہہ دی گئی تھی انہیں۔ وہ بھی اتنے آرام سے۔ مگر انہوں نے ڈرائیور کی موجودگی کو فراموش نہیں کیا اور کمال ضبط سے کام لیا۔

"اتنی پرانی شادی نہیں ہوئی ہماری کہ جسے کوئی خوبصورت بات نہ بچی ہو۔"

"کہاں ہے یہ شادی۔ یہ تو کوئی پراجیکٹ ہے۔ جس پر آپ مرحلہ وار کام کر رہے ہیں۔" وہ بات کاٹ کر بہت آہستہ آواز میں بولی۔

"پچھتا رہی ہیں شاید۔" ان کا لہجہ یکدم برف ہو گیا۔

"ارے نہیں۔ جواد اور روشانے کی موجودگی میں کبھی اس فیصلے پر پچھتاوے کا احساس نہیں ہو سکتا میرے پاس۔ میرے اپنے میرے قریب ہیں۔" وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"میری تو کہیں جگہ ہی نہیں بن رہی۔ پراجیکٹ تو پھر آپ کا ہوا؟" یاور علی خان کے لہجے میں واضح آ گئی تھی۔

"سودے بازی میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ حسب توقع منافع ہو۔ ویسے آپ ایک بات بتائیے۔"

"کافی بہت سنسنی ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے بات گھر پر ہونا چاہیے۔"

یاور علی خان کی تمام حسیات شارپ ہو کر خطرے کا الارم بجا رہی تھیں۔

ماہین خاموش ہو گئی۔

پشاور سے ہری پور پہنچتے پہنچتے تھکن سے بری حالت ہو چکی تھی۔ مگر روشی کو سامنے پا کر جیسے وہ ایک دم تازہ دم ہو گئی تھی۔ گہرے رنگوں کے پرنٹڈ کپڑوں میں سبزے کے درمیان کھڑی روشی اسے قدرتی حسن کا ایک حصہ محسوس ہوئی۔

"بہت خراب ہیں آپ اب آ رہی ہیں؟" وہ ماہین کے گلے لگ کر شکوہ کناں ہوئی۔

"تمہیں پہلے اس لیے بھیج دیا تھا کہ کوئی تو ہمارے استقبال کے لیے موجود ہو۔" وہ اس گرمجوشی سے لپٹا کر بولی۔

"اف خدایا۔ آپ آئی ہیں تو لگتا ہے کہ گھر ہے یہ۔ تھوڑے دن پہلے کیا وحشت تھی۔" وہ اسی طرح گلے لگے لگے کہہ رہی تھی۔

اسی دم یاور علی خان پاس سے گزرے تو روشی ماہین سے الگ ہو گئی اور ادب سے ان کی طرف دیکھ کر سلام کیا۔

یاور علی خان نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ روشی نے ماہین کی طرف دیکھا۔

"ابو تو ہمیشہ ہی ایسے ہیں خالہ۔ اگر پہلے سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"ایک بار پتا ہے وہ ہو جاؤں خالہ پھر کوشش کروں گی کہ مرتے دم تک سامنے نہ آؤں۔ کوکا جان اتنے دور رہتے ہیں مگر نہیں، میں ایک بار ان کے گلے لگی تو ایسا لگا جیسے وہ کوئی غلطی چھپا رہے ہوں۔ ان سے اچھے ہیں۔ مگر کبھی اظہار نہیں ہوا۔ پتا نہیں بابا ان سے کیوں ناراض ہیں۔ لگتا ہے بابا تو سب ہی سے ناراض ہیں۔ شاید اپنے آپ سے بھی۔"

وہ بہت دل گرفتہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

ماہین خاموشی سے سنتی رہی۔

"بری بات ہے روشی۔ اپنے باپ سے زیادہ کوئی نہیں ہونا چاہیے۔ باپ پھر باپ ہوتا ہے۔"

ماہین کا اخلاقی فرض تھا وہ سمجھتی تھی کہ ان کے درمیان فاصلے پیدا نہ ہونے دے۔ لہٰذا وہ اسے سمجھانے لگی۔

"چھوڑیے خالہ۔ آپ کو کیا پتا مجھے باپ سے کتنی محبت ہے۔ مگر وہ اتنی مرتبہ میرا دل توڑ چکے ہیں کہ شاید اب اس کو کیا ہے بھرا۔"

وہ اسی طرح بولی کہ ماہین بے ساختہ مسکرا دی۔

لاؤنج کی طرف روشی کے ہمراہ جاتے ہوئے ماہین دفعتاً کسی خیال کے تحت چونک پڑی۔ اور وہ کتاب میں تیمور علی خان کا فون نمبر ہے اور کتاب یاور علی خان کے بریف کیس میں ہے۔ یقیناً وہ اب سب سے پہلے غسل کریں گے۔ بہتر یہی موقع ہے کہ کتاب بریف کیس سے نکالی جا سکتی ہے۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ مگر سبزے کی کثرت کی وجہ سے شام گہری محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا بس رات ہونے والی ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر روشی کی طرف دیکھا۔

"روشی۔ جان ابھی سی چائے پلواؤ۔ جب تک میں ہاتھ منہ دھو لیتی ہوں۔"

وہ کمرے میں آئی تو یاور علی خان کوٹ اور ٹائی اتار کر بستر پر دراز تھے۔ سلگتا ہوا سگریٹ ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ گویا کسی سوچ میں تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی مگر انہوں نے توجہ نہ کی۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" اس نے قدرے حیرت سے دریافت کیا۔ ان کی عادت تھی وہ باہر سے آ کر پہلی فرصت میں غسل کرتے تھے بعد میں کوئی اور کام کرتے تھے۔

"کیوں کیا ہوا میری طبیعت کو؟" انہوں نے سرد مہری سے دریافت کیا۔ ماہین اس عجیب سے جواب پر پریشان سی ہو گئی۔

"میرا مطلب ہے آپ نے ہاتھ نہیں لیا۔ وہاں میں چائے کے لیے کہہ آئی ہوں۔ اس لیے پوچھ رہی تھی کہ آپ

چائے ابھی پئیں گے یا اٹھ لینے کے بعد؟" اسے ایک دم جواب سوجھ گیا۔

"کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے۔ آپ چائے منگوا لیجیے۔" ان کا انداز بدستور تھا۔

"ماہین۔" ان کے کھردرے انداز سے فضا میں عجیب سوگواری سی رچ گئی۔

"جی۔"

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ روشی علیم الدین کے ہاں رشتے پر کیوں رضامند نہیں ہو رہی؟"

بڑا ہی غیر متوقع سوال تھا۔

"جی۔ وہ مجھے کیا پتا۔ شاید علیم اسے پسند نہ ہو۔" اس نے گڑبڑا کر جواب دیا اور ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں کیا وہ اس کے جوڑ کا نہیں؟" ان کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

"میرا خیال ہے شاید وہ اس سے کچھ چھوٹا ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے ان کی سمت دیکھا۔

"نان سنس۔ مرد بھی کبھی چھوٹا ہوتا ہے۔ دراصل اسے جوک آ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے بھی تو دونوں میں کون سا اتنا ایج ڈفرنس ہے؟ جنریشن گیپ تو نہیں ہے۔ اس کی شادی یہیں ہری پور میں ہو گی۔ آپ اس کا مائنڈ میک اپ کریں۔ ساتھ ہی شادی کی تیاری بھی۔ جواد کے ایگزام ختم ہونے والے ہیں۔ اسے بھی ہم یہیں بلا رہے ہیں۔ ویسے بھی میں اسے مزید تعلیم دلانا چاہتا۔ وہ یورپ جانا چاہتا ہے۔ تعلیم کے لیے اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ جلد وہیں سیٹل ہو جائے اور بس۔"

وہ یہ کہہ کر کش لگانے لگے۔

ماہین خاموشی سے سنتی رہی۔

"میرا خیال ہے بابا صاحب سے مشورہ کر کے روشی کی شادی اگلے مہینے کی کسی تاریخ کو ٹھہرا دیتے ہیں۔"

"احساس ذمہ داری کے تحت ایسا چاہ رہے ہیں یا اسے خود سے دور رکھنے کے لیے غصے میں یہ فیصلہ کر رہے ہیں۔" اس نے ان کی بات کاٹ دی۔

"کچھ بھی سمجھ لیں۔ شادی کوئی بری چیز نہیں ہوتی۔ اچھا ہے وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز جلد سے جلد کرے۔"

"اتنی جلدی تو شاید وہ۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔ میری ساری زندگی پرابلمز فیس کرنے میں گزری ہے۔ اب میں ٹھہراؤ چاہتا ہوں۔ آپ اسے سمجھا کر دیں۔"

"بعض اوقات انسان کے پرابلمز اس کی اپنی کسی غلطی کی وجہ سے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا بدلہ دوسروں سے تو نہیں لینا چاہیے۔" ماہین کہے بنا رہ نہ سکی۔

"سو واٹ۔ پھر بھی تو انسان خود ہی کرتا ہے۔ اگر میں بدلہ لے رہا ہوں تو بہت اچھا بدلہ لے رہا ہوں۔ اس کی شادی کر رہا ہوں۔ شوٹ تو نہیں کر رہا۔" وہ قدرے برہم انداز میں گویا ہوئے۔

ماہین شرمندہ سی ہو گئی۔ مگر دل تو چاہ رہا تھا کہ زمین کھل جائے۔

اسی لمحے ملازم نے دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ۔" ماہین نے عجلت سے میگزین ہٹا کر رکھنے کے لیے ٹیک ہٹا لی۔

یاور علی خان بھی اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

ملازم نے ٹرے میز پر رکھی اور ان کے حکم کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

"ہوں۔ بس جاؤ تم۔" ماہین نے ٹرے اپنے آگے کھسکا کر اسے فارغ کیا۔

"وہ بیگم صاحبہ۔ روشی کو چائے دی؟" اس نے چائے بناتے ہوئے ملازم کو روک کر سوال کیا۔

"جی بس صاحب نے چائے پی لی تھی اور وہ ہیں پی رہی ہیں۔" ملازم نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"اب تو زیادہ تر وہ پھر کھانا وغیرہ خود ہی بنا لیتی ہیں کسی کو بھی کچن میں آنے نہیں دیتیں صاحب کے لیے۔"

"اچھا بس۔ تم جاؤ۔" ماہین نے بے ساختہ یاور علی خان کی سمت دیکھا۔

وہ چہرہ صاف سلیٹ کی طرح تھا۔

ملازم ایک سمت مڑ کر باہر چلا گیا۔

"آپ کا گھر آخر آپ کا گھر ہوتا ہے۔ یہ احساس آپ کی ہر اصلیت بھی اس سے نہیں چھین سکتی۔" ماہین چائے بناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آپ کے گھر کا احساس کر سکتی ہے۔ آپ کا نہیں۔" وہ عجیب سے انداز میں کہہ کر سگریٹ انگلیوں میں مسلنے لگے۔

"بدگمانی حد سے بڑھ جائے تو انسان کی حس مزید ہو جاتی ہے۔ حق چھپ جاتا ہے۔ فریب چھا جاتا ہے۔" ماہین نے چائے میں شکر ملاتے ہوئے خفا خفا سے لہجے میں کہا۔

"آپ کا مینٹل لیول انتہائی ہے کہ ہم عام میں اپروچ نہیں کر پاتا۔" یاور علی خان نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

ماہین خاموشی سے چائے میں شکر ملانے لگی۔ پھر اس نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھا دیا۔ یاور علی خان نے کپ تھام لیا۔

سوا ماہین کی نگاہ کھلے ہوئے بریف کیس کی طرف پڑی۔ جو ان کے پہلو میں رکھا تھا اور اس میں سے کاغذات جھانک رہے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ شاید انھوں نے کتاب نکال کر باہر رکھ دی ہو۔ مگر اسے کتاب نظر آ گئی۔

"وہ بریف کیس میں سے کتاب تو نکال دیجیے جو ہاری نے دی تھی۔" کتاب ہاتھ میں لینے کا یہ موقع وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔

یاور علی خان نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور جھک کر بیگ سے کتاب نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"کافی عام سی کتاب ہے مگر آپ جانے کیوں اتنی کانشس ہو رہی ہیں؟" انھوں نے عام سے لہجے میں کہا اور دوبارہ چائے کا کپ اٹھا لیا۔

ماہین نے خاموش رہنا مناسب سمجھا اور کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔ وہ تیزی سے صفحات الٹ رہی تھی کہ فون نمبر والا کارڈ سامنے آ جائے۔ مگر کئی بار صفحات ادھر ادھر کرنے کے باوجود کارڈ نظر نہ آیا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ وہ بار بار صفحات ٹٹولنے لگی۔ وہ جو اسی میں اتنا دھیان بھی نہیں دے پائی کہ یاور علی خان اس کی حرکات و سکنات بغور دیکھ رہے ہیں۔

انہوں نے تکیے کے پیچھے دوبارہ ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا "اس کتاب میں سے یہ کارڈ گر گیا تھا میں نے باہر کو گرنے سے رکھ دیا تھا۔ کسی وکیل صاحب کا ہے وہ نمبر تو پرنٹ ہیں اور ایک نمبر ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ کہیں آپ کسی کو تلاش تو نہیں کر رہیں؟"

ماہین اپنی حماقت پر سر پیٹ کر رہ گئی۔ مگر اس نے فوراً ہی خود پر کنٹرول کر کے بڑے اعتماد سے کارڈ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ "مگر وہ لی گئی کچھ نہیں کر بعض اوقات مقامی پیش کرنے سے الجھنیں پیش آ سکتی ہیں۔"

البتہ دل ہی دل میں حیران تھی کہ آئے ہوئے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی مگر یاور علی خان نے اتنی دیر میں وہ بکس بھی کھول لیا کتاب بھی دیکھ لی۔ اور پھر یہ بھی نہیں پوچھا کہ ایک مقامی ایڈووکیٹ کے کارڈ کی ضرورت کیوں پیش آ گئی اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ جان بوجھ کر اس معاملے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس خیال کے تحت عجیب سی فکر نے اسے مضطرب سا کر دیا۔

اس نے کارڈ کو بظاہر لاپروائی سے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا اور واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔ دونوں کے مابین خاموشی کی زبان میں بڑی تیز و تند گفتگو ہونے لگی۔

ماہین صبح ہی سے بہت مصروف تھی۔ کچھ گھر کی سیٹنگ اپنی سہولت و مرضی سے کی تھی دوسرے دن بہت اپ سیٹ محسوس ہو رہا تھا۔ وہاں ملازم کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ روشی ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ یاور علی خان کا سوٹ اس رات ہی تیار کر دیا تھا۔ رات سے اب تک اس کی ان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی دو مرتبہ وہ بیڈ روم میں گئی تھی مگر اس کے انداز بہت مصروف تھا یہ کہ کام کی دھن سوار تھی دوسری مرتبہ وہ چادر اور اپنا بیگ لینے بیڈ روم میں گئی تھی۔ اور بہت عجلت کے انداز میں انہیں بتایا تھا۔

کہ وہ ذرا بیگی بازار جا رہی ہے۔ ملازم کے ساتھ کچھ گھر کی بہت ضروری اہم چیزیں لینے۔ یہ بتا کر اس نے یاور علی خان کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

وہ برآمدے میں آئی تو سامنے سے ایک خوش شکل خوش لباس نوجوان آتا دکھائی دیا۔ اس نے بہت آہستگی سے ماہین کو سلام کیا اور ایک طرف ہو کر راستہ دے دیا۔

"یہ کون ہے خوش دل؟" اس نے افغان ملازم کی سمت دیکھا۔

"ڈی سی صاحب کا آپریٹر ہے بیگم صاحب۔" خوش دل نے مودبانہ جواب دیا۔

"کیا نام ہے ان کا؟" اس نے یونہی پوچھ لیا تھا۔

"سب لوگ عثمانی صاحب بولتا ہے۔ اماری زیادہ بات نہیں ہے بیگم صاحب۔"

"اچھا اچھا۔ خیر زیادہ دور تو نہیں ہے بازار چلتی کریں؟" اس نے پوچھا۔

"زیادہ دور تو نہیں اے۔ ویسے آپ تھوڑی لیٹ ہو جاتا اے۔" ملازم نے مشورہ دیا۔

"یہ صاحب کے آفس جانے کا ٹائم ہے وہ دفتر جائیں گے۔ اور مجھے تو گھر پہ ٹھیک ٹھاک ناشتہ کرنے کی عادت ہے۔ اس لیے بازار جانا ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔ مجھے دوسروں کا لایا ہوا سودا پسند نہیں آتا۔"

"ادھر حویلی میں بھی آپ ہی لاتا ہے سب سامان۔" خوش دل نے تعجب سے دیکھا۔

"نہیں۔ وہاں نہیں۔ شادی سے پہلے کچھ گھر کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی تھی۔ بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے عادت ہے سب کچھ کرنے کی۔ حویلی میں تو بہت سے لوگ ہیں۔ مگر یہ تو میرا اپنا گھر ہے جہاں تو مجھے ہی سب کچھ سنبھالنا ہے۔" اس نے گیٹ عبور کرنے کے دوران یہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔

"آپ اجازت دیں تو ایک بات عرض کروں۔" خوش دل بہت جھجکتے ہوئے اجازت طلب کر رہا تھا۔

"ہوں۔" اسے اس مودب ملازم سے کسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے بہت اطمینان سے اجازت دے دی تھی۔

"آپ بس مس صاحب کو سنبھال لیں۔ اما اس کی بہت فکر کرتا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ہے اسے؟" اس نے تشویش کے انداز میں قدرے چونک کر سوال کیا۔

"بہت غصہ کرتا ہے۔ پھول دان برتن توڑ دیتا ہے۔ اما یہ سب ڈی سی صاحب کو نہیں بولا ہے۔ پھر وہ کھانا وانا کچھ نہیں کھاتا ہے۔ اما فکر کرتا ہے۔ پر اما کیا کر سکتا ہے۔"

ایک روز مس صاحب نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور بہت رویا۔ وہ اللہ نے خان کو اور بھیج دیا۔ وہ اس کو کھانا کھلایا رات کو۔"

"وہ ادھر حویلی میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ادھر آتا ہے۔ آپ نہیں جانتا؟" خوش دل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہادی؟" اس نے اندازے سے پوچھا۔

"جی۔ اور سب اس کو خان بولتا ہے۔ بڑا اچھا ہے۔ بہت پڑھا ہے۔ ابھی وکیل بنے گا وہ۔" خوش دل نے اپنی دانست میں اطلاع بہم پہنچائی۔

"اوہ۔" ماہین نے گہرا سانس لیا۔

"پھر وہ صبح چلا گیا تھا۔ مس صاحب نے اٹھ کر پوچھا خان کدھر گیا۔ اما بتایا وہ واپس چلا گیا تو وہ بہت غصہ کیا۔ پتہ نہیں کیا کیا بولا؟"

"ہوں۔" ماہین گویا گہری سوچ میں چلی گئی۔

"پھر اس کے بعد تو بھوک ہڑتال نہیں کی روشی نے؟" اس نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ پر وہ اس طرح کھانا نہیں کھاتا ہے۔ بس جب دل چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ اما اس کی بہت فکر کرتا ہے۔ بیگم صاحب اماری بچی ہے اس کے برابر کا۔ ڈی سی صاحب بھی اس سے پتا نہیں کیوں بات نہیں کرتا ہے۔ اما بہت افسوس کرتا ہے۔ آپ مس صاحب کا خیال کرو بیگم صاحب۔"

وہ بہت ہمدردی اور دلسوزی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی اپنائیت نے ماہین کے دل پر بہت اثر کیا۔

"ہاں خوش دل اب مجھے صرف اسی کا خیال کرنا ہے۔ بہر حال وہ میری بیٹی ہے۔ پھر اس کی ماں کی ایک ایک بات کا احترام کروں۔ میں ان کی دوسری ماں ہوں اور یہ رشتہ بہت کمزور ہے مگر میں ان کی سگی خالہ بھی ہوں اور یہ رشتہ بہت مضبوط ہے تم فکر نہ کرو۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ۔"

اس نے آج تک کسی گھریلو ملازم سے اسے قریب ہو کر بات چیت نہیں کی تھی۔ مگر اس بوڑھے میں اس نے بڑی جانثاری محسوس کی تھی۔

"دراصل وہ اکیلے میں گھبرا جاتی ہوں گی۔ اب آپ آ گئی ہیں تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

خوش دل نے ماہین کے انداز سے بہت اچھی امید باندھ لی تھی۔ اس لئے مطمئن انداز میں کہا تھا۔

سارا دن کی اور جیز سے اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ یاور علی خان اپنی فائلوں میں مگن تھے۔ وہ کافی دیر ادھر ٹہلتی رہی۔ روشنی اس بے جی کر بند کر چکی تھی۔ اس کا اپنا سونا بھی نہیں تھا۔ ختم کرنے کا کر کے وہ دروازے پر دستک بھی دے سکتی تھی اور روشنی کو باتوں میں لگا سکتی تھی۔

دوسرے پر آنچل جما کر وہ بے پاؤں باہر چلی آئی۔ یاور علی خان سے یہ کہہ کر روشنی کے پاس جا رہی ہے وہ آپریٹر کے کیبن میں چلی آئی تھی۔

آپریٹر ماہین کو دیکھ کر سروقد کھڑا ہو گیا۔ "السلام علیکم میڈم۔"

"وعلیکم السلام۔ ابھی تک ڈیوٹی ہو رہی ہے آپ کی؟" وہ سامنے پڑی لیدر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"جی نہیں۔ ایگزیکٹلی میں پانچ بجے آف ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد گل صاحب آ جاتے ہیں۔ مگر آج ان کے ساتھ پرابلم ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ کبھی میرے ساتھ۔" وہ بڑے مودبانہ انداز میں جواب دے کر مسکرایا۔

"ہوں۔"

"بھئی، مجھے تو یہ لائف بڑی بور سی محسوس ہوتی ہے۔ دم الجھتا ہے اپنے کمرے میں خود فون ڈائل کرنے کا موڈ ہو رہا ہے۔"

اس نے ہینڈ بیگ کھول کر کارڈ اس کے سامنے کیا جو اس نے دراز سے نکال کر پچھلی فرصت میں اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ محض بے نیازی ظاہر کرنے کیلئے یاور علی خان کے سامنے دراز میں ڈال دیا تھا۔

"یہ تیسرا نمبر جو ونڈ رائٹنگ میں ہے۔ یہ ملا دیجئے۔"

"آپ نے زحمت کی آپ اپنے بیڈ روم سے حکم فرماتیں۔ میں ملا دیتا۔" آپریٹر حیرانی سے کہہ رہا تھا۔ "نہیں۔ بس میں ذرا پرائیویسی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ بھی پلیز نمبر ملا کر یہ چیمبر خالی کر دیجئے گا۔" اس نے قدرے تحکمانہ انداز اختیار کیا۔

"ہو گئے میڈم؟" وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پھر لائن کاٹ کر ماہین کی سمت قدرے سوچتے ہوئے انداز میں دیکھا۔ "نمبر آ گیا۔"

"جی ہیلو۔ فرزانہ ہاؤس۔ جی۔ ایک نمبر سے کیا کوئی نمبر سے ڈائل ہو گا۔ جی۔"

"جی؟" اس نے ماہین کی سمت دیکھا۔

"سرکار۔" ماہین اس کے قریب ہوتے ہوئے پوری بولی۔ آپریٹر کے بھی شاید ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہ اس کو محسوس کر رہا تھا۔ پھر کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔

قدرے الجھا سا ہو کر وہ نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

"بیل جا رہی ہے میڈم! اس سے بات کیجئے گا؟" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"تیمور علی خان سے۔"

"وہ تو نہیں ہیں۔ آپ یوں کیجئے کہ حویلی سے بڑی بیگم عالم جاب بیگم تیمور سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" اس نے ذرا سی کھنکھارتے ہوئے کوشش کی۔

آپریٹر نے نظریں جھکا کر اپنی حیرت چھپائی اور ادھر سے آنے والی آواز کی سمت متوجہ ہو گیا۔

"ہیلو۔ مسز تیمور سے بات کرائیے۔ جی حویلی سے فون ہے بڑی بیگم عالم جاب کا۔ بس۔"

آپریٹر نے ریسیور ماہین کی سمت بڑھایا اور خود کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا اور پھر باہر نکل گیا۔

ریسیور میں ہنوز سناٹا طاری تھا۔

چند لمحوں بعد سوئی سی نسوانی آواز ریسیور میں ابھری۔ "جی بیگم السلام علیکم۔"

ماہین کا دل بڑی تیزی سے دھڑکا تھا۔ ایک لمحے کو جیسے کوئی دل ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

"ہیلو۔ ہیلو" دوسری جانب سے نازنین ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔ اس کی کھلی آواز صاف محسوس ہوئی۔

سماعت کو اطلاع دیتے کو خوشگوار اثر چھوڑتی ہوئی۔

ماہین نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"السلام علیکم۔" اس نے جھجکتے اسلام کیا۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ آپ کون؟" نازنین ایک نامانوس آواز محسوس کر کے بری طرح چونک پڑی تھی۔

"میں جو کوئی بھی ہوں، کیا آپ سے بات کرنے کی سعادت حاصل کر سکتی ہوں۔"

"آپ کا نام؟" وہ بے تابی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھ رہی تھی۔

"نام بتانے کے بعد فون بند تو نہیں کریں گی؟" ماہین بہت دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

ادھر بھی خاموشی چھا گئی۔

"ہیلو" ماہین کا انداز بے قراری لیے ہوئے تھا۔

"جی۔ کون محترمہ بات کر رہی ہیں؟" معذرت سے تیمور علی خان کی آواز ابھری۔

ماہین بری طرح سٹپٹا گئی۔ اس نے بے ساختہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اضطراری کیفیت میں ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"ہیلو" تیمور علی خان مسلسل ہیلو ہیلو کر رہے تھے۔

اس کی خود اعتمادی انتشار میں بدل چکی تھی اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ فون بند کر دے اور پھر بہت اچھی طرح سوچ کر پھر کوئی قدم اٹھائے۔ اس نے ناکامی کے تھکا دینے والے احساسات کے ساتھ ریسیور کریڈل پر رکھا اور باہر نکل آئی۔ اسے آج بھی آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیا۔

وہ دکھ کے گہرے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ "آپ کا نام" ایک شناسا ہو جانے والی آواز نے اس کا سہما سا سکون بھی درہم برہم کر دیا تھا۔

"ایکسکیوزمی میڈم۔ یہ آپ کا کارڈ۔" اسے پشت سے آپریٹر کی آواز آئی وہ اس نے گویا کارڈ جھپٹ لیا تھا۔ ماہین کی اطلاع بے ہی ہو تو اس طرح کے نازک کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہوتا۔

"تھینکس۔" اس نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے کر چند قدم کے فاصلے پر موجود اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ اور گویا اطمینان کا سانس لیا تھا۔

اندر آئی تو یاور علی خان ہنوز اپنے کام میں مصروف تھے۔ سیاہ نائٹ سوٹ میں ملبوس گریبان کھولے بائیں طرف بیٹھے گویا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ انہوں نے اس کی آمد کو محسوس تو کر لیا تھا مگر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے قلم کی رفتار میں کوئی فرق آیا تھا۔

وہ الماری سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئی۔

واپس آئی تو ادھر انداز جوں کا توں تھا۔ وہ برش اٹھا کر بالوں میں چلانے لگی۔

ڈریسنگ ٹیبل بیڈ کے بالکل برابر میں تھی وہ ان سے بہت کم فاصلے پر کھڑی آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

"روشی کو وہ سب بتا دیا جو میں نے آپ سے کہا تھا۔؟" یاور علی خان نے خاموشی توڑنے میں پہل کی۔

"ہوں۔" وہ غائب دماغی کی کیفیت سے دوچار تھی۔

"سو گئی وہ۔؟"

"آپ کی بلا سے۔" وہ بہت نرم انداز میں سخت بول گئی۔

"کیا بات ہے پھر لڑائی کا موڈ ہے؟ آئی ایم سوری۔ مجھے احساس ہے۔ میں نے بہت دنوں سے آپ کو وقت نہیں دیا۔ چلیں۔ آج صرف اپنی باتیں کریں۔"

انہوں نے واقعی فائلیں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔

بے خبری کے دنوں میں ان کا یہ انداز شاید اسے لوٹ لیتا۔ مگر آج اس انداز پر اس کا دل بھر آیا۔

یوں بھی آج سماعت پر صرف ایک آواز کی دستک ہو رہی تھی۔ "آپ کا نام؟"

"مجھے نیند آ رہی ہے میں سونا چاہتی ہوں۔" اس نے سرد انداز میں جواب دیا۔

"لیکن میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ دن میں آپ کے پاس سونے کے لیے بہت وقت ہے۔" ان کا انداز شگفتہ تھا۔

"کیا یاد نہیں؟" اس کے لہجے سے آنچ آنے لگی۔

"یاد تو آپ کر رہی ہیں میرے ساتھ۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

ماہین کو جی چاہا تھا ان سے دور بہت دور بھاگ جائے۔ وہ اسے بہت غیر بلکہ اجنبی سے محسوس ہونے لگے تھے۔

ایک عجیب سی وحشت نے اسے گھیر لیا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

یاور علی خان نے پہلے ٹیبل لیمپ آن کی پھر کمرے میں تیز روشنی کر دی۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے کہ ماہین کے رونے کا انداز بہت غیر معمولی تھا۔ جس کا غیر معمولی پن وہ اپنی تمام حسیات سے محسوس کر رہے تھے۔

"ماہین!" وہ اسے شانوں سے تھام کر بٹھا رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے آپ مجھے نہیں بتائیں گی تو پھر کسے بتائیں گی؟" وہ اس کا سر اپنے شانے سے لگائے بہت نرمی سے مخاطب تھے۔

"کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی نعمان بھائی بہت یاد آ رہے ہیں" اس نے خود پر بمشکل کنٹرول پا کر جواب دیا۔

"واٹس اے جاب۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگر وہ کراچی ہیں تو آپ چلی جائیے گا کچھ دن ان کے پاس رہ آئیں روشی کو بھی اپنے ساتھ لے جائیے گا۔ یہ بھی کوئی رونے کی بات ہے۔" وہ نرمی سے بولے۔

"اچھا بتائیں۔ حویلی میں نعمان کو یاد کر کے کتنی مرتبہ روئیں۔" وہ تکیے کے نیچے سے رومال نکال کر اس کے آنسو صاف کرنے لگے۔

"کاش اس شخص کے اور میرے درمیان وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہو چکا ہے تو یہ آنسو پونچھنے والے ہاتھ کتنے نورانی لگتے اور بھلے لگتے۔ جن کو حقیقت سے دور رہنے کے لیے انسان کتنے نقصان کے سودے منظور کر لیتا ہے۔ وہ نقصان جو اس کے اور ان ہاتھوں کے درمیان پھیلے راستے میں کہیں بھی کسی بھی موڑ پر پیش آ سکتے ہیں۔ محبت کا وہ عظیم اور اک جواب لیے حاصل ہوتا ہے جسے پا کر جان سے گزر جانے کو جی چاہے اس لاجواب اور کامل حسن کے بعد کسی بدصورت وقت کا سامنا ہو جائے۔ ایسے ادراک کے بعد اندر کا ہر تقاضا کھوکھلا اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ عظیم الشان محبت کا ادراک عظیم الشان احساس کمتری ہے۔ پھر اس کے بعد رونا کیا جاتا ہے؟

"میں سونا چاہتی ہوں پلیز یاور صاحب!" اس نے التجا کے انداز میں کہا۔

"اوکے۔" یاور علی خان کو اس کی سنائی ہوئی رونے کی وجہ پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے کہ جس کو اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ انہوں نے رومال رکھ دیا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹس آف کرنے لگے۔

بابا صاحب نے ہادی کو بلایا تھا۔ ان کا رات گئے بلانا کوئی معنی رکھتا تھا۔ وہ سوچوں میں الجھا ہوا ان کی خواب گاہ تک
آیا تھا اور بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

"ہوں۔ آ جاؤ۔" بابا صاحب کی آواز آئی۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔

"جی خان۔ آپ نے یاد کیا۔"

"ہاں بھئی۔ ہم نے ہی یاد کیا۔ آؤ بیٹھو۔" وہ نیم دراز لیٹے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہادی ان کے پلنگ کے قریب
پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آج شام یاور کا فون آیا تھا۔" وہ یہ کہہ کر رک گئے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ ہادی ان کی بات آگے بڑھنے کا انتظار
کرنے لگا۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ روشی کی شادی اگلے مہینے کی کسی تاریخ کو ٹھہرا دیں۔ مگر ایک الجھن جو ہمیں پریشان کر رہی ہے وہ یہ
ہے کہ تیمور ہمیں دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اب روشی کی شادی میں جلدی نہ کریں۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ وقت
بتائیں گے ہماری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ تیمور اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں اور وہ کیا وجہ ہے جو ابھی
معلوم ہے اور کسی کو معلوم نہیں یاور علی خان روشی کے باپ ہیں۔ اہمیت انہی کی بات کی ہے۔ ہم ان کی بات کیسے نظر انداز کر سکتے
ہیں۔ ہمارا ذہن تو سوچ سوچ کر تھک چکا ہے۔ تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

وہ بڑے بے بس سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"آپ کاکا جان سے کہہ دیں کہ یاور علی خان کا یہ ارادہ ہے اس لیے جو وجہ ہے وہ دیر کیے بغیر بتا دیں۔"

ہادی نے قدرے جھجکتے ہوئے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"ہوں۔ یہ درست ہے لیکن فرض کرو اگر تیمور نے ایسی وجہ بتائی جس سے شادی میں حرج ہو سکتا ہے تو یاور کو کس
طرح سمجھایا جائے گا؟"

"یہ تو وجہ ظاہر ہونے کے بعد خود بخود واضح ہو جائے گا کہ اب کیا کرنا ہے؟" ہادی نے بڑی حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔

"ہم سوچ رہے ہیں۔ وجہ کیا ہو سکتی ہے کہیں نازنین۔ آخر وہ بھی تو اس کی ماں ہے۔" بابا صاحب نے اتنی آہستہ آواز
میں کہا گویا وہ دیواروں سے بھی احتیاط کر رہے ہوں۔

ہادی خاموش رہا۔ اس کے اور والد علی خان کے مابین آج تک نازنین کے موضوع پر کبھی براہ راست بات چیت نہیں
ہوئی تھی۔

جب کبھی سرائے جاتے تھے تو اس کے ساتھ جاتے تھے کہ ہادی کل صبح سرائے جاتا ہے بہت دن ہو گئے ہیں نازنین سے
ملے ہوئے۔ تیمور تو خود ہی آ جاتے ہیں ہم سے ملنے کے لیے۔ کیسی اذیت ناک زندگی کا انتخاب کیا ہے نازنین نے اپنے لیے۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔

"ہادی اکثر ہماری ضمیر رکھا ہے اپنے دل پر ہم نے۔ روشی سرائے گئی ان ہی دنوں وہ بھی ساتھ ہی آئی۔ جب
بھی ہمیں اندر سے بری طرح کاٹنے لگتا ہے تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ ایسی نیند سو جائیں کہ پھر کبھی صبح نہ دیکھیں۔" بابا صاحب کی
آواز رکنے لگی تھی۔

ایسے لمحوں وہ بے اختیار شخص کی حالت سے بے بسی پر ہادی نے بھی بہت دکھ سے کہا۔ اسے دل ہی دل میں ان کی بات سے اتفاق نہ آ رہا تھا

اتنا کہا۔

مگر شکر ہے ایسا ہوا تھا کہ وہ اب ان کی دلجوئی کے لیے مناسب الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی اس بارے تذکرہ کرنے والے
دل میں اس کے اپنے الفاظ اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ وہ بچوں کی طرح سر جھکائے ہوئے اس کی بات سنتے رہے۔

"ہادی۔ بیٹے ہم کیا کریں۔ بتاؤ۔ ہماری کوئی تدبیر دونوں بھائیوں کے دلوں کے فاصلے کم نہیں کر سکی۔ ہمیں حیرت ہے
جاتے جاتے دکھوں کے درمیان ہم ابھی تک زندہ کیسے ہیں۔"

"آپ اتنا مت سوچیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ کاکا جان کو بلوا لیتا ہوں۔ وہ آپ سے بات کریں گے تو شاید کوئی حل
کوئی حل نکل آئے گا۔" ہادی نے تسلی دی۔

"صرف ایک پریشانی تو نہیں ہمیں۔ ہو سکتا ہے ہمارا وہم ہو۔ مگر ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیمور بھی شاید اندر سے اس
روشی کے رشتے پر رضامند نہیں ہے۔ اور اس کے رضامند نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نازنین رضامند نہیں ہے۔ ہمارے اختیارات
ابھی ہمارے پاس ہیں۔ ہم اپنی بات دونوں سے منوا سکتے ہیں۔ کل ہی روشی کو رخصت کر سکتے ہیں۔ لیکن حیثیت باپ یہ
احساس ہمیں بے اختیار کر رہا ہے کہ کہیں ہمارے بچوں کے دکھوں میں مزید اضافہ نہ ہو جائے۔ اور وہ ہم سے اتنی نفرت
کرنے لگیں کہ ہماری موت کے بعد ہمیں ایصال ثواب پہنچانے کے لیے ہاتھ اٹھانا بھی گوارا نہ کریں۔"

ہم تیمور کے سامنے بہت کمزور پڑ جاتے ہیں ہادی۔ جو زیادتی ایک بار اپنی خود غرضی کے سبب اس کے ساتھ کر چکے
ہیں۔ وہ خود غرضی ہمیں اندر سے دیمک کی طرح آج بھی چاٹ رہی ہے۔ اس نے نکاح کے بعد سے آج تک ایک حرف
شکایت کوئی گلہ ہم سے نہیں کیا۔ نہ اپنے کسی دکھ کا اظہار کیا۔ وہ عائشہ کے پاس لاہور چلا گیا تھا تو ہم نے کچھ سکون محسوس کیا
تھا۔ مگر وہ صورت بہت بے رونق لگی۔ بے موتی جیسا ہمارا بیٹا۔ تو نہیں پہچانی اس نے۔ خود بھی دکھوں کے سودے کر لیے
ہمارے بیٹے کو بھی روگ دیا۔

ہادی ایسے بھی گمان آتا ہے وہ روشی کے معاملے میں مداخلت کر کے کہیں یاور کو اذیت دینا تو نہیں چاہتا انسان ہی تو
ہے۔"

"نہیں خان۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ وہ بھی روشی بی بی کے ساتھ جو ان کی نگاہ میں قطعی بے قصور ہیں۔" ہادی نے بے
ساختہ کہا تھا۔

"ہاں شاید دل تو ہمارا بھی یہی کہتا ہے۔" والد علی خان نے تائید کی۔

''ہماری تو نیندیں اڑ گئی ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر حقہ گڑگڑانے لگے۔

''صبح آپ کا کا جان کو بلوائیں۔ بے فکر ہو جائیں۔ وہ ضرور آپ کا خیال کریں گے۔'' ہاری تسلی دیتے ہوئے ایک انجانے احساس جرم سے چور چور تھا۔

''ہاں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ کاش یہ شادی پہلے ہو جاتی اور یہ نیا مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔'' وہ تاسف سے گویا ہوئے۔ ہاری اٹھ کھڑا ہوا۔

''مسئلوں کو ختم کرنے کے لیے بڑے بڑے فیصلے کیے مگر مسئلے اپنی جگہ موجود ہیں۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا رہے تھے۔

''ہم اس لیے منع کر رہے ہیں اس رشتے سے کہ روشنی اس رشتے پر راضی نہیں ہے۔'' تیمور علی خان گھر سے پہلے واپس پہنچے تھے اور اب باپ بیٹا بند کمرے میں بات چیت کر رہے تھے۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے ہاں ان معاملات میں لڑکیوں کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' بابا صاحب نے ان کا موقف یکسر مسترد کر دیا۔

''مسئلہ ہے بابا صاحب! انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اپنی بیٹی کے ساتھ زور زبردستی والا سلوک وہ برداشت نہیں کریں گی۔ روشنی عاقل و بالغ ہے۔ وہ جو قدم اٹھائے گی وہ بحیثیت گارجین اسکو سپورٹ کریں گی۔'' تیمور علی خان نے دبے لفظوں میں بتایا۔

''نہ وہ بے وقوف لڑکی عاقل ہے اور نہ ماں اس کی گارجین۔'' بابا صاحب نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ''اسے یاد دلایا ہوتا کہ وہ خود کو بچوں کے لیے مار چکی ہے۔ جب وہ ہے ہی نہیں تو یہ مداخلت کیا معنی؟'' وہ ناراضگی سے گویا ہوئے۔

''لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اور اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی پر رد عمل کر سکتی ہیں۔''

''یہ زیادتی ہے؟ اپنے گھر میں شادی کر رہے ہیں ہم اس کی بیٹی کی۔ اکلوتا لڑکا ہے وہ۔ سب کچھ اسی کا ہے۔ صورت شکل تعلیم سب ہی کچھ تو ہے۔'' وہ خاصے ناراض لہجے میں بات کر رہے تھے اور قطعی برہم تھے۔

''مگر اس طرح کی جذباتی اور نا سمجھ لڑکی کی زبردستی شادی سے وہ خاندان بہت مسائل کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔'' تیمور علی خان نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ یہ سب شادی سے پہلے کی باتیں ہیں۔ شادی کے بعد لڑکی مصلحتاً اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں پیدا کر لیتی ہے۔''

''یہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔'' تیمور علی خان نے باپ کی بات کاٹ دی۔ ان کے انداز میں بڑی مضبوطی اور قطعیت تھی۔

''یہ محض تمہارے اندیشے ہیں۔'' دلاور علی خان اپنی بات پر اسی طرح قائم تھے۔

''یاد ہے پچیس برس بابا صاحب! آپ جانتے ہیں ہم نے ہوا اور شانے کے معاملات میں زندگی میں کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ ان کے قریب آنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ ہمارا خون ہیں۔ مگر اب حالات کچھ ایسے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اس بات کو اصل میں یہ ہے کہ روشانے مرنے سے پہلے ہمارے پاس ہماری مدد حاصل کرنے آئی تھی۔ جس میں انہیں آج بھی جرأت ہے کہ اس نے ہم سے ایک امید رکھی ہوگی۔ ہم کیسے برداشت کریں؟ اس کے ذہن میں یہ کیسے آیا کہ ہم اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔'' تیمور علی خان بہت سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔

''اس قسم کی مدد لینے گئی تھی وہ تمہارے پاس؟'' بابا صاحب کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ بڑی تشویش تھی ان کے انداز میں۔

''یہی کہ ہم آپ سے کہہ کر ہم سے اس کا رشتہ ختم کروا دیں۔'' تیمور علی خان نے یہ جملہ بہت مشکل سے کہا تھا۔

''تم سے براہ راست کہا تھا اس نے؟'' دلاور علی خان حیرت سے ساکت ہو گئے۔

تیمور علی خان گہری سانس لی۔ اور بہت آہستہ سے کہا۔ ''جی۔''

کمرے میں یکدم صحرائی سکوت طاری ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹے خاموشی کا توڑ تلاش کرنے لگے۔

''اور تم کل کی لڑکی کی بات ہم سے منوانے لگے۔ کیا فرض بنتا تھا تمہارا؟ اس کو سمجھاتے۔ تاج داری کے اصول سمجھاتے۔ بڑوں کے فیصلوں پر اعتماد کا درس دیتے۔ الٹا انہیں قائل کرنے کے چکر میں پڑ گئے۔'' بابا کی ناراضگی تھی دلاور علی خان کے لہجے میں۔

''بابا صاحب! بہت کچھ ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی کمی ہے ہماری زندگی میں۔ اور یہی ہم سے کبھی برداشت نہیں ہوگی اور وہ بھی اپنے بچوں کی زندگی میں۔

آپ نے اور بھائی میاں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ نظری کے شادی کے بعد ٹھیک ہونے کے ننانوے فیصد چانسز ہیں۔ میڈیکل کے مطابق اسے کوئی فزیکل پرابلم نہیں ہے۔ ہم نے بھتیجے کے لیے خود خوشی کا مظاہرہ کیا۔ اور آپ کی بات مان لی۔ بھجوا آپ کے حوالے کر دی کہ اس کا باپ دس ہزار روپے میں ساٹھ سال کے بوڑھے سے اس کا نکاح کر رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ تھوڑے دنوں کی تکلیف کے بعد نسبتاً اسے بہتر اور ینگ پارٹنر مل جائے گا۔ تھوڑا سا اس بیمل کی اس بوڑھے سے تو کہیں بہتر ہے۔ مگر مقصد یہ درست نہیں ہو سکی۔ ہم تھوڑا سا گلٹی فیل کر رہے تھے۔ بہت تھوڑا سا۔

مگر روشانے نے تو ایک رات میں اکیس سال پہلے کے تیمور علی خان کو زندہ کر دیا۔ وہ بے حسی جو ہم نے اپنے آپ سے انتقام لینے کے لیے اوڑھ لی تھی۔ اس لڑکی نے نوچ ڈالی ہے۔

ہماری ذات اس لڑکی کی بہت سی محرومیوں کی ذمہ دار ہے۔ ہماری اولاد ہے۔ ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ ہمارے بچے ہمارے تضادات نے کبھی اسے کھل کے خوش نہیں ہونے دیا۔ اس کے والد محترم ہمارے بڑے استحقاق کے ساتھ دلاتے تھے مگر کبھی فرق نہیں کرا سکے ان کو کتنا قرب حاصل رہا۔ آپ ہمارے باپ ہیں ہم بھی آپ کی غلطیوں کی نشاندہی نہیں کریں گے مگر اپنے آپ کو تو مطمئن کر سکتے ہیں۔ اپنے گناہوں کا اعتراف تو کر سکتے ہیں۔ تب تو ہو سکتے ہیں ازالہ کرنے کو

کوشش تو کر سکتے ہیں؟"

تیمور علی خان کے لہجے سے تپش آ رہی تھی۔ دکھوں کا ایک لاوا تھا جس میں کراہیں سوکھی لکڑیوں کی طرح چٹخ رہی تھیں۔

دلاور علی خان تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئے تھے۔

"ہم اپنے ہاتھوں اسے مزید دکھ نہیں دے سکتے۔ آپ ہمیں معاف کر دیں۔" وہ اتنا کہہ کر بالکل خاموش ہو گئے۔

دونوں کے درمیان ایک بے بسی خاموشی چھا گئی۔

"تم خیر خواہ کی حیثیت سے اسے اچھا سمجھا تو سکتے ہو تیمور۔" دلاور علی خان نے چند لمحوں بعد خاموشی توڑ ڈالی۔

"ہم نے چونکہ اس کی بات کھول دی ہے۔ اس لیے یہ کافی ہے۔ یہی ہونا چاہیے تھا۔ بابا، تو وہ دوبارہ بات کو کبھی بھی نہیں اٹھائیں گے، یہ بات سمجھ لیجیے۔"

"یعنی تمہارا مطلب یہ ہے کہ علیم الدین کو جواب دے دیا جائے؟ مگر کیا تم ہمیں یہ بتانا پسند کرو گے کہ اس نے تمہیں یہ بات سمجھائی ہے؟" بابا صاحب نے سوال کیا۔

"ہم آپ کے احسان مند ہوں گے۔ آپ جلد از جلد فرصت میں یہ رشتہ ختم کر دیجیے۔ آپ کے مکمل سوال کا یہی مکمل جواب ہے۔"

"اب یہ اتنا آسان نہیں ہے تیمور۔ یاد رکھو اسے وہ شخص اس کی شادی چاہ رہے ہیں۔" دلاور علی خان۔ بہت الجھے ہوئے تھے۔

"آپ رشتہ ختم کر دیں گے تو وہ کیا کر سکیں گے۔ رشتہ طے بھی تو آپ ہی نے کیا تھا۔"

تیمور علی خان تو فیصلہ کن حالات میں تھے اس لیے ان کا ہر جواب دو ٹوک اور بے دھڑک تھا۔ ہر قسم کی مصلحت سے بالا۔

"کیا بدلہ لے رہے ہو بیٹے ہم سے؟" دلاور علی خان نے جیسے شکست مان لی۔

"اتنے برے گمان کر کے ہمیں اپنی ہی نظروں میں نہ گرائیں بابا صاحب۔ بس اتنا چاہتے ہیں کہ دکھوں کا سلسلہ ختم ہو جائے۔" تیمور علی خان کا لہجہ بھی شکستہ تھا۔

"بہت مشکل ہو جائے گا تیمور۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔" بابا صاحب گویا ہوئے۔

"اگر اس مسئلے کا نتیجہ کسی حقیقی خوشی کی صورت میں نکلتا ہے تو بابا صاحب مشکل ہو جانے دیں۔" وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے قطعی انداز میں کہہ رہے تھے۔

دلاور علی خان نے آنکھیں موند لیں۔ ان کی تھکن آلود پیشانی سے ظاہر تھا وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔

"ہم ذرا بی بی جان سے مل لیں۔ وہ کئی دنوں سے ہمیں بلا رہی تھیں۔" تیمور علی خان اٹھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"ہوں۔" دلاور علی خان نے غائب دماغی کی کیفیت میں ہنکارا بھرا۔ تیمور علی خان کمرے سے باہر آ گئے۔ حویلی کی راہداریوں میں سناٹا تھا۔ وہ پہر کا وقت تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں بند ہو چکے تھے۔ ملازمین بھی اپنے

سنا رہے تھے۔

تیمور علی خان کے چری جوتوں کی چرچراہٹ اس خاموشی میں بہت واضح تھی۔ ماہی نے کمرے کا دروازہ کھولا ہوا تھا۔ اس نے اس چرچراہٹ ہی سے اندازہ لگا لیا کہ تیمور علی خان کا رخ اس کے کمرے کی طرف ہے۔ وہ مستعد ہو چکی تھی۔ اندازہ درست تھا۔

اور چند لمحوں بعد۔ تیمور علی خان واقعی دروازے میں تھے۔

"ابھی کچھ پریشان تو نہیں ہو پارٹنر۔ اپنا دل یہ حسب معمول رکھو۔"

"او کے۔"

ڈارک براؤن پینٹ اور ہلکی گرے شرٹ میں ملبوس تیمور علی خان کا انداز بہت پر سکون تھا۔ ماہی نے ان کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا اس کی نظریں ان کے ڈارک براؤن چمکتے ہوئے جوتوں پر جمی تھیں مگر اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی "گڑبڑ" نہیں۔

"ہم بی بی جان کے کمرے میں ہیں۔ کوئی بات ہو تو کہہ سکتی ہو۔" وہ پلٹ گئے۔

"جب کچھ پریشان ہی نہیں ہوں تو بات کیا کریں خان۔" وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ دل ہی دل میں کہہ کر اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا صاحب آپ؟" یاور علی خان تو جیسے سناٹے میں رہ گئے۔ ماہین اپنے سر میں مساج کر رہی تھی اس کے گردش کرتے ہاتھ رک گئے۔

"مگر کیوں؟ کل تک تو اس لڑکے میں دنیا جہان کی خوبیاں تھیں؟" انہیں واقعی بڑا شاک پہنچا تھا۔ بابا صاحب سے یہ سن کر کہ وہ علیم الدین کو جواب دے چکے ہیں۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کل تک تو سب ٹھیک تھا آخر اب غلط کیسے ہو گیا۔" وہ اپنی جھلاہٹ پر بمشکل قابو پا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ آ جاؤں گا ویک اینڈ پر۔ جی۔ سب خیریت ہے۔" انہوں نے بے دلی سے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہو گیا؟" ماہین اٹھ کر قریب چلی آئی۔

"علیم الدین کو جواب دے دیا ہے۔ وجہ بھی نہیں بتائی۔ حویلی بلایا۔ کیا زندگی ہے۔ مشکل در مشکل۔" انہوں نے ٹائی ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھی۔

"کوئی تو وجہ ہو گی۔ جائیں گے تو پتہ چل جائے گا۔ غصہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔"

ماہین تو جیسے اپنی خوشی چھپا نہیں پا رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر روشی کو یہ خوشخبری سنا دے۔

"بس۔ ادھر ہی ہوتی ہے ہر وجہ۔ واٹس اے لائف۔"

بس اب کوئی شادی وادی نہیں ہوگی اس کی۔ پاسپورٹ اپلائی کروا رہا ہوں۔ اس کا جواد کے ساتھ ہے ابھی بھی وہ اس کو
کے لیے۔ آپ کہہ دیں اس سے کہ وہ ماسٹر چیک اپ کرالے کوئٹہ۔ شادی۔ وہ دوسری طرح بھلا رہا ہے تھے۔

ماہین جیل کی بوتل بند کر کے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ مزید خبر اس کی برداشت سے باہر تھی۔

اس نے دروازے پر ہولے سے ناک کیا تو وہ کھل گیا۔ روشی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ ماہین کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دی۔

"آئیں خالہ! اپنے بلوے پاس آنے کی اجازت دے دی؟"

"اچھا بند کرو یہ طعنے بازی۔ ایک اچھی خبر لے کر آئی ہوں۔ موڈ خراب نہیں کرو۔"

"اچھی خبر۔ ادھر بھی ایسا ہونے لگا ہے؟" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

"بابا صاحب کا فون آیا تھا ابھی تمہارے پاپا کے پاس۔"

روشی کے کان کھڑے ہو گئے مگر بظاہر بے تاثر چہرہ لیے کھڑی رہی۔

"بھئی سمجھ میں نہیں آ رہا مبارک باد دیں یا افسوس کریں۔" ماہین اس کے بستر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

روشی ہنوز خاموش رہی۔

"تمہارے پاپا تو بہت غم ناک بیٹھے ہوئے ہیں۔" وہ مزید گویا ہوئی۔

"کیوں سسپنس کری ایٹ کر رہی ہیں۔" روشی مزید ضبط نہ کر سکی۔

"علیم الدین صاحب کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہے اور بی صاحب ان کے سر ہی پٹختے رہ گئے۔ افسوس۔" ماہین نے مسکرا کر افسوس کا اظہار کیا۔

روشی نے حیرت آمیز خوشی سے ماہین کی سمت دیکھا۔ "کیا سچ خالہ۔۔۔؟"

"بالکل سچ۔ کیسی لڑکی ہو تم۔ منگنی ٹوٹنے پر خوش ہو رہی ہو؟" ماہین نے گویا ملامت کی۔

"اگر یہی وہ خبر ہے جو آپ سنانے آئی ہیں۔ تو آپ کے منہ میں گھی شکر۔ مگر یہ بتائیں بات ختم ہو گئی ہے یا فی الحال کسی طرف بڑھ رہی ہے۔ اگر بڑھ رہی ہے تو یہ خبر کچھ اچھی نہیں ہے۔ کیونکہ پھر کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔" روشی نے یہ کہا اور ماہین کے قریب آ بیٹھی۔

"ہر خوشی کا اختتام کسی دکھ پر ہوتا ہے تو خوشی پر سے اعتبار اسی طرح اٹھ جاتا ہے۔ ابھی یہ تو علم نہیں کہ بابا صاحب نے اچانک اس طرح کا فیصلہ کس وجہ سے کیا۔ مگر کیونکہ فیصلہ ان کا ہے اس لیے یہ بات بہت اہم ہے۔" ماہین نے پیار سے روشی کے بال سمیٹے۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" روشی نے سوچتے ہوئے کہا۔

اب بس اس بات کا تجسس ہے کہ بات کیا ہوئی ہے۔ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا؟" ماہین کے لہجے میں گہری سوچ کا انداز تھا۔

اور روشی کے ذہن میں جیسے ایک جھماکا سا ہوا۔ تیمور علی خان اس کے تصور کے پردے پر ابھرنے لگے۔ اس نے طویل سی گہری سانس لی۔

"مگر کوئی بات نہیں کی کاکا جان نے؟" اس نے بے دھیانی میں سوال کیا۔

"کاکا جان نے؟" ماہین نے حیرت سے پوچھا۔ "کاکا جان کو کیا کرنا۔" وہ ذرا تشویش بھری نظروں سے روشی کو دیکھنے لگی۔

"آں۔ ہاں۔ وہ میرا مطلب ہے بابا صاحب نے۔" روشی ایک دم پشیمان ہوئی۔

"تمہارے ذہن میں اچانک کاکا جان کا خیال کیسے آیا؟" ماہین نے کھوجتی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"پتا نہیں۔ یونہی منہ سے نکل گیا۔" روشی نے قدرے لاپروا انداز میں بات بنانے کی کوشش کی۔

"وہ ہر شخص کے خیال میں آسانی سے آ سکتے ہیں۔ مگر تمہارے والد صاحب جواد اور تمہارے خیال میں بلاوجہ نہیں آ سکتے۔" ماہین درحقیقت کسی وجہ سے الجھن میں تھی۔

دونوں چند لمحوں کے لیے اپنی اپنی جگہ خاموش ہو کر بیٹھ رہیں۔ مگر کسی اہم بات کے دوران اچانک آنے والی خاموشی بہت محسوس ہوا کرتی ہے۔ دونوں سوچنے لگیں کہ اب کیا بات ہو۔

"روشی؟" ماہین از حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔

"ایک بات پوچھتی ہوں تم سے۔ وعدہ کرو جھوٹ نہیں بولو گی۔" ماہین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

"آپ پوچھیے۔ اور میں آپ سے کیوں جھوٹ بولوں گی؟" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"تم سرائے گئی تھیں؟ وہاں کئی دن ٹھہری بھی تھیں۔ وہاں کس کس سے ملیں؟"

ماہین سوال تو کر رہی تھی مگر جیسے جواب اسے پتہ تھا۔ اگر روشی ذرا ذہین سے ملی ہوتی تو ماحول میں زبردست تبدیلی آ چکی ہوتی۔ اگر اس سے چھپ چھپ کے وعدے بھی لے لیے جاتے تو اس کا چہرہ بہت کچھ بتا رہا تھا۔

کم از کم اس کے سامنے ضرور کھل جاتی۔ کسی نہ کسی زاویے سے پھر بھی جانے کیوں اس نے یہ پوچھا تھا۔

"کسی سے نہیں۔ وہاں تھا کون۔ کاکا جان کی بیٹی تھی صوفاں اور وہ جو کاکا جان کی واقف ہیں انہیں تو ہم نے کبھی دیکھا نہیں۔ بلقیس آپا بتا رہی تھیں کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو وہ ایک مرتبہ حویلی آئی تھیں۔ اماں جی کہتی ہیں کاکا جان کی شادی پر نہیں آئی تھیں اس لیے شاید وہ دوبارہ کبھی حویلی نہیں آئیں۔ بلقیس آپا نے بتایا تھا کہ ان کا نام لیزا تھا۔ مگر کاکا جان نے ان کا اسلامی نام عائشہ رکھا تھا۔ شاید۔ اماں جی کا بی بی جی انہوں نے پسند نہیں کیا ہوگا۔ مائنڈ کیا ہوگا۔ اسی لیے وہ دوبارہ کبھی نہیں آئیں۔ بلقیس آپا کہتی ہیں حویلی کے سب ہی لوگوں سے ناراض ہیں کیونکہ میں جتنے دن بھی سرائے میں رہی وہ مجھ سے نہیں ملیں۔"

روشی نے بڑی تفصیل اور سادگی سے جواب دیا۔

ماہین گویا سانس روکے اس کی بات سن رہی تھی۔ روشی خاموش ہوئی تو اس نے گہرا سانس سینے سے آزاد کیا۔

"تو کیا وہ اتنے دن گزار کر کے بیٹھی رہیں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ البتہ مجھے حویلی کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں گیسٹ روم میں تھی یا پھر باہر لان میں چلی جاتی تھی۔ صوفیاں سے میری ملاقات باغ ہی میں ہوئی تھی۔ بڑی کیوٹ بچی ہے۔ آکاجان کی۔ ان کے بیٹے کو تو ہم نے دیکھا ہے۔ بہت چھوٹا تھا۔ ایک مرتبہ جب بابا صاحب اسے حویلی میں لائے تھے۔ انگریزی میں بات کرتا تھا اور ان دونوں میں گزارے لائق انگریزی بھی نہیں آتی تھی۔"

روشی اپنی بات کے اختتام پر ہنس پڑی۔

"بہت انجوائے کیا تھا ہم نے۔ بڑا مزہ آیا تھا۔ چھوٹی بی بی جان (تزئین) سے ٹرانسلیشن کراتے تھے۔"

وہ بھی ہنس پڑی۔

"تم نے کوشش بھی نہیں کی ان کی وائف کو دیکھنے کی؟"

ماہین کے چہرے پر اس کی ہنسی کے جواب میں مسکراہٹ بھی نہ آئی۔

"میں اتنی پاگل تھی کہ بس کچھ سوچتی ہی نہیں تھی۔ اور پھر آرڈر آکاجان کا تھا اور میں ان کی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔" وہ بڑی روانی سے جواب دے رہی تھی۔

"ہوں۔ ملازموں سے بھی تم نے ان کی وائف کے متعلق بات چیت نہیں کی؟"

"ملازم؟" روشی ہنس پڑی۔ "جتنے پراسرار آکاجان نظر آتے ہیں، ان کے ملازم ان سے زیادہ پراسرار لگتے ہیں۔ روبوٹ جیسے۔ جذبات سے عاری ایک دم بلینک۔" وہ اب بات بات پر ہنس رہی تھی۔

"اچھا صوفیاں سے تمہاری کیا باتیں ہوئیں؟" ماہین کسی دھیان سے چونک کر پوچھنے لگی۔

"ارے خالہ کیا یاد دلا دیا۔ کیا زبردست بچی ہے۔ اتنی پیاری باتیں کرتی ہے کہ دل چاہتا ہے اس سے باتیں کیے جاؤ۔ اس پر اس کے ڈریسز۔ غضب کی میچنگ۔ کیا باذوق خاتون ہیں آکاجان کی وائف۔ سچ اب تو آپ دیکھیے گا میں آکاجان سے ضد کروں گی کہ وہ مجھے ان سے ضرور ملوائیں۔ کیا زبردست کپل ہے ہمارے خاندان کا۔"

"آہستہ بولو۔ مت کرو آکاجان، آکاجان۔ تمہیں پتا نہیں تمہارے پپا ان کا نام سن کر کتنے اپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔" ماہین نے اسے ٹوک دیا اور اسے واقعی بریک لگ گئے تھے۔

"واٹس اے سنگ۔ ہم نے بہت اہم بات مس کی ہوئی ہے۔ اور وہ کیا بات ہے کوئی نہیں بتاتا۔ بابا صاحب بھی انکاری بھی دونوں بھائیوں کا پرابلم سولو نہیں کر سکتی۔ بڑا اسٹرینج۔ کیوں خالہ؟"

"اچھا۔ تمہیں اتنا الو ہونے کی ضرورت نہیں۔" ماہین نے اسے ڈانٹ دیا۔

"اُفوہ۔ واقعی میں بن گئی ہیں۔ اب لائٹ بھی گئی ہیں پپا سے کہوں گی۔" روشی نے ہنستے ہوئے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"پلیز۔" ماہین نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے بگڑی سی بات کہی۔

"اچھا خالہ ایسا تو نہیں آپ کا دل چاہتا ہے کہ آکاجان کو دیکھنے کو ان سے باتیں کرنے کو؟" روشی ابھی تک اس کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے تھی۔

"نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں۔" ماہین نے اس کی بانہوں کا حصار توڑتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"جی آپ ان سے ضرور ملیے گا۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھا تو تھا البتہ میں نے جب تم نے حویلی میں طوفان اٹھایا تھا اور بابا صاحب اُٹھ کر چلے گئے تھے۔"

"مجھے تو اب آکاجان سے اچھا کوئی نہیں لگتا۔" روشی اٹھ کر بال درست کرتے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"اسی بات پر تو خفا ہیں تم سے تمہارے پپا۔" ماہین کے لہجے میں نامعلوم سی اداسی اتر آئی۔

"کوئی بھی باپ اپنی اولاد سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتا۔ میں کسی بہتر طریقے کی تلاش کر رہی ہوں۔ آکاجان ان کے سگے بھائی ہیں۔ وہ میرے آکاجان ہی تو پپا کی وجہ سے ہیں۔"

"اچھا اب خاموش ہو جاؤ۔ میں تو تمہیں خوشخبری سنانے آئی تھی۔ صاحب پھر انتظار کر رہے ہوں گے۔ گڈ نائٹ۔ اللہ نگہبان۔"

ماہین ایک دم گم صم سی نظر آنے لگی تھی۔

"بہت چھپی ہیں آپ پپا کو صاحب کہتے ہوئے۔" روشی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ویسے بنڈل آف تھینکس فار دی نیوز۔"

"گڈ نائٹ مائی ڈیئر۔" ماہین زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی اور باہر نکل گئی۔

ابھی ویک اینڈ میں دو دن باقی تھے کہ حویلی سے پھر ایک زبردست خبر آ گئی کہ گل گوہر کا نکاح ہو رہا ہے کیونکہ مصور بابا شعلی کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر روانہ کیا جائے۔ حاتم تیمور علی خان کے ماضی میں کیے گئے اقدام کی وجہ سے اب باہر جانے والے لڑکے کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔

روشی تو سنتے ہی بے تاب ہو گئی۔ "خالہ! جلدی چلیں۔ وہاں کتنا مزہ آ رہا ہو گا۔ اور یہ خالی نکاح کی کیا تُک ہے۔ گل کو مصور بھائی کے ساتھ ہی بھیج دیں۔ پتا نہیں کتنے سال بعد لوٹیں۔"

"یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کہ صرف نکاح کیوں ہو رہا ہے۔ رخصتی کیوں نہیں ہو رہی۔"

"خالہ آپ کہیں وہ ہمیں آج ہی حویلی بھجوا دیں۔ پلیز خالہ۔"

ماہین کچن کے کام سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں اپنے حساب کتاب سے الماریوں میں برتن سیٹ کر رہی تھی۔ روشی ہاتھ ملتے اس کے پیچھے پیچھے منت کے انداز میں پھر رہی تھی۔

"وہ کہہ رہے ہیں ہم بس نکاح والے روز جائیں گے۔ وہ بہت بزی ہیں۔" ماہین نے بہت مصروفیت کے عالم میں

جواب دیا۔

"فرسٹ کزن کا نکاح ہے۔ بھلے کی شادی تو نہیں ہے۔ حد ہو گئی۔" وہ بری طرح جھلا گئی۔

"ہاں تو صبح سے چلے جائیں گے۔ اب وہ عام آدمی تو نہیں ہیں کہ جب چاہے کہیں چل دیں۔ ایک حساس اور اہم سیٹ ہے ان کی۔ میں اصرار کروں گی تو بھی کہیں گے کہ پڑھ لکھ کر جاہل بن رہی ہو۔" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو آپ ان سے یہ کہیں، وہ ہمیں ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیں۔" روشی کے انداز میں ضد تھی۔ "سب ان سے ڈرتے ہیں، آپ تو اتنا نہیں ڈرتیں۔ آپ کی بات تو وہ سن لیں گے۔"

"وہ مجھے فیصلہ سنا چکے ہیں۔ مجھے تو وہ ڈرائیور کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ مگر تمہارے بارے میں ان کا کہنا ہے، تم جہاں جاؤ گی ان کے ساتھ جاؤ گی۔"

ماہین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو پھر میں نکاح والے دن بھی نہیں جاؤں گی۔" وہ دھم سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہو سکتا ہے آنے والے کل میں تمہیں ان سے اس سے بھی زیادہ اہم بات منوانا پڑ جائے۔ ان کا غصہ بڑھاؤ گی تو خود ہی مشکل میں پھنسو گی۔"

"اب بھی کونسی آسانی ہے۔ جیل میں ڈال دیا ہے اٹھا کر۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

ماہین الماری کھلی چھوڑ کر تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"بری بات ہے روشی! اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو بس ہر جگہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ انہوں نے تمہیں پڑھایا لکھایا ہے۔ تمہاری شادی بھی اچھی جگہ کریں گے۔ تمہیں زندگی میں خدانخواستہ سرد و گرم پیش آئیں گے تو وہ حال پوچھیں گے۔ کوئی تمہارے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کرے گا تو اس سے سختی سے نمٹیں گے۔ خود بھی سخت سست کہہ لیں گے۔ مگر کسی دوسرے کو کبھی اس طرح کی حرکت کی اجازت نہیں دیں گے۔ حتیٰ کہ اگر میں بھی تمہارے ساتھ زیادتی کر بیٹھوں تو وہ مجھے بھی معاف نہیں کریں گے۔"

وہ اسے گلے سے لگا کر بہت محبت سے سمجھا رہی تھی۔

"آپ کو واقعی پپا سے بہت محبت ہے۔ اور مجھے اس بات پر افسوس نہیں بلکہ خوشی ہے اس لیے کہ میرے باپ نے ایک طویل زندگی ویران اور بے رنگ گزاری ہے۔ بہت اچھی وکیل ہیں آپ پپا کی۔"

روشی نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔

"بدتمیز نہیں تو۔" ماہین نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی۔

"اس طرح بولتے ہیں باپ کے 'پرسنل' پر، بے وقوف۔ اور میں کیوں ان کی وکالت نہیں کروں گی۔ جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "چلو موڈ ٹھیک کرو۔ پھر شاپنگ کرنے چلیں گے۔ تمہیں نکاح پر پہننے کے لیے کوئی اچھا سا سوٹ دلوا دیتے ہیں۔"

"ایسی نہیں ہوں میں جو آپ مجھے بہلا لیں گی۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"اچھا میں ان سے اصرار کروں گی کہ وہ تمہیں حویلی اس طرح بھجوا دیں کہ تم نکاح سے پہلے ایک رات کیوں کہ تم مل کر آنے والے تو کہا ہیں۔ ٹھیک۔ ویسے مجھے پتا ہے کہ تمہیں حویلی پہنچنے کی جلدی کیوں ہے۔" وہ رک کر شرارت سے کھنکاری۔ "بہت ہی مشکل پسند لڑکی ہو۔"

"خیال، آپ شادی سے پہلے بھی اتنا ہی کام کرتی تھیں۔ یا دادا گھر میں آپ کو بہت ہے تو پتہ لگتا ہے، کیونکہ جب سے آپ آئی ہیں صبح سے شروع ہو جاتی ہیں۔" اس نے فوراً بات بدل دی۔

"نہیں بھی اتنا، مگر تم بہت خوبصورت ہے۔ بس یونہی ذرا میچ کر کے دیکھ رہی ہوں۔ ویسے بات ہونے سے خیال نہیں بدلتا۔" ماہین نے اسے شرارت سے چھیڑا۔

"پھر شاپنگ کے لیے کب چلیں گی؟"

"بتاؤں گی۔ پہلے تمہارے پپا سے ایک دن پہلے جانے والی بات تو منوا لوں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو تمہاری شاپنگ بے کار جائے گی۔"

"ہاں بس یہ بات ضرور منوائیں۔ ورنہ میں واقعی نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا بابا۔ ویسے تم اپنے پپا سے سوری ضرور کرو۔ کتنی بری بات ہے وہ تم سے ناراض ہیں اور تم نے ابھی تک ان سے سوری نہیں کیا۔ اس طرح کی ہٹ دھرمی سے تو دونوں کا غصہ اور بڑھتا ہے۔"

"کروں گی سوری۔ مگر میرے سوری کرنے سے ان کی ناراضی ختم نہیں ہوگی۔ کیونکہ معاملہ ان کی انا کا ہے۔ اور مجھے تو ان سے بہت سے سوری کرنا ہیں۔ اکٹھے کروں گی۔" اس نے دھیمی قدرے شرارت بھری آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" ماہین نے بری طرح چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسے وہ بہت عجیب سی محسوس ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ یہ کہہ کر ایک لمحے کے لیے باہر نکل گئی۔

"سوری تو ڈی۔ سی صاحب کتنوں کے آپ پر ادھار ہیں کیا کروں کبھی آپ پر ترس آنے لگتا ہے اور کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ کیا قسمت ہے ہم دونوں بہنوں کی۔ ہماری تقدیر میں کھل کر خوش ہونا لکھا ہی نہیں، یا پھر خوشیاں ہمیں راس نہیں۔"

عقلوں کی جکڑبندیوں سے پریشان دل بہانے بہانے سے رسیاں تڑانے لگتا تھا۔

بہت عرصے بعد یاور علی خان نے خود ہی جیپ خود ڈرائیو کی تھی۔ ماہین نے پوچھا بھی تھا۔ "ڈرائیور کو کیوں نہیں لے جا رہے؟"

"ایسے ہی۔" یہ جواب تھا ان کا۔

ماہین تو ان کے برابر میں ہی بیٹھی تھی، جبکہ روشی ان کے پیچھے بیٹھی۔ بظاہر میگزین پڑھنے میں مصروف تھی۔ یوں لگتا

یاور علی خان کی موجودگی میں اب وہ ضرورت سے زیادہ کانشس ہو جاتی تھی۔

کوشش کرتی تھی کہ ان سے کم سے کم سامنا ہو۔ بس کچھ اندر کے چور ہوتے ہیں جو انسان کی خود اعتمادی چھین لیتے ہیں۔ وہ جیت بھی سکتا ہے مگر ہار جاتا ہے۔ اس نے کئی بار نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ گریس فل سے سوٹ میں ملبوس ہیئر اسٹائل۔ اسٹیئرنگ پر دھرے مضبوط ہاتھ۔ ایک تنے سے بالا قامت جھلک رہی تھی۔ اس پر ان کی محسوس خوشبو۔ مگر ایک دم برف۔ سپاٹ۔ سرخ ڈورے والی آنکھیں ونڈ اسکرین پر اس انداز میں جمی تھیں کہ وہ محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک دم اس کا دل بھر آیا۔ اس کا دل چاہا جان ہار کر باپ کو منا لے۔ آنسو ایک تواتر سے رخساروں پر بہہ نکلے۔ وہ دانت کاٹ کر آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

"روشی کچھ کھانے کا موڈ ہو تو باسکٹ سے لے لو۔ فکر نہیں بھی ہیں۔" ماہین نے گردن موڑ کے بظاہر اسے متوجہ کیا۔

وہ خاموش رہی۔

"وہ اسٹوری کی چاچاں تم نے مکس سے اٹھائی تھیں۔" معا ماہین کو ایک اور فکر نے ستایا۔

"جی۔" روشی نے خود پر قابو پاتے ہوئے مختصر کہا۔

ماہین کو یہ فکر بھی ہو رہی تھی کہ وہ بور نہ ہو رہی ہو۔ اس لیے وہ بات برائے بات بھی کر رہی تھی۔ اور اسے بات کرنے کا حوصلہ بھی مل رہا تھا۔

"وہ بکس رکھ لی تھیں تم نے جو تم کہہ رہی تھیں کہ پڑھ کر دینا ہیں۔" ماہین نے پھر ایک سوال کیا۔

"جی۔" اس نے جلدی سے رخسار اور آنکھیں چادر سے پونچھ ڈالیں۔ مبادا ماہین گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھ لے۔

یاور علی خان نے مرر میں دیکھ لیا تھا۔ ان کے دل کو کچھ ہوا تو تھا۔ دل تو چاہا تھا کہ پوچھیں کہ کیا دکھ رہا ہے؟ مگر پھر وہی لاتعلقی سی منظر ونڈ اسکرین پر لگا۔ چادر میں لپٹی روشی تیمور علی خان کا بازو تھامے ان کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ ان کی آنکھوں کی سرخی گہری ہونے لگی۔

ماہین اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ "کوئی اہم تقریب ہے کیا؟ تیمور علی خان شریک ہوں گے؟"

رات گیارہ بجے کے قریب وہ حویلی پہنچے تھے۔ باہر کا تو کوئی مہمان نہیں تھا۔ حویلی کے مکین ہی ماشاءاللہ اتنے تھے کہ اکٹھے بیٹھے دکھائی دیتے تو عام حالات میں تقریب کا گمان ہونے لگتا تھا۔

فاران اور شہر گیٹ پر ہی مل گئے۔ ماہین کو دیکھ کر بہت خوشی سے مسکرائے تھے۔ اور یاور علی خان کی موجودگی کا احساس کر کے زیادہ احتیاط سے باتیں کر رہے تھے ورنہ ماہین سے تو وہ خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔

بالو ان کی آمد کا سن کر بھاگی چلی آئی۔

"السلام علیکم ماہین بی بی۔ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ دو ایک روز میں بلوا لوں گی۔"

اس نے پھر سے ہی شکوہ کیا۔ اس روز وہ چاہتی تھی مگر یاور علی خان نے ماہین سے کہا تھا کہ اسے دو روز لے کر جاتی ہیں۔ بلوانا وہ بھی وعدہ کر کے گئی تھی مگر مصروفیت میں دھیان ہی نہیں آیا۔

"ہاں مصی، واقعی میں مصروفیت میں بھول گئی تھی، خیر اب چلو۔" اس نے تسلی دی۔ وہ روشن آرا کی طرف دیکھ کر استقبال کے لیے پورچ تک چلی آئی تھیں۔ روشی انہیں سلام کر کے اندر جا چکی تھی۔

جہاں بارکیوں میں اس کی آمد کی خبر نے تہلکہ مچا دیا تھا۔

یاور علی خان بھی اندر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ ماہین روشن آرا اور بالو ایک طرف ہٹ گئی تھیں۔

"وہ تیمور۔" روشن آرا نے گویا صرف گاڑی پہچان کر کہا تھا۔ بے ساختہ اندر کی طرف جاتے ہوئے یاور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔ ماہین نے پیچھے اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ قدم وہیں زمین نے پکڑ لیے تھے۔ روشن آرا نے ماہین کی سمت دیکھا وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی تھیں۔

تیمور علی خان پچھلا دروازہ کھول کر باہر آ چکے تھے۔ بہن پر نظر پڑی تو ان کی طرف ہی چلے آئے۔

"السلام علیکم بی بی جان!" ساتھ ہی ماہین کی سمت دیکھا تھا۔

"وعلیکم السلام" انہوں نے اسی پریشانی کے انداز میں جواب دیا۔

"السلام علیکم ماہین۔" اس نے مسکرا کر بہت ہی زیادہ اختصار سے کام لیا۔ وہ بہت دلچسپی سے تیمور علی خان کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" تیمور علی خان نے گویا الجھ کر بہن کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں سمجھا دیا کہ یاور علی خان آئے ہوئے ہیں۔ لیلی تو کب کا رابطے سے انہیں حویلی کی سب خبریں ملتی رہتی تھیں۔ جب یاور حویلی میں مقیم ہوتے تھے۔ وہ اس طرف آنے سے احتراز کیا کرتے تھے۔ [illegible]

"ہم ادھر گیسٹ روم میں ہیں بی بی جان! آپ بابا صاحب کو بتا دیں۔"

انہوں نے ماہین کو مسکرا کر نظر انداز کر کے بہن سے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

"آؤ ماہین۔" روشن آرا نے گم صم سی کیفیت میں ماہین کو مخاطب کیا اور اسے شانوں سے تھام کر اندر لے گئیں۔

اندر کا تو رنگ ہی اور تھا۔ روشی کے اپنے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

بیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے گھول کر پی جائے۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی تھی۔

"دیکھ لیجئے ممانی جان۔ کیا حال ہو گیا ہے بے چاری کا۔ کتنی دبلی ہو رہی ہے یاور ماموں کو ذرا خیال نہیں۔" زیبا نے سلام کے فوراً بعد دہائی دی۔

"ابھی لڑکیاں دبلی ہی اچھی لگتی ہیں اب وہ زمانہ نہیں جب موٹاپا خوشحالی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔" ماہین نے روشی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ جو خود مسکراتی نظر آ رہی تھیں۔ بظاہر اپنی حاضر دماغی ظاہر کرنے کو مسکرا رہی تھیں۔

"ممانی آپا نظر نہیں آ رہیں خیریت؟" روشی کو بے چینی ہوئی۔

"ابھی اور بھی بہت سے لوگ نظر نہیں آ رہے ہیں۔" ممانی اپنی چوٹی میں بل ڈالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں اور آداب کرتی ہوئیں پھر باقاعدہ ترچھا منہ کر کے ماہین کو سلام کیا اور اپنی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

چہرے پہ کیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"ہائے اللہ ڈھولکی" معاً روشی کی نگاہ کونے میں پڑی ڈھولکی پر پڑی۔

"کتنے دن سے ہو رہی ہو تم لوگ" روشی کے چہرے پر دلی مسکراہٹ کو واضح محسوس کیا۔

"جب سے اعلان ہوا ہے" تابیہ نے برجستہ کہا۔

"اوہ کتنے مزے ہیں تم لوگوں کے۔"

"ایک تو پھٹ بھی چکی ہے" ستارہ نے اطلاع دی۔

"ہائے اتنے جوش و خروش سے بجائی تھی؟" ماہین ہنس پڑی۔

"اتنے برس کی خوش خبریاں ملیں تو یہی حال ہوتا ہے" ستارہ نے بھی حصہ لیا۔ عجیب سی بات تھی اس کے لہجے میں۔

ماہین کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی جانے اسے کیا یاد آ گیا تھا۔

"رکھو اس کی ڈھولکی تھی اسے ڈھولکی کے پیچھے ہے اور گھر کیلئے الگ سے منگوائی" زری نے قصہ کوتاہ کیا۔

"کس سوچ میں گم ہو گئیں؟" بیا نے روشی کو ٹہوکا دیا۔

"کچھ نہیں میں سوچ رہی ہوں ایک شادی پر اگر دو ڈھولکیاں خرچ ہوں گی تو خوشی ہمارے گھر میں کتنی ڈھولکیوں کا خرچ ہے؟" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ قہقہوں میں بڑی بے ساختگی تھی۔

روشی ایک دم تیزی سے ڈھولکی کی طرف بڑھی تھی اور وہیں بیٹھ کر اسے بجانے لگی تھی۔ آنچلوں میں دوپٹہ پھنسا کر کھینچ رہی تھی ساتھ ہی جھینپ کر تال بھی چیک کر رہی تھی۔

"اسٹائل سے تو لگتا ہے بڑی ایکسپرٹ ہو" ماہین بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"بڑی اچھی ڈھولکی بجا لیتی ہے یہ ممانی ابھی بجائے گی تو دیکھئے گا۔ اسے تو رقص بھی بہت اچھا آتا ہے آپا کی شادی پر اس نے ڈانس کیا تھا کون ساتھ تھا وہ؟" زری نے موٹو کی طرف دیکھا تھا۔

"اہم اہم ڈھونڈورا پیٹنے سے بہتر ہے سے کان کالا" موٹو کو اچھی طرح یاد تھا۔

"ارے واہ بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں" ماہین نے بڑی حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔

"اچھا ذرا بجا کر دکھاؤ"

"پہلے گوا دیا کر دکھائیں ایک گانے نے میرے اندر آفت مچائی ہوئی ہے" وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"کیا گانا ہے بھئی" سب ہی ازحد مشتاق نظر آنے لگی تھیں۔

اے مصور تیری تصویر ادھوری ہے ابھی

اس نے باقاعدہ ترنم کر سنایا تو پھر ماہین کے پہلو میں بیٹھی روشن آرا کو دیکھ کر ایک دم جھینپ گئی۔

"سوری بی بی جان" اس نے خفیف سے انداز میں نظریں جھکا کر کہا۔

"اس کیا خاص بات ہے اس میں سوائے اس کے کہ مصور بھائی کا ذکر ہے" تابیہ نے حیرت سے کہا۔

''بہت خاص بات ہے اس میں ہمارے منصور بھائی بھی ادھر ادھر کام کر رہے ہیں یعنی صرف نکاح نامے پہ دستخط کرنے کو چل
ہے'' روشی نے بڑے تاسف سے کہا۔

''یعنی مطلب یہ کہ تمہیں نکاح پسند نہیں ہے حاضرین غور سے سن لیں بلکہ فرمائش نوٹ کر لیں'' روبی نے جالے والے انداز
سر گھما کر گویا اعلان کیا۔

''چلو ٹھیک ہے کتنا ہی شارٹ نوٹس کیوں نہ ہو روشی کا صرف نکاح نہیں کریں گے بلکہ رخصتی بھی ساتھ ہی کریں گے''
روشن آرا نے مسکراتے ہوئے کہا اور گویا اپنی کیفیت میں تبدیلی پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

''امید ہے یقین آ گیا ہوگا آخر بی بی جان نے کہا ہے بڑی مضبوط دلیل ہے'' زری نے شرارت سے کہا۔

روشی ایک لمحے کو چپ ہو گئی تھی اور ماہین بے ساختہ دروازے کی سمت اٹھ گئی تھیں کہ جیسے وہ وہاں سے ہو کر گزر
رہتا ہو۔

''میرے خیال میں ہال میں سانپ آ گیا ہے'' ہیرے نے سنجیدگی سے کہا۔

لڑکیاں گویا اچھل پڑیں ''کیا مطلب'' وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں باغ میں کبھی کبھی سانپ نکل آتے تھے اس لیے
غالباً یہ کوئی مذاق نہیں لگی تھیں۔ روشن آرا اور ماہین بھی تشویش بھری نظروں سے ہال میں نظر دوڑانے لگی تھیں۔

''بھئی روشی بھری ہوئی ہے بس گئی سانپ سونگھ گیا ہے۔''

''بدتمیز'' سب جھینپ کر دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر ٹک گئیں۔

''امی بتا رہی تھیں ایک مرتبہ کاکا جان کو بھی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ بہت حالت خراب ہوئی تھی ان کی'' زری نے
اطمینان کا سانس بھرتے ہوئے گویا اپنے ڈر جانے کی توجیح پیش کی تھی۔

''ہیں بی بی جان'' ثانیہ نے پھر بھی تصدیق چاہی۔

''ہوں'' روشن آرا نے ٹالنے والے انداز میں ہنکارا بھرا اور ماہین پر اچٹتی ہوئی ایک نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئیں ایک
مرتبہ پھر وہ گم صم سی نظر آنے لگی تھیں۔

''آؤ ماہین۔ اوپر بھابی بیگم کے پاس چلتے ہیں وہ بہت شدت سے تم لوگوں کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں'' عجیب سرا
مری سی محسوس کی تھی ماہین نے ان کے لہجے میں۔ اب تو وہ حویلی والوں سے اتنی واقف ہو چکی تھی کہ نہ کسی انداز پر چونکتی
اور نہ الجھن میں پڑتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت حویلی میں کسی قسم کی کھلبلی مچی ہوئی ہے شاید دوسری خواتین تو
سادہ بیٹھی ہوں گی۔ وہ اطمینان بھرے انداز میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد لڑکیوں نے جلدی جلدی عشاء کی نماز پڑھی پھر باقاعدہ ڈھولکی لے کر بیٹھ گئیں تھیں ہوا
عالم تاب کے تمام خواتین بھی وہیں آ گئی تھیں۔

روشی مگو کو بھی کمرے سے گھسیٹ لائی تھی اس کا جوش و خروش حالانکہ خاصا سرد پڑ چکا تھا ماہین گھسے ہوئے لوگ تھے۔
دشمن جان ابھی تک نظر نہیں آیا تھا پہلے تو کسی بہانے سے اس کا ذکر بھی کر لیتی تھی اب تو خیال ہی سے زبان پر تالے پڑ جاتے

ہے۔

''میں بھی تو ماہین کون سا ہوم کیں اب؟'' حنا نے گولی کو باوا آیا تو اس نے روشی سے وضاحت چاہی۔

''وہ ملاحظہ کو آئی ہیں بڑی پیاری لے ہے اس گھونگھٹے کی چاندنی میں آ کیسی لگ رہی ہے''

''بہت اچھا ہے۔ ان کو گھونگھٹ دو وہ نہیں ہے اس طرف سے بچی آ جائیں گی پیچھے ہوئے کرسی لا رہا ہے''

بالکل'' سونا قہقہہ لگا کر گھونگھٹ کے شانے سے لگ گئی۔ گھونگھٹ کے چہرے پر ان گنت رنگ بکھر گئے۔

''بہت شیطان ہیں یہ'' تزئین نے اندر داخل ہوتے ہوئے سب کو سن لیا تھا۔

''پھوپھی بی بی جان سے پوچھو انہیں بہت گانے آتے ہیں'' لالی نے لقمہ لگایا۔

''تمہاری امی کو بھی کم نہیں آتے'' تم بڑی روتی رہتی تھیں اور یہ گھر کی شادیوں میں ڈھولکی بجاتی رہتی تھیں'' تزئین
نے ہنس کر روشن آرا کو چھیڑا۔

''ہیں بی بی جان سچ کہہ رہی ہیں امی؟'' لالی نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''ارے تو یہ کرو مجھے کہاں آتے ہیں گانے والے۔ اسے ہی سدھ بدھ نہیں رہتی تھی نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا بس ڈھولکی
ڈھولکی بجاتی رہتی تھی'' روشن آرا نے مسکرا کر ماہین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اچھا تو پھر آپ کے زمانے میں جب حویلی میں شادیاں ہوتی تھیں تو سب سے اچھے گانے کون گاتا تھا'' حنا نے بڑی
سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

خواتین کے چہروں سے مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی تھی تزئین نے روشن آرا کی طرف بے ساختہ دیکھا تھا۔ ایک
دہشت ناک سی خاموشی ماہین نے ماحول میں محسوس کی تھی اس نے سب کے چہرے پر باری باری ایک بہت ہی گہری نگاہ
ڈالی تو وہ سوچ رہی تھی وہ تو چند ہی تھی۔

''تائیں ہاں امی؟'' روبی نے روشن آرا کو متوجہ کیا۔

''اے کیا بے کار کی باتیں کرنے لگیں۔ چلو گانے گاؤ'' روشن آرا نے جھلا کر کہا۔

''کوئی حرج دار سا گانا یاد نہیں آ رہا'' حنا ذہن پر زور ڈالنے لگی روشی ڈھولکی پر تھاپ لگانے لگی۔ ہیرے نے دف بجانا
شروع کر دیا۔

''گھونگھٹ سے پوچھو۔ انہیں تو پتہ نہیں کون کون سے بھولے بسرے یاد آ رہے ہوں گے'' ثانیہ نے چھیڑا۔

''ماہین بھابی سے پوچھو'' سونی نے پہلی بار مشورہ دیا۔

''سنا ہے انہیں تو انگریزی میں آتے ہوں گے یا 'اس' میں'' یہ کنفہ میں کون سی زبان بولی جاتی ہے بھابی'' روبی نے گویا
اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

ہال میں پھر قہقہے بجنے لگے تھے۔ حنا نے رکھ سے ایک پنگاڑی جو نکالی تھی وہ پھر رکھتے رکھتے دب گئی۔ مگر ماہین کے
اندر جگنو کیاں نہیں اللہ روشن تھے۔

اندر ایک مستقل سی کیفیت کا قیام عمل میں آچکا تھا وہ بظاہر ہال میں تھی مگر ذہن کبھی اپنے بیڈ روم میں پہنچ جاتا تو کبھی گیسٹ روم میں۔ پھر اگلے ہی لمحے سرائے میں اس نے روشی کی سمت دیکھا تو بڑی جگمگاتے کپڑوں میں ایک مرتبہ اس کی آنکھوں میں روشنیاں اتر آئی تھیں۔

"یہ ہاری کہاں ہے۔ ابھی تک دکھائی نہیں دیا" وہ کسی دھیان سے چونک پڑی۔ تھاپ گویا ڈھولکی پر نہیں روشی کے دل پہ پڑی تھی۔ اس نے بڑی شکرگزار نظروں سے ماہین کی سمت دیکھا "اتنی دیر میں کسی نے اس کا نام تو لیا۔"

"خوشی کی تقریب ہے اب تو مصروفیات میں کوئی نہ کوئی اضافہ ہو گیا ہوگا" صبیحہ کے بستہ لبوں پر بھی جنبش ہوئی۔

"صبح منصور کے ساتھ ہی دیکھا تھا بائیک پر جا رہے تھے دونوں کہیں" زبیدہ بیگم نے بھاوج کو جواب دینا ضروری خیال کیا۔

"خوشی کا موقع ہے بی بی جان منصور کو بھی ادھر بلوا لیا کریں" ماہین کو منظر کی تنہائی کا دھیان آتے ہی منصور کا خیال آیا۔

"بابا صاحب نے چند دنوں کیلئے اسے کوہاٹ بھیج دیا ہے ظفری کراچی ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے اس ... تین ہفتے اسے وہاں لگ جائیں گے" زبیدہ بیگم بہت آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں۔

"کوہاٹ میں اس کا کیا ہے؟" ماہین نے دریافت کیا۔

"ٹھیکہ ہی بھجوا لو وہ ... وہاں رہتے ہیں خود ہی کہا تھا وہاں جانے کو" زبیدہ بیگم بولیں۔

"کس سے؟ بابا صاحب سے؟" ماہین نے جانے کیا سوچ کر پوچھا۔

"نہیں۔ بھابی بیگم سے کہتی ہے جو کچھ کہنا ہوتا ہے" وہ تزئین کی سمت دیکھتے ہوئے کچھ متفکر سی کیفیت میں کہہ رہی تھیں۔

اسی لمحے لڑکیوں نے گیت چھیڑ دیا۔

سن ری سکھی موہے بجنا بلائے

وہ سب یکدم لڑکیوں کی سمت متوجہ ہو گئیں۔ بلکہ تزئین تو ڈھولک اور روشی کے درمیان جگہ بنا کر خود بھی گانے میں شریک ہو گئیں اور اشارے سے صبیحہ کو بھی حصہ لینے کیلئے کہا۔ ساتھ ہی ماہین کو بھی اپنے برابر آ بیٹھنے کیلئے اشارتی اصرار کیا۔

صبیحہ تو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں ماہین نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر معذرت کر لی۔

اسی دوران ہاری اندر داخل ہوا تھا روشی ڈھولکی بجانے میں اور سُر تال ملانے میں اتنی منہمک تھی کہ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے ہاری کو نہیں دیکھا تھا اور جب وہ زبیدہ بیگم کو باہر آنے کا کہہ کر ایک بھرپور نگاہ روشی پر ڈال کر واپس پلٹ رہا تھا تو روشی جیسے کسی خواب کے عمل سے باہر آئی تھی مگر اب اس کی سمت ہاری کی پشت تھی وہ کمبل کلر کے ... شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ کپڑوں پر پڑی بے تحاشا شکنیں اس کی دن بھر کی مصروفیت کی چغلی کھا رہی تھیں زبیدہ بیگم بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھیں غالباً بابا صاحب نے طلب کیا تھا۔

"ارے ستیاناس کر دیا گانے کا بار بار ایک ہی مصرعہ دہرائے جا رہی ہو" لڑکیوں نے شور مچا دیا وہ کچھ کہہ رہی تھیں روشی

کو لگا جیسے ریڈیو سے بیک وقت دو اسٹیشن سنائی دے رہے ہوں۔

"اچھا بھابھی کیا ہو گیا ایک دم؟" روشی نے بے دھیان ہو کر پوچھا۔

ماہین کے ہونٹوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

صبیحہ کنکھیوں سے لڑکیوں کے کپڑوں پر بنا کام چیک کر رہی تھیں۔ اندازہ تو یہ لگانا تھا جہاں وہاں ادھر ادھر ہر طرف کپڑے ہی نظر آ رہے تھے ماہین نے نوٹ کیا کہ گانے کے بعد جانے میں اب روشی کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔

"ارے ماں صاحب تو گھر والوں کو نہیں کہیں اپنی مصروفیات میں ہمارا خیال ہی نہیں گیا" ماہین نے صبیحہ بیگم پر ایک ہی کہانی ... کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"روشی وہ والا گاؤ نا"

جب ساون گھر گھر آئے کوئلیا گائے
بلم تو آ جانا ——— سجن تو آ جانا

ماہین کو ایک پسندیدہ گیت یاد آ گیا۔

"پھر تو انہیں پاکستانی موسم کی خبروں کیلئے بہت کوشش رہتا ہوگا کوئی آسمان ہی شرط لگا" زری نے جگنی کا مظاہرہ کیا۔ اب بس پڑی تھیں مگر روشی کے لب مسکراہٹ سے ابھی عاری تھے۔

"میرا خیال ہے روشی تھک گئی ہے" شفیقہ بیگم نے روشی کی بدلتی کیفیت کو شاید سب سے زیادہ محسوس کیا تھا وہ عالم شب کی بے آرامی اور تھکی ہوئی سانس بھی تھیں۔

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں" زری نے تائید کی "واقعی اب یہ بالکل اضمحلال محسوس ہو رہی ہے"

"آج تو سفر کر کے آئی ہے بیٹھے بیٹھے بھی انسان تھک جاتا ہے" روشی اپنے آپ کو موضوع بنتا دیکھ کر قدرے شرمندہ ہو گئی۔

"ارے نہیں رات پڑی ہے سونے کیلئے ایک کپ کافی پی لوں گی سب تھکن بھاگ جائے گی بناؤں کافی؟ کون کون پیئے گا" اس نے سب حاضرین کو آفر کی۔

"ملانے کہو وہ بنا لے گی" روشن آرا بولیں۔

"نہیں کافی تو میں خود بناتی ہوں" اسے وہاں جیسے ایک دم گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی بس وہ جلدی سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔

یہ عمر کا ایک ایسا موڑ ہوتا ہے جب سنگ کھیلی سکھیوں کے بیچ تنہائی اور وحشت ہونے لگتی ہے یا تو تنہائی اچھی لگتی ہے یا وہ "وہ" جس کی ذات میں روشنی کے سارے رنگ جھلمل جھلمل کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ باتیں کرنا بھی اچھا لگتا ہے اور خاموش بیٹھنا بھی۔

"بھئی عجیب لڑکی ہو تھکن بھی ہے اور کام بھی کرنا چاہ رہی ہو" "اوہو تب کہہ وہ بہت اچھی چائے کافی بنا لیتی ہے" زری کو لگا کہ اس کا اٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"ابھی آجاتی ہوں آپی بیٹھے بیٹھے ٹانگیں بھی جڑ گئی ہیں" اس پر کسی کے صبر کا مطلق اثر نہیں تھا۔

وہ تیزی سے باہر نکل آئی تھی عجیب سی بے کلی تھی کہ بس چادر اتار کر وہ سامنے آجائے۔

کافی کا کہہ کر آئی تھی کافی تو بنا رہی تھی مگر کچھ سوچا بھی تھا بہت ہی خوبصورت سوچوں سے کیف کشید کر رہا تھا۔

وہ بڑی بے خبری کی کیفیت میں کچن میں داخل ہوئی تھی مگر مسرت کے احساس سے پیچھے ٹھہر رہی گئی۔

سائیڈ پر پڑی ڈائننگ ٹیبل کے سامنے بابری بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ یہ تو اس کے دھیان میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے بالو ماما اور کلثوم اوون کے سامنے کھڑی جانے کن خوش گپیوں میں مصروف تھیں سرسوتی سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔

"خیریت روشی بی بی۔ ہم سب بھی تو ایک جگہ اکٹھی ہو گئی وہاں آوازیں پڑ رہی ہوں گی" سب سے پہلے بالو کی نظر دروازے میں ایستادہ روشی پر پڑی ایک دم گڑبڑا کر گویا ہوئی۔

"کوئی نہیں بالو ماں میں تو کافی بنانے آئی ہوں" وہ بابری کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھی چھپاتے ہوئے بولی

"میں بنا دیتی ہوں کافی۔ سب پئیں گی؟" ماما نے اپنے مخصوص خادمانہ انداز میں کہا۔

"دو تین کے علاوہ تقریباً سب ہی پئیں گی۔ مگر کافی میں خود بناؤں گی آپ لوگوں کو ہوا لگے گی اٹھتی نہیں کب ہی کچن کو "جائے پناہ" بنا لیا۔ وہ مسکرا کر نظروں ہی نظروں میں الیکٹرک کیتل تلاش کرتی ہوئی گویا ہوئی۔

"ہم تو گانے سننے کیلئے ہی کچن کا کام جلدی جلدی سمیٹ رہے تھے" آپ لوگ تو بہت اچھا گاتے ہوئے گا رہی ہیں اچھے گانے آتے ہیں آپ کو" بالو نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"ہم نکلنے ہی والے تھے یہاں سے کہ خان آ گئے ان کیلئے کھانا گرم کیا" سرسوتی کہہ رہی تھی کہ اس کے لفظ یہاں سے نکلیں۔" کلثوم نے مزید تفصیل بیان کی۔

"ہاں بھئی۔ خان تو ہیں ہی سر سے پاؤں تک بے ترتیب کوئی وقت ہی نہیں جب دل چاہا کھا لیا۔ جب جی چاہا سو گئے" بابری بظاہر کھانے میں بہت منہمک تھا مگر اس کی ساری توجہ اسی ستم گر کی طرف تھی جو اس کی روح کی غذا بن چکی تھی۔

"بے مہار تنقید بھی بے ادبی میں شامل ہوتی ہے" مرشد فرماتے ہیں عورت بے ادب ہو تو گھر سے برکت اٹھ جاتی ہے" اس نے کانٹے میں کھیرے کا ٹکڑا پھنساتے ہوئے بڑی شریر مسکراہٹ کے ساتھ حصہ ملایا۔

سرسوتی تو خاک نہیں بھی۔ ماما کی صرف آنکھوں تک مسکراہٹ محدود رہی البتہ بالو دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ روشی کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ تو بڑا "جرات مند" ہو گیا ہے۔ یہاں ملازموں کے سامنے ہی شروع ہو گیا۔

"خان! مرشد نے تو بیوی کیلئے کہا ہو گا ہر عورت کیلئے تھوڑا ہی اس طرح کی باتیں تو گھر والی کے لئے کی جاتی ہیں" اس نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے گرہ لگائی۔

"اچھا ہو سکتا ہے آپ ٹھیک فرما رہی ہوں مگر یہ بیویاں اتنی بے ادب کیوں ہوتی ہیں کہ ان کیلئے اس طرح کی باتیں فرمانا پڑتی ہیں" وہ بڑی سادگی سے کہہ رہا تھا حسین بننے کی اداکاری کر رہی تھی۔

"اب ہی تھوڑا سی ہوتی ہیں" بالو نے اپنا حساب سے صفائی سے بچانے کی کوشش کی۔

"مگر جس بے چارے کی قسمت میں لکھی ہے اب بیچاری ہو گی وہ تو گھر بہ صورت مار ہی سمجھ لے والا ہوں گے عورت اپنا سب سے بڑھ کے بچے کو ڈانٹ رہی ہے۔ یہ نہیں معلوم اندر تو ہر بیچارہ از تا حیا ہیں۔ وہ بے چاری کب کی ہوتی ہے۔" ذومعنی مسکراہٹ بہت بلا کی شرارت ظاہر کر رہی تھی۔

روشی کیتل کا سوئچ آن کر چکی تھی" ماما کپ ٹرے میں رکھ لو" وہ یوں گویا ہوئی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"آپ فکر نہ کریں خان۔ انشاء اللہ آپ کو بہو اللہ نے اچھا ہی عطا ہو گا" ماما نے ہنس کر تسلی دی۔

"اللہ کرے حق ہے ماما۔ تکلیف کی دو صورتیں ہیں۔ ایک آزمائش دوسری سزا۔ نیک لوگوں کی تکلیف آزمائش ہوتی ہے تمہاری تکلیف عذاب دوسرا آزمائش تو ہو سکتی ہے میری۔ کیوں روشی بی بی؟" اس نے اچانک ہی اس میں کمال راست مخاطب کیا۔

"مجھے کیا پتہ آپ کے پاس تو فرشتے پروگریس کارڈ لے کر حاضری لگاتے ہیں ابھی ہمارا بہت ہے اس کے در سے پاس نہیں آتے۔" اس نے جیسے جل کر جواب دیا۔

"اللہ کسی کی پرخلوص محنت ضائع نہیں کرتا" آپ کوشش کرتی رہیے شاید آپ کے پاس بھی آنے لگیں" اس نے بہت تھوڑا سا بادام کا حلوہ نکالا ہوا تھا وہ تین چمچ کھا کر ٹیشو سے ہاتھ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کافی پئیں گے خان۔" کلثوم نے پوچھا

روشی اس کے قاتل انداز پر پہلے ہی جل کر خاک ہو رہی تھی اب باہر جانے کیلئے اس کا عجلت بھرا انداز اسے اپنی توہین محسوس ہوا تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ تو اب وہاں سے اٹھانے نہ اٹھے گا۔

"ارے نہیں بھئی۔ میری مرنے کے ساتھ بڑی انڈرسٹینڈنگ ہے جلدی سونا چاہتا ہوں آج۔ بہت تھکن ہے۔ اوپن جیپ میں سینکڑوں کلو میٹر طے کئے ہیں۔ یوں بھی رات کو جاگنے کافی پینا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی" سارا دن ہوتا ہے کھانے پینے کیلئے رات سونے کیلئے ہوتی ہے۔ دو ہستیاں ہی رات کو جاگتی اچھی لگتی ہیں۔ ایک الو دوسرا عاشق۔ نہ میں الو ہوں نہ عاشق۔ حالانکہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں"

"تو خان آپ تو پوری کتاب ہی پڑھ کر سنانے لگے۔ سیدھے سیدھے "نہ" کریں" ماما کی ہنسی چھوٹ گئی مگر روشی کا تو اس بے مہر نے دل توڑ کر بھی موڈ آف کر دیا تھا۔

اس کی ہیلو ہائے اس کے کام اس کے الفاظ سب کے بعد ہے۔ کیا اذیت ناک احساس ہوا تھا آنکھیں بھر آئی تھیں اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی تھا وہ اتنی دور گیا تھا اور اس سے ملے بغیر واپس آیا تھا۔ یہ تک نہیں سوچا کو خدا معلوم وہ دوبارہ کب ملتا ہو۔

"ماما کافی اندر لے جانا اگر کوئی میرا پوچھے تو کہہ دینا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ آرام کر رہی ہوں۔" وہ کافی بنانے کا پروگرام ملتوی کر کے اس سے پہلے کچن سے باہر نکل گئی۔ ماما کا بکا جاتے دیکھتی رہی۔

"روشی بی بی کا بھی پتہ نہیں چلتا خوشی تو کوئی بیماری تھیں اب خود ہی چھوڑ کر چلی گئیں" ماما نے ہاری کی طرف دیکھتے
ہوئے پیچیدہ سے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔
ہاری بھی کسی گہری سوچ سے جاگا۔
"حویلی کی ساری لڑکیاں بڑی سادہ اور عام سی ہیں۔ حویلی میں شہزادی تو صرف روشی بی بی ہے۔ وہ شاہزادوں والا
مزاج ہے اور شاہوں کے پاس وکیل تو نہیں ہوتی۔ سوا ہوتا ہے" وہ مسکراتے ہوئے ماما کو سمجھا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ
کی حیرت کو ختم کر رہا تھا۔
"یہ تو ہے مجھے شروع ہی سے ان سے ڈر لگتا ہے ہر وقت خفا خفا سی نظر آتی ہیں" کلثوم نے ہاری کی ہاں میں ہاں ملائی۔
"اب پتہ نہیں خود کوئی قیمتی گی یا نہیں" ماما خود کلامی کرتے ہوئے کوئی بنانے لگی ہاری کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔
ماہین تو اپنے اندر کی ادھیڑبن سے گھبرا کر ہال سے باہر آئی تھی یاور علی خان کو دیکھنے کا تو بہانہ تھا۔ بے اختیار اس کی
نظریں گیسٹ روم کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا بھاگ کر وہاں جا پہنچے اور تیمور علی خان کو سارے کا سارا واقعہ سب بتا دے
پہلی فرصت میں اپنی بہن سے ملنا چاہتی ہے تو اسے سرائے لے چلیں ابھی اسی وقت۔
وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گھاس پر ٹہلنے لگی وہ اضطراری انداز میں اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔
اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس حساب میں اتنی مصلحت سے کام لے رہی ہے زیادہ سے زیادہ یاور علی خان کے لیے
کی انتہا یہ ہوگی کہ وہ اسے چھوڑ دیں گے۔
ذہنی عذاب تو یوں بھی ہے اور یوں بھی۔ روشی کی شادی ہو جائے گی جواد باہر چلا جائے گا اسے تو اب ہمیشہ اس عذاب سے
ہی رہنا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو جائے گا کہ بچے اپنی ماں سے مل لیں ناز بڑا اپنے بچوں کو ایک بار سینے سے لگا لیں۔
وہ بے اختیاری کیفیت میں گیسٹ روم کے دروازے تک چلی آئی تھی اس احساس سے بے خبر کہ کسی نے اسے اس
طرف آتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔
اس نے دروازہ ناک کیا۔
کوئی آواز سنائی نہ دی اس نے دروازہ دوبارہ ناک کرنا چاہا ابھی ہاتھ فضا میں ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ تیمور علی خان
درحقیقت شاک لگا تھا۔
"اندر آنا چاہتی ہوں" اس نے نگاہوں میں نگاہ جما کر بے خوفی سے کہا۔
"تشریف لائیے" انہوں نے الجھن بھرے انداز میں ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیا۔ وہ اندر چلی آئی اور پلٹ کر
دروازہ بند کیا بلکہ چٹخنی چڑھا کے لاک لگا دیا۔ تیمور علی خان اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔ "بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے
اجازت طلب کی۔
"او شیور۔ ٹیک یور سیٹ پلیز" انہوں نے بہت مہذبانہ انداز میں صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ چہرے پر الجھن کے
آثار ہنوز تھے۔

"میں غیر ضروری تمہید میں نہیں الجھنا چاہتی اور اصل بات کرنا چاہتی ہوں" اس نے سنجیدگی سے کہا اور ان کی سمت
دیکھنے لگی۔
"پلیز آپ بھی تشریف رکھیے۔ اس طرح مجھے بات کرنے میں دشواری ہو گی"
تیمور علی خان ایک طرف ایک بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ماہین ان کی نظروں سے بچنے لگی تھی۔
"ایک درخواست ہے آپ سے" وہ کہتے کہتے رک گئی۔
"جی فرمائیے"..... بے قراری سوا ہونے لگی۔
"آپ مجھے میری بہن سے فون پر بات کرنے دیجئے اگر میں ان سے ملنا چاہوں تو مجھے ملنے دیجئے پلیز"
تیمور علی خان اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے گویا سماعت کا دھوکا ہوا ہو۔
"جی۔ بہن۔ آپ" ان کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو گئے وہ رک گئے۔
"جی میری حقیقی بہن میری بے گناہ اور مظلوم بہن۔ وہ بیس سال سے غلطی کر رہی ہیں۔ آپ ان کی غلطی میں ان کا ساتھ دے
رہے ہیں۔ آپ۔ صرف آپ ہی تو انہیں سمجھا سکتے تھے کتنی زیادتی کی ہے آپ نے بچوں کے ساتھ" اس کی آواز بھرانے
لگی۔
تیمور علی خان کی گویائی سلب ہو گئی۔ وہ اس کی جانب بغور دیکھ رہے تھے۔ کتنی شباہت تھی اس میں نازنین کی جب ہی تو
ایک لمحے کیلئے بھی اجنبی محسوس نہیں ہوئی تھی۔
"بیس سال بعد اچانک حویلی والوں کو کیا ہو گیا؟ آپ کے ساتھ یہ مہربانی کس نے کی۔ خیر اگر آپ ان سے مل بھی لیں
تو کیا ہو گا۔ وہ خود تو کسی سے ملنا نہیں چاہتیں" تیمور علی خان بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔
گرے ڈنر سوٹ پر سلور پرنٹ کا کاٹن پہنے گہری سوچوں میں گم تھے وہ آج بھی اتنے ہی جاذب اور حسین نظر آ رہے
تھے جتنا بیس سال پہلے صغریٰ کے ہوش اڑانے کیلئے تھے۔
"ان کا چاہنا چھوڑیئے میرے چاہنے پر توجہ فرمائیے۔" ماہین بے ساختہ کہہ رہی تھی۔
"ہماری will کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہم آپ کی خواہش ان تک پہنچا دیں گے اور جو بھی ان کا جواب ہو گا آپ تک پہنچ
جائے گا۔"
"خواہش نہیں پہنچائیں گے۔ اصرار کریں گے ان سے۔ پر بشر اصرار کریں گے ورنہ میں خود سرائے پہنچ جاؤں گی۔ چاہے
روشی کے بابا مجھے ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیں" ماہین کا انداز تقاضا ہی تھا۔
"ہم نے کہا ناں۔ ہم انتہائی کوشش ضرور کریں گے۔ آپ کو اطلاع ہو جائے گی۔" انہوں نے قدرے پرسکون انداز میں
کہا "حویلی میں کسی کو معلوم ہے آپ یہاں ہیں آئی ہیں" وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
"نہیں اس لئے کہ حویلی میں کسی کو بھی پتہ نہیں کہ مجھے معلوم ہے۔ ناز بھی الحمد للہ زندہ ہیں" اس نے بڑے سکون سے
جواب دیا۔

تیمور علی خان چونک پڑے "پھر آپ کو کیسے پتہ چلا؟" ان کی حیرت بجا تھی۔

ماہین مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی "کیا کریں گے جان کر۔ اور پھر آپ تو ابھی آئے ہیں"

"ہم آپ سے ایک بات کہیں گے، غور ضرور کیجئے گا" تیمور علی خان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی فرمائیے" ماہین نے قدم روک لیے۔

"زندگی کے سوز سے چلی ہے ہر تبدیلی پرانی ہو چلی ہے۔ تسلسل اسی طرح رہے، دیکھئے" کے اقدامات سے بری اثرات ہوں گے۔ اگر کچھ ہوا بھی تو یہ کہ نقصان کی فہرست طویل ہو جائے گی۔"

"شکریہ میں ضرور غور کروں گی" اس نے گہری سوچ میں ڈوب کر جواب دیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت دنوں سے کوئی بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی وہ آج تھوڑا سا اتر گیا تھا۔

"مہندی لگانے میں تو خالہ سولہ آنے ماہر تھیں، خود بھی مہندی لگانے اور پھول پہننے کی بہت شوقین تھیں۔ اماں بی کا کہنا تھا تو یہ سولہ آنے تو ہر وقت چوتھی کی دلہن بنی رہتی ہے۔ انہوں نے کبھی مرتے دم تک یہ حقیقت تسلیم نہیں کی کہ وہ بیوہ ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے شوہر فسادات میں لاپتہ ہو گئے ہیں اور ایک روز انہیں ڈھونڈتے ہوئے حویلی میں آ پہنچیں گے۔"

"رنگ اتنا نہیں چڑھتا جتنا مہندی کی تعریف تھی" تزئین گھر کی مہندی سے بے پناہ متاثر ہو کر تبصرہ کر رہی تھیں۔

"انہیں خالہ سولہ آنے کیوں کہتے تھے" "ایک روپیہ" "کیوں نہیں کہتے بی بی اماں" تانیہ نے آج پوچھ ہی لیا۔

تزئین کی ہنسی چھوٹ گئی "بھئی ان کا تکیہ کلام تھا سولہ آنے۔ جانے کس نوکرانی نے انہیں مذاق میں سولہ آنے کہنا شروع کیا پھر تو سب ہی انہیں چھیڑنے لگے۔ انہوں نے تو تکیہ کلام ترک کر دیا مگر لوگوں نے یہ ان کا نام ہی رکھ چھوڑا۔ سب لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے مگر اماں جی تو بڑی سنجیدگی سے انہیں سولہ آنے کہتی تھیں۔

کوئی ایسی عمر بھی نہیں تھی۔ برسات کے موسم میں انہیں ڈائریا ہو گیا تھا وہی موت کا بہانہ بن گیا۔

یوں بھی اماں جی کی رحلت کے بعد وہ بہت غمگین رہنے لگی تھیں۔ بہت محبت کرتی تھیں اماں جی سے اور اماں جی کو بھی بہت لگاؤ تھا ان سے۔ ہمیشہ انہیں تاکید کی کہ خالہ کا احترام کریں انہیں نوکر نہ سمجھا جائے، گھر کا فرد سمجھیں۔ حویلی کی شادیوں میں ان کا بھرپور رول ہوتا تھا۔ اللہ جانے کیا کیا ملاتی تھیں اُبٹن مہندی میں۔ مایوں کے بعد کتنوں دلہن کے وجود سے خوشبوئیں پھوٹتی رہتی تھیں" تزئین بڑی افسردگی سے خالہ سولہ آنے کا ذکر کر رہی تھیں۔

"گانے بھی وہ گاتی تھیں کہ بس۔ بڑی رونق تھی ان کے دم سے حویلی میں۔ کاش ایک دفعہ اور لگاؤں مہندی، رنگ اور تیز ہو جائے گا" انہوں نے گلو سے کہا۔

"رہنے دیں بی بی جان۔ بس ٹھیک ہے" وہ سر جھکا کر دھیرے سے گویا ہوئی۔

"اور کیا بی بی جان۔ کیوں بے چاری گلو آپا کو ماندہ کر رہی ہیں۔ کون سا رخصتی ہو رہی ہے" سمو نے کہا۔

"کاکا جان آئے تھے کیا چلے گئے ہیں بی بی جان؟" زری نے پوچھا۔

"وہ تقریب اٹینڈ کیے بغیر کیسے چلے جائیں گے" سمو نے تعجب سے پوچھا۔ تزئین خاموش رہیں۔

"ہو بھی سکتا ہے۔ وہ کب انوالو ہوتے ہیں حویلی کی باتوں میں، بالکل مہمانوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ بہت عجیب ہیں۔"

"پتہ نہیں کیوں ان سے اتنا ڈر لگتا ہے، بابا صاحب سے بھی زیادہ" روبی نے بھی حصہ لیا۔

تزئین اور خاموش تھیں۔

"اچھا ماموں اتنے اچھے ہیں پھر پتہ نہیں کاکا جان سے ان کی ان بن کیوں ہے؟ آج تک کسی نے بتایا نہیں جس سے بھی پوچھو ٹالنے لگتا ہے" ثمینہ نے منہ بسور کر کہا۔

"ہاں تو پھر بچوں کو کیا واسطہ، کوئی ضروری ہے بچوں کو ہر بات بتائی جائے؟" اس مرتبہ تزئین نے اتنے روکھے انداز میں بات کی۔ خلاف اختیار کر رہی تھی۔

لڑکیاں تزئین کا آف موڈ دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ اگرچہ ان کے لیے نئی بات نہیں تھی جب بھی وہ اس موضوع پر آتی تھیں انہیں اسی طرح ٹوک دیا جاتا تھا۔

"مگر تم تیار ہو کر جاؤ۔ پھر تمہیں چوڑیاں بھی پہنانا ہیں۔ تمہیں چوڑیاں بہت مشکل سے چڑھتی ہیں" تزئین جیسے کسی بہانے سے وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھیں۔

"چوڑیاں تو ہم سب نے بھی پہننا ہیں بی بی جان۔ روز کل کل کرتے آج کا دن آ پہنچا" ہیں نے یاد دلایا۔

"میرے خدا، وہ سانچے چوڑیوں کے جوڑے بھی پڑے ہیں" تزئین نے گویا سر پیٹ لیا۔

"وہ تو سب پرانی ہیں، اتنی اہم تقریب ہے کیا پرانی پہنیں گے؟" وہ اصرار کر کے بولی "آپ جیسی ہیں ویسے ہی ساتھ ہی لے کر آئیں مگر آپ کی طرح کہہ دیں کہ ہم پرانی پہنیں تو" روبی نے جیسے خوشامد کی۔

"اچھا ٹھیک ہے دیکھتی ہوں۔ ماہین کو کہتی ہوں وہ تم لوگوں کے ساتھ چلی جائیں گی۔ ایک تو ابھی تک جانے سے ماہین اکل جاتی ہے پھر بھی اکتائی نہیں"

"حالانکہ سولہ آنے بھابی ہیں" زری شرارت سے بولی۔

"ہاں اب تم خالہ کی جگہ سنبھال لو" تزئین مسکرا کر باہر نکل گئیں۔

"ارے روشی کو تو دیکھو۔ اسے نہ بھول جانا ورنہ موڈ آف کر کے ساری تقریب کا ستیاناس کر دے گی" زری نے توجہ دلائی۔

"ابھی جاتی ہوں۔ اس کے بغیر کیا مزا آئے گا" یہ بھاگ کر باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ باہر گاڑی تیار کھڑی ہے، لڑکیاں تو جیسے خوشی سے دیوانی ہو کر چادریں اوڑھ کر باہر بھاگیں۔

روشی اور روبی باہر آئیں تو گاڑی کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ البتہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ ابھی خالی تھی۔ وین میں اچھی خاصی گنجائش تھی مگر لڑکیاں بھی تو تقریباً ساری تھیں۔ ثمینہ اور گلو کے علاوہ۔

"تم دونوں آگے بیٹھ جاؤ" ماہین نے پرس سے گلاسز نکال کر چادر سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

دو انگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ "ذرا ٹھیک سے بیٹھو میں تو گیئر پر ہی چڑھ گئی ہوں" روشی نے روبی کو ٹوکا۔

"ذرا احتیاط سے کہیں ڈرائیور کی گود میں نہ چڑھ جانا" پیچھے سے ایک شرارتی آواز آئی۔

"کوئی بات نہیں اگر ڈرائیور گل شیر ہے تو چلے گا۔ بچے بڑوں کی گود میں بیٹھ سکتے ہیں" روشی نے بھولا بن کر کہا تھا۔

اس شور شرابے میں پتا ہی نہ چلا۔ بلیو جینز پنک شرٹ میں ملبوس آنکھوں پر ڈارک گلاسز چڑھائے ہاری ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ کھول رہا تھا۔ تقریباً ایک ساتھ ہی سب کی نظر پڑی تھی۔ سب ہنس ہنس کر دہری ہو گئیں۔

"روشی یہ کیسا ڈرائیور ہے؟" پیچھے سے سونا کی آواز آئی۔ روشی تو پہلے ہی جز بز ہو رہی تھی۔ اتنی زور سے پیچھے والی روبی کی طرف مڑی کہ روبی اچھل کر رہ گئی۔

"دروازہ کھول کر باہر لٹک کر بیٹھ جاؤں؟" وہ جھلائی۔

"کوئی مضائقہ نہیں یہ کوئی یقین نہیں کہ باہر پر سے جانے کا خطرہ ہو" پیچھے سے پھر ہنسنے کی آواز آئی تھی۔

چوکیدار گیٹ وا کر کے منتظر کھڑا تھا۔ ہاری نے گاڑی تیزی سے ریس کی اس پر گویا لڑکیوں کے جملے ہاری کو متاثر نہیں کر رہے تھے۔

ہاری نے پیچھے سے گاڑی گزار کر ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا تھا۔ بہت دھیمے سروں کی غزل تھی۔ آواز بھی بہت آہستہ تھی۔

"ہاری آواز تو تیز کرو کیا صرف روشی روبی کو سنانا ہے" سونا نے ہاری کو ٹوکا۔

"نہیں میں خود ہی سن رہا ہوں۔ بابا صاحب کو پتہ چلا کہ لڑکیوں کو غزلیں سناتا ہوا بازار لے گیا تھا تو کورٹ مارشل ہو جائے گا میرا۔"

"تو پھر روشی روبی کو روئی لے دو اپنے کانوں میں ٹھونس لیں گی۔ پھر بھی تو دونوں سن ہی رہی ہوں گی" گلالی نے پیچھے جل کر کہا۔

"کیا خیال ہے؟" اتنی دیر میں پہلی بار براہ راست ہاری نے روشی کو مخاطب کیا۔

روشی کی آنکھوں میں پانی اتر آیا "غلطی میری ہی ہے میں نے اسے خواہ مخواہ اہم بنا دیا ہے اپنے مضبوط شخص کے باوجود اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پہلے سے بھی زیادہ دور اور اجنبی ہو گیا ہے۔

زندگی یوں تھی کہ جینے کا بہانہ تو تھا
ہم فقط زیب حکایت تھے فسانہ تو تھا

سلمیٰ آغا کی آواز میں فراز کی غزل کے اشعار سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ روشی نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ آف کر دیا۔

"بند کر دیا کیوں بھئی؟" پیچھے چیخ و پکار شروع ہو گئی۔

"روشی کو غزل پسند نہیں آئی" روبی نے اطلاع پہنچائی۔

"چلو ہاری تم خود ہی کچھ گنگنا دو چلو" ماہین نے کافی دیر میں لب کشائی کی۔

"سونا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ روشی کی یہی سزا ہے" گلالی بولی۔

"منظور ہے؟" ہاری نے مڑ کر پیچھے اس کی طرف سوال کیا۔

"بات نہیں کرنی مجھ سے" وہ غرائی۔

"ناراض ہو رہی ہے بھائی" روبی نے پیچھے اطلاع پہنچائی۔

"دوران ڈرائیونگ ڈرائیور سے بات کرنا رولز اینڈ ریگولیشن کے خلاف ہے۔ خطرہ ہے زندہ بچے تو ان شاء اللہ بات کریں گے۔" سونا نے قانون کے تحت بات کرنا مناسب سمجھا۔

"بہت مطلبی دنیا ہے مطلب نکل جائے تو لوگ پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں" ہاری نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف روشی ہی سن سکے۔

اس کا جی تو چاہا اس کو جواب دے مگر سب شیطان کی خالائیں اس طرف متوجہ تھیں تو وہ منہ موڑ کر رہ گئی۔

روشی کی شوخ آواز ابھی بھی لوگوں کے جھرمٹ میں پتہ بھی نہ چلا۔

وہ سب بڑی سرخوشی کی کیفیت میں اتر رہی تھیں۔ ماہین چاہنے کے باوجود اپنا موڈ خوشگوار کر پا رہی تھی۔ بس رات کا منظر آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ اسے بہت سے ملال تھے کہ اس نے یہ کیوں کیا اسے یہ بھی کہنا چاہیے تھا اسے وہ بھی کہنا چاہیے تھا۔ روبی اتری تو وہ بھی کھسکنے لگی۔

مگر جیسے جان نکل کر رہ گئی۔ ہاری نے گیئر سے ہاتھ ہٹا کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اتنی مہارت سے کہ باہر کھڑے کسی شخص کی نگاہ اس کی اس حرکت پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

روشی تو دم بخود بیٹھی رہ گئی تھی۔

ہاری کے وجود سے اٹھتی ہوئی بھینی سی مہک اسے آنچ کی طرح محسوس ہونے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی گرمی سے روشی کا وجود سلگنے لگا۔

"بہت رش ہے گھر میں۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں میرا دل بہت ضد کر رہا ہے بہت ہو گئی اگر آپ رات کو میرے کمرے میں نہیں آئیں تو حویلی چھوڑ کر چلا جاؤں گا" اس کی سرگوشی کرتی آواز سے اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

"میں ہی ملا ہوں بے وقوف بنانے کیلئے" وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔ یہ کیا طریقہ ہے" خوف جھجک غصہ جانے کیا کیا تھا اس کے لہجے میں۔ "سب ادھر دیکھ رہے ہیں"

"دیکھنے دیں۔ میں خود چاہتا ہوں دیکھ لیں قصہ تمام ہو۔ تخت ہو یا تختہ"

"میں کاکا جان سے کہہ دوں گی" اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے تھے۔

"انہوں نے ہی تو یہ ہاتھ ہاتھ میں دیا ہے" اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کہاں گم ہو گئیں" سونا نے قریب آ کر کچھ تعجب اور غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

"روشی بی بی کا دوپٹہ پھنس گیا ہے ونڈ بریک میں" آپ لوگ اسے برے گمان کیوں کرتے ہیں۔"

اس کا ہاتھ پڑتے ہی جیسے روشی کی جان میں جان آ گئی۔ وہ تیزی سے گاڑی سے اتر گئی تھی۔

"پرسوں بھی تو بیٹھی تھیں ویسے ڈریک پر" یہ کو مزید دیر ہونے پر کوفت ہو رہی تھی اصل کر رہی تھی۔

روشی نے دوپٹہ سر پر اوڑھا، چادر شانوں پر سیٹ کی۔ ابھی تک اس کی حالت غیر تھی جلدی میں گھبے میں بھول ہی گئی تھی اسی پر چادر اوڑھنی تھی اور اب گاڑی سے اتر کر دونوں کا استعمال طریقے سے کر رہا تھا۔ تھوڑی دور کھڑی یامین بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے یہ بات خصوصی طور پر نوٹ کی تھی کہ روشی کے اتر جانے کے بعد وہ انداز نشست جو تھا وہ بڑی فطری سی بات ہے۔ دو افراد اگلی سیٹ پر پھنس کر بیٹھے ہوں تو ایک کے اتر جانے کے بعد دوسرا فوراً ایزی ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسی طرح یاور کے بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھی اس نے روشی کے بیٹھے ہوئے بھی دیکھے تھے جس سے واضح ہوتا تھا دونوں کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے۔ وہ اس انتظار کر کر رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

نکاح تو عصر مغرب کے درمیان ہو گیا تھا مہمان کچھ زیادہ نہیں تھے زیادہ تر گھر کے افراد اور جاگیر کے اہم کارندے تھے۔ یامین کو اس بات کی بے چینی تھی کہ آیا تیمور علی خان اور یاور علی خان محفل میں اکٹھے موجود ہیں یا نہیں؟ اس نے بہانے بہانے سے گھمکو (ملازم) سے دریافت کیا تھا مگر اس نے صرف تیمور علی خان کی موجودگی کی اطلاع دی تھی یاور علی خان کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تھی۔

وہ اپنے بیڈ روم میں بھی نہیں تھے فکر کی بات تو تھی کہ پھر کہاں ہیں۔ وہ بہت مضطرب سی تھی۔ اپنے اضطراب کی وجہ اسے خود بھی معلوم تھی وہ اوپر چلی آئی اور بالکنی میں کھڑی ہو کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔ بہت سے لوگ باغ میں بیٹھے اور چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اسے تیمور علی خان بھی دکھائی نہیں دیے۔ صرف پھاٹک کی طرف کھڑا ہوا یاور نظر آیا (وہ چونک پڑی) وہ آج مکمل مرد اسے پینٹ کوٹ میں نظر آیا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ، سرخ اور سیاہ دھاریوں والی ٹائی کوٹ کی اوپری جیب سے جھانکتا سرخ رومال وہ بے حد خوبصورت محسوس ہو رہا تھا۔ مصور اور ذوالفقار ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جاوید بابا کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے محو گفتگو تھا۔

پتہ نہیں روشی کی نظر یاور پر پڑی کہ نہیں۔ آج تو نیا ہی رنگ ہے۔ یہ تھی بے ساختہ اسے خیال آیا تھا اور اپنے خیال پر خود ہی چونک کر مسکرا دی تھی۔ معاً اسے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اس نے صرف گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ تیمور علی خان کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جو حویلی میں ان کیلئے مخصوص تھا۔

وہ ایک دم پوری گھوم گئی۔

"السلام علیکم۔ مزاج بخیر" وہ بہت دوستانہ اور مہربان انداز سے مسکرا رہی تھی۔

تیمور علی خان تو جیسے اسے سامنے پا کر الجھن میں پڑ گئے تھے۔ اس پر اس کا پرانے شناساؤں جیسا انداز۔

"مزاج کہاں بخیر آرات بھر نہیں سو سکے ہم آتی پسند آ گئی تھی آپ کو حویلی کہ آنا ہی تھا یہیں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا۔ الجھنیں آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھیں۔ حالات کا اثر دھندلا رہا تھا۔ آپ نے آ کر زخم ہرے کر دیے۔ یوں محسوس ہوتا ہے ان پاسٹ پر ثبت ہماری آپ کی خاندانی دشمنی رہی ہے۔ صدیوں پہلے۔ آپ اتنا کیوں کر رہی ہیں۔ اتنی مشکل سے جیت

پ جاتے آپ کیوں اپ سیٹ کر رہی ہیں؟" تیمور علی خان کے گویا اوسان جواب دے چکے تھے جب ہی شکستگی ان کے لہجے میں گھل گئی تھی۔

"اگر مجھے یہ سب معلوم ہو گیا ہوتا تو میں حویلی میں آنے کی بجائے بہت آزردگی سے وہ سب کرتی جو میں اب کر رہی ہوں۔ میں یہ جاننے کے بعد کہ میری بہن زندہ ہے اس سے ملے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔ وہ تو آتی جاتی ہیں تجسس کر سکتے ضمیر کا تقاضا ہے کہ میں ان کے قریب ہوں۔ وہ دل آنکھوں کو بچھانے جس میں وہ خود کو محفوظ رکھ سکیں۔ یاور علی خان بات ٹوٹ چکا ہے۔ اب مسلمان کے ساتھ تعلق ہے۔ وہ میرے ارادوں میں حارج ہوں گے تو میں مرنے کے بعد اپنی بہن کو لے کر چلی جاؤں گی۔ ایک اپنائیت کے احساس کے ساتھ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے ہوئے اسرار کرتی ہیں گے" اس کا انداز قطعی اور جارحانہ تھا۔

"آپ نقصانات میں ہمارا حصہ نظر انداز کر کے یہ سب کیسے کر سکتی ہیں؟ ہم بھی تو کچھ کہہ سکتے ہیں؟" تیمور علی خان نے گلہ کیا۔

"شیور، آپ ضرور کچھ کریں۔ مگر ہمیں بھی کچھ کرنے سے نہ روکیں" اس کا لہجہ مصلحت سے عاری تھا۔

"آپ کو احساس ہے کہ بچوں پر اس سے حادثے کا کتنا گہرا اور جان لیوا اثر ہو سکتا ہے۔ آپ کی ہمدردی نہیں اصل سے ظلم ہے کیا فائدہ اب ان باتوں سے کیا حاصل ہے؟"

"ظلم تو میری بہن نے کر دیا ہے بلکہ ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ آپ مجھے ان سے ملائیں تو سہی تاکہ میں ان کو یہ کہہ سکوں کہ خود غرضی کی کیا اعلیٰ مثال قائم کی ہے اپنی عزت نفس کی حفاظت کیلئے خود کو مار لیا کہ بچے ان کو غلط نہ سمجھیں۔ ابھی تک ان بچوں کے باپ کو کسی نے انہیں غلط نہیں سمجھا۔ آپ نے بھی نہیں۔ تو پھر بچے کیسے غلط سمجھ لیتے؟ حویلی والوں کا آج تک جو ان کے ساتھ رویہ ہے بابا صاحب سمیت کیا بچوں کے اطمینان کیلئے یہ کافی نہیں تھا۔ یاور علی خان غلط ہو کر شملے میں لٹکنے لگا کر مار رہے ہیں اور بچے اپنے باپ کو اوتار سمجھ بیٹھے ہیں۔ میری بہن مگر مجرم ہے جو غلط ہے۔ وہ غلط سمجھا جائے۔ جو سچ ہے وہ سچ سمجھا جائے۔ ضمیر کی آواز تو یہی ہونا چاہئے۔ یاور علی خان نے زیادتی کی ہے ان کا چہرہ واضح ہونا چاہئے۔ کیوں مجرم ہے ہیں حویلی والے ان کے بیٹے پر اتنا ناز۔ وہ اس کے بالکل مستحق نہیں ہیں" وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

ہمارے ساتھ تو جو ہوا لیکن ہم سب کے ساتھ اس میں مزید اضافہ ہو جائے گا مگر آپ کیوں بلاوجہ آگ میں کود رہی ہیں؟ کوئی فائدہ دور دور نظر نہیں آ رہا سوائے آپ کے نقصانات کے۔ غور کیجئے ہماری بات پر" تیمور علی خان سپاٹ لہجے میں گویا ہوئے۔

آپ نہیں ان سے ملاتے تو کسی تیغ نقصان بھی نے ہو جائیں گے۔ آپ کو میری ذہنی اذیت کا اندازہ ہے؟ میں اپنے ماں میں بالکل تنہا ہوں جبکہ میری سگی بہن موجود ہے میں یہ حقیقت کیسے نظر انداز کر دوں" اس کی آواز بھرا گئی۔

تیمور علی خان چند لمحے کیلئے خاموش کھڑے رہے۔

"ہم تو آپ کے لیے کانفس ہو رہے ہیں۔ ورنہ ہم تو حاضرین کے گروپ میں آل ریڈی شامل ہیں۔" اس کے انداز سے محظوظ ہونے لگی تھی۔

"دوسری بات یہ کہ ہم اپنے ساتھ آپ کو مزار سے کیسے لے جا سکتے ہیں۔ جب تک وہاں آپ کو مکمل آرام حاصل نہیں ہے آپ آزاد نہیں ہیں۔ اور آپ نے کیا سوچا ہے؟ انہیں اس کا اندازہ نہیں ہے" تیمور علی خان نے فیروزی کنتان کی ساڑھی میں ملبوس بھاری زیورات سے آراستہ ماہین کی سمت ایک اچٹتی نگاہ ڈالی تھی۔

"میں کراچی چلی جاؤں گی کچھ دن کے لیے آپ ہم کو وہیں لے آئیے گا؟" اس نے بہت خوش ہو کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔

"اگر وہ رضامند نہیں ہوئیں؟" تیمور علی خان نے امکان ظاہر کیا۔

"اف اتنی پتھر ہو چکی ہیں۔ بجو۔" ماہین نے بڑے دکھ سے بے ساختہ کہا تھا۔

"تو پھر میں وہاں سے ائیرکنگ سرائے خود پہنچ جاؤں گی۔" اس نے فوراً دوسرا راستہ بتایا تھا۔

"حویلی میں آپ کے ساتھ یہاں سے بھی جا سکتی ہوں۔ مگر یہاں بہت خوف کہ زلزلے کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب ایک کام سکون سے ہو سکتا ہے تو بلاوجہ کی ٹینشن کری ایٹ کرنے کا کیا فائدہ۔ سکون سے کام ہو سکتا ہے تو کچھ ٹینشن ساتھ لگ جائیں۔ یوں بھی ٹینشن ہو تو پوزیٹو پاور زیرو ہو جاتی ہے۔ اس تعاون کے لیے میں ہمیشہ تھینک فل رہوں گی آپ کی۔"

اس کے سر سے گویا بہت بڑا بوجھ سرک گیا تھا۔ وہ بہت پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

"اب بھی نہیں بتائیں گی کہ حویلی میں کون آپ کا رازدار غمگسار پیدا ہو گیا ہے۔" تیمور علی خان کے ذہن میں اس سوال کی چبھن ابھی باقی تھی۔

"بتا دیں گے پھر کسی اچھے وقت میں۔" وہ مسکرائی۔ ماضی کی تمام کہانیوں کے رنگ وہ تیمور علی خان کے وجود میں دیکھ رہی تھی۔

سوا اس کی نگاہ سامنے زینے کی طرف پڑی۔ یاور علی خان آخری اسٹیپ سے واپس پلٹ رہے تھے۔

ایک لمحے کو تو جیسے وجود یکدم بے روح ہو گیا۔ اچانک پہنچنے والے شاک کے سبب اس کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور وہ پلک جھپکنا بھول گئی تھی۔ تیمور علی خان اس کی یہ کیفیت دیکھ کر پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اتنی دیر میں مگر یاور علی خان زینے کے اگلے موڑ پر گم ہو چکے تھے۔

"کون تھا؟" انہیں یکدم اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ بیچ درمیان میں کھڑے ماہین سے گفتگو کر رہے تھے۔ ماہی نے تو انہیں بتایا تھا کہ یاور علی خان تشریف لا چکے ہوئے ہیں تو پھر ماہین نے کس کو دیکھا

"یاور صاحب۔" ماہین کے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔

"اوہ۔" تیمور علی خان نے فکرمندی سے ماہین کا چہرہ دیکھا۔

"ڈونٹ وری، آپ فکر نہ کریں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ کے بعد میں آپ سے کانٹیکٹ کروں گی اور کراچی میں آپ سے ان ٹچ رہوں گی۔" وہ مسکراتی ہوئی زینے کی سمت بڑھ گئی۔

تیمور علی خان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں واضح ہو رہی تھیں۔

انسان کو کوئی ہمراز دوست ہو تو وہ مصیبت میں دور کرنے والی بہت سی باتیں کر کے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کی تو یہ مشکل تھی کہ وہ کسی سے اشارے کنائے تک میں کوئی ذکر نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی جو تم کو کیا کہوں کیا کہا چاہا کرتے ہے۔

آپا، ہو گیا ہے وہ سب کچھ جس کے اندیشوں سے آپ لرزتی رہتی تھیں۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ آج وسیم اس نے پکڑ لیا۔ پھر میں یوں ہو گی۔ آپ بتائیں اس سے بچنے کا راستہ۔ آخر آل وہ میرا شوہر ہے۔ یہ اب غیر مشکوک اور سطوت لاج ہے۔ میرا میرے سگے بچانے کا ارادہ ہے۔ میں نے دل و جان سے ہاں کی ہے۔

مگر آپا، کہیں یہ سب سن کر تم ہیرانہ جائیں۔ آخر وہ حویلی میں یہاں سے وہاں تک یونہی بے مقصد گھوم رہی تھی۔

عجیب عجیب سے خیالات کی یلغار تھی۔

اس کے ہاتھ کی گھڑی ابھی تک ہاتھ میں تھی۔

بڑا بہت خراب ہے۔ لگتا تو نہیں ہے ایسا۔ یعنی ہم خود سے ان کے پاس ہوں تو انہیں بری بری سوچ لگے۔ کبھی خود سے اتر دیا کہ میرا اعمال پوچھ لیا جائے۔ میں کیوں جاؤں؟ قیامت تک نہیں۔ وہ جیسے خواہ اور انا کی جنگ میں پھنس گئی تھی۔

وہ نواب صاحب۔ گھوڑے دماغ سے اتر گئے تو ہم اچھے میرا خیال آ گیا۔ مجھے تمہاری توجہ چاہیے ساری تمہارے دل سے اہم تمہاری توجہ ہے۔ تمہارا خلوص تمہاری شدت۔ میں تمہیں چاہوں یہ تو چاہتا ہوں۔ مگر تم صرف مجھے چاہو۔ جب تک مجھے تمہارے خلوص اور انتہائی توجہ کا یقین نہیں آ جاتا۔ میں یونہی بے کل بے زار پھرتی رہوں گی۔ ہو سکتا ہے مر ہی جاؤں۔

یکدم دل بھر آیا۔

"ابھی پیار یک رہا ہے یا گھڑی؟" منصوبہ جانے کب سے کچن میں اور کیوں تھیں۔ غائبانہ ہی سے دلداری میں مصروف رہا تھیں۔

"گھڑی آپ چاہیں ہمیں تو پیار اپینٹ ہے۔" اس نے اپنی بی منصوبہ کو پرشوق نگاہوں سے دیکھا لائٹ پنک میں حیدرآبادی ایلس میں وہ آج درحقیقت بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

"تم بہت کیسے پاگل تھا۔ کوئی بات کر گئی ہے تو وہ اسے نظروں میں تو لنے لگیں۔

"ہمیں ایسے ہی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"ہمیں کیوں بہت الگ تھلگ محسوس ہونے لگی ہو۔ پہلے تو یہ تھا کہ تمہاری شادی زبردستی ہوئی تھی اب تو سنا ہے یاور صاحب نے بات ختم کر دی ہے۔ اب تو تمہیں خوش رہنا چاہیے۔ مگر اب کیا ہوا؟" وہ جیسے کچھ کھوجنے کے در پے تھیں۔

"کچھ نہیں۔" اب وہ الجھن کیا کہتی۔

"ماہین ممانی تو تمہاری بھی خالہ ہیں۔ دوستوں کی طرح ہیں کوئی بات ہے تو ان سے کہو۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

روشی نے چونک کر ان کی صورت دیکھی۔ آج تو بڑی خیر خواہ محسوس ہو رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں ہے مینو آپا۔ آپ گیدرنگ انجوائے کریں۔ میں ابھی آتی ہوں۔" مینو اپنی خیر خواہی کے باوجود بہت بھاری محسوس ہو رہی تھیں۔

"ٹرنکولائزر لے لو کوئی۔ ڈپریشن کم ہو جائے گا۔" وہ جاتے جاتے پھر مشورہ دے گئیں۔

اس نے کچھ دیر قبل یاور علی خان کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جانے کیا ارادہ آ گیا تھا۔ کچھ طبیعت اس وجہ سے بھی اداس تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر ٹہلتے ٹہلتے ان کے کمرے کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ اس نے سر اندر کر کے جھانکا تو بہت سی ملی جلی خوشبوؤں کے جھونکے اس تک آئے۔ کچھ دیر پہلے ماہین تیار ہوئی تھی۔ خوشبوئیں اسی تیاری کی گواہ تھیں۔

سامنے سائیڈ ٹیبل پر یاور علی خان اور ماہین کی شادی کی تصویر بڑے خوبصورت فریم میں لگی ہوئی تھی۔

وہ کشاں کشاں اندر چلی آئی اور تصویر اٹھا کر دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

"بہت اچھی لگ رہی ہیں آپ پپا کے ساتھ۔ مگر... میری امی کی تصویر بھی تو دوسرے کونے پر ہونا چاہیے۔ انسان بھی کے جسم دفنا دیتے ہیں تصویریں تو نہیں۔ پتا نہیں کیوں محسوس ہوتا ہے۔ امی تصویر کرے ہی میں نہیں پپا کے دل میں بھی نہیں ہیں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور فریم کے شیشے پر آ گرے۔ اس قدر زبردست خلا پڑا ہے میری زندگی میں محبت کا۔ بظاہر سب ہی محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں پھر مجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے فرض ادا ہو رہا ہے۔ بے اختیاری والی بے ساختگی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ جس کو میری وجہ سے رات دیر تک جاگنا چاہیے۔ وہ بھی گنگناتے ہی پڑ کر سو جاتا ہے اگر میں اس کی خواہشوں میں ہوں تو وہ میرے پندار کو بار بار ٹھیس کیوں پہنچاتا ہے۔ نہ ان رکتا ہے نہ دل۔ آنسو ایک قطار سے بہنے لگے۔

جی چاہتا ہے اسے اپنی عظیم جدائی سے آشنا کروں پھر دیکھوں کہ میں اس کی خواہشوں میں کس حد تک شامل ہوں۔

ماحول میں اتنی اجنبیت کیوں ہے۔ حقیقی اور خوبصورت رشتوں کی موجودگی کے باوجود۔

وہ اپنی کیفیات کچھ نہیں پا رہی تھی۔ حالانکہ یہی ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی شدید خواہش کی تسکین کے سارے راستے بند دیکھتا ہے تو غم و اندوہ اس پر غالب آنے لگتے ہیں۔ اور کسی ایک غم کے بہانے جانے کتنے پرانے اور مدفون غم جاگ کر اسکرین پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ آنسو اس قدر روانی سے بہہ رہے تھے۔ کہ اگر اس نے میک اپ کیا ہوتا تو سب دھل جاتا۔

آپ تو باپ ہیں پپا۔ میری تقدیر کے ناہموار راستے آپ کے علم میں نہیں آ سکتے۔ میرے مزاج کے پیچ و خم

آپ کی دوسری ممی ہیں۔ رہ جانا نہیں۔ رہ سکتے ہیں۔

وہ یونہی سوچتے سوچتے چونک پڑی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔

"کون؟" وہ جلدی جلدی چہرہ دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ وا ہوا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر آنے والے کو دیکھا تھا۔ چہرے پر رونے والی ساری علامتیں موجود تھیں۔ اس لیے اس نے نیچی نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا تھا مگر گھر کا داخل ہونے والا شخص سوالیہ نشان بنا سامنے کھڑا تھا۔

"اصل میں تو میں یاور خان کی تلاش میں آیا تھا۔ مگر آپ کی آواز سنی تو بلا اجازت دروازہ کھول لیا۔ آئی ایم سوری۔ خیریت ہے نا آپ؟" وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں مخاطب تھا۔

وہ بے اختیار سے چہرہ پونچھنے لگی گویا اس کے لیے رو رہی ہو۔

"میں نے خیریت پوچھی ہے۔" وہ بھلا اڑنے والا تھا۔

"اپنی خیریت اپنے پاس رکھو۔ باہر بہت لوگ ہیں۔ جا کر مہمانوں کی خیریت۔" اس کی آواز اس کے آنسوؤں کی چغلی کھا گئی۔ ہاں وہ چونک پڑا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک بے معنی سی خاموشی حائل ہو گئی تھی۔

وہ رخ پشت کیے کھڑی تھی۔

"کیوں رو رہی ہیں۔ یاور خان نے کچھ کہہ دیا؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں کیا۔" وہ تنک کر گویا ہوئی۔

"آپ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مجھے یہ لگتا ہے۔" وہ بغور شگفتگی کے رنگ میں ڈھلنے لگا۔

"کچھ اس طرح، دیکھو تو کیا کہہ رہی ہیں یہ ادھر۔" اس نے آگے بڑھ کر تصویر واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"کچھ اصول اپنی جگہ ہے کہ کیوں رو رہی ہیں۔ حالانکہ رونا تو گوری بی بی کو چاہیے کہ ان کا نکاح ہو رہا ہے اور نکاح کے وقت تو ساری ہی لڑکیاں روتی ہیں اور بعض تو بے ہوش بھی ہو جاتی ہیں۔ جیسے آپ ہو گئی تھیں۔" وہ بہت شرارت بھرے لہجے میں مخاطب تھا۔

روشی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنا اہم موڑ میری زندگی میں آ چکا ہے اور یہ میرا سب کچھ ہو چکا ہے۔ پھر کچھ محسوس کیوں نہیں ہوتا۔ صرف ایک گھٹن۔ ایک دکھ۔ اور کچھ کیوں محسوس نہیں ہوتا؟

"کچھ مبارک ہو۔ وہ باہر تمام کام بخیر و خوبی انجام پا چکے ہیں۔ آپ اور گوری بی بی ایک کشتی میں سوار ہو چکی ہیں۔ دیکھیں پہلے کون اترتا ہے۔ ویسے میرا دل تو یہ چاہ رہا ہے پہلے آپ کی کشتی پار لگے۔ اصولی طور پر نکاح پہلے آپ کا ہوا ہے۔ لہٰذا پہلا حق آپ کا ہی ہے۔"

"کیا بس ادا کی کر سکتے ہو اور کر بھی کیا سکتے ہو۔" مارے غصے کے وہ اول فول بولنے لگی۔

باری کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ جزبز ہو کر رہ گئی۔ باری کے قہقہے نے احساس دلا دیا تھا کہ وہ کیا کہہ گئی۔

"عقل مند وہ ہوتے ہیں جو کر کے دکھاتے ہیں اور ثابت ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے دم نہیں کرتے۔ مجھے عقل مند بننے کی اجازت دے دیں۔ خیر۔ یہ یاور خان کا کمرا ہے۔ اس سے زیادہ وہ بات نہیں ہو سکی۔ وہ میں نے اپنے کمرے میں بلایا تھا آپ کو۔" وہ جاتے جاتے مڑ کر گویا ہوا۔ اس کو پلٹتا دیکھ کر وہ بھی رخ بدل چکی تھی۔ اور بڑی حسرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا غضب ڈھا رہا تھا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں کہ پی کی چھب دیکھ کر اپنی بھول جاتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کیا کہہ گئیں آپ؟"

"کیوں؟" وہ ٹھٹک کر بولی۔ "پہلے تو تم نے مجھ سے کبھی اس طرح بات نہیں کی؟"

"پہلے رشتے داری نہیں تھی اب تو بڑی قریبی رشتے داری ہے۔" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔ "ایک بار اندر آ کر تو دکھائیے۔ تاکہ ہمیں بھی اپنی خوش قسمتی کا یقین آ جائے۔" اس نے دروازہ وا کرتے ہوئے پھر چھیڑا۔

"میں نہیں آ سکتی۔ یہ کوئی آسان بات ہوتی ہے؟" جانے کیسے اس نے رواداری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

"پھر آسان بات کیا ہوتی ہے۔ دوسرے کو بات بات پر آزمانا؟ احساسات کی انتہا پر لا کر پہنچا دینا؟ اس کا کوئی خوش رنگ پتھر نہیں ہوں۔ جسے آپ نے چن لیا تھا۔

جی بھر کر بے اعتباری کا اظہار کریں کوئی پابندی نہیں۔ لیکن پہلے آپ کو ثابت ہونا ہے مجھ پر۔ میں کیا ہوں آپ کے لیے کیا ہوں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے بتانے کی۔

میں تو ویسے ہی تنگ کر رہا تھا آپ کو۔ میں کیوں آپ کو کسی مشکل میں ڈالوں۔ مگر آپ کچھ اس طرح تو ظاہر کر کے مان رہ جاتا۔ میری خاکساری پر نہ جائیے خاکسار نہیں ہوں۔ بس کچھ انسان کے اپنے اپنے سلیقے ہوتے ہیں۔

میں آپ کی پسندیدہ چیزوں میں نہیں ہوں۔ جو آپ نے اپنے کالا جان سے فرمائش کر کے حاصل کر لی تھی۔ آپ اس ریلیشن میں پہلے میری جگہ واضح طور پر بتانا ہے۔ پھر کچھ سوچیں گے۔"

دروازہ معمولی سا کھلا ہوا تھا اور اس نے جھٹکے سے مزید کھولا تو گویا اوسان جاتے رہے۔ سامنے یاور علی خان کھڑے تھے۔

☆—☆—☆—☆—☆—☆—☆

یاور علی خان نے باری کے چہرے پر جو نگاہ ڈالی تھی۔ نہ وہ شعلہ بار تھی نہ اس میں سرد مہری تھی۔ نہ کوئی سوال۔ لیکن باری کو وہ معمول کے مطابق بھی محسوس نہیں ہوئے۔ یعنی کوئی تبدیلی تھی اندر جو اس بات کا بھید دے رہی تھی کہ انہوں نے کچھ سن لیا ہے۔

باری کے تو جسم کا سارا خون نچڑ چکا تھا۔ وہ لاکھ بہادر سہی مگر اس طرح کی بے ساختہ صورت حال میں تو یہ اس کا فطری رد عمل تھا۔

یاور علی خان اس طرح ایک طرف کو ہو گئے گویا باری کو جانے کے لیے راستہ دے رہے ہوں۔

باری دل ہی دل میں حیران تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ یاور علی خان نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ روشنی اندر سکتے کی کیفیت میں کھڑی تھی۔ باپ کو دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا تو قدرے چونکی۔ اب اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

یاور علی خان گہرے تفکر کے ساتھ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

"کیوں کھڑی ہو؟" ان کے لہجے میں جیسے اجنبیت کا سارا زہر امڈ آیا تھا۔ وہ اسے جانیں نہ جانیں وہ تو جانتی تھی۔ دل جانے کیسی گہرائیوں میں اترنے لگا۔

وہ خاموشی سے دوسرے صوفے پر ٹک گئی۔ کچھ دیر قبل وہ جو یہاں اسے کھری کھری سنا رہا تھا۔ اس کے احساسات

خاک کے سوال کر رہا تھا۔ وہ قیامت کیا اسے گھیرنے کو تھی کہ کوئی افتاد آن پڑی تھی۔

وہ خوف کی اس انتہا پر تھی جب احساسات گم ہونے لگتے ہیں۔ اور بے حسی نجات کا راستہ کھول دیتی ہے۔

"روشانے۔"

"جی پاپا۔" بمشکل اس کی آواز نکلی تھی۔

"تم مجھے اپنا فادر اون کرتی ہو یا کوئی شبہ ہے؟" ان کا لہجہ سرد تھا۔

اس نے دہل کر ان کی صورت دیکھی۔ چھٹی حس نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اب ضرور کچھ ہوگا۔

"میں سمجھی نہیں پاپا۔" اس کی آواز لرزی تھی۔

"پاپا اس وقت میری بہت بری حالت ہے۔ آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔" اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"تو پھر تم میرے کچھ پوچھنے کا انتظار نہ کرو۔ خود ہی بتا دو جو بات بھی بتانے والی ہے۔ ورنہ میری شریانیں پھٹ جائیں گی ہے۔"

یاور علی خان کے لہجے میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔ مگر وہ اندر سے کانپ کر رہ گئی۔ بات اتنی بڑی تھی کہ اب اندازہ تھا کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔

"آپ نے اگر باری کی بات سن لی ہے تو پھر یہی ہے کہ آپ جو سمجھے ہیں وہی ہوا ہے۔"

"اچھا کیا ہوئی؟" یاور علی خان نے تیزی سے بات کاٹی تھی۔

روشی خاموش رہی۔ درحقیقت اس کی سمجھ میں یاور علی خان کا سوال نہیں آیا تھا۔

"تمہاری شادی باری کے ساتھ کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے؟ تم نے خود تصور سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا صرف معاملہ طے ہوا ہے یا عملی طور پر کچھ ہو چکا ہے؟" بلا کی روانی تھی طرز تخاطب میں۔

روشی ہنوز خاموش تھی۔

"روشانے! میرا وقت ضائع نہ کرو۔" اس مرتبہ وہ برہم ہو کر پوچھ رہے تھے۔

"نکاح ہوا ہے پاپا۔" اس کی جان ہونٹوں کی حد تک نکل چکی تھی۔

کوئی بلاسٹ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ایک ہولناک سناٹا کمرے میں چھا گیا تھا۔

"صرف نکاح ہی ہوا ہے ناں؟" یاور علی خان نے خاصی دیر بعد خاموشی توڑی تھی۔ ان کی آواز میں گہری سوچ کا عکس تھا۔

"صرف" وہ کچھ نہیں ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"جی۔ بس نکاح ہوا ہے۔" اب سے کچھ نہ کہنا تھا۔

"نکاح۔ سرائے میں ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے چھوٹی حویلی میں؟" یاور علی خان جس قدر پُرسکون انداز میں پوچھ رہے

تھے حیران کرنے کو کافی تھا۔

"جی؟"

"کون کون شریک ہوا تھا؟" اس مرتبہ ان کا لہجہ گہری کھوج کی چغلی کھا رہا تھا۔

"جی بس۔ کاکا جان اور ان کے دوست تھے بس۔" خوف سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"گھر کی یا باہر کی کوئی خاتون؟" یاور علی خان کے انداز میں کچھ الجھاوٹ تھی۔

"نہیں تو۔ کوئی خاتون نہیں تھیں۔ کاکا جان کی وائف تو مجھ سے ملیں تک نہیں۔"

اس نے پھر ڈرتے ڈرتے ان کی سمت دیکھا۔ وہ بڑی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے۔ اور اس کی بات مکمل ہوتے ہی ایک گہرا سانس لیا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"تم اور کچھ نہیں کہنا چاہتیں؟" انھوں نے ابرو اٹھا کر اس کی سہمی ہوئی صورت دیکھی۔

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"او کے اب میری بات غور سے سنو۔" ان کے انداز سے وہ سر سے پیر تک سہم گئی۔

روشی کا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ وہ ہمہ تن گوش تھی۔

"تم سرکشی دکھا چکیں۔ اپنی سی کر چکیں۔ ایک احمق انسان سے صرف حماقت ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ تمہارے پاس عقل ہوتی تو یہ سب کیوں ہوتا؟ ٹھیک؟"

"اب یہ ہے کہ اسی وقت بتا دو۔" باری یا باپ۔ "تمہیں ہمیشہ کے لیے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اپنا غضب انھوں نے کس سکون سے ظاہر کیا تھا اور اپنے فولادی اعصاب ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

"آپ ایسے نہیں کریں پاپا۔" اس کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔

"تم جو چاہے کرو نہ باپ کی انا کا خیال نہ اس کی سالوں کی ریاضت کا احساس۔ میں کوئی لمبی چوڑی بات یا تقریر نہیں کروں گا۔ مگر مجھے جواب ابھی چاہیے۔"

غضب بلا کا مگر انداز دھیما تھا۔ جس انتہائی فیصلے پر مصر تھا وہ پیمانہ روشی کی زد میں ہی نہیں آتا۔

"پلیز پاپا!" وہ زار و قطار رونے لگی۔

"یہ تو باری ہے۔ باری اور ان بگڑے باپ کی اولاد۔ اگر تیمور علی خان تمہارے لیے کسی پرنس کا رشتہ بھی لاتے تو میں قبول نہ کروں۔ اتنا اعزاز تو اسے کرنا بھی نہیں چاہیے تھا اصولاً۔ خیر۔ کیا فیصلہ ہے تمہارا۔ اگر باری کا ساتھ منظور ہے تو یاور کہتا ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔" ان کی آواز میں اس مرتبہ بہت تلخی تھی۔

"پاپا پلیز۔ ابھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ بابا صاحب سے تو ڈسکس کیجیے۔"

"شیم اور سیلف۔ تمہارے کارنامے ڈسکس کرتا پھروں۔ یو نو نان سنس۔ مجھے تمہارا جواب مل گیا ہے۔ ہمیشہ کے

لیے دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔ گیٹ آؤٹ۔"

یادر علی خان خود پر قابو پاتے ہوئے بمشکل کہہ پا رہے تھے۔

"پاپا آپ ساری بات سنے بغیر مجھے اتنی سخت سزا نہیں سنا سکتے۔ مائی گاڈ۔ ویک۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کارپٹ پر بیٹھ کر ان کے گھٹنے تھام لیے۔

"پتا ہے مجھے پوری بات۔ ہاری اگر چیف جسٹس کا بیٹا بھی ہوتا تو میں اس کا پرپوزل مسترد کر دیتا۔ ابھی تمہاری عمر بہت چھوٹی ہے۔ فیصلے کرنے کی عمر نہیں ہے تمہاری۔" "تم نے میری اتنی انسلٹ کی ہے کہ جی چاہتا ہے خود کو شوٹ کر لوں۔ ہو بھی سکتا ہے اگر کسی رات جلد جواب دے گیا۔"

"مائی گڈنیس!" روشنی نے بدحواس ہو کر ان کی صورت دیکھی۔ "پاپا میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔ آپ کی اگنورنس کے باوجود میں نے گھر میں ہمیشہ آپ کی راہ دیکھی ہے۔ آپ کا انتظار کیا ہے۔ کتنے کتنے دن آپ کی ایک جھلک کو ترستی ہوں۔"

وہ ان کے گھٹنوں پر پیشانی ٹکا کر زور زور سے رو رہی تھی۔

"جن سے انسان محبت کرتا ہے انہیں کبھی عظیم دکھ نہیں دیتا۔" انہوں نے بے رخی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"پاپا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بات آپ کے لیے عظیم دکھ کا باعث ہو سکتی ہے۔ مجھے پتہ تھا آپ اس قدم اٹھانے پر خفا ضرور ہوں گے۔ مگر بات یہ ہوئی کہ اس کی جان کی انوالومنٹ کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو گیا۔ پاپا آئی ایم کانشس بہت سوفٹ۔"

"شٹ اپ۔" یادر علی خان اسے ایک طرف ہٹا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "تم چلی جاؤ اسی کانشس کے پاس۔ ہمارا تمہارا اب کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ شل سی دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔

ماہین کب سے ادھر ادھر بے مقصد آ جا رہی تھی۔ اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے اس نے تمام ممکنہ سوالات کے جواب تیار کر رکھے تھے۔ سب ہی ہیں گھر میں۔ کچھ ہو نہ جائے۔ پھر کوئی نیا تماشا نہ ہو۔ یادر علی خان سے ہر طرح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ نہ اس میں حوصلے کی کمی تھی نہ فیصلہ کرنے کی طاقت سے محروم تھی۔ مگر وہ اندھا دھند کچھ کر نہیں پا رہی تھی۔ اب بھی سارے قصے میں روشنی اور جواد کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ ان کے ذاتی مفادات پیش نظر تھے۔

تقریب کے اثرات دھندلا رہے تھے۔ حویلی میں آہستہ آہستہ آوازیں معدوم ہو رہی تھیں۔ روشنیاں دھیرے دھیرے گل ہو رہی تھیں۔ لڑکیاں تھکی ہاری ادھر ادھر گری پڑی نظر آ رہی تھیں۔ اور وہ الگ اور عجیب نظر سے ... یادر علی خان تقریب میں کسی وقت بھی حصہ لیتے نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ تیمور علی خان کو اس نے کئی جگہ مختلف اوقات میں ...

نکاح کے وقت لڑکی کے وکیل کی حیثیت سے بھی وہ گھر کے اور دوسری لڑکیوں کے ہمراہ کمرے میں آئے تھے۔ وہ اس وقت گھر کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

آج تک جب بھی ماما جانی نے کئی بار جواری سے گزرتے ہوئے اس کی سمت تعجب سے دیکھا تھا مگر کچھ بولی نہیں تھی۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے اس نے اپنی خواب گاہ میں قدم رکھا تھا۔ یادر علی خان شب خوابی کے لباس میں رائٹنگ ٹیبل سے پشت لگائے ہوئے سوچ میں گم تھے۔ انہوں نے اندر داخل ہوتی ماہین کو گہری نظر سے دیکھا اور صرف لمحے بھر کو دیکھا تھا اور پھر مصروف ہو گئے تھے۔

ماہین نے طنزیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھا تھا۔ ان کی انگلیوں میں سلگتا سگریٹ دھواں اڑا رہا تھا۔ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے ان کی اندرونی بے چینی کا واضح ثبوت تھا۔

وہ چپ چاپ آگے بڑھ کر شب خوابی کا لباس وارڈ روب سے نکالنے لگی۔ نائٹی نکال کر اس نے بیڈ پر ڈالا اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف رخ کر کے جیولری اتارنے لگی۔ وہ اسے سرسری آئینے میں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آئینے میں غور سے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ روشنی کی وجہ سے اس حویلی میں داخل ہوئیں اسی کی وجہ سے آج تک میری زندگی میں بھی۔ یا پھر نہیں گے کہ یہ چاہت بھی نہیں کرتے ہیں۔" اچانک ہی انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔

آویزہ اتارتے اتارتے وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ کسی الجھی ہوئی تصویر کی صورت۔

"مطلب؟" ان کا انداز دل جلانے والا تھا تو اس کا لہجہ بھی تیکھا ہو گیا۔

"کاش آپ دونوں خالہ بھانجی کی انڈرسٹینڈنگ بھی بہت ہے؟" پھر طنزیہ استفسار تھا۔

"جو کہنا ہے بس وہی کہیے اور جلدی کہیے۔" وہ بے تابی سے انداز میں ان کے قریب چلی آئی۔

"مری سے واپسی کے بعد آپ کی روشنی سے ہاں وہ سب کی بات چیت تنہائی میں ہوئی تھی؟" یادر علی خان نے سگریٹ اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہے۔

"ایک مرتبہ نہیں جانے کتنی مرتبہ۔" ماہین نے بے نیازی اختیار سے جواب دیا۔

"تو پھر اس کا مطلب ہے آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ بلکہ آپ اس کے ساتھ اس تمام قصے میں شریک ہیں۔"

"کون سا قصہ۔ کیسا قصہ؟" ماہین دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"پلیز میرے ساتھ یہ ڈرامہ نہ کریں۔" یادر علی خان نے بڑی دقت سے ہاتھ اٹھا کر گویا اسے مزید سے روکا۔

"آپ اس طرح بغیر ثبوت و تحقیق مجھے ملزم نہیں کر سکتے۔" ماہین کو شدید غصہ آ گیا۔

"ملزم نہیں کر رہا۔ بالکل شعور ہوں۔ یقیناً سب کچھ آپ کی نالج میں ہے۔ جب اتنی اہم باتیں حقیقی باپ سے چھپائی جائیں تو پھر اس رشتے کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔" وہ بھی ناراضگی سے گویا ہوئے۔

"کیا ہے میری نالج میں آپ کے حساب سے۔ ذرا بتا دیجیے مجھے۔ بلکہ ذرا ٹھہریے پلیز میرا تو دماغ پھٹ جائے گا ان

پچھلوں میں۔" ماہین نے سر تھام لیا۔

"یعنی کہ میری بیٹی شادی شدہ ہو چکی ہے۔" وہ تیزی سے گویا ہوئے۔

ماہین بھونچکی سی ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی جیسے اسے سننے میں مغالطہ ہوا ہو۔

"جی؟" اس کا چہرہ یکدم سفید پڑ گیا تھا۔

"جی!" وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورنے لگے۔ ماہین نے تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیں۔ دل زور کی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔

"مس اے وری شاکنگ نیوز فار می۔ وہ پسپل... مجھے کچھ نہیں پتا پلیز۔" اس کی آواز مجرم کی طرح بہت آہستہ ہوتی چلی گئی۔

"آپ جس طرح چاہے تحقیق کر لیں۔ عنقریب ثابت ہو جائے گا کہ میں قطعی لاعلم اور بے گناہ ہوں۔ بلکہ میرے لیے وہ عظیم دکھ کی بات ہے کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میرا اعتبار کیا جاتا۔" اس کے لہجے میں واقعی دکھ گھرا تھا۔

"کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ ایسا کیسے ہوا۔ کب ہوا؟ اور وہ کون ہے۔" وہ اتنی شرمندگی سے پوچھ رہی تھی گویا اس سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہو۔

"مجھ سے پیار نہیں کرو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تمہیں یہ سب معلوم ہی نہ ہو۔ اتنا بڑا اقدام وہ اپنے حوصلے سے کر ہی نہیں سکتی۔" یاور علی خان نے بڑی ناگواری سے اسے ٹوک دیا۔

"آپ کو یقین دلانے کا کیا پیمانہ ہے؟ کون سی قسم کھائی جائے کہ آپ کو یقین آ جائے۔ یہ خود بھی شاکنگ ہے آپ کے لیے ہے اتنی ہی میرے لیے۔" ماہین نے بے بسی سے کہا۔ "اگر ایسا ہوا ہے تو اس نے کم از کم میرے ساتھ بہت ہی زیادتی کی ہے۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔" وہ بہت دکھ سے کہہ رہی تھی۔

یاور علی خان نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ جہاں صرف تحیر ہی تحیر تھا۔

"بتائیے ناں۔ وہ کون ہے؟ جس نے اسے اتنا بہادر بنا دیا۔ کہ اسے بابا صاحب تک کا خوف نہیں رہا۔" اس نے منت کے انداز میں کہا۔

"اسے بڑی مضبوط ٹیک ملی ہے۔ انتقام لیا گیا ہے مجھ سے۔ مگر میں یہ اسکیم فیل کر دوں گا۔ جتنا وہ عمر کر دوں گا۔" وہ غضبناک ہو کر کہہ رہے تھے۔

"آپ کسی ملازمہ سے کہہ کر ہاری کو بلوائیں۔ ابھی سامنے آ جائے گا سب کچھ۔"

ماہین حیران پریشان سی اٹھ کھڑی ہوئی "ہاری! ابھی بلواتی ہوں۔"

وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھی۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ اسے بہت کچھ جاننے کی بہت جلدی ہے۔

چند منٹوں بعد وہ واپس آ گئی تھی۔ "ماما جی بے چکانے۔" اس نے اطلاع دی اور صوفے پر بیٹھ کر گم سم یاور علی خان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

پانچ سات منٹوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ ہاری!" ماہین نے بے تابی سے کہا۔

یاور علی خان نیا سگریٹ سلگا رہے تھے۔

دروازہ کھلا اور ہاری اندر آ گیا۔ اس کے قدم ٹھٹکے اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"السلام علیکم بیگم!" اس نے یاور علی خان کی سمت دیکھ کر سلام کیا۔ یاور علی خان نے سلام کا جواب نہیں دیا اور تکنے لگے۔

"بیٹھ جاؤ ہاری!" ماہین نے اپنے قریب کی نشست کی سمت اشارہ کیا۔ ہاری فوراً بیٹھ گیا۔

"یہ ماہین تمہاری اور روشانے کی کارگزاری سے لاعلم ہیں۔ ذرا انہیں تفصیل سے بتاؤ۔" یاور علی خان نے آغاز کیا۔

ماہین کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"ہاری!" وہ حیرت سے بس اس کا نام ہی لے پائی۔

ہاری خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"خاموشی ٹوٹ چکی ہے ہاری! سازش منظر عام پر آ چکی ہے۔ ماہین کا کہنا ہے کہ یہ کچھ نہیں جانتیں تمہارے بیان سے تصدیق ہو گی کہ یہ غلط کہہ رہی ہیں یا درست۔"

یاور علی خان نے سرد لہجے میں ہاری کو متوجہ کیا۔

"درست کہہ رہی ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں۔" ہاری کی آواز کمرے میں گونجی۔

"مگر مجھے یقین نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بھی کوئی گٹھ جوڑ ہو اور تم انہیں بچانے کے پابند ہو۔" اس کٹ حجتی کے تحت یاور علی خان کو کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یہ سچ ہے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں۔ مجھے، روشانے بی بی کا جان اور ان کے دو تین دوست اور دو تین کے چند ملازمین کے علاوہ کسی کو اس واقعے کا علم نہیں۔"

اس نے اس مرتبہ بہت پرسکون انداز میں جواب دیا تھا۔ شام سے اب تک وہ ایک ذہنی عذاب سے دوچار تھا۔ جیسے نہیں کہہ رہا تھا کہ روشی کے ساتھ یاور علی خان نے کیا معاملہ کیا۔ اور حیرت اس بات پر تھی کہ بابا صاحب کے دربار میں اب تک اسے پیشی کے لیے کیوں نہیں بلوایا گیا۔ اور اب آخر کار وہ کمرے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے باوجود پرسکون تھا کہ شام سے اب تک کی کشمکش و ذہنی اذیت سے نجات مل گئی تھی۔

"تم نے تیمور علی خان نے کس طرح کہا۔ اور کس انداز میں تمہیں اس کے لیے تیار کیا۔ تم تو بابا صاحب کا دم بھرا کرتے تھے۔ تم نے تیمور علی خان کی سازش کا حصہ بنتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بعد بابا صاحب تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ تم نے اتنی آسانی سے تیمور علی خان کی بات کس طرح مان لی؟ آخر جاگیر تمہارے نام کرنے کا وعدہ کیا تھا اس نے تمہارے ساتھ۔ یا کوئی ادائیگی۔"

"پلیز۔ یاور خان۔ تفصیل جانے بغیر اور میرا جواب سنے بغیر آپ بات کو یوں رول نہ کریں۔ پلیز۔" اس نے بے اختیار ان کی بات کاٹ دی۔

ماہین ششدری بیٹھی کبھی یاور علی خان کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی ہاری کو۔ اس کے اپنے حلق میں تو بہت سارا سوالوں جیسا کچھ تھا۔ وہ بات کرنے کے قابل تو کیا کوئی گھونٹ نگلنے کے قابل بھی نہیں تھی۔

"آپ اس پوائنٹ پر بھی غور کیجئے کہ روشی بی بی سرائے خود اپنی مرضی سے گئی تھیں۔ کہ وہ نعیم سے شادی کرنے پر قطعی آمادہ نہیں تھیں۔ اور ان کا انکار حویلی کے تمام اہم لوگوں کے علم میں تھا آپ سمیت۔ کاکا جان ان کو پکی فرسٹ میں لا کر حویلی واپس بھیجنا چاہتے تھے کہ حویلی میں ان کی غیر موجودگی سے قیامت برپا ہو رہی ہو گی۔ انہوں نے حویلی واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ لامحالہ کاکا جان نے ریزن طلب کی اور روشی بی بی نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نعیم سے شادی نہ کرنے کی وجہ تم تھے؟"

یاور علی خان نے برہم انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

ہاری ایک لمحے کو خاموش سا ہو گیا۔

"آپ یقین نہیں کریں گے پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ میری ان سے کبھی کسی قسم کی کوئی کمٹ منٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں تو اپنے معمول کے کام سے سرائے گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ روشی بی بی وہاں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا۔ ماہین نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر دوڑائی۔ اور ایک گہری سانس لی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے اندر تو قیامتیں برپا ہو رہی تھیں۔

"تو پھر روشانے نے تیمور علی خان کو وجہ بتا دی کہ وہ تمہاری وجہ سے نعیم کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند نہیں۔ اور انہوں نے تمہاری خدمات کے اعتراف میں کھڑے کھڑے تمہارا نکاح پڑھوا دیا۔ یعنی حد ہو گئی کیا خیال ہے تمہارا گھاس کھاتا ہوں میں؟" یاور علی خان برہمی کی انتہا کو چھونے لگے۔

"زبردستی تو سے ہی بالکل بھی ہو گئی مگر باقی سب کچھ اس طرح نہیں ہوا۔ کاکا جان نے مجھ سے تفصیلی بات چیت کی تھی۔"

"مثلاً انہوں نے تمہیں بہت خوبصورت خواب دکھائے اور بہرصورت تمہیں اس نیک کام کے لیے آمادہ کیا۔" یاور علی خان نے تلخی سے کہا۔

"نہیں انہوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی زبردستی یا دباؤ سے کام نہیں لیا۔ میں اگرچہ اس رشتے سے بہت خوش ہوں۔ بلکہ یہ میری خواہش کی تکمیل ہے لیکن جس طرح یہ سب ہوا یہ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ میری خواہش قیامت تک میری زبان پر آ سکتی تھی نہ ہی میرے کسی عمل سے ظاہر ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود کہ میں بہت آسانی سے اپنا مقصد پورا کر سکتا تھا۔ کیونکہ سیکنڈ پارٹی کی بھی یہی خواہش تھی۔ مگر بابا صاحب نے جو منصوبے بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں اس طرح کی خواہش پوری ہونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ خواہش بہت طاقتور سہی مگر میں حویلی والوں سے ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اپنے

جیسے حویلی میں کسی قسم کا انتشار نہیں پھیلانا چاہتا تھا۔ بہت سے حقیقی رشتوں کے بغیر جب زندگی گزاری جا سکتی ہے تو پھر یہ کسی نے سن چاہے تعلق کے بغیر بھی گزاری جا سکتی ہے۔ اپنا میں بہت سے لوگ گزارتے ہیں۔

مگر روشی بی بی نے سب کچھ کر دیا۔ جس سے یہ بات آشکار بھی کر رہے ہیں کہ اگر وہ حویلی واپس لوٹیں تو بہت بڑے امتحان میں ڈال سکتی ہیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو وہ کر سکتی تھیں۔ آپ کو یاد ہوگا کراچی میں سوسائیڈ (خودکشی) کی کوشش کر چکی ہیں۔ ان کے پاس کوئی ایک بھی گنجائش نہیں ہے۔ کاکا جان نے تو بات سنبھال لی ہے۔"

"پتہ نہیں میں جانتا ہوں کہ موصوف نے بات کتنی سنبھالی ہے اور کتنی بگاڑی ہے۔

دیکھو لڑکے تم بہت ذہین ہو تم نے بہت سلیقے سے رپورٹ پیش کی ہے۔ مگر میرے لیے یہ بہت ہے کہ تم میرے بابا صاحب کے نہیں اس کے دوست کے بیٹے ہو۔ اسی کو سپورٹ بھی کرو گے اور صرف اسی کی بات مانو گے۔ تم چھوٹی حویلی میں ہو یا بڑی حویلی میں تم صرف اس کے آدمی ہو بلکہ اس کے خاص آدمی ہو۔"

یاور علی خان کی شریانوں میں جو زہر بھرا ہوا تھا وہ ان کے طرز تخاطب سے آشکار تھا کہ ماہین بھی آج "تم" تھی اور تیمور علی خان بھی "اس" "اس" ہو رہے تھے۔

ہاری خاموش رہا کہ وہ آگاہ تھا ان کے خیالات تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ اختلاف یا تردید اس وقت جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھا۔

"سب لوگ اتفاق کریں یا اختلاف مگر میں اپنی جگہ قائم ہوں۔ یہ صرف سازش اور انتقام ہے۔ محض مجھے اذیت پہنچانے کے لیے ہے۔ مگر آپ سب کو بہت مایوسی ہوگی۔

محترمہ!" وہ ماہین کی سمت یکلخت متوجہ ہوئے۔ "آپ کو میں نے تیمور علی خان سے خوب بات کرتے دیکھا ہے۔ مجھے اب بھی اسی صحت کے ساتھ مکمل یقین ہے کہ آپ اس سارے قصے سے صرف واقف ہی نہیں باقاعدہ اس میں آپ کا رول ہے۔

آپ کا انداز اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ تیمور علی خان سے آپ کی وہ پہلی ملاقات نہیں ہے۔

بابا صاحب کی موجودگی میں یہ ڈراما اپنے منطقی انجام کو پہنچے گا ورنہ تنسیخ نکاح کے لیے کورٹ سے رجوع کیا جائے گا۔"

انہوں نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

"مت دیکھیے یہ خواب۔ نکاح اس کی اپنی مرضی سے مجھے چچا کی موجودگی میں ہوا ہے۔ میں جا رہی ہوں بھابی بیگم کے کمرے میں۔ اب آپ مجھے تب ہی بلائیے گا اور طلب کیجئے گا۔ جب میرا جرم ثابت ہو جائے۔"

ماہین نے شب خوابی کا لباس اٹھایا، دو چار چیزیں ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھائیں اور ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہاری اور یاور علی خان چند لمحے خاموش رہ کر ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہے۔

"ہاری ابھری اس میں ہے کہ تم اسے آزاد کرو۔ وہ تمہیں ملے گی بھی نہیں یہ تمہارا خواب ہے۔ لعنت بھیجو گی تو تمہیں ملے گی۔ یہ میری انا کا سوال ہے۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت آؤٹ آف کنٹرول ہے۔ کہ میں اپنی انا کی بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہوں۔ تم پر تو اس حویلی کی پرت پرت عیاں ہے۔ کیوں کود پڑے اس آگ میں اس قدر احمق ہوئے ہو تم۔"

یاور علی خان کے لہجے میں تاسف بھی تھا اور برہمی بھی۔

"میری اپنی رضامندی تھی ورنہ آگ میں کود کون پسند کرتا ہے۔" ہاری نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اور گردن جھکا کر بہت دھیمی آواز میں گویا اعتراف جرم کیا۔

"اسی لیے تو احمق کہا ہے تمہیں۔ وہ یاور علی خان کی بیٹی ہے۔" یاور علی خان نے بڑی تلخی اور نخوت سے کہا۔

"مگر خیر۔ اگر کسی نے ہار جیت کا کھیل شروع ہی کر دیا ہے تو میں پیچھے نہیں ہوں گا۔ اس میں کسی کا کوئی رول نہیں ہے روشی بی بی کی فیصلہ کن نیچر کا بس سب سے اہم رول ہے۔"

"سب وزن اس پر ڈال کر اپنی جان بچا رہے ہو۔ کاش یہ جملہ وہ بے وقوف اپنے کانوں سے سنتی۔" یاور علی خان بول پڑے۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو ان کا شکر گزار ہوں۔ اب اگر نقصان بارش کی طرح برسیں تو مجھ پر برسیں۔ روشی بی بی کا رول تو اب ختم ہو چکا ہے۔ اب تو صرف رول ہی میرا ہے۔ وہ بہت بہادر اور فیصلہ کن ہیں۔ میں گستاخی اور بے ادبی نہیں کروں گا۔ ان کے لیے مورل سپورٹ حاصل کروں گا۔ تمرد پر در پیش جیل۔ میں ہر قسم کی سزا کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا ہوں۔ آپ جو چاہیں میرے لیے سزا تجویز کریں سوائے اس کے کہ میں انہیں آزاد کر دوں۔"

وہ کھڑا ہو گیا اور یاور علی خان کی کسی اگلی بات کا انتظار کرنے لگا۔

"لوگ انٹینس حاصل کرنے کے لیے صبح سے شام تک جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کرتے رہتے ہیں۔ تم بھی کچھ دن کے لیے خود کو بہادر اور شو کر لو تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

یاور علی خان نے تلخی سے کہا اور کش لگانے لگے۔ ہاری نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ان کی سمت دیکھا۔

"میں نے آپ سے کبھی کوئی غیر ضروری بات نہیں کی مجھے افسوس ہے کہ آج میں بہت کچھ کہہ بیٹھا ہوں مگر کیا کروں۔ یہ راستہ بھی میرے سفر میں پڑتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ یاور علی خان کا انداز بھی یہ تھا کہ رانی انا کی جو کچھ تھا وہ کہا جا چکا اور اب وہ کچھ آگے کی سوچ رہے ہیں۔

تیمور علی خان رات گئے سرائے پہنچے تھے۔ نازنین گہری نیند سو رہی تھی۔ دستک پر وہ ادھ کھلی بھوجتی اٹھی تھی اور دروازہ کھول کر پھر بستر میں دبک گئی تھی۔ انہوں نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کیا تھا اور بہت احتیاط سے وارڈروب سے نائٹ ڈریس نکال کر ڈریسنگ کی طرف چلے گئے تھے۔ لباس تبدیل کر کے باہر آئے تو ہاتھ میں کف لنکس اور ریسٹ واچ تھی جو انہوں نے

بہت احتیاط سے سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھی۔ ساتھ ہی ایک نگاہ نیند کی آغوش میں کھلی ہوئی نازنین پر ڈالی تھی اور کچھ سوچتے ہوئے ان کی بغل میں ایزی چیئر پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ تو تقریب ختم ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چل پڑے تھے۔ گاڑی چونکہ ڈرائیور چلا رہا تھا اس لیے وہ کچھ راستے میں سوچتے بھی چلے تھے۔ حالانکہ انہیں بہت منتشر سا تھا۔ آنے والے کسی پریشانی کی وقت انہیں ان کے وجود میں شور برپا کر رہی تھی۔ وہ سوئی ہوئی نازنین کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے حوالے سے جانے کیا کیا خیال آ رہے تھے۔

نازنین نے خاصی دیر بعد کروٹ بدلی تھی۔ جانے تیمور علی خان کے کسی مرتعش خیال کی قوت تھی کہ اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے نیند بھری آنکھوں سے اپنے پہلو میں نظر دوڑائی تھی۔ جہازی سائز بیڈ دور تک خالی نظر آ رہا تھا۔ جس پر قاتلانہ چونک پڑی تھی اور کمرے میں نظر دوڑانے لگی تھی۔ سامنے ایزی چیئر پر تیمور علی خان اسے کسی دھیان میں گم نظر آئے۔

"حویلی سے آ رہے ہیں؟" اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز کمرے میں ابھری تھی۔

"ہوں۔" انہوں نے صرف ہنکارا بھرا تھا۔

"روشی آ گئی تھی؟" اس نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔

"ہوں۔" انہوں نے پھر ہنکارا بھرا۔

"اور وہ نصیب۔" اس کی آواز نیند کے سبب بھاری تھی۔

"ہم کون ہوتے ہیں کسی کے نصیب کا فیصلہ کرنے والے۔" تیمور علی خان نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

نازنین کی نیند جھٹ سے اڑ گئی۔ آج پھر اسٹائل بدلا ہوا تھا۔ گویا پھر سے محنت پڑنے والی ہے۔

اسے عرصے سے بیتی تو ہوش آیا تھا۔ وہ اس موڈ میں آتے تھے تو اسے کتنی ریاضتیں کرنی پڑتی تھیں۔ ان کی واپسی کو آزاد ایک مرحلہ بن جاتا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

"طبیعت کیسی ہے؟" اس نے بہت جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ سو جائیں۔ ٹھیک ہیں ہم اور اب نہیں مزید کیا ہوگا۔ بہت ہو چکا ہے ہمارے ساتھ۔"

"مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ آپ کے ساتھ بہت ہو چکا۔ مگر اب نئے سرے سے نیندیں ویران کرنے کا کیا فائدہ؟ سو جائیں آپ بھی۔" وہ کھوجتی نظروں سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"کوئی بات تو نہیں ہوئی؟" وہ بیڈ سے اتر کر ان کے قریب چلی آئی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ پلیز۔" وہ تقریباً جھلا گئے۔

"اتنا تو مجھے شعور ہے کہ آپ کی یہ کیفیت نیچرل ہوتی ہے۔ دیوالیہ کاروباری ہو گا جب اپنے نقصان یاد کرتا ہے اور آہیں بھرتا ہے۔ مگر آپ کی اس کیفیت سے جو نئے سرے سے مجھ پر احساس کا بوجھ پڑتا ہے تو میری کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

تیمور علی خان یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ اتنا ٹینشن میں کیوں چلی جاتی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا کہ آپ وہم میں مبتلا ہو جائیں۔ جو عام سے واقعات ہوتے ہیں وہ ہم آپ کو صبح بتائیں گے۔ پلیز آپ آرام کریں۔"

وہ نازنین کو تھام کر ریلنگ کر لائے۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں نازنین سیاہ نائٹی پہنے ہوئے بالکل سفید محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ سیاہ کلر مت پہنا کریں۔ اس سے اپریشن ہوتا ہے۔" وہ اسے لٹاتے ہوئے بہت ملائمت سے کہہ رہے تھے۔

"قسمت کا رنگ سیاہ ہو تو کیا کرتے ہیں؟" وہ آزردگی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ ان وائز ٹیک آپ ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی کر رہی ہیں۔" وہ اس پر کمبل ڈالتے ہوئے بہت ملائمت سے کہہ رہے تھے۔

"آپ کو تو تیمور بھیج رہا ہے؟" وہ اس کی پیشانی چھو کر تشویش سے گویا ہوئے۔

"پتا نہیں کب ٹھنڈا ہو گا یہ وجود۔" نازنین نے یہ کہہ کر ان کی طرف سے پشت کر لی۔

"بہت ذہن پر زور ڈالتے ہیں۔ کسی طرح وہ نام یاد آ جائے جس نے ہمیں اذیت دی ہو۔" سائیڈ ٹیبل کی دراز سے کوئی ٹیبلٹ نکالتے ہوئے بڑے دکھ سے کہہ رہے تھے۔

ایک گلاس میں پانی جگ سے انڈیلا جو بیڈ کے سرہانے ہی رکھا ہوا تھا۔

"یہ لیجیے یہ ٹیبلٹ لے لیجیے۔" انھوں نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔ "ایک تو یہ آپ کے گیسو ہے دراز دوبارہ تو صرف انہی کے لیے وقف ہوتا ہے۔"

وہ احتیاط سے اس کے بال ایک طرف ہٹاتے ہوئے اپنے بیٹھنے کی جگہ بنا رہے تھے۔

"لگتا ہے ان ہی کی نحوست ہے زندگی میں۔ نہ کسی کے ایسے بال ہیں نہ ایسی قسمت۔"

اس نے بے نیازی سے ان کی ہتھیلی سے ٹیبلٹ اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ اور گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر منہ سے لگایا۔ دو تین گھونٹ لے کر واپس دے دیا اور گرنے کے انداز میں دوبارہ لیٹ گئی۔

"اتنا تھک کر آپ آئے اور بجائے آرام کرنے کے چیئر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگے اس کا مطلب کچھ ہوا ہے وہاں۔"

اس کی سوچ ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔

تیمور علی خان سر کے نیچے ہاتھ باندھ کر چت لیٹے چھت کی سمت تک رہے تھے۔

"کچھ نہیں ہوا۔ جو خوشگوار واقعات ہمیں پیش آئے ہیں صبح بتائیں گے آپ کو۔" وہ بے نیاز لہجے میں گویا ہوئے۔

"خوشگوار؟" کس قدر خوبصورت لفظ ہے اس کے حسن کی اہمیت کوئی ہم سے پوچھے۔"

"اب تو اس گھر میں روشنی صرف آپ کی وجہ سے ہے۔ کیوں عمر بھر کی ریاضتوں کو غیر اہم کر رہی ہیں۔ آپ ٹھیک ہونے کی امنگ رکھیں گی تو کچھ امید روست ہوگی اگر یہ ذہن مایوس ہو گا کہ بس کھیل ختم ہو جانا چاہیے تو زندگی تو خود ہاتھ چھڑا کر بھاگے گی۔ اب ہماری طرف بھی دیکھیے۔ کچھ ہمارا بھی خیال ہونا چاہیے۔" تیمور علی خان کے لہجے میں بلا کی تھکن آ گئی

آئی۔

"معصومیت ابھی بہت چھوٹی ہے۔ آپ اسی کا خیال کر کے زندگی کی طرف دیکھیں۔"

"اب رات یہ آپ مجھے خود غرض ہونے کا احساس دلا رہے ہیں تیمور۔ معصومیت کے ساتھ تو آپ کو بھی کوئی انکار کرنا ہے؟ بلکہ میں نے تو اسی کے لیے جاوی کی طرح کی لپیٹ رکھی ہیں۔ اور یہ آپ کی قربانیوں کا رزلٹ ہے کہ میں نے معصومیت پائی ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ زندگی جوں جوں ہوتی جاتی ہے میرے اندر سکون اترتا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آسان ہونے والی ہیں۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"ہر شخص اپنے دل کی کر لیتا ہے۔ کہہ لیتا ہے۔ ورنہ دل کی جانے کب ہوگی۔ کب تو کس بات کا یقین آئے گا کہ ہم بھی اللہ کے بندے ہیں۔ نہ فرشتے ہیں اور نہ ہی کسی جبل (دھات) سے بنے ہیں۔" انھوں نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"آئی ایم سوری تیمور۔ ہماری طرف سے تو آپ کو صرف دکھ ہی ملتے ہیں۔ مگر جس کے پاس جو ہوگا وہی تو دوسرے کو دے گا۔"

نازنین نے رخ موڑ کر ان کے بازو پر سر سے ہاتھ رکھ کر بڑی ندامت سے کہا تھا۔

ساری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی تھی۔ عالم تاب نے از خود ہی اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہو جاتی ہے بعض اوقات میاں بیوی میں بد مزگی۔ نہ انھوں نے کچھ پوچھا نہ اس نے کچھ بتایا۔ وہ نماز کے لیے اٹھیں تو وہ بھی اٹھ گئی تھی۔ ماما جائے نماز پر دونوں نے بہت خاموشی سے ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ کر چائے پی۔ عالم تاب نظر بچا کر اس کے چہرے کا جائزہ تو لے رہی تھیں مگر کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ برسوں سے دونوں ایک وقت حویلی میں تھے تو حویلی میں کچھ پیش آ جانے کے خوف سے ہر فرد اندر سے سہما ہوا تھا مگر تیمور کے چلے جانے کے بعد کیا ہوا ان کی موجودگی میں تو کچھ نہیں ہوا۔ بجرا ان کے جانے کے بعد کیا ہوا یہ جاننے کی خواہش پیدا ہونا فطری امر تھا۔ مگر جانے بے سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس نے ابھی انھیں زیادہ دیر امتحان میں مبتلا نہیں رکھا اور ادھر ادھر کی معمول کی بات چیت کر کے روشنی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ دروازہ لاک تھا۔ اس نے کئی بار دستک دی تب جا کر کھلا۔ بڑی گہری نیند تھی۔ ساری رات کی کشمکش کے بعد صبح اونگھ کے گرد کچھ گئی تھی۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی ماہین نے آ کر اٹھا دیا تھا۔ اور یہ اتنا غیر معمولی تھا کہ خوف سے اس کا دل بیٹھ گیا تھا۔ بلکہ رات اس حیرانی میں کٹی تھی کہ خالہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں یا اسے بلوایا کیوں نہیں؟

ایسا ممکن ہی نہیں کہ پیا کے کمرے میں قیامت برپا ہو اور خالہ کو خبر نہ ہو۔ اس نے بغیر کچھ کہے ایک طرف ہو کر ماہین کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر آ گئی تو دروازہ دوبارہ لاک کر دیا اور وہیں کھڑے کھڑے ماہین کا چہرہ دیکھنے لگی جو اس کے بستر پر پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیوں کھڑی ہو۔ اِدھر آ کر میرے پاس بیٹھو۔" ماہین نے اسے مخاطب کیا۔

وہ چپ چاپ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"اتنا سب کچھ کر کے بیٹھی ہوئی ہو اور مجھے پتا تک نہیں۔ میرے لیے کتنی مشکلات کھڑی کر رہی ہیں مجھے پتا تھا جب تک
جب دل کی بات پہنچائی تھی مجھ تک خاموشی کی زبان ہی سے سہی تو اتنا سب کچھ بھی تو دیا ہوتا۔ تمہاری شخصیت اسلام
میرے اور تمہارے لیے کھڑی نہ ہوتیں۔ بلکہ اب تک تو بہت سارے حل بھی نکل چکے ہوتے۔"

ماہین ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔

"وہ شخص تو ازلی بدگمان ہے' کیسے یقین دلاؤں گی' کیسے سنبھالوں گی یہ سب۔ یہ کوئی فیلڈ نہیں پہلے سے ہی بہت
ہے۔ کیا ضرورت تھی اس طرح سے کرنے کی۔ اِدھر تو پہلے ہی گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔"

ماہین شدید ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔ اور روشی بس ہاتھ مسلتے ہوئے سنے جا رہی تھی۔

"خالہ! میں اس لیے باہر نہیں آتی تھی۔ بلیوی۔" بالآخر اس نے لب کشائی کی۔

"اتنی بڑی بات بغیر سوچے سمجھے' پروگرام بنائے بغیر کیسے ہو سکتی ہے؟ اب اتنا پاگل بھی نہیں بناؤ۔" ماہین نے برہمی
سے کہا۔

"خالہ! آپ کاکا جان سے ساری بات پوچھ لیں۔ ان کا تو اعتبار کریں گی ناں آپ۔" اسے مقبول جملہ سوجھ گیا جس
سے مزاج میں تبدیلی متوقع تھی۔

"ان کا کیا ذکر۔" ماہین نے تفصیل جاننے کے شوق میں انجان بننا پسند کیا۔ بازی کے اختصار میں ساری تفصیل واضح
کر چکی تھی۔

"ان ہی کی وجہ سے تو یہ مشکل سا کام انجام کو پہنچا ہے۔" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"مگر ان تک تمہارے دل کی بات پہنچی کیسے؟" ماہین کی حیرانی بجا تھی۔

"پتا نہیں۔ وہ تو خود ہی سمجھ گئے تھے۔" اس نے قدرے جھینپتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"سبحان اللہ۔ بڑے ولی اللہ ہو گئے ہیں تمہارے کاکا جان۔" اس بے سروپا جواب پر ماہین نے جل کر کہا تھا۔

اب روشی سے ماہین کا یہ انداز مزید برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ ماہین کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"خالہ! اتنے اجنبیوں کی بھیڑ میں آپ تو ایسے نہ کریں۔ مجھے تو کاکا جان نے منع کیا تھا کہ ہم کسی سے اس واقعے کا ذکر
نہ کریں وہ خود ماحول حق میں کر کے یہ سب کچھ ہینڈل کریں گے۔ مجھے بھی تاکید کی تھی اور بازی کو بھی۔ آپ میری بات پر
یقین کیوں نہیں کر رہی ہیں؟" وہ بُری طرح رو رہی تھی۔

"کیسے کروں۔ کوئی سر پیر ہے بھلا۔ کاکا جان کو الہام ہوا تھا کہ تم بازی میں انٹرسٹڈ ہو؟" ماہین کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی
ہوئی تھی۔

"صحیح طریقے سے بتاؤ مجھے۔ دماغ نہیں گھماؤ۔" اس کے اس بُری طرح رونے سے ماہین الجھ سی گئی تھی۔

"کیا بتاؤں۔ کوئی بات سوجھتا ناں؟" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"روشی! ایسا نہیں کرو میرے ساتھ۔ تمہیں پتا ہے میں آل ریڈی کتنے عذابوں سے گزر رہی ہوں۔ کس دلدل میں دھنسی
ہوئی ہوں۔ کسی لمحے میں میری شادی ختم ہو سکتی ہے۔ تمہارے پاپا کو ایک پل میں بھی ان جانے کا خطرہ ہے۔ اب
پھر سے تو کوئی گھڑی نہیں رہ گئی۔"

روشی نے چونک کر اس کے شانے سے سر اٹھایا اور مسکراتی اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"خالہ! آپ نے کیا کہا ہے؟ پاپا آپ کے ساتھ اس قدر زیادتی نہیں کر سکتے۔ ان کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ اچھا ہے کہ رہیں اتنا
اچھا ہے تو ملنا ہے۔ آپ کی وجہ سے وہ کتنے کمپلیکس میں ہیں۔ اب کیا کمی ہے ان کے پاس۔ بچے بھی ہیں۔ پاپا تو ہیں۔
بلیس بھی ہے۔ کیا ہوا ہے انہیں؟"

وہ خود پر پڑی بھول گئی۔ جذب سے اس کا چہرہ اٹھانے لگی تھی۔ ماہین کو بھی اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس کی آنکھیں
بھی بھر آئیں۔

"میری جان۔ بے خبری بھی بڑی نعمت ہے۔ نہ زیادہ کی کھوج کرتا کہ پھر کھائی کا سفر پڑتا ہے۔ اتنی بھاری رکھنے
سے پہلے اگر پوچھ ہی لیتی مجھ سے تو شاید کوئی آسانی کی راہ نکل آتی۔ کچھ نہ کر کے چلتے تو حل آسان ہو جاتا۔"

"مگر جو انکشاف اچانک ہوا ہے۔ یہ دھول آندھی کی طرح ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ بیک وقت کتنے لوگ الجھن
میں آ گئے ہیں۔" ماہین نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"زیادتی اور بلاوجہ کی ٹینشن ہے خالہ۔ نکاح ہوا ہے کاکا جان کی موجودگی میں۔ کورٹ میرج تو نہیں ہوئی۔ اور اس
طرح کے ارادے سے حویلی سے چھوٹی حویلی گئی تھی۔ کاکا جان کو بھی تو وہی خاندان ہے۔ وہی خون ہے جو میرا اور پاپا کا
ہے۔ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ پاپا صرف ضد میں میری اور کاکا جان کی مخالفت کرتے ہیں
اور بلیں۔ یہ شخص اجنبی نہیں ہے۔ بہت بڑی زیادتی ہے۔ اگر وہ کم تر ہے تو اس کے برابر گاڑی میں۔ ڈائننگ میں
کیوں بیٹھتے ہیں۔ اسے بیڈ روم کیوں دیا ہوا ہے' نوکری کیوں نہیں دی اسے اعلیٰ تعلیم کیوں دلوائی جا رہی ہے؟"

وہ ہارش انداز میں تواتر سے بول رہی تھی۔

"ٹھیک ہے مگر نکاح تمہارے پاپا اور بابا صاحب کی رضامندی کے ساتھ بھی تو ہو سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تھوڑی محنت
کرنا پڑتی انہیں قائل کرنے کے لیے۔"

"نہیں ہو سکتا تھا قیامت تک۔ اس کا اندازہ کاکا جان کو بھی ہوگا تب ہی تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔ میرے اصل کارگزن
تو وہی ہیں جنہوں نے میری فیلنگ کو سمجھا اور بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ ایک پرو پر کام کیا۔ جرأت کی تاریکی میں نہیں
بلکہ قانون کی روشنی میں ہوا تھا۔ پاپا تو میرے قادر مطلق ہی نہیں ہوتے۔ وہ صرف قانونی کاغذات اور شناختی کارڈ میں میرے
ابا جان ہیں۔ وہ اتنی بے دردی سے فیصلے سناتے ہیں کہ لگتا ہے اپنی چھری سے ذبح کر رہے ہوں۔"

اس نے تیزی سے ماہین کی بات کاٹ کر بہت تلخ انداز میں کہا تھا۔

"باپ ہونے کے ناتے وہ بہت سے حقوق محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ کبھی تمہارا راز تو نہیں جانیں گے۔ پہلے ان کے سامنے یہ سب کچھ مشورے کے لیے پیش تو کیا جاتا۔ تب کہیں جا کر اس اقدام کا جواز بنتا تھا۔"

ماہین نے گھبراتے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"اگر ایسا ہوتا تو وہ محض ضد میں غیر آباد کے کسی مزارعے سے مجھے بیاہ دیتے۔ کاکا جان بھی تو نہیں جانتے ہیں آخر ان کے سگے بھائی ہیں۔ کاکا جان جیسے آدمی سے ان کی ناراضگی صرف یہی یقین دلاتی ہے کہ اس میں بھی قصور بابا کا ہوگا۔ انہی کی زیادتی ہوگی۔" اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

حیرت سے ماہین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنا تیز وجدان ہے اس کا۔ حقیقت کو کھوجے جانے بغیر اس نے کیسا نشانے پر تیر چلایا تھا۔

"روشی۔ جس طرح یہ سب ہوا ہے اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تم نے اگر یہ سب کر ہی لیا تھا تو کم از کم مجھے تو مطلع کر دیتیں۔ میں اپنے طور پر کچھ تو کرتی۔ مجھے پہلے ہی بہت کام پڑے ہوئے تھے۔ بہت گڑبڑ کر دی ہے تم نے جیت کر بھی ہار سکتی ہو۔ بابا صاحب اتنی آسانی سے شکست تسلیم نہیں کریں گے۔"

ماہین زچ ہو کر کہہ رہی تھی۔

"بابا اب کچھ نہیں کر سکتے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اگر وہ چاہیں تو یہ پوزیشن سنبھال سکتے ہیں۔" اس بار اس کے لہجے میں بہت سکون تھا۔

"وہ پوزیشن کیوں سنبھالیں گے۔ اب تو مزہ چکھانے کا موقع ملا ہے انہیں۔" ماہین نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں کلیئر کر دوں گی کہ اس تمام قصے میں آپ کی کوئی انوالومنٹ نہیں ہے۔ وہ آپ کو ذرا بھی پریشان نہ کریں۔" اس نے ماہین کی تھوڑی چھو کر کہا۔

"تم کہو گی اور جیسے وہ یقین کر لیں گے۔ حیرت ہے تم انہیں نہیں سمجھ پائیں ابھی تک۔" وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"وہ تو خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اب معاملہ بابا صاحب کے سامنے پیش ہوگا۔ اور تمام تفصیلات سامنے آئیں گی۔" روشی نے اطمینان سے کہا تھا۔

"یہ تو خیر جانتے ہوں گے وہ کہ میں اس معاملے میں شریک نہیں تھی۔ مگر یہ خیال ان کے دل سے کیسے نکالا جائے گا کہ نکاح کے بعد تم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اور میں نے خاموش رہ کر تمہیں سپورٹ کیا ہے۔ ناراضگی کا سبب تو بنے گا ناں۔" ماہین نے جیسے تنگ آ کر کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ بلکہ اب آپ نے مجھے سپورٹ کرنا ہے۔ بابا جو چاہ رہے ہیں۔ وہ میں نہیں کروں گی۔" اس نے قطعی انداز میں جواب دیا تھا۔

"مگر بابا پر برا اثر ہو سکتا ہے۔" ماہین بیڈ سے اترتے ہوئے بولی۔

"وہ ایسا نہیں کریں گے۔ اگر وہ ایسا کرنے کی نیت ظاہر کریں گے تو میں خود ہمیشہ کے لیے اس سے الگ ہو جاؤں گی۔

کیونکہ یہ ہماری نہیں ہوگا جس کے لیے میں نے اتنا بڑا اقدام اٹھایا تھا۔ اس کی محبت، قدر اور کردار کی عظمت جیت جائے گی۔ محبت ہے جس کی خاطر اتنا بھی سہا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اس طرح کا ثابت نہیں ہوتا تو پھر اس میں اسے لوٹنے والے ہی ذرا کروا جاتا ہے۔ پھر میں اپنی غلطی تسلیم کروں گی اور سب سے معافی مانگ لوں گی۔ وہ ساری زندگی ضد اختیار کے پچھتاوے کے ساتھ گزاروں گی۔"

اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ ماہین اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کسی کے بہت ہونے کا یقین نہ ہو تو اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے۔ مگر کیا کریں۔ تمہارے پیار تو ہر طرح سے جیت کے نظر آ رہے ہیں مگر یہاں پر شادی خطرے سے دوچار ہے۔ اب یہ قسمت ہی تو ہے۔ بہر حال ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بس تو اس سے کس حد تک تم دونوں کو بچانا ہے۔ اب تو ہر مرحلے پر تمہارے کاکا جان کی انوالومنٹ ضروری ہو گئی ہے۔ پھر بابا کو بھی تو لانا ہے کہ وہ کس حد تک جرأت مند ہے۔ تم فکر کرو میں بھی ایسی کراسس میں ہوں۔" وہ سوچنے کے انداز میں ہم کلام تھی۔

وہ خواب گاہ میں داخل ہوئی تو تیمور علی خان کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گھڑی باندھتے ہوئے پایا۔

وہ آف وائٹ شلوار سوٹ میں ملبوس بہت نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔

"ارے... آپ تو کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا کہ صبح کو بڑی حویلی میں پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات بتائیں گے۔" نازنین نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔

"بتائیں گے۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے جا رہے ہیں۔ پولیس اسٹیشن تک۔" انہوں نے ٹائی درست کرتے ہوئے مختصر انداز میں کہا۔

"اب مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔ آپ مجھے ابھی بتائیے۔ آپ کو کیا پتا کہ صبح کے انتظار میں رات کیسے کٹی ہے۔"

وہ ان کی پشت کی طرف جا کھڑی ہوئی اور انہیں آئینے میں دیکھتے ہوئے مخاطب تھی۔

"روشی آپ کو کیسی محسوس ہوئی۔ خوش یا اداس؟" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"بظاہر تو خوش ہی ہوگی۔ ماہین کی موجودگی میں وہ خوش ہی نظر آتی ہے۔"

"ہاں... ماہین کے متعلق آپ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ کاش مجھے اندازہ ہوتا کہ یہ سب بھی ممکن ہو سکتا ہے تو تم رات ہی جانے کے لیے بڑی حویلی میں پہنچ جاتی دوبارہ زندہ ہو کر۔ میرے تو... وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ اتنی ذہین ہونے کے باوجود اس پتھر کے ساتھ شادی کرنا پسند کرے گی۔ یہی خیال تھا جب سے مل کر چلی جائے گی اور پھر اپنی رنگوں بھری زندگی میں واپس پلٹ جائے گی۔"

"نہیں ایک بات ضروری نہیں کہ قسمت بھی ایک ہو۔ اس کا بھی اتنا قصور نہیں جتنا قصور بابا صاحب بھائی میاں اور بھابی بیگم... ان سب کو حوالات کرنا چاہیے تھی۔ کیا ہمیشہ اس شخص کے ہی دل کی ہوگی۔ اور صرف اسی شخص کے ہاتھوں لوگ

بربادہوتے رہیں گے۔" اس کی آواز ڈولتے ہوئے بکھرنے لگی۔

تیمور علی خان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب ان سب باتوں کا فائدہ۔ نئی بات تو یہ ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"م۔ مجھ سے۔؟" وہ مارے حیرت کے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"آپ سب کچھ تو تباہ کر چکے ہیں اب۔ یہ آپ نے کیا کیا؟ ساری ریاستیں ہی مٹی میں ملا دیں۔ یہی سب کچھ کرنا تھا تو سب کیوں کیا تھا؟ تھک گئے یا انتقام کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا؟ اب تو وہ جوان ہیں۔ اب تو انہیں ماں کی نہیں لائف پارٹنر کی ضرورت تھی۔ مگر تیمور علی خان میں تماشا نہیں بنوں گی۔ یوں بھی زندگی مجھ سے ناراض ہو رہی ہے۔ بہت مایوسی ہوگی سب کو۔ یہ آپ نے کیا کر دیا۔؟"

وہ نڈھال سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔

تیمور علی خان نے دوسری کرسی کھینچ کر اس کے مقابل کی اور بیٹھ گئے۔ ان کی سیاہ جادو اثر آنکھیں نازنین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"یا تو کسی کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرتے اور جب دعویٰ کر لیتے ہیں تو گنجائش رکھ کر بات کرتے ہیں۔ ہم بھلا ان سے اتنے قریب کس حساب میں ہوں گے؟ اور کیوں اپنی الجھی ہوئی زندگی میں مزید پریشانیاں مول لیں گے۔"

وہ اپنی بھاری اور جذب ہونے والی آواز میں اس سے دھیرے دھیرے مخاطب تھے۔ نازنین نے الجھ کر ان کی سمت دیکھا۔

"آپ ہی کی طرح ہمیں بھی یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ ان کے سامنے حقائق سے پردہ کس نے اٹھایا ہے؟ کسی پرانے ملازم کی تو یہ جرأت نہیں ہو سکتی؟ حویلی کے ذمہ دار افراد یہ حرکت نہیں کر سکتے۔" وہ سوچتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

نازنین کو ذرا سا ہی اضطراب آ گیا تھا۔

"آئی ایم سوری تیمور علی خان!۔۔۔ پھر کس نے کی یہ حرکت؟ اگر "وہ" زندہ ہوتی تو میں سمجھتی یہ نیا شر وفساد پھر اس کی طرف سے آیا ہے کہ اس کا خمیر ہی شر سے اٹھا تھا۔" اس کی رگ رگ میں آگ اترنے لگی۔

تیمور علی خان چونک پڑے۔ (مائی گڈنیس۔ سے بی پاسیبل)

ظاہر ہے یاور علی خان تو یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ اس سارے واقعے میں سب سے زیادہ قصور وار وہی تھے۔ وہ اپنا پہلو کس طرح ماہین کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟ اس میں تو سراسر نقصان ان کا ہوتا نظر آتا ہے (ویک پوائنٹ) انہوں نے گہری سی ایک نگاہ نازنین کے چہرے پر ڈالی۔ ایک الجھن سے بیٹھے بیٹھے نجات مل گئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ زنجیر چھنکاتی رات کے اندھیرے میں پھر باہر آ گئی ہو تازہ ہوا میں سانس لینے اور ماہین اتفاق سے اسے مل بیٹھی ہو۔

"اچھا! آپ اسے ایک طرف ہٹائیں اور ہماری بات غور سے سنیں۔" انہوں نے سمجھانے کے انداز میں مخاطب کیا۔

"آپ کی بات ہم بخوبی طور سے سمجھتے ہیں۔ مگر آپ ان سے ملنے کے لیے نہیں کہیں کہ اس بات اس کی آواز سے جو اپنے بچپن کی ڈور میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ مجھے نہیں پتہ کہاں ہیں۔ تیمور صرف سترہ سال کی عمر میں آپ کی حویلی میں آ گئی تھی۔ وہاں آپ سے بیاہ کر۔ آپ سترہ میں رہتا تھا۔ پہلے ملک کے اندر پھر ملک سے باہر۔ میں مری کو نونٹ میں اس سے [illegible] پھر شادی ہوئی اور جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ زندگی کی اوجھ آپ سے زندگی تو میں نے اپنی کر کے آپ کو داخلے بیچ دیا لیز کے پاس۔ کر میں نے تو صرف اس شخص کو اذیت پہنچانے کے لیے آپ سے اس کی خوشی چھین لی تھی۔ یاد ہے کہ اذیت مجھ پر دوہری پڑ گئی۔ ادھر کوئی فرق نہیں پڑا۔ بلکہ اس شخص نے تو مجھ سے انداز میں سے مرے سے انتقام لیا۔

پھر لیزا کی نادانی کے سبب آپ مرے بعد پلٹ کر آئے۔ صوفی گود میں آئی تو زندگی کی جھلک کی خوشی کی امید جاگی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

تیمور علی خان سر جھکائے سن رہے تھے۔

"آپ نے ہمیشہ اپنے فیصلے کو درست سمجھا ہے جو سوچا وہی کیا ہے مگر اب آپ کو ہماری بات ماننا ہوگی۔ کیا اب بھی تھوڑی سی گنجائش نہیں بنتا آپ پر۔" تیمور علی کا انداز دو ٹوک تھا۔

"آپ ان سے مل لیں۔ مسائل شیئر کرنے کے لیے نہیں صرف اس لیے کہ وہ آپ کی حقیقی بہن ہیں وہ محرم راز ہوں گی ہی۔ تو کیا فرق پڑتا ہے۔ شاید ہی کسی نے خود سے اس قدر شدید انتقام لیا ہو۔ ہماری پارٹنرشپ میں تو آپ کے جذبات سرد ہو رہے ہوں گے۔ تھوڑی سی حرارت اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے آپ ان سے مل لیں۔ پلیز۔"

"مجھے فرض کریں میں کر بھی لی ملاقات پھر اس کے بعد بلاوجہ کا ٹینشن جو دوسروں کو ہوگا۔ سب سے زیادہ تو پھر خود ماہین کے ساتھ ہو سکتی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے۔ وہ شخص بہت مہارت کے ساتھ اسے بے وقوف بنا رہا ہو اور وہ ان کے ساتھ خوش گمانیاں ہوں۔"

"نہیں ہیں وہ خوش۔ وہ بس آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ بہن کی حیثیت سے۔ آپ کے اندر اس طرح کی خواہش نہیں ابھرتی؟ حیرت ہے۔"

تیمور علی خان نے قدرے تاسف سے کہا اور اٹھ کر بالوں میں برش چلانے لگے۔

"آپ کے اندر ابھرتی ہے؟" نازنین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

"ہمارے اور آپ کے کیس میں بہت فرق ہے۔" "اس لیے ہماری آپ کی فیلنگ یکساں نہیں ہو سکتیں ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ انہوں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ اور ہم آپ کو کونس اس لیے کر رہے ہیں کہ اگر آپ ان سے ملنا بھی نہیں چاہیں گی تو وہ تب بھی آپ سے ملیں گی۔ وہ صرف ہمارے جواب کا انتظار کر رہی ہیں اگر انہیں ہمارا جواب ملنے میں تاخیر ہوئی تو وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گی۔"

"اسے سمجھا لیا ہوتا۔ مردوں پر تو فاتحہ پڑھتے ہیں ان سے ملنے پر اصرار نہیں کرتے۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب

گئی۔

"میری بیٹی باہر باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اور میں اسے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑا میں ...... حبلہ کے ان راستوں سے گزر آئی ہوں جن کے پیش آنے کے خوف سے لوگ اقدام خودکشی کرنے کا سوچنے لگتے ہیں۔ مجھے خود پر جبر کرنے میں مہارت ہوگئی ہے۔ آپ یہ سب ماہین کو سمجھا دیجیے' کیونکہ وہ صرف ملاقات کرنے نہیں آئے گی۔ بلکہ بہت سی تبدیلیوں کے منصوبے ساتھ لائے گی۔ ابھی اس نے دنیا آنکھیں کھول کر دیکھی نہیں ہے اس لیے اسے بڑی خوش گمانیاں ہوں گی۔ اسے کہیے وہ اپنی زندگی جیا ہے۔ جو فیصلہ کر کے حویلی میں داخل ہوئی ہے اس فیصلے کی آبرو سنبھالے۔ روشی کا خیال رکھے اور بس۔ اور یہ کہ اس کا باپ اس کی خوشیوں میں حائل ہو تو اسے اس کے حق میں قائل کرے وہ کم عمر جانتا ہے تھوڑی سی کوشش سے اپنی بات منوا سکتی ہے سن رہے ہیں ناں آپ۔ اسے ماہین کو رہنے دیجیے کہ یوں بھی ہم تو اب کے گزر گئے ہیں۔"

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"انسان اپنے گھر میں پالتو جانور رکھتا ہے تو ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ بیمار ہوتے ہیں تو ان کا علاج کرتا ہے۔ ان سے انسیت محسوس کرتا ہے' ایک حسین خاتون جو ہمارے گھر میں عرصے سے ہے' وہ جس رشتے میں بندھ کر بڑی حویلی میں آئی تھی وہ رشتہ تو ہمارے اور اس کے درمیان گنتی کے چند سالوں پر کنسسٹ کرتا ہے۔ اور جو دوسرا رشتہ ہے وہ تو بڑی طویل رفاقت کا سلسلہ ہے۔ اصل رفاقت تو مینٹل لیول پر ہوتی ہے۔ اس میں ڈسٹینس ڈسکس نہیں ہوتا۔ ہم اپنے نقصان بھول کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کیوں بار بار یاد دلاتی ہیں۔ اللہ سے رحم مانگتے رہتے ہیں۔ کیا آپ سے بھی اس قسم کی ریکویسٹ کیا کریں۔ فار گاڈ سیک۔"

گزرے ہوئے بیس سالوں میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے نام لے کر خطاب نہیں کیا تھا۔ اس طرح سے ہمکلام ہوتے تھے۔ کہ نام استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"ڈرائیور بہت دیر سے ہمارا ویٹ کر رہا ہے۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آتے ہیں۔ پھر آرام سے بات کریں گے۔ او کے۔" وہ ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

"اچھا۔ تو باقاعدہ مالی بھی بن گئے ہو۔ ماشاءاللہ۔"

وہ جھوری کی آواز پر بُری طرح چونک پڑا تھا۔ اور مُڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

"پودوں اور درختوں سے دوستی رکھنا چاہیے۔ قدردان ہوتے ہیں۔ اچھا سلوک کرنے پر دعا دیتے ہیں۔"

"یعنی تمہیں تو گھوڑے بھی بہت دعائیں دیتے ہوں گے۔ تمہیں دعاؤں کی بھلا کیا کمی۔" وہ کھلکھلائی۔

"آپ صبح صبح تشریف لے آئیں' اس کا مطلب ہے۔ منہ اندھیرے گاڑی میں بیٹھی ہوں گی۔ بڑی جلدی واپسی ہوگئی؟" ہاری نے پائپ سنبھالتے ہوئے پوزیشن بدلی۔

"حویلیوں میں رہنے کی عادت ہو جائے تو چھوٹے گھروں میں دل نہیں لگتا' اور ہمیں تو بڑے اصرار اور منت سے حویلی

والوں نے قبول کیا ہے۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اس میں کیا شک ہے۔" ہاری بھی مسکرا دیا۔

"اور سنا ہے صاحب۔ سنا ہے کل بڑی خوشی کی تقریب ہوئی۔ یہ تو یہاں آ کر معلوم ہوا۔ تم۔ ویسے بھی یہاں خوشیاں کہاں آتی ہیں۔ حویلی والوں کا تو اتنا بھی ہوا ہوگا۔ وہ تو ہمیں ماہین بی بی کی شرم سے پہلے ہی آ گئے تھے۔"

ہاری نے اُچٹ کر اس کی سمت دیکھا۔

"خیر چھوڑو۔ یہ تو ویسی گزر رہی ہے آپ کی روشی بی بی کے کیا حال ہیں؟" وہ پھر کچھ کہنے کے انداز میں مسکرایا۔

"صرف روشی بی بی کے؟" وہ بھی انجان بن کر مسکرا دیا۔

"ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے بھائی۔ ہمارا حال تو مجھے انداز لگ کر پوچھا ہوتا۔"

روشی کی آواز بہت قریب سے سنائی دی۔ دونوں چونک پڑے۔ اس نے اوپر بالکنی سے دونوں کو باتیں کرتے دیکھا تو بے اختیار نیچے چلی آئی تھی۔

ہاری نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ سلیقے کے کپڑے ستا ہوا چہرہ جو اس کی شب بیداری کی چغلی کھا رہا تھا۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆

"چلو تم ہی سے پوچھ لیتے ہیں تمہارا دل۔ سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔ شکر ہے حویلی میں بھی خوشگوار تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ لگتا ہے تمہاری روانگی بھی شروع ہونے والی ہے۔ وہ اپنی اماں کے اکلوتے نعیم صاحب۔ کیا خبر ہے وہاں کی؟"

اس نے گہری نگاہ روشی کے چہرے پر دوڑائی۔ باری پائپ گھسیٹتا دور چلا گیا۔

"لگتا ہے باری کو یہ موضوع پسند نہیں۔ حصہ لینے کا ارادہ نہیں۔" جھومر پھر کھلکھلائی تھی۔ "بے چارہ باری اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ تم نے وہ بیل تو دیکھا ہی ہوگا۔ جس کی آنکھوں پر چمڑے کے "ڈھکن" لگے ہوتے ہیں؟" جھومر کا انداز بے باک اور جارحانہ تھا۔

"مگر یہ باری ہے بیل نہیں ہے۔" روشی نے تنک کر جواب دیا۔

"مگر مجھے تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔" جھومر نے ہنس کر حد درجہ دور ہوتے ہوئے باری کو دیکھا۔

روشی کا چہرہ جذب سے تپنے لگا۔ جھومر کی حسین صورت سے اسے وحشت ہونے لگی۔

"اس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے بھابی! جو آپ اتنی انسلٹ کر رہی ہیں؟" وہ کچھ بے ساختہ ہو گئی۔

"ہائے یہ تو وہی ہیں کہ بگاڑیں تو لگے سنور جائیں۔" جھومر نے ایک آہ سرد کھینچی۔ روشی کا ضبط جواب دینے لگا۔

"یہ تو بہت ہی گری ہوئی بات ہے بھابی۔ آپ کو اپنے مقام کا تو خیال کرنا چاہیے۔"

"پاگل۔ بڑا اونچا مقام ہے میرا حویلی میں۔ جھومر والے ایک بڑے شوروم میں۔ بہت سارے تھے ایک میں بھی انہی میں سے ایک میں۔ تم لوگ مقام ہونے کا مقام اپنے میں ڈھونڈو گی۔ مگر مجھے تو کچھ حاصل کرنا ہے۔ ایسے ہی تو کوئی نہیں رہتی۔ اپنے بیٹے کی خوشی اسی حویلی میں رہ کر دیکھوں گی۔ پھر وہاں کوئی تو ہوگا۔ مجھے تو باری پر حیرت ہے۔ عجب جوان کا بچہ ہے کہ کچھ کو قابل رہا ہے۔ جوانی لٹانے لگا ہے۔ جھومر کا پتا جائے۔ جانے۔ تیری کی ملاقات سے کوئی تو فائدہ اٹھائے۔" جھومر ہنسی سے بولی۔

"آپ رہنے دیجیے اس سے مشورہ۔" روشی کی رگ رگ میں غصہ بھر رہا تھا۔

اسی دم مہر سوتی ان کی سمت چلی آئی۔

"بس ان ہوں بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔" وہ جھومر سے مخاطب ہوئی۔

"بیچ مجھری چلی ہوں گی بڑی بی۔ مگر مجھے سب پر ترس آتا ہے۔ ڈر نہیں لگتا۔" وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

روشی تیز تیز چلتی باری کے قریب پہنچی۔

"تم اندر نہیں جا سکتے تھے۔ تم پانی نہیں دو گے پودوں کو تو انہیں پانی نہیں ملے گا؟ کیوں اتنا پیچھا کرتے ہو کر حویلی تمہارے کندھوں پر کھڑی ہے؟" وہ بری طرح برس پڑی۔

"کس حساب میں آپ میرے کان اینٹھ رہی ہیں۔ ابھی میرا اور آپ کا تعلق مشتاقانہ ہے۔ مجھ سے پرہیز کریں۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نگاہ بدستور پودوں پر تھی۔

"وہ تو شروع ہی سے مشتاقانہ ہے۔ نئی بات کیا ہے؟" وہ جل کر بولی۔

"کم از کم ایک بات پر تو اتفاق ہوا ہمارا۔ سرائے میں چار گواہ موجود ہیں۔" وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

روشی ایک لمحے کو لاجواب سی ہو کر چپ ہو گئی۔

"خدارا آپ اندر جائیے۔ کسی کی نگاہ پڑ گئی تو آج ہی ثبوت داخل کر دیں گے یا ہر خاص۔ اور آپ سے بڑی آسانی سے اقرار کروا لیں گے عدالت میں کہ یہ نکاح جبری ہے۔"

"ہونہہ کہلوا ہی نہ لیں کہیں۔" وہ ناک سکوڑ کر نخوت بھرے انداز میں بولی۔

"اور جو کہلوا لیا؟" وہ مسکرا رہا تھا۔

"نہ وہ کہوں گی جو وہ کہلوائیں گے اور نہ وہ کہوں گی جو تم کہو گے۔"

"مگر اس طرح کے کیس میں تیسرا راستہ تو ہے ہی نہیں۔" وہ در حقیقت حیران ہوا۔

"پتا ہے۔ مگر میں تمہیں کیوں بتلاؤں۔ تاکہ وکیل صاحب پہلے سے تیاری کر لیں؟"

"ابھی وکیل صاحب کہاں۔ ایڈووکیٹ اپنے نام کے ساتھ اس دن لگائیں گے جب حویلی والوں سے آپ کو جیتیں گے۔ ورنہ تو ڈگری اور پریکٹس لائسنس دونوں کو آگ لگا دیں گے۔"

اس نے پائپ ایک کیاری میں چھوڑ دیا اور اس کی سمت دیکھ کر بہت دل آویز انداز میں مسکرایا جو کسمسی کھڑی تھی جیسے

اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

"جو کسی کی جستجو میں ہوتے ہیں ان کے سکون میں بھی بے قراری ہوتی ہے۔ جو کہہ دے وہ محسوس نہیں ہوتے۔ کچھ تو محسوس تو ہو۔ میں تو آج تک جو محسوس کرتی رہی ہوں وہی اب تک میں سچ بھی نکلا ہے۔ حتیٰ میں سمجھتی تھی کہ میں خواہ مخواہ سے بدگمان رہی ہوں۔ ان کے بارے میں میرے احساسات غلط ہیں وہ سخت دل نہیں ہیں شاید مجھے لگتے ہیں مگر یہ ثابت ہو رہا ہے کہ وہ وہی ہیں جو میں محسوس کرتی تھی۔"

"ذہن پر بہت زیادہ دباؤ ہو تو انسان وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی Will ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاں شک کی پختگی وہی ہوتی ہے جو منفی ذہن رکھنے والے پُرسکون انسان کے "یقین" کی ہوتی ہے اس طرح کے ذہنی امراض میں مبتلا ہونے والے بعض اوقات اتنے آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتے ہیں کہ پیغمبری کے دعوے کر بیٹھتے ہیں۔ اپنے خیالات، احساسات پر حقیقت کو Base مت کیجئے نفسیاتی مریضہ بن جائیں گی۔"

ہاری نے اس کی بات کاٹ کر سمجھانے کے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"جو پیش آئے اسے فیس کیجئے۔ افلاطون بننے کی کوشش میں مت بھی ماری جاتی ہے بندے کی۔" اس نے مزید کہا۔

"تمہیں تو تسلی دینا بھی نہیں آتی۔" اس کے مشتعل انداز پر اسے رونا آ گیا۔ اسے اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنی پریشان ہے۔

"ہم تسلیوں پر نہیں رکھتے۔" اس کا لہجہ سخت تیز تھا۔ روشی کو نہ جانے کیوں اس کے لہجے پر چوٹ کرنا آ گئی۔

وہ آگے بڑھ گیا تھا مگر اس کے اپنے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

دل کی دھڑکن بھی غیر معمولی طور پر تیز ہو چکی تھی۔ پتا نہیں کس کے لیے رکھتا ہے سخت سخت کراتی دھڑک رہی تھی۔ وہ بھی ادھر سے ادھر سے قدم بڑھ جانے لگی۔ معاً وہ اپنے دھیان سے چونک پڑی ماہین سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

"یہ دلیری نہیں حماقت ہے۔ ایسی کون سی ایمرجنسی تھی کہ بیچوں بیچ کھڑی ہو کر اس سے باتیں کرنے لگیں۔ اس طرح کی حماقتیں کرو گی تو بنتی بات بھی بگڑ جائے گی۔ اسے تمہاری سرکشی سمجھ کر اب بڑے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیں گے۔ ایک حساب سے یاور صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اس طرح کے فیصلہ کن اقدام کرنے کی عمر نہیں تھی تمہاری۔" ماہین سخت ناراض نظر آ رہی تھی۔

"وہ جھومر بھابی اس سے باتیں کر رہی تھیں مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں بھی اس طرف آ گئی۔"

اسے یہی جواب سوجھا۔ نظریں جھکا کر شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔

"جھومر اس سے بات کر رہی تھی تو کیا ہوا۔ وہ بھی میری طرح حویلی کی بہو ہے۔ کسی سے بھی بات کر سکتی ہے۔ تمہیں کیا فرق پڑتا ہے اس کی بات چیت سے؟" ماہین نے ناراضگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"آپ لوگ سمجھتے ہیں انہیں بہو۔ وہ نہیں مانتیں خود کو یہاں کی بہو۔" وہ زچ ہو کر کہہ رہی تھی۔

"تمہیں کوئی ضرورت نہیں اس معاملے میں الجھنے کی۔ تم صرف اپنی فکر کرو۔ اور مزید الجھنیں نہیں پھیلاؤ۔ اب کیا تم اس کو پابند کرو گی کہ وہ تمہارے علاوہ کسی سے بات بھی نہ کرے۔ حد ہو گئی۔ پہلے اعتبار کا رشتہ پھر نکاح کا رشتہ۔ بھاگا جا رہا ہے کہیں۔ یاور صاحب مجھ سے کہیں زیادہ کوالیفائیڈ اور خوبصورت خواتین سے صبح سے شام تک ملتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب

ہے کہ میں ان کے پیچھے سراغ رساں چھوڑ دوں۔ مرد ہزاروں عورتوں سے ملتے ہیں ہزاروں سے شناسائی کرتے ہیں وہ نا ہی گزر ہے کہ بھائی سے "ملیک سلیک" شروع کرے گا اور تو دیکھ کہ جب خالہ جان نے تمہارا ہاتھ اٹھایا ہے۔ تو ہیم کی بھی بہت اہمیت ہے۔ روشی اس وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمہارے پاپا کی رگ رگ میں خان کے خلاف زہر بھرا ہے۔ ہوش کے ناخن لو۔" ماہین بہت سنجیدہ تھی۔

"مجھے پتا ہے خالہ اگر آپ کو بھی پتا ہو جاتا ہے۔ اب وہ ہرگز نہیں رکیں گے بابا صاحب سمجھاتے رہیں گے نقصان کے بعد۔ میں خطرے کی بات سے خوف نہیں آتا۔ میں اور بے کا حوصلہ ختم ہو گیا ہو گا سے پہلے کسی ایک بار اچھا ضرور دوں گی۔ آپ پریکٹیکل نہیں کر سکتی ہیں۔"

روشی کے لہجے میں اور دور تک کسی مصلحت کا نام و نشان نہیں تھا۔

"خاک ہے تمہاری ترانی جیت ایک دم کم تم سمجھ نہیں سکو گی۔" ماہین جھلا پڑی۔ "میں میدان میں کھڑی تم ترانی جیت کا تمہیں بلکہ حماقت جیت کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ خود سے دشمنی کر رہی ہو مجھے پتا نہیں۔ مجھے پورے جگل سے کام کرنے دو۔ چاہو اندازہ پُرسکون رہو۔ اور سنو جب تک کام مکمل نہ ہو جائے اس سے ملنے اور بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

ماہین کا انداز حتمی تھا۔ روشی چند لمحے کھڑی سوچتی رہی پھر اندر کی سمت بڑھ گئی۔

ماہین بھی کچھ دیر کسی دھیان میں رہی پھر جیسے کوئی فیصلہ کر کے اندر کی سمت بڑھی۔ سامنے ہی نظر ہاری پر پڑی تو نظر آ گئی۔

"سنو!" اس نے آواز دی۔

"جی چھوٹی دلہن!" وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

"دیکھو۔ ہاری کو فوراً میرے کمرے میں بھیج دو اور اسے کہنا یاور خان باہر گئے ہوئے ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔ اور خواب گاہ میں داخل ہو کر دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد ہی دروازہ بجا تھا۔

"ہاں۔ آ جاؤ۔" وہ عجیب تھکے تھکے انداز میں کہہ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہاری قدرے مؤدبانہ انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

"آؤ۔ وہاں بیٹھو۔" ماہین مبہم سے انداز میں مسکرائی۔

ہاری اس طرز کلام پر قدرے ٹھٹکا تھا۔ اور سر جھکا کر اس سے خاصے فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

"خیریت؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے ماہین کی سمت دیکھا۔

"اپنی شامت کو خود آواز دے رہے ہو بھلا خیریت کیسے ہو؟" ماہین کے لہجے میں ناراضگی واضح تھی۔

ہاری الجھ سا گیا مگر کچھ بولا نہیں۔

"دیکھو سب کچھ منظر عام پر آ چکا ہے۔ تیمور علی خان اور میں بہت سمجھانے کی کوشش شروع کر چکے ہیں مگر تم لوگوں کی اداؤں میں خلاف کر دیں گی۔ کیا ضرورت تھی اسے لے کر باغ میں کھڑے ہونے کی۔ تم تو اس کے مقابلے میں بہت سمجھ دار

او۔ سر پیٹنے کو دل چاہ رہا ہے میرا۔" ماہین نے بدستور رازدارانہ انداز میں کہا۔

"مجھے واقعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو وہ تمہیں بتا رہا تھا۔ پہلے بھابی آ گئیں پھر "محترمہ""

باری کے ساری بات سمجھ میں آئی تو اس نے سکون کا گہرا سانس لے کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو ہماری اصورت حال تم پر واضح ہے کتنی نازک پوزیشن ہے۔ معمولی سی غلطی بہت سارے لوگوں پر برے انداز ہو سکتی ہے اور ایسے بگاڑ بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو کبھی ٹھیک نہ ہوں خدانخواستہ۔" ماہین فکرمند انداز میں گویا ہوئی۔

"آپ فکرمند نہ ہوں۔ میری جانب سے آپ بے فکر رہیں۔ بس محترمہ کو تھوڑا ہینڈل کر لیجیے۔ باقی خیر ہے۔ مجھے اجازت آیا کوئی اور بات باقی ہے ابھی؟" وہ اٹھتے ہوئے ماہین سے مخاطب ہوا۔

"نہیں۔ بس یہی فکر تھی کہ کیا کرنے والے ہو تم لوگ۔ اور "محترمہ" سے تو خیر میں نپٹ لوں گی۔ مگر ایک بات تو بتاؤ محترمہ کی کون سی خوبی ہے جس نے سماج سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ تم جیسا گھرا اور کچھ بدھو صرف شکل و صورت کی بنا پر تو اس طرح آگ میں نہیں کود سکتا۔" ماہین بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کئی بار یہ سوال میں نے اپنے آپ سے بھی کیا ہے۔" وہ بھی شرارت بھرے لہجے میں جواب دہ ہوا۔

"ان کے پاس چاہنے کی ایک پاور ہے شاید۔ یہ جس سمت بھی رخ کرے گی غالب ہو جائے گی۔ وہ ہر کام بہت توجہ سے کرتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہتے کہتے یکدم ہنس پڑا۔

"کام؟" ماہین بھی بے ساختہ مسکرا دی۔

"چاہنا تو یہاں الزام ہے جو تم اس پر لگا رہے ہو۔ تمہیں احساس ہے؟" ماہین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"وہ یہ الزام مجھ پر لگا کر حساب برابر کر سکتی ہیں؟" اس نے پھر مسکرا کر جواب دیا۔ اب وہ بہت سوبر سے انداز میں سنجیدہ کھڑا تھا۔

"اچھا؟ بہت ذہین ہو۔ مانتے ہیں۔ کیا قیامت ہے اور کس قیامت کا سکون ہے تم میں۔ کامیابی سے پہلے اس ارادہ بجائے خود ایک خوشی و سکون ہے۔ مجھے حیرت ہے یار علی خان جیسا سنجیدہ اور بہت گہرائی میں سوچنے والا شخص جو تمہیں بہت پسند کرتا رہا ہے۔ اس نے رشتے پر ساری دنیا سے جنگ کرنے کے در پے ہیں۔ شاید روشنی کا یہ خود مختارانہ انداز ان کے لیے چیلنج بنا ہے۔ ہاں۔ یہی بات ہو سکتی ہے۔"

اس نے خود ہی اپنے خیال کی تائید کی۔ "بات ہے بھی غلط۔ ابھی مارجن تھا اتنی جلدی یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔" بہرحال وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

"یہ بات نہیں ہے۔ مارجن نہیں تھا ورنہ کم از کم میں ان کے اس انتہائی قدم میں ان کا ساتھ نہ دیتا۔ اور یہ بات آپ بھی بہت اچھی طرح جانتی ہیں کہ بابا خان مجھے سونے کا تاج تو پہنا سکتے ہیں بحیثیت داماد مجھے قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ میں تیمور خان کے بیسٹ فرینڈ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ان کے حساب سے تو تیمور خان ہی کی اولاد ہوں۔ کیونکہ میرا باپ انہیں بہت عزیز تھا۔"

آپ ماہین ان کر ہم سے سوال نہ کیا کریں مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں جان رہا ہوں آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔"

ماہین تب سے دیکھ رہی تھی۔ اتنی صاف گوئی کی توقع اسے نہیں تھی۔ باری نے چہرہ اس کے سامنے سے ہٹا لیا پھر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"ممی وہ جو بڑی کیوٹ سی لڑکی بڑی حویلی سے آئی تھی۔ وہ بات ہریم؟" وہ ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔

نازمین نے چونک کر مصطفیٰ کی شکل دیکھی۔ دل تو کیسے کی طرح لرزنے لگا۔

پتا نہیں اسے کیا دھیان آیا؟ وہ خاموشی سے مصطفیٰ کے ہاتھوں میں برش چلاتی رہی۔

"تاکہ ہیں تھی۔ پہلی آئی ہوگی ہریم"

"روشانے۔ ہائی اورنگ۔" نازمین اس طرح گویا ہوئی جیسے کسی مجرم سے مخاطب کر رہی ہو۔

"نام۔ اورنگ۔ آپ نے کہا۔ ہمیں پارو شانے کو؟" مصطفیٰ نے گھوم کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"تو کیا بات۔ بڑی ہے وہ تم سے۔ باجی کہہ سکتی ہو۔ آپی کہہ سکتی ہو۔" نازمین نے گم سم سے انداز میں سمجھایا۔

"آئی ایم سوری۔ وہ دوبارہ بھی آئیں گی؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔ (میری خیر سے رشتے داری میں؟)" اس نے فوراً حقائق کی ادھوری سوال کیا جو تمام پوچھنے کا محرک تھا اور درمیان میں گم۔۔۔ ہو گیا تھا۔

"نہیں۔"

"وہ تو بہت اچھی بہت نائس ہیں پھر آپ نے پاپا نے ہمیں ان سے ملنے سے کیوں روکا؟ وہ تو بہت ویل مینرڈ ہیں۔ بیوٹیفل۔ بہت تمیز والی ہیں۔ باری بھائی نے بھی پاپا کے ساتھ ملنے سے منع کیا تھا اور خود وہ باہر ان کے کمرے میں گئے تھے۔ ہم نے اوپر کھڑکی سے خود دیکھا تھا۔"

"کیوں یاد رکھے ہوئے ہو۔ اتنی پرانی بات؟ کتنے مہینے ہو گئے۔ جب کہ پاپا کی بات سے منع کرتے ہیں تو سچ والے وہ بات کر کے انہیں پزل نہیں کرتے۔" نازمین نے جھنجلاتے ہوئے انداز میں اسے سرزنش کی تھی۔

"جب ہم نے بھی ان سے بات نہیں کی اور آپ نے بھی تو پھر وہ ہمارے گھر کیوں آئی تھیں؟ کیا ان کے بھی پاپا نہیں ہیں؟" مصطفیٰ پر نازمین کی تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

نازمین خاموشی سے ضبط کی منزلیں طے کرنے لگی۔

"کیوں پریشان کرتے ہو بیٹا ماں کو۔ آل ریڈی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" تیمور علی خان تولیے سے سر رگڑتے ہوئے باتھ روم سے برآمد ہوئے تھے۔

نازمین نے چھلکتے آنسو مصطفیٰ کی نظر بچا کر صاف کیے۔

"کیوں؟ کوئی پاپا کے علاوہ ٹھیک نہیں ہونا چاہیے؟" انہوں نے ایک اچٹتی نگاہ نازمین پر ڈالی۔

"پاپا کیا وہ باری بھائی کی کزن ہیں؟" بچی بس ایک دھن میں آ گئی تھی۔

نازنین نے اسے بازو سے اپنی طرف موڑا اور چٹاخ چٹاخ چہرے پر دو تھپڑ اس کے پھول سے رخساروں پر جڑ دیے۔

تیسرے تھپڑ کی نیت سے ہاتھ اٹھا ہی رہی تھی کہ تیمور علی خان نے درمیان ہی میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے ضوفی کو اپنی طرف کھینچا جو خوف سے سہم کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ اور بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"تمہارے تو خاندان کی عادت ہے پیچھے گھر جانا۔" عجیب سی وحشت نازنین کے چہرے پر برسنے لگی تھی۔

ضوفی باپ سے لپٹی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ "پاپا ممی بہت خراب ہیں۔"

"میری جان ممی کو ایسے نہیں بولتے۔ ممی کی طبیعت خراب ہے جب ہی کسی بات سے منع کرتی ہیں تو بچوں کو مان جانا چاہیے۔"

"جاگیرداروں کے ہاں جاگیردار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی منوانے والے۔ اپنی سنانے والے۔ خوامخواہ میں باہر سے ہی لے آئیں۔ میلی نہیں بدلے گی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیجیے۔ آئندہ مجھ سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرے۔"

نازنین کے سانسوں کی بے ترتیبی بتا رہی تھی کہ اس وقت وہ اپنے حواس کھو چکی ہے۔ تیمور علی خان نے ہاتھ میں پکڑے تولیے سے ضوفی کا چہرہ صاف کیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ جو بری طرح سسک رہی تھی۔

"آؤ بیٹا آپ کے کمرے میں چلتے ہیں۔" انہوں نے ضوفی کا ہاتھ تھاما اور وضع داری فراموش کر کے ہاتھ تھامے ان ہی میں بیڈروم سے باہر چلے گئے۔

نازنین بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ پہلی مرتبہ کسی بچے پر اس نے ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب اس کا اپنا دل کٹ رہا تھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

پندرہ بیس منٹ کے وقفے کے بعد تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔

"آئی ایم ساری تیمور! پتا نہیں میں کیا اول فول بول گئی۔"

تیمور علی خان خاموش رہے اور وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگے۔

"بہت ہی سوال جواب کرنے لگی ہے۔ تنگ آ جاتی ہوں میں۔ میرے اپنے اندر کیا کم سوال جواب ہوتے رہتے ہیں۔"

تیمور علی خان بدستور خاموش رہے۔

"اب مجھے آپ کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں۔ اب میری کشتی کو ایک اچھالے کی بھی ضرورت نہیں۔ اب میں بے خوف خطر ہوں۔ میں انیکسی میں چلی جاؤں گی۔ مجھے اپنی ناراضگی کے خنجر سے مزید لہولہان مت کریں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"جو آپ کا دل چاہتا ہے آپ وہی کرتی ہیں۔ لہٰذا جو دل چاہ رہا ہے کر لیں۔" تیمور علی خان نے بہت آہستہ آواز میں اور بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔

مگر سب کچھ کرنے کے اختیارات دینا ان کے انتہائی غضب کا بھید تھا۔

"اتنا بہت کچھ برداشت کر سکتی ہیں۔ بچی کی معصومانہ ضد سے اتنی جلدی ٹیمپر لوز کر گئیں۔ ہم اسے ہمیشہ کے لیے بھیجا

رہے تھے۔ پانچ منٹ کی محنت سے مسئلہ حل ہو جاتا مگر۔ کیا تھا اگر اسے تیار کر کے بھیجتے۔

ہم اپنی اولاد کے ساتھ یہ سب برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ اپنی الجھنیں دور کرنے کے لیے ہماری بیٹی کو استعمال نہیں کریں گی۔ ہماری بیٹی بہت چھوٹی ہے بہت نازک ہے۔" تیمور علی خان کے لہجے سے انتہائی ملال عیاں تھا۔

"میری بھی تو بیٹی ہے" کیا میرا اس پر کوئی حق و اختیار نہیں۔ افسوس مجھے بھی ہے مگر کبھی کبھی بچوں کے ساتھ ایسی سختی کرنی ہی پڑ جاتی ہے۔" نازنین نے بھی ناراضگی سے جواب دیا۔

"وہ صرف ہماری بیٹی ہے۔ آپ تو حقوق و فرائض کا پاس تو صرف ہم ہی نے کیا ہے۔ آپ تو گھر کی صورت میں اصل کر بہت سارے جواز کی ڈھال بنا کر ہمیشہ پیٹھ پیچھے کرنے کی عادی رہی ہیں۔"

وہ ڈریسنگ کی سمت بڑھ گئے۔ نازنین ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔ ان کے ایک ایک لفظ میں کئی کئی سچائیاں ہونے کی عادت یوں بھی ہو چلی تھی۔

"شکر ہے کر دوگی کو بہتر مقدر ہے پورا ہوا چاہتا ہے۔ ہمارے بعد دیکھیں کون اس کا نصیب بنانے پر ہوگا۔ کرے چاہے بوجھ اس کے سر۔"

اس نے قدرے اونچی آواز میں تیمور علی خان کو سنانے کی غرض سے کہا اور پیاز کے چھلکوں جیسی رنگت والے پاؤں چپلوں میں پھنسا کر دوپٹا گلے میں ڈال کر کھوئی کھوئی سی بے دلی سے خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔

تیمور علی خان ڈریسنگ سے باہر آئے تو ان کی پیشانی پر بھی شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ بے حد الجھے ہوئے تھے۔

ماہین غسل کر کے ابھی ابھی باتھ روم سے باہر آئی تھی کہ بیڈ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟" اس نے باتھ گاؤن میں لپٹے اپنے سراپے پر نگاہ دوڑا کر قدرے الجھ کر پوچھا۔

"میں ہوں جی بالو۔ آ جاؤں؟"

"اوہ۔ ہوں۔ آ جاؤ۔" اس نے تولیے سے بالوں کو آزاد کرتے ہوئے جواب دیا۔

بالو اندر آ گئی۔

"خیریت۔ کوئی کام؟" ماہین نے انگلیوں سے بال سلجھانے شروع کر دیے۔

"جی۔ ماہین بی بی۔ آپ سے اجازت لینے آئی ہوں۔ اب نہ میں ہری پور جاؤں گی اور نہ یہاں رہوں گی۔"

"کیوں بھئی۔ کیا ہوا۔ کیا کام بہت کرنا پڑتا ہے یہاں؟ اور تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں کہ تم اب در بدر پھرو۔" ماہین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں جی۔ میں در بدر نہیں پھروں گی اس کے پاس جاؤں گی جس نے در بدر کیا ہے۔" بالو روتے روتے بمشکل کہہ پائی۔

"عارف کے پاس۔ کیوں کیا کوئی شخص لیے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے؟" ماہین نے قدرے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

"ساری بات سمجھ میں آ گئی ہے بی بی اور وہ اب اس کے کسی کام کی نہیں۔ کوشش کروں گی کہ اس سوالی کی خواری ختم ہو جائے۔"

"سوالی وہ کم تم زیادہ ہو۔ لال خان تم سے عمر میں بہت بڑا ہے تو عارف کون سا تمہارے برابر کا ہے۔ اس میں کیا خاص بات ہے؟ فلمی ہیروئن مت بنو۔ بچے کے سر پر اس کے باپ کا سایہ ہے اسی میں عافیت ہے۔" ماہین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس کی عمر کا بھید تو اب کھلا ہے مجھ پر۔ مگر جی آپ بھی اسے دیکھو تو حیران ہو جاؤ۔ ذرا چلا بالکل لڑکوں جیسا لگتا ہے۔ بالوں میں بھی سفیدی نہیں۔ جی۔" بالو کے پاس جواب تیار تھا۔

"کیا کہتا ہے بھئی وہ تو آج سے بیس سال پہلے بھی جوان تھا۔ بالوں کو ڈائی کرتا ہوگا۔ تیمور علی خان سے کچھ ہی چھوٹا ہوگا۔ ان کے بھی سر میں ہلکی ہلکی سفیدی جھلکنے لگی ہے۔" وہ بڑے تعجب سے تجزیہ کرنے میں الجھ گئی تھی۔

"کیا کرتا ہوگا؟" بالو کی سمجھ میں نہیں آیا تو پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے بالوں کو رنگ لگاتا ہوگا۔" ماہین نے وضاحت کی۔

"ایسا تو میں نے نہیں دیکھا پر کیا خبر جی۔ دنیا ہی دھوکے کی ہے۔" بالو نے اس سے اتفاق کر لیا۔

"ایک بات کہوں بی بی! آپ برا تو نہیں مانیں گی؟" بالو نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"ہوں۔ پوچھو۔" ماہین نے برش سے بال سلجھانا شروع کر دیئے ساتھ ہی اندازہ بھی لگانا شروع کر دیا کہ وہ کیا سوال کرنا چاہ رہی ہے۔

"یاور خان بھی تو آپ سے عمر میں بہت بڑے ہیں مگر آپ تو بہت خوش ہیں۔"

ماہین کے گرش کرتے ہاتھ یکدم رک گئے۔ چہرہ متغیر سا ہو گیا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے میرے لیے کہ میں بہت خوش نظر آتی ہوں۔" وہ خیال سے باہر آ کر بڑی بے ساختگی سے مسکرائی۔

"بالو!" یکلخت وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"جی بی بی؟" بالو ہمہ تن گوش تھی۔

"بالو۔ شادی بس ایک اتفاق ہے۔ یا ایک سودے بازی ہے۔ جو کبھی مرضی سے ہوتی ہے کبھی مجبوری سے۔ مثلاً ہم ایک لاکھ روپے کے مالک ہیں۔ اگر چہ اس سے ایک لاکھ کے زیور خریدتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے اپنا پیسہ خوشی سے خرچ کیا ہوتا ہے۔ اگر اسی پیسے سے ہم اپنے گردے یا دل کا علاج کراتے ہیں اور یہ پیسہ اسپتال میں خرچ ہوتا ہے تو ہمیں تمام عمر ایک قلق رہتا ہے کہ ہمارا اتنا سارا پیسہ اسپتال میں چلا گیا۔ زیور خریدیں تو خوشی، بیماری میں خرچ کریں تو مجبوری۔

بے وقوف "عورت" کے فرق ہی تو ہوتا ہے۔

عورت تو بس ایک رات ہی کے لیے ہوتی ہے۔ ایک رات کی ہوتی ہے۔ مگر تیری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔

مالو! کیا چاہیے کہ تو اپنے بیٹے کی رات کو دیکھ لے۔ اب تمہارا کون سا شوق باقی ہے؟" وہ ہنس کر پوچھ رہی تھی۔

"بی بی اول کی بھی تو کوئی آرزو ہوتی ہے۔" بالو کی آواز بھر آ گئی۔

"چھوڑو اس دل کا قصہ۔ نری خواری۔ تجھے خبر نہیں کتنے ضروری کام ہو جاتے ہیں اس دل کے پیچھے۔ اپنے بچے کی فکر کر۔ اب صرف اس کی سوچ۔ اب بھی سمجھ نہیں سکے گی۔ بچھڑا تو چیز ہوتی ہے۔ دل تو بانورا ہے گزر کے بھی نہیں ہے؟" ماہین کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی۔

"بی بی اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔ آپ کا دل آباد رکھے۔ یاور خان کی لمبی عمر ہو۔ آپ کا دل آباد ہے۔ خالی تھک فرق آپ کو کیا پتا؟" بالو نے بڑے کرب سے کہا۔

"میں تجھے کیسے سمجھاؤں بالو۔ تیرے اندر زندگی پروان چڑھ رہی ہے مگر تیرے اندر کی ماں ابھی جاگی نہیں۔ جاگی ہوئی ماں کو اپنے بچے سے زیادہ کسی کا خیال نہیں ہونا چاہیے۔ چاہے عورت خوشی سے خرچ ہو یا مجبوری سے "ماں" کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ سن رہی ہے نا میری بات؟

عورت آخرکار صرف ماں ہے جو عورت ماں نہیں ہوتی۔ ماں ہونے کو محسوس نہیں کرتی۔ اس کی قسمت کے اندھیرے مرتے دم تک دور نہیں ہوتے۔ تو کیا سمجھتی ہے میں ماں نہیں ہوں؟ میں اپنی بہن کے بچوں کی ماں ہوں۔ تو کہتی ہے تو مجھے خوش نظر آتی ہو۔ میں ان بچوں کی وجہ سے خوش ہوں۔ ان کو ملنے والی خوشیوں کے خیال سے خوش ہوں۔ میں بچوں کے باپ کی وجہ سے خوش نہیں ہوں۔" ماہین نے پھر سے بالوں میں برش چلانا شروع کر دیا۔

"تو آپ کی شادی زبردستی ہی ہوئی تھی یاور خان آپ کو پسند نہیں؟" بالو نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"شادی تو زبردستی ہی ہوتی ہے۔ کہیں دل زبردستی کرتا ہے کہیں گھر کے لوگ۔" ماہین عجیب سی ہنسی کے ساتھ ہنس پڑی۔

بالو اس مبہم جواب پر اس کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔

"ایک بات اور پوچھوں بی بی! آپ غصہ تو نہیں ہوں گی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں پوچھو۔ بہت سوال پیدا ہونے لگے ہیں تمہارے ذہن میں بھی اللہ رحم کرے۔" وہ پھر بے بسی انداز میں مسکرائی۔

"مجھے اور سرسوتی کو باہر بھیج کر وہ آپ کو کیا باتیں بتاتی تھی۔ سرسوتی تو کہتی تھی کہ بی بی تو بہت دن سے اس کے پاس رات کو جا رہی ہیں؟"

"کمبخت ہو جا آئندہ پھر اس طرح کی بات تیری زبان پر آئے۔ سرسوتی کو کہا ہے اس کی طرح اندھی بہری گونگی ہو جا۔" ماہین نے اسے راستے میں ٹوک دیا۔ "یہ تیرے سوچنے کرنے کی باتیں نہیں۔ میں تم لوگوں کو میرے کے لیے ساتھ لے جاتی تھی۔ حویلی کے بھیدوں میں حصہ دار نہیں۔ حویلی کے نوکروں کے منہ میں زبان نہیں ہوتی۔"

"بی بی ابھی کب حویلی کی نوکر ہونا چاہتی ہوں۔ بس آپ تو مجھے واپس جانے کی اجازت دے دیں۔" بالو نے منت سے کہا۔

"میرا حکم پر کیا زور... مگر اس حالت میں تمہیں حویلی سے نکالنے کو میرا دل نہیں مانتا۔"

"آپ اپنے دل کی نہ مانیں۔ میری مان لیں۔ مجھے جانے دیں۔" بالو نے منت کی۔

"ہاں مجھے پتا ہے۔ تجھے کچھ نہیں آئی۔ اسی کے چکر میں نکلنا چاہ رہی ہے۔" ماہین نے نرمی سے کہا۔

بالو خاموش رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

"کیا سوچ رہی ہے؟" ماہین نے بالوں کو چھو کر ان کے خشک ہونے کا اندازہ لگایا۔

"کچھ نہیں بی بی۔ انسان کے پاگل پن کو سوچ رہی ہوں۔ جیسے حالات اس کا نصیب ہو۔ آگے کا نظر نہیں پڑتا وہ دل کھوج رہتی ہے۔ جو مل جاتا ہے اس پر دھیان نہیں ہوتا جو نہیں ملتا اس سے دھیان نہیں ہٹتا۔ میرا ابھی بڑا اچھا گھر تھا۔ منزلوں والا۔ اس کے کئی کمرے تو میں نے کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے ساری مشینیں تھیں۔ یہاں حویلی میں تو بہت پانی ہے۔ میرے گھر میں پانی کا مسئلہ تھا۔ مگر لال خان موٹر لے آیا تھا۔ میرے باورچی خانے میں بھی ساری مشینیں تھیں۔ آم کا جوس بنانے والی' سیب کا جوس بنانے والی۔ گیلا مسالا پیسنے والی الگ۔ سوکھا پیسنے والی الگ۔ قیمہ بنانے والی' آلو پیاز کاٹنے والی۔ پانچ صوفے تھے تین ڈرائنگ روم میں ایک ٹی۔ وی والے کمرے میں جو باورچی خانے کے ساتھ تھا ایک اس کمرے میں جہاں ہم سوتے تھے۔

کیسا بھرا گھر تھا بی بی۔ پر مجھے وہاں نیند کیوں نہیں آتی تھی؟ میرے باپ کا آدھا کچا آدھا پکا گھر تھا۔ وہاں تو مجھے بہت نیند آتی تھی۔ اماں چیختی رہتی تھی۔ کہ غریب اتنا نہ سویا کر سستی ہوتی ہے۔ مگر میں سستی کب تھی۔

کہاں گئی میری نیند بی بی؟" وہ پھوٹ کر رونے لگی۔

ماہین کے دل میں بھی لہریں اٹھنے لگیں۔

"چپ کر جا بالو۔ دل کی کر کے تو بعض اوقات جسم میں روح پڑ جاتی ہے۔ کیسی وحشت تھی کہ تجھے قدم قدم پر گھر سے شکوہ نظر نہیں آئے۔" اس نے بڑے دکھ سے بالو کی سمت دیکھا۔

"ایسی وحشت بی بی وحشت تو اب بھی وہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ دنیا کچھ اور سمجھ میں آئی ہے۔ مگر وحشت تو کم نہیں ہوتی۔"

"بالو اس بچے کی خاطر خود کو روک لے بس۔ ایک خاندان کی سات پشتیں تیری احسان مند ہوں گی۔ مت بھٹک۔ میرا بس چلے تو تیرے ہاتھ پاؤں باندھ کر پچھواڑے ڈال دوں۔"

ماہین کو بھی اندازہ تھا کہ ان وحشتوں میں سمجھ تو سب سے پہلے ساتھ چھوڑتی ہے۔ مگر ایک امید کے سہارے اگلا قدم انسان اٹھاتا ہی ہے۔ اس نے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"بی بی دعا کرنا کہ یہ باپ پر پڑ گیا تو میں اس سے محبت کیسے کروں گی؟" بالو کے انداز میں بلا کی سادگی تھی۔

"مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ اس پر نہ ہو جس کے دھیان میں تو ہر دم رہتی ہے۔"

ماہین کو بھی جھرجھری سی آگئی۔

"ہائے اللہ ایسا بھی ہوتا ہے۔" بالو نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہوں۔ مگر اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ گھل مل کر رہا کرو۔ ہونے سے بچاؤ تو یہ ہے کہ شکل پر نہ اترے۔

اب حویلی کے مردوں کے سامنے نہ پڑنا۔ بادر صاحب کو مطمئن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ مجھے کام بہت پڑنے ہیں ورنہ میں تو بچہ ہونے کے بعد تجھے کراچی پہنچا دیتی۔"

"آپ بھجوا دیں۔" بالو نے پھر اصرار کیا۔

"میرا بھائی ابھی گھر نہیں ہے۔" ماہین نے بتایا۔

"تو کیا آپ مجھے اپنے بھائی کے پاس بھیجیں گی؟ میں آپ کے میکے جانے کے لیے تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ میں تو بس اپنے شہر واپس جانا چاہتی ہوں۔" بالو نے وضاحت کی۔

اسی دم بادر علی خان دروازہ کھول کر مالکانہ بے نیازی کے ساتھ اپنی دلہن میں داخل ہوئے۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حویلی ہی میں موجود تھے۔

ماہین بری طرح گڑبڑا کر رہ گئی۔ بالو کا انداز تو ایسا تھا کہ اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ گھبرانے کے باوجود پھرتی سے اٹھ نہ سکی۔ اور بمشکل کھڑی ہوئی تھی۔ چوڑا سا چادر نما دوپٹہ اس کے ہاتھ میں تھا وہ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔ عجیب سے خوف نے اسے پسینے میں بھگو دیا تھا۔

"السلام علیکم جی۔" اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

بادر علی خان نے اس پر ایک نگاہ ڈالی تھی ان کی ایک نگاہ بھی بہت تھی۔

"کون ہے یہ...؟" انہوں نے عام سے انداز میں ماہین سے دریافت کیا۔

"بالو ہے۔ ایسے ہی لیبر ری طور پر حویلی میں کام کرتی ہے۔" ماہین کی آواز بہت آہستہ تھی۔ اسے اپنی اندرونی طبیعت پر ہلکا سا غصہ آیا۔

بالو چادر اچھی طرح لپیٹ کر باہر چلی گئی۔

بادر علی خان صوفے پر بیٹھے تھے اور ماہین کھڑی تھی۔

"کس نے کی تھی یہ لیبر ری اپائنٹمنٹ؟" ان کا لہجہ بہت ٹھنڈا تھا۔

"کراچی سے آئی تھی حویلی کا پتہ پوچھتی ہوئی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں نے بھابی بیگم سے سفارش کی تھی۔"

"کتنی مدت ہوگی۔ کتنے دن سے قیام ہے حویلی میں محترمہ کا؟" بادر علی خان نہایت سنجیدہ تھے۔

"چھ ماہ ہونے ہیں۔" ماہین نے اسی طرح کھڑے کھڑے جواب دیا۔

"یعنی آپ کی صورت میں حویلی کو کوئی نشان ہی مل گئی ہیں۔ کیا یہ کم ظرف ہے اس کا شوہر کہاں ہے، کیا کام کرتا ہے یہ اس سے دور اس حال میں کس حساب میں یہاں نظر آ رہی ہے۔"

"سیپریشن ہو چکی ہے۔ ماں باپ بہت غریب۔"

"یعنی کوئی بھی خاتون اس حال میں اس حویلی میں آرام سے قیام کر سکتی ہیں۔ حد ہو گئی۔ نکاح [illegible] میں [illegible] رہی ہیں محترمہ..... مجھے یاد آیا۔ خانم ابھی کو ہری پور ساتھ لے جانے کے لیے آپ کہہ رہی تھیں۔ اس وقت میں بہت مصروف تھا۔ میں نے اس کیس پر توجہ نہیں دی تھی۔ مگر مجھے آپ سے اس قسم کی حماقت کی امید نہیں تھی۔"

وہ مشرقی شوہر ہونے کی حیثیت سے یہ حق محفوظ رکھتے تھے کہ جب موڈ ہو بیوی کو جاہل ہونے کا احساس ضرور دلائیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کا شوہر تو بہت بے تاب رہتا ہے کہ کسی طرح ثابت کرے کہ بیوی کا شعور اور ڈگریاں سب بے کار ہیں وہ جاہل ہے اس لیے کہ عورت ہے۔

احساسِ توہین سے چند گھڑیاں لب بستہ رہ کر گزریں۔

"کیا نام بتایا ہے اس نے اپنے بچے کے باپ کا؟" یاور علی خان کی آنکھوں سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

"لال خان۔ معمولی پڑھا ہوا کاروباری آدمی ہے۔ ٹھیک ٹھاک پیسے والا ہے۔" ماہین ناراض سے انداز میں گویا ہوئی۔

"وہ پیسے والا ہے اور یہ یہاں اس حال میں جھک مار رہی ہے۔ کوئی سر پیر ہے اس اسٹوری کا؟" یاور علی بری طرح الجھ گئے۔

"بتایا تو ہے سیپریشن ہو گئی ہے۔" ماہین نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

"اور ہاں..... ایک پوائنٹ تو مس ہو رہا ہے۔ حویلی کا پتہ کیسے [illegible] کیوں آئی ہے۔ کیا حویلی میں اس کا کوئی رشتے دار ملازم ہے۔" یاور علی خان ایک دھیان سے چونکے۔

"غلطی ہو گئی مجھ سے۔ ذرا سا بھی اعتماد بھی ہے مجھ پر۔ کٹہرے میں آ کھڑی ہوں جیسے۔ نوکروں سے کہہ دوں دھکے دے کر حویلی سے باہر نکال دیں جیسے کہ آپ کے ہاں کا دستور ہے۔" اب ماہین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"اس قسم کی ہمدردیاں گلے پڑ جاتی ہیں۔ کیوں نہیں سمجھ میں آتی یہ بات آپ کو؟" یاور علی خان سیلف کنٹرول کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"فیوڈل لارڈز ہمارے سسٹم میں ہر قانون و بندش سے آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ اگر کوئی کچھ بگڑے گا تو اسی بے چاری کا بگڑے گا۔" ماہین نے تلخ انداز میں جواب دیا۔

"فیوڈل لارڈز کی کوئی ریپوٹیشن بھی ہوتی ہے" یاور علی خان نے مزید دلیل دی۔

"ہونہہ۔ ریپوٹیشن؟ کس پوائنٹ پر بھی جا ہے ریپوٹیشن ہو جائیں۔" ماہین کا موڈ تو گویا ہمیشہ کے لیے آف ہو چکا تھا۔

"میں بہرحال کہہ چکا ہوں اب یہ لڑکی ایک دن بھی یہاں نہیں رکے گی اور آئندہ کوئی لڑکی یا عورت بابا صاحب سے

لیے بغیر ملازم نہیں ہو گی۔ حویلی میں ملازم رکھنے یا نکالنے میں حویلی کی کوئی عورت حصہ نہیں لے گی۔"

"ایک قانون اور بنا لیں کہ آئندہ حویلی کے مرد باہر سے شادی کر کے عورتیں حویلی میں نہیں لائیں گے۔ [illegible] سسٹم ہی [illegible] ہو جائیں گے اور اس سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔" ماہین نے ان کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

یاور علی خان سگریٹ سلگا رہے تھے انہوں نے شیشے سے [illegible] دیکھا [illegible] کر ماہین کی صورت دیکھی [illegible] کوئی [illegible] تھی۔

"اب میں نے آپ سے شادی کی تھی تو سوچا تھا ایک فریش اور کوالیفائیڈ لڑکی مجھے [illegible] سے اتنا سیراب کرے گی کہ سارے ملال مٹ جائیں گے اور خوشیاں رنگ [illegible] پر برسیں گی۔"

"اب کیا [illegible] سوچا تھا۔ اس [illegible] لڑکی کا بھی [illegible] سوچا ہوتا۔" ماہین نے [illegible] پوچھا۔

"مجھے سے حیرت ہی تو ہوں۔ گھر ہے رگوں میں [illegible] گرم جوش ہی لڑکی کا ہاتھ جب میرے ہاتھوں میں آتا ہے تو [illegible] کیوں ہو جاتا ہے؟ اسے میری کمزوری کا پتا ہے کہ میں سامنے ہوتے ہوئے [illegible] نہیں کرتا۔ اس لیے [illegible] کر جاتی ہے؟"

گویا چارج شیٹ مکمل کی گئی تھی۔

ماہین سر جھکائے سن رہی تھی۔

"ایک بیوی میں اس طرح کی کمی سب سے بڑی کمی ہوتی ہے۔ میں ان دنوں [illegible] میں آپ جتنے [illegible] ایک [illegible] بھی اپنے ہاں ملازم میں رکھ سکتا تھا۔"

"مجھے یاد آ رہا ہے کہ بالوں کے موضوع پر ہماری پہلے بھی بات چیت ہوئی تھی۔ مگر تب آپ نے ایسا کوئی [illegible] نہیں لیا تھا۔ اب کہاں کا غصہ کہاں نکالا جا رہا ہے؟ جس بات پر غصہ ہے وہی بات کیجیے نا۔" ماہین نے تحمل بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"اب اور غصے کے جذبات کے علاوہ دوسرے جذبات ہی کہاں ہیں۔ آج تو [illegible] بھی تم [illegible] ہے۔" وہ [illegible] میں کہہ کر کش لگانے لگے۔

ماہین نے چونک کر ان کی صورت دیکھی۔

"تم..... کون سا تم؟" اس کی نظر میں سوال تھا۔

"بابا صاحب خیر آباد سے واپس آگئے ہیں۔ آرام کر رہے ہیں۔ [illegible] کا معاملہ آج فائنل ہو جائے گا۔ اگر ہماری کے لیے کوئی [illegible] ظاہر کریں گے تو ان سے بھی اس موضوع پر دوبارہ کبھی بات نہیں ہو گی۔ پھر کورٹ ہی میں معاملہ طے ہو گا۔ رہی اس لڑکی کی بات 'کیا نام ہے اس کا'۔ مجھے اگر علم ہوتا کہ آپ نے ایسی لڑکی کو پناہ دی ہے جو ماں بننے والی ہے تو میں بہت پہلے ہی ایکشن لے چکا ہوتا۔ یہ بات آپ کو میرے علم میں لانا چاہیے تھی۔ مگر آپ تو مجھ سے ہر بات چھپانے کی عادی ہیں۔ کیسی احمقانہ پارٹنر شپ ہے ہماری۔ اعتبار و اعتماد کی کس قدر کمی ہے۔"

انہوں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جھاڑ جھپاڑ کی۔

"میں آپ کو یقین دلانے کی مزید کوشش ہرگز نہیں کروں گی کہ رشی کے کیس میں پہلے علم آپ سے آئی ہی ہوئی تھی۔ لہٰذا اتنا علم ضرور تھا کہ وسیم سے شادی پر رضامند نہیں ہے۔"

"جو ہو چکا ہوتا ہے میں اس پر زیادہ غور نہیں کرتا۔ جو کرنے کا ارادہ ہوتا ہے میری ساری اٹینشن اس پر ہوتی ہے۔" یاور علی خان نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "پتا ہے مجھے۔" ماہین بڑبڑائی۔

"مگر یہ آپ کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ انسان خود کو جانتا ہو تو اپنی اولاد کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتا ہے۔ دنیا کو دھوکا دیا نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اپنی اولاد کو آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کو جانے بغیر آپ کورٹ میں جائیں گے تو بہت بڑی غلطی ہوگی۔" ماہین نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"اتنا نادان میں بھی نہیں ہوں۔ اسے سیٹ کروں گا پھر کورٹ میں جاؤں گا۔ اس لیے کہ یہ ایک مضبوط پوائنٹ ہے۔ بارش کی بیک بھی بہت مضبوط ہے۔ میں سب سمجھ رہا ہوں۔" یاور علی خان نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"مثلاً کیا سمجھ رہے ہیں؟" ماہین نے گرم لوہے پر چوٹ لگانے کی کوشش کی۔

"میں اس موضوع پر آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ بھابی بیگم کی تاکید ہے ان کا کہنا ہے۔ آئندہ ماہین اپنے بیڈروم سے باہر نہ سوئے۔ آپ نے انہیں کچھ نہیں بتایا تو کیا خیال ہے وہ اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ میں بیڈروم میں موجود ہوں اور آپ بیڈروم چھوڑ کر کہیں اور رات گزاریں۔

میں آپ کی ناراضگی سے خائف نہیں ہوں۔ مگر معاملے کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے آپ سے بگاڑ بھی نہیں چاہتا۔ بہتر ہے کہ اس موضوع پر ہماری بات نہ ہو۔ یہ ہم دونوں کے لیے ہی اچھا نہیں ہے۔"

یاور علی خان خشک لہجے میں بات کر رہے تھے۔

"بات تو میرا خیال ہے مجھ سے ہی ہوگی آپ نہیں کریں گے تو بابا صاحب کریں گے۔ مگر میرے ہاتھ صاف ہیں۔ مجھے مطلق اس بات کی پروا نہیں کہ کوئی مجھ سے اس موضوع پر بات کرتا ہے یا نہیں۔"

ماہین نے بھی قطعی انداز میں بات کی۔

"میرا آپ سے خود بات کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ میں اس معاملے میں سرے سے آپ کو انوالو ہی نہیں کرنا چاہتا۔"

"انوالو تو آپ مجھے کر چکے ہیں یہ کہہ کر کہ میں اس پلاننگ میں شامل ہوں۔" ماہین نے زور دے کر کہا۔

"بات آگے بڑھے گی تو ثابت ہو جائے گا کہ آپ شامل ہیں یا نہیں۔ اس سے پہلے میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اسٹاپ دس ٹاک۔"

یاور علی خان اٹھ کر میز کی طرف بڑھے جیسے کچھ تلاش کرنا چاہتے ہوں۔

"لیکن اگر یہ ثابت ہو گیا کہ میں اس معاملے میں شامل نہیں ہوں تو آپ کو مجھ سے معذرت کرنا پڑے گی۔" ماہین نے

رہی ہے کیا۔

"پڑھتی ہے۔" یاور علی خان نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

"ایک مرتبہ پھر کوئی بڑا نقصان ہو سکتا ہے آپ کو۔ وقت میں بہت سوچ سمجھ کر اقدام کرنا ہوگا آپ کی ایک ہی بیٹی ہے۔" ماہین بولے جا رہی تھی۔

"اگر رشی بھی ہوتیں تو میرا طریقہ کار اور عمل یہی ہوتا۔ مگر ایک مرتبہ پھر۔"

آپ کا کیا مطلب ہے؟" وہ مڑ کر سوالیہ انداز میں اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔

"اس پر آپ غور کریں گے۔ میں نے جو کہنا ہے بتا چکی ہوں وہ اس کا ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور یاور علی خان کی سمت دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ یاور علی خان گہرے تفکر میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔

"تم لوگ اس بے چاری سے اب کام نہیں لیا کرو۔ زیادہ تنخواہ پر ملازم نے تم لوگوں سے کچھ نہیں کہا۔ اسے سارے کپڑے لے کر اوپر جا رہی تھی۔ میں نے اس سے لے لیے۔ دیکھو اس پہ زیادتی ہے۔"

وہ اپنی دھن میں بولتے ہوئے کچن میں داخل ہوئی۔ بارش چائے کا کپ سامنے رکھے ایک کے پیچھے ایک کھڑے پاتے ہوتے جانے کس سوچ میں گم تھا اس کی آواز پر چونک پڑا۔

"یا لوگی بات کر رہی ہیں آپ بی بی ابھی میں نے سرسوتی سے کہا تھا کہ بے چاری کے پیچھے ہونے والا ہے سو کام ہو کرا دو۔ مگر بی بی اور خود بھی تو باز نہیں آتی۔" کلو نے صفائی پیش کی۔

"کام ہوا ہو گا۔" رشی بارش کے سامنے آتی کھل کر بات پر بیٹھ گئی۔

"ایک تو تجھے بات کرنے کا ڈھنگ جانے کب آئے گا۔" وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔

کلو احمقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگی کہ ٹھیک تو بات کی ہے پھر اعتراض کیا ہے۔

"میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں میری چائے وہیں پہنچا دو۔" وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ رشی نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"کو آج بھی کھانا تو وقت پر بابا صاحب کے ساتھ ہو گا اور چائے میرے کمرے میں اور ناشتہ بھی۔ کچن میں آنے کی ضرورت جب ہوتی تھی کہ کھانے پینے میں میرا اہتمام مقرر نہیں تھا۔ مگر اب میں نے سیٹ کر لیا ہے۔ ماما کو بھی میری وجہ سے بہت پریشانی ہوتی تھی۔ اگر میں پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تو تم لوگ اور زیادہ تنگ ہو جاؤ گی۔" وہ نکلتا اور بڑھا باہر نکل گیا۔

رشی حیران پریشان اس کے الفاظ پر غور کرتی رہ گئی۔ کلو اور سرسوتی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "پڑھائی کے لیے باہر" بس یہی بازگشت تھی۔

"آپ چائے پئیں گی بی بی؟" کلو نے اس کے کھڑے ہونے کی بیچ سے احتیاط کی۔

"جہنم میں گئی چائے۔" وہ جھنجھلاتی ہوئی باہر کی طرف بڑھی۔

چند منٹوں کے بعد وہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ وہ چار مرتبہ دستک دینے کے بعد دروازہ کھل گیا۔

"نانی ماں —— سامنے روشی کو دیکھ کر گویا وہ چکرا گیا۔

"آپ کو اب اس طرح نہیں آنا چاہیے۔" اس نے پہلے سامنے پھر زینے کی سمت دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

"پھر کس طرح آنا چاہیے۔ گھوڑے پر چڑھ کر یا بیل گاڑی میں؟" وہ اس کے سرد انداز پر چڑ کر بولی۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ کس قدر ٹینشن ہے ماحول میں۔ ہماری وجہ سے بات کو کسی واضح سمت رخ دیتے ہیں۔ مزید الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ اب تو سب الجھے ہوئے ہیں۔ مزید الجھنوں کے ہم متحمل نہیں ہیں ان میں کیا کر سکتے اب۔" روشی کی عادت تھی کہ جب کسی مسئلے میں الجھتی تھی تو ہر مصلحت بالائے طاق رکھ دیتی تھی۔

"یہ صرف آپ کا خیال ہو سکتا ہے۔" بارق دروازے میں ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی طور اسے کمرے میں آنے نہیں دے گا۔

"ہاں ظاہر ہے اس لیے کہ میں آنسٹ (Honest) ہوں۔ جو آنسٹ ہوتا ہے اسی کے پاس اسٹرانگ ول بھی ہوتی ہے اور Will بھی اسی کی ہوتی ہے۔ تم تو ہر حال کے بہانے یہاں سے فرار ہونے کے چکر میں ہو۔ صرف پیا سے ایک منگنی ہوئی ہے اور تمہاری "ہارس پاور" ہوا ہو گئی ہے۔

مگر میں تمہیں بتا دوں کہ میں تم سے بہت اچھی طرح نمٹ لوں گی۔ کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔" اس کا چہرہ یکلخت سرخ ہو گیا۔

"مجھے ٹھیک اندازہ ہے کہ میں بری طرح گرفتار ہو رہا ہوں۔ میں فی الحال کہیں فرار نہیں ہو رہا، آپ غم نہ کریں۔ اب پلیز آپ مزید یہاں نہ کھڑی ہوں۔ کسی اور مشکل ہو سکتی ہے۔ سمجھیں آپ۔"

"اب کیا مشکل۔ اچھا ہے بات کھل گئی۔ میرا تو دم گھٹنے لگا تھا۔ اتنا بہادر شو کرنے کی ضرورت کیا تھی جب ابھی سے تھر تھر کانپ رہے ہو۔ میں کاکا جان کے پاس اس لیے تو نہیں گئی تھی۔ تم انکار کر سکتے تھے۔ کیوں نہیں کیا؟ میں بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتی کہ کاکا جان کسی کے ساتھ اس طرح کی زبردستی کر سکتے ہیں۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔ کیا میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر سکتا ہوں؟" بارق نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ ہر قیمت پر اسے وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا۔

اسی لمحے سرسوتی زینے کی طرف سے نمودار ہوئی۔

"سائیں نوں بڑے خان بلا ساں۔" وہ بارق سے مخاطب تھی۔

روشی سرسوتی کی آواز پر بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"اکیلے ہیں یا اور کوئی بھی ہے ان کے پاس؟" اس کے چہرے پر سنجیدگی کے نشان ظاہر تھے۔ سوال میں تجسس بھی تھا۔

"جی۔ بابا خان ہیں۔ بس۔"

روشی نے چونک کر بارق کی سمت دیکھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی۔

بارق نے ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ بند کر دیا۔

"اچھا تم، آ رہا ہوں۔" اس نے سرسوتی کو روانہ کیا۔

"آپ بھی چلیں۔ آرام کریں۔ اور دعا کریں کہ ہماری اگلی باتیں کمرے سے باہر نہیں کمرے کے اندر ہوں۔"

بارق اس کا فکر سے گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر بارق کا دل موم ہونے لگا۔ وہ بہت سہمی سہمی سی لگ رہی تھی۔

"بابا صاحب تمہارے ساتھ جانے کیا ایکشن لیں؟ میں بھی چلوں؟" وہ فکر مندی سے بارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آپ تو یوں میں گویا مر جائیں گی۔ کیوں پریشان ہوتی ہیں یہ تو ایک دن پیش آنا تھا جس دن خبر سے دھماکے تھے سر پر کفن باندھ کر گئے تھے۔

مگر —— روشنے —— حویلی میں ایک پاگل سی لڑکی ہے جس کا دل بہت بے ایمان ہے۔ اس لڑکی میں جیت جانے کے سارے گُن موجود ہیں۔"

"بارق —— وہاں دونوں ہیں پتا بھی اور بابا صاحب بھی۔" اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"وہاں اور دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ آ سکتے ہیں۔ مثلاً بڑے تم ... مصور، بصیر چچا۔ اور دوسرے گھر ... کرتے ہیں۔" وہ ہارا ہوا تھا۔

"وہ تمہیں چل کر دیں گے۔" روشی درحقیقت بہت پریشان تھی۔

"ابھی تک تو صرف ایک ہستی ہی ہمیں چل کر گئی ہے۔" وہ مسکرایا اور آگے بڑھا۔ "بارق" اس نے جاتے ہوئے بارق کو آواز دی۔

"اوہو۔ جانے دیں مجھے۔ "ادھر" جائیں گے تو "ادھر" آئیں گے۔" وہ بہت پُرسکون لہجے میں اس سے شرارت کر رہا تھا۔

"کاکا جان کو فون کروں۔" بارق کی آنکھوں میں جانے کیا تھا اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔

"ضد ہو گی۔ ویسے تو بڑی توپ چیز تھی ہیں۔ بندے کے دم کا ٹھیک اندازہ ہمیشہ کرائسس میں ہوتا ہے۔ پول کھل رہی ہے آپ کی۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔

"مجھے تمہاری فکر ہے کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ ہو۔ یہ لوگ بہت سخت ہیں۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"ایسی بے موقع بات کرتی ہیں کہ بندہ انجوائے بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ہی انداز ہے جیسے کوئی چاند دیکھ کر کہے کل عید ہے۔ ایسی ہی سنسنی خیز سچویشن ہے یہ۔" وہ اس کے بولنے سے پہلے موڑ پر غائب ہو گیا۔

روشی اب اس دھن میں تھی کہ کس طرح بابا صاحب کے کمرے میں ہونے والی گفتگو خود اپنے کانوں سے سنے۔

"السلام علیکم!" ہلکی سی آواز سے دروازہ وا ہوا اور ہادی اندر داخل ہوا۔

باباصاحب نے اشارے سے جواب دیا۔ یاور علی خان نے اتنی زحمت بھی نہیں کی۔ کمرے میں کچھ دیر عجیب سی خاموشی چھائی رہی۔

"ہادی۔۔!" باباصاحب کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

"جی خان۔" وہ وجود کھڑا ہوا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے مقابل پڑی کرسی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہادی ادھر ادھر دیکھے بنا خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"ہم راز ہو حویلی کے تمہاری عمر کے کتنے وارث ہیں۔ ہماری حویلی میں؟ کسی پر اتنا اعتماد و اعتبار نہیں کیا گیا۔ یہ اعزاز تمہیں اس لیے دیا گیا تھا کہ ذمہ داری اور فرض شناسی کا جوہر جو تمہارا خاصا ہے۔ بہت بچپن میں ہم نے اسے جانچ لیا تھا اور ہماری جانچ تمہاری بڑھتی عمر کے ساتھ ثابت ہوتی گئی۔

مگر یہ کیا کر دیا۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یاور ہم سے خواب میں مخاطب ہوئے تھے۔

کیا ہم نے جو سنا ہے درست سنا ہے؟"

دلاور علی خان دکھ کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کے لیے ماحول میں سکوت سا چھا گیا۔

"آپ نے جو جانچ میری کی تھی وہ بھی سچ ہے اور جو سنا ہے وہ بھی درست ہے۔" ہادی اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

"ہمیں یقین کیوں نہیں آ رہا؟" دلاور علی خان نے بڑی بے بسی سے یاور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔

"کیسے آ سکتا ہے۔ کوئی معمولی دکھ ہوتا ہے جب اعتبار ٹوٹتا ہے۔ اور سانپ آستین میں سے نکلتا ہے۔" یاور علی خان کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو کچھ عرض کروں۔" ہادی نے باباصاحب کی سمت دیکھا۔ جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

"حویلی کی چار دیواری کے اندر جو قانون اور ضابطے ہیں۔ ان کے حساب سے یہ نہایت سنگین جرم ہے۔ لیکن بحیثیت انسان میرے تمام حقوق اسی طرح محفوظ ہیں۔ جیسے کہ دوسرے انسانوں کے۔ اگر آپ نے بچپن ہی میں میرے ایک پاؤں میں بیڑی ڈال دی ہوتی تو میں کتاب اٹھانے کے بجائے تیشہ اٹھا لیتا۔ کہ اس وقت تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور میرا باپ کون ہے۔ مگر آپ نے تو میرے ہاتھ میں کتاب دی تھی۔ کتاب سے تو انسان کی "میں" کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اپنی "میں" استعمال کرنے کی جرأت کی ہے خان۔ اگر چند فیصد بھی یہ یقین ہو جاتا کہ آپ اور یاور خان تھوڑے سے ٹینشن کے بعد مان جائیں گے تو میں وقت کا صبر سے انتظار کرتا۔ لیکن مجھے اور زرکا کو بہت اچھی طرح پتا تھا کہ آپ لوگ قیامت تک رضامند نہیں ہوں گے۔ اس لیے"

"اس لیے تم نے ہمیشہ کے لیے داغ لگا دیا۔" یاور علی خان نے ٹکڑا لگایا۔

"بات تو ہماری سمجھ میں آ گئی ہے۔ تیمور کی وہ باتیں جو پچھلی ملاقات میں سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ اب سمجھ میں آ گئی

تھیں۔

کیا تمہیں راز اور تیمور نے پہلے ہی آگاہ کیا تھا؟" باباصاحب نے ایک اچٹتی نظر یاور علی خان پر ڈال کر ہادی سے پوچھا جیسے ان کے سامنے تمام سرے اکٹھے ہو گئے ہوں۔

"ایک جوان صحت مند اور باشعور انسان پر جبر نہ کیا جائے۔ اس کی سب سے بڑی توہین ہے خان۔ اس لیے کہ اس میں بات اور جذبات کا احساس ہو جاتا ہے۔ میں یہ بات اپنے ساتھ محض نہیں کر سکتا کوئی بھی کسی کے ساتھ۔

بات صرف اتنی ہے کہ زرکا اور روشانے یاور علی خان کے ہونے والا تسلیم نہیں کیا گیا۔ ورنہ مجھ میں ایسی کوئی خاص بات تھی کہ تم روشی بی بی کے لیے مجھے پیش نظر رکھتے۔ جب کہ آل ریلی ایک میت پر پڑی موجود تھی۔"

ہادی بہت اعتماد اور ٹھہرے انداز میں کلام کر رہا تھا۔ پیش ہونے کی تیاری تو اسی دن سے شروع ہو گئی تھی جس دن نکاح ہوا تھا۔ اس دن سے اندر ایک ٹھہراؤ تخلیق ہو چکا تھا۔ جب تک یہ حقائق پوشیدہ تھے۔

"ہم صرف یہ سننا چاہتے ہیں کہ تم یہ اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے ایک بھیانک جرم کا ارتکاب کیا ہے اور تمہیں اپنی غلطی پر سخت ندامت ہے۔ واقعہ بہت بڑا ہے ہماری استطاعت اور حوصلے سے بہت زیادہ ہے۔ مگر اس واقعے سے پہلے جو اعتماد تمہارا ہمارے ساتھ رہا ہے وہ ہمیں فیصلہ کن حالت میں آنے سے روک رہا ہے۔ تم میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی کہ ہم تمہیں نظر انداز کرتے۔ تم قابل غور سمجھتے تھے۔ مگر یاور روشانے کے سرپرست ہیں۔ اس کے باپ ہیں انہیں یہ رشتہ ہرگز نامنظور ہے۔ ہم اس کمرے میں ہمیشہ کے لیے یہ واقعہ بھلا دینا چاہتے ہیں۔ کسی بھیانک خواب کی طرح۔ امید ہے تم ہماری بات سمجھ چکے ہو۔"

دلاور علی خان سارا ماضی ان گھڑیوں میں استعمال کر رہے تھے۔ سارے تجربات کا نچوڑ یہ تھا کہ وہ انتہائی دھیمے انداز میں اس سے ہم کلام تھے۔

"اس واقعے میں سرائے کے مکین بھی شامل ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ بات سننے سے پہلے۔ میں ان کی موجودگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں سرائے کے مکینوں کو اپنی بیٹی کے معاملات میں مداخلت کی اجازت کسی طور نہیں دوں گا۔ اپنی بیٹی کا معاملہ نمٹانے کے لیے میں اکیلا کافی ہوں۔ آخر میرے سامنے سرائے کے ذکر سے پرہیز کیا جائے۔" یاور علی خان نے گویا اتنی دیر میں پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔

"یہ واقعہ آپ سب کے لیے جتنا بڑا ہے میرے لیے بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ مجھے معاف کریں۔ میں اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ سب کچھ غور کریں۔ کچھ سوچیں۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔" ہادی بہت متانت سے بات کر رہا تھا۔

"ہمیں کچھ نہیں سوچنا غور کرنا ہے۔ بات یہیں ختم کرتے ہیں۔ ہادی تم صرف اس کا جواب دو۔" یاور علی خان نے غضب ناک انداز میں دریافت کیا۔

"بات کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ اس کیس کا اہم فریق ہماری میٹنگ میں شامل نہیں ہے۔" ہارلی کے انداز پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ بدستور تھا۔

"ہارلی۔ مجھے دکھ نہ دو۔ میں تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔" بابا صاحب کے انداز میں شکستگی تھی۔

"دکھ کی بات تو میرے لیے ہے۔ آپ کی عزت افزائی صرف ایک غلام کے لیے تھی۔ یہ احساس کس قدر اذیت ناک ہے۔ میرے دکھ کی کوئی حد نہیں۔"

"بابا صاحب الجھتا نہیں ہے۔ فیصلہ سنتا ہے۔" یاور علی خان نے خفگی بھرے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

"دراصل میرے ذہن میں اس طرح سے کبھی نہیں آیا تھا کہ مجھے تنہا اس موضوع پر آپ سے اور خان سے بات کرنا پڑے گی۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ اس کیس پر آپ سے براہ راست بات کروں۔ کاکا جان کی ایڈوائس تھی کہ میں ان کی اجازت کے بغیر کسی سے کوئی بات نہ کروں اس لیے آپ لوگ اس وقت مجھ پر بگڑیں یا ناراض ہوں خوشی کہ کوئی سزا بھی سنا ڈالیں۔ تب بھی میں کوئی فیصلہ آپ کو نہیں سنا سکتا۔ البتہ اس کارنر سے میں آپ کو اطمینان دلا دینا چاہتا ہوں۔ کہ میری جانب سے کوئی گستاخانہ جملہ نہیں آئے گا۔"

وہ پرسکون لہجے میں اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"سن لیا بابا صاحب؟ اب بھی آپ کو کوئی شک ہے کہ یہ پاگل نہیں ہے۔ کتنی واضح بات ہوئی ہے۔" یاور علی خان نے اپنا خیال درست نکل آنے پر باپ کی سمت فخریہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہارلی! ہمیں تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تمہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ پھر گھوڑا دوڑانا بتایا۔ تمہیں اپنے دل میں وہ مقام دیا۔ جس کا تصور بھی ایک بے نام ونشان انسان نہیں کر سکتا۔" دلاور علی خان کی آواز میں عجیب سی شکستگی تھی۔

"میں بے نام ونشان نہیں ہوں خان! مہمندی سرداروں میں کسی نمبر پر میرا بھی نام ہے۔ میرا نشان تو اتنا گہرا تھا کہ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی حویلی میں مجھے جگہ دینے پر مجبور ہوئے۔ میں نے کتنی مرتبہ آپ سے اپنے قبیلے والوں سے ملنے کی اجازت مانگی۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ وہاں میری جان کو خطرہ ہے اور آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھے کھونا نہیں چاہتے۔" وہ آہستہ آواز میں بولتے بولتے رکا اور قمیض کی جیب میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ پھر ایک کارڈ نکال کر بابا صاحب کے سامنے کیا۔ "یہ میرے والد عبدالعلی مہمندی کے قبیلے کا کارڈ ہے۔ ایک مرتبہ کاکا جان کے پاس کاغذات سمیٹتے ہوئے ہاتھ لگا تھا۔ ان کی لائبریری میں۔ اس وقت میں ساتویں کلاس میں تھا۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ مجھے خود اپنے بے نشان ہونے کا گمان ہونے لگا۔ اس لمحے میں یہ کارڈ نکال کر دیکھ لیا کرتا ہوں۔ اور میرا اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔"

وہ بڑے اعتماد سے کہہ رہا تھا۔

"ایک کرپٹ آدمی کا دوست بھی کرپٹ تھا۔ تمہارے باپ نے بھی کسی کی لڑکی کو بہکایا تھا۔ خون کی وہی تاثیر تم تک پہنچی۔" یاور علی خان نے تلخی سے ٹکڑا لگایا۔

کمرے کی فضا عجیب سی محسوس ہونے لگی جیسے وہاں بہت دیر تک ہے جیسے اس سانحے کی بازگشت ہو رہی تھی۔ دلاور علی خان کے لب ایک دوسرے سے اس طرح پیوست تھے گویا اب انہیں کھولنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ سرخی تھمی ہوئی تھا۔ ہارلی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جذبات میں تلاطم برپا تھا کہ جیسے ابھی ایک طوفان بپا تھا۔

"یہ کرسٹن اسی وقت ختم کر دی جاتی تو کیا بہتر تھا۔ حویلی میں مجھے رکھنے کا فیصلہ کس کا تھا۔ مجھے نہیں۔ لیکن پہلے سے یہ فیصلہ ہمارا ہی کیا ہوا۔ مجھے انسان ہونے کا احساس ہو گیا۔ اگر یہ تو ہم کو خود مختار ہونا چاہیے تھا۔"

"ان تمام احسانات کا قرض ہی تو چکا رہا تھا تم نے۔" یاور علی خان کا حرف حرف زہر تھا۔

"کر رہے تو میں اس وقت بہت ہوتا۔ جب اپنی امی سے الگ کر کے یہاں سے جا چکا تھا۔ یہاں رہ کر اپنے اعتراف نہ ہو آئے ہوتے۔ ہماری کورٹ میرج نہیں ہے۔" ہارلی کا انداز بہت دو ٹوک اور بے حد سنجیدہ تھا۔

"تمہارے مفادات اسی حویلی سے منسلک ہیں۔ یاور علی خان کے صرف دو بچے ہیں اور مجھے میرے بچے تمام سب ان دونوں بچوں کا ہے۔" یاور علی خان پھر تلخ لہجے میں گویا ہوئے۔

"مجھے اندازہ تھا کہ مجھے یہ سب بھی سننا ہو گا۔ لیکن اس سے بھی بہت زیادہ۔ آپ مجھے اجازت دیجیے۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ اصولاً تو مجھے وہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرا اگر حقیقی ٹھکانا ہونا چاہیے تو وہ جگہ مرانے ہے۔ کیونکہ وہاں میرے باپ کا وطن ہے۔"

"تمہاری روشانے سے شادی کے متعلق بات چیت کتنا عرصہ قبل ہوئی تھی۔ کیا اس کی منگنی سے پہلے۔ یا کراچی میں جب اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس سے بھی پہلے۔"

دلاور علی خان کی خاموشی بھی بالآخر ٹوٹ گئی۔ شاید آتش درون سے وہ گزر رہے تھے۔

"شادی یا نکاح کے موضوع پر ہماری براہ راست کبھی بات نہیں ہوئی نہ واضح اور نہ ہی اشارتاً۔ یہ سچ ہے اتنا سچ ہے کہ میں آپ کے اطمینان کی خاطر حلف بھی اٹھا سکتا ہوں۔" ہارلی کا انداز جنونی اعتماد تھا۔

دلاور علی خان اور یاور علی خان دونوں ہی بری طرح چونک پڑے۔ وہ تو اپنے حساب سے جانے ان کی کتنی حیثیت بات چیت کا پارہ دبائے ہوئے تھے کہ کورٹ میرج کا مرحلہ بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد ہی آتا ہے۔

"شاید ابھی تم حلف اٹھانے کا مطلب نہیں جانتے۔" بابا صاحب نے ابرو اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

"میں کیونکہ ملزم ہوں اس لیے ہر زاویے سے شک کرنا آپ کا حق ہے۔" ہارلی نے سنجیدگی سے کہا۔

"کتنی آفر ہے تیموری کی طرف سے؟" یاور علی خان نے پہلو بدل کر طنزیہ پوچھا۔

ہارلی۔ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔

"خان۔ بہترین کھانا، بہترین لباس یہاں مجھے ہمیشہ ملا ہے۔ مرسیڈیز، لینڈ کروزر، پجارو ضرورت کے تحت استعمال کرتا رہا ہوں۔ لاکھوں کا کیش یہاں وہاں سے خرچ کیا ہوں۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک کروڑ کی زمین حال ہی میں میرے نام ہوئی۔ وہ کون سی مادی آسائش ہے جسے میں نے چھو کر محسوس نہ کیا ہو۔ یہ تمام چیزیں آپ کو آل ریڈی مجھے حاصل تھیں۔

بلکہ نکاح کے بعد تو خطرے میں پڑ گئی ہیں۔ آپ ادھر ادھر ذہن دوڑانے کے بجائے حقیقت پر غور کرنے کی کوشش کیجیے۔ آپ سے درخواست کر رہا ہوں میں۔"

بارق نے بڑی ہمت کر کے یاور علی خان کو مشورہ دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"نہیں ان چیزوں کے کبھی نہ کبھی جان کا امکان تھا مگر اب تم نے مستقل طور پر اپنے … محفوظ کرنے کا اہتمام کرنے کی کوشش کی تھی۔" یاور علی خان نے پھر طنز کا تیر چھوڑا۔

"میرا پروگرام یہ ہے کہ مجھے سب کچھ برداشت کرنا ہے جسے اپنی عزت بنایا ہے اس کی عزت کی خاطر ہر طرح کی توہین برداشت کرنا ہے۔ میں تو "اس" کا … ان کراسس میں استعمال کرنا پسند نہیں کروں گا سامنے اگر خدا نخواستہ کوئی بات۔"

زندگی میں پہلی بار بارق نے رشتے کے لیے لفظ "اس" استعمال کیا تھا۔ انداز میں استحقاق کی آمیزش تھی۔

"آپ اسے کورٹ میں لے جا سکتے ہیں۔ اس کا نقصان ہو سکتا ہے مگر میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اس کو کبھی آپ کے سامنے بھی نہیں بلواؤں گا۔ حقیقی رشتوں کا میل ملاپ عمر بھر کا۔ ایسی کراسس میں وہ الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں کہ پھر جب بھی سامنا ہوتا ہے تو وہ مجھے شرمسار کرتے ہیں۔ یہ واقعہ اپنے منطقی انجام تک تو آ پہنچا ہے اب احتیاط کے راستوں سے گزر کر پہنچنا تو بہت ہی عمدہ ہے۔"

بابا صاحب نے جیسے دم بخود ہو کر اس کی صورت دیکھی تھی۔ اتنی پختگی اتنا ٹھہراؤ اور دور اندیشی۔ حقیقت کی تو تجربہ ہے کہ ہوش بہر حال ہوتی ہے۔ ان کی تجربات سے لبالب عمر اس کے سکون کے سامنے پھیکی محسوس ہو رہی تھی۔

"میرا خیال ہے یاور بیٹے! مجھے آگے بات کرنے دو۔"

"مجھے نہیں کرنی آگے بات۔ کسی سازش سے۔" یاور علی خان نے خراب موڈ کے سبب باپ کی بات ہی کاٹ دی۔

"میں اس طرف کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ادھر حویلی ہی میں۔ بڑے نقصان کے بعد مزید نقصان کا حوصلہ نہیں ہوتا بیٹے۔"

"ہاری!" نادر علی خان بات کرتے کرتے اس کی سمت متوجہ ہوئے۔

"جی خان؟" اس کی نگاہ میں الجھن تھی۔

"ایسا ہے کہ فی الحال تم سرائے شفٹ ہو جاؤ۔ باقی باتیں ہم تم سے بعد میں کریں گے۔" ان کا انداز حکمیہ اور فیصلہ کن تھا۔ نادر علی خان بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے۔

ہاری اٹھ کھڑا ہوا۔ یوں محسوس ہوا گویا قید سے رہا ہوا ہو۔

"خدا حافظ۔" اس نے بہت دکھ سے کہا تھا۔

نادر علی خان کی آنکھوں کی سرخی بڑھ رہی تھی۔ وہ سوالیہ انداز میں بلکہ شاکی انداز میں باپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہاری کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

روشی جی بھر کر خواہش کے باوجود اندر ہونے والی گفتگو نہیں سن سکی تھی کہ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوتی تو دوسرے کمرے کے مکین آتے جاتے اسے دیکھتے اور لازماً اس سے کھڑے ہونے کی وجہ دریافت کرتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ لوگ اسے "کی ہول" سے کان لگائے دیکھ بھی لیتا۔ اگر وہ پیچھے کی طرف جاتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا کہ دونوں کھڑکیاں اب بند تھیں جو لازماً صبح کے وقت ہی کھلی تھیں۔

وہ بے بسی سے تڑپ کر رہ گئی۔ سرسوتی سے پتا چلا تھا کہ ماہین اوپر بھائی بیگم کے پاس ہے۔ وہاں اسے مطلع کرنے بھی نہیں جا سکتی تھی۔

ایک ایک گھڑی وہ جیسے کانٹوں پر چل رہی تھی۔

دروازہ کھلا اور گویا اس کا دل بند ہوا تھا۔ وہ زینے کے چوتھے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔ صرف ہاری باہر آیا تھا اور اس نے باہر آتے ہی دروازہ دوبارہ بند کر دیا تھا۔ اس نے بہت غور سے ہاری کی شکل دیکھی۔ بظاہر تو کچھ بھی نظر نہیں آیا سوائے اس کے کہ کسی گہری سوچ کے سائے کی جھلک تھی۔

وہ بڑی تیزی سے اس کے سامنے آ گئی تھی۔

"خیریت ہے ناں؟"

"اوہ!" وہ دھیان سے چونک پڑا۔ "فی الحال تو خیریت ہے لیکن اگر آپ نے بیچ راہ میں خیریت پوچھنے کا سلسلہ ترک نہ کیا تو "خیریت" کو سنگین خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔"

وہ رکے بغیر آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی تیز تیز اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہارا؟ کیا ڈھونڈنے جا رہے ہو؟ بات تو سنو میری۔ کیا کہہ رہے تھے بابا صاحب۔"

وہ پیچھے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ "میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ کب سے منتظر ہوں۔"

ہاری ٹھہر گیا پھر اس کی طرف پلٹا۔

"ہم اپنے قبائلی لوگ ہیں۔ عورت کو استعمال کر کے اپنے لیے آسانیاں پیدا کرنا بہت شرم کی بات سمجھتے ہیں۔ یہ کیوں کہ وہ آپ کے سامنے آ جائے گا۔ فی الحال تو بابا صاحب کے حکم پر سرائے جا رہا ہوں۔ وہاں سے سائیں میں یہ بہت ضروری ہے۔ کاکا جان کو بھی چل جانا چاہیے کہ بات کھل چکی ہے۔ اب آپ جائیے۔ آپ نے پہلے ہی اپنی جاں نثاری کا ثبوت دے دیا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر تیزی سے زینے چڑھنے لگا۔

وہ کھلا سا اسے زینے چڑھتے دیکھ رہی تھی۔

"خیریت۔ کیا چہروں نے چہرہ کر دیا ہے؟" شعلہ جانے کہاں سے نکل آئی تھی۔ ایک شوخ سی پر اسرار سی اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تھا۔

روشی ایک دم چونک پڑی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے شعلہ کی سمت دیکھا۔

"شاید آپ کو احساس نہیں کہ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہوتا۔ مگر کیا کریں ذوق سوال سے آپ پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔" وہ بھی مسکرا کر کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

شعلہ اس کی جانب دیکھنے کے بجائے زینے کی سمت دیکھ رہی تھی۔

روشی نے کلثوم کے ہاتھ ماہین کو پیغام بھیجا تھا "میں آپ کے پاس نہیں آ سکتی۔ آپ میرے کمرے میں آ جائیں بہت ضروری بات ہے۔"

ماہین تو پیغام ملتے ہی نہ جانے کس خدشے کے تحت دوڑی آئی تھی کہ آج کل تو اس کے لیے ہر پیغام ہی بہت اہم تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو روشی کو بے قراری سے ادھر ادھر ٹہلتے پایا۔ اس نے تشویش بھری نظروں سے اس کی سمت دیکھا اور ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ بند کر دیا۔

"خان آپ کہاں تھیں۔ اتنے اہم وقت پر غائب۔ بابا صاحب اور چچا نے ہاری کو بلایا تھا۔ پتا نہیں اس سے کیا کہا ہے کہ وہ حویلی سے جا رہا ہے۔" وہ جلدی جلدی بولی۔

"حویلی سے جا رہا ہے۔ کہاں؟" زمین ماہین کے پیروں تلے کھسکنے لگی۔

"سرائے۔ کاکا جان کے پاس۔" وہ بہت پریشان تھی۔

"اوہ۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کچھ پیلے وہ سامان بھی تیمور علی خان کا ہے۔" ماہین نے طمانیت بھرا سانس لیا۔

"جی۔ کیا مطلب؟" روشی کی حیرت بجا تھی۔ ماہین کا جملہ اس کے لیے مبہم تھا۔

"وہ تو ہمیشہ سے حویلی ہی میں ہے۔ کاکا جان سے اس کا کیا تعلق؟" اس کے حلق میں الفاظ پھنسنے لگے۔ "اس کے ماں باپ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟" یہ سوال تو اسے کبھی بھی بہت مضطرب کرتا تھا۔

اس نے عجیب اداس سے انداز میں ماہین کی صورت دیکھی تھی۔ "تیمور علی خان کا سامان۔"

"مطلب یہ کہ وہ ان کے دوست کا بیٹا ہے۔ اس موضوع پر میں اس سے زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ تمہاری الجھن کو دیکھتے ہوئے اس کی پوزیشن کو کلیئر کیا ہے۔ یہ اور بات کہ تمہیں اس طرح کی معلومات سے کوئی دلچسپی نہیں۔" ماہین نے بے نیازی سے کہا اور اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"یہاں تو شاید یہ بات کسی کو نہیں پتہ۔ آپ کو کیسے پتہ چلی؟" روشنی نے حیرانی سے سوال کیا۔ "یہاں تو وہ یوں دیکھا جاتا ہے کہ جیسے بابا صاحب اسے منڈی سے خرید کر لائے تھے۔ اور کوکا جان کا دوست تو لازمی کے اسٹیٹس کا ہو سکتا ہے۔ اس سے چڑ کیوں؟" روشنی سرتاپا سوال ہو رہی تھی۔

"میں نے کہا ناں۔ میں اس موضوع پر فی الحال تم سے کوئی بات نہیں کر سکتی۔ لیکن بہر حال یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ مرا جا رہا ہے۔ یہ بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ میں عجیب سا سکون محسوس کر رہی ہوں۔" ماہین کے انداز میں بہت سکون تھا۔

"لیکن خالہ! یہ بھی تو پتہ چلے کہ بابا صاحب نے اس سے کیا معاملہ کیا ہے۔ اس سے تو آئیڈیا ہو گا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ سمجھیں ناں آپ؟"

"سمجھ لیں گے ہم۔ جب بات یہاں تک پہنچ ہی گئی ہے تو اب یہ تمہاری دردسری نہیں رہی۔ میں جا رہی ہوں اس کے پاس۔ تمہیں الجھنے کی ضرورت نہیں۔" ماہین نے پاؤں بیڈ سے اتار کر سلیپر پہنے۔

روشنی خاموش رہی مگر فکرمندی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

ماہین باہر آ کر سیدھی ہادی کے کمرے کی سمت بڑھی۔ دروازے پر دستک دی اور جواب "یس" کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

ہادی سوٹ کیس پر جھکا ہوا تھا۔ چونک کر پلٹا تھا۔ ماہین کو دیکھ کر خفیف سے انداز میں مسکرایا۔

"ہیلو جنٹلمین۔ کہاں کی تیاری ہے؟" وہ بھی جواباً مسکرائی۔

"اپنے لیگل فادر کے پاس۔" اس نے مسکرا کر کہا اور سوٹ کیس میں چیزیں رکھنے لگا۔

"یہ کیا ہوتا ہے؟" وہ بیڈ پر بکھرے سامان پر نظریں دوڑا رہی تھی۔

"غالباً باپ کا دوست ہوتا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"ابھی ہم قانون کے 'بچے طالب علم' ہیں مگر تمہاری اپروچ ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہارا خوشگوار موڈ بتا رہا ہے کہ دادا صاحب سے بڑے اچھے لطیفے سن کر آ رہے ہو۔ ایک آدھ ہمیں بھی سناؤ۔" وہ ایک طرف پڑی لیدر چیئر پر بیٹھ گئی۔

ہادی نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر دوڑائی اور یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ "غالباً آپ کو ہیڈ لائنز مل گئی ہیں۔ خان لطیفے سناتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ وہ تو تعزیرات اور یا کچھ دہرائے بھر یا ایکٹ ایٹس سوالات اور فلاں سناتے ہیں۔"

"یا اللہ! تمہارے تو ایک ایک جملے میں وکالت سما گئی ہے۔ بہت برائٹ فیوچر نظر آ رہا ہے۔" ماہین نے سر تھام کر کہا۔

"اب یہ بتاؤ۔ تم پر ان کے جبریہ قوانین میں سے کون سی دفعہ لگی ہے۔ جو یہ پیکنگ ہو رہی ہے؟" وہ اصل بات کی

طرف آئی۔

"بے عقلی کی دفعہ نمبر ایک سو ایک۔" وہ مسکراتے ہوئے کپڑے تہہ کرنے لگا۔

"ہاں یہاں کے آئین کے پہلے صفحے پر بے عقلی کے قانون کی تشریح ہے۔" ماہین نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے یہاں کا آئین اتنی جلدی کیسے اسٹڈی کر لیا۔ حیرت ہے۔" اس نے جلدی جلدی کپڑے سوٹ کیس میں ٹھونسے۔

"اپنی اپنی ریڈنگ پاور ہے۔ دل بڑا رکھو تو دادو... سوال نہ کرو۔" ماہین نے بڑے سادہ انداز سے کہا۔

"او کے۔" ہادی بے ساختہ ہنس دیا۔ "بعض اوقات وقت کی کمی کے سبب جان بوجھ کر انجان بننا پڑتا ہے۔ اس وقت اسی قسم کی صورتحال ہے۔"

"تمہارا اطمینان دیکھ کر رشک پیدا ہو رہا ہے۔ اتنا اعتماد ہے اپنی ذہانت پر؟" ماہین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ذہانت پر نہیں اللہ پر۔ نصر اللہ نہ ہو تو ذہانت کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔"

"ماشاء اللہ تمہیں شعر سوالات بھی ہو۔ ہمیں اپنے دادا کی اس اضافی خوبی پر دلی مسرت ہوئی۔"

ماہین۔ خاصی دیر کی گھٹن کے بعد کھلکھلائی تھی۔

ہادی بھی جھینپ کر مسکرا رہا تھا۔

"وقت سوالیہ نشان کے بڑی تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔" اس نے شریر انداز میں کہتے ہوئے سوٹ کیس بند کر دیا۔

"سرائے میں سب سے تمہاری اسی طرح دوستی ہے جس طرح حویلی میں ہے؟" ماہین نے اچانک اس سے غیر متوقع سوال کر دیا۔

ہادی چند لمحوں کے لیے ساکت سا ہو گیا تھا۔ ہونٹ بھینچ کر اس نے ماہین کی سمت دیکھا تھا۔

"جی۔ انکل علی خان کے بچوں سے۔" اس سے جھوٹ نہ بولا گیا۔

"کتنے بچے ہیں خان کے؟" ماہین جیسے کسی گہری نیند سے جاگی۔

"وہ یہ تو معلوم ہونا چاہیے تھا آپ کو۔ میرا امتحان لے رہی ہیں؟" اس نے اس سے نظریں چراتے ہوئے سوال کیا۔

"اب اتنی بھی سوالات انفارمیشن نہیں ہیں میرے پاس۔" ماہین نے قدرے اطمینان سے جواب دیا۔ "کیا نام ہیں ان کے اور کتنی عمریں ہیں؟" اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔

"تیمور علی، منصور علی خان عمر بارہ سال۔ ضوفشاں عمر آٹھ یا نو سال۔"

"کون سی بیوی کے بچے ہیں؟" ماہین نے بڑے اعتماد سے سوال کیا تھا۔

ہادی نے چونک کر اس کی صورت دیکھی تھی۔ لیکن اس طرف اس طرز کی نگاہ تھی کہ اس کی نگاہیں ٹھٹک گئیں۔

"نیتاں کی فارنر بیوی کا ہے اور بیٹی۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"زندہ و گور ہوں گی۔" ماہین نے طنزیہ انداز میں اس کا ادھورا جملہ مکمل کر دیا۔

"چلو خیر۔ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ ان کا کسی سے تو کوئی تعلق ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم بیٹھو۔ ہم بھی آج ہیں سو جائے۔"

اگرچہ باری افسردہ تھا مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔

"باری!"

"جی!"

"جب تم وہاں جاتے ہو تو کیسا محسوس کرتے ہو؟" ماہین نے گہری سوچ میں ڈوبے اس سے یونہی پوچھ لیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میرا تو وہاں کوئی ضروری کام ہوتا ہے تو وہاں جاتا ہوں۔ خان سے ملنا ہوتا ہے اور بس۔"

"خیر اور بس تو نہیں۔ وہ تو عنقریب ہم خود ہی دیکھ لیں گے۔" وہ باری کو اور زچ کرتے ہوئے خود دیکھ رہی تھی۔

"چھوڑو ان سب باتوں کو مجھے راز کی بات بتاؤ کہ اتنے بڑے واقعے سے ہو گزرنے کے بعد بھی بڑے خان سے ملنے کے بعد تم پر تو کوئی اثر ہی دکھائی نہیں دیتا۔ حالانکہ مجھے اندازہ ہے کہ انہوں نے کس انداز میں تم سے بات کی ہوگی۔ اس کا ثبوت بھی یہ ہے کہ تم حویلی سے جا رہے ہو۔ اگر تم اس سب سے خود کو خوش دل ظاہر کر رہے ہو اور حقائق کو مجھ سے اور روشی سے چھپا رہے ہو کہ ہم پریشان ہوں گی تو میری حد تک یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ مجھ سے چھپاؤ گے تو خود مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ میں تمہاری مدد بھرپور بھی کر سکتی ہوں۔ اس لیے کہ اگر نکاح میں روشی کی ماں کی مرضی اور موجودگی ثابت ہے تو روشی تو اس فعل پر روشی کو شاباشی نہیں دے سکتے تھے۔ مگر اب تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کی سپورٹ کروں اور تم ہو کہ ہنستے ہوئے بتاؤ مجھے کیا بات ہوئی ہے؟"

وہ بالآخر اصل بات پر آ گئی تھی۔ باری کو امید نہیں تھی کہ وہ یہ بات کرے گی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بات کیا ہے اس کو ظاہر نہ کرنے سے۔

وہ باتھ روم کی طرف بڑھ چکا تھا شیونگ کی چیزیں اٹھانے کی غرض سے۔ مگر ماہین کا حرف حرف اس نے بغور سنا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بہر حال اتنا نہیں ہوا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ کہ خان کا اعتبار ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ اصل میں میں ابھی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تیمور خان نے کہا تھا کہ وہ اسٹیپ بائی اسٹیپ آگے بڑھیں گے۔ فرسٹ ٹرم سے تعلق توڑنے کے لیے بڑے خان سے بات ہو گی پھر اس کے بعد وہ اس کیس پر بات کریں گے کہ اس میں روشی اور روشی کی۔۔۔"

بولتے بولتے یکدم وہ رک گیا۔

"ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے میں سمجھ رہی ہوں۔ روشی اور روشی کی ماں کی پسند اور اتفاق الوقت ہے۔"

"کیوں کہ ابھی تک تیمور خان کا اسٹیٹمنٹ بڑے خان کے سامنے نہیں آیا اس لیے بڑے خان بہت دکھ میں ہیں اور مجھ سے اس قدر ناراض ہیں کہ ان سے بولا بھی نہیں گیا۔ اصولی سی بات ہے۔ میں اپنے حساب سے درست ہوں تو وہ اپنے لحاظ سے ٹھیک ہیں۔ یہ المیہ صرف فیوڈل سسٹم کا نہیں ہے۔ لوئر مڈل کلاس میں بھی مل سکتا ہے۔ ہم جس پر ترجیح کرتے ہیں

سب سے پہلے اس کا وہ پاسپورٹ ضبط کرتے ہیں جس پر اس کی شناخت بحیثیت انسان ہوتی ہے۔ اور تمام انسانی حقوق صرف انہی کے لیے مختص ہوتے ہیں جو خرچ کرنے کی پاور رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں تو جنگل جو ہے اس کا قانون اصل میں رائج ہوتا ہے۔ ایک لمحے کی خاطر پورا کا پورا انسان گروی ہوتا ہے۔ اس کی وفا کا معیار یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام اخلاقی حقوق سے دستبرداری کا مظاہرہ کرے۔

اس لحاظ سے تو وہ اپنی جگہ درست ہیں۔ تیمور خان نے میرے انسان ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ یا کوئی اور بات ہے مجھے نہیں معلوم لیکن انہوں نے مجھے محسوس ہی کرایا ہے کہ میں ان سے الگ نہیں ہوں۔ بنیادی چیز یہی ہے۔ اصل تعلق تیمور خان سے ہے۔ لیکن بڑے خان نے بھی مجھ سے بہت محبت کی ہے۔ اور کچھ ان کی محبت کی ہے جو شروع سے حویلی میں ہوں۔ تیمور خان کو تو میں بہت فاصلے پر محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے خان مجھے خود اپنی گود میں اٹھا کر گھماتے پھراتے تھے۔ میری باتوں پر ہنستے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ غلام سے تو ایک انتہا بے تکلف نہیں ہوتا۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ بڑے خان واقعی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ورنہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو جانے کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔ انہوں نے نرمی سے پیش آ کر یار خان کے غصے کو دبا دیا ہے۔"

باری ماہین کے مقابل بیٹھ کر بہت تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ شاید پہلی بار۔ اس میں ماہین کے بہت سے سوالات کے جواب بھی موجود تھے۔ وہ بہت غور سے سن رہی تھی۔

"اور حقیقت یہ ہے کہ اس معرکہ آرائی سے میرے "کاز" کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔" وہ مسکرایا اس جملے سے واضح تھا کہ وہ جانتا ہے ماہین کہاں تک اپروچ رکھتی ہے۔

"باری ابھی تو چاہ رہا ہے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ بلکہ روشی کو بھی ساتھ لے چلوں۔ اور اس حویلی میں کیا کام مگر صرف روشی کی خاطر مجھے بہت محتاط ہونا پڑ رہا ہے۔ یار علی خان کی صف میں کھڑے ہو کر مجھے روشی کی جنگ لڑنا ہے۔ جو تم اس کے ساتھ ہوا ہے جب گہرائی میں سوچتی ہوں تو ایسا لگتا ہے دکھ سے دل بند ہو جائے گا۔"

"میں جانتا تھا کہ رات کے پچھلے پہر آپ حویلی کے پچھواڑے ہوتی ہیں۔ میں جان کر انجان بنا رہا کہ شاید آپ کی وجہ سے وہ بدگمانی کی دوزخ ٹھنڈی ہو جائے جس کی تپش سے بے گناہ و گناہگار ایک ساتھ جھلس رہے ہیں۔" باری نے ماہین کو جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

"میں نے بہتر سمجھا کہ جاتے جاتے آپ کو بتا دوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"باری احتیاط رکھنا۔ مجھے صد فی صد یقین ہے یار صاحب کیس ضرور کریں گے۔"

"اللہ کرے۔ اللہ سے دعا کریں کہ اب حویلی میں مزید تماشے نہ ہوں۔" باری نے بے ساختہ گفتگو کا رخ بدل دیا تھا۔

"آمین۔ ثم آمین۔" ماہین نے ایک ایک حرف پر زور دے کر کہا۔

"ویسے دوسری پارٹی بہت مضبوط ہے۔ اس نے حویلی کے در و دیوار ہلا دیے ہیں۔ جارحانہ جنگ کرنے والوں کو بھی جنگ پر مجبور کر دیا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"ہوں۔ تو یہ وجہ ہے کہ مسکراہٹ ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ فیصلہ کن اچھا پسند اور بے اختیار لوگوں کی اولاد ہے۔ ماہ رخ سچ کا اسم ہی ہوگا۔ اولاد تو آئینہ ہوتی ہے۔ اگر اس آئینے میں اپنی صورت اچھی محسوس نہ ہو تو پھر آئینے کا کیا قصور ہوا ہوتا ہے۔ قرآن میں واضح لکھا ہے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی۔ دیسے کہتی ہے ہر شے اپنی فطرت پر لوٹتی ہے یوں بھی ہوتا ہے کہ کئی پشتوں کے بعد کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے پچھلے کسی دادا کی شکل پر ہوتا ہے ناں اس کی شکل کا۔ لوگ تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ اپنے فلاں دادا پر گیا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے لوگ صورت پر تو تبصرہ کرتے ہیں عادات کی مماثلت پر کم توجہ دیتے ہیں۔ اب یہاں المیہ یہ ہے کہ باپ دادا سے مماثلت رکھنے والا بچہ ان کو نہیں بھاتا ہے۔ اب یہ اس کی مصلحت ہے۔ کیوں؟" ماہین بہت سنجیدہ تھی۔

"اختلاف کے لیے اپنے پاس کوئی دلیل نہیں پاتا۔ آپ کے پاس تفکر کرنے والا ذہن ہے۔ آپ نے ضرور اس طرف غور کیا ہوگا۔" ہادی نے خوبصورت انداز میں اتفاق کیا۔

"ہمیں تو لوگوں کی بہادری نے شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے۔ کوشش کر رہے ہیں مدد اور کسی اپنی کسی کوتاہی کو۔" اس نے اٹھ کر سوٹ کیس لاک کیا۔

"ابھی چلے جاؤ گے؟" ماہین نے پوچھا۔

"شیور۔" وہ ہاتھوں سے اپنے بال سیٹ کرنے لگا۔

"بہت مجبور ہو ہادی۔ اللہ تمہیں ہمت دے۔ اور خدا کرے کہ یہ معاملہ باعزت طریقے سے خوشگوار انجام سے ہمکنار ہو۔" ماہین اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں اب تو یہی دعا کر رہے ہیں کہ "ہمکنار کر یا بے کنار کر۔"" وہ ہنس دیا اور وزنی سوٹ کیس کھینچ کر لے چلا۔

"کوئی پیغام تو نہیں دینا اس طرف؟" ہادی نے سوٹ کیس اٹھا کر اس کا وزن جانچتے ہوئے پوچھا۔

"تھینکس۔ اب ہم خود ہی پہنچیں گے۔ اچھا میں بھی چلتی ہوں۔ روشی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" ماہین نے سر پر دوپٹہ درست کیا۔

ہادی کسی خیال میں کھو گیا تھا۔

"بس ایک بات ہے پسند فرمائیں تو پہنچا دیجیے گا۔ کہ کوشش میں کسر نہیں ہوگی لیکن جو نتیجہ سامنے آئے اسے قبول کریں اور مزید کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو حویلی والوں کے لیے ناقابل برداشت سزا ہو۔ کسی کے اعمال کی بازپرس کر کے سزا تجویز کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ بحیثیت انسان ہم اپنے حق کے لیے صرف جدوجہد کر سکتے ہیں۔ بس۔"

"خدا حافظ" وہ سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔ ماہین لب بستہ سی کھڑی تھی۔

اتنی لمبی ڈرائیو کے بعد تھکاوٹ ہونا فطری سی بات تھی۔ کچھ اندر کی اکھاڑ پچھاڑ سے بھی اعصاب شل تھے۔ اس نے ملازمین سے بھی کوئی بات چیت نہیں کی۔ ان میں سے ایک کو سوٹ کیس اپنے کمرے میں پہنچانے کا کہہ کر تیزی سے زینہ

چڑھ گیا تھا۔

شاور لے کر تھکن اتارنے کے موڈ میں تھا۔ اس کا کمرہ صاف ستھرا تھا جیسے اس کی آمد کا منتظر ہو۔ وہ حویلی میں اس کا بیڈ روم بہت سادہ اور عام سا تھا جبکہ سرائے کی چھوٹی حویلی میں اس کی خواب گاہ دیدنی تھی۔ ایک وسیع کمرے میں لائے گئے جہاں کھڑکیاں بھی کھلی تھیں اور ان سے خوبصورت روشنی آتی تھی ہو جاتے تھے۔ خواب گاہ کی ایک چابی ہمیشہ اس کے پاس ہوتی تھی۔ جب بھی آدھی رات کو وہ یہاں آتا تو صرف ایک آدھ ملازم ہی کو اس کی آمد کی خبر ہو پاتی تھی۔ وہ گیٹ کے اندر داخل ہو کر گاڑی پورچ میں کھڑی کرتا اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ دن چڑھے گھر کے مکینوں کو اطلاع ملتی تھی کہ ہادی آیا ہوا ہے۔

آج اتنی رات نہیں ہوئی تھی تقریباً تمام ملازمین نے اسے دیکھا تھا۔ اس کا سوٹ کیس کمرے میں پہنچ چکا تھا اور وارڈروب میں بھی اس کے کپڑے موجود تھے۔ وہ شب خوابی کا لباس نکال کر باتھ روم میں چلا گیا تھا۔

نہانے دھونے سے طبیعت میں کچھ تازگی کا احساس بیدار ہوا تھا۔ وہ تولیہ گلے میں ڈال کر گیلے بالوں کے ساتھ سوٹ کیس کھول کر کارپٹ پر دو زانو بیٹھا اپنی پڑھنے لکھنے کی چیزیں نکال کر ایک طرف ڈھیر کرتا جا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟ آجاؤ۔"

دروازہ کھلا اور سرائے کی بہت پرانی اور بوڑھی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

"سلام خان!"

"ہوں۔ وعلیکم السلام۔ خیریت کیسے آئی ہو بے بے؟" وہ مصروف انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"سعد خان میاں ابھی آئے ہو۔ میں کیا روٹی پانی پہنچا دوں۔" ملازمہ نے ادب و محبت سے جواب دیا۔

"بھوک نہیں ہے۔ بس ایک گلاس گرم دودھ پہنچا دینا۔" وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

"چنگا جی۔" وہ مزید کچھ بولے بغیر واپس پلٹ گئی۔

اسے گئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس نے جھنجھلا کر دروازے کی سمت دیکھا اتنی جلدی دودھ لے آئی۔ یہاں سے کچن تک پہنچنے ہی میں پانچ منٹ لگ جاتے تھے۔

"ہاں بھئی۔ آجاؤ۔" سوٹ کیس کا سارا سامان کارپٹ پر بکھر چکا تھا۔

"اس مرتبہ لگتا ہے قیام طویل ہوگا۔ مگر کیسے ہوگا۔ ہم تو ابھی تک تمہیں بھاگتا دوڑتا دیکھتے رہے ہیں۔ اور ماشاءاللہ کیسے رہے ہیں۔"

نازنین کی آواز پر وہ ایک دم سروقد کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم۔" وہ قدرے جھینپ سا گیا تھا۔

"میں سمجھا۔ کوئی ملازم ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"بے بے جی نے مجھے بتایا کہ تم بہت سارا سامان بڑے سے "بیگ" میں لائے ہو۔ اور کھانا کھانے سے انکار کر رہے ہو۔ کیا راستے میں کھایا تھا؟ جس وقت وہاں سے چلے ہو گے تو شام ہو گی۔ اور رات کے کھانے کا وقت بھی نہیں ہوا۔" نازنین دروازے ہی میں کھڑی تھی۔

"کھایا تو نہیں ہے مگر بھوک نہیں ہے۔ دودھ پی لوں گا۔ اب تو یوں بھی سونے کا وقت ہے۔ خان سو گئے؟"

"مجھے کیا پتا۔ دو دن سے نہیں دیکھا انہیں۔" اس کا موڈ یکلخت بدل گیا۔

"شکار پر گئے ہوئے ہیں؟" وہ اس کے انداز سے الجھن میں پڑ گیا۔

"خدا معلوم۔" وہ ناگواری سے گویا ہوئی۔

ہاری خاموش سا ہو گیا۔ اسے ماحول میں گھٹن سا محسوس ہوا تھا۔

"اور کیا خیر خبر ہے۔ تمہارا سامان دیکھ کر عجیب عجیب سے وہم آ رہے ہیں۔ روشی ماہین وہیں ہیں یا باہر چلی گئی ہیں؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"وہیں ہیں۔ شاید کل پرسوں چلی جائیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔

وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ براؤن ویلوٹ کے گاؤن میں وہ اسے بہت زیادہ سفید محسوس ہوئی۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ چہرے پر اضمحلال واضح تھا۔

"بابا صاحب نے تمہیں طویل قیام کی اجازت کیسے دے دی؟ تم تو راستے میں ہی ہوتے ہو اور ان کے فون آنا شروع ہو جاتے ہیں۔" اس کے انداز میں ایک کھٹک سی تھی۔

"کبھی کبھی وہ بھی ہوتا ہے جو کبھی نہیں ہوا ہوتا۔ اب کی بار ایسے بھی سہی۔" وہ ہنس دیا۔

"سچ سچ بتاؤ۔ کچھ ہوا تو نہیں؟" وہ جو ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔

"نہیں بھابی! کچھ نہیں ہوا۔ آپ زیادہ زور نہ دیا کریں ذہن پر۔ آپ کی طبیعت یوں بھی سیٹ نہیں رہتی۔"

نازنین کچھ سوچ کر بے ساختہ مسکرا دی۔ "تمہارے منہ سے بھابی سننے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ ابھی تم بولنا ہی سیکھ رہے تھے کہ مجھے سب کی دیکھا دیکھی بھابی کہنا شروع کر دیا تھا۔ بچوں میں تو کوئی بھی مجھے بھابی نہیں کہتا تھا علاوہ تمہارے۔ جب تم بھابی کہتے تھے تو سب بہت چڑتے تھے۔ کہ اسے منع کرو۔ لوگ کہیں گے تمہاری ساس کے ابھی تک بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر مجال تم باز نہیں آئے۔ حالانکہ میں تو کسی رشتے سے بھی تمہاری بھابی نہیں ہو سکتی۔"

وہ جانے کتنے عرصے بعد مسکرا رہی تھی۔

"کیا کریں۔ اب تو عادت ہو چکی ہے۔" ہاری نے مجبوری ظاہر کی۔

"چلو خیر۔ یہ تو طے ہے کہ تم اتنے سارے سامان کے ساتھ آنے کی وجہ تو بتاؤ گے نہیں۔ تم سے جرح بات بے کار ہے۔ میں چلتی ہوں۔ بے بے سے دودھ کے لیے کہہ دوں گی۔"

"جی۔ رات خاصی ہو رہی ہے۔ آپ بھی سو جائیں۔" ہاری نے جلدی سے کہا۔

"ہاں۔" وہ جاتے جاتے پلٹی۔

"جی؟"

"آپ کاکا جان سے کہنا وہ مجھے انگلینڈ بھیج دیا کریں۔ میرے ساتھ تم مہمان جیسا برتاؤ کریں۔ تمہاری تو وہ بہت سنتے ہیں۔ کل بھی مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔"

وہ طوفانی انداز میں کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔ ہاری جواب کے لیے ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔

دو دن بعد تیمور علی خان اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئے تھے اور نازنین سے کوئی بات کیے بغیر کپڑے وغیرہ لے کر باتھ روم میں چلے گئے تھے۔ نازنین بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹی خاموشی سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہی۔ اس نے خود بھی انہیں مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سوچوں کی یلغار سے یوں بھی اعصاب شل تھے کچھ کرنے سے بھی تھکن ہوئی تھی۔

وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد باتھ روم سے باہر آئے تھے اور نہانے کے بعد کے افعال سرانجام دے رہے تھے اسی دوران ان کی کال خوبصورت سُروں میں بجنے لگی۔ سیل کی آواز بھی کم کی ہوئی تھی اس وجہ سے کمرے میں معمولی سا ارتعاش ہوا۔

تیمور علی خان نے ریسیو اٹھایا تھا۔

"السلام علیکم۔ جی خیریت ہے۔ بچے ابھی گھر ہی ہیں۔"

وہ ٹہلتے ہوئے بیڈ پر بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ نازنین بالکل سرے ہی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے تیمور علی خان کا سامنا لیا تھا اور پیچھے کھسک گئی تھی۔ تیمور علی خان بیٹھ گئے۔

"جی۔ کب۔ آج۔ نہیں میری ملاقات نہیں ہوئی۔" انہوں نے ایک نگاہ نازنین پر ڈالتے ہوئے فون پر مخاطب کو جواب دیا۔

"دراصل ہم خیر آباد سے ابھی تھوڑی دیر ہوئی واپس آئے ہیں۔ ہوں بچے گیا ہو گا اپنے کمرے میں ہو گا۔ خیریت؟"

نازنین خاموش لیٹی ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نوٹ کر رہی تھی۔ وہ فون کرنے والے کی طرف مکمل طور پر متوجہ تھے۔

"اوہ!" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"آپ کی خفگی بالکل بجا ہے برحق ہے۔ لیکن آپ کو تمام صورت حال معلوم نہیں۔ آپ ہمیں موقع دیں کہ ہم کچھ گوش گزار کریں۔" ان کی آواز سے ان کے اندر کی تبدیلی عیاں تھی۔

"ہم فون پر نہیں بتا سکتے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ فی الحال حویلی پہنچنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکے تو آپ ہر صورت انہیں کورٹ پہنچنے سے روکیں۔ ان کا کیس بہت کمزور ہو گا۔"

"ہم بتا رہے ہیں ناں آپ کو۔ دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو روشی کو شفٹ کر دیا جائے یا گھر میں مزید تماشا کیا جائے۔"

ان کے لہجے سے ہی جھلکنے لگی۔

"وہ کیس پہلی پیشی پر ہی ہار جائیں گے۔ اور یہ شکست ان سے برداشت نہیں ہوگی اور جو کچھ وہ اس کا سبب بنا ان کو دکھا پائیں گے۔" وہ بدستور خفگی بھرے لہجے میں کلام کر رہے تھے۔

نازنین اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ اس بار سفید پڑ چکا تھا۔ وہ بے تابی سے فون بند ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"آپ ان کے ہری پور روانہ ہونے سے قبل ہی ہمیں مطلع کیجئے ہم پہلی فرصت میں حاضر ہوں گے۔"

"بابا صاحب اور یہ کرائسس کی ہمارے ہاں گنجائش نہیں۔ فار گاڈ سیک، اپنے اصولوں پر نظر ثانی کرنے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے خود ساختہ اصول کسی وقتی مصلحت سے پیدا ہوتے ہیں جبکہ فطری اصول کا اطلاق ہوتا ہے اور اس سے ہی کرائسس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ آپ خود کو بیس ہونے سے بچائیے۔ ہرگز نہیں یہ سب ہماری سوچ کی اختراع نہیں۔ انگریزوں کا خدا بھی وہی ہے جو ہمارا ہے۔ ہم نے کہا ناں ہم خود حاضر ہوں گے۔ خدا حافظ۔"

تیمور علی خان ریسیور ہاتھ میں تھام کر جانے کیا سوچنے لگے۔

"روشی کو کچھ ہوا تو پوری حویلی کو عدالت میں کھڑا کر دوں گی یہ بھی کہہ دیجئے ادھر۔ اس کی صحت مجھ سے مختلف ہے اس کی قسمت بھی مجھ سے مختلف ہونا چاہیے۔" نازنین کا حویلی میں کوئی نہیں تھا مگر روشانے حویلی ہی کی ایک بیٹی ہے۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم حویلی میں پولیس بھیج کر روشی کو یہاں بلوا سکتے ہیں مگر بابا صاحب کی موجودگی میں ہم یہ نہیں سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو قائل کر کے وقت کی نزاکت کا احساس دلا کر۔ اس وقت کی نزاکت کا جب یہ اقدام ہوا تھا۔"

"آپ کی ہم سے ناراضی اس کیس پر اثر انداز تو نہیں ہوگی؟" ان کی بات کے اختتام پر نازنین نے فوراً سوال کیا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ جس بات پر ناراضی جائز تھی جب وہاں نہیں ہوئی تو۔ جی تو یہی چاہتا ہے واقعی آپ سے بات نہ کریں۔ مگر اب تو فطرت ہمیں ایکسپلائٹ کر رہی ہے۔"

وہ شانے سے تولیہ اٹھا کر بال خشک کرنے لگے۔

"ہاری کب پہنچا، کچھ پتا ہے؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"گیارہ بجے سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ وہ تو میں پہلے ہی کھٹک گئی تھی کہ اتنا سامان لے کر تو وہ کبھی نہیں آیا۔ اب بابا صاحب کے فون سے میرا شک درست ثابت ہو رہا ہے۔ کیا ہوا ہے؟" وہ ان کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

"وہی جو ایک روز ہونا ہی تھا۔ روشی کے والد صاحب کو پتا چل گیا ہے۔ روشی کے نکاح کا۔ اب وہ ہم پر مقدمہ دائر کرنے والے ہیں۔ ڈی سی صاحب اس گمان میں ہیں کہ عدالتیں ان کی جیب میں ہیں۔ ہو سکتا ہے مگر جج ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"مگر وہ گھبرا ہی گئے تو؟" نازنین نے پریشانی ظاہر کی۔

"تو پھر اپنے آپ گھریں گے۔ اس مرتبہ حساب کتاب دوسرا ہے۔ مقابل کوئی اور نہیں ابھی کا آنا ہے۔ ہم نے

تو جانے میں ان کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ روشی کو دو سال اندھیرے میں رکھ کر جو ہم نے دیکھا تھا انہوں نے نہیں دیکھا۔ وہ اعتقاد حد تک بھولا ہے۔ وہ خود کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ انہیں روایتوں کی عادت ہے جن کے ہاتھوں ایک صد پوتی ہونے والی ہے۔ اگر ہماری کا مسئلہ ہوتا تو ہمیں پھر بھی ایک امید ہوتی کہ بابا صاحب کی مداخلت سے یہ حادثہ ٹل سکتا ہے مگر ڈی سی صاحب کی صاحبزادی کے لیے ہاری کو وہ رعایت کبھی نہیں دی جا سکتی تھی کیونکہ اس کا باپ ہمارا دست راست ہے حویلی میں اس کی قدر زیادہ ہی اس پر پلی ہوئی تھی کہ سب کو یقین تھا حویلی کی کسی لڑکی کے لیے اس کا بیٹا نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی اولاد بھی ایک ملازم سی کو دوں میں اس گھر میں داخل ہوا تھا مگر ہم نے کبھی اسے ملازم سے مختلف نہیں رکھا۔

"میرے سامنے تمام منظر ہے کیا کریں اس جیسی کا۔" نازنین نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی۔

"تاریخ کی کتاب میں روشن باب کے ساتھ ساتھ سیاہ اوقات کا باب بھی ہوتا ہے جو ہمیشہ ایک ہی جلد میں ہوتا ہے۔"

تیمور علی خان نے تلخی سے کہا۔

"مگر میں نے کچھ دیکھا نہ سوچا اگر سوچا تو صرف یہی کہ میری بچی کو خوشی ملنا چاہیے۔ اسی لیے میں نے آپ پر دباؤ ڈالا اپنے خاندانی فیصلوں کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ بھی کہا کہ ہاری مجھے ہمیشہ سے پسند ہے وہ ذہین کچھ اور اسمارٹ ہے کہ مجھے ہمیشہ سے دیکھ کر خیال آتا تھا کاش روشی کی شادی اس سے ہو سکتی۔ میری بچی کو ان کی ضرورت تھا ماننا چاہیے۔

تیمور دیکھیں اب میرے بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ روشی کو کسی قسم کا نقصان پہنچا تو میں تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دوں گی اور یاور علی خان کے حق میں اٹھ جاؤں گی۔ تہس نہس کر دوں گی سب کچھ۔"

جذبات کے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"نازی، ایزی۔ آپ اتنا کانشس نہ ہوں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ رنجیت کیا کرتا ہے۔" تیمور علی خان نے تسلی دی۔ اور اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

"صوفی کا موڈ کیسا ہے، پتا ہے آپ کو؟"

"بچے اپنی ماں سے زیادہ دیر موڈ آف نہیں کرتے۔ آپ خواہ مخواہ اتنا اپ سیٹ ہو گئے تھے۔ بالکل بھی صحت نہیں کرتے آپ کو کتنی اذیت ناک گزری ہیں یہ پچھلی راتیں۔" نازنین کی آواز بھر آگئی۔

"کتنی پیاری! کتنی اوسط ہے ہماری بچی۔ ہم اس پر ہر ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمیں علم ہے آپ نیچو کو کبھی ناراض نہیں کریں گی ایک حساب سے ہمارا خیال کیا جائے گا۔ اس کیس میں آپ بہت کانشس ہوں گی۔ صوفی کو وہ اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے جیسا چاہیں گی سلوک کر لیں گی۔ مگر صوفی بھی نیچو کی طرح صرف ہماری بچی ہے۔ آپ نے خود پر ظلم کرنے، خود کو سزا دینے کے لیے جو دو رخ اپنے چاروں طرف کھڑا کیا تھا۔ اس میں ہمت کر کے تو ہم نے رکھا تھا۔ خواہ اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہم اس اذیت ناک احساس سے نجات چاہتے تھے کہ ہمیں بہت بے دردی سے استعمال کیا گیا ہے۔ ہمیں کسی طرح تو کوئی تو ریلیف چاہیے تھا۔ کہ جس محبت پر اعتماد کر کے ہم لندن واپس پہنچے تھے۔ اور بے نیازی سے کام لیا تھا پہلے ہی مرحلے میں وہ جڑ سے اکھڑ گئی تھی۔ دوسرے لوگوں کے الزامات سے ایسی اذیت نہیں پہنچی تھی جتنی اس الزام سے پہنچی کہ

لندن لا روز ہوتے ہی عیاش ہیں۔ بہت سمجھایا تھا اس بیٹے پر کر لیتے اور ہم احمقی کی اصول کے پیچھے محبت کا آئینہ ہے صرف ایک ایسا رشتہ جو شخص کا قطر پر تھا۔ رقابت کا یہ حال تھا کہ نازنین احمد وہاں لندن میں ہمارے بیڈروم میں ہر وقت موجود ہوتی تھی۔

ہم نے زندہ وہ جو بیٹا تو وہ اس کے پاس موجود۔ اس کی اصل اہمیت میں اور اسے ہمارے ہونے کا یقین نہیں تھا، کیسا انتقام حیرت ہے۔ محبت کے اس سراب سے گزرنے کے بعد تو ہم بالکل خالی ہاتھ تھے۔ دولت، جاگیر، بیٹا۔ پھر بھی خالی ہونے کا اذیت ناک احساس۔ واپس آئے تو ایک خالی وجود کے خالی پن کو اس طرح محسوس کیا جیسا کہ محسوس کرنا چاہیے تھا۔ وہ خالی وجود جو خود ساختہ مقبرے میں قید تھا۔ جسے اپنے نقصانات گننے کے دوران بھی ہمارے نقصانات گننے کا خیال نہ آیا۔ پھر وہ صنوبی پر اپنا حق جتانے تو ہمیں کیسے غصہ آئے۔"

نازنین حیرت سے تیمور علی خان کو دیکھ رہی تھی۔ ایسا اور اتنا تو وہ کبھی نہیں بولے تھے۔ بڑی سے بڑی بات پر ان کے پاس خاموشی ملتی تھی۔ جتنی بڑی بات اتنی گہری خاموشی۔

"یقین کریں ہم نے تو کبھی آپ سے کچھ نہیں چاہا۔ بس اتنا ہی چاہا تھا کہ دکھ دینے والے کے گرد بیٹھ کے لیے ایک آگ بھڑکا دوں مگر آپ لندن میں اپنے پارٹنر کے ساتھ خوش رہیں۔ میں تو مر کے نکلی تھی اس حویلی سے۔ یاد رہا کہ والدین سے خط و کتابت یہاں آ کر بھی کچھ عرصہ جاری رکھی۔ اپنی موت کا پیغام بھی خود بھجوایا اور پھر بابا صاحب کو منع کیا۔ پابند کیا۔ مجبور کیا۔

تو اس میں حیرت کیا۔ یاور علی خان نے تو میرے وجود سے روح اسی دن کھینچ لی تھی۔ جس دن۔" وہ یکدم خاموش ہو کر آنسو پینے لگی۔

"مگر ہم نے تو آپ کو زندہ وجود تسلیم کیا۔ جو آپ کا حق بنتا تھا وہ دینا چاہا۔ ورنہ لیزا کے سامنے آپ کے وجود کا ذکر کیوں کرتے۔ تو آپ نے خود کو بے روح دوسروں سے تسلیم کروایا تو ہم سے نہیں۔ مردے نکاح ناموں پہ دستخط نہیں کرتے۔"

تیمور علی خان کے لہجے سے تلخی چھلکنے لگی۔

نازنین۔ چند ثانیے کو خاموش سی ہو کر رہ گئی۔

"نکاح کے وقت جو سوچ آپ کی تھی وہ صرف آپ کی تھی ہماری نہیں۔ جو کچھ ہوا جن حالات میں ہوا اس کے لیے ہم نے عرصے تک اپنا مائنڈ سیٹ اپ کیا ہے۔ آپ کیا سوچتی ہیں۔ آپ کیا کرنا چاہتی ہیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ رہا روشی کا معاملہ۔ اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم فیس بھی کریں گے ہینڈل بھی کریں گے۔ ہم جلد ہی حویلی پہنچیں گے۔ مگر اب آپ کو احساس ہو جانا چاہیے کہ انسان فرض کر لینے سے نہیں مرتا۔ آپ زندہ ہیں۔ ابھی کرائسس میں یہ حقیقت بھی سامنے آ سکتی ہے۔ اس کے بارے میں سوچا ہے؟"

تیمور علی خان بالوں میں برش کرتے ہوئے سوال کر رہے تھے۔

"تھینکس گاڈ۔ جھوٹ بس سچ ہوا ہی چاہتا ہے۔ میرا جواب اب ماہین کی ذمہ داری ہوگی۔ وہ بچوں کو ہینڈل کرے گی۔

مجھے یقین ہے وہ دن کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے گی کہ ان کی ماں کے کردار پر کوئی داغ نہیں۔ ایک علاج آ رہا ہے بچوں کی کوشش کی تھی مگر حسرت کی کہانی ہے۔

میرے پاس محبت بھی ہے اور ایک بہت حساس دل۔ اب بولنے والے پارٹنر بھی۔ کہ میرے آنسوؤں میں بھی اس کے عکس پڑ رہے ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہے احساس تذلیل سے میں پاگل ہو کر گلیوں کی خاک چھانتی۔ میں اپنی عظمت پہ ضرور ہوگی کہ مجھے دونوں کی عزت افزائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں اس خواب کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی کہ آپ لندن میں وقت گزار رہے ہیں اور میں روشی اور جواد کے ساتھ ہوں گی اور یہ کہ تمام عمر بابا صاحب کی موجودگی میں پیچھے کوئی نہیں بچے گا۔ مگر کسی نے بھی کچھ نہیں کیا۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ "آپ کو بھی چھوڑ ہی میں نے سر پہ ہاتھ چلا۔ کہ کس حد سے بچوں کا سامنا کروں گی۔ ایسی شرمناک باتیں نہیں کہ نفسیاتی طور پر جو وہ جب لکھے گئے۔ اس عمر میں گزرے کی موجودگی میں ان کی گرد میں بھی رہیں گی۔ یہ سب اس شخص کو سوچنا چاہیے تھا مگر مجھے سوچنا پڑا۔ آپ بلاوجہ کے لیے مجھے اتر کے جانے پر مجبور رہے ہیں جبکہ مشکل … آسانی میں اعلیٰ وہ کہ کس خوشی سے سرشار رہتی ہوں۔"

"یہ تو خودکشی ہے۔ خود غرضی ہے۔ صنوبی کی خاطر بھی آپ کے اندر جینے کی امنگ بیدار نہیں ہوتی۔" تیمور علی خان واپسی پر کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔

"روشانے اور جواد کے باپ سے بہت بہتر صنوبی کا باپ ہے۔ میرے بغیر وہ پرورش ہو سکتے ہیں تو پھر صنوبی تو زیادہ بہتر ماحول میں ہے۔"

"آپ ان دلائل سے خود کو بہلا سکتی ہیں۔ مگر ہم اسے صرف آپ کی خود غرضی کہیں گے۔" وہ اٹھے اور بیڈ کی جانب جانے لگے۔

"اتنی بڑی بڑی باتیں سنی ہیں۔ یہ تو بڑا معصوم سا الزام ہے۔" نازنین پر گویا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"ماہین بھی کسی روز بس یہاں پہنچنے والی ہیں۔ اس طرف کچھ سوچا؟"

انہیں معلوم تھا کہ یہ موضوع کبھی مکمل نہیں ہوگا لہٰذا انہوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

"بے چاری ماہین۔ کیا عمر ہے اور کیا جوکھم۔ جتنی دیر جاگتی رہتی ہوں یہی سوچتی رہتی ہوں۔ بچے میں اللہ کی مہربانی الجھی رہتی ہیں۔ کیا دیکھا تھا اس نے۔ کیا جاگیر، اگر دل نہیں مانتا۔ بس ایک بات ہی ہے جس پر دل گواہی دیتا ہے۔ اس شخص کے اندر ایک انتقام کی آگ روشن تھی۔ بیس سال سے کہ میں نے اس الزام کو سچ کر دکھایا تھا۔ میں نے تو اس لیے کیا تھا کہ اس نے ناحق میری چادر تار تار کی تھی مگر اس نے میری بہن کو گھیر کر بیس سال بعد اتنا قرض چکانے کی کوشش کی ہے۔ اس شخص کے اندر جذبات صرف ایک شکل میں ہیں اور وہ ہے انتقام۔"

"کیا فائدہ ان باتوں کو بار بار دہرانے کا۔" تیمور علی خان لیٹ چکے تھے۔ انہوں نے پھر گفتگو کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

"کتنی پیاری آواز ہے اس کی۔ خود کتنی پیاری ہوگی۔ جانے کون ہے وہ جس نے اسے عید دیا ہے۔ کون ہے حویلی میں

اس کا دھرو۔ مگر یہ دھروا اس وقت کہاں تھا جب ڈی سی صاحب اس سے شادی کر رہے تھے۔ جیسے ہی یہ خیال آتا ہے بے ہاتھ ملتی ہوں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی مجھے لعن طعن کرنے آ رہی ہو؟" ایک نیا خدشہ بیدار ہوا۔

"مائی گاڈ بس۔ ایسا کچھ غلط نہیں کیا ہم نے۔ وہ جتنا ہمیں اپنا سمجھ رہی تھیں ہم انہیں نہیں سمجھ رہے تھے جبھی ادا سے دلی مجبور پر ستائی۔"

تیمور علی خان نے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں میرے احساسات کہاں جا سوئے ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں جاگتا اندر۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اوہ نو۔" سومو کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ "تم نے خود سنا؟" روبی سوئی سے دریافت کر رہی تھی۔

"بڑی امی بشیر چچا کی دلہن سے باتیں کر رہی تھیں۔ اوپر لاؤنج میں۔ یقین میری تو آنکھیں کانپ گئیں۔"

"مائی گاڈ۔ یہ نہیں پتا چلا کہ یہ عظیم واقعہ کب ہوا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حویلی میں روشی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ اکیلی کہیں بھی نہیں جاتی۔ بیری پور میں باری نہیں ہوتا۔" سومو نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"اوہو۔ پوری بات تو سنیں سومو باجی!" سوئی جھنجھلا گئی۔

"کاکا جان کے ہاں نہیں گئی تھی روشی؟" اس نے سوالیہ انداز میں یاد دلایا۔

"ہوں۔ ہوں۔" بیک وقت کئی آوازوں نے تائید کی۔

"ان دنوں کی بات ہے۔" سوئی نے بات مکمل کی۔

"لیکن۔ ایسا کیوں ہوا۔ کاکا جان نے حصہ کیوں لیا وہ تو پاور ماموں سے نہیں ملتے پھر روشی۔" کالی نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں نے نکاح کر کے کاکا جان کے ہاں پناہ حاصل کی ہو۔" حنا کی سوچ ایک اور انداز میں ظاہر ہوئی۔

"تو نکاح بھی قتل کے برابر ہو گیا کہ مفروروں کو پناہ کی تلاش ہوئی۔" تانیہ کو اس خیال پر سب سے زیادہ اعتراض ہوا۔

"ہائے نی۔ میں تاں مر جاواں۔ اڈے گوری چاچی نے تکیں۔"

مریم نے شوخی کے پردے میں اپنی حیرت ظاہر کی۔ اور زور سے سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

"اچھا اسی لیے وہ نعیم کا ذکر تک سننا پسند نہیں کرتی تھی۔ اب سب کو اس کے موڈ کی ریزن سمجھ آنے لگیں۔"

"اوہ۔ مجھے تو چکر آ رہے ہیں۔" نازک طبع سومو نے سر تھام لیا۔

"گھو آپا کہاں ہیں۔ انہیں بھی تو پتا چلنا چاہیے۔" حنا نے سا گھو کی غیر حاضری کی طرف متوجہ کیا۔

"سے بی پاسبل۔ انہیں آل ریڈی پتا ہو۔ گھر کی خواتین انہیں راز داری کے معاملات میں شامل رکھتی ہوں۔ تب۔

زری آپی۔ کہیں آپ کو بھی تو پہلے سے خبر نہیں تھی۔" ہیبے نے پوچھا۔

"مائی گاڈ بس۔ میں تو خود بھی یک حیرت سے تھر تھری ہوئی ہوں۔ اس شاک لگنے سے پہلے سست گھو۔" زری نے کمال پردہ پالی دی۔

ابھی دھماکہ حاصل ہوئیں۔ عقل میں دھماکے کا کوئی تھا سرا دستیاب کی تفصیل ہو رہی تھی۔ اس سب کا اندر بہت کچھ گڈ مڈ سی کی گتھی سی نظر آتی تھیں۔ مگر آج تو ایک دوسرے میں یوں الجھی تھیں کہ ایک سرا پکڑنے کو ہاتھ بڑھاتی تو دوسرا ہاتھ سے نکل جاتا۔ آج وہ سب دکھائی دیتی ہیں۔ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتی ہوئیں۔"

"آپ آ رہی ہیں جب خبر بھی نئی ہو گی۔" حنا نے ان میں قرار دوڑانے کی کوشش کی۔

"چلو اب کوئی تازہ خبر آئے تو جلدی بتانا۔" وہ مشتق ہوئی اور صوفے پر جا بیٹھیں۔

"نکاح کے بعد تو گویا امر یکسی دریافت ہو گیا۔ کولمبس کے سارے تجسس ہی ختم ہو گئے۔" سماں کی آنکھوں میں اشتیاق سے بڑھ کر سخت مایوسی ہوئی۔

"آپ تھیں کہاں سچ سے؟" تانیہ نے غیر حاضری کی طوالت کا اندازہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"مامیں امی کر رہی جا رہی ہیں۔ ان کی ہیلپ کر رہی تھی پیکنگ میں۔ اس سے پہلے اپنی امی کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور اس سے بھی پہلے روشن خالہ کے ساتھ کپڑے کتروا رہی تھی اور۔"

"بس۔ بس۔ ہمیں پتا ہے اس سے پہلے آپ حکومت کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ کیا کہنے آپ کی سرکاری نیم سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات کے۔" سومو نے چڑ کر بیچ میں ٹوکا۔ "مگر کسی کام کی نہیں آپ کی مصروفیات۔ تک کے پیچھے سے لوگ ہوا لے گئے لوگ۔" جانے کون سی حسرت کی لہٹ سے بے چارہ نکالا گیا تھا۔

"اتنا چھوٹا سا واقعہ تھا؟" وہ مسکرا گئیں۔

"روشی بھی جا رہی ہے ممانی کے ساتھ؟" ہیبے نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ ماموں کے ساتھ بری پوری جا رہی ہے۔" گھو نے جواب دیا۔

"ممانی کے ساتھ کیوں نہیں جا رہی؟ اب کون سا اس کے ایگزام ہو رہے ہیں۔ یا رخصت ہونے سے پہلے ماں جی کی خدمت کا حق ادا کرنے کا ارادہ ہے۔"

"آپ کے ذہن میں یقیناً آیا ہو گا کہ نعیم کے ساتھ رخصت ہونے والی ہیں محترمہ۔ جی نہیں انہیں باری صاحب کا سماج سے دور لے جانے والے ہیں۔" سومو کو گھو تک بات پہنچانے کی بہت جلدی تھی۔

"بھئی لڑکی کو کسی نہ کسی کے ساتھ رخصت تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ نعیم نہ سہی باری سہی۔" گھو نے ایک اور چھوٹا قہقہہ لگاتے ہوئے بہت رسانیت سے جواب دیا۔

"دیکھا ہم تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ تایا کو پتا ہو گا۔ انہیں بڑا اعتبار حاصل ہے حویلی میں۔ کھلی فرصت میں ہمراز بنایا جاتا ہے۔"

"اچھا۔ کب سے پتا ہے آپ کو؟" تقریباً سب ہی تجسس سے نظر آنے لگی تھیں۔

"آج ہی پتا چلا ہے۔" ان کے چہرے پر قدرے سنجیدگی نظر آنے لگی۔

"آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟" حنا نے تعجب سے پوچھا۔

"حیرت نہیں دکھ۔ کہ اتنا پیار کرتی ہے روشی مجھ سے اور اس نے اتنی اہم خبر اپنی زندگی کا اہم واقعہ مجھ سے چھپایا۔" گو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"ایسی باتیں تو کبھی چھپتی نہیں ہیں۔ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ کیا کچھ ہوگا۔"

معصومہ ہمیشہ کی طرح بولتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ کن سوئیاں لینے کی عادت میں اتنی طاق تھیں کہ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی بہت کچھ سن لیا کرتی تھیں۔

"فرشتوں سے راہ و رسم ہوگی آپ کی۔ ہم نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔"

روبی کو ان کا یہ جملہ محض تبصرہ کرنے کی ایک فضول سی کوشش محسوس ہوا۔

"یاور ماموں سخت غصے میں ہیں۔ باری سرائے جا چکا ہے۔ کاکا جان آنے والے ہیں۔" مونا نے خصوصی بلیٹن نشر کیا۔

"کاکا جان کی انوالومنٹ کے معنی سمجھ میں نہیں آ رہے۔" زری نے گو کی سمت دیکھا۔

"میرے سائیں اللہ! اتنی بڑی بات روشی کب سے پیٹ میں لیے پھر رہی تھی اس کا پیٹ بھی نہیں پھولا۔ اگر ہمارا نکاح ہو جاتا تو ہمیں تو ہر ایک کو بتانے کی جلدی ہوتی کہ اب ہم تجھے تنگ نہیں رہے۔"

"گاۓ۔" تانیہ نے روبی کے پہلو میں گرہ لگائی۔ تذکرہ تانیہ کی خامی پر متوجہ کیا۔

"اے۔ ذرا صبر کرو۔ روشی کو تو آ جا کر لاؤ۔ اس کی کمپنی کرتے ہیں۔ پھر تو وہ ہری پور چلی جائے گی۔" مریم نے کہا۔

"شاید وہ آنے نہیں دے؟" حنا نے سوال کیا۔

"تو پھر ہم چلیں گے اس کے کمرے میں۔" ہینے فوراً حل دیا۔

"اس بے چاری کا کیا قصور۔ باری نے اسے کیسے پٹا لیا۔ اسے بابا صاحب کا خوف بھی محسوس نہیں ہوا۔" مونا سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"اے خدا کا خوف نہیں آیا۔ تم بابا صاحب کی بات کر رہی ہو۔ جس تھالی میں کھانا اس میں چھید کرنا۔" معصومہ کے لہجے کی تلخی آج بہت بڑھی ہوئی تھی۔

"یہ کون سے روحانی یا انسانی قانون میں لکھا ہے کہ نکاح کرنے سے تھالی میں چھید ہو جاتے ہیں۔" مونا نے تنگ کر پوچھا۔

"نکاح کرنے سے نہیں۔ نکاح کرنے کے طریقۂ کار سے۔" معصومہ بھڑکانے والی تھیں۔

"نان سینس۔ روبی ستاری تھی۔ کاکا جان نے خود نکاح پڑھوایا ہے۔" زری نے جواب دیا۔

"ظاہر ہے وہ بے چارے کیا کرتے۔ دونوں نے انہیں بھی رضامند ہی ہونا کر لی۔ بے چارے بلیک میل ہو گئے ہوں گے۔"

"کاکا جان بلیک میل کرتے ہیں نہ ہوتے ہیں۔ اصل اعتراض ہے وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اور وہ ری چال غور طلب ہے کہ جب دونوں نے نکاح کر لیا تھا تو خود اپنے زور بازو پر سرائے جا کر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

"کبھی بھی کر سکتے تھے۔ اہمیت تو اس بات کی ہی ہوتی ہے کہ نکاح سرائے میں کیوں ہوا؟" کوئی بہت ساری کوئی دلیل تھی۔

اور یہ کچھ ایسا تھا کہ چند لمحوں کے لیے گہرا سکوت طاری ہو گیا جیسے سب کچھ سوچ رہی ہوں۔

"کاکا جان اتنا بڑا کام کیسے کر سکتے ہیں۔ آل ریڈی ان کے تعلقات یاور ماموں سے خراب ہیں۔ تم ہمیں کیا اصل بات بتاتی ہے کہ باری ایسا چہارم ہے۔ تو وہ دشمنوں کی طرح ہے۔ روشی کو تو اس کی ہر بات بری لگتی تھی۔"

"یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے۔" معصومہ ہنسیں۔ آج تو سر سے پاؤں تک زہر سے تیلی ہوئی تھیں۔

"کچھ بھی ہے۔ بے وفائی۔ روشی نے ہم سے اتنی اہم بات چھپائی۔"

"خطرے بھی تو بہت ہیں۔ اس لیے چھپائی ہوگی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یاور ماموں اس نکاح کو رسمی کے انجام تک پہنچنے دیں۔" معصومہ نے مستقبل کی پیش گوئی کی۔

"اللہ نہ کرے۔ باری سے کسی کی کیا دشمنی۔ اتنا اچھا تو ہے۔" ہینے معصومیت سے کہا۔

اسی وقت ماہین اندر داخل ہوئی۔ "اچھا بھئی ہم تو چلے۔ روشی کا خیال رکھنا۔ ویسے تو وہ بھی رات کو ہری پور چلی جائے گی۔"

زرد اور پنک کے پھولوں والے ڈریس سوٹ میں ملبوس ماہین گہرے رنگوں کے باوجود بہت تھکی تھکی محسوس ہوئی۔

"واپسی کب ہوگی؟" وہ سب کھڑی ہو گئیں۔

"دیکھو۔" وہ زبردستی مسکرائی تھی۔ "کوئی اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔" وہ اسے قریب قریب بیٹھی تھیں کہ دیکھنے والا بھی محسوس کرے کہ وہ چپکے چپکے کوئی بات کر رہی ہیں۔

"روشی آپ کے ساتھ نہیں جا رہی؟" تانیہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کے پیا کی مرضی نہیں۔ خیر۔ بہت مزا آتا ہے جب یہاں آتی ہوں تم لوگوں سے باتیں ہوتی ہیں۔ جو دیر تک یاد آتی ہیں۔"

اچانک بالو سیاہ بڑی سی چادر لپیٹے ماہین کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ "بی بی۔ خان کہہ رہے ہیں کہ جلدی کریں۔"

"یاور ماموں آپ کو کراچی چھوڑنے جا رہے ہیں؟" گلو نے پوچھا۔

"ائیرپورٹ تک جا رہے ہیں۔ بالو جا رہی ہے میرے ساتھ۔" ماہین نے بتایا۔ "کراچی میں اس کی ماں کا بھی گھر ہے۔ اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر آؤں گی۔ سفر سے انسان کو بہت متلی آتی ہیں۔ اسے ایک سفر نے بہت حقیقی بنا دیا ہے۔"

ماہین مسکرا کر بالوں کی سمت دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

تمام لڑکیاں ماہین کو باہر تک خدا حافظ کہنے آ گئیں۔

روشی اور ممی بھی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ماہین کے چلے جانے سے ایک تو خود کو بہت تنہا اور غیر محفوظ سا محسوس کر رہی تھی۔ کہیں بابا صاحب کا بلاوا تو نہیں آ گیا۔ وہ لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔

"اوہ!" ان سب کو سامنے پا کر اس نے گہرا سانس لیا۔ اور ایک طرف ہو گئی۔

"پھر کہیں جانے کا پروگرام ہے؟" وہ ان کو ایک ساتھ دیکھ کر ہی کہہ گئی۔

"ہاں۔ پیا گھر جانا ہے۔" روبی تیزی سے بولی۔

وہ دل ہی دل میں حیران سی ایک کونے میں جا بیٹھی۔

"میدان مار کر کونے میں چھپی بیٹھی ہو۔" گڈو نے ایک دھپ لگائی۔ اور بیٹھ گئیں۔

اس نے حیرت سے باری باری سب کو دیکھا۔ کچھ کچھ سمجھ میں تو آیا۔ مگر وہم کو یقین کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ خود کو بہلایا کہ کوئی اور بات ہو گی۔

"آخر اسے حویلی سے بے دخل کروا کر ہی دم لیا۔" سمو نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ روشی کے سینے میں عجیب سی دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔

"دونوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ پہلے تم سرائے پہنچ جاؤ۔ اور پھر نکاح ہو جائے۔ مگر یہ کالا جان پر کون سی جادو کی چھڑی گھما کر بھاگ کر قاضی کو پکڑ لائے۔" زری نے بھی جھاڑ جھپاڑ میں شرکت کی۔

"خیر جب یہ ہو ہی گیا تھا تو واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں سیاسی پناہ کی درخواست کیوں نہیں دی؟" روبی نے ایک فاش غلطی کی طرف متوجہ کیا۔

"سماجی پناہ کی۔" لالی نے تصحیح کی۔

"چلو جی۔ اب دریا کیسے پار ہو گا۔ تمہارے پاس کچا گھڑا بھی نہیں۔ حشر نشر کر دیں گے بابا اور ماموں۔" مریم نے امکانی نتیجے سے خبردار کیا۔

روشی سر جھکائے سب کی سن رہی تھی۔ مگر خاموش تھی۔

"تم تو پاگل ہو۔ سب سیٹ کر لیں گے۔ سیٹ ہو جائیں گے۔ وہ بے چارا تو مفت میں مارا گیا۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں۔ اتنا بے خوف کر دیا تھا تمہیں اس نے۔ کیا خواب دکھائے تھے۔ ایسا لگتا تو نہیں تھا۔" زری نے پھر کہا۔

"ہائے اللہ کتنی رونق تھی اس سے حویلی میں۔" سمو کو گم گشتہ رونقیں یاد آنے لگیں۔

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم لوگ تو مسلسل تاریک پہلو پیش کیے جا رہی ہو۔" گڈو نے روشی کے چہرے پر نظر ڈال کر ان

سے کہہ دیا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب بن ٹھن کر کچہری جا تو سکتی ہو۔ چاروں طرف جا جا کر آئے گی ہے۔" روبی نے چھیڑا۔

"ہوں تم بھی خاص رنگ میں سے سجی رہی ہو۔" تانیہ نے روبی کو گھورا۔

"تم تو۔ جو اچھا ہوتا ہے سب ہی کو اچھا لگتا ہے۔ ہمارے ساتھ تو اس کا کوئی ہمیں بھی بہت اچھا لگتا ہے کر رہا۔" سمو نے

ہو۔" روبی چپ کر گئی۔

"وہ رہے۔ تھوڑی۔ ابا بھی بحال نہیں ہوا۔ سب سے پہلے ایک اس کو بھلا کر بھی ان کے بارے تو شروع سے کوئی

کھانا کھا رہی تھی۔"

پانی پی کر لوٹ گئی۔ وہ سب بھی بیٹھ گئیں۔

"مگر ہمیں تو گڈو پا سے بھی بڑی والی آپا کا افسوس ہوتا ہے۔ ہم اپنی ہی کوئی کمی کے وقت کہتا ہے۔"

"کا دل دوا تو۔" گڈو نے گویا سر پیٹ لیا۔

"یہ تم لوگوں کو شروع سے جو محسوس ہوا ہے وہ بتاتا ہے۔ اب روشی سے پوچھتے ہیں کہ شروع سے اسے کیا محسوس ہوا تھا۔" تانیہ نے ٹوکا۔

"تو یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسے شروع سے جو لگا ہو گا۔ اس پر تو عمل کیا ہے۔"

سب نے لطیفے کا لطف اٹھایا۔ بے ساختہ قہقہے گونجنے لگے۔

روشی ہنوز خاموش بیٹھی تھی۔

"لوگ تمہارے احساسات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ تم بھی تو کچھ بولو۔" گڈو نے اسے ٹہوکا دیا۔

روشی نے گڈو کے شانے سے سر ٹکایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "خاموش ہو جائیں آپ لوگ۔ سب کی سب ظالم ہو گئی ہیں۔"

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سب کی سب ایک دم شرمساری ہو کر ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگیں۔

"ارے تم تو مذاق کر رہے تھے۔ سچ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ واقعی وہ تو بہت اچھا ہے۔ بلکہ ہم تو حیرت سے فوت ہونے کے قریب ہیں کہ اتنا بڑا کام کیسے ہو گیا؟"

گڈو نے اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے پچکارا۔

"سچ ہم تو نکاح کی کہانی تمہاری زبانی سننے آئے تھے۔ اور تمہاری مجبوری کو سراہنے آئے تھے کہ کسی حرکت سے پتا نہیں تھا کہ تم دونوں کے بیچ کوئی خاص رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ واہ بھئی واہ۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ۔ بابا صاحب نے تو تمہیں نہیں بلوایا ابھی تک؟" گڈو نے پوچھا۔

روشی نے نفی میں سر ہلایا۔

"بلائیں گے تو خیر ضرور۔" مریم نے وثوق سے کہا۔

"ظاہر ہے ڈانٹ ڈپٹ کے لیے بلائیں گے۔ فیصلہ تو امی کے پاس محفوظ ہے۔" کائی نے کہا۔ "ان کے حساب سے تو یہ ایک قیامت ہے۔"

"کوئی محفوظ نہیں ہے۔ فیصلہ بس ہو چکا۔ ایک بڑی سیدھی سی بات تھی جو ان سب نے دل کرا الجھادی۔ زیادہ سے زیادہ شوٹ کریں گے۔" روشی نے آنسو پونچھتے ہوئے فلسفی انداز میں کہا۔

"تمہاری بات۔ اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ یہ سب ہوا کیسے۔ آئیڈیا کس کا تھا؟" گلو نے اپنے آنچل سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔

مگر روشی کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اس کا کچھ بتانے کا موڈ نہیں ہے۔

"بی بی! ہوائی جہاز میں تو مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ میں تو بس کلمہ پڑھتی رہی۔ اتنا تیز اڑتا ہے مگر پتا ہی نہیں چلتا، توبہ اللہ۔" بالو ماہین کے سر میں تیل ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "تو پتا بھی نہیں چلا کراچی آ گیا۔ اتنی دیر میں تو کراچی سے اوکاڑہ پہنچتے ہیں ویگن میں۔"

ماہین مسکرادی۔ "میں تو سمجھ رہی تھی تجھے مزا آئے گا۔ مگر تیری تو جان سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔"

"تو بی بی! جہاز بھی تو آسمان سے لٹکا ہوتا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

ماہین نے بہت لطف محسوس کیا۔

"بی بی! اتنے بڑے گھر میں صرف نوکر رہتے ہیں۔"

"ہاں زیادہ تر۔ وہ تین مہینے کے لیے میرے بھائی آتے ہیں۔ یہ جو بڑی بی ہیں۔ یہ پاکستانی نہیں ہیں نیانی کی خاص ملازمہ تھیں یوگنڈا میں۔ نعمان بھائی انہیں یہاں لے آئے۔ گھر کے مالک کی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں۔ بلکہ میری تو پرورش ہی ان کے ہاتھوں میں ہوئی ہے۔ وہ جوڑا کا ہے وہ یہیں کا ہے۔ ایک عورت صبح کو آتی ہے وہ رات تک رہتی ہے۔ دیکھو کیسا چمک رہا ہے گھر۔"

"نام کیا ہے ان بڑی بی کا؟"

"رانکا!" ماہین نے بتایا۔

"جیسے ڈانکا ہوتا ہے۔ لو بتاؤ، کہاں ڈائن کہاں ڈانکا۔" بالو اپنی نکتہ رسی پر خود ہی ہنسی۔

ماہین بھی مسکرادی۔ "بھئی وہ ڈانکا نہیں ہے ڈاؤنا ہے۔ گیارہ بج گئے بالی گاڈ۔ اچھا تم جا کر سو جاؤ۔ میں ایک ضروری فون کرلوں۔" وہ بڑبڑا کر کارپٹ سے اٹھی۔

"کہاں۔ اپنے سسرال کریں گی؟" بالو نے تیل کی بوتل کا ڈھکنا لگاتے ہوئے پوچھا۔

"سسرال بھی سمجھ لو اور میکہ بھی۔" وہ دوپٹا اٹھا کر فون کی سمت بڑھی۔ دل میں ایک عجیب سی دھکڑ پکڑ شروع ہو چکی تھی۔ اتفاقیہ فون وہ جان بوجھ کر کر رہی تھی تاکہ تیمور علی خان گھر سے باہر گئے ہوئے ہوں تو واپس آ جائیں۔ گیارہ کا نام بھی کچھ

اتنا برا نہیں تھا۔ اب بھی وقت تھا کہ شاید وہ ویسی ... کر سکے۔ یقین تھا کہ وہ اس سے کبھی محبت نہیں کر سکے گی۔

اس نے دھڑکتے دل سے نمبر ڈائل کیا۔ دو تین مرتبہ کی بیل کے بعد ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔

"ہیلو!" تیمور علی خان کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ماہین نے طمانیت کا سانس بھرا۔

"السلام علیکم۔ ماہین بات کر رہی ہے۔"

"وعلیکم السلام۔ کراچی پہنچ گئیں۔ خیریت سے۔ اکیلی ہو یا روشی بھی ساتھ ہے؟"

اس مرتبہ تیمور علی خان بالکل اپنے سے محسوس ہوئے۔ ایسا لگتا تھا گویا اس کے فون ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

"جی بالکل اکیلی۔ اب وہیں چھوڑ آئی ہوں۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟" تیمور علی خان کے لہجے سے یوں محسوس ہوا جیسے انہیں دھچکا لگا ہو۔

"آپ تک پہنچنے کے لیے شارٹ کٹ اختیار کیا ہے۔" وہ ہنسی۔

"یہ شارٹ کٹ ہے؟" تیمور علی خان اس لطیفے سے محظوظ ہوئے تھے۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ آپ کے حساب سے یہ بہتر اقدام ہوگا۔ اب پتا ہے کب پہنچ رہی ہیں۔ ہم منتظر ہیں۔"

"واقعی۔ بہت خوشی ہوئی یہ سن کر۔ آپ یہ بتائیں ان کو بھی لے آتے ہیں را... یہ باتوں باتوں میں۔" وہ اس مرتبہ کھل کر ہنسی۔

"یہ بہت اچھی زبان کی کتاب ہے۔ بیس سال سے اٹک اٹک کر پڑھ رہے ہیں۔" تیمور علی خان بہت دلچسپ انداز میں جواب دے رہے تھے۔

"بہت خوب آپ کلام اور یت ہمیں دیکھنے کو کل صبح تک۔ کیونکہ کل سہ پہر ہم بڑی حویلی جا رہے ہیں۔ بابا صاحب نے بلایا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کس سلسلے میں۔"

"جی۔ جی۔ بلکہ جتنا جلد پہنچ سکتے ہیں پہنچ جائیں۔"

"جی۔ ماہین ہیں۔ بات کریں گی؟" تیمور علی خان ماہین کے بجائے کسی اور کی سمت متوجہ تھے۔ ناتاشہ کی طرف۔

ماہین کا دل چھلانگیں مارنے لگا۔ بلکہ اس کے سارے وجود پر لرزش سی طاری ہو گئی جو اس کی جذباتی کیفیت کی غماز تھی۔

اس کی ایک ایک حس سماعت بن گئی۔

"ہیلو!" ایک نرم اور احتیاط بھری آواز میں۔

"السلام علیکم۔" ماہین کو خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟" آواز بہت دھیمی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟" وہ بہت اشتیاق اور خوشی سے کلام کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہوں میں بھی۔ کب آ رہی ہو ادھر؟" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب چکی تھی۔

"آپ کو بھلا میرے آنے سے کیا دلچسپی؟ آپ تو تمام جذباتی تقاضے ایک انتقام کے عوض رہن رکھ چکی ہیں۔"

ماہین کی آواز بھی بھر آگئی۔ دوسری طرف سے سسکیوں کی آواز سنائی دی پھر فون بند ہو گیا۔ ماہین نے بھی تھکے تھکے انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

بالو کمرے سے جا چکی تھی۔ ماہین انگلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

روشی نے بہت چھوٹا سا سوٹ کیس پیک کیا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھی۔ گلو نے اسے یاور علی خان کا پیغام پہنچا دیا تھا کہ ٹھیک ساڑھے دس بجے پورچ میں پہنچ جائے۔

ابھی دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ اس کے قدم گلو اور موتا کے مشترکہ بیڈ روم کی طرف اٹھ رہے تھے۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ موتا نے کھولا۔ گلو نماز پڑھ رہی تھیں۔

"آؤ روشی! ہم تمہارے پاس آنے ہی والے تھے۔ روبی وغیرہ بھی نماز پڑھ رہی ہیں۔" موتا اسے لیے اپنے پلنگ تک آئی۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے موتا جی!" روشی نے بہت آہستہ آہستہ آواز میں کہا۔ وہ نماز پڑھتی ہوئی گلو کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔

"ہوں۔ کہو۔" موتا نے بھی اس کا انداز دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔

"اگر ہو سکے تو آپ ہاری سے فون پر رابطہ کیجئے گا۔ اسے کہیے گا کہ اگر اس نے ہار مان لی۔ تو میرے باپ دادا بھی اسے کے لیے مجھے کھو دیں گے۔ یہ بہت کچھ کر ڈالیں گے۔ وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کریں گے جس سے وہ فتح مندی کا اعمل جیت سکیں۔"

"جس کے ساتھ اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ کمال ہے اسے نہیں جانتیں۔ اس کے پاس برداشت اور ذہانت کے بڑے موثر ہتھیار ہیں۔ اس کی فطری ذہانت جس ہوئی ذہانتوں کے مقابل ہے اسے کھلنے زور دینے تاکید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

گلو سلام پھیر کر یک ٹک اس کی سمت متوجہ تھیں۔ فوراً گلو اٹھ کر اگلی رکعتوں کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں۔

"آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ مفت کے اندیشے مت پالو۔ چلو باقی سب سے مل لو۔"

"اوہ!" وہ وال کلاک پر نظر ڈال کر ایک دم ہوش میں آئی۔ "بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔" وہ موتا کے ساتھ باہر آ گئی۔

گلو کے بے نیاز انداز اور اعتماد بھرے جملے نے گویا اس میں نئی روح پھونک دی تھی۔

جلدی جلدی سب کو خدا حافظ کہا اور پورچ میں آ گئی۔ سامان ڈگی میں رکھا جا چکا تھا۔ یاور علی خان پچھلی سیٹ پر فروکش تھے۔ وہ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ عالم تاب اور زبیدہ بیگم وہاں موجود تھیں۔ اس نے شیشہ نیچے کر کے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ عالم تاب کا انداز انتہائی سرد جبکہ زبیدہ بیگم کا معمول کے مطابق تھا۔

گاڑی پورچ سے باہر نکل گئی مگر وہ عالم تاب کے انداز پر ہی غور کر رہی تھی۔

"کہاں ہو پر کرو۔" یاور علی خان کا انداز مشفقانہ اور بہت دوستانہ تھا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے ... کے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا سارا اعتماد دم توڑ رہا تھا۔

یا شاید حالات نہیں سمجھے تھے یا کہ برابر میں بیٹھ کر کیسے کیسے گی۔ پتہ ہے کہ اس وقت وہ اس بات پر پریشان تھی کہ اگر گئے کہ وہ زبیدہ ساتھ ہے۔ اس پر اپنی خفگی کا اظہار بھی نہیں کریں گے۔ جبکہ شاید اس سے بہت ہی ڈر کر اسے برابر میں بیٹھے ہوئے باپ سے ایک نفسیاتی اور فطری خوف محسوس ہو رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ اس نے مسلسل اپنے دل کی دھک دھک اپنے کانوں سے سنی۔ بالآخر اس نے خود ہی خاموشی توڑ دی۔

"بابا جی! بھی نے کافی کا فلاسک بھی رکھا ہے۔ آپ کافی پئیں گے؟"

"ہوں ... نکال دو۔"

انہوں نے جیب سے گولڈن ہاف فریم کی نظری عینک نکال کر ناک پر ٹکائی اور لیدر کی فائل کھول کر اپنے زانوؤں پر رکھی پھر جیب سے پنسل ٹارچ نکالی۔ قلم فائل کی جیب سے کھینچا اور پنسل ٹارچ فائل پر ڈال کر مطالعہ کرنے لگے۔ گاڑی کی مدھم روشنی میں غالباً وہ احتیاط کے ضمن میں پنسل ٹارچ استعمال کر رہے تھے۔ اس لمحے وہ اسے اجنبی اور دور محسوس ہوئے کہ روشی نے کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے اتنا دور بے گانگی کی غیرت تھی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے رخساروں پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اجنبیت کے سبب اندھیرے میں وہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

تیمور علی خان تو صبح دس بجے ہی بڑی حویلی پہنچ چکے تھے مگر بابا صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ عالم جب کی خواب گاہ میں وہ بڑے بھائی اصیر علی خان، عالم تاب اور زبیدہ بیگم کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ وہ چاروں تیمور علی خان سے اس بحث پر ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔

"تمہیں تو اس معاملے میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کم ہوئی ہے تمہارے ساتھ؟" وہ سخت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"ہم کسی ایک فرد کے لیے کچھ نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے ساری حویلی کا سوال تھا۔" تیمور علی خان نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ "وہ بے وقوف لڑکی بہت کچھ کرنے کے در پے تھی۔ ہم نے تو بہت سے الزام اپنے سر لے کر بہت سے لوگوں کو ریلیف دیا ہے۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن سے قیامت تک کسی بھلائی کی امید نہیں۔

اور پھر اصولاً غیر فطری و غیر انسانی طرز عمل مشکلات ہی پیدا کرتا ہے۔ مسائل حل نہیں کرتا۔ اگر ہم اسے یہاں پہنچا دیتے اور وہ بعد میں کہیں اور چلی جاتی تو اس نقصان کی تلافی کی کوشش نہ ہوتی۔ ہم جان چکے تھے کہ وہ اپنے فیصلے پر بہت مضبوط ہے۔ اسے سمجھایا نہیں جا سکتا۔"

"بڑی حویلی میں صرف یاور علی خان نہیں رہتے۔ اور بہت سے لوگ بھی ہیں جن کی محنت سے بڑی حویلی کا بھرم قائم ہے۔ ضد کے جواب میں ضد یہ کوئی دانائی تو نہیں۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم بابا صاحب سے رابطہ کرتے۔ تمہیں اپنے سر مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت تھی۔" اصیر علی خان نے بھی اپنی دیرپا خاموشی توڑ دی۔

"اصیر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" زبیدہ بیگم نے جلدی سے یوں کہا جیسے وہ بھی یہی کہنا چاہ رہی تھیں۔

"یہ صرف ہمارا فیصلہ نہیں تھا۔ اس کی ماں بھی موجود ہے۔ جو ہمیشہ سے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش مند تھی۔ بچوں کے چھین لیے جانے پر جس نے ساری دنیا چھوڑ دی۔ روشانے کی ماں زندہ ہے اس حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں آپ لوگ۔" وہ زچ ہو کر گویا ہوئے۔

"ٹھیک۔ تو پھر تمہیں چاہیے تھا کہ اسے سرائے میں روک لیتے۔ اسے واپس حویلی میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔" بڑے ابا نے اپنا خیال پیش کیا۔

"مجھے ہمیشہ اس لڑکی کی سرکشی سے خوف آتا تھا۔ میں بابا صاحب سے کہا کرتی تھی کہ یاور سے کہیں اور روشی کو اپنے ساتھ رکھا کریں۔ اپنی نگرانی میں اس کی پرورش کریں مگر وہ ہمیشہ ٹال دیتے تھے۔"

عالم تاب نے اپنی سنہری چوڑیوں کو ہاتھ سے اِدھر اُدھر کرتے ہوئے ناگوار لہجے میں کہا۔

"بھائی بیگم اس طرح کے کیسز میں تو بچے کمپلیکس کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔" نصیر علی خان نے سمجھایا۔ "ہم تو تیمور کو کہہ رہے ہیں کہ انہیں یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔"

"جب وہ خود کو ہمیشہ کے لیے پس منظر میں لے جا چکی ہے تو اسے اکیلے ہونے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ بچے اس کے بغیر بہت سے اہم مرحلوں سے گزرے ہیں۔" بڑے ابا نے خاصے تند لہجے میں کہا۔

"اس نے بہت سے فیصلے دیوانہ وار کیے ہیں اور ایسے فیصلے ہمیشہ دکھ پہنچاتے ہیں۔ گناہگار و بے گناہ سب لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔" زبیدہ بیگم کا لہجہ تلخ تھا۔ تیمور علی خان نے بہن کا چہرہ بغور دیکھا۔

"اب ان باتوں کا مطلب بی بی جان؟ جلے ہوئے دشمنوں کی راکھ پر بیٹھ کر تعمیرِ نو کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ صرف ماتم نہیں۔"

"یاور بھائی رات اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ تعمیرِ نو کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔" نصیر علی خان نے اپنی دانست میں حقیقت کی جانب توجہ دلائی۔

"ہمارے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ وہ انہی کی اولاد ہے۔ اتنی آسان نہیں ہوگی ان کے لیے۔ محض وقت ضائع کریں گے۔ ہم نے ایک نگاہ میں اسے تول لیا تھا اور وہ اپنی اولاد کو نہیں سمجھ سکتے۔" تیمور علی خان کے لہجے میں تلخی تھی اور استہزا بھی۔

"یہ تو اسے شہہ دینے والی بات ہوئی۔ یوں کہو اس راستے تم نے بھی اپنی بھی کی بھڑاس نکالی ہے۔"

زبیدہ بیگم ایک کل کی لڑکی کو اتنی اہمیت دینے پر بھائی پر برس پڑیں۔ تیمور علی خان نے ایک نگاہ بہن پر ضرور ڈالی مگر خاموش رہے۔

"یاور کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مقدر سے بازی ہو گی ایک تماشا ہے بس۔ حاصل ندارد۔" بڑے ابا کسی گہری سوچ سے باہر آئے۔

"یہ منطق ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ انہیں سمجھانا اب ناممکن کیوں سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں سمجھانے کو سارا زمانہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ زیادتی در زیادتی کر گزریں کوئی انہیں کچھ نہ کہہ سکے۔ ہم نے یہ قدم اسی اسپرٹ کے تحت ہی اٹھایا ہے

کہ ان کے ہاتھوں زیادتی کا سلسلہ اب رک جانے۔ ہمیں اس بچی سے اپنی اولاد ہی کی طرح محبت ہے جو ماں باپ کی محبت سے محروم رہی ہے۔ دوسروں کی زیادتی کا براہِ راست شکار ہوئی ہے۔ ہم اس بچی کی زندگی کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو خوش نہیں کر سکتے مگر اس بچی کو دل ہمیشہ کے لیے اداس نہیں کریں گے۔ ہم خود غرض ہو جائیں۔ سب ہمارے کے سوا میں ہیں۔"

"تم نے جس معاشرے میں پرورش پائی ہے حویلی کا ماحول اس سے یکسر الگ ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو اتنی آزادی دینے کا رواج نہیں۔" بڑے ابا نے دو ٹوک انداز میں قطع کلامی کی۔

"پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا چاہیے کہ ہمارا ضابطۂ حیات مذہب کے تحت ہوتا ہے۔ یا اپنے بنائے ہوئے رواجوں کے مطابق۔ دو کشتیوں میں سوار ہو کر کشتی اور تیک سفر کیا جا سکتا ہے۔"

"مذہب لڑکیوں کے گھر سے فرار ہونے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔" عالم تاب بھی تڑپ کر بولیں۔

"وہ فرار نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے پاس آئی تھی۔ شادی کرنے کی نیت سے نہیں صرف اس خیال سے کہ اس کی شادی جو زبردستی کی جا رہی ہے اسے روک دیا جائے اور ہم اس کی نظر میں شاید اس قابل تھے کہ اس کے خیالات بابا صاحب تک پہنچا دیں اور شادی رکوا دیں۔"

"تو پھر تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ تم بابا صاحب سے بات کرتے ہیں۔" زبیدہ بیگم نے فوراً ان کی بات پکڑی۔

"مگر ہم تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھ رہے تھے کہ وہ شادی کیوں کرنا نہیں چاہتی۔ اور پھر ہمیں اپنے طور پر پتہ چل گیا کہ وہ حلیم الدین کے ہاں شادی پر کیوں رضامند نہیں ہے۔ اور اصل پیچیدگی تو یہیں سے شروع ہوتی ہے۔"

"اپنے طور سے کیا مطلب؟" نصیر علی خان نے چونک کر بھائی کی شکل دیکھی۔

"ہم وضاحت سے معذور ہیں مگر بات کا اعتبار کیا جائے۔" تیمور علی خان جز بز ہو گئے۔

"ہمارے ہاں اس قسم کی آزادی لڑکیوں کو نہیں دی جاتی۔" عالم تاب ناگوار لہجے میں گویا ہوئیں۔

"وہ کسی قسم کی معیوب حرکت میں ملوث نہیں پائی گئی۔" تیمور علی خان نے بے ساختہ انداز میں دفاع کیا۔

"یہ کیا کم معیوب حرکت ہے کہ وہ بلا اجازت حویلی سے نکل کھڑی ہوئی اور پیچھے چیخ و پکار چھوڑ دیا۔" عالم تاب بے ساختہ انداز میں گویا ہوئیں۔

"اسے بابا صاحب نے کام سے بھیجا تھا اسے روشی کے وہاں موجود ہونے کا علم نہیں تھا۔ یہ بات ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔" تیمور علی خان مضبوط لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"وہ یاور علی خان کی بیٹی ہے۔ اس کے معاملے میں تم نے مداخلت کر کے بہت برا کیا۔ کاش یہ بات تمہاری سمجھ میں آ سکتی۔" بڑے ابا تیز انداز میں کہہ رہے تھے۔

"وہ ہماری بھی کچھ لگتی ہے۔ ہم اس کے وجود کی حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے سارے اپنے ضد کی اصول میں لپیٹے ہوئے ہیں صرف اپنا اپنا سوچ رہے ہیں۔ یہ انتہائی ظلم ہے۔ ہمیں اپنے اقدام پر ہرگز کوئی افسوس نہیں ہے۔"

تیمور علی خان نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔

"تم نے برسوں پہلے بھی ایک غلط قدم اٹھایا تھا۔ اس کے زخم تمہیں آج بھی تنگ کرتے ہیں گے۔" ریحہ بیگم جیسے گویا ہوئیں۔

"اسی سبب تو اب دوسروں کو زخم خوردہ دیکھنے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ زخم کھایا ہے تو زخم کی سمجھ آئی ہے اس کا علاج چلا ہے۔" تیمور علی خان کا سکون کمال تھا۔

"تمہارے پاس اپنے دکھ کیا کم تھے جو ادھار مانگے لئے کھڑے ہوئے۔ میرے چاند جیسے بھائی میرے راج دلارے۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک۔ میری آنکھوں کے نور۔"

ریحہ بیگم بے تابی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور تیمور علی خان کا سر اپنے سینے سے لگا کر ان کے سر پر بوسے دیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

"تم سے سچی بات کرتی ہوں تو احساس گناہ سے مر مر جاتی ہوں۔ غصہ تو اس بات پر آتا ہے کہ تمہیں اپنے آپ پر رحم کیوں نہیں آتا۔؟" وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

"تم مجھ سے اتنے چھوٹے ہو کہ تمہارا لڑکھڑا کے چلنا بھی یاد ہے۔ جب اونچے پورے ہو کر میرے سامنے آئے تو میں نے نظر بھر کر دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور دعائیں مانگتی تھی کہ اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔ میرے شیر جیسے بھائی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میرا بھائی قدم قدم پر شکست پائے۔ مگر۔" وہ بلک رہی تھیں۔

تیمور علی خان نے انہیں تھام کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اور جیب سے رومال نکال کر ان کے آنسو پونچھنے لگے۔

"پلیز۔ بی بی جان وہ بھی ہماری اپنی ہے۔ خیر خواہی کے یہی جذبات اس کے لیے بھی ہونا چاہئیں۔"

"میری جان! مجھے تو اس وقت تمہاری پڑی ہوئی ہے۔ تمہاری ناآسودگی کے احساس سے میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔" وہ تیمور علی خان کے شانے سے پیشانی ٹکا کر پھر رونے لگیں۔ سب دم سادھے انداز میں دونوں بہن بھائی کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم بہت خوش ہیں۔ مت پریشان ہوا کریں۔ آپ روتی ہیں تو ہم بہت گلٹی فیل کرتے ہیں۔ اب تو ہم بالکل سیٹ ہیں۔ ہمارا مقصد حیات ہمارے بچے ہیں۔ ہر انسان کا نصب العین اس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ تو سنگ میل کی طرح راہ میں آتا ہے۔ او بھلی اب ہم سیٹ ہیں بڑی بزی لائف (مطمئن) ہوگی ہے لائف۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔ وہ بہت کوشش کرتے تھے کہ ان کی گفتگو میں انگریزی شامل نہ ہو مگر ایک عرصہ دیار غیر میں گزارنے ـــ کی وجہ سے ان کا مخصوص انداز گفتگو پختہ ہو چکا تھا۔ وہ بہن کو بہت دلسوزی سے سمجھا رہے تھے، بہلا رہے تھے۔

اسی دم ماما جی اجازت لے کر اندر داخل ہوئی۔

"چھوٹے خان کو بابا صاحب بلا رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔" ماما ایک مشفقی انداز میں

پلٹ کر معمول کی طرح پلٹ گئی۔

بڑے اور بصیر علی خان بھی تیمور علی خان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

عالم جاہ اور ریحہ بیگم اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ تیمور علی خان نے ایک طرف ہو کر پہلے بڑے بھائیوں کو گزرنے کا راستہ دیا۔ یہ بھائیوں کی جذباتی وابستگی ہی تھی کہ وہ تیمور علی خان کو باپ کے سامنے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

تینوں بابا صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے تینوں کے چہرے پر باری باری نظر دوڑائی تھی۔ الجھن ان کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ شملہ اتار کر اپنا سر سہلانے لگے تھے۔ تینوں کے سلام کا جواب بھی انہوں نے اشارے سے دیا تھا۔

"آؤ بیٹھو۔ بہت بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" ان کے لہجے میں کوئی خاص کیفیت نہیں تھی معمول کا انداز تھا۔

"اندازہ تو ہو گا تمہیں کہ کیوں بلایا ہے؟" انہوں نے اچٹتی سی نظر بیٹے پر ڈالی۔

"جی!" تیمور علی خان جی کہہ کر خاموش ہو گئے۔ وہ اور بصیر علی خان تھوڑے فاصلے پر تھے جبکہ بڑے بھائی باپ کے پہلو میں بیٹھ گئے تھے۔

"جو کچھ ہو چکا اس کی تفصیل دہرانا بے معنی ہے۔ ہم کس صدمے سے گزر رہے ہیں۔ یہ بتانا بھی ضروری نہیں۔ بات تو بس یہ ہے کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔ تمہیں برا بھلا کہنے سے اگر مسئلہ حل ہو سکتا تو ہم ضرور کہہ لیتے۔ یہ کیا کر دیا تیمور؟" وہ بے تسلسل سے بولتے بولتے یکدم خاموش ہو گئے۔

"مسئلہ یہی ہے بابا صاحب کہ حویلی میں مسئلے تو پیدا ہوتے ہیں مگر ان مسئلوں کا کوئی پرسولوشن نہیں نکالا جاتا بلکہ مسئلے کے جواب میں نیا مسئلہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ روشانے کی شادی ہوگی تو اس کی ماں کی مرضی سے ہوگی بس۔" تیمور علی خان کا انداز قطعی دوٹوک اور پرسکون تھا۔

"اور بس نہیں۔ روشانے کا باپ زندہ ہے الحمدللہ اور موجود ہے۔" بابا صاحب کے لہجے میں برہمی تھی۔

"اگر اس نکاح میں پوائنٹ آف آبجیکشن یہ ہے کہ اس کی ماں نے اس کیس میں حصہ لیا اس کے باوجود کہ اس نے بچی کی پرورش میں حصہ نہیں لیا تو یہ بالکل فضول ہے۔ اگر ماں نے اس کی پرورش میں حصہ نہیں لیا تو اس کے باپ ـــ نے بھی اس کے گرون اپ ہونے تک لاتعلقی اختیار رکھی۔ اس کی پرورش بڑی بی بی جان نے کی ہے۔ اگر پرورش کرنے والے کی پوزیشن ڈسکس ہو رہی ہے اور صرف اس کا رول ہی امپورٹنٹ ہے تو پھر بڑی بی بی جان کے علاوہ اس کیس میں کسی کو حصہ نہیں لینا چاہیے۔"

"ہمارے موجود ہوتے ہوئے کوئی بھی امپورٹنٹ نہیں ہے۔ یہ ہمارے خاندان کا مسئلہ ہے جس کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں ہے۔ علیم الدین کے ہاں رشتہ ہم نے طے کیا تھا یا دوسرے مشورہ تک نہیں مانگا تھا صرف اطلاع دی تھی۔ اور اس نے تسلیم کیا تھا اس نے ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ روشانے کے باپ کی حیثیت سے صرف خود کو

فیصلہ کرنے کا مستحق سمجھتا ہے۔ اور وہ جسے ہم نے بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھا کر خاندانی تحفظ دیا اس نے اتنی زحمت بھی نہیں کی کہ ہم سے اس موضوع پر بات چیت کرتی۔ آج وہ خود کو مکمل فیوڈل لیڈی سمجھ کر فیصلے کر رہی ہے جیسے سب مر چکے ہوں۔ اس کا کوئی بڑا اس پر موجود نہ ہو۔"

باباصاحب کے انداز سے غیظ و غضب جھلکنے لگا۔

"یہ فیصلہ کن پوزیشن شاید ہم نے انہیں دی ہے ان کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو ایک مٹی کے کھلونے جیسی پوزیشن کے ساتھ ہمارے حوالے کی گئی تھیں۔ ہم چاہتے تو توڑ کر رکھ دیتے۔ افسوس وہ عدی کے سارے رشتے اسکلیٹ ہو چکے تھے ان سے۔ مگر بیس سال کی طویل رفاقت کوئی معنی رکھتی ہے۔ انہوں نے تو تمام عمر کے ہم نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ان کی ہم سے کبھی کوئی ڈیمانڈ نہیں رہی۔ مگر ہم جانتے ہیں وہ ان دونوں بچوں کے لیے کتنا روئی ہیں جنہیں محض اتفاقاً ان سے دور کیا گیا۔ انہوں نے پہلی بار ہم سے کچھ مانگا' وہ بھی اپنی ذات کے لیے نہیں اپنی بیٹی کے لیے۔ جو ماں خود ظلم کا شکار ہوئی ہو وہ اپنی اولاد کے ساتھ زیادتی کے احساس ہی سے پاگل ہو جاتی ہے۔"

"مگر تم نے ہم سے تو کچھ کہا ہوتا۔" باباصاحب نے بات کاٹ دی۔

"اگر کوئی اچھا امکان نظر آتا تو ہم پہلی فرصت میں آپ سے بات کرتے۔ باباصاحب اپنا رشتہ۔ عبدالعلی محمدی کی اولاد ہے۔ ہمارے دوست کا بیٹا۔ اور ہمارے بھائی کا تو یہ حال ہے کہ سرائے سے گزر کر آنے والی ہوا میں سانس لینا بھی پسند نہ کریں۔" تیمور علی خان کا لہجہ تلخ ہونے لگا۔

"یہ غلط ہے۔ یاور ہاری کے لیے بہت نرم گوشہ رکھتے تھے۔" باباصاحب نے اختلاف کیا۔

"مگر کسی معتبر انسانی رشتے کے حوالے سے نہیں ایک غلام کی اندھی تابعداری اور اپنی غرض کی وجہ سے۔" تیمور علی خان نے فوراً کہا۔

"اتنے پڑھے لکھے روشن دماغ غلام بھلا کہیں ملتے ہیں۔" تیمور علی خان نے بھی بہت خفگی سے ناراضگی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ تم ہمیں الزام دے رہے ہو۔ ہم نے اس سے بہت محبت کی ہے۔ اسے اپنے ساتھ بٹھایا ہے۔ کھانا کھلایا ہے۔ وہ کہیں سے واپس آیا تو یہ تک نہیں پوچھا کہ کہاں سے آیا ہے۔" باباصاحب کے غصے نے دکھ کی جگہ لے لی۔

"جب وہ اتنا معتبر اور محترم ہے تو پھر جھگڑا کیا ہے؟" تیمور علی خان نے فوراً کہا۔

"جھگڑا یہ ہے کہ خاندانی لوگوں کے ہاں نکاح' یاور اس طرح نہیں ہوتے۔"

باباصاحب نے تائید طلب نظروں سے بڑے بیٹے کی سمت دیکھا۔ جن کی غیر جانبداری مسلّم تھی۔

"مگر خاندانی لوگوں کے ہاں پوزیشن اس طرح کی ہو کہ جیسے کہ ہماری اور روشانے کی تھی تو پیشنٹ فارمولے ترک ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی عجیب و غریب باتیں کبھی بھی سامنے آ سکتی ہیں۔" تیمور علی خان کی حاضر دماغی عروج پر تھی۔

"تیمور! تمہیں احساس ہے کہ ہم کس عظیم دکھ سے دوچار ہیں؟" باباصاحب کی آواز سے شکستگی سی جھلکنے لگی۔

"تم نے تو ہمارا جلال' ہماری آن' ہمارا اعتماد ختم کر دیا۔ اتنی محبتوں کے جواب میں یہ حق بنتا تھا ہمارا؟ یاور کو ہم سمجھا سکتے

ہیں نہ بہلا سکتے ہیں۔ لہٰذا تم سے کچھ امید ہی تھی۔"

"باباصاحب اصطلاحات کے ساتھ جب محض بے اصولی ہو جاتی ہے تو اصول کی بات دقیق ہو جاتی ہے۔ ایک نسل جو وقت کے ساتھ دکھوں سے گزر رہی ہو بہت آگے نکل جاتی ہے اسے اپنی نسل کی خوشی کا اہتمام کرنے کی پاداش میں اکھڑ کی تعلیم اچانک نے جانا کون سی اصول پرستی ہے۔ اصل سے اصول وضع ہوتے ہیں۔ اصل کے معنی حقیقت اور فطرت کے ہیں۔ محض اپنے اہداف کے سبب حقیقت کو مسخ کرنا اور اس طرح کے فیصلے کرنا جو انسان کو گمراہ کریں۔ یہ فطرت حقیقت کا کون سا رخ ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بھی قسم کے نقصان سے بچا جائے۔ انکی سلطنت کی پردہ پوشی کی جائے۔"

بصیر علی خان نے حالی کی بات مکمل کرتے ہوئے بالآخر خاموشی توڑ ڈالی۔

باباصاحب نے چونک کر بصیر علی خان کی سمت دیکھا۔

"یاور بھائی نے جو کیا اس کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ایک بہت اچھی کوارہ رشتہ دار باشعور خاتون ضائع ہو گئی کہ انہوں نے اپنی ذات مائینس کر دی مگر آپ کی وجہ سے تیمور کی وجہ سے وہ ایک جی سے بچ گئیں۔ انہیں کچھ وظیفہ ملا مگر ٹھیک ہے کہ وہ موجود ہیں۔ ان کے کان اپنی اولاد کے مسائل کی طرف لگے رہتے ہیں۔ ایک جیتا جاگتا انسان دل دماغ نہیں ہو سکتا۔ صدمہ دکھ اٹھانے والی خاتون ان سے کوئی اچھی امید نہیں رکھ سکتی تھی۔ ان کے فیصلے کو اسی کے تناظر میں دیکھا جائے۔"

بصیر علی خان نے کسی جج ہوتے وکیل کی طرح تیمور کے حق میں دلائل دیے۔

تیمور علی خان بھی جیسے یکسر احساس تنہائی سے باہر نکل آئے۔

"وہ اپنی بیٹی کو لے کر جا چکا ہے۔"

بڑے ہوتے نے گویا اطلاع دی اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ سب لاحاصل بحث کر رہے ہوں۔

"سو واٹ۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ کیس ہے جس میں ان کی سیٹ بھی ان کی کوئی مدد نہیں کرے گی۔" تیمور علی خان نے اطمینان سے کہا۔

مگر ایک لاحاصل رسہ کشی تو شروع ہو گی۔" بڑے تا مزید گویا ہوئے۔

"وہ نہیں مانے گا تیمور!" باباصاحب بھی تھکے تھکے انداز میں گویا ہوئے۔

"اب ان کے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر وہ کورٹ میں جا سکتے ہیں تو ہم بھی ڈائریکٹ آئی جی سے بات کر سکتے ہیں۔"

تیمور علی خان کا انداز بھی دو ٹوک تھا۔

"کچھ خوف خدا کرو۔ اپنے باپ کی عزت کا احساس کرو۔"

باباصاحب آزردگی سے کہہ رہے تھے۔ جوان اور فیصلہ کن اولاد کے سامنے ایک باپ کا آخری ہتھیار یہی ہوتا ہے۔

"آپ ابھی بے بس نہیں ہیں۔ فیصلہ کن پوزیشن میں ہیں۔ آپ انہیں کہیے کہ وہ رخصتی کی تیاری کریں بلکہ انہیں تاریخ دیں۔" تیمور علی خان نے بحث سمیٹی۔

"کاش یہ اتنا آسان ہوتا۔ وہ ہمیشہ کے لیے حویلی تو چھوڑ سکتا ہے مگر۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

"تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جذباتی وابستگی کی حس تو یوں بھی نہیں ہے ان میں۔ کچھ فرق نہیں پڑے گا ان پر۔" تیمور علی خان کے لہجے میں بلا کی بے رخی تھی۔

"یہ تم کہہ سکتے ہو۔ ہماری اولاد ہے ہماری۔ اس نے تو خود کو بھی کر لیا ہے۔" بابا صاحب دکھ سے کہہ رہے تھے۔

"وہ صرف اپنا سوچتے ہیں۔ گنجائش نہیں چھوڑتے۔ ایک کم عمر اور معصوم لڑکی کو بھی وہ استعمال کر گئے۔ حد ہوتی ہے سنگدلی کی۔ ایک کو دار چڑھا دینے کے لیے دوسرے کو استعمال کرتے ہیں۔ قدرت نے روشانے کی صورت میں انہیں بہت جواب دیا ہے۔ اس کا رزلٹ ہم بھی ریلیکس فیل کر رہے ہیں۔ آخر ہم بھی انسان ہی ہیں۔"

تیمور علی خان بہت سفاکی سے کہہ رہے تھے۔

"تو کیا تم نے اس کی بیٹی کو استعمال نہیں کیا۔ جبھی تو پھر یوں کھلتا ہے۔"

بابا صاحب نے مشکوک نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

"پھر ایسا ہوا ہے اور ہم حیران ہو گئے ہیں۔ ماہین سے ہمیں ہمدردی ہے اور آپ سے گلہ ہے۔ یہ جو مزاحمت آپ روشانے کے لیے کر رہے ہیں۔ ماہین کے لیے کرنا چاہیے تھی۔" تیمور علی خان شاکی نظر آئے۔

"ہم تو اس کی بنجر و ویران زندگی پر افسردہ تھے۔ سوچا تھا وہ زندگی میں حصہ لینا چاہتا ہے تو ہم دیوار کیوں بنیں۔ پھر اس میں ماہین کی اپنی خواہش کا سب سے اہم رول ہے۔"

بابا صاحب تو جیسے آج بیٹوں کے سامنے نہیں خود اپنے ضمیر کی عدالت میں جواب دے رہے تھے۔ جانے کہاں جا سویا تھا ان کا ظرف۔

"بہر حال آپ انہیں قائل کیجیے کہ اپنے اسٹیٹس کا خیال کیجیے اور کورٹ میں جانے کا خیال چھوڑ دیجیے۔ ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں روشانے ان کے خلاف ہی بولے گی۔ وہ پہلی پیشی ہی میں ہار جائیں گے۔ خواہ وہ کتنا ہی پریشر ڈال کر کے روشانے کو کورٹ میں لے جائیں۔"

"ہمیں اندازہ ہے۔ مگر وہ روشانے کو رخصت نہیں کریں گے۔ یہ بھی طے ہے۔"

"وہ ہم کرا لیں گے۔" تیمور علی خان نے تیزی سے ٹکڑا لگایا۔

"ابھی بات کھلی نہیں ہے۔ اندر ہی یہ قصہ ختم ہو سکتا ہے۔ تم اپنی جان کو مشکل میں کیوں ڈالتے ہو۔" بابا صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ قصہ ختم نہیں کرنا چاہتے۔ کچھ لوگوں کی پوری زندگی کی خوشیاں اس قصے پر ڈیپینڈ کر رہی ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے۔ کہ آپ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔"

ہم کچھ بیٹے کی کوئی تاریخ لے لیں ان سے۔ آخر ان بھول بھلیوں میں کب تک گھومتے رہیں گے۔ اب وہ ان کی کسٹڈی سے نکل چکی ہے۔ اور دوسرے شخص کی کسٹڈی میں آ گئی ہے جس نے قانونی اور شرعی طریقے سے اس پر حق حاصل کیا ہے، اس کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔"

تیمور علی خان قطعی انداز میں اپنی بات کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اگر وہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم مرتے دم تک تم دونوں کی صورت نہیں دیکھیں گے۔"

بابا صاحب نے شہادت کی انگلی اٹھا کر دھمکایا اور باپ (جتنے کو) انگلی کی نوک میں بابا صاحب کا فیصلہ بھی سنا دیا۔

تیمور علی خان ایک ہاتھ باپ کو ساتھ سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ پھر لاؤنج کو خالی کر دونوں بھائیوں کی سمت دیکھا۔

"انشاء اللہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اگر صرف بابا کی رحمت ہو تو شاید ہم بھی بخشش ہو جاتے۔ مگر ہماری بیٹی کا اس دل بھی ہمارے سینے میں دھڑک رہا ہے۔"

تیمور علی خان کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ دلاور علی خان عجیب سے ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگے۔

"ہمیں خوشی ہے کہ تمہارا سینہ اتنا فراخ اور دل اتنا بڑا ہے۔ کاش تم تھوڑی سی گنجائش علی کے لیے بھی رکھتے۔" مغموم آواز میں کہہ رہے تھے۔

"ہم انسان ہیں بابا صاحب، فرشتے نہیں ہیں۔ ہم سے اتنی زیادتی کیجیے جو عام انسان ہماری دسترس میں ہو۔"

"خدا حافظ۔" انہوں نے بھائیوں سے مصافحہ کیا۔

"وہ پھر کھانا کھا کر چلے جاتے۔" بصیر علی خان نے کہا۔

"بہت ضروری کام ہے۔ تین بجے تک پشاور پہنچنا تھا۔ پہلے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔"

وہ بہت تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔

ماہین کی فلائٹ پشاور کے لیے شام کی تھی۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے بابا کو اس کے گھر پہنچانے جا رہی تھی۔ بابا کے واسطے گاڑی چلانا دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ اور بہت حیرت سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

"جب میں روڈ پر گاڑی چلاتی ہوئی عورتوں کو دیکھتی تھی تو وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں اور عجیب بھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ان میں بھی ایک خوبصورت کار میں بیٹھوں گی جسے ایک عورت چلا رہی ہوگی۔ میں سوچتی تھی کار چلانے والی عورت بہت مضبوط ہوتی ہوگی۔ مگر آپ تو اتنی بڑی حویلی میں رہتی ہیں اور بالکل بھی مضبوط نہیں ہیں اور بہت خوبصورت بھی تو ہیں۔"

"اچھا!" ماہین بے ساختہ ہنس پڑی۔ "یعنی حد ہو گئی۔ مجھے تم تیار ہو کر میں خوبصورت ہوں۔ میرے میاں نے آج تک مجھے بھی مجھے احساس نہیں دلایا کہ میں خوبصورت ہوں۔ اور جب تک اپنے میاں سے پیار نہ کر سکتے خوبصورت ہی یقین نہیں آتا کہ ہم خوبصورت ہیں۔"

وہ عجیب سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"پھر اماں تو میری تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہی تھیں۔ وہ میری تعریف کرتی تھیں تو مجھے لگتا تھا زمانے بھر میں مجھ سی کوئی نہیں۔
میں کہاں کی خوبصورت ہوں۔" بالو نے منہ بنا کر کہا۔ "بہت غصہ آتا تھا مجھے۔"

"تم سے تو جلتی ہوگی۔" ماہین مسکرا دی۔

"بےکار۔ سب وہم کرنے کے چونچلے ہیں۔" بالو کا یکدم موڈ آف ہو گیا۔

ماہین بھی خاموش ہی ہو گئی۔ گاڑی مناسب رفتار سے گامزن تھی۔ بالو نے ایک مصروف سڑک سے ان لینے کو کہا اور ایک کشادہ سی سڑک کے سامنے بنے اپارٹمنٹس کے سامنے رکوا دی۔

ماہین کو حیرت سی ہوئی کہ یہ تو بتا رہی تھی کہ بہت مفلوک الحال قسم کے مزدوروں کی بستی ہے۔ یہ تو ٹھیک ٹھاک قسم کا رہائشی علاقہ ہے۔ بہرحال وہ کچھ بولی نہیں اور انجن بند کر کے نیچے اتر آئی اور گاڑی لاک کر دی۔ بالو چل پڑی تھی۔ اس نے بھی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

اس نے گراؤنڈ فلور پر بنے دائیں طرف کے اپارٹمنٹ کی بیل رنگ کی۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ وہ تین مرتبہ بجا چکی تب کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ کھولنے والا جتنی تیزی سے آگے آیا تھا اس سے زیادہ تیزی سے پیچھے ہٹا تھا۔ ماہین فاصلے پر کھڑی بغور یہ سب دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم۔ آپ کی حویلی سے مہمان ساتھ لائی ہوں۔ اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہیں۔ اندر آنے کو کہیے۔" بالو کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔

عارف کو تو جیسے یہ سن کر سکتہ ہی ہو گیا۔ ماہین بھی الجھ کر بالو کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"یہ عارف ہیں ماہین بی بی۔" بالو نے بتایا۔

ماہین بری طرح چونک پڑی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بالو اسے عارف سے ملوائے گی۔ ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

اس کی آواز پر عارف جیسے کسی دھیان سے چونکا۔

"آئیے۔ پلیز اندر تشریف لائیے۔" اس نے جلدی سے ایک طرف ہو کر راستہ دیا۔ ماہین جیسے بادل نخواستہ آگے بڑھی۔ بالو البتہ بہت ایکٹو نظر آ رہی تھی۔

"یہ ماہین بی بی ہیں۔ یاور خان کی بیگم۔" بالو نے اندر داخل ہو کر باضابطہ تعارف کرایا۔

"ان کی بیگم کا تو..." عارف کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں ان کی دوسری بیگم ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ماہین نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے بولنے سے باز رکھا۔

عارف نے ایک معنی خیز نگاہ اس پر ڈالی۔

یا رب غم عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے

وہ گھڑیاں ان کی سمت کھسکاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ماہین نے نظر اٹھا کر ایک بار اس کے حال حلیے کا جائزہ لیا۔ مگر خاموش رہی۔

"یہاں کیوں آئی ہو مجھے لے کر؟" اس نے بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں بالو سے دریافت کیا۔

"ان سے ملانے۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر میں نے تو تم سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی۔" وہ ناراضگی سے گویا ہوئی۔

"میں نے سوچا آپ انہیں دیکھ لیں۔ شاید آپ کچھ کر سکیں میرے لیے۔"

عارف ایک بغلی دروازے میں غائب ہو چکا تھا۔ بالو پھر بھی بہت آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"وہ تو اب ایسا بھی نہیں ہے۔ تمہارا کیا خاک ہوگا۔ اوں ہنہ۔" ماہین نے ناراضگی سے کہا۔ "کیوں لائی ہو مجھے اس کے پاس۔ تمہاری عقل میں ابھی تک میری بات نہیں آئی۔"

"میں بے فکر ہو گئی ہوں بی بی! مجھے معاف کر دیں۔ میری ماں میرا جینا حرام کرے گی۔ میں بھی سوچ کر آپ کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ آپ کو میری ماں کا پتا نہیں۔"

"مائیں۔ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ صرف اپنی اولاد پر ہی تو حکمرانی ہوتی ہے ان کی جو چاہتی ہیں کہہ سکتی ہیں مگر یہ بھی خاص صورت میں نہیں ہوتی ہے۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھی تمہاری خیر خبر لیتی رہوں گی۔"

"آپ اس سے بات تو کر کے دیکھیں۔" بالو نے ہچکچاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"تیری جانے اس سے کتنی باتیں ملاقاتیں ہوئی ہیں مگر تو ابھی بھی نہیں سمجھی۔ اور میں ایک نظر میں اسے جان گئی ہوں۔ اس کا دل برباد ہے۔ جس کا دل برباد ہو اسے گھر آباد کرنے سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ جس کا یہ حال ہو جائے تو وہ کہاں گئی ہے۔ جاگیردار جانے کیسے بچ گئے۔ کیا شیشے میں رنگ بھرنے تھے قدرت نے اس کا حال ایسے ہی خراب نہیں ہے۔ مجبور ہے۔ بہرحال چل اٹھ اپنے گھر لے چل۔ مجھے تین بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔"

"بی بی! ایک دفعہ کوشش میں کیا حرج ہے۔" بالو کے لہجے سے مایوسی چھلکی۔

"بیگم صاحبہ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی!" عارف دو کولڈ ڈرنکس ہاتھوں میں تھامے اندر داخل ہوا۔

بالو نے اس کے منہ سے بھابی سن کر وہ اذیت محسوس کی جس کی تشریح وہ الفاظ میں کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

"ابھی تو مرض میں ذرہ برابر افاقہ نہیں۔ ابھی تو حالت بدستور ہے۔ ابھی تو ہم اپنے قاتل بھی نہیں۔"

شکست خواب گزشتہ پر نوحہ خوانی ہوئی
پھر اس کے بعد کی محفل حسین خواب

بس ایک خواب مسلسل میں رہ کر زندگی کٹ رہی ہے اب تو۔ ایک ماں تھی کبھی کبھی وہ حقیقت حال میں گھسیٹ لاتی تھی۔ وہ بھی اپنی جنت میں واپس ہوئی۔

بالو نے چونک کر اس کی صورت دیکھی وہ اسے [illegible] رہا تھا۔

ماہین اس کی ذہنی الجھن بھانپ کر بالو کی حماقت پر جی بھر کر ہنسنا چاہتی تھی۔

"کس قدر خوار کرتی ہیں خود کو یہ کیسی بنانی لڑکیاں۔ کہاں وہ ایک کلاسیکل ذہن کا اس قدر انسان۔ کہاں یہ جس کی کم میں اس کی سیدھی بات بھی مشکل سے آئے۔

اپنی ذات پر حکومت کرنے والا سودا، تلاطم سے ماورا۔

کہاں یہ۔ جسے آسائش بھی چاہیے اور خوش شکل اظہار محبت کرنے والا جیون ساتھی بھی۔ اور یہ دونوں حالتوں میں مکمل مایوس کرنے والا۔

اس نے جلدی جلدی دو تین گھونٹ بھرے اور بوتل تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو بالو! جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس کا انداز بے ساختہ اور قطعی انداز تھا — کہ بالو بڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔

"بہت اچھا ہوا۔ آپ انہیں مل گئیں۔ وہ وقت چلا گیا ہے۔ مگر میں اسے سمجھا سکتا ہوں۔ آپ انہیں سمجھا لیجیے ابھی کوئی کھٹائی پڑھائی نہیں ہوئی ہے۔ میں کیونکہ بے ایمان نہیں ہوں اس لیے میری آواز میں طاقت ہے۔ میں اسے گریبان سے پکڑ کر بھی لا سکتا ہوں۔"

"کیا صورت بہت زیادہ اچھی ہو تب ہی کسی کی محبت ملتی ہے؟" بالو بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے چادر ٹھیک کر رہی تھی۔

"یہی سوال لال خان آپ سے کرے تو آپ کیا جواب دیں گی بھابی؟"

عارف نے سوال کیا مگر اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ماہین نے توصیفی نظروں سے عارف کو دیکھا۔ کیا بات کہی تھی۔

"یہ جو ہم کسی پر ایک بار مر مٹ جانے والے لوگ ہوتے ہیں ناں بھابی! بہت پارسا ہوتے ہیں۔ بہت مغرور اور عاجز ہے ہمیں عشق۔ اپنی دیانت داری پر خود کو شاباش دیتے رہتے ہیں۔ اس کا اپنا نشہ ہے۔ اور لوگوں کو اس گھر میں وحشت سی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی ہم سے پوچھے کیا رونق لگی رہتی ہے ادھر۔

کبھی وہ لال کپڑوں میں اس کرسی پر ہوتی ہے۔

کبھی گہرے ہرے لباس میں ادھر باورچی خانے میں۔

میں سوجاتا ہوں اور وہ میرے گھر میں گھومتی ہے۔ میں آنکھیں موندے اس کی چوڑیوں کی چھن چھن سنتا رہتا ہوں۔

صبح آنکھ کھلتی ہے تو وہ پودوں کو پانی دیتے ہوئے بہت خوبصورت گیت گنگنا رہی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی وہ روتی بھی بہت ہے۔ آدھی رات کو ایک دم میرے چہرے پر اس کے آنسو گرتے ہیں۔ میری آنکھیں [illegible] سے کھل جاتی ہیں۔

ایک رات وہ بہت بلک بلک کر رو رہی تھی۔ میں اس کے سامنے [illegible] ہیں۔ پھر [illegible] بھیگ گیا اور پھر [illegible] پر سو گیا [illegible]۔

عجیب بات ہے۔ برسوں ہو گئے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ میرے ساتھ نہ ہو۔"

ماہین کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے جلدی سے [illegible] آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"آؤ بالو!" اس نے [illegible] کھڑی بالو کو متوجہ کیا۔ وہ [illegible] ماہین کے پیچھے چل پڑی۔

"خدا حافظ عارف!" ماہین نے بھی کسی خواب کی کیفیت میں اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ بڑے خاص بڑے نایاب لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی زیارت کی جاتی ہے۔ ملاقات نہیں کی جاتی ابھی یہ دامن بھرے گا۔ اور پھر اپنے اصل کی جانب بہت خالص ہو کر پہنچے گا۔ ان ایمان والوں کی دنیا میں گل نہیں ہوتے۔"

"یہ کوئی بزرگ تو نہیں ہے۔" بالو نے گم صم کیفیت سے باہر آ کر [illegible] کہا۔

"مٹی بڑی زرخیز ہے۔ تو بیج کر تو بیل بننے کی دیر ہے۔ یہ راستہ تیری منزل کی طرف نہیں جاتا۔ چل تو مجھے اپنے گھر چھوڑ دے۔"

"لے چل بی بی اگر۔ میری ہڈیوں کا سرمہ بنائے گی ماں۔" بالو ملول گرفتہ انداز میں گویا ہوئی۔

"کیوں نہیں کہے گی۔ میں جو ساتھ جا رہی ہوں۔ وہ آتی پریشان ہوگی کہ جانے کتنی مان کر بیٹھی تیری اور یکھتی ہوگی۔ اس کی کچھ اس وقت اچھی طرح آتی ہے جب عورت خود ماں بن جاتی ہے۔ سارے خوف نکال پھینک آگے کی سوچ۔ یہ تو لال خان نے تجھے تین طلاقیں دی تھیں یا کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا تھا؟"

ماہین خاصی تیز ڈرائیو کر رہی تھی۔

"اس کا اب کیا ذکر؟" بالو ناگواری سے بولی۔

"اسی کا تو ذکر رہ گیا ہے اب تیری زندگی میں۔ سائے کے پیچھے دوڑ رہی ہے ہوش نہیں ہے۔

جب کسی کے دل میں صفیہ جیسی عورت بس جاتی ہے پھر اس دل میں کوئی اور نہیں بستا۔ وہ تو ہر آن ہر لمحے اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ سناں کا گھر خالی ہے ناں دل۔

تیرے ساتھ معاملہ دوسرا ہے۔ تیرے دل پر اب ایک پچھتاوا ہے۔ [illegible] پھر تو جاگ جائے گی۔

اگر پیچھے بھی تجھے نہ دیکھ سکا تو تیرا دل وہ نہیں جو محبت کے لیے خاص ہوتا ہے اور جب دل خاص نہیں تو "واردات" بھی خاص نہیں۔

پھر وقت اور حالات تجھے خود بخود سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیں گے۔ صفیہ کا عارف بھی تجھے یاد نہیں رہے گا۔ دراصل کچھ یوں ہے کہ طبیعت لال خان سے۔ بیزار تھی۔ بس اس کا ردعمل ہوا ہے۔ قریب ترین عارف ہی تھا۔"

ماہین خودکلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

"جی؟" بالو ٹھیک سے سن نہیں پائی۔

"کچھ نہیں۔ اب کس طرف جانا ہے اور گلی وہاں تو آ گیا۔" ماہین نے سر جھٹک کر جیسے خیالات کی یلغار سے جان چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"مین مارکیٹ کی طرف۔ چاند بابو کے ہوٹل کے پیچھے۔" بالو سمجھانے لگی مگر اس کا انداز بہت اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

ماہین کی گاڑی گلی میں داخل ہوئی تو کھیل کود میں مگن ڈھیروں بچوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ انہی میں بالو کا بھائی بھی تھا جو بالو کو گاڑی میں دیکھ کر ماں کو خبر دینے دوڑ گیا تھا۔

ماہین نے گاڑی لاک کر کے بچوں کے "احتجاج" پر ایک تشویش بھری نظر دوڑائی۔

"یہ گاڑی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے۔" اس نے فکرمندی سے بالو کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible]۔

"نہیں بی بی! گاڑی اچھی ہے اس لیے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں میں اپنے بھائی سے کہہ دوں گی کہ گاڑی کا دھیان رکھے۔"

بالو یکدم بہت مضمحل نظر آنے لگی تھی۔ تھکی تھکی اور شکست خوردہ سی۔

وہ ماہین سے آگے چلتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔ بدرنگ لوہے کے دروازے پر اس نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ رکھا تھا اور دباؤ ڈالتے ہوئے پلٹ کر ماہین کی سمت دیکھا تھا۔

دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئیں۔ ماں کو اطلاع مل گئی تھی وہ حیرت سے گم بالو کے بجائے ماہین کی سمت متوجہ تھی سکتے کی سی کیفیت میں۔ ایسے سناٹے میں گھر گئی تھی جو گھٹا چھانے کے بعد بجلی کوند پڑنے سے پہلے ہوتا ہے۔

اس کا باپ نظر نہیں آیا دوسرے بہن بھائی ماں کے اردگرد اس طرح کھڑے ہو کر دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے چیل کی آواز سن کر چوزے مرغی کے پاس دوڑتے ہوئے پہنچتے ہیں۔

"السلام علیکم اماں۔" بالو کی آواز نہایت پست تھی۔

بالو کی ماں آناً فاناً گہری نیند سے جاگ گئی۔ اس نے شاید بالو کا سلام سنا نہیں تھا۔ مگر خود اس نے ماہین کو حیرت چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سلام کیا۔

"کہاں سے لائی ہیں آپ اس منحوس کو؟"

وہ ایک کونے سے موڑھا اٹھا کر ماہین کی طرف بڑھی۔ تمام حسیات کے بیدار ہوتے ہی حق شفقت بھی اجاگر ہونے لگا۔

"ایسے نہ کہیں۔ بگڑی بات کو بنانے ہی سے زندگی میں سہولت آتی ہے۔ آگ پر آگ ڈالنے سے تو آگ ہی تیز ہوتی ہے۔ ہو جاتی ہے انسان سے غلطی۔ آپ اس کی ماں ہیں۔"

"نہیں ہوں میں اس کرموں جلی کی ماں۔ ایسے گھر میں بیاہ کر گئی تھی کہ سارے محلے میں ہماری عزت بن گئی تھی۔ ناشکری، بدنصیب۔"

بالو کی ماں کی آواز بلند ہونے لگی۔

ماہین موڑھے پر بیٹھنے کے بجائے اس کی ماں کی طرف از خود بڑھی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"پھر میرے پاس آ گئی تھی۔ اور بالکل خیریت رہی۔ اگر اب آپ نے سختی کی تو اس کے سامنے صرف مسئلہ ہے اس لیے اب یہ پھر میرے پاس بھی نہیں آ سکتی۔ اب یہ اس حال میں ہے کہ سوائے آپ کے کوئی اس کا خیال نہیں رکھ سکتا۔ بیٹی ہے ماں باپ کی۔ لوگ تو غیروں کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ تو آپ کا اپنا خون ہے۔ آپ اس کو عارف کے پاس بھیجئے۔ لال خان تو واپس چلا گیا ہے۔ عارف خود اسے سمجھائے گا۔ یہ تو لال خان خود پاکستان آ جائے گا تو پھر عارف کوشش کرے گا اسے لال خان کے پاس بھجوانے کی۔ مگر اس وقت آپ اس کا خیال کیجئے۔ یہ اپنے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"بیگم صاحبہ!" بالو کی ماں نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔

"میں خود بھی عارف سے ملوں گی۔ وقت نکال کر۔ اور یہاں بھی آؤں گی اس کا حال احوال معلوم کرنے۔"

"اس سے غلطی ہوئی۔ آپ کو بھی پتا ہے مجھے بھی پتا ہے۔ میں پھر بھی اس کا بھلا چاہتی ہوں۔ کیا آپ نہیں چاہتیں۔ بیٹی ہے آپ کی۔ میرا خیال ہے چند ہی دن باقی ہیں۔"

ماہین نے افلاس سے اٹے گھر پر ایک نگاہ ڈالی اور پرس کھول کر ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"یہ بالو کے ہیں۔ وقت قریب ہے ضرورت ہو گی۔"

"آپ بیٹھئے تو سہی بیگم صاحبہ۔"

شکر گزاری کے جذبوں سے ہلکان عورت کے چہرے پر یکدم سنجیدگی دوڑنے لگی۔ اس کا انداز و لہجہ یکدم بدل گیا۔ کچھ ماہین کی شخصیت کچھ مالی امداد کا فوری اثر تھا۔

"مجھے جلدی ہے دوسرے شہر جانا ہے۔ کچھ دنوں بعد کراچی آؤں گی تو بالو کی خیریت معلوم کرنے ضرور آؤں گی۔ اب یہ گھر سے باہر جب بھی جائے گی آپ کے ساتھ جائے گی۔ آپ لوگ لال خان سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔ رخصتی جلد ہو سکے کریں۔"

پھر وہ بالو کی طرف پلٹی۔

"دکھ سہنے والے دکھ دینے والوں سے کبھی نہ کبھی یہ ضرور سننا چاہتے ہیں کہ دکھ دینے والے شرمندہ ہیں۔ اپنی غلطی پر شرمسار ہیں۔ اپنی ماں سے معافی مانگو۔ ماں کو دکھ دینے کے بعد جھولیاں خالی ہو جاتی ہیں۔ ہر رشتے سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ بے وقوف! مذاق نہیں ہے۔ ماں ہے یہ تیری۔"

ماہین نے بالو کو اس کی ماں کی طرف دھکیلا۔

بالو کی ماں بالو کے بجائے ماہین کے گلے سے لگ کر بری طرح رونے لگی۔

"بیگم صاحبہ۔ مجھے نہیں پتا پیٹ بھر روٹی کھا کر کیسا لگتا ہے۔ مجھے نہیں پتا۔ بے فکر ہو کر نیا کپڑا کیسے پہنتے ہیں۔ یہ آپ کے گھر میں گئی تو مجھے یہ لگا کہ میں زندہ ہو گئی ہوں۔ کھاتی یہ اور پیٹ میرا بھر جاتا۔ پہنتی یہ اور دست میں ہوتی۔ کھوکھلی کر دیا ہے اس نے مجھے اندر سے۔"

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ماہین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وہ اس کی پشت تھپتھپا کر تسلی دینے لگی۔

ماہین نے چونک۔ تیمور علی خان کو چیک کر رہا تھا اس لیے مطمئن انداز میں سفر تمام ہوا تھا۔ وہ صرف ایک چھوٹا سا سوٹ کیس ہمراہ لائی تھی اس لیے اسے کسی قلی کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ وہ سوٹ کیس اٹھا کر باہر آ گئی تھی۔ ویٹنگ لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے اس نے متجسس نظریں ریلنگ کے اس طرف منتظر لوگوں پر دوڑائیں تو سامنے تیمور علی خان کو پایا۔ دل میں عجیب سا سکون در آیا۔ وہ قریب آئی تو تیمور علی خان کا سلام آیا۔ وہ مسکرا دی۔

"کیسی ہیں آپ؟" تیمور علی خان نے سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ٹھیک ہوں۔ بہت خوش ہوں۔"

اس نے تیمور علی خان کے سراپے پر نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ سیاہ شلوار قمیص، آف وائٹ ویسٹ کوٹ، سیاہ چمکدار پشاوری چپل۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز، گھنی سیاہ مونچھیں وہ ایک قبائلی سردار کی تصویر نظر آ رہے تھے۔

"فلائٹ ایکوریٹ ٹائم پر آ گئی۔" انہوں نے اطراف پر نگاہ ڈال کر گلاسز اتار دیے۔ اور جیب میں اٹکا لیے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کا احساس شاید انہیں اب ہوا تھا۔

"گھر کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟" ماہین نے ریسٹ واچ دیکھتے ہوئے پوچھا اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شاندار لینڈ کروزر کا پچھلا دروازہ کھول کر سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور اگلا دروازہ کھول کر ماہین کو اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"بس سمجھیں گھر پہنچ گئے۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے گویا ہوئے۔

"کوئی مسئلہ تو نہیں ہے ناں؟" ماہین نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا۔

"ڈونٹ کیئر۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے بڑی مشاقی سے گاڑیوں کے ہجوم میں سے باہر لا رہے تھے۔

"انہیں پتا ہے میری آمد کا۔" ماہین نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم نے جان بوجھ کر نہیں بتایا۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

"بابا صاحب سے ملاقات ہو گئی؟" بالآخر ماہین ہی نے پہل کی۔

"جی۔" یہ مختصر جواب آیا۔

مختصر ترین جواب اس وقت بہت کھلا کرتا ہے جب کوئی تفصیلی بات کرنے کے موڈ میں ہوتا ہے۔ تب یوں محسوس ہوتا ہے گویا دوسرا فریق گفتگو کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئی کہ شاید وہ خود ہی کچھ بات کریں۔

"پھر کیسا رہا؟" اس نے بالآخر پھر سوال کر ڈالا۔

"بیرسٹر کو ڈرائنگ روم میں شکست ضرور ہوئی مگر ایک وارث کی حیثیت سے اس کا اختلاف ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس کا ایک جملہ بہت سے بہت ایکٹ کرتا ہے۔ کہ "تم بہت پیار کو ادا کرو گے" ضرور ہارو گے۔" کیونکہ ہمیں پیار کی ادائیگی میں اس کے لیے ہمیں کوئی اور دروازہ بھی نہیں ہے۔ ابھی کچھ پروسیس نہیں ہوا ہے۔ مگر سب کچھ کلیئر ہو گیا ہے۔ یہی بہت ہے۔"

"مگر آپ کے لیے بہت مشکل وقت ہوگا۔ جب بابا صاحب سے بات کر رہے ہوں گے۔" ماہین نے ان کے خاموش ہوتے ہی پھر سوال کیا۔

"تب تو کوئی مشکل نہیں رہی۔" تیمور علی خان کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"بہت ناراض ہو رہے ہوں گے بابا صاحب؟" ماہین کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"بہت خفا ہیں ان کے بیٹے۔ یعنی ہم سب۔ بہت تھک گئے ہیں بابا صاحب۔" تیمور علی خان کی اپنی آواز میں بھی شکستگی در آئی۔

"روشی چلی گئی ہری پور؟" معاً اسے دھیان آیا۔

"جی۔ چلتے چلتے یہ خبر بھی سنی ہے کہ روشی کے والد صاحب کی پوسٹنگ ہو رہی ہے۔ ادھر سے کشمیر۔"

ماہین نے چونک کر ان کی سمت دیکھا۔ "مجھ سے تو انہوں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ کس شہر میں؟"

"اسلام آباد۔"

"اچھا۔" اسے عجیب عجیب وسوسے آنے لگے۔ وہ گم صم سی ہو گئی۔

"فائنانشل آرڈرز ہیں۔ جیسے کہ عموماً ایمرجنسی میں ہوا کرتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ فون پر بات کر لیجئے گا۔" کتنی شارپ حسیات تھیں تیمور علی خان کی۔ وہ فوراً ماہین کی پریشانی سمجھ گئے تھے۔

"نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ روشی کو ٹینشن ہوگی۔ نئے گھر کی سیٹنگ آسان کام نہیں ہوتا۔" اس نے جلدی سے بات ٹالی۔

"آپ مجھے بتائیں۔ بابا صاحب نے کس طرح کا ری ایکٹ کیا آپ سے۔ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے آپ کی پریشانی بڑھ گئی ہے۔"

ماہین نے اپنی کیفیت پر قابو پا کر جلدی سے سابقہ موضوع چھیڑ دیا۔

"روشی کو ہم خیال بنائے بغیر وہ کورٹ میں کیسے جائیں گے۔ اور وہ احمقانہ حد تک ضدی اور جذباتی ہے۔ مگر وہ نہیں کھیل سکیں گے۔ ان شاء اللہ آپ کو شاید علم ہو جب آپ پہلی بار بڑی حویلی آئی تھیں اور اسے زبردستی کراچی بھیج دیا گیا تھا تو اس نے سوسائیڈ کی کوشش کی تھی۔ اتنی معمولی سی بات پر۔ اس کیس میں تو اس کے سارے اعتراضات ختم ہو گئے ہیں۔"

تیمور علی خان نے گاڑی ایک طویل شاہراہ پر ڈال دی۔

"ہوں۔ محسوس تو میں نے بھی کیا تھا کہ روشی کو تفصیل مجھ سے دور رکھا جا رہا ہے۔ مجھے بھی پائی تھی میں۔ شاید اس کی

وجہ یہ ہوگی کہ میں بار بار ان سے متعلق بہت سارے کریس کوئسچن کروں گی۔ کہیں روشی کو کچھ محسوس نہ ہو جائے۔ یعنی میں تو گھر واپس چلی جاؤں اور وہ حویلی والوں کی جان عذاب میں کر دے۔

اگر ایسے ہی خدشات تھے تو یار علی خان نے مجھے عمر بھر کے لیے اپنے گھر لانے کی کوشش کیوں کی۔ اس طرح تو سب بکھر جانے کا خطرہ زیادہ تھا۔"

ماہین الجھی۔

"جب مرد نکاح کے عوض عورت پر اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ تو پھر سارے خطرے عورت کے لیے رہ جاتے ہیں۔ ان کے خطرات کی حد وہاں تک تھی جہاں تک آپ ان کی دسترس سے دور تھیں۔ "اب" کر لیں جو کچھ کرنا ہے۔"

تیمور علی خان بے ساختگی سے دھیمے انداز میں ہنس دیے۔

ماہین کے لبوں پر بھی خفت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اتنا تو خیر میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ کہ وہ یار علی خان کی بیٹی ہے۔ مگر میں تو بابا صاحب کی طرف سے کی جانے والی کسی مزاحمت کی بات کر رہی تھی۔"

"وہ ہمارے کسی بھی کیس میں نہیں ہوئے۔ پتہ نہیں ہماری لک ہے یا واقعی وہ ہم سے بہت بلکہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے صرف ایک بار ہم پر جبر کیا۔ اور پھر اس کے بعد تو انہوں نے مدتوں ہم سے نگاہ نہیں ملائی۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت مجبور تھے۔ مگر شاید انہوں نے ابھی تک خود کو معاف نہیں کیا۔

آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ہم کس لیے ہیں؟"

ماہین کو ان کے اس جملے سے اتنی تقویت محسوس ہوئی کہ باہر کے نظاروں کی خوبصورتی دھیان میں آنے لگی۔

باہر ٹرک کھڑے تھے۔ سامان لادا جا رہا تھا۔ روشی تھک کے چُور ہو چکی تھی۔ ملازم سے چائے کا کہہ کر وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ اس وقت بہت تھی کہ مر جانے کو جی چاہتا تھا۔ یار علی خان اسے صبح سے نظر نہیں آئے تھے۔ ملازموں ہی سے اسے پوسٹنگ اور پیکنگ کی اطلاع ملی تھی۔

اسے ہر قدم پر ماہین یاد آ رہی تھی۔ خالہ ہوتیں تو وہ آرام سے پڑی سوتی رہتی۔ "انہیں تو یوں بھی گھر کی مصروفیت بہت اچھی لگتی ہے۔ ملازم کی لائی ہوئی مرچیں تک انہیں پسند نہیں آتیں۔ چادر اوڑھ کر خود کریانہ اسٹور جا پہنچتی ہیں۔ وہ تو بہت خوش ہوتیں اس انخلا سے۔ ابھی جانا ہو گیا تھا کراچی۔ میں تو کچھ نہیں کروں گی اسلام آباد جا کر۔ بند جا رہا ہے گا سامان۔ خود کریں گی آ کر۔ وہ کوفت بھرے انداز میں پاؤں کرسی پر رکھے بیٹھی تھی۔ آتے جاتے کسی ملازم نے کسی وجہ سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تو اس نے جھلا کر ہاتھ ہلا دیا۔

"پاپا سے بولو جو بولنا ہے۔"

پھر کسی نے اس سے کلام کرنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ ملازم چائے کے ساتھ یار علی خان کا پیغام بھی لایا تھا کہ اپنے بیٹا

روم میں بلا رہے ہیں۔ پیغام سن کر اس کو اول تو دھچکا سا لگا مگر بلا چون و چرا اسٹڈی میں چلی گئی۔

"کہہ دینا چائے پی کر آتی ہوں۔"

جتنی دیر چائے پیتی رہی اسی ادھیڑ بن میں رہی۔ یہ کہیں گے تو وہ کہوں گی۔ وہ کہیں گے تو یہ کہوں گی۔ خالہ آپ نے اچھا نہیں کیا ایسے موسم میں اکیلا چھوڑ گئی ہیں۔ چہرہ ماتمی سا بنا کر جب اس نے اسٹڈی روم کا دروازہ کھولا تو جھجکتی سی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

"میں؟" اجازت ملتے ہی وہ اندر داخل ہو گئی۔ مخصوص قسم کی خوشبو نے اس کا خیر مقدم کیا۔

"جی پاپا۔ آپ نے بلایا؟" اس نے بظاہر ان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا گویا کسی کے کان کی گھڑی ہوں۔

"ہوں۔ کوئی زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں ہے۔ یہ کچھ پیپرز ہیں ان پر سائن کرنے ہیں۔"

وہ میز کے نزدیک جا کھڑی ہوئی۔ جہاں ایک فائل رکھی تھی۔

"کس چیز کے پیپرز ہیں؟" اس نے گھور کر ان کی سمت دیکھا۔

بلیک پینٹ اور آف وائٹ شرٹ اور بلیک ٹائی جس میں گہری نیلی پٹیاں تھیں۔ ہلکی مسکراہٹ کا عکس ان کے چہرے تک پہنچ رہا تھا کے ساتھ وہ نہایت معتدل متوازن مہذب اور اسمارٹ نظر آ رہے تھے۔ مگر روشی کو محض ایک بے شناخت سائے کی طرح محسوس ہوئے۔

"پڑھ سکتی ہو۔" وہ ایک طرف ہو گئے گویا اسے قریب آنے کا عندیہ دیا۔

وہ بھی بے اختیار ٹیبل کے پاس آ گئی۔ بڑی بے تابی اور خوف کی کیفیت میں اس نے فائل کھولی یار علی خان اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ چکے تھے۔

روشی نے فائل کھولی اور یوں بدک کر پیچھے ہٹی گویا بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"میں اس پر سائن نہیں کر سکتی پاپا۔ ہاں اگر آپ کہیں تو میں زہر کھا سکتی ہوں خودکشی کر سکتی ہوں۔

مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اپنے باپ کے گھر میں ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اسٹیٹ اس بوٹ میں مجھے کڈنیپ کیا گیا ہے اور گن پوائنٹ پر اپنے مطالبات تسلیم کرائے جا رہے ہوں۔ نہ بڑی بی جان ہیں جہاں جو ایک بار مجھے اچھا لگتی ہیں تو بعد میں اس بار میری پیشانی پر کس کرتی ہیں۔ نہ ولاء بھائی ہیں جن سے میں لڑ بھی لیتی ہوں اور بہت سارے پیسے بھی مانگ لیتی ہوں۔

اگر آپ ہیں سو ہانٹ زندگی میں کبھی لگا ہی نہیں کہ آپ میرے پاپا ہیں۔ آپ حویلی آتے تھے تو بی جان کہتی تھیں۔ تمہارے پاپا آئے ہیں سلام کر آؤ۔ بس میں آپ کو سلام کر آتی تھی۔ میرے اور آپ کے بیچ صرف "سلام" ہے۔ آپ کو احساس دلایا گیا کہ میں خوش ہوں۔ مگر آپ کیوں میری خوشی کا احساس کریں گے۔ آپ کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا ہوا بھی ایک ریوالور ہوں میں۔ جسے ایموشنز بتے آپ خود کو ڈیفینڈ کرنے کے لیے جب چاہے استعمال کریں۔"

"شٹ اپ۔" پوری قوت کے ساتھ انہوں نے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا تھا۔ "جانتی ہو تم کس کی زبان بول

رہی ہو۔"

روشی رخسار پر ہاتھ رکھے دم بخود کھڑی ہو گئی۔ "بہت سوچا۔"

"روشانے۔ میں خود کو شوٹ کر لوں گا۔ تمہارے اور کسی اور کے سامنے نہیں کہ مجھے بلیک میل کیا جائے۔ اس طرح تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو۔ تم میری اولاد ہو۔ وہی کرو گی جو میں کہوں گا۔"

"آپ کو یقین ہو گا کہ میں آپ کی اولاد ہوں مگر مجھے یقین نہیں کہ آپ میرے والد ہیں۔ آپ دونوں بھائیوں کی جنگ ہے تو آپ مجھے کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ کھل کر ایک دوسرے سے کیوں نہیں لڑتے۔ میں ایک ادھوری ذات ہوں۔ نہ ماں کے معنی جانتی ہوں نہ باپ کے۔ باری بھی مجھ جیسا ہے۔ ہم میں بہت سی باتیں کامن ہیں۔ ہم انڈر اسٹینڈ کر سکتے ہیں ایک دوسرے کو۔

جب آپ اٹھارہ سال تک بھلائے رکھتے ہیں کہ آپ کی کوئی بیٹی بھی ہے تو باقی زندگی بھلائے رکھنے میں کیا حرج ہے۔"

اس نے وحشت بھرے انداز میں جھپٹ کر فائل سے کاغذ نوچے اور پرزے پرزے کر دیے۔ اور منہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"پاپا۔ میری آپ سے کوئی جنگ نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک بار خوش ہو لینے دیں۔ پاپا مجھے فیوڈل سسٹم کا پارٹ نہیں بننا۔ مجھے اپنے کسٹمز اپ پر فخر نہیں کرنا۔ مجھے تو بس خوشی کا اختیار چاہیے۔ آپ یہ سب نہ کریں۔ میں آپ سے پرامس کرتی ہوں کہ میں دونوں حویلیوں میں زندگی بھر قدم نہیں رکھوں گی۔

کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ کہ آپ کے سینے میں دل نہیں رہا۔ آپ مجھے ہی نہیں سب کو ایک مہمان جیسے کیوں محسوس ہوتے ہیں؟ آپ اپنے کیوں نہیں لگتے؟"

یاور علی خان پشت پر ہاتھ باندھے ہونٹ چبا رہے تھے جیسے ان کی کچھ جواب دے گئی ہو۔ روشی بے ساختہ ان کے سینے سے لگ گئی تھی۔ اور بُری طرح رو رہی تھی۔

"پاپا۔ پلیز پاپا۔ یقین کریں مجھے کسی نے استعمال نہیں کیا۔ پریشرائز نہیں کیا۔ اگر آپ کہیں گے تو میں زندگی بھر کسی سے نہیں ملوں گی۔ جب ماں باپ کے بغیر رہ سکتی ہوں تو ہر رشتے کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ کاکا جان سے بھی نہیں ملوں گی۔ پاپا کس طرح سے تو مجھے یقین دلائیں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

اس کے آنسو یاور علی خان کا گریبان بھگو رہے تھے۔

اس کا ایک جملہ ان کی ہستی تہس نہس کر رہا تھا۔

"کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ کہ آپ کے سینے میں دل نہیں رہا؟"

وہ ان کی بیٹی تھی۔ طمانچہ کھا کر انہی کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

"روشانے! تم نے غلط جگہ کمٹمنٹ کی ہے۔" بالآخر انہوں نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کی

آنکھوں کی سرخی گہری ہونے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن۔ آج کے بعد تم بڑی حویلی جاؤ گی نہ چھوٹی حویلی۔ ویسے بھی [illegible] جب تمہارے شایانِ شان رہائش کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو تمہیں اس کے ساتھ جانے کی اجازت ہو گی۔ لیکن دونوں حویلیوں سے رابطہ وہ بھی نہیں رکھے گا۔ [illegible] تعلق رکھنا ہو گا۔ اگر اس کے قبیلے والے اس کی سرداری کا حق تسلیم کریں اور دستار دلانا چاہیں تو تمہیں پھر [illegible] اجازت ہو گی۔ تم اس کے ساتھ اس کے قبیلے جا سکتی ہو مگر دوبارہ یہاں آنے کی اجازت نہیں۔"

جانے کون کون سی مصلحتیں انہیں کس کس پیش بندی پر مجبور کر رہی تھیں۔

روشی ایک دم ان سے دور ہٹ کر بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ جیسے سماعت کا دھوکہ ہوا ہو۔ وہ کہہ کیا رہے ہیں۔ وہ کچھ اور سمجھ رہی ہو۔

"میرا خیال ہے مجھے کبھی اپنی بات دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اب تم جا سکتی ہو۔ بی بی جی۔ پلیز۔"

وہ چیئر پر دوبارہ بیٹھ گئے۔ اور کاغذ کے ٹکڑے سمیٹنے لگے۔ روشی کو یوں محسوس ہوا اس نے باپ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ ایک خزاں کی سی خشکی ان کے چہرے سے آ لگی تھی۔

وہ حویلی میں داخل ہوئے تو باری کو منتظر پایا۔

وہ ماہین کو سامنے پا کر بہت خوش دلی سے مسکرایا۔

"السلام علیکم۔ بہادر خواتین بہت اٹریکٹو ہوتی ہیں۔ مگر میڈل دینے کی پوزیشن نہیں ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"یہ ہمیں بتانے کی بات نہیں ہے۔ جب میڈل دینے کی پوزیشن میں آؤ تو پہلے ادھر میڈل دینا۔ وہ صاحب کیا فرما رہے ہیں۔"

ماہین احمد کی اکھاڑ پچھاڑ کے برعکس خود کو بہت فریش ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی نظریں سامنے پاکٹوں پر یوں پڑ رہی تھیں گویا وہ کسی پاکٹ میں کمزوری اس کو نظر آ جائے گی۔

"اللہ کا شکر ہے جی۔ کرم ہے اس مالک کا۔" اسی لمحے تیمور علی خان اس کے قریب آ گئے۔ "ہمیں علم ہے پارٹنر سے ٹھیک ٹھاک فرینڈ شپ ہے۔ سو مائنس۔ ٹھیک ہو پارٹنر۔ خیریت رہی۔" وہ باری کی سمت متوجہ ہوئے۔

"جی۔ بالکل خیریت رہی۔" وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے "خیریت" نہ پوچھ سکا۔

"اب ایسا ہے کہ اس وقت بڑا موسٹ [illegible] ہے۔ ہم اسٹڈی میں جاتے ہیں تم انہیں اپنی "بھابی" کو کھانا وانا کھلاؤ آپ بھی کچھ دیر بعد آپ سے ملاقات ہو گی۔"

"بھابی؟" وہ حیران ہو کر تیمور علی خان کی سمت دیکھنے لگی۔

"بھئی یہ انہیں "بھابی" کہتے ہیں۔ بہت کوشش کی مگر کچھ بات نہیں بنی۔"

"بہت خوب۔ اب یہ سارے کو بھائی کیا کریں گے۔"

ماہین ہاری کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ دل کی جو کیفیت تھی وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ سارے وجود پر ایک لرزش سی تھی۔ جانے وہ کس طرح ملیں گی جہاں ہاری کے قدم ٹھہرے تھے۔ ہاری نے متصل سیاہ آبنوسی چمکتے ہوئے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور خود اشارے سے اسے اندر جانے کا کہہ کر واپس پلٹ گیا۔

ماہین نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کا ہینڈل گھمایا اور آگے کر کے بہت احتیاط سے اندر جھانکا۔ جسم و جاں کو معطر کرنے والی ایک دل پذیر خوشبو نے اس کا سواگت کیا۔

دستک سن کر نازنین دروازے ہی کی سمت متوجہ تھی۔ ماہین کو دیکھ کر ایک دم بجلی کی سی تیزی سے بیڈ سے اتر آئی۔ ماہین اندر داخل ہو چکی تھی۔

"السلام علیکم!" ماہین نے بانہیں پھیلا دیں۔

کھلتے ہوئے زرد رنگ کے لباس میں ملبوس اپنی دراز بھیگی ہوئی زلفوں کے ساتھ ماہین کو اس حیرت میں مبتلا کر رہی تھی جو غیر معمولی حسن کے نظارے کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ اس کا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ ماہین کی کھلی بانہوں کی جانب اس کی توجہ نہیں تھی۔

ماہین خود آگے بڑھی اور خود نازنین کو گلے سے لگایا۔

"آپ گھر کسی خطر سے داخل ہیں تو کیا ہوا۔ ہم تو چہرے نہیں ڈھلے۔ کبھی کسی لے دھیان بھی نہیں آیا ہو گا کہ کسی باپ کی زندگی اولاد کی جواں مرگی کی اطلاع پا کر کس کرب مسلسل سے گزرتی ہے۔ ایسا چاند جیسا روپ کسی کو سوچتے ہوئے وہ کس اذیت سے گزرے ہوں گے۔" "وہ بہت ظالم ان کے لیے۔ کتنی بے رحم ہیں۔ تو آپ؟" ماہین کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

نازنین نے لفظ تو پر عجیب سی دھڑکن کا ترانہ سنا۔ شاہین اور جبین اسے "تم" کہا کرتی تھیں۔ اس نے تو اپنے ہوش میں مجھے دیکھا تک نہیں۔

اس نے بہت محبت سے ماہین کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ مضبوط کیا۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"بس کرو ماہین۔ میری جان! یقین کرو، زندہ تو نیک ہو گئے ہیں۔ کر زندہ انسانوں کی طرح کوشش کے باوجود ایکٹ نہیں کر پاتی۔"

نازنین کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ پسینے سے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔

ماہین ایک دم گھبرا گئی۔ وہ جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ اور اسے تھام کر بیڈ تک لائی اور آہستگی سے لٹا دیا۔ اور سرہانے رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور اس کا سر اونچا کر کے لبوں سے لگا دیا۔ نازنین ایک سانس میں پی گئی اور تکیے پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

ماہین نے اپنے آنچل سے اس کے چہرے کا پسینہ پونچھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو؟" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بہت فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں۔ بس ایسی ہی رہتی ہے۔" وہ نحیف سی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"ماہین۔ بہت دنوں تک اندر گھمسان کا رن رہا۔ تمہاری شادی کی خبر تو پہلے ہمیں نے ہی دی تھی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ قدرت کی حکمت سمجھ میں آنے لگی۔ میرے بچوں کو تم سے بہت تقویت رہے گی۔ سب سے بڑھ کر تم انہیں سمجھا سکو گی۔ انہیں چاہ کر رہو گی کہ ان کی ماں ہرگز بری عورت نہیں تھی۔ اب وہ کچھ رہ جائیں گے اور حقیقت ان کے سامنے آئے گی جو کہ ایک دن آئے گی ضرور۔ تو تم مجھے مکمل ڈیفینڈ کر سکو گی۔ یقین کرو اب میرے اندر کوئی جنگ نہیں ہے۔ بہت پرسکون ہوں میں۔ دیکھو اب کچھ ہو جانے سے حویلی سے نانا کو نانو۔ وہ میرے بچوں کے سر چھپنے کے لیے ٹھکانہ بن جائیں گے۔ وہ سچ تو یہ ہوتی ہے تمہارے حق میں تو نانا ہو۔ ضروری تو نہیں کہ ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے بچوں کی قسمت بھی ایک جیسی ہو۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ بچے بڑی حویلی میں ہیں اور وہ ادھر ہیں۔ وہ میری امانت ہیں تمہارے پاس۔"

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گئی اور آنکھیں موند لیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ خدا نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو۔" ماہین بہت پریشان ہو گئی۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ تیمور علاج کے لیے ہمیں نیدرلینڈ لے کر جا رہے ہیں اور ہم بھی ہار ان کا دل رکھ رہے ہیں کہ وہ بھی کیا یاد کریں گے۔" نازنین کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

ماہین تو جیسے سب کچھ بھول گئی۔ حواس باختہ سی ہو کر نازنین کی صورت دیکھنے لگی۔

"آپ کو کیا ہوا ہے۔ بجو؟"

"کاش یہ سلوشن کی پیدائش سے پہلے ہو جاتا۔" نازنین کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی کھل گیا۔ تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔ وہ بہت عجلت انداز میں داخل ہوئے تھے مگر کمرے کی صورت حال بھانپ کر تیزی سے آگے بڑھے۔

"کیا ہوا۔ مائی گڈنیس۔ آئی ایم سوری۔ ہمیں بالکل دھیان نہیں رہا کہ آپ کو کسی قسم کا سرپرائز نہیں دینا چاہیے۔" وہ اسٹول گھسیٹ کر نازنین کے قریب بیٹھ گئے اور اس کی کلائی تھام کر نبض چیک کی۔ پیشانی چھو کر دیکھی۔

"یہ کہتے ہیں کہ مجھے کوئی خطرناک بیماری نہیں۔ اور ہائی پوٹینسی کی دوائیں کھلاتے ہیں۔ میں اندر سے دیمک کھائی لکڑی کی طرح کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ کیا مجھے اندازہ نہیں کہ ہر لمحہ زندگی سے کتنی دور جا چکی ہوں۔ بس حد ہو گئی۔"

وہ تیمور علی خان کے چہرے پر نظر ڈال کر دھیرے سے ہنس پڑی۔

ماہین نے تشویش بھری نظروں سے تیمور علی خان کی طرف دیکھا۔ وہ نظر چرا گئے اور ماہین کا دل بیٹھنے لگا۔

"بات سنیں۔ کیوں پریشان ہوتے ہیں دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں کہ ان کی دل پسند چیزیں انہیں قضائے الٰہی چھوڑ جاتی ہیں اور وہ زندہ رہتے ہیں۔ ہمارے پاپا کی مثال سامنے ہے۔ کیوں ماہین اور ہم پر تو دل پسند ہوتے

کا بھی الزام نہیں۔ آپ کے احسانات نے اس قدر زیر بار کیا ہوا ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔

"ماہین! میری جان دل کا کھلا کائنات کی سب سے بڑی سرمستی ہے۔ میری بیٹی کا دل ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ اس میں Will تو ہے مگر ہے تو بچی۔ اس کا دل کھل گیا۔ اس تو سمجھ میں کامیاب ہو گئی۔ کتنی پیاری ہے میری بیٹی۔ اس کے دل میں میری تصویر اس طرح سجانا کہ جب اسے میرا دھیان آئے تو وہ دل سے میری بخشش کی دعا کرے۔ جو وقت میں نے دیکھا نہیں۔ اپنے باپ اور چچا اس ہی پر ہو گا۔ چھوٹا سا تھا تو سب کہتے تھے بابا صاحب جیسا ہے۔ میرا بیٹا۔ ماہین۔ میں نے سنا ہے وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ بہت کم گو ہے۔

جوانی وہ ہے جو پوری بہار دیکھے کبھی سرنگوں نہ ہو۔ پارسا ماں کا جوان بیٹا تو اصل میں حیران ہوتا ہے اسے تاریا لطف کی قسم میں بے گناہ ہوں۔"

نازنین تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔

"مائی گاڈ!" تیمور علی خان ذرا طرح سے پریشان ہو گئے۔

"ممّا! اس طرح نہ کریں۔ آپ کو تیمور خان پر رحم نہیں آتا؟" ماہین کی آواز بھر آگئی۔

"ارے۔ ہمارا بس چلے تو چوک پر ان کا مجسمہ نصب کرا دیں۔ بہت دکھ دیے ہیں انہیں ہم نے۔" وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"آپ انہیں سنبھالیے۔ ہم ڈاکٹر کو فون کرتے ہیں۔" تیمور علی خان فون کی طرف بڑھے تو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

تیمور علی خان نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو"

"السلام علیکم۔ جی ہم ہی ہیں۔"

"جی؟ ابھی آیا تھا؟"

"جی۔ جی اور کچھ نہیں کہا؟"

"جی ہم سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ اور پلٹ کر ماہین کی سمت دیکھا۔

"بابا صاحب کا فون تھا۔" ان کے انداز میں عجیب سی ہچکچاہٹ تھی۔ ماہین تو ان کے انداز ہی سے کچھ محسوس کر چکی تھی۔

"ہری پور سے فون آیا ہے بابا صاحب کے پاس۔ کہ ہادی سے کہیں وہ کراچی سے آپ کو لے کر اسلام آباد پہنچ جائے۔"

"مجھے۔ ہادی۔" وہ حیرت سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ پھر قدرے تحمل ہو کر نازنین کی سمت دیکھا اور دوبارہ بیٹھ گئی۔

تیمور علی خان نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ اور مڑ کر فون ڈائل کرنے لگے۔

نازنین نے ماہین کا چہرہ دیکھا اور مسکرا دی۔

"میں سب جانتی ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔ جب آپ سب میرا خیال کرتے ہیں تو میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں کہ میں اس قابل ہوں کہ میرا خیال رکھا جائے۔ یہ شخص بہت بلند ہمت حلیم ہے۔ ماہین ان کی بہت عزت کرنا۔ انہوں نے ہمیں کتنا مان دیا۔ عزت دی۔ اور ایک بہت پیاری گڑیا سی بیٹی ہے ہماری۔ مجھے امکان نظر آیا ہے کہ میرے ضمیر نہیں ہاری کو بھی بلا لیا ہے۔ بہت سمجھدار ہے ہماری۔ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

اگر میں سفر کر کے چلی جاؤں تو انہیں ہی روشنی کی تصویریں ضرور بھیجنا۔"

نازنین کی طبیعت ایک دم خاصی ہلکی محسوس ہوئی۔

"آپ کیوں رو رہی ماہین؟" نازنین کے انداز میں بلا کی اپنائیت تھی۔

"کچھ نہیں ممّا۔ بہت کچھ سوچ کر آئی تھی کہ آپ سے یہ کہوں گی وہ کہوں گی۔ مگر۔" اس نے دکھ سے نازنین کی طرف دیکھا۔

"مجھے علم ہے تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ ظلم کے جواب میں ظلم کیا ہے۔ مگر انجام کو بھی تو پہنچ گئے ہیں۔ بیس سال زندہ درگور بھی جلنے کے لیے کم تو نہیں ہیں۔" وہ بہت کرب سے بولی۔

"ٹھیک ہے ممّا۔ ہم تو خالی ہو گئے ہیں۔ کچھ کہنے کو رہا ہی نہیں۔" ماہین نے بہت دکھ سے کہا۔

"ہمیں تو یہ آہستہ خرامی سے واپسی کا سفر بہت پسند آ رہا ہے۔ مگر یہ۔" اس نے گردن گھما کر تیمور علی خان کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

"ہاں بس۔ آپ تو بس ہمیشہ اپنے لیے ہی سوچیں گی۔" ماہین کہتے کہتے رک گئی۔ نازنین نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"سہارا ہونا اور بننے میں بہت فرق ہے ماہین۔ المختصر یہ ہے کہ سہارا بننے والے لوگ ہیں اور بنانے والے اپنے اپنے موجوں پر اپنے اپنے حساب سے جنگ جاری ہے۔ مجھے اب کسی بات کی پروا نہیں۔ صرف یہی خواہش ہے کہ میرے بچے جب بھی یہ داستان سنیں تو انہیں یہ یقین رہے کہ ان کی ماں غلط عورت نہیں تھی۔"

تیمور علی خان دوبارہ ان کی جانب آ بیٹھے تھے۔ اور فکرمندی سے نازنین کی جانب دیکھ رہے تھے ان کے انداز میں اپنائیت کا جو واضح تاثر تھا وہ ماہین کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان کی کشادہ پیشانی اور سیاہ بھنورے جیسی آنکھوں میں جو تشویش تھی وہ ان کی ذات کو بہت معتبر بنا رہی تھی۔

"آپ باتیں کریں۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد گویا ہوئے اور باہر چلے گئے۔

"ممّا! حقیقت یہ ہے کہ تیمور علی خان شاید بنے ہی آپ کے لیے تھے۔ آپ تو دیکھنے کی "چیز" ہیں۔ اور بیس سال سے اس وقت آپ کو دیکھ رہے ہیں۔"

ماہین نے ماحول کی اداس کیفیت مٹانے کی کوشش میں ہلکی پھلکی بات کی۔

"اچھا۔" نازنین اداسی سے ہنس پڑی۔ "پتا نہیں انہوں نے کبھی ہمیں دیکھا بھی ہے یا ہمیں کسی دوسرے کے عکس میں

قید کر کے دیکھتے رہے ہیں۔ مگر یقین کرو ماہین، ہم نے انہیں آج تک نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ شرمندگی سے نظریں نہیں اٹھتیں ان کے روبرو۔ کوئی ایک قرض ہو۔ ہمارے لیے ان کا تو کہیں۔"

اس نے پھر قناعت بھرے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

"ماہین۔ روشی کے پپا کو ابھی بھید نہیں دینا کہ تم سب احوال سے واقف ہو چکی ہو۔ کہیں وہ جواز در جواز کا سلسلہ شروع نہ کر دیں اور کچھ ہو نہ جائے۔ مجھے تمہاری موجودگی کا یقین چاہیے۔ تم مجھے خود غرض کہہ سکتی ہو۔ مجھے ہر قیمت پر تمہاری موجودگی چاہیے۔ اپنے لیے بھی اپنے بچوں کے لیے بھی۔ حالانکہ للہ ہوا تھا مگر اب سیج ہو گیا ہے۔ پلیز ماہین۔ ہر قسم کی جذباتیت سے پرہیز کرنا۔ سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟"

"جی تو۔ بس اب تو ویلفیئر شپ کا ٹوکن ہے ہمارے پاس۔ فی الحال تو زندگی کا مقصد یہی ہے۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"کسی معجزے کی آمد سے پہلے وہ شخص بہت اچھا تھا۔ خدانخواستہ تمہاری راہ میں کوئی معجزہ کوئی زعفران بانو نہیں ہے۔ تم اسے اپنے حق میں اچھا کر سکتی ہو۔ راستے ہی میں بدل نہ ہو جاتا۔ اللہ سے دعا ہے وہ شخص تمہیں نہال کر دے۔"

نازنین کی آواز بھر آگئی۔

ماہین نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کا اپنا دل بھر آیا تھا۔

وہ باری کے ساتھ وہیں سے اسلام آباد روانہ ہو گئی۔ فون پر ایڈریس وغیرہ لے لیا تھا۔ انہیں اپنی آمد کی اطلاع اس لیے نہیں دی تھی کہ اگر وہ خود لینے آ گئے تو پتا چل جائے گا کہ وہ پشاور سے آ رہی ہے۔ اور پھر وضاحت در وضاحت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

یوں بھی حواس پر عجیب سی تھکن طاری ہو رہی تھی۔ تیمور علی خان نے اسے بتایا تھا کہ نازنین معدے کے کینسر میں مبتلا ہے۔ اور انجائنا اسٹیج پر ہے۔ السر کی شکایت تھی جو بگڑ کر کینسر میں تبدیل ہو گئی ہے۔

بس اتنی ذرا سی دیر کی بات تھی۔ ہمارے اور ان کے بیچ۔ کیا خواب سا رشتہ رہا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ تصویروں میں جو دیکھا تھا وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کیسی حسین تصویر، کیسی سنگین تقدیر۔

"باری!" اس نے باری کی سمت دیکھا۔ جو اپنی الجھن کو اخبار میں مدغم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"تم کب سے اس اسرار اس راز میں شریک ہو؟" اس نے باری کی سوالیہ نظروں کے جواب میں سوال کیا۔

"شروع سے۔ پہلی مرتبہ بڑے خان کے ساتھ بھابی سے ملنے سرائے آیا تھا۔ پھر جب تک خاناں جی زندہ رہیں ان کے ساتھ آ کر رہا کرتا تھا۔ خاناں جی بھابی سے بہت پیار کرتی تھیں۔" وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

"جب میں چھوٹا تھا تو بھابی مجھ سے روشی اور جواد کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ کہتی تھیں روشی کا خیال رکھا کرو۔"

"تم نے کہا ہوگا آپ فکر نہ کریں۔ میرا ہمیشہ کے لیے خیال رکھنے کا پروگرام ہے۔" ماہین نے برجستگی سے لقمہ دیا۔

باری جھینپ کر مسکرا دیا۔

"تم بچے سمجھتے تھے۔ بڑی حویلی میں باتیں پہنچا سکتے تھے۔ اتنا اعتبار کیسے کر لیا تمہارا اس سب نے؟" ماہین کو حیرت ہوئی۔

"جب بڑے خان مجھے پہلی بار سرائے لے کر گئے تو انہوں نے مجھے کہا تھا۔ باری تم مجھے اس لیے بہت پیارے ہو۔ ہم تمہارا کر اچھا ہے۔ تمہیں اپنے گھوڑے دے رہے ہیں۔ لیکن اگر تم نے بڑی حویلی کے بچوں کو سرائے کی کہانی سنائی تو ہم تم سے سب کچھ واپس لے لیں گے۔ اور تمہیں اصطبل بھجوا دیں گے۔ وہاں گھوڑے نہیں ہوتے۔

بار یہ بچے کیا تھا پتا ہی نہیں۔ اور سرائے کے انداز میں بولنے لگے۔ اور بات مجھ میں آتی گئی تو انہیں وہ کبھی ضرورت ہی نہیں رہی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے بڑے خان نے سب کچھ مجھے خود بتایا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آج تک کسی نے آنسو نہیں دیکھے۔ مگر میں نے ان کی بھیگی آنکھیں کئی بار دیکھی ہیں۔ سرائے کے لیے انہوں نے مجھے مخصوص کیا تھا۔ اس سے پہلے ملازمہ ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ حویلی میں اور کسی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔"

"تم سے سرائے کی کبھی بابا سے آپ کے متعلق بات کی؟" ماہین نے اچانک پوچھا۔

باری ایک دم خاموش ہو گیا۔ اور اخبار رول کرنے لگا۔

"آپ کو اندازہ ہے کہ بڑے خان نے کس موڈ میں ہمیں اسلام آباد بلایا ہوگا؟" اس نے بہت خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔

ماہین نے گہری سانس کھینچی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ "ہمیں بھی چاہتے ہو باری آخر مرضی ہے تمہاری۔ سوچ تو میں بھی رہی ہوں کہ مجھے تو جب چاہے کال کر سکتے ہیں۔ مگر ساتھ میں تمہیں طلب کیا ہے اللہ خیر کرے۔ روشی واپس گئی ہے۔ نہ جانے کس مسئلے پر؟ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ تم سے کرانا چاہیں۔ اس طرف بھی سوچا۔" ماہین نے توجہ دلائی۔

"جی سوچا ہے۔ لیکن جو طے ہے اسے تو کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔ آپ میری طرف سے اطمینان رکھیں۔ اگر بات کسی طرح نہ بنی تو میں روشانے کو لے کر اپنے قبیلے میں واپس چلا جاؤں گا۔" وہ کن انکھیوں سے ماہین کی سمت دیکھ کر بے شرمی سے گویا ہوا۔

"ہوں۔ یعنی ہمارے سامنے ہماری لڑکی کو اڑانے کی بات۔" وہ مصنوعی خفگی سے گویا ہوئی۔

باری ہنس دیا۔ "جب فیصلہ کرنا ہے تو پھر پہلے سے خود کو کیا الجھانا۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"ہوں۔" ماہین گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"تو بھابی خانہ میں تو شش ہو گی۔ صرف سامان کو دیکھ کر۔ پتا نہیں لوگ کس طرح اتنے بڑے بڑے گھر آباد کر بیٹھتے ہیں۔ میں نے تو کہہ دیا تھا ملازموں سے مجھے مفت میں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ گھر کی مالکن آئیں گی تو ان کو رکھوا دو۔"

قید کر کے دیکھتے رہے ہیں۔ مگر یقین کرو ماہین، ہم نے انہیں آج تک نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ شرمندگی سے نظریں اٹھیں ان کے روبرو۔ کوئی ایک قرض ہو۔ ہمارے لیے ان کا تو کہیں۔"

اس نے پھر ندامت بھرے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

"ماہین۔ روشی کے پپا کو ابھی بھید نہیں دیا کہ تم سب احوال سے واقف ہو چکی ہو۔ کہیں وہ جواز در جواز کا سلسلہ شروع نہ کر دیں اور کچھ ہو نہ جائے۔ مجھے تمہاری موجودگی کا یقین چاہیے۔ تم مجھے خود غرض کہہ سکتی ہو۔ اور مجھے ہر قیمت پر تمہاری موجودگی چاہیے۔ اپنے لیے بھی اپنے بچوں کے لیے بھی۔ حالانکہ ﷲ ہوا تھا مگر اب سچ ہو گیا ہے۔ پلیز ماہین، ہر قسم کی جذباتیت سے پرہیز کرنا۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

"جی تو۔ بس اب تو ویلفیئر شپ کا ٹوکن ہے ہمارے پاس۔ فی الحال تو زندگی کا مقصد یہی ہے۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"کسی معجزہ کی آمد سے پہلے وہ شخص بہت اچھا تھا۔ خدانخواستہ تمہاری راہ میں کوئی معجزہ کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔ تم اسے اپنے حق میں اچھا کر سکتی ہو۔ راستے ہی میں بدل نہ ہو جانا۔ ﷲ سے دعا ہے وہ شخص تمہیں نہال کر دے۔"

نازنین کی آواز بھر آگئی۔

ماہین نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کا اپنا دل بھر آیا تھا۔

وہ باری کے ساتھ وہیں سے اسلام آباد روانہ ہوگی۔ فون پر ایڈریس وغیرہ لے لیا تھا۔ انہیں اپنی آمد کی اطلاع اس لیے نہیں دی تھی کہ اگر وہ خود لینے آ گئے تو پتا چل جائے گا کہ وہ پشاور سے آ رہی ہے۔ اور پھر وضاحت در وضاحت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

یوں بھی حواس پر عجیب سی تھکن طاری ہو رہی تھی۔ تیمور علی خان نے اسے بتایا تھا کہ نازنین معدے کے کینسر میں مبتلا ہے۔ اور انجائنا اسٹیج پر ہے۔ السر کی شکایت تھی جو بگڑ کر کینسر میں تبدیل ہو گئی ہے۔

بس اتنی ذرا سی دیر کی بات تھی۔ ہمارے اور ان کے بیچ۔ کیا خواب سا رشتہ رہا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ تصویروں میں جو دیکھا تھا وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کیسی حسین تصویر، کیسی سنگین تقدیر۔

"باری!" اس نے باری کی سمت دیکھا۔ جو اپنی الجھن کو اخبار میں مدغم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"تم کب سے اس اسرار اس راز میں شریک ہو؟" اس نے باری کی سوالیہ نظروں کے جواب میں سوال کیا۔

"شروع سے۔ پہلی مرتبہ بڑے خان کے ساتھ بھابی سے ملنے سرائے آیا تھا۔ پھر جب تک خالہ جی زندہ رہیں ان کے ساتھ آ کر رہا کرتا تھا۔ خالہ جی بھابی سے بہت پیار کرتی تھیں۔" وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

"جب میں چھوٹا تھا تو بھابی مجھ سے روشی اور جواد کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ کہتی تھیں روشی کا خیال رکھا کرو۔"

"تم نے کہا ہوگا آپ فکر نہ کریں۔ میرا ہمیشہ کے لیے خیال رکھنے کا پروگرام ہے۔" ماہین نے برجستگی سے ٹکڑا لگایا۔

باری جھینپ کر مسکرا دیا۔

"تم تب چھوٹے تھے۔ بڑی حویلی میں باتیں پہنچا سکتے تھے۔ اتنا اعتبار کیسے کر لیا تمہارا ان سب نے؟" ماہین کو حیرت ہوئی۔

"جب بڑے خان مجھے پہلی بار سرائے لے کر گئے تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ باری تم مجھے اس لیے بہت عزیز ہو کہ تمہارا کردار بہت اچھا ہے۔ تمہیں اپنے گھوڑے دے رہے ہیں۔ لیکن اگر تم نے بڑی حویلی کے بچوں کو سرائے کی کہانیاں سنائیں تو ہم تم سے سب کچھ واپس لے لیں گے۔ اور تمہیں اصطبل بھجوا دیں گے۔ وہاں گھوڑے نہیں ہوتے۔

ہمارے پیچھے بڑا ہو گیا تو تمہیں۔ اور ایک انداز میں بولنے لگے۔ اور بات سمجھ میں آ گئی تو انہیں کسی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے بڑے خان نے سب کچھ مجھے خود بتایا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آج تک کسی نے آنسو نہیں دیکھے۔ مگر میں نے ان کی بھیگی آنکھیں کئی بار دیکھی ہیں۔ معجزہ کے لیے انہوں نے مجھے مخصوص کیا تھا۔ اس سے پہلے خالہ جی اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ حویلی میں اور کسی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔"

"تم نے معجزہ سے کبھی تنہا پاپا کے متعلق بات کی؟" ماہین نے اچانک پوچھا۔

باری ایک دم خاموش ہو گیا۔ اور اخبار رول کرنے لگا۔

"آپ کو اندازہ ہے کہ بڑے خان نے کس موڈ میں انہیں اسلام آباد بلایا ہوگا؟" اس نے بہت خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔

ماہین نے گہری سانس کھینچی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ "ہمیں بھی چاہتے ہو باری؟ آخر مرضی ہے تمہاری۔ سوچ تو میں بھی رہی ہوں کہ مجھے تو جب چاہے کال کر سکتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی تمہیں طلب کیا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ روشی واپس آگئی ہے۔ نہ جانے کس مسئلے پر؟ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ تم سے کروانا چاہیں۔ اس طرف بھی سوچا۔" ماہین نے توجہ دلائی۔

"جی سوچا ہے۔ لیکن جو طے ہے اسے تو کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔ آپ میری طرف سے اطمینان رکھیں۔ اگر بات کسی طرح نہ بنی تو میں روشانے کو لے کر اپنے قبیلے میں واپس چلا جاؤں گا۔" وہ کن انکھیوں سے ماہین کی سمت دیکھ کر بے حد شرمیلے پن سے گویا ہوا۔

"ہوں۔ یعنی ہمارے سامنے ہماری لڑکی کو لے اڑنے کی بات۔" وہ مصنوعی خفگی سے گویا ہوئی۔

باری ہنس دیا۔ "جب فیصلہ کرنا ہے تو پھر پہلے سے خود کو کیا الجھانا۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"ہوں۔" ماہین گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"توبہ خالہ! میں تو خوش ہو گئی۔ صرف سامان کو دیکھ دیکھ کر۔ پتا نہیں لوگ کس طرح اتنے بڑے بڑے گھر آناً فاناً سیٹ کر لیتے ہیں۔ میں نے تو کہہ دیا تھا ملازموں سے مجھے مفت میں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ گھر کی مالکن آئیں گی تو انہی کا رکھوانا۔"

روشی ماہین کے گلے میں بانہیں ڈالے لاپروائی سے اپنی کہے جا رہی تھی۔

"گھرداری کا شوق نہیں۔ بس گھر بسانے کا شوق ہے۔ تمہارے بچوں کو تو بارہ مہینے نزلہ زکام ہوا کرے گا۔ گرمیوں میں پانی کے ٹب میں کھیلتے رہیں گے۔ خالہ جان پڑی سوتی رہوں گی۔ سردیوں میں گرم کپڑے اتار کر گھومیں گے تو والدہ کو ہوش نہیں ہوگا۔"

"بتاؤ۔ میرے انتظار میں سارا کام پھیلا رکھا ہے۔" اس نے ہنس کر روشی کے بہت رسید کی۔

"لیکن خالہ! گھر میں میرے علاوہ دوسرے لوگ بھی تو ہوں گے جو بچوں کا خیال رکھیں گے۔ کم از کم بابا تو ہم کو ہی رکھا کریں گے۔" وہ کھلکھلائی۔

ہاری اچانک دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس اٹھائے ان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔

"اوہ۔ آپ کے ساتھ۔؟" روشی نڈر کی طرح گڑبڑا کر ماہین کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"جی میرے ساتھ۔" ماہین نے مسکراہٹ چھپائی۔

"پاپا نے کہا تھا خود آ کر۔" روشی کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ خوش بھی تھی اور الجھن بھی۔

"مجھے یقین ہے پاپا نے بلایا ہے۔ فیصلہ ہو گیا ہے خالہ!" روشی اسے لے کر لاؤنج کی طرف بڑھی۔

"کیسا فیصلہ؟" ماہین کچھ بھی نہیں۔

"پاپا نے کہا ہے۔ ہاری ہمارے ساتھ رہے گا۔ نہ سرائے جائے گا نہ دریا بھی۔ اگر چاہے تو اپنے دادا کے پاس جا سکتا ہے اپنا حق مانگنے۔"

وہ تفصیل سے اپنے اور یاور علی خان کے مابین ہونے والی گفتگو ماہین کے سامنے دہرانے لگی۔

ماہین بہت توجہ سے سن رہی تھی۔

"اور اگر ہاری نے اس پابندی کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا؟" ماہین نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے فکرمندی سے روشانے کا چہرہ دیکھا۔

"تو خالہ آپ سمجھانا نا۔" روشی ایک دم پریشان سی نظر آئی۔

"بعض اوقات مرد بہت سمجھدار ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی سمجھ کے بجائے سودے سے کام لیتا ہے۔" ماہین سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تمہارے پاپا ابھی تک نہیں آئے۔" ماہین نے رسٹ واچ دیکھی۔

"نہیں۔ فون آیا تھا دو مرتبہ۔ ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ میں نے کھانا کھایا یا نہیں۔ دوسری مرتبہ تاکید تھی کہ سیٹنگ وغیرہ تمہاری خالہ کریں گی۔ الجھنے کی ضرورت نہیں۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ ماہین کی صورت دیکھ کر کھلکھلا اٹھی۔

"ہوں۔ خالہ نے خیال رکھا ہے ناں تمہارے والد محترم کا گھر سجانے کا؟"

"وہ تو بھرا ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔" روشی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ماشاءاللہ۔" ماہین نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

"اچھا اٹھو۔ دیکھو۔ ہاری کیا کر رہا ہے۔ کہاں جاتا ہے۔ گھر تو ہمیں ہو ہی رہا ہے جیسے افشاں دلہن کے لیے ساری سامان رکھا ہو۔"

"میں نہیں جا رہی۔ آپ ہی دیکھ لیں۔" روشی شرارتی ہنسی کے عکس میں ماہین کے دل میں اتر گئی۔ اس کی نظریں بھی جم گئی تھیں۔

"اچھا چلو۔ چائے تو لاؤ۔ میں دیکھتی ہوں۔" ماہین اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں پہلے اپنے بیڈروم کا جائزہ تو لے لوں۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ تو پاپا نے اپنی نگرانی میں سیٹ کرایا تھا۔ بہت خوبصورت بیڈروم سیٹ لیا ہے آپ کے لیے۔" روشی نے اس کا اشتیاق بڑھا دیا۔

"چلو جلدی سے میرے ساتھ۔" ماہین نے بھی بہت مسرت اور اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔ روشی اسے لے کر اپنے بیڈروم سے ملحق خوابگاہ میں آ گئی۔

طبیعت واقعی خوش ہو گئی۔ وہائٹ و گولڈن کا بہت دلکش امتزاج تھا۔ روشی اسے کمرے میں چھوڑ کر چائے کی غرض سے فوراً باہر نکل گئی تھی۔

ماہین۔ وارڈروب کے دروازے کھول کر جائزہ لینے میں مصروف تھی کہ یاور علی خان نے اندر قدم رکھا۔ ملازم ان کو اطلاع دے چکی تھی۔ اسی لیے ان کا انداز بے تاب سا رہا۔

ماہین ان کے قریب چلی آئی۔

"السلام علیکم!" اس نے کوٹ ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بہت دلنشین مسکراہٹ میں سلام کیا۔

یاور علی خان نے اپنی پوری حسیات کے ساتھ اس کے اندر ہونے والی کسی عظیم تبدیلی کو محسوس کیا۔

"وعلیکم السلام۔ انتظام کیوں نہیں کیا۔"

"بس یونہی۔ دیکھنا تھا کہ آپ اچانک ہمیں سامنے پا کر کیسا ریسپانس کریں گے۔"

سیاہ جارجٹ کی چلمن ساڑھی اور سرخ فل آستین ہائی نیک بلاؤز زیب تن کیے کھلے ہوئے بالوں میں گلاب کی ادھ کھلی کلی۔ سرخ چمکدار لپ اسٹک۔ ایک ایک چیز اس کے پرجوش اور بھرپور موڈ کا مظہر تھی۔ وہ کوٹ لٹکاتے ہوئے ان کے بہت نزدیک آ کھڑی ہوئی تھی۔

"خیریت۔ میرا مطلب ہے خیریت تو ہے ناں؟" انہوں نے اس کے سراپے پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ مسکراہٹ جو صرف اپنے پارٹنر کے لیے مخصوص ہوا کرتی ہے ان کے لبوں پر نظر آئی۔ ماہین بھی حیا آمیز انداز میں مسکرا دی۔

"اتنے دنوں بعد آپ سے ملاقات ہو رہی تھی۔ آپ کے لیے تیار ہوئے ہیں۔"

وہ وارڈروب کی طرف کوٹ لٹکانے کی غرض سے بڑھتے ہوئے بڑے مزے سے گویا ہوئی۔

"مائی گاڈ نہیں۔ جلدی سے کام بتا دیجئے۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر شوز اتارنے لگے۔

"کیا سارے بیورو کریٹس اتنے ہی شکی ہوتے ہیں اور اصل کرپشن بھی تو بہت بڑھ گیا ہے۔ بس۔" ماہین ان کے برابر بیٹھ گئی۔

"شک بھی بلاوجہ نہیں ہوتے۔ جو شے وجود نہیں رکھتی محسوس بھی نہیں ہوتی۔ خیال میں بھی نہیں آسکتی۔" یاور علی خان بہت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"چلیں چھوڑیں۔ اتنے دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اپنی باتیں کریں بحث کے لیے تو عمر پڑی ہوئی ہے۔ ہادی سے ملاقات ہوئی۔ آپ کی؟"

"نہیں۔"

"آپ نے بات سنبھال لی۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے خوشی ہے اور میں ٹھیک فیل بھی ہوں۔ اب میرے اور آپ کے بیچ کوئی ٹینشن نہیں آنا چاہیے۔ چاہے مجھ سے جو غلطیاں سرزد ہو جائیں یا میں آپ کو تنگ کروں۔ ہر صورت میں تھیں آپ کو ہیں۔ آپ کو مجھے منانا ہے۔ آپ کو میرا خیال رکھنا ہے۔ ساری دنیا چھوڑ دی ہے آپ کے پیچھے۔ آپ کا فرض ہے کہ میرا اور میرے دل کا خیال رکھیں۔"

بے پایاں اعتماد نے اسے یاور علی خان پر غالب کر دیا تھا۔ اور اس بار تو وہ واقعی ساری کشتیاں جلا کر فیصلہ کن پوزیشن میں ادھر داخل ہوئی تھی۔

ایک نصب العین! ایک مقصد حیات کا تعین کر کے۔ اپنی ذات کی نفی کر کے۔

"بہت خوب۔ سب کام تو ہمیں کرنا ہیں آپ کو پھر کیا کرنا ہے۔" وہ اپنی حیرت کو چھپانے میں ٹھیک ٹھاک کامیاب تھے۔

"وہ بھی بتا دیں گے۔"

"ماہین!"

"جی؟" وہ ان کی یکلخت بدلتی آواز پر چونک گئی۔

"وہ کیا الجھن تھی جو اب سلجھ گئی ہے؟" یاور علی خان کا سوال اپنی جگہ جائز تھا۔

"کچھ نہیں۔ سر۔ خود کو اپنی ذات سے باہر ابھر آئے ہیں۔ حساب کتاب کی دنیا تو بہت چھوٹی سی ہے۔ بڑے کاموں کی طرف توجہ دینا چاہیے۔"

اس نے دونوں ہاتھ ان کے شانے پر رکھ دیے پھر ان پر اپنا سر ٹکا دیا۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

جس شخص سے بندھن توڑنے کے لیے اس نے کئی راتیں اعصابی جنگ میں گزار دی تھیں۔ آج اسی شخص سے اسی طرح کے اظہار کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ حالانکہ اپنی بہن کے خون کے چھینٹے اسی دامن پر نظر آرہے تھے۔ مگر اسی بہن کی خاطر اپنی ذات کی نفی کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

"میرا خیال ہے اس معاملے کو دو دن رکھ لیتے ہیں۔ چھوٹی ماں وہاں ہیں۔ بابا صاحب اور نعمانہ بھی وہیں ہیں۔ روشی کی رخصتی اس جلدی کر دیتے ہیں۔"

"صرف چچا اور بابا صاحب کو اور دوسرے لوگ۔" ماہین نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہادی کے وہ لوگ کچھ نہیں لگتے ہیں۔ مگر روشی کے تو لگتے ہیں۔" ماہین نے اعتراض کیا۔

"شادی کے بعد روشی کی انوالومنٹ بھی ختم ہو جائے گی ان لوگوں سے۔" یاور علی خان نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ ہادی کے سسرال میں آمدورفت پر پابندی لگا رہے ہیں مگر حویلی سے ان کا ناتا کیوں توڑنا چاہتے ہیں وہ سب روشی کے اپنے ہیں۔ سب نے روشی کی پرورش میں حصہ لیا ہے۔ وہ سب اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔" ماہین نے حجت کی۔

"کچھ مصلحتیں ہیں جنہیں میں نہیں چاہتا وہ آپ کی زندگی میں داخل ہوں۔"

"کیا ہیں وہ مصلحتیں۔ مجھے بتائیں۔ اعتبار کریں مجھ پر۔" ماہین نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر باور کرایا۔

یاور علی خان اٹھ کھڑے ہوئے۔ "آپ کو کیا کسی کو بھی نہیں بتائی جا سکتیں۔"

"پہلے مجھے آپ پر غصہ آتا تھا۔ مگر اب ترس آتا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نے پانچ نہیں کی بلکہ آپ پانچ کا انکار ہوتے ہیں۔" مارے جذبات کے ماہین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

شرٹ کے بٹن کھولتے کھولتے یاور علی خان کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ انہوں نے ایک دم پلٹ کر ماہین کی سمت دیکھا جو ضبط سے ہونٹ چبا رہی تھی۔

"صاف صاف بات کریں مجھ سے۔" انہوں نے اسے بازوؤں سے تھام کر جھٹکے سے اپنے مقابل کھڑا کیا۔ ماہین خاموشی سے ہونٹ چباتی رہی۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بس اتنا جانتی ہوں آپ کو بہت مشکل ہے کہ دو دن بھی۔ کچھ نہیں چھپا ان میں۔ ٹھیک دیکھیے سارے اندیشوں کی چادر اتار کر۔" یاور علی خان نے اس کے بازو چھوڑ دیے۔

"غصے کی حالت میں دل کو اسی کے فرض سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ مگر میں سالوں میں کسی رات کے سونے میں یہ ضرور یاد ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔" ماہین ان کے شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھ کر ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

یاور علی خان دم بخود سے کھڑے تھے۔ جیسے ان کے حواس معطل ہو گئے ہوں۔

وہ ایک ٹک ماہین کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"یہ فطرت ہے۔ اگر کہیں کچھ ہوتا ہے تو کبھی نہ کبھی سامنے ضرور آتا ہے۔ اس میں حیرت کیا۔" ماہین نظریں جھکا کر کہہ رہی تھی۔

دونوں کے مابین ایک گہری اور بے معنی خاموشی چھا گئی۔

"میں نے ڈرا کیا تھا ماہین۔ تو انہوں نے بہت ڈر کیا تھا۔" وہ وہ بارہ روشن کھولتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ لہجے میں بلا کی
حسن تھی جیسے میلوں پیدل چل کر آئے ہوں۔

"دو افراد جو بیک وقت غصے کی حالت میں ہوں تو دونوں سے نادانی ہوتی ہے۔ میں آپ سے اس موضوع پر کوئی تفصیلی
بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو اب آپ کے ساتھ ہوں ہمیشہ کے لیے۔ دم بہ دم ہم قدم۔ میری تو اتنی گزارش ہے کہ دلوں کے
توڑنے کی روایت اب ختم کیجیے۔ بچے بچھڑ رہے ہیں۔ ہر بات کے اچھے بُرے پہلو ہو سکتے ہیں۔

آپ نے بابا صاحب کو بھی ظلم کیا۔ جن کے اکٹھے ہوئے بغیر یہ سب ہو ہی نہیں سکتا تھا جس پر آپ کو اعتراض ہے؟"
ماہین نے ایک اور پتا پھینکا۔

"جو حضور میں ہوتا ہے ہاتھ پاؤں مارنا اس کا حق بھی ہوتا ہے اور مجبوری بھی۔ تیمور نے بابا صاحب کی بات کہیں مانی
وہ بے اختیار بھی نہیں تھا۔" یاور علی خان کے لہجے میں زہر امڈنے لگا۔

"آپ نے بھی تو روشی کی بات مانی ہے۔ حالانکہ آپ نے تو نہ ماننے کی گویا قسم اٹھائی تھی۔" بڑا برجستہ جواب آیا۔
"کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ بات مانے بغیر چارہ نہیں رہتا۔"

"اچھا چلیں چھوڑیں۔ میں پرامس کرتی ہوں کہ یہ موضوع کبھی ریپیٹ نہیں کروں گی۔ مگر آپ بھی میری ایک بات مان
لیجیے۔ رابطے توڑنے کی عادت چھوڑ دیجیے۔ ہر مسئلے کا ایک ہی حل نہیں ہے کہ رابطہ توڑ دیا جائے۔
اس سارے کیس میں اگر ناقابل تلافی نقصان۔ کسی کو پہنچا ہے تو وہ ہیں تیمور علی خان۔"

"نہیں۔ ہمارا بھی بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ ہمارا ایک بہت عزیز چھوٹا بھائی تھا۔ جسے ہم کھو چکے۔" یاور علی خان نے
فوراً ماہین کی بات کاٹ دی۔ بلا کا کرب تھا ان کے لہجے میں۔

ماہین چپ ہو گئی۔ اسے احساس تھا کہ یہ وہ کیس ہے جس میں دو سگے بھائیوں کی غیرت کا سوال ہے۔ اور وہ بھی ایک
دوسرے سے ہاتھ نہیں ملا سکتے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور یاور علی خان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔

"بہت سے نقصانات واقعی ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔ مگر جلے ہوئے جسموں کی راکھ پر تعمیر نو کے خاکے کھینچنا بھی تو
فطرت ہے۔ اب تو ساری توجہ کا مرکز آپ کے اپنے بچے ہونا چاہئیں۔ آپ کی بہترین صلاحیت اپنے بچوں کی خوشی اور تحفظ
میں صرف ہونا چاہیے۔" وہ بہت ملائمت سے کہہ رہی تھی۔

یاور علی خان خاصی دیر سر جھکائے خاموشی سے سوچتے رہے۔ ماہین نے انہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ پھر ایک خواب کی سی
کیفیت میں گویا ہوئے۔

"ماہین! آپ کا دل بہت وسیع ہے یا کوئی مصلحت ہے۔ اگر مصلحت بھی ہے تو آپ کے حوصلے کی مظہر ہے۔ دونوں
صورتوں میں میں آپ کو ایڈمائر کرتا ہوں۔"

وہ مسکرا دی۔ "خدا کرے آپ کی آنکھوں کی نرمی اب ختم ہو جائے۔ حالانکہ بہت جچتی ہے آپ پر۔" وہ ان کے شانے

سے لگ گئی۔

"مصلحتیں مجھیں کب جچتی ہیں۔ یہ بڑا غور طلب سوال ہے۔" وہ اپنے مخصوص مختلف انداز میں ذرا سا مسکرائے۔

"جب انسان ذات کے چھوٹے دائرے سے نکل کر گردش کرتا ہے تو ہر دائرے میں آ جاتا ہے۔ یہ کائنات کا مقصد
حیات ہے۔ چھوٹے دائرے میں انسان تنہا ہوتا ہے اور بڑے دائرے میں ساری کائنات اس کی ہم رکاب ہوتی ہے۔"
وہ آنکھیں موندے بہت کرب آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ماہین اور یاور علی خان کسی سرکاری ڈنر کے سلسلے میں جیسے ہی گھر سے باہر نکلے۔ روشی بارش کی سی صورت ہوئی سارے گھر
میں چکراتی پھری۔ ملازم سے پتا چلا کہ "صاحب" لان میں ہیں۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی لان میں آئی تھی۔

"یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔" وہ پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"گھر تو آپ ہی کے والد محترم کا ہے۔ حکم کیجیے کہاں بیٹھوں؟ آپ کہیں تو راول ڈیم کے کنارے اور وہاں کر بیٹھ
جاؤں۔ اگر وہاں مچھلیاں پائی جاتی ہوں۔"

وہ بہت انہماک سے نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کی مداخلت پر چونک پڑا تھا۔

"تمہیں ہر وقت مذاق کی پڑی رہتی ہے۔ دیکھو سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو تمہاری طرف سے
ہوگی۔ اب کیا سب کچھ میں ہی کیے جاؤں؟"

"خیر سب کچھ آپ اکیلی تو نہیں کر سکتیں۔ یہ تو بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"بس اسی آپ جناب میں لگے رہنا۔ کچھ کر تو سکتے نہیں۔ بس جو بھی کہیں تو تم کہہ دینا ٹھیک ہے۔ او کے۔"

"یعنی وہ کہیں کہ آپ سے دستبردار ہو جاؤں تو میں کہوں او کے۔" وہ بہت دلچسپی سے اس کا سراپا دیکھ رہا تھا۔

روشی نے گھور کر اس کی سمت دیکھا۔

"پھر کر تو دیکھو ذرا۔"

"لیجیے۔ آپ ہی تو کہہ رہی ہیں۔"

"دیکھو اب میں تم سے پپا کے یا خالہ کے سامنے بات نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟" وہ شرارت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ پپا نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"انتظار کر رہا ہوں ان کا۔ فکر کرنے سے کیا حاصل۔ جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہے۔" وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

روشی چڑ گئی۔ "تمہیں تو کوئی جستجو ہی نہیں۔ حالانکہ تمہیں فکر مند ہونا چاہیے تھا۔"

"اچھا۔ مجھے اتنا سا بتا دیجیے کہ مجھے اور کیا کیا ہونا چاہیے۔" وہ شریر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ پپا نے مجھ سے کیا بات کی۔ کیا معاملہ ہوا؟"

"وہ تو آپ کے چہرے پر لکھا ہوا ہے کہ کیا معاملہ ہوا ہے۔ میں آپ کی خالہ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا، ابھی کچھ دیر قبل۔ اور وہ کہہ رہی تھیں آپ پاؤں رکھتی کہیں ہیں اور پڑتا کہیں ہے۔ خوشی سے حالت غیر ہے۔ مگر یہ تو بتائیے آپ اتنی خوش کیوں ہیں؟" وہ بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"مجھ سے تو کسی نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کسی خوشی کا سراغ ملتا ہے۔ پاور خان نے بھی مجھ سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ بس میری خیر خیریت پوچھی اور کچھ کاغذات پر سائن کرنے کو کہا۔"

"کس قسم کے کاغذات پر؟" روشی ایک دم حواس باختہ ہوگئی۔

"پتا نہیں۔ میں نے پڑھنے کی کوشش کی تو ڈانٹ کر کہنے لگے بچو مت۔ صرف سائن کرو۔ تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

"تم نے کر دیے؟" روشی کا چہرا دھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔

"تو پھر کیا کرتا۔" ہاری نے بلا کی مجبوری ظاہر کی۔

روشی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس سے پہلے کاکا جان نے اپنے گھر میں سائن کرنے کو کہا تھا تو کر دیے تھے۔ یہاں پاور خان نے کہا تو ان کی بات مان لی۔ ہمیں تو سب کی ماننا ہے۔"

روشی کا ایک ہاتھ ہونٹوں پر دوسرا دل پر تھا۔ وہ گنگ سی کیفیت میں کھڑی تھی۔

"میرا خیال ہے پاور خان نے اسی لیے بلایا تھا مجھے۔" وہ خیال آرائی کرنے لگا۔ مگر نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"تم نے سائن کر دیے؟"

"جی۔"

روشی کی ٹانگیں بے جان ہوگئیں۔ وہ بمشکل کار پر بیٹھ گئی۔

"پاپا اس طرح نہیں کر سکتے۔ وہ تو بہت کلیئر فیس کرتے ہیں۔ مگر وہ بہت مایوس ہوں گے۔" وہ دم بخود سی کیفیت میں خود کلامی میں مبتلا تھی۔

"آپ کیوں پریشان ہیں؟" وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"اس لیے کہ تم پریشان نہیں ہو۔ بزدل، مصلحت کوش، دنیاوی آسائش کے لالچی۔ تم جیسے فضول انسان کے لیے میں نے اپنے پاپا سے ٹکر لی۔"

"واقعی۔ مگر آپ کو ان سے یہ بدسلوکی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" وہ معصوم سے انداز میں حیرت و تعجب کا اظہار کر رہا تھا۔

روشی نے لوٹ کر پلنگ سے اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"میں آج ہی سرائے چلی جاؤں گی۔ نہ تمہاری صورت دیکھوں گی نہ پاپا اور بابا صاحب سے کبھی ملوں گی۔ سب نے مل کر میرا تماشا بنایا ہے۔"

وہ اس بری طرح روئی کہ ہاری گھبرا گیا۔

"اور تمہارا جینا حرام کر دوں گی۔" اس نے روتے روتے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے چکرا رہے ہوں۔

"او سائیں! روشانے۔ پلیز اٹ واز اے جوک۔ روشی جوک۔"

وہ اس کے قریب ہوگیا۔ وہ تیورا کر اس کی بانہوں میں آ رہی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی ملازم نظر آ جائے اور وہ اس سے پانی منگائے۔

وہ اسے اٹھا کر اندر بھی نہیں لے جا سکتا تھا کہ اندر ملازم کام میں مصروف تھے۔ ان کے دیکھنے کے بعد واقعہ بہت مشہور ہو جاتا۔ خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔

"محترمہ! ہار گئے آپ سے۔" وہ اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اسی دم ملازم کی نگاہ اس گوشے پر پڑی تھی۔ وہ دسترخوان جھاڑنے کی نیت سے باہر کو آ رہا تھا۔ ہاتھ میں دسترخوان لیے کر رہ گیا تھا۔

"کی ہوا بی بی کو؟ سانپ تو نہیں ڈس لیا۔ ادھر بہت سانپ نکلتے ہیں۔"

وہ روشی کو تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"صاحب کو فون کریں؟"

"بھاگ کر ایک گلاس پانی لاؤ۔ سانپ واپ نہیں ڈسا۔ اسے غش آ گیا ہے۔ جلدی۔ ہری اپ۔"

ملازم تیزی سے اندر چلا گیا۔

ہاری تشویش بھرے انداز میں اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی شرمندگی اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

ملازم پانی لے کر آیا تو اس نے جھپٹنے کے انداز میں اس سے گلاس لے لیا۔

"روشانے!" وہ پانی کے چھینٹے بھی مار رہا تھا اور آواز بھی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد روشی نے آنکھیں کھول دیں اور ہاری کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کچھ سمجھ نہ پا رہی ہو۔

"اوہ۔ تھینکس گاڈ!" ہاری نے سکون کا سانس لیا۔ اور ملازم کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی پلٹ گیا۔

"خوب صورت کا کھیل کھیلتی ہیں اور دنیا کو آزمائش میں ڈالتی ہیں۔ ورنہ کوئی مذاق بھی نہیں کر سکتا۔ اٹھیے پلیز۔ پاور خان آ گئے تو مشکل ہو جائے گی۔"

روشی اسے چپ چاپ گھورتی رہی مگر کوئی حرکت نہیں کی۔

"پلیز۔ گیٹ اپ۔ اٹ واز اونلی اے جوک۔ کیا میں آپ سے مذاق بھی نہیں کر سکتا؟" اس نے ایک طرف پڑا دوپٹا اٹھا کر روشی پر ہولے سے ڈال دیا۔

اور روشی جیسے حواسوں میں واپس آ گئی۔

"مذاق۔ جوک۔ نان سینس۔ مجھ سے ہر طرح کا مذاق کر لینا۔ مگر یہ والا نہیں۔ ساری پونجی اس جوئے میں لگا دی ہے۔"

اگر کسی سرمایہ دار کو اس کا دُگنا سرمایہ دے کر مذاق میں بھی دی جائے تو اس کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے۔
میرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا۔

وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوپٹہ درست کرنے لگی۔

"کیا کہوں اسے اور کیا کہوں اسے۔" ہاری بہت قدردانی کے ساتھ مسکرایا۔

"اللہ تمہیں توفیق تو دے۔ جان نکال دی ہے کے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"دل چاہ رہا ہے عمر بھر بات نہ کروں تم سے۔" وہ آنکھیں پونچھنے لگی۔

"بہت مشکل ہو جائے گی۔ بچے عموماً ماں ہی کے ذریعے اپنی بات باپ تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے لیے ورحقیقت مسئلہ ہو جائے گا۔ یہ بھی سوچ لیں۔"

روشی کی پلکوں پر جیسے منوں بوجھ آ پڑا۔ اسے ہاری سے اس طرح کے مذاق کی امید نہیں تھی۔ وہ جس حیثیت میں اس سے قریب تھا وہ بڑی مضبوط تھی۔

"تم مجھے اتنا تنگ کیوں کرتے ہو؟" اس نے جلدی سے بات کا رخ پھیرا۔

"کسی اور کو کرنے لگا تو آپ پھر اسی طرح ہلکان ہو جائیں گی۔ اگر اجازت ہو تو۔"

روشی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں ہنوز بھیگی ہوئی تھیں۔

"پتا ہے کبھی مان لینا۔ کوئی گڑبڑ مت کر دینا۔ پتا کہہ رہے ہیں اگر تم اپنے قبیلے واپس جانا ہو تو جا سکتے ہیں۔ تم کہہ دینا ٹھیک ہے۔"

"مگر میں اپنے قبیلے کیوں جاؤں۔ میری تمنا ہے کہ عمر تو آپ کے ساتھ پریشانی میں گزریں۔ قبیلے واپس گئے تو وہاں آپ اکیلی رہ جائیں گی۔ آپ کو تو جیولری پہننے کا بہت شوق ہے۔ ہمارے ہاں بیوہ عورت جیولری نہیں پہن سکتی۔ سفید کپڑے پہنتی ہے۔ اگر سردار کے بیٹے کی ماں ہو تو بیٹے کے جوان ہونے تک موتی کہہ رہ سکتی ہے۔ اور مکمل پردے میں حکومت کرتی ہے۔ دوسری شادی نہیں کرتی۔"

روشی آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھنے لگی۔ "بیوہ؟"

"کتنے بے رحم ہو ہاری!" اس نے ہاری کو سر سے پاؤں تک بھیگی نظروں سے دیکھا۔

"کھٹی رہیے۔ ایک دن آپ کے سارے ادھار چکائیں گے تو آپ کو کہیں پتا نہیں لگے گی۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ کام اپنے وقت پر کرتے ہیں۔ جیسے صبح اٹھ کر وقت پر نماز پڑھتے ہیں۔ پھر سب سے پہلے نسب اور پیار گھوڑوں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا لذتی کرتے ہیں۔ پھر ناشتے کا وقت ہو جاتا ہے۔"

"اچھا بس بس۔ زیادہ بیگم نٹی کا رعب جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہاری پلیز بیاہ سے بحث نہیں کرتا۔ پلیز دیکھو یہ سب آسان نہیں تھا۔ بہت مشکل سے ہوا ہے۔" وہ جانے کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

یہ کون بولا ہے تم آگی جاؤ سے
احساس برتری سے تڑا ہو گیا ہوں میں

وہ بڑی بے ساختگی سے گنگنایا تھا۔

"روشنی نے آپ نے تو مجھے اپنی حواس پر لگا دیا ہے۔ میں خود بھی وہ مزاحمت ہوں جس کے سبب طوفان کی وحدت بالکل تھی ہے۔"

وہ وقت کو ٹکڑے سمیٹتے ہوئے نہ تولاکاری سے دوچار تھا۔

ڈنر میں اگرچہ ایک ہنگامہ تھا۔ سارے شہری کریم جمع تھی مگر ماہین کے اندر جو گھمسان کا رن پڑا تھا وہ سب ایک مستقل بے کلی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رسٹ واچ پر نظر ڈال کر یاور علی خان کی سمت دیکھنے لگتی تھی۔ جو ہوم منسٹر کے ساتھ بات چیت میں اسے مصروف تھے کہ انہیں شاید یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ماہین ان کے ساتھ ہے۔

ماہین کے اندر ایک انگارہ سا بھڑک اٹھا تھا کہ دم گھٹ رہا تھا۔ بجلی بار بار ہی اپنائیت کے اظہار کے بعد ادھر ادھر لگ بجھ گئی تھی۔

غائب دماغی کا یہ حال تھا کہ خالی پلیٹ لے کر وہ گوشے میں کھڑی ہوئی تھی اور خالی الذہن کیفیت میں لوگوں کو دیکھ رہی تھی جو کھانے کے مقابلے کے پارٹی سپرٹ دکھائی دے رہے تھے۔ اگر یہاں ان کی نظر اس پر نہ پڑتی تو شاید وہ دیر تک اسی طرح کھڑی رہتی۔ یاور علی خان اسے گہری دھند میں نظر آ رہے تھے۔ اور سفید لبادے میں ملبوس ان کے آگے بادل کی طرح اڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ دو چار نوالے زہر مار کر کے پھر گوشے میں جا بیٹھی۔ یاور علی خان کی اچانک ہی اس پر نظر پڑ گئی تھی۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں تھامے ہوئے اس کے قریب چلے آئے۔

"کھانا نہیں کھا رہیں آپ؟"

"کھا چکی ہوں۔" اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟" انہوں نے کچھ محسوس کیا۔

"ٹھیک ہے۔ گھر کتنی دیر میں چلیں گے؟"

"دس پندرہ منٹ میں چلتے ہیں۔ آپ اسد رضوی کی بیگم سے ملیں۔ انہیں آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ سب تو مجھے بھی نہیں معلوم آپ یہ۔"

"پلیز۔ اس وقت میں کسی سے نہیں ملوں گی۔ بس گھر چلیں۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

اس نے کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

یاور علی خان نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور پلیٹ واپس رکھنے ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑی میں بھی وہ آنکھیں موندے پشت سے ٹیک لگائے گم صم رہی۔ یاور علی خان نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

گھر آ کر ماہین نے بہت عجلت میں شب خوابی کا لباس تبدیل کیا تھا اور بیڈ پر چلی گئی تھی۔ یاور علی خان اس کی کیفیت نوٹ تو کر رہے تھے مگر خاموش تھے۔ خیالات کی یورش تو ان پر بھی تھی۔ مگر بیس سال کی بے کلی مشقت نے انہیں ایک مستقل شغل میں ڈھال دیا تھا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ اسٹڈی کے دروازے کی طرف بڑھے جو بیڈ روم ہی کے ایک کونے میں کھلتا تھا۔ پھر قدرے مڑ کر ماہین کی سمت دیکھا جو کروٹ کے بل بلینکٹ تانے سونے کی تیاری میں تھی۔

"سفر سے واقعی تھکن ہو جاتی ہے۔ شام کو آپ نے حیران کر دیا تھا۔ اب قدرے پریشانی ہے۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ چلیں آج آپ آرام کریں۔ کل سہی۔"

وہ اسٹڈی میں چلے گئے اور جاتے جاتے بیڈ روم کی لائٹ آف کر گئے۔ ماہین کو بالکل اندھیرے میں سونے کی عادت تھی جبکہ یاور علی خان نائٹ بلب کی روشنی میں سونے کے عادی تھے۔ مگر ماہین کی خاطر سب سے پہلے انہوں نے اپنی عادت ترک کی تھی۔ ایک وقت وہ بھی تھا وہ گھپ اندھیرے میں سونا چاہتے تھے اور ماہین ہلکی روشنی پر اصرار کرتی تھی۔ اور آج انہیں گھپ اندھیرے سے وحشت ہوتی تھی اور نیند بہت دیر میں آتی تھی۔

ماہین نے ان کے آخری جملے سنے تھے مگر یوں ظاہر کیا گویا پڑی سو رہی ہے۔ اس شخص کو چھوڑ کر پچھتانے کا احساس دلا کر گویا وہ کسی امتحان سے دوچار ہو گئی تھی۔

یہ جو مجھے محض اپنی بیس سال کی دبی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے گھر میں گھیر کر لایا ہے۔ میں کس دل سے اس سے محبت کروں۔ بہت بڑا دل کر کے شام کو اس کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ مگر حوصلہ بار بار ٹوٹ رہا ہے۔

سب سے مضبوط لوگ وہ ہوتے ہیں جو ہمالیائی راستوں پر چلنے کی لگن رکھتے ہیں۔ ان بڑے لوگوں کو بھی کسی پیر طریقت کا امتحان سہنا پڑتا ہے۔ جو ان وصف الافلاک کے حامل قلب کو مزید وسعت کی طرف لے جاتا ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی نے بیس سال اپنے مرشد کے ہاں پانی بھرا تھا اور جب بیس سال ان کے مرشد نے پوچھا تھا لڑکے تیرا نام کیا ہے؟ آتش زدہ شوقِ قلب میں ذرا کسر رہی ہوتی تو اصولی جواب یہ بنتا کہ بیس سال میں آج نام پوچھ رہے ہیں۔ مگر روشنی وجاہت کے خواستگار جو گرویدہ ہوئے اپنی طرف دیکھا ہی سامنے روشن مستقبل کا پتہ دیا اور متوجہ عرض کیا۔ معین الدین۔

بیس سال بے نام رہنے والے رولا کی نظرِ التفات کا انتظار کرتے ہیں۔ اور شرح صدر کی خاطر بیس سال صرف پانی بھرتے ہیں۔ میں "محدود مجبور" کمزور بیس سال تو بڑی بات ہے اے میرے پاس تو ریاضت کی بیس گھڑیاں بھی نہیں۔ کتنے جوش میں آپ کی خاطر آپ کا مان رکھنے پھر پلٹ آئی تھی۔ مگر خوار ہو رہی ہوں۔ دل بڑا کرنے کے لیے اور اتنا بڑا کرنے کے لیے وہ مرشد کہاں کہاں سے لاؤں کہ شرح صدر کا مرحلہ طے ہو۔ ظرف وسعت تک رسائی ہو۔

ان حالات میں عام سے دل کام نہیں کر سکتے۔ کل ہو سکتے ہیں۔ یاور علی خان ایسا سوچتے ہیں۔ آپ اپنا سوچ رہی ہیں اور میرا کون سوچے۔

اس نے پھر کروٹ بدلی۔

"یاور علی خان آپ تو آج بے دردی سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ کر رہے ہیں۔ کر حقیقت سے میرے احساس پر بالکل بھاری ہے۔ تم بہت مشکل ہے وعدہ ایفا کرنا۔ کتنا بے حس انسان ہے۔ اس انکشاف کے بعد کس سب حقیقت جان گئی ہوں۔ مجھے راز میں لے جاتا ہے۔ کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔ کیا صرف ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بچوں کو چھپانے والوں کو معاف کریں۔ کس حساب میں؟"

وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اور بستر سے نیچے اتر آئی۔ اس کے قدم اسٹڈی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس نے دروازے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ اسے یہ کر حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا۔ یاور علی خان صوفہ کم بیڈ پر دراز تھے۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی میں ان کی آنکھیں میں ملتفت ہو رہی تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا۔ ٹیبل پر کوئی کتاب وغیرہ نہیں تھی وہ کوئی فائل موجود تھی۔ ہر شے اسی طرح اپنی جگہ تھی جس طرح چھوڑ کر گئی ہوتی ہے۔

یعنی وہ "اپنی جنگ" اس موڑ پر لڑ رہے تھے۔ وہی اندرونی جنگ جس سے بڑی کوئی جنگ نہیں ہوتی۔ جیتو یا ہارو جنگ مگر سب ہو جاتا ہے۔ آخر زندگی اسی جنگ میں ہوتی ہے۔ سب کچھ کافی کہتر ہو جاتا ہے۔ حوصلہ عزم، جوش، امید سب کچھ۔

وہ ننگے پاؤں تھی اور پاؤں کے نیچے کارپٹ تھا۔ یاور علی خان کو اس کی آمد کا پتہ نہیں چل سکا کہ بیڈ روم میں بھی اندھیرا تھا۔ روشنی ہوتی تو دروازہ کھلنے پر متوجہ ہوتے۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

"اٹھیے یاور علی خان۔ کچھ حساب کتاب کی باتیں کرتے ہیں۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی اور وحشت بھی۔

یاور علی خان کے ذہن میں سر پر کوئی دھماکا ہوا تھا۔ جانے خیال کے کس پاتال سے ان کو لوٹنا پڑا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنی گہری سرخ آنکھوں سے ماہین کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو ماہین شام کو تھی وہ اب بکھری نظر آ رہی تھی۔ اجنبی۔ بالکل انجان وغیرہ۔

"کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے ناں۔"

"نہیں بہت خراب ہے۔ یقیناً اب آپ علاج کا مشورہ دیں گے۔ مگر یہ وہ خرابی نہیں جو میڈیسن کی محتاج ہو۔

کل آپ کتنے ہی مصروف ہوں۔ خواہ پرائم منسٹر سے اپائنٹمنٹ ہو آپ کو ہر صورت میرے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے کوئی نہیں پتا۔ صرف آپ کی "ہاں" میں وہ تاثیر ہے کہ میں سو جاؤں گی اور آپ کو مزید ڈسٹرب نہیں کروں گی۔"

وہ بے بسی سے اشک پیتے ہوئے ہم کلام تھی۔

یاور علی خان نے کچھ سوچتے ہوئے ایک گہرا کش لیا اور ماہین کا ہاتھ تھام کر زور سے دبا دیا۔ "ہوا کیا ہے۔ کچھ پتا تو

چلے؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ کو میرے ساتھ کل ہر صورت چلنا ہے ورنہ میری شریان پھٹ جائے گی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"آپ تو بہت خوش واپس آئی تھیں۔ اور اتنا بہت کچھ جان کر بھی بہت ایزی تھیں۔ پھر اچانک کیا ہوا ہے؟" ان کی تشویش بجا تھی۔

"آپ میرے ساتھ کل چل رہے ہیں یا نہیں؟" وہ اسی انداز میں مصر تھی۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ کس وقت؟" انہوں نے جیسے کچھ سوچ لیا۔

"جب آپ کی مرضی۔ مگر کل۔"

"ٹھیک ہے پھر صبح ہی چلتے ہیں ارلی مارننگ۔ شام ساڑھے چھ بجے یہاں بہت اہم میٹنگ ہے۔ پانچ ساڑھے پانچ بجے تک واپس آ جائیں گے۔ زیادہ دیر رکنے والی تو کوئی بات نہیں؟" وہ پوچھ بھی رہے تھے اور الجھ بھی رہے تھے۔

"نہیں وہاں پہنچنے کے بعد تو صرف دس منٹ آپ مجھے دیجئے گا۔" ماہین کو قدرے قرار سا آیا۔

"او کے۔" یاور علی خان صوفہ کم بیڈ سے نیچے اتر آئے۔ "چلیں آئیں آرام کریں۔"

انہوں نے ماہین کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے بازو کے گھیرے میں تھام لیا۔

وہ بغیر کسی مزاحمت کے ان کے ہمراہ بیڈ تک آئی اور سرہانے سے پانی اٹھا کر ایک سانس میں پی گئی۔

راستے بھر تو کوئی بات نہیں ہو سکی۔ عام سی بات چیت کے سوا کیونکہ ڈرائیور ہمراہ تھا۔ مگر ایک دوسرے کی الجھن انہوں نے سارے راستے محسوس کی تھی۔

حویلی میں بغیر اطلاع کی آمد نے عجیب ہلچل مچا دی تھی۔ یاور علی خان کے تو معمولات میں شامل تھا کہ حویلی میں کسی بھی وقت ان کی آمد متوقع کی جا سکتی تھی۔ مگر ماہین کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے خیال تھا کہ شاپنگ کی وجہ سے اس مرتبہ ہو سکتی ہے۔ کچھ حویلی میں یوں بھی کھلبلی تھی کہ روشنی اور ہادی کا معاملہ طے ہونے یا نہ ہونے کی طرف بھی ہر وقت کا دھیان تھا۔ سب نے یہی خیال کیا کہ کوئی بات ہوئی ہے اور وہ دونوں بابا صاحب کے پاس آئے ہیں۔ دیر تک خواتین کچھ جاننے کے شوق میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں مگر جب اس نے روشنی سے متعلق کوئی بات کی نہ ذکر کیا تو الجھ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ لنچ میں پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

"کہاں ہیں آپ؟" بابا صاحب سے بھی ملے نہیں کیا کہ پہلے یہ تو پتا چلے کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائی ہیں؟"

"بھائی بیگم بی بی جان وغیرہ باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے تو ویسے آپ سے زیادہ بے چینی اور جلدی ہے چلئے۔ آیئے میرے ساتھ۔"

"کہاں۔ بابا صاحب کے پاس؟" یاور علی خان نے اخبار اٹھا کر بغل میں دباتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

"آپ آیئے تو سہی۔" وہ کچھ جھنجھلا گئی۔ یاور علی خان اس کے ہمراہ کمرے سے باہر آ گئے۔ وہ انہیں لے کر بارہ دری میں چل پڑی۔

احاطے میں قدم رکھتے ہی یاور علی خان نے اس کا بازو تھام کر ٹھہرا لیا۔

"کہیں لے جا رہی ہیں مجھے اس کے پاس۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔ وہ میری سب سے بڑی دشمن ہے۔"

"ہاں آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ حقیقتاً وہی آپ کی سب سے بڑی دشمن ہے اور اس کے بعد اپنے دشمن آپ خود ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کا تیسرا دشمن اس روئے زمین پر شاید ہی ہو۔"

"میں کسی وجہ سے آپ کو وہاں لے جا رہی ہوں۔ آپ کو چلنا ہوگا۔" اس کے انداز میں ضد کی انتہا تھی۔

یاور علی خان نے سوچتے ہوئے اس کی جانب دیکھا پھر گہری سانس لے کر ساتھ چل پڑے۔ پُراسرار سے کمرے کی قطار شروع ہوئی تو ایک کمرے سے جھومر نکل آئی۔

یاور علی خان کو دیکھ کر وہ دم بخود سی کھڑی رہ گئی پھر جلدی سے سر پر آنچل ڈال کر سلام کیا۔ اور ماہین کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جھومر اس کمرے کی چابی کس کے پاس ہے؟"

"کمرہ تو کھلا ہوا ہے چھوٹی دلہن وہ بہت بیمار ہے تو انہیں ماری گئی ہیں بے چاری کی۔ چل پھر نہیں سکتی۔"

جھومر نے یاور علی خان کی موجودگی کے سبب بہت محتاط لہجے میں جواب دیا۔ ماہین نے یاور علی خان کا بازو تھام رکھا تھا جیسے خدشہ ہو کہ موقع پاتے ہی کہیں نکل جائیں گے۔

وہ کمرے کراس کر کے وہ اس کی کوٹھری کے سامنے آ گئے۔ جھومر اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

یاور علی خان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ بہت مجبوری میں وہ یہاں تک آئے ہیں۔ اگر ماہین کے رویے نے ان کے ذہن میں سوالات پیدا نہ کیے ہوتے تو شاید وہ کسی قیمت پر یہاں نہ آتے۔

ماہین نے اندر قدم رکھا۔ اب اس نے یاور علی خان کا بازو چھوڑ کر ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یاور علی خان کی موجودگی ہے۔

ماہین سے زیادہ وہ یاور علی خان اسے دیکھ کر شاکڈ ہوئے تھے۔ وہاں کی چارپائی پر ہڈیوں کا پنجر پڑا ہوا تھا۔ رنگ بھی اڑ چکا تھا اور خوبصورتی بھی۔

صغریٰ کی اعصابی قوت اس حد تک جواب دے گئی تھی کہ وہ حیرت و جوش جیسے جذبوں کا اظہار کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے پیشانی تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

"کیا تم بات کر سکتی ہو مطربہ؟" سلام کے جواب میں ماہین نے عجلت بھرے انداز میں سوال کیا۔

"بات کریں گی آپ؟" وہ سوال ماہین سے کر رہی تھی اور نظریں یاور علی خان پر تھیں۔ آواز بے حد کمزور اور نحیف تھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی۔

"بس اتنا کہو کہ تم نے میری معصوم بہن کو برباد کیا ہے۔ تیمور علی خان کا غصہ میری بہن پر اتارا ہے۔ تم شیطان ہو۔ جس کے قلب میں تھوڑی سی بھی جگہ پاتی ہو۔ اسی کو بہکاتی ہو۔"

ماہین کی آواز رندھ گئی۔ اس نے یاور علی خان کو بھی ساتھ لپیٹ لیا تھا۔

"ان کا خیال ہے کہ بابا صاحب کے کہنے پر یا تشدد کروانے پر تم ایسا کہہ بھی رہی ہو۔ ان کا خیال ہے میری بہن اصل میں مجرم ہے۔ ان کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ سی آئی اے سینٹر میں "ہاتھی" سے بھی کہلوا لیتے ہیں کہ میں "شیر" ہوں۔"

زمانے بھر کی تلخی ماہین کے لہجے میں اتر آئی تھی۔

مطربہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر یاور علی خان کی طرف دیکھا۔

"یاور خان!" اس کی نحیف آواز پر آنسو غالب آ گئے۔ "م۔ میں گنہگار ہوں۔ دل خالی تھا مگر عزت تھی حویلی میں۔ مگر۔ میں نے ناشکری کی۔ ناقدری کی۔" وہ تھک کر یکلخت خاموش ہو گئی۔ ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ گوشوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"تیمور خان سے کہیے گا۔ ہماری طرح انہیں کوئی نہیں چاہے گا۔ کتنی آگ تھی میرے عشق میں کہ ہر طرف آگ گئی۔ جو سامنے آیا جل گیا۔"

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"چھوٹی بی بی جان کو ایک غزل سنائی تھی۔

ع شعلہ سا جل بجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو۔

انہوں نے اپنا بہت خوبصورت سوٹ انعام میں دیا تھا۔ اور اب تو واقعی جل بجھی۔ خواب کی طرح کبھی کبھی شعر بھی بہت سچے ہوتے ہیں۔ تیمور خان سے کہیے گا۔"

یاور علی خان اس کی بات سنے بغیر یکلخت کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ لامحالہ ماہین بھی ان کے پیچھے چلی۔

راہ میں پھر جھومر کھڑی تھی۔

"اگر میں اسے تین شام دوا نہ کھلاتی تو یہ آج آپ کو زمین کے اوپر نہ ملتی۔" جھومر نے اپنی کارکردگی کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

"میں تمہاری شکر گزار ہوں جھومر! میں تمہیں حویلی کے پچھواڑے سے نکال کر اپنے گھر لے جاؤں گی۔ آئندہ یہاں کسی انسان کو نہیں رکھا جائے گا۔"

"اب مجھے کہیں نہیں جانا۔ بھر پائی حویلیوں محلوں سے۔ دل تو آباد نہیں ہو سکا۔ بوڑھی مائی کی خدمت کر کے ہی کچھ

سکون ملے گا۔

ہم عورتیں واقعی بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ جاگتے میں خواب دیکھتی ہیں اور بے حقیقت کی طرف سے چاہے جانے کی چاہ میں دل دھڑکا رہے وہ جاتے ہیں۔ دنیا کی حسین ترین عورت تو وہ ہے جس کو اعتبار مل جاتا ہے۔ بچے پلتے ہیں۔ پیار ملتا ہے۔ سارے ملنے والے اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ گھر میں سوگ ہو یا خوشی چاہے تو سب اس کے پیچھے آگے نوکروں کی طرح پھرتے ہیں۔ بس عورت تو وہی حسین و بری بچی ہوتی ہے۔ اس کی کتنی تھی کرتی جو وہیں کھایا اس کے لبے سے ارمان ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔"

جھومر عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

یاور علی خان جا چکے تھے۔ ماہین نے قدم بڑھانے سے قبل جھومر کی طرف دیکھا۔

"تم بہت سمجھدار ہو جھومر۔ تم نے بروقت سوچا اور اچھا سوچا۔ بہت اچھا کیا۔ کون، دروازہ تمہارے لیے ہمیشہ کھلا ہے۔ میں اچھا خاصا تھا پھر بات ہو گی تم سے۔"

وہ یاور علی خان کی طرف سے فکر مند تھی اس لیے تیزی سے سیدھی اپنے بیڈروم میں آئی تھی۔

یاور علی خان وہاں نہیں تھے۔ وہ گھبرا کر باہر آئی تو ملازمہ سے پوچھا۔

اس نے بتایا چھوٹے خان کے لیے مردانے میں جا چکے ہیں اور بڑی بیگم آپ کو بھی بلا رہی ہیں۔

ماہین نے ایک گہرا سکون کا سانس لیا تھا۔

یاور علی خان بالکل خاموش تھے۔ مطربہ سمیت کسی موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ کچھ بولنا نہیں چاہتے۔ دو ڈھائی بجے انہوں نے ماہین سے صرف اتنا کہا تھا کہ اب چلنا چاہیے۔ روشنی کے سلسلے میں وہ بابا صاحب سے سب باتیں کر چکے ہیں۔ بابا صاحب کو ان کی کسی شرط پر اعتراض نہیں ہے۔ مگر لگتا ہے وہ بہت افسردہ ہیں۔

ماہین کے پاس ان کی کسی بات کا جواب نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ خود عجیب حالت میں تھی۔ پونے چھ بجے وہ اسلام آباد پہنچ گئے تھے اور آتے ہی یاور علی خان تیار ہو کر میٹنگ میں چلے گئے تھے۔ بابی بھی نظر نہیں آیا۔ روشی کو کچن میں مصروف دیکھ کر وہ آرام کرنے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اسے یاور علی خان کی واپسی کا انتظار تھا۔

احساسات یوں ہو رہے تھے گویا کوئی بہت بڑا مسئلہ منطقی حل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس نے کپڑے نکال کر شاور لینے کا ارادہ کیا کہ پھر دیر تک سونے کا ارادہ تھا۔ رات بھر بھی سو نہیں پائی تھی۔ اور سارا دن سفر میں کٹ گیا تھا۔

شاور لینے کے بعد باہر آئی تو مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ اس نے پہلے عصر کی قضا اور پھر مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر بیڈ پر سو رہی۔ جانے کیا وقت تھا جب تیز روشنی کے سبب آنکھ کھل گئی تھی۔ گہری نیند سے اچانک بیداری پھر تیز روشنی چند لمحوں تک تو کچھ سمجھ ہی نہ پائی۔

کچھ دیر بعد منظر واضح ہوا تو سامنے یاور علی خان کو پایا وہ کوٹ اتار رہے تھے۔

"کھانا کھالیا؟" وہ ماہین سے پوچھ رہے تھے۔

"نہیں۔ آپ نے کھالیا؟"

"ہوں۔" بہت مختصر جواب آیا۔

"تو پھر کھالیں۔ شاید روشی بھی آپ کا انتظار کر رہی ہو۔"

"ہوں کھالوں گی۔" اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

"میرا خیال ہے بہت تھک گئی ہیں۔ ویسے آپ نے بہت زحمت کی۔ جب انسان بھی کسی واقعے پر بہت سوچتا ہے تو حقائق روشن ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ نہ تو دلاسے ادا ہو سکتے ہیں نہ کفارے۔"

وہ کوٹ اور ٹائی صوفے پر ڈالتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ آل ریڈی سب کچھ جان چکے تھے۔ جب ہی تو میں حیران ہو رہی تھی کہ آپ نہ چونکے نہ پزل ہوئے۔ لیکن جب حقائق روشن ہو چکے تھے تو مجھے انتقام کی بھینٹ چڑھانے اور استعمال کرنے کی کیا تک تھی؟" وہ ایک دم تلخ ہو گئی۔

یاور علی خان بری طرح چونک گئے۔ "انتقام؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"یہی کہ آپ نے میری بہن کو دلی ٹھیس پہنچانے کے لیے مجھ سے شادی کی۔"

"واٹ نان سنس۔" وہ شرٹ کے بٹن کھولتے کھولتے ایک دم ٹھٹک گئے۔

"تو پھر آپ کو ایک اور قربانی دینا چاہیے تھی۔ سنگ میل کی طرح مجھ سے صرف نظر کر کے گزر جانا چاہیے تھا۔ کیوں ٹھہرے۔ رک کے پھر کیوں۔ کیا آپ کو احساس نہیں تھا کہ میری آپ سے شادی ادھر کتنی بڑی شاکنگ نیوز ہو گی اور وہ کتنی بڑی ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جائیں گی؟" ماہین جیسے پھٹ پڑی۔

"آپ یہ سب سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن آپ سے شادی کی ریزن یہ نہیں ہے۔ تھکن کے جس موڑ پر مجھے تنہا کیا گیا تھا۔ اس موڑ پر صرف آپ کھڑی ہوئی ملیں۔ شاید خواہش خواہش ہی رہتی مگر آپ کی توجہ سے توجہ ہٹانا کوئی آسان بات نہیں تھی میرے لیے۔

خوابوں، کتابوں میں مستقل پناہ نہیں ملتی۔ چھاؤں کی طلب پر تو ان کا سب سے زیادہ حق ہوتا ہے جو دھوپ میں بہت چلے ہوں۔

آپ مجھے اس اپائنٹ کر سکتی تھیں۔ میں آپ کو بلیم نہیں کر رہا ہوں۔ چاہے جانے کی خواہش ہر ذی نفس میں موجود ہوتی ہے۔ ایک خوبصورت، اسمارٹ، ویل ایجوکیٹڈ لڑکی ہر معقول انسان کو انسپائر کر سکتی ہے۔ اور عالم دیوانگی میں تو ایسی لڑکی بہت اٹریکٹ کرتی ہے جبکہ وہ اس اپائنٹ بھی نہ کر رہی ہو۔ پھر کوئی مصلحت انتقام نہیں رکھتی کہ دیوانگی کے اس مقام پر مزاحمت کر سکے۔ البتہ نکاح کے بعد بہت سوچا تھا کہ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔

ابتدا میں نے نہیں کی تھی۔ ابتدا آگے والوں نے کی تھی۔ حویلی کے صاحب جنہوں نے کی تھی۔ جسے کوئی بات ہونے میں کسی دشواری نہیں ہوئی۔ اسے پسند نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"آپ نے جو کیا وہ غلط کیا۔ سب پر اس کلیش کی نوعیت کھلنا ساری ضرور جانتی ہے۔ سوائے آپ کے کیا واقف ہے۔ ماہین موڑ پر آ رہی تھی پھر پیچھے سے آ گئی ہو گی۔"

یاور علی خان نے شرٹ اتار کر صوفے پر ڈال دی۔ ماہین نے نظریں ہٹا لیں۔

"جس کے ذہن میں جو آئے وہ کہہ سکتا ہے اس کو رات ہوتا ہے۔ مگر اب حاصل کیا ہے اب جو آپ کو سوچنا ہے۔ روشی اور میرا جو سوچتا ہے۔ آپ کے پاس کیا ہونا چاہیے اب زیادہ ضرور صرف یہ بات ہے۔ اور اب آپ کے لیے آپ کی ازدواجی زندگی اہم ہونا چاہیے۔ آپ کا اپنا ایک گھر ہونا چاہیے۔ آپ کے مستقل قسم کے کوشش کا اندازہ ہونا ہے۔ روشی باوا جاگیر میں غیر شادی شدہ بیٹے وارث ہیں۔ ان کے تین تین تو اور بھی ہیں۔"

ماہین نے ان کی طرف حیرت و صدمے سے دیکھا۔

"یاور صاحب اگر کوئی سچ کی دلیل پر آ پہنچا ہے۔ ایک مرتبہ اعتراف تو ہمارا تک پہنچا دیجئے۔"

"بہتر ہوا اگر ایک وقت میں صرف ایک فرد کو واضح ماہوڑ ہو۔ کیا آپ کی تسلی کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ احساس جرم آپ تک تو پہنچا۔ دوسری طرف اس کے حق اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اب آپ مجھے کسی عمل کے لیے مجبور نہیں کریں گی۔"

وہ بہت نڈھال اور شکستہ آواز میں کہتے ہوئے وارڈ روب سے شب خوابی کا ڈریس نکال رہے تھے۔

"ان اول کھوٹے کی راہ تو چلیں۔ کیا معلوم کس موڑ پر محبت دوبارہ آ کھڑی ہو۔"

"جب حقائق روشن ہو گئے تھے۔ تیمور علی خان سے اس قدر نفرت کیا معنی؟ کہ ان کے دوست کو چاچی بھی آپ کی ناپسندیدگی کی زد پر آ گیا۔"

ڈریسنگ کی سمت بڑھتے قدم رک گئے۔ یاور علی خان نے پلٹ کر اس کی سمت دیکھا۔

"یہ نفرت نہیں ہے علی رضا کی ذلت آمیز بے بسی ہے۔ اس وقت میں بہت ریلیف ہے۔ میں نے کمال کیا تھا۔ اس نے حد کر دی۔ اپنے دکھوں کی انتہا بھی کسی کو نہیں بتائی اور تنہا سہتا رہا ہے۔ بلیک اسٹوری بن کے رہ گیا۔"

"سب سے اہم ذمہ داری تو بابا صاحب پر عائد ہوتی ہے۔" ماہین کہے بنا نہ رہ سکی۔

یاور علی خان نے اپنی بات کے سچے ہونے کا ثبوت دے کر خاموشی سے ڈریسنگ میں چلے گئے۔

واپس آئے تو ماہین بے آواز اشک بہا رہی تھی۔

"آپ کو قریب پاتی ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔" وہ رو رہی تھی۔

"جب قضائے الٰہی سے کسی کا پیارا بچھڑتا ہے تو لوگ اللہ پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔۔۔ آپ حق بجانب ہیں۔ جب ظاہر کہہ رہا ہوں کہ بات اسی بیڈروم میں ختم کر دیں۔ "احساس جرم" کا ان تک نہ پہنچنا بہتر ہے۔ لیکن یہ زندگی کی حفاظت کرتا جائے۔ ورنہ دوسری صورت میں واقعی کچھ ہو جائے گا۔ جائیے آپ کھانا کھا لیجئے۔"

"اتنی برداشت اتنی مجبوری۔ کاش بہت پہلے ہوتی۔ مگر عظیم لوگ ہی تو عظیم ادائیں عطا کرتے ہیں۔ اگر یہاں نہ ہوتا تو کبھی کوئی بگاڑ نہ ہوا انتشار نہ ہو۔"

اس نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں اور سلیپر پاؤں میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

بادر علی خان آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش چلا رہے تھے۔

"کیسا مذاق بن گئی ہے۔ میری زندگی۔" وہ یہ کہہ کر باہر نکل آئی۔

غلام محمد کا انتظار کرتے کرتے عورت کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ سب بچے ادھر ادھر پڑے سو رہے تھے۔ وہ دو عالم میں بالو دو پاچھرے پڑا لے جانے سو رہی تھی کہ جاگ رہی تھی۔

بارہ بجے سے کچھ پہلے غلام محمد گھر میں داخل ہوا۔

بالو کی ماں بڑی سرعت سے اٹھی۔

"اتنی دیر لگا دی۔ کہاں رہ گئے تھے۔ ایک تو حالات ایسے ہیں کہ ہول ہول کر آدھی ہو گئی۔ مل گیا تھا عارف۔ بات ہوئی اس کی لال خان سے؟"

غلام محمد نے کاندھے سے چار خانے والا رومال پلنگ پر ڈال کر ہاتھ اٹھایا جیسے کہہ رہا ہو صبر تو کرو دم تو لینے دے۔

"ایک گلاس پانی پلا دے۔" وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

بالو کی ماں بڑی پھرتی سے پانی لائی۔ اس کی ایک ایک حرکت سے اضطراب و بے چینی واضح تھی۔

غلام محمد نے پانی پی کر گلاس اسے واپس تھمایا۔ اور دونوں ہاتھ پلنگ کی پٹی پر جما کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔

"اب بتا بھی دو عارف ملا یا نہیں؟" وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"ملا تھا۔" غلام محمد اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"یا اللہ۔ پورا کیوں نہیں بول رہے؟ جواب کیا ملا؟" بالو کی ماں کا ضبط جواب دے گیا۔

"وہ نہ بسانے کا اب اسے۔ کہتا ہے عورت اعتبار کی ہوتی ہے۔ اسے واپس لا کر اپنی عمر بھر کی نیندیں گنواؤں۔ جیسے ہر وقت چوری کا دھڑکا لگا رہے جیسے بے دروازوں کا گھر ہو اور لٹنے کا خطرہ کسی پل سونے نہ دے۔ مان لے بالو کی ماں۔ ہمارے نصیب اچھے نہیں۔ ایک ذرا دیر کو بھولی بھٹکی روشنی اس گھر میں آئی تھی بس۔"

غلام محمد ایک دم یوں خاموش ہو گیا جیسے اپنے دکھ پر نوحہ خوانی کرنے لگا ہو۔

بالو کی ماں سناٹے میں رہ گئی تھی۔ اسے ایک گمان سا تھا کہ کسی نہ کسی طرح عارف لال خان کو آمادہ کر ہی لے گا۔

"عارف کہہ رہا تھا لال خان نے بچے کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔ مہینے کے مہینے اس کا خرچ بھیج دیا کرے گا۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا۔ اگر بالو کی دوسری شادی ہو گئی تو وہ اپنے بچے کو آ کر لے جائے گا۔ اسے بھی اپنے ساتھ باہر لے جائے گا۔"

بالو کی ماں گم صم کیفیت سے فوراً باہر آ گئی۔ "دوسری شادی؟ تو تم کہو ناں۔ عارف خود کرے اس سے شادی۔"

ذرا بالو کے ساکت وجود میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔

"دماغ خراب ہے تیرا۔ ایسا اندھا بھی نہیں کہ عمر بھر کی ذلت کا سودا کرتے ہاتھ لال خان کے کہ ہاں واپس ہی چلی (گئی) نہیں ہے۔ پہلے لڑکے کی بے وقوف عورت۔" غلام محمد کے کڑوے اعصاب 88 گئے۔ "بیٹی کے معاملے میں سوچ بھی نہ کر رہے گی تو بھی نہیں کرنے کا وہ۔ وہ اور قسم کا مرد ہے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا اسے۔ اگلی چار دن میں بیٹی ہی تھی اس کے گھر سے (غلام محمد نے عارف کی بیوی کی بات اشارہ دیا۔) اسے نہیں چاہیے گھر والی۔"

بالو کی ماں دکھ سے چور کافی دیر تک ایک ہی زاویے سے بیٹھی رہی۔

"کیسی عزت آئی تھی اس گھر میں۔ کیسی پاس کی بات تھی ہے۔ جیسے پلک جھپکنے میں ہوا کو مٹھی کی ہو۔ گھڑی دو گھڑی کی بات تھی ہے۔ آہ۔"

اس نے سرد آہ بھی کھینچی اور ہاتھ بھی ملے۔ دونوں کے درمیان ایک گہری خاموشی چھا گئی۔

"ہزار دو ہزار تو بھجوا ہی کرے گا مہینے کے مہینے۔"

ہار مان کر بالو کی ماں نے جیسے خود کو دوسری سمت سے بہلانے کی کوشش کی۔

غلام محمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ عظیم فلسفی کی طرح اپنی قسمت پر بہت توجہ سے غور کر رہا تھا۔

روشی مایوں بیٹھ چکی تھی۔ دور پاس کی بستی سے تمام خواتین و لڑکیاں آئی تھیں۔ کراچی سے روشن آرا بھی آ گئی تھیں۔ سب اپنی حیرت چھپائے خوشی میں مصروف تھے۔ بابا صاحب کے بارے میں پتا چلا تھا وہ صرف بارات والے دن شریک ہوں گے۔

حویلی میں صرف ضیغم تھیں وہ کیوں نہیں آ گئیں۔ کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

بادی تو صبح ہوتے ہی جانے کدھر غائب ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کے ہاتھ میں ہی نہیں لگ رہا تھا۔

رات میں جانے کب آتا تھا۔ سب سے زیادہ کرتی تو تزئین اس کے کان کھینچنے کے لیے بے تاب تھیں۔ صرف پہلے روز اس کی جھلک سی دیکھنے کو ملی تھی۔

سب نے مل کر روشی کے تو تقریباً چھکے چھڑوا رکھے تھے۔

"اس مسٹری مین سے پوچھو وہ کہاں اور کب پایا جاتا ہے۔" زری نے روشی کی طرف سب کو لگا دیا۔ اسے تو قسمیں کھا کھا کر تھک گئی کہ اسے نہیں پتا۔

ماہین نے بھی لاعلمی کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی انداز سے یہ بھی کہہ دیا کہ "ممکن ہے تیرا آباد چلا جاتا ہو۔ وہاں موسم کے پھل اتارے جا رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے اسے شرم دیر سے آئی ہو۔ شکر ہے ہنستا مسکراتا وقت ہے۔"

"دیکھو روشی ایسا کیا کہہ رہی ہے اسے۔"

روبی نے تائی کی شکایت کی۔ روشی کو تو فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے سامنے رنگوں کی سرزمین تھی۔ روشی کے سامنے تھے۔ ماہین بظاہر بچی تھی مگر بڑی کو یقین نہیں تھا۔ نازنین کے پُرزور اصرار کے باوجود اس نے اسے نہیں لگوایا تھا۔ یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا۔

"بی بی جان اس میں عجیب سی اسمیل آتی ہے۔ میں ماسک لگاؤں گی۔ بالکل "اسمیل فری" ہے۔"

"ہاؤ۔ خالص چنبیلی کے تیل میں اسے عجیب سی اسمیل آتی ہے۔ بچوں میں سے بیچ کی اسمیل آئے گی تو انکار کر پھینک دے گی۔" وہ بہت بے مزا ہوگئی تھیں۔

اتنے ہنگامے میں ماہین کے اُلجھے اُلجھے انداز کسی نے نوٹ نہیں کیے۔ ان چار پانچ دنوں میں اس نے دو مرتبہ سرالے فون کرکے نازنین کی خیریت دریافت کی تھی اور گھر میں برپا ہونے والے خوشگوار ہنگامے کی بھنک بھی نہیں دی تھی۔ کر مٹھوں کے کانٹے سر سے اُدھڑنے لگیں گے۔

پرسوں روشی کی رخصتی تھی اور آج رات گیارہ بجے نازنین نیو یارک جا رہی تھی۔ لڑکیاں کھانے کے بعد پھر اُدھر کو جانے بیٹھ گئی تھیں۔ وہ بڑی بے سکون اور بے کل سی اوپر ٹیرس میں آ کھڑی ہوئی۔ اور روڈ پر رواں ٹریفک پر خالی خالی نظریں دوڑانے لگی۔

"واہ بجو! آپ کی بیٹی کے پاس میں ہوں، میری خوشبو ہے۔ آپ ہیں تو اس کے قریب۔" اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔

جانے کب تک وہ بے خبری کی کیفیت میں کھڑی رہی تھی۔ یونہی خود بخود محسوس ہوا تھا کہ جیسے اس کے علاوہ بھی وہاں دوسرا کوئی موجود ہے۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یاور علی خان کھڑے کش لگا رہے تھے۔

اسے متوجہ پا کر انہوں نے سگریٹ منہ سے نکال لیا۔

"آئیے۔ میرے ساتھ۔" وہ پلٹ گئے۔ اور ماہین کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

وہ نیچے آ کر پورچ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اگلا دروازہ کھول کر ماہین کو اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ خود دوسری طرف سے گھوم کر آئے اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

ماہین نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

چوکیدار نے گیٹ وا کیا اور یاور علی خان تیزی سے گاڑی نکال لے گئے۔

صرف دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ دس منٹوں میں بھی ان کے درمیان خاموشی حائل تھی۔ مگر ایئرپورٹ پر نظر پڑتے ہی اس نے بے تحاشا چونک کر یاور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔ جواب میں انہوں نے ایک کارڈ اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"اگر سیکورٹی کی وجہ سے کوئی پرابلم ہو تو یہ کارڈ دکھا دیجیے گا۔ آپ جائیے، میں ویٹ کر رہا ہوں۔"

"آ... آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کہ..." وہ کہنے لگی۔

"آپ جائیے۔ پھر آپ کے پاس وقت نہیں رہے گا۔" یہ سنتے ہی ماہین بہت عجلت میں اندر کی سمت بڑھی۔

مسافر لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔ اس نے ریسپشن سے رجوع کیا۔ اور کارڈ دکھایا۔ بے حد تسلی دی گئی کہ ابھی وہ بندوبست کرتے ہیں۔ مسز نازنین تیمور علی خان ادھر آ کر آپ سے مل لیں گی۔"

ماہین رِنگ سے ٹیک لگا کر بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

تقریباً تین چار منٹ بعد نازنین اور تیمور علی خان باہر آتے دکھائی دیے۔ شیشے کا دروازہ ہوتے سے قبل ہی اس نے نازنین کا جائزہ لے لیا تھا۔ کاہی سبز سوٹ میں ملبوس جس پر تیز زرد رنگ کے ریشم سے کام ہوا تھا۔ پہنے ہوئے تھے۔ تیز زرد رنگ کا دوپٹہ سینے اور بازوؤں پر پھیلا ہوا تھا۔ جس پر کاہی سبز رنگ کی ریشمی بیل لگی ہوئی تھی۔ کمال کی جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ بال سادہ چوٹی کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ تیز سرخ لپ اسٹک نے چہرے کو حد درجہ نمایاں اور روشن کر رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں سبز اور زرد رنگ کی بہت کم چوڑیاں تھیں اور بائیں کلائی پر چمکتے ڈائل کی گولڈن ریسٹ واچ تھی۔ غرضیکہ سراپا چاند کسی طور کہیں سے نمایاں نہیں تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم ہنستی باہر آئی تھی۔ سامنے ماہین کو دیکھ کر خوشی اس کی آنکھوں میں جھلملائی تھی وہ تیزی سے اس کی سمت بڑھی۔ اور اسے گلے سے لگا لیا۔

"مائی گاڈ۔ یہ تو بالکل غیر متوقع ہے، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بالکل۔ بہت اچھا کیا۔ کوئی تو اپنا وقت رخصت سامنے ہو کہ آخری تصویر آنکھوں میں بسی رہے۔"

"خدا نہ کرے بجو۔ اللہ کرے آپ صحت کی خوشخبری بہت جلد سنیں۔" ماہین نے تڑپ کر اسے زور سے بھینچ لیا۔ "کتنی حسین لگ رہی ہیں۔ سب آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ خدا کرے یہ تابندگی تمام عمر رکھیں۔ آمین۔"

"کیا کروں گی صحت پا کر۔" وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی۔

"بہت سے لوگ اب بھی آپ کی ضرورت بہت شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ یہ کفران ہے۔" وہ سمجھانے لگی۔

"ڈرائیور کے ساتھ آئی ہو؟ روشی اور تقی کیسے ہیں؟"

"جواد بھی آج آ رہا ہے اسلام آباد۔ اور روشی ٹھیک ہے۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"اچھا اپنے کسی کام سے آ رہا ہے یا ویسے ہی تم لوگوں کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے؟" نازنین کے لہجے سے زندگی جھلکنے لگی۔ "میں نے سنا ہے۔ میرا بیٹا بہت گریس فل اور ذہین ہے۔ ماشاءاللہ۔ تم کیا آ گئی ہو ان لوگوں کے پاس۔ میری جان کو سکون مل گیا ہے۔ ان کی زندگی میں بہت سے موڑ آئیں گے۔ اچھے فیصلوں میں ان کی ہیلپ کرنا۔ آئی ول تھینک فل ٹو یو۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر گرمجوشی سے ماہین کو گلے سے لگایا۔ کافی دیر دونوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو محسوس کیا۔ پھر بچھڑنے کا لمحہ آن پہنچا۔ نازنین بہت دکھ سے اس پر ایک نگاہ ڈال کر واپس ہوئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی تو ماہین کی نظر

تیمور علی خان پر پڑی۔ غالباً وہ ماہ زمین کو بلانے کی غرض سے وہاں تک آئے تھے۔ شیشے کے پیچھے کھڑے ہوئے تیمور علی خان ماہ زمین کے ساتھ بہت ہم آہنگ نظر آ رہے تھے۔

"آپ تو امی کی ہیں اتو جن کے ساتھ اجنبی بن کر بیس سال گزارے ہیں۔"

تیمور علی خان نے الوداعی انداز میں اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو حرکت دی اور ماہ زمین کے ساتھ اندر غائب ہو گئے۔

ماہین جانے کس خیال میں گم ریلنگ تھامے کھڑی رہ گئی۔ کسی بچے کے رونے کی آواز سن کر گویا ہوش میں آئی تھی اور بہت عجلت بھرے انداز میں پارکنگ لاٹ کی طرف آئی تھی۔

یاور علی خان اپنی طرف کا دروازہ کھولے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ماہین نے کوئی بات کیے بغیر کاروان کی سمت بڑھا دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

انہوں نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

ماہین نے مدھم روشنی میں ایک نگاہ ان کے چہرے پر کی۔ آنکھیں نیم وا۔ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے۔ جانے کیوں کوئی عام سی بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اس نے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

ڈنر کا انتظام بہت محدود پیمانے پر تھا۔ جتنے افراد حویلی کے تھے اتنے ہی باہر کے تھے۔ ہادی تو صبح ہی سے گرفتار ہو چکا تھا۔ جی بھر کے کان کھینچے گئے تھے۔

مختلف زاویوں سے انٹرویو لیا گیا تھا۔ بال کی کھال نکالی گئی تھی۔ وہ تو عالم تاب کی بروقت مداخلت نے اس کی جان چھڑائی تھی۔

ڈھولک پر "مسٹر فرازیئے" باقاعدہ اسے سامنے بٹھا کر گایا گیا۔

واہ بھئی واہ کتنا سویٹ ہے۔ مسٹر فرازیئے۔

یہ گردان جاری تھی کہ عالم تاب آ گئی تھیں۔ اور یوں اس کی جان چھوٹی تھی۔

"کاکا جان کے بعد یہ دوسری "محبت زندہ باد" ہے۔" زوبی نے اہم نکتے کی طرف ان سب کو متوجہ کیا تھا۔

روشی دلہن بنی ہادی کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ سب انہیں گھیرے کھڑی تھیں۔ تصاویر کا سلسلہ جاری تھا۔

"اللہ روشی کتنی پیاری لگ رہی ہے۔" بینی نے بہت سرخوشی کی کیفیت میں کہا تھا۔

"ہادی ادھر دیکھو تو تم تو ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے بیٹھے ہو۔ آج بھائی پارٹی کی کارگزاری کی داد تم بھی دو۔" مومو نے ہادی کو تنگ کیا۔

مرتا ہوں سادگی پہ کہ فطرت کا حسن ہے
میرے لیے نہ خود کو سنوارا کرے کوئی

ہادی نے بڑی شریر مسکراہٹ کے ساتھ ایک لوہار کی کے مصداق جواب دیا تھا۔

"آ... اوہ۔" ایک ساتھ پکار گئی۔

"بی بی جان ہادی کو کہیں روشی کو تنگ کر رہا ہے۔" کنزی نے شرارتاً شکایت لگائی۔

"ہادی! ابھی تم نے روشی کو نہیں دیکھا؟" مریم نے یوں کہا جیسے اسے نہ دیکھنے پر بہت افسوس ہو رہا ہو۔

"صرف ابھی کو تو دیکھا ہے اور تو کوئی نظر نہیں آیا۔" ہادی نے گنگنایا۔

ماہین نزدیک ہی کھانے کا انتظام دیکھ رہی تھی۔ شور و شغف بھرے جملے اس کے کانوں میں بھی پڑ رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ فون آنے کی اطلاع آئی۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی جلدی سے لاؤنج میں آئی۔ شاید مہمان جلدی شاید مستند پارے۔

"ہیلو!" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ دوسری طرف محترم آواز اور شستہ انگریزی میں کوئی موصوفہ کہہ رہی تھیں۔ "پلیز ویٹ فار جسٹ اے منٹ۔ مسٹر تیمور علی خان آن لائن۔"

ماہین کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اللہ کرے خیریت کی خبر ہو۔

"ہیلو السلام علیکم۔ تیمور علی خان فرام یو ایس اے۔"

"وعلیکم السلام کیسے ہیں۔ بچوں کی طبیعت کیسی ہے۔" اس کی آواز میں لرزش آ گئی تھی۔

"ٹھیک ہیں۔ پہلا چیک اپ آج تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہوا ہے۔ اچھی خبر ہے کہ بچی پر جلد امید ہے آپ دعا کریں۔ ہم آپ کو اس لیے بھی فون کر رہے ہیں کہ اب آپ پاکستان میں ہمارا انتظار دیکھئے گا۔ ہم یہاں دو ماہ کے لیے ہیں پھر لندن چلے جائیں گے اور وہیں سیٹل ہوں گے۔"

ہمارا خیال ہے یہ ہم سب کے لیے بہت بہتر ہے۔ ان کا ایک موسٹلم بھیج کر اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن بچوں کو لینے ہم دو تین ماہ کے اندر پاکستان آئیں گے۔ ہم سے مطلب صرف ہم۔ امید ہے یہ حوصلہ افزا خبر آپ کے لیے بھی بہت بڑی خوشخبری ہے۔"

"جی بہت زیادہ۔ بیان سے باہر ہے۔ آپ کی اس وقت رئیل فیلنگ کیا ہے؟ واقعی آپ خوش ہیں؟"

"ایک انسان واقعی یہ بہت اچھی خبر ہے۔ آپ ہماری طرف سے بے فکر ہیں۔" تیمور علی خان بہت سکون سے بات کر رہے تھے۔

آپ کے لیے ایک شعر ہے۔

پست حوصلے والے تیرا ساتھ کیا دیں گے
زندگی ادھر آ جا ہم تجھے گزاریں گے

"اس میں آپ کا "ہم" بھی موجود ہے۔" ماہین ہنس پڑی تھی۔

"سو پلیز۔ تھینکس۔ اور آپ کیسی ہیں۔ کیا کر رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں۔ ابھی مصروفیت تھی۔" اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"آپ بجو کا خیال رکھیے گا۔ وہ وہاں جا کر آپ سے خفا تو نہیں ہوئیں لڑیں تو نہیں؟"

ع اُسے میری چپ نے رُلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا

ماہین کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ تیمور علی خان شاعری بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ تیمور علی خان نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور وہ ریسیور ہاتھ میں تھامے ہنوز ایک ہی زاویے سے کھڑی تھی۔

"بات تو پھر یہ ہوئی بجو کہ ازل سے ہمارے درمیان طویل فاصلے طے ہیں۔"

وہ ریسور رکھ کر دوبارہ لان میں آئی تو منظر ہنوز وہی تھا۔ روشی کے چہرے پر پاپابی کے وہ رنگ تھے کہ دل سے مسافت و تھکن کی دھول اترنے لگی۔

یاور علی خان مین گیٹ پر تنہا ہی کسی جوڑے کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔

☆------------------------------☆

copied from web

9-4-2008